اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(سُوْرَۃُ النِّسَآءِ) ...... تا ...... (سُوْرَۃُ الْمَآئِدَۃِ)

(جلد: ۳)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیاایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(سُوْرَةُ النِّسَآءِ) ...... تا ...... (سُوْرَةُ الْمَآئِدَةِ)

(جلد: ۳)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے،پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

نام کتاب	:	تفسیر روح القرآن
مؤلف	:	ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی
ناشر	:	ادارہ هُدًى لِلنَّاسِ
کمپوزنگ	:	زاہد حسین
پرنٹرز	:	محمد ندیم پرنٹنگ پریس، لاہور
تاریخ اشاعت دوئم	:	جنوری 2012ء
تعداد	:	1000
قیمت	:	700 روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ 343-مہران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔فون: 042-35426800

۲۔ ادارہ اسلامیات نئی انارکلی لاہور۔

۳۔ مکتبہ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور۔

۴۔ ادارہ منشورات ملتان روڈ بالمقابل منصورہ لاہور۔

۵۔ ۳۔کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور۔فون: 042-37248676-37320961

ہیڈ آفس: منصورہ ملتان روڈ لاہور۔ 042-35417074

۶۔ ادارہ البدر پبلی کیشنز 23 راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

موبائل: 0300-8485030۔فون: 042-37225030

Marfat.com

(ایک ضروری گزارش)

بعض احباب کے اصرار پر ادارہ هُدًى لِلنَّاسِ نے اس کتاب کا نام ''دروس القرآن'' کی بجائے ''تفسیر روح القرآن'' تجویز کیا ہے۔ اس کتاب کی بیشتر جلدیں چونکہ دروس القرآن کے نام سے چھپ چکی ہیں اس لئے اپنے قارئینِ کرام کو کسی خلطِ مبحث یا غلط فہمی سے بچانے کیلئے یہ گزارش ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ مناسب سمجھیں تو اپنے پاس نسخوں میں نام کی تبدیلی کر لیں، اور اگر کہیں کتاب کے اندر سابقہ نام کا ذکر آئے تو اسے بھی نئے نام سے بدل دیں۔

Marfat.com

فہرست

تعارف: ---------- 14

زمانۂ نزول: ---------- 14

سُوْرَۃُ النِّسَآءِ: ---------- 17

اسلوبِ قرآن کا ایک انداز: ---------- 19

اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ: ---------- 21

عورت کی عزت وحرمت: ---------- 22

صلہ رحمی کی تاکید: ---------- 23

یتیموں کے سرپرستوں سے خطاب: ---------- 26

یتیموں کے مال کی حفاظت کے لیے ضروری ہدایات: ---------- 26

یتیم بچیوں پر ظلم کی مختلف صورتیں: ---------- 28

ظلم کے انسداد کے لیے ہدایات: ---------- 29

مَاطَابَ لَکُمْ کا مفہوم ---------- 30

مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کا مفہوم: ---------- 30

غلامی اسلام کے پروگرام کا حصہ نہیں ---------- 32

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ بیویوں کی صورت وحکمت: ---------- 34

ایک غلط فہمی کا ازالہ ---------- 37

مہر کی تاکید اور ہدایات: ---------- 38

سُفَھَآءَ سے مراد اور مال کی اہمیت: ---------- 40

ایک ضروری ہدایت: ---------- 42

یتیموں کا مال کب انہیں سپرد کرنا چاہیے؟ ---------- 44

بدارًا کا مفہوم: ---------- 46

سرپرستوں کو خدمت کے معاوضہ کے حوالے سے ہدایات: ---------- 46

یتیموں کے تحفظ کی برکت: ---------- 48

قانونِ وراثت کی تمہید اور اس سے متعلق ہدایات: ---------- 48

Marfat.com

یتیموں کے مال کھانے والوں کو تہدید:	51
وصیت کا مفہوم:	58
لڑکا اور لڑکی کی میراث کے حکم میں اسلوبی حکمت:	58
لڑکیوں کی میراث کی تفصیل:	59
میاں بیوی کی میراث کی تفصیل:	62
کلالہ کی میراث کا بیان:	63
تکملہ احکامِ میراث:	65
قرآن کتابِ قانون بھی ہے اور کتابِ نصیحت بھی:	67
عارضی تعزیراتی احکام:	71
اَلَّذٰنِ کا مفہوم:	73
دو مردوں کے ناجائز تعلق کی شناعت اور سزا:	74
ربطِ کلام اور اصلاح میں توبہ کی اہمیت:	77
توبہ کے تین ارکان:	78
جہالت کا مفہوم:	79
عرب جاہلیت کے ایک مکروہ رواج کی اصلاح:	82
فاحشہ کا مفہوم:	83
عورتوں کے حقوق کی تاکید:	84
علیحدگی ناگزیر ہو تو اس کے لیے ہدایات:	86
محرمات شرعیہ کی تفصیل:	90
محرمات نسبیہ:	90
محرمات رضاعیہ:	92
محرمات صہریہ:	94
بیٹوں کی بیویاں:	95
جمع بین الاختین اور خالہ اور بھانجی اور پھوپھی اور بھتیجی کا جمع کرنا بھی حرام ہے:	95
مَاقَدْ سَلَفَ کا مفہوم:	95
منکوحہ عورت دوسرے کے لیے حرام ہے:	96

Marfat.com

لونڈیوں سے متعلق ضروری تفصیل: 99
متذکرہ احساسات کے ساتھ متعہ میل نہیں کھاتا: 100
لونڈی سے نکاح کی اجازت اوراس کی شرائط: 103
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی: 106
مسلمانوں کے مقابل کون اور کیسے؟ 107
ایک اہم حقیقت: 110
اس آیتِ کریمہ میں تین باتیں: 111
پابندیوں کی علت: 114
کبائر اور صغائر کا مفہوم: 114
انسانی زندگی میں مفاسد کا اہم سبب خِلقی اور غیر اختیاری امور میں غلط سوچ اور رویہ ہے 118
اللہ کے فضل کو متعین اور مقید نہ کرو: 121
نظامِ میراث قطعی ہے: 121
آیت کریمہ کو سمجھنے کے لیے تمہید: 124
بیویوں کی صفات اور فرائض: 127
شوہر کی اطاعت غیر مشروط نہیں: 129
نشوز کا مفہوم: 130
نشوز کی صورت میں شوہر کو تین باتوں کی ہدایت: 131
ترکِ مباشرت لامحدود نہیں: 131
بدزبانی نہ کی جائے: 132
حسن سلوک سے پیش آؤ: 137
سب سے پہلا حق اللہ کا حقِ عبادت ہے: 137
حقوق الوالدین: 138
والدین کے تین حقوق: 138
ذوی القربٰی کے حقوق: 143
یتیموں اور مسکینوں کے حقوق: 146
ہمسایوں کے حقوق: 149

Marfat.com

پڑوسی کا مقام اور اس کے حقوق کی رعائت کی تاکید: ---------- 151
پڑوسی کے معاشرتی حقوق: ---------- 153
ایک مومن بخیل نہیں ہوتا: ---------- 158
بخیل کس شخص کو کہتے ہیں؟: ---------- 159
ہر رسول اپنی امت پر گواہی دے گا: ---------- 169
ہمارے رسول پاکؐ ہم پر گواہی دیں گے: ---------- 169
امتوں کی بداعمالیاں ان کے رسولوں کے لیے جواب دہی کا باعث ہوں گی: ---------- 171
ایک اذیت ناک احساس: ---------- 172
صلوٰۃ کا مفہوم: ---------- 176
شراب کی حرمت تدریج کے ساتھ: ---------- 176
حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَاتَقُوْلُوْنَ کا مفہوم: ---------- 177
اِلَّاعَابِرِیْ سَبِیْلٍ کا مفہوم: ---------- 178
کن صورتوں میں تیمّم جائز ہے: ---------- 178
تیمّم کرنے کا طریقہ: ---------- 179
تیمّم وضو یا غسل کا مقصد کیسے ادا کر سکتا ہے؟: ---------- 179
اوتوا نصیبا من الکتاب کا مفہوم: ---------- 180
رسولوں کی عزت وحرمت اور اللہ کی غیرت: ---------- 182
یہود کی قومی شخصیت کی شناخت: ---------- 183
پیغمبروں کی توہین یہود کے ملی مقاصد میں شامل ہے: ---------- 183
عیسائی بھی یہود کے ہمنوا ہیں: ---------- 184
یہود کی طرف سے مجلسی الفاظ کا غلط استعمال: ---------- 185
نبی پر طعن خود دین پر طعن ہے: ---------- 187
اتمام حجت: ---------- 188
چہروں کو مسخ کرنے کا مفہوم: ---------- 188
یہود پر لعنت کا اصل سبب شرک ہے: ---------- 190
توحید کا مفہوم: ---------- 191

Marfat.com

شرک افتراء عظیم: ---------- 192
اہل کتاب کے شرک کی مثال ---------- 193
جبت اور طاغوت کا مفہوم: ---------- 196
یہود کی اصل بیماری: ---------- 197
یہود کی اسلام اور مسلمان دشمنی: ---------- 198
یہود ونصاریٰ کا اصل چہرہ پہچاننے کی ضرورت: ---------- 200
نَصِیبٌ مِّنَ الْمُلْکِ کا مفہوم: ---------- 200
یہود حسد کے مریض تھے: ---------- 202
آلِ ابراہیم سے کون مراد ہے؟ ---------- 203
بنی اسماعیل سے اللہ کے تین وعدے: ---------- 204
یہاں آلِ اسماعیل مراد ہیں: ---------- 206
ایمان نہ لانے والوں کا انجام: ---------- 206
ایمان لانے والوں پر انعام: ---------- 208
ازواج مطہرۃ کا مفہوم: ---------- 208
آیات کا شانِ نزول: ---------- 209
امانت کا مفہوم: ---------- 210
نااہلوں کو امانت سپرد کرنا خرابی کا اصل سبب ہے: ---------- 212
امانت کی اہمیت: ---------- 213
حقِ امانت میں عدل وانصاف پر زور: ---------- 213
تمہیدی کلمات: ---------- 214
تین نظام ہائے حکومت: ---------- 215
اصل خرابی انسان کو غیر معمولی اختیارات کا مل جانا ہے: ---------- 216
اسلام میں امر واطاعت کے مراکز: ---------- 218
اولوالامر سے کیا مراد ہے؟: ---------- 220
اختلاف کی صورت میں آخری مرجع اور سند: ---------- 222
آیات کا شانِ نزول: ---------- 226

Marfat.com

منافقین کا اصل جرم:---------- 227
و یرید الشیطان ان یضلھم ضلالاً بعیدا کا مفہوم:---------- 228
یہ تنقید ہمارے لیے آئینہ ہے:---------- 229
منافقین کو تنبیہ اور آگاہی:---------- 230
رسولؐ کا حقیقی مقام و مرتبہ:---------- 232
"وَ رَبِّکَ" کا معنی و مفہوم:---------- 234
ایمان کے ثبوت کے لیے تین شرائط:---------- 235
نفاق کا اصل سبب:---------- 236
ایک اہم حقیقت:---------- 238
صدیق کا تعارف:---------- 239
شہید کا تعارف:---------- 240
صالح سے کون مراد ہے؟:---------- 240
شانِ نزول:---------- 241
آیت کا پس منظر:---------- 243
مشکل الفاظ کی تشریح:---------- 244
دو ہدایات:---------- 244
نفاق کی علامتیں:---------- 245
اللہ کی راہ میں لڑنے والے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟:---------- 247
اس رکوع میں مضامین کی ترتیب:---------- 249
ترتیب کے لحاظ سے آخری آیت:---------- 251
اس آیت کا پس منظر اور پیش منظر:---------- 256
قتال سے پہلے معنوی، اخلاقی اور روحانی تیاری کے لیے نماز اور روزہ کا حکم:---------- 256
منافقین کا اصل روگ:---------- 258
منافقین کی مزید علامات و خصوصیات:---------- 260
آیت میں بیان کردہ چند حقائق:---------- 263
چند مقدمات:---------- 264

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اللہ کی گواہی: ---------- 265
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے: ---------- 266
منافقین کا طرزِ عمل: ---------- 266
منافقین کا فکری تضاد: ---------- 267
تدبر قرآن کا نتیجہ: ---------- 268
منافقین کی افواہوں سے دلچسپی: ---------- 269
افواہ سازی قوم کا حوصلہ توڑنے کا مؤثر ذریعہ: ---------- 270
فضل اللہ کا مفہوم: ---------- 272
دو حقیقتیں: ---------- 273
شفاعت کا معنی ومفہوم: ---------- 275
سفارش کا صحیح مفہوم: ---------- 276
سلام کے حکم کا پس منظر: ---------- 278
سلام مسلمان کی شناخت: ---------- 278
سلام کا مفہوم اور اس کی جامعیت: ---------- 279
سلام ملاقات کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے بھی: ---------- 282
سلام کے لیے کچھ ضوابط: ---------- 282
منافقین کے نفاق کا اصل سبب: ---------- 284
ہجرت نہ کرنے والے منافقین کے بارے میں مسلمانوں کی دو رائے: ---------- 287
ہجرت مدارِ ایمان: ---------- 288
قتلِ عمد کا تصور بھی مسلمان کے لیے روا نہیں: ---------- 294
قتلِ خطا اور اس کی سزا: ---------- 294
قتلِ عمد کی سزا اور اس جرم کی سنگینی: ---------- 297
سلام کہنے والوں کو مسلمان سمجھو اور قتل مت کرو: ---------- 298
جہاد کی ترغیب اور اس کے مختلف درجات: ---------- 300
تمام غیر معذور مسلمانوں کو ہجرت کا حکم ترغیب اور ترہیب کے ذریعے: ---------- 302
ہجرت پر دنیوی اور اخروی برکات کے دعوے: ---------- 306

Marfat.com

آیت کا ربط: ---------- 309
نماز ہجرت اور جہاد کی روح ہے: ---------- 309
وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ کا مفہوم: ---------- 310
آیت میں نماز اور مسلح رہنے پر زور دیا گیا ہے: ---------- 314
اسلام تدبیر اور توکل کا حسین امتزاج: ---------- 315
صلاۃ الخوف میں کمی کی تلافی ذکر اللہ کی کثرت سے: ---------- 316
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام من جانب اللہ ہیں: ---------- 316
القوم کا معنی: ---------- 317
دشمن کے تعاقب کا حکم اور اہمیت: ---------- 317
شانِ نزول: ---------- 320
خطاب حضورؐ سے...... روئے سخن منافقین کی طرف: ---------- 321
حمایت کرنے والوں کو تنبیہ: ---------- 322
قرآنِ کریم کا حکیمانہ اسلوب: ---------- 322
ربطِ کلام ---------- 332
شرک کی کبھی بخشش نہیں ہوگی: ---------- 332
باقی گناہوں کو بخشنے کا امکان ظاہر فرمایا ہے وعدہ نہیں: ---------- 332
مشیت حکمت کی پابند ہے: ---------- 333
جہنم کے عذاب کی شدت کا استحضار ضروری ہے: ---------- 333
دور کی گمراہی میں پڑنے کا مفہوم: ---------- 334
شرک کا بودا پن: ---------- 334
شیطان کو پکارنے کا مفہوم: ---------- 335
شیطان کا بندوں سے مقررہ حصہ لینے کا مفہوم: ---------- 337
آرزوؤں کا جال: ---------- 337
خدائی ساخت میں تبدیلی کا مفہوم: ---------- 338
شیطان کا کاروبارِ ضلالت...... وعدے کرنا اور امیدیں دلانا: ---------- 339
شانِ نزول: ---------- 340

Marfat.com

سب سے بہتر انسان: ---------- 341
ترجمہ سے متعلق: ---------- 344
ربطِ کلام: ---------- 345
کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ کا مفہوم: ---------- 355
صاحب ایمان لوگوں کو ایمان لانے کا مفہوم: ---------- 358
سابقہ آیت کے اصحاب ایمان کے کردار کی تصویر: ---------- 359
منافقین کی پہلی علامت: ---------- 361
منافقین کی دوسری علامت: ---------- 362
ربطِ کلام: ---------- 365
منافقین کی جسارت: ---------- 366
خدع اللہ کا مفہوم: ---------- 366
نماز اسلام کی علامت ہے: ---------- 367
منافق کی نماز محض دکھاوا ہے: ---------- 368
سنت اللہ: ---------- 368
دوست نہ بنانے کا مفہوم: ---------- 369
مسلمانوں کے بالمقابل کفار سے دوستی دلیلِ کفر ہے: ---------- 369
دَرَک کا معنی: ---------- 370
منافقین کا انجام: ---------- 370
تعیینِ اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار صرف مظلوم کے لیے جائز ہے: ---------- 371
جماعتی زندگی کی ایک اہم ہدایت: ---------- 372
صفاتِ الٰہی کے ذکر سے مقصود ان کا لازم ہے: ---------- 372
پسندیدہ روش کا بیان: ---------- 372
کفر کی اقسام: ---------- 373
شانِ نزول: ---------- 373
اہل کتاب کی تاریخ سے استشہاد: ---------- 378
واقعات بیان کرنے کا مقصود: ---------- 379

Marfat.com

یہود کے کفر پر ولادتِ مسیح سے استدلال: ---------- 380
رسول اللہ کی توجیہ: ---------- 381
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل یا صلیب دینے کی تردید: ---------- 382
لٰکِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ کا مفہوم: ---------- 382
اِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ کا مفہوم ---------- 385
آیت کے مختلف تراجم کی وضاحت: ---------- 386
یہود کی سرکشی کی وجہ سے بعض طیبات کی ممانعت: ---------- 387
قرآن کریم کی تنقید میں عدل: ---------- 389
یہود کے مطالبہ کا جواب ایک دوسرے پہلو سے: ---------- 392
رسولوں کے بھیجنے کا مقصد: ---------- 394
رسولوں کی بعثت کی ضرورت: ---------- 394
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی: ---------- 396
اللہ اور فرشتوں کی گواہی کا ادراک: ---------- 397
ایک عام تنبیہ جس میں روئے سخن نصاریٰ کی طرف ہے: ---------- 398
عیسائیوں کا اصل روگ غلو ہے: ---------- 398
قوموں کی گمراہی کا ایک سبب: ---------- 402
دوسرا سبب: ---------- 402
مقامِ بندگی: ---------- 404
برہان اور نور سے مراد: ---------- 405
کلالہ سے متعلق سوال کا جواب: ---------- 406

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ النِّسَآءِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

زمانہ نزول: یہ سورة قرآن پاک کی چوتھی سورة ہے۔ یہ مدنی ہے یعنی یہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی۔ اس کی آیات کی تعداد ۱۷۶ ہے۔ اس کے ۲۴ رکوع ہیں۔ اس کے زمانہ نزول کے بارے میں متعین طور پر کوئی بات کہنا مشکل ہے کیونکہ یہ پوری سورة ایک دفعہ نازل نہیں ہوئی بلکہ یہ متعدد خطبوں کا مجموعہ ہے جو مختلف وقتوں میں نازل ہوتے رہے ہیں۔ البتہ اس کے بعض احکام کے بارے میں چونکہ آثار و سیر میں تاریخوں کا ذکر موجود ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ احکام فلاں سال اور فلاں تاریخ میں نازل ہوئے۔ اسی طرح اس سورة میں بعض واقعات کی طرف اشارے ہیں اور حدیث کی مدد سے ہمیں معلوم ہے کہ یہ واقعات کب پیش آئے۔ اس سے ہمیں ان آیات کے نزول کے زمانے کا تعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً جنگِ احد میں جب مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد شہید ہوگئی اور انہوں نے اپنے پیچھے بیوگان اور یتامیٰ چھوڑے تو ضرورت ہوئی کہ بیوگان اور یتیموں کے حقوق کے بارے میں ضروری احکام نازل کئے جائیں اور اسی طرح شہدا کی وراثت کے بارے میں بھی ہدایت دے دی جائیں کہ اب وراثت کے مسائل کیا ہوں گے اور کون کون لوگ مرحومین کے ورثا ہوں گے؟ تو اس صورت میں جہاں بھی ان احکامات کا ذکر ہوا ہے اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیات جنگِ احد کے بعد نازل ہوئی ہوں گی۔ اسی طرح بنو نضیر کے بارے میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس سورة میں انہیں آخری تنبیہ کی گئی ہے اور اس کے بعد بنو نضیر کو ہمیشہ کیلئے مدینہ سے نکال دیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ تنبیہ والی آیت یقیناً اس وقت نازل ہوئی ہوگی جب بنو نضیر مسلسل عہد شکنی اور سازشوں کے ذریعے اپنے آپ کو مسلمانوں کیلئے ناقابلِ برداشت بنا چکے تھے۔ پھر اسی باعث ان کا مدینے سے اخراج ہوا۔ یہ واقعہ چونکہ چار ہجری کا ہے اس لئے تنبیہ والی آیت یقیناً چار ہجری سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اسی طرح اس سورة میں تیمم کے احکام دیئے گئے ہیں اور ہم حدیث اور تاریخ کی مدد سے جانتے ہیں کہ تیمم کی اجازت مسلمانوں کو غزوہ بنی المصطلق میں دی گئی ہے۔ جب مسلمان پانی نہ ملنے کے باعث پریشان تھے کہ اب نماز کیسے ادا کریں۔ تو یہ بات انتہائی قرینِ قیاس ہے کہ تیمم کے احکام غزوہ بنی المصطلق کے موقعہ پر نازل ہوئے ہوں گے جو پانچ ہجری کا واقعہ ہے۔ اسی طرح اس سورة میں اور بھی بعض احکام کا تذکرہ ہے بعض واقعات کے حوالے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سورة کا زمانہ نزول تین ہجری کے اواخر سے لے کر چار ہجری کے اواخر یا پانچ ہجری کے اوائل کا زمانہ ہے۔

رہے وہ احکام اور وہ ہدایات جو اس سورة میں نازل کی گئی ہیں ہم ان کا خلاصہ ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھتے اس لئے کہ سورة النساء کی تدریس میں جیسے جیسے احکام اور ہدایات سے متعلق آیات آتی جائیں گی ویسے ویسے ان کی تفصیل بھی بیان ہوتی جائے گی۔ البتہ بعض قرآن سے سورة کا زمانہ نزول اور مقامِ نزول چونکہ متعین کرنا آسان ہوگیا ہے تو اب یہ بات ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں کہ ہم ان حالات کا جائزہ لیں۔

Marfat.com

جن حالات میں یہ سورۃ نازل ہوئی ہے کیونکہ تیسری، چوتھی، پانچویں ہجری کا زمانہ ایسا نہیں جس کی تاریخ سے حدیث کی کتابیں اور آثار و سیر کا ذخیرہ خاموش ہو۔ چنانچہ تین ہجری سے پانچ ہجری کے زمانہ تک جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمانہ مسلمانوں کیلئے انتہائی کشمکش اور فتنوں اور مصیبتوں سے بھرپور زمانہ ہے۔ جنگِ بدر کے بعد اگرچہ مسلمانوں کو ایک استحکام اور وقار ملا تھا اور تمام دیکھنے والی نگاہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اسلام کے نام سے اٹھنے والی ایک نوزائیدہ تحریک ایسی چیز نہیں جسے نظرانداز کیا جاسکتا ہو۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مدینہ طیبہ اور پورے جزیرۂ عرب میں رہنے والے لوگوں نے نہایت تشویش کی نگاہ سے مسلمانوں کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور وہ ہر ممکن طریقے سے یہ چاہتے تھے کہ اس نوزائیدہ تحریک کو ہمیشہ کیلئے کچل کر رکھ دیا جائے۔ لیکن وہ کھل کر مسلمانوں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر رہے تھے۔ کیونکہ قریش کی شکست کا تجربہ ایسا نہیں تھا جس سے عرب صرفِ نظر کر سکتے۔ بنوقینقاع نے جنگِ بدر کے بعد بے صبر یا مشتعل ہو کر مسلمانوں کے خلاف بعض ایسی حرکتیں کیں جس سے ان کا خبث باطن کھل کر سامنے آ گیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبوراً ان کا محاصرہ کیا۔ آپؐ چاہتے تھے کہ اس فتنہ کی مکمل سرکوبی کر دی جائے لیکن عبداللہ بن ابی جیسے رئیس المنافقین نے نہایت اصرار کے ساتھ ان کی جاں بخشی کرا لی۔ لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ یہود کے باقی قبیلے اور مدینہ کے دور و نزدیک پھیلے ہوئے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف کوئی برہنہ اقدام کرنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ لیکن جنگِ احد نے صورتحال کو بالکل بدل دیا۔ وہ قوتیں جو دب چکی تھیں لیکن موقع کے انتظار میں تھیں وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل آئیں یہود کے باقی قبیلے بھی کھل کر مسلمانوں اور اسلام کے خلاف معاندانہ مساعی بروئے کار لانے لگے۔ ان حالات میں چند باتوں کی انتہائی ضرورت تھی۔ سب سے پہلی بات یہ کہ مسلمانوں کے سامنے انتہائی بپھرے ہوئے حالات تھے۔ مکہ والے تو پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ جنگِ احد میں انہیں بظاہر فتح نے اور زیادہ بدمست بنا دیا۔ دوسرے قبائل جنگِ بدر میں مسلمانوں کی فتح کے باعث دبے ہوئے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کی تبلیغ و دعوت کو کھل کر روکنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ لیکن اب صورتحال بدلنے کے باعث وہ مسلمانوں سے درشتی بلکہ دشمنی سے پیش آنے لگے۔ مسلمانوں کے اندر منافقین کی ایک اچھی خاصی تعداد مارِ آستین کے طور پر پہلے ہی موجود تھی۔ جنگِ احد میں انہوں نے خاصی بڑی تعداد میں لشکرِ اسلامی سے کٹ کر اپنی حیثیت اور اہمیت کا احساس دلایا اور مسلمانوں کی عارضی شکست نے انہیں موقعہ دے دیا کہ وہ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے بارے میں بدگمانیاں پھیلا سکیں۔ ان حالات میں سب سے ضروری دو باتیں تھیں ایک تو یہ کہ مسلمانوں کو ناموافق حالات میں جینے کا حوصلہ اور ہنر سکھایا جائے۔ دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی پائیداری دل و دماغ میں بیش از بیش مستحکم کی جائے اور منافقین کے پراپیگنڈے کا اثر ختم کرنے کیلئے ان کے ایمان اور یقین کو مزید جلا بخشی جائے۔ چنانچہ اس ضرورت کے پیشِ نظر ایسے زوردار اور پر جوش خطبے اس سورۃ میں نازل کئے گئے ہیں جس میں مسلمانوں کو محض اللہ پر اعتماد اور اپنی سچائی کی قوت پر بھروسہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اور دوسری یہ کہ مسلمانوں کی اس نوزائیدہ سوسائٹی میں گہرا ارتباط اور مستحکم معاشرت پیدا کر دی جائے۔ چنانچہ مسلمانوں میں گہرا ارتباط پیدا کرنے کیلئے دو مضبوط بنیادیں فراہم کیں، جنہیں عقیدہ کی حیثیت دی گئی۔ ایک یہ کہ تمام انسانوں کا خالق و مالک اور رب اللہ وحدہٗ لاشریک ہی ہے اور دوسرا یہ کہ اس نے سب انسانوں کو ایک آدم اور حوا سے وجود بخشا ہے۔ اس لحاظ سے تمام انسان وحدتِ رب اور وحدتِ اب میں شریک ہیں۔ خدا کی ربوبیت اور رحم کا رشتہ سب کے درمیان مشترک ہے۔ ان دو مضبوط بنیادوں نے ایک مضبوط ارتباط کی بنیاد رکھ دی، جس نے شرک کی تمام آلودگیوں سے اس معاشرے کو محفوظ کر دیا اور نوزائیدہ سوسائٹی کی عمارت تمام افتراقات سے محفوظ

Marfat.com

ہوگئی اوران میں مضبوط معاشرت پیدا کرنے کیلئے پرانے تمام طریقوں کو مٹا کر اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت اور تدبیر مملکت کے نئے اصول رائج کیے گئے۔ پورے معاشرے کو ہمسائیگی کے حقوق اور انسانی احترام کے رشتوں سے اس طرح پیوست کر دیا کہ پورا معاشرہ ایک گھر کی مانند ہوگیا۔ اس سے وہ مضبوط عمارت وجود میں آئی جس نے حوادث روزگار کا رخ پھیر دیا۔

جنگِ احد میں چونکہ مسلمانوں میں سے ایک بڑی تعداد شہید ہوگئی، جس کے نتیجے میں بہت سارے گھرانوں میں بیوگان اور یتامیٰ کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور ساتھ ہی ساتھ یہ ضرورت بھی پیدا ہوئی کہ وراثت کے بارے میں ضروری ہدایات دی جائیں۔ لیکن یہ ہدایات اس وقت تک مستحکم نہیں ہوسکتی تھیں جب تک منظم اسلامی سوسائٹی کا تصور دماغوں میں راسخ نہ کیا جاتا اور جاہلیت کے پرانے طریقوں کو مٹا کر ایسے صالح اصولِ معاشرت نہ دیئے جاتے جس سے ایک نئی معاشرتی زندگی وجود میں آتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سورۃ میں نہایت موثر اور منضبط طریقے سے اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت اور تدبیر مملکت کے اصول نازل کیے گئے ہیں۔ جس سے افراد میں باہمی صلہ رحمی اور قرابت داری کے ساتھ ساتھ انسانی رشتوں کو ایسا مستحکم کیا گیا ہے کہ جس سے ایک مضبوط سوسائٹی جنم لیتی ہے اور وہی سوسائٹی اسلامی ریاست اور حکومت کی بنیاد بنتی ہے۔

ہر نوزائیدہ تحریک کی طرح مسلمانوں کی بھی ترقی اور بقا کا راز دو چیزوں پر تھا۔ ایک تو ہر فرد کی ذاتی زندگی کا صاف ستھرا ہونا اور دوسرا مسلمانوں میں سے ہر فرد کا اسلام کیلئے داعی بن جانا۔ کیونکہ غیر مسلم معاشرے میں رہتے ہوئے یہ دو ہی چیزیں ہیں جو غیر مسلموں کو اسلام کی طرف لانے کی قوت رکھتی ہیں۔ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے شب و روز کا میل جول تھا، پرانی رشتہ داریاں تھیں، ایک شہر تھا، ایک زبان تھی، ایک جیسے رسم و رواج تھے، باہمی لین دین اور تجارتی معاملات کا اشتراک بھی تھا۔ یہ ہر وقت کا میل جول تاثیر اور تاثر میں سب سے موثر قوت ہے۔ جب آدمی کسی کو دیکھتا ہے کہ وہ میری طرح کا آدمی ہے، اس کی ضروریات بھی میری جیسی ہیں، لیکن نہ اس میں بد معاملگی ہے، نہ وہ خیانت کرتا ہے، نہ وہ جھوٹ بولتا ہے، وہ زبان کے معاملے میں اور دیگر عوامل کے بارے میں بے حد محتاط واقع ہوا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے اس کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہزار تنہائیوں میں بھی گناہ اور خیانت کا تصور نہیں کرتا کیونکہ اسے یقین ہے کہ اس کا اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ ذاتی زندگی کی یہ پاکیزگی اور اخلاقی زندگی کی بلندی ہر شخص کو سوچنے پر مجبور کر دیتی تھی کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس نے ان لوگوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس طرح سے مسلمانوں کی سادہ اور بے میل زندگی غیر مسلموں کو اسلام کی طرف لانے میں سب سے موثر عامل ثابت ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ تبلیغ و دعوت کے حوالے سے مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ وہ نہایت ناموافق حالات میں بھی تبلیغ و دعوت سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ قرآنِ کریم ان کے نوکِ زبان پر رہتا تھا۔ آنحضرت کی صحبتیں انہیں ہر وقت دعوتی سرمایہ فراہم کرتی تھیں اور وہ زندگی کی سب ضرورتوں سے بڑی ضرورت اس کام کو سمجھ کر انجام دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہم ایک محدود تعداد میں ہیں ہم ساری دنیا کو لڑ کر ختم نہیں کر سکتے ہماری اصل طاقت دعوت اور ان میں نفوذ پیدا کرنا ہے چنانچہ اس سورۃ میں اس کے حوالے سے بار بار خطبات نازل ہوئے ہیں۔ جن میں ایک طرف تبلیغ و دعوت کے اصول بیان کیے گئے تو دوسری طرف یہودیوں عیسائیوں اور مشرکین تینوں مخالف گروہوں کے غلط مذہبی تصورات اور غلط اخلاق و اعمال پر اس طرح تنقید کی گئی کہ جس سے صالح عنصر کو اسلام کی طرف آنے میں مدد ملی اور معاندین کا نہ صرف کہ بھرم کھل گیا بلکہ ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ اور مسلمان تین ہی سالوں میں ان تعلیمات کی روشنی میں نہ صرف اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے بلکہ وہ تیزی سے اٹھتی ہوئی طاقت میں تبدیل ہوگئے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۱۷۶	سُوْرَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ (۴)	رُكُوْعَاتُهَا ۲۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ
وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ
نِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝۱ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا
الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ
حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا
مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ
اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا
تَعُوْلُوْا ۝۳ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ
عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۝۴ وَلَا تُؤْتُوا
السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ
فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى
حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا

Marfat.com

إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا ۚ
وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ
بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا
عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ﴿٦﴾ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ
الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ
وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ﴿٧﴾ وَإِذَا
حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُمْ
مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ﴿٨﴾ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا
مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ
وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ
ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾

عربی رکوع ۱ (اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے پھیلا دیئے بہت سے مرد اور عورتیں اور اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس کے واسطہ سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے باب میں بھی اللہ سے ڈرو بے شک اللہ تمہارے اوپر نگران ہے ٥ اور یتیموں کے مال ان کے حوالہ کرو اور اپنے برے مال کو ان کے اچھے مال سے نہ بدلو اور نہ ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ گڈمڈ کر کے ہڑپ کرو، بے شک یہ ایک بہت بڑا گناہ ہے ٥ اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے معاملے میں انصاف نہ کر سکو گے تو عورتوں میں سے جو تمہارے لئے جائز ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر لو اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان

Marfat.com

کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو ایک ہی پر بس کر دیا پھر کوئی لونڈی جو تمہاری مِلک میں ہو۔ یہ طریقہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ تم بے انصافی سے بچ جاؤ٥ اوران عورتوں کومہر دوخوش دلی سے پھراگروہ اس میں سے تمہارے لئے کچھ چھوڑیں اپنی خوشی سے، توتم اس کوکھاؤ رچتا پچتا٥ اوراپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے قیام اور بقا کا ذریعہ بنایا ہے نادان لوگوں کے حوالہ نہ کرو البتہ انہیں کھانے اور پہننے کیلئے فراغت کے ساتھ دو اور دستور کے موافق ان کی دل داری کرتے رہو٥ اوریتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کوپہنچ جائیں پھرتم اگران کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کردو اوراس ڈر سے کہ وہ بڑے ہوجائیں گے اسراف اور جلد بازی کرکے ان کا مال ہڑپ نہ کرو یتیم کا جو سرپرست مال دار ہواس کو چاہئے کہ وہ پرہیز کرے اور جومحتاج ہووہ معروف طریقہ سے کھائے پھرجب ان کے مال ان کے حوالے کرنے لگوتو ان پر گواہ ٹھہرالو اور حساب لینے کیلئے اللہ کافی ہے٥ والدین اوراقربا کے ترکے میں سے مردوں کیلئے بھی ایک حصہ ہے اور والدین اوراقربا کے ترکے میں سے عورتوں کا بھی ایک حصہ ہے خواہ ترکہ کم ہویا زیادہ، حصہ مقرر کیا ہوا ہے٥ اور جب تقسیم کے موقعہ پر قرابت دار اوریتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کوبھی کچھ دو اوران کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو٥ ان لوگوں کوڈرنا چاہئے جواپنے پیچھے اگر کمزور بچے چھوڑتے ہیں تو ان کے معاملے میں بہت اندیشہ ناک ہوتے ہیں، پس انہیں چاہئے کہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات کہیں٥ جولوگ ظلم وناانصافی سے یتیموں کا مال کھارہے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں وہ انجام کار دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے)۔ (آیات ۱ تا ۱۰)

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ٥

(اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کوایک ہی جان سے پیدا کیا اوراسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اوران دونوں سے پھیلا دیئے بہت سے مرد اورعورتیں اوراللہ سے تقویٰ اختیار کروجس کے واسطہ سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے باب میں بھی اللہ سے ڈرو بے شک اللہ تمہارے اوپر نگران ہے) (النسآء : ۱)

اسلوبِ قرآن کا ایک انداز

قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ جب وہ اسلام کے اساسی اصولوں کی طرف دعوت دیتا ہے اور یا ایسی بنیادی حقیقت کی طرف بلاتا ہے جس پر مسلم اور غیر مسلم کی زندگی کی کامیابی اور بقا کا دارومدار ہے تو وہ خطاب صرف مسلمانوں سے نہیں کرتا بلکہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ کہہ کر تمام نوع انسانی کو مخاطب کرتا ہے۔ یہاں بھی اسی اصول کے تحت یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس آیتِ کریمہ میں جن

Marfat.com

حقائق کی طرف نوعِ انسانی کو بلایا گیا ہے وہ انسانوں کی زندگی اور بقا کیلئے اس حد تک لازمی ہیں کہ ان کے بغیر انسانی زندگی کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ ان میں سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ لوگو! اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ انسانی فطرت جب تک سلامت ہے اور انسانی عقل صحیح نہج پر کام کرتی ہے اس وقت تک انسان کیلئے اس بات کا انکار کرنا کہ میں ایک مخلوق ہوں اور اللہ ہی میرا خالق ہے کسی طرح ممکن نہیں۔ جدید اور قدیم فلسفے ہزار سر ماریں لیکن اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں اور اس پر مزید دلیل یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اگر تمہارا خالق کوئی اور ہوتا تو وہ تمہاری ربوبیت کا سامان بھی کرتا۔ تم لحد سے لے کر مہد تک دیکھتے ہو کہ ایک ہی ذاتِ گرامی ہے جو اگرچہ تمہیں نظر نہیں آتی لیکن تم اس کی ربوبیت کے آئینے میں ہر وقت اسے اپنے دائیں بائیں محسوس کرتے ہو۔

ہر کہ بینیم در جہاں غیرے تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

ایک بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ تمام مخلوقات کے بچوں میں سب سے زیادہ بے بس اور محتاج ہوتا ہے۔ مرغی کا بچہ بھی کچھ ہی دیر بعد ماں کی آواز کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے، بلی کے بچے آنکھیں کھولتے ہی ماں کے پستان چوسنے لگتے ہیں، لیکن انسان کا بچہ پیدا ہونے کے بعد بالکل نہیں جانتا کہ اس کی ماں کون ہے اور باپ کون ہے۔ اس کے اندرونی احساسات میں سے صرف اس کا وہی احساس زندہ ہے جو اسے رلا سکتا ہے۔ اس کے سوا وہ ہر احساس سے عاری ہوتا ہے۔ وہ کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا ہے لیکن نہیں جانتا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے۔ اس کے حواسِ خمسہ میں سے سوائے ایک حس کے کوئی حس کام نہیں کرتی۔ ماں اسے جب تک اٹھا کر سینے سے نہیں لگاتی اسے نہیں معلوم اس کی غذا کا سرچشمہ کہاں ہے۔ ایسا بے حس، بے علم، بے دانش بچہ کسی طرح بھی اپنی غذا حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن اللہ کی ربوبیت کے قربان جایئے کہ اس کا فیضان جب وہ ماں کے پیٹ میں ہے تب بھی جاری رہتا ہے اور جب وہ دنیا میں آنے والا ہوتا ہے تب بھی کام کرتا ہے اور جب وہ دنیا میں آجاتا ہے تو پھر اس کی نمود میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ ماں تخلیق کے عمل سے گزرتی ہے تو گویا موت اور زندگی کی کشمکش سے گزرتی ہے، لیکن وہ اس کشمکش کو زندگی کی سب راحتوں سے عزیز سمجھتی ہے۔ بچہ ابھی اس کی گود میں نہیں آتا کہ مامتا اس کے سینے میں پہلے سے مچلنے لگتی ہے۔ اور جب وہ اس بے بس بچے کو اٹھاتی ہے تو کس محبت اور دیوانگی سے اسے اپنے سینے سے لگاتی ہے اور دودھ کی صورت میں اپنا خونِ جگر اس کے منہ میں ٹپکا کر نہال ہوتی جاتی ہے۔ بچہ کسی بات کو نہیں جانتا لیکن جیسے ہی ماں اسے سینے سے لگاتی ہے تو وہ دودھ کی تلاش میں منہ مارنے لگتا ہے اور پھر پستان کو منہ میں لے کر اس طرح چوستا ہے کہ غذا کا یہ چشمہ جاری ہو جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ یہ بے بس بچہ جو کچھ نہیں جانتا اسے چوس چوس کر دودھ نکالنا اور گھونٹ گھونٹ پینا کس نے سکھایا ہے۔ یہ وہ ربوبیت کا فیضان ہے جو مسلسل اپنا کام کر رہا ہے۔ باپ کے سینے میں اٹھنے والی شفقت ننھیالی اور ددھیالی رشتوں کی صورت میں پہچانی جانے والی محبت یہ سب اسی ربوبیت کے کرشمے ہیں۔ پھر جیسے جیسے بچہ بڑھتا جاتا ہے ربوبیت کا فیضان ساتھ ساتھ اس کی ضرورتیں پوری کرتا چلا جاتا ہے۔ جب تک اس کا معدہ کسی چیز کو قبول کرنے کی سکت نہیں رکھتا تو دودھ میں دھنیت کم اور مائیت زیادہ ہوتی ہے اور جیسے جیسے معدہ توانا ہوتا جاتا ہے مائیت کم اور دھنیت بڑھتی جاتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ بچہ دوسری غذائیں کھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے تمام مراحل میں اللہ کی ربوبیت کو دیکھتے ہیں وہ انسان کو انگلی پکڑ کر چلاتی ہے اور پھر کبھی احساس کا چراغ بن جاتی ہے اور کبھی شعور اور دانش کا نور بن کر روشن ہوتی ہے۔ خوشیاں آتی ہیں تو خوشیوں کا احساس بن جاتی ہے، غم آتے ہیں تو

Marfat.com

استقلال میں ڈھل جاتی ہے۔ مشکلات پیش آتی ہیں تو محنت، قوت اور پامردی کی صورت اختیار کرجاتی ہے، ناکامیاں ہوتی ہیں تو برداشت کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ غرضیکہ زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جس میں ربوبیت کا فیضان اپنی نمود نہیں دکھاتا اور کوئی ایسا راستہ نہیں جو اس کے نور سے روشن نہیں ہوتا۔ آدمی اور کچھ نہ سمجھے تو ربوبیت کا یہ عمل اسے یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ تیرا کوئی خالق و مالک بھی ہے۔ جس نے تمہیں پوری زندگی ضروریات سے بہرہ ور کیا ہے اور کہیں بھی بے دست و پا ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اگر آپ تھوڑا سا ذہن پر زور ڈالیں تو آپ کو یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوسکتی کہ جس طرح انسان کی جسم و جان کی ضرورتیں ہیں اور پروردگار کی ربوبیت نے اس کی کفالت اپنے ذمہ لے رکھی ہے اسی طرح اس کی روح، اس کی انسانیت، اس کے اخلاق، کائنات سے اس کے تعلق اور خالق و مالک سے اس کے تعلق اور انسانوں کے آپس کے تعلقات کے حوالے سے بھی انسان کی ضرورتیں ہیں۔ جس پروردگار نے اس کی تمام جسمانی ضرورتوں کو پورا کیا ہے کیسے ممکن ہے کہ وہ ان ضرورتوں کو پورا کرنے سے انکار کردے اور یا وہ انسان کو اختیار دے دے کہ تم ان ضرورتوں کیلئے اپنا راستہ خود طے کرو اور اپنے ہی راستے سے ان ضرورتوں کو حل کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ کی ربوبیت نے جس طرح پہلے مرحلے میں انسان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا اسی طرح دوسرے مرحلے میں بھی اس نے انسان کی دستگیری کی۔ اس کے اندر خیر و شر کی شناخت کا جذبہ رکھا پھر اس کو عقلِ سلیم سے نوازا تاکہ وہ حق و باطل میں فرق کرسکے اور مزید رہنمائی کیلئے اپنے رسول بھیجے اور اپنی کتابیں اتاریں۔ لیکن انسان کی غفلت کا عجیب حال ہے کہ وہ تمام جسمانی اور مادی ضرورتیں تو اللہ کی ربوبیت سے حاصل کرتا ہے لیکن معنوی اور روحانی ضرورتوں کیلئے وہ خود کفیل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ کبھی کسی ایک کی دریوزہ گری کرتا ہے اور کبھی کسی دوسرے کی۔ اس لئے سب سے پہلی بات یہ فرمائی کہ لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔ ربوبیت کی معرفت اپنے رب کو پہچانو اور پھر جس طرح مادی اور جسمانی ضرورتوں میں تم اس کی مدد سے آگے بڑھتے ہو اسی طرح زندگی کی باقی ضرورتوں میں بھی اسی کی نازل کردہ روشنی سے فائدہ اٹھاؤ۔ کیونکہ تمہارا رب ایک ہی رب ہے یہ کسی طرح مناسب نہیں جسمانی غذاؤں کیلئے تو تم اس کے سامنے دستِ سوال دراز کرو لیکن باقی پوری زندگی کسی اور کے آستانے پر ڈھیر کردو۔ اس گمراہی کے انجام سے ڈرو اور ربوبیت کے آستانے ایک سے زیادہ بنانے اور بار بار بدلنے سے احتراز کرو۔

اِنّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ

دوسری حقیقت جو اس آیت میں منکشف کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح تمہارا رب ایک ہے اسی طرح تمہارا اب یعنی باپ بھی ایک ہے۔ تمہاری یہی دو بنیادیں ہیں جس پر قائم رہنے سے تمہیں وحدتِ آدمیت نصیب ہوسکتی ہے۔ اسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے موقعہ پر فرمایا اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَّاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ ''تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے''۔ جس طرح تم زندگی کی رہنمائی میں اس ایک رب کے سوا کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے اسی طرح تم اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف اپنا انتساب بھی نہیں کرسکتے تمہیں اللہ نے نفسِ واحدہ سے پیدا کیا ہے۔ یعنی تم ابوالبشر حضرتِ آدم کی اولاد ہو۔ وہی سب کے جدِ امجد ہیں۔ ہر گورا اور ہر کالا ہر وحشی اور ہر مہذب، ہر ہندی اور ہر چینی اور ہر حبشی اور ہر فرنگی کے جدِ امجد وہی ہیں۔ کسی نسل کو یہ حق نہیں کہ وہ ان کے علاوہ کسی اور کو اپنا مورثِ اعلیٰ سمجھے۔ کوئی برہمن برہما جی کے منہ سے پیدا نہیں ہوا، کوئی کھشتری برہما جی کے سینہ سے نہیں نکلا، اور کوئی ویش برہما کے پیٹ سے اور کوئی

Marfat.com

شودر اس کی ٹانگوں سے پیدا نہیں ہوا۔ یہ سب انسان ہیں اور ایک باپ ہونے کی وجہ سے سب برابر ہیں۔ اس سے نسلِ انسانی کے سب سے بڑے روگ کا علاج کر دیا جس نے انسانیت کے گھر میں بے شمار دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں اس نے تمام انتسابات اور تمام طبقات کو زمیں بوس کر دیا۔ انسانوں میں یہ اونچ نیچ اور طبقاتی تقسیم انسانوں کی بے شمار بیماریوں کا سبب ہیں اسی سے انسان انسان کو غلام بناتا ہے، اسی سے قوموں میں برتری کا احساس پیدا ہوتا ہے اور جنگوں کا سبب بنتا ہے۔ اسی سے انسان کی عزتِ نفس کا جنازہ نکلتا ہے۔ یہی تصور تقدس کا لبادہ اوڑھ کر غلط مذہب کو جنم دیتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اے انسانو! تمہاری کامیابی اور بقا کا راز اس میں ہے کہ تم اپنے خالق کو ایک رب مانو اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور تمام انسانوں کو ابوالبشر حضرتِ آدم کی اولاد سمجھو۔ اس سے تمہارے یہ سارے بکھیڑے ختم ہو جائیں گے اور تمہارے لئے ایک بنیاد فراہم ہو جائے گی۔

عورت کی عزت و حرمت

تیسری بات یہ فرمائی کہ انسانیت کے گھر کو جن آندھیوں نے مسمار کیا ہے ان میں یہ تصور بھی شامل رہا ہے کہ عورت کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ یہ دنیا پر اللہ کا عذاب ہے، کبھی اس کو نحوست کی علامت سمجھا گیا، کبھی انسان کے بگاڑ کا ذریعہ، اس کی توہین اور ذلت کیلئے عجیب و غریب باتیں کہی گئیں، یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ جس طرح تمہارا باپ ایک ہے اسی طرح تمہاری ماں بھی ایک ہے۔ پوری نوعِ انسانی کی پیدائش اسی جوڑے سے ہوئی ہے، جس طرح اللہ نے تمہارے لئے تمہارے باپ کو محترم ٹھہرایا ہے اسی طرح اس نے تمہاری ماں کو بھی عزت و رفعت بخشی ہے۔ صرف ماں ہی کو نہیں بلکہ عورت کو عزت عطا فرمائی، وہ ماں کی صورت میں ہو تو اس کے پاؤں تلے جنت ہے اور اگر وہ بیٹی کی شکل میں ہو تو باپ کے دل کا ٹکڑا ہے۔ اور بہن کی شکل میں ہو تو بھائی کی غیرت ہے اور اگر بیوی کی صورت میں ہو تو وہ زندگی کی خوبصورتی کا نام ہے۔ وہ ہر صورت میں قابلِ عزت و وقعت ہے۔ آج شائد اس کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے لیکن جب اللہ کی کتاب نے صدیوں پہلے عورت کو عزت بخشی تھی تو یہ دنیا کیلئے ایک رعد آسا آواز تھی۔ جس نے نہ جانے کس کس گھر میں تہلکہ مچایا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ انسان نے اسلامی تعلیمات کے باعث عورت کی عزت کو پہچانا، لیکن بدنصیبی کا کیا کہئے کہ جاہلیت جدیدہ نے تہذیبِ مغرب کی شکل میں عورت کو پھر بازار کی جنس بنا دیا ہے۔ اس کی ایسی برین واشنگ کی ہے کہ اس کیلئے گھر کا چولھا جلانا شوہر اور بچوں کی خدمت کرنا تو عار بن گیا ہے۔ لیکن ایئر ہوسٹس بن کر غیروں کیلئے مسکراہٹیں لٹانا اور بھوکی نگاہوں کا سامنا کرنا اور ہوٹلوں میں ویٹرس بن کر بستروں کی چادریں بدلنا اور واش بیسن صاف کرنا اور مینا اور جام کے شور میں ہر طرح کی خدمت بجالانا عزت اور شرافت کی علامت بنا لیا گیا ہے۔ وہ عورت جس کی گود میں پیغمبر کھیلے ہیں اسے اشتہاروں کی صورت چوراہوں میں لٹکا دیا گیا ہے۔ اور چند پیسوں کی چیز بیچنے کیلئے بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے جس کی عزت و حرمت کی حفاظت کیلئے کبھی جغرافیے بدل جاتے تھے۔ آج وہ محض خریدنے بیچنے کی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ آدمی اپنی ہوس رانی کیلئے اسے برہنہ کرتا چلا جا رہا ہے اور وہ اسے آزادی سمجھ کر پالتو جانور کی طرح اشاروں پر رقص کرتی چلی جا رہی ہے۔ اس نئی تہذیب نے پوری دنیا کو ایک سرکس بنا دیا ہے، جس میں کردار کی کوئی عظمت نہیں، اداکاری کی ایک قیمت ہے، جسے عورت نے اپنی عزت سمجھ لیا ہے۔

109510

Marfat.com

بعض لوگوں نے عورت کی قدر و قیمت گرانے کیلئے یہ تصور دیا ہے کہ عورت کو پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی تائید میں اس آیت کریمہ کے ایک ٹکڑے خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا کو پیش کیا جاتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اللہ نے حضرتِ حوا کو حضرتِ آدم سے پیدا کیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے حضرتِ حوا کی پیدائش کی تفصیلی کیفیت کو بالکل بیان نہیں فرمایا۔ حدیث بھی اس بارے میں خاموش ہے۔ البتہ جس مشہور حدیث سے حضرتِ حوا کا حضرت آدم کی پسلی سے پیدا ہونا بیان کیا جاتا ہے اس میں نہ حضرت آدم کا ذکر ہے نہ حضرت حوا کا بلکہ محض عورت کی پیدائش اور اس کی کج سرشتی کا بیان ہے۔ آثار میں جو روایت ملتی ہے وہ تورات کی آوازِ بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ تورات میں بیان کیا گیا ہے۔ ''خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک صورت بنا کر آدم کے پاس بھیجی (پیدائش: ۲: ۲۲، ۲۳)''۔ قرآن و سنت میں تورات کے اس مضمون کی تائید کہیں بھی نہیں کی گئی بلکہ بخاری کی ایک حدیث میں تو بالکل صاف ہے کہ عورت مثل پسلی کے ہے۔ امام مسلم نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا پسلی سے پیدا ہونا محض بطور تشبیہ کے ہے اور مقصود اس سے یہ بتانا ہے کہ عورت کی طبیعت میں تلون کا غلبہ ہے اور یہی اس کی طبیعت کا حسن بھی ہے اور خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا کا ترجمہ اکثر اہلِ علم نے یہ کیا ہے کہ اللہ نے اس کا جوڑا اسی کی جنس سے پیدا کیا۔ اس کی تفصیل کیا ہے، ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کیونکہ قرآن و سنت نے اسے کھولا نہیں ہمیں بھی اسے اسی طرح مجمل رکھنا چاہئے اور اسی پر یقین رکھنا چاہئے۔

صلہ رحمی کی تاکید

مزید ایک بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ جس طرح تمہاری زندگی کی کامیابی اور بقا کا راز اس میں ہے کہ زندگی گزارتے ہوئے تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اسی طرح اس بات میں بھی ہے کہ تم رحمی رشتوں کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھو۔ ارحام، رحم کی جمع ہے۔ رحم بچہ دانی کو کہتے ہیں، جس میں ولادت سے پہلے ماں کے پیٹ میں بچہ رہتا ہے چونکہ ذریعہ قرابت یہی رحم ہی ہے اس لئے اس سلسلے کے تعلقات وابستہ رکھنے کو صلہ رحمی کہا جاتا ہے اور رشتہ داری کی بنیاد پر جو فطری طور پر تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں ان کی طرف سے بے توجہی اور بے التفاتی برتنے کو قطع رحمی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں اسی صلہ رحمی تاکید کی گئی ہے کیونکہ معاشرتی استواری کی بنیاد اس کے سوا کسی اور چیز پر نہیں۔ احادیث مبارکہ میں بھی صلہ رحمی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:۔

مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّبْسَطَ لَهٗ فِيْ رِزْقِهٖ وَيُنْسَأَ لَهٗ فِيْ اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ.

(یعنی جس کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے رزق میں اکشادگی پیدا ہو اور اس کی عمر دراز ہو تو اسے چاہئے کہ صلہ رحمی کرے) (مشکوٰۃ، ص ۴۱۹)

اس حدیث سے صلہ رحمی کے دو بڑے اہم فائدے معلوم ہوئے کہ آخرت کا ثواب تو ہے ہی، دنیا میں بھی صلہ رحمی کا فائدہ یہ ہے کہ رزق کی تنگی دور ہوتی اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔

Marfat.com

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے اور میں حاضر ہوا تو آپ کے وہ مبارک کلمات جو سب سے پہلے میرے کانوں پڑے یہ تھے، آپ ﷺ نے فرمایا:۔

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اَفْشُوا السَّلَامَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْاَرْحَامَ وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ

(لوگو! ایک دوسرے کو کثرت سے سلام کیا کرو اللہ کی رضا جوئی کے لئے لوگوں کو کھانا کھلایا کرو، صلہ رحمی کیا کرو اور ایسے وقت میں نماز کی طرف سبقت کیا کرو جبکہ عام لوگ نیند کے مزے میں ہوں۔ یاد رکھو! ان امور پر عمل کر کے تم حفاظت اور سلامتی کے ساتھ بغیر کسی رکاوٹ کے جنت میں پہنچ جاؤ گے) (مشکوٰۃ ص ۱۰۸)

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ اللہ کے ساتھ اپنا تعلق نبھاتے ہوئے اور بندوں کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے اور صلہ رحمی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے یہ مت بھولنا کہ اللہ تمہارے چھپے ہوئے ارادوں کو بھی جانتا ہے۔ وہ تمہارے کاموں کو بھی دیکھتا ہے اور کاموں کے محرکات سے بھی واقف ہے۔ تمہاری جلی یا خفی کوئی بات اس سے مخفی نہیں۔ اس لئے ہر کام کرتے ہوئے یہ یقین رکھنا کہ اس کی بارگاہ میں وہی عمل قابلِ قبول ٹھہرے گا جو انتہائی نیک نیت، نیک ارادے، اللہ کے خوف اور اس کے اخلاص سے کیا گیا ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ انسانی زندگی کی مضبوطی اور استواری ہمیشہ مضبوط تصورات، احساسات اور عقائد کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس آیتِ کریمہ میں دو ایسے تصورات یا عقائد دیئے گئے جو انسانی زندگی کی مضبوط بنیاد بن سکتے ہیں جنہیں ہم نے وحدتِ رب اور وحدتِ اب سے ذکر کیا ہے۔ ایک خدا اور ایک رب کے ماننے والے بندگی اور اطاعت کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک صالح گروہ اور ایک مضبوط امت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ایک اصل اور ایک جڑ کے تصور سے نسلِ انسانی کی وحدت کا وہ تصور پیدا ہوتا ہے جس سے انسانی رشتے اس طرح پھوٹتے ہیں جس طرح ایک درخت سے شگوفے پھوٹتے شاخیں جنم لیتیں اور تنے وجود میں آ کر ایک سایہ دار درخت لہلہانے لگتا ہے اور پھر اس کی ایک ایک شاخ ایک ایک تنا اور ایک ایک شگوفہ اس اطمینان سے برگ و بار پیدا کرتا ہے کہ میرا تعلق یکساں طور پر اس درخت کے ساتھ ہے۔ کوئی شاخ نیچے ہے یا اوپر لیکن وہ برابر طور پر اس درخت کا حصہ اور اس سے وابستہ ہے۔ اس طرح اونچ نیچ، کہین و مہین، عزیز و ذلیل اور مختلف طبقات کے تصورات اپنی موت آپ مرجاتے ہیں۔ آقائی اور غلامی کے رشتے خود اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو جاتے ہیں ہر انسان شرفِ انسانیت سے بہرہ ور ہوتا اور سر اٹھا کر چلنا سیکھ جاتا ہے اور پھر ان رشتوں میں احساسات کی گرمی پیدا کرنے کیلئے صلہ رحمی کی اہمیت کا احساس دلا کر اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضمانت فراہم کی گئی کہ اس رشتے کو جوڑنے والوں کو میں جوڑوں گا اور اسے توڑنے والوں کو میں توڑ ڈالوں گا۔ ان تصورات سے ایک مضبوط فرد، مضبوط امت، مضبوط خاندان اور مضبوط معاشرے کی بنیادیں رکھ دی گئی ہیں۔ پھر اس کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے یتامیٰ کے حقوق کا ذکر کیا کیونکہ خاندان کسی بھی معاشرے کی اساس ہے۔ خاندان کی شکست و ریخت معاشرے کی اور آخر کار پوری قوم کی تباہی پر منتج ہوتی ہے۔ خاندان کے ارکان اربعہ والدین اولاد زوجین اور اہلِ قرابت ہیں اور یتیم اگر خاندان ہی کا حصہ ہے یعنی بیٹا مرجانے کی صورت میں یتیم بچہ دادا کا پوتا ہے اور بھائی کی موت کی شکل میں یہ یتیم مرحوم کے بھائی کا بھتیجا

Marfat.com

ہے، اب اگر ایسے یتیم کے ساتھ بدسلوکی ہوتی ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خاندان میں کتنی دراڑیں پڑسکتی ہیں۔ جب تک یتیم بچہ ظلم کی تصویر بن کر زندگی گزارتا ہے تو دوسرے اہلِ قرابت چاہے لفظی ہمدردی کے سوا کچھ نہ کریں لیکن اس یتیم کے ساتھ ہونے والے سلوک کو نہ صرف محسوس کریں گے بلکہ خاندانی تقریبات میں موضوعِ سخن بھی بنائیں گے۔ اور کبھی کبھی زیبِ داستاں کے طور پر بھی ذکر کریں گے۔ ایسی صورت میں خاندانی روابط اور ان کے استحکام پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ یہ تو وہ اثرات ہیں جو شعوری اور غیر شعوری طور پر خاندان پر اثر انداز ہوں گے لیکن اس کا ایک پہلو اور بھی ہے کہ یتیم بچہ اگر بے مروتی اور بدسلوکی کے سائے میں پروان چڑھتا ہے وہ دادا کی بے مروتی کو دیکھتا ہے تو خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے کہ یہی میرے وہ دادا ہیں کہ میرے باپ کی زندگی میں سراپا محبت اور شفقت تھے وہ اپنے چچا اور تایا کے بدلے ہوئے رویہ کو دیکھتا ہے تو نجانے کیسے کیسے تاریک رجحانات اس کے رگ و پے میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ بچپنے کی وہ عمر جسے پیار اور محبت کی ٹھنڈک میں بسر ہونا چاہیے جب بے التفاتی، بدسلوکی اور بے نیازی کی تیز دھوپ میں جلنے لگتی ہے تو اس نوخیز بچے کی محرومیاں خاندان سے نفرت، بزرگوں سے بدگمانی اور انسانی جذبات سے مایوسی میں ڈھلنے لگتی ہیں۔ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ محرومیاں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح دہکنے لگتی ہیں جو آخر کار بغاوت اور انتقام کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور معاشرہ جن سے بالواسطہ متاثر ہوتا ہے اور اگر اس یتیم بچے کی کفالت کرنے والے اپنے نہیں پرائے ہیں تو پھر یہ بچہ بڑا ہو کر براہِ راست معاشرے سے اپنی محرومیوں کا انتقام لیتا ہے۔ شائد اسی بات کی طرف قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ''اے مخاطب تو نے اس شخص کو دیکھا جو روزِ جزا کو یا جزا کے قانون کو جھٹلاتا ہے'' یعنی اسے اس بات سے انکار ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اعمال کی جزا اور سزا سے گزرنا پڑے گا اور وہ اس بات سے انکار کرتا ہے کہ دنیا میں جزا اور سزا کا قانون جاری ہے۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے یہاں کی ریت ہے۔ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ○ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ''اس شخص کے ایسے ہی خیالات کا نتیجہ ہے کہ یہ یتیم کو دھکے دیتا ہے اور یتیم کو کھانا دینے پر آمادہ نہیں کرتا''۔ اسی صورتحال کا نتیجہ ہے کہ محبت اور مروت اور ایثار و ہمدردی سے محروم یہ طبقہ وقت آنے پر معاشرے سے انتقام لیتا ہے۔ جب یتیم کو چچا کے مظالم اور چچا زاد بھائیوں کی بے اعتنائیاں یاد آتی ہیں تو وہ بڑا ہو کر چچا زاد بھائیوں بلکہ تمام اہلِ قرابت سے اپنے زخموں کا حساب لیتا ہے۔ اگر خاندان سے باہر معاشرہ بھی اس کی محرومیوں کا سبب بنتا رہا ہے تو وہ معاشرہ کے افراد کو بھی زیادتیوں کا نشانہ بنا کر سکون حاصل کرتا ہے یہ جو ہم نوجوانوں کو بنک لوٹتے، ڈاکے ڈالتے، عفتوں کے فانوس توڑتے اور عظمتوں کے چراغ بجھاتے دیکھتے ہیں، یہ دراصل اپنی محرومیوں کا انتقام ہے۔ پھر اس میں صرف یتامیٰ اور مساکین ہی شریک نہیں بلکہ بڑے اور خوشحال لیکن تہذیب خوردہ اور مغرب زدہ خاندانوں کے چشم و چراغ بھی ہیں جنہیں ان کی ماؤں نے اپنی سوشل مصروفیات اور بیگمات کی تفریحات کے باعث پیار نہیں دیا۔ بچے ان کے پیار کو ترستے رہے لیکن وہ صنفِ نازک کے حقوق حاصل کرنے اور عورت کا مقام بلند کرنے کیلئے دن بھر مختلف تقریبات میں شرکت اور اس کے لئے دن میں کئی کئی دفعہ لباس بدلنے کی مصروفیت کے باعث بچوں کیلئے وقت نہ نکال سکیں اور باپ جلب زر کی دوڑ اور کلبوں کی مصروفیت کی وجہ سے بچوں کو وقت نہ دے سکے۔ آج یہ بچے انسانی احساسات سے تہی دامن انسانی معاشرے کو ادھیڑنے کھدیڑنے میں لگ گئے۔ تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ جو قومیں اپنے خاندان کے اجزا کو نہیں سمیٹتیں ان کے شیرازہ کو بکھرنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور جو قومیں معاشرہ کے گرے ہوئے اور پسماندہ افراد کو سہارا نہیں دیتیں یہی افراد معاشرہ کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں۔ نتیجتاً معاشرہ خانہ جنگی کا شکار ہو کر قومی استحکام سے محروم

Marfat.com

ہو جاتا ہے، پھر اس کو گرانے کیلئے چند حوادث ہی کافی ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں قرآنِ کریم نے سب سے پہلے یتامیٰ ہی کے حقوق کا ذکر کیا اور جہاں جہاں سے اس تعلق کو نقصان پہنچتا ہے اس کی تلافی کی کوشش فرمائی ہے۔ اس کیلئے تذکیر و ترغیب سے بھی کام لیا اور ترہیب سے بھی۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ تذکیر و ترغیب صرف صالح طبیعتوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کسی بھی چیز کو زندگی کی حقیقت بنانے اور اسے محفوظ حیثیت دینے کیلئے ضروری ہے کہ اسے قانونی تحفظ فراہم کیا جائے۔ اس لئے اگلی آیتِ کریمہ سے قانونی تحفظات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ دورِ جاہلیت میں یتیموں پر جو مظالم کیئے جاتے تھے اور جو زیادتیاں ہوتی تھیں ان میں سے پہلی زیادتی یہ تھی کہ مرنے والا باپ اپنے بچوں کیلئے جو مال و اسباب چھوڑ جاتا تھا یا جو حصہ بچوں کو اپنے باپ کی میراث سے ملنا چاہیے تھا انہیں دینے سے یکسر انکار کر دیا جاتا تھا۔ اس لئے سب سے پہلے یتیموں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا اور ہر طرح کی کمی بیشی سے روک دیا۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝

اور یتیموں کے مال ان کے حوالہ کرو اور اپنے برے مال کو ان کے اچھے مال سے نہ بدلو اور نہ ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ گڈمڈ کر کے ہڑپ کرو، بے شک یہ ایک بہت بڑا گناہ ہے) (النسآء : ۲)

یتیموں کے سرپرستوں سے خطاب

اس آیتِ کریمہ میں خطاب یتیموں کے اولیا اور سرپرستوں سے ہے۔ اسلامی حکومت میں تو یتیموں کے سرپرست اور اولیا حکومت کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں۔ اور وہی وقتاً فوقتاً اس انتظام کا جائزہ بھی لیتی رہتی ہے۔ لیکن اگر اسلامی حکومت قائم نہ ہو تو مسلمانوں میں کبھی پنچائتی سسٹم کے تحت یہ کام ہوتا ہے اور کبھی برادریاں یہ کام اپنے طور پر انجام دیتی ہیں اور کبھی خود خاندان کے بزرگ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ عربوں کا اپنا ایک معروف تھا کہ جس گھر میں بھی یتیم بچے بچیاں رہ جاتے تھے تو رشتے میں جو بھی بڑا اور قریب ہوتا تھا وہ یتامیٰ کی کفالت کا بوجھ اٹھا لیتا تھا۔ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی ہے تو معلوم ہوتا ہے ابھی اسی معروف کے مطابق کام چل رہا تھا۔ اس لئے یہاں یتیموں کے سرپرستوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تم سب سے پہلے اس بات کو ذہن نشین کر لو کہ مرنے والا جو مال اپنے وارثوں کیلئے چھوڑ گیا ہے ان میں بڑی عمر کے وارث تو خود وصول کر لیں گے لیکن چھوٹی عمر کے وارث خود وصول نہیں کر سکتے ان کے سرپرستوں کو ان کے بالغ ہونے تک ان کے ورثہ کی حفاظت اور یتیموں کے دیکھ بھال کی ذمہ داری ادا کرنا پڑے گی۔

یتیموں کے مال کی حفاظت کے لیے ضروری ہدایات

لیکن یہ بات یاد رہے کہ جو کچھ مرحوم نے ان یتیموں کیلئے چھوڑا ہے وہ بہر حال ان کی ملکیت ہے۔ سرپرست اور ولی اس مال کا امین ہے مالک نہیں۔ یتیموں کے بالغ ہونے پر وہ بہر صورت ان کو ادا کرنے کا پابند ہے۔ انہی کے مال سے وہ ان کی ضروریات پوری کرے گا لیکن اپنی اغراض کیلئے ان میں سے نہ کوئی چیز لے سکتا ہے نہ کمی بیشی کر سکتا ہے۔ اس لئے جب بھی ادائیگی کا موقعہ آئے تو خوش

Marfat.com

دلی سے یتیموں کے مال ان کے حوالے کرو لیکن جب تک وہ تمہارے پاس بطور امانت موجود ہیں کسی طرح کی خیانت یا خودغرضی کی کوشش نہ کرنا۔خیانت کی ایک ممکن شکل یہ ہوسکتی تھی کہ یتیم کے مال کی تعداد تو پوری رکھی جائے لیکن اچھا مال برے مال سے تبدیل کر دیا جائے۔اس لئے فرمایا کہ ان کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے تبدیل نہ کرنا ایسا نہ کرنا کہ ان کی صحت مند اونٹنیاں، صحت مند بکریاں یا نفع بخش اور قیمتی اشیاء ان کی ملکیت سے لے لو اور اپنی طرف سے ان کی جگہ کمزور اونٹنیاں، مریل یا ردی بکریاں یا بے کار چیزیں ان کے مال میں شامل کر دو اور اس خیانت سے انہیں نقصان پہنچاؤ۔

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بظاہر یتیموں کے مال میں کوئی خیانت نہیں کی جاتی تھی۔لیکن انتظام اور اصلاح کے نام پر ان کے مال کو اپنے مالوں میں شامل کر لیا جاتا۔مثلاً یہ کہا جاتا کہ ہمارے لئے یہ بات بہت مشکل ہے کہ ہم ان کے کھانے کی ایک ایک چیز الگ الگ رکھیں۔ان کا سالن الگ پکے، ان کی روٹی الگ تیار ہو، اور پھر ان کا باقی ماندہ الگ سے سنبھال کر رکھا جائے، اس لئے ہمیں یہ اجازت دی جائے کہ ہم کھانا پینا اکٹھا رکھیں، اس طرح آپس کی محبت بھی بڑھے گی اور ہمارے لئے کوئی انتظامی دشواری بھی پیدا نہیں ہوگی۔پروردگار نے سورۃ بقرۃ میں اسی طرح کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ مقصود تو صرف یہ ہے کہ یتیموں کے ساتھ ہر حال میں بھلائی ہو ان کی دیکھ بھال اور تربیت میں آسانی رہے، ان کا مال و اسباب محفوظ ہاتھوں میں رہے، اگر اپنے مال کے ساتھ ان کا مال ملا کر یہ احتیاطیں کی جاسکتی ہیں تو پھر شوق سے ملا لیجئے وہ تمہارے بھائی ہیں اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ اللہ تعالیٰ مفسد کو بھی جانتا ہے اور صالح کو بھی۔لیکن یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ انتظامی مجبوریاں اپنی جگہ لیکن عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ انتظامی مجبوریوں کا نام لے کر یتیموں کا مال اپنے مال میں شامل کر لیا جاتا ہے اور پھر اس میں خیانت کیلئے راستہ نکال لیا جاتا ہے۔کیونکہ ہر چیز کے اکٹھا ہونے سے خرد برد کرنے میں آسانی رہتی ہے اور اس میں کسی کو شبہ بھی نہیں ہوتا۔اسلئے یہاں صاف طور پر منع کر دیا وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ''تم ان کے مال اپنے مالوں سے ملا کر نہ کھاؤ''۔یعنی یہ کھانے کا ایک آسان راستہ ہے اس لئے اس سے رکنے کی کوشش کرو۔اس طرح سے یتیموں کا مال کھانے اس میں خرد برد کرنے اور کسی طرح کی بھی خیانت کا ارتکاب کرنے کے جتنے راستے ممکن ہوسکتے تھے وہ سارے بند کر دیئے تاکہ یتیموں کے مال کی پوری طرح حفاظت ہوسکے اور ان کے حقوق کو نقصان نہ پہنچے۔لیکن ہم جانتے ہیں کہ قانون کتنی بھی احتیاط اور نیک نیتی سے بنایا اور نافذ کیا جائے اس میں چور دروازے نکالنے کا عمل کبھی بند نہیں ہوسکتا جب تک کہ دل و دماغ میں بدنیتی سے پیدا ہونے والے چور دروازے بند نہ کئے جائیں۔اس لئے آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ''بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے''۔حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے نزدیک ''حوبا'' حبشی لفظ ہے جو عربی زبان میں استعمال ہونے لگا ہے۔اس کا معنیٰ ''گناہ'' ہے۔یعنی جب تک یتیموں کے سرپرست دلوں میں اس بات کو زندہ نہ رکھیں کہ یتیموں کے حقوق کے بارے میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہم سے باز پرس کریں گے۔اور اس دن حیلے بہانوں سے کی گئی خیانتوں سے بھی پردہ اٹھا دیا جائے گا۔آج تو لوگوں کی نگاہوں میں دھول جھونکی جاسکتی ہے لیکن وہاں کوئی سخن سازی اور کوئی بہانہ کام نہیں دے گا۔ہر چیز کھل کر سامنے آجائیگی اور یہ جرم ایسا شدید ہے کہ اللہ کی طرف سے اس پر سخت عذاب ہوگا اس وقت تک مخفی خیانتوں کا سلسلہ نہیں رک نہیں سکتا۔یہی وہ تصور ہے جو لوگوں کو یتیموں کے اموال میں خیانت کرنے سے کلی طور پر روک سکتا ہے ورنہ تنہا قانون کی پابندی بھی پوری طرح اس جرم کو روکنے پر قادر نہیں۔

Marfat.com

عرب معاشرے میں یتیم بچیوں سے نکاح کے ضمن میں یا یتیم بچوں کی تربیت کے سلسلے میں جو کوتاہیاں ہو رہی تھیں اگلی آیت کریمہ میں ان کی اصلاح کیلئے ہدایات دی جارہی ہیں۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَاطَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْمَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝

(اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے معاملے میں انصاف نہ کرسکو گے تو عورتوں میں سے جو تمہارے لئے جائز ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کرلو اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو ایک ہی پر بس کرو یا پھر کوئی لونڈی جو تمہاری مِلک میں ہو۔ یہ طریقہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ تم بے انصافی سے بچ جاؤ) (النسآء: ۳)

یتیم بچیوں پر ظلم کی مختلف صورتیں

اس کے تین مفہوم اہلِ تفسیر نے بیان کئے ہیں:

1:۔ حضرت عائشہ اس کی تفسیر میں فرماتی ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں ان کے مال اور ان کے حسن و جمال کی وجہ سے اس خیال سے کہ ان کا کوئی سر دھرا تو ہے نہیں جس طرح ہم چاہیں گے دبا کر رکھیں گے وہ ان کے ساتھ خود نکاح کرلیتے تھے اور پھر ان پر ظلم کیا کرتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کرسکو گے تو دوسری عورتیں دنیا میں موجود ہیں ان میں سے جو تمہیں پسند آئیں ان کے ساتھ نکاح کرلو۔ اسی سورۃ میں انیسویں رکوع کی پہلی آیت اس تفسیر کی تائید کرتی ہے۔

2:۔ ابن عباس اور ان کے شاگرد عکرمہ اس کی تفسیر یہ بیان کرتے ہیں کہ جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک ایک شخص دس دس بیویاں کرلیتا تھا اور جب اس کثرتِ ازدواج سے مصارف بڑھ جاتے تھے تو مجبور ہو کر اپنے یتیم بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے بے بس عزیزوں کے حقوق پر دست درازی کرتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نکاح کیلئے چار کی حد مقرر کردی اور فرمایا کہ ظلم و بے انصافی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ ایک سے لے کر چار تک اتنی بیویاں کرو جن کے ساتھ تم عدل پر قائم رہ سکو۔

3:۔ سعید بن جبیر اور قتادہ اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ جہاں تک یتیموں کا معاملہ ہے اہلِ جاہلیت بھی ان کے ساتھ بے انصافی کرنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن عورتوں کے معاملہ میں ان کے ذہن عدل و انصاف کے تصور سے خالی تھے۔ جتنی چاہتے تھے شادیاں کرلیتے تھے اور پھر ان کے ساتھ ظلم اور جور سے پیش آتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو عورتوں کے ساتھ بھی بے انصافی کرنے سے ڈرو۔ اول تو چار سے زیادہ نکاح ہی نہ کرو اور اس چار کی حد میں بھی بس اتنی بیویاں رکھو جن کے ساتھ انصاف کرسکو۔ (ماخوذ از تفہیم القرآن)

Marfat.com

مندرجہ بالا تینوں مفاہیم پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عرب معاشرے میں یتیم بچیوں پر دو طرح کے مظالم ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ یتیم بچیاں جس عمر میں بھی ہوتیں یہ دیکھ کر کہ ان کا کوئی سر دھرا تو ہے نہیں ان کے ولی ان کے ساتھ نکاح کر لیتے اور اس بہانے سے ان کے حصے کی جائیداد پر قبضہ کر لیتے اور حق مہر کو اپنے لئے ویسے ہی ضروری نہیں سمجھتے تھے کیونکہ وہ ایسی بچیوں سے نکاح کرنا بجائے خود ایک ایسی نیکی سمجھتے تھے جو حق مہر کی ادائیگی سے بڑھ کر ہے۔

ظلم کی دوسری صورت یہ تھی کہ عرب چونکہ غیر محدود حد تک نکاح کرنے کو جائز سمجھتے تھے اس لئے نکاح پر نکاح کرتے چلے جاتے۔ لیکن جب بیویوں کے مصارف ادا نہ ہوتے تو پھر یتیم بچوں اور بچیوں کے حقوق پر دست درازی کرتے۔

ظلم کے انسداد کے لیے ہدایات

اسلام نے ان مظالم کو روکنے کیلئے دو پابندیاں لگائیں۔ ایک تو یہ کہ چونکہ تم یتیم بچیوں سے نکاح کرنے کی صورت میں ان کے حقوق کی نگہداشت نہیں کرتے ہو بلکہ ہر طرح کے ظلم کو روا رکھتے ہو۔ اس لئے آئندہ تم یتیم بچیوں سے نکاح کرنے کی بجائے دوسری عورتوں سے نکاح کرو اور دوسری پابندی یہ لگائی کہ عورتوں پر تمہارے ظلم کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تم غیر محدود کثرتِ ازواج کے قائل ہو۔ جس کی وجہ سے مصارف میں تنگی کا شکار ہوتے ہو تو پھر ایک طرف یتیموں کے حقوق تلف کرتے ہو اور دوسری طرف بیویوں پر ظلم ڈھاتے ہو اس لئے آئندہ تم زیادہ سے زیادہ بیک وقت چار تک بیویاں رکھ سکتے ہو اس سے زیادہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ تم ان کے درمیان عدل کرنے کا تہیہ کرو۔ بعض اہلِ علم نے یتامیٰ سے یتیم بچیاں مراد لینے پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یتامیٰ کا لفظ نابالغ لڑکوں یا لڑکیوں پر بولا جاتا ہے۔ صرف نابالغ لڑکیوں کیلئے اس کا استعمال نہ عربی زبان میں معروف ہے نہ قرآنِ کریم اور حدیث میں۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ کم از کم پندرہ جگہ جمع کی صورت میں استعمال ہوا ہے لیکن کسی جگہ بھی صرف یتیم بچیوں کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوا۔ میری عاجزانہ درخواست یہ ہے کہ مقصود ان آیاتِ کریمہ سے یتیموں پر ہونے والے مظالم اور ان کی حق تلفیوں اور حق شکنیوں کا سدباب کرنا ہے۔ اس میں یتیم بچے بھی شامل ہیں اور یتیم بچیاں بھی۔ پہلی آیت کریمہ میں یتامیٰ کے لفظ سے ہر طرح کے یتیم مراد لئے گئے اور اسی سیاقِ کلام میں دوسری آیتِ کریمہ میں اگر یتامیٰ سے مراد یتیم بچیاں مراد لے لی جائیں تو اس میں عربی لغت کے اعتبار سے کیا اشکال ہے۔ اگر اس آیتِ کریمہ میں نساء کے لفظ سے یتیموں کی مائیں مراد لی جاسکتی ہیں، صرف اس لئے کہ اس آیت کے مضمرات اس کیلئے قرائن کا کام دے سکتے ہیں۔ تو اسی طرح یہاں یتامیٰ سے یتیم بچیاں مراد لی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ یتیموں کے ساتھ ہونے والی حق تلفیوں کا زیادہ تر تعلق وراثت اور نکاح کے حوالے سے یتیم بچیوں ہی کے ساتھ تھا اور مزید یہ بات بھی ہے کہ اگر یتامیٰ کے لفظ میں صرف یتیم بچیوں کا معنی لینے کی بالکل کوئی گنجائش نہ ہوتی تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ اور ان کے شاگرد حضرت عکرمہؒ جیسے لوگ یہ کیونکر مراد لے لیتے۔ البتہ یہ بات کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ جس طرح اس آیت کے مفہوم میں مندرجہ بالا مفاہیم شامل ہیں اور وہ تمام کے تمام یتیم بچیوں سے متعلق ہیں اسی طرح اس آیت سے یہ مفہوم بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ یتامیٰ سے مراد یتیم بچے ہیں۔ اس طرح سے آیت کی تفسیر ایک ایسی مکمل شکل اختیار کرلے گی جس میں یتیم بچوں اور بچیوں پر ہونے والی زیادتیوں کا استقصاء ہو جائے گا۔

Marfat.com

یتامیٰ سے اگر یتیم بچے مراد لئے جائیں تو پھر آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے یتیموں کے سرپرستو! اگر تمہیں یہ اندیشہ ہے کہ تم اپنے طور پر یتیموں کے مال اوران کے واجبی حقوق کی صحیح نگہداشت نہیں کر سکتے ہو کیونکہ ان کے حقوق میں صرف کھلانا پلانا ہی نہیں ان کی مناسب تربیت بھی شامل ہے۔ اور تمہارے اپنے بچوں کی موجودگی میں یہ بھی ضروری ہے کہ انہیں احساس کہتری اور احساسِ محرومی سے بچایا جائے اور یہ تمام ذمہ داری یقیناً تم تنہا نہیں اٹھا سکو گے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ اس ذمہ داری کو بتمام وکمال انجام دینا اسی صورت میں ممکن ہے کہ یتیم بچوں کی مائیں بھی اس ذمہ داری میں تمہارے ساتھ شریک ہوں تو اس صورت میں مناسب یہ ہے کہ تم ان بچوں کی ماؤں کے ساتھ نکاح کرلو۔ جب ان کی مائیں ان کی ذمہ داری میں تمہارے ساتھ شریک ہوجائیں گی تو وہ چونکہ اپنے بچوں کے ساتھ قلبی تعلق رکھتی ہیں اور شوہر کے مرجانے کے بعد اس تعلق میں یقیناً اضافہ بھی ہوگیا ہے تو وہ یقیناً اس ذمہ داری کو پورے احساسِ ذمہ داری اور دل کی بیداری کے ساتھ ادا کریں اور اس نازک ذمہ داری کی ادائیگی میں اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہاری ضرورت ایک سے زیادہ بیویاں ہیں تو تم زیادہ عورتوں سے نکاح کر سکتے ہو بشرطیکہ ان کی تعداد کسی صورت میں چار سے زیادہ نہ ہونے پائے اور مزید یہ کہ تم ان کے درمیان عدل قائم بھی رکھ سکو اور اگر تمہیں اپنا جائزہ لے کر یہ اندیشہ ہو کہ عدل نہیں قائم رکھ سکو گے تو پھر ایک سے زیادہ نکاح نہ کرو۔ اس طرح سے اس بات کا بے حد امکان ہے کہ تم پر جو ذمہ داریاں آپڑی ہیں تم ان کو اس طرح ادا کرسکو کہ جس میں حق وانصاف کے تقاضے مجروح نہ ہونے پائیں۔

مَاطَابَ لَكُمْ کا مفہوم

آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس آیت کے بعض الفاظ کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ ان الفاظ کی وضاحت میں بعض لوگوں نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ "مَاطَابَ لَكُمْ" کا ترجمہ حضرت حسن بصری اور بعض دوسرے بزرگوں نے کیا ہے ماحلَّ لکم کہ تم ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے لئے حلال ہیں اور دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ جو تمہیں پسند ہوں۔ اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ جو عورتیں تمہارے لئے حلال ہوں لیکن ساتھ ساتھ سیرت وصورت کے اعتبار سے پسندیدہ بھی ہوں چونکہ اسلام میاں بیوی میں خوشگوار تعلقات دیکھنا چاہتا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب دونوں ایک دوسرے کے لئے قابلِ قبول ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو عیاشی کی تعلیم دے رہا ہے بلکہ وہ اپنے ماننے والوں کو عقدۂ نکاح اور میاں بیوی کے نازک تعلق کے حوالے سے ایسی تعلیم دے رہا ہے جس میں انسانی زندگی کی مشکلات کم سے کم ہوجائیں اور ایک بہتر انسانی معاشرت کی ابتداء کی جاسکے۔

مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کا مفہوم

اس کے بعد فرمایا مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ اس میں "و" عطف کا نہیں تخییر کا ہے یعنی اَو کے مترادف ہے جس کا معنی ہے کہ جو عورتیں تمہارے لئے حلال ہوں ان سے نکاح کرلو۔ دودو، تین تین، چار چار۔ یعنی تم ایک وقت میں دو بیویاں رکھ سکتے ہو، تین رکھ سکتے ہو یا چار رکھ سکتے ہو اس سے زیادہ کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔ خود قرآن مجید میں "و" کے اس معنی میں استعمال کی مثالیں متعدد ملتی ہیں۔ مثلاً فرشتوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے پر ہیں مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ کسی کے دو ہیں کسی کے تین کسی کے چار۔ یعنی دودو، تین تین، چار چار پروں والے فرشتے ہیں۔ لیکن بعض گمراہ لوگوں نے دو اور تین اور چار کے عدد کو جوڑ کر اس آیت سے نو بیویوں کے جواز کا استدلال کیا ہے اور بعض

Marfat.com

ظالموں نے اس تعداد کو اٹھارہ تک پہنچا دیا ہے اس پر اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ اس طرح کی باتیں زبانِ عرب اور سنت رسول دونوں سے جہالت کے مترادف ہیں۔ اگر نو ہی کی تعداد منظور ہوتی تو صاف ہی ارشاد فرما دیا جاتا اس قدر گھوم پھر کر بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ قرآن وسنت کی وضاحت کے باعث فقہاءِ امت کا اجماع ہے کہ اس آیت کی رو سے تعددِ ازواج کو محدود کیا گیا ہے اور بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسلام سے پیشتر نہ صرف متعدد بیویاں رکھنا دنیا کے تمام مذاہب میں جائز سمجھا جاتا تھا بلکہ اکثر ملکوں میں کسی عدد پر بھی اس کو محدود نہیں کیا جاتا تھا۔ اسلام نے کثرتِ ازواج کو رواج نہیں دیا بلکہ پہلے سے دنیا میں ایک مروج چیز کو محدود کر کے مہذب بنایا ہے۔ خود عربوں کا حال یہ تھا کہ ان کے ہاں بیویوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ طائف کا رئیس غیلان بن اسلمہ جب اسلام لایا تو اس کی نو بیویاں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ چار بیویاں رکھ لو باقی کو چھوڑ دو۔ قیس بن الحارث اسدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جب مسلمان ہوا تو میرے نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا ان میں سے چار رکھ لو باقی کو طلاق دے دو۔ اسی طرح ایک دوسرے شخص نوفل بن معاویہ کی پانچ بیویاں تھیں۔ آپ نے حکم دیا کہ ان میں سے ایک کو چھوڑ دو۔ تعددِ ازواج دنیا میں ہمیشہ ایک حقیقت کے طور پر زندہ رہا، اس کی مخالفت مغرب کی طرف سے اور ان کے زیرِ اثر مغرب زدہ مسلمانوں کی جانب سے ایک ایسی نئی چیز ہے جس کا تاریخ میں کوئی وجود نہیں اور حقیقت میں یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس پر شرما کر تاویلیں کرنے کی ضرورت ہو۔ مرد کے قویٰ اس کی جسمانی ساخت اور ترکیب ہی اس نوعیت کی ہے کہ یہ کثرت عورتوں میں ایک بیوی اس کی طبعی خواہش کی تشفی کیلئے کافی نہیں ہوتی۔ مرد اور عورت کے اتحاد و تناسل کا جہاں تک تعلق ہے مرد کا عمل چند منٹ میں ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد مرد پر جسمانی حیثیت سے کوئی ذمہ داری ہی نہیں بخلاف اس کے عورت کیلئے اس کے نتائج کا سلسلہ دنوں اور ہفتوں نہیں حمل اور رضاعت کی مدت ملا کر ڈھائی ڈھائی سال تک پھیلا ہوا رہتا ہے۔ پھر حمل کے بغیر بھی ہر جوان اور تندرست عورت کیلئے ہر مہینہ ایک ایک ہفتہ کی معذوری ایک امرِ طبعی ہے اور وہ قانونی نظام کامل نہیں ناقص ہے جو مرد کی طبعی ضرورتوں کی طرف سے آنکھ بند کر لے اور عورت کی طبعی معذوریوں کا لحاظ کر کے مرد کیلئے کوئی سہولت جائز نہ رکھے۔ پھر یورپ کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ماہرین حیاتیات کی شہادتیں اس تجربہ اور مشاہدہ کی تائید میں ہیں کہ طبعی ضرورت سے قطع نظر مرد کی شہوانی جبلت تنوع پسند بھی ہے۔ اس لئے جو شریعت اس کی اس جبلت کی کوئی رعائت اپنے نظام میں نہیں رکھتی وہ اور کچھ بھی ہو بہر حال خدائی اور مطابقِ فطرت نہیں کہی جا سکتی۔ یہی سبب ہے کہ تاریخ جب سے ساتھ دیتی ہے داعیانِ توحید نے اس دستور کو نہ صرف جائز رکھا ہے بلکہ اس پر عمل کر کے اور زیادہ قوت پہنچا دی ہے۔ حضرت ابراہیم حضرت یعقوب، حضرتِ موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام میں سے کسی کے ہاں بھی یک زوجی کی سند نہیں ملتی۔ بلکہ بعض کی حرم سرا تو کثرتِ تعداد کیلئے بھی مشہور ہے۔ ہند قدیم میں اکابرِ ہنود کی بابت بھی روایتیں وحدت کی نہیں تعدد کی ہیں۔ کرشن جی کے بارے میں تو کئی بیویوں کی روایت کی جاتی ہے اور یورپ اور امریکہ میں آج رسمِ نکاح کو درمیان میں لائے بغیر جو اندھیر کھلے بندوں ہو رہا ہے اس کی نقل وحکائت کی تاب بھی ان صفحات میں کہاں سے لائی جائے۔ اسلام میں ایک طرف تو یک زوجی کی قید اڑا کر تعدد کو سند جواز دے دی اور دوسری طرف اس کی مناسب حد بندیاں بھی کئی کئی طرح کر دیں۔ یہی اس کی حکمت کا کمال رہا۔ (ماخوذ از تفسیر ماجدی) یہ جو کچھ اب تک عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق انسان کی فطرت، جبلت اور اس کی انفرادی زندگی سے ہے۔ لیکن جہاں تک اجتماعی زندگی اور اس کے حوالے سے بعض دفعہ پیدا ہونے والی ضرورتوں کا تعلق ہے وہ تو اور بھی

Marfat.com

زیادہ قابلِ توجہ ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک میں بالعموم عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ رہی ہے۔ اور آج بھی یہی حال ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو عورتیں مردوں سے زیادہ ہیں ان کی صنفی ضرورت، اخلاق کی حفاظت، نسب کی بقا، اور نسلی خصوصیات کے تحفظ کے حوالے سے ہمارا آج کا علم و دانش کیا کہتا ہے۔ کیا اس کا وہی حل قبول کرلیا جائے؟ جو دنیا کے مادہ پرست بے خدا تہذیب کے ماننے والے اور مذہب بے زار لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے کہ اخلاقی اقدار کو قصۂ پارینہ سمجھو۔ گھروں میں ایک ایک بیوی رکھ کر باقی سب کو داشتاؤں کی صورت میں زندگی گزارنے پر مجبور کردو اور اس طرح سے ایک ایسی دنیا بسادو جس میں شرم وحیا عفت وصفا اور غیرت وحمیت کا نام تک نہ ہو۔ رشتے اپنا تقدس کھو بیٹھیں، ماں باپ کی اہمیت اس سے زیادہ نہ ہو کہ وہ انسانی جسم کو Produce کرنے والی ایک مشین ہیں۔ مذہب نے جوان کے گرد تقدس اور بزرگی کا ہالہ بنایا ہوا ہے اس کا وجود باقی نہ رہے۔ اولاد پیداواری تسلسل کے سوا اور کوئی حیثیت نہ رکھتی ہو رہی شفقت اور وراثتِ پدری کی حفاظت محض دقیانوسی باتیں ہو کر رہ جائیں ان رشتوں کے ٹوٹنے سے گھر ٹوٹیں، خاندان برباد ہوں، معاشرہ تباہ ہوجائے حتی کہ سیاسی انارکی پیدا ہوجائے ان نام نہاد دانشوروں کو ان باتوں میں سے کسی بات سے غرض نہیں۔ یہ دنیا دو دفعہ جنگِ عظیم کا شکار ہو چکی ہے اس میں بے شمار لوگ کام آئے، بے شمار گھر اجڑے، ان گنت عورتیں بیوہ ہوئیں، عورتوں کی تعداد بڑھ گئی، مرد کم ہوگئے۔ لیکن ان دانشوروں کی دانش میں غیرت نام کی کوئی چیز پیدا نہ ہوئی اٹلی اور جرمن میں ایسی نسل تک تیار ہوگئی جن کے باپ کا کوئی پتہ نہیں، جس کا رفتہ رفتہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسا فلسفہ وجود میں آیا جس نے حرام کے بچے کو حلال کے بچے کے نہ صرف برابر قرار دے دیا بلکہ اب اسے آگے بڑھانے کی فکر میں ہیں۔ اسلام نے ایک سیدھا سادھا انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پیدا ہونے والی جنسی اور صنفی الجھنوں کا حل محدود تعدد ازواج کی صورت میں پیش کیا اور پھر ان کو مناسب پابندیوں کے ساتھ ایسا مہذب بنایا کہ جس سے مزید بہتر قانون کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ صاف صاف حکم دیا کہ دوسری بیوی کی اسی صورت میں اجازت ہے جب تم بیویوں کے درمیان عدل کرو اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرسکو گے یعنی جو بیویوں کے حقوق ہیں ان کی ادائیگی میں مساوات نہیں رکھ سکو گے پھر تمہیں دوسری بیوی کی ہرگز اجازت نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی صحت، اپنی مالی حالت اور اپنی وڈیروں والی تربیت کے باعث ایک بیوی سے بھی انصاف نہیں کرسکتا تو اس کیلئے ایک خاتون سے نکاح کرنا بھی جائز نہیں کیونکہ عورت کوئی کھلونا نہیں، جسے محض جنسی ضرورت پورا کرنے کیلئے استعمال میں لایا جائے۔ اس کے ایسے ہی حقوق ہیں جیسے مرد کے حقوق ہیں اور وہ بھی اپنی ذات کا ایسا ہی احترام رکھتی ہے جیسا مرد۔ اس لئے اسلام عدل کی شرط سے کسی طور بھی دست بردار نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم ایک آزاد عورت سے نکاح کرنے کے بعد اس کے تقاضے پورے نہیں کرسکتے تو پھر تمہیں لونڈی سے نکاح کرلینا چاہئے کیونکہ اس کے حقوق میں وہ وسعت نہیں جو آزاد عورت کے حقوق میں ہے۔

غلامی اسلام کے پروگرام کا حصہ نہیں

یہ یاد رہے کہ غلامی اسلام کے پروگرام کا حصہ نہیں اسے تو اسلام نے اسیرانِ جنگ کے اہم معاملے کے حل کے طور پر قبول کیا تھا کیونکہ اسیرانِ جنگ کا معاملہ ہمیشہ ایک اہم اور دشوار معاملہ رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو مرد اور عورتیں شکست خوردہ غنیم کے ہاں سے گرفتار ہو کر آئیں ان کیساتھ کیا برتاؤ کیا جائے اور انہیں کہاں رکھا جائے۔ کسی نے اس کا حل جبری مزدوری Forced Labour یا بے گار کو نکالا، کسی

Marfat.com

نے کچھ اور کہا۔ اسلامی شریعت نے حکم دیا کہ بجائے اس کے کہ ایک بڑی آبادی کا بار حکومت پر ڈالا جائے اس تعداد کو افراد میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر فرد اس نو وارد کو اپنے خاندان کا ایک جز بنائے، اس سے کام ہر طرح کا یقیناً لے لیکن اس کے آرام کا بھی ہر طرح لحاظ رکھے اور ان میں جو عورتیں ہوں ان سے ہم بستری کا حق بھی حاصل رہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ غلام یا لونڈی بننے کا تعلق جیسا کہ پہلے عرض کیا اسیرانِ جنگ سے ہے اور جنگ بھی وہ جسے قتال فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے اور پھر یہ بات بھی نہیں کہ جس سپاہی کے ہاتھ کوئی دشمن کا سپاہی لگ جائے وہ اسے غلام بنا لے اور جس کے ہاتھ دشمن کی کوئی لڑا کا خاتون لگ جائے تو وہ اسے لونڈی بنا لے۔ اگر کوئی آدمی اس طرح سے خود فیصلہ کرے تو پکڑا جانے والا غلام نہیں ہوگا اور پکڑی جانے والی لونڈی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ تمام جنگی قیدی مرد ہوں یا عورت سالارِ جنگ کے پاس جمع کئے جائیں۔ وہ اگر اپنی حکومت کی اجازت سے انہیں آزاد کرنا چاہے تو آزاد کر سکتا ہے قیدیوں کے تبادلے میں چھوڑنا چاہے تو چھوڑ سکتا ہے، زرِ فدیہ لے کر رہا کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، لیکن اگر دشمن ان باتوں میں سے کسی پر راضی نہ ہو اور وہ کسی بھی معاہدے سے اپنے قیدیوں خصوصاً قیدی عورتوں کو واپس نہ لینا چاہے (کیونکہ مشرق میں عموماً اسے غیرت کا معاملہ بنا لیا جاتا ہے) تو پھر سب سے بہتر حل یہ ہے کہ سپہ سالار باقاعدہ اسیرانِ جنگ کو حکومت کے فیصلے اور دینی مصلحت کے تحت اپنے سپاہیوں میں ایک ایک کر کے تقسیم کرے۔ سپہ سالار کا اس طرح سے قیدیوں کو تقسیم کرنا اور مسلمان سپاہیوں کا انہیں قبول کرنا یہ نکاح کے ایجاب و قبول کی مانند ہے جس کی وجہ سے قیدی عورتوں سے میاں بیوی کے تعلقات رکھنے کی اجازت ہو جاتی ہے۔ مزید کسی ایجاب و قبول کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ اگر کوئی شخص لونڈی کو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بے حد فضیلت کا عمل قرار دیا ہے۔ اسی طرح لونڈیوں اور غلاموں کو آزاد کرنے کی فضیلتوں اور ترغیبات سے قرآن و سنت معمور ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ایسے صاف سیدھے شریفانہ اور حکیمانہ قانون سے شرمانے اور اسے غیروں سے چھپانے کی تجدد زدہ مسلمان ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ شائد اس لئے کہ ان کا ذہن معاً انگریزی کے لفظ Slave اور ان ساری سختیوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اس لفظ کے تخیل کے ساتھ وابستہ ہیں اور جو خاص طور پر رومی حکومت کے چہرے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ لیکن اسلام نے غلاموں کے حقوق کا جس تاکید کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور پھر جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے اس پر عمل کر کے دکھایا ہے اور جس طرح غلاموں کو گھر میں رکھ کر تربیت کا سامان کیا اور اس تربیت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دل و دماغ اسلام کے لئے کھول دیئے وہ تو اسلام اور مسلمانوں کیلئے فخر کی چیز ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ ان کے احساسِ کمتری اور محرومیوں کو دور کرنے کیلئے مسلمانوں نے گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ شائد اسی کا نتیجہ تھا کہ ہمارے یہاں خاندانِ غلاماں تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ کتنے غلاموں اور غلام زادوں نے بادشاہتیں کی ہیں اور اہل علم تو ان میں کثرت سے ہوئے ہیں اور دینی حیثیت سے بڑے بڑے علماء، فقہاء اور ائمہ فن کی کتنی بڑی تعداد تابعین کے زمانے میں غلاموں سے اٹھی۔

کنیز اور لونڈی کا ذکر ایک ضرورت کے تحت یہاں کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ ورنہ اصل بحث تو یتیموں کے حقوق کی چل رہی ہے اور عربوں میں یتیم بچیوں کے ساتھ چونکہ بڑا ظلم ہو رہا تھا اس لئے قرآنِ کریم نے متعدد جگہ اس کو موضوع بنایا ہے اور یہاں بطورِ خاص اس موضوع کے اہم پہلو بیان کئے جا رہے ہیں۔

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ بیویوں کی صورت وحکمت

لیکن ہم ان کا ذکر کرنے سے پہلے تعددِ ازدواج کے حوالے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چار سے زیادہ ازواجِ مطہرات کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ معاندینِ اسلام نے جس طرح اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں وہ تو یقیناً قابلِ توجہ نہیں البتہ مستشرقین نے ریسرچ اور تحقیق کے نام سے جس طرح استعماری مصلحتوں کی خدمت انجام دی ہے اور اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعددِ ازدواج کو موضوع بنا کر آپ کی پاکدامنی اور شرم وحیا پر جس طرح چھینٹے اڑائے ہیں اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان نام نہاد تحقیق اور ریسرچ کرنے والوں کا اندرون کس قدر بھیانک ہے اور یہ تحقیق کے نام پر کس طرح یاوہ گوئی اور خبث باطن کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنے اسی اندھے حسد کے باعث انہوں نے اس بات پر شدید تنقید کی کہ مسلمانوں کو جب چار سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت نہیں تھی تو خود مسلمانوں کے پیغمبر نے نو بیویاں اپنے نکاح میں کیسے رکھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا پیغمبر جنسی جذبات اور ہیجانات سے مغلوب شخصیت رکھتا تھا۔ اس لئے نہایت اختصار سے ہم اس سلسلے میں کچھ عرض کرتے ہیں۔ جو آدمی بھی غیر جانب دار ہو کر آپ کی سیرت کا مطالعہ کرتا ہے وہ اس بات کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پورے مکہ میں نہایت شرم وحیا والے عفت مآب اور پاک دامن مشہور تھے۔ آپ کی آنکھوں میں کنواری لڑکیوں سے بڑھ کر حیا تھی۔ نبوت کے بعد بھی دشمنوں نے آپ پر ہر طرح کے الزامات لگائے کبھی آپ کو شاعر قرار دیا، کبھی کاہن، کبھی جادوگر، لیکن ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس میں دشمنوں نے آپ کی سیرت وکردار کے بارے میں ایک حرف تک کہنے کی جسارت کی ہو۔ آپ کے بلند اخلاق، حسنِ کردار، اور اعلیٰ انسانی صفات کے دشمن بھی ہمیشہ معترف رہے۔ جہاں تک شادیوں کا تعلق ہے، آنحضرت کی زندگی کے اس پہلو کو جب ہم غور سے دیکھتے ہیں تو آپ پر کبھی کبھی تارک الدنیا کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ آپ نے پچیس سال کی عمر میں ایک سن رسیدہ، صاحب اولاد بیوہ سے جس کے دو شوہر فوت ہوچکے تھے عقد کر کے عمر کے پچیس سال تک انہیں کے ساتھ گزارہ کیا۔ جب تک حضرت خدیجہ زندہ رہیں باوجود اس کے کہ بڑھاپے سے ان کے متعدد دانت بھی نکل چکے تھے آپ نے کسی دوسری شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ جب آپ کی عمر پچاس سال کی ہوگئی اور حضرت خدیجہ کے وفات پاجانے کے باعث گھر میں جوان بیٹیوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ رہا آپ کو بیوی کی شدید ضرورت محسوس ہوئی تو آپ نے حضرت سودہ سے نکاح فرمایا۔ آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ حضرت سودہ نہایت سن رسیدہ خاتون تھیں انہوں نے محض آنحضرت کی دلجوئی، خدمت اور بیٹیوں کی دیکھ بھال کیلئے آنحضرت سے نکاح کیا ورنہ اس عمر میں انہیں نکاح کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ آپ نے نکاح کیا لیکن کم سنی کے باعث ان کی رخصتی اس وقت عمل میں آئی جب کہ آپ کی عمر شریف چون 54 برس کی ہوچکی تھی۔ غور فرمایئے! آپ پر اترنے والی کتاب نے مسلمانوں کو چار بیویاں کرنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن خود حضور چون سال کی عمر میں دو بیویاں رکھتے ہیں ان میں بھی ایک شادی کی عمر سے گزر جانے والی اور دوسری نہایت کم سن جس کی ابھی رخصتی عمل میں نہیں آسکتی۔ اس کے ایک سال بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کیا پھر ایک ماہ بعد حضرت زینب بنت خزیمہ سے نکاح ہوا جو صرف اٹھارہ ماہ آپ کے نکاح میں رہ کر وفات پاگئیں اور ایک قول کے مطابق صرف تین ماہ آپ کے نکاح میں رہیں۔ پھر چار ہجری میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح ہوا۔ پھر پانچ ہجری میں حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ کے نکاح میں آئیں۔ اس وقت آپ کی عمر

Marfat.com

شریف اٹھاون سال کی ہوچکی تھی۔اس کے بعد چھ ہجری میں حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور سات ہجری میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح ہوا۔خلاصہ یہ ہے کہ چون سال کی عمر تک آپ نے صرف ایک بیوی کے ساتھ گزارہ کیا یعنی پچیس سال حضرت خدیجہ کے سات اور چار پانچ سال حضرت سودہ کے ساتھ گزارے جو حضرت خدیجہ ہی کی طرح سن رسیدہ خاتون تھیں۔اس طرح سے اٹھاون سال کی عمر میں چار بیویاں آپ کے حرم میں جمع ہوئیں اور باقی ازواجِ مطہرات دو تین سال کے اندر مسلمانوں کی ماؤں کی حیثیت سے آپ کے گھر میں داخل ہوئیں۔معمولی عقل کا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر آپ پر جنسی جذبات کا غلبہ ہوتا یا ذراسا بھی جنسی میلان رکھتے ہوتے تو کیا چون سال آپ دو عمر رسیدہ عورتوں کے ساتھ گزار دیتے۔اور مزید حیران کن بات یہ ہے کہ جب آپ نے مزید شادیاں فرمائیں بھی تو سوائے ایک خاتون کے کوئی بھی کنواری نہیں تھی۔بعض تو ان میں ایسی تھیں جو اس سے پہلے دو دو شوہر گزار چکی تھیں۔ممکن ہے آپ کو یہ خیال آئے کہ آپ کو اصل میں کوئی کنواری خاتون نکاح کرنے کیلئے میسر نہ آسکی تھی۔اس لئے آپ نے بیوگان سے نکاح کیا اور مزید یہ بات بھی کہ آپ نے بڑھاپے تک دو بیویوں سے صرف اس لئے گزارہ کیا کہ کوئی اور خاتون آپ کے ساتھ نکاح کرنے کیلئے تیار نہ ہوسکی۔ایسا خیال ایک عقل کا اندھا ہی کرسکتا ہے۔تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ جس قدر محبت اور جاں نثاری آپ کیلئے صحابہ نے دکھائی ہے دوسری کسی اور امت میں اس کی مثال نہیں ملتی۔کیا صحابہ کے گھروں میں بیٹیاں نہیں تھیں ان کیلئے اس سے بڑھ کر کوئی اعزاز نہیں ہوسکتا تھا کہ ان کی بیٹی حرمِ نبوت میں داخل ہوجائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نبی کا کوئی کام اللہ کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا چنانچہ جب اللہ کا حکم آجاتا ہے تو اللہ کا رسول اس کی تعمیل میں لگ جاتا ہے سورۃ احزاب پڑھ کر دیکھ لیجئے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید بن حارثہ کی مطلقہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بالکل شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔کیونکہ وہ حضرت زید کی بیوی رہ چکی تھیں اور زید حضور کے متبنیٰ رہ چکے تھے۔اور عرب معاشرے میں متبنیٰ یعنی منہ بولے بیٹے کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح کرنا انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا۔لیکن اللہ تعالیٰ یہ چاہتے تھے کہ اس رسم بد کا خاتمہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہو۔اس لئے حضور کو بادلِ نخواستہ تعمیلِ حکم میں نکاح کرنا پڑا اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ آنحضرت کے نکاح اگر جنسی ضرورت کے تحت ہوتے تو وہ اس عمر میں ہوتے جب جنسی جذبات زندہ تھے۔لیکن تعلیمِ امت، تبلیغ دین اور معاند قبائل کو قریب لانے کی مصلحت جیسے متعدد عوامل تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عمر کے آخری سالوں میں نکاح کرنے پر مجبور کیا۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے لڑکپن میں نکاح اس لئے کیا گیا کہ کوئی ایسی خاتون ہونی چاہئے جس کی زندگی کے تمام مراحل اور جسم اور احساسات میں ہونے والی تبدیلیاں حضور کے سامنے گزریں اور ان کے ذریعے سے امت کی عورتوں کو ان نازک مسائل کا ادراک ہوسکے جو ایک مسلمان عورت کیلئے ضروری ہیں۔اسی طرح نوعمری سے لے کر جوانی تک چونکہ صلاحیتیں پوری طرح بیدار ہوتی ہیں، قوتِ اخذ اور قوتِ حفظ عروج پر ہوتی ہیں۔آنحضرت کی ازواجِ مطہرات میں اس عمر کی بیوی کا ہونا ضروری تھا تاکہ وہ آنحضرت کے ارشادات کو یاد بھی رکھ سکے اور دین میں استنباط اور اجتہاد کا ملکہ حاصل کرکے آنحضرت کے وصال کے بعد امت کی رہنمائی بھی کرسکے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ کو اس کام کیلئے چن لیا۔انہوں نے بائیس سو دس 2210 احادیث امت تک پہنچائیں۔ایک بہت بڑی تعداد آپ کے فتاویٰ کی ہے۔سینکڑوں آپ کے شاگرد ہیں جن کے واسطے سے حضرت عائشہ کا علم امت تک منتقل ہوا۔جن میں احکام و مسائل، اخلاق و آداب، اور سیرتِ نبوی کا ایک خزانہ موجود ہے۔

Marfat.com

حضرت امِ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس لئے آنحضرت نے نکاح فرمایا کہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین خاتون تھیں۔ تین سو اٹھہتر احادیث انہوں نے روایت کی ہیں۔ حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ اگر حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ جمع کیے جائیں جو انہوں نے آنحضرت کی وفات کے بعد دیئے ہیں تو ایک رسالہ مرتب ہوسکتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور حکمت بھی اس نکاح میں پنہاں تھی جو ہم جیسے بے بصر لوگوں کو بھی نظر آتی ہے اہلِ نظر تو نجانے کیا کیا دیکھتے ہوں گے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت ابو سلمہ نے اپنی شہادت پر بچے بھی یتیم چھوڑے تھے۔ جن میں ان کے بیٹے بھی تھے آپ نے ان یتیم بچوں کو نہایت شفقت اور پیار سے پالا اور پروان چڑھایا۔ حضرت ام سلمہ کے صاحبزادے عمر بن ابی سلمہ سے کئی اس طرح کی روایات مروی ہیں، جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ حضور نے کس طرح ان کی تربیت فرمائی۔ کس طرح پیار دیا اور کس طرح ہمیشہ نہایت شفقت سے غلط بات پر ٹوکتے اور رہنمائی فرماتے تھے۔ حضرت ام سلمہ کی اولاد کے ساتھ آپ کی شفقت اور نگرانی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نرینہ اولاد کی تربیت کیسے کی جاتی ہے۔ اس طرح حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنوالمصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں وہ ایک جہاد میں قید ہوکر آئیں۔ چنانچہ ان کے ساتھ بھی باقی قیدیوں جیسا سلوک کیا گیا لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آزاد کر کے اپنی بیوی بنالیا تو ان کی قوم کے سینکڑوں افراد جو گرفتاری کے بعد صحابہ کی ملکیت میں آچکے تھے، وہ سب آزاد ہوگئے کیونکہ جب صحابہ کو پتہ چلا کہ جویریہ آپ کے نکاح میں آگئی ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کے پیشِ نظر سب نے اپنے اپنے غلام، باندی آزاد کر دیئے۔ ایک طرف تو صحابہ کا ادب اور محبت ملاحظہ کیجئے کہ جب انہیں معلوم ہوا کہ بنوالمصطلق آنحضرت کے سسرال بن گئے ہیں تو انہوں نے تمام لوگوں کو آزاد کر دیا کیونکہ حضور کے سسرال کو غلام نہیں رکھا جاسکتا تھا اور دوسری طرف اس مصلحت کی طرف نظر ڈالئے کہ جیسے ہی آنحضرت کی ان کے ساتھ قرابت داری ہوئی تو وہ قبیلہ جو حضور کو کسی طرح بھی نبی ماننے کو تیار نہیں تھا اس احسان کے بعد مسلمان ہوگیا۔

حضرت امِ حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت ابوسفیان کی صاحبزادی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ چلی گئیں وہاں نجانے کیا افتاد پڑی کہ ان کا شوہر پہلے مرتد ہوا پھر بیمار رہ کر مرگیا۔ امِ حبیبہ پردیس میں بیوہ ہوگئیں۔ اس روح فرسا غم سے اس عفیفہ خاتون کو نجات دلانے کیلئے حضور نے انہیں پیغامِ نکاح بھیجا۔ اس طرح انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کرلیا۔ تاریخ پر گہری نظر رکھنے والا آدمی جانتا ہے کہ ابوسفیان کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو بے اختیار اس کی زبان سے الفاظ نکلے ھُوَا الْفَحْلُ لَا یُجْدَعُ اَنْفُہٗ ''محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ایک ایسے جواں مرد ہیں جن کی ناک نہیں کاٹی جاسکتی''۔ مراد یہ تھی کہ وہ نہایت معزز شخصیت کے مالک ہیں اس لئے ان کے ساتھ میری بیٹی کا نکاح ہوجانا ہمارے لئے ذلت کا نہیں عزت کا مقام ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ابوسفیان جو قریش کے سردار تھے ان کی دشمنی میں وہ زور اور وہ تیزی باقی نہ رہی جو پہلے نظر آتی تھی۔ مختصر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نکاح کی عمر تھی تو بڑھاپے تک یک بعد دیگرے دو بوڑھی عورتوں کے ساتھ گزارہ کیا، لیکن جب نبوت کی ذمہ داریاں، حکومت کے مشاغل، اصلاح و تربیت کا نازک کام باہر سے آنے والے وفود سے ملاقاتیں اور ان کے لئے مناسب ہدایات اندرون اور بیرونِ ملک میں اٹھنے والے فتنوں سے آگاہی اور ان کا سدِ باب ایک ہجوم کار ہے جس میں کوئی فرصت کے لمحات نظر نہیں آتے۔ ایسے حالات میں بیویوں سے نکاح صرف اس لئے تھا تاکہ تبلیغ و دعوت، تفہیم دین، بطورِ خاص عورتوں کے مسائل کا عورتوں تک پہنچنا اور ان کی مناسب تربیت جیسی ذمہ داریاں تقاضا کرتی تھیں کہ آپ کا گھر چونکہ دین وہدایت کا

Marfat.com

سر چشمہ ہے اس میں ایسی معلمات اور مبلغات کی شدید ضرورت تھی جو عورتوں تک اللہ کا دین پہنچا سکیں اور انہیں بتا سکیں کہ اچھی ماں، اچھی بیٹی، اچھی بہن اور اچھی بیوی بننے کیلئے تمہیں کیا کچھ کرنا چاہئے۔

یہ چند مصلحتیں اور حکمتیں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازدواج کے حوالے سے سرسری طور پر سمجھ میں آتی ہیں ورنہ سیرت پر عبور رکھنے والے اور اسلام کا اجتماعی مزاج سمجھنے والے لوگ اس معاملے میں اس سے بہت زیادہ حکمتوں کا ادراک رکھتے ہیں۔ جنہیں بعض بزرگوں نے سپردِ قلم بھی کیا ہے۔ لیکن ہم نے جو چند گذارشات پیش کی ہیں انہیں بھی اگر غور سے پڑھ لیا جائے تو ملحدین اور مستشرقین کے دامِ تزویر کو بڑی آسانی سے کاٹا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ ایک جملہ معترضہ تھا اصل سلسلہ بیان تو یتیموں کے حقوق سے متعلق ہے۔ اسی سلسلے میں چار بیویوں کی اجازت دی گئی، لیکن اس کو عدل کے ساتھ مشروط ٹھہرایا گیا۔ ہم اس سے پہلے اس کا تذکرہ کر چکے ہیں، یہاں اسی سلسلے میں ایک غلط فہمی کو دور کرنا پیشِ نظر ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے: وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاءِ ''تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے ہو کہ عورتوں کے درمیان عدل کر سکو''۔ اس آیت کے حوالے سے یہ کہا جاتا ہے کہ زیرِ بحث آیت میں تو یہ کہا گیا ہے کہ تم کو ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اس صورت میں اجازت ہے کہ تم ان کے درمیان انصاف کرو۔ اور محولہ بالا آیت میں صاف فرمایا گیا ہے کہ تم عورتوں میں انصاف کرنے کی ہرگز طاقت نہیں رکھتے ہو۔ تو جس بات پر عمل کرنے کی آدمی میں طاقت نہ ہو اس کا اسے پابند کیسے کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت دونوں آیتوں کا محمل اور مقام الگ الگ ہے۔ جہاں انصاف کا حکم دیا گیا ہے وہ وہ معاملات ہیں جو انسان کے اختیار میں ہیں۔ مثلاً نفقہ، شب باشی، عام ضروریاتِ زندگی، ظاہری رویہ، ان میں بہر صورت بیویوں میں مساوات رکھنا ضروری ہے۔ لیکن وہ معاملات جو انسان کے اختیار میں نہیں ان کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ تم ان میں مساوات اور انصاف کے پابند نہیں ہو۔ مثلاً ایک شخص اپنی تمام بیویوں کے ساتھ یکساں حسنِ سلوک کرتا ہے لیکن اس کے دل کا میلان کسی ایک کی طرف زیادہ ہے تو یہ دل کا میلان ایک ایسا غیر اختیاری معاملہ ہے جس میں برابری رکھنا انسان کے اختیار میں نہیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں اسی نازک حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اللھم ھذا قسمی فی ماالملک فلا تلمنی فیما تملک و لا املک ''یا اللہ! یہ میری برابر والی تقسیم ہے ان چیزوں میں جو میرے اختیار میں ہیں اور وہ چیز جو آپ کے قبضہ میں ہے اور میرے اختیار میں نہیں ہے اس پر مجھ سے مواخذہ نہ کرنا''۔ آیت کے اختتام پر ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا۔ اَدْنٰى دُنُوٌّ سے ہے۔ جس کا معنی ہے ''قریب'' اور لَا تَعُوْلُوْا، عال یعول مال یمیل کے معنی میں ہے۔ جس کے معنی ''میلان'' کے ہیں۔ یہاں ناجائز میلان اور بے انصافی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں جن احتیاطوں کا حکم دیا گیا ہے اور جن مصلحتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اگر تم ان کی پابندی کرو تو پھر اس بات کا بہت امکان ہے کہ تم بے انصافی سے بچ جاؤ۔ اس میں ایک نہایت نازک بات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بے انصافی اس وقت شروع ہوتی ہے جب کوئی شخص دوسرا نکاح کرتا ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات میں خرابی کا حقیقی سبب ایک سے زیادہ بیویاں ہونا نہیں

Marfat.com

ہے بلکہ حقیقی سبب بے انصافی ہے۔ یہ بے انصافی جس طرح ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان مسائل پیدا کرتی ہے اسی طرح اگر ایک بیوی کے ساتھ بھی بے انصافی کی جائے تو تب بھی میاں بیوی کے درمیان مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ میاں بیوی کے درمیان خوشگوار تعلقات ہوں تو اپنے اندر اللہ کا خوف پیدا کرو اور بے انصافی سے بچو تا کہ اللہ کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ○

(اور ان عورتوں کو مہر دو خوش دلی سے پھر اگر وہ اس میں سے تمہارے لئے کچھ چھوڑیں اپنی خوشی سے، تو تم اس کو کھاؤ رچتا پچتا) (النسآء: ۴)

مہر کی تاکید اور ہدایات

اس آیتِ کریمہ میں النسآء سے مراد ان یتیموں کی مائیں ہیں جوان عورتوں سے نکاح کرنے والوں کے زیرِ کفالت ہیں۔ لیکن جو حکم یہاں دیا گیا ہے وہی حکم عام عورتوں کیلئے بھی ہے۔ لیکن یہاں بطورِ خاص اس حکم کے ذکر کا سبب یہ ہے کہ جب یتیموں کے ولی اور سرپرست یتیموں ہی کی تربیت اور بہتری کیلئے ان کی ماؤں سے نکاح کرتے تھے تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم نے ایک نیکی کی ہے بلکہ یتیموں کی ماؤں پر احسان کیا ہے۔ ہم نے اپنے نفس کی خواہش پر یہ نکاح نہیں کیا بلکہ انہیں کے بچوں کی مصلحت کیلئے کیا ہے۔ اس حوالے سے ہمارے لئے مہر کی ادائیگی کوئی ضروری نہیں۔ اس لئے بطورِ خاص یہاں حکم دیا گیا ہے کہ نکاح کا سبب کچھ بھی ہو نکاح کا تحقق مہر کے بغیر نہیں ہوتا اس کی ادائیگی بہر صورت واجب ہے۔ مزید یہ بھی فرمایا کہ نہ صرف کہ تم ان کو ان کا مہر ادا کرو بلکہ خوشدلی سے ادا کرو اور اللہ کا حکم سمجھ کر دل کی خوشی سے حکم کی تعمیل کرنے کی کوشش کرو۔ آیتِ کریمہ کے پہلے جملے کے الفاظ پر غور کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شوہروں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ براہِ راست اپنی بیویوں کو مہر ادا کریں اور اگر اس کا خطاب لڑکیوں کے سرپرستوں سے بھی سمجھا جائے تو بھی اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لڑکیوں کے شوہروں سے اگر مہر وصول کریں تو اس کی ادائیگی لڑکیوں کو کریں اپنے پاس مت رکھیں اور ان کی اجازت کے بغیر اس رقم میں کسی قسم کا تصرف نہ کریں اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اسے خوشدلی سے ادا کریں اس طرح ادا نہ کریں کہ بیوی یہ سمجھے کہ اگر میں نے اس مہر کو قبول کر لیا تو اس کے ساتھ ناگواری بھی میرے حصے میں آئیگی۔ اگر مجھے اپنے شوہر سے محبت اور اچھے سلوک کی خواہش ہے تو پھر مجھے مہر قبول نہیں کرنا چاہئے۔ اسی تصور سے اکثر بیویاں اپنے شوہروں سے مہر لیتے ہوئے ہچکچاتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ نامناسب رویہ بلکہ ظلم جس طرح عہدِ جاہلیت میں ہوتا تھا آج بھی مسلمانوں میں اسی طرح مروج ہے بڑے بڑے مہر باندھ دیئے جاتے ہیں تا کہ لوگوں میں شہرت ہو لیکن ساتھ ہی یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب کون لیتا ہے کون دیتا ہے۔ یہ تو محض باندھنے کی چیز ہے لینے دینے کی نہیں اور جہاں ادا بھی کیا جاتا ہے تو نہایت ناگواری کے ساتھ۔ گھر کا ماحول اس طرح کا بنا دیا جاتا ہے جس سے بیوی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ اگر میں نے مہر کا مطالبہ کر دیا تو میرے لئے اس گھر کی زمین تنگ ہو جائے گی اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ مہر بیوی کا نہایت جائز اور باوقار حق ہے۔ لیکن اس کے مطالبے کو شرفا کے گھروں میں بے غیرتی اور بے لحاظی سمجھا جاتا ہے۔ جس کے نتائج نہایت مکروہ نکلتے ہیں۔ اس لئے نحلۃ سے اس ظلم کا سدباب کیا گیا ہے۔

Marfat.com

فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ سے ایک اور ظلم کا تدارک کیا گیا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مہر کا ادا کرنا ضروری ہے انہوں نے اس سے جان چھڑانے کیلئے یہ رستہ نکالا ہے کہ بیوی سے معاف کرا لیا جاتا ہے۔ کہنے کو تو اسے معاف کرانا کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک طرح کا جبر ہے شوہر یا اس کے والدین نہائیت سنجیدگی سے جس میں آئندہ پیش آنے والے خدشات کی دنیا مضمر ہوتی ہے، کہتے ہیں کہ مہر معاف کردو، ہم اس کے ادا کرنے کے متحمل نہیں ہیں۔ کبھی بظاہر اس کیلئے نرم لہجہ بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن لڑکی خوب جانتی ہے کہ انکار کی صورت میں نتیجہ کیا ہوگا۔ چنانچہ لڑکی ڈری سہمی مستقبل کے اندیشوں سے زیر بار مہر معاف کر دیتی ہے۔ شریعت میں اس معافی کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس لئے یہاں طیب نفس کی شرط لگائی گئی ہے کہ اگر وہ طِیْبِ نفس یعنی نفس کی رضامندی اور خوشدلی سے معاف کرے تو معافی ہوگی ورنہ معافی نہیں ہوگی۔ اس لئے ہمارے بڑے بڑے علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ مہر کی معافی کی صورت یہ ہے کہ بیوی کو مہر ادا کر دیا جائے پھر وہ اگر اپنی خوشی سے بغیر کسی دباؤ کے واپس کر دے تو سمجھا جائے گا کہ اس نے یہ طِیْبِ نفس مہر کی رقم واپس کی ہے، پھر شوہر کیلئے اسے لے لینے میں کوئی حرج نہیں۔

آیتِ کریمہ میں صَدُقَاتٌ کا لفظ مہر کیلئے استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ صَدُقَاتٌ صَدُقَه اور صُدَاق کی جمع ہے۔ ہمارے یہاں عام طور پر خیرات کے لئے جو لفظ استعمال ہوتا ہے، صَدَقَه، جس کی جمع صَدَقَاتٌ ہے۔ وہ ص اور د کی فتح کے ساتھ ہے۔ ملا علی قاری مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں کہ مہر کو صُدَاق اور صَدُقَه اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے مادہ میں سچ کے معنی موجود ہیں اور مہر سے بھی چونکہ شوہر کا اپنی بیوی کی طرف سچا میلان ثابت ہوتا ہے اس لئے اس مناسبت سے مہر کو صداق کہنے لگے۔ اندازہ فرمایئے! جس چیز سے شوہر کی طبعی محبت اور رجحان کا کچھ اندازہ ہوتا تھا ہم نے اسی کو نکاح سے خارج کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔

آیت کے آخری الفاظ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا دونوں فعیل کے وزن پر صفت کے الفاظ ہیں۔ هَنِیْٓـًٔا ۔ هَنَأَ، هَنُوَ، هَنِیَ سے ہے۔ لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مشقت اور تکلیف کے بغیر حاصل ہو جائے۔ جب یہ طعام کی صفت واقع ہو تو اس کے معنی ''خوشگوار طعام'' کے ہوتے ہیں۔

مَرِیْٓـًٔا ۔ مرء الطعام فهو مری ء سے ہے۔ یہ بھی مَرِیْٓـًٔا کا ہم معنی ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے اس کا ترجمہ ''رچتا پچتا'' کیا ہے اور مولانا تھانوی نے ''خوشگوار''۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝

(اور اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے قیام اور بقا کا ذریعہ بنایا ہے نادان لوگوں کے حوالہ نہ کرو البتہ انہیں کھانے اور پہننے کیلئے فراغت کے ساتھ دو اور دستور کے موافق ان کی دل داری کرتے رہو) (النسآء : ۵)

Marfat.com

سُفَہَآءَ سے مراد اور مال کی اہمیت

سابقہ آیتِ کریمہ میں یتیموں کے حقوق کے سلسلے میں حکم دیا گیا تھا کہ جن سرپرستوں کی تحویل میں یتیم ہوں جب وہ بالغ ہو جائیں اور اس قابل ہو جائیں کہ ان کے بزرگوں نے جو ان کے لئے مالِ وراثت چھوڑا تھا اسے سنبھال سکتے ہوں تو وہ مال ان کے سپرد کر دو۔ اس آیتِ کریمہ میں اس حکم پر عمل کرنے کے سلسلے میں جن احتیاطوں اور نزاکتوں کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے ان کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔

سب سے پہلی یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ ولی اور سرپرست کا کام چونکہ یتیموں کی بھلائی اور خیر خواہی ہے۔ اس لئے جب تک یتیم اپنے معاملات کو سنبھالنے کے قابل نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی تربیت کرنا ولی اور سرپرست کی ذمہ داری ہے۔ لیکن جب وہ بڑا ہو جائے اور اس کے بزرگوں کا چھوڑا ہوا مالِ وراثت اگر واقعی اس کے سرپرست کے پاس موجود ہے تو سرپرست کی ذمہ داری ہے کہ جس طرح وہ اس بات کا پابند ہے کہ وہ مال یتیم کے سپرد کرے اسی طرح وہ اس بات کا بھی پابند ہے کہ وہ مال سپرد کرنے میں پوری احتیاط سے کام لے۔ کیونکہ مال کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں بے احتیاطی یا لاپرواہی سے کام لیا جا سکتا ہو۔ مال و دولت کی زندگی میں ایک اہمیت ہے بلکہ یہ ایک ایسی بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر زندگی نہیں گزرتی۔ اس لئے اس آیت میں مال کو زندگی کے قیام و بقا کا ذریعہ فرمایا گیا ہے۔ تو جو چیز قیام و بقا کا سبب ہے اس کے بارے میں کسی طرح کی غفلت مال کو بھی نقصان پہنچا سکتی ہے اور نظامِ تمدن کو بھی تباہ کر سکتی ہے۔ مال و دولت کے بارے میں چونکہ ہمیشہ افراط و تفریط ہوتی رہی ہے اس لئے اسلامی شریعت نے اس کی اصلاح کیلئے خصوصی احکام دیئے ہیں۔ لیکن ان تمام احکام کے باوجود آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ افراط و تفریط پر مبنی طریقہ بدستور جاری ہے۔ جن لوگوں کا دین سے واجبی سا رشتہ ہے اور وہ اپنی زندگی کا اصل مقصد دنیا کمانا ہی سمجھتے ہیں انہوں نے تو دنیا اور دولتِ دنیا کو مقصدِ زندگی اور دل کا محبوب سمجھ رکھا ہے۔ وہ اسی کیلئے جیتے اور اس کے چھن جانے سے اس کے غم میں مر جاتے ہیں۔ ان کے ہاں عزت و ذلت کے معیارات اسی دولت ہی کے حوالے سے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ ان کیلئے یہ بات سمجھنا آسان نہیں کہ دولتِ دنیا کا حصول مقصدِ زندگی نہیں۔ یہ زندگی کی ایک ضرورت ہے جسے بقدرِ ضرورت اور بوقتِ ضرورت حاصل کرنا چاہئے۔ اس کی محبت میں ڈوب جانا' یہ کسی طرح مناسب نہیں۔

جو لوگ شریعت کے پابند اور دین دار کہے جاتے ہیں وہ بھی بعض دفعہ افراط و تفریط کا شکار ہوتے ہیں۔ ان میں بطورِ خاص وہ لوگ جن کو صوفیا کہا جاتا ہے وہ ہمیشہ دنیا اور دولتِ دنیا کی مذمت میں لگے رہتے ہیں وہ دنیا کو ایک مردار اور اس کے چاہنے والوں کو کتا قرار دیتے ہیں۔ ان کے یہاں دین کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس آئے اسے فوراً اللہ کے راستے میں دے دو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ رویہ بالکل غلط ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ رویہ غیر متوازن ہے۔ اگر شریعت کے احکام ایسے ہی ہوتے تو پھر احکامِ زکوٰۃ اور وراثت دینے کی کیا ضرورت تھی اور حقِ ملکیت کی بحثوں کا کیا فائدہ تھا نازک حالات میں آنحضرت نے ہمیشہ انفاق پر ابھارا ہے۔ کبھی یہ حکم نہیں دیا کہ لوگوں کے پاس ضرورت سے جو زیادہ ہو وہ سب چھین لیا جائے۔ مال کو خیر قرار دیا اور ضرورت کے لئے اس کا کمانا فریضہ ٹھہرایا گیا۔ دیانت دار تاجر کے فضائل بیان فرمائے گئے، تجارت اور زراعت کو ترقی دینے کے لئے آنحضرت نے ہدایات جاری فرمائیں۔ اگر مال کے بارے میں مذکورہ بالا تصور صحیح ہوتا تو حضور کبھی یہ ہدایات جاری نہ فرماتے۔ مال نہ صرف کمانے کی اجازت دی بلکہ اس کی حفاظت کا بھی حکم دیا یہاں تک فرمایا: مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ ''اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے جو شخص قتل ہو جائے وہ شہید ہے''۔ حقیقت یہ ہے کہ مال ایک دو دھاری تلوار ہے

Marfat.com

یہ زندگی کورواں دواں رکھنے کیلئے نہایت ضروری ہے لیکن اس کو مقصد زندگی بنالینے سے صرف اخلاقی مفاسد ہی پیدا نہیں ہوتے بلکہ اسلامی تہذیب وتمدن کے لئے بھی خطرات لاحق ہوجاتے ہیں۔اسلام نے اس کی ان دونوں حیثیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایسے احتیاطی احکام دیئے ہیں جس سے اس کی افادیت میں اضافہ ہوجاتا ہےاوراس کے ضرررساں پہلو کمزور پڑ جاتے ہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: لَا بَاسَ بِالْغِنٰی لِمَنِ اتَّقَی اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ ''جو شخص اللہ عزوجل سے ڈرتا ہواس کی مال داری میں دین کا کوئی حرج نہیں''۔جس طرح تلوار مجاہد کے ہاتھ میں اسلام کی قوت ہے اورڈاکواورظالم کے ہاتھ میں انسانیت کی دشمن ہے۔یہی حال دولت کا بھی ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے کے ہاتھ میں خلقِ خدا کی ضرورت اور تمدن کی خادم ہے۔لیکن اللہ کے خوف سے بے گانہ آدمی کے پاس اخلاق اور تمدن کے لئے تباہ کن ہے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ علیہ نے ایک موقعہ پر مثال دیتے ہوئے فرمایا:''زندگی کشتی کی مانند ہےاوردنیا کا مال ودولت پانی کی مانند''۔کشتی پانی کے بغیر نہیں تیر سکتی اس طرح زندگی بھی مال ودولت کے بغیر نہیں گزرتی۔لیکن یہ پانی اس وقت تک کشتی کیلئے مفیداوراس کی قوت ہے جب تک کشتی کے نیچے ہے اگر خدانخواستہ پانی کشتی کے اندرداخل ہوجائے تو پھر یہ پانی کشتی کی قوت نہیں بلکہ اس کی ہلاکت اور تباہی کا باعث ہے ۔اسی طرح مال ودولت جب تک آدمی کے ہاتھ کی چھڑی ہے تو وہ انسانی تمدن کا ستون ہے۔اور زندگی کی ضروریات کا سہارا۔جب تک جیب کی گھڑی ہے تو وہ زندگی میں اعتدال کا ضامن اور خلقِ خدا کا معاون ہے۔لیکن جب یہ دل کا محبوب بن جاتا ہے تو پھر یہ ناگ بن جاتا ہے اب اس سے نہ انسانیت بچتی ہے نہ رشتوں کا احترام باقی رہتا ہے نہ اخلاق سلامت رہتے ہیں اور نہ نظامِ تمدن ومعیشت خرابی سے محفوظ رہتا ہے۔

مولانا عبیداللہ احرار ایک صاحب دل بزرگ گزرے تھے۔ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے دولت وثروت اور خوشحالی سے بھی نوازا تھا۔مولانا عبدالرحمٰن جامی انہیں کے ہمعصر فارسی کے مشہور شاعر اور اپنے وقت کے جید عالم تھے۔انہوں نے مولانا کی شہرت سنی تو اپنے تزکیہ اور اصلاح کیلئے ان سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ان کے گھر پہنچے تو مولانا گھر میں موجود نہیں تھے۔انہوں نے گھر دیکھا نوکر چاکر دیکھے بدگمانی سی ہوئی کہ دنیا داروں جیسے ٹھاٹھ باٹھ اللہ والوں کے تو نہیں ہوتے۔معلوم ہوتا ہے کہ میں غلط جگہ آ گیا ہوں۔شاعر تو تھے ہی ایک مصرعہ موزوں ہوا وہیں دیوار پر لکھ دیا۔

نہ مرد آنست کہ دنیا دوست دارد

وہ شخص مردِ خدا نہیں جو دنیا کو دوست رکھتا ہے

واپس پلٹے قریب کوئی مسجد تھی وہاں چلے گئے کہ ذرا آرام کرلوں تھک گیا ہوں تو پھر سفر شروع کروں گا۔اتفاق کی بات آنکھ لگ گئی خواب میں دیکھا کہ دوفرشتوں نے آ پکڑا۔الزام یہ کہ تم نے فلاں کا قرض ادانہیں کیا ہمیں حکم ملا ہے کہ تمہیں جیل بھیج دیا جائے۔آپ شور مچارہے ہیں کہ میں ایک پردیسی ہوں یہاں تو میرے پاس کچھ نہیں۔اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے بگھی پر سوار مولانا عبیداللہ احرار تشریف لارہے ہیں انہوں نے قریب آکر بگھی روکی پوچھا اس غریب کو کیوں پکڑ رکھا ہے بتایا کہ اس نے قرض ادانہیں کیا پوچھا کہ کتنا قرض ہے ۔بتایا کہ اتنا قرض ہے۔آپ نے اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ قرض ادا کردو۔قرض ادا ہوگیا تو انہوں نے مولانا عبدالرحمٰن جامی کو چھوڑ دیا۔یہ سارا خواب کا ماجرا تھا آنکھ کھل گئی۔سمجھ گئے کہ اللہ کی طرف سے کوئی اشارہ ہے میں نے لوٹنے میں جلد بازی کی ہے۔دوبارہ گئے مولانا سے ملاقات ہوگئی،جو کچھ پیش آیا تھا کہہ سنایا۔مولانا نے فرمایا جو مصرعہ تم نے لکھا تھا اب پڑھو۔انہوں نے پڑھا۔

نہ مرد آنست کہ دنیا دوست دارد

Marfat.com

مولانا عبید اللہ احرار نے فرمایا کہ دوسرا مصرعہ اس طرح لکھو۔

اگر دارد برائے دوست دارد

اگر وہ دنیا اپنے پاس رکھے تو اپنے لئے نہ رکھے دوست یعنی اللہ کے لئے رکھے۔ بس اتنا سا فرق ہے کہ صرف اپنے لئے رکھنے سے دنیا سرتاسر تباہی ہے اور اللہ کیلئے رکھنے سے اللہ کی رحمت بن جاتی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں یہ توجہ دلائی جارہی ہے کہ مال و دولت چونکہ زندگی کی ضرورت اور قیام و بقا کا ذریعہ ہے اس لئے ایسی مفید اور ضروری چیز کے بارے میں یہ بے احتیاطی نہیں ہوسکتی کہ دینے سے پہلے یہ نہ سوچا جائے کہ جس کو دیا جارہا ہے وہ دیئے جانے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ سیاقِ کلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہاں سُفَهَآءَ سے یتیم ہی مراد لئے جائیں۔ اور آیت کا مطلب یہ متعین کیا جائے کہ بے وقوف یتیموں کو مال سپرد نہ کرو۔ لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت ابو موسیٰ اشعری سے یہ منقول ہے اور امام تفسیر حافظ طبری نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے کہ سُفَهَآءَ کا لفظ عام ہے جو تمام لوگوں کو شامل ہے چاہے وہ یتیم ہوں اور چاہے وہ اپنے بچے ہوں۔ وہ اَمْوَالَكُمْ سے استدلال کرتے ہیں کہ اگر یہاں صرف یتیم ہی مراد ہوتے تو پھر اَمْوَالَهُمْ کہا جاتا بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اپنے بچے ہوں یا زیرِ تربیت یتیم بچے، ان میں اگر عقل اور سمجھ کی ایسی کمی ہے کہ وہ مال کو سنبھال نہیں سکتے بلکہ اندیشہ ہے کہ نقصان کردیں گے تو انہیں مال سپرد نہ کیا جائے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انہیں کھلانے پلانے اور پہنانے میں جزرسی سے کام نہ لیا جائے۔ یعنی یہ سمجھ کر کہ یہ سیدھے سادھے بچے ہیں جیسا سیدھا سادھا کھلا پلا دیں گے انہیں کیا شکائت ہوگی۔ وَارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا سے اس طرف اشارہ نکلتا ہے کہ انہیں کھانے پلانے میں وسعت و فراغت سے کام لیا جائے۔ اگر معمولی کھلانے کی اجازت ہوتی تو وَارْزُقُوْهُمْ مِنْهَا ہوتا۔

ایک ضروری ہدایت

ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ یتیم تو اپنے باپ کے مال کے وارث ہونے کی وجہ سے مال کے مالک ہوتے ہیں۔ اس لئے بالغ ہونے کے بعد انہیں مال حوالے کرنا یا ان کی طرف سے مال کا مطالبہ ان کا قانونی اور اخلاقی حق ہے۔ لیکن والدین کی جانب سے اپنی اولاد کو اپنی زندگی میں مال و دولت حوالے کرنے کی نہ کوئی اخلاقی مجبوری ہے نہ قانونی۔ تو پھر حضرت عبداللہ ابنِ عباس اور بعض دوسرے بزرگوں کا اس آیت کے مفہوم میں انہیں شامل کرنا چہ معنیٰ دارد۔ بات دراصل یہ ہے کہ ممکن ہے خیر القرون میں یہ باتیں اجنبی معلوم ہوتی ہوں۔ لیکن آج کے دور میں تو یہ مشاہداتی حقیقتیں ہیں کہ بچے جیسے ہی جوان ہوتے ہیں وہ بجائے اس کے کہ یہ محسوس کریں کہ بالغ اور جوان ہونے کے بعد والدین اور گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا ہماری ذمہ داری ہے۔ والدین اپنی ذمہ داریوں کا زمانہ گزار چکے ہیں۔ اب ہماری ذمہ داری کا دور شروع ہوا ہے اس لئے ہمیں دست و بازو اور دماغی قوتوں سے کام لے کر اپنا فرض انجام دینا ہے۔ لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ اگر وہ کاروبار کرنا چاہتے ہیں تو اپنے والد کو مجبور کرتے ہیں کہ کاروبار کیلئے سرمایہ آپ مہیا کریں اور اگر ملازمت اختیار کرتے ہیں تو تنخواہ میں بجائے والدین کی خدمت کرنے کے اور اپنے آپ کو سمیٹ کر رکھنے کے والدین سے ان کے مطالبات جاری رہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات مسلسل گردش کرتی رہتی ہے کہ والدین کے پاس جو کچھ ہے وہ ہمارا ہے۔ اور ہم جتنی جلدی ان سے وصول کرلیں بہتر ہے۔ اور اس بات کو وہ غلطی سے بھی ماننے کو تیار نہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے یہ والدین کا بھی ہے بلکہ عموماً خوشحال گھرانوں تک میں دیکھا گیا ہے کہ بچے اپنے والد

Marfat.com

سے دوبدوشکوہ کرتے ہیں کہ آپ نے ہمارے لئے کیا بنایا ہے لیکن انہوں نے والدین کیلئے کیا کیا ہے۔اس کیلئے وہ کوئی بات سننے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔حالانکہ اسلام نے والدین پر اولاد کی جو ذمہ داریاں ڈالی ہیں وہ بلوغ تک ہیں اور اس کے بعد والدین اولاد کے ساتھ جو حسنِ سلوک کرتے ہیں وہ تبرع اور احسان ہے۔جس پر بچوں کو شکر گزار ہونا چاہئے۔اور ساتھ ساتھ یہ بات ذہن میں متحضر رکھنی چاہئے کہ جیسے جیسے والدین بوڑھے ہوتے جارہے ہیں ان کی تمام تر ذمہ داریاں اولاد کے سر ہیں۔جس طرح اولاد والدین کے مال کو اپنا مال سمجھتی ہے اسی طرح والدین کو بھی حق ہے کہ وہ اولاد کے مال کو اپنا مال سمجھیں بلکہ بڑھاپے میں اصل حقیقت یہی ہے۔حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی اپنے جوان بیٹے کو ساتھ لے کر حضور کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ یہ میرا بیٹا ہے۔بچپن میں اس کی ماں مرگئی تھی، میں نے اس کو اس طرح پالا کہ میں اس کا باپ بھی تھا اور اس کی ماں بھی۔میں نے اس کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔اس کی تکلیف میں راتیں جاگ کر کاٹیں۔اس کی ہر آسائش کیلئے بیش از بیش قربانی دی۔اس کی ہر ضرورت کو پورا کرنے کیلئے اپنی ضرورتیں روکیں۔اب جبکہ یہ جوان ہوگیا ہے اور میں بوڑھا ہوگیا ہوں یہ کمانے لگا ہے اور میں اس کی کمائی کا محتاج ہوگیا ہوں۔تو یہ اپنی ایک ایک چیز کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ میری ہے۔اپنے مال و دولت کو اپنا سمجھتا ہے اور میرے لئے اس میں کوئی گنجائش محسوس نہیں کرتا۔آنحضرت نے خاموشی سے باپ کی شکایت سنی۔پھر اٹھے، اس جوان لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور اس کے باپ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے فرمایا: اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ ''تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے''۔اس حدیث سے آپ کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔لیکن ہمارے یہاں الٹی گنگا بہتی ہے۔بچے جوان ہوتے ہی باپ سے تقاضا کرنے لگتے ہیں کہ آپ کے پاس جو کچھ ہے اس میں ہمارا حصہ ہمارے حوالے کردیجئے۔چنانچہ اس طرح کے دباؤ کے تحت بعض دفعہ والدین اپنا مال اولاد کے سپرد کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔اور پھر ان کی ناتجربہ کاری یا نااہلیت سے نقصان اٹھاتے ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بچوں کی طرف سے دباؤ نہیں ہوتا لیکن خود والدین کی محبت ان سے اس طرح کے فیصلے کرواتی ہے۔اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیویاں ایک سے زیادہ ہیں ایک بیوی کی اولاد جوان ہوگئی۔کاروبار کرنے لگی۔اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی۔دوسری بیوی کے بچے ابھی اس عمر کو نہیں پہنچے کہ ان پر ذمہ داری کا بوجھ ڈالا جاسکے۔لیکن بچوں کی ماں اپنے شوہر کو مجبور کرتی ہے کہ میرے بچے آپ کے دوسروں بچوں سے پیچھے رہ گئے ہیں اس لئے آپ سرمایہ ان کے حوالے کریں تاکہ وہ بھی اپنے سوتیلے بھائیوں کی طرح خوشحالی کے دن دیکھ سکیں۔اور ان بچوں کی ماں یہ سمجھنے کیلئے بالکل تیار نہیں ہوتی کہ بچے ابھی نابالغ ہیں یا ان میں ابھی وہ صلاحیت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ کامیابی سے کاروبار چلاسکیں لیکن باپ روز روز کے مطالبات سے تنگ آکر سرمایہ ان بچوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔اس لئے اس آیت کے تحت ایسے والدین کو بھی ہدایات دی جارہی ہیں کہ دیکھو تم اس طرح کی غلطی نہ کرنا۔بچوں کی محبت اپنی جگہ لیکن دین اور عقل کے تقاضے اپنی جگہ تمہیں بہر حال دین اور عقل کے تقاضوں پر عمل کرنا چاہئے۔

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ سفہاء سے مراد صرف زیرِ تربیت یتیم بچے یا اپنے بچے ہی نہیں ہیں بلکہ یہ ایک جامع ہدایت ہے جس کی مخاطب تمام امت ہے۔ہدایت یہ دی جارہی ہے کہ مال جو زندگی کے قیام کا ذریعہ ہے اسے ایسے نادان لوگوں کے اختیار اور تصرف میں نہ رہنا چاہئے جو اسے غلط طریقے سے استعمال کرکے نظام تمدن، معیشت اور بالآخر نظام اخلاق کو برباد کردیں۔اسلام حقِ ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔کسی بھی شخص کو جسے اپنی املاک پر حق حاصل ہے اس کا احترام ہونا چاہئے لیکن وہ ایسا غیر محدود نہیں ہونا چاہئے جس سے اجتماعی فساد برپا ہوجائے۔ایک آدمی ذہین و فطین اور سمجھدار ہے، وہ انتہائی کامیابی سے اپنے کاروبار کو ترقی دے رہا ہے۔لیکن اس کی دولت ملکی مصالح کے خلاف استعمال

Marfat.com

ہو رہی ہے۔ایسی تنظیموں کو وہ سپورٹ کر رہا ہے جو ملک اور ملک کے نظریات کیلئے تباہ کن ہیں۔اب اس شخص کو اس لئے نہ روکا جائے کہ وہ اپنے مال پر حقوقِ مالکانہ رکھتا ہے ریاست چونکہ اپنے شہریوں کی جان، مال، اور آبرو کے ساتھ ساتھ ان کے دین اور اخلاق کی بھی محافظ ہوتی ہے اسی طرح ملک کا دستور اس کے تقاضے اور ملک کے اساسی نظریات کی وہ سب سے بڑھ کر امین ہوتی ہے۔اگر کسی کی دولت سے ان چیزوں کو نقصان پہنچ رہا ہے تو حقِ ملکیت کو راستے میں حائل نہیں ہونا چاہئے۔البتہ یہ ضرور ہے کہ اس معاملے میں نہایت احتیاط اور خدا خوفی کی ضرورت ہے کیونکہ بعض دفعہ یہی جائز اور صالح محرکات حکومت کے ظلم کا باعث بن جاتے ہیں۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ○

(اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں پھر تم اگر ان کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو اور اس ڈر سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے اسراف اور جلد بازی کر کے ان کا مال ہڑپ نہ کرو یتیم کا جو سرپرست مال دار ہو اس کو چاہئے کہ وہ پرہیز کرے اور جو محتاج ہو وہ معروف طریقہ سے کھائے پھر جب ان کے مال ان کے حوالے کرنے لگو تو ان پر گواہ ٹھہرالو اور حساب لینے کیلئے اللہ کافی ہے) (النسآء: ٦)

یتیموں کا مال کب انہیں سپرد کرنا چاہئے

سابقہ آیتِ کریمہ میں تو ان لوگوں کو مال دینے سے روکا تھا جو اس کی اہلیت نہیں رکھتے اور جنہیں سُفَهَآءَ کہا گیا تھا۔اب وہ طریقہ بتایا جارہا ہے جو یتیموں کا مال ان کے حوالے کرنے کے معاملے میں سرپرستوں کو اختیار کرنا چاہئے۔اس کے مختلف مدارج ہیں۔سب سے پہلا درجہ تو یہ ہے کہ بچے ابھی چھوٹی عمر میں ہیں وہ خود سے اپنے معاملات کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔تو یہ عمر ان پر ذمہ داری کا بوجھ ڈالنے کی نہیں ہے بلکہ سرپرست کا فرض ہے کہ وہ ہر طرح سے ان کی تربیت کرے۔ان کی تعلیم کا بندوبست کرے،ان کے دین اور اخلاق کی مناسب نگہداشت کرے،کیونکہ اگر ایک لڑکا مروجہ تعلیم حاصل کرلے لیکن دینی اور اخلاقی لحاظ سے بگاڑ کا شکار ہو جائے تو وہ نہ صرف اپنا اور اپنے مال کا دشمن ثابت ہوتا ہے بلکہ جس سرپرست کی تحویل میں ہے اس کا گھر بھی اس کے شر سے محفوظ نہیں ہوتا۔اس لئے سرپرست کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ صرف مروجہ تعلیم پر اکتفا نہ کرے اور کسی تعلیمی ادارے میں بچے کو بھیج کر بچے کی طرف سے بے فکر نہ ہو جائے اور تربیت کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ علمی اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ اسے معاملات کی تربیت بھی دی جائے۔بہتر لوگوں سے میل جول کے مواقع پیدا کئے جائیں۔مختلف ضرورتوں کیلئے بازار بھیج کر لوگوں کے طور اطوار سمجھنے کا موقع دیا جائے۔اگر اسے کل کو کاروبار ہی کرنا ہے تو بڑے کاروبار کی تمہید کیلئے اس پر چھوٹی موٹی ذمہ داریوں کا بار ڈالا جائے۔اس طرح اسے آزمایا جائے کہ اس کے ذہن اور اس کی سمجھ کی کیفیت کیا ہے۔یہ تمہید اور تیاری بلوغ کی عمر تک جاری رہنی چاہئے۔اگر بالغ ہونے تک یہ محسوس ہونے لگے کہ یہ لڑکا اپنے معاملات کی دیکھ بھال کر سکتا ہے تو پھر نہایت احتیاط کے ساتھ اس کی

Marfat.com

ذمہ داریاں اس کے سپرد کردی جائیں۔ مزید وضاحت کیلئے عرض کرتا ہوں کہ ذمہ داریاں سپرد کرنے سے پہلے دو پابندیاں لگائی گئی ہیں ایک تو یہ کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائے، اور دوسرا یہ کہ اس میں رشد اور سمجھ آجائے۔ نکاح کی عمر سے مراد یہ ہے کہ اس کے اندر وہ علامتیں ابھر آئیں جو بلوغ کی علامتیں ہوتی ہیں اور جس کے بعد ایک بچہ بالغ مرد کہلاتا ہے اور وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اس کا نکاح کردیا جائے۔ لیکن اگر بلوغ کی علامتیں ظاہر نہ ہوں تو پھر بلوغ کی عمر کیا ہونی چاہئے۔ اس میں فقہا نے اختلاف کیا ہے۔ بعض نے لڑکے کیلئے اٹھارہ سال اور لڑکی کیلئے سترہ سال مقرر کیے ہیں اور بعض نے دونوں کیلئے پندرہ سال قرار دیئے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے مذہب میں فتویٰ اسی قول پر ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں پندرہ سال عمر پوری ہونے پر شرعاً بالغ قرار دیئے جائیں گے خواہ آثارِ بلوغ پائے جائیں یا نہیں۔ دوسری چیز رشد اور سمجھ ہے۔ بعض بچے بالغ ہوجاتے ہیں لیکن ان میں رشد نہیں آتی۔ بالغ ہوجانا شادی کی ضمانت تو ہوسکتا ہے لیکن کاروبار سنبھالنے اور معاملات کا بوجھ اٹھانے کیلئے تو بہرحال رشد اور سمجھ داری کی ضرورت ہے اگر یہ سمجھ داری بچے میں نہیں آتی تو اب کیا کیا جائے۔ اس کے بغیر تو اس کا مال و دولت اس کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔ ورنہ وہ مال و دولت کو ضائع کرکے اپنے آپ کو بھی تباہ کرلے گا اور دوسروں کے حقوق کو بھی نقصان پہنچائے گا۔

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ بے سمجھی اور عقلی طور پر عدمِ بلوغت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ لڑکا بالغ ہونے کے بعد بھی عقل کے اعتبار سے بالکل ہی مفلس ہے۔ پاگل یا نیم پاگل ہے۔ ایسی صورت میں تو فقہاء کا اتفاق ہے کہ جب تک اس سے جنون اور پاگل پن زائل نہ ہو اس کے اموال اس کے سپرد نہ کیے جائیں۔

بے سمجھی کی دوسری قسم وہ ہے جو بچپن کے اثر سے ہوتی ہے۔ یعنی بعض بچے بالغ ہوجاتے ہیں لیکن ابھی ان میں بچپنا ختم نہیں ہوتا۔ الھڑپن ان کے مزاج پر غالب رہتا ہے۔ ان میں دیوانگی تو نہیں ہوتی لیکن فرزانگی بھی نہیں ہوتی۔ ایسے بچے کسی کے ماتحت اور نگرانی میں تو شائد کام کرسکیں، اپنے طور پر ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہوتے، اختلاف ایسی صورتحال میں ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ کم عقلی جو بچپن کے اثر سے ہے، اس کے ختم ہونے کا زیادہ سے زیادہ دس سال تک انتظار کیا جائے۔ امید ہے پچیس سال کی عمر تک بچپن کا اثر ختم ہوجائے گا، پھر اس کے معاملات اس کے حوالے کردیئے جائیں۔ مکمل ہوشیاری اور دانشمندی کا انتظار نہ کیا جائے، وہ تو بعض لوگوں میں عمر بھر نہیں آتی۔ امام ابویوسف، امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ علیہ تعالیٰ ایسی صورت میں بھی رشد پر زور دیتے ہیں۔ محتاط رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں قاضی شرع سے رجوع کیا جائے اور قاضی پر اگر ثابت ہوجائے کہ اس میں رشد نہیں پایا جاتا، تو وہ اس کے معاملات کی نگرانی کیلئے خود کوئی مناسب انتظام کرے۔ کوئی سا انتظام بھی ہو، رشد اور سمجھ داری کی عدم موجودگی میں انتظار تو کرنا پڑے گا۔ اس انتظار کی مدت میں یہ اندیشہ پیدا ہوسکتا ہے کہ کسی مرحلے پر بھی ولی اور سرپرست کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ اس سے پہلے کہ یہ ذمہ داری میرے ہاتھ سے نکلے، میں کیوں نہ یتیم کے مال کو ختم کرنے کی کوشش کروں۔ اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ اسراف اور بدار۔ اسراف تو یہ ہے کہ یتیم کی ضروریات پر مال خرچ کیا جائے لیکن جائز حد تک نہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ۔ یتیم بچہ تو یہ سمجھے گا کہ میرا سرپرست مجھے زیادہ سے زیادہ راحت دینا چاہتا ہے۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ میرا ہی کیسہ خالی کیا جارہا ہے۔ مثلاً اگر وہ لڑکا کسی تعلیمی ادارے میں تعلیم پا رہا ہے تو اسے کونسی کیلئے اگر سائیکل کفائیت کرتی ہے تو اسے موٹر سائیکل لے دی جائے اور اگر موٹر سائیکل کافی ہے تو کار خرید دی جائے۔ بے سمجھ لڑکا تو یقیناً اس سے خوش ہوگا۔ لیکن آئندہ یہی چیزیں وجہ شکائت بنیں گی۔

Marfat.com

بِدَارًا مفہوم

بِدَارًا کا مطلب یہ ہے کہ جلد بازی سے کام لیا جائے اور ہر کام میں جلدی کا سبب یہ ہو کہ اگر بچہ بڑا ہو جائے گا تو یہ اپنے اموال ہم سے واپس لے لے گا تو اس سے پہلے کہ وہ ہم سے اس کا مطالبہ کرے یا دیکھ بھال کرنے کے قابل ہو جائے کیوں نہ جلد بازی سے اس کا مال ٹھکانے لگا دیا جائے۔ مال جلد ختم کرنے کی یہ دونوں ترکیبیں اگرچہ ہزار پردوں میں کی جاتی ہیں لیکن پروردگار چونکہ دلوں کا بھید جانتا ہے اس لئے جب وہ ان باتوں سے روک رہا ہے تو یقیناً وہ جانتا ہے کہ کن کن راہوں سے یہ کوششیں جاری رہتی ہیں۔ تو جب وہ ان پر باز پرس کرے گا تو پورے علم اور آگاہی سے کرے گا جس سے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہوگی۔ یہاں تک تو ساری بحث یتیموں کے حقوق کی ادائیگی کیلئے تھی۔ اس لئے سرپرستوں کو ان کی ذمہ داریوں کے حوالے سے بار بار تنبیہ کیا جا رہا تھا۔ لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ جس شخص نے یتیم کی تربیت اور اس کے اموال کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے وہ یقیناً ایک خدمت ہے جس میں وقت بھی صرف ہوتا ہے اور صلاحیتیں بھی کام آتی ہیں۔

سرپرستوں کو خدمت کے معاوضہ کے حوالے سے ہدایات

دونوں صورتوں میں سرپرست کو اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی اور اپنے وسائل کی فراہمی میں دشواریاں پیش آسکتی ہیں۔ اس لئے یتیموں کے حقوق کے ساتھ ساتھ سرپرستوں کے حوالے سے بھی ہدایات دی گئی ہیں کہ جو سرپرست بھی یتیموں کے حقوق ادا کرنے میں کوشاں ہیں یقیناً وہ دو طرح کے لوگ ہوں گے۔ ایک تو وہ ہوں گے جن کی اپنی مالی حالت بہت مستحکم ہے، وہ اگر اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں صرف کرتے ہیں تو ان کیلئے کسی دشواری کا باعث نہیں ہوتیں اور دوسرے وہ جنہیں اپنے معاش کی فکر بھی لاحق ہے اور اپنے اہل وعیال کی ذمہ داریاں بھی ان کا راستہ روکتی ہیں۔ اس لئے دونوں کے بارے میں ایک ہی ہدایت جاری نہیں ہو سکتی۔ پہلی طرح کے سرپرستوں کے بارے میں فرمایا کہ وہ غنی اور مالدار ہیں اس لئے یتیموں کی خدمت کے عوض میں انہیں یتیموں کے مال میں سے کچھ نہیں لینا چاہئے۔ وہ جو خدمت انجام دے رہے ہیں اس کا اجر وہ اللہ سے طلب کریں۔ اللہ کے ہاں یتیموں کی خدمت بہت بڑا اجر رکھتی ہے۔ لیکن جو سرپرست خود فقیر اور محتاج ہیں، انہیں اپنے معاش کی فکر کسی اور طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی، تو وہ اگر یتیموں کیلئے وقت نکالیں گے تو ان کے گھر کے مسائل پریشان کن صورت اختیار کر جائیں گے۔ اس لئے ایسے لوگوں کیلئے اجازت دی جا رہی ہے کہ یتیموں کے والدین اگر واقعی یتیموں کیلئے مال و دولت چھوڑ کر گئے ہیں تو اس مال و دولت میں سے ان کا سرپرست ایک ایسا معقول معاوضہ لے سکتا ہے جسے دیکھنے والا ہر فرد معقول سمجھے اور کوئی بھی یہ کہنے کی جرأت نہ کرے کہ لینے والے نے یتیم سے زیادتی کی ہے۔ اس معاوضہ کے معقول ہونے کا جہاں تک تعلق ہے اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ سرپرست کو کس طرح کی ذمہ داریاں ادا کرنا پڑ رہی ہیں۔ اگر تو یتیم کی ملکیت چند بھیڑ، بکریاں، کچھ اشیائے خوردنی، چند اونٹ یا ایسی ہی چند اور چیزیں ہیں تو ان کا معاوضہ بھی انہیں چیزوں کو دیکھ کر طے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر یتیم کسی کارخانے کا مالک ہے، اس کا باپ کوئی مل چلا رہا تھا یا کوئی وسیع کاروبار رکھتا تھا جس کیلئے ہمہ وقتی نگرانی کی ضرورت تھی تو ظاہر ہے کہ یتیم کے سرپرست کیلئے جزوقتی دیکھ بھال کافی نہیں ہوگی۔ اسے اپنا پورا وقت صرف کرنا پڑے گا اور اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہوگا اور پھر اس معاوضے کے تعین میں جہاں ہمہ وقتی خدمت کو دیکھا

Marfat.com

جائے گا وہاں مقامی حالات اور سرپرست کے معیارِ زندگی کو بھی دیکھ کر معاوضے کا تعین کرنا پڑے گا۔ یہ ساری چیزیں مل کر یہ بتائیں گی کہ سرپرست جو کچھ لے رہا ہے وہ معقول ہے یا نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد، حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے۔ تو آپ دوسرے روز حسبِ معمول اپنے کپڑے کی تجارت کیلئے نکلے۔ راستے میں حضرتِ عمر فاروق ملے، انہوں نے پوچھا آپ کہاں جارہے ہیں؟ انہوں نے انہیں بتایا کہ میں اپنے کاروبار کیلئے جارہا ہوں۔ اگر میں کاروبار نہیں کروں گا تو اپنے بچوں کو کہاں سے کھلاؤں گا۔ حضرت عمر نے کہا کہ اگر آپ کاروبار کریں گے تو خلافت کی ذمہ داریوں کا بار کون اٹھائے گا؟ تو بڑے بڑے صحابہ کی ایک میٹنگ بلائی گئی۔ غالباً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ آپ چونکہ کمائی سے مستغنی نہیں ہیں، اس لئے آپ بھی امت سے معاوضہ لیں۔ لیکن معاوضہ اتنا ہی ہونا چاہئے جتنا ایک یتیم کا سرپرست لیتا ہے۔ چنانچہ آپ کیلئے جو روزینہ مقرر کیا گیا، وہ شائد ایک مزدور کے روزینہ سے بھی کم تھا۔ آپ مدتِ خلافت میں یہ معاوضہ لیتے رہے، لیکن انتقال کے وقت وصیت فرمائی کہ میرا امکان بیچ کر یہ ساری رقم واپس کردی جائے۔ مجھے شرم آتی ہے کہ جب میں اپنے اللہ کے سامنے جاؤں، تو کیا میں یہ کہوں کہ میں حضور کی امت کی خدمت معاوضہ لے کر کرتا رہا ہوں۔

آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ یتیموں کے بالغ اور سمجھدار ہونے کے بعد جب تم ان کے مال ان کے حوالے کرنے لگو تو اس پر کچھ ثقہ اور معتبر لوگوں کو گواہ بھی بنالو کیونکہ جب یتیموں کے مال ان کے سپرد کئے جاتے ہیں تو عموماً ایک محبت کی فضا موجود ہوتی ہے لیکن انسانی نفس انسانی معاملات میں ہمیشہ اونچ نیچ کا شکار رہتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر سے اگر یتیم کو بہکانے کی کوشش کی گئی تو کوئی تعجب نہیں کہ یہ لڑکا اپنی یتیمی کے زمانے کو بھول جائے اور اسے بالکل یاد نہ رہے کہ میرے سرپرست نے مجھ پر کیا احسانات کیے تھے۔ بدگمانیوں کی اڑائی ہوئی دھول ایسی اس کی آنکھوں میں پڑے کہ وہ سامنے کی بات کو بھی نہ دیکھ سکے اور نتیجہ اس کا یہ ہو کہ وہ اپنے محسن سے الجھ پڑے یا بدگمان ہوجائے۔ ایسی ممکن صورتحال سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ گواہوں کی موجودگی میں اموال کے سپرد کرنے کی کارروائی عمل میں آئے تاکہ کسی سوئے ظن اور نزاع کا احتمال باقی نہ رہے۔ آیت کے آخری جملے میں سب سے اہم بات ارشاد فرمائی کہ گواہوں کی موجودگی میں اموال کی سپردگی سے بظاہر ہر طرح کی خرابی کا امکان ختم ہوجائے گا اور ولی اور سرپرست اہلِ دنیا کی نگاہوں میں سرخرو ہوجائیں گے۔ لیکن یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہئے کہ اصل حساب لینے والی ذات تو "اللہ" ہے۔ یہاں بہت ساری چیزوں پر پردہ ڈالا جاسکتا ہے۔ لیکن اللہ کے علم سے کوئی بات چھپائی نہیں جاسکتی۔ جب وہ حساب لے گا تو ایک ایک بات کھل جائے گی۔ اس لئے فکر درحقیقت اسی حساب کی ہونی چاہئے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ○

(والدین اور اقربا کے ترکے میں سے مردوں کیلئے بھی ایک حصہ ہے اور والدین اور اقربا کے ترکے میں سے عورتوں کا بھی ایک حصہ ہے خواہ ترکہ کم ہو یا زیادہ، حصہ مقرر کیا ہوا ہے) (النسآء : ۷)

Marfat.com

یتیموں کے تحفظ کی برکت

گزشتہ آیات میں یتیموں کے حقوق کے بارے میں ہدایات پڑھتا ہوا جب آدمی یہاں پہنچتا ہے تو اسے دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ جس دنیا میں یتیموں کو حقوق میسر نہیں تھے، جب اللہ کی رحمت جوش میں آئی تو جہاں یتیموں کو حقوق ملے وہیں ان کی برکت سے دوسروں کے حقوق کی بھی راہ کھل گئی۔ عجیب بات ہے کہ جو خود حقوق سے محروم تھے انہیں حقوق کیا ملے وہ دوسروں کیلئے بھی حقوق کا باعث بنے۔ یہ آیات کریمہ درحقیقت تمہید ہے اس قانونِ وراثت کی جس کی تفصیل اگلے رکوع میں آرہی ہے۔ جس میں مردوں، عورتوں اور بچوں پر ہونے والے ان تمام مظالم کا سدباب کر دیا ہے جو وراثت کے حوالے سے صدیوں سے انسانوں پر انسانوں کے ہاتھوں ہو رہے تھے۔

قانونِ وراثت کی تمہید اور اس کے متعلق ہدایات

اسلام سے پہلے صرف جزیرۂ عرب میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں ایک ہمہ نوع ظلم کی چادر تنی ہوئی تھی جس نے پوری نوعِ انسانی کو اپنے سائے میں لے رکھا تھا۔ کمزور آدمی، صنفِ نازک اور یتیم بچے بالخصوص ان مظالم کا شکار تھے۔ عرب میں تو یہ اصول مروج تھا کہ ہر شخص وراثت کا استحقاق نہیں رکھتا۔ وراثت کا مستحق صرف وہ شخص ہے جو گھوڑے پر سوار ہو کر دشمنوں کا مقابلہ کر کے ان سے مالِ غنیمت چھین سکتا ہو۔ بچے چونکہ اپنی چھوٹی عمر کے باعث شاہسواری کا فرض انجام نہیں دے سکتے تھے اس لئے وہ وراثت کا استحقاق نہیں رکھتے تھے۔ عورتیں بھی اپنی صنفی کمزوری کے باعث یہ فرض انجام دینے سے قاصر تھیں اس لئے انہیں بھی کسی طرح وراثت میں حصہ دار نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ صرف جوان اور بالغ لڑکا وراثت کا حق رکھتا تھا۔ اسلام آجانے کے بعد بھی جب تک کہ وراثت کے احکام نازل نہیں ہو گئے مسلمانوں میں بھی اسی طریقے سے وراثت تقسیم ہوتی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ایک واقعہ پیش آیا کہ حضرتِ اوس بن ثابت شہید ہو گئے اور اپنے پیچھے دو لڑکیاں ایک لڑکا نابالغ اور ایک بیوی وارث چھوڑے۔ مگر عرب کے قدیم دستور کے مطابق ان کے دو چچازاد بھائیوں نے آکر مرحوم کے پورے مال پر قبضہ کر لیا اور اولاد اور بیوی میں سے کسی کو کچھ نہ دیا کیونکہ ان کے نزدیک عورت تو مطلقاً مستحقِ وراثت نہ سمجھی جاتی تھی۔ خواہ بالغ ہو یا نابالغ اس لئے بیوی اور دونوں لڑکیاں تو یوں محروم ہو گئیں اور لڑکا بوجہ نابالغ ہونے کے محروم کر دیا گیا۔ لہٰذا پورے مال کے وارث دو چچازاد بھائی ہو گئے۔ اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوہ نے یہ بھی چاہا کہ یہ چچازاد بھائی جو پورے ترکے پر قابض ہو گئے ہیں ان دونوں لڑکیوں سے شادی کر لیں تو چلئے میری فکر ختم ہو جائے مگر انہوں نے اسے بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ تب اوس بن ثابت کی بیوہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی گزارش پیش کی اور شکائت کی کہ حضور ان بچیوں کے پاس چونکہ کوئی مال نہیں رہا تو ان سے شادی کون کرے گا؟ چنانچہ حضور نے وحی کے انتظار میں جواب دینے میں توقف کیا تب یہ آیاتِ کریمہ نازل ہوئیں۔

اس آیتِ کریمہ میں غور کیجئے! اس میں متعدد احکام دیئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا جو حکم دیا گیا ہے اس میں صدیوں پرانا ظلم ختم کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے بھی میں عرض کر چکا ہوں کہ میراث میں صرف مردوں کا حصہ سمجھا جاتا تھا عورتوں یا نابالغ بچوں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ سب سے پہلا یہ حکم دیا کہ جس طرح مردوں کو والدین یا اقربا کے ترکہ سے حصہ ملے گا اسی طرح عورتوں کو بھی ان کے والدین اور اقربا کے ترکہ

Marfat.com

سے حصہ ملے گا اور صدیوں پرانی رسم کو توڑنے کیلئے پوری وضاحت سے کام لیا۔ مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے ایک ہی جملے میں حکم دیا جاسکتا تھا۔ لیکن مردوں کا حکم الگ ذکر فرمایا اور عورتوں کے حصے کا الگ حکم دیا تاکہ کسی طرح کا اشتباہ باقی نہ رہے۔

اَقْرَبُوْنَ کا لفظ کہہ کر ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازلہ فرمایا۔ لوگ اپنی وراثت میں یا تو ان لوگوں کو شامل کرتے تھے جن سے معاشرتی یا سماجی تعلقات زیادہ گہرے ہوتے تھے اور یا پھر یہ سمجھتے تھے کہ مالِ وراثت کی تقسیم ضرورت کے معیار سے ہونی چاہئے۔ وارثوں میں جو زیادہ ضرورت مند ہے اسے وراثت میں حصہ دار بنانا چاہئے۔ یہاں بتایا جارہا ہے کہ مالِ وراثت کی تقسیم ضرورت کے معیار سے نہیں بلکہ قرابت کے معیار سے ہوتی ہے۔ جو شخص میت کے ساتھ رشتہ میں قریب تر ہوگا وہ بعید کی نسبت زیادہ مستحق ہوگا۔ اگرچہ ضرورت اور حاجت کے اعتبار سے بعید زیادہ محتاج ہو کیونکہ اگر ضرورت اور حاجت کو مالِ وراثت کی تقسیم میں معیار بنایا جاتا تو یہ کبھی بھی اصول نہیں بن سکتا تھا کیونکہ ضرورت بدلتی رہتی ہے۔ آج ایک شخص ضرورت مند اور فقیر ہے کل کو وہ غنی اور دولت مند ہوجاتا ہے اور آج ایک شخص غنی ہے تو وقت کا کوئی حادثہ اسے کل کو فقیر بنا سکتا ہے۔ اس لئے یہ بات مستقل اصول بننے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ مستقل اصول یہی ہے کہ رشتے داری میں جو زیادہ قریب ہے وہی وارث بننے کا حق رکھتا ہے۔ اسی اصول کی بنیاد پر یتیم پوتے کو وراثت سے محروم رکھا گیا ہے۔ یتیم پوتا بہ نسبت بیٹے کے زیادہ حاجت مند بھی ہو تب بھی مستحق وراثت بیٹا ہے پوتا نہیں۔ البتہ بیٹے کی ضرورت رفع کرنے کیلئے شریعت نے دوسرے انتظامات کیئے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں ایک اور قانونی حکم یہ دیا گیا ہے کہ میراث بہر حال تقسیم ہونی چاہئے خواہ وہ کتنی ہی کم ہو۔ حتی کہ اگر مرنے والے نے ایک گز کپڑا چھوڑا ہے اور دس وارث ہیں تو اسے بھی دس حصوں میں تقسیم ہونا چاہئے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک وارث دوسروں وارثوں سے ان کا حصہ خرید لے عربوں میں یہ بھی ایک جاہلانہ رسم پائی جاتی تھی کہ مال کی بعض اقسام خاص وارثوں کیلئے مخصوص کردی جاتی تھیں، دوسرے وارثوں کو اس سے محروم کردیا جاتا تھا۔ مثلاً گھوڑا، تلوار اور دوسرا اسلحہ یہ اگر مالِ وراثت میں موجود ہوتا تو یہ صرف نوجوان مردوں کا حق تھا۔ نابالغ بچوں کو تو خیر ویسے ہی وراثت نہیں دی جاتی تھی۔ بڑی عمر کے لوگ اگرچہ وراثت سے حصہ پاتے تھے لیکن اسلحہ وغیرہ سے ان کو کوئی حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اسی طرح یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ ہر طرح کی وراثت قابلِ تقسیم نہیں ہوتی۔ یعنی وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال واملاک پر جاری نہیں ہوتا۔ اسی لئے غیر منقولہ زرعی اراضی یا صنعتی ادارے وغیرہ وراثت کے طور پر تقسیم نہیں ہوتے تھے اور آج بھی بعض مذاہب میں تقسیم نہیں ہوتے۔ اسلام نے ان مظالم کی جڑ کاٹ دی تھی لیکن مسلمانوں نے جاہلیتِ قدیمہ کو پھر زندہ کردیا ہے۔ کسی جاگیر کو وراثت نہیں بننے دیا جاتا۔ عام زمیندار بھی اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو اپنی زمینوں سے حصہ دینے کے روادار نہیں ہوتے۔

تَرَكَ کے لفظ پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ میراث کا حق زندگی میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی مورث مال چھوڑ کر مرتا ہے۔ اس لئے کسی اولاد کیلئے ہرگز زیبا نہیں کہ وہ زندگی میں اپنے والدین سے وراثت کا حصہ مانگے۔

آیتِ کریمہ کا آخری جملہ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وراثت کے ذریعے جو ملکیت وارثوں کی طرف منتقل ہوتی ہے ملکیت جبری ہے۔ نہ اس میں وارث کا قبول کرنا شرط ہے نہ اس کا اس پر راضی ہونا ضروری ہے بلکہ اگر وہ زبان سے بصراحت یوں بھی کہے کہ میں اپنا حصہ نہیں لیتا، تب بھی وہ شرعاً اپنے حصے کا مالک ہوچکا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ مالک بن کر شرعی قاعدہ کے مطابق کسی دوسرے کو ہبہ کردے یا بیچ ڈالے یا تقسیم کردے۔

Marfat.com

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَۃَ اُولُوا الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنُ فَارْزُقُوْھُمْ مِّنْہُ وَقُوْلُوْا لَھُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا o

اور جب تقسیم کے موقعہ پر قرابت دار اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو
اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو) (النسآء : ۸)

گزشتہ آیات سے یہ تو واضح ہو گیا اور اس کی تفصیل اگلے رکوع میں آ رہی ہے کہ وراثت میں ہر حصہ دار کا حصہ مقرر کر دیا گیا ہے اور وارث بھی اللہ کی جانب سے طے فرما دیئے گئے ہیں۔ اب نہ کوئی نیا وارث بن سکتا ہے اور نہ کسی کے حصے میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود یہ بات بہر حال ممکن ہے کہ جب مالِ وراثت تقسیم کیا جانے لگے تو جن رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کا حق اس مالِ وراثت میں نہیں وہ بے خبری کے باعث یا تنگدستی کے سبب اس تقسیم کے وقت پہنچ جائیں۔ لاریب ان کے آ جانے سے وراثت کی تقسیم میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی اور وارث اپنا حصہ وصول کرنے کے ہر طرح مستحق ہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ لوگ اگرچہ مالِ وراثت میں حصہ نہیں رکھتے لیکن وہ قرابت داری کا تعلق تو رکھتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان سے زیادہ قریب قرابت داری کا تعلق رکھنے والوں کی موجودگی کی وجہ سے یہ وراثت سے محروم رہ گئے۔ لیکن اپنی قرابت داری کے باعث اس بات کے مستحق تو ضرور ہیں کہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے۔ اسی طرح جو یتیم بچے اور مسکین لوگ ضرورت کے تحت کچھ امیدیں لے کر آ گئے ہیں ان کی دل شکنی کرنا بھی کسی طرح مناسب نہیں اسلئے اس آیتِ کریمہ میں ایک طرح سے سفارش کی جا رہی ہے کہ جن قرابت داروں یتیموں اور مسکینوں کا تمہارے مالِ وراثت میں کوئی حق نہیں لیکن وہ اپنی نسبتوں کے باعث کچھ امیدیں لے کر آ گئے ہیں تو دل بڑا کر کے ان کو اپنے اپنے حصے سے کچھ نہ کچھ دینے کی کوشش کیجئے۔ پروردگار نے بغیر کسی مشقت اور محنت کے تمہیں مالِ وراثت کی صورت میں بہت کچھ عطا فرمایا ہے تو تم ان ضرورت مندوں کو خالی ہاتھ مت لوٹاؤ، تھوڑا تھوڑا کر کے بھی دو گے تو ہو سکتا ہے ان کی دلجوئی کا سامان ہو سکے۔ لیکن اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ انہیں بھی پورا حصہ ملنا چاہئے تو تم انہیں مناسب طریقے اور شیریں کلامی سے سمجھانے کی کوشش کرو، کوئی سخت جملہ کہہ کر ان کی دل آزاری مت کرو۔ کس قدر حکیمانہ قرآنی نظام ہے کہ ایک طرف میراث کے حوالے سے ایسے احکام دیئے جا رہے ہیں جو سراسر عادلانہ ہیں لیکن ساتھ ہی ان ضرورت مندوں کی دل جوئی کا بھی حکم دیا جا رہا ہے جو اگرچہ وراثت میں اپنا حصہ تو نہیں رکھتے لیکن ان کی حالت کی رعائیت بہر حال ضروری ہے۔ یہاں ایک بات یاد رہے کہ ان لوگوں کو تبرعاً جو کچھ بھی دیا جائے وہ مجموعی مال میں سے نہ دیا جائے کیونکہ وارثوں میں تو نابالغ وارث بھی شامل ہوں گے۔ وہ جب تک بالغ نہ ہوں، اس وقت تک ان کے حصے میں سے کچھ نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے جو بالغ ورثا ہوں، وہ اپنے اپنے حصے میں سے جو دینا چاہیں دل کھول کر دیں، اللہ ان کو جزا دے گا۔

وَلْیَخْشَ الَّذِیْنَ لَوْ تَرَکُوْا مِنْ خَلْفِھِمْ ذُرِّیَّۃً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَیْھِمْ
فَلْیَتَّقُوا اللّٰہَ وَلْیَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا o

(ان لوگوں کو ڈرنا چاہئے جو اپنے پیچھے اگر کمزور بچے چھوڑتے ہیں تو ان کے معاملے میں بہت اندیشہ ناک ہوتے ہیں، پس انہیں چاہئے کہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات کہیں) (النسآء: ۹)

Marfat.com

گزشتہ آیات میں یتیموں کے حقوق کے تحفظ اور ان کی ادائیگی کے سلسلے میں احکام بھی دیئے گئے اور نصیحتیں بھی فرمائی گئی ہیں۔ یتیموں کے حقوق کی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں تک نصیحت فرمائی گئی کہ اگر وہ وارثوں میں شامل نہ بھی ہوں لیکن وراثت کی تقسیم کے وقت کسی طرح پہنچ جائیں تو اپنی طرف سے کچھ ہدیہ دے کر ان کی دل داری کی کوشش ضرور کرنا اور ان سے گفتگو کرتے ہوئے ایسا لب ولہجہ اختیار نہ کرنا، جس سے ان کی دل آزاری ہو۔ پیشِ نظر آیت میں اسی سلسلہ میں مزید تاکید فرمائی گئی ہے اور اس میں نفسیاتی حوالے سے نصیحت کو مزید موٴثر بنا دیا گیا ہے فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ یتیموں کے سرپرست ہیں یا وہ لوگ جنہیں مالِ وراثت میں سے حصہ ملا ہے لیکن کچھ دوسرے یتیم بچے وارث نہ ہونے کی وجہ سے حصہ نہ پاسکے تو سرپرستوں اور مالِ وراثت میں حصہ پانے والوں کو ان بچوں کے ساتھ طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے یہ سوچنا چاہیے کہ اگر ہمیں موت آجاتی اور ہم اپنے پیچھے انہیں کی طرح بے بس یتیم بچے چھوڑ جاتے اور ان کے ساتھ کوئی سخت طرزِ عمل اختیار کرتا یا گفتگو میں نامناسب الفاظ استعمال کرتا تو ان بچوں پر کیا قیامت ٹوٹتی۔ اس لئے دوسروں کے یتیم بچوں کو بھی اپنے ہی بچے سمجھو اور ان سے معاملہ کرتے ہوئے اپنے بچوں کو ذہن میں لاؤ۔ تاکہ تمہارے دلوں میں ان کیلئے جذبۂ رحمت بیدار ہو اور اس رویے کو متعین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا۔ ان لوگوں کو چاہیے کہ اللہ سے ڈریں کیونکہ اللہ ہر عمل کو دیکھتا بھی ہے اور طرزِ عمل کو پہچانتا بھی ہے۔ اور اس کے پس منظر میں جو محرکات کام کرتے ہیں ان سے بھی بخوبی واقف ہے۔ اگر اللہ کے حوالے سے یہ احساسات دلوں میں زندہ ہوں گے تو پھر یتیموں پر ظلم نہیں ہوسکتا۔ مزید فرمایا کہ عمل تو بعد کی بات ہے فوری واسطہ تو زبان سے پڑتا ہے۔ اس لئے ان یتیموں سے بات کرتے ہوئے زبان کو نرم رکھو۔ نہ تو کوئی سخت بات کہو اور نہ پرپیچ بات۔ بلکہ ایسی سیدھی سادھی بات کرو جسے بچے آسانی سے سمجھیں اور راحت محسوس کریں۔

آدمی کی طبیعت دو طرح کی باتوں سے متاثر ہوتی ہے۔ کبھی ترغیب سے اور کبھی ترہیب سے۔ اس آیتِ کریمہ میں ترغیب سے کام لیا گیا ہے اور اگلی آیت میں ترہیب سے کام لیتے ہوئے اس مضمون کی آخری بات کہی جارہی ہے۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ
فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۟

(جو لوگ ظلم و ناانصافی سے یتیموں کا مال کھا رہے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں وہ انجام کار دوزخ کی بھڑکتی آگ میں پڑیں گے) (النسآء: ۱۰)

یتیموں کے مال کھانے والوں کو تہدید

جو لوگ یتیموں کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہیں اور مختلف طریقوں سے ان کا مال ہڑپ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یا زبردستی اور ظلم سے ان کے مال پر قبضہ کرلیتے ہیں وہ ممکن ہے اس کو مالی فتوحات میں شمار کرتے ہوں اور اسے اپنے لئے بہت بڑی کامیابی سمجھتے ہوں لیکن انہیں اندازہ نہیں کہ اس دنیا کے بعد ایک اور دنیا بھی ہے۔ وہاں جاکر پتہ چلے گا کہ یتیموں کا مال چاہے کسی صورت میں بھی ہو حقیقت میں جہنم کے انگارے ہیں۔ جو قیامت کے دن اپنی اصل شکل میں بھڑک اٹھیں گے۔ اکثر اہلِ علم اسے مجاز اور کنایہ کہتے ہیں۔ لیکن بعض اہلِ تحقیق ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ مجاز یا کنایہ نہیں بلکہ حقیقت ہے یہ الگ بات ہے کہ آج ہمیں وہ آگ دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن قیامت کے

Marfat.com

دن جب ہر چیز اپنی اصل شکل میں سامنے آجائے گی تو تب پتہ چلے گا کہ یہ آگ ہی تھی جو یتیموں کے مال کی صورت میں ہم نے ہتھیائی تھی۔اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھنا چاہئے کہ دیا سلائی کو جلنے سے پہلے آگ نہیں کہا جاتا لیکن اس کے آگ ہونے میں کیا شبہ ہے۔سنکھیے کو کھانے سے پہلے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ موت ہے۔لیکن جس کی نگاہ اس کے اثر اور نتیجے پر ہے وہ یقین سے جانتا ہے کہ وہ موت ہی کا باعث ہے۔آج اگر کسی کمرے میں سوئی گیس بھر جائے تو بد بو سونگھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کمرے میں سوئی گیس بھر گیا ہے لیکن ایک شعلہ جلنے کی دیر ہے جب بھک سے آگ بھڑکے گی تب پتہ چلے گا کہ جسے ہم سوئی گیس کہہ رہے تھے وہ تو آگ تھی۔اسی طرح یتیموں کا مال بھی درحقیقت آگ ہی ہے اور آنحضرت ﷺ نے قیامت کے دن دیئے جانے والے عذاب کی ایسی ہی خبریں دی ہیں۔جن میں اس تعبیر کی تائید ہوتی ہے۔مثلاً آپ نے فرمایا کہ یتیم کا مالِ ناحق کھانے والا قیامت کے روز اس حالت میں اٹھایا جائے گا کہ پیٹ کے اندر کی آگ کی لپٹیں اس کے منہ ناک اور کانوں اور آنکھوں سے نکل رہی ہوں گی۔ایک اور حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایک قوم قیامت کے دن اس طرح اٹھائی جائے گی کہ ان کے منہ سے آگ بھڑک رہی ہوگی۔صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: تم نے قرآن کریم میں نہیں پڑھا اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا ۔ الخ

یتیموں کے ساتھ عموماً مالِ وراثت کے حوالے سے ظلم ہوتا ہے اور ویسے بھی یہاں سے وراثت کے مسائل شروع ہو رہے ہیں اور ان تین آیتوں میں احکامِ میراث کی تمہید ہی اٹھائی گئی ہے۔اس لئے احکامِ میراث کو شروع کرنے سے پہلے ہم چند مسائل کا ذکر کرتے ہیں جو وراثت کی تقسیم یا یتیموں کے حقوق میں پیش آتے ہیں اور بے خبری یا لاپرواہی کے باعث اس میں غلطیاں روا رکھی جاتی ہیں۔ہم ان مسائل کو "معارف القرآن" سے نقل کر رہے ہیں۔

مسئلہ: میت کے بدن کے کپڑے بھی ترکہ میں شامل ہوتے ہیں ان کو حساب میں لگائے بغیر یونہی صدقہ کر دیتے ہیں۔بعض علاقوں میں تانبے، پیتل کے برتن مال کو تقسیم کئے بغیر فقیروں کو دیدیتے ہیں۔حالانکہ ان سب میں نابالغوں اور غیر حاضر وارثوں کا بھی حق ہوتا ہے۔پہلے مال بانٹ لیں جس میں مرنے والے کی اولاد، بیوی، والدین، بہنیں، جس جس کو شرعاً حصہ پہنچتا ہو اس کو دیدیں، اس کے بعد اپنی خوشی سے جو شخص چاہے مرنے والے کی طرف سے خیرات کرے یا مل کر کریں تو صرف بالغین کریں نابالغ کی اجازت کا بھی اعتبار نہیں اور جو وارث غیر حاضر ہو اس کے حصہ میں اس کی اجازت کے بغیر بھی تصرف درست نہیں۔

مسئلہ: میت کو قبرستان لے جاتے وقت جو چادر جنازہ پر ڈالی جاتی ہے وہ کفن میں شامل نہیں ہے۔اس کو میت کے مال سے خریدنا جائز نہیں بلکہ وہ مال مشترک ہے کوئی شخص اپنی طرف سے خرچ کر دے تو جائز ہے بعض علاقوں میں نمازِ جنازہ پڑھانیوالے امام کیلئے کفن ہی کے کپڑے میں سے مصلّٰی تیار کیا جاتا ہے اور پھر یہ مصلّٰی امام کو دیدیا جاتا ہے۔یہ خرچ بھی کفن کی ضرورت سے فاضل ہے ورثہ کے مشترک مال میں سے اس کا خریدنا جائز نہیں۔

مسئلہ: بعض جگہ میت کے غسل کے لئے نئے برتن خریدے جاتے ہیں پھر ان کو توڑ دیا جاتا ہے۔اول تو نئے خریدنے کی ضرورت نہیں کیونکہ گھر کے موجودہ برتنوں سے غسل دیا جاسکتا ہے اور اگر خریدنے کی ضرورت پڑ جائے تو توڑنا جائز نہیں۔اول تو اس میں مال ضائع کرنا ہے اور پھر ان سے یتیموں کا اور غائب وارثوں کا حق وابستہ ہے۔

Marfat.com

مسئلہ: ترکہ کی تقسیم سے پہلے اس میں سے مہمانوں کی خاطر تواضع اور صدقہ و خیرات کچھ جائز نہیں۔ اس طرح کے صدقہ خیرات کرنے سے مردے کو کوئی ثواب نہیں پہنچتا بلکہ ثواب سمجھ کر دینا اور بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ اس لئے مورث کے مرنے کے بعد اب یہ سب مال تمام وارثوں کا حق ہے اور ان میں یتیم بھی ہوتے ہیں۔ اس مشترک مال میں سے دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کا مال چرا کر میت کے حق میں صدقہ کر دیا جائے۔ پہلے مال تقسیم کر دیا جائے اس کے بعد اگر وہ وارث اپنے مال میں سے اپنی مرضی سے میت کے حق میں صدقہ خیرات کریں تو ان کو اختیار ہے۔

تقسیم سے پہلے بھی وارثوں سے اجازت لے کر مشترک ترکہ میں سے صدقہ خیرات نہ کریں اس لئے کہ جو ان میں یتیم ہیں ان کی اجازت تو معتبر ہی نہیں اور جو بالغین ہیں وہ بھی ضروری نہیں کہ خوش دلی سے اجازت دیں ہوسکتا ہے وہ لحاظ کی وجہ سے اجازت دینے پر مجبور ہوں یا لوگوں کے طعنوں کے خوف سے کہ اپنے مردہ کے حق میں دو پیسے تک خرچ نہ کئے۔ اس عار سے بچنے کے لئے بادلِ نخواستہ ہامی بھر لیں حالانکہ شریعت میں صرف وہ مال حلال ہے جب کہ دینے والا طیب خاطر سے دے رہا ہو۔

یہاں ہم ایک بزرگ کا واقعہ نقل کرتے ہیں، جس سے مسئلہ اور زیادہ واضح ہو جائے گا۔ یہ بزرگ ایک مسلمان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تھوڑی دیر مریض کے پاس بیٹھے تھے کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔ اس موقع پر جو چراغ جل رہا تھا انہوں نے فوراً اسے بجھا دیا اور اپنے پاس سے پیسے دے کر تیل منگایا اور روشنی کی لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا جب تک یہ شخص زندہ تھا یہ چراغ اس کی ملکیت تھی اور اس کی روشنی استعمال کرنا درست تھا۔ اب یہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا تو اس کی ہر چیز میں وارثوں کا حق ہو گیا۔ لہٰذا سب وارثوں کی اجازت ہی سے ہم یہ چراغ استعمال کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اپنے پیسوں سے تیل منگوا کر روشنی کی۔"

یہ تو وہ مسائل تھے جن کا تعلق تقسیم میراث یا یتیموں کے حقوق سے تھا۔ اب ہم چند ایسے امور کا ذکر کرتے ہیں جنہیں تقسیم میراث سے پہلے انجام دینا ضروری ہے۔ جن کا تعلق مرحوم کے ترکہ سے ہے یا مرحوم کی ذات سے ہے۔ مسائل سے بے خبری کے باعث عموماً ایسے امور میں غلطیاں ہوتی ہیں ان غلطیوں کا تعلق چونکہ ہمارے دین سے ہے اور اس کا ہماری عاقبت پر اثر بھی پڑ سکتا ہے اس لئے بہت ضروری ہے کہ ان امور میں شرعی احکام کو سمجھ لیا جائے۔

ا۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مرنے والے کے کفن دفن کی ذمہ داری اس کے وارثوں پر ہوتی ہے۔ اگر مرنے والے نے کوئی ترکہ نہیں چھوڑا تو پھر تو وارث اس کے ذمہ دار ہیں کہ تکفین اور تدفین پر اپنی طرف سے خرچ کریں۔ لیکن اگر مرنے والے نے اتنا ترکہ چھوڑا ہے جس سے تکفین اور تدفین کے اخراجات ادا کیئے جا سکتے ہیں تو پھر وارثوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ مجموعی مالِ میراث سے مرنے والے کی تکفین اور تدفین کے اخراجات کریں لیکن یہ اخراجات کرتے ہوئے بیحد ضروری ہے کہ نہ کنجوسی سے کام لیا جائے اور نہ فضول خرچی کی جائے۔ مرحوم کی مالی حیثیت اور اسلوبِ زندگی کے مطابق تکفین اور تدفین پر خرچ ہونا چاہیئے۔ بہت مہنگا کفن خریدنا کسی طرح بھی مناسب نہیں اور قبر کو پختہ کرنا اور پھر اس پر کسی عمارت کا اٹھانا سراسر سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے۔

۲: تکفین و تدفین کے بعد عموماً تین دن سوگ کے ہوتے ہیں۔ انہی دنوں میں ایصالِ ثواب کیلئے عموماً مرحوم کے مجموعی ترکہ میں سے خرچ کرنے کا معمول لوگوں نے بنا لیا ہے۔ یہ سراسر ناجائز ہے۔ مرحوم کے ورثا اگر کچھ خیرات کرنا چاہتے ہیں یا ایصالِ ثواب کے نام

Marfat.com

سے کچھ رسمیں ادا کرنا چاہتے ہیں تو ان کیلئے نہایت ضروری ہے کہ مالِ میراث میں سے کچھ لینے سے احتراز کریں۔ کیونکہ عموماً وارثوں میں نابالغ بچے بھی ہوتے ہیں۔ اگر ایصالِ ثواب کیلئے ان سے اجازت لے بھی لی جائے (نابالغ ہونے کی وجہ سے چونکہ ان کی اجازت معتبر نہیں) تب بھی ان کے مال کو خرچ کرنا جائز نہیں۔ البتہ بالغ ورثا اگر آپس میں مشورے سے ایصالِ ثواب کرنا چاہیں، تو کر سکتے ہیں۔ لیکن اس میں تشویش کی بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے ان وارثوں میں سے کسی نے بجائے خوشدلی سے اجازت دینے کے محض بدنامی سے بچنے کیلئے اجازت دی ہو جبکہ شریعت نے بہ طیب خاطر یعنی خوشدلی سے اجازت دینے کی شرط رکھی ہے۔ اگر شبہ بھی ہو تو ایسے مال سے ایصالِ ثواب نہیں ہوتا اس لئے اس معاملے میں بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔

۳: تقسیمِ میراث سے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ مرحوم کے ذمہ کوئی قرض تو نہیں اور اگر اس کے ذمہ کوئی قرض ہے تو سب سے پہلے قرض کی ادائیگی ضروری ہے۔ اگر یہ قرض اتنا ہے کہ تمام مالِ میراث اس میں صرف ہو جاتا ہے اور وارثوں کیلئے کچھ بھی نہیں بچتا تو اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔ قرض کا ادا کرنا بہر حال فرض ہے، ورنہ قیامت کے دن مرنے والے سے جب اس کا مطالبہ کیا جائے گا تو یہ چیز اس کے لئے سخت ندامت اور عذاب کا باعث ہوگی

۴: اگر مرنے والا شوہر ہو اور اس کی بیوی زندہ ہو تو یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس نے بیوی کا حق مہر ادا کیا تھا یا نہیں اور اگر اس نے ادا نہیں کیا تھا اور بیوی نے معاف بھی نہیں کیا تو یہ حق مہر شوہر کے ذمہ قرض ہے اس لئے تقسیمِ میراث سے پہلے یہ قرض بیوی کو دلایا جائے گا۔

۵: قرض نہ ہونے کی صورت میں یا قرض کی ادائیگی کے بعد اگر مرنے والے نے کوئی وصیت چھوڑی ہو تو پھر دیکھا جائے گا کہ یہ وصیت کسی گناہ کی وصیت تو نہیں۔ یعنی ایسے کسی کام کو سرانجام دینے کی اس نے وصیت کی ہو جس کی شریعت میں اجازت نہیں۔ مثلاً وہ یہ وصیت چھوڑ جائے کہ میرے مال سے کوئی بے حیائی کا مرکز بنایا جائے، کوئی ایسا ریس گراؤنڈ بنایا جائے جس میں ریس کے گھوڑے دوڑائے جائیں، کوئی قحبہ خانہ کھولا جائے، یا ایسا کوئی تعلیمی ادارہ جس میں اسلامی اقدار کو تباہ کرنے کی کوشش کی جائے، اسلامی ثقافت کو جس سے کوئی نقصان پہنچے یا کوئی ایسا مرکز جس میں اللہ کے دین، امتِ اسلامیہ یا ملک کے خلاف کام ہو۔ علیٰ ھذا القیاس ایسی کوئی وصیت جو گناہ کو غذا بہم پہنچانے والی ہو، اس پر عمل نہیں کیا جائیگا۔ اسی طرح یہ بھی دیکھا جائے گا کہ مرنے والے نے جو وراثت چھوڑی ہے یہ وصیت مجموعی وراثت کے تہائی سے زیادہ تو نہیں اور اگر تہائی سے زیادہ ہو تو صرف تہائی میں وصیت نافذ ہوگی باقی کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جائیگا کہ مرنے والے نے محض وارثوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تو وصیت نہیں کی کیونکہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرحوم اپنے وارثوں سے خوش نہیں ہوتا اس لئے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ میں ایسی کوئی وصیت کر جاؤں جس سے وارثوں کے حصے میں نامناسب کمی واقع ہو۔ ان تمام احتیاطوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے وصیت پر عمل کرنا ضروری ہے اس کے بغیر میراث کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔

ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اللہ تعالیٰ نے جب وارثوں کے حصے مقرر فرما دیئے تو پھر مرنے والے کو وصیت کا حق دینے کا کیا مطلب؟ اس لئے اس سلسلے میں چند باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔

Marfat.com

سب سے پہلی بات یہ کہ شریعت نے وارثوں میں سے کسی کے لیے وصیت کرنے کی اجازت نہیں دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَاوَصِيَّةَ لِوَارِثٍ ''وارث کیلئے کوئی وصیت نہیں''، کیونکہ اگر وارث کیلئے وصیت کرنے کا اختیار دیا جاتا تو پھر احکامِ میراث بے معنی ہو کر رہ جاتے اور اسکا مفہوم یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو پوری طرح اس بات کا شعور نہیں کہ وراثت میں کن کن لوگوں کو حصہ ملنا چاہئے اور کتنا ملنا چاہئے۔ وارث کو اس لئے وصیت کا اختیار دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ حصوں میں جو کوئی کمی بیشی ہوگئی ہے وہ اپنی طرف سے اس کا تدارک کردے، ظاہر ہے ایسا سوچنا بھی کفر ہے۔ البتہ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ وراثت کے احکام اگر چہ نہائیت حکیمانہ اصولوں پر مبنی ہیں، لیکن انسانوں پر آنے والی ناگہانی آفات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ضروریات اور رشتوں کے گوناں گوں مصالح اور ملت کے رفاہی، تہذیبی، اور تمدنی تقاضے اپنی جگہ ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تمام کو اصولِ میراث میں سمونا ممکن نہیں، اس لئے ضروری تھا کہ ان تمام ضرورتوں کی بجا آوری کیلئے مرنے والے کو وصیت کا حق دیا جاتا اور اس کیلئے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی کی حد مقرر کردی جاتی تاکہ وہ اپنی طرف سے اس ضرورت کو پورا کرسکے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اسلام میں تقسیمِ میراث کا یہ اصول ٹھہرایا گیا ہے کہ میراث کی تقسیم ضرورت کی بنیاد پر نہیں بلکہ رشتے میں قربت کی بنیاد پر ہوگی۔ کوئی شخص قرابت داروں میں زیادہ ضرورت مند ہے، لیکن رشتے میں اس سے زیادہ دوسرا شخص قریب ہے، تو وراثت اقرب کو ملے گی، زیادہ محتاج کو نہیں ملے گی۔ مثال کے طور پر ایک شخص مرگیا اور اپنے پیچھے بیٹے اور پوتے چھوڑ گیا۔ پوتے نابالغ اور یتیم ہونے کے باعث زیادہ ضرورت مند ہیں۔ لیکن مرنے والے سے زیادہ قریب کا رشتہ بیٹوں کا ہے پوتوں کا نہیں اس لئے وراثت میں حصہ بیٹوں کو ملے گا پوتوں کو نہیں ملے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پوتے اس گھر کا اثاثہ ہیں، اسلامی معاشرے کی ذمہ داری ہیں، انہیں بے سہارا نہیں چھوڑا جاسکتا، اس طرح تو ان کے ضائع ہوجانے یا بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ اسلام نے اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے مرنے والے کو ایک تہائی تک وراثت کی اجازت دی۔ اس اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ پوتوں کی ضرورت کو پورا کرسکتا ہے۔ فرض کیجئے مرنے والے نے اپنے پیچھے دو بیٹے اور ایک پوتا چھوڑا۔ اور اس کا مالِ میراث تین لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔ مرنے والے کو چونکہ ایک تہائی کیلئے وصیت کرنے کی اجازت ہے اس لئے وہ ایک لاکھ کی وصیت کرسکتا ہے۔ جب وراثت تقسیم ہوگی تو دو بیٹوں کو ایک ایک لاکھ ملے گا کیونکہ تہائی نکال کر دو لاکھ باقی بچے گا اور ایک تہائی وصیت کے مطابق پوتے کو مل جائے گا۔ اس طرح سے اسلام نے احکامِ میراث کو مضبوط بنیادوں پر اٹھایا ہے، لیکن ساتھ ہی مزید پیدا ہونے والی ضرورتوں کیلئے بھی ایک راستہ دے دیا ہے۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ
فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن
كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا

Marfat.com

السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ
وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ
السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَ
اَبْنَآؤُكُمْ ۚ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ
اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١١﴾ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ
اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ
الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ
وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ
لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ
تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ
امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ
كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿١٢﴾ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١٣﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ

Marfat.com

حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

عربی رکوع ۲ (اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں حکم دیتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، اگر لڑکیاں دو سے زائد ہیں تو ان کے لئے ترکے کا دو تہائی ہے اور اگر ایک ہے تو اس کے لئے نصف ہے اور میت کے ماں باپ کیلئے ان میں سے ہر ایک کیلئے اس کا چھٹا حصہ ہے جو مورث نے چھوڑا، اگر میت کے اولاد ہو اور اگر اس کے اولاد نہ ہو اور اس کے وارث ماں باپ ہی ہوں تو اس کی ماں کا حصہ ایک تہائی اور اگر اس کے بھائی بہنیں ہوں تو اس کی ماں کیلئے چھٹا حصہ ہے، یہ حصے اس وصیت کی تعمیل یا ادائے قرض کے بعد ہیں جو وہ کر جاتا ہے، تم اپنے باپوں اور بیٹوں کے متعلق یہ نہیں جان سکتے کہ تمہارے لئے سب سے زیادہ نفع دینے والا کون ہوگا؟ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے، بے شک اللہ ہی علم اور حکمت والا ہے ٥ اور تمہارے لئے اس ترکہ کا نصف ہے، جو تمہاری بیویاں چھوڑیں اگر ان کے اولاد نہیں ہے اور اگر ان کے اولاد ہے تو ان کے ترکہ میں سے تمہارے لئے چوتھائی ہے، بعد اس وصیت کی تعمیل اور ادائے قرض کے جو وہ کر جائیں اور ان کے لیے چوتھائی ہے تمہارے ترکہ کا اگر تمہارے اولاد نہیں ہے اور اگر تمہارے اولاد ہے تو ان کیلئے آٹھواں حصہ ہے تمہارے ترکہ کا اس وصیت کی تعمیل اور ادائے قرض کے بعد جو تم کر جاؤ ٥ اور اگر وہ مرد جس کی میراث ہے ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں نہ فروع اور اس کے ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو دونوں میں سے ہر ایک کیلئے چھٹا حصہ ہے اور اگر یہ لوگ اس سے زائد ہوں تو وہ ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔ بعد وصیت کے جس کی وصیت کر دی جائے یا ادائے قرض کے بعد بغیر کسی کو نقصان پہنچائے۔ یہ حکم اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ بڑا علم والا ہے اور بڑا بردبار ہے ٥ یہ اللہ کے ضابطے ہیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسے داخل کرے گا ایسے باغوں میں جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے ٥ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کے ضابطوں کے حدود سے باہر نکل جائے گا اسے وہ دوزخ کی آگ میں داخل کرے گا، اس میں وہ ہمیشہ ہمیش پڑا رہے گا اور اس کے لئے ذلت دینے والا عذاب ہوگا) (آیات ۱۱ تا ۱۴)

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَاتَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ ۚ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ٥

Marfat.com

(اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں حکم دیتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، اگر لڑکیاں دو سے زائد ہیں تو ان کے لئے ترکے کا دو تہائی ہے اور اگر ایک ہے تو اس کے لئے نصف ہے اور میت کے ماں باپ کیلئے ان میں سے ہر ایک کیلئے اس کا چھٹا حصہ ہے جو مورث نے چھوڑا، اگر میت کے اولاد ہو اور اگر اس کے اولاد نہ ہو اور اس کے وارث ماں باپ ہی ہوں تو اس کی ماں کا حصہ ایک تہائی اور اگر اس کے بھائی بہنیں ہوں تو اس کی ماں کیلئے چھٹا حصہ ہے، یہ حصے اس وصیت کی تعمیل یا ادائے قرض کے بعد ہیں جو وہ کر جاتا ہے، تم اپنے باپوں اور بیٹوں کے متعلق یہ نہیں جان سکتے کہ تمہارے لئے سب سے زیادہ نفع دینے والا کون ہوگا؟ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے، بے شک اللہ ہی علم اور حکمت والا ہے) (النسآء : ۱۱)

وصیت کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ کا آغاز یُوۡصِیۡکُمُ کے لفظ سے ہوا ہے۔ جس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ تمہیں وصیت کرتا ہے۔ اردو اور پنجابی زبان میں بالعموم وصیت کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب کوئی آدمی برلب مرگ ہوتا ہے تو وہ آخری وقت میں اپنے بچوں اور قریبی عزیزوں کو جو نصیحتیں کرتا ہے یا بعض معاملات کے بارے میں ہدایات دیتا ہے، انہیں وصیت کہا جاتا ہے۔ لیکن عربی زبان میں اس کا مفہوم یہ نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ لفظ آخری نصیحتوں کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے اور مرنے والا بھی اس لفظ کے حوالے سے نصیحت کرتا ہے۔ لیکن زندگی میں بھی جس بات کو زیادہ اہتمام اور تاکید سے کہنا مقصود ہوتا ہے، اس کیلئے بھی وصیت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وصیت کے مفہوم میں دو مفہوم جمع ہیں۔ ایک مفہوم تو وہ ہے جس کا تعلق وصیت کرنے والے سے ہے اور ایک مفہوم وہ ہے جس کا تعلق اس بات سے ہے جس کی وصیت کی جا رہی ہے۔ پہلے مفہوم کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ وصیت کا سننے والا کہنے والے کے بارے میں یہ یقین رکھتا ہے کہ مجھ سے جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں کہنے والے کی خیر خواہی، شفقت، ہمدردی، حق کے پیش بینی، تدبر اور دور اندیشی سب کچھ شامل ہے۔ زندگی بھر کا تجربہ اور گہری بصیرت نے میری طرف متوجہ ہو کر میری ہمدردی میں ڈوب کر کچھ کہا ہے اور دوسرے مفہوم کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کہنے والا اس بات کے حوالے سے جو مجھ سے کہی جا رہی ہے درحقیقت مجھ سے ایک عہد لے رہا ہے اور مجھ پر ایک ذمہ داری ڈال رہا ہے کہ جب بھی کبھی تمہیں ایسا موقعہ پیش آئے جس کے حوالے سے میں نصیحت کر رہا ہوں تو یہ تمہارے ذمہ داری ہے کہ اس وقت تم اس نصیحت کو پیشِ نظر رکھو۔ وصیت کے لفظ نے ان وسیع الاطراف مطالب کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اردو زبان سمیت کسی زبان میں ایسا لفظ نہیں پایا جاتا جو ان تمام معانی پر حاوی ہو۔ اور ان تمام مضمرات کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

لڑکا اور لڑکی کی میراث کے حکم میں اسلوبی حکمت

سب سے پہلے میراث کے حوالے سے جن ورثا کے حصوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ لڑکا اور لڑکی یا مرد اور عورت ہیں۔ لیکن اس کیلئے جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ توجہ طلب ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ کہا جاتا کہ مذکر کیلئے دو حصے ہوں گے اور مؤنث کے لیے ایک حصہ یا یہ کہا جاتا کہ مذکر کا حصہ جتنا ہوگا مؤنث کا حصہ اس کا نصف ہوگا۔ لیکن یہاں فرمایا گیا لِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ ''لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل مقصود تو لڑکیوں کے حصے کو ذکر کرنا ہے اس کے ضمن میں لڑکے کے حصے کو ذکر کیا گیا ہے۔ ا

Marfat.com

اسلوب اور تعبیر سے شائد اس طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ دنیا میں آج تک عورتوں کو میراث سے محروم رکھ کر جو ظلم کیا گیا ہے قرآن کریم کے نزول اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اسلامی حدود میں یہ ظلم نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کو اچھی طرح یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ مذکر اور مؤنث دونوں میراث میں برابر کے شریک ہیں بلکہ ذکر میں عورت پہلے ہے۔ اگر عورت کا حصہ نہیں دیا جاتا تو مرد کے حصے کا بھی کوئی جواز نہیں۔ صنفِ نازک کے حق میں جدید تاریخ کی یہ سب سے پہلی اور مضبوط آواز ہے جو قرانِ کریم نے بلند کی ہے اور جو رفتہ رفتہ صنف نازک کو وہ عزت وحرمت عطا کر گئی جس سے قرآن وسنت کے اوراق معمور ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ایک اور بڑی حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ صنفِ نازک کو حصہ تو ضرور ملے گا لیکن وہ مرد کے برابر نہیں ہوگا بلکہ اس سے نصف ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام کے نظامِ معاشرت میں تمام کفالتی ذمہ داریاں اللہ تعالیٰ نے مرد پر ڈالی ہیں۔ وہ شوہر ہے تو بیوی کی تمام ذمہ داریوں کا کفیل ہے، وہ باپ ہے تو تمام اولاد کی ذمہ داریوں کا ضامن ہے، ماں کو اللہ نے بے پناہ مرتبہ دیا ہے لیکن اولاد کی کفالت کے حوالے سے اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے۔ شوہر کے ادب واحترام کے حوالے سے بیوی کو مکلّف بنایا گیا ہے۔ لیکن شوہر کی ضروریات کیلئے اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی۔ وہ اپنے والدین کی طرف سے بیشک دولت وامارت کی مالک ہو، اس کے حقِ ملکیت میں چاہے کیسی ہی وسعت ہو، لیکن وہ شوہر اور بچوں کے حوالے سے کوئی پابندی نہیں رکھتی۔ وہ اگر ان کیلئے کچھ خرچ کرے تو تبرع اور احسان ہے، ذمہ داری نہیں ہے۔ عقل اور انصاف کی بات ہے کہ جس پر ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں میراث میں حصہ بھی اس کا زیادہ ہونا چاہیئے اور بھی بعض حقوق میں اسے ترجیح ملنی چاہیئے۔ اسی ترجیح کے پیشِ نظر مرد کو عورت سے دونا حصہ دیا گیا ہے اور یہ ایک ایسا اٹل اصول ہے جس میں سوائے کلالہ کی میراث کے کہیں بھی تبدیلی نہیں کی گئی۔

لڑکیوں کی میراث کی تفصیل

لڑکیوں کے حقوقِ میراث کے حوالے سے مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر کسی شخص کی نرینہ اولاد نہ ہو صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں، تو اگر لڑکیاں ایک سے زائد ہیں، چاہے دو ہیں یا دو سے زیادہ، تو ان کو وراثت سے دو تہائی حصہ ملے گا، جس میں سب لڑکیاں برابر کی شریک ہوں گی اور باقی ایک تہائی دوسرے ورثا مثلاً میت کے والدین، بیوی یا شوہر وغیرہ میراث کے حق داروں کو ملے گا۔ قرآنِ کریم نے دو لڑکیوں سے زیادہ کے بارے میں یہ حکم دیا ہے۔ لیکن اگر لڑکیاں دو سے زیادہ نہیں بلکہ دو ہوں تو اس کا حکم بھی یہی ہے۔ البتہ قرآنِ کریم نے اسے ذکر نہیں کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مطابق فیصلہ فرمایا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے

عن جابر بن عبداللہ قال خرجنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم حتی جئنا امرء ۃ من الانصار فی الاسواف فجاء ت المرء ۃ بابنتین لھا فقالت یارسول اللہ ھاتان بنتا ثابت بن قیس معک یوم احد وقد استفاء عمھما مالھما ومیراثھما کلہ ولم یدع مالا الا اخذہ فما تری یارسول اللہ فو اللہ لاتنکحان ابدا الا ولھما مال فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم یقضی اللہ فی

Marfat.com

ذالک وقال نزلت سورۃ النساء یوصیکم اللہ فی اولادکم الایۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ادعوا الی امرء ۃ وصاحبھا فقال لعمھما اعطھما الثلثین واعط امھما الثمن وما بقی فلک (ابو دؤد کتاب الفرائض، وبمعناہ فی الترمذی ابواب الفرائض)

(حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ باہر نکلے اتنے میں ہمارا گزر اسواف میں ایک انصاری عورت پر ہوا وہ عورت اپنی دو لڑکیوں کو لے کر آئی اور کہنے لگی کہ اے اللہ کے رسول! یہ دونوں لڑکیاں ثابت ابن قیس (میرے شوہر) کی ہیں جو آپ کے ساتھ غزوہ احد میں شہید ہو گئے ہیں ان لڑکیوں کا چچا ان کے پورے مال اور ان کی پوری میراث پر خود قابض ہو گیا ہے اور ان کے واسطے کچھ باقی نہیں رکھا۔ اس معاملہ میں آپ کیا فرماتے ہیں، خدا کی قسم اگر ان لڑکیوں کے پاس مال نہ ہو گا تو کوئی شخص ان کو نکاح میں رکھنے کیلئے بھی تیار نہ ہو گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیرے حق میں فیصلہ فرمادے گا۔ حضرت جابر فرماتے ہیں کہ پھر جب سورۃ نساء کی یہ آیت یوصیکم اللہ فی اولادکم نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس عورت اور اس کے دیور کو (لڑکیوں کا وہ چچا جس نے سارے مال پر قبضہ کر لیا تھا) بلاؤ، آپ نے لڑکیوں کے چچا سے فرمایا کہ لڑکیوں کو کُل مال کا دو تہائی حصہ دو، ان کی ماں کو آٹھواں حصہ اور جو بچے، وہ تم خود رکھ لو)

اس حدیث میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو لڑکیوں کو بھی دو تہائی حصہ دیا۔ جس کا حکم قرآنِ کریم میں دو سے زیادہ لڑکیوں کیلئے دیا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ لڑکیاں دو ہوں یا دو سے زیادہ ان کو میراث میں سے دو تہائی حصہ ملے گا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: وان کانت واحدۃ فلھا النصف "اگر مرنے والے کی ایک لڑکی ہو تو اسے نصف ملے گا"۔ یعنی کل ترکہ کے نصف کی وہ حق دار ہو گی اور بقیہ نصف حصہ میں اگر اولاد نرینہ نہ ہو تو دوسرے ورثا حصہ پائیں گے۔ لیکن اگر دوسرے وارث موجود نہ ہوئے تو پھر وہ نصف بھی اسی لڑکی کی طرف لوٹ کر آئے گا۔ اولاد کیلئے وراثت کی تقسیم کی تفصیل بیان کرنے کے بعد والدین کی میراث کا ذکر فرمایا کیونکہ مرنے والے کے سب سے قریب رشتہ دار اولاد اور والدین ہی ہیں باقی سب کا مقام ان کے بعد ہے۔ وہ کبھی وارث ہوتے ہیں کبھی وارث نہیں ہوتے۔ لیکن اولاد اور والدین کمی اور بیشی کے ساتھ ہمیشہ وارث بنتے ہیں۔ مرنے والے نے اگر ماں اور باپ دونوں زندہ چھوڑے تو ان کی وراثت کی تین صورتیں ہیں۔

1:۔ والدین بھی زندہ ہوں اور ان کے ساتھ مرنے والے کی اولاد بھی زندہ ہو۔ ولد کا لفظ واحد جمع، مذکر مؤنث سب کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس لئے مرنے والے کی اولاد چاہے مذکر ہو یا مؤنث ایک ہو یا زیادہ ہر صورت میں ماں اور باپ ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور باقی جو وراثت بچے گی وہ دوسرے وارثوں کو ملے گی۔ بعض حالات میں کچھ بچا ہوا پھر والد کو پہنچ جاتا ہے جو اس کیلئے مقررہ حصے کے علاوہ ہے۔ علم فرائض کی اصطلاح میں اس طرح کے استحقاق کو استحقاقِ تعصیب کہتے ہیں۔

Marfat.com

2:۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مرنے والے کے والدین تو ہوں لیکن اس کی اولاد کوئی نہ ہو۔اور نہ کوئی بہن بھائی ہو۔اس صورت میں مالِ موروث کا تہائی ماں کو اور باقی دو تہائی والد کو ملے گا۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ مرنے والے کے وارثوں میں اس کا شوہر یا اس کی بیوی موجود نہ ہو۔اگر شوہر یا بیوی موجود ہے تو سب سے پہلے ان کا حصہ الگ کیا جائے گا۔ باقی میں 1/3 ماں کو اور 2/3 والد کو مل جائے گا۔

3:۔ تیسری صورت یہ ہے کہ مرنے والے کی اولاد تو نہ ہو لیکن بھائی بہن ہوں۔ جن کی تعداد دو ہو۔خواہ دو بھائی ہوں یا دو بہنیں ہوں، یا دو سے زیادہ ہوں۔اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر کوئی اور وارث نہیں تو بقیہ 5/6 حصہ باپ کو مل جائے گا۔ بھائیوں اور بہنوں کی موجودگی سے ماں کا حصہ کم ہو گیا۔لیکن بھائی بہن کو بھی کچھ نہ ملے گا کیونکہ باپ بہ نسبت بھائی بہن کے اقرب ہے۔جو بچے گا باپ کو مل جائے گا۔اس صورت میں ماں کا حصہ 1/3 کی بجائے 1/6 ہو گیا۔فرائض کی اصطلاح میں اس کو حجبِ نقصان کہتے ہیں۔اور یہ بہن بھائی جن کی وجہ سے والدین کا حصہ کم ہوا ہے خواہ حقیقی ہوں، خواہ باپ شریک ہوں، خواہ ماں شریک ہوں، ہر صورت میں ان کے وجود سے ماں کا حصہ گھٹ جائیگا۔بشرطیکہ ایک سے زیادہ ہوں۔

اولاد اور والدین کے مقررہ حصوں کو بیان کرنے کے بعد فرمایا: اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ ۚ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ''اس میں تین باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ انسان ہمیشہ نارسائی فکر کا شکار رہا، کوشش کے باوجود عموماً حقیقت تک نہیں پہنچ پاتا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ مزید مصیبت یہ ہے کہ اس کی سوچ کبھی حرص کے احساس سے خالی نہیں ہوتی۔ یہ ہزار غیر جانبدار ہو کر سوچے تب بھی بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ حصولِ منفعت کا تصور اس کی سوچ میں دخل انداز نہ ہو۔وراثت میں تو اس کا ہر وقت امکان ہے۔ یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تقسیم میراث تم پر چھوڑ دی جاتی تو تم اسے ضرورت اور منفعت کی اساس پر اٹھانے کی کوشش کرتے۔لیکن تمہارے پاس یہ جاننے کیلئے کوئی حتمی ذریعہ نہیں تھا جس سے تم یہ فیصلہ کر سکو کہ والدین اور اولاد میں تمہارے لئے زیادہ منفعت بخش کون ہے۔تمہاری فکری تاریخ ہمیشہ اس میں الجھی رہتی کہ دونوں اساسی رشتوں میں سے کسے زیادہ منفعت بخش قرار دیا جائے۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے تمہاری آسانی اور بہتری کیلئے منفعت اور ضرورت کو اساس بنانے کی بجائے قرابت میں اقرب ہونے کو بنیاد بنایا۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جو حالات کے بدلنے سے بھی کبھی نہیں بدلتا۔

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی جا رہی ہے کہ میراث کے جو حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیئے ہیں ان میں کسی عقل کو دخل دینے اور کسی کمی بیشی کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ حتمی فیصلے ہیں جس میں انسانی عقل کیلئے دخل دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جس میں حالات کے بدلنے سے کسی کمی بیشی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔جس طرح زندگی اور موت کا قانون اٹل ہے جس میں حالات کے بدلنے سے کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔اسی طرح موت کے نتیجے میں جو حقوق مقرر کر دیئے گئے ہیں وہ بھی ایسے محکم اور اٹل ہیں کہ ان میں کسی تبدیلی کا وہم بھی نہیں ہو سکتا۔

تیسری بات یہ ارشاد فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میراث کے جو اصول مقرر فرمائے، جو حقوق متعین کئے اور جو احکام دیئے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے ہمہ گیر علم اور گہری حکمت کا نتیجہ ہیں۔اس لئے ان میں کسی طرح کی تبدیلی کرنے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو علم اور حکمت سے محروم کرنا ہے یا ان کے مقابلے میں اور اصولِ میراث وضع کرنا اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت کو چیلنج کرنے اور غیر معتبر ٹھہرانے کے مترادف ہے۔ایسی حرکت وہی شخص کر سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات علم و حکمت پر یقین نہیں رکھتا اور اپنے بارے میں نہایت غلط اندازہ رکھتا ہے۔

Marfat.com

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ

(اور تمہارے لئے اس ترکہ کا نصف ہے، جو تمہاری بیویاں چھوڑیں اگر ان کے اولاد نہیں ہے اور اگر ان کے اولاد ہے تو ان کے ترکہ میں سے تمہارے لئے چوتھائی ہے، بعد اس وصیت کی تعمیل اور ادائے قرض کے جو وہ کر جائیں اور ان کے لیے چوتھائی ہے تمہارے ترکہ کا اگر تمہارے اولاد نہیں ہے اور اگر تمہارے اولاد ہے تو ان کیلئے آٹھواں حصہ ہے تمہارے ترکہ کا اس وصیت کی تعمیل اور ادائے قرض کے بعد جو تم کر جاؤ) (النساء: ۱۲)

میاں بیوی کی میراث کی تفصیل

انسانی زندگی میں جو رشتے بے حد اہمیت کے حامل ہیں وہ چار رشتے ہیں اور یہی حقیقت میں قرابت داری کے چار ستون ہیں۔ والدین، اولاد، شوہر اور بیوی۔ اولاد اور والدین کے احکامِ میراث کا ذکر ہو گیا۔ اب میاں بیوی کی میراث کے حوالے سے احکام دیئے جا رہے ہیں۔ سب سے پہلے شوہر کے بارے میں بتایا گیا کہ اگر بیوی مر جائے تو شوہر کو اس کی میراث میں کتنا حصہ ملنا چاہیئے۔ یوں تو میاں بیوی کی میراث کے سلسلے میں کسی ایک کا ذکر پہلے آنا ناگزیر تھا، لیکن بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ شوہر کا ذکر پہلے کرنے کا سبب یہ ہے کہ بیوی اگر اپنے میکہ میں انتقال کرتی ہے تو بیوی کے میکہ سے تعلق شوہر کا بیوی کے واسطہ سے ہوتا ہے اور جب تک بیوی زندہ ہے اس کے میکہ والے بھی ہمیشہ اس کے شوہر کو اپنے بیٹے کا درجہ دیتے ہیں۔ لیکن بیوی کے مرنے کے بعد شوہر اس گھر کے لئے غیر ہو جاتا ہے۔ عموماً دیکھا یہ گیا ہے کہ اب بیوی کے گھر والوں کا رویہ یکسر بدل جاتا ہے۔ اولاً تو وہ اپنے داماد کی پرواہ ہی نہیں کرتے اور اگر کچھ شرما شرمی خیال کریں بھی تو بیٹی کے ترکہ میں سے اس کے شوہر کو کچھ دینا ان کیلئے آسان نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کا حصہ دینے سے ہمیشہ گریز کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے پروردگار نے اس زیادتی کی اصلاح کیلئے شوہر کے حصے کا پہلے ذکر فرمایا ہو تا کہ اس کے سسرال کو اس کی اہمیت کا احساس ہو سکے۔ شوہر کے حصے کی تفصیل یہ ہے کہ اگر اس کی مرحومہ بیوی نے اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، نہ اس شوہر سے نہ پہلے کسی شوہر سے تو پھر شوہر کو مرحومہ کے قرض کی ادائیگی اور وصیت کے نفاذ کے بعد کل ترکہ کا نصف ملے گا اور باقی نصف میں دوسرے ورثا مثلاً مرحومہ کے والدین، بھائی بہن، شریعت کے اصول کے مطابق اپنا اپنا حصہ پائیں گے۔

اگر مرنے والی بیوی نے اولاد چھوڑی ہو ایک ہوں یا دو ہوں یا اس سے زائد ہوں لڑکا ہو یا لڑکی ہو، اس شوہر سے ہو جس کو چھوڑ کر وفات پائی ہے یا اس سے پہلے کسی اور شوہر سے ہو، تو اس صورت میں موجودہ شوہر کو مرحومہ کے مال سے ادائے دین اور انفاذ وصیت کے بعد کل مال کا چوتھائی ملے گا اور بقیہ تین چوتھائی حصے دوسرے ورثا کو ملیں گے۔

اگر میاں بیوی میں سے مرنے والا شوہر ہے تو پھر دیکھا جائے گا کہ اس نے اپنے پیچھے کوئی اولاد چھوڑی یا نہیں اور اگر اس نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تو سب سے پہلے قرض ادا کیا جائے گا اگر کوئی اس کے ذمہ ہے اور پھر اگر اس نے کوئی وصیت کی ہے تو ایک تہائی تک اس کی وصیت نافذ

Marfat.com

کی جائے گی، اس کے بعد کل ترکہ کا چوتھائی اس کی بیوی کو ملے گا۔ اگر اس نے کوئی اولاد چھوڑی ہو، چاہے وہ اس بیوی سے ہو یا کسی دوسری بیوی سے، تو قرض کی ادائیگی اور وصیت کے انفاذ کے بعد اس بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا۔ اگر بیویاں ایک سے زیادہ ہوں تو وہی آٹھواں یا پہلی صورت میں چوتھا حصہ تمام بیویوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ان دونوں حالتوں میں جو ترکہ بچے گا وہ ان کے دوسرے وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

یہ یاد رہے کہ شوہر کے مرنے کی صورت میں جہاں یہ دیکھا جائے گا کہ اس کے ذمہ کوئی قرض ہے یا نہیں وہیں سب سے پہلے یہ بھی دیکھا جائے گا کہ اس نے اپنی بیوی کا مہر ادا کیا تھا یا نہیں اور اگر اس نے ادا نہیں کیا تو دوسرے قرضوں کی طرح یہ مہر بھی ادا کیا جائے گا۔ بیوی باقی ترکہ میں بھی اپنا حصہ پائے گی اور اپنا مہر بھی قرض کے طور پر وصول کرے گی۔ فرض کیجئے کہ قرض کی ادائیگی میں سارا مالِ میراث کام آ جاتا ہے تو پھر تمام وارث وراثت سے محروم رہیں گے اور قرض کی ادائیگی بہر صورت کی جائے گی۔ اندازہ فرمایئے! اسلام کی نگاہ میں قرض کی ادائیگی کی کس حد تک اہمیت ہے کہ آدمی مر جائے تو اس کی وراثت سے قرض ادا کیا جائے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص کا جنازہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نمازِ جنازہ پڑھانے کیلئے آگے بڑھے پھر پلٹ کر پوچھا کہ یہ شخص مقروض تو نہیں تھا یعنی کسی شخص کا قرض تو اس کے ذمہ نہیں۔ بتایا گیا کہ مرنے والا کئی لوگوں کا مقروض تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا کہ کوئی شخص اپنے بھائی کا قرض ادا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ سب چپ رہے کیونکہ مسلمانوں کے مالی حالات انتہائی ناگفتہ بہ تھے۔ جب دیکھا کہ کوئی قرض ادا کرنے کیلئے تیار نہیں تو حضور پیچھے ہٹ گئے فرمایا کہ میں مقروض آدمی کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھاؤں گا۔

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۭ ○

(اور اگر وہ مرد جس کی میراث ہے ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں نہ فروع اور اس کے ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو دونوں میں سے ہر ایک کیلئے چھٹا حصہ ہے اور اگر یہ لوگ اس سے زائد ہوں تو وہ ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔ بعد وصیت کے جس کی وصیت کر دی جائے یا ادائے قرض کے بعد بغیر کسی کو نقصان پہنچائے۔ یہ حکم اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ بڑا علم والا ہے اور بڑا بردبار ہے) (النساء: ۱۲)

کلالہ کی میراث کا بیان

ان سطور میں کلالہ کی میراث بیان کی گئی ہے۔ کلالہ کی تعریفیں تو مختلف کی گئی ہیں لیکن جو تعریف اہلِ علم کے نزدیک بہت مقبول ہے وہ یہ ہے کہ کلالہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کے نہ اصول ہوں نہ فروع۔ یعنی نہ اس کے باپ دادا ہوں اور نہ اس کی اولاد ہو۔ البتہ اس کا ایک بھائی یا بہن ہو۔ تو اس کی وراثت کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر اس کا بھائی ہو تو اس کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر بھائی نہیں تو بہن کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر یہ بھائی ایک سے زیادہ ہوں، مثلاً ایک بھائی ایک بہن ہوں یا دو بھائی یا دو بہنیں ہوں تو سب مرنے والے کے کل

Marfat.com

مال کے تہائی حصے میں شریک ہوں گے۔لیکن اس میں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے ایک تو یہ کہ ان بھائی بہنوں میں تہائی حصہ اس طرح تقسیم ہوگا کہ سب کا حصہ برابر ہوگا۔اصولی طور پر تو مرد کو دوگنا ملتا ہے لیکن یہ واحد جگہ ہے جہاں سب کو یکساں دینے کا حکم ہے۔دوسری یہ بات یاد رہے کہ اس آیت میں جن بھائی بہنوں کا حصہ بیان کیا گیا ہے، وہ بھائی بہن اخیافی ہیں یعنی ماں شریک بھائی اگر وہ حقیقی بہن بھائی ہوں یا باپ میں شریک ہوں تو پھر ان کے حصے کی تفصیل اور ہے۔جسے سورۃ النساء کے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔وہاں بتایا گیا ہے کہ اگر ایک بہن ہو تو اس کو آدھا ملے گا اور اگر ایک بھائی ہو تو اپنی بہن کے پورے مال کا وارث ہوگا اور اگر دو بہنیں ہوں تو دو تہائی مال پائیں گی اور اگر متعدد بھائی بہن ہوں تو مذکر کو مونث سے دونا دیا جائے گا۔

ہم اس بحث کے آغاز میں وصیت کے بارے میں عرض کر چکے ہیں۔یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آپ نے اس رکوع میں دیکھا کہ میراث کے مسائل بیان کرتے ہوئے پروردگار نے تین مرتبہ وصیت اور دَین کا ذکر فرمایا۔اور ہر جگہ وصیت کو دَین سے پہلے ذکر کیا۔اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ شائد وصیت پر عمل کرنا دَین کی ادائیگی سے زیادہ ضروری اور مقدم ہے حالانکہ ایسا نہیں۔تقسیم میراث کے سلسلے میں سب سے پہلے مرنے والے کے قرض کی ادائیگی کی جاتی ہے اور اس کے بعد وصیت کے نفاذ کے بارے میں دیکھا جاتا ہے۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرمایا:

انکم تقرء ون هذه الاية من بعد وصية توصون بها اودين وان رسول الله صلی الله عليه و سلم قضٰى بالدين قبل الوصية (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی ص ۲۶۴)

آپ حضرات .... یہ آیت تلاوت کرتے ہیں۔ مِنْ بَعْدِ وَصِیَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَیْنٍ اس میں گو لفظ وصیت مقدم ہے لیکن عملی طور پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دَین کے بعد ہی رکھا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس وصیت کے نفاذ میں میراث کے وارث عام طور پر لاپرواہی کا ثبوت دیتے ہیں بلکہ بعض دفعہ جان بوجھ کر اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور دَین اور قرض کے مطالبہ کرنے والے قرض خواہ چونکہ مطالبے کیلئے موجود ہوتے ہیں اس لئے اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں ہوتا۔البتہ وصیت لاوارث سمجھ کر نظر انداز کر دی جاتی ہے۔اس لئے پروردگار نے بطورِ خاص تینوں جگہ وصیت کا پہلے ذکر فرمایا۔کلالہ کی میراث کے ضمن میں آپ نے دیکھا غیر مضار کا لفظ آیا ہے۔یعنی وصیت کرنے والا اس طرح وصیت نہ کرے جس سے وارثوں کو نقصان پہنچے۔اس کا ذکر اگرچہ کلالہ کی میراث کے ضمن میں ہی آیا ہے شائد اس لئے کہ کلالہ سے سب سے زیادہ اس غلطی کا امکان ہے ۔ورنہ ہر شخص جو وصیت کرتا ہے اس کیلئے یہ لازمی شرط ہے۔اسے نہ وصیت کے ضمن میں نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ دَین کے ضمن میں۔اس لئے جو وصیت کرنے والا یا اپنے اوپر فرضی قرض تسلیم کرنے والا ایسا کرتا ہے وہ سخت گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔اس قسم کی حرکت کو گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ وصیت میں نقصان رسانی بڑے گناہوں میں سے ہے اور ایک دوسری حدیث میں آپ کا ارشاد ہے:

Marfat.com

(آدمی تمام عمر اہلِ جنت کے سے کام کرتا رہتا ہے مگر مرتے وقت وصیت میں ضرر رسانی کر کے اپنی کتابِ زندگی کو ایسے عمل پر ختم کر جاتا ہے جو اسے دوزخ کا مستحق بنا دیتا ہے)

دَین یا وصیت کے ذریعہ ضرر پہنچانے کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔ مثلاً یہ کہ قرض کا جھوٹا اقرار کرلیا جائے، کسی دوست وغیرہ کو دلانے کیلئے یا اپنے مخصوص مال کو جو اس کا اپنا ذاتی ہے یہ ظاہر کیا جائے کہ فلاں شخص کی امانت ہے تاکہ اس میں میراث کے احکام جاری نہ ہوں۔ یا ایک تہائی سے زائد مال کی وصیت کرے۔ یا کسی شخص پر اپنا قرض ہو اور وہ وصول نہ ہوا ہو لیکن جھوٹ یہ کہہ دیا جائے کہ اس سے قرض وصول ہوگیا تاکہ وارثوں کو نہ مل سکے یا مرض الموت میں ایک تہائی سے زیادہ کسی کو ہبہ کردے۔ یہ صورتیں ضرر پہنچانے کی ہیں، ہر مورث جو دنیا سے جارہا ہے اسے زندگی کے آخری لمحات میں اس طرح کے ضرر پہنچانے سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

تکملہ احکامِ میراث

مسلمان، کافر کا وارث نہیں بن سکتا:۔ اگرچہ میراث کی تقسیم نسبی قرابت پر رکھی گئی ہے۔ لیکن اس میں سے بعض چیزیں مستثنیٰ ہیں۔ اول یہ کہ مورث اور وارث دو مختلف دین والے نہ ہوں لہٰذا مسلمان کسی کافر کا اور کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہوگا خواہ ان میں آپس میں کوئی بھی نسبی رشتہ ہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لایرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم (مشکوٰۃ۔ ص ۲۶۳) ''مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا''

یہ حکم اس صورت سے متعلق ہے جب کہ پیدائش کے بعد ہی سے کوئی شخص مسلم یا کافر ہو لیکن اگر کوئی شخص پہلے مسلمان تھا، پھر العیاذ باللہ اسلام سے پھر گیا اور مرتد ہوگیا، اگر ایسا شخص مرجائے یا مقتول ہوجائے تو اس کا وہ مال جو اسلام کے زمانہ میں کسب کیا تھا، اس کے مسلمان وارثوں کو ملے گا اور جو ارتداد کے بعد کمایا ہو وہ بیت المال میں جمع کردیا جائے گا۔

لیکن اگر عورت مرتد ہوگئی تو اس کا کل مال خواہ زمانۂ اسلام میں حاصل ہوا ہو یا زمانۂ ارتداد میں اس کے مسلمان وارثوں کو ملے گا۔ لیکن خود مرتد مرد ہو یا عورت اس کو نہ کسی مسلمان سے میراث ملے گی نہ کسی مرتد سے۔

قاتل کی میراث:۔ اگر کوئی شخص ایسے آدمی کو قتل کردے جس کے مال میں اس کو میراث پہنچتی ہو تو یہ قاتل اس شخص کی میراث سے محروم ہوگا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: القاتل لایرث (مشکوٰۃ، ص ۲۶۳) ''قاتل وارث نہیں ہوگا''۔ البتہ قتلِ خطا کی بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (تفصیل فقہ کی کتابوں میں ہے)

پیٹ میں جو بچہ ہے اس کی میراث:۔ اگر کسی شخص نے اپنی کچھ اولاد چھوڑی اور بیوی کے پیٹ میں بھی بچہ ہے، تو یہ بچہ بھی وارثوں کی فہرست میں آئے گا۔ لیکن چونکہ یہ پتہ چلانا دشوار ہے کہ پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی، یا ایک سے زیادہ بچے ہیں۔ اس لئے بچہ پیدا ہونے تک تقسیمِ میراث ملتوی رکھنا مناسب ہوگا اور اگر تقسیم کرنا ضروری ہی ہو تو سرِ دست ایک لڑکا یا ایک لڑکی فرض کرکے دونوں کے اعتبار سے دو صورتیں فرض کی جائیں ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت میں ورثہ کو کم ملتا ہو وہ ان میں تقسیم کردیا جائے اور باقی اس حمل کے لئے رکھا جائے۔

Marfat.com

معتدّہ کی میراث:۔ جس شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور طلاق رجعی ہے پھر طلاق سے رجوع یا عدت ختم ہونے سے پہلے وفات پا گیا تو یہ عورت میراث میں حصہ پاوے گی، اس لئے کہ نکاح باقی ہے۔

اور اگر کسی شخص نے مرض الوفات میں بیوی کو طلاق دی، اگر چہ طلاق بائن یا مغلظہ ہی ہو اور عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے مر گیا تب بھی وہ عورت اس کی وارث ہوگی اور عورت کو وارث بنانے کی وجہ سے دو عدتوں میں سے جو سب سے زیادہ دراز ہو اسی کو اختیار کیا جائے گا، جس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ:

عدت طلاق تین حیض ہے اور عدت وفات چار مہینہ دس دن ہے ان دونوں میں جو عدت زیادہ دنوں کی ہو اسی کو عدت قرار دیا جائے تا کہ جہاں تک ممکن ہو عورت کو حصہ مل سکے۔

اور اگر کسی شخص نے مرض الوفات سے پہلے بائن یا مغلظہ طلاق دی اور اسکے چند دن بعد عورت کی عدت میں وہ فوت ہو گیا تو اس صورت میں اس کو میراث میں سے حصہ نہیں ملے گا۔ البتہ اگر طلاق رجعی دی ہے تو وہ وارث ہوگی۔

مسئلہ:۔ اگر کسی عورت نے شوہر کے مرض وفات میں خود خلع کر لیا تو وارث نہیں ہوگی، اگر چہ اس کا شوہر اس کی عدت کے دوران مر جائے۔

عصبات کی میراث:۔ فرائض کے مقررہ حصے بارہ ورثہ کے لئے طے شدہ ہیں اور ان وارثوں کو اصحاب الفروض کہا جاتا ہے۔ جن کی تفصیل کسی قدر اوپر گذر چکی، اگر اصحاب الفروض میں سے کوئی نہ ہو یا اصحاب الفروض کے حصے دیدینے کے بعد کچھ مال بچ جائے تو وہ عصبہ کو دیدیا جاتا ہے اور بعض مرتبہ ایک ہی شخص کو دونوں حیثیتوں سے مال مل جاتا ہے، بعض صورتوں میں میت کی اولاد اور میت کا والد بھی عصبہ ہو جاتے ہیں، دادا کی اولاد یعنی چچا اور باپ کی اولاد یعنی بھائی بھی عصبہ ہو جاتے ہیں۔

عصبات کی کئی قسمیں ہیں جن کی تفصیل فرائض کی کتابوں میں موجود ہے، یہاں ایک مثال لکھی جاتی ہے۔ مثلاً زید فوت ہو گیا اور اس نے اپنے پیچھے چار وارث چھوڑے، بیوی، لڑکی، ماں اور چچا۔ تو اس کے مال کے کل چوبیس حصے کیے جائیں گے جن میں سے آدھا یعنی بارہ حصے لڑکی کو 1/8 کے حساب سے تین حصے بیوی کو 1/6 کے حساب سے چار حصے ماں کو اور بقیہ پانچ حصے جو بچے وہ عصبہ ہونے کی حیثیت سے چچا کو ملیں گے۔

مسئلہ:۔ عصبات اگر نہ ہوں تو اصحابِ فروض سے جو مال بچے وہ ان کے حصوں کے مطابق انہی کو دیدیا جاتا ہے۔ اور اس کو علمِ فرائض کی اصطلاح میں رد کہتے ہیں۔ البتہ شوہر اور بیوی پر رد نہیں ہوتا، کسی حال میں ان کو مقررہ حصے سے زیادہ نہیں جاتا۔

مسئلہ:۔ اگر اصحاب فروض میں سے کوئی نہ ہو اور عصبات میں بھی کوئی نہ ہو تو ذوی الارحام کو میراث پہنچ جاتی ہے۔ ذوی الارحام کی فہرست طویل ہے، نواسے، نواسیاں، بہنوں کی اولاد، پھوپھیاں، ماموں، خالہ، یہ لوگ ذوی الارحام کی فہرست میں آتے ہیں اس مسئلہ میں تفصیل ہے، جس کا یہ محل نہیں، یہاں اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ (ماخوذ از معارف القرآن)

Marfat.com

تِلْكَ حُدُوْدُاللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُالْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۖ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

(یہ اللہ کے ضابطے ہیں اور جوکوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسے داخل کرے گا ایسے باغوں میں جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے ۝ اور جوکوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کے ضابطوں کے حدود سے باہر نکل جائے گا اسے وہ دوزخ کی آگ میں داخل کرے گا، اس میں وہ ہمیشہ ہمیش پڑا رہے گا اور اس کے لئے ذلت دینے والا عذاب ہوگا) (النساء: ۱۳ تا ۱۴)

قرآن کتابِ قانون بھی ہے اور کتابِ نصیحت بھی

قرآنِ کریم صرف آئین اور قانون کی کتاب نہیں کہ جس میں ایک ترتیب سے آئینی دفعات بیان کردی جائیں۔ بلکہ یہ ایک کتابِ نصیحت بھی ہے جس میں ہمدردی اور خیر خواہی کے تمام اسالیب اختیار کئے گئے ہیں۔ اور ایک کتابِ ہدایت بھی ہے جس میں رہنمائی کی تمام ضرورتیں پوری فرمائی گئی ہیں۔ اس لئے قرآنِ پاک جب کبھی کسی شعبۂ زندگی کے بارے میں اصول وضوابط بیان کرتا ہے تو ان تمام اسالیب سے کام لیتا ہے جن کی مدد سے ان اصول وضوابط کو دل ودماغ میں راسخ کیا جاسکتا ہے۔ کبھی انعامات کا ذکر کر کے عمل کی آمادگی پیدا کرتا ہے اور کبھی نافرمانی کے انجام سے ڈرا کر نافرمانی کو مشکل بنادیتا ہے۔ اسی اسلوب کے تحت پیشِ نظر دونوں آیات میں پہلے ترغیب سے کام لیا گیا ہے اور پھر ترہیب سے۔ ان دونوں سے پہلے ان احکام کی اہمیت کو واضح کرنے کیلئے فرمایا گیا کہ یہ خداوندی ضابطے ہیں جن کی حیثیت اللہ کی حدود کی ہے اس نے ان حدود کے ذریعے اپنی پسند وناپسند کی لکیریں کھینچ دی ہیں اور صاف صاف واضح کردیا ہے کہ ان حدود اور ان لکیروں کے ایک طرف اللہ کے فرمانبرداروں کی جگہ ہے اور دوسری طرف اس کے نافرمانوں کی۔ اس لئے کبھی ان حدود کو پھلانگنے اور پامال کرنے کی کوشش نہ کرنا اگر تم ان حدود کی پاسداری کرو اور اللہ کے احکام کی تعمیل کرو تو اس کا وعدہ ہے کہ وہ تمہیں آخرت میں ایسی جنتیں انعام میں دے گا جن کی شادابی اور تازگی اور جن کی خوبصورتی اور رعنائی اور جن کی دل آویزی ایسی ہوگی، جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہوگی، نہ کسی کان نے سنی ہوگی اور نہ کسی دل میں اس کا خیال گزرا ہوگا اور پھر یہ نعمتیں چند دن کیلئے نہیں ہوں گی۔ یہ اندھیری رات میں چار دن کی چاندنی نہیں ہوگی بلکہ ان جنتوں کے رہنے والے ہمیشہ ہمیش کیلئے اس میں رہیں گے۔

مزید فرمایا کہ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ دنیا میں اہلِ دنیا نے کامیابی کے نجانے کیا کیا معیارات قائم کرلیے ہیں اور اس کے لئے گوناگوں اسباب بھی تلاش کرلئے ہیں۔ لیکن یہ سب آنکھوں کا فریب اور عقل کا دھوکہ ہے۔ اس کی حقیقت جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری سے زیادہ نہیں۔ حقیقی کامیابی صرف یہ ہے کہ آدمی ایسی زندگی اختیار کرنے میں کامیاب ہوجائے، جس کے نتیجے میں اللہ راضی ہو اور وہ

Marfat.com

خوش ہو کر جنت کی نعمتیں عطا فرما دے اور اگر خدانخواستہ یہاں بظاہر زندگی بھر کی نعمتیں میسر آ بھی گئیں لیکن اس کے نتیجے میں جہنم کی ابدی سزاؤں سے واسطہ پڑ گیا تو کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو اسے کامیابی سمجھے گا۔ زندگی بھر کی راحتوں کے بدلے میں ایک دن بھی کوئی شخص جہنم میں جلنے کیلئے تیار نہیں ہوسکتا۔ چہ جائیکہ چند روزہ زندگی کے بدلے میں ابدی عذاب خرید لیا جائے۔ دنیا میں بھی حقیقی آسودگی اور دل کا حقیقی اطمینان اسی کو نصیب ہوتا ہے جو اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارتے ہیں اور اخروی نعمتیں تو یقیناً ضابطۂ خداوندی کے اطاعت کے سوا ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے فرمایا گیا کہ اللہ کے احکام کی اطاعت کرو اس کے ضابطوں کی پابندی کرو اس کی حدود کو کبھی عبور کرنے کی کوشش نہ کرو اسی کے نتیجے میں تمہیں جنت ملے گی۔ حقیقت میں یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ لیکن اگر تم نے اللہ کے ضوابط کو توڑا اور اس کی حدود کو پامال کیا اور اس کے احکام کی نافرمانی کی اور وہ سارے ضوابط جو یہاں یتیموں، وصیتوں اور ترکہ کے بارے میں ذکر کئے گئے ہیں۔ دیگر ضوابط سمیت ان کی بھی نافرمانی کی تو پھر یاد رکھو اگر تو یہ نافرمانی محض غفلت کے باعث اور دنیاوی ترغیبات کے سبب وجود میں آئی ہے تو سزا تو پھر بھی ملے گی لیکن ایمان پر خاتمہ کے باعث کبھی نہ کبھی نجات کی امید بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن اللہ نہ کرے اگر ان ضوابط کی خلاف ورزی اور ان حدود کی پامالی بغاوت اور سرکشی کی وجہ سے ہو رہی ہے اور آدمی اللہ کے احکام کی پرواہ ہی نہیں کرتا تو پھر اس کے نتیجے میں جہنم کے ایسے عذاب میں ڈالا جائے گا، جس سے کبھی نکلنا نصیب نہیں ہوگا اور یہ ایک ایسا ذلیل کر دینے والا عذاب ہوگا کہ جہنم کے دوسرے طبقات کے لوگ بھی ان پر تھوکیں گے اور لعنت بھیجیں گے۔

آپ نے اندازہ فرمایا کہ اللہ کے احکام کی پابندی کے بارے میں کیسے کیسے انعامات کی بشارت دی گئی ہے۔ اور اس کی نافرمانی کی صورت میں کیسے ہولناک انجام سے ڈرایا گیا ہے۔ لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس قدر سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں نے بالکل یہودیوں کی سی جسارت کے ساتھ اللہ کے قانون کو بدلا اور اس کی حدوں کو توڑا۔

(اس قانونِ وراثت کے معاملہ میں جو نافرمانیاں کی گئی ہیں وہ اللہ کے خلاف کھلی بغاوت کی حد تک پہنچ چکی ہیں۔ کہیں عورتوں کو میراث سے مستقل طور پر محروم کیا گیا، کہیں صرف بڑے بیٹے کو میراث کا مستحق ٹھہرایا گیا، کہیں سرے سے تقسیم میراث ہی کے طریقے کو چھوڑ کر ''مشترک خاندانی جائداد'' کا طریقہ اختیار کر لیا گیا، کہیں عورتوں اور مردوں کا حصہ برابر کر دیا گیا اور اب ان پرانی بغاوتوں کے ساتھ تازہ ترین بغاوت یہ ہے کہ بعض مسلمان ریاستیں اہلِ مغرب کی تقلید میں ''وفات ٹیکس Death Duty'' اپنے ہاں رائج کر رہی ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ میت کے وارثوں میں ایک وارث حکومت بھی ہے، جس کا حصہ رکھنا اللہ میاں بھول گئے تھے! حالانکہ اسلامی اصول پر اگر میت کا ترکہ کسی صورت میں حکومت کو پہنچتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کسی مرنے والے کا کوئی قریب و بعید رشتہ دار نہ ہو اور اس کا چھوڑا ہوا مال تمام اشیائے متروکہ Unclaimed Properties کی طرح داخل بیت المال ہو جائے یا پھر حکومت اس صورت میں کوئی حصہ پا سکتی ہے جبکہ مرنے والا اپنی وصیت میں اس کیلئے کوئی حصہ مقرر کر جائے)۔ (ماخوذ از تفہیم القرآن)

Marfat.com

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ
اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى
يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿١٥﴾ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا
مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿١٦﴾ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ
السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١٧﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ
حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ
يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۗ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٨﴾ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۗ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ
لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ
وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا
وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿١٩﴾ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ
زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا ۚ اَتَاْخُذُوْنَهٗ
بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿٢٠﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى
بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿٢١﴾ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ

Marfat.com

مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾

عربی رکوع ۳ (اور جو کوئی بدکاری کریں تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ طلب کروان پر چار مرد اپنوں میں سے۔ پس اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں کے اندر محبوس کر دو یہاں تک کہ موت ان کو اٹھا لے یا اللہ ان کیلئے کوئی راہ نکالے ٥ اور جو دونوں تم میں سے اس بدکاری کا ارتکاب کریں تو ان کو ایذا دو پھر اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو ان کا خیال چھوڑ دو، بیشک اللہ توبہ کرنے والا اور مہربان ہے ٥ اللہ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری تو انہیں کیلئے ہے جو کرتے ہیں برا کام جہالت سے پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ وہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے ٥ اور ان لوگوں کی توبہ نہیں ہے جو کئے جاتے ہیں برے کام یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوئی تو بولا کہ اب میں نے توبہ کر لی اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو کہ مرتے ہیں حالتِ کفر میں، ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ٥ اے ایمان والو! تمہارے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن جاؤ اور نہ یہ بات جائز ہے کہ جو کچھ تم نے ان کو دیا ہے اس کا کچھ حصہ واپس لینے کیلئے ان کو تنگ کرو۔ مگر اس صورت میں کہ وہ صریح بدکرداری کی مرتکب ہوں اور بیویوں کے ساتھ خوش اسلوبی سے گزر بسر کیا کرو اور اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو بعید نہیں کہ ایک چیز تم کو ناپسند ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اس میں بڑی بھلائی پیدا کر دے ٥ اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو اور تم نے ایک کو ڈھیروں مال دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو کیا تم بہتان لگا کر اور کھلی ہوئی حق تلفی کر کے اس کو لو گے ٥ اور آخر تم اس سے کس طرح لے لو گے جبکہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور انہوں نے تم سے مضبوط عہد لے رکھا ہے ٥ اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے نکاح نہ کرو مگر جو کچھ ہو چکا۔ بے شک یہ کھلی بے حیائی اور نفرت کی بات ہے اور نہایت برا طریقہ ہے)۔ (آیات ۱۵ تا ۲۲)

وَالّٰتِیْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُيُوْتِ حَتّٰی يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ٥ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ٥

Marfat.com

(اور جو کوئی بدکاری کریں تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ طلب کروان پر چار مرد اپنوں میں سے۔ پس اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں کے اندر محبوس کر دو یہاں تک کہ موت ان کو اٹھا لے یا اللہ ان کیلئے کوئی راہ نکالے ○ اور جو دونوں تم میں سے اس بدکاری کا ارتکاب کریں تو ان کو ایذا دو پھر اگر وہ دونوں توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو ان کا خیال چھوڑ دو، بیشک اللہ توبہ کرنے والا اور مہربان ہے) (النسآء: ۱۵ تا ۱۶)

سابقہ آیات میں ان مفاسد کا سد باب کیا گیا ہے جو حد سے بڑھی ہوئی حبِ دنیا سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے معاشرے میں ابتری پیدا ہوتی اور قطع رحمی کا راستہ کھلتا ہے۔ پیشِ نظر آیات میں ان مفاسد کو روکنے کی کوشش کی گئی ہے جو صنفی انتشار اور جنسی بے راہ روی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہر صاحبِ نظر جانتا ہے کہ جس طرح مال سے حد سے بڑھی ہوئی محبت سے پیدا ہونے والے مفاسد انسانی معاشرہ کیلئے تباہ کن ہیں اسی طرح جنسی بے راہ روی، صنفی جذبات کی بے قیدی، اور شرم وحیا کے بندھن ڈھیلے پڑ جانے کے باعث جو انتشار اور انارکی پیدا ہوتی ہے اور قومی خصوصیات کو نقصان پہنچتا ہے وہ اس سے بھی ہولناک ہیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ گزشتہ آیات میں اگر اسلامی معاشرے کو ایک طرح کی اخلاقی بیماریوں سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے تو دوسری طرح کی اخلاقی خرابیوں سے بھی بچانے کی کوشش کی جاتی۔

عارضی تعزیراتی احکام

ان آیات میں جو احکام بیان کئے گئے ہیں انہیں پڑھنے سے پہلے یہ بات یاد رہے کہ یہ اسلام کے قانونِ تعزیرات کے مستقل احکام نہیں ہیں بلکہ یہ وہ عارضی احکام ہیں جو مستقل قانونِ تعزیرات کے آنے سے پہلے مسلمان معاشرے کو صنفی جذبات کی بے قیدی سے بچانے کیلئے دیئے گئے۔ مسلمان معاشرہ وجود میں آچکا اور آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا لیکن اسے اسلامی معاشرے میں ڈھالنے کیلئے جس مستقل قانون کی ضرورت تھی ابھی اس کیلئے حالات پیدا نہیں ہوئے تھے کیونکہ ابھی اس معاشرے میں نظم واستحکام پیدا نہیں ہوا تھا۔ مدینہ طیبہ کے اندر صرف مسلمان نہیں بلکہ غیر مسلم بھی آباد تھے۔ ان میں یہود خاص طور پر اپنا ایک مذہب اور قانون رکھتے تھے۔ ان پر اسلامی قانون نافذ نہیں کیا جاسکتا تھا اور خود اوس اور خزرج جن کی اکثریت مسلمان ہو چکی تھی ابھی تک مکمل طور پر اسلام کی آغوش میں نہیں آئے تھے۔ پھر مدینہ کے اطراف میں غیر مسلم قبائل بھی موجود تھے وہ مسلمانوں سے تعلق تو رکھتے تھے لیکن پوری طرح اسلام کے زیرِ نگیں نہیں تھے۔ اس لحاظ سے نہ تو مسلمان ریاست میں ابھی اتنی قوت آئی تھی کہ وہ پورے مدینہ اور اس کے مضافات میں اسلامی حدود و تعزیرات نافذ کر دیں اور نہ خود مسلمان ابھی قانونی پابندیوں کا بوجھ اٹھانے کے خوگر ہوئے تھے۔

ان حالات میں اسلام کا قانونِ تعزیرات نافذ کرنا سراسر حکمت اور مصلحت کے خلاف تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام جس طرح شرک کو برداشت نہیں کرتا اسی طرح بے حیائی اور صنفی آوارگی کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ نامساعد حالات میں بھی یہ بات تصور میں نہیں لائی جاسکتی کہ مسلمانوں کو اباحیت پسند بنا دیا جائے یا ان کی اخلاقی اقدار میں دراڑیں آنے دی جائیں ان حالات میں ایک ہی راستہ تھا کہ مسلمانوں کو کچھ ایسے عارضی احکام دیئے جائیں جس سے ایک طرف اخلاقی اقدار کا تحفظ ہو سکے مسلمان اپنی امتیازی خصوصیات کو پہچان سکیں اور ساتھ ہی ساتھ اصل قانونِ تعزیرات کیلئے ذہنوں کو تیار ہونے کا موقعہ بھی ملے۔ چنانچہ ان دونوں آیتوں میں اسلامی حدود و تعزیرات کے حوالے سے عارضی اور

Marfat.com

ابتدائی احکام دیئے گئے ہیں اور جن کی جگہ بعد میں سورۃ النور میں مستقل احکام دیئے گئے۔ اس طرح سے مسلمان سوسائٹی کا اخلاقی اعتبار سے تحفظ بھی ہو گیا اور مسلمان معاشرے میں کسی قانونی بحران کا خطرہ بھی پیدا نہیں ہوا۔

ان دونوں آیتوں میں ان عورتوں اور مردوں کے بارے میں احکام دیئے گئے ہیں جن سے زنا کا صدور ہوا ہے۔ فاحشة کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کو کہتے ہیں اور زنا کیلئے اس لفظ کا استعمال عام ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں اس عورت کے متعلق حکم دیا گیا ہے جو مسلمان ہو اور زنا کا ارتکاب کرے لیکن اس گناہ میں شریک مرد مسلمان معاشرے سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ ایسی صورت میں یہ تو ممکن نہیں ہے کہ عورت اور مرد دونوں کو سزا دی جائے کیونکہ عورت تو مسلمان ہونے اور مسلمان معاشرے میں رہنے کی وجہ سے اسلامی احکام کی پابند ہے۔ لیکن ایک ایسا غیر مسلم جو غیر مسلم معاشرے میں رہتا ہے، لیکن مسلمانوں میں اس کا آنا جانا، مسلمانوں سے سابقہ تعلقات کی بنا پر ابھی تک جاری ہے اور انہیں تعلقات نے یہ گل کھلایا ہے اور مسلمان معاشرہ ابھی ابتدائی سٹیج پر ہے۔ جس میں نہ حجاب کے احکام آئے ہیں، نہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں تعلقات کی تہذیب کی گئی ہے اور نہ پوری طرح مسلمان آبادیوں میں اسلام پھیل سکا ہے۔ مسلمانوں کے اندر ابھی تک غیر مسلم گھرانے آباد ہیں اور ان سے قرابت داری کے رشتے بھی ہیں۔ ایسی صورتحال میں مرد و عورت دونوں کو قانونی گرفت میں لانا ممکن نہیں۔ اس لئے صرف عارضی طور پر مسلمان عورت کے بارے میں قانون دیا گیا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر تمہیں شبہ ہو کہ مسلمان عورتوں میں سے کسی عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، تو محض شبہ پر کسی کو سزا نہیں دی جاسکتی۔ اربابِ حل وعقد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس گناہ کا ثبوت تلاش کریں۔ ثبوت کیلئے ضروری ہے کہ چار گواہ طلب کیے جائیں، گواہ ایسے ہوں جو شہادت کی اہلیت رکھتے ہوں یعنی مسلمان ہوں، مرد ہوں، بالغ ہوں، عاقل ہوں، آزاد ہوں اور کبائر سے بچنے والے ہوں، ان کی تعداد کسی طرح چار سے کم نہ ہو۔ چار سے کم کی گواہی قبول نہیں ہوگی۔ اسی طرح ایسے معاملے میں عورتوں سے بھی گواہی نہیں لی جاسکتی۔ عام معاملات میں شریعت دو گواہوں کا حکم دیتی ہے لیکن زنا کے ثبوت کیلئے چار گواہ ضروری ٹھہرائے گئے ہیں کیونکہ یہ معاملہ بہت اہم ہے۔ جس سے عزت وعفت مجروح ہوتی ہے اور خاندانوں کے ننگ و عار کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ضروری تھا کہ کڑی شرائط رکھی جائیں، گواہی کا نصاب دوگنا ہوتا کہ کوئی شخص کسی کی عزت وعفت پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ زنا کے معاملے میں چار گواہوں کی شرط اس لئے لگائی گئی ہے کہ اس معاملے میں دو افراد ملوث ہوتے ہیں۔ اس طرح سے ایک ہی معاملہ دو معاملوں کے قائم مقام ہے اور ہر ایک معاملہ دو گواہوں کا تقاضا کرتا ہے۔ لہذا ایسا معاملہ جو دو معاملوں کے برابر ہے اس پر چار گواہ ہی ہونے چاہئیں۔ اگر چار گواہ گواہی دے دیں اور جرم ثابت ہو جائے تو اس کی سزا بیان فرمائی کہ ایسی بدچلن عورتوں کو گھروں میں بند کر دو اور ان کی موت آنے تک ان کی یہ سزا ختم نہ ہونے پائے یا تو انہیں موت اٹھا لے اور یا پھر اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور حکم نازل فرما دے۔ یہ آیت کا آخری جملہ خود بول رہا ہے کہ اس آیت میں جو حکم دیا گیا ہے، وہ عارضی ہے۔ چنانچہ سورۂ نور میں بالآخر تفصیلی احکام نازل کر دیئے گئے اور ان احکام میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں رکھی گئی بلکہ دونوں اگر غیر شادی شدہ ہوں گے تو سو سو کوڑے لگیں گے اور اگر شادی شدہ ہوں گے تو سنگسار کیے جائیں گے۔

Marfat.com

عورتوں کے بارے میں یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ انہیں موت تک گھروں میں بند رکھا جائے جبکہ مردوں کے بارے میں یہ سختی روا نہیں رکھی گئی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مرد عورت کے ساتھ جرم میں شریک ہے وہ اسلامی معاشرے کا فرد نہیں اور پھر مرد میں قدرت نے نیکی اور بدی دونوں اعتبار سے فتوت اور صراحت رکھی ہے۔وہ عموماً عورت کو گناہ پر اکساتا ہے اور آگے بڑھ کر گناہ کا راستہ کھولتا ہے۔اگر عورت کو گھر سے نکلنے کی آزادی حاصل رہے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ دوبارہ اپنے آشنا سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گی اور اس کا آشنا موقعہ پا کر اپنی دوست خاتون سے ربط وضبط کی کوشش نہیں کرے گا۔اگر اس خاتون نے دل سے توبہ نہ کی ہو تو وہ اس بہکاوے میں آ کر کچھ بھی کر سکتی ہے۔وہ اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو سکتی ہے،خفیہ طریقوں سے ملاقاتیں جاری رکھ سکتی ہے،وہ مرد بھی موقعہ پا کر اغوا کی واردات کر سکتا ہے۔ان تمام قباحتوں سے بچانے کیلئے پابندی لگا دی گئی کہ ایسی عورت کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہ دی جائے۔

دوسری آیت میں زانی اور زانیہ یعنی مرد اور عورت دونوں کی سزا کا ذکر فرمایا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ انہیں ایذا پہنچائی جائے یعنی انہیں زجر و توبیخ کی جائے،ڈانٹ ڈپٹ کی جائے،تحقیر و تذلیل کی جائے،ضروری ہو تو مارنے سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔کوئی ایک طریقہ مقرر نہیں فرمایا بلکہ ایذا دہی کا جو طریقہ ارباب حل وعقد مناسب سمجھیں عمل میں لائیں۔اگر وہ اس ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کے بعد محسوس کریں کہ انہوں نے اپنے گناہ سے توبہ کر لی ہے اور اپنا چال چلن درست کر لیا ہے،تو پھر ان سے اعراض کریں،یعنی ان سے درگزر کریں اور یہ امید رکھیں کہ آئندہ وہ ایسی کوئی نازیبا حرکت نہیں کریں گے اور معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں کیونکہ وہ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ عارضی حکم تھا جو سورۂ نور کے نازل ہونے کے بعد منسوخ ہو گیا۔البتہ شہادت کا یہی ضابطہ بعد میں بھی باقی رہا۔

اَلَّذٰنِ کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ کے پہلے لفظ پر غور فرمائیں اَلَّذٰنِ۔اَلَّذِیْ کا تثنیہ ہے۔اس کا معنی ہے "وہ دو مرد جو" زنا کا ارتکاب کریں۔اس سے اس کے مطلب اور مفہوم کے متعین کرنے میں دشواری ہوئی ہے۔چنانچہ ابو مسلم اصفہانی اور قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی اس طرف گئے ہیں کہ یہاں دو مردوں کے گناہ میں ملوث ہونے کا ذکر کیا جا رہا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک مرد دوسرے مرد سے ناجائز تعلق پیدا کرے اور غیر فطری طور پر آپس میں قضائے شہوت کریں یعنی استلذاذ بالمثل کے مرتکب ہوں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام میں یہ فعل قطعاً حرام ہے اور قرآنِ کریم نے صراحتاً قومِ لوط پر عذاب آنے کے جو اسباب بیان کئے ہیں ان میں سب سے پہلا یہی جرم ہے۔لیکن ہمیں قرونِ اولی میں کہیں اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ کسی نے اس جرم کی سزا کیلئے اس آیت سے استدلال کیا ہو۔شائد یہی وجہ ہے کہ صحابہ میں ایسے بدچلن لوگوں کی سزا کے بارے میں اختلاف تھا۔جناب ابو مسلم اصفہانی نے تو عجیب بات یہ کہی ہے کہ پہلی آیت میں عورت اور عورت کے ناجائز تعلق کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں مرد کا مرد سے ناجائز تعلق کا۔

مفسر سدی کو ان دونوں آیتوں کے ظاہری فرق سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ پہلی آیت منکوحہ عورتوں کیلئے ہے اور دوسری آیت غیر شادی شدہ مرد و عورت کیلئے۔لیکن یہ ایک ایسی کمزور تفسیر ہے جس کی سند ہمیں کہیں نہیں ملتی۔

Marfat.com

اَلَّذٰنِ کے سلسلے میں ان مختلف اقوال کو سامنے رکھئے اور پھر اس لفظ پر غور کیجئے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اَلَّذِیْ مذکر ہے اور اَلَّذٰنِ اس کا تثنیہ ہے، اس لحاظ سے اس سے دو مذکر ہی مراد لئے جاسکتے ہیں۔لیکن یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ عربی زبان میں مذکر کا صیغہ کبھی شریکِ غالب کے لحاظ سے بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں اسی طرح استعمال ہوا ہے۔جس طرح والدین کا لفظ ہے تو مذکر لیکن ماں باپ دونوں کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔والدین کا ترجمہ کوئی بھی دو والد نہیں کرتا حالانکہ یہی اس کا صحیح ترجمہ ہے۔والد اور والدہ میں چونکہ شریکِ غالب، والد ہے اس لئے اس کا لحاظ کرتے ہوئے والدین کا لفظ بول دیا جاتا ہے اور مراد اس سے ماں اور باپ دونوں ہوتے ہیں۔یہاں بھی اس سے مراد زانی اور زانیہ دونوں ہیں اور زانی مرد کے اعتبار سے اَلَّذٰنِ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

دو مردوں کے ناجائز تعلق کی شناعت اور سزا

ان آیتوں کی تفسیر کا اگر چہ دو مردوں کے ناجائز تعلق سے کوئی واسطہ نہیں۔لیکن اس جرم کی شناعت اور شیوع کا تقاضا ہے کہ اس کی جزا اور تعزیر کا ذکر کر دیا جائے تاکہ ہمیں اندازہ ہو کہ یہ جرم اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کس قدر شدید اور قابلِ نفرت ہے۔لیکن ہمارے معاشرے میں دوسری برائیوں کی طرح آہستہ آہستہ اس کی نفرت بھی کم ہوتی جارہی ہے۔احادیث وآثار سے اس سلسلہ میں جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس میں سے بطورِ نمونہ کچھ نقل کیا جاتا ہے:۔

عن ابی هريرة رضی الله عنه ان رسول الله صلی الله عليه و سلم قال لعن الله سبعة من خلقه من فوق سبع سموته وردد اللعنة علی واحد منهم ثلاثا ولعن كل واحد منهم لعنة تكفيه قال ملعون .....من عمل عمل قوم لوط،ملعون من عمل عمل قوم لوط ملعون من عمل عمل قوم لوط،الحديث (الترغيب والترهيب)

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے سات قسم کے لوگوں پر سات آسمانوں کے اوپر سے لعنت بھیجی ہے اور ان سات میں سے ایک پر تین تین دفعہ لعنت بھیجی ہے اور باقی پر ایک دفعہ، فرمایا ملعون ہے وہ شخص جو قومِ لوط والا عمل کرتا ہے۔ملعون ہے وہ شخص جو قومِ لوط والا عمل کرتا ہے۔ملعون ہے وہ شخص جو قومِ لوط والا عمل کرتا ہے)

وعن ابی هريرة رضی الله عنه ان النبی صلی الله عليه و سلم قال اربعة يصبحون فی غضب الله ويمسرن فی سخط الله قلت من هم يارسول الله قال المتشبهون من الرجال بالنساء والمتشبهات من النساء بالرجال والذی ياتی البهيمة والذی ياتی الرجال(الترغيب والترهيب)

Marfat.com

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار آدمی صبح کے وقت اللہ جل شانہ کے غضب میں ہوتے ہیں اور شام کو بھی اللہ جل شانہ ان سے ناراض ہوتے ہیں میں نے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ مرد جو عورتوں کی طرح بنتے ہیں اور وہ عورتیں جو مردوں کی طرح بنتی ہیں اور وہ شخص جو چوپایہ کے ساتھ غیر فطری حرکت کرتا ہے اور وہ مرد جو مرد سے قضائے شہوت کرتا ہے)

وعن ابن عباس رضی اللہ عنهما قال قال رسول الله من وجد تموه يعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول به (الترغيب والترهيب)

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کو تم قومِ لوط کی طرح غیر فطری حرکت کرتا ہوا دیکھ لو، تو فاعل اور مفعول دونوں کو مار ڈالو)

حافظ زکی الدین نے ترغیب وترہیب میں لکھا ہے کہ چار خلفاء حضرت ابوبکر صدیق ؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ، اور ہشام بن عبدالملکؒ نے اپنے زمانوں میں غیر فطری حرکت والوں کو آگ میں جلا ڈالا تھا۔

اس سلسلہ میں انہوں نے محمد بن المنکدر کی روایت سے ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو خط لکھا کہ یہاں عرب کے ایک علاقہ میں ایک مرد ہے، جس کے ساتھ عورت والا کام کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اس سلسلہ میں صحابہ کرام کو جمع کیا اور ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تشریف لائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کا ارتکاب سوائے ایک قوم کے کسی نے نہیں کیا اور اللہ جل شانہ نے اس قوم کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ آپ سب کو معلوم ہے میری رائے ہے کہ اسے آگ میں جلا دیا جائے۔ دوسرے صحابہ کرام نے بھی اس سے اتفاق کر لیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے آگ میں جلا دینے کا حکم دیا۔

مذکورہ روایات میں قومِ لوط کے عمل کا حوالہ بار بار آیا ہے، حضرت لوط علیہ السلام جس قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے، وہ قوم کفر وشرک کے علاوہ اس بدترین اور غیر فطری حرکت کی بھی عادی تھی اور جب حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کا ان پر اثر نہ ہوا تو اللہ جل شانہ کے حکم سے فرشتوں نے اس قوم کی بستیوں کو زمین سے اٹھالیا اور اوندھا کر کے زمین پر پھینک دیا، جس کا ذکر سورۂ اعراف میں آئے گا۔ انشاء اللہ

مندرجہ بالا روایات استلذاذ بالجنس سے متعلق تھیں، روایات میں عورتوں کے ساتھ غیر فطری فعل کرنے پر بھی شدید ترین وعیدیں آئی ہیں۔

عن ابن عباسؓ ان رسول الله صلى الله عليه و سلم قال لا ينظر الله عزوجل الى رجل اتى رجلا او امرءة فى دبرها. (الترغيب والترهيب)

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ جل شانہ اس مرد کی طرف رحمت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جو مرد یا عورت کے ساتھ غیر فطری فعل کرے)

Marfat.com

عن خزيمة بن ثابت قال قال رسول الله صلى الله عليه و سلم ان الله لايستحيى من الحق ثلاث مرات لاتأتوا النساء فى ادبارهن (الترغيب و الترهيب)

(خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ جل شانہ حق بیان کرنے میں شرم نہیں کرتے، یہ الفاظ آپ نے تین دفعہ ارشاد فرمائے (پھر فرمایا) عورتوں کے پاس غیر فطری طریقہ سے مت آیا کرو)

وعن ابی هريرة رضی اللہ عنہ ان رسول الله صلى الله عليه و سلم قال ملعون من اتى امرء ة فى دبرها. (الترغيب و الترهيب)

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے وہ شخص ملعون ہے جو غیر فطری طریقہ سے بیوی کے ساتھ جماع کرتا ہے)

وعنه ان رسول الله صلى الله عليه و سلم قال من اتى حائضا او امرء ة فى دبرها او كاهنا فصدقه فقد كفر بما انزل علىٰ محمد صلى الله عليه و سلم

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مرد حیض کی حالت میں بیوی کے ساتھ جماع کرتا ہے یا غیر فطری طریقہ سے اس کے ساتھ جماع کرتا ہے یا کسی کاہن کے پاس جاتا ہے اور غیب کے متعلق اس کی خبر کی تصدیق کرتا ہے تو ایسے لوگ اس دین سے منکر ہو گئے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا)

اس قبیح فعل کیلئے کسی معین حد کے مقرر کرنے میں تو فقہاء کا اختلاف ہے، جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے۔ تاہم اس کیلئے شدید سے شدید سزائیں منقول ہیں۔ مثلاً آگ میں جلا دینا، دیوار گرا کر کچل دینا، اونچی جگہ سے پھینک کر سنگسار کر دینا، تلوار سے قتل کر دینا وغیرہ۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○

(اللہ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری تو انہیں کیلئے ہے جو کرتے ہیں برا کام جہالت سے پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ وہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے ○ اور ان لوگوں کی توبہ نہیں ہے جو کیے جاتے ہیں برے کام یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوئی تو بولا کہ اب میں نے توبہ کر لی اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو کہ مرتے ہیں حالتِ کفر میں، ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے) (النسآء: ۱۷ تا ۱۸)

Marfat.com

ربطِ کلام اور اصلاح میں توبہ کی اہمیت

سابقہ دونوں آیات میں بداخلاقی میں مبتلا ہونے والوں کیلئے ایک عارضی قانون بھی دیا گیا ہے۔لیکن اصل زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ گناہ میں مبتلا ہونے والے اگر اللہ سے توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو پھر ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کرنے والوں اور سزا دینے والوں کے سامنے اصلاح اور توبہ کی اہمیت اور افادیت واضح کی گئی کہ اسلامی قانون کا اصل مقصد اصلاح ہے محض سزا دینا نہیں۔سزا دینے سے مقصود بھی اصلاح کی طرف راغب کرنا ہے۔البتہ سزا کے ذریعے ان لوگوں کو ختم کردیا جاتا ہے، جو اپنے آپ کو اصلاح سے محروم کرلیتے ہیں۔اللہ کے نبی دنیا میں لوگوں کی اصلاح کیلئے آتے ہیں، لوگوں کو مسخر اور مغلوب کرنے کے لئے نہیں آتے۔اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ کریم کا زورِ تبلیغ توبہ اور اصلاح پر صرف ہوا اور ان دونوں آیتوں کے نزول کے وقت توبہ اور اصلاح کے جذبات پیدا کرنے کی اور بھی زیادہ ضرورت تھی کیونکہ ابھی اسلامی ریاست بہ ہمہ وجوہ قائم نہیں ہوئی تھی، تو اس لئے ان آیات کے بعد فوراً توبہ پر مشتمل آیات نازل کی گئیں اور توبہ کا صحیح طریقہ بھی بتایا گیا اور توبہ کی ترغیب بھی دی گئی۔

اسلام سے پہلے جتنے مذاہب تھے وہ اگرچہ دنیوی اور اخروی کامیابی کے دعوے دار تھے۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ پوجا پاٹ کی چند ظاہری رسوم اور شریعت کے ایک بے جان ڈھانچے کے سوا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے۔ان کے دیئے ہوئے اعتقادات سے نہ تو انابت الی اللہ کے جذبات پیدا ہوتے تھے اور نہ کسی شخص کو اپنے اعمال کی اصلاح کی طرف توجہ ہوتی تھی اور اگر کبھی کسی شخص کو خیال پیدا ہوتا کہ میں ڈھیروں گناہ کرچکا ہوں اگر اللہ کے سامنے حاضری ہوئی تو کیا جواب دوں گا، مجھے اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنی چاہئے تو یہ مذاہب گناہوں سے نکل کر نیکی اور اطاعت کی زندگی اختیار کرنے کیلئے نہ صرف کہ اس کی کوئی مدد نہیں کرتے تھے بلکہ اسے مایوس کرتے تھے کہ ایک دفعہ گناہوں کی زندگی اختیار کرلینے سے آدمی اس کے نتائج سے بچ نہیں سکتا۔اسے بہرصورت اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔یہ ایک ایسا تصور تھا جس نے انسان کی کمر پر بے انتہا بوجھ لاد دیا تھا اور اسے اپنی اصلاح سے اور اپنے مستقبل کی تعمیر سے مایوس کردیا تھا۔ہندوؤں میں تناسخ اور آواگون کے تصورات اسی مایوسی کا نتیجہ تھے اور عیسائیوں نے اس کیلئے کفارہ کے نام سے ایک راستہ نکالا، جو نامعقولیت کے سوا کچھ بھی نہیں اور انہوں نے نجات کا سررشتہ مذہبی پروہتوں کے ہاتھ میں دے کر اصلاح اور توبہ کے عمل کو اور مشکل بنادیا اور انسان کی مایوسی کو اور گہرا کردیا۔

اسلام اہلِ دنیا کیلئے ایک نوید جاں فزا بن کر آیا۔اس نے انسانوں کو امید کی ایک روشنی دی، انہیں بتلایا کہ انسان کی معنوی اخلاقی اور روحانی زندگی اسی قانون کے مطابق چل رہی ہے جو قانون ہم اپنے گردوپیش میں کارفرما دیکھتے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ تکوینی اور تشریعی قوانین کا پیراہن جدا جدا ہے، لیکن ان کے اصل مزاج اور روح میں کوئی تضاد نہیں ہے۔جس طرح ایک درخت بیمار ہوتا ہے اور علاج سے درست ہوجاتا ہے، چارپائے بیمار ہوتے ہیں اور علاج سے شفا پاجاتے ہیں۔انسانی جسم بیماریوں کا شکار ہوتا ہے اور بروقت علاج سے درست ہوجاتا ہے بالکل اسی طرح انسانی روح کو بھی بیماریاں لگتی ہیں۔اس کی بیماری کبھی عقیدے کی خرابی ہے، کبھی اخلاق کا بگاڑ ہے، کبھی معاملات کی بے اعتدالی ہے، کوئی وجہ نہیں ہے کہ باقی مخلوقات کی طرح اس کی بیماریوں کا علاج نہ ہوسکے اور وہ بروقت علاج سے شفایاب نہ ہوسکیں۔چنانچہ جس طرح باقی اجسام کا علاج معالج کے پاس جانا اور اس کے بتائی ہوئی ادویہ کو استعمال کرنا ہے اسی طرح روحانی بیماریوں کا علاج بھی اللہ کی طرف پلٹنا اور اس کے پیغمبر کی ہدایات کے مطابق زندگی کے اعمال کو درست کرنا ہے۔اللہ کی طرف پلٹنے کو توبہ کہتے ہیں کیونکہ توبہ کا معنی ہی "پلٹنا

Marfat.com

اور رجوع کرنا'' ہے۔ایک بندہ جواللہ کی نافرمانی کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ کا آستانہ چھوڑ دیتا ہے اور شیطان یا اپنے نفس کا راستہ اختیار کر لیتا ہے ۔پھراسے احساس ہوتا ہے کہ میں اپنے آقا کا راستہ اور آستانہ چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کر گیا ہوں اب وہ اپنے غلط رویہ اور معصیت سے اللہ کی اطاعت کی طرف پلٹتا ہے اور دوبارہ پھر اس آستانے پر جھک جاتا ہے جسے وہ چھوڑ گیا تھا۔پھر وہ اپنے اعمال کا جائزہ لیتا ہے ان میں سے ہر وہ عمل جس سے اللہ کی نافرمانی جھلکتی ہے اسے وہ چھوڑ دیتا ہے اور بھلائیوں اور نیکی کے کاموں میں سبقت اپنا شعار بنالیتا ہے۔وہ کوشش کرتا ہے کہ مجھ سے جو کوتاہیاں ہوئی ہیں اس کی معافی مانگ کر میں اپنے اللہ کو راضی کرلوں۔یہی درحقیقت توبہ ہے۔

انسان جب بگاڑ کا شکار ہوتا ہے تو وہ صرف گناہ گار ہی نہیں ہوتا بلکہ انسانیت کی سطح سے بھی گر جاتا ہے کیونکہ انسانیت اور اللہ کی معصیت دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے ۔امام غزالی علیہ الرحمۃ نے اس کو اپنے خاص انداز میں خوبصورت تعبیر دی ہے۔امام صاحب فرماتے ہیں کہ گناہوں پر اقدام کے تین درجے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ کسی گناہ کا کبھی ارتکاب نہ ہو یہ تو فرشتوں کی خصوصیت ہے یا انبیائے کرام کی۔دوسرا درجہ یہ ہے کہ گناہوں پر اقدام کرے اور پھر ان پر اصرار جاری رہے کبھی ان پر ندامت نہ ہو اور نہ کبھی ان کے ترک کا خیال آئے یہ درجہ شیاطین کا ہے۔تیسرا مقام بنی آدم کا ہے کہ گناہ سرزد ہو تو فوراً اس پر ندامت ہو اور آئندہ اس کے ترک کا پختہ عزم ہو۔یہی وہ چیز ہے جس کا قرآنِ کریم نے بار بار حکم دیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بے شمار فضائل بیان فرمائے ہیں۔البتہ یہ ضروری ہے کہ اس توبہ میں حقیقت کا رنگ ہو محض الفاظ کا کھیل نہ ہو۔آدمی زبان ہی سے توبہ نہ کرے بلکہ اس کا پورا سراپا توبہ کی تصویر بن جائے۔اسی کو توبة النصوح کہا گیا ہے۔علماء کہتے ہیں کہ ایسی توبہ کے تین ارکان ہیں۔

توبہ کے تین ارکان

ا۔ اپنے کئے پر ندامت اور شرمساری، حدیث میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **انما التوبة الندم** ''توبہ نام ہی ندامت کا ہے۔'' آدمی اپنے گناہ پر اس حد تک نادم ہو کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا برسے اور دل اس تصور سے پگھلتا جائے کہ مجھ سے یہ جرم کیوں سرزد ہوا۔

۲۔ جس گناہ کا ارتکاب کیا ہے، اس کو فوراً چھوڑ دے اور آئندہ اس سے باز رہنے کا پختہ عزم کرے۔

۳۔ تلافیِ مافات کی فکر کرے یعنی جو گناہ ہو چکا ہے، اس کا جتنا تدارک ممکن ہو کرے۔یعنی نمازیں چھوٹ گئی ہیں تو تمام چھوٹی ہوئی نمازوں کا حساب کر کے ان کی قضا کرے۔روزے چھوٹ گئے ہیں تو ان کی بھی قضا کرے۔جتنے سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کی، حساب کر کے پوری زکوٰۃ ادا کرے۔جتنے لوگوں کے حقوق اس کے ذمہ ہیں سب کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرے۔جو لوگ مر چکے ہوں ان کی اولاد کو دے اور اگر کوئی بھی باقی نہ ہو تو پھر خیرات کر دے اور اللہ سے معافی مانگے۔جن کی دل آزاریاں کی ہیں عزتوں کو صدمہ پہنچایا ہے سب سے معافی مانگے اور اگر مالی حقوق ادا کرنے کی صلاحیت نہ رہی ہو تو پھر اہلِ حقوق سے معاف کرانے کی کوشش کرے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو زندگی بھر اللہ سے معافی مانگے۔اللہ فرماتا ہے کہ اگر واقعی تم ایسی توبہ کرو تو اللہ اسے قبول کرنے والا ہے۔بلکہ اس نے انسانوں کو سہارا دیتے ہوئے فرمایا: **لا تقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعاً** ''اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو اللہ سب گناہ بخش دے گا اس

Marfat.com

لئے کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ اگر کسی کے گناہوں سے زمین اور آسمان کی فضا بھر جائے اور وہ سچے دل سے توبہ کرے اللہ اسے بھی معاف کر دے گا کیونکہ

این درگہ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

جہالت کا مفہوم

پیشِ نظر آیات میں توبہ کیلئے چند شرائط کا ذکر فرمایا گیا ہے اور چند احتیاطیں سکھائی گئی ہیں۔ جن کے ملحوظ رکھنے اور پابندی کرنے پر اللہ تعالیٰ جیسے کریم نے وعدہ فرمایا ہے کہ ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرنا میری ذمہ داری ہے، یعنی میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی توبہ ضرور قبول کروں گا۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ ان لوگوں کی توبہ قبول ہوگی جو جہالت سے گناہ کا ارتکاب کریں۔ سوال یہ ہے کہ جہالت کا کیا مفہوم ہے؟ عام طور پر جہالت کا معنی بے علمی، بے خبری، نہ جاننا اور نادانی سے کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر قصداً اور عمداً گناہ کرے اس کا گناہ توبہ کرنے سے بھی معاف نہیں ہوگا۔

اکثر اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ اس آیت کا یہ مفہوم نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو گناہ تو قصد اور ارادے سے کرتا ہے لیکن اسے گناہ کرتے ہوئے اس بات کا احساس نہیں رہتا کہ اس گناہ کا نتیجہ کیا ہوگا، آخرت میں اس پر کتنی بڑی سزا ملے گی؟ اس انجامِ بد اور اخروی عذاب سے غفلت اس کے گناہ کا سبب بن جاتی ہے۔ تو اس آیت میں جہالت سے مراد یہی اخروی عذاب سے غفلت ہے۔ اسی سے ملتا جلتا معنی حماقت اور بے وقوفی بھی ہے۔ سورۂ یوسف میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے فرمایا تھا: هل علمتم مافعلتم بيوسف واخيه اذانتم جاهلون ''کیا تمہیں معلوم ہے جو تم نے یوسف اور اس کے بھائی سے کیا جبکہ تم جاہل تھے''۔ یہاں بھائیوں کو جاہل کہا گیا ہے حالانکہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ جان بوجھ کر اور عمداً کیا تھا۔ مگر انہیں اس کا اندازہ نہ تھا کہ اس فعل کا انجام کیا ہوگا؟ اور یہی بیوقوفی ہے اور اسی لئے ان کو جاہل کہا گیا۔ شائد اسی وجہ سے صحابہ کرام اس بات پر متفق تھے کہ بندہ جو گناہ کرتا ہے چاہے وہ بالقصد ہو یا بلا قصد وہ بہر حال جہالت ہے۔

ابو حیان نے تفسیر بحرِ محیط میں مثال سے سمجھایا کہ اس کو ایسا ہی سمجھو جیسے حدیث میں آتا ہے لايزني الزاني وهو مومن ''زنا کرنے والا جب زنا کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا''۔ یعنی وہ مومن ہونے کی حالت میں زنا نہیں کرتا کیونکہ جس وقت وہ اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے، تو ایمان کی طرف سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے یہی چیز جہالت ہے جو گناہ کا باعث بنتی ہے۔ لیکن بعض اہلِ علم اسی بات کو ایک اور انداز میں سلجھاتے ہیں وہ کہتے ہیں جہالت کا لفظ جس طرح نہ جاننے کے معنی میں آتا ہے اسی طرح جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی شرارت یا ظلم یا گناہ کا کام کر گزرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ان کا خیال ہے یہ لفظ عام طور پر علم کی بجائے حلم کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ معلقات کا مشہور شعر ہے

Marfat.com

الا لا یجھلن احد علینا

فنجھل فوق جھل الجاھلینا

(خبردار کوئی ہمارے خلاف جہالت کا اظہار نہ کرے کہ ہم بھی تمام جاہلوں سے بڑھ کر جہالت کرنے پر مجبور ہو جائیں)

اس شعر میں دیکھ لیجئے جہالت کا لفظ حلم کے ضد کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ شاعر اپنے مخالفوں سے کہہ رہا ہے کہ اپنے جذبات پر قابو رکھو اور اگر تم نے مشتعل ہو کر کوئی کام کیا تو پھر ہمارے اشتعال کو کوئی نہ روک سکے گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی کبھی جذبات سے مغلوب ہو کر (جبکہ ارادہ کام نہیں کرتا) کوئی گناہ کر گزرے اور پھر فوراً اس پر ندامت کا اظہار کرے اور اللہ کی طرف پلٹے تو اللہ اس کے گناہ کو معاف کر دے گا۔ میرا ناقص خیال یہ ہے کہ جہالت کو حلم کا ضد قرار دے لیں یا اسے حماقت کہہ لیں یا اخروی عذاب سے غفلت کی تعبیر اختیار کریں۔ مآل کار سب کا مفہوم ایک ہی ہے کہ آدمی گناہ ضرور اپنے ارادہ سے ہی کرتا ہے لیکن اس وقت اس کا ارادہ دوسرے احساسات سے مغلوب ہوتا ہے اور ایسا ہی گناہ گار ہے جسے توبہ کی توفیق نصیب ہو سکتی ہے اور جو شخص گناہ کو گناہ کے جذبے سے کرتا ہے ایسے شخص کے بارے میں بہت کم امید کی جا سکتی ہے کہ وہ کبھی گنہ سے پلٹنے کی کوشش کرے گا۔

اس آیت کریمہ میں دوسری شرط لگائی گئی ہے **من قریب** یعنی توبہ اس کی قبول ہو گی جو فوراً پہلی فرصت یعنی قریب زمانہ میں توبہ کرے۔ جن لوگوں نے اس لفظ کو عام معنی میں لیا ہے، وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ جس نے توبہ کرنے میں تاخیر سے کام لیا اس کی توبہ قبول نہیں ہو گی لیکن جب ہم احادیث کو دیکھتے ہیں تو یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ توبہ کی قبولیت کیلئے آنحضرت کے بعض ارشادات بالکل واضح ہیں معلوم ہوتا ہے من قریب کی یہی صحیح تعبیر ہے۔ آپ نے فرمایا: **ان اللہ یقبل توبۃ العبد مالم یغرغر** ''اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتے ہیں جب تک اس پر موت اور نزع روح کا غرغرہ طاری نہ ہو جائے''۔ ایک اور حدیث حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ''جو بندۂ مومن موت سے ایک مہینہ پہلے اپنے گناہ سے توبہ کرے یا ایک دن یا ایک گھڑی پہلے توبہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائیں گے بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ سچی توبہ کی جائے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان پر نزع کی کیفیت طاری نہیں ہوتی اور انسان موت کو سامنے نہیں دیکھ لیتا اس وقت تک اس کیلئے توبہ کا موقعہ ہے اور اللہ کی صفتِ کریمی سے امیدِ واثق ہے کہ جب بھی بندہ توبہ کرے گا اللہ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔

مولانا تھانوی نے تفسیر بیان القرآن میں ایک اور طرح سے اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ موت کے قریب دو حالتیں پیش آتی ہیں ایک تو یاس کی جب کہ انسان ہر دوا و تدبیر سے عاجز ہو کر یہ سمجھ لے کہ اب موت آنے والی ہے، اس کو حالتِ یاس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری حالت اس کے بعد کی ہے، جبکہ نزع روح شروع ہو جائے اور غرغرہ کا وقت آ جائے، اس حالت کو ''یاس'' کہا جاتا ہے۔ پہلی حالت یعنی حالتِ یاس تک تو **من قریب** کے مفہوم میں داخل ہے اور توبہ اس وقت کی قبول ہوتی ہے مگر دوسری حالت یعنی حالت یاس کی توبہ مقبول نہیں جبکہ فرشتے اور عالمِ آخرت کی چیزیں انسان کے سامنے آ جائیں کیونکہ وہ **من قریب** کے مفہوم میں داخل نہیں۔

دوسری آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کا رویہ ذکر کیا گیا ہے جو زندگی کے بارے میں عملی طور پر اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ زندگی بہت دراز ہے، ابھی سے آخرت کی باتیں کرنا زندگی کو بے رنگ اور بے نمک بنانے والی بات ہے۔ جس زندگی میں خوشیاں نہ ہوں اور عیش و عشرت کی

Marfat.com

امنگ نہ ہو وہ زندگی تو بوجھ بن جاتی ہے۔اس طرح کی زندگی جس میں آنے والی ناکامی کا خوف، جوابدہی کے اندیشے، موت کے لہراتے ہوئے سائے، بداعمالیوں کے پچھتاوے، طبیعتِ ثانیہ بن جائے، اس میں زندگی گزارنے کا کیا لطف رہ جاتا ہے۔نیکی کی باتیں اچھی باتیں ہیں، آخرت کی فکر بھی بجا ہے، لیکن جب بڑھاپا آئے گا تو یہ باتیں بھی ہو جائیں گی۔ آخرت کی تیاری بھی کرلیں گے، گزری ہوئی زندگی کی بد اعمالیوں کا جائزہ لے کر توبہ کا بھی سوچ لیں گے، لیکن ابھی اتنی جلدی کیا پڑی ہے۔ یہ زندگی کا وہ رویہ ہے جس میں عام اہلِ دنیا گرفتار ہیں۔ مومن، مومن ہوتے ہوئے بھی اپنی بے فکر زندگی پر مطمئن ہے اور کافر اپنے کفر پر غور کرنے کیلئے تیار نہیں۔ جوانی کی دیوانگی کسی کو فرزانگی کی خبر نہیں لینے دیتی۔ دنیا ایک نشہ ہے، جس میں ہر آدمی مخمور نظر آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس رویے پر تنقید کرتے ہوئے فرمارہے ہیں کہ توبہ کیلئے وہ رویہ درکار ہے جس کا ذکر گزشتہ آیت میں کیا گیا ہے۔ اسی رویہ کی وجہ سے توبہ کی دولت نصیب ہوسکتی ہے، ورنہ یہ رویہ جس کا ذکر اس آیت میں کیا جارہا ہے یہ تو سراسر بدقسمتی اور محرومی کا غماز ہے، جس میں آدمی برائیوں پر برائیاں کیے چلا جارہا ہے۔ لیکن اسے بالکل ہوش نہیں کہ میں کس طرح اپنی زندگی ضائع کررہا ہوں، مہلتِ عمل میرے ہاتھوں سے نکلی جارہی ہے۔ لیکن اچانک جب موت اس کے سر پر آ کھڑی ہوتی ہے، تو پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ اب میں اس دنیا کی طرف جانے لگا ہوں جس میں مجھے اپنی گزشتہ زندگی کا حساب دینا ہوگا۔ تو تب اسے خیال آتا ہے کہ اب میں اپنے اللہ سے معافی مانگوں اللہ فرماتا ہے کہ جب سکرات الموت طاری ہو جائیں اور آنے والی دنیا کی علامات ظاہر ہونے لگیں تو اس وقت کی توبہ اللہ قبول نہیں فرماتا۔ جس طرح جب فرعون ڈوبنے لگا تو اس نے فوراً اللہ پر ایمان لانے کا اعلان کیا۔ قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ اسے جواب دیا گیا: آلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ''اب تجھے یاد آیا، اس سے پہلے تو نافرمانی کرتا رہا ہے اور تو فساد پھیلانے والوں میں سے تھا''۔ اس کے بعد اس کو ڈبو دیا گیا۔

اسی طرح وہ آدمی جو کفر کی حالت میں ساری زندگی گزار دیتا ہے اور جب موت کی علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں اور فرشتے تک نظر آنے لگتے ہیں تو پھر وہ ایمان لانے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ فرماتا ہے کہ اس حال میں اس کا ایمان بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ ایمان لانا ہی اس کی توبہ ہے۔ توبہ کا وقت دوسری زندگی کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے ہے۔ یا اس کا مطلب شائد یہ ہے کہ جب ایک آدمی کفر کی حالت میں مرجاتا ہے، تو موت کے بعد عالمِ برزخ یا عالمِ آخرت میں اللہ سے دعائیں کرتا ہے کہ یا اللہ! مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج میں تیرے فرمانبردار بندوں جیسی زندگی گزاروں گا۔ ظاہر ہے اب اسے دوبارہ دنیا میں آنے کا موقعہ نہیں دیا جائے گا۔ اسے بتایا جائے گا کہ توبہ کا وقت موت سے پہلے تھا جو تم نے ضائع کر دیا۔

مختصر یہ کہ اللہ کا اپنے بندے پر کتنا بڑا انعام ہے کہ وہ زندگی کے آخری مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے پہلے اگر کسی وقت بھی اللہ کی طرف پلٹ آئے، معصیت کی زندگی چھوڑ دے، گناہوں سے توبہ کرلے، تو اللہ تعالیٰ نہائیت رحمت کا سلوک فرماتے ہیں۔ نہ صرف گناہ معاف کیئے جاتے ہیں بلکہ گزشتہ گناہوں کو سرے سے مٹا دیا جاتا ہے۔ اگر توبہ اور استغفار میں اخلاص اور ندامت کا بھرپور اظہار کیا جائے اور بندگی کا پورا سرمایہ اس کے آستانے پر ڈھیر کر دیا جائے تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ گناہوں کو نیکیوں کی شکل دے دیتا ہے اور گناہ گار کو اتنا نوازتا ہے کہ نوازشات کی انتہا ہو جاتی ہے۔ اس کی ندامت کے آنسو موتیوں کی طرح عزیز ہو جاتے ہیں اور اس کا پگھلتا ہوا دل اللہ کی رحمت و عنائت کا مورد بن جاتا ہے۔

Marfat.com

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

حقیقت یہ ہے کہ نیکی ایک بڑی سعادت ہے۔ لیکن گناہوں پر ندامت سحر گاہی کی آہیں اور نالہ نیم شب کا نیاز وہ سرمایہ ہے۔ جس سے بندگی کو رفعتِ پرواز مل جاتی ہے۔

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
اک بار خطا ہوجاتی ہے سوبار ندامت ہوتی ہے

عورتوں کے حقوق کے تحفظ اور معاشرے میں ان کے مرتبہ اور مقام کے حوالے سے ہدایات جاری تھیں کہ توبہ کے مضمون کیلئے تقریب پیدا ہوئی، چنانچہ دو آیتوں میں توبہ کے مضمون کو بیان کرنے کے بعد پھر اسی سلسلۂ مضمون کو لے لیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ○

(اے ایمان والو! تمہارے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن جاؤ اور نہ یہ بات جائز ہے کہ جو کچھ تم نے ان کو دیا ہے اس کا کچھ حصہ واپس لینے کیلئے ان کو تنگ کرو۔ مگر اس صورت میں کہ وہ صریح بدکرداری کی مرتکب ہوں اور بیویوں کے ساتھ خوش اسلوبی سے گزر بسر کیا کرو اور اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو بعید نہیں کہ ایک چیز تم کو ناپسند ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اس میں بڑی بھلائی پیدا کردے) (النسآء : ۱۹)

عرب جاہلیت کے ایک مکروہ رواج کی اصلاح

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں عورتوں پر جو ظلم ہوتا تھا اس کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ بعض طبقات میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص مرجاتا تو جس طرح مرنے والے کی جائیداد مال مویشی وارثوں کے حصے میں آتے تھے اسی طرح اس کی بیویاں بھی وارثوں کے قبضے میں آجاتی تھیں۔ یہ ظلم صرف عرب میں ہی نہیں تھا بلکہ یونانی تمدن اور رومی تمدن میں بھی یہی دستور تھا۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کا بڑا بیٹا اپنی سوتیلی ماؤں میں سے جن پر اپنی چادر ڈال دیتا وہ سب اس کے تصرف میں آجاتیں۔ وہ چاہتا تو ان سے نکاح کرلیتا اور زن وشو کا تعلق ان سے قائم کرلیتا۔ تَرِثُوا النِّسَآءَ سے شائد اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ صرف ان کے اموال وجائیداد پر ہی قبضہ نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے جسموں پر بھی قابض ہوجاتے تھے۔ اس کے علاوہ وارث ان پر جو مظالم کرتے تھے، مفسرین نے اس کی تین صورتیں لکھی ہیں۔

ایک یہ کہ عورت کا جو حق شرعی میراث میں نکل رہا ہوتا اسے خود لے لیا جاتا اور اسے اس سے محروم کردیا جاتا۔ دوسرا یہ کہ ان کو صرف اس لئے نکاح نہ کرنے دیا جاتا تاکہ وہ اپنا مال و دولت اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔ ان کو اسی طرح گھر میں رہنے پر مجبور کیا جاتا تاآں کہ اس

Marfat.com

موت آجاتی اور وارث اس کے مال پر قبضہ کر لیتے۔ تیسری صورت یہ تھی کہ بعض اوقات بیوی شوہر کو پسند نہ ہوتی تو وہ بلاوجہ اس کو پریشان کرتا ،حقوقِ زوجیت ادا نہ کرتا مگر طلاق دے کر اسے علیحدہ بھی نہ کرنا چاہتا۔ بہانے بہانے سے اسے اذیت دی جاتی تا کہ وہ تنگ آ کر وہ زیور اور زرِ مہر جو وہ اسے دے چکا ہے واپس کر دے اور اگر ابھی حق مہر نہیں دیا تو معاف کر دے، تب اسے آزادی مل سکتی ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ شوہر طلاق بھی دے دیتا لیکن پھر بھی اپنی مطلقہ کو کسی دوسرے سے نکاح نہ کرنے دیتا تا کہ وہ مجبور ہو کر اس کا دیا ہوا مہر واپس کرے یا واجب الادا مہر کو معاف کر دے۔ یہ سارے مظالم اس بنیا پر کئے جاتے تھے کہ وہ عورت کے مال بلکہ اس کی جان کو بھی اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ قرآنِ کریم نے اس تصور کی جڑ اکھاڑ ڈالی اور اس طرح تمام مظالم کا راستہ بند کر دیا۔ ارشاد فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ''اے ایمان والو! تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم جبراً عورتوں کے مال کے مالک بن بیٹھو''۔ یہ جبراً کی قید اس جگہ بطور شرط کے نہیں بلکہ بیانِ واقعہ کے طور پر ہے۔ کیونکہ عورتوں کو اللہ نے مردوں کی طرح آزاد ہستی دی ہے۔ ان کی اپنی ایک شخصیت ہے۔ جس طرح جبراً ان پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح وہ اپنی رضا سے بھی اپنے آپ کو کسی کی ملکیت میں نہیں دے سکتیں۔ اگر کوئی عورت اپنی بے وقوفی سے کسی کی مملوک بننے پر راضی ہو جائے تو اسلامی قانون اسے مملوک نہیں بلکہ آزاد ہی قرار دے گا۔ چونکہ اسلام میں جبر کا کوئی اعتبار نہیں اس لئے شریعت نے ایسے نکاح کو کالعدم قرار دیا ہے، جس میں عورت کی رضامندی شامل نہ ہو بلکہ جبراً اس سے نکاح کیا جائے۔ اسی طرح اگر کسی نے کسی عورت کو مجبور کر کے اس سے اپنا دیا ہوا مہر واپس لے لیا یا واجب الادا مہر کو جبراً معاف کروا لیا تو یہ جبری واپسی یا معافی شرعاً معتبر نہیں۔ نہ اس طرح لیا ہوا مال مرد کیلئے حلال ہوتا ہے اور نہ کوئی واجب حق اس طرح سے معاف ہوتا ہے۔

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اگر کسی شخص کو اپنی بیوی ناپسند ہو تو اسے اس بات کی ہرگز اجازت نہیں ہے کہ جو کچھ اس نے آج تک اس کو دیا ہے یا کھلایا، پلایا اور پہنایا ہے، اسے اگلوانے کیلئے اسے تنگ کرے اور جینا دوبھر کر دے۔ اگر وہ اسے چھوڑنا چاہتا ہے تو اس کیلئے بھی شریفانہ طریقہ اختیار کرے۔ لیکن اگر اسے رکھنا چاہتا ہے تو پھر کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ اس سے اس طرح کا رویہ اختیار کرے کہ میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ آج تک شوہر کی حیثیت سے حسنِ سلوک کیا ہے تحائف دیئے ہیں، نوازشات کی ہیں، سب واپس کرو۔ کیونکہ میاں بیوی کا تعلق جن نزاکتوں کا حامل ہے اس میں اس طرح کی باتوں کی کوئی گنجائش نہیں اور پھر دیئے ہوئے تحائف واپس لینا یا ادا کردہ مہر واپس طلب کرنا یا مزید کسی فائدے کی امید میں تنگ کرنا یہ تو سراسر کمینگی ہے۔ جس کی نہ عقل اجازت دیتی ہے اور نہ مرد کی مردانگی اسے گوارا کرتی ہے۔ ہاں ایک چیز ہے جو شوہر کو بیوی سے حسنِ سلوک ختم کر دینے کی اجازت دیتی ہے۔ جس کے بارے میں ارشاد فرمایا: اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ''مگر اس صورت میں کہ وہ کسی کھلی بدکاری کا ارتکاب کرے''۔

فَاحِشَة کا مفہوم

یہاں فَـــاحِشَة کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کا اطلاق عام طور پر زنا یا اخلاقی طور پر ناشائستہ حرکت پر ہوتا ہے۔ ایسی ناشائستہ حرکت جس کے بعد ایک شریف اور غیرت مند شوہر کیلئے ایسی بیوی کو رکھنا ناممکن ہو جائے۔ حضرت ابنِ عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس سے مراد بیوی کی طرف سے شوہر کی نافرمانی اور بدزبانی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عورت بے حیائی پر اتر آئے اور یا وہ اپنے شوہر کے مقابلے میں نشوز کا رویہ اختیار کر لے کہ ہر بات کا ترکی بہ ترکی جواب دے۔ آداب کو بالائے طاق رکھ دے، اور شوہر کے ادب

Marfat.com

واحترام کی پرواہ نہ کرے۔تب شوہر کیلئے مجبوری ہے کہ وہ ایسی عورت کو بیوی بنا کر نہیں رکھ سکتا۔وہ یقیناً طلاق دے گا۔طلاق کی صورت میں گھر اجڑے گا،نئی بیوی لانے کیلئے نئے اخراجات درکار ہوں گے۔ممکن ہے شوہر ان باتوں کا متحمل نہ ہو سکے۔اس لئے ایسے شوہر کیلئے اجازت ہے (چونکہ یہ ساری مشکلات بیوی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں) کہ وہ بیوی کو اس وقت تک روکے رکھے،جب تک وہ مہر معاف نہ کردے یا مہر لے چکی ہے تو جب تک واپس نہ کردے اور اگر کچھ اور بھی اسے دیا جا چکا ہے تو اسے واپس لے۔لیکن اگر بیوی سے ایسی کوئی نامناسب حرکت سرزد نہیں ہوئی اور وہ ایک شریف بیوی بن کر رہنا چاہتی ہے تو پھر شوہر کو اللہ سے ڈرنا چاہئے۔محض اس کے نین نقش یا رنگ روپ کو بہانہ بنا کر اسے تنگ کرنا یا کسی اور نامناسب بات کا سہارا لینا،اس کی کسی طرح بھی اجازت نہیں۔اسے حکم دیا جا رہا ہے: وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ''اور بیویوں کے ساتھ خوش اسلوبی سے گزر بسر کرو''۔اور اس خوش اسلوبی کا معیار وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے قائم کیا ہے۔

عورتوں کے حقوق کی تاکید

اسلام نے جس طرح مرد کے حقوق مقرر کیے ہیں اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق مقرر فرمائے ہیں۔شوہر کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ وہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق بیوی کے مصارف کی کفالت کرے۔کھانے پینے اور پہننے کی ذمہ داری معقول طریقے سے نبھائے۔اپنی حیثیت کے مطابق اس کے لئے رہائش مہیا کرے،بیمار ہو تو اس کا علاج کرائے،یہ تو وہ بنیادی حقوق ہیں جن کی ادائیگی بہر صورت لازم ہیں۔لیکن حسنِ سلوک اس سے زائد چیز ہے۔اس کا تعلق اس معاشرت،اس رہن سہن،اور اس رویے سے ہے جو شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔اگر ایک شخص اپنی بیوی کو ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرتا ہے۔لیکن اسے وقت نہیں دیتا،اس سے خندہ روئی سے پیش نہیں آتا،اس کے میل جول سے محبت کی خوشبو نہیں مہکتی،تو یہ ایک بدسلوکی ہے جس پر اللہ کے ہاں گرفت ہوگی۔کیونکہ حکم معروف طریقے سے معاشرت کا دیا گیا ہے اس میں یہ سب باتیں شامل ہیں۔اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہتر انسانوں کیلئے جو معیار ذکر فرمایا ہے وہ حسنِ کردار کے علاوہ بھی ہے: خیارکم خیارکم باھلہ ''تم میں بہتر وہ ہیں جو اپنے گھر والوں سے بہتر ہیں''۔اور آپ کا اسوہ یہ بات سمجھانے کیلئے کافی ہے کہ بیویوں کے ساتھ کس طرح کا رویہ ہونا چاہئے۔آپ کی نو بیویاں تھیں لیکن ہر بیوی کے ساتھ آپ کا سلوک اور آپ کا رویہ مثالی تھا۔ہر بیوی سمجھتی تھی کہ حضور مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔حالانکہ آپ سب سے محبت کرتے تھے۔کبھی ایک بیوی کو دوسری بیوی پر ترجیح نہ دیتے تھے اور کبھی کوئی ایسی بات نہیں فرماتے تھے جس سے کسی بیوی کو شکائت کا موقعہ ملے بلکہ آپ کا بیویوں کے ساتھ طرزِ عمل اس طرح کا تھا جسے ناز برداری کہنا چاہئے۔آپ کے گھر میں کسی نے بھنی ہوئی بکرے کی ران بھیجی۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی خدمت میں پیش کی،آپ نے حضرت عائشہ سے پہلے کھانے کیلئے فرمایا،لیکن حضرت عائشہ کی خواہش تھی کہ حضور پہلے کھائیں بچا ہوا میں کھالوں گی۔لیکن جب حضور نے اصرار فرمایا تو تعمیلِ حکم میں حضرت عائشہ نے دانتوں سے ران کو ایک طرف سے کھایا آپ نے ان کی دل جوئی اور ناز برداری اسی جگہ سے تناول فرمایا جہاں حضرت عائشہ کے دانتوں کے نشان لگے تھے۔

اندازہ فرمایئے!حضور ایک اولوالعزم پیغمبر بھی ہیں اور کائنات میں آپ کا مقام اور مرتبہ سب سے بالا ہے۔بایں ہمہ آپ کا طرز تمام بیویوں سے اسی طرح کا تھا۔آپ کے اسی اسوۂ حسنہ کا نتیجہ ہے کہ اس امت کے صالح لوگوں نے ہمیشہ اپنے گھر میں بھی آنحضرت کی

Marfat.com

کو زندہ رکھا ہے۔ مولانا تھانوی مرحوم کے پاس کسی نے تین خربوزے بھیجے۔ آپ نے ایک تو حاضرین میں تقسیم کر دیا اور دو کو نصف نصف کاٹ کر دونوں میں سے ایک ایک نصف، اپنی دونوں بیویوں کے گھر بھیجا۔ حاضرین میں سے کسی نے عرض کیا، حضرت آپ نے دونوں کاٹ کر ایک ایک حصہ دونوں کا دونوں گھروں میں بھیجا ہے، تو آپ نے بغیر کاٹے ایک ایک خربوزہ ایک ایک گھر میں کیوں نہ بھیج دیا۔ فرمایا: میں نے سوچا ممکن ہے ان میں سے ایک میٹھا نکلے اور دوسرا پھیکا تو ایک گھر میں میٹھا جائے گا اور دوسرے گھر میں پھیکا، یہ برابری نہیں ہوگی۔ اس لئے میں نے دونوں تقسیم کر کے برابر برابر بھیج دیئے تا کہ اللہ کے یہاں میں برابری نہ کرنے کے جرم میں پکڑا نہ جاؤں۔

مولانا تھانوی کے ایک خلیفہ ڈاکٹر عبدالحی عارف صاحب مرحوم کے بارے میں کہیں پڑھا کہ ایک دفعہ انہوں نے فرمایا کہ میرے نکاح کو باون سال ہوگئے ہیں۔ لیکن آج تک لڑائی تو دور کی بات ہے میں نے لہجہ بدل کر بھی کبھی اپنی بیوی سے بات نہیں کی۔ یہ وہ حسنِ معاشرت ہے جس کا یہاں حکم دیا جا رہا ہے۔ مزید فرمایا کہ اگر تمہیں کسی وجہ سے بیوی ناپسند ہے اور وہ وجہ ایسی نہیں ہے جسے شرعی کہا جاسکے بلکہ اس کا سبب شکل وصورت کا یا رنگ وروپ کا پسندیدہ نہ ہونا ہے، تو پھر یاد رکھو! یہ کوئی قابلِ نفرت چیز نہیں۔ قابلِ نفرت چیز اخلاقی فساد ہے۔ اگر سیرت اچھی ہے اور صورت زیادہ اچھی نہیں تو شوہر کو فوراً دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے۔ اسے حتی الامکان صبر وتحمل سے کام لینا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ آہستہ آہستہ اسے بیوی کے طور اطوار، رکھ رکھاؤ، سلیقہ شعاری اور خدمت کا جذبہ رائے بدلنے پر مجبور کر دے۔ ازدواجی زندگی ہمیشہ یکساں تو نہیں رہتی، کبھی مالی دشواریاں مسائل پیدا کر دیتی ہیں یا مشترکہ گھرانوں میں رشتوں کے نشیب وفراز بہت ساری الجھنیں پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں شکل وصورت کام نہیں آتی بلکہ حسنِ سیرت، حسنِ اخلاق، سلیقہ شعاری، اور دردمندی کام آتی ہے۔ تب شوہر کو احساس ہونے لگتا ہے کہ اگر میں نے گھر میں ایک چاندی کی گڑیا لا کر بٹھائی ہوتی تو میں اس کی پوجا تو کر سکتا تھا لیکن وہ میرے کسی کام نہ آتی۔ لیکن میری اس بیوی نے جس طرح میری مشکلات میں میرا ہاتھ بٹایا ہے اور جس طرح میرے تھکے ہوئے اعصاب کو گھر کے ماحول نے راحت بخشی ہے، یہ میرے لئے ایک ایسی نعمت ہے، جس کا کوئی بدل نہیں اور اس آیتِ کریمہ میں تو اللہ نے ایک ایسا وعدہ فرمایا ہے، جو ایسی صورتحال میں سوچنے سمجھنے والوں کیلئے بہت بڑا سہارا ہے۔ فرمایا: فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ''اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو''۔

عَسٰی کا لفظ اگر چہ امید کیلئے ہوتا ہے، لیکن یہی لفظ جب کسی بادشاہ کے منہ سے نکلتا ہے تو خوشی کے شادیانے بجنے لگتے ہیں اور اگر بادشاہوں کے بادشاہ سے اس کا صدور ہو تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں کتنا بڑا وعدہ مضمر ہے۔ جن لوگوں نے اس وعدے پر بھروسہ کر کے ناپسندیدہ بیویوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا اور اچھی زندگی گزاری انہوں نے واقعی اپنی آنکھوں سے اس وعدے کو پورا ہوتے دیکھا ہے۔ شوہر کے صبر کا پھل مختلف صورتوں میں ملتا ہے۔ کبھی صالح اولاد سے نوازا جاتا ہے، کبھی میاں بیوی کی باہم ہم آہنگی ہر چیز پر غالب آجاتی ہے، کبھی اللہ تعالیٰ گھر میں برکت عطا فرماتے ہیں، کبھی مختلف نیکیوں اور سعادتوں سے مالا مال کر دیا جاتا ہے، شرط یہ ہے کہ اللہ کے وعدے پر پورا بھروسہ کیا جائے اور اسی کی امید پر زندگی گزاری جائے۔

Marfat.com

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ○ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ○

(اگرتم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کرلو اور تم نے ایک کو ڈھیروں مال دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو کیا تم بہتان لگا کر اور کھلی ہوئی حق تلفی کر کے اس کو لوگے ○ اور آخر تم اس سے کس طرح لے لوگے جبکہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور انہوں نے تم سے مضبوط عہد لے رکھا ہے) (النسآء : ۲۰ تا ۲۱)

سابقہ آیتِ کریمہ میں بتایا گیا تھا کہ بیوی کی ناپسندیدگی کے باوجود پسندیدہ طریقہ یہی ہے کہ نبھانے کی کوشش کی جائے۔ طلاق بالکل آخری چارۂ کار ہے جسے ناگزیر حالات ہی میں استعمال کرنا چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ابغض الحلال الی الله الطلاق یعنی طلاق اگرچہ جائز ہے مگر تمام جائز کاموں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند اگر کوئی چیز ہے تو وہ طلاق ہے۔ دوسری حدیث میں ہے آپ نے فرمایا: تزوجوا ولا تطلقوا فان الله لایحب الذواقین والذواقات ''نکاح کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ اللہ ایسے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو بھنورے کی طرح پھول پھول کا مزہ چکھتے پھریں''۔

علیحدگی ناگزیر ہو تو اس کے لیے ہدایات

اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان سب ہدایات کے باوجود اگر تم نے ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری بیوی لانے کا ارادہ کر ہی لیا ہے اور تم سمجھتے ہو کہ اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں تو پھر ٹھیک ہے اللہ نے اس کی اجازت دی ہے کر گزرو۔ لیکن اگر تم نے اپنی بیوی کو حق مہر کی صورت میں یا تحائف کے طور پر (جو اس کی ملکیت بنا دیئے گئے ہیں)، خزانہ بھی دے رکھا ہے، تو اسے واپس لینے کی کوشش نہ کرو۔ قنطار کا معنی خزانہ ہے لیکن مراد اس سے ڈھیروں مال ہے۔ یعنی اگر تم ایک بڑی سے بڑی رقم بھی یا بڑی سے بڑی قیمت کی چیزیں بھی بیوی کو دے چکے ہو تو اب چونکہ تم نے طلاق کا فیصلہ کر لیا ہے تو گزشتہ زمانہ بالکل بھول کر ایک نئی طرح مت ڈالو۔ اگر تم نباہ نہیں کر سکے تو کم از کم علیحدگی تو خوش اسلوبی سے اختیار کرو۔ عام انسانوں کا معمول یہ ہے کہ جب وہ الگ ہونا چاہتے ہیں تو خوش اسلوبی سے الگ نہیں ہوتے۔ ہمارے معاشرے میں یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ میاں بیوی میں علیحدگی اس طرح ہونی چاہئے کہ دنیا بھر کو اس کی خبر ہو اور جو الزام ایک دوسرے پر لگایا جا سکتا ہو اس میں دریغ نہ کیا جائے۔ علیحدہ ہونے والی بیوی عام طور پر اس پوزیشن میں نہیں ہوتی کہ شوہر کو زیادہ پریشان کر سکے۔ اگرچہ ارادے اس کے بھی نیک نہیں ہوتے لیکن شوہر جب بیوی سے کچھ چھیننا چاہتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ سیدھی انگلیوں سے تو گھی نہیں نکلے گا۔ اس لئے بہتان لگا کر بیوی کو مجبور کر دو کہ لیا ہوا حق مہر واپس کرے اور اس کے علاوہ اگر کوئی تحائف وغیرہ ہیں تو وہ بھی واپس کر دے۔ لیکن قرآنِ کریم نے اسے کھلی حق تلفی قرار دیا ہے، کیونکہ بیوی کی علیحدگی کی صورت میں بھی اس کے وہ حقوق تو باقی رہتے ہیں جو ایک مسلمان کے ایک مسلمان پر ہیں۔ کسی مسلمان کی عزت پر حملہ کرنا یہ کسی بھی مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ چہ جائیکہ آدمی اپنی پہلی بیوی پر بہتان باندھے اور اس کی عزت کو محض چند ٹکوں کی خاطر خاک میں ملا دے۔

Marfat.com

دوسری آیتِ کریمہ میں نہایت تعجب سے مرد کی مردانگی کو غیرت دلا کر فرمایا کہ تم کیسے اپنا دیا ہوا مال اس سے واپس لے سکتے ہو جبکہ تم دونوں ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور ایک دوسرے کے سامنے بے حجاب ہو چکے ہو۔ اور اس طرح تم نے ایک مدت تک یک جان اور دو قالب ہو کر زندگی گزاری ہے۔ کیا علیحدگی کی تلخیاں اتنی شدید ہیں کہ تنہائیوں کے سارے تقاضے بھول جائیں؟ اور مال کی محبت میں بیوی جو تنہائیوں کی امین رہ چکی ہے، اسے بہتانوں اور تہمتوں کا ہدف بنا دیا جائے۔ اسی سلسلے میں مزید فرمایا کہ تم علیحدہ ہوتے ہوئے اس بات کو بھی بھول گئے ہو کہ تمہاری بیوی نے تم سے ایک مضبوط عہد لیا تھا۔ تم نے آپس میں ایک میثاقِ غلیظ باندھا تھا یعنی ایک مضبوط عہد و پیمان کیا تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ دینے کے وعدے کئے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ جب تم آپس میں نکاح کی شکل میں یہ عہد کر رہے تھے تو اگرچہ اس میثاق کے الفاظ نہائیت سادہ اور مختصر تھے لیکن اس کے پیچھے جو عزم پوشیدہ تھا اور اس کے اندر جو مضمرات اور تضمنات مخفی تھے اسے تم بھی جانتے تھے اور تمہارے دونوں خاندان بھی جانتے تھے۔ دونوں خاندان اس عہد و میثاق کی پشت پر تھے اور دونوں اس کے گواہ تھے۔ پھر تم نے اللہ کا نام لے کر اس عہد و پیمان کی گرہ باندھی تھی اور مخلوق کے ساتھ ساتھ تم نے اپنے خالق کو بھی اپنے اس عہد کا گواہ بنایا تھا۔ ذرا غور کیجئے! ایسے مضبوط عہد و پیمان کا انجام یہی ہونا چاہئے کہ وہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جائے اور خود اپنے ہاتھوں سے اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی جائیں۔ نہیں! ایسا ہرگز نہیں یہ ایک مضبوط عہد و پیمان ہے جو میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے۔ اسی عہد و پیمان کے نتیجے میں مرد کو حقوق ملتے ہیں، تو عورت کو بھی ملتے ہیں۔ ان حقوق کو جو بھی پامال کرنے کی کوشش کرے گا وہ اللہ کے ہاں جوابدہ ہوگا۔

وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ
اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقۡتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيۡلًا ۝

(اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے نکاح نہ کرو مگر جو کچھ ہو چکا۔ بے شک یہ کھلی بے حیائی اور نفرت کی بات ہے اور نہایت برا طریقہ ہے) (النسآء : ۲۲)

اس رکوع کے آغاز میں یہ بات گزر چکی ہے کہ عرب جاہلیت کے بعض طبقات میں یہ رواج تھا کہ باپ کی منکوحہ بیویاں بیٹے کو وراثت میں ملتی تھیں اور بیٹے بعض دفعہ ان سے نکاح بھی کر لیتے تھے اور اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ وہاں دوسری قباحتوں کے ضمن میں اس کے ارتکاب سے بھی روکا گیا تھا۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں اس انتہائی بیہودہ فعل کی حتمی ممانعت کر دی گئی اور صاف صاف حکم دیا کہ جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں یعنی جو تمہاری سوتیلی مائیں ہوں ان سے ہرگز نکاح مت کرنا۔ یہ صرف برائی نہیں بلکہ بے حیائی بھی ہے، قابلِ نفرت چیز بھی ہے اور بہت برا راستہ بھی ہے، اس راستے پر چلنے والے تباہی کے غار میں گرے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسلام نے اس کو فوجداری جرم قرار دیا ہے اور قابلِ دست اندازیِ پولیس ٹھہرایا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا جرم کرنے والوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے موت اور جائیداد کی ضبطی کا حکم دیا۔ ابنِ ماجہ نے ابنِ عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت نے یہ قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا تھا: من وقع علی ذات محرم فاقتلوہ ''جو شخص محرمات میں سے کسی کے ساتھ زنا کرے اسے قتل کر دیا جائے۔''

Marfat.com

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ
وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ
الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ
الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ
وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ
الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۲۳﴾

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ كِتٰبَ

اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ
مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ
فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا تَرٰضَیْتُمْ
بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِیْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۲۴﴾ وَمَنْ
لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ
مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِكُمْ
بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ
اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ
اَخْدَانٍ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ

Marfat.com

نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ
الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٥﴾

عربی رکوع ۴ (تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں، جنہوں نے تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہے، ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمہارا تعلق زن وشو قائم ہو چکا ہو اور اگر تم نے ان سے صحبت نہیں کی تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس نکاح میں اور تمہارے بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پشت سے ہیں اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو مگر جو پہلے ہو چکا، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ○ اور وہ عورتیں بھی حرام ہیں جو کسی کے نکاح میں ہوں مگر یہ کہ وہ تمہاری مِلکِ یمین بن جائیں یہ تم پر اللہ کا لکھا ہوا فریضہ ہے اور حلال کی گئی ہیں تمہارے لئے ان کے ماسوا عورتیں اس طرح کہ تم اپنے مال کے ذریعے سے ان کے طالب بنو، قیدِ نکاح میں لانے کو نہ بدکاری کے طور پر پھر ان میں سے جن سے تم نے تمتع کیا ہے تو انہیں ان کے مہر دو فریضہ کی حیثیت سے، تم پر کوئی گناہ نہیں جس پر تم آپس میں رضامند ہو جاؤ مہر مقرر کرنے کے بعد، بے شک اللہ خبردار حکمت والا ہے ○ اور جو تم میں سے مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے تو اسے چاہئے کہ تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے جو تمہارے قبضہ میں ہوں اور مومنہ ہوں، اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے، تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو۔ سو ان سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کر لو اور دستور کے مطابق ان کو ان کے مہر دو۔ وہ قیدِ نکاح میں آنے والیاں ہوں نہ مستی نکالنے والیاں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کرنے والیاں، پھر جب وہ قیدِ نکاح میں آ جائیں تو اگر وہ بدکاری کا ارتکاب کریں تو آزاد عورتوں کیلئے جو سزا ہے اس کی نصف سزا ان پر ہے۔ یہ اجازت تم میں سے ان لوگوں کیلئے ہے جن کو گناہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو اور یہ کہ تم صبر کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اللہ غفور الرحیم ہے) (آیات ۲۳ تا ۲۵)

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ
وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ
نِسَاۗىِٕكُمْ وَرَبَاۗىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَاۗىِٕكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۡ فَاِنْ لَّمْ

Marfat.com

تَكُوْنُوْا دَخَلْتُم بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۫ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ
وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

(تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی لڑکیاں، جنہوں نے تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہے، ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمہارا تعلق زن وشو قائم ہو چکا ہو اور اگر تم نے ان سے صحبت نہیں کی تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس نکاح میں اور تمہارے بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پشت سے ہیں اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو مگر جو پہلے ہو چکا، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے) (النسآء : ۲۳)

محرمات شرعیہ کی تفصیل

باپ کی منکوحہ سے نکاح کی حرمت کو بیان کرنے کے بعد ان تمام عورتوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جنہیں محرمات کہا جاتا ہے۔ یعنی جن سے نکاح کرنا حرام ہے۔ ان کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ **محرمات نسبیہ** یعنی وہ عورتیں جو رحمی رشتے کی قربتِ قریبہ کے باعث حرام ہوئی ہیں۔ یہ ہمیشہ کیلئے حرام ہیں۔

۲۔ **محرمات رضاعیہ** وہ عورتیں جو رضاعت کی وجہ سے حرام ہوئی ہیں، انہیں محرماتِ رضاعیہ کہا جاتا ہے۔ وہ بھی ہمیشہ کیلئے حرام ہیں۔

۳۔ **محرمات بالمصاهره** وہ عورتیں جو بیوی سے تعلق کی وجہ سے حرام ہوئی ہیں، انہیں محرماتِ بالمصاہرہ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ہمیشہ کیلئے حرام ہیں۔

۴:۔ وہ عورتیں جو کسی کے نکاح میں ہیں وہ دوسرے کے نکاح میں ہونے کی وجہ سے حرام ہیں۔ یہ اس وقت تک حرام ہیں جب تک دوسرے کے نکاح میں ہیں اور اگر یہ نکاح کا تعلق ختم ہو جائے تو پھر یہ حرمت ختم ہو جاتی ہے۔

محرمات نسبیہ

محرمات نسبیہ میں سے جن محرمات کو بیان کیا گیا ہے انہیں ہم ایک ترتیب سے بیان کرتے ہیں۔

۱۔ اُمَّهٰتُكُمْ ''تمہاری مائیں''۔ اس کا اطلاق جس طرح سگی ماں پر ہوتا ہے اسی طرح سوتیلی ماں پر بھی ہوتا ہے۔ پھر اسی حکم میں باپ کی ماں اور ماں کی ماں بھی شامل ہیں اور یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ ماں سے مراد ہر وہ عورت ہے جس سے باپ نے نکاح کیا ہو۔ چاہے اس سے میاں بیوی کے تعلق کی نوبت نہ آئی ہو۔ بس صرف عقد ہو جانے سے بیٹے کیلئے ہمیشہ کیلئے حرام ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر باپ نے کسی عورت سے ناجائز تعلق پیدا کیا ہو تو اس ناجائز تعلق کی وجہ سے وہ بھی بیٹے پر حرام ہے۔ اگرچہ سلف میں سے بعض بزرگو

Marfat.com

نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ تعلق زن وشو تو بڑی بات ہے اگر باپ نے کسی عورت کو شہوت سے ہاتھ بھی لگایا ہو تو وہ بھی بیٹے پر حرام ہے۔ اسی طرح سلف میں اس امر پر بھی اختلاف رہا ہے کہ جس عورت سے بیٹے کا ناجائز تعلق رہ چکا ہو وہ باپ پر حرام ہے یا نہیں۔ اور جس مرد سے ماں یا بیٹی کا ناجائز تعلق رہا ہو یا بعد میں ہو جائے اس سے نکاح ماں اور بیٹی دونوں کیلئے حرام ہے یا نہیں؟ اس باب میں فقیہانہ بحثیں بہت طویل ہیں۔ مگر یہ بات معمولی غور وفکر سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی شخص کے نکاح میں ایسی عورت کا ہونا جس پر اس کا باپ یا اس کا بیٹا بھی نظر رکھتا ہو یا جس کی ماں یا بیٹی پر بھی اس کی نگاہ ہو ایک صالح معاشرت کیلئے کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتی۔ شریعتِ الٰہی کا مزاج اس معاملہ میں ان قانونی موشگافیوں کو قبول نہیں کرتا جن کی بنا پر نکاح اور غیر نکاح اور قبل نکاح اور بعد نکاح اور لمس اور نظر وغیرہ میں فرق کیا جاتا ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ خاندانی زندگی میں ایک ہی عورت کے ساتھ باپ اور بیٹے کے یا ایک ہی مرد کے ساتھ ماں اور بیٹی کے شہوانی جذبات کا وابستہ ہونا سخت مفاسد کا موجب ہے۔ اور شریعت اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **من نظر الی فرج امرأة حرمت علیه امها وابنتها** ''جس شخص نے کسی عورت کے اعضاء صنفی پر نظر ڈالی ہو اس کی ماں اور بیٹی دونوں اس پر حرام ہیں'' اور **لا ینظر الله الی رجل نظر الی فرج امرأة وابنتها** ''اللہ اس شخص کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا جو بیک وقت ماں اور بیٹی دونوں کے اعضاء صنفی پر نظر ڈالے''۔ ان روایات سے شریعت کا منشا صاف واضح ہو جاتا ہے۔

۲۔ وَبَنٰتُكُمۡ ''اور تمہاری بیٹیاں'' تم پر حرام کی گئی ہیں۔ جس طرح صلبی بیٹی حرام ہے، اسی طرح اس کی لڑکی اور پوتی بھی حرام ہیں۔ یعنی اس حرمت کا اطلاق بیٹی، پوتی، پڑپوتی، نواسی، پڑنواسی، پر ہوتا ہے۔ اسی طرح سوتیلی لڑکی، جو دوسرے شوہر کی ہو اور بیوی ساتھ لائی ہو۔ اس سے نکاح کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ البتہ جو لڑکا یا لڑکی صلبی نہ ہو بلکہ لے پالک ہو ان سے اور ان کی اولاد سے نکاح جائز ہے بشرطیکہ کسی دوسرے طریقہ سے حرمت نہ آئی ہو۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی عورت سے زنا کیا تو اس نطفہ سے جو لڑکی پیدا ہو وہ بھی بیٹی کے حکم میں ہے اس سے بھی نکاح درست نہیں۔

۳۔ وَاَخَوٰتُكُمۡ : ''اور تمہاری بہنیں'' بھی تم پر حرام ہیں۔ اس کا اطلاق جس طرح سگی بہن پر ہوتا اسی طرح علاتی (باپ شریک) اور اخیافی (ماں شریک) پر ہوتا ہے۔ یہ بھی بھائی پر حرام ہیں۔

۴۔ وَعَمّٰتُكُمۡ ''اور تمہاری پھپھیاں'' بھی تم پر حرام ہیں۔ وہ چاہے باپ کی حقیقی بہنیں ہوں، علاتی ہوں یا اخیافی ہوں۔ تمام حرمت کے حکم میں داخل ہیں۔

۵۔ وَخٰلٰتُكُمۡ ''اور تمہاری خالائیں'' بھی تم پر حرام ہیں۔ اس سے مراد والدہ کی بہنیں ہیں۔ چاہے وہ حقیقی ہوں، علاتی ہوں یا اخیافی ہوں۔

۶۔ وَبَنٰتُ الۡاَخِ ''اور بھائی کی بیٹیاں'' یعنی بھتیجیوں سے بھی چچا کیلئے نکاح کرنا حرام ہے۔ یہ بھتیجیاں چاہے حقیقی ہوں، علاتی ہوں یا اخیافی یعنی تینوں طرح کے بھائیوں کی بیٹیوں سے نکاح حرام ہے۔

۷۔ وَبَنٰتُ الۡاُخۡتِ ''اور بہن کی بیٹیاں'' بھی تم پر حرام کی گئی ہیں۔ ان میں بھی وہی تعمیم ہے کہ چاہے حقیقی ہوں، علاتی ہوں یا اخیافی ہوں۔

Marfat.com

یہ سات محرماتِ شرعیہ ہیں، جن کی حرمت ابدی ہے۔ اس حرمت کا سبب ان کا رحمی رشتہ اور قرابتِ قریبہ ہے۔ پروردگار کو یہ ہرگز منظور نہیں کہ رحمی رشتے کے تقدس کو جنسی آلودگیوں سے آلودہ کیا جائے۔ پھر اس رشتے میں جو گہرائی ہے اس کا بھی تقاضا یہ ہے کہ اس پر صہری رشتوں کا سایہ نہ پڑنے دیا جائے تاکہ یہ خون کے رشتے ہر طرح کے جنسی جذبات سے محفوظ رہیں۔

محرمات رضاعیہ

اب ہم ان محرمات کی تفصیل بیان کرتے ہیں، جو رضاعت کی وجہ سے حرام ہیں۔

برصغیر میں رضاعت کے رشتے کی وہ اہمیت نہیں جو عرب میں رہی ہے۔ لیکن اسلام نے اس رشتے کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ وہ اس رشتے کو وہی اہمیت دیتا ہے جو رحمی رشتوں کو دیتا ہے۔ جو شخص کسی عورت کے سینے سے دودھ پیتا ہے وہ اگرچہ اس کی حقیقی ماں نہیں لیکن اس کی آغوش کے لمس اور اس کی چھاتیوں کی گرمی اور اس کے خونِ جگر نے دودھ کی صورت میں اس کے اندر اتر کر اسے ماں کا احترام اور وقار دے دیا ہے۔ جس طرح حقیقی ماں کا دودھ بچے کے رگ و پے میں دوڑتا ہے اور وہ ہر نازک موقعہ پر اپنے دودھ کے حوالے سے بات کرتی ہے کہ اگر تم نے یہ کام کیا تو میں تمہیں کبھی دودھ نہیں بخشوں گی۔ اسی طرح رضاعی ماں بھی دودھ کے اسی تقدس کے باعث اپنے رضاعی بیٹے کے احساسات کا حصہ بن جاتی ہے۔ جس طرح اس کا پیٹ اس کے دودھ سے سیراب ہوتا ہے اسی طرح اس کے جذبات اس تعلق سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس طرح سے وہ دودھ پلانے والی عورت بچے کی ماں بن جاتی ہے اور اس کا شوہر باپ کے حکم میں شامل ہو جاتا ہے اور تمام وہ رشتے جو حقیقی ماں اور باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں رضاعی ماں اور باپ کے تعلق سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔ اس حکم کا ماخذ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: یحرم من الرضاع مایحرم من النسب ”جو رشتے نسب سے حرام ہوتے ہیں وہی رضاعت سے بھی حرام ہو جاتے ہیں“۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ حرمتِ رضاعت کس قدر دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک جتنی مقدار سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اتنی ہی مقدار سے اگر بچہ کسی کا دودھ پی لے تو حرمتِ رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔ مگر امام احمد کے نزدیک تین مرتبہ پینے سے اور امامِ شافعی کے نزدیک پانچ دفعہ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ حرمت رضاعت اسی زمانہ میں دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے جو بچپن میں دودھ پینے کا زمانہ ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: انما الرضاعة من المجاعة ”رضاعت سے جو حرمت ثابت ہوتی ہے، وہ اسی زمانہ میں دودھ پینے سے ہوتی ہے، جس زمانہ میں دودھ پینے سے بچہ کا نشوونما ہوتا ہے“ کسی نے شیرخوارگی کی عمر کے بعد کسی خاتون کا دودھ پیا تو اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے اس نے پانی پی لیا۔ حضرت ام سلمہ اور حضرت عبد اللہ ابن عباس کی یہی رائے ہے۔ حضرت علیؓ سے بھی ایک روایت اسی معنی میں آئی ہے۔ زہری، حسن بصری، قتادہ، عکرمہ، اور اوزاعی بھی اسی کے قائل ہیں۔ البتہ امام ابوحنیفہ اڑھائی سال تک اور امام مالک دو سال سے کچھ عرصہ اوپر ہونے تک احتیاطاً مدتِ رضاعت تسلیم کرتے ہیں۔ بعض بزرگوں کی رائے یہ ہے کہ کسی عمر میں بھی دودھ پیا جائے حرمتِ رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔ یہی رائے حضرت عائشہؓ کی ہے۔ حضرت علیؓ سے بھی صحیح تر روایت اسی کی تائید میں منقول ہے اور فقہاء میں سے عروہ بن زبیر، عطاء لیث بن سعد اور ابنِ حزم نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

رضاعت کے حوالے سے جو عورتیں حرام کی گئی ہیں، ان میں سب سے پہلے

Marfat.com

۱۔ وَاُمَّھٰتُکُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَکُمْ ''تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے''۔ چاہے ایک دفعہ پلایا ہو اور چاہے متعدد دفعہ۔

۲۔ وَاَخَوٰتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَۃِ ''اور رضاعت کے رشتے سے تمہاری بہنیں'' ان سے بھی نکاح حرام ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب کسی لڑکی یا لڑکے نے ایامِ رضاعت میں کسی عورت کا دودھ پی لیا، وہ عورت اس کی رضاعی والدہ بن گئی اور اس عورت کا شوہر اس کا باپ بن گیا۔ اس عورت کی نسبی اولاد اس کے بہن بھائی بن گئے اور اس عورت کی بہنیں ان کی خالائیں بن گئیں اور اس عورت کا جیٹھ، دیور ان بچوں کے رضاعی چچا بن گئے اور اس عورت کے شوہر کی بہنیں ان بچوں کی پھوپھیاں بن گئیں اور باہم ان سب میں حرمتِ رضاعت ثابت ہوگئی۔ نسب کے رشتہ سے جو نکاح آپس میں حرام ہیں رضاعت کے رشتہ سے بھی حرام ہوجاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: یحرم من الرضاعة مایحرم من الولادة اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے: ان اللّٰہ حرم من الرضاعة ما حرم من النسب۔

اس تعلق کی وسعت دکھانے کیلئے ہم معارف القرآن سے چند مسائل نقل کرتے ہیں:

مسئلہ اگر ایک لڑکے اور ایک لڑکی نے کسی عورت کا دودھ پیا تو ان دونوں کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح رضاعی بھائی اور رضاعی بہن کی لڑکی سے بھی نکاح نہیں ہوسکتا۔

مسئلہ رضاعی بھائی یا رضاعی بہن کی نسبی ماں سے نکاح جائز ہے۔ اور نسبی بہن کی رضاعی ماں سے بھی حلال ہے اور رضاعی بہن کی نسبی بہن سے اور نسبی بہن کی رضاعی بہن سے بھی نکاح جائز ہے۔

مسئلہ منہ یا ناک کے ذریعہ ایامِ رضاعت میں دودھ اندر جانے سے حرمت ثابت ہوتی ہے اور اگر اور کسی راستہ سے دودھ اندر پہنچا دیا جائے یا دودھ کا انجکشن دے دیا جائے تو حرمتِ رضاعت ثابت نہ ہوگی۔

مسئلہ عورت کے دودھ کے علاوہ کسی اور دودھ (مثلاً چوپائے کا دودھ یا کسی مرد کا) سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

مسئلہ دودھ اگر دوا میں یا بکری، گائے، بھینس کے دودھ میں ملا ہوا ہو تو اس سے حرمتِ رضاعت اس وقت ثابت ہوگی جب کہ عورت کا دودھ غالب ہو اور اگر دونوں برابر ہوں تب بھی حرمتِ رضاعت ثابت ہوتی ہے، لیکن اگر عورت کا دودھ کم ہے تو یہ حرمت ثابت نہ ہوگی۔

مسئلہ اگر مرد کے دودھ نکل آئے تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

مسئلہ اگر دودھ پینے کا شک ہو تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی اگر کسی عورت نے کسی بچے کے منہ میں پستان دیا لیکن دودھ جانے کا یقین نہ ہو تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہ ہوگی اور نکاح کی حلت پر اس کا اثر نہ پڑے گا۔

مسئلہ اگر کسی شخص نے کسی عورت سے نکاح کرلیا اور کسی اور عورت نے کہا کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے تو اگر دونوں اس کی تصدیق کریں تو نکاح فاسد ہونے کا فیصلہ کرلیا جائے گا اور اگر یہ دونوں اس کی تکذیب کریں اور عورت دیندار خداترس ہو تو فسادِ نکاح کا فیصلہ نہ ہوگا، لیکن طلاق دے کے مفارقت کرلینا پھر بھی افضل ہے۔

مسئلہ حرمتِ رضاعت کے ثبوت کیلئے دو دیندار مردوں کی گواہی ضروری ہے ایک مرد یا ایک عورت کی گواہی سے رضاعت ثابت نہ ہوگی لیکن چونکہ معاملہ حرام وحلال سے متعلق ہے اس لئے احتیاط کرنا افضل ہے۔ حتیٰ کہ بعض فقہاء نے یہ تفصیل لکھی کہ اگر کسی عورت

Marfat.com

نے نکاح کرنا ہو اور ایک دیندار مرد گواہی دے کہ یہ دونوں رضاعی بھائی بہن ہیں تو نکاح کرنا جائز نہیں اور اگر نکاح کے بعد ہو تو احتیاط جدا ہونے میں ہے بلکہ اگر ایک عورت بھی کہہ دے تب بھی احتیاط اسی میں ہے کہ مفارقت اختیار کرلیں۔

مسئلہ جس طرح دو دیندار مردوں کی گواہی سے حرمتِ رضاعت ثابت ہوجاتی ہے، اسی طرح ایک دیندار مرد اور دو دیندار عورتوں کی گواہی سے بھی اس کا ثبوت ہوجاتا ہے۔ البتہ! احتیاط اسی میں ہے کہ اگر نصابِ شہادت پورا نہ ہو تب بھی شک سے بچنے کیلئے حرمت کو ترجیح دی جائے۔

محرمات صہریہ

وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ (اور تمہاری عورتوں کی مائیں) تم پر حرام کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی حرمت صہری رشتے کی وجہ سے ہے۔ یعنی بیوی کے حوالے سے عائد کی گئی ہے۔ یہاں بھی امہات میں تفصیل ہے کہ بیویوں کی ماؤں کا اطلاق نانیوں اور دادیوں پر بھی ہوتا ہے۔ وہ چاہے نسبی ہوں یا رضاعی ہوں۔ مزید یہ کہ جس طرح منکوحہ بیوی کی ماں حرام ہے اسی طرح اس عورت کی ماں بھی حرام ہے جس کے ساتھ شبہ میں ہم بستری کی ہو یا جس کے ساتھ زنا کیا ہو یا اس کو شہوت کے ساتھ چھوا ہو۔ البتہ! اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے محض نکاح ہوا ہو اس کی ماں حرام ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ، مالک، احمد اور شافعی رحمہ اللہ علیہم اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ جب تک کسی عورت سے خلوت نہ ہوئی ہو اس کی ماں حرام نہیں ہوتی۔

وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (ربائب، ربیبہ کی جمع ہے۔ بیوی کی پچھلگ لڑکی کو کہتے ہیں۔ اس کی حرمت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ شوہر نے اس کی ماں کے ساتھ زن وشو کا تعلق قائم کرلیا ہو لیکن اگر محض نکاح کیا ہے اور خلوتِ صحیحہ نہیں ہوئی تو پھر یہ لڑکی اپنے سوتیلے باپ کیلئے حرام نہیں ہوتی۔ بیوی سے نازک تعلق قائم ہونے کے بعد صرف بیٹی ہی حرام نہیں ہوتی، پوتی اور نواسی بھی حرام ہوجاتی ہے۔ اسی طرح نکاح کے بعد اگر شوہر نے اپنی بیوی کو شہوت کے ساتھ چھوا یا اس کے اعضاء صنفی کی طرف شہوت کی نگاہ سے دیکھا، تو یہ بھی ہم بستری کے حکم میں ہے، اس سے بھی اس عورت کی لڑکی یا پوتی یا نواسی سب حرام ہوجائیں گی۔

آیت کے اس حصے میں فِیْ حُجُوْرِكُمْ کا مفہوم یہ ہے کہ تمہاری بیوی کی دوسرے شوہر سے لڑکیاں تمہارے آغوشِ تربیت میں پلی ہوں لیکن اس کے بارے میں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا اس لڑکی کی حرمت سے کوئی تعلق نہیں، اسے محض حکم کو موثر بنانے کیلئے ذکر کیا گیا۔ اس کی حیثیت قید وشرط کی نہیں، اس لئے ایک ایسی خاتون جس سے اس کا شوہر تعلقِ زن وشو قائم کرلیتا ہے تو اس کی دوسرے شوہر سے بیٹی اس پر حرام ہوجاتی ہے چاہے وہ اس کے آغوشِ شفقت میں پلی ہو اور چاہے اس نے اسے دیکھا بھی نہ ہو۔ لیکن آغوشِ شفقت میں پلنے کا ذکر اس جذبے کو ضرور ابھارتا ہے جو باپ اور بیٹی کے درمیان ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے نگاہوں میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔

Marfat.com

بیٹوں کی بیویاں

وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ (اورتمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں) بھی تم پرحرام ہیں۔جس طرح بیٹے پر باپ کی منکوحہ حرام ہے اس طرح باپ پر بھی صلبی بیٹے کی منکوحہ حرام ہے۔اور بیٹے کے عموم میں پوتا،نواسا بھی شامل ہیں۔لہذاان کی بیویاں بھی اپنے دادا اورنانا پرحرام ہوں گی۔ مِنْ اَصْلَابِكُمْ کی قید سے مقصود یہ بتانا ہے کہ لے پالک بچے جنہیں متبنیٰ کہاجاتا ہے وہ صلبی بیٹوں کی طرح نہیں ہوتے۔اس لئے ان کی بیویوں سے نکاح حلال ہے۔البتہ!رضاعی بیٹانسبی بیٹے کی طرح ہے۔لہذااس کی بیوی سے بھی نکاح کرنا حرام ہوگا۔

جمع بین الاختین اور خالہ اور بھانجی اور پھوپھی اور بھتیجی کا جمع کرنا بھی حرام ہے

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ (دوبہنوں کونکاح میں جمع کرنا) بھی حرام ہے،چونکہ دونوں بہنوں میں رحمی رشتہ پایا جاتا ہےاوررحمی رشتوں کی بنیادرافت ورحمت پر ہےاوراگر یہ دونوں آپس میں سوکنیں بن جائیں تو پھر یہ رافت ورحمت کا جذبہ سوکنوں کے جلاپے اوررشک ورقابت کے جذبات میں بدل جائے گااور یہ انسانی فطری رشتوں کی شکست وریخت کا سبب بنے گا۔اس لئے دو بہنوں کوایک نکاح میں جمع کرناحرام قرار دیا گیا تا کہ ان نازک جذبات کوٹھیس نہ پہنچے۔جس طرح کارحمی رشتہ اورانتہائی قرابت دو بہنوں کے درمیان ہے اسی طرح یہ رشتہ خالہ اور بھانجی اور پھوپھی اور بھتیجی میں بھی ہے۔اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو بھی کسی ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے۔یہ بات بھی یادرہے کہ بہن کے لفظ میں عموم پایا جاتا ہے،جس طرح اس کا اطلاق حقیقی بہن پر ہوتا ہے اسی طرح علاتی اوراخیافی بہن پر بھی ہوتا ہےاور جس طرح اس کا اطلاق نسلی اورنسبی بہنوں پر ہوتا ہےاسی طرح اس کا اطلاق رضاعی بہنوں پر بھی ہوتا ہے۔لیکن یہ حرمت ابدی نہیں،عارضی ہے۔اگر کوئی شخص اپنی بیوی کوطلاق دےدے یا وہ وفات پاجائے تواس کیلئے اس کی بہن سے نکاح کرلینے میں کوئی حرج نہیں۔لیکن یہ جوازعدت گزرنے کے بعد ہےعدت کے دوران نکاح جائز نہیں۔

مَاقَدْسَلَفَ کا مفہوم

آخر میں فرمایا اِلَّا مَاقَدْ سَلَفَ اوراس سے پہلے بھی آیت نمبر۲۲ میں یہ لفظ گزر چکا۔اس سے مراد یہ ہے کہ حلت وحرمت کے جواحکام اب دیئے جارہے ہیں ان کا تعلق حال اور مستقبل سے ہے۔یہ موثر بہ ماضی نہیں ہوں گے۔جاہلیت کے زمانے میں تم جو کچھ کرچکے ہواب اس کے بارے میں بازپرس نہیں ہوگی۔تم نے اس سے پہلے اپنی سوتیلی ماؤں کے بارے میں جوروبہ اختیار کئے رکھایا دو بہنوں کوایک نکاح میں جمع کرتے رہے یا کئی کئی عورتوں کو بیک وقت نکاح میں رکھتے رہے۔اب اس کے متعلق بازپرس نہیں ہوگی۔البتہ!ان کی اصلاح ضروری ہے۔ہرکام کواسلام کے قانون کے شکنجے میں لانا ہوگا۔البتہ!گزشتہ معاملات کی تحقیق وتفتیش نہیں ہوگی،ان سے پیدا ہونے والے نتائج کوزیرِ بحث نہیں لایا جائے گا۔اگر کسی حرام تعلق کے نتیجے میں اولاد پیدا ہوچکی ہے،تواسے ماں باپ سے الگ نہیں کیا جائے گا۔ہاں!یہ ضرور ہوگا کہ ان میں سے جو چیزیں اسلامی احکام کے خلاف ہیں،انہیں اب اسلام کے مطابق کردیا جائے گا۔کسی کے نکاح میں دو بہنیں ہیں توایک کوطلاق دینا ہوگی۔کسی نے چار سے زیادہ بیویوں سے نکاح کررکھا ہے،توچار سے زیادہ بیویوں کوچھوڑنا ہوگا۔البتہ!ان معاملات پرسزا

Marfat.com

[illegible] بخشنے والا [illegible] کا تقاضا ہے کہ گزشتہ گناہوں پر نہ پکڑے اور اس کی رحمت کا [illegible] شامل نہ ہوں [illegible]

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۖ كِتَابَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَأُحِلَّ لَكُم مَّا
وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ ۚ فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ
فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُم بِهِ مِن بَعْدِ الْفَرِيضَةِ ۚ إِنَّ
اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا

[illegible] یہ تم پر اللہ کا لکھا ہوا فریضہ ہے اور [illegible] ان کے علاوہ [illegible] بطور فریضہ [illegible] حیثیت سے [illegible] بے شک اللہ علم و حکمت والا ہے (النساء: ۲۴)

منکوحہ عورت دوسرے کے لیے حرام ہے

[illegible] مسلمانوں کے لیے حرام ہے ان میں سے [illegible] شوہر [illegible] عورت [illegible] ایک سے زیادہ شوہر [illegible] ایک سے زیادہ مردوں [illegible] عورت کی فطرت اور اس [illegible] جو کچھ دیکھے اور سنے [illegible] تعجب [illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible] ہو جائے

[illegible]

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
یہ منظر دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

Marfat.com

اب پردہ اٹھتا جا رہا ہے اور وہ وہ باتیں سننے کو مل رہی ہیں جن کے تصور سے بھی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ میں لاہور کے لڑکیوں کے ایک بڑے کالج میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے گیا۔ وہاں نوعمر اور نوجوان طالبات نے جو مجھ سے سوالات کئے اور جن میں سے بعض سوالوں پر میں دیر تک پریشان رہا۔ ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ جس طرح مرد چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے، اسلام میں چونکہ بہت حد تک مساوات ہے، کیا اسلام عورتوں کو بھی چار مردوں سے نکاح کی اجازت دیتا ہے یا نہیں؟ اور اگر نہیں دیتا تو کیوں؟ اور کیا یہ عورت کے ساتھ زیادتی نہیں کہ جو حق مرد کو دیا جا رہا ہے اسے اس سے محروم رکھا جا رہا ہے؟

یہاں دیکھ لیجئے! قرآنِ کریم نے ایک شوہر والی عورت کو دوسرے کسی مرد کیلئے مطلقاً حرام کیا ہے۔ ایک مسلمان عورت کیلئے یہی بات کافی ہونی چاہئے کہ تحلیل و تحریم کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔ اللہ کے نبی بھی اپنے اختیار سے کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں ٹھہرا سکتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ایک عورت کیلئے دوسرے شوہر کو حرام ٹھہرایا ہے تو اس کے لیے یہ سوچنا بھی گناہ ہے کہ وہ کبھی کسی دوسرے شوہر سے تمتع کر سکتی ہے کیونکہ اللہ کے حکم نے جس چیز کو حرام ٹھہرایا ہے اسے کوئی اور قوت یا ہماری کوئی دلیل حلال نہیں کر سکتی۔ لیکن جدید تعلیم نے جو نتائج پیدا کئے ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ اللہ کا حکم سن کر اپنی رائے بدل لینے کیلئے ہم تیار نہیں ہوتے ہم اس کے بعد بھی دلیل کا تقاضا کرتے ہیں حالانکہ اللہ کے حکم کے بعد کسی اور دلیل کیلئے کیا گنجائش رہ جاتی ہے کیونکہ اللہ کے حکم کے بعد کسی اور دلیل کی اہمیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ دلیل کا وزن اللہ کے حکم سے زیادہ ہے اور دلیل دینے والے کی حیثیت اللہ کی حیثیت سے فائق ہے۔ حاکمِ مطلق صرف اللہ کی ذات نہیں بلکہ کوئی اور بھی ہے، یہ تمام تصورات اپنے اندر کفر کے اثرات رکھتے ہیں جس سے ہزار دفعہ اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ لیکن اگر اس سے ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو تاریخی لحاظ سے، عقلی طور پر، اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے کسی طرح بھی یہ بات قابلِ فہم دکھائی نہیں دیتی۔

تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب سے انسان نے شعور کی آنکھ کھولی اور اس نے اخلاقی اقدار کو پہچانا ہے اس وقت سے لے کر تہذیبِ مغرب کے پیدا ہونے سے پہلے تک کبھی بھی عورت کے لئے ایک سے زیادہ شوہر کا تصور بھی پیدا نہیں ہوا۔ مانی یا مزدک جیسے شہوت گزیدہ نفسیاتی مریضوں کو چھوڑ کر کسی صالح طبقہ میں دور دور تک آپ کو اس کے اثرات نہیں ملیں گے۔

جہاں تک عقل کا تعلق ہے وہ یہ کہتی ہے کہ انسان بعض دوسرے تصورات کے ساتھ ساتھ اولاد کے حصول کیلئے نکاح کرتا ہے۔ اگر ایک عورت کے ایک سے زیادہ شوہر ہوں تو وہ ایک شوہر سے حاملہ ہو جانے کے بعد دوسرے مرد سے تو حاملہ نہیں ہو سکتی۔ اب دوسرے شوہر کیلئے اس کے سوا کیا چارہ کار ہے کہ یا تو وہ ایک طویل وقت کیلئے انتظار کرے اور یا دوسری بیوی کا انتظام کرے اور پھر اس کا بھی کیا بھروسہ ہے کہ پہلے شوہر کے بچے کی ذمہ داریوں سے فارغ ہونے کے بعد وہ ضرور ہی دوسرے شوہر کے بچے کی ماں بنے۔ ہو سکتا ہے پھر پہلے شوہر کی قسمت یاوری کرے، ایسی صورت میں اس گھر کا مستقبل کیا ہوگا؟ جہاں یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

ایک عورت اپنے ساتھ کچھ کمزوریاں بھی رکھتی ہے وہ ایام مخصوص میں اپنے شوہر کے قابل نہیں ہوتی اور اگر وہ حاملہ ہو جائے تو دورانِ حمل آخری مہینوں میں وہ ایک شوہر سے تعلق رکھنا بھی تکلیف کا باعث سمجھتی ہے اور بعض صورتوں میں بیماری کا سبب بھی بن سکتا ہے، تو دوسرے شوہروں کے ساتھ وہ کس طرح تعلقات رکھ سکتی ہے؟ اور اگر دوسرے شوہر اس پر اصرار کریں تو کوئی عقلمند بتائے کہ ایسی صورت میں خاتونِ خانہ کی صحت کی ضمانت کون دے سکتا ہے؟ جبکہ ہر سنجیدہ فکر آدمی جانتا ہے کہ عورت بعض دفعہ ایک شوہر کے حقوق ادا کرنے پر بھی پوری طرح قادر

Marfat.com

نہیں ہوتی اور ایسی ہی مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے شریعت نے دوسری بیوی کی اجازت دی ہے۔ ورنہ کتنے ایسے صحت مند مرد ہیں جو ایسی صورتحال میں گناہ کی طرف مائل ہو کر معاشرے کے بگاڑ کا سبب بن سکتے ہیں۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ نکاح کا اصل مقصد تو اولاد حاصل کرنا ہے۔ ایک سے زیادہ شوہروں کی بیوی اگر امید سے ہوتی ہے تو ہمارے پاس کون سا ذریعہ ہے جس سے معلوم کر سکیں کہ یہ بچہ کس کا ہے؟ رہی یہ بات کہ آج D.N.A. ٹیسٹوں کے نتیجے میں اس کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے انجام پر ہم نے غور نہیں کیا۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ انسانی مشینیں نتیجہ دینے میں کبھی غلطی سے مبرّا نہیں ہوتیں۔ اولاد کے خواہش مند ہر باپ کے دل میں ان وسوسوں کا آنا اور بھی قرینِ قیاس ہے۔ ٹیسٹ جب اس کے خلاف نکلے گا تو اس کا دل و دماغ کیسا ردِعمل دکھائے گا؟ اسے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر ٹیسٹ کے نتیجے میں بننے والے باپ کو اس فیصلے سے یکسوئی نہ ہوئی تو وہ نومولود کے حوالے سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کی کفالت کہاں تک کرے گا؟ اس کا جواب دینا بھی آسان نہیں۔

جہاں تک اخلاقی نقطۂ نگاہ کا تعلق ہے نکاح کا سب سے بڑا مقصد ایک ایسے قلعہ کی تعمیر ہے جس میں میاں بیوی کا ایمان، شرم و حیا کی قدریں اور بیوی کا شرف عفت و عصمت پوری طرح محفوظ ہو۔ کسی کو کبھی یہ جرأت نہ ہو سکے کہ وہ اس قلعہ کی دیواروں کو پھلانگ سکے یا اس میں دراڑیں ڈال سکے اور اس قلعہ میں پلنے والی اولاد اخلاقی قدروں کی امین اور ماں باپ کے جذبۂ احترام سے مالا مال ہو۔ لیکن اگر ایک عورت ایک سے زیادہ مردوں سے نکاح کرتی ہے اور مرد اپنے ازدواجی تعلق کیلئے باری باری اپنی بیوی سے رجوع کرتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ ذہنی اور جسمانی طور پر بیوی پر کیا گزرتی ہے؟ اخلاقی طور پر وہ اپنی بیوی کے بارے میں کس طرح کے احساسات رکھتے ہیں اور بیوی اپنے ہر شوہر کے بارے میں کس قدر محبت کا جذبہ رکھتی ہے اور ایک گھر میں مختلف شوہروں کی اولاد کیا ماحول پیدا کرتی ہے؟ اور جب ان میں سے ہر ایک یہ سوچتا ہے کہ فلاں فلاں شخص جو میرا باپ نہیں لیکن میری ماں کا شوہر ہے تو اس کے اندر کی غیرت پر کیا قیامت گزرتی ہے؟ ان باتوں پر غور کرنے کے بعد کیا اس گھر کو گھر قرار بھی دیا جا سکتا ہے؟ کیا ایسے گھر اور قحبہ خانے میں کوئی فرق کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا اسلامی معاشرے کو واقعی کیا ایسے ہی گھروں کی ضرورت ہے؟ کیا ایسے ہی گھروں سے بننے والا معاشرہ اسلامی ریاست کیلئے تقویت کا باعث ہوگا؟ **فاعتبروا یا اولی الابصار**

مختصر یہ کہ شادی شدہ عورت سے نکاح اس لئے حرام کیا گیا ہے کہ فطری، عقلی اور اخلاقی طور پر کوئی اس کا جواز نہیں۔ ہاں! دوسرے نکاح کی ایک صورت ہے کہ کسی لونڈی سے نکاح کیا جائے، بے شک وہ پہلے کسی شخص کی بیوی ہو۔ **اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ** سے اسی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ

> جو غیر مسلم عورتیں جنگ میں گرفتار ہو کر مسلمانوں کے قبضے میں آئیں اور ان کے کافر شوہر دارالحرب میں موجود ہوں وہ حرام نہیں ہیں کیونکہ دارالحرب سے دارالاسلام میں آنے کے بعد ان کے نکاح ٹوٹ گئے۔ ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کیا جا سکتا ہے اور جس کی مِلک یمین میں ہوں وہ ان سے تمتع بھی کر سکتا ہے۔ البتہ فقہاء کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ اگر میاں بیوی دونوں ایک ساتھ گرفتار ہوں تو ان کا کیا حکم ہے؟ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ ان کا نکاح باقی رہے گا اور امام مالک و شافعی کا مسلک یہ ہے کہ ان کا نکاح بھی باقی نہ رہے گا۔

Marfat.com

لونڈیوں سے متعلق ضروری تفصیل

لونڈیوں سے تمتع کے معاملہ میں بہت غلط فہمیاں لوگوں کے ذہن میں ہیں۔ لہٰذا حسبِ ذیل مسائل کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہئے:

۱۔ جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں ان کو پکڑتے ہی ہر سپاہی ان کے ساتھ مباشرت کر لینے کا مجاز نہیں ہے بلکہ اسلامی قانون یہ ہے کہ ایسی عورتیں حکومت کے حوالہ کر دی جائیں گی۔ حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے ان کو رہا کر دے، چاہے ان سے فدیہ لے، چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ آ جائیں اور چاہے تو انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے۔ ایک سپاہی صرف اس عورت ہی سے تمتع کرنے کا مجاز ہے جو حکومت کی طرف سے باقاعدہ اس کی ملک میں دی گئی ہو۔

۲۔ جو عورت اس طرح کسی کی ملک میں دی جائے اس کے ساتھ بھی اس وقت تک مباشرت نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اسے ایک مرتبہ ایامِ ماہواری نہ آ جائیں اور یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے مباشرت کرنا حرام ہے اور اگر وہ حاملہ ہو تو وضعِ حمل سے پہلے مباشرت ناجائز ہے۔

۳۔ جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اہلِ کتاب ہی میں سے ہوں ان کا مذہب خواہ کوئی ہو جب وہ تقسیم کر دی جائیں تو جن کے حصہ میں وہ آئیں وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں۔

۴۔ جو عورت جس شخص کے حصہ میں دی گئی ہو صرف وہی اس کے ساتھ تمتع کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے کو اسے ہاتھ لگانے کا حق نہیں ہے۔ اس عورت سے جو اولاد ہو گی وہ اسی شخص کی جائز اولاد سمجھی جائے گی جس کی ملک وہ عورت ہے۔ اس اولاد کے قانونی حقوق وہی ہوں گے جو شریعت میں صلبی اولاد کے لئے مقرر ہیں۔ صاحبِ اولاد ہو جانے کے بعد وہ عورت فروخت نہ کی جا سکے گی اور مالک کے مرتے ہی وہ آپ سے آپ آزاد ہو جائے گی۔

۵۔ جو عورت اس طرح کسی شخص کی ملک میں آئی ہو اسے اگر اس کا مالک کسی دوسرے شخص کے نکاح میں دے دے تو پھر مالک کو اس سے دوسری تمام خدمات لینے کا حق تو رہتا ہے لیکن شہوانی تعلق کا حق باقی نہیں رہتا۔

۶۔ جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے اس طرح لونڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی۔ لیکن اس معاملہ میں کوئی حد مقرر نہ کرنے سے شریعت کا منشا یہ نہیں تھا کہ مالدار لوگ بے شمار لونڈیاں خرید خرید کر جمع کر لیں اور اپنے گھر کو عیاشی کا گھر بنا لیں بلکہ درحقیقت اس معاملہ میں عدمِ تعین کی وجہ جنگی حالات کا عدمِ تعین ہے۔

۷۔ ملکیت کے تمام دوسرے حقوق کی طرح وہ مالکانہ حقوق بھی قابلِ انتقال ہیں جو کسی شخص کو ازروئے قانون کسی اسیرِ جنگ پر حکومت نے عطا کئے ہوں۔

۸۔ حکومت کی طرف سے حقوقِ ملکیت کا باقاعدہ عطا کیا جانا ویسا ہی ایک قانونی فعل ہے جیسا نکاح ایک قانونی فعل ہے۔ لہٰذا کوئی معقول وجہ نہیں کہ جو شخص نکاح میں کسی قسم کی کراہت محسوس نہیں کرتا وہ خواہ مخواہ لونڈی سے تمتع میں کراہت محسوس کرے۔

Marfat.com

۹۔ اسیرانِ جنگ میں سے کسی عورت کو کسی شخص کی ملکیت میں دے دینے کے بعد پھر حکومت اسے واپس لینے کی مجاز نہیں رہتی۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی عورت کا ولی اس کو کسی نکاح میں دے چکنے کے بعد پھر واپس لینے کا حقدار نہیں رہتا۔

۱۰۔ اگر کوئی فوجی کمانڈر محض وقتی اور عارضی طور پر اپنے سپاہیوں کو قیدی عورتوں سے شہوانی پیاس بجھا لینے کی اجازت دے دے اور محض کچھ وقت کیلئے انہیں فوج میں تقسیم کرے، تو یہ اسلامی قانون کی رو سے قطعاً ایک ناجائز فعل ہے۔ اس میں اور زنا میں کوئی فرق نہیں اور زنا اسلامی قانون میں جرم ہے۔ (ماخوذ از تفہیم القرآن)

حاصل کلام یہ کہ جن عورتوں کی آپ نے تفصیل پڑھی ہے، یہ وہ چار قسم کی عورتیں ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کیلئے حرام قرار دیا ہے اور یہ اللہ کا قطعی حکم ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ البتہ! اس کے علاوہ جتنی عورتیں ہیں وہ سب مسلمانوں کیلئے حلال ہیں، لیکن دو شرائط کی پابندی ضروری ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ جس عورت سے تم نکاح کرنا چاہو اس کا مہر ضرور مقرر کرو۔ اگر کسی نے مہر مقرر نہ کیا تو پھر اسے وہ مہر ادا کرنا ہوگا جو اس کی منکوحہ جیسی لڑکیوں کا مہر مقرر کیا جاتا ہے یعنی جو اس کے خاندان جیسے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں، ان کا مالی پس منظر اس جیسا ہو، وہ حسن و جمال میں ان سے کم نہ ہو اور وہ اپنے اخلاق کے بارے میں اسی طرح نیک شہرت کی مالک ہو۔ جتنا حق مہر عام طور پر ان کا مقرر ہوتا ہے، وہی حق مہر مقرر نہ کرنے کی صورت میں اس کا مہر ہوگا۔ اس کو مہرِ مثل کہتے ہیں اور یہ شوہر کو ادا کرنا ہوگا۔ اگر کوئی شخص یہ نیت رکھے کہ جتنا بھی مقرر کر لیا جائے مجھے بہر حال ادا نہیں کرنا تو نکاح کے ایجاب و قبول کے باوجود نکاح نہیں ہوگا کیونکہ ایسے شخص نے نکاح کو کوئی سنجیدہ معاملہ نہیں سمجھا۔ وہ اسے محض جنسی تعیش کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ شریعت قید لگا کر اس معاملہ کو سنجیدہ بنانا چاہتی ہے تا کہ اسے لڑکوں کا کھیل نہ سمجھا جائے۔ نکاح کرنے والا اپنے دل میں یہ محسوس کرے کہ میں بظاہر ایک لڑکی سے تعلق پیدا کر رہا ہوں، لیکن حقیقت میں اس کے تحفظ کیلئے شرائط آسمان سے اتری ہیں اور مزید یہ کہ ان تحفظات کو اسلامی شریعت کے ساتھ ساتھ دونوں خاندانوں کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ نکاح سے مقصود عورت کو اپنی حمایت و حفاظت میں لینا ہو، یعنی نکاح کرنے والا اس بات کا یقین رکھتا ہو کہ نکاح دراصل ایک قلعہ تعمیر کرنا ہے۔ جس میں میں ہمیشہ اپنی بیوی کی عفت و عصمت کی حفاظت کروں گا اور اپنے بچوں کی تربیت کروں گا۔ اس کا مقصود کوئی شہوت رانی نہیں کہ ایک وقتی تلذذ اور جنسی آسودگی کے بعد یہ سمجھ لیا جائے کہ اب میری ذمہ داریاں ختم ہو گئی ہیں بلکہ یہ زندگی بھر کا سنجوگ ہے اور ایک ایسا عہد و پیمان ہے جس کے ایفا سے ایک صالح گھر تعمیر ہوتا ہے جس میں قوم کے مستقبل کے محافظ تیار ہوتے ہیں یہی گھر مضبوط خاندان کی خشتِ اول بنتا ہے اور اسی سے اسلام کا سیاسی نظام وجود میں آتا ہے۔

متذکرہ احساسات کے ساتھ متعہ میل نہیں کھاتا

ان احساسات اور شرائط کے ساتھ جو رشتہ وجود میں آتا ہے اس میں متعہ کا تصور کہاں راہ پا سکتا ہے۔ لیکن قرآن میں تحریف کی کوشش کرنے والوں کو داد دینی چاہیئے کہ انہوں نے **فما استمتعتم** سے متعہ کا جواز ڈھونڈ نکالا ہے حالانکہ اس آیت میں **استمتاع** کا معنی بیوی سے ہمبستر ہونا اور وطی کرنا ہے۔ یہاں یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ اگر ایک آدمی نکاح کرتا ہے اور بیوی سے تعلق پیدا کرنے سے پہلے ہی طلاق دے دیتا ہے تو مہر مقرر کرنے کی صورت میں آدھا مہر ادا کرنا واجب ہوگا۔ لیکن اگر اس نے بیوی سے استمتاع کر لیا۔ یعنی اس سے خلوتِ صحیحہ ہو گئی تو اب پورا مہر ادا کرنا ضروری ہے۔ اس میں کوتاہی کرنا شریعتِ اسلامی کے خلاف ہے۔ اندازہ فرمائیے! جس جملے سے عورت کی عفت

Marfat.com

عصمت اور اس کی عزت کی حفاظت کی گئی ہے اور جس کے لئے مہر کا ادا کرنا واجب ٹھہرایا گیا ہے اسی سے متعہ کا جواز کشید کرنا بڑی ذہانت کی بات ہے۔لیکن یہ وہ ذہانت ہے جو ایمان کے مفلوج ہو جانے کے بعد وجود میں آتی ہے۔جس شریعت نے نکاح کیلئے احصان اور مہر کی شرط لگائی ہے یعنی وہ اس نکاح کو تسلیم نہیں کرتا جس میں مہر ادا نہ کیا جائے اور بیوی کو اپنی حمایت اور حفاظت میں زندگی بھر لینے کا تہیہ موجود نہ ہو۔اور جو شریعت نکاحِ مؤقت کی اجازت نہ دے (یعنی نکاح بھی ہو مہر بھی ادا کیا جائے لیکن صرف ایک مقرر پیریڈ کیلئے نکاح کیا جائے تو وہ حرام ہے) ۔اس میں متعہ کا تصور کیسے پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ متعہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مرد کسی عورت سے یوں کہے کہ اتنے دن کیلئے اتنے پیسوں یا فلاں جنس کے عوض میں تم سے متعہ کرتا ہوں۔انصاف کیجئے! اس میں اور زنا میں کیا فرق ہے؟ زنا میں بھی زانی قیمت دے کر منہ کالا کرتے ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض دفعہ یہ مختصر وقت کیلئے ہوتا ہے اور بعض دفعہ ایک لمبی مدت کیلئے۔لیکن دونوں میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے واضح طور پر اس کی حرمت ثابت ہے۔

عن علی بن ابی طالب ان النبی صلی الله علیه و سلم نهی عن متعة النساء وعن لحوم الحمر الاهیة زمن خیبر

(حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے موقع پر عورتوں سے متعہ کرنے اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بخاری و مسلم میں بھی ہے۔

دوسری حدیث جو امام ترمذی نے نقل کی ہے وہ یہ ہے۔

عن ابن عباس قال انما کانت المتعة فی اول الاسلام حتی اذا نزلت الآیة الا علی ازواجهم اوماملکت ایمانهم قال ابن عباس فکل فرج سواهما فهو حرام

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں متعہ اسلام کے عہد اول میں مشروع تھا۔یہاں تک کہ آیت کریمہ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَامَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ نازل ہوئی تو وہ منسوخ ہو گیا۔اس کے بعد حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ زوجہ شرعیہ اور مملوکہ شرعیہ کے علاوہ ہر طرح کی شرمگاہ سے استمتاع حرام ہے)

مورخین لکھتے ہیں کہ مامون الرشید نے ایک دفعہ نجانے کس بہکاوے میں آ کر متعہ کے حلال ہونے کا حکم دے دیا اور باقاعدہ اس کی منادی کرادی۔چند علماء پریشانی کی حالت میں شیخ الاسلام کے پاس پہنچے۔انہیں سارا واقعہ سنایا کہنے لگے کہ تم دربار میں چلو میں تیار ہو کر آتا ہوں۔دربار پہنچے تو چہرہ اترا ہوا اور پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے۔خلیفہ مامون الرشید نے دیکھتے ہی پوچھا خیریت تو ہے آپ بہت پریشان دکھائی دیتے ہیں۔شیخ الاسلام نے کہا کہ اس سے بڑھ کر پریشانی کیا ہوگی کہ زنا حلال کر دیا گیا ہے۔مامون نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کس نے حلال کیا ہے؟ شیخ الاسلام نے کہا آپ نے۔آپ نے متعہ حلال قرار دے کر زنا کیلئے راستہ کھول دیا ہے۔مامون نے کہا: متعہ تو حلال ہے۔اس کی زنا سے کیا مشابہت؟ شیخ الاسلام نے کہا: قرآن کریم میں سورۃ المومنون میں مومنوں کی صفات بیان فرماتے

Marfat.com

ہوئے پروردگار نے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ (المؤمنون : ۵ تا ۷)

(مومن وہ لوگ ہیں جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ۝ سوائے اپنی بیویوں اور ان عورتوں کے جوان کی ملکِ یمین میں ہوں کہ ان پر محفوظ نہ رکھنے میں وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں ۝ البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں)

ان آیات میں دیکھ لیجئے! ایک مومن کیلئے جائز تعلق کی جگہ صرف دو ہیں۔ ایک بیوی دوسرے لونڈی۔ امیر المومنین! میری گزارش یہ ہے کہ جس عورت سے کوئی شخص متعہ کرتا ہے کیا وہ بیوی بن جاتی ہے؟ کیا وہ اپنے اس نام نہاد شوہر کی وارث ہوگی؟ امیر المومنین نے کہا کہ وہ بیوی تو نہیں۔ تو شیخ الاسلام نے پوچھا: کیا وہ لونڈی ہے؟ اس نے واقعی اسے خریدا ہے؟ مامون نے کہا: وہ لونڈی بھی نہیں۔ تو شیخ الاسلام نے کہا: نہ وہ بیوی ہے نہ لونڈی تو پھر وہ کس حیثیت سے حلال ہے؟ کیونکہ بیوی اور لونڈی کے علاوہ تو کوئی عورت مسلمان کے لئے حلال نہیں۔ امیر المومنین مامون الرشید نے فوراً اپنے فیصلے سے توبہ کی اور شہر میں اعلان کروا دیا کہ متعہ حرام ہے۔ کوئی اس کی جرأت نہ کرے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْ ۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(اور جو تم میں سے مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے تو اسے چاہئے کہ تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرلے جو تمہارے قبضہ میں ہوں اور مومنہ ہوں، اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو۔ سو ان سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرلو اور دستور کے مطابق ان کو ان کے مہر دو۔ وہ قیدِ نکاح میں آنے والیاں ہوں نہ مستی نکالنے والیاں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کرنے والیاں، پھر جب وہ قیدِ نکاح میں آجائیں تو اگر وہ بدکاری کا ارتکاب کریں تو آزاد عورتوں کیلئے جو سزا ہے اس کی نصف سزا ان پر ہے۔ یہ اجازت تم میں سے ان لوگوں کیلئے ہے جن کو گناہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو اور یہ کہ تم صبر کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اللہ غفور الرحیم ہے) (النسآء : ۲۵)

Marfat.com

لونڈی سے نکاح کی اجازت اور اس کی شرائط

ان آیات کے نزول کے وقت مسلمانوں کی مالی حالت نہایئت ناگفتہ بہ تھی۔ ہر آدمی آزاد خاندانی عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا۔ طول "غنا اور قدرت" کو کہتے ہیں کہ تم میں سے جو شخص آزاد خاندانی عورت سے نکاح کے اخراجات کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ آزاد خاندانی عورت کا حق مہر بھی زیادہ ہوگا، اس کی زندگی کے باقی اخراجات کی کفالت بھی اس کے خاندانی مالی حالات کے مطابق ہوگی، تو ایک غریب آدمی یقیناً اس کا متحمل نہیں ہوسکتا اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ اسلام نے برائی کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں، دلوں میں احساسات کو بیدار کر دیا ہے۔ جو نکاح کرنے پر قادر نہیں وہ گناہ کی زندگی بھی اختیار نہیں کرسکتا کیونکہ اللہ ہر وقت دیکھتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا کرے؟ اسے کوئی سہولت ملنی چاہئے اگر متعہ کی کچھ بھی اجازت ہوتی تو اس موقعہ پر ایسے لوگوں کو اس کی اجازت ملنی چاہئے تھی۔ لیکن اس کی بجائے یہ فرمایا: تم کسی مسلمان لونڈی سے نکاح کرلو۔ اس کا حق مہر یقیناً تھوڑا ہوگا اس کے اخراجات بھی ایک غریب عورت کے اخراجات ہوں گے، جسے ایک غریب آدمی برداشت کرسکتا ہے۔ البتہ! یہ لازمی شرط ہے کہ اسے مومنہ ہونا چاہئے، کافر لونڈی سے نکاح نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے ذہنوں مین یہ خیال آئے کہ لونڈی کے ایمان کا کیا اعتبار؟ اس لئے فرمایا کہ دلوں کا حال تو اللہ جانتا ہے آزاد ہونا ایمان کی مضبوطی کا ذریعہ نہیں۔ اس لئے ضروری نہیں کہ جو لونڈی ہو اس کے ایمان میں بھی کمزوری ہو۔ ہوسکتا ہے وہ ایمان میں آزاد عورتوں سے بلکہ تم سے بھی بہتر ہو۔ باقی رہا اس کا لونڈی ہونا تو یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے، تم سب انسان ہو آزاد بھی انسان ہے اور غلام بھی انسان ہے۔ حالات کے پھیر نے بعض لوگوں کو غلامی تک پہنچا دیا ہے۔ حقیقت میں تو سب حضرتِ آدم کی اولاد ہیں۔ اصل کے اعتبار سے تم میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے لونڈیوں سے نکاح کرتے ہوئے تمہیں ہرگز تامل نہیں ہونا چاہئے۔ البتہ یہ بات یاد رکھو! ان سے نکاح کرتے ہوئے ایمان کے ساتھ ساتھ مزید تین باتوں کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

۱۔ جس لونڈی سے تم نکاح کرنا چاہتے ہو تم نکاح کی بات چیت اس کے مالک اور اس کے آقا سے کرو گے۔ وہ اگر اجازت دے تو نکاح ہوگا اور اگر اجازت نہ دے تو نکاح نہیں ہوسکتا۔

۲۔ آزاد عورت کی طرح لونڈی کا بھی حق مہر ہے اور اس کا ادا کرنا بھی اسی طرح ضروری ہے۔ اس لئے اگر نکاح کرلو تو ان کے مہر بھی فرض سمجھ کر ادا کرو۔ مہر کی کمیت میں فرق ہوسکتا ہے لیکن اس کے فرض ہونے میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے اگر تم اس کا مہر ادا کرنے کی نیت نہیں رکھتے تو پھر اس نکاح کا بھی کوئی جواز نہیں۔

۳۔ ان کو نکاح میں لانے کیلئے بھی تمہارے ارادے پختہ اور نیک ہونے چاہئیں۔ ان کے ساتھ نکاح انہیں جذبات کے ساتھ کیا جائے جن جذبات کے ساتھ ایک آزاد عورت کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی بیوی کو نکاح میں لا کر عفت و عصمت کا ایک حصار تیار کیا یہ بات اچھی طرح دل و دماغ میں اتارنی ہے کہ میں شوہر کی حمایئت اور حفاظت میں جا رہی ہوں۔ میرا اس کے ہے، اب وہی میری عزت کا محافظ ہے اور میں اس کی پرائیویسی (Privacy) کی محافظ ہوں۔ اس نکاح سے انرجی ضائع کرنا نہیں اور نہ ایسا ہے کہ نکاح کرنے والی لونڈیاں چھپ چھپ کر آشنائی کرنے والی ہوں، نہایئت یہ رشتہ وجود میں آنا چاہئے۔

Marfat.com

اس حصنِ نکاح میں آجانے کے بعد ایک لونڈی محصنہ بن جاتی ہے۔ اب وہ اپنے شوہر کی حفاظت میں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا ایک تعلق اپنے آقا سے بھی ہے۔ اس کا آقا نکاح ہو جانے کے بعد اس سے تمتع تو نہیں کر سکتا لیکن خدمت کے لئے اسے طلب کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے کبھی وہ اپنے خاوند کے گھر میں ہوگی اور کبھی اپنے آقا کے گھر میں۔ خاندان کا وہ تحفظ جو ایک عورت کی جائے پناہ ہوتا ہے اور ماں باپ کا گھر جو اس کے لئے جنت ہوتا ہے وہ یقیناً اس لونڈی کو میسر نہیں۔ شوہر کا تحفظ اسے ضرور ملا ہے لیکن آقا کے رشتے نے اسے مکمل نہیں ہونے دیا۔ لیکن فی الجملہ اسے ایک پناہ گاہ مل گئی ہے۔ اس وجہ سے اب اس کے طور اطوار ہر طرح سے ایک مومنہ عورت کے ہونے چاہئیں۔ جس میں کسی بداخلاقی کا کوئی جواز نہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی اگر وہ کوئی بدکاری کا ارتکاب کرتی ہے تو اب چونکہ وہ مسلمان معاشرے کا ایک فرد بن گئی ہے۔ اسے برائی کے لئے آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا، اب اسے سزا ملے گی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسے ایک آزاد عورت جیسا خاندانی تحفظ حاصل نہیں اور اس کی ذمہ داری دو گھروں میں تقسیم ہونے کے باعث اس تحفظ کو اور بھی کمزور کر چکی ہیں۔ اس لئے اللہ کی صفتِ عدل نے اس کی اس کمزوری پر رحم فرمایا اور اس کی سزا میں تخفیف کر دی اور حکم دیا کہ اس کی سزا ایک غیر شادی شدہ آزاد لڑکی سے نصف ہونی چاہئے یعنی اسے پچاس کوڑے لگائے جائیں گے تاکہ وہ آئندہ کیلئے ایسی کسی برائی کا سوچ بھی نہ سکے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ یہاں محصنات کا لفظ دو دفعہ آیا ہے اور دونوں دفعہ الگ الگ معنی میں استعمال ہوا ہے۔ محصنات محصنہ کی جمع ہے۔ اس کا ایک معنی ہے "شادی شدہ عورت"، اور دوسرا معنی ہے "آزاد کنواری لڑکی"۔ یہ لفظ لونڈی کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔ آخر آیت میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ لونڈی سے شادی کرنے کی اجازت صرف ان لوگوں کو ہے جو آزاد خاندانی عورت سے نکاح کرنے کی مقدرت نہ رکھتے ہوں اور ساتھ ہی انہیں یہ بھی خطرہ ہو کہ اگر میں نے نکاح نہ کیا تو شائد میں بندِ تقویٰ کو ٹوٹنے سے نہ بچا سکوں، ممکن ہے کسی گناہ میں آلودہ ہو جاؤں۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ لونڈی سے نکاح کرنا کوئی فروتر بات ہے۔ نہیں! اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ وہ لونڈی اپنے آقا کی بھی خدمت کرے گی اور اپنے شوہر کی بھی۔ عین ممکن ہے کہ اس کا شوہر اس منقسم زندگی سے مطمئن نہ رہے اور اس کا اس کے آقا کے پاس جانا اسے اچھا نہ لگے اور یہی چھوٹی چھوٹی باتیں اس کی آسودگی کیلئے پھانس بن جائیں۔ اس لئے فرمایا: اگر تم صبر کرو اور اچھے حالات کا انتظار کرو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ اللہ بخشنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے۔

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ
وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦﴾ وَاللّٰهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ
عَلَيْكُمْ ۚ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا
عَظِيمًا ﴿٢٧﴾ يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ

Marfat.com

ضَعِيْفًا ﴿٢٨﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ
بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۟ قف وَ
لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿٢٩﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ
ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ
عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿٣٠﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ
عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿٣١﴾ وَلَا تَتَمَنَّوْا
مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ
مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَسْئَلُوا اللّٰهَ
مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿٣٢﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا
مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ
فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿٣٣﴾ ع

عربی رکوع ۵ (اللہ چاہتا ہے کہ بیان کرے تمہارے لئے اور ہدایت دے تمہیں ان لوگوں کے طریقوں کی جو تم سے پہلے تھے اور تم پر رحمت کی نگاہ کرے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے ٥ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم پر رحمت کی نگاہ فرمائے اور وہ لوگ جو اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ تم پھر جاؤ راہ سے بہت دور ٥ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے ٥ اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے اور ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر بڑا مہربان ہے ٥ اور جو شخص یہ کام کرے گا تعدی اور ظلم سے تو ہم اس کو ایک سخت آگ میں جھونک دیں گے اور یہ اللہ کیلئے بہت ہی آسان ہے ٥ اگر تم بچتے رہو ان بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تم روکے جا رہے ہو تو ہم تم سے تمہاری چھوٹی برائیاں جھاڑ دیں گے اور تم

Marfat.com

کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے ○ نہ تمنا کرو اس چیز کی جس میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے۔ مردوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انہوں نے کمایا اور اللہ سے اس کے فضل میں سے حصہ مانگو، بیشک اللہ ہر چیز سے باخبر ہے ○ ہر ایک کیلئے ہم نے مقرر کر دیئے ہیں وارث اس مال کے جو والدین اور قرابتدار چھوڑ جائیں۔ رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو ان کا حصہ انہیں دے دو، بیشک اللہ ہر چیز پر نگران ہے) (آیات ۲۶ تا ۳۳)

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○

(اللہ چاہتا ہے کہ بیان کرے تمہارے لئے اور ہدایت دے تمہیں ان لوگوں کے طریقوں کی جو تم سے پہلے تھے اور تم پر رحمت کی نگاہ کرے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے) (النسآء : ۲۶)

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

امتِ مسلمہ کے نام سے جو نئی امت تشکیل پا رہی ہے اس کے حوالے سے سورۂ بقرۃ میں اور پھر سورۃ نساء میں یہاں تک معاشرت، تمدن اور تہذیب کی تشکیل و تعمیر کیلئے ہدایات جاری تھیں کہ درمیان میں یہ تین آیتیں ایک خاص مقصد کیلئے نازل کی گئیں اور اس کے بعد پھر اصلاحی ہدایات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے۔ ان تین آیتوں میں سے سب سے پہلی آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ امتِ اسلامیہ کا ظہور اس طرح نہیں جس طرح کبھی بین الاقوامی حالات کے الٹ پھیر سے اچانک نئی قوم وجود میں آجاتی ہے۔ اگرچہ اس کے پیچھے بھی قضا و قدر کا فیصلہ ہوتا ہے لیکن اس کا وجود حالات کے نتیجے سے زیادہ کسی بڑے مقصد کا حامل نہیں ہوتا۔ وہ باقی قوموں کی بھیڑ میں ایک اضافے کے طور پر اپنا وجود باقی رکھتی ہے اور انہیں جیسے طور اطوار اختیار کر کے زندگی گزارتی رہتی ہے۔ لیکن امتِ مسلمہ کا وجود حالات کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ کا فیصلہ ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ اس کی زمین فساد سے بھر گئی ہے، بر و بحر میں فساد پھیل گیا ہے، زمین کا کوئی حصہ اس فساد سے محفوظ نہیں۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ ایک نبی مبعوث فرما کر ایک امت اٹھائی جائے اور اس کے سامنے زندگی کے وہ تمام طریقے واضح کئے جائیں اور ان تمام اچھائیوں کی اسے ہدایت دی جائے جن پر چل کر اپنے اپنے وقتوں میں اللہ کے نیک بندوں نے فلاح پائی ہے، اللہ کی زمین خیر و صلاح سے معمور ہوئی ہے، زمین پر بسنے والوں نے سکھ کا سانس لیا ہے اور لوگوں نے اپنے فکر و عمل سے اللہ کی رضا کو دعوت دی ہے۔ آج شدید ضرورت ہے کہ زمین کو کسی بڑی تباہی سے بچانے کیلئے دوبارہ ان پر زندگی کے وہ طور اطوار کھولے جائیں اور ظاہر ہے اتنا بڑا کام اللہ کے فیصلے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ اس آیت میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو یُرِيْدُ اللّٰهُ سے بیان فرمایا ہے اور اس کی تاکید کیلئے لِيُبَيِّنَ پر ''لام'' کا اضافہ کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ارادۂ الٰہی دنیا کی طرف متوجہ ہو چکا ہے اور وہ اہلِ زمین سے بھلائی کا فیصلہ کر چکا ہے اور اس کیلئے امتِ مسلمہ کو چن لیا گیا ہے لیکن وہ افراد کا مجموعہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اعمال و کردار میں باقی افرادِ انسانی کی طرح نہیں ہوگی اس کا وجود انسانوں کے لئے بہار کا جھونکا بھی ہوگا لیکن مفسدین کیلئے ڈاکٹر کا خنجر بھی کیونکہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے ارادے کو بروئے کار لائیں گے۔

Marfat.com

اس آیت میں ایک طرف تو مخالفین کو تنبیہ کرنا ہے کہ تم اس امت کو غریب مسلمانوں کا گروہ سمجھ کر ان سے معاملہ نہ کرنا بلکہ ان کی مخالفت کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھنا کہ ان کے پیچھے اللہ کی قوت کارفرما ہے۔ یہ اس کے ارادے کی تکمیل کیلئے اٹھے ہیں، ان کے سر پر اللہ کی رحمت کا سایہ ہے اس لئے انہیں کسی طور شکست نہیں دی جاسکتی اور مسلمانوں کو یہ حوصلہ دینا ہے کہ تمہیں جو اصلاحی ہدایات دی جارہی ہیں یہ صرف تمہارے لئے نہیں بلکہ یہ ہدایات ہر دور میں ان لوگوں کو دی گئی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں کا مورد بنایا ہے اور اپنے بندوں کی اصلاح کیلئے چنا ہے اور پھر ان کے واسطے سے ارادۂ الٰہی کی تکمیل ہوئی ہے۔ اس لئے تمہیں قدم قدم پر مخالفتوں سے ضرور واسطہ پڑے گا لیکن تمہیں یہ اطمینان رکھنا چاہئے کہ تم اللہ کے سپاہی ہو جنہیں ایک عظیم مقصد کیلئے اٹھایا گیا ہے۔ اللہ جب کسی کو کسی عظیم مقصد کیلئے اٹھاتا ہے تو اسے جس طرح اپنی رحمتوں سے نوازتا ہے اسی طرح ان کی آزمائش کیلئے مصائب سے بھی گزارتا ہے کیونکہ

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

وَاللّٰهُ يُرِيۡدُ اَنۡ يَّتُوۡبَ عَلَيۡكُمۡ وَيُرِيۡدُ الَّذِيۡنَ يَتَّبِعُوۡنَ الشَّهَوٰتِ اَنۡ تَمِيۡلُوۡا مَيۡلًا عَظِيۡمًا ۝

(اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم پر رحمت کی نگاہ فرمائے اور وہ لوگ جو اپنی خواہشات کی پیروی کررہے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ تم پھر جاؤ راہ سے بہت دور) (النسآء : ۲۷)

مسلمانوں کے مقابل کون اور کیسے؟

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں سے یہ فرمایا جارہا ہے کہ تم جس جانکسل کشاکش سے گزر رہے ہو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تم سے جو رحمت کا سلوک فرمانا چاہتا ہے تمہیں اس کا مورد بنادیا جائے گا اور اس کی رحمتیں تم پر جھوم جھوم کر اتریں گی۔ لیکن یہ کبھی نہ بھولو کہ اس کشاکش میں جن لوگوں سے تمہیں واسطہ ہے وہ کیسے لوگ ہیں اور ان کے عزائم کیا ہیں؟ ایک طرف تو ان میں قدامت پرست جہلاء ہیں۔ جن کیلئے اپنے آباؤاجداد کی ہر بات جسے وہ مذہب کا رنگ دے چکے ہیں اور ہر رسم جو روایت کا درجہ پا چکی ہے کو زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ جب کبھی بھی جہالت کی ان باتوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے مذہب پر حملہ کیا جارہا ہے چنانچہ وہ پوری قوت سے مقابلے کیلئے اٹھتے ہیں۔ انہوں نے جب دیکھا کہ میراث میں لڑکیوں کو حصہ دیا جارہا ہے، بیوہ عورت کو سسرال کی غلامی سے نکلنے کا حق مل رہا ہے، دو بہنوں کے ایک ساتھ نکاح میں جمع کرنے کو ناجائز قرار دیا جارہا ہے، متبنّٰی کو وراثت سے محروم کیا جارہا ہے، اسی طرح کی دوسری اصلاحات سے انہوں نے محسوس کیا کہ ہم آج تک اپنی معاشرت کو جن بنیادوں پر قائم کیے ہوئے تھے ان میں سے ایک ایک کو ڈھایا جارہا ہے اور مزید یہ کہ ان میں سے بعض چیزوں کے نتائج کا حوالہ دے دے کر لوگوں میں اشتعال بھی پیدا کیا جارہا ہے، مثلاً جس طرح کے نکاح کو اسلام نے حرام ٹھہرایا ہے اور پہلے اس پر عمل ہوتا تھا اور اس کے نتیجے میں اولاد بھی ہوتی تھی تو یہ کہہ کر آگ لگانے کی کوشش کی گئی کہ اگر اس طرح کے رشتے ناجائز تھے تو ان کی اولاد بھی ناجائز ہوگی اور انہیں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو آج معاشرے کے جانے پہچانے لوگ ہیں تو ان کا کیا بنے گا؟ جب لوگ یہ کہیں گے کہ ان کا تو نسب ہی ثابت نہیں۔

Marfat.com

دوسری طرف یہودی تھے جنہوں نے صدیوں کی موشگافیوں سے ایک ایسی خانہ ساز شریعت ایجاد کرلی تھی جس نے اصل شریعت کو بیکار کر کے رکھ دیا تھا اور ایسے مصنوعی قوانین پیدا کر لئے تھے جن کے نتیجے میں بکثرت حلال چیزیں حرام کردی گئی تھیں اور حرام چیزیں حلال کردی گئی تھیں۔ بہت سارے توہمات کو قانونِ خداوندی میں داخل کرلیا تھا، اب جب کہ ان کو اسلام کی سیدھی سادی شریعت سے واسطہ پڑا جو اللہ کا آخری نبی اور قرآن پیش کررہا تھا تو وہ ہر بات پر مشتعل ہوتے اور ایک ایک چیز پر سو سو اعتراضات کرتے تھے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ یا تو قرآن ان کے فقہا کے تمام اجتہادات اور ان کے اسلاف کے سارے اوہام وخرافات کو شریعتِ الٰہی قرار دے ورنہ یہ ہرگز کتابِ الٰہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یہودیوں کے ہاں دستور تھا کہ ایامِ ماہواری میں ہندوؤں کی طرح عورت کو بالکل اچھوت سمجھتے تھے۔ نہ اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاتے نہ اس کے ہاتھ سے پانی پیتے، نہ اس کے ساتھ فرش پر بیٹھتے بلکہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ ایامِ مخصوص میں عورت ایک عضوِ معطل بن کر رہ جاتی یا گھر میں اس کی حیثیت ایک اچھوت کی طرح ہوتی۔ یہی رواج یہودیوں کے اثر سے مدینہ کے انصار میں بھی چل پڑا تھا۔ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا۔ آپ نے قرآن کریم کے حوالہ سے بتایا کہ ایامِ مخصوص میں عورت سے صرف مباشرت ناجائز ہے باقی تمام تعلقات میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، عورت عبادت نہیں کرسکتی باقی بھلائی کے ہر کام میں شریک ہوسکتی ہے۔ اس پر یہودیوں میں ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا اور انہوں نے لوگوں کو یہ کہہ کر مشتعل کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کوئی مذہب نہیں بلکہ ایک سازش ہے جو پہلے کے ہر معاشرتی سسٹم کو تباہ کردینا چاہتا ہے اور ہر حلال کو حرام اور ہر حرام کو حلال میں بدل دینا چاہتا ہے۔

تیسری طرف منافقین اور معاشرے کے وہ اوباش لوگ تھے جو اسلام کی معاشرتی اصلاحات کو اپنی نفسانی خواہشات کے خلاف ایک چیلنج سمجھتے تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ اباحیت اور فسق وفجور کا ایک ایک دروازہ بند کیا جارہا ہے اور عیاشی کے جتنے راستے ہیں ان پر پہرے لگائے جارہے ہیں۔ انسان کو نفسانیت کے چنگل اور خواہشات کی غلامی سے نکال کر خود آگاہی اور خدا آگاہی کی فضا مہیا کی جارہی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فسق وفجور کی تمام آزادیاں ختم ہوجائیں گی ان کیلئے یہ بات کسی طور بھی گوارا نہ تھی کہ محرم اور نامحرم کے شعور سے ہماری آزادیوں کو محدود کردیا جائے اور عورت کو اپنے حقوق کا شعور دے کر عورت پر ظلم وتعدی کے راستے بند کردیے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے ان اصلاحات کے مقابلے میں اس طرح پروپیگنڈا کیا کہ گویا یہ عورت کی آزادی محدود کرنے کی کوشش ہورہی ہے اور اس کے حقوق سلب کیے جارہے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ انسان نے علم وہنر میں کتنی ترقی کی ہے لیکن اس کی خواہشِ نفس جس طرح دورِ جاہلیت میں اس پر حکمران تھی اسی طرح آج بھی حکمران ہے۔ مغرب میں پوری قوت سے محرم اور نامحرم کا فرق مٹایا جارہا ہے، نکاح کے بندھن کو توڑنے کی کوششیں جاری ہیں۔ عورت کیلئے سر پر سکارف باندھ لینا بھی ان کے ہیجانِ نفس کیلئے ناگوار ہے۔ ساری دنیا کو رواداری اور آزادی کا درس دینے والے عورت کے سر پر کپڑے ایک چیتھڑا برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان کی بے حیائی پر کوئی تنقید کرے تو رجعت پسندی ہے اور وہ شرم وحیا کی ہر قدر کو مٹادیں رمکارمِ اخلاق کی معمولی باتوں کو بھی برداشت نہ کریں تو یہ تہذیب ہے۔

تیری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں ہے

Marfat.com

اَنْ تَمِیْلُوْا مَیْلًا عَظِیْمًا سے ایک اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جاہلیتِ قدیمہ ہو یا جاہلیتِ جدیدہ ہر دور کے نفسانی شہوات کے پیروکار اور سفلی جذبات کے پرستار صرف یہی نہیں چاہتے کہ ان کے لئے بے حیائی کے راستے کھلے رہیں بلکہ ان کا اصل زور اس بات پر ہے کہ جو لوگ ان کے حیوانی اور شہوانی رویے کو پسند نہیں کرتے اور اس کے مخالف ہیں انہیں بھی کسی طرح اس حد تک گمراہ کر دیں کہ وہ بھی یہی رویہ اپنانے پر مجبور ہو جائیں۔ یہ لوگ اپنی بربادی پر قناعت کرنے والے نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے بارے میں ان کے عزائم یہ ہیں:

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمعصر جاہلیت کے پرستار بھی اسی ڈگر پر چل رہے تھے اور آج کی جاہلیت کے علمبردار بھی اسی راستے کے مسافر ہیں۔ انہوں نے تہذیب وثقافت کے نام پر جس طرح انسان کو حیوان بنایا اور شرم وحیا کا ایک ایک ٹانکہ اس طرح توڑا کہ ان کے اندر سے شرافت، نجابت اور غیرت وحمیت کے تصورات یا رخصت ہو گئے یا اپنے معنی کھو گئے، جس کے نتیجے میں ان کا خاندانی نظام تباہی کے کنارے جا لگا۔ میاں بیوی کا رشتہ ایسا کچا دھاگا بنا کہ جس کے ٹوٹنے کی آواز بھی نہیں آتی۔ وفا ومحبت کے دعوے قصہ پارینہ بن گئے بار بار کی بے وفائی کے جھٹکے خودکشی کی صورت میں ڈھلنے لگے اور مغرب کی خوشحال آبادی لاکھوں کی تعداد میں خودکشی کی وارداتیں کرنے لگی۔ اولاد اور والدین کا رشتہ جوانیوں کی طغیانیوں میں بہہ گیا۔ اپنا گھر اجاڑ لینے کے بعد اب مغرب کی پوری کوشش ہے کہ مشرق کو بھی اس انجام سے دوچار کیا جائے۔ وہ اپنی تعلیم، تہذیب اور ثقافت کے زور سے مشرق کو بھی اپنے رنگ میں ڈبو دینے پر تل گئے ہیں۔ اب تو یہاں تک اندھیر ہو گیا ہے کہ جو ملک اپنی اخلاقی قدریں چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ان پر عجیب وغریب سیاسی اور معاشی پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔ ان کے حکمرانوں کو اپنے نصابِ تعلیم سے ہر ایسی چیز نکالنے پر مجبور کیا جاتا ہے جو اخلاق کا جذبہ ابھارتی اور اپنے اسلاف سے رشتہ جوڑتی ہے۔ فرانس جیسا ملک جو اپنے آپ کو جمہوریت کا منشا اور معاد سمجھتا ہے۔ وہاں ہر طرح سے جمہوری آزادیاں کارفرما ہیں لیکن سکولوں کی بچیاں اپنی مرضی سے سر پر سکارف نہیں باندھ سکتیں۔ غور کیجئے! سکارف کپڑے کا ایک مختصر سا ٹکڑا ہے جسے سر ڈھانپنے یا بال سنبھالنے کیلئے باندھ لیا جاتا ہے، آخر فرانس کی قوم یا اس کے معاشرے پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ لیکن عدالت کا غیر جانبدار ادارہ بھی اس معاملے میں حکومت کا شریکِ کار ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہیں کپڑے کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا اصل میں اس شرم وحیا کی یاد دلاتا ہے جو ان کی زندگیوں سے نکل چکی ہے اور وہ ہر دوسرے شخص یا دوسری قوم کے افراد میں سے نکال دینے پر تل گئے ہیں اور ان کا یہ پروپیگنڈا یا ان کا سیاسی اثر جس میں وہ پورے مغرب کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اس قدر مؤثر ہے کہ ان کے نقوشِ قدم پر چلنے والی مشرقی یا مسلمان حکومتیں بھی بے دینی اور بے حیائی کے ہر کام میں روادار ہیں۔ لیکن شرم وحیا کی عکاس کوئی چیز بھی انہیں بری طرح پریشان کر دیتی ہے۔ ترکی کی پارلیمنٹ میں ایک مسلمان خاتون جو ان کی نیشنل اسمبلی کی منتخب رکن ہے سکارف باندھ کر چلی جاتی ہے تو حکومت کے وزیراعظم، صدر اور نیشنل اسمبلی کے سپیکر تک کے حقوق مجروح ہو جاتے ہیں اور وہ اس عفت مآب خاتون کی رکنیت ختم کر دیتے ہیں کیونکہ اس نے سر پر یہ خطرناک کپڑا کیوں باندھا جس سے شرم وحیا کی بو آتی ہے۔ جس سے عفت اور پاکدامنی جنم لے سکتی ہے، جو کبھی حجاب اور نقاب تک کا مسئلہ پیدا کر سکتی ہے۔ اندازہ فرمائیے! اسلام اور اسلامی احکام جو کبھی ابوجہل جیسے لوگوں کو پریشان کرتے تھے آج وہ اہلِ مغرب اور ان کے راستوں پر چلنے والے مستغربین کو پریشان کرتے ہیں اور یہی اتباعِ شہوات کرنے والوں کی اصل منزل ہے۔

Marfat.com

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ○

اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے) (النسآء : ۲۸)

ایک اہم حقیقت

اس آیتِ کریمہ میں جس حقیقت کو منکشف فرمایا گیا ہے وہ ایک طرف تو سراسر اللہ کا احسان ہے اور دوسری طرف ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی خودساختہ غلط فہمیوں کا علاج بھی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت انسان جس طرح سوچتا تھا آج کا دانشور بھی اسی طرح سوچتا ہے۔ وہ بھی اللہ کی شریعت کو اپنی آزاد زندگی کیلئے اک پابندی سمجھتا تھا اور آج کا دانشور بھی یہ سمجھتا ہے کہ شریعت کے احکام ایک زنجیریں ہیں جن کو پہن لینے کے بعد آدمی دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ اس کی خواہشات محدود ہو جاتی ہیں ایک آسودہ زندگی اس کیلئے خواب وخیال ہو کر رہ جاتی ہے وہ سوائے اس کے کہ ابلہِ مسجد بن کے رہے زندگی کے کسی کارآمد ادارے کے قابل نہیں رہ جاتا۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ شریعت انسان کے بوجھ ہلکا کرنے کے لئے آئی ہے، اس کی زنجیریں کاٹنے کیلئے آئی ہے، اس کے طوق اتارنے کیلئے آئی ہے، اس کی ذہنی پریشانیوں کو دور کنے کیلئے آئی ہے، اس کی الجھنوں کو ختم کرنے کیلئے آئی ہے۔ بظاہر دنیوی زندگی جو اتباعِ شہوات کا نام ہے اس میں بڑی چکا چوند دکھائی دیتی ہے۔ مگر یہ جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری کے سوا کچھ بھی نہیں۔ چہرے میک اپ سے بے شک روشن بنائے دیئے جا ہیں، لیکن کاش! کوئی اندر جھانک کر دیکھے کہ کس قدر اندھیرا اور کس قدر ویرانی ہے۔ مسجدوں کے لوگ جیسے روشن چہرے رکھتے ہیں اس سے زیادہ روشن دل رکھتے ہیں۔ لیکن بظاہر مہذب اور مثقف کہلانے والے مغموم اور بجھے ہوئے دلوں کے سوا کچھ نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک آدمی جس کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل ہیں کبھی اس کی زندگی کو دیکھئے کہ اسے ضروریاتِ زندگی میں سے جو جائز طریقے سے مل جاتا ہے وہ اسی پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ نہ کثرت کے حصول کیلئے اس کی راتوں کی نیند حرام ہوتی ہے اور نہ حرام کا ارتکاب کر کے وہ احتسابی اداروں سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ اس کی ساری توجہ زندگی کے مقاصد پر ہوتی ہے اور یہ مقاصد ایسے ہیں جس میں اگر ایک طرف اللہ کے قرب سے دل روشن ہوتا ہے تو دوسری طرف بندوں کے ساتھ بھلائی کی وجہ سے معاملات میں بہتری اور ہر کام میں برکت پیدا ہوتی ہے۔

انسان کی عملی زندگی کی پہلی منزل گھر بسانا ہے۔ گھر میں میاں بیوی ہوتے ہیں اور پھر اگر اللہ برکت دے تو اولاد ہوتی ہے۔ اس گھر کی بہتری، استواری، پائیداری، اور خیر وبرکت کا مرکز ہونے کیلئے چند باتوں کی ضرورت ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے محبت کرنے والا، اس کے ہر دکھ درد کو اپنا سمجھنے والا، اور اس کی عزت کی حفاظت کرنے والا ہو اور بیوی اپنے شوہر کی اطاعت گزار، اس کے دکھوں میں شریک، اس کی خوشیوں کی امین اور اس کی غیر حاضری میں شرم وحیا اور گھر کی حفاظت کرنے والی ہو اور اگر اللہ اولاد دے تو ماں باپ اولاد کے لئے شفیق ہوں اور اولاد ماں باپ کی فرمانبردار ہو۔ جس گھر میں بھی یہ باتیں پائی جائیں گی وہ گھر دنیا میں جنت کا نمونہ ہوگا۔ یہی وہ باتیں ہیں جو گھر کے بارے میں شریعت کے احکام ہیں اور اگر خدانخواستہ ان میں سے ایک ایک بات ختم ہوتی جائے میاں بیوی میں اعتماد اٹھ جائے، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خیانت کرنے لگیں، اولاد اپنے ماں باپ کی گستاخ ہو جائے اور ماں باپ اپنے بچوں سے بیزار ہو جائیں، گھر میں شوہر جو کما کر لائے بیوی ہمیشہ اس سے زیادہ کا مطالبہ کرے اور اولاد اپنے ہوائے نفس کے تقاضوں کیلئے اس کمائی کو ناکافی سمجھے، شوہر جیسے جیسے

Marfat.com

ذرائع استعمال کرتا جائے ویسے ویسے ان مطالبات میں بھی ترقی ہوتی جائے۔ اندازہ فرمایئے! اس گھر کی دیواریں تو شائد کھڑی رہیں لیکن اس گھر کے مکین اس گھر سے لاتعلق ہو جائیں گے اور یہ گھر ان کے لئے پناہ گاہ یا ٹھنڈا سایہ نہیں بلکہ ایک سرائے بن کر رہ جائے گا۔ اولاد صرف راتیں گزارنے کیلئے اسے استعمال کرے گی تو کیا آپ اس گھر کو واقعی گھر کہہ سکتے ہیں؟ اگر آپ غور فرمائیں تو اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس گھر کو جہنم بنانے والی چیز پر وہ آزادیاں ہیں جنہوں نے شریعت کے احکام کو توڑا اور آزادیاں حاصل کرتے کرتے گھر کی حقیقت کو پامال کر دیا۔

زندگی کی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے تمہیں جو معاشرتی اصلاح کے احکام دیئے ہیں بظاہر وہ احکام ہیں لیکن حقیقت میں وہ تمہاری بہت ساری بیڑیاں توڑنے اور بہت سارے طوق اتارنے کا ذریعہ ہیں اس نے تمہارے بہت سارے بوجھ ہلکے کر دیئے ہیں اور ان میں سے کوئی حکم ایسا نہیں جو تمہارے لئے دشواری کا باعث ہو کیونکہ پروردگار سے بڑھ کر کون جانتا ہے کہ اسے کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ وہ سخت احکام کا متحمل نہیں ہو سکتا لیکن ساتھ ساتھ پروردگار یہ بھی جانتا ہے کہ وہ آوارگی اور عیاشی کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ناگوار پابندیاں اس کے لئے دشواری کا باعث ہو سکتی ہیں اسی طرح حد سے بڑھی ہوئی آزدیاں بھی اس کی انسانیت کیلئے سمِ قاتل بن سکتی ہیں۔ اس لئے اسے ایسے احکام دیئے گئے جس کے نتیجے میں وہ ایک ایسی معتدل زندگی گزار سکتا ہے جو اس کی ذات اور صفات کے عین مطابق ہو۔

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَـكُمْ بَيْنَـكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۟ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝

(اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے اور ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر بڑا مہربان ہے ۝ اور جو شخص یہ کام کرے گا تعدی اور ظلم سے تو ہم اس کو ایک سخت آگ میں جھونک دیں گے اور یہ اللہ کیلئے بہت ہی آسان ہے) (النسآء: ۲۹ تا ۳۰)

اس آیتِ کریمہ میں تین باتیں

اس آیتِ کریمہ میں تین باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ دو باتوں سے منع فرمایا گیا ہے اور تیسری بات کی اجازت مرحمت فرمائی گئی ہے۔ سب سے پہلے اس بات پر توجہ فرمایئے کہ آیت میں لَا تَاْكُلُوْٓا کا لفظ آیا ہے، جس کا معنی ہے ''مت کھاؤ''۔ لیکن مراد اس سے صرف کھانا نہیں بلکہ ہر وہ تصرف ہے جو دوسرے کے مال میں غلط طریقے سے کیا جائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چاہے وہ چیز کھانے کی ہو یا کھانے کی نہ ہو۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود اور جمہور صحابہ کے نزدیک اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو شرعاً ممنوع اور ناجائز ہیں۔ چوری، ڈاکہ، غصب، خیانت، رشوت، سود، قمار اور تمام معاملاتِ فاسدہ جن سے شریعت نے روکا ہے وہ سب اس میں داخل

Marfat.com

ہیں۔ بالباطل سے تمام ناجائز طریقے مراد ہیں جن پر شریعت نے پابندی لگائی ہے۔ حرام چیز تو حرام ہی ہے لیکن حلال چیز بھی اگر باطل اور ناجائز طریقے سے حاصل کی جائے تو وہ بھی حرام ہو جاتی ہے۔ باطل اور ناجائز طریقوں سے مراد کاروبار، تجارت اور لین دین کے وہ طریقے ہیں جن میں معاملہ کے دونوں فریقوں کی حقیقی رضامندی یکساں طور پر نہیں پائی جاتی بلکہ اس میں ایک کا مفاد محفوظ ہوتا ہے دوسرا ضرر یا غرر کا ہدف بنتا ہے اور یا وہ معاملہ مُفْضِی اِلَی الْمُنَازَعَة ہوتا ہے۔ معاملات کی جائز صورت صرف وہ ہے جسے اس آیتِ کریمہ میں آپس کی رضامندی سے تجارت کا نام دیا گیا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ تجارت عام طور پر خرید و فروخت کے معاملہ کو کہا جاتا ہے۔ لیکن تفسیر مظہری کے مصنف نے واضح کیا ہے کہ تجارت میں اجارہ یعنی ملازمت و مزدوری اور کرایہ کے معاملات بھی شامل ہیں۔ یعنی ایسے وہ تمام معاملات جس میں مفاد اور منافع کا تبادلہ ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی ضروریات فراہم کرنے کیلئے محنت کرتا ہے اور وہ اس کا معاوضہ دیتا ہے البتہ یہاں صرف تجارت کا نام اس لئے آیا ہے کہ اگرچہ مال کمانے کے جائز ذرائع اور بھی ہیں لیکن تجارت اور محنت سب سے افضل اور سب سے پاکیزہ ذریعۂ معاش ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر اس کی فضیلت بیان فرمائی۔ کہیں فرمایا کہ سچا اور امانتدار تاجر صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا اور کہیں فرمایا کہ قیامت کے دن وہ عرش کے سائے کے نیچے ہوگا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت بڑی تفصیلی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ پاک کمائی تاجروں کی کمائی ہے بشرطیکہ جب بات کریں تو جھوٹ نہ بولیں اور جب وعدہ کریں تو وعدہ خلافی نہ کریں اور جب ان کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت نہ کریں اور جب کوئی سامان کسی سے خریدیں تو (تاجروں کی عادت کے مطابق) اس سامان کو برا اور خراب نہ بتائیں اور جب ان کے ذمہ کسی کا قرض ہو تو ٹالنے کی کوشش نہ کریں اور جب ان کا قرض کسی کے ذمہ ہو تو اس کو تنگ نہ کریں۔ (اخرجہ الاصبہانی از حاشیہ مظہری)

تجارت کے ساتھ عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ کی شرط لگائی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ لین دین اور تجارت آپس کی رضامندی سے ہونا چاہئے لیکن جہاں تجارت ہی نہ ہو بلکہ تجارت کے نام پر جوا، سٹہ، یا ربا اور سود کا معاملہ ہو یا مال ابھی موجود نہیں محض ذہنی قرارداد پر اس کا سودا کیا گیا ہو وہ بیع باطل اور حرام ہے۔ اگر تجارت تو ہو لیکن آپس کی رضامندی شامل نہ ہو یعنی اس میں کسی کا ناجائز دباؤ شامل ہو یا اس میں فریب یا دغا کیا جا رہا ہو، رشوت اور سود میں بظاہر رضامندی ہوتی ہے لیکن فی الواقع رضامندی مجبورانہ ہوتی ہے اور دباؤ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جوئے میں بظاہر رضامندی ہوتی ہے مگر درحقیقت جوئے میں حصہ لینے والا ہر شخص اس غلط امید پر رضامند ہوتا ہے کہ جیت اس کی ہوگی۔ ہارنے کے ارادے سے کوئی بھی راضی نہیں ہوتا۔ بعض اہلِ علم نے اس میں ایک اور قسم کو بھی شامل کیا ہے وہ یہ کہ طرفین سے تبادلہ بھی ہے اور بظاہر فریقین کی رضامندی بھی مگر وہ رضامندی درحقیقت مجبوری کی رضامندی ہے حقیقی رضامندی نہیں۔ اس لئے شرعاً اس قسم کو بھی ناجائز کہا جاتا ہے۔ مثلاً عام ضرورت کی چیزوں کو سب طرف سے سمیٹ کر کوئی ایک شخص یا ایک کمپنی اسٹاک کرے اور پھر اس کی قیمت من خاطر خواہ اضافہ کر کے فروخت کرنے لگے چونکہ بازار میں دوسری جگہ میسر نہیں گاہک مجبور ہو کر مہنگے داموں یہ چیز خریدتا ہے۔ اگرچہ گاہک خود چل کر آتا ہے اور بظاہر رضامندی کے ساتھ خریدتا ہے لیکن اس کی یہ رضامندی درحقیقت ایک مجبوری ہے۔

Marfat.com

اس آیت میں جن دو باتوں سے منع کیا گیا ہے ان میں سے ایک تو وہ ہے کہ جس کی آپ نے تفصیل پڑھی اور دوسرا ہے کسی دوسرے کو قتل کرنا یا قتلِ نفس کہہ لیجئے۔ لیکن اس میں عجیب بات یہ ہے کہ اس آیت میں دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے حالانکہ کسی کے مال میں ناجائز تصرف کرنا اس کا بظاہر قتلِ نفس سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا لیکن اگر تھوڑے سے تدبر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک گہرا رشتہ پایا جاتا ہے کہ جہاں کہیں پہلا جرم پایا جاتا ہے وہیں بالعموم دوسرے جرم کا صدور ہوتا ہے۔ دوسروں کے مال میں ناجائز تصرف اس وقت ہوتا ہے جب آدمی میں مال کی حرص جائز حدود سے تجاوز کر جاتی ہے۔ بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جن میں سرے سے مال کی خواہش نہ ہو۔ لیکن یہ خواہش جب تک جائز اور حلال پابندیوں میں محصور رہتی ہے تو کسی کو نقصان نہیں دیتی لیکن جب یہ خواہش حرص کی شکل اختیار کر کے اور حدود سے تجاوز کر جاتی ہے تو پھر یہ اپنے راستے میں ہر حائل ہونے والی رکاوٹ کو گرا دینا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ ایسا آدمی اگر اپنی حرص کے باعث فیصلہ کر لیتا ہے کہ مجھے اپنے مفاد کیلئے فلاں زمین پر قبضہ کرنا ہے تو وہ زمین اس کے حقیقی بھائی کی بھی ہو تو اس کے حصول کیلئے اگر اسے بھائی کو بھی قتل کرنا پڑے تو وہ دریغ نہیں کرے گا۔ روزانہ اخبارات میں ہم ایسے واقعات پڑھتے ہیں کہ چند مرلے زمین یا چند ہزار روپے کی خاطر قتل و خوں ریزی کے بڑے بڑے واقعات پیش آتے ہیں اولاد اپنے ماں باپ کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتی۔ بھائی بھائی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتا۔ جتنے بھی ہماری سماجی زندگی میں فسادات برپا ہیں اگر ان کی حقیقت جاننے کی کوشش کی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں مال کی محبت کو سب سے زیادہ دخل ہوگا۔ اس لیے اسلام نے ان میں باہمی گہرے رشتے کی وجہ سے دونوں چیزوں کی حرمت کی یکساں تاکید فرمائی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حُرْمَةُ مَالِهِ كَحُرْمَةِ دَمِهِ "مومن کا مال بھی اسی طرح محترم ہے جس طرح اس کی جان محترم ہے"۔ جو معاشرہ اور جو سماج اپنے اندر ان مفاسد کو روکنے کی کوشش نہیں کرتا اس کے اندر قتل کے واقعات کا پیش آنا ایک فطری امر ہے اس لئے یہ دونوں حکم ساتھ ساتھ دیئے گئے اور اس کے لئے جو تعبیر اختیار کی گئی وہ نہایت توجہ طلب ہے۔ فرمایا گیا: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ جس کا لفظی معنی ہے "تم اپنے نفسوں کو قتل نہ کرو" حالانکہ نفسوں کو یعنی اپنے آپ کو کون قتل کرنا پسند کرتا ہے۔ لیکن جب پہلے حکم کے ساتھ ہم اسے ملا کر دیکھتے ہیں تو یہ اس حکم کا تتمہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھانا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ دنیا میں اس سے نظامِ تمدن اس قدر بگڑتا ہے کہ اس کے برے نتائج سے حرام خور آدمی بھی نہیں بچ سکتا۔ جس کا یہ نتیجہ نکلے بغیر نہیں رہتا کہ یہ صورتحال قتل و خوں ریزی کا باعث بنتی ہے اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص معاشرے کے اندر کسی قتل کا ارتکاب کرتا ہے وہ کسی اور کو نہیں خود اپنے آپ کو قتل کرتا ہے کیونکہ جسے اس نے قتل کیا وہ اس کا دینی بھائی ہے اسے قتل کرنا گویا اپنے آپ کو قتل کرنا ہے۔ اسی اصول پر قرآن کریم نے ایک قتل کو سب کا قتل قرار دیا ہے اور مزید یہ بات بھی کہ جو شخص کسی پر ہاتھ اٹھاتا ہے وہ دراصل اپنے لئے خطرے کا راستہ کھولتا ہے کیونکہ اگر اس کا قتل اندھا قتل ثابت ہو تو جب بھی معاشرہ غیر محفوظ ہو جاتا ہے جس کا یہ بھی ایک فرد ہے اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے فلاں کو قتل کیا ہے تو پھر یا تو قانون کا ہاتھ اس کی طرف بڑھے گا اور یا مقتول کے وارثوں میں سے کسی کا ہاتھ اس کا گلا دبوچ لے گا۔

دلوں کو زخم نہ دو حرفِ ناملائم سے
یہ تیر وہ ہے جو لوٹ کر بھی آتا ہے

اگر حرفِ ناملائم تیر بن کر لوٹ سکتا ہے تو کسی کا قتل خنجر بن کر واپس کیوں نہیں آسکتا؟

Marfat.com

پابندیوں کی علت

آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا اس آیت میں جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں یہ درحقیقت اس کی علت بیان کی گئی ہے کہ تمہارا پروردگار چونکہ تم پر مہربان ہے اس کی مہربانی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تمہارے آپس کے تعلقات کو بگڑنے سے بچائے تاکہ تمہیں ایک آسودہ زندگی گزارنے میں دشواری پیش نہ آئے اور اس کی زمین فساد سے محفوظ رہے۔ اس لئے جن طریقوں سے تم باہمی مفاسد سے بچ سکتے تھے ان طریقوں کو تم پر لازم فرمادیا۔ رہے وہ لوگ جو ان ہدایات سے فائدہ نہ اٹھائیں اور خواہش نفس میں اندھے ہو کر ایک دوسرے کے مال ہڑپ کریں، ایک دوسرے کے گلے کاٹیں، یعنی وہ ظلم و عدوان کے مرتکب ہوں۔ تو اللہ کی رحمت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ وہ عدل وانصاف کا ایک ایسا دن لائے جس میں نیکوکار جزا پائیں اور ایسے بدکردار اپنے انجام کو پہنچیں۔ اس لئے دوسری آیت کریمہ میں فرمایا گیا: کہ جو شخص بھی اس طرح ظلم اور عدوان سے کام لے گا یعنی وہ کسی کے حقوق پر طاقت اور جبر سے دست درازی کرے گا یا دھاندلی سے کسی کا حق دے لے گا اور ادا نہیں کرے گا تو اللہ کیلئے یہ بات نہایت آسان ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو جہنم رسید کردے اور یہ بات شائد اس لئے بھی فرمائی گئی کہ اس سے پہلے کی آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تم پر بڑا مہربان اور رحیم ہے تو بعض لوگ اس کا یہ مفہوم لیتے ہیں کہ وہ چونکہ رحیم ہے اس لئے کبھی کسی کو سزا نہیں دے گا۔ اس آیت کریمہ میں اس غلط فہمی کا ازالہ کردیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحیم بھی ہے اور عادل بھی ہے اس کے عدل کا تقاضا ہے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ انصاف کرے۔ اطاعت گزاروں کو نوازے اور ظالم اور بدکردار لوگوں کو ان کے کئے کی سزا دے اور یہ اللہ بہت آسان ہے۔ جس طرح اس کی رحمت بے پایاں ہے اسی طرح اس کے عدل کے سامنے بھی کوئی رکاوٹ نہیں۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ○

(اگر تم بچتے رہو ان بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تم روکے جا رہے ہو تو ہم تم سے تمہاری چھوٹی برائیاں جھاڑ دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے) (النسآء : ۳۱)

کبائر اور صغائر کا مفہوم

اللہ تعالیٰ ہمارا معبودِ برحق اور حاکمِ حقیقی ہے وہی ہماری آنکھوں کی روشنی اور دلوں کے سکون کا باعث ہے۔ ہم ہر حال میں اس کے احکام کے پابند ہیں اور اس کی رضا کا حصول ہماری منزل ہے۔ ہماری حیثیت اس کے سامنے ایک بندۂ محض کی ہے جسے صرف بندگی زیب دیتی ہے اپنی حیثیت کے حوالے سے اپنے آقا کی کسی بھی معصیت اور سرتابی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اسے ہرگز یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اس کا کوئی حکم توڑے یا اس کی خوشنودی کے خلاف کوئی کام کرے، اسے بہرصورت اپنے اللہ کی بندگی اور اطاعت کرنی ہے۔ بات کوئی چھوٹی ہو یا بڑی اسے کسی طرح بھی معصیت اور نافرمانی کا کوئی حق نہیں۔ اس کے چھوٹے اور بڑے گناہ کی مثال محسوسات کے حوالے سے ایسی ہے جیسے آگ کا بڑا انگارہ اور چھوٹی چنگاری۔ لیکن کوئی عقل مند انسان دونوں میں سے کسی کو بھی پسند نہیں کرسکتا۔ اس لئے حضرت فضیل بن عیاض نے فرمایا کہ تم جس قدر کسی گناہ کو ہلکا سمجھو گے اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک بڑا جرم ہوجائے گا۔ اور سلف صالحین نے فرمایا کہ ہر گناہ کفر کا قاصد ہے جو انسان کو کافرانہ اخلاق و

Marfat.com

کی طرف دعوت دیتا ہے۔لیکن یہ اللہ کا انتہائی فضل واحسان ہے کہ ایک بندہ ہوتے ہوئے ہمارے لئے کسی گناہ کا کوئی موقع نہیں۔لیکن اس نے گناہوں میں تقسیم فرمادی کہ کچھ گناہ کبیرہ ہیں اور کچھ صغیرہ۔اگر تم کبیرہ گناہوں سے بچتے رہوتو ہم اپنے فضل وکرم سے تمہارے صغائر کو معاف فرمادیں گے یعنی جو احکام تم پر فرض وواجب کیے گئے ہیں تم ان کی بجا آوری میں کبھی کمی نہ کرو کیونکہ ان کا بجانہ لانا بجائے خود ایک کبیرہ گناہ ہے۔فرائض وواجبات کی پابندی کے ساتھ ساتھ اگر تم کبائر سے بچنے میں کامیاب ٹھہرے تو اللہ تعالیٰ فرائض وواجبات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ تمہارے صغیرہ گناہ معاف فرمادے گا۔ہمیں احادیثِ مبارکہ میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔حضور نے ایک موقعہ پر فرمایا کہ جب کوئی شخص نماز کیلئے وضو کرتا ہے تو ہر عضو کے دھونے کے ساتھ ساتھ گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے۔چہرہ دھویا تو آنکھ،کان،ناک وغیرہ کے گناہوں کا کفارہ ہوگیا،کلی کی تو زبان کے گناہوں کا کفارہ ہوگیا،پاؤں دھوئے تو پاؤں کے گناہ دھل گئے،پھر جب وہ مسجد کی طرف چلتا ہے تو ہر قدم پر گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔لیکن جو شخص کبائر سے پرہیز پوری طرح نہیں کرتا اس کے صغائر بھی معاف نہیں ہوتے کیونکہ عملی زندگی میں بھی یہی دیکھا گیا ہے کہ جو آدمی اپنے ہزاروں کے قرضے ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا وہ کسی کے پانچ روپے بھی کبھی نہیں دبا سکتا۔لیکن جو لوگ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں اور کبائر کے ارتکاب سے نہیں بچتے وہ ساری زندگی مچھر چھانتے رہتے اور اونٹ نگلتے رہتے ہیں۔اب رہی یہ بات کہ قرآن وسنت میں کبیرہ گناہ کسے کہا گیا ہے؟ تو اہلِ علم نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کی تشریح فرمائی ہے۔

صاحب معارف القرآن فرماتے ہیں:

’’گناہِ کبیرہ کی تعبیر قرآن وحدیث اور اقوال سلف کی تشریحات کے ماتحت یہ ہے کہ جس گناہ پر قرآن میں کوئی شرعی حد یعنی سزا دنیا میں مقرر کی گئی ہے یا جس پر لعنت کے الفاظ وارد ہوئے ہیں یا جس پر جہنم وغیرہ کی وعید آئی ہے۔وہ سب گناہ کبیرہ ہیں اسی طرح ہر وہ گناہ بھی کبیرہ میں داخل ہوگا جس کے مفاسد اور نتائج بد کسی کبیرہ گناہ کے برابر یا اس سے زائد ہوں،اسی طرح جو گناہ صغیرہ جرأت وبیباکی کے ساتھ کیا جائے یا جس پر مداومت کی جائے تو وہ بھی کبیرہ میں داخل ہوجاتا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے کبیرہ گناہوں کی تعداد سات بتلائی تو آپ نے فرمایا سات نہیں سات سو کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔

امام بن حجر مکی نے اپنی کتاب الزواجر میں ان تمام گناہوں کی فہرست اور ہر ایک کی مکمل تشریح بیان فرمائی ہے جو مذکور الصدر تعریف کی رو سے کبائر میں داخل ہیں ان کی اس کتاب میں کبائر کی تعداد چار سو سڑسٹھ تک پہنچی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بعض نے بڑے بڑے ابواب معصیت کو شمار کرنے پر اکتفاء کیا ہے تو تعداد کم لکھی ہے بعض نے ان کی تفصیلات اور انواع واقسام کو پورا لکھا تو تعداد زیادہ ہوگئی،اس لئے یہ کوئی تعارض واختلاف نہیں ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات میں بہت سے گناہوں کا کبیرہ ہونا بیان فرمایا اور حالات کی مناسبت سے کہیں تین،کہیں چھ،کہیں سات،کہیں اس سے بھی زیادہ بیان فرمائے ہیں۔اسی سے علمائے امت نے یہ سمجھا کہ کسی عدد میں انحصار کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ مواقع اور حالات کے مناسب جتنا سمجھا گیا اتنا بیان کردیا گیا۔

Marfat.com

بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں بھی جو سب سے بڑے ہیں میں تمہیں ان کی خبر کرتا ہوں وہ تین ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی یا جھوٹی گواہی دینا یا جھوٹ بولنا۔

اسی طرح بخاری ومسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے دریافت کیا کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسا گناہ سب سے بڑا ہے؟ تو فرمایا کہ تم اپنے بچہ کو اس خطرہ سے مار ڈالو کہ یہ تمہارے کھانے میں شریک ہوگا تمہیں اس کو کھلانا پڑے گا پھر پوچھا کہ اس کے بعد کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا کہ اپنے پڑوسی کی بیوی کے ساتھ بدکاری کرنا، بدکاری خود ہی بڑا جرم ہے اور پڑوسی کے اہل وعیال کی حفاظت بھی چونکہ اپنے اہل واعیال کی طرح انسان کے ذمہ لازم ہے اس لئے یہ جرم دوگنا ہوگیا۔

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بات کبیرہ گناہوں میں سے ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالیاں دے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے ہی ماں باپ کو گالی دینے لگے؟ فرمایا کہ ہاں! جو شخص کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ اس کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے خود اپنے ماں باپ کو گالیاں دی ہوں کیونکہ یہ ان گالیوں کا سبب بنا ہے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک اور قتل ناحق اور یتیم کا مال ناجائز طریق پر کھانے اور سود کی آمدنی کھانے اور میدانِ جہاد سے بھاگنے اور پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانے اور ماں باپ کی نافرمانی کرنے اور بیت اللہ کی بے حرمتی کرنے کو کبیرہ گناہوں میں شمار فرمایا ہے۔

بعض روایات حدیث میں اس کو بھی کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے کہ کوئی شخص دارالکفر سے ہجرت کرنے کے بعد پھر دارالہجرۃ کو چھوڑ کر دارالکفر میں دوبارہ چلا جائے۔

دوسری روایاتِ حدیث میں ان صورتوں کو بھی کبیرہ کی فہرست میں داخل کیا گیا ہے مثلاً جھوٹی قسم کھانا، اپنی ضرورت سے زائد پانی کو روک رکھنا، دوسرے ضرورت والوں کو نہ دینا، جادو سیکھنا، جادو کا عمل کرنا اور فرمایا کہ شراب پینا اکبر الکبائر ہے اور فرمایا کہ شراب پینا ام الفواحش ہے کیونکہ شراب میں مست ہوکر آدمی ہر برے سے برا کام کرسکتا ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ سب سے بڑا کبیرہ گناہ یہ ہے کہ انسان اپنے مسلمان بھائی پر ایسے عیب لگائے جس سے اس کی آبروریزی ہوتی ہو۔

ایک حدیث میں ہے جس شخص نے بغیر کسی عذر شرعی کے دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کردیا تو وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ کسی نماز کو اپنے وقت میں نہ پڑھا بلکہ قضاء کرکے دوسری نماز کے ساتھ پڑھا۔

Marfat.com

بعض روایات حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا بھی کبیرہ گناہ ہے اور اس کے عذاب وسزا سے بےفکر و بےخوف ہو جانا بھی کبیرہ گناہ ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ وارث کو نقصان پہنچانے اور اس کا حصۂ میراث کم کرنے کیلئے کوئی وصیت کرنا بھی کبائر میں سے ہے۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ خائب وخاسر ہوئے اور تباہ ہو گئے اور تین دفعہ اس کلمہ کو دہرایا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ محروم القسمۃ اور تباہ و برباد کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا ایک وہ شخص جو تکبر کے ساتھ پاجامہ یا تہبند یا کرتہ اور عباء کو ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے، دوسرا وہ آدمی جو اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کر کے احسان جتلائے، تیسرا وہ آدمی جو بوڑھا ہونے کے باوجود بدکاری میں مبتلا ہو، چوتھے وہ آدمی جو بادشاہ یا افسر ہونے کے باوجود جھوٹ بولے پانچویں وہ آدمی جو عیال دار ہونے کے باوجود تکبر کرے، چھٹے وہ آدمی جو کسی امام کے ہاتھ پر محض دنیا کی خاطر بیعت کرے۔

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ چغلی کھانے والا جنت میں نہ جائے گا۔

نسائی و مسند احمد وغیرہ کی ایک حدیث میں ہے کہ چند آدمی جنت میں نہ جائیں گے شرابی، ماں باپ کا نافرمان، رشتہ داروں سے بلاوجہ قطع تعلق کرنے والا، احسان جتلانے والا، جنات وشیاطین یا دوسرے ذرائع سے غیب کی خبریں بتانے والا، دیوث یعنی اپنے اہل وعیال کو بےحیائی سے نہ روکنے والا۔

مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اس شخص پر جو کسی جانور کو اللہ کے سوا کسی کے لئے قربان کرے۔"

صاحبِ تفہیم القرآن نے صغیرہ اور کبیرہ گناہ کے مفہوم کے حوالے سے قرآن وسنت کی تفصیلات کو دیکھتے ہوئے مغز کی بات پانے کی کوشش کی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بڑے گناہ اور چھوٹے گناہ میں اصولی فرق کیا ہے؟ جہاں تک میں نے قرآن وسنت میں غور کیا ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے (واللہ علم بالصواب) کہ تین چیزیں ہیں جو کسی فعل کو بڑا گناہ بناتی ہیں:

۱۔ کسی کی حق تلفی، خواہ وہ خدا ہو جس کا حق تلف کیا گیا ہے یا والدین ہوں یا دوسرے انسان یا خود اپنا نفس، پھر جس کا حق جتنا زیادہ ہے اسی قدر اس کے حق کو تلف کرنا زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اسی بنا پر گناہ کو "ظلم" بھی کہا جاتا ہے اور اسی بنا پر شرک کو قرآن میں ظلمِ عظیم کہا گیا ہے۔

۲۔ اللہ سے بےخوفی اور اس کے مقابلہ میں استکبار جس کی بنا پر آدمی اللہ کے امر و نہی کی پرواہ نہ کرے اور نافرمانی کے ارادے سے قصداً وہ کام کرے جس سے اللہ نے منع کیا ہے اور عمداً ان کاموں کو نہ کرے جن کا اس نے حکم دیا ہے۔ یہ نافرمانی جس قدر زیادہ ڈھٹائی اور جسارت اور ناخدا ترسی کی کیفیت اپنے اندر لئے ہوگی اسی قدر گناہ بھی شدید ہوگا۔ اسی معنی کے لحاظ سے گناہ کے لئے "فسق اور معصیت" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

۳۔ ان روابط کو توڑنا اور ان تعلقات کو بگاڑنا جن کے وصل واستحکام اور درستی پر انسانی زندگی کا امن منحصر ہے خواہ یہ روابط

Marfat.com

بندے اور خدا کے درمیان ہوں یا بندے اور بندے کے درمیان، پھر جو رابطہ جتنا زیادہ اہم ہے اور اس کے کٹنے سے امن کو جتنا زیادہ نقصان پہنچتا ہے اور جس کے معاملہ میں مامونیت کی جتنی زیادہ توقع کی جاتی ہے اسی قدر اس کو توڑنے اور کاٹنے اور خراب کرنے کا گناہ زیادہ بڑا ہے۔ مثلاً زنا اور اس کے مختلف مدارج پر غور کیجئے! یہ فعل فی نفسہٖ نظام تمدن کو خراب کرنے والا ہے اس لئے بجائے خود ایک بڑا گناہ ہے مگر اس کی مختلف صورتیں ایک دوسرے سے گناہ میں شدید تر ہیں۔ شادی شدہ آدمی کا زنا کرنا بن بیاہے کی بہ نسبت زیادہ سخت گناہ ہے۔ منکوحہ عورت سے زنا کرنا غیر منکوحہ سے کرنے کی بہ نسبت قبیح تر ہے۔ ہمسایہ کے گھر والوں سے زنا کرنا غیر ہمسایہ سے کرنے کی بہ نسبت زیادہ برا ہے۔ محرمات مثلاً بہن یا بیٹی یا ماں سے زنا کرنا غیر عورت سے کرنے کی بہ نسبت اشنع ہے۔ مسجد میں زنا کرنا کسی اور جگہ کرنے سے اشد ہے۔ ان مثالوں میں ایک ہی فعل کی مختلف صورتوں کے درمیان گناہ ہونے کی حیثیت سے مدارج کا فرق انہی وجوہ سے ہے جو اوپر بیان ہوئے۔ جہاں مامونیت کی توقع جس قدر زیادہ ہے جہاں انسانی رابطہ جتنا زیادہ مستحق احترام ہے اور جہاں اس رابطہ کو قطع کرنا جس قدر زیادہ موجبِ فساد ہے وہاں زنا کا ارتکاب اسی قدر زیادہ شدید گناہ ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے گناہ کے لئے ''فجور'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ○

(نہ تمنا کرو اس چیز کی جس میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے۔ مردوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انہوں نے کمایا اور اللہ سے اس کے فضل میں سے حصہ مانگو، بیشک اللہ ہر چیز سے باخبر ہے) (النسآء : ٣٢)

انسانی زندگی میں مفاسد کا اہم سبب خِلقی اور غیر اختیاری امور میں غلط سوچ اور رویہ ہے

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مفاسد پیدا ہونے کے مختلف اسباب ہیں۔ ان میں سب سے بڑا سبب انسان کی سوچ کا بگاڑ ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں نہائیت حکمت کے ساتھ اس غلط سوچ کی طرف دلائی گئی ہے۔ انسان جب اپنے گردوپیش میں پھیلی ہوئی انسانی زندگی کے تنوع کو دیکھتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ انسانوں کی خلقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ ان کے درمیان متعدد حیثیتوں سے فرق پایا جاتا ہے۔ کوئی خوبصورت ہے اور کوئی بدصورت، کوئی طاقتور ہے اور کوئی کمزور، کوئی خوش آواز ہے اور کوئی بدآواز، کوئی سلیم الاعضا ہے اور کوئی معذور، کوئی جسمانی اور ذہنی قوتوں سے مالا مال ہے اور کوئی اس لحاظ سے مفلس، کسی نے امیر گھر میں جنم لیا ہے اور کسی نے غریب گھر میں، کوئی عالی نسب خاندان سے نسبت رکھتا ہے اور کوئی معمولی خاندان سے، کسی کیلئے آگے بڑھنے کے امکانات کشادہ ہیں اور کسی کیلئے دست وبازو کے سوا کوئی سہارا نہیں۔ انسان جب اس قسم کے مختلف تضادات کو دیکھتا ہے تو وہ

Marfat.com

بجائے اس کے کہ اس کی حقیقت کو سمجھے، وہ اپنی حالت کو دیکھ کر کڑھنے لگتا ہے اور اپنی کمتر حالت کو قدرت کی طرف منسوب کر کے اپنی بدقسمتی پر شاکی ہو کر بیٹھ جاتا ہے حالانکہ اگر وہ حقیقت پر ذرا غور کرتا تو اس کیلئے یہ بات سمجھنا مشکل نہ تھا کہ انسانوں میں یہ فرق اور امتیاز انسانی تمدن کی ضرورت بھی ہے اور انسانی زندگی کی آسانیوں کا راز بھی ہے کیونکہ اگر دنیا میں تمام انسان ہر حیثیت سے یکساں ہوتے تو انسانی ضرورتیں کبھی پوری نہ ہوتیں اور تمدن کی گونا گونی کبھی وجود میں نہ آتی کیونکہ ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

انسانی زندگی اور خود ہماری گردوپیش کی دنیا اسی حقیقت کی ترجمان ہے۔ہم قدم قدم پر اس اختلاف اور تنوع سے محظوظ ہوتے ہیں۔موسموں میں تبدیلی، بہار اور خزاں کا آنا جانا، میدانی علاقوں میں رنگا رنگ لہلہاتی فصلیں، بہتے ہوئے دریا، رواں دواں نالے اور جھیلیں اور پھر اس کے مقابلے میں سربفلک پہاڑ، ان کے دامن میں جھنڈوں کی طرح گڑے ہوئے مختلف درخت، ان میں ابلتے ہوئے چشمے، گرتی ہوئی آبشاریں، یہ وہ تنوع اور اختلاف ہے جو انسانی زندگی کو یکسانی کی کلفت سے بچاتا ہے اور زمین کو حسن آرا بنا دیتا ہے۔یہی حال انسانی زندگی کا بھی ہے اگر سب لوگ خوبصورت ہوتے خوبصورتی کی قدر ختم ہو جاتی۔سب لوگ تومند اور سلیم الاعضا ہوتے تو نجانے کتنے نازک احساس اپنی موت آپ مرجاتے۔اگر سب مالدار ہوتے تو کوئی کسی کی ضرورتیں پوری کرنے کیلئے آگے نہ بڑھتا۔ہر شخص کو خود بڑھئی، مزدور، معمار، خوانچہ فروش، دکاندار، سیلز مین، کاشتکار، خاکروب، سب کچھ خود بننا پڑتا۔چھوٹا کام کر کے روٹی کمانے والے لوگ جب کام سے رک جاتے تو گندم پیدا کرنے، آٹا پیسنے، روٹی کمانے، جوتا گانٹھنے، کپڑا بننے، عمارت تعمیر کرنے، غرضیکہ زندگی کے ہر کام کرنے والا کوئی نہ ہوتا تو انسانی ضرورتیں کیسے پوری ہوتیں؟ اور یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ ایک عالمِ دین اور یونیورسٹی کا پروفیسر علمی انہماک چھوڑ کر ان ضرورتوں کے پورا کرنے میں لگ جاتا۔ملک کی سرحدوں کے محافظ حفاظت ترک کر کے کاشتکاری میں کھپ جاتے۔انسانی زندگی اگر انسانی ضرورتوں کے پورا ہونے کا نام ہے تو اس کا تمام تر دارومدار اللہ کی اس حکمتِ تخلیق پر ہے کہ اس نے سب کو یکساں پیدا نہیں فرمایا۔اس لئے سب سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسانوں میں یہ فرق و امتیاز عین مقتضائے حکمت ہے۔البتہ! یہ فرق اس وقت ظلم بن جاتا ہے جب انسان اسے فطری حدود سے بڑھا کر مصنوعی امتیازات سے اس میں اضافہ کر دیتا ہے۔اسی طرح وہ شخص اور وہ قوم جو اس خلقی فرق اور امتیاز کو مٹا دینے کی کوشش کرتی ہے وہ فطرت سے جنگ کرتی ہے اور اس سے دوسری نوعیت کا فساد برپا ہوتا ہے۔اس لئے انسان کیلئے عافیت کا راستہ یہ ہے کہ ایسے امتیازات اور اختلافات جو خلقی اور اس کے لئے غیر اختیاری ہیں انہیں کبھی اپنا مسئلہ نہ بنائے ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی اجتماعی زندگی حسد، رقابت، عداوت اور مزاحمت کی کشاکش سے خون خون ہو جائے گی کیونکہ یہ امتیازات اس کے مٹائے سے تو مٹیں گے نہیں، وہ یقیناً اس کیلئے ناجائز تدبیروں سے کام لینے کی کوشش کرے گا۔یہیں سے وہ ایک ایسے راستے پر چل پڑے گا جو انسانیت کیلئے تباہی کا راستہ ہے۔اس لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ نے اگر ایک کو دوسرے پر غیر اختیاری معاملات میں ترجیح سے نوازا ہے تو اس کی حکمت کا تقاضا انسانی تمدن کی ضرورت اور تمہاری ضروریاتِ زندگی کا مطالبہ اور حسن ہے۔

Marfat.com

اس حکمت کا ایک اور پہلو بھی ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ آدمی اختیاری معاملات میں کوشش کے باوجود بھی ناکامی کا شکار ہوتا ہے۔ایسی صورت میں عقل کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی دوبارہ سہ بارہ کوشش کرے اور اللہ سے کامیابی کی دعا کرے۔لیکن بعض لوگ اسے قسمت کا مسئلہ بنا کر ہمت ہار دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شائد قدرت نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی غیر جانبداری سے غور کرے تو وہ محسوس کرے گا کہ جس کام کے بارے میں میں سمجھتا ہوں کہ میں نے پوری کوشش سے اسے انجام دینے کی کوشش کی ہے، درحقیقت میری کوشش میں کئی کمزوریاں رہی ہیں۔اگر میں ان کمزوریوں کو دور کر لیتا تو یقیناً اللہ مجھے بھی کامیابی عطا فرما دیتا۔البتہ! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی اپنی امکانی مساعی کے باوجود بھی کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ قدرت میرے ساتھ ناکامی کی صورت میں کوئی بھلائی کر رہی ہے کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ آدمی جس کو اپنے لئے کامیابی سمجھتا ہو حقیقت میں وہی اس کیلئے کامیابی ہو۔بسا اوقات ایسا دیکھا گیا ہے کہ وقتی طور پر کسی ناکامی نے آدمی کو پریشان کیا ہے لیکن آئندہ چل کر اسی ناکامی سے اس کیلئے کامیابی کا راستہ نکلا یا وہی ناکامی اس کیلئے رحمت ثابت ہوئی۔مولانا محمد علی جوہر برصغیر کے مسلمانوں کے قابلِ فخر رہنما تھے۔آکسفورڈ جانے سے پہلے ان کے خیالات قومی سیاستدانوں سے مختلف نہیں تھے۔بہت سے معاملات میں حکومت کی ہمنوائی کرتے تھے۔آکسفورڈ پڑھنے گئے ان کے ذہن میں آئندہ زندگی کا تصور حکومت کے کسی عہدہ ومنصب کے سوا کچھ نہ تھا۔وہ چاہتے تھے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نوکر شاہی میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکیں۔لیکن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ وہ فیل ہو گئے۔یہ صدمہ ان کے اور ان کے خاندان کیلئے ناقابلِ برداشت تھا لیکن اسی ناکامی سے وہ محمد علی جوہر پیدا ہوئے جس کی صورت میں اللہ نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک ایسا رہنما عطا کیا جس کا دل صرف مسلمانوں کیلئے دھڑکتا تھا۔زندگی میں ایسی مثالیں آپ کو بکثرت ملیں گی کہ اللہ تعالیٰ نے ناکامیوں میں کامیابیوں کا راستہ روشن کر دیا۔

حاصل کلام یہ کہ غیر اختیاری معاملات میں اللہ نے انسانوں میں سے ایک دوسرے کو جو فضیلت عطا فرمائی ہے اور انسانوں میں مختلف حیثیتوں سے جو امتیازات رکھے ہیں وہ انسانی زندگی کی ضرورت بھی ہیں اور انسانی تمدن کا حسن بھی۔اس لئے کسی بھی انسان کو ایسے امتیازات میں منفی جذبات کا اسیر نہیں ہونا چاہئے اور دوسری یہ بات کہ کامیابیاں بھی اللہ کی دین ہیں اور ناکامیاں بھی۔ناکامیوں کو بدقسمتی سے تعبیر کرنا انتہائی کوتاہ فکری ہے۔ہوسکتا ہے یہی ناکامیاں مستقبل کی کامیابی کی نوید بن جائیں۔البتہ انسان کی محنت وعمل کا اصل میدان اختیاری امور ہیں، ان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا نہ صرف محمود ہے بلکہ مسابقت فی الخیرات کا حکم دیا گیا ہے۔مسابقت اور تنافس میدان خلقی صفات یا فطری ترجیحات نہیں بلکہ اکتسابی صفات ہیں۔علمی فضائل، اخلاقی کمالات اور کاروباری معاملات میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا مستحسن اور پسندیدہ ہے۔اسی طرح نیکی تقویٰ، عبادت، ریاضت، توبہ، انابت، یعنی ایمان وعمل صالح کا میدان درحقیقت وہ میدان ہے جس میں ہر ایک کیلئے مسابقت کے دروازے کھلے ہیں اور ہر ایک کو اپنی محنت اور اپنی جدوجہد کا پورا ثمرہ ملے گا۔ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ کا یہی مفہوم ہے۔مرد اور عورت اس میدان میں یکساں ہیں جو بھی محنت اور عمل سے آگے بڑھ جائے گا وہ اللہ کے ہاں فضیلت پا جائے گا۔مرد کو اس لئے آگے بڑھنے کا حق نہیں ملے گا کہ وہ مرد ہے اور عورت کو اس لئے پیچھے نہیں ہٹا دیا جائے گا کہ وہ عورت ہے بلکہ دونوں اپنے اپنے ایمان وعمل اور علمی اور اخلاقی کمالات کے اعتبار سے دنیا میں بھی عزت پائیں گے اور قیامت کے دن بھی باریاب ہوں گے۔مزید فرمایا: وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اس میں ایک عجیب وغریب حکمت سے پردہ اٹھایا

Marfat.com

گیا ہے۔ آدمی بعض دفعہ کسی کو اپنے سے بہتر حال میں دیکھتا ہے تو وہ اللہ سے اس جیسا ہونے کی دعا کرتا ہے۔ کبھی دولت مانگتا ہے، کبھی عزوجاہ کی تمنا کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ فلاں شخص کو جس چیز کی وجہ سے عزت وناموری ملی ہے اور جس چیز کی وجہ سے اس کے گھر میں دولت کی ریل پیل اور آسودگی ہے وہی چیز مجھے بھی مل جائے تو میں بھی اس جیسا ہو جاؤں گا۔

اللہ کے فضل کو متعین اور مقید نہ کرو

یہاں فرمایا جارہا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے کسی متعین چیز کی دعا نہ کرو کہ مجھے فلاں شخص جیسا بنادے بلکہ اللہ تعالیٰ سے صرف فضل مانگو کیونکہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہر شخص کیلئے جدا جدا صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ کسی کیلئے مال ودولت فضلِ الٰہی ہوتا ہے اگر وہ فقیر ہو جائے تو گناہ وکفر میں بتلا ہو جائے اور کسی کیلئے تنگی اور تنگدستی ہی اس کا فضل ہے کیونکہ اگر وہ غنی اور مالدار ہو جائے تو ہزاروں گناہوں کا شکار ہو جائے۔ یہی حال باقی کمالات کا بھی ہے، ہر شخص الگ الگ ظرف دے کر پیدا کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کون سی حالت کس شخص کیلئے بہتر ہے۔ اس لئے جب اللہ تعالیٰ سے صرف فضل مانگا جائے گا تو وہ وہ چیز عطا فرمائے گا جو مانگنے والے کیلئے خیر وبرکت کا باعث ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اس کا علم اور اس کی حکمت خوب جانتی ہے کہ میرا کون سا بندہ کس حال میں آسودہ رہ سکتا ہے اور اس کی کون سی حالت اس کی دنیا اور آخرت کی بھلائی کا سبب بن سکتی ہے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۟

(ہر ایک کیلئے ہم نے مقرر کردیئے ہیں وارث اس مال کے جو والدین اور قرابتدار چھوڑ جائیں۔ رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد وپیان ہوں تو ان کا حصہ انہیں دے دو، بیشک اللہ ہر چیز پر نگران ہے) (النسآء : ۳۳)

نظامِ میراث قطعی ہے

قرآنِ کریم میں نظامِ میراث نازل ہونے سے پہلے عربوں میں یہ طریقہ تھا کہ دوست واحباب آپس میں عہد وپیان کر لیتے کہ تم میری وراثت میں حصہ دار بنو گے اور میں تمہاری وراثت میں حصہ دار بنوں گا۔ اسی طرح منہ بولے بیٹے کو بھی وارث سمجھا جاتا تھا۔ اس آیتِ کریمہ میں جاہلیت کے ان تمام طریقوں کو منسوخ کرتے ہوئے فرمایا: ہم نے وارثوں کا حصہ مقرر کردیا ہے اور وارث بھی مقرر کردیئے ہیں اس لئے عہد وپیان کے ذریعے نہ کوئی کسی کا وارث ہوسکتا ہے نہ احکامِ میراث میں تبدیلی کرسکتا ہے۔ البتہ! اگر کوئی شخص وارثوں میں شامل نہیں تو تہائی مال میں مرنے والا اس کے لئے وصیت کرسکتا ہے۔ تو اگر کسی نے کسی غیر وارث کو کچھ دینے کا وعدہ کر رکھا ہے اور وہ ایک تہائی سے کم ہے تو یہاں حکم دیا گیا ہے کہ ایسے شخص کو وعدے کے مطابق اس کا حصہ دے دو۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ اگر تم نے بلاوجہ ان احکام میں تبدیلی لانے کیلئے کوئی مخفی یا فرضی کوشش کی تو وہ اللہ تعالیٰ کے علم سے مخفی نہیں رہ سکتی وہ ہر جگہ حاضر وناظر اور ہر جلی اور خفی کا جاننے والا ہے تمہاری بھی ہر طرح کی کوششوں سے باخبر ہے۔

Marfat.com

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى
بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ
لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ
وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا
عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ
بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ
يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾
وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا
وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى
وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۨ ۙ ﴿۳۶﴾ الَّذِيْنَ
يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ ﴿۳۷﴾
وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ
بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا
فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

Marfat.com

وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمۡ عَلِيۡمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنۡ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفۡهَا وَ يُؤۡتِ
مِنۡ لَّدُنۡهُ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍ
بِشَهِيۡدٍ وَّ جِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا ﴿۴۱﴾ ؕ يَوۡمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيۡنَ
كَفَرُوۡا وَ عَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰى بِهِمُ الۡاَرۡضُ ؕ وَ لَا يَكۡتُمُوۡنَ
اللّٰهَ حَدِيۡثًا ﴿۴۲﴾ ع

عربی رکوع ۶ (مردعورتوں پر قوام ہیں بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور بوجہ اس کے کہ انہوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں پس جو نیک بیبیاں ہیں وہ فرمانبرداری کرنے والی رازوں کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں بوجہ اس کے کہ خدا نے بھی رازوں کی حفاظت فرمائی ہے اور جن سے تمہیں سرتابی کا اندیشہ ہو تو ان کو نصیحت کرو اور ان کو ان کے بستروں پر تنہا چھوڑ دو اور ان کو سزا دو پس اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف راستہ تلاش نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ بہت بلند اور بہت بڑا ہے ○ اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان افتراق کا اندیشہ ہو ایک پنچ مرد کے لوگوں میں سے اور ایک پنچ عورت کے لوگوں میں سے مقرر کرو۔ اگر دونوں اصلاح کے طالب ہوئے تو اللہ ان کے درمیان سازگاری پیدا کر دے گا بے شک اللہ علیم و خبیر ہے ○ اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو اور قرابت داروں کے ساتھ، یتیموں کے ساتھ اور مسکینوں کے ساتھ اور قرابتدار پڑوسی کے ساتھ اور بے گانہ پڑوسی کے ساتھ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور اپنے مملوک کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ اللہ اترانے اور بڑائی مارنے والوں کو پسند نہیں کرتا ○ جو خود بھی بخل کرتے اور لوگوں کو بھی بخالت کا مشورہ دیتے ہیں اور اللہ نے اپنے فضل میں سے جو کچھ انہیں دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں۔ ہم نے ایسے ناشکروں کیلئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے ○ اور وہ لوگ جو اپنے مال لوگوں کو دکھانے کیلئے خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جس کا ساتھی شیطان بن جائے وہ نہایت برا ساتھی ہے ○ اور کیا نقصان تھا ان کا اگر ایمان لاتے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور اللہ نے ان کو جو کچھ عطا کر رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے اور اللہ تو ان سے اچھی طرح باخبر ہے ○ اللہ ذرا بھی کسی کی حق تلفی نہیں کرتا اگر ایک

Marfat.com

نیکی ہوتو اس کوئی گناہ بڑھا دیتا ہے اور خاص اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا فرماتا ہے ○ اس دن ان کا کیا حال ہوگا؟ جب ہم ہرامت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر کھڑا کریں گے ○ اس دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور جنہوں نے رسول کی نافرمانی کی تمنا کریں گے کہ کاش! ان پر زمین برابر کردی جائے اور اس دن وہ اللہ سے کوئی بات بھی چھپا نہ سکیں گے) (آیات ۳۴ تا ۴۲)

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ○

(مرد عورتوں پر قوام ہیں بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور بوجہ اس کے کہ انہوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں پس جو نیک بیبیاں ہیں وہ فرمانبرداری کرنے والی رازوں کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں بوجہ اس کے کہ خدا نے بھی رازوں کی حفاظت فرمائی ہے اور جن سے تمہیں سرتابی کا اندیشہ ہو تو ان کو نصیحت کرو اور ان کو ان کے بستروں پر تنہا چھوڑ دو اور ان کو سزا دو پس اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف راستہ تلاش نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ بہت بلند اور بہت بڑا ہے) (النسآء : ۳۴)

آیت کریمہ کو سمجھنے کے لیے تمہید

پیشتر اس سے کہ ہم اس آیت کی وضاحت کریں تمہیدی طور پر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام اجتماعی اور انفرادی زندگی کے جو حدود اور آداب متعین کرتا ہے، اس کی تربیت کیلئے پہلا ادارہ گھر کو قرار دیتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں گھر ایک ایسی اکائی ہے جو اجتماعیت کی کونپل ہے۔ اسی سے خاندان کی تنظیم ہوتی ہے، یہی آگے بڑھکر معاشرہ کی صورت اختیار کرتا ہے اور اسی سے ریاست وجود میں آتی ہے۔ چنا قرآنِ کریم نے اس گھر کی حقیقی حیثیت کو واضح کرنے کیلئے اس کو حصن قرار دیا ہے اور نکاح کو احصان کا نام دیا ہے۔ گویا یہ گھر انسانی معاشر کی پہلی اکائی کا قلعہ ہے اور نکاح کے ذریعے سے اس کی قلعہ بندی کی جارہی ہے۔ جس میں رہنے والے دوسرے انسانوں کی طرح خواہشات رکھتے ہوئے بھی شرم وحیا اور عفت اور پاکدامنی کے قلعے میں محصور رہ کر زندگی گزاریں گے اور جس میں پیدا ہونے والا بچہ پاکیزہ اور محفوظ نسب کا حامل ہونے کی وجہ سے والدین کے خصائل حسنہ اور صفات حمیدہ کا امین ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی کہ اس رشتے کا مقصد عفت اور پاکدامنی پیدا کرنا ہے وہاں اس گھر میں رہنے والوں میں مودت اور رحمت کے جذبات پیدا کرنا بھی مقصود کیونکہ کوئی قلعہ محض اینٹوں کی پختگی اور مضبوطی سے پائیدار نہیں ہوتا بلکہ قلعے میں رہنے والے اور اس کے مورچوں میں بیٹھنے والے لوگو

Marfat.com

باہمی محبت، گہرے تعلق اور باہمی ہم آہنگی سے پائیداری اور استواری وجود میں آتی ہے۔ان تصورات کے پیشِ نظر یہ بات سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ گھر کی یہ چھوٹی سی وحدت حقیقت میں ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس کے زیرِ سایہ رہنے والوں کی حفاظت ان کی عادات واطوار کی درستی، ان کے اعمال وافکار کی تہذیب و تنقیح اس ریاست کا اولین مقصد ہے۔اور مزید یہ کہ یہ ریاست اپنے نظریاتی مقاصد بھی رکھتی ہے اور پھر اپنے زیرِ سایہ رہنے والوں میں باہمی ہم آہنگی اور مودت ورحمت کے جذبات بھی پیدا کرنا چاہتی ہے یقیناً اس کا کوئی نہ کوئی سر براہ کار، کوئی نہ کوئی نگران اور منتظم اور کوئی نہ کوئی امیر اور حاکم ہونا چاہئے اس لئے کہ دنیا کی ریاست تو خیر دور کی بات ہے ایک چھوٹے سے چھوٹا ادارہ بھی تقسیم کار اور تقسیم اختیارات اور سر براہی کا فیصلہ کئے بغیر اولاً تو وجود میں ہی نہیں آتا اور اگر وجود میں آ جائے تو باقی نہیں رہتا اور اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ جس ادارے میں جتنے افراد کام کرتے ہیں وہ سب برابر کے اختیارات رکھیں گے اور کوئی کسی کو کسی غلطی پر ٹوکنے کا مجاز نہیں ہوگا بلکہ ہر کوئی من مرضی کا مالک ہوگا تو آپ پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ایسا ادارہ چند دن بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ پوری دنیا میں اس مسلمہ حقیقت کا چلن ہم عام دیکھتے ہیں کہ اداروں اور ریاستوں میں کام کرنے والے لوگ جس طرح مختلف فرائض رکھتے ہیں اسی طرح مختلف حیثیتوں کے مالک بھی ہیں۔کسی انتظامی شعبے کا کوئی ایک سیکشن بھی دیکھ لیجئے اس میں باہر آپ کو ایک نائب قاصد ملے گا، اندر کام کرنے والے چند کلرک دکھائی دیں گے، ان کے اوپر ایک ہیڈ کلرک ہوگا، پھر ان کی نگرانی کیلئے ایک اسسٹنٹ اور پھر سپرنٹنڈنٹ ہوگا اور ان سب کے اوپر راہنمائی اور نگرانی کیلئے ایک سیکشن آفیسر ہوگا۔غور کیجئے! یہ تمام انسان ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں لیکن صلاحیتوں کے اعتبار سے اختیارات کے اعتبار سے اور اپنی حیثیت کے اعتبار سے ہرگز برابر نہیں۔ یہ حال اس ایک سیکشن کا ہے جس کو دن بھر میں چند گھنٹے کام کرنا ہے اور چند ذمہ داریاں ادا کرنا ہیں۔رہا وہ گھر جس کے رہنے والوں کو زندگی بھر اکٹھے رہنا ہے اور جن کے سپرد نوعِ انسانی کی آئندہ تیار ہونے والی نسل کی زندگی اور ان کے فکر و عمل کی درستی کی ذمہ داری ہے اسے اگر اس سوال کو حل کئے بغیر چھوڑ دیا جائے کہ اس چھوٹی سی ریاست کا سر براہ کون ہوگا؟ اور اس گھر میں رہنے والے باقی افراد کی حیثیت کیا ہوگی؟ یعنی ان کے حقوق وفرائض کا تعین کیسے کیا جائے گا؟ تو یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ یہ گھر باقی نہیں رہ سکتا۔اب سوال یہ ہے کہ یہ ریاست جس کا آغاز دو افراد یعنی میاں اور بیوی سے ہو رہا ہے ان دونوں میں سے کس کو سر براہی کے مقام پر فائز کیا جائے؟ دونوں تو سر براہ نہیں ہو سکتے اس لئے کہ یہ عقل اور انسانی تجربے کے خلاف ہے۔کسی ایک کو بہر حال سر براہ بننا ہے تو وہ مرد ہو یا عورت؟ قرآنِ کریم کا جواب یہ ہے کہ یہ مقام مرد کو حاصل ہے۔ارشادِ خداوندی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ

(مرد عورتوں کے سر براہ منتظم اور سرپرست ہیں بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور بوجہ اس کے کہ انہوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے)

قوام کا معنیٰ ''حاکم، محافظ، سر براہ کار، معاملات کا منتظم اور نگران'' کے ہیں۔عربی زبان میں قائم کے بعد علیٰ آتا ہے تو اس کے اندر نگرانی کفالت اور تولیت کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ میں بالاتری کا مفہوم بھی ہے اور کفالت اور تولیت کا بھی۔

یہ مرد کا قوام ہونا بلاوجہ نہیں بلکہ اس پر قرآن کریم نے اسی آیت میں دو دلائل بھی مہیا فرمائے ہیں۔

Marfat.com

1۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت بخشی ہے مرد کو بعض صفات میں عورت پر نمایاں تفوق حاصل ہے۔ جس کی بنا پر وہ سزاوار ہے کہ قوامیت کی ذمہ داری اسی پر ڈالی جائے۔ مثلاً محافظت و مدافعت کی جو قوت و صلاحیت یا کمانے اور ہاتھ پاؤں مارنے کی جو استعداد اور ہمت اس کے اندر ہے وہ عورت کے اندر نہیں ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیرِ بحث کلی فضیلت نہیں ہے بلکہ صرف وہ فضیلت ہے جو مرد کی قوامیت کے استحقاق کو ثابت کرتی ہے۔ بعض دوسرے پہلو عورت کی فضیلت کے بھی ہیں لیکن ان کا قوامیت سے تعلق نہیں مثلاً عورت گھر در سنبھالنے اور بچوں کی پرورش ونگہداشت کی جو صلاحیت رکھتی ہے وہ مرد نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے قرآنِ کریم نے یہاں بات ابہام کے انداز میں فرمائی ہے۔ جس سے مرد وعورت دونوں کا کسی نہ کسی پہلو سے صاحبِ فضیلت ہونا نکلتا ہے لیکن قوامیت کے پہلو سے مرد ہی کی فضیلت کا پہلو راجح ہے۔

2۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ مرد نے عورت پر اپنا مال خرچ کیا ہے یعنی بیوی بچوں کی معاشی اور کفالتی ذمہ داری تمام تر اپنے سر اٹھائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری مرد نے اتفاقیہ یا تبرعاً نہیں اٹھائی ہے بلکہ اس وجہ سے اٹھائی ہے کہ یہ ذمہ داری اسی کے اٹھانے کی ہے۔ وہی اس کی صلاحیتیں رکھتا ہے اور وہی اس حق کا ادا کر سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کی اس حیثیت کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اَلرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی اَهْلِهٖ وَمَسْئُوْلٌ

مرد اپنے اہلِ خانہ کا نگران ہے اور اسی سے اس نگرانی کے حوالے سے سوال کیا جائے گا

مرد کو چونکہ گھر کی راہنمائی، نگرانی، گھر بھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور پھر قیامت کے دن اسی حوالے سے اس سے سوال بھی کیا جائے گا۔ واضح بات ہے کہ جب کسی پر ذمہ داری ڈالی جاتی ہے تو پھر اس کو اختیارات بھی دیئے جاتے ہیں اس لحاظ سے مرد کو بھی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ایسے حقوق عطا کیے گئے اور ایسے اختیارات دیئے گئے ہیں جن کو کام لا کر وہ باحسن طریق اپنی ذمہ داریاں ادا کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ مرد کو بیوی پر جو بھی حقوق حاصل ہیں اس کی بنیاد مرد کا قوام ہونا اور گھر کی اس حیثیت اور کردار کا تسلیم کرنا ہے جس کا ذکر سابقہ سطور میں کیا گیا ہے۔ اگر ان دونوں بنیادی باتوں کو قبول نہ کیا جائے تو پھر ایک عورت کیلئے مرد کے حقوق یعنی اپنی ذمہ داریوں کو قبول کرنا چنداں آسان نہیں۔ یہ وہ بنائے نزاع ہے جس نے آج مرد وعورت کے تعلق کو الجھا کر رکھ دیا ہے اور اولاد کی تربیت روز بروز زوال کا شکار ہے۔ دنیا کا کوئی ادارہ بھی جسے کوئی مثبت اور تعمیری کام سرانجام دینا ہے یہ صورت حال قبول نہیں کر سکتا کہ اس میں فرائض ادا کرنے والے اپنے سامنے اہداف کو اہمیت دیں اور نہ کسی کی نگرانی اور راہنمائی کو قبول کریں۔ بس ان کے سامنے زندگی سے لطف اٹھانے داد عیش دینے اور کھانے پینے کے سوا کسی چیز کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ اگر دنیا میں معمولی نوعیت اور مختصر دائرہ میں اثر انداز ہونے والے اداروں کا یہ حال ہے تو زندگی کو وجود بخشنے والا ادارہ یعنی انسان کا مولد و مبدا اور پھر اس کی نشأۃ وارتقاء کا ضامن اور اس کے افکار واعمال کی پہلی تربیت گاہ کے معاملے میں یہ رویہ کہاں تک قابلِ قبول ہو سکتا ہے کہ میاں بیوی کے بارہ یہ احمقانہ تصور قبول کر لیا جائے کہ مرد وعورت کی برابری اور مساوات کا مطلب یہ ہے کہ عورت مرد بن کر زندگی گزارے گی اور اس کا دائرہ کار بھی وہی ہوگا جو مرد کا دائرہ کار ہے۔ پھر پروپیگنڈا کے زور اور آزادیٔ نسواں کے پُرفریب نام سے عورت کو ایسا بے وقوف بنایا گیا ہے جس کے نتیجے میں عورت پوری طرح جسمانی، روحانی اور اخلاقی استحصال کا شکار ہو

Marfat.com

عورت جس کی گود میں تاریخ کی بڑی سے بڑی عظمتوں نے آنکھیں کھولی تھیں اور جس کے پاؤں تلے جنت کی نوید سنائی گئی تھی اس کی گود بھی اجڑ گئی اور اس کا بڑھاپا بھی رسوا ہو گیا۔ انسانیت کی اس تذلیل میں چونکہ مرد نے بھی عیارانہ کردار ادا کیا ہے اس لئے دونوں کو قدرت سزا دے رہی ہے کہ کہیں آئے دن عہد وفا کی شکست و ریخت نے خودکشی کی وارداتوں کے تناسب کو تشویشناک حد تک بڑھا دیا ہے اور کہیں نرسنگ ہومز اور اولڈ ہومز کی صورت میں انسانیت تذلیل کا شکار ہو کر اپنی آنکھوں سے اپنے انجام کو دیکھ رہی ہے۔

غضب خدا کا کہ عورت کو آزادی کے نام پر گھر سے نکالا اور اس نے اس پروپیگنڈے کا شکار ہو کر گھر کی چاردیواری میں محصور ہونے اور چھوٹے بہن بھائیوں شوہر اور بچوں کی خدمت سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ چولہا جھونکنا اور دوسروں کی خدمت کرنا میری توہین ہے۔ میں اس رجعت پسندی اور دقیانوسیت کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہوں۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا کہ جس عورت کو گھر میں بیٹھنا اور اہلِ خانہ کی خدمت رجعت پسندی معلوم ہوتی تھی وہ ہوٹلوں میں ویٹرس بنی ہوئی دن رات لوگوں کی خدمت میں لگی ہوئی ہے۔ ہوٹلوں میں بستروں کی چادریں بدل رہی ہے۔ ہوائی جہازوں میں ایئر ہوسٹس بن کر سینکڑوں مہمانوں کی جا و بے جا ناز برداریاں کر رہی ہے اور ہوسناک نگاہوں کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ اسی پر بس نہیں دفتروں میں اسٹینو گرافر یا کسی صاحب کی سیکرٹری بن کر متاعِ دین و دانش لٹا رہی ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام کے نزدیک اس خرابی کی تمام تر ذمہ داری اور انسانیت کی اس تذلیل کا تمام تر انحصار مرد و عورت کے تعلق کے غلط ہونے پر ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ وہ اسی طرح ممکن ہے کہ ان دونوں کو ان کے حقیقی مقام اور اپنے اپنے فرائض سے آگاہ کیا جائے اس لئے وہ سب سے پہلے اس تعلق کو درست کرنے کیلئے مرد کے قوام ہونے کا اعلان کرتا ہے اور پھر اسی حوالے سے اس کے حقوق کا ذکر کرتا ہے۔

بیویوں کی صفات اور فرائض

گھر کی اہمیت اور مرد کی حیثیت کو واضح کرنے کے بعد بیویوں کی صفات کو بیان کیا گیا ہے۔ جو درحقیقت بیویوں کی ذمہ داریاں اور فرائض اور مردوں کے ان کے ذمہ حقوق ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ گھر کو صحیح معنی میں گھر بنانے اور آئندہ بچوں کی تربیت کیلئے خاتونِ خانہ کی اصل حیثیت کا تعین بھی ہے۔ ان میں سب سے پہلی بات یہ فرمائی کہ بیویاں اور گھروں کی ذمہ دار خواتین صالحات ہوتی ہیں۔ یہ ان کی ایسی مستقل صفت ہے جو ان سے کبھی منفک نہیں ہوتی۔ صالحات ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ تعلقات اور گھر کے معاملات کو چلاتے ہوئے اپنے نفس کی ہدایات پر نہیں چلتیں بلکہ اللہ اور رسول کی ہدایات ان کی راہنما ہوتی ہیں۔ وہ ہر حال میں اللہ سے ڈرنے والی اور شریعت کے احکام پر عمل کرنے والی ہوتی ہیں۔ اللہ کی نعمتوں پر شکر گزار اور تنگیوں پر صبر کرنے والی ہوتی ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے شوہر کی وفاداری کرتی ہیں۔

ان کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ قانتات ہوتی ہیں۔ قانتات کا معنی ہے ''فرمانبرداری کرنے والیاں''۔ یعنی نیک بیویوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہائیت فرمانبرداری کے ساتھ اپنے شوہر کی اطاعت کرتی ہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

Marfat.com

اَعْظَمُ النَّاسِ حَقًّا عَلَی الْمَرأَةِ زَوْجُهَا وَاَعْظَمُ النَّاسِ حَقًّا عَلَی الرَّجُلِ اُمُّه

(لوگوں میں سے سب سے زیادہ حق عورت پر اس کے شوہر کا ہے اور لوگوں میں سب سے زیادہ حق مرد پر اس کی والدہ کا ہے)

مزید فرمایا:

لَوْ كُنْتُ اٰمُرُ اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا

(اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے)

قرآن وسنت کے ان واضح ارشادات سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ جو عورتیں صالحات بن کر نہیں رہنا چاہتیں اور وہ اپنے شوہر کی اطاعت کو اپنے لئے بوجھ سمجھتی اور اسے اپنی آزادی کیلئے چیلنج گردانتی ہیں، وہ درحقیقت عورت بن کر نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں مرد بن کر رہنا چاہتی ہے۔ان کا یہ رویہ صالحات کا نہیں بلکہ فاسقات کا ہے۔ یہی وہ رویہ ہے جس نے اسلام کے نظامِ عفت وعصمت اور عائلی قوانین کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ نتیجتاً گھر برکتوں اور خوشحالیوں سے محروم ہو گئے۔

تیسری صفت ان نیک بیبیوں کی یہ ہے کہ وہ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ ہوتی ہیں۔یعنی وہ مرد کی عزت وناموس اور رازوں کی حفاظت کرتی ہیں اور وہ ہر اس چیز کی حفاظت کرتی ہیں جو شوہر کی غیر موجودگی میں بطور امانت عورت کے پاس ہے۔اس میں اس کے نسب کی حفاظت، اس کی آبرو کی حفاظت، اس کے مال کی حفاظت، اس کے رازوں کی حفاظت، خود اس کی اپنی عفت اور پاکدامنی کی حفاظت، غرض سب کچھ اس میں آجاتا ہے کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے قدرتی امین ہیں۔ بالخصوص عورت کا مرتبہ تو یہ ہے کہ وہ مرد کے محاسن ومعائب اس کے گھر در، اس کے اموال واملاک اور اس کی عزت وناموس ہر چیز کی ایسی رازدان ہے کہ اگر اس کا پردہ چاک کرنے پر اتر آئے تو مرد بالکل ہی ننگا ہو کر رہ جائے۔اس لئے قرآنِ کریم نے میاں بیوی کی حیثیت کو واضح کرنے کیلئے ارشاد فرمایا: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ''وہ تمہارا لباس ہیں تم ان کا لباس ہو''۔

لباس جس طرح ایک لباس پوش کیلئے پردہ پوش حفاظت کرنے والا اور اس سے گہرے اتصال کی علامت ہے، یہی حال میاں بیوی کا بھی ہے۔ بیوی پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اطاعت کے ساتھ ساتھ مرد کے رازوں اور ان تمام چیزوں کی جس کا ابھی ذکر ہو چکا ہے حفاظت کرے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اس کی تفصیل بیان فرمائی، جن میں سے میں چند ایک کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔آپ نے فرمایا:

ان لکم علیھن ان لا یوطئن فرشکم احد تکرھوا

(تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے ہاں کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو)

Marfat.com

لَا تُصَدِّقُ بِشَيْءٍ مِن بَيتِهِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ فَاِنْ فَعَلَتْ كَانَ لَهُ الْاَجْرُ

وَعَلَيْهَا الْوِزْرُ وَلَا تَخْرُجُ مِن بَيتِهِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ

(وہ اس کے گھر میں سے کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر صدقہ نہ کرے اگر ایسا کرے گی تو اجر
شوہر کو ملے گا اور گناہ عورت پر ہوگا نیز وہ اس کی اجازت کے بغیر گھر سے نہ نکلے)

خَيْرُ النِّسَآءِ اِمْرَاَةٌ اِذَا نَظَرْتَ اِلَيْهَا سَرَّتْكَ وَاِذَا اَمَرْتَهَا اَطَاعَتْكَ

وَاِذَا غِبْتَ عَنْهَا حَفِظَتْكَ فِيْ مَالِكَ وَنَفْسِهَا

(بہترین عورت وہ ہے کہ جب تو اس کو دیکھے تو تمہارا دل خوش ہو جائے اور جب تو اس کو حکم دے وہ تمہاری اطاعت
کرے اور جب تو اس کے پاس موجود نہ ہو تو وہ تمہارے مال اور اپنے نفس میں تمہارے حق کی حفاظت کرے)

شوہر کی اطاعت غیر مشروط نہیں

البتہ یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ یہ اطاعت غیر مشروط نہیں کیونکہ غیر مشروط اطاعت صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ اگر شوہر اپنی بیوی سے اللہ کی معصیت کا مطالبہ کرے مثلاً وہ فرض نماز اور روزے سے منع کرے یا شراب پینے کا حکم دے یا پردہ شرعی ترک کرائے یا فواحش کا ارتکاب کرانا چاہے تو عورت نہ صرف انکار کرنے کی مجاز ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ شوہر کے ایسے حکم کو ٹھکرا دے۔ اس لئے کہ خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ مختصر یہ کہ ایک بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کرنا چاہئے اور یہی اس کی ذمہ داری ہے اور یہی رویہ اس گھر کیلئے سرتاپا رحمت ہے اور اللہ کی رحمتیں ہمیشہ اس پر برستی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ جب شوہر بیوی کو دیکھے تو وہ مسکرائے اور بیوی شوہر کو دیکھے تو شوہر مسکرائے تو دونوں کی اس خوشی کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی رحمت ان پر مسکرانے لگتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی کی بظاہر آپس کی خوشیاں جو نفسانی خواہشیں بھی کہی جاسکتی ہیں لیکن وہ اللہ کی رحمت کا سبب بنتی ہیں۔ کیونکہ یہی خوشیاں اور یہ بہتر رویہ انسانی معاشرے کی بہتری اور اس کے تہذیب و تمدن کے ارتقا کا باعث بنتا ہے۔ لیکن اگر کوئی بیوی شوہر کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرتی ہے جسے قرآن کریم نے نشوز کا نام دیا ہے تو اس کیلئے اس آیت کے اگلے حصے میں ہدایات عطا فرمائی گئی ہیں۔ ارشاد فرمایا:

وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ
اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ○

(اور جن سے تمہیں نشوز کا اندیشہ ہو تو ان کو نصیحت کرو اور ان کو ان کے بستروں پر تنہا چھوڑ دو اور ان کو سزا دو۔ پس اگر وہ
تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف راہ نہ ڈھونڈو بے شک اللہ بہت بلند اور بہت بڑا ہے)

Marfat.com

(نشوز کی صورت میں شوہر کو تین اختیارات دیے گئے ہیں)

(۱) نصیحت (۲) ھجر فی المضاجع (۳) تعزیر

نشوز کا مفہوم

ان تینوں اختیارات کا تعلق چونکہ نشوز سے ہے اس لئے نشوز کا مفہوم سمجھ لینا چاہئے۔ نشوز معمولی عدم اطاعت کو نہیں کہتے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ بیوی نے اگر ذرا سی کسی بات سے انکار کیا یا تعمیل حکم میں دیر ہوگئی یا کسی بات میں کوتاہی ہوگئی تو یہ سمجھ لیا جائے کہ نشوز ہو گیا ورنہ شوہر کو تو نرم دل ہونا چاہئے اس لئے کہ جس پروردگار نے شوہر کو بیوی پر قوام بنایا ہے اسی نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ

(اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک یہ نشانی ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری بیویاں تمہارے نفس سے پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون پاؤ اور اس نے تمہارے درمیان ہمدردی اور رحمت پیدا کردی)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی میں صرف یہی تعلق نہیں رکھا کہ مرد حاکم ہے اور بیوی محکوم، مرد اور بیوی، مرد اور عورت کے درمیان یہ تعلق بھی ہے کہ شوہر اپنی بیوی میں سکون پاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں میں ہمدردی اور رحمت کا رشتہ رکھا ہے۔ ہمدردی اور رحمت کے رشتے کا یہ تقاضا ہے کہ انتظامی ضرورتوں کے حوالے سے اگرچہ شوہر کو ایک فوقیت حاصل ہے اور اس کے احکام مانے جانے چاہئیں لیکن اس کا رویہ اپنی بیوی سے ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہئے جیسے ایک حکمران اور بادشاہ کا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہ حکم ہے کہ تم میں سے دو دوست بھی اگر کہیں سفر کریں تو دونوں آپس میں ایک کو امیر بنالیں تاکہ راستے کے معمولات حسن و خوبی سے انجام پاسکیں۔ اب اس امیر بننے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ دوستوں میں دوستی کی نزاکتیں ختم ہوگئیں اسی طرح شوہر کو اگرچہ قوام بنایا گیا ہے اور اسے ایک درجہ فضیلت حاصل ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ دونوں ہی مودت و رحمت کے رشتے کو بھول جائیں۔ اس لئے میاں بیوی میں کہیں معمولی اختلاف بھی ہو جائے تو اس کو شوہر کو ہرگز بڑا نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسے برداشت کرنا چاہئے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ایک ساتھ رہتے ہوئے معمولی اختلاف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات آنحضرت سے بھی کرتی تھیں اگرچہ جلالت تھیں لیکن طبیعتوں میں کسی بات سے انقباض کا پیدا ہو جانا انسانی فطرت ہے۔ لیکن حضور نے کبھی اسے برا نہیں مانا۔ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ عائشہ جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تو "رب محمد" کہہ کر قسم کھاتی ہو اور جب مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو "رب ابراہیم" کہہ کر قسم کھاتی ہو۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا حضور: انی لااھجر الا اسمک "حضور میں آپ کا صرف نام چھوڑتی ہوں" یعنی صرف آپ کا نام نہیں لیتی ورنہ خدانخواستہ آپ سے تعلق میں تو کوئی کمی نہیں آتی۔

اندازہ کیجئے ازواج مطہرات اگر کسی معمولی ناراضگی کا شکار بھی ہوتی تھیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بلند ترین مراتب کے باوجود اس بات کو اپنی قوامیت کے خلاف نہیں سمجھتے تھے۔

Marfat.com

نشوز کی صورت میں شوہر کو تین باتوں کی ہدایت

اس لئے نشوز کا معنی عدم اطاعت نہیں بلکہ یہ ایسی سرتابی اور سرکشی کو کہتے ہیں جو کسی عورت کی طرف سے اس کے شوہر کے مقابل میں ظاہر ہو اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرکشی کی راہ پر چل پڑی ہے اور وہ ایسا قدم اٹھانا چاہتی ہے جو مرد کی قوامیت کو چیلنج کرنے والا ہے اور جس سے گھر کے معمولات میں بدامنی اور اختلال پیدا ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو مرد تین صورتیں اختیار کر سکتا ہے اور قرآن کا انداز بیان دلیل ہے کہ ان تینوں میں ترتیب وتدریج ملحوظ رہے۔

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ نصیحت وملامت کرے۔ قرآنِ کریم میں وعظ کا لفظ ہے جس کے اندر فی الجملہ زجر وتوبیخ کا مفہوم بھی پایا ہے۔ یعنی وہ ہر ممکن طریقے سے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کرے کہ دیکھو تم نے جو روّیہ اختیار کیا ہے اس سے ہمارا گھر برباد ہو جائے گا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔ اولاد پر اس کے اثرات نہایت منفی بھی ہو سکتے ہیں جب تک چھوٹے ہیں ہماری بے توجہی کا شکار ہوں گے، بڑے ہو جائیں گے تو ہماری نافرمانی کریں گے کیونکہ بیوی جب شوہر کا احترام اور اطاعت نہیں کرتی تو اولاد کیسے کرے گی؟ اور جب شوہر اپنا مقام ومرتبہ کھودے گا تو اولاد ماں کی بھی پرواہ نہیں کرے گی۔ اس طرح یہ گھر گھر نہیں رہے گا بلکہ سرائے بن جائے گا۔ اگر شوہر کا سمجھانا موثر نہ رہا ہو تو خاندان کے بزرگوں سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ شوہر کو نصیحت اور سمجھانے بجھانے کے تمام ممکن ذرائع اور تمام موثر اسالیب سے کام لے کر اصلاح حال کی کوشش کر دیکھنی چاہئے لیکن اگر یہ تمام مساعی بیکار ثابت ہوں تو پھر دوسرے مرحلے میں دوسری ہدایت پر عمل ہونا چاہئے۔ وہ یہ کہ شوہر اپنی بیوی سے بے تکلفانہ خلاملا ترک کر دے۔ میاں بیوی کے درمیان جو بھی بے تکلفی کے تعلقات رشتۂ ازدواج کی علامت ہیں ان سے یکسر لاتعلقی اختیار کی جائے تاکہ بیوی کو اندازہ ہو جائے کہ معاملہ بہت بگڑ گیا ہے اب اگر میں نے اپنی روش نہ بدلی تو اس کے نتائج دوررس بھی ہو سکتے ہیں۔

یہاں بھی دو باتیں ذہن میں رہنی چاہئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ جس طرح بیوی کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ وہ اپنے اور شوہر کے درمیان فاصلہ رکھے اور شوہر سے صنفی تعلق سے احتراز کرے اس طرح مرد کیلئے بھی اس بات کی بالکل گنجائش نہیں ہے کہ وہ معمولی باتوں پر بیوی سے قطع تعلق کرے اور اس کے احساس کو زخمی کرے۔ یہ قطع تعلق صرف نشوز کی صورت میں بیوی کی راہِ راست پر لانے کیلئے جائز ٹھہرایا گیا ہے۔

ترکِ مباشرت لامحدود نہیں

دوسری بات یہ کہ یہ ترکِ تعلق لامحدود نہیں بلکہ آیت ایلا کے ذریعے اس کی ایک فطری حد مقرر کر دی گئی ہے یعنی ترک مباشرت اور لاتعلقی چار مہینے سے زیادہ نہ ہو کیونکہ اگر بیوی کی طبیعت میں ذرا بھی سلامتی اور اصلاح کا مادہ ہوگا تو وہ اپنی روش بدلنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ لیکن اگر وہ ایسی شوریدہ سر ہے کہ اس انتہائی اقدام کی بھی پرواہ نہیں کرتی تو آخری درجے میں مرد کو جسمانی سزا دینے کا بھی اختیار ہے۔ لیکن اس میں بھی دو باتوں کا لحاظ بہت ضروری ہے۔

Marfat.com

ا۔ پہلی بات یہ کہ شوہر کو اس بات کا اطمینان کر لینا چاہئے کہ جس خاتون نے نصیحت کا اثر قبول کیا نہ ترکِ تعلق اور ترکِ مباشرت سے راہِ راست پر آئی کیا جسمانی سزا اسے راہِ راست پر لے آئے گی؟ کیونکہ تعلیم یافتہ خواتین اپنے بگاڑ میں بھی بعض تخصصات رکھتی ہیں۔ایسی سختی ان پر بالعموم منفی اثرات پیدا کرتی ہے۔اگر صورتحال ایسی ہو تو پھر جسمانی سزا سے احتراز کرنا چاہئے۔البتہ! اگر واسطہ کسی ان پڑھ خاتون یا ایسے مزاج کی خاتون سے ہو تو پھر اس پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ مقصد تو اصلاح احوال ہے۔

۲۔ دوسری بات جس کی طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے وہ یہ کہ جسمانی سزا اس حد تک ہونی چاہئے جس حد تک ایک معلم ومودِّب اپنے کسی زیرِ تربیت شاگرد کو دے سکتا ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے ہمیں واضح راہنمائی ملتی ہے۔ارشادِ نبوی ہے:

اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَاِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٌ لَيْسَ تَمْلِكُوْنَ مِنْهُنَّ شَيْئًا غَيْرِ ذٰلِكَ اِلَّا اَنْ يَّاتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ فَاِنْ فَعَلْنَ فَاهْجُرُوْهُنَّ وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا

(عورتوں کے بارے میں بھلائی کی نصیحت حاصل کرو کیونکہ وہ تمہارے ماتحت ہیں۔تم اس کے سوا کسی اور شے کے مالک نہیں مگر جب وہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ترکِ تعلق کرو اور انہیں ہلکی مار دو۔اگر وہ اطاعت کر لیں تو ان سے کچھ نہ کہو)

ایک دوسرے ارشاد میں فرمایا:

وَاضْرِبُوْهُنَّ اِذَا عَصَيْنَكُمْ فِي الْمَعْرُوْفِ غَيْرَ مُبَرِّحٍ وَلَا يَضْرِبُ الْاَوْجُهُ وَلَا يُقَبِّحُ

(جب وہ معروف میں تمہاری نافرمانی کریں تو انہیں ہلکی مار دو اور چہرہ پر نہ مارو اور برا بھلا نہ کہو)

ان احادیث میں غَيْرَ مُبَرِّحٍ کے الفاظ سے مار اور سزا کی حد واضح فرما دی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ سزا ایسی نہ ہو کہ وہ پائیدار اثر چھوڑ جائے۔

بدزبانی نہ کی جائے

نیز وَلَا يُقَبِّحُ بھی فرمایا گیا کہ جسمانی سزا تادیب کیلئے ہونی چاہئے اس لئے اپنی بیوی کو گالی گلوچ یا برے کلمات کہہ کر ذہنی اذیت مت دو۔

مرد کے تادیبی اختیارات کی یہ آخری حد ہے اگر اس کا نتیجہ مفید مطلب برآمد ہوا اور عورت بغاوت کی بجائے اطاعت کی راہ پر آجائے تو پچھلی کدورتیں بھلا دینی چاہئیں، اس سے انتقام لینے کے بہانے نہیں ڈھونڈنے چاہئیں۔مرد کو اپنی قوامیت کے زعم میں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ سب سے بلند اور سب سے بڑا اللہ ہے جس کی گرفت سے کوئی باہر نہیں۔

لیکن اگر یہ ترغیب وتادیب کے تمام ممکن ذرائع استعمال کرنے کے بعد بھی عورت نشوز سے تائب نہیں ہوتی اور مرد کی تمام تدابیر

Marfat.com

اکارت جاتی ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے مرد یعنی شوہر کو طلاق کا حق دیا ہے۔اب چونکہ یکجائی کی کوئی صورت نہیں اور اختلافات کی خلیج بہت وسیع ہو گئی ہے اس لئے بہتر ہے کہ طلاق کے ذریعہ دونوں الگ ہو جائیں کیونکہ اب اگر زبردستی دونوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی تو اولاً تو یہ دونوں پر ظلم ہوگا اور ثانیاً اس سے مقاصدِ نکاح کو بھی نقصان پہنچے گا کیونکہ نکاح کے دو بڑے مقاصد تھے۔ایک یہ کہ میاں بیوی کے باہمی گہرے جذباتی رشتے سے شرم وحیا اور عفت وعصمت کا وہ قلعہ تعمیر ہو جس میں یہ دونوں نہایت پاکیزہ زندگی گزاریں۔دوسرا یہ کہ ان دونوں کے درمیان مودت ورحمت کے جذبات کی وجہ سے معاشرے کو ایک مضبوط معاشرتی اور اخلاقی بنیاد فراہم ہو جو تہذیب وتمدن کیلئے مطلوبہ نتائج پیدا کرنے میں ممدومعاون ہو۔لیکن جب دونوں مقاصد کسی طرح بھی بروئے کار آتے نظر نہیں آتے تو شریعت دوزندگیوں کو تباہ کرنے اور اس کے وسیع تر اثرات سے معاشرے کو بچانے کیلئے مرد کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ طلاق دے کر نئی زندگی کے آغاز کی صورت پیدا کردے۔یاد رہے! یہ اختیار اس نے مرد کو دیا ہے عورت کو یا کسی عدالت کو یہ اختیار نہیں دیا۔قرآنِ کریم واضح طور پر جہاں بھی احکامِ طلاق بیان کرتا ہے وہاں فعل طلاق کو شوہر کی طرف منسوب کرتا ہے اور سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۱ میں صریحاً شوہر کے بارے میں کہتا ہے:

بیدہ عقدۃ النکاح (نکاح کی گرہ شوہر کے ہاتھ میں ہے)

اب کون یہ حق رکھتا ہے کہ اس گرہ کو اس کے ہاتھ سے چھین کر کسی اور کے ہاتھ میں دے دے۔

ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت سے شکایت کی کہ میرے آقا نے اپنی لونڈی کا نکاح مجھ سے کیا تھا اب وہ اسے مجھ سے جدا کرنا چاہتا ہے۔اس پر آپ نے خطبے میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

یٰاَیُّھَا النَّاسُ مَا بَالُ اَحَدِکُم یُزَوِّجُ عَبدَہٗ اَمَتَہٗ ثُمَّ یُرِیْدُ اَنْ یُّفَرِّقَ
بَیْنَھُمَا اِنَّمَا الطَّلَاقُ لِمَنْ اَخَذَ بِالسَّاقِ

(اے لوگو! یہ کیا ماجرا ہے کہ تم میں سے ایک شخص اپنے غلام سے اپنی لونڈی بیاہ دیتا ہے پھر دونوں کو جدا کرنا چاہتا ہے، طلاق کا اختیار تو شوہر کو ہے)

ویسے بھی طلاق کا حق اگر عورت کو دیا جاتا تو پھر شائد ہی زندگی بھر کا ساتھ زندگی کا ساتھ دے سکتا کیونکہ عورت کی طبیعت میں جذبات کی فراوانی اور حالات سے شدید تاثر کی جو کیفیت فطرت نے ودیعت کی ہے (اور یہی اس کی طبیعت کو حسن بھی ہے) اس کے پیشِ نظر بہت امکان تھا کہ وہ اس تعلق کو توڑنے میں ہمیشہ جلد بازی کا مظاہرہ کرتی اور معمولی اختلافات میں بھی صبر وتحمل کو بھی ہاتھ سے چھوڑ دیتی۔

مرد کو یہ اختیار آخری چارہ کے طور پر دیا گیا ہے ورنہ ہمارا پروردگار طلاق کو ہرگز پسند نہیں فرماتا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَبغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ

(اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے)

مزید ارشاد فرمایا:

Marfat.com

تَزَوَّجُوا وَلَا تُطَلِّقُوا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الذَّوَّاقِيْنَ وَالذَّوَّاقَات

(شادیاں کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا)

اگر طلاق کے سوا کوئی اور صورت باقی نہ رہے تو پھر بھی شریعت ہدایت کرتی ہے کہ زندگی بھر کا یہ تعلق یک لخت نہ توڑ ڈالو بلکہ ایک ایک مہینے کے فاصلے سے ایک ایک طلاق دو۔ تیسرے مہینے کے اختتام تک تم کو سوچنے سمجھنے کا موقعہ حاصل رہے گا۔ ممکن ہے اصلاح کی کوئی صورت نکل آئے یا عورت کے رویہ میں کوئی صحت مند تغیر واقع ہو جائے یا خود تمہارا دل ہی بدل جائے۔ البتہ! اگر اس مہلت میں سوچنے اور سمجھنے کے باوجود تمہارا فیصلہ یہی ہو کہ اس عورت کو چھوڑ دینا چاہئے تو پھر چاہو تو تیسرے مہینے کے ختم پر آخری طلاق دے دو ورنہ رجوع کئے بغیر یونہی عدت گزر جانے دو بلکہ احسن طریقہ یہ ہے کہ تیسری مرتبہ طلاق نہ دی جائے بلکہ یونہی عدت گزر جانے دی جائے۔ اس صورت میں یہ موقعہ باقی رہتا ہے کہ اگر یہ زوجین باہم نکاح کرنا چاہیں تو دوبارہ ان کا نکاح ہو سکتا ہے لیکن تیسری بار طلاق دینے سے طلاق مغلظ ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد تحلیل کے بغیر زن و شوہر کا ایک دوسرے سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ افسوس یہ ہے کہ لوگ بالعموم اس مسئلے سے ناواقف ہیں اور جب طلاق دینے پر آتے ہیں تو چھوٹتے ہی تین طلاق دے ڈالتے ہیں بعد میں پچھتاتے ہیں اور مفتیوں سے مسئلے پوچھتے پھرتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ مرد کا ناگزیر حالات میں طلاق کا اختیار دیا گیا ہے لیکن شریعت کا حقیقی منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں بھی جہاں نصیحت، ہجر فی المضاجع اور ضرب و تعزیر جیسی تدابیر بھی ناکام ہو جائیں اور نظر بہ ظاہر طلاق کے سوا کوئی صورت نظر نہ آتی ہو وہاں بھی وہ اصلاح احوال کے لئے ایک اجتماعی کوشش کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ
اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ○

(اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان افتراق کا اندیشہ ہو ایک پنچ مرد کے لوگوں میں سے اور ایک پنچ عورت کے لوگوں میں سے مقرر کرو، اگر دونوں اصلاح کے طالب ہوئے تو اللہ ان کے درمیان سازگاری پیدا کر دے گا، بے شک اللہ علیم و خبیر ہے) (النسآء : ۳۵)

یعنی جب دیکھو کہ شوہر کی کوششیں ناکام ہو گئی ہیں اور معاملہ جدائی اور افتراق تک پہنچا چاہتا ہے تو اب میاں بیوی کے قبیلہ برادری اور ان کے رشتہ داروں اور خیر خواہوں کو آگے بڑھنا چاہئے اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اس بگاڑ کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہئے اس کی عملی صورت یہ ہو کہ ایک پنچ میاں کے رشتہ داروں سے منتخب کیا جائے۔ دوسرا بیوی کے خاندان میں سے۔ یہ دونوں مل کر اصلاح کی کوشش کریں۔ بسا اوقات فریقین جس جھگڑے کو خود طے کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے دوسرے خیر خواہوں کی مداخلت سے وہ طے ہو جاتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں خطاب جمع کے صیغے سے ہے۔ جس کے مخاطب میاں بیوی کے خاندان بھی ہو سکتے ہیں اور پورا اسلامی معاشرہ بھی جس کی نمائندہ حکومت ہوتی ہے۔ یہ تینوں درجہ بدرجہ اس کے مکلف ٹھہرائے گئے ہیں۔ ہمارے فقہائے کرام نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ

Marfat.com

الث مقرر کیے جائیں گے ان کے اختیارات کیا ہوں گے؟ جو بات زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر تو میاں بیوی انہیں صرف اس لئے منصف مان رہے ہیں کہ وہ جانبین کے معاملات سن کر صرف مشورہ دیں یا تصفیہ کی کوئی سفارش کریں تو ایسی صورت میں یقیناً ان کے پاس کوئی اختیارات نہیں ہوں گے۔ ہاں! اگر زوجین نے انہیں طلاق یا خلع یا کسی اور امر کا فیصلہ کر دینے میں اپنا وکیل بنایا ہو تو اب ان کا فیصلہ تسلیم کرنا زوجین کے لئے واجب ہوگا اور اگر یہ معاملہ عدالت تک پہنچ جائے تو پھر حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے فیصلوں کی جو نظیریں ہم تک پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات حکم مقرر کرتے ہوئے عدالت کی طرف سے انہیں حاکمانہ اختیارات بھی دیتے تھے۔ حضرت عقیل ابن ابی طالب اور ان کی بیوی فاطمہ بنت عقبہ بن ربیعہ کا مقدمہ جب حضرت عثمان کی عدالت میں پیش ہوا تو انہوں نے شوہر کے خاندان میں سے حضرتِ ابن عباس کو اور بیوی کے خاندان میں سے حضرت معاویہ بن ابی سفیان کو پنچ مقرر کیا اور ان سے کہا کہ اگر آپ دونوں کی رائے میں ان دونوں کے درمیان تفریق کر دینا ہی کافی ہو تو تفریق کر دیں۔ اسی طرح ایک مقدمہ میں حضرت علی نے حکم مقرر کیے اور ان کو اختیار دیا کہ چاہیں ملا دیں اور چاہیں جدا کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ پنچ بطورِ خود تو عدالتی اختیارات نہیں رکھتے البتہ اگر میاں بیوی ان پر راضی ہوں یا عدالت ان کو مقرر کرتے وقت اختیارات دے دے تو پھر ان کا فیصلہ ایک عدالتی فیصلے کی طرح نافذ ہوگا۔ گزشتہ دونوں آیات پر اگر آپ مجموعی طور پر تدبر کی نگاہ ڈالیں تو دو باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ میاں بیوی کا باہمی رشتہ اور تعلق انتہائی نزاکتِ احساس کا حامل ہے۔ اسی طرح ان کے باہمی اختلافات نہایت خطرناک نتائج کا سبب بن سکتے ہیں۔ بنابریں یہ ضروری ہے کہ ان اختلافات کو حتی الامکان باہر نکلنے اور لوگوں کی زبانوں پر چڑھنے سے روکا جائے۔ اس لئے سب سے پہلے تو یہ حکم دیا کہ شوہر اپنے تینوں اختیارات یکے بعد دیگرے استعمال کر کے گھر ہی میں اختلافات کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن اگر یہ معاملہ ان کے اپنے قابو سے نکل گیا ہے تو پھر دونوں گھروں کے ذمہ دار لوگ اس میں مداخلت کریں اور جانبین میں سے ایک ایک حکم مقرر کر کے خاندانوں ہی میں ان اختلافات کو حل کر کے دفن کر دینے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اگر معاملہ عدالت تک پہنچنا ناگزیر ہو جائے تو پھر عدالت کے معاملے میں بھی اسلام کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی میاں بیوی کے خاندانوں کے ذمہ دار لوگوں کے واسطے سے ان اختلافات کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے قاضیوں کے نام ایک فرمان جاری فرمایا تھا اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ آپ نے لکھا تھا:

ردوا القضاء بين ذوى الارحام حتى يصطلحوا فان فصل القضاء يورث الضغائن

(رشتہ داروں کے مقدمات کو انہیں میں واپس کر دو تا کہ وہ خود برادری کی امداد سے آپس میں صلح کی صورت نکالیں کیونکہ قاضی کا فیصلہ دلوں میں کینہ و عداوت پیدا ہونے کا سبب ہوتا ہے)

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ میاں بیوی کا تعلق ایک گھر کو بسانے یا اجاڑنے کا باعث ہے۔ اس کی کامیابی سے خاندان وجود میں آتا ہے اور اسی خاندان کی ترقی یافتہ صورت مسلمان معاشرہ اور اسلام کا سیاسی نظام ہے۔ اس لئے تمام دینی اور شیطانی قوتوں کا ہمیشہ یہ ہدف رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس رشتے میں دراڑیں پیدا کریں۔ چنانچہ اس شیطانی مقصد کو بروئے کار لانے کیلئے وہ اپنی تمام ممکن مساعی کو صرف کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتیں کیونکہ ایک گھر اجاڑنے میں ان کی کامیابی درحقیقت اسلامی معاشرے کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

Marfat.com

ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابلیس کبھی کبھی سمندر میں پانی کی سطح پر اپنا تخت بچھاتا ہے اور اپنا دربار منعقد کرتا ہے، اس کے تمام کارندے دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔ ابلیس ان سب سے ان کی کارکردگی کی رپورٹیں سنتا ہے۔ ایک چیلا اپنی کارگزاری سناتا ہے کہ ایک شخص نماز پڑھنے کے ارادے سے مسجد کی طرف جا رہا تھا میں نے درمیان میں اس کو ایک ایسے کام میں پھنسا دیا جس سے اس کی نماز چھوٹ گئی ابلیس سن کر خوش ہوتا ہے کہ تم نے اچھا کام کیا۔ اسی طرح ہر چیلا مختلف لوگوں کے گمراہ کرنے اور اچھے کام روکنے کی کارگزاری سناتا ہے، ابلیس سب کو شاباش دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک چیلا آ کر بیان کرتا ہے کہ دو میاں بیوی باہمی اتفاق اور محبت کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے میں نے جا کر ایک ایسا کام کیا جس کے نتیجے میں دونوں میں لڑائی ہوگئی اور لڑائی کے نتیجے میں دونوں میں جدائی واقع ہوگئی۔ ابلیس یہ سنتے ہی خوشی کے مارے تخت پر کھڑا ہو جاتا ہے اس چیلے کو گلے لگاتا اور معانقہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تو صحیح معنی میں میرا نمائندہ ہے اور تو نے جو کام کیا وہ اصل میں حقیقی کارنامہ ہے جس پر مجھے فخر ہے۔

حاصل کلام یہ کہ گھر کی آسودگی اور اس کا پرسکون ماحول خاندان کی بقا اور اس کے کردار کے نتیجہ خیز ہونے کی ضمانت ہے۔ اس شریعت نے خاتونِ خانہ پر آخری ذمہ داری یہ ڈالی ہے کہ مرد جب تک بیرونِ خانہ اپنی ذمہ داریوں اور اجتماعی فرائض ادا کرنے میں مشغول وہ گھر اور اہل و عیال کے تمام امور کی نگران بنائی گئی ہے اور اس کے بارے اسے عنداللہ جوابدہی بھی کرنا ہوگی کیونکہ اگر وہ ذمہ داری ادا کرنے میں تساہل یا تغافل کا ثبوت دے گی تو گھر کے معاملات بگڑ جائیں گے۔ بچوں کی تربیت متاثر ہوگی۔ نتیجۃً شوہر گھر میں الجھ کر باہر کی ذمہ داری ادا نہیں کر سکے گا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْمَرْأَۃُ رَاعِیَۃٌ عَلٰی بَیْتِ زَوْجِھَا وَھِیَ مَسْئُوْلَۃٌ

(عورت اپنے خاوند کے گھر پر نگران ہے اور جوابدہ ہے)

اس اعتبار سے عورت کی بڑی ذمہ داری گھر کی تنظیم بچوں کی تربیت اور خاندان کے وقار کی حفاظت ہے اور ایسا ہی خاندان ایک اچھے معاشرے کی بنیاد ہے جہاں ایک زندہ اولوالعزم اور آبرومند قوم وجود میں آتی ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۝

(اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو اور قرابت داروں کے ساتھ، یتیموں کے ساتھ اور مسکینوں کے ساتھ اور قرابتدار پڑوسی کے ساتھ اور بے گانہ پڑوسی کے ساتھ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور اپنے مملوک کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ اللہ اترانے اور بڑائی مارنے والوں کو پسند نہیں کرتا) (النسآء : ٣٦)

Marfat.com

حُسنِ سلوک سے پیش آؤ

اسلامی زندگی اپنی اصل حقیقت اور حیثیت کے اعتبار سے دو چیزوں سے عبارت ہے۔

۱۔ حقوق اللہ ۲۔ حقوق العباد

حقوق العباد کی اسلام میں بہت تاکید کی گئی ہے اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت بھی کسی سے مخفی نہیں۔لیکن حقوق العباد کا تصور وجود میں نہیں آسکتا اور اگر مصنوعی طریقے سے اسے وجود دے بھی دیا جائے تو اس کی ادائیگی کی کوئی ضمانت نہیں تاوقتیکہ اللہ کے حقوق کو تسلیم نہ کیا جائے۔اللہ کا سب سے پہلا حق جو اس کے تمام حقوق کی بنیاد ہے وہ اس پر ایمان اور اس کی عبادت ہے اسی ایمان اور عبادت کی آخری شکل تقویٰ ہے۔

سب سے پہلا حق اللہ کا حقِ عبادت ہے

چنانچہ قرآنِ کریم میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب بھی اپنے بندوں کو احکام سے نوازتا ہے تو سب سے پہلے انہیں بنیادی باتوں کا حوالہ دیتا ہے۔کبھی اپنی ذات اور اپنے احسانات کا ذکر فرماتا ہے کبھی اپنی بندگی اور عبودیت کی دعوت دیتا ہے اور کبھی تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔اگر اس حقیقت پر ذرا بھی غور کر لیا جائے تو یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ انسان جس طرح اللہ کی مخلوق ہے اسی طرح ہر حیثیت سے اس کا بندہ بھی ہے۔اس کی زندگی میں جتنی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی حیثیت کو بھول جاتا یا نظر انداز کرتا ہے۔وہ بجائے اپنے آپ کو بندہ سمجھنے کے جب آقائی کرنے لگتا ہے،بجائے بندگی اور عبادت کرنے کے لوگوں سے بندگی کروانے لگتا ہے تو وہ اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہے اور وہیں سے فساد فی الارض کا آغاز ہو جاتا ہے۔اس لئے قرآنِ کریم بار بار انسان کو اس کی اصل حیثیت یاد دلاتا ہے کیونکہ اصل حیثیت کا یاد نہ رہنا ہر سطح پر خرابی کا باعث بنتا ہے۔ماتحت اپنے آپ کو افسر سمجھنے لگے،مزدور اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے،شاگرد استاد کی کرسی پر بیٹھ جائے،استاد پرنسپل کا منصب سنبھال لے،ہر چھوٹا بڑا بن جائے اور ہر بڑا اپنی بڑائی کے تقاضوں کو بھلا دے تو اجتماعی زندگی کا کوئی ادارہ اپنی جگہ کام نہیں کر سکتا۔جس گھر میں میاں بیوی اپنی اپنی حیثیت کو بھول جائیں اور اولاد خودسر ہو جائے اس گھر کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔یہی حال پوری انسانی زندگی بلکہ پوری کائنات کا ہے۔ہم جو ہر طرف فساد مچا ہوا دیکھ رہے ہیں اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ بندوں کو اپنے حقوق یاد ہیں۔لیکن اللہ کے حقوق جس کے نتیجے میں بندوں کے حقوق پیدا ہوتے ہیں انہیں ہم یکسر نظر انداز کر چکے ہیں۔

چنانچہ اس سورۃ کے آغاز میں اصلاحِ معاشرہ کی ہدایات دینے سے پہلے اللہ نے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی حدود سے تجاوز مت کرو اور ان آیات میں جب حقوق العباد کی ادائیگی کا حکم دیا تو پھر سب سے پہلے اپنا حق یعنی عبادت کا ذکر فرمایا کیونکہ جو شخص اللہ کے حقِ عبادت اور اپنے بندہ ہونے کو تسلیم نہیں کرتا وہ اس کے حکم سے بندوں کے حقوق کیسے ادا کرے گا؟ اللہ کی ذات وصفات اور اس کی عبادت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والی چیز اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ہے۔اس لئے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ دیکھو اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو۔جس طرح اللہ کی حیثیت کا انکار درحقیقت اپنی حقیقت اور حیثیت کا انکار ہے اسی طرح اس کی ذات وصفات اور اس کے حقوق میں کسی کو شریک کرنا ایک ایسا جرم ہے جس سے پورا نظامِ تکوین اور نظامِ تشریع تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

Marfat.com

حقوق الوالدین

اپنا حق ذکر فرمانے کے بعد سب سے پہلے والدین کے حق کا ذکر فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا خالق و مالک تو یقیناً خالق کائنات ہے لیکن بظاہر انسان کے دنیا میں آنے کا سبب اس کے والدین ہیں۔ اس لئے اللہ کی صفت تخلیق اور ربوبیت کے بعد اگر کسی کے احسانات سب سے زیادہ ہیں تو وہ ہر شخص کے والدین ہیں۔ بچہ اپنی پیدائش کے بعد اس قدر بے بس ہوتا ہے کہ نہ اس کے حواس کام دیتے ہیں اور نہ اس کا جسم ساتھ دیتا ہے۔ ہر چھوٹی بڑی مخلوق پیدا ہونے کے جلدی بعد اپنے ضروری معمولات انجام دینے کے قابل ہو جاتی ہے مرغی کے بچے ماں کے پیچھے چلتے پھرتے اور دانا دنکا چنتے ہیں۔ بلی کے بچے آنکھیں کھلتے ہی اپنی ماں کے پستان ڈھونڈ لیتے ہیں۔ بھینس کا بچہ چند گھنٹوں کے بعد لڑکھڑاتا ہوا ماں کے نیچے پہنچ کر دودھ پینے لگتا ہے۔ لیکن انسان کا بچہ مہینوں تک اپنے ماں باپ کو پہچانتا نہیں۔ اس بے بسی کی حالت میں اس کی ماں اسے سنبھالتی، کھلاتی پلاتی، موسم کی شدت سے بچاتی اور ہر طرح کے آرام اور راحت کا سامان کرتی ہے۔ غریب سے غریب باپ بھی اپنے بچے کیلئے آنکھیں بچھاتا ہے، اس کے کندھے اس کا بوجھ اٹھانے کیلئے بے چین اور بے تاب ہوتے ہیں۔ اس لئے ماں باپ کے احسانات کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ سب سے پہلے ان کے حق کا ذکر کیا جائے۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ وہ اپنی ساری خدمات اور تمام تر احسانات کے باوجود بچے پر یہ حق نہیں رکھتے کہ وہ ان کی عبادت کرے بلکہ ان کا زیادہ سے زیادہ حق یہ ہے کہ اولاد ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اس حسنِ سلوک کو کسی حد تک تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلاھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریما واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ وقل رب ارحمھما کما ربینی صغیرا

(اور تمہارے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف بھی نہ کہو اور ان سے جھڑک کر بات نہ کرو (یعنی خفا نہ ہو) اور ان سے ادب سے بولو اور ان کے لئے اطاعت کا باز و محبت سے جھکائے رکھو اور اللہ سے دعا کرو کہ اے ہمارے پروردگار! تو ان پر رحمت فرما جس طرح انہوں نے بچپن سے مجھے پالا)

والدین کے تین حقوق

اس آیت کے مضمون پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے تین حقوق بیان فرمائے ہیں۔ پہلا حق ہے حسنِ سلوک، دوسرا ہے اطاعت اور تیسرا ہے دعا۔ حسنِ سلوک چونکہ ادائے حق سے ایک بالاتر چیز ہے اس لئے اس کا تو حقیقی تعلق اولاد کی فرمانبرداری کے حسنِ ذوق سے ہے جتنا کسی کا ذوق اس لحاظ سے پاکیزہ اور نازک ہو گا وہ اتنا ہی حسن سلوک میں آگے بڑھ جائے گا۔ لیکن یہاں آیت قرآنی میں اس حسنِ سلوک کی طرف راہنمائی بھی کی گئی ہے۔ فرمایا گیا کہ اگر ماں باپ تمہاری زندگی میں بوڑھے ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ بڑھاپا آ جانے کے بعد انسان کے اندر دو طرح کی تبدیلیاں آتی ہیں۔

Marfat.com

ا۔ قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اپنی مرضی سے بعض دفعہ چلنا پھرنا تو دور کی بات ہے حرکت کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں حسنِ سلوک کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں نوکروں کے رحم وکرم پر نہ چھوڑ دیا جائے یا ان کی طرف سے لاپرواہی نہ برتی جائے بلکہ اولاد کی ذمہ داری ہے کہ امکانی حد تک خود ان کی کمزوریوں اور ناتوانیوں کا مداوا بننے کی کوشش کریں۔

دوسری تبدیلی ذہن اور عقل کی تبدیلی ہے۔ بڑھاپے میں بعض دفعہ آدمی ٹھیک بات کہنے اور سمجھ کر گفتگو کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے اور یہ بات بہت حد تک صحیح ہے کہ بڑھاپے میں آدمی دوبارہ بچہ بن جاتا ہے۔ جو حرکتیں بچے کرتے ہیں وہی بوڑھا آدمی کرنے لگتا ہے۔ ان دونوں تبدیلیوں کو سامنے رکھتے ہوئے پروردگار نے فرمایا کہ دیکھنا ایسی صورتحال میں اپنے ماں باپ کو اف تک بھی نہ کہنا۔ یعنی اظہارِ بیزاری نہ کرنا۔ ہوسکتا ہے کہ اُن کے منہ سے رال ٹپک رہی ہو، ناک بہہ رہی ہو، آنکھیں تلچھٹ سے بھری ہوں۔ ممکن ہے وہ رفع حاجت بھی خود نہ کرسکیں، ایسی حالت میں خدمت سے تنگ آجانا انسانی فطرت سے بعید نہیں۔ دیکھنا ایسے وقت میں بیزاری کا اظہار نہ کرنا، اف اف کر کے تنفر کا اظہار نہ کرنا، ان سے لاتعلقی ظاہر کر کے انہیں ان کے حال پر نہ چھوڑ دینا۔ اگر وہ عقل اور ذہن کے فتور کے باعث بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگیں یا بلاوجہ کسی بات کی ضد کریں۔ بار بار کوئی بات پوچھیں تو دیکھنا ان کو جھڑکنا نہیں۔ ان سے ناراض نہیں ہونا بلکہ جس طرح انہوں نے نہایت محبت اور پیار سے تمہیں اس وقت پالا جب تم گوشت کے ایک لوتھڑے کی طرح تھے۔ ہر طرح کی عقل اور سمجھ سے خالی، بستر پر گندگی، نہ کھانے کا ہوش، نہ پینے کا سلیقہ لیکن اس کے باوجود ماں باپ نے کیسی محبت سے تمہیں پالا اور بڑا کیا۔ تم بھی اسی محبت کے جذبے سے ان کی دیکھ بھال کرنا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک صاحب بوڑھے ہوگئے ایک دن گھر کے لان میں بیٹھے تھے کہ جوان بیٹا آگیا۔ جوان بیٹے کو پاس بٹھایا۔ دیوار پر ایک کوا بیٹھا تھا اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا بیٹا یہ کیا ہے؟ بیٹے نے جواب دیا ابا جان کوا ہے۔ انہوں نے پھر پوچھا یہ کیا ہے بیٹے نے پھر جواب دیا کہ یہ کوا ہے۔ جب انہوں نے تیسری بار پوچھا تو بیٹے کے لہجے میں تیزی آنے لگی حتی کہ جب پانچویں دفعہ یہی سوال کیا تو بیٹے نے جھڑک کر کہا کہ ابا جان یہ کیا ایک ہی سوال آپ بار بار کئے جا رہے ہیں۔ میں کتنی دفعہ آپ کو جواب دے چکا ہوں یہ صاحب اٹھے اندر سے اپنی ڈائری اٹھا لائے۔ ڈائری کا ایک صفحہ کھول کر بیٹے کے سامنے رکھ دیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا کہ میرا بیٹا چھوٹا سا تھا اسی صحن میں بیٹھے ہوئے اس نے مجھ سے دیوار پر بیٹھے ہوئے کوے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اس کو جواب دیا لیکن وہ بار بار مجھ سے پوچھتا، ابا جان یہ کیا ہے؟ میں جواب دیتا بیٹے یہ کوا ہے۔ اس نے پچیس دفعہ سوال کیا اور پچیس دفعہ ہی میں نے جواب دیا اور اتنی دفعہ جواب دینے کے بعد مجھے ناگواری نہیں ہوئی بلکہ خوشی ہوئی کہ میرا بیٹا بار بار پوچھتا ہے۔ اندازہ کیجئے! باپ پچیس دفعہ جواب دیتا ہے تو اس کی محبت اور پیار میں کوئی کمی نہیں آتی۔ قرآنِ کریم کی اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ تم بھی اسی جذبہ سے اپنے ماں باپ کی خدمت کرنا اور ہر طرح کی بات برداشت کرنا۔

دوسرا حق جو اس میں بیان کیا گیا ہے وہ ہے ہر حال میں اپنے ماں باپ کی اطاعت کرنا اور ہر جائز حکم کو بجالانا۔ ان کی مالی ضروریات کو پورا کرنا اور ہر جائز خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرنا اور پھر اس میں یہاں تک وسعت کی گئی ہے کہ تمہارے والدین اگر غیر مسلم بھی ہوں وہ تمہیں کوئی اسلام کے خلاف بات کہیں تو اسے تو ہرگز نہ ماننا لیکن ویسے ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ
فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا

Marfat.com

(اور اگر تیرے والدین تجھے مجبور کریں اس بات پر کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک کر جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی اطاعت مت کرنا لیکن دنیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا)

پھر والدین کے اس رشتے کو اسلام نے رضاعی والدین تک وسعت دے دی ہے یعنی جس خاتون کا دودھ پیا ہے وہ دودھ پینے والے کی رضاعی ماں کہلاتی ہے اور اس کا شوہر رضاعی والد بن جاتا ہے اور ساتھ دودھ پینے والا دوسرا بچہ رضاعی بھائی کہلاتا ہے۔ جس طرح حضرت حلیمہ سعدیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی والدہ تھیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ آپ کی رضاعی والدہ یعنی حضرت حلیمہ سعدیہ تشریف لے آئیں۔ آپ نے اپنی چادر بچھادی کہ اس پر تشریف رکھیں۔ پھر آپ کے رضاعی والد آئے تو آپ نے اپنی چادر کا دوسرا حصہ ان کے لئے بچھا دیا۔ اتنے میں آپ کے رضاعی بھائی بھی پہنچ گئے تو آپ نے ان کو ماں باپ کے درمیان بٹھایا۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں ماں باپ کا مقام ومرتبہ کیا ہے؟ اطاعت کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ نافرمانی سے منع فرمایا بلکہ نافرمانی سے روکنے کو قانونی حق کے طور پر تسلیم کیا۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّهَات

(اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی کو حرام کردیا)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

یارسول اللہ ماحق الوالدین علی ولدھما قال ھما جنتک ونارک

(اے اللہ کے رسول! والدین کا ان کی اولاد پر کیا حق ہے؟ فرمایا وہ دونوں تمہاری جنت ہیں اور تمہاری جہنم ہیں)

یعنی اطاعت کرو گے تو جنت کے مستحق ٹھہرو گے اور نافرمانی کرو گے تو اس کی وجہ سے جہنم میں جانا ہوگا۔ ایک دوسری حدیث ہے:

عن ابی ھریرۃ قال، قال رسول اللہ رغم انفہ رغم انفہ رغم انفہ قیل من یارسول اللہ قال من ادرک والدیہ عندالکبر احدھما او کلا ھمائم لم یدخل الجنۃ

(حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو، اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو ہے یعنی وہ ذلیل ہو۔ پوچھا گیا کون اے اللہ کے رسول؟ فرمایا جس نے اپنے والدین کو بڑھاپے میں پایا، ان میں سے ایک کو یا دونوں کو اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت میں داخل نہ ہوا)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باپ کی رضامندی کو اللہ کی رضامندی ٹھہرایا باپ کی ناراضگی کو اللہ کی ناراضگی قرار دیا۔

Marfat.com

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم رِضَی الرَّبِّ فِی رِضَی الوَالِدِ وَسَخطُ الرَّبِّ فی سخط الوالد

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی رضا مندی والد کی رضا مندی میں ہے اور اللہ کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے)

پھر والدین کی نافرمانی کو نہ صرف اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا بلکہ یہ بھی بتایا کہ والدین کی نافرمانی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا میں ہی اس کی سزا نہ دے دی جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

کل الذنوب یغفر اللہ تعالیٰ منھا ماشاء الا عقوق الوالدین فانه یجعل لصاحبه فی الحیاۃ قبل الممات

(اللہ تعالیٰ تمام گناہوں میں سے جس کو چاہے گا معاف فرمائے گا مگر والدین کی نافرمانی کو معاف نہیں فرمائے گا۔ ممکن ہے کہ وہ نافرمان کو موت سے پہلے زندگی میں ہی سزا دے ڈالے)

اولاد پر ماں باپ کا تیسرا حق دعا کرنا ہے۔ اس کا تعلق والدین کی زندگی سے بھی ہے اور والدین کی زندگی کے بعد سے بھی۔ جب والدین زندہ رہیں تو آدمی حتی المقدور ماں باپ کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کرتا رہے۔

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا

(اے میرے پروردگار! تو ان پر رحمت فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا)

اس میں اشارہ دو باتوں کی طرف ہے۔ ایک تو یہ کہ جو آدمی اپنے والدین کی خدمت کے ساتھ ساتھ ان کے لئے اس طرح دل سے مانگے گا تو یقیناً اس کے دل میں اپنے ماں باپ کی خدمت بوجھ نہیں بنے گی اور پھر اس دعا سے ماں باپ کی محبت کا جذبہ ہمیشہ زندہ رہے گا وہ امکانی حد تک کبھی اس خدمت سے دریغ نہیں کرے گا اور دوسرا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دنیا میں ہر آدمی کیلئے بہت سے لوگ دعائیں مانگتے ہیں جن میں دوست احباب ہیں، بیوی ہے، بچے ہیں، ان کی دعاؤں میں یقیناً اخلاص بھی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بے لوث اور بے غرض دعا سوائے والدین کے اور کوئی نہیں مانگتا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ماں باپ کے اٹھ جانے سے بے لوث اور بے غرض دعائیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اولاد چاہے کتنے پیار سے ہی دعا مانگے لیکن کوئی نہ کوئی خواہش کہیں نہ کہیں چھپی ہوتی ہے۔ یہی حال بیوی اور دوست احباب کا ہے۔ لیکن والدین جب دعا مانگتے ہیں تو اپنی ذات کی مکمل نفی کر کے دعا کرتے ہیں۔ تو یہاں خدمت کے ساتھ ساتھ جو دعا کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ والدین کا حوالہ بھی ہے تو اس میں شاید اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ دیکھو! تمہارے والدین نے جب تمہاری تربیت کی تھی اس میں جہاں ہر طرح کی دیکھ بھال، خیر خواہی، ہمدردی اور ایثار کا جذبہ کارفرما تھا وہیں اس میں تمہارے لئے بے لوث دعائیں بھی شامل تھیں۔ جن کا سلسلہ ان کی زندگی کے آخری سانس تک قائم رہا۔ وہ اپنے آپ کو بھول کر ہمیشہ تمہاری بھلائی اپنے رب سے مانگتے رہے۔ دیکھنا تم بھی ایسے ہی جذبے کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی کوشش کرنا اور جہاں تک زندگی کے بعد دعاؤں کا تعلق ہے ہے اسے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں باپ کے بعد از وفات حقوق میں شامل فرمایا۔ ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:

Marfat.com

عن ابی السید الساعدی قال بینمانحن عند رسول الله صلی الله علیه وسلم اذجاء رجل من بنی سلمة فقال یارسول اللّٰہ هل بقی من برابوی شیء ابرهما من بعد موتهما؟ قال نعم الصلوة علیهما والاستغفار لهما وانفاذ عهدهما وصلة الرحم التی لاتوصل الا بهما واکرام صدیقهما

(ابوسعید الساعدی سے روایت ہے کہ ایک وقت جب ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے بنی سلمہ میں سے ایک شخص آیا اور اس نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ کیا میرے ماں باپ کے مجھ پر کچھ ایسے بھی حقوق ہیں جوان کے مرنے کے بعد مجھے ادا کرنے چاہئیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! ان کے لئے خیر و برکت اور رحمت کی دعا کرتے رہنا، ان کے واسطے اللہ سے مغفرت اور بخشش مانگنا ان کا اگر کوئی عہد معاہدہ کسی سے ہو تو اس کو پورا کرنا ان کے تعلق سے جو رشتے ہیں ان کا لحاظ رکھنا اور ان کا حق ادا کرنا اور ان کے دوستوں کا اکرام اور احترام کرنا۔ اس حدیث میں ماں باپ کے لئے دعا اللہ سے ان کی بخشش کی طلب بندوں میں سے کسی کے ساتھ اگر کوئی عہد معاہدہ ہو تو اسے پورا کرنا ماں باپ کے تعلق سے جو جو رشتے بھی ہیں ان کا لحاظ کرنا اور ان کا حق ادا کرنا اور زندگی میں ان کے جن کے ساتھ دوستی کے تعلقات تھے ان کا اکرام واحترام کرنا)

یہ وہ حقوق ہیں جو ماں باپ کی وفات کے بعد بھی اولاد پر باقی رہتے ہیں۔ تو ان میں سب سے پہلا حق ان کیلئے دعا خیر و برکت کرنا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جب بھی موقع ملے تو آپ اپنے والدین کے لئے یہ دعا کرتے رہا کریں۔

اللهم اغفر لهما وارحمهما

(اے اللہ! میرے والدین کو بخش دے اور ان پر رحمت فرما)

اس کا فائدہ اس کے والدین کو قبر میں اور آخرت میں ان شاء اللہ جو ہوگا سو ہوگا خود اولاد کو بھی اس کا سب سے بڑا فائدہ جو پہنچتا ہے یہ ہے کہ نافرمان اولاد کو بھی اس دعا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرمانبردار اولاد میں شامل فرما دیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

عن انس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان العبد لیموت والداه اَواحدهما وانه لهما لعاق فلا یزال یدعولهما ویستغفر لهما حتی یکتبه الله بارا

(حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے ماں باپ کا یا دونوں میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جاتا ہے اور اولاد زندگی میں ان کی نافرمان اور رضامندی سے محروم ہوتی ہے لیکن یہ

Marfat.com

اولاد ان کے انتقال کے بعد سچے دل سے ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے خیر و رحمت کی دعا مانگتی اور بخشش کی التجا کرتی رہتی ہے (اور اس طرح اپنے قصور کی تلافی کرنا چاہتی ہے) تو اللہ تعالیٰ نافرمان اولاد کو فرمانبردار قرار دے دیتا ہے اور پھر وہ ماں باپ کی نافرمانی کے وبال اور عذاب سے بچ جاتی ہے)

ذوی القربیٰ کے حقوق

اس آیتِ کریمہ میں والدین کے حقوق کے بعد قرابت مندوں کے حقوق کا ذکر کیا ہے جو درحقیقت والدین کے تعلق اور حقوق سے پھوٹنے والی شاخیں ہیں کیونکہ خاندان کی بنیاد زوجین ہیں۔ یہی دونوں جب والدین کی شکل اختیار کرتے ہیں تو خاندان کی نمود و پراخت کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اولاد خاندان کے ارتقاء کی علامت اور والدین کی آرزؤں کا پھل ہے۔ پھر والدین کے حوالے سے ننھیالی اور ددھیالی رشتے دار اس خاندان کے شجر سایہ دار کی شاخیں اور تنوں کی صورت میں خاندان کی وسعت کا سبب بنتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاندان کے ارکان اربعہ زوجین، والدین، اولاد اور اہلِ قرابت ہیں۔ اگر زوجین کے نازک رشتے کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو خاندان کی بنیاد ہل جاتی ہے اور اگر والدین کے احترام اور ان کی حیثیت میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں تو خاندان کا ارتقا اگرچہ جاری رہتا ہے لیکن یہ خاندان کے لئے تقویت کا باعث بننے کی بجائے مفاسد کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور خاندان کی کمزوری کا سبب بنتا ہے۔ یہ تینوں ادارے اگر اپنی جگہ ٹھیک کام کرتے ہیں تو یقیناً ایک خاندان پھلتا پھولتا اور ترقی کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ گرد و پیش میں بے تعلقی، خودغرضی، نفسانفسی اور انانیت کی چلنے والی تیز ہوائیں اس خاندان کے کسی حصے کو بھی نقصان پہنچا دیں ضروری ہے کہ تحفظ کی دیواریں اس خاندان کے گرد کھڑی کی جائیں تاکہ یہ خاندان ایک شجر سایہ دار کی طرح اپنے زیرِ سایہ رہنے والوں کو حفاظت اور محبت کی ٹھنڈک مہیا کر سکے۔ حفاظت کی یہ دیواریں اصل میں قرابت کے تعلقات ہیں جو خاندان کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور خاندان کی وسعت کو مزید پھیلانے میں مدد بھی دیتے ہیں اور جب خاندان کا کوئی ایک فرد حالات کی ستم ظریفی سے زخم کھا کر گرنے لگتا ہے تو یہی اس کو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔

انسانی فطرت کو دیکھتے ہوئے ایک اور اہم پہلو بھی سامنے آتا ہے جس سے رشتہ و قرابت کی اہمیت افادیت اور ضرورت واضح ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ انسان فطری طور پر اجتماعیت پسند ہے۔ بڑی اجتماعیت میں شریک ہو کر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے اور اپنے حصے کے فرائض انجام دینے کے لئے تو ایک بڑی حوصلہ مندی کی ضرورت ہے اور زندگی کے وسیع تجربات کے بعد آدمی اس میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن ایک محدود سطح پر مل جل کر رہنا مل جل کر بہت سے کام انجام دینا یہ انسانی فطرت کا اولین تقاضا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر بچہ کھیلنے کے لئے ہمجولی تلاش کرتا ہے، سکول میں بچے اپنے ہم عمر بچوں سے پیار کرتے ہیں، جماعت کا اشتراک، مضامین کا اشتراک، ان میں باہمی تعلقات کا سبب بنتا ہے۔ جب آدمی عملی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو خیالات کی ہم آہنگی، پیشے کی یکسانی، ہمسائیگی، ہم وطنی، ہم مذاقی، یہ جو اشتراک کی مختلف صورتیں ہیں یہ باہم مل کر چلنے کا جذبہ پیدا کرتی ہیں اور ایک ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک کالج کے پڑھے ہوئے لوگ ہمیشہ کالج کے انتساب کو اور یونیورسٹی کے فارغ التحصیل یونیورسٹی کے انتساب کو تعلقات کی بنیاد قرار دے کر اپنی یادیں محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیاسی دنیا میں، سیاسی جماعتوں میں شرکت کی بنیاد پر تعلقات کی بنیاد وجود میں آتی ہے۔ مختصر یہ کہ محدود یا وسیع سطح پر مل کر رہنا مل کر چلنا، مشترک

Marfat.com

اعمال بجالانا، یہ یکسانی کی صورتیں ہیں جو انسانی فطرت کا تقاضا ہیں اور ان کی بنیاد پر اجتماعیت کی مختلف شکلیں وجود میں آتی ہیں اور انسان انہی کو اپنے لئے زندگی کا سہارا سمجھتا ہے۔ اسلام اشتراک کی ان تمام صورتوں اور تعلقات کی ان تمام بنیادوں کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ واضح کرتا ہے کہ یہ ساری بنیادیں اور سارے اشتراکات مصنوعی اور تمہارے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ لیکن حقیقی اشتراک کی وہ گرہ جو اللہ نے تمہارے درمیان باندھ رکھی ہے اور جسے تم کھولنا بھی چاہو تو کھول نہیں سکتے اور پھر جو جذبات کی شدت ان سے وجود میں آسکتی ہے ظاہر ہے کوئی اور بندھن اور کوئی اور تعلق اس کا ہم پلہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس گرہ کو مضبوط باندھنے کی کوشش کرو اور اسی تعلق کو تمام تعلقات کی بنیاد جانو اور یہ تعلق کیا ہے؟ وہی ہے جس کو ہم قرابت کا تعلق کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خون کا رشتہ ہے جو تمام رشتوں سے افضل و اعلیٰ ہے۔ عربی زبان میں اسی قرابت کے تعلق کی قدر کرنے کو اور قرابت کا حق ادا کرنے کو ''وصل رحم یا صلہ رحمی'' کہا گیا ہے۔

حق قرابت کو اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل چند باتوں سے ہوسکتا ہے۔

۱۔ قرآنِ کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق اور اس کے بعد والدین کے حقوق کا ذکر فرمایا ساتھ ہی اہلِ قرابت کے حقوق کا ذکر ضرور کیا۔ اس سے حق قرابت کی عنداللہ اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى

(اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو اور اہلِ قرابت کے ساتھ حسنِ سلوک کرو)

۲۔ قرآن کریم نے پہلی امتوں بالخصوص بنی اسرائیل کے حوالے سے کئی جگہ اس بات کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک عہد و پیماں لیا تھا اور اپنی تمام عنایات کو اس کے ساتھ مشروط ٹھہرایا تھا اور یہ کہا تھا کہ اگر تم اس عہد و پیمان کو پورا کرو گے تو ہم بھی تم پر اپنی عنایات کی بارش کریں گے لیکن اگر تم نے اپنے عہد و پیمان اور میثاق کی پرواہ نہ کی تو اللہ تعالیٰ بھی تمہاری پرواہ نہیں فرمائے گا۔ اس عہد و پیمان میں جہاں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر ہے وہیں اہلِ قرابت کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر بھی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى

(اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا اور اہلِ قرابت کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا)

۳۔ حق قرابت کی اسلام میں اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی اصلاح اور ان کو دعوت اسلام دیتے ہوئے جو تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائیں اور اس راستے میں جس طرح زخم پر زخم برداشت کئے وہ امت پر ایسا احسان ہے جس کی تلافی امت کبھی نہیں کرسکتی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس احسان و کرم کا جو ہدایت تعلیم اور اصلاح کے ذریعے اس امت پر فرمایا معاوضہ اور بدلہ اپنی امت سے اگر کوئی طلب فرمایا ہے تو صرف یہ کہ میری امت کو اپنے رشتے داروں اور قرابت مندوں کا حق ادا کرنا چاہیے اور ان سے لطف و محبت سے پیش آنا چاہیے۔ قرآنِ کریم میں آنحضرت سے فرمایا گیا ہے کہ آپ اپنی امت سے یہ کہیے:

Marfat.com

قل لااسئلکم علیہ اجرا الاالمودۃ فی القربی

(کہہ اے پیغمبر! میں تم سے اس پر بجز اس کے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا کہ ناتے اور قرابت میں محبت اور پیار کرو)

۴۔ جیسے پہلے ذکر ہو چکا کہ عربی زبان میں قرابت کو رحم یا رَحِم کہتے ہیں اور قرابت کا حق ادا کرنے کو وصل رحم یا صلہ رحمی کہا جاتا ہے اس صلہ رحمی کا مقام اور اہمیت اللہ کی نگاہ میں کیا ہے؟ اس اکا اندازہ چند احادیث سے ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الرحم شجنۃ من الرحمان قال اللہ تعالیٰ من وصلک وصلتہ ومن قطمک قطعتہ

(رحم (حقِ قرابت) مشتق ہے رحمان سے اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ جو تجھے جوڑے گا میں اسے جوڑوں گا اور جو تجھے توڑے گا میں اس کو توڑ دوں گا)

یعنی انسانوں کے باہمی قرابت اور رشتہ داری کے تعلق کو اللہ تعالیٰ کے اسمِ پاک رحمٰن سے اور اس کی صفتِ رحمت سے خاص نسبت ہے اور وہی اس کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے اس کا عنوان رحم مقرر کیا گیا۔ اسی خصوصی نسبت ہی کی وجہ سے عنداللہ اس کی اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ جو صلہ رحمی کرے گا یعنی قرابت اور رشتہ داری کا حق ادا کرے گا اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ اپنے سے وابستہ کرلے گا اور اپنا بنالے گا اور جو کوئی اس کے برعکس قطع رحمی کا رویہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سے کاٹ دے گا اور بے تعلق کردے گا۔ یہی بات ایک دوسری حدیث میں بھی فرمائی گئی۔

عن عبدالرحمن بن عوف قال سمعتُ رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول قال اللہ تبارک وتعالی انا اللہ وانا الرحمن خلقت الرحم وشققت لھا من اسمی فمن وصلھا وصلتہ ومن قطع بتتہ

(حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے: اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اللہ ہوں، میں الرحمٰن ہوں، میں نے رشتہ قرابت کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام رحمٰن کے مادہ سے نکال کر اس کو رحم کا نام دے دیا ہے۔ پس جو اسے جوڑے گا میں اس کو جوڑوں گا اور جو اس کو توڑے گا میں اس کو توڑوں گا)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکامات اور مشیت سے پیدائش کا ایسا انتظام بنایا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا رشتوں کے بندھنوں میں بندھا ہوتا ہے۔ پھر ان رشتوں کے کچھ فطری تقاضے اور حقوق ہیں جن کا عنوان اللہ تعالیٰ نے ''رحم'' مقرر کیا، جو اس کے نام ''رحمٰن'' سے گویا مشتق ہے۔ یعنی دونوں مادوں کا مادہ ایک ہی ہے۔ پس جو بندہ انسان کی فطرت میں رکھے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ان حقوق اور تقاضوں کو ادا کرے گا یعنی صلہ رحمی کرے گا اس کیلئے اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ وہ اس کو جوڑے گا یعنی اس کو اپنا بنالے گا اور فضل وکرم سے

Marfat.com

نوازے گا۔ اس کے برعکس کوئی قطع رحمی کا رویہ اختیار کرے گا اور قرابت کے ان حقوق کو پامال کرے گا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں ا
انسان کی فطرت میں رکھے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو توڑ دے گا یعنی اپنے قرب اور اپنے رحم و کرم سے محروم کر دے گا۔ اس مفہوم کو استعارہ ک
گہرے رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور طریقے سے بھی بیان فرمایا، اس حدیث میں کلام کے تیور بہت تیکھے ہیں جس
اندازہ ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صلہ رحمی کس قدر اہمیت کی حامل ہے اور قطع رحمی کس قدر خطرناک نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ حضور
اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، جس کا ترجمہ یہ ہے:

(اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا۔ جب پروردگار اس سے فارغ ہوئے تو رحم یعنی قرابت نے اٹھ کر پروردگار کا دامن پکڑ لیا۔ پروردگار نے فرمایا بتا کیا بات ہے؟ حقِ قرابت نے کہا یہی جگہ قطع رحمی سے آپ کی پناہ لینے کی ہے۔ پروردگار نے فرمایا: کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ جو تجھے جوڑے میں اسے جوڑوں اور جو تجھے توڑے میں اسے توڑ دوں؟ حقِ قرابت نے کہا: کیوں نہیں، اے رب! میں اس پر راضی ہوں۔ پروردگار نے فرمایا پھر یہی کچھ ہوگا)

یتیموں اور مسکینوں کے حقوق

سورۃ النساء کی اس آیتِ کریمہ میں معاشرتی حقوق کی جو ترتیب رکھی گئی ہے اس میں اہلِ قرابت کے بعد یتیموں اور مسکینوں کا
ہے کیونکہ یتیم اور حاجت مند لوگ اہلِ قرابت میں سے بھی ہو سکتے ہیں اور دیگر مسلمانوں میں سے بھی اس لئے اس کی ٹھیک جگہ اہلِ قرابت
پہلو میں ہی ہونی چاہئے۔

یتیم ''اکیلے اور منفرد'' کو کہتے ہیں۔ جس سیپ میں ایک ہی موتی ہو اسے درِ یتیم کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے یتیم وہ ہے جو بچپن یا لڑ
میں یعنی بلوغ سے پہلے باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے سے اکیلا اور تنہا رہ جائے۔ قریبی عزیزوں کے رحم و کرم پر ہو یا معاشرہ کی ہمد
و خیر خواہی کا محتاج ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے۔

مسکین ''مسکنت'' سے ہے۔ مسکنت کے لفظ میں عاجزی، درماندگی، بیچارگی اور ذلت کے مفہومات شامل ہیں۔ اس اعتبا
مساکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہوں۔ جو اپنی ضروریات کے مطابق ذرائع نہ پا رہے ہوں اور سخت
حال ہوں مگر نہ تو ان کی خودداری کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت دیتی ہو اور نہ ظاہری پوزیشن ایسی ہو کہ کوئی انہیں حاجت مند سمجھ
کی مدد کیلئے ہاتھ بڑھائے۔ چنانچہ حدیث میں اس کی تشریح یوں آئی ہے:

المسکین الذی لایجد غنی یغنیه و لایفطن له فیتصدق علیه و لایقوم فسال الناس

(مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا اور نہ پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگتا ہے، گویا وہ ایک شریف خوددار اور غریب آدمی ہے)

Marfat.com

یتیم اور مسکین دونوں ہی اپنی بے کسی اور بے چارگی اور درماندگی کی وجہ سے یکساں طور پر امداد و اعانت اور ہمدردی و خیر خواہی کے مستحق ہیں۔ لیکن یتیم مسکنت اور بے چارگی کے ساتھ ساتھ کم عمری اور صغرسنی کے باعث زیادہ ہمدردی اور خیر خواہی کا مستحق ہے اور پھر مساکین میں ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوسکتی ہے جنہیں یتیمی کی بے چارگی میں معاشرے نے سہارا دے کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد نہیں دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کا بوجھ تو کسی نہ کسی طرح اٹھائے پھرے مگر ذلت و مسکنت سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ اس لئے قرآن کریم اگرچہ یتامیٰ اور مساکین دونوں کے حقوق پر زور دیتا ہے لیکن یتامی کا ذکر پہلے کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی صغرسنیت اور بے چارگی کے باعث یقیناً اولیت کے مستحق ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قرآنِ کریم کی طرح اپنے ارشادات عالیہ میں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی ترغیب دی اور اسے مسلمان معاشرے کی اخلاقی ذمہ داری قرار دیا۔ آپ کا ارشاد ہے:

انا و کافل الیتیم له ولغیره فی الجنة هکذا و اشار بالسبابة والوسطٰی و فرج بینهما شیئا

(میں اور اپنے یا پرائے یتیم کی کفالت کرنے والا آدمی جنت میں اس طرح (قریب قریب) ہوں گے اور آپ نے اپنی انگشتِ شہادت اور بیچ والی انگلی سے اشارہ کر کے بتلایا اور ان کے درمیان تھوڑی سی کشادگی رکھی)

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کلمہ والی انگلی اور اس کے برابر کی بیچ والی انگلی اس طرح اٹھا کر کہ ان کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا بتلایا کہ جتنا تھوڑا سا فاصلہ اور فرق تم میری ان دو انگلیوں کے درمیان دیکھتے ہو بس اتنا ہی فاصلہ اور فرق جنت میں میرے اور اس مردِ مومن کے مقام میں ہوگا جو اللہ کیلئے اس دنیا میں کسی یتیم کی کفالت اور پرورش کا بوجھ اٹھائے۔ خواہ وہ یتیم اس کا اپنا ہو جیسے پوتا یا بھتیجا وغیرہ یا پرایا ہو یعنی جس کے ساتھ رشتہ داری وغیرہ کا کوئی خاص تعلق نہ ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد دیکھئے:

من قبض یتیما من بین المسلمین الی طعامه و شرابه ادخله الجنة البتة الا این یکون قد عمل ذنبا لایغفر

(اللہ کے جس بندے نے مسلمانوں میں سے کسی یتیم بچے کو لے لیا اور اپنے کھانے پینے میں شریک کر لیا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور بالضرور جنت میں داخل کرے گا۔ الا یہ کہ اس نے کوئی ایسا جرم کیا ہو جو نا قابلِ معافی ہو)

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من مسح راس یتیم لم یمسحه الالله کان له بکل شعرة یمر علیها یده حسنات و من احسن الی یتیمة اویتیم عنده کنت انا وهو فی الجنة کهاتین وقرن بین اصبعیة

(جس شخص نے کسی یتیم کے سر پر صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے ہاتھ پھیرا تو سر کے جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ پھرا تو ہر ہر بال کے حساب سے اس کو نیکیاں ملیں گی اور جس نے اپنے زیرِ کفالت کسی یتیم بچی یا یتیم بچے کے ساتھ بہتر سلوک

Marfat.com

کیا تو میں اور وہ آدمی جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب قریب ہوں گے اور آپ نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملا کر دکھایا یعنی ان دو انگلیوں کی طرح بالکل پاس پاس ہوں گے)

اندازہ فرمایئے! کہ محض اللہ کی رضا اور خوشنودی کیلئے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرنا کتنی بڑی سعادت اور لاکھوں نیکیوں کے حصول کا ہے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک پیار اور محبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کا ذریعہ ہے وہ بھی جنت میں۔ یعنی جنت میں داخل خود کتنی بڑی خوش بختی ہے اور پھر اس کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

مزید فرمایا:

خیر بیت فی المسلمین بیت فیه یتیم یحسن الیه و شر بیت فی المسلمین بیت فیه یتیم یساء الیه

(مسلمانوں کے گھرانوں میں بہترین وہ گھرانہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اس کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جاتا ہو اور مسلمانوں کے گھروں میں بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جائے)

یعنی یتیم کے ساتھ حسنِ سلوک کسی گھر کو اللہ کی نگاہ میں عزت و وجاہت کا حامل بنا دیتا ہے اور یتیم کے ساتھ بدسلوکی کسی گھر نفرت بنا دیتی ہے لوگ عزت و ذلت کے اسباب اور ذرائع نہ جانے کیا کیا گمان کرتے ہیں لیکن اللہ کی نگاہ میں بالکل دوسرے معیار اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ جو گھر اللہ کے یہاں بہتر ہے اسی پر اس کی رحمتوں کی بارش ہوتی ہے وہیں رزق میں برکت ہوتی ہے اور اس مکینوں کو نیکیوں کی توفیق ہوتی ہے اور جو گھر اس کے یہاں برا ہے وہ خیر و برکت سے محروم اور توفیق خداوندی سے دور ہے۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مساکین کے ساتھ مروت و خیر خواہی کو اتنی بڑی نیکی قرار دیا ہے جو سر کرم ہے ورنہ آدمی کبھی اس کا گمان بھی نہیں کر سکتا۔ ارشادِ نبوی ہے:

الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاهد فی سبیل الله واحسبه قال کاالقائم لایفتر و کالصائم لایفطر

(کسی بے چاری بے شوہر والی عورت یا کسی مسکین حاجت مند کیلئے دوڑ دھوپ کرنے والا بندہ اللہ کے نزدیک اور اجر و ثواب میں راہِ خدا میں جہاد کرنے والے بندے کی طرح ہے)

(راوی کہتا ہے) اور میرا گمان ہے کہ یہ بھی فرمایا تھا کہ اس قائم اللیل (یعنی شب زندہ دار) بندے کی مانند ہے جو (عبادت و رشد خیزی میں) سستی نہ کرتا ہو اور اس قائم الدھر بندے کی مثل ہے جو ہمیشہ روزہ رکھتا ہو کبھی ناغہ نہ کرتا ہو۔

Marfat.com

یہ بات معلوم ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد وقتال بلند ترین عمل ہے اسی طرح کسی بندے کا یہ حال کہ اس کی راتیں عبادت میں کٹتی ہوں اور ہمیشہ روزہ رکھتا ہو بڑا ہی قابلِ رشک حال ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی درجہ اور مقام ان کا بھی ہے جو کسی حاجت مند مسکین یا کسی ایسی لاوارث عورت کی خدمت واعانت کیلئے جس کے سر پر شوہر کا سایہ نہ ہو دوڑ دھوپ کریں۔

مختصر یہ کہ اسلام نے مختلف اسالیب سے یتامیٰ ومساکین کے حقوق کے تحفظ اور ان کے مقام کے تعین اور بعثتِ نبوی کے وقت ان مظلوموں سے متعلق دنیا کی ذہنیت کی تبدیلی کیلئے حیرت انگیز کام کیا جس سے فی الواقع یتامیٰ اور مساکین کو ایک نئی زندگی اور ایک نیا معاشرتی مقام حاصل ہوا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محض تذکیر وترغیب سے لائی ہوئی تبدیلی دیرپا اور مستقل نہیں ہوتی۔ اس لئے اسلام نے اسی پر اکتفا کرنے کی بجائے یتامیٰ اور مساکین کو قانونی تحفظ بھی دیا اور ان بے کسوں پر ہونے والے مظالم کا قانونی عمل سے انسداد کر کے رکھ دیا۔

ہمسایوں کے حقوق

اس آیتِ کریمہ کی ترتیب میں قرابت مندوں کے بعد ہمسایوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ لیکن ہمسائیگی کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کیلئے الفاظ کا اضافہ فرمایا۔ ارشاد فرمایا: وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ ''ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ''۔ علماء نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہمسایہ قریب وہ ہے جس کا گھر اپنے گھر کے ساتھ متصل ہے۔ اور ہمسایہ بیگانہ وہ ہے جس کا گھر دور ہے۔ بعض دوسرے علما نے کہا کہ ہمسایہ قریب سے مراد مسلمان ہمسایہ ہے اور بے گانہ ہمسایہ سے مراد غیر مسلم ہمسایہ ہے۔ بعض اور علما کی رائے یہ ہے کہ ہمسایہ قریب سے مراد رشتہ دار ہمسایہ ہے اور بے گانہ ہمسائے سے مراد وہ ہمسایہ ہے جس سے رشتہ داری کا تعلق نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ علما کا بظاہر یہ اختلاف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ قرآنِ کریم کے ان دونوں الفاظ سے یہ تینوں قسم کے ہمسائے مراد ہیں۔ کیونکہ اس کی تعیین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے ہوتی ہے: آپ نے ارشاد فرمایا:

الجیران ثلاثة فجار له حق واحدٌ وهوا ادنٰی الجیران حقاً وجار له حقان وجار له ثلاثة حقوق فاما الذی حق واحد فجار مشرک لارحم له، له حق الجوار واما الذی له حقان فجار مسلم له حق الاسلام وحق الجوار واما الذی له ثلاثة حقوق فجار مسلم ذورحم له حق الاسلام وحق الجوار وحق الرحم

(پڑوسی تین قسم کے اور تین درجے کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ پڑوسی جس کا صرف ایک ہی حق ہے اور وہ حق کے لحاظ سے کم درجہ کا پڑوسی ہے اور دوسرا وہ پڑوسی ہے جس کے دو حق ہیں اور تیسرا وہ جس کے تین حق ہیں۔ تو ایک حق والا وہ مشرک پڑوسی ہے جس سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے تو اس کو صرف پڑوسی ہونے کا حق حاصل ہے اور دو حق والا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسی ہونے کے ساتھ مسلمان بھی ہے اس کا ایک حق مسلمان ہونے کی وجہ سے ہے اور دوسرا پڑوسی ہونے کی وجہ سے اور تین حق والا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسی بھی ہے، مسلمان بھی ہے اور رشتہ دار بھی ہے۔ اس کا ایک حق مسلمان ہونے کا اور دوسرا حق پڑوسی ہونے کا اور تیسرا حق رشتہ داری کا ہے)

Marfat.com

قرآنِ کریم کی پیشِ نظر آیت اور اس حدیث سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں ہمسائے کا صحیح تصور کیا ہے اور پھر ان میں ایک ترتیب اور تدریج رکھی ہے تاکہ ان کی درجہ بدرجہ اہمیت واضح ہو اور جب آدمی ہمسائیگی کے حوالے سے حسنِ سلوک کرنے لگے تو اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کے حسنِ سلوک کا اولاً مستحق کون ہے؟ اور بعض مواقع زندگی میں ایسے آتے ہیں جب آدمی کو واقعی اس ترتیب کا خیال کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ حضور میں اپنے پڑوسی کو ہدیہ بھیجنا چاہتی ہوں میرے پڑوسی ایک سے زیادہ ہیں تو میں کس کو ہدیہ بھیجوں؟ آپ نے فرمایا اسے مقدم رکھو جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر کے دروازے کے بالکل سامنے ہے اور دوسرا اس حدیث سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمسائیگی کا تعلق صرف مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ یہ تعلق غیر مسلمون کے ساتھ بھی ہے۔ اگرچہ ہمارا ان کے ساتھ رشتہ دینی بھائی ہونے کا نہیں لیکن ایک انسان کے وہ بھی ہماری طرف سے نیکی کا حق رکھتے ہیں۔ اس لئے اگر غیر مسلم ہمارا ہمسایہ ہے تو ہم اس کے ساتھ بھی ہمسایوں جیسا سلوک کریں گے۔ صحابہ کرام نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے یہی سمجھا تھا حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے گھر میں ایک بکری ذبح ہوئی۔ وہ تشریف لائے انہوں نے آتے ہیں اہلِ خانہ سے پوچھا کہ کیا تم لوگوں نے اپنے یہودی پڑوسی کو بھی گوشت کا ہدیہ بھیجا؟ یہ بات آپ نے دو دفعہ فرمائی اور پھر آپ نے وہ حدیث بیان کی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی کے حقوق کی ادائیگی پر زور دیا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ امتِ مسلمہ نے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات پر عمل کیا ہوتا بالخصوص ایسے علاقوں میں جہاں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی رہتے ہیں تو آج صورتحال بالکل مختلف ہوتی پہلے لوگوں نے اپنے اخلاق کے ذریعے ہی ہمیں اور ہمارے آباؤ اجداد کو مسلمان کیا تھا۔ لیکن ہم نے اپنی بداخلاقی اور بے مروتی کے باعث بلکہ ہندوؤں کے دیئے ہوئے چھوت چھات کے تصور کی وجہ سے غیر مسلموں کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جو ہندو اچھوتوں کے ساتھ کرتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ ہم نے اپنے کاموں میں بطور ملازم ان کو شریک رکھا گھر کی خدمتیں بھی لیں، باہر کے کاموں میں بھی شریک رہے، لیکن یہ چھوت چھات کا تصور ہمیشہ ہمارے ساتھ موجود رہا۔ اس معاشرتی زندگی میں کبھی ان کو برابری کا درجہ دینے کی ہم نے زحمت نہیں کی بلکہ ہم نے یہ غلط تصور نجانے کہاں سے لے لیا کہ ایک صاف غیر مسلم بھی اگر کسی برتن کو ہاتھ لگا دے تو برتن ناپاک ہو جاتا ہے اور دھونے سے بھی پاک نہیں ہوتا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اگر وہ غیر مسلم گوری چمڑی والا ہمارا آقا بن کر ہم پر مسلط ہو جائے تو ہم اس کی غلامی اختیار کرنے کیلئے بھی تیار رہتے ہیں اور وہ ہماری کھالوں کے جوتے بنوا کر پہن لے تو ہمیں اس سے بھی انکار نہیں بلکہ اس کا طرزِ معاشرت اور اس کی تہذیب اختیار کرنے میں ہم فخر محسوس کرتے ہیں لیکن انہیں کے مذہب فراش اور ملازم بن کر ہمارے گھروں میں کام کرتے ہیں تو ہم ان سے فاصلہ رکھتے ہیں۔ کاش! ہم نے یہ فاصلے نہ رکھے ہوتے تو ان لوگوں کو جس طرح انگریز نے باوجود ہم مذہب ہونے کے کالا ہونے کی وجہ سے اپنا مساوی کبھی نہیں سمجھا تھا اگر ہم ان کو برابری کا درجہ دیتے تو بہت پہلے اسلام کے دامن میں آچکے ہوتے۔ حتی کہ ہندوستان میں کروڑوں کی تعداد میں جو اچھوت رہتے ہیں اگر انہوں نے اسلامی اخلاق دیکھے ہوتے تو وہ دیگر نومسلموں کی طرح ہندوستان میں مسلمانوں کیلئے ایک طاقت بنتے۔

اسلام نے ہمسائیگی کے اس تصور میں ایک اور لفظ بول کر مزید وسعت پیدا کر دی اس آیت کریمہ میں وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ کے ساتھ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ کا اضافہ بھی ہے۔ اس کا معنی ہے "پہلو کا ساتھی"۔ یعنی وہ شخص جو عارضی طور پر کسی میں آپ کا رفیق ہے یا آپ کا ہم رکاب مثلاً ایک سکول میں پڑھنے والے دو لڑکے، ایک دکان پر کام کرنے والے، ایک پیشے سے تعلق رکھنے والے، حتی کہ ایک ٹرین یا ایک بس میں سفر کرنے والے، ہوائی جہاز کے سفر میں ساتھ ساتھ بیٹھنے والے، یعنی جہاں کہیں بھی دو یا چند انسان

Marfat.com

یکجائی اور ہم نشینی کا موقع ملا ہے اسلام نے انہیں پہلو کا ساتھی قرار دیا ہے اور ان کے درمیان ہمسائیگی کے رشتے کو تسلیم کر کے ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں دو مسلمان ایک جگہ اکٹھے مل بیٹھتے تھے یا سفر میں شریک ہوتے تھے وہ ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی، غم گساری، ایک دوسرے کی مدد اور اعانت اپنا فریضہ جانتے تھے اور اگر دونوں میں سے کوئی ایک کسی حادثے کا شکار ہو گیا تو دوسرا اپنا فرض سمجھتا تھا کہ وہ جہاں تک اس کی مدد کر سکتا ہے کرے اور اس بات کا تو عام مسلمانوں میں چلن تھا کہ گاڑیوں میں ایک ساتھ بیٹھ کر سفر کرنے والے اپنے کھانے میں ایک دوسرے کو شریک کیا کرتے تھے۔ مشہور نو مسلم مورخ اور محقق جن کا تعلق جرمنی سے تھا اور جو اصلاً یہودی تھے اور نصف صدی پہلے وہ اسلام کے دامن میں آئے اور پھر اللہ نے ان سے اسلام کی بہت خدمت لی۔ ان کا اصل نام لیو پولڈ تھا اور آج وہ علامہ اسد کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب Road to Mecca میں مشرقِ وسطیٰ کے سفر کے دوران اپنے جن مشاہدات کا ذکر کیا ہے جو انہیں اسلام تک لانے کا باعث ہوئے ان میں انہوں نے اس بات کا بطورِ خاص ذکر کیا کہ میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ ایک عرب جو گاڑی میں سفر کر رہا ہے اور جب کھانے کا وقت ہوتا ہے تو ایک روٹی جو اس نے اپنے ساتھ باندھ رکھی ہے وہ کھولتا ہے آدھی خود کھاتا ہے اور آدھی اپنے ساتھ بیٹھنے والے کو اصرار کر کے کھلاتا ہے۔ پھر وہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک ٹرین کے سفر کے دوران ایک بدو جو میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا آہستہ آہستہ اٹھا اور اپنا مفلر کھولا پھر کھڑکی کھولی اس کا رنگ سانولا اور چہرہ ستواں تھا ان عقابی چہروں میں سے ایک چہرہ جو آہنی عزم اور قوتِ ارادی کے ساتھ ہمیشہ آگے کی طرف دیکھتے ہیں اس نے ایک روٹی خریدی اور واپس ہونے لگا اور جب وہ بیٹھنے جا رہا تھا اس وقت اس کی نگاہ مجھ پر پڑی کچھ کہے بغیر اس نے اس روٹی کے دو ٹکڑے کیئے اور ایک مجھے دینے لگا جب اس نے میرا تردد اور تعجب دیکھا تو مسکرایا اس کی مسکراہٹ بھی اس کے چہرے پر اسی طرح موزوں تھی جس طرح عزم اور قوتِ ارادی۔ پھر اس نے ایک لفظ کہا جو اس وقت تو میں نہیں سمجھا لیکن اب سمجھتا ہوں۔

تفضل، ''نوش فرمایئے''۔ میں نے وہ ٹکڑا لے لیا اور سر کے اشارے سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ایک مسافر نے جو ترکی ٹوپی کے علاوہ باقی تمام یورپین لباس میں تھا اور کوئی متوسط درجہ کا تاجر معلوم ہو رہا تھا، رضا کارانہ طور پر ترجمہ کی پیشکش کی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا:

(یہ کہتے ہیں آپ بھی مسافر ہیں اور میں بھی مسافر ہوں اور ہم دونوں کا راستہ ایک ہے)

یعنی اسلام نے پہلو کے ساتھی کو جو حقوق دیئے تھے یہ اسی کا اثر تھا کہ ہمسائیگی کے اس تصور نے مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے کا خیر خواہ بنا دیا تھا اور وہ بجائے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے، جیب کاٹنے یا دھوکا دینے کے ایک دوسرے کیلئے ہمدردی اور غمگساری کے پیکر بن گئے تھے۔

پڑوسی کا مقام اور اس کے حقوق کی رعائت کی تاکید

ہمسائیگی کے تصور کی وضاحت کے بعد اب ہم یہ دیکھتے ہین کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں ہمسائے کا مقام و مرتبہ کیا ہے اور ہمسائیگی کے حق کی رعائت اور حقوق کی ادائیگی کی اہمیت اور فضائل کیا ہیں؟ جہاں تک اس کی اہمیت کا تعلق ہے اس کا اندازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہوتا ہے۔

Marfat.com

عن عائشه و ابن عمر عن النبی صلی الله علیه و سلم قال مازال جبرائیل یوصینی بالجار حتی ظننت انه سیورثه

(حضرت عائشہ صدیقہ ؓ اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت جبرائیل مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پڑوسی کے بارے میں برابر وصیت اور تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ میں خیال کرنے لگا کہ وہ اس کو وارث قرار دے دیں گے)

یعنی پڑوسی کا حق اور اس کے ساتھ اکرام ورعائت کا رویہ رکھنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت جبرائیل مسلسل تاکیدی پیغام لاتے رہے کہ مجھے خیال ہوا کہ شائد اس کو وارث بھی بنا دیا جائے گا یعنی حکم آجائے گا کہ کسی کے انتقال کے بعد جس طرح اس کے ماں باپ، اس کی اولاد اور دوسرے اقارب اس کے ترکہ کے وارث ہوتے ہیں اسی طرح پڑوسی کا بھی اس میں حصہ ہوگا۔ اس حدیث سے بڑی آسانی سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ حقوق میں جو اہمیت ماں باپ اور اولاد کی ہے کہ وہ مرنے والے کی وراثت کے وارث ہوتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمسائے کے حقوق کی تاکید کی وجہ سے اس بات کا خیال ہونے لگا کہ شائد یہی مقام ہمسائے کو بھی دے دیا جائے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر بھی کسی حق کی اہمیت ہوسکتی ہے۔

ایک مسلمان کی زندگی میں ایمان سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں۔ وہ ایک مومن بن کر زندہ رہنا چاہتا ہے اور مومن بن کر ہی مرنا چاہتا ہے اور اگر اسے یہ معلوم ہوجائے کہ کسی چیز کے نہ کرنے سے میرے ایمان کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے تو میرا خیال ہے کہ اس کیلئے اس سے بڑھ کر کوئی خطرناک چیز نہیں ہوسکتی اور اگر اسی خطرے کا اظہار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نہایت پرخطر طریقے سے اور تاکیدی انداز میں فرمایا جائے تو پھر اس کے خطرناک ہونے اور اس کے ثابت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ آپ ذرا اس حدیث کو ملاحظہ فرمائیے! اور اندازہ فرمائیے کہ اس میں کلام کے تیور کتنے تیکھے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات فرماتے ہوئے کس قدر جلال میں دکھائی دیتے ہیں۔

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لایومن واللّٰهِ لَایُؤمِنُ وَاللّٰهِ لا یُؤمِنُ قِیلَ مَنْ یَارَسُولَ اللّٰه؟ قَالَ الَّذِی لا یَامَنُ جَارُهُ بَوَائِقَه

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ اللہ کی قسم وہ شخص مسلمان نہیں، اللہ کی قسم اس میں ایمان نہیں، اللہ کی قسم وہ صاحب "ایمان نہیں عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون شخص؟ یعنی حضور کس بدنصیب شخص کے بارے میں قسم کے ساتھ ارشاد فرما رہے ہیں کہ وہ مومن نہیں اور اس کا ایمان نہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ آدمی جس کے پڑوسی اس کی شرارتوں اور اس کی فتنہ پردازیوں سے مامون اور بے خوف نہیں ہیں۔"

اندازہ کیجئے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر حتمی انداز میں اس آدمی کے صاحب ایمان ہونے سے انکار فرما رہے ہیں۔ جس آدمی کا رویہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ اس طرح کا ہے کہ وہ اس کی شرارتوں اور اس کی دل آزاریوں سے پریشان ہیں۔ یعنی ہمسایہ ہمسائے کیلئے قوت اور راحت کا سامان ہونا چاہئے اور اگر اس کے برعکس اس نے اپنے ہمسائے کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے تو وہ یقیناً ایمان کے اعتبار سے کوئی

Marfat.com

آدمی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دو خواتین کے بارے میں بتایا گیا کہ حضور ایک خاتون بہت عبادت گزار ،شب زندہ دار، راہِ اللہ میں مال صرف کرنے والی اور بہت نیک ہے لیکن اس کے ہمسائے اس کی زبان درازیوں سے بہت پریشان ہیں۔ لیکن دوسری خاتون جو بہت زیادہ عبادت گزار نہیں صرف فرائض کی پابند ہے لیکن اس کے ہمسائے اس کے سلوک اور اس کی مروت سے بہت خوش ہیں اور بہت تعریف کرتے ہیں تو حضور نے ارشاد فرمایا کہ پہلی خاتون کا نیکی میں کوئی حصہ نہیں اور وہ اپنی زبان درازیوں کے باعث جہنم میں جائے گی اور دوسری خاتون اپنے ہمسایوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی وجہ سے جنت میں داخل کی جائے گی۔ اسی طرح ایک اور حدیث کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمسائے کے حقوق ادا نہ کرنے والے کے بارے میں یہاں تک فرمایا کہ ایسے شخص نے معلوم ہوتا ہے مجھے مانا ہی نہیں۔ ذرا حدیث کے الفاظ ملاحظہ کیجئے:

عن انس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ما امن بی من بات شبعان وجاره جائع الی جنبه وهو یعلم به

(حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا یعنی اس نے مجھے مانا ہی نہیں جو ایسی حالت میں اپنا پیٹ بھر کر رات کو بے فکری سے سوجائے کہ اس کے برابر رہنے والا اس کا پڑوسی بھوکا ہو اور اس آدمی کو اس کے بھوکے ہونے کی خبر ہو)

پڑوسی کے معاشرتی حقوق

اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات غائت درجہ، پرمغز اور از بس لطیف واقع ہوئے ہیں۔ ان ارشادات میں آپ نے معاشرتی حقوق کو بھی بیان فرمایا اور اصلاحی اور دعوتی حقوق کی بھی تاکید فرمائی معاشرتی حقوق کے حوالے سے آپ کا ارشادِ گرامی ہے:

قال رسول الله صلی الله علیه و سلم حق الجار ان مرض عدته وان مات شیعته وان استقرضک اقرضته وان اعور سترته وان اصابه خیر هناته وان اصابته مصیبة عزیته ولاترفع بناء ک فوق بنائه فتسد علیه الریح ولاتوذیه بریح قدرک الا ان تغرف له منها

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پڑوسی کے حقوق تم پر یہ ہیں کہ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت اور خبر گیری کرو اور انتقال کر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ جاؤ (اور تدفین کے کاموں میں ہاتھ بٹاؤ) اور اگر وہ اپنی ضرورت کیلئے قرض مانگے تو (بشرطِ استطاعت) اسے قرض دو اور اگر وہ کوئی برا کام کر بیٹھے تو پردہ پوشی کرو اور اگر اسے کوئی نعمت ملے تو اس کو مبارکباد دو اور اگر کوئی مصیبت پہنچے تو تعزیت کرو اور اپنی عمارت اس کی عمارت سے اس طرح بلند

Marfat.com

نہ کرو کہ اس کے گھر کی ہوا بند ہو جائے اور (جب تمہارے گھر کوئی اچھا کھانا پکے تو اس کی کوشش کرو کہ) تمہاری ہانڈی کی مہک اس کے لئے (اور اس کے بچوں کیلئے) باعث ایذا نہ ہو (یعنی اس کا اہتمام کرو کہ ہانڈی کی مہک اس کے گھر تک نہ جائے) الا یہ کہ اس میں سے تھوڑا سا کچھ اس کے گھر بھی بھیج دو)

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی کے معاشرتی حقوق بیان فرمائے ہیں۔ ہم انہیں اسی ترتیب سے بیان کرتے ہیں۔

قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی سے حسنِ سلوک کرنے اور حق جوار کی رعایت کرنے کی مطلقاً تو جابجا تاکید فرمائی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عام معمول کے تعلقات اور روزمرہ کے معمولات میں پڑوسی کے ساتھ مروت اور شائستگی سے پیش آنا اور دونوں کا ایک دوسرے کیلئے تقویت اور اکرام وراحت کا ذریعہ بن کر زندگی گزارنا تو ایک مستقل وتیرہ ہونا چاہئے لیکن مخصوص حالات میں تعین کے ساتھ مخصوص احکام دیئے، مثلاً حکم دیا

ا۔ اگر پڑوسی بیمار ہو جائے تو دوسرے پڑوسی کا فرض ہے کہ وہ اس کی تیمارداری عیادت اور خبر گیری کرے۔ یعنی بیماری کے دنوں میں اسے جس طرح کی مدد اور دلجوئی کی ضرورت ہو اس کا انتظام کرے۔ کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تو دیکھ بھال کرے۔ ہسپتال لے جانے کی ضرورت ہو تو ہسپتال لے کر جائے، وہ تہی دامن ہے تو ادویہ مہیا کرے اور بقدر استطاعت جتنی مدد اور اعانت کر سکتا ہو اس میں دریغ نہ کرے اور ایسا رویہ اختیار کرے کہ اسے اپنے تنہا ہونے کا احساس نہ ہو۔

۲۔ اور اگر خدانخواستہ پڑوسی انتقال کر جائے تو جنازے کے ساتھ جائے اگر اس کے تکفین اور تدفین میں مدد کی ضرورت ہو یعنی کفن خریدنا پڑے تو کفن خریدے۔ قبر کھدوانے کی ضرورت ہو تو قبر کھدوائے۔ پھر تدفین میں ساتھ رہے۔ مرحوم کے اہلِ خانہ کے لئے کھانے کا انتظام کرے کیونکہ وہ غم کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی دور دراز کے مہمان آئے ہوں تو ان کی بھی دیکھ بھال کرے۔ مرحوم کے اہلِ خانہ کی ہمدردی اور دلجوئی کی پوری کوشش کرے اور ان پر ذمہ داری کا بار کم سے کم کرنے کی کوشش کرے۔

۳۔ اگر پڑوسی کبھی حالات کی نامساعدت یا کسی ناگہانی آفت سے مجبور ہو کر قرض مانگے تو اس کے پڑوسی کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ بقدر استطاعت مدد اور اعانت سے دریغ نہ کرے کیونکہ مالی احتیاج بعض دفعہ جسمانی احتیاج سے بھی شدید تر ہوتی ہے اور ایسی صورت میں دستگیری نہ کرنا اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا سنگین نتائج کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی ایک آدمی کا اصل امتحان مالی معاملات میں ہی ہوتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو وقت اور ہمت صرف کرنے میں فیاض ہوتے ہیں لیکن مالی ایثار میں کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حقوق میں ہر طرح کے تعاون اور ایثار کو شامل فرمایا ہے۔

۴۔ اگر پڑوسی سے کوئی برائی ہو جائے تو دوسرے پڑوسی کو پردہ پوشی سے کام لینا چاہئے۔ غلطیوں اور فروگزاشتوں سے کون مبرا ہے۔ کتنے گنہگار ہیں جن کے گناہوں پر رحمت حق نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ پڑوسی کو پڑوسی کیلئے رحمت بننا چاہئے۔ غایت اتصال اور اکثر اوقات کی آگاہی کے باعث ایک دوسرے کے عیوب کی اطلاع اکثر اوقات ممکن ہے اس لئے اصلاح کے حوالے سے اور تعلقات کے استحکام کے لئے بھی ضروری ہے کہ عیبوں اور گناہوں پر پردہ ڈالا جائے۔

Marfat.com

۵۔ تعلقات میں گہرائی اور گیرائی محبت اور اخلاص اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب پڑوسی دوسرے پڑوسی کے احساسات میں بھی شریک اور حصہ دار بن جائے یعنی اگر پڑوسی بھائی کو کوئی نعمت میسر آئے، کوئی خوشی اور مسرت کا لمحہ نصیب ہو مثلاً اللہ گھر میں بچہ دے یا کوئی بچہ امتحان میں کامیاب ہو یا کسی کو نوکری ملے، ملازمت میں ترقی ہو، کاروبار پھلے پھولے، غرضیکہ بہتری اور خوشی کی کوئی بھی صورت پیدا ہو تو دوسرے پڑوسی کو تہنیت اور مبارکباد پیش کرنے کیلئے ضرور جانا چاہئے۔ اس طرح اس کی خوشی دوچند ہو جائے گی اور دونوں کے تعلقات میں گہرائی پیدا ہوگی اور استحکام آئے گا۔

۶۔ جس طرح دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہونے سے تعلقات میں قربت آتی ہے اس طرح مصیبت اور غم کے موقع پر ہمدردی اور غمخواری کرنے سے قلبی رشتے قائم ہوتے ہیں بلکہ مصیبت اور درد کے رشتے خوشی کے تعلقات سے زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوتے ہیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی کا یہ حق رکھا ہے کہ اگر تمہارے پڑوسی کو کوئی دکھ پہنچے تو تمہارا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس کے دکھ اور غم میں شرکت کرو۔ اس کا غم بٹانے کی کوشش کرو۔ اس سے ہمدردی اور خیر خواہی کرو۔ اس طرح اس کی مصیبت کو بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور انسانیت پر جانبین کا اعتقاد مستحکم ہو جائے گا۔

۷۔ پڑسی کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اس کے مکان سے دوسرا پڑوسی اپنے مکان کی دیوار اتنی بلند نہ کرے کہ اس کی ہوا رک جائے اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ میں جیل کی دیواروں کے پیچھے بیٹھا ہوں۔ آج بجلی کی سہولت کی وجہ سے شائد اس نصیحت کی حقیقی قدر و قیمت معلوم نہ ہو سکے لیکن جن پسماندہ دیہات اور علاقوں میں آج بھی یہ سہولت نہیں ہے ان سے پوچھئے کہ پڑوسی کی بلند دیواروں کا کیا مفہوم ہے؟ اور ان سے کیسی اذیت ہوتی ہے۔ البتہ! ہوا بند ہونے کے علاوہ ان بلند دیواروں یا غیر ذمہ دار اور غیر شائستہ پڑوسی سے ایسی اذیتیں بھی وقوع پذیر ہوتی ہیں جن کا آج سے پہلے تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ لیکن ان کا تعلق چونکہ صرف دیواروں کی بلندی سے نہیں اس لئے آنحضرت نے اس کا الگ سے ذکر فرمایا

۸۔ مندرجہ بالا حدیث میں آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے پڑوسی کو ایذا اور تکلیف مت پہنچاؤ اپنی ہنڈیا کی مہک سے یعنی ایسی ہنڈیا مت پکاؤ جس کی مہک اور خوشبو غریب پڑوسی تک پہنچے اور اسے اور اس کے بچوں کو یہ خوشبو اپنی محرومیوں کی یاد دلانے لگے اور بچے چونکہ اپنی محرومیوں کا ذمہ دار بالعموم اپنے والد کو سمجھتے ہیں تو ایسے مواقع پر زبانیں خاموش بھی رہیں لیکن خشمگین نگاہیں والد کو ضرور گھورتی ہیں اور دل میں دبا ہوا احساس لاوے کی طرح کھولنے لگتا ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ اس کی کسی حد تک تلافی اس طرح ہو سکتی ہے کہ جو پر تکلف پکوان گھر میں تیار ہوا ہے اس میں سے کچھ ہمسائے کے گھر بھی بھیجو تاکہ وہ تمہیں بھی اپنا سمجھیں اور ان کے دلوں میں رشک وحسد کی بجائے اپنائیت کے جذبات پیدا ہوں۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اب تک چھ قسم کے لوگوں کے حقوق بیان کئے گئے ہیں جو خونی رشتوں یا ہمسائیگی کے تعلقات کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ قربت رکھتے تھے۔ اب دو طرح کے ایسے لوگوں کے حقوق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو نہ تو خونی رشتوں سے منسلک ہیں اور نہ ہمسائیگی کی وابستگی رکھتے ہیں۔ ان میں ایک ''اِبْنِ السَّبِیْلِ'' ہیں اور دوسرا ''وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ''

اِبْنِ السَّبِیْل کا معنی ہے ''مسافر''۔ اندرونِ ملک یا بیرونِ ملک سے آنے والا کوئی شخص یا چند اشخاص جو کسی بھی نیک ارادے سے گھر سے نکلے ہوں چاہے وہ تبلیغی ارادے سے آئے ہوں یا تجارتی ارادے سے، گھومنے پھرنے اور سیر کرنے کیلئے یا کسی خاص علاقے

Marfat.com

کے تاریخی آثار دیکھنے یا کسی خاص علاقے میں خاص موسم سے محفوظ ہونے کیلئے یہ تمام لوگ مسافر ہیں۔ان میں دونوں طرح کے لوگ ہوسکتے ہیں وہ بھی جو اپنے پاس سفر کی ضروریات کے لئے کافی سرمایہ رکھتے ہیں اور وہ بھی جو واجبی سا خرچ لے کر نکلے ہیں اور کسی وقت بھی ضروریات میں کمی کا شکار ہوسکتے ہیں۔جو لوگ بظاہر اپنے ساتھ زرِ کثیر یا سہولیات کی ایک بڑی مقدار لے کر آئے ہیں یہ اندیشہ تو ان کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے کہ وہ کسی نقصان یا کسی حادثے کا شکار ہو جائیں۔سامان چوری ہو جائے،راستے میں ایکسیڈنٹ ہو جائے،کار تباہ ہو جائے،جسمانی طور پر کسی نقصان کا شکار ہو جائیں،تو باوجود اس کے کہ یہ لوگ اپنی ذات میں مالدار اور معزز لوگ ہیں لیکن اب چونکہ حالات نے انہیں ضرورت منداور حاجت مند بنا دیا ہے تو اسلام نے ان کو وہ حقوق عطا کیے ہیں جو ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کیلئے ہیں اور ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے وہی فضائل ہیں جو کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے فضائل ہو سکتے ہیں۔اب ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ ان کی کوئی مالی مدد کر کے ان کو سفر کے قابل بنا دیں یہ بھی عین سعادت کی بات ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ارشادات میں اور قرآنِ کریم نے اپنی مختلف آیات میں ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے اور بھوکوں کو کھانا کھلانے اور ننگوں کو کپڑا پہنانے کی بہت فضیلتیں بیان فرمائی ہیں۔لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ وہ معاشرے کے پاس بطور مہمان آ جائیں اور معاشرہ انہیں اپنے پاس مہمان ٹھہرا کر ان کو سنبھالا دینے کی کوشش کرے۔

وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ کا معنی ہے "وہ جو تمہارے زیرِ دست ہیں"،"تمہارے ہاتھ جن کے مالک ہیں"۔نزولِ قرآن کے وقت تک اس طبقے کی زنجیریں کٹنے کی بجائے مضبوط ہوتی رہی تھیں۔ہر دور میں فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوموں کے افراد کو غلامی کی زنجیریں پہنائی ہیں اور اپنی خواہشات اور قوت واقتدار کے لئے ہمیشہ ان کو ایندھن بنایا۔شاہوں اور ظالم امراء کے چراغ ہمیشہ ان مظلوموں کے پسینے اور خون سے جلتے رہے۔ہندوؤں میں اچھوت اسی ظلم کی یادگار ہیں،مصر میں بنی اسرائیل کے ساتھ یہی ظلم ہوتا رہا،رومیوں کے بحری جہاز اسی مظلوم طبقے کی توانائیوں کو نچوڑتے رہے،ان کے کھیلوں کے میدان درندوں کے جبڑوں میں انہیں تڑپتا دیکھ کر تالیوں سے گونجتے رہے،عربوں میں بھی یہی مظلوم طبقہ اپنی محرومیوں کی تصویر بنا زندگی کا رتھ کھینچتا رہا۔مذہب جب بھی دنیا میں آیا اس نے ہمیشہ مظلوموں کی داد رسی کی اور کمزوروں کو طاقت اور خود اعتمادی دے کر جبر واستبداد کا شکنجہ توڑا۔

بعثتِ نبوی کے وقت دنیا میں جو بین الاقوامی قوانین جنگ نافذ تھے ان میں قیدیوں کے تبادلے یا فدیہ وغیرہ لے کر قیدیوں کو آزاد کرنے کی بجائے مفتوح قوم کے افراد کو غلام بنا لینے کا عام چلن تھا۔اسلام کو بادلِ نخواستہ اس کو قبول کرنا پڑا۔لیکن اسے ایک تدبیر کے طور پر اختیار کیا گیا۔اسے اسلامی نظام کا جزو یا اسلامی اہداف میں سے ایک ہدف قرار نہیں دیا۔علاوہ ازیں اس میں ایسی اصلاحات کیں جس سے غلامی استحصال کا ذریعہ بننے کی بجائے تربیت وتشکیل کردار کا ذریعہ بن گئی۔جنگ میں گرفتار ہونے والے قیدیوں کو جب مسلمان گھرانوں میں رہ کر مسلمانوں کے سیرت وکردار کو قریب سے دیکھنے کا اور اسلام اور اس کے اثرات کو براہِ راست مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تو ان کی عظیم اکثریت نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ ان میں سے ایک قابلِ ذکر تعداد وعلماء،فضلا اور مجاہدین کی ایسی تیار ہوئی جس پر ہمیشہ مسلمانوں کی تاریخ فخر کرتی رہے گی۔

Marfat.com

مزید برآں اسلام نے اس عقدہ کو حل کرنے کے لئے ایسی اصلاحات تجویز کیں جس نے پہلے مرحلے میں غلاموں کو ایک مظلوم طبقے کی بجائے عام انسانوں کی طرح زندگی کے سفر میں شرکت کے قابل بنایا۔ کسی کو عبد کہہ کر بلانے پر پابندی لگادی۔ تمام امتیازی علامات کا خاتمہ کردیا۔ ان کی معاشرتی زندگی کو برابر کی سطح پر لانے کیلئے حکم دیا کہ غلاموں کو اپنے بھائی سمجھو اوران کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کرو۔

عن ابی ذر قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اخوانكم جعلهم الله تحت ايديكم فمن جعل الله اخاه تحت يديه فليطعمه مما ياكل و ليلبسه ممايلبس ولايكلفه من العمل مايغلبه ان كلفه ما يغلبه فليعنه عليه

(حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ غلام تمہارے بھائی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہاری زیرِ نگرانی دے دیا ہے۔ جس کے بھائی کو اللہ تعالیٰ اس کی تحویل میں دے دے اسے چاہئے کہ جو خود کھائے اسے کھلائے جو خود پہنے اسے پہنائے اور اس کی ہمت سے بڑھ سے اسے کام کی تکلیف نہ دے اور اگر کسی مشکل کام کا بار اس پر ڈالے تو اس میں خود اس کی مدد کرے)

دوسرے مرحلے میں غلاموں کو آزاد کرنے کو بہت بڑی نیکی قرار دیا اور اسے اس قدر اہمیت دی کہ قرآن کریم نے اسلامی زندگی اختیار کرنے اور اس راستے میں شریعت کی طرف سے عائد کردہ فرائض وواجبات کو باحسن طریق ادا کرنے کو گھاٹی سر کرنے سے تعبیر کیا اور اس عظیم مہم کے پہلے مرحلے کو ''فَكُّ رَقَبَةٍ'' کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا قرار دیا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ کثرت ارشادات میں اس کی ترغیب فرمائی۔ انہیں میں ایک ارشاد حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا: جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا، اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عضو کو دوزخ کی آگ سے بچائے گا۔ ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے بدلے پاؤں، شرمگاہ کے بدلے شرمگاہ۔

حضرت علی بن حسین (امام زین العابدین) نے اس حدیث کے راوی سعد بن مرجانہ سے پوچھا کیا تم نے ابو ہریرہؓ سے یہ حدیث خود سنی ہے۔ انہوں نے کہا: ہاں۔ اس پر امام زین العابدین نے اپنے سب سے قیمتی غلام کو بلایا اور اسی وقت اسے آزاد کردیا۔ مسلم میں بیان کیا گیا ہے کہ اس غلام کیلئے ان کو دس ہزار درہم قیمت مل رہی تھی۔ مزید برآں کفارہ کی مختلف شکلوں میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ مثلاً قتل خطا، عمداً روزہ توڑنے اور بیوی سے ظہار وغیرہ میں غلام کی موجودگی میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ اسی طرح غلام اگر آزادی حاصل کرنے کیلئے شریعت کی عطا کردہ قانونی صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کرنا چاہے تو غلام کے مالک کو اسے قبول کر لینے کا حکم ہے۔

انہی ترغیبات اور تعلیمات کا نتیجہ کا یہ ہوا کہ مسلمانوں میں غلامی کو ختم کرنے غلاموں کی فلاح و بہبود اور غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کا ایک دینی ذوق پیدا ہوگیا، جس کی وجہ سے ہر مالدار شخص اس نیکی میں ایک دوسرے سے سبقت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ حضرت حکیم بن حزام فتح مکہ کے موقعہ پر مسلمانوں ہوئے آپ نے ایک سو غلام آزاد کئے۔ حضرت عثمان غنیؓ ہر جمعہ کو دس غلام آزاد کرتے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے مجموعی طور پر تیس ہزار غلام آزاد کئے۔ ایسی ہی کاوشوں کے نتیجے میں نہ صرف غلامی ختم ہوگئی بلکہ ماضی کے غلام مستقبل میں حکمران بن کر اٹھے۔

Marfat.com

بقول ہری چند اختر ؎

جس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا

آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنۡ کَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا ''اللہ اترانے اور بڑائی مارنے والوں کو پسند نہیں کرتا''

اس آیتِ کریمہ کی وضاحت میں آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حقِ عبادت کو بیان کرنے کے بعد بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور احسان کا حکم دیا ہے اور بندوں کے معاملے میں جن رشتوں اور جن وابستگیوں کی اہمیت بنیادی ہے بطورِ خاص ان کیلئے ادائے حقوق کی تاکید کی گئی ہے اور اس بات کو سمجھنے کیلئے کسی بڑی عقل کی ضرورت نہیں کہ ادائے حقوق اور احسان کی ادائیگی کیلئے ایک خاص ذہنیت اور خاص مزاج کی ضرورت ہے، جس میں اللہ کی نعمتوں پر شکر گزاری اور بندوں کے ساتھ معاملات میں تواضع کا جذبہ کارفرما ہو۔ یہی جذبہ انسان کو ادائے حقوق اور احسان پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن اگر اس کے برعکس انسان کے اندر وہ رویہ پیدا ہو جائے جس سے گھمنڈ اور فخر پیدا ہوتا ہے اور جس سے انسان میں تکبر کو راہ ملتی ہے۔ تو ایسے انسان سے کبھی اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اللہ کی نعمتوں پر شکر ادا کرے گا، جن کے حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ان کے حقوق کی ادائیگی کی فکر کرے گا، لوگوں سے حسنِ سلوک سے پیش آئے گا کیونکہ تکبر اور گھمنڈ انسان کے اندر بالکل اس سے متضاد اخلاق پیدا کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں انسانیت مجروح ہوتی اور انسانی رشتے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے ناشکروں اور کم ظرفوں کی اللہ کے ہاں کیا پذیرائی ہوسکتی ہے؟ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا یعنی میں ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ اس رویے سے انسان کے اندر چند خصوصیات جنم لیتی ہیں جو انسانیت کیلئے بدنما داغ سے کم نہیں۔ اگلی آیتِ کریمہ میں انہیں کا ذکر فرمایا جارہا ہے۔ اب ہم ایک ترتیب سے انہیں واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ وَیَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ وَیَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّهِیۡنًا ۚ

(جو خود بھی بخل کرتے اور لوگوں کو بھی بخالت کا مشورہ دیتے ہیں اور اللہ نے اپنے فضل میں سے جو کچھ انہیں دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں۔ ہم نے ایسے ناشکروں کیلئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے) (النسآء : ۳۷)

ایک مومن بخیل نہیں ہوتا

ا۔ اکڑنے والے اور تکبر کرنے والوں میں تکبر کے باعث جو مذموم خصوصیات پیدا ہوتی ہیں ان میں پہلی خصوصیت بخل کرنا ہے اسلامی زندگی میں بخل کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دو عادتیں کسی مومن میں جمع نہیں ہوتیں ''بخل اور بد اخلاقی''۔ جس طرح اسلامی معاشرے میں ہر طرح کی بداخلاقی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامی معاشرے میں باہمی تعلقات میں بخل نہایت قابلِ نفرت چیز ہے کیونکہ بخل بجائے خود کوئی بیماری نہیں وہ انسان کے اس بگاڑ کا اظہار ہے جس کی جڑیں اس کے دل و دماغ میں

Marfat.com

ہیں۔ آدمی جب یہ سمجھتا ہے کہ میں نے جو کچھ کمایا ہے یہ میری دماغی صلاحیت اور دست و بازو کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اس لئے بجا طور پر مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں اپنی ذات کے سوا کہیں اور خرچ نہ کروں اور اسے سینت سینت کر رکھوں تاکہ اس میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہے۔ یہ وہ قارونی ذہنیت ہے جس کے پیدا ہو جانے کے بعد اللہ سے تعلق نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے اور اپنی ذاتی صلاحیتوں پر اعتماد بڑھ جاتا ہے۔ یہی اعتماد ہے جو جب تکبر کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو پھر اس کی نگاہوں میں انسانی رشتے قابلِ لحاظ نہیں رہتے۔ وہ اپنی ذات کے گنبد میں ایسا اسیر ہوتا ہے کہ اسے اپنی ذات کے باہر نہ تو کوئی رشتہ نظر آتا ہے نہ کوئی ضرورت نظر آتی ہے، حتی کہ ہمدردی اور خیر خواہی جیسے الفاظ اس کے نزدیک بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اللہ سے مانگنے کا تصور بھی اس کے دل و دماغ سے نکل جاتا ہے۔ اسلام کے تمام تصورات کی اساس توحید ہے۔ جس ذہنیت سے اس بنیادی اساس کو نقصان پہنچتا ہو۔ اس کے بارے میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ کی نگاہ میں کس قدر مبغوض ہوگی۔ ایسی ذہنیت والے آدمی کو آپ اللہ کا نام لے کر یا انسانیت کا نام لے کر کسی بھلائی کیلئے آمادہ نہیں کر سکتے۔ وہ ایک طرف اگر اللہ کی ذات سے کٹ جاتا ہے تو دوسری طرف انسانیت سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ صرف لکشمی دیوی کی پوجا کرتا ہے اور یہ دھن کی محبت اس کی پوری ذات کا اس طرح احاطہ کر لیتی ہے کہ وہ انسانیت کی بڑی سے بڑی ضرورت اور اخلاق کی بڑی سے بڑی قدر کو بھی ہمیشہ درہم و دینار کے ترازو میں تولتا ہے۔ وہ ہر بھلائی کے تصور سے کٹ کر دولت کے تصور سے اس طرح جڑ جاتا ہے کہ معدہ ہی اس کا مطاف ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر معاملے پر جب بھی غور کرے گا دولتِ دنیا کے حوالے سے غور کرے گا۔ اس کی تمام ترجیحات دولت کے کم و بیش ہونے سے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

بخیل کس شخص کو کہتے ہیں؟

لیکن یہ بات ذہن میں رکھئے کہ بخیل اس آدمی کو نہیں کہتے جو اپنی ذات پر خرچ کرنا پسند نہ کرتا ہو بلکہ بخیل اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں تنگ دل ہو اور کسی بھی خیر کے موقعہ پر اس کا ہاتھ کھلنے کی بجائے گردن سے حمائل ہو جاتا ہو۔ اگرچہ اسلام نے دولت اور نعمت کے ہوتے ہوئے اپنی ذات پر بے جا سختی کرنے سے بھی منع کیا ہے۔ جس شخص کو اللہ نے نعمتوں سے نوازا ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے رہن سہن، اپنے لباس اور میل جول سے اس کا اظہار بھی کرے۔ لیکن اگر کوئی آدمی اپنے آپ کو بہت سادہ رکھ کر سب کچھ اللہ کے راستے میں یا اللہ کے بندوں پر خرچ کر دیتا ہے تو اسے بخل نہیں کہتے اور نہ یہ اللہ کے نزدیک مذموم ہے بلکہ اگر اس سے کسی غلط فہمی کا اندیشہ نہ ہو تو اسے محمود ہی کہا جائے گا۔ بالخصوص وہ لوگ جو تختِ اقتدار پر فائز ہوں یا بڑے عہدہ و منصب کے مالک ہوں یا امیر کبیر ہونے کی شہرت رکھتے ہوں تو ایسے لوگوں کی سادگی اور اپنے آپ پر کم سے کم خرچ کرنے کی عادت نہ صرف کہ کوئی برائی نہیں بلکہ اللہ کے نزدیک بھی باعثِ اجر ہے اور بندوں کی نگاہ میں بھی مادہ اور مادی زندگی کو حقیر جاننے کی ایک قابلِ قدر کوشش ہے۔ جس کے اثرات ہمیشہ دیکھنے والوں پر اچھے ہی ثابت ہوتے ہیں۔ خلفائے راشدین کا نہایت سادہ زندگی گزارنا، موٹا جھوٹا کھانا، پیوند زدہ کپڑے پہننا، آج تک ایک قابلِ تعریف عمل کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ ہماری قریبی تاریخ میں آخری نظام حیدرآباد دکن اپنے سیاسی فیصلوں کے علاوہ اپنی اس خوبی کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے کہ انہوں نے بڑی بڑی مساجد اور بڑے بڑے اداروں کو دل کھول کر سرمایہ فراہم کیا لیکن ان کا اپنا لباس اور اپنی ضرورت کی چیزیں ایک عام آدمی کی سطح سے زیادہ نہیں تھیں۔ ہماری قریبی تاریخ میں ایک مشہور سرجن گزرے ہیں جو ڈاکٹر امیر الدین مرحوم کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انہیں ایک دفعہ جب ان کے داماد نے بتایا کہ اگر ایک اے۔ سی (A.C.) بند کر دیا جائے تو کئی غریب گھروں کو بجلی مل سکتی ہے۔ تو وہ اپنی

Marfat.com

کرسی سے اٹھے اور انہوں نے اے۔سی بند کر دیا۔اس کے بعد برسوں زندہ رہے لیکن پھر کبھی اے۔سی نہیں چلایا۔انہیں جب بھی توجہ دلائی جاتی کہ گرمی بہت ہے آپ اے۔سی چلانے کی اجازت دے دیں تو وہ ہمیشہ اپنے داماد کی بات دہراتے۔اس طرح کی بے شمار مثالیں آپ اپنے گردوپیش میں دیکھ سکتے ہیں۔لیکن بخل میں جو چیز نہایت قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ کوئی آدمی دوسروں کے حقوق فیاضی اور کشادہ دلی سے ادا کرتا ہے یا نہیں۔اگر وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ اپنی کوتاہی کے مطابق بخیل کہا جائے گا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عادتِ بد کو مسلمانوں سے دور رکھنے کیلئے بارہا بخل کی مذمت فرمائی۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر صبح کے وقت دو فرشتے نازل ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ کہتا ہے اے اللہ! بھلائی کے راستہ میں خرچ کرنے والے کو اچھا عوض عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے، اے اللہ! بخیل کو تباہی سے ہمکنار کر۔(بخاری ومسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ اسماء رضی اللہ عنہا سے فرمایا: بھلائی کے راستے میں خرچ کیا کرو اور گن گن کر نہ دیا کرو ورنہ اللہ بھی تمہارے حق میں گننا شروع کر دے گا۔

بخل معلوم ہوتا ہے ایک حالت پر اکتفا کرنے والی بیماری نہیں بلکہ اس کی نئی نئی شاخیں پھوٹتی ہیں اور سرطان کی طرح یہ ناسور پھیلتا جاتا ہے۔چنانچہ اس سے جو دوسری برائی جنم لیتی ہے۔

۲۔ اس کے بارے میں قرآنِ کریم نے کہا: وَيَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ”وہ لوگوں کو بخل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں“۔یعنی ان کی عادتِ بد اپنے بخل کی حد تک قناعت نہیں کرتی بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی بخل کریں تاکہ ان کے بخل پر پردہ پڑا رہے۔ایک آدمی جب دوسروں کے حقوق ادا نہیں کرتا تو وہ اپنے عزیزوں اور اپنے ملنے والوں سے بھی چاہتا ہے کہ وہ بھی دوسروں کے حقوق دبائے رکھیں کیونکہ جب اس کے گردوپیش میں ایک ہی طرح کی ذہنیت کے لوگ ہوں گے تو کوئی اس کی طرف انگلی نہیں اٹھائے گا کیونکہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ افراد کے ضمیر تو سو جاتے ہیں اجتماعی زندگی کا ضمیر نہیں مرتا۔ان میں کچھ نہ کچھ ایسے رہتے ہیں جو برائی سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور برائی کرنے والوں کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں۔سخاوت اور بخل کا تعلق چونکہ عام انسانی معاملات سے ہے جس طرح سخاوت نیک نامی کا باعث بنتی ہے اسی طرح بخل سے بدنامی پھیلتی ہے اور کبھی نہ کبھی بخیل کو اس بدنامی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔اس لئے بخیل کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے گردوپیش میں رہنے والے لوگوں میں اپنی ذہنیت پیدا کر دے تاکہ اسے کبھی اس صورتحال سے واسطہ پڑے۔یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کا تعلق عموماً ان لوگوں سے ہے جنہیں مال و دولت سے اس حد تک محبت ہو جاتی ہے کہ باقی تمام وابستگیاں اور محبتیں انسانی رشتے اور اخلاقی قدریں ان کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں۔لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مال و دولت کی محبت کے ساتھ ساتھ بعض خانہ ساز قسم کے نظریات یا باطل قوتوں کے ساتھ دل و دماغ کے ایسے رشتے وابستہ ہو جاتے ہیں کہ پھر آدمی مال و دولت کے ساتھ ساتھ ان رشتوں اور وابستگیوں کے حوالے سے بھی دیکھتا ہے۔چنانچہ اس کی سب سے واضح مثال قرآنِ کریم میں منافقین کا وہ رویہ ہے جس کا ذکر پروردگار نے ”سورۃ المنافقون“ میں فرمایا ہے۔ایک غزوہ میں حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے ملازم اور ایک انصاری کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا دونوں نے اپنے اپنے حمائیتیوں کو پکارا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بروقت پہنچ گئے اور لڑائی کا خطرہ ٹل گیا۔آپ نے اس پر برہمی کا اظہار فرمایا اور اصلاح کے لئے نصیحتیں فرمائیں۔لیکن منافقین جو اس غزوہ میں مسلمانوں کے ساتھ تھے ان کے رئیس عبداللہ بن ابی کو جیسے ہی ان کے ساتھ تخلیہ میں بیٹھنے کا موقعہ ملا تو اس نے کہا یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔تم نے ان مہاجرین کو اپنے یہاں

Marfat.com

ی اواپنے گھران کے لئے کھول دیئے، اب وہ تمہیں ہی آنکھیں دکھانے لگے ہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ کتے کو کھلاؤ پلاؤ کہ وہ تمہیں پر بھونکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اس یاوہ گوئی کی اطلاع دی گئی۔ آپ نے اسے بلا کر پوچھا تو صاف مکر گیا۔ "سورۃ المنافقون" نے نازل ہوکران کا سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ چنانچہ جو کچھ انہوں نے کہا ان میں سے ایک بات کا قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا:

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا

(یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو لوگ ہیں ان پر مت خرچ کرو تا کہ یہ لوگ چلتے بنیں۔)

ان الفاظ پر غور کیجئے! یہ ایک اجتماعی بخل کی مثال ہے اور جس کے پیچھے صرف مال و دولت کی محبت کارفرما نہیں بلکہ منافقت کے جذبات، باطل سے گہرا تعلق اور اسلام دشمنی بھی اپنا کام دکھا رہی ہے۔ یہ بخل کی بدترین مثال ہے اس کے آئینہ میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بخل کا حکم دینا یا بخل کا مشورہ دینا کسے کہتے ہیں ورنہ آدمی یہ الفاظ پڑھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ لوگ اپنے مال و دولت کے معاملے میں بخیل ہوتے ہیں لیکن وہ دوسروں کو اس کا حکم دیتے ہیں یا مشورہ دیتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس مثال سے اسے بڑی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ہمارے اپنے ملک میں ہماری قریبی تاریخ میں اس کی مثالیں موجود رہی ہیں۔ روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو تیس لاکھ کے قریب مہاجرین ہمارے ملک میں آ گئے۔ انہوں نے ایک اسلامی ملک میں اپنی جانیں اور عزتیں بچانے کیلئے پناہ لی۔ اہلِ پاکستان کیلئے لازم ہو گیا کہ وہ ان مہاجرین کیلئے انصار کا کردار ادا کریں۔ لیکن آپ اخباروں کے فائل اٹھا کر دیکھیں آپ کو ایسے مضامین کی بڑی تعداد ملے گی جس میں ان مہاجرین پر خرچ کرنے سے روکا گیا ہے اور بار بار ملکی وسائل کی کمی کا حوالہ دیا گیا ہے حالانکہ اصل حقیقت بائیں بازو سے تعلق لادینی قوتوں کی آشیرباد اور اسلامی اخوت سے دشمنی تھی۔ اس لئے کیسے کیسے دانشور اپنی حکومت کو بخل کے مشورے دے رہے تھے۔

گزشتہ دو سال سے امریکہ نے اسلامی ملکوں میں جو حالات پیدا کر دیئے ہیں اور جس نے دو مسلمان ملکوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے اسلامی رشتے کے حوالے سے ہمارا فرض تو یہ تھا کہ ہم اسلام کے رشتے سے ہر طرح کے مہاجرین کو اپنے ملک میں پناہ دیتے ان کی جانیں اور عزتیں بچاتے اور ان کیلئے انصار ہونے کا ثبوت دیتے۔ لیکن اس کے برعکس ہو یہ رہا ہے کہ نہ صرف کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے جانی دشمن بن گئے ہیں بلکہ جہاں جہاں بھی خیر کے مراکز ہیں جہاں سے اسلام کو کسی طرح بھی سپورٹ (Support) مل رہی ہے، ہمیں باہر اور اندر سے یہ مشورے دیئے جا رہے ہیں کہ آپ ایسے تمام مراکز اور اداروں کی مدد سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں اور اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو آپ کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ میں حیران ہوں کہ قرآنِ کریم کے یہ الفاظ جو کل تک ہمارے لئے ناقابلِ فہم تھے آج ایک حقیقت بن کر ہمارے سامنے ہیں۔ منافقت نے آج تک کبھی اتنی صراحت اور جرأت کے ساتھ گھونگھٹ نہیں الٹا ہوگا۔ ایک عرصہ دراز سے غیر مسلم قوتیں مسلمانوں کے ساتھ منافقت کا کھیل کھیل رہی تھیں اور خود مسلمانوں کے اندر چھپے ہوئے منافق پانچویں کالم کا کردار ادا کر رہے تھے۔ لیکن اب انہوں نے براہِ راست مسلمانوں کی زندگی کے سرچشموں پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم تعلیمی اداروں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے امتِ مسلمہ کی اکثریت کو اصل مقصد اور اصل اہداف سے دور کر چکے ہیں۔ لیکن ایک محدود اقلیت ابھی تک دینی مدارس میں پڑھ رہی ہے اور ابھی مسلمانوں میں اس کے اثرات باقی ہیں۔ ان کی مساجد کو وہیں سے کارکن میسر آتے ہیں۔ ان کی دینی زندگی کی راہنمائی وہیں سے ہوتی ہے۔ وہاں سے نکلنے والے اپنی دنیا برباد کر کے دین کی آبادی کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ انہیں کے دم سے نوجوانوں میں روحِ محمدؐ باقی ہے اور انہیں کی وجہ سے غیرت

Marfat.com

دینی کو ابھی تک ختم نہیں کیا جاسکا۔ ایک طرف تو دہشت گردی کا لیبل لگا کر ان پر ہاتھ ڈالنے کا راستہ نکالا اور دوسری طرف علمِ دین کے سرچشموں کو خشک کرنے کیلئے دولت مندوں کو حکم دیا کہ ان اداروں کو امداد دینا بند کردیں۔ ملک میں اگر کپڑے کی قلت پیدا کرنی ہو تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ کپڑا جلانا شروع کردیا جائے بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں جہاں بھی کپڑے کی صنعت اور کپڑے کا خام مال دستیاب ہوتا ہے اسے برباد کردو۔ دینی مدارس علمِ دین کی فیکٹریاں ہیں، یہاں سے علمِ دین بھی پروڈیوس Produce ہوتا ہے اور رجالِ دین بھی۔ اگر انہیں وسائل سے تہی دامن کردیا جائے تو یہ خود بخود بند ہوجائیں گی اور رفتہ رفتہ نتیجہ یہ ہوگا کہ دین کے پڑھنے پڑھانے والے ختم ہوجائیں گے۔ کاش! ہمیں اندازہ ہوتا کہ یہ کتنا بڑا خطرناک اقدام ہے جو غیر مسلم قوتوں اور اپنے ملک کے منافقین کی طرف سے ہو رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے صفہ کا ایک چبوترا بنایا جس میں رات دن قران وسنت کا علم حاصل کرنے والے پڑے رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاں ان کی تربیت فرماتے تھے وہیں ان کی ساری ضروریات کے کفیل بھی تھے۔ پہلے آپ ان کی ضروریات کا انتظام فرماتے بعد میں اپنے گھر کی خبر لیتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں ان لوگوں کی کس قدر اہمیت تھی اور آپ کے دل میں ان کے لئے کس قدر شفقت تھی اس کا اندازہ آپ اس سے کرلیجئے کہ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے اس حال میں لیٹ گئے کہ بھوک کی وجہ سے آپ کو نیند نہیں آرہی تھی اور ہمارا حال بھی ابتر تھا۔ اتنے میں ایک شخص دودھ کا ایک بڑا پیالہ لے کر آیا مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب حضور مجھے بھی اس میں سے حصہ عطا فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے مجھے ہی حکم دیا کہ جاؤ جا کر تمام اصحابِ صفہ کو بلا لاؤ۔ اس وقت ان کی تعداد ستر کے قریب تھی۔ وہ سب آگئے تو مجھے خیال ہوا کہ شاید حضور سب سے پہلے مجھے ہی پینے کا حکم دیں۔ لیکن اس وقت تو میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی جب آپ نے فرمایا کہ ابو ہریرہ ان سب کو باری باری پلاؤ۔ میں نے ان کو پلانا شروع کیا تو ستر افراد ایک ایک کرکے سیر ہو کر پی گئے لیکن پیالہ ویسے کا ویسے بھرا رہا۔ اب حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کہ ابو ہریرہ تم پیو، میں نے سیر ہو کر پیا۔ حضورؐ نے پھر حکم دیا اور پیو، میں نے اور پیا۔ آپ نے مزید پینے کیلئے فرمایا لیکن اب میرے پیٹ میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس کے بعد حضورؐ نے پیا تو پیالہ خالی ہوگیا۔ اندازہ فرمایئے! جن لوگوں کا بچا ہوا اور جھوٹا سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پیتے ہیں اب انہیں کے راستے پر چلنے والوں اور انہیں کی سنت زندہ کرنے والوں کے لئے احکام جاری کئے جارہے ہیں کہ ان کا ناطقہ بند کردو، ان کے ذرائع کی تلاشی لو۔ مقصود صرف یہ ہے کہ علم کے سوتے خشک ہوجائیں۔ یہ بخل کا حکم دینے کی بدترین مثال ہے۔

وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰـهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (اور اللہ نے اپنے فضل میں سے انہیں جو کچھ دے رکھا ہے اسے چھپاتے ہیں)

۳۔ یہ ان متکبروں اور خود پسندوں میں پیدا ہونے والی تیسری بری خصوصیت ہے جو درحقیقت بخل ہی کی ایک صورت ہے کہ ایسے لوگ جب لوگوں کے حقوق کی ادائیگی میں بخل سے کام لیتے ہیں اور اپنی بدنامی سے بچنے کیلئے دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ گردوپیش میں کوئی ان کو ملامت کرنے والا نہ رہے۔ لیکن آخری کوشش ان کی یہ ہوتی ہے کہ ان کی دولت کی خبر کسی شخص تک نہ پہنچنے پائے۔ لوگ انہیں ایک دولت مند آدمی ضرور سمجھیں تاکہ ان کا ایک رعب بھی باقی رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کا بھی یقین رکھیں کہ یہ شخص سب کچھ رکھتا ہوا بھی اس قدر مجبور ہے کہ کسی دوسرے کی مدد کرنے کے قابل نہیں کیونکہ ایسے لوگ ہر ملنے جلنے والے اور ہر مدد کے خواہش مند کے سامنے اپنے وسیع اخراجات، کاروبار میں نقصانات، اپنی پھیلی ہوئی ذمہ داریوں اور سائلوں کی کثرت کا اس طرح دکھڑا روتے ہیں کہ سننے والا سمجھنے لگتا ہے کہ یہ شخص ہے تو بڑا دریا دل اور بڑا فیاض لیکن ذمہ داریوں کے بوجھ نے اس کا ہاتھ روک رکھا ہے چونکہ اس کے پاس بچتا کچھ

Marfat.com

اس لئے وہ کسی کی مدد کرنے کے قابل نہیں۔

اپنے مال و دولت کو چھپانا بعض لوگوں کے یہاں ایک اور طریقے سے بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، لباس، سواری اور گھر رکھنے کے معاملے میں اس طرح کا رویہ اختیار رکھتے ہیں کہ دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ نہایت خستہ حال لوگ ہیں وہ نہ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کریں گے، نہ لوگوں کی مدد کریں گے، نہ نیک کاموں میں حصہ لیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کو بھی تنبیہ فرمائی۔ آپ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَنْعَمَ نِعْمَةً عَلٰى عَبْدِهٖ اَحَبَّ اَنْ يَّظْهَرَ اَثَرُهَا (اللہ جب کسی بندے کو نعمت دیتا ہے تو وہ پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کا اثر بندے پر ظاہر ہو)۔ یعنی اس کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس اور مسکن اور اس کی داد و دہش ہر چیز سے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا اظہار ہو۔

وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا (ایسے کافروں کیلئے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے)

ایسے بخیل لوگ جو خود بھی اپنے خزانے پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں اور دوسروں کو بھی بخل کی تلقین کریں اور اپنی دولت کو ہوا تک نہ لگنے دیں قیامت کے دن ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس لئے رسوا کن عذاب دیں گے کیونکہ انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی قدر نہ پہچانی اس کے شکر گزار بندے بننے کی بجائے اترانے والے اور تکبر کرنے والے بنے۔ انہوں نے اپنی دولت سے عیاشیاں کیں لیکن انسانیت ان کے سامنے ذلیل ہوتی رہی۔ اب ان کی سزا صرف عذاب ہی نہیں بلکہ رسوائی بھی ہونی چاہئے تاکہ یہ پوری طرح اپنے انجام کو پہنچیں۔

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ
وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ○

(اور وہ لوگ جو اپنے مال لوگوں کو دکھانے کیلئے خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جس کا ساتھی شیطان بن جائے وہ نہایت برا ساتھی ہے) (النسآء : ۳۸)

۴۔ ان متکبروں کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندوں پر، اللہ کے راستے میں اور خیر اور بھلائی کے کسی کام کیلئے تو ایک دمڑی خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے لیکن ایسی جگہوں اور ایسے کاموں میں دل کھول کر خرچ کرتے ہیں جہاں لوگ دیکھیں ان کے نام کا چرچا ہو ان کی شہرت پھیلے اور لوگ تعریفیں کریں کہ فلاں آدمی کا کیا کہنا وہ تو بہت فیاض آدمی ہے۔ وہ تو اجتماعی کاموں کیلئے بڑھ چڑھ کر خرچ کرتا ہے۔ حکومت کسی کام کیلئے اگر امرا کو دعوت دیتی ہے کہ اس میں حکومت کی مدد کرے یا کسی ادارے کو قائم کرنے کیلئے حکومت کوئی سکیم منظور کرتی ہے یا کوئی وقتی آفت آنے پر حکومت کی طرف سے اپیلیں ہوتی ہیں تو یہ لوگ دوسروں سے آگے بڑھ کر حکمرانوں کے ساتھ تصویریں کھنچوائیں گے، وہاں بڑی بڑی رقموں کا اعلان کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ پوری کوشش کریں گے کہ ان کا یہ اعلان قومی ذرائع ابلاغ کے ذریعے لوگوں تک پہنچ جائے تاکہ ان کی نیک نامی ہو اور حکومت کے بڑے بڑے لوگوں کے بھی علم میں آ جائے تاکہ ان کی نگاہوں میں ان کی عزت پیدا ہو۔ جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اس سے مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی رائے اپنے حق میں ہموار کریں اور ساتھ ہی ساتھ حکمرانوں کی نگاہوں میں بھی اپنا ایک مقام پیدا کریں۔ لوگوں کی رائے بدلنے کا فائدہ الیکشن کی

Marfat.com

صورت میں نکلتا ہے۔لوگ ان کی ان نیک نامیوں کے باعث انہیں ووٹ دیتے ہیں اور یہ انہیں چندوں اور فیاضیوں کی وجہ سے اسمبلیوں میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں جا کر مختلف ذرائع سے وہ ساری کی پوری کرتے ہیں جو آج تک ان کی فیاضیوں کے نتیجے میں ان کی دولت میں واقع ہوئی ہے اور حکمرانوں کا اعتبار حاصل کر کے ان سے مصنوعی اداروں کیلئے فنڈز منظور کرواتے ہیں اور ایسی ایسی مراعات حاصل کرتے ہیں جس سے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے میں انہیں مدد ملتی ہے۔قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ یہ لوگ سب کچھ محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اللہ پر ایمان کا دعویٰ تو رکھتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کے دلوں میں ایمان نہیں۔وہ آخرت کا اقرار بھی کرتے ہیں لیکن انہیں ہرگز یقین نہیں کہ آخرت واقع ہوگی اور اس دن اپنے تمام اعمال کا جواب دینا پڑے گا۔اللہ پر اس طرح کا ایمان کہ وہ آدمی کے ہر عمل کو دیکھتا ہے اس کی نیت کو جانتا ہے اس کے ارادوں سے واقف ہے، وہ ہر حال میں اس کا نگران ہے، کوئی کام ہزار تنہائیوں میں کیا جائے وہ اس سے بھی واقف ہے۔مزید یہ کہ اللہ کی قدرت بے پناہ ہے ہر چیز اس کے قبضے میں ہے، رزق کے خزانے بھی اسی کے پاس ہیں، وہ جسے چاہے خوشحالی دیتا ہے اور جسے چاہے بدحالی میں مبتلا کر دیتا ہے، لیکن یہ خوشحالی اور بدحالی اس کی طرف سے بندے کی آزمائش ہے کہ وہ خوشحالی میں شکر گزار ہوتا ہے یا نہیں اور بدحالی میں صبر کرتا ہے یا نہیں اور ساتھ اس بات کا یقین رکھتا ہے یا نہیں کہ رزق میں فراخی اور تنگی سراسر اللہ کے ہاتھ میں ہے اس لئے مجھے ہمیشہ اسی کے سامنے دستِ سوال پھیلانا چاہئے۔اور دوسرا اس بات کا یقین اور ایمان کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں میرا ایک ایک عمل محفوظ کیا جا رہا ہے، میرے دونوں کندھوں پر دو لکھنے والے بیٹھے ہیں جو نہایت دیانت داری اور احتیاط کے ساتھ میرے اعمال کو منضبط کر رہے ہیں۔قیامت کا دن آئے گا جب مجھ سے میرے ایک ایک عمل کا حساب مانگا جائے گا۔مجھ سے پوچھا جائے گا تم نے دولت کیسے کمائی اور کہاں خرچ کی؟ یہ ایمان کے دو پہلو ہیں جو انسان کو راہِ راست پر رکھتے ہیں۔جس آدمی کو یقین ہو کہ میں اللہ کی نگاہوں میں ہوں وہ سرکشی کیسے کر سکتا ہے؟ اور جسے ایمان ہو کہ ایک نہ ایک دن مجھے اپنے اعمال کی جواب دہی بھی کرنی ہے وہ اعمال کے بارے میں بے فکر اور لا پرواہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنی دولت کو برے کاموں میں یا دکھاوے کیلئے خرچ کر سکتا ہے؟ دکھاوے کیلئے تو عبادت بھی کی جائے تو شرک بن جاتی ہے چہ جائیکہ عام عمل اللہ کی رضا جوئی کے بجائے لوگوں کو خوش کرنے کیلئے کیا جائے۔چنانچہ جو لوگ ایمان کے ان دونوں پہلوؤں سے محروم ہو جاتے ہیں ان کی سوچ میں نہایت خطرناک تبدیلی آتی ہے۔وہ پھر اسی دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں ان کے نزدیک اسی دنیا کی خوشیاں اصل خوشیاں ہیں اور اسی کے غم حقیقی غم ہیں۔جو آدمی اللہ پر ایمان کھو دیتا ہے اور دولت اور اقتدار کو سب سے بڑی قوت سمجھتا ہے اور آخرت میں جواب دہی کے احساس سے بے نیاز ہو جاتا ہے اس کی دولت اللہ اور اس کے بندوں کی دولت نہیں بلکہ شیطان کی دولت بن جاتی ہے وہ مختلف سکیموں کے ذریعے دولت بھی کمائے گا اور سود کی لعنت بھی عام کرے گا۔وہ مختلف اداروں پر خرچ کرے گا لیکن وہاں کسی خیر کا گزر نہیں ہوگا۔وہاں ہر برائی اور ہر بے حیائی کو فروغ ملے گا۔ہر وہ کام کرے گا جس سے اس کی دولت بڑھے اور اس کے ساتھ ساتھ شیطنت بھی پھیلے۔اب اس کی خواہشات کی باگ دوڑ شیطان کے ہاتھ میں ہوگی۔وہ جس راستے کی اسے ترغیب دے گا وہ ادھر چلے گا۔اس کی مثال اس سوار کی ہوگی جو اپنے گھوڑے کے قابو میں آچکا ہو اور لگام اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکی ہو۔اب گھوڑا اسے کھینچے پھرے گا۔کچھ خبر نہیں کہ وہ اسے کس کھائی میں پھینکتا ہے۔گھوڑا ایک جانور ہے جو اپنے مالک کو بے

Marfat.com

بھی سکتا ہے اور مار بھی سکتا ہے۔اس میں اگر بہیمیت کی وجہ سے نقصان رسانی کے پہلو ہیں تو اپنے مالک سے وفاداری کی وجہ سے بہتر امید بھی کی جاسکتی ہے۔لیکن جو شخص شیطان کو اپنا دوست بنالے اور وہ ہر کام میں شیطان کی راہنمائی کو قبول کرلے اور شیطان کی انگیخت کو ہی اپنے نفس کا مطالبہ سمجھ بیٹھے اور اسی کے مطابق زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلے تو ایسے شخص کی تباہی کے بارے میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کیونکہ شیطان ازل سے انسان کا دشمن ہے اس نے جنت میں حضرتِ آدم علیہ السلام سے دشمنی کی حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا ان کی برتری کو تسلیم نہ کرنے کے باعث اسے راندۂ درگاہ قرار دیا گیا اور ذلت سے اسے وہاں سے نکلنا پڑا۔اس نے آدم کی اولاد سے اس کا انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا اور پھر اس نے اپنے اس ارادے کو چھپایا نہیں بلکہ اللہ کے سامنے اس کا اظہار بھی کیا اس لئے قرآنِ کریم نے انسانوں کو اس سے باخبر کرتے ہوئے بتایا: اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (یہ شیطان تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے)۔ایسا خطرناک دشمن جس کا ساتھی بن جائے وہ یقیناً اسے کسی ایک کھائی میں نہیں بلکہ زندگی کی ہر کھائی میں پھینکے گا اور جب تک اسے تباہ و برباد نہ کردے اسے چین نہیں آئے گا کیونکہ شیطان کی جو خصوصیات اور اس کے عزائم ہمیں قرآن وسنت سے معلوم ہوتے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو وہ شیطان ہے جس کا نام ابلیس ہے اور ایک شیطانوں کی فوج ہے جو اس کی کمانڈ میں کام کرتی ہے اور جس کے سپاہی جنات میں سے بھی ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔یہ اس کا تمام لاؤ لشکر نہایت مستعدی کے ساتھ جن وانس کو بگاڑنے میں لگا رہتا ہے۔اس کی چالیں اور گھاتیں اس قدر گہری اور اس قدر پراسرار ہیں کہ عام انسانوں کیلئے اس کا سمجھنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔وہ برائی کو برائی کی صورت میں اور برائی کا نام دے کر بہت کم متعارف کراتا ہے۔بالخصوص ان لوگوں میں جو نیک ہونے کے باعث برائی کے نام سے چڑتے ہیں ان کیلئے تو ایسے خوبصورت قالب اور ٹائٹل کے ساتھ برائی کو پیش کرتا ہے کہ اس پر نیکی کا گمان ہوتا ہے اور پھر اس کام پر اس کی پوری فوج اس دیانت،اخلاص اور مستعدی سے کام کرتی ہے کہ انسانوں میں اس کا تصور بہت کم ہے۔اس کے اور نیک لوگوں کے مقابلے کو دیکھتے ہوئے بعض دفعہ کچھوے اور خرگوش کی کہانی یاد آتی ہے،جو سکولوں میں بچوں کو پڑھائی جاتی ہے کہ دونوں نے آپس میں ریس لگائی۔خرگوش یہ سوچ کر بے فکری سے سو گیا کہ میں چونکہ انتہائی تیز رفتار ہوں جب اٹھوں گا چھلانگتا پھلانگتا اس سے آگے نکل جاؤں گا اور کچھوا اپنی سست رفتاری کو محسوس کرکے مسلسل چلتا رہا۔نتیجہ یہ ہوا کہ خرگوش اس وقت نیند سے جاگا جب کچھوا منزل پر پہنچ چکا تھا۔اس کا حد سے بڑھا ہوا اعتماد اور اپنے مقصد سے لاپرواہی اور بے نیازی اسے لے بیٹھی۔اسلامی اور شیطانی قوتوں کے مقابلے کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیطانی قوتیں خرگوش کی مانند ہیں اور اسلامی قوتیں کچھوے کی طرح ہیں اور تشویشناک بات یہ ہے کہ کچھوا سو رہا ہے اور خرگوش جاگ رہا ہے۔اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ جس کا دوست شیطان بن جائے اس کی دین سے بیزاری اور لادینیت سے محبت ہر خیر کے کام سے نفرت اور ہر شر کی طرف رغبت کا عالم کیا ہوگا؟یوں تو جو بھی شخص اللہ کے ذکر اور اس کی بندگی سے اعراض کرتا ہے،پروردگار فرماتے ہیں:ہم اس پر ایک شیطان مسلط کردیتے ہیں لیکن جو لوگ اپنا مال و دولت اللہ کے راستے میں اور اللہ کے بندوں پر خرچ کرنے کی بجائے اسراف اور تبذیر میں اڑاتے ہیں اور لوگوں کے دکھلاوے کیلئے خرچ کرتے ہیں ایسے تبذیر کرنے والوں کو تو قرآنِ کریم نے شیطان کا بھائی قرار دیا ہے۔یہاں ایسے ہی لوگوں کو قرین اور دوست ٹھہرایا گیا ہے اور ساتھ ہی فرمایا جس شخص کا دوست شیطان بن جائے وہ نہایت برا دوست ہے۔

Marfat.com

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا o اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ
حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا o

(اور کیا نقصان تھا ان کا اگر ایمان لاتے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور اللہ نے ان کو جو کچھ عطا کر رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے اور اللہ تو ان سے اچھی طرح باخبر ہے o اللہ ذرا بھی کسی کی حق تلفی نہیں کرتا اگر ایک نیکی ہو تو اس کو کئی گناہ بڑھا دیتا ہے اور خاص اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا فرماتا ہے) (النسآء : ۳۹ تا ۴۰)

متکبروں، بخیلوں، تنگ دلوں اور دکھاوے کیلئے خرچ کرنے والوں پر پوری طرح بات کھول دینے اور ان کو آخری تنبیہ کردینے کے بعد اسلوبِ کلام بدل گیا ہے۔ ان لوگوں کو عذاب کی دھمکی اور سرزنش کے بعد بھی اپنی بدنصیبی کا احساس نہیں ہوا اور وہ اپنی حالت بدلنے پر تیار نہیں تو لہجہ بدل کر فرمایا کہ نادانو تم اس ایک پہلو پر بھی غور کر کے دیکھو کہ ایمان سے محرومی اور انفاق سے کوتاہی نے تمہارے سیرت و کردار میں جو کانٹے بوئے ہیں اور تمہارے باہمی تعلقات میں جو ڈائنامیٹ بچھ گئے ہیں کہ تمہاری سماجی اور معاشرتی زندگی کھیل کھیل ہو کر رہ گئی ہے اور تم خود اپنی پیدا کردہ قیامت کا سامنا کر رہے ہو۔ کاش! تم اپنی اس حالت پر غور کرتے اور تم اپنی حالت کو بدلنے پر آمادہ ہوتے اور اس بے ایمانی کے رویے کو ترک کر کے تم ایمان کی روش اختیار کرتے اور اللہ کے راستے میں انفاق کا فیصلہ کرتے تو ذرا سوچو تمہارا کیا بگڑ جاتا۔ تم نے اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھودی ہے اور خود اپنے لئے مشکلات پیدا کی ہیں۔ تم نے ہرگز نہیں سوچا کہ ایمان کے مقابلے میں بے ایمانی، یقین کے مقابلے میں بے یقینی، انفاق کے مقابلے میں بخل، آخر تمہیں اور معاشرے کو کیا دے سکتے ہیں۔ اگر تم ایمان لے آتے تمہارے اندر کی بے اطمینانی نکل جاتی، تمہارے معاشرے میں یکسانی اور یکسوئی پیدا ہوتی، تم روشنی کے مسافر ہوتے، تمہیں اپنی منزل کا یقین ہوتا۔ اندازہ کرو! اس سے تمہاری سوچ اور زندگی کے عمل میں کتنی خوبصورت تبدیلی واقع ہوتی اور پھر تم اگر بخل کی بجائے انفاق کا راستہ اختیار کرتے اور یہ سوچتے کہ میں جو بھی خرچ کر رہا ہوں وہ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کر رہا ہوں کیونکہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ کی دین اور اس کی امانت ہے۔ میں نے اگر دولت کے حصول میں محنت کی ہے تو محنت کا جذبہ بھی اسی کی عطا ہے اور اگر میں نے صلاحیت سے کام لیا ہے تو صلاحیت بھی تو اسی کی بخشی ہوئی ہے۔ جن عوامل نے میری دولت بڑھانے میں کردار ادا کیا ہے ان میں سے کوئی سی چیز بھی اللہ کے علم اور اس کی گرفت سے باہر نہیں۔ جب میں ان احساسات کے ساتھ اس کے راستے میں خرچ کروں گا اور یہ سمجھ کر خرچ کروں گا کہ اللہ میرے ایک ایک عمل سے باخبر ہے اس کا علم بے حد و بے نہایت ہے۔ اس کی نگاہ سے کوئی چیز مخفی نہیں، وہ میری نیت سے بھی واقف ہے، اور اس کا کرم یہ ہے کہ وہ اپنے راستے پر خرچ کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ نوازتا ہے۔ میں اگر ایک پائی خرچ کروں تو وہ نجانے اس کے بدلے میں مجھے کیا کچھ عطا کر دے کیونکہ اس کا ارشاد یہ ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا) کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ حق تلفی نہ کرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ جتنا کسی نے خرچ کیا ہے اور جتنے اخلاص سے کیا ہے اتنا اسے واپس کر دے۔ لیکن اس کے کرم اور فضل کا عالم تو یہ ہے کہ وہ

Marfat.com

فرماتا ہے: وَاِنْ تَکُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا (اگر ایک نیکی ہوتو وہ اس کو دوگنا چوگنا کر دیتا ہے اور پھر اپنی طرف سے اجرِ عظیم عطا فرماتا ہے) کسی نیکی پر دس گنا اجر دینا تو اس کا عام معمول ہے۔ لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے اعمال بھی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ بیس لاکھ گنا اجر عطا فرماتے ہیں۔ نیکی میں جیسے جیسے اخلاص بڑھتا جاتا ہے اللہ پر اعتماد اور یقین میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اللہ کی طرف سے نیکی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہم چونکہ انہیں محض آخرت کی باتیں سمجھتے ہیں اور یہ خیال نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں تو دے گا ہی کیونکہ وہی حقیقت میں دارالجزا ہے۔ لیکن بعض دفعہ وہ دنیا میں بھی اسی طرح عطا کرتا ہے۔ سیالکوٹ کے ایک مخلص اور مخیر دوست جن کا وسیع کاروبار ہے انہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے جب اپنا کاروبار شروع کیا تو میں نے اپنے اللہ سے وعدہ کیا کہ یا اللہ! میں اپنے کاروبار میں سود کا مال شامل نہیں ہونے دوں گا۔ سود پر قرض نہیں لوں گا اپنی فیکٹریوں میں کوئی ناجائز کام نہیں ہونے دوں گا۔ آپ میرے کاروبار میں برکت عطا فرمائیں۔ شریعت کی پابندی کرنا اور حرام مال سے اجتناب کرنا اور حلال طریقوں پر چلنا یہ میری ذمہ داری ہے اور کاروبار میں برکت دینا یہ آپ کی عطا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چند سالوں تک تو اللہ تعالیٰ نے خوب میرے اخلاص کا امتحان لیا اور خوب مجھے جھٹکے دیئے لیکن میں نے جب اپنے وعدے پر استقامت دکھائی اور مسلسل اپنے پروردگار سے مانگتا رہا تو آج نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ پروردگار نے مجھے اتنا عطا فرمایا ہے کہ میں کبھی اس حد تک سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ میرا جتنا کاروبار ہے اس میں بینک کا کوئی حصہ نہیں۔ جبکہ بیشتر کاروبار کرنے والے بینکوں کے سودی سرمائے سے کاروبار کرتے ہیں۔ اسی طرح کی سینکڑوں مثالیں آپ کو اپنے گردوپیش میں ملیں گی۔ لیکن ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہم اللہ کے وعدوں پر اعتبار نہیں کرتے۔ ہم قرآنِ کریم کو پڑھتے ضرور ہیں لیکن اس کی ہر بات ہمارے دل میں یقین پیدا نہیں کرتی۔ صحابہ میں اور ہم میں یہی فرق ہے کہ وہ جس حکم کو سنتے تھے اس پر یقین لاتے تھے پھر عمل کیلئے کمربستہ ہو جاتے تھے، بالآخر اپنا سب کچھ اس پر قربان کر دیتے تھے۔ حضرت ابوالدحداح ؓ ایک صحابی ہیں۔ انہوں نے سنا کہ قرآنِ کریم کی ایک آیت اتری ہے۔ جس میں پروردگار نے فرمایا ہے کہ جو اللہ کو قرض دے گا اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس کرے گا۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کیا حضور میں نے سنا ہے اللہ نے قرض مانگا ہے اور پھر اس پر اجرِ کبیر دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ تم نے ٹھیک سنا، انہوں نے کہا حضور اپنا ہاتھ بڑھایئے، آپ نے ہاتھ آگے بڑھایا تو صحابی نے حضور کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا: حضور میرے دو باغ ہیں ایک زیادہ قیمتی ہے اسی میں میری رہائش ہے۔ آپ گواہ رہیں میں نے وہ باغ اپنی رہائش سمیت اللہ کو قرض دے دیا۔ پھر وہاں سے اٹھے اور باغ کے کنارے کھڑے ہو کر اپنی بیوی ام الدحداح کو آواز دی کہ بچوں کو لے کر باہر آ جاؤ۔ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ ایسی کیا بات ہے؟ آپ اندر تشریف کیوں نہیں لا رہے؟ انہوں نے کہا: میں نے یہ باغ اللہ کو قرض دے دیا ہے۔ بیوی بھی صحابیہ تھیں اور رسولِ پاک کی تربیت یافتہ۔ سن کر کہنے لگیں ابوالدحداح مبارک ہو آپ نے بہت اچھا سودا کیا۔ یہی وہ انفاق ہے جو سچے ایمان کا نتیجہ ہے کیونکہ جب تک اللہ پر ایمان نہ ہو کہ رزق کے خزانے اسی کے ہاتھ میں ہیں وہ جب چاہتا ہے رزق میں کشادگی پیدا کرتا ہے اور جب چاہتا ہے تنگی پیدا کر دیتا ہے۔ وہ چاہے تو غریب کو دولت مند اور بے کس کو تخت و تاج کا مالک بنا دے اور جب چاہے قارون جیسے دولت مند کو اس کے خزانوں سمیت زمین میں غرق کر دے۔ اس وقت تک اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کیا جا سکتا لیکن ایسا ایمان نصیب ہو جانے کے بعد جب اسے انفاق کیلئے کہا جاتا ہے تو فوراً ایمان اس کے اندر سے بولتا ہے کہ یہ میرا مال و دولت اللہ کی ہی عطا ہے۔ میں جتنا اس کے راستے میں خرچ کروں گا اس کا وعدہ ہے کہ اتنا ہی

Marfat.com

اس میں اضافہ کرے گا۔ وہ یہ اضافہ دنیا میں بھی کرتا ہے اور آخرت میں بھی کرے گا۔ یہ سوچ اس کے ہاتھ کو رکنے نہیں دیتی۔ اس کے کانوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ گونجنے لگتے ہیں بلال اللہ کے راستے میں خرچ کر اور اس سے تنگی کا شکوہ نہ کر۔ اور یہ بھی کہ لوگو! اگر اللہ کے راستے میں گن گن کر دو گے تو وہ بھی تمہیں گن گن کر دے گا، بے حساب دو گے تو وہ بھی بے حساب دے گا۔ اس آیت کا آخری جملہ ایک مومن کی سرخوشی کیلئے ایسا مژدۂ جاں فزا ہے جس پر جتنا بھی اظہارِ مسرت کیا جائے تھوڑا ہے۔ ارشاد فرمایا: وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا (وہ اپنی طرف سے اجرِ عظیم عطا فرماتا ہے) سوال یہ ہے کہ یہ اجرِ عظیم کیا ہے؟ لفظی معنی تو ہے بڑا اجر لیکن بڑے اجر یا بڑے معاوضے کا کوئی ایک پیمانہ نہیں۔ اس پیمانے کا دارومدار اس کے کہنے والے پر ہے۔ اگر ایک چھوٹا آدمی یہ کہتا ہے کہ میں تمہیں بہت بڑا معاوضہ دوں گا تو ظاہر ہے وہ اپنی حیثیت کے مطابق دے گا۔ لیکن جب ایک بڑا آدمی کوئی نواب یا بادشاہ کسی سے کہتا ہے کہ ہم تمہیں بڑا اجر عطا کریں گے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے ہاں بڑے اجر کا کیا مفہوم ہوگا۔

نواب عبدالرحیم خان خاناں مغلیہ دور کے ایک عظیم نواب گزرے ہیں۔ یہ بادشاہ کے نورتنوں میں سے تھے۔ ان کی حوصلہ مندی اور فیاضی ضرب المثل کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ ایک دفعہ دہلی سے آگرہ جانے کیلئے نکلے، امرا، مصاحب اور فوج کا ایک حصہ ساتھ تھا۔ آگرہ دہلی سے پندرہ منزل کے فاصلے پر ہے اور یہ ہر منزل یعنی پندرہ میل پر پڑاؤ ڈالتے تھے۔ رات وہاں گزارتے اور اگلے دن پھر سفر شروع کر دیتے۔ پہلی ہی منزل پر پڑاؤ ڈالا۔ دربار سجا۔ امرا اور مصاحب اپنی اپنی مسندوں پر فروکش ہو گئے۔ نواب اپنی مسندِ خاص پر نہایت تمکنت کے ساتھ آ کر بیٹھے کہ اچانک ایک درویش بارگاہ کے دروازے پر آ کر کھڑا ہوا اور اس نے بلند آواز سے ایک شعر پڑھا۔

منعم بہ کوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

منعم کا معنی تو مال دار اور سخی ہوتا ہے۔ لیکن نواب کو اسوقت بادشاہ کی جانب سے منعم خاں کا لقب بھی عطا ہو چکا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اور بھی محظوظ ہوئے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ منعم یعنی ایک بڑا آدمی پہاڑ، جنگل اور صحرا میں بھی مسافر نہیں ہوتا وہ جہاں بھی جاتا ہے خیمہ لگاتا اور دربار سجاتا ہے۔ نواب نہایت خوش ہوا اور اسی وقت اس درویش کو ایک لاکھ روپے دینے کا حکم دیا۔ دوسرے روز اگلی منزل پر دربار لگایا۔ خیمے آراستہ ہوئے، تو پھر وہی درویش آیا اور اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر پھر وہی شعر پڑھا۔ نواب نے خوش ہو کر پھر ایک لاکھ روپے دینے کا حکم دیا۔ چار پانچ منزلوں تک یہ درویش آتا رہا اور ہر بار یہی شعر پڑھتا اور ایک لاکھ روپیہ انعام حاصل کر کے چلا جاتا۔ لیکن چھٹے دن وہ نہیں آیا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اتنا انعام آج تک کبھی کسی نے کسی کو نہیں دیا، ایسا نہ ہو نواب بگڑ کر سارا انعام چھین لے۔ اس لئے زیادہ حرص اچھی نہیں جو میں لے چکا ہوں وہ ہی بہت ہے۔ اس دن نواب نے دیر تک دربار جاری رکھا۔ شام ہو گئی اور وہ درویش نہیں آیا، تو نہایت افسوس سے کہنے لگے کہ درویش کم ظرف نکلا اسے نجانے کس خیال نے روک لیا ہم نے تو پہلے دن پندرہ لاکھ روپیہ الگ رکھنے کا حکم دے دیا تھا تاکہ روزانہ اس درویش کو ایک لاکھ روپیہ دیا جاتا رہے۔ اندازہ کیجئے! جس انعام کو ایک درویش غیر معمولی اور بہت بڑا سمجھتا ہے وہ نواب کی نگاہوں میں کوئی بڑا انعام نہیں۔ تو اللہ جیسے کریم کے بارے میں کون اندازہ کر سکتا ہے کہ جب وہ کسی کو اجرِ عظیم عطا فرمائے تو اس اجر کی عظمت کا حال کیا ہوگا۔

Marfat.com

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۗ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝

(اس دن ان کا کیا حال ہوگا؟ جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر کھڑا کریں گے ۝ اس دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور جنہوں نے رسول کی نافرمانی کی، تمنا کریں گے کہ کاش! ان پر زمین برابر کردی جائے اور اس دن وہ اللہ سے کوئی بات بھی چھپا نہ سکیں گے) (النسآء : ۴۱ تا ۴۲)

سابقہ آیات میں جہاں تک حقوق و فرائض، بنیادی اعتقادات اور اخلاقی اقدار کا تعلق ہے اس کی پوری طرح وضاحت کردی گئی اور مختلف اسالیب بیان سے کہیں زور دے کر کہیں دھمکی کی صورت میں اور کہیں نفسیاتی اور افادی پہلوؤں سے پوری طرح اتمامِ حجت کردیا گیا۔ اس کے بعد بھی اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مخاطب اپنی روش بدلنے کیلئے تیار نہیں اور ان کا انکار و جود برابر اپنی جگہ پر قائم ہے اور انہیں اپنے انجام کے بارے میں کوئی فکر لاحق نہیں تو ان دونوں آیاتِ کریمہ میں ان سے آخری بات کہی جارہی ہے کہ تم دنیا میں اپنے رویے کے بارے میں کیسے ہی دلائل ڈھونڈ لو اور اس کی کیسی ہی توجیہات کرلو لیکن کبھی یہ سوچنے کی بھی زحمت نہ کرو کہ جب تمہاری اللہ کے دربار میں حاضری ہوگی تو وہ قیامت کی گھڑیاں کس قدر ہولناک ہوں گی اور تمہیں کن کٹھن مراحل سے گزرنا پڑے گا۔

ہر رسول اپنی امت پر گواہی دے گا

اگر تم نے اب تک غور نہیں کیا تو ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں کہ میدانِ حشر میں بے شمار امتوں کا ہجوم ہوگا، اس میں تمہاری طرح نافرمانوں اور کافروں کے گروہ بھی ہوں گے، ہر امت کے سامنے ان کے رسول کو بلا کر یہ پوچھا جائے گا کہ بتایئے ان امتوں نے آپ کی دعوت کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ وہ رسول بتائیں گے کہ یا اللہ ہم نے خون کے گھونٹ پی پی کر اپنی امت کے لوگوں تک تیرے دین کی دعوت پہنچائی، ان کی طرف سے بے پناہ مخالفتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ افہام و تفہیم کے جتنے ممکن ذرائع ہوسکتے تھے ان میں سے ایک ایک سے کام لیا، ان کی طرف سے جو تکالیف اور دکھ پہنچائے گئے ان پر کبھی شکوہ نہ کیا بلکہ ان کی گالیوں پر بھی انہیں دعائیں دیں۔ لیکن ان بدبختوں نے ہماری دعوت پر کان نہ دھرا اور آج یہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔

ہمارے رسول پاک ﷺ ہم پر گواہی دیں گے

پھر یہ ہولناک منظر اپنی ہولناکی اور ہیبت ناکی میں انتہا کو پہنچ جائے گا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے سامنے گواہی کیلئے تشریف لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نہایت برہمی کے ساتھ کفارِ مکہ سے پوچھے گا کہ غور سے دیکھو! یہ وہی آخری رسول ہیں جنہیں ہم نے تمہاری طرف مبعوث کیا تھا؟ تم ان کے خاندان سے واقف تھے؟ ان کا بچپن، لڑکپن، جوانی، چالیس سالہ عمر کا ایک ایک لمحہ تمہارے سامنے گزرا تھا؟ انہوں نے نبوت کے اعلان سے پہلے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر تم سے پوچھا تھا کہ بتاؤ تم میری زندگی کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟ دیانت و امانت کے حوالے سے تمہارا میرے بارے میں کیا تجربہ ہے؟ تم میری شخصیت کے ایک ایک پہلو سے واقف ہو بتاؤ اس بارے میں تم کیا کہتے ہو؟

Marfat.com

اس سوال وجواب کو مولانا حالی نے نظم کا لباس پہنایا ۔

کہا سب نے قول آج تک کوئی تیرا
کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا
کہا گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا
تو باور کروگے اگر میں کہوں گا
کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پا کر
کہا تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے
کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے

اس طرح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم سے اعتماد کا ووٹ لیا اور ایسا خطرناک ووٹ جسے حاصل کرنے کیلئے چالیس سالہ ریاضت ضروری ہے۔ اس دن پوچھا جائے گا کہ یہ اللہ کے وہ رسول ہیں جن پر تم نے غیر مشروط اور غیر معمولی اعتماد کا اظہار کیا اور ان کی زندگی کے بارے میں تم نے غیر معمولی شہادت دی اور یہ شہادت سچی شہادت تھی کیونکہ اس کے پیچھے کوئی دباؤ یا کوئی لالچ نہ تھا۔ لیکن اسی رسول نے جب اللہ کے دین کی دعوت تمہارے سامنے پیش کی اور تمہیں دین کے بنیادی تصورات، اقدار اور احکام وفرائض سے آگاہ کیا تو تم نے نہ صرف ماننے سے انکار کیا بلکہ اس کی پاداش میں تم نے اس رسول کیلئے زندگی دشوار کردی اس کے ایمان لانے والوں کیلئے جینا دوبھر کردیا۔ کل تک جسے تم ہمیشہ الصادق اور الامین کہہ کر پکارتے تھے اور جس کے راستے میں تم آنکھیں بچھاتے تھے اب تمہاری آنکھوں سے اس کیلئے نفرت کے تیر نکلنے لگے اور تمہاری زبانیں اس کیلئے زہر اگلنے لگیں۔ کوئی ایسا الزام اور اتہام نہیں جو تم نے اس پر نہ باندھا ہو اور کوئی ایسی اذیت نہیں جو تم نے اسے نہ پہنچائی ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس نے تمہیں محبت کا پیغام دیا تمہاری جفاؤں کے مقابلے میں اس نے تمہیں دعاؤں سے نوازا، تم اسے پتھر مارتے تھے، وہ تمہاری ہدایت کیلئے اللہ کے سامنے جھولیاں پھیلاتا تھا۔ اس کی بے پناہ استقامت نے تمہارے ہر تیر ونشتر کو کند کر کے رکھ دیا۔ لیکن اس کی مروت رحمت اور مؤدت کے باوجود تم نے اس کیلئے وطن کی زمین تنگ کردی۔ بالآخر وہ اپنے مخلص ایمان لانے والوں کے ساتھ ہجرت کر گیا لیکن تم نے اس کا پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا، تم اس کی ذات کو جو تمہارے لئے رحمت بن کر آئی تھی، بار بار جنگوں میں کھینچتے رہے۔ اس کشمکش کا بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ تمہارا کفر شکست کھا گیا، تمہاری طاقت کا مرکز سرنگوں ہوگیا۔ اب تم اس کے سامنے مجرموں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑے تھے لیکن اس نے پھر تم سے عفوودرگذر سے کام لیا۔ ایک طرف اس کا یہ رویہ اور دوسری طرف تمہارا کفر اور تمہاری ناشکری۔ بتاؤ تم نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ تم دنیا میں تو اس رسول کا انکار کرتے رہے آج وہ رسول گواہی دے رہا ہے کہ کس طرح اس نے تمہیں اللہ کے دین سے آگاہ کیا اور تم نے کیا رویہ اختیار کیا۔ اب بتاؤ ہم تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں؟ کہا اگر اس منظر کو آج اپنی آنکھوں میں سما سکو تو شائد تمہیں کل کی ندامت اور ہولناکی سے بچالے ورنہ تم اپنے سارے انکار اور جحود کے باوجود کل جس طرح شرم اور شرمندگی سے اللہ کے سامنے گڑ گڑاؤ گے ہم تمہیں آج اس کی اس لئے خبر دے رہے ہیں کہ شاید تم اس سے ہی کچھ سبق سیکھ سکو۔ فرمایا اس دن یہ بڑے بڑے جغادری کافر اور

Marfat.com

بڑے بڑے منافق جو نام اسلام کا لیتے ہیں لیکن رسول کی نافرمانی کرتے ہیں اس دن تمنا کریں گے کہ اے کاش! زمین ہم پر برابر کردی جائے ۔یعنی زمین ہمیں نگل لے اور پھر زمین کو ہموار کردیا جائے تا کہ ہمارا نام ونشان نہ رہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں پائیں گے کہ اس منظر کا دیر تک سامنا کرسکیں اور آج جس طرح یہ بڑھ چڑھ کر دین کی مخالفت میں بولتے ہیں اور جس طرح پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والوں کا تمسخر اڑاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں کل جب پکڑے جائیں گے تو ان کی بے بسی کا عالم یہ ہوگا کہ کوئی بات اپنے اللہ سے چھپا نہ سکیں گے۔ وہ چھپانا ضرور چاہیں گے لیکن ہر چیز ان کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گی۔ وہ بے کسی اور بے بسی کی اس طرح تصویر بن جائیں گے جس کا نقشہ قرآنِ کریم نے کھینچا ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا مَاجَآءُوْهَاشَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ

(یہاں تک کہ وہ جب حاضر ہوں گے تو ان کے خلاف گواہی دیں گے ان کے کان ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں)

یعنی ان کا رونگٹا رونگٹا ان کے خلاف گواہی دے گا۔ وہ حیران ہو کر اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تمہیں قوتِ گویائی کیسے مل گئی؟ اور کس نے تمہیں ہمارے خلاف گواہی دینے پر لگا دیا؟ تو وہ جواب میں کہیں گی: اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِىْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَىْءٍ (ہمیں اس اللہ نے قوتِ گویائی بخشی ہے جس نے ہر چیز کو بولنا سکھایا ہے) مزید ایک جگہ فرمایا:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ

(آج ہم مہر کردیں گے ان کے مونہوں پر اور ہم سے بات کریں گے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں ان کے تمام اعمال اور کرتوتوں کی)

امتوں کی بداعمالیاں ان کے رسولوں کے لیے جواب دہی کا باعث ہوں گی

اس سلسلے میں قرآنِ کریم کی وضاحتوں کو دیکھتے ہوئے ایک اور تکلیف دہ صورتحال کا علم ہوتا ہے، وہ یہ کہ نافرمان اور بداطوار امتیں اپنی بداعمالیوں کے سبب خود ہی احتساب کے شکنجے میں نہیں آئیں گی بلکہ ان کی طرف مبعوث ہونے والے رسولوں کو بھی ان کی وجہ سے عدالت کے کٹہرے میں آنا پڑے گا۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ آپ کی امتیں عقیدے کے جس فساد اور اعمال کی جس انحطاط کا شکار ہوئیں کیا آپ نے انہیں اس بات کی تعلیم دی تھی؟ انہوں نے اللہ کے ساتھ جن جن قوتوں کو شریک کیا تھا کیا آپ نے ان کو بتایا تھا؟ اس کی سب سے نمایاں مثال حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ گرامی ہے جو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہونے والے آخری رسول ہیں اور جو اپنی ذاتی خصائص اور غیر معمولی معجزات کی وجہ سے بہت اعلیٰ مقام رکھتے ہیں ان کے بارے میں قرآنِ کریم نے پوری تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح اپنی امت کے مشرکانہ اعتقادات کی وجہ سے اللہ کے سامنے انہیں جوابدہی کرنا پڑے گی۔ سورۃ المائدہ میں اس کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے۔

Marfat.com

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَيْنِ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَايَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَالَيْسَ لِیْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ
كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ
اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ○ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ
رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّادُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِیْ كُنْتَ
اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِيْدٌ ○

(جب کہ اللہ پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی معبود ٹھہراؤ؟ وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے یہ مجھ سے کس طرح ہوسکتا ہے کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں ۔اگر میں نے یہ بات کہی ہوگی تو تجھے تو اس کا علم ہوگا۔تو میرے دل کی باتوں کو جانتا ہے میں تیرے دل کی باتوں کو نہیں جانتا۔غیب کی باتوں کو جاننے والا تو ہی ہے ○ میں نے ان سے نہیں کہی مگر وہی بات جس کا تو نے مجھے حکم دیا یہ کہ اللہ ہی کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ میں جب تک ان کے اندر رہا اسی بات کی گواہی دینے والا رہا، پھر جب تو نے مجھے وفات دی تو ان کا نگرانِ حال تو رہا اور تو ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے) (المآئدہ : ۱۱۶ تا ۱۱۷)

ان آیات میں غور کیجئے! کس طرح عیسائی امت کی بداعتقادیوں کی وجہ سے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی عدالت میں جواب دہی کے مراحل سے گزرنا پڑے گا اور کس طرح وہ بار بار اللہ سے معافی طلب کریں گے اندازہ کیجئے! اس وقت ان کے دل پر کیا قیامت گزر رہی ہوگی کہ میں نے اس امت کو اللہ کے خالص دین کی دعوت دی، اس کی ذات وصفات سے انہیں آگاہ کیا، انہیں ہر طرح کے شرک سے بچنے کی ہدایت کی اور ان کی ہر طرح کی مخالفت کے باوجود میں نے ان کے ساتھ ہمدردی کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔لیکن آج ان کے رویے کے باعث مجھے اللہ کی عدالت میں شرمسار ہونا پڑا۔

ایک اذیت ناک احساس

اس سے نہایت تشویشناک اور اذیتناک جس صورتحال کا احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر عیسائی امت کی بداطواریوں کے باعث سید عیسیٰ علیہ السلام کو حشر کے دن جواب دہی کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے تو کیا یہ امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام جس کی ذمہ داریاں عیسیٰ علیہ السلام کی امت کی نسبت بہت زیادہ ہیں اور جس کے سر پر قیامت تک کیلئے امامت وسیادت کا تاج رکھا گیا ہے اور صدیوں تک جس نے انسانیت کی خدمت انجام دی ہے آج وہ جس برے طریقے سے اپنے فرض منصبی سے تقریباً دست کش ہوچکی ہے وہ دیکھ رہی ہے کہ کفر کی منہ زور طاقتیں صرف مسلمانوں کے خون سے ہی ہولی نہیں کھیل رہیں بلکہ اسلامی اعتقادات تک خطرے میں ہیں۔اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو چیلنج کر دیا گیا ہے اللہ ہی کی اطاعت اور محبت کو بنیاد پرستی اور اس کے دین کی سربلندی اور مسلمانوں کی ہدایت کیلئے ہر طرح کی جدوجہد کو دہشت گردی کا نام دے دیا گیا

Marfat.com

مسلمان اس حدتک کفر کی طاقتوں ان کی تہذیب، سیاست اور ثقافت سے مرعوب ہو چکے ہیں (آج تو جو قیامت گزر رہی ہے اس کا تو ایک خاص سبب ہی) لیکن چند سال پہلے پاکستان سے مسلمانوں کا ایک وفد ایک مسلمان ریاست میں پاکستان کی نمائندگی کیلئے گیا تھا اس مسلمان ریاست کے سربراہ کو جب انہوں نے قرآن کریم کا ایک نسخہ بطور تحفہ پیش کرنے کی اجازت چاہی تو انہوں نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کردیا کہ اس کی وجہ سے یہاں کی عیسائی اقلیت کو شکایت پیدا ہو سکتی ہے۔اگر اس بے حمیتی اور بے غیرتی کا جواب قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگ لیا گیا تو میں شرمساری کی وجہ سے اس تصور سے ہی خوف زدہ ہوں کہ حضور کے دل پر کیا گزرے گی؟اور اگر کہیں یہ سوال کرلیا گیا کہ آپ کی امت کو ہم نے دنیا میں تقریباً ساٹھ 60 ملکوں کی حکومتوں سے نوازا، ان کو تمام مذاہب سے زیادہ افرادی قوت عطا کی، دنیا کے تمام قابلِ ذکر ساحل ان کے قبضے میں دے دیئے اور زمین کے نیچے بہنے والا زرِ سیال ان کے حوالے کردیا، کتنی بیش قیمت دھاتوں کی کانیں ان کے ملکوں میں موجود ہیں، کوئی اللہ کی نعمت ایسی نہیں جس سے مسلمان ملک مالا مال نہیں ہیں۔باایں ہمہ! مسلمانوں کا کوئی ایک ملک ایسا نہیں ہے جس میں اللہ کا قانون نافذ ہو۔ ہر جگہ اللہ کے ساتھ شرک کیا جارہا ہے، شرک صرف یہی تو نہیں کہ کسی کو رب یا اللہ کہہ کر پکارا جائے یا اس کو خدا کا بیٹا بنالیا جائے۔یقیناً یہ بھی شرک ہے کہ اللہ کے قانون کے مقابلے میں اس کی شریعت کے توڑ پر وضعی قوانین نافذ کیے جائیں۔حلت وحرمت کا حق اللہ سے چھین کر پارلیمنٹ کو دے دیا جائے۔کہیں الوہیت کی پوجا ہو اور کہیں فوجی ڈکٹیٹر اسلامی شریعت، اسلامی اقدار اور اسلامی تاریخ پر خنجر چلا رہے ہوں۔اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھ لیا گیا کہ کیا آپ نے اپنی امت کو یہی تعلیم دی تھی کہ وہ میری بجائے اقتدار کی پوجا کریں، میرے قانون کی جگہ وضعی قانون نافذ کریں، میری بجائے غیر اللہ سے امیدیں باندھیں میں سوچتا ہوں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کے سوالات کیے گئے اور ہماری وجہ سے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو شرمندگی اٹھانا پڑی تو کیا ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے مستحق ہوسکیں گے؟ یہ وہ مرحلہ ہے جس پر اس امت کو رک کر دیانت داری سے سوچنا چاہیے اور اگر آج ہم نے نہ سوچا اور کوئی صحیح فیصلہ نہ کیا تو ہم بھی قیامت کے دن شائد یہ آرزو کرنے پر مجبور ہوجائیں کہ کاش! ہم پر زمین برابر کردی جائے۔

میرا گمان یہ ہے کہ یہی وہ احساس ہے اور یہی وہ اندیشے ہیں جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیتِ کریمہ کو سن کر اشکبار ہوگئے۔حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ نے ایک دفعہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے فرمایا کہ تم مجھے قرآنِ پاک پڑھ کر سناؤ، حضرتِ عبداللہؓ نے عرض کیا کہ آپ مجھ سے سننا چاہتے ہیں حالانکہ قرآن آپ پر نازل ہوا۔آپ نے فرمایا: ہاں پڑھو! حضرت عبداللہؓ نے سورۃ النساء کی تلاوت شروع کردی جب اس آیتِ کریمہ پر پہنچے تو آپ نے فرمایا: اب بس کرو۔حضرت عبداللہؓ نے جب نگاہ اٹھا کر دیکھا آپ کی مبارک آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔غور فرمایئے! یہ کس بات کا احساس تھا جس نے آپ کو اشکبار کردیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ

Marfat.com

مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً
فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا
مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا
السَّبِيْلَ ؕ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّ
كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ
عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ
مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ
اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا
لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ
اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا
لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ
اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ
يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمْ
تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىْ مَنْ يَّشَآءُ وَ

Marfat.com

لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ ع

عربی رکوع ۷ (اے ایمان والو! مت قریب جاؤ نماز کے جس وقت تم نشہ کی حالت میں ہو یہاں تک کہ جو کچھ تم زبان سے کہتے ہو اس کو سمجھنے لگو اور نہ اس وقت جب جنابت کی حالت میں ہو مگر یہ کہ بس گزر جانا پیشِ نظر ہو یہاں تک کہ غسل کرلو اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو یا آئے تم میں سے کوئی جائے ضرور سے یا عورتوں سے ہم صحبت ہوا ہو پھر تم نہ پاؤ پانی تو ارادہ کرو پاک زمین کا اور اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرو، بیشک اللہ درگزر کرنے والا بخشنے والا ہے o کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا؟ جن کو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ ملا۔ وہ گمراہی کو ترجیح دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راستہ گم کر بیٹھو o اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور اللہ کافی ہے حمایت کیلئے اور اللہ کافی ہے مدد کیلئے o یہود میں سے ایک گروہ زبان کو توڑ مروڑ کر اور دین پر طعن کرتے ہوئے الفاظ کو ان کے موقع ومحل سے ہٹا دیتا ہے اور سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا، اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ اور رَاعِنَا کہتا ہے اور اگر وہ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ''اِسْمَعْ'' اور اُنْظُرْنَا کہتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا اور بات برمحل ہوتی۔ لیکن اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کردی ہے اس وجہ سے وہ شاذ ہی ایمان لائیں گے o اے وہ لوگو! جن کو کتاب دی گئی اس چیز پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتاری ہے تصدیق کرنے والی ان پیشین گوئیوں کی جو خود تمہارے پاس موجود ہیں اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور ان کو ان کے پیچھے کی جانب الٹ دیں یا ان پر بھی اسی طرح لعنت کریں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کی اور اللہ کی بات شدنی ہے o بے شک اللہ نہیں بخشے گا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور بخش دے گا اس کے علاوہ جس کیلئے چاہے گا اور جو شخص اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے وہ ایک بہت بڑے گناہ کا افتراء کرتا ہے o کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ ٹھہراتے ہیں بلکہ اللہ ہی ہے جو پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا o دیکھئے! یہ اللہ پر کیسا جھوٹ باندھ رہے ہیں اور صریح گناہ ہونے کیلئے تو یہی کافی ہے) (آیات ۴۳ تا ۵۰)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا o

Marfat.com

(اے ایمان والو! مت قریب جاؤ نماز کے جس وقت تم نشہ کی حالت میں ہو یہاں تک کہ جو کچھ تم زبان سے کہتے ہو اس کو سمجھنے لگو اور نہ اس وقت جب جنابت کی حالت میں ہو مگر یہ کہ بس گزر جانا پیشِ نظر ہو یہاں تک کہ غسل کر لو اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو یا آئے تم میں سے کوئی جائے ضرور سے یا عورتوں سے ہم صحبت ہوا ہو پھر تم نہ پاؤ پانی تو ارادہ کرو پاک زمین کا اور اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرو، بیشک اللہ در گزر کرنے والا بخشنے والا ہے) (النسآء : ۴۳)

اس رکوع کے آغاز میں آپ نے دیکھا کہ اللہ ہی کی عبادت اور والدین، اقربا اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ احسان اور انفاق کرنے کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ساتھ جو چیزیں عبادت، احسان اور انفاق کو باطل کرنے والی تھیں مثلاً شرک، ریا اور تکبر وغیرہ کا ذکر فرمایا۔ آیتِ کریمہ میں نماز کا اس حوالے سے ذکر کیا جا رہا ہے کہ یہ عبادت کا سب سے اہم رکن اور اہم جز ہے۔ اس سے جہاں اللہ کے حقِ عبادت وضاحت ہوگی وہیں اس کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کا بھی ذکر فرمایا جو نماز کیلئے مفسدات کا درجہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ ... کی حالت میں نماز کے قریب مت جانا۔

صلوٰۃ کا مفہوم

صَلٰوۃ کے معنی اگر چہ نماز کے ہیں۔ لیکن اس جملے کے الفاظ پر غور کرنے سے ایک اور بات کی طرف بھی ذہن منتقل ہوتا ہے وہ یہ یہاں فرمایا گیا: لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ ''نماز کے قریب نہ جاؤ'' حالانکہ نماز ادا کی جاتی ہے یا پڑھی جاتی ہے اس کے قریب جانے یا نہ جا... کا کوئی مفہوم نہیں۔ جو آدمی نماز نہیں پڑھتا وہ نماز سے دور ہے اور جو پڑھتا ہے وہ نماز کے قریب ہے، درمیان کی کوئی منزل نہیں۔ اس لئے ج... بھی کسی کو نماز کا حکم دیا جاتا ہے تو اسے نماز پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے نماز کے قریب جانے کا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نماز کے ساتھ کسی بات کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جس طرح ہم ظرف بولتے ہیں تو بعض دفعہ اس کا مظروف بھی اس کے مفہوم میں شا... ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نہر چلتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پانی چلتا ہے، اسی طرح کبھی مظروف بھی ظرف کے مف... پر مشتمل ہوتا ہے۔ صَلٰوۃ مظروف ہے اور مسجد اس کا ظرف ہے۔ یہاں اگر چہ صلوٰۃ کا لفظ ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کے مفہوم میں مسجد بھی ش... ہے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم نشے کے حال میں نماز کے لئے مسجد میں مت جاؤ اور نماز کے بغیر بھی مسجد کے قریب مت پھٹکو یعنی اس گزرنے کی کوشش نہ کرو۔ ہاں! اگر کوئی اور راستہ نہ ہو اور گزرنا بہت ضروری ہو تو: اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ کہہ کر گزرنے کی اجازت دی گئ... ۔ اگر چہ اس کے ساتھ بعض فقہا نے یہ شرط عائد کی ہے کہ وضو کر لینا چاہئے۔

شراب کی حرمت تدریج کے ساتھ

اسلام کی بعثت سے پہلے عرب لوگ بہت ساری بری عادتوں میں مبتلا تھے۔ انہیں میں سے ایک عادت شراب پینا بھی تھی اور یہ ... بری عادت تھی کہ جنہیں عربوں سے چھڑوانا آسان کام نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض قبیلے اسلام لانے کیلئے اس شرط پر اصرار کرتے تھے کہ ... شراب پینے کی اجازت دی جائے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تسلیم نہیں فرمایا۔ دنیا کا تجربہ بھی یہی ہے کہ سب سے ...

Marfat.com

عادت چھٹتی ہے وہ شراب پینے کی عادت ہے۔ امریکہ میں غالباً 1908ء میں شراب کی حرمت کا بل پاس کیا گیا اور لوگوں کے دلوں میں شراب کی نفرت پیدا کرنے اور اس کے ترک کے فوائد بیان کرنے کیلئے کروڑوں روپیہ پراپیگنڈہ پر صرف کیا گیا۔ لیکن آٹھ سال کے بعد جو رپورٹ ملی وہ نہایت تشویشناک تھی کہ ملک میں شراب نوشی پہلے سے کہیں بڑھ گئی، بھٹیوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ اب بظاہر شراب کی بھٹیاں دکھائی نہیں دیتی تھیں لیکن گھروں میں یہ کاروبار جاری تھا۔ مایوس ہو کر پارلیمنٹ کو شراب کی حرمت کا بل واپس لینا پڑا۔ اس انسانی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے پروردگار نے شراب کو یک لخت حرام نہیں فرمایا بلکہ اس کے احکام تدریجاً نازل فرمائے۔ ابتداء میں صرف اتنا اشارہ کیا کہ یہ مضر اور نقصان دہ چیز ہے۔ اس سے بعض لطیف طبائع نے شراب چھوڑ دی۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اوقاتِ نماز میں شراب کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دن میں شراب کا استعمال بند ہو گیا۔ عشاء کی نماز کے بعد ہی لوگ اس سے شوق کرتے کچھ مدت بعد سورۃ المائدہ میں شراب کی قطعی حرمت کا حکم نازل ہوا۔ اس آیت کے شان نزول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک روز حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کے ہاں کئی صحابہ موجود تھے کھانے کے بعد شراب کا دور چلا، جب وہ اس کے نشہ سے جھوم رہے تھے تو مغرب کی نماز کا وقت آ گیا ایک صاحب امامت کیلئے آگے بڑھے اور اتفاق سے سورۃ الکافرون پڑھنا شروع کر دی اور بے خودی میں لا اعبد ما تعبدون کی جگہ اعبد ما تعبدون پڑھ گئے، جس سے معنی بالکل بدل گیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور نشہ کی حالت میں بارگاہِ الٰہی میں حاضری سے روک دیا گیا۔ اس سے پہلی آیت میں قیامت کے روز بارگاہِ الٰہی میں حاضری کا ذکر گزرا اس آیت میں بارگاہِ الٰہی میں حاضری کے آداب سکھائے جا رہے ہیں تاکہ قیامت کی حاضری آسان ہو۔

حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَاتَقُوْلُوْنَ کا مفہوم

حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَاتَقُوْلُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تم نماز پڑھ رہے ہو اور نماز میں جو پڑھنا چاہیے وہی پڑھ رہے ہو ایسا نہ ہو کہ تم قرآنِ کریم کی بجائے کوئی غزل شروع کر دو اور تسبیح وتہلیل کی بجائے گانا شروع کر دو۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تم جو پڑھ رہے ہو تمہیں اس کا ترجمہ آنا چاہیے۔ ترجمہ کا تعلق علم سے ہے اور علم تو حاصل کئے بغیر نہیں آتا اور جو کچھ آدمی کہتا ہے اس کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اس کا تعلق ہوش وحواس اور سلامتیِ عقل سے ہے۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے بعض لوگوں نے بلاوجہ اس سے دوسرے مطالب نکالنے کی کوشش کی ہے۔ مزید یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ جس طرح یہ حکم شراب کے بارے میں دیا ہے گہری نیند کے بارے میں بھی حضور نے یہی ارشاد فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

اذانعس احدکم وھو یصلی فلینصرف فلینم حتی یعلم مایقولُ

(جب تم میں سے کسی پر نیند کا غلبہ ہو جائے اور وہ نماز پڑھ رہا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ نماز چھوڑ کر سو جائے اور نیند پوری کرنے کے بعد جب ہوش وحواس درست ہو جائیں تو پھر نماز ادا کرے)

وَلَا جُنُبًا جس طرح تم نشہ کی حالت میں نماز اور مسجد کے قریب نہیں جا سکتے اسی طرح حالتِ جنابت میں بھی تم نہ نماز پڑھ سکتے ہو نہ مسجد میں داخل ہو سکتے ہو، جب تک غسل نہ کر لو۔

Marfat.com

اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ کا مفہوم

اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ اس کے دو ترجمے کیے گئے ہیں۔ایک تو یہ (مگر یہ کہ تم سفر کررہے ہو)۔اور دوسرا یہ (مگر یہ کہ تم راستہ گزرنے والے ہو)۔دوسرے ترجمے کے اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ تم نشے کی حالت میں ہو یا حالتِ جنابت میں اگر تمہیں مسجد سے گزرنا ضروری ہو اور دوسرا کوئی راستہ نہ ہو تو صرف گزرنے کی اجازت ہے ٹھہرنے کی اجازت نہیں۔ پہلے ترجمے کی رو سے مفہوم یہ ہوگا کہ سفر کی حالت میں جنبی کو اجازت ہے کہ وہ تیمّم کرکے غسل کے بغیر نماز پڑھ لے۔لیکن زیادہ واضح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس سے سفر نہ مراد لیا جائے کیونکہ سفر کا ذکر آگے آرہا ہے۔اس لئے اس سے سفر مراد لینا تکلف کے سوا اور کچھ نہیں۔

کن صورتوں میں تیمّم جائز ہے

وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰی یہاں سے آخر آیت تک ان صورتوں کا بیان ہو رہا ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے تیمّم کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ان میں سب سے پہلی صورت یہ ہے کہ انسان بیمار ہے اور ڈاکٹروں نے اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ پانی کے استعمال سے مرض میں اضافہ ہوسکتا ہے تو پانی کی موجودگی میں بھی اس کے لئے تیمّم کی اجازت ہے۔ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ پانی کے استعمال سے مرض بڑھنے کا اندیشہ تو نہ ہو لیکن تکلیف کی شدت کے باعث یا کسی چوٹ یا زخم کی وجہ سے مریض زیادہ حرکت نہ کرسکتا ہو اور دوسرا کوئی ایسا شخص پاس نہ ہو جو اسے وضو کرا سکے۔تو اس کے لئے بھی لیٹے لیٹے یا کسی طرح اگر تیمّم ممکن ہو تو تیمّم کرکے نماز پڑھ سکتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی حالتِ سفر میں ہے، اس میں دو صورتیں ممکن ہیں۔ایک یہ کہ پانی تو موجود ہو لیکن سفر کی نوعیت اس طرح کی ہو کہ وضو کرنا انتہائی مشکل ہو۔مثلاً جہاز کا سفر ہے اس کے تنگ سے باتھ روم میں ہر شخص کیلئے وضو کرنا آسان نہیں ہوتا ٹرین کا سفر ہے تو اس میں بھی یہی کیفیت ہوتی ہے بلکہ گندگی سے لتھڑ جانے کا زیادہ خدشہ ہوتا ہے اور اگر کسی اسٹیشن پر اتر کر وضو کرنے کی کوشش کی جائے تو گاڑی کے نکل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔بس کا سفر تو بعض دفعہ اس سے بھی زیادہ مشکلات کا باعث ہوتا ہے مختصر یہ کہ سفر کی رواروی اگر وضو کرنے کی اجازت نہ دے یا وہ جنبی ہے اور وہ غسل نہ کرسکے اور غسل کرنا تو سفر میں مشکل کیا ناممکن ہوجاتا ہے۔ایسی صورت میں اس مسافر کو بعض فقہا تیمّم کی اجازت دیتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سفر کی یہ رواروی تو نہ ہو لیکن پانی کم یاب یا نایاب ہو۔پانی اس حد تک کم ہو کہ اگر غسل کرلیا گیا یا وضو کرلیا گیا تو پینے کیلئے پانی نہیں بچے گا تو اس صورت میں بھی تیمّم کرنا جائز ہے اور یا یہ صورت ہو کہ سرے سے پانی موجود ہی نہ ہو اور دور دور تک کوشش کرکے دیکھ لی جائے پانی ملنے کے کوئی آثار نہ ہوں تب بھی تیمّم کرکے نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

تیسرا وہ شخص ہے جو رفعِ حاجت سے واپس آئے۔اس کیلئے قرآنِ کریم نے اَلْغَائِطِ کا لفظ استعمال کیا ہے اس کا معنی ہوتا ہے نشیبی زمین، لیکن یہاں یہ قضائے حاجت سے کنایہ ہے۔دیہاتی زندگی میں جہاں گھروں میں بیت الخلاء نہیں ہوتے اور لوگوں کا معمول یہ ہے کہ خاموشی سے باہر آبادی سے دور اس ضرورت سے فارغ ہوتے ہیں تو کوئی بھی آدمی جب رفعِ حاجت کیلئے باہر جاتا ہے تو وہ ہمیشہ نشیبی جگہ تلاش کرتا ہے اور ایسی جگہ ڈھونڈتا ہے جہاں جھاڑیاں ہوں یا کسی بھی فصل کے پودوں نے پردہ سا کر رکھا ہو۔قرآنِ کریم نے بجائے قضائے حاجت

Marfat.com

کہنے کے، اس لفظ کے استعمال سے مفہوم بھی ادا کر دیا اور حسنِ تعبیر کی ایک مثال بھی قائم کر دی۔ ہم جانتے ہیں کہ قضائے حاجت کے بعد آدمی ناپاک ہو جاتا ہے لیکن یہ ناپاکی وضو سے دور ہو جاتی ہے، اس کیلئے غسل کرنا ضروری نہیں۔ ایسے شخص کو اگر پانی میسر نہ آئے یا وضو کرنے میں اور کوئی شرعی رکاوٹ ہو تو اس کیلئے بھی تیمّم کرنا جائز ہے۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ شوہر نے اپنی بیوی سے ملاقات کی ہو۔ اسے قرآنِ کریم نے لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ سے تعبیر کیا ہے۔ ملامست کے معنی یقیناً چھونے اور ہاتھ لگانے کے بھی ہیں۔ لیکن اہلِ زبان مباشرت کیلئے کنائے کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے بھی معلوم ہوتا ہے اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ اگرچہ اس میں اہلِ علم کا اختلاف ہے لیکن امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اس سے مباشرت ہی مراد لیتے ہیں۔ مباشرت کے بعد غسل فرض ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں اگر پانی میسر نہ ہو تو تیمّم کرنے کی اجازت ہے۔

آیتِ کریمہ کے آخر میں پروردگار نے صرف تیمّم کرنے کی اجازت ہی مرحمت نہیں فرمائی بلکہ تیمّم کا طریقہ بھی سکھایا اور سنت نے اسے عملی شکل دے کر وضاحت کر دی۔ تیمّم کا معنی ہوتا ہے ''قصد کرنا'' اور صعید ''سطحِ ارض'' کو کہتے ہیں، لیکن وہ جگہ طیب اور پاک ہونی چاہئے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس پر مٹی بھی موجود ہو۔ زمین کی بالائی سطح یا مٹی اور اس کی جنس سے بنی ہوئی کوئی چیز چاہے اس پر غبار ہے یا نہیں تیمّم کیلئے کافی ہے۔ امام صاحب کے نزدیک مٹی اور مٹی کی جنس کی سب چیزوں مثلاً پتھر، ریت وغیرہ سے بھی تیمّم جائز ہے بشرطیکہ وہ پاک ہو۔ مٹی کی جنس سے ہونے کی علامت عام طور پر یہ بیان کی جاتی ہے کہ اسے آگ نہ جلا سکتی ہو۔

تیمّم کرنے کا طریقہ

تیمّم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تیمّم کی نیت کرے اس کے بعد دونوں ہاتھ زمین پر مارے۔ اگر ان کے ساتھ غبار زیادہ لگ جائے تو ہاتھوں کو جھاڑ کر یا پھونک سے کم کر دے۔ اس کے بعد اپنے چہرہ پر ملے۔ دوبارہ پھر اسی طرح زمین پر دونوں ہاتھ مار کر دونوں بازوؤں کی کہنیوں تک ملے، جس طرح منہ، ہاتھ اور بازو دھوتے ہوئے بال برابر جگہ بھی خشک نہیں رہنی چاہیے اسی طرح تیمّم میں بھی کوئی جگہ مسح سے باہر نہیں رہنی چاہیے۔

تیمّم وضو یا غسل کا مقصد کیسے ادا کر سکتا ہے؟

رہی یہ بات کہ تیمّم وضو کے قائم مقام کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا تعلق ایک مومن کے احساس سے ہے۔ نماز درحقیقت اللہ کے حضور حاضری کا نام ہے۔ اس کے حضور حاضری کیلئے صرف پاکیزہ جسم درکار نہیں بلکہ دل و دماغ کے ریشے ریشے میں ہمہ نوع پاکیزگی ہونی چاہئے۔ ایسی پاکیزگی ظاہر ہے نہ جسم پر پانی بہا لینے سے ہوتی ہے اور نہ ہاتھ پاؤں اور منہ دھو لینے سے۔ اس کیلئے تو ضروری ہے کہ آدمی کے دماغ کی فکر اور دل کا احساس ظاہری طہارت کے ساتھ ساتھ پوری طرح تطہیر کے عمل سے گزرے اور تطہیر کا یہ عمل اللہ کی ذات اور اس کی صفات کے یقین اور استحضار سے شروع ہوتا ہے اور اللہ کے ساتھ عشق و محبت کی سرمستیوں اور دیدہ و دل کی بے تابیوں سے مکمل ہوتا ہے۔ ان دونوں کا تعلق نہ پانی کے استعمال سے ہے نہ مٹی کے مسح سے بلکہ وہ اس اہم نفسیاتی تدبیر سے اور اس گہرے تصور سے ہے کہ آدمی جب بھی نماز کیلئے کھڑا ہو تو اس کے اندر برابر یہ احساس چٹکیاں لے کہ کیا میں پوری طرح اپنے ظاہر و باطن میں پاکیزہ ہوں یا نہیں؟ اگر وہ واقعی اپنے

Marfat.com

اس احساس کی گرفت میں ہے تو وہ جس طرح اپنے دل و دماغ سے برے خیالات نکالنے کی کوشش کرے گا اسی طرح اگر وہ پانی کے استعمال پر قادر ہے اور پانی میسر ہے تو وہ پانی سے اپنے ظاہر کو پاک کرنے کی کوشش کرے گا اور اگر پانی میسر نہیں تو وہ تیمّم کے ذریعے اس احساس کو باقی رکھنے کیلئے پاکیزگی کا اہتمام کرے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ظاہر و باطن کی پاکیزگی اللہ کے احکام کی تعمیل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں ہے۔ یہ اگر وضو یا غسل کے ذریعے ہو تو عین سعادت کی بات ہے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو چونکہ میرے پروردگار نے تیمّم کو اس کا قائم مقام ٹھہرایا ہے تو اب میرے احساس کو اسی کے ذریعے پاکیزگی نصیب ہو سکتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۝ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ۝

(کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا؟ جن کو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ ملا۔ وہ گمراہی کو ترجیح دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راستہ گم کر بیٹھو ۝ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور اللہ کافی ہے حمایت کیلئے اور اللہ کافی ہے مدد کیلئے) (النسآء : ۴۴ تا ۴۵)

اصلاحِ معاشرہ کے متعلق احکام کا جو سلسلہ جاری تھا وہ اس وقت کے معاشرے کی ضرورت کے مطابق اتمام کو پہنچ گیا۔ اب ان لوگوں کو اور ان کے کرتوتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اس اصلاحی عمل کا راستہ روکنا چاہتے ہیں اور جن کے پیشِ نظر اللہ کے اس دین کو ناکام کرنے کے سوا اور کوئی ہدف نہیں۔ ان میں سب سے پہلے اہلِ کتاب کو ذکر کیا جا رہا ہے اور اہلِ کتاب میں سے بھی یہود پر سب سے پہلے تنقید کی جا رہی ہے کیونکہ یہی گروہ اس وقت مدینہ میں علمی اور مالی حیثیت سے اور اثر و اقتدار کی وجہ سے مدینہ کے معاشرے پر سب سے زیادہ اثر انداز تھا اور یہی وہ گروہ ہے جس نے من حیث المجموع اسلام اور مسلمانوں کا راستہ روکنے کا فیصلہ کیا۔

اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ کا مفہوم

یہود کے حوالے سے سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب کا ایک حصہ دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم انہیں دوسرے مواقع پر اہلِ کتاب کہہ کر پکارتا ہے اہلِ کتاب تو وہی ہوگا جس کے پاس کتاب کا حصہ نہیں بلکہ کتاب موجود ہو۔ لیکن قرآن کریم کوئی لفظ بلاوجہ استعمال نہیں کرتا اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس پر غور کریں۔ مختلف اہلِ علم نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں۔ بعض اہلِ علم کا گمان ہے کہ دراصل گزشتہ آسمانی صحیفوں اور قرآنِ کریم میں نسبت جزو اور کل کی ہے۔ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی کامل کتاب ہے۔ جس میں تمام انسانی زندگی کی رہنمائی کیلئے ہدایات دی گئی ہیں۔ اعتقادات، معاملات، اسلوبِ حکومت اور آدابِ زندگی میں سے ہر ضرورت کو قیامت تک کیلئے پورا کر دیا گیا ہے اور پہلی کتابوں میں جو احکام دیئے گئے تھے ان میں آئندہ زمانوں کیلئے جو مفید تھے انہیں تکمیلی شکل دے دی گئی ہے جس کی وجہ سے اب قیامت تک انسانوں کو کسی اور پیغمبر اور کسی اور کتاب کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوگی۔ اس لحاظ سے قرآنِ کریم کو ایک مکمل کتاب کہنا ہر لحاظ سے بجا ہے۔ لیکن باقی آسمانی صحیفے اس کے مقابلے میں اجزا اور حصص کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہود آگے بڑھ کر قرآنِ

Marfat.com

کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتے تو انہیں احساس ہوتا کہ اللہ نے ہمیں کتاب کی صورت میں جو نعمت عطا فرمائی تھی وہ اپنی تکمیلی شان میں تو اب نازل ہوئی ہے تو ان کے لئے لازم تھا کہ یہ دوسروں سے بڑھ کر اس کتاب کی قدر کرتے۔

بعض دوسرے اہلِ علم کا خیال ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ انہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے پہلی نسلوں نے اس کتابِ الٰہی کے نجانے کس کس حصے کو ضائع کر ڈالا کیونکہ تورات کی پانچویں کتاب، ''کتاب تثنیہ'' انہوں نے ایسی گم کی کہ جو کئی صدیوں کے بعد انہیں دوبارہ مل سکی۔ اس کے علاوہ نجانے اور وہ کیا کیا گم کر چکے ہیں کیونکہ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ یہ کتاب تین دفعہ دنیا سے ناپید ہو چکی ہے اور جو کچھ کتاب میں سے ان کے پاس موجود بھی ہے اس کے مقصد اور روح کو اگر دیکھا جائے تو اس سے تو وہ بالکل بے گانہ ہو چکے ہیں ان کی تمام دلچسپیاں لفظی بحثوں اور احکام کے جزئیات اور عقائد کی فلسفیانہ پیچیدگیوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کتاب رکھتے ہوئے بھی دین کی حقیقت سے ناآشنا اور دینداری کے جوہر سے محروم ہیں۔

یَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَةَ وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِیۡلَ یہاں سے اسلام کے خلاف ان کے عزائم اور ان کی سازشوں کا بیان شروع ہو رہا ہے لیکن بات لپیٹ کر کہی گئی ہے کیونکہ وہ اپنی حرکتوں سے پوری طرح واقف ہیں اس لئے ان کیلئے تو اشارہ ہی کافی ہے اور مسلمانوں پر چونکہ اس سے پہلے سورۃ البقرۃ نازل ہو چکی ہے، ان کیلئے بھی ان کی حرکات کوئی نئی بات نہیں۔ وہ اس اختصار میں پوری تفصیل کو دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں یَشۡتَرُوۡنَ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اشتراء کا معنی ''خریدنا بھی ہوتا ہے اور بیچنا بھی''۔ لیکن اس معنی کی اصل روح ترجیح دینا ہے۔ بتلانا یہ ہے کہ تم ان کی زندگیوں میں جھانک کر دیکھو۔ تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ باوجود اہلِ کتاب ہونے کے ان کا اصل رشتہ ضلالت اور گمراہی سے ہے۔ انہیں ہدایت سے واجبی سی بھی دلچسپی نہیں وہ ہر معاملے میں ہدایت پر ضلالت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ کتاب کا علم رکھنے کی وجہ سے وہ ہدایت کے شائق اور طلب گار ہوتے لیکن انہوں نے کتاب سے اپنا تعلق ایسا توڑ لیا ہے کہ اب وہ بجائے ہدایت کے ضلالت اور گمراہی کو اپنی منزل بنا چکے ہیں اور یہ ان کی مجبوری بھی ہے کیونکہ اگر وہ ہدایت کے راستہ پر چلیں اور اپنی قوم کو بھی اس پر چلنے کی ترغیب دیں تو ان کے مفاد پرست علماء اور جاہ پرست مشائخ اپنے کاروبار اپنی فتوحات اور اپنی آمدنی سے یکسر محروم ہو کر رہ جائیں اور ایسا وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ جس طرح اندھیرے کا خوگر روشنی کا دشمن ہو جاتا ہے اسی طرح وہ ہدایت سے تعلق ٹوٹ جانے کے باعث صراطِ مستقیم سے ایسے اترے ہیں کہ تمہارے بارے میں بھی ان کی یہ کوشش ہے کہ تمہیں بھی گمراہ کر دیں کیونکہ تمہاری لائی ہوئی روشنی ان کے اندھیروں کی دشمن ہے۔ چراغ جلے گا تو تاریکی کو پاؤں سمیٹنے پڑیں گے اور آفتاب چمکے گا تو ہر گھر میں اجالا پھیلے گا۔ اپنے اندھیرے کو باقی رکھنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ روشنیوں کو گل کرنے کی کوشش کی جائے چنانچہ وہ ایسا ہی کرنا چاہتے ہیں اور ان سے جو بن پڑتا ہے اسے کر گزرنے سے دریغ نہیں کرتے اس کی پوری تفصیل ''سورۃ البقرۃ'' میں گزر چکی ہے اور کچھ مزید اشارات آگے آ رہے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں استقامت کے ساتھ صراطِ مستقیم پر چلتے رہو۔ تم یہ نہ سمجھو کہ تمہارا اللہ تمہارے دشمنوں سے بے خبر ہے بلکہ وہ تمہارے دشمنوں کو تم سے زیادہ جانتا ہے اور اتنا جانتا ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ہزار پردوں میں چھپی ہوئی سازشوں کو بھی دیکھ رہا ہے اور آئندہ چل کر تمہارے دشمن جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ ان سے بھی واقف ہے۔ تمہیں اپنے ایمان و عمل جذبۂ جہاد اور اتحاد میں کوئی کمی نہیں آنے دینی چاہیے اور تمہارا بھروسہ صرف اللہ پر ہونا چاہئے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ جس کا حامی، جس کا پشت پناہ اور جس کا مددگار ہو اس کے لئے کوئی پریشانی کا موقعہ نہیں۔ وہ اپنے بندوں کی مدد بھی کرتا ہے اور ان کی حفاظت بھی کرتا ہے۔

Marfat.com

مِنَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَیًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِی الدِّیْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَکَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰکِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِکُفْرِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝

(یہود میں سے ایک گروہ زبان کو توڑ مروڑ کر اور دین پر طعن کرتے ہوئے الفاظ کو ان کے موقع محل سے ہٹا دیتا ہے اور سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا، اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ اور رَاعِنَا کہتا ہے اور اگر وہ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا، اِسْمَعْ اور انْظُرْنَا کہتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا اور بات برمحل ہوتی۔ لیکن اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کر دی ہے اس وجہ سے وہ شاذ ہی ایمان لائیں گے) (النسآء : ۴۶)

رسولوں کی عزت وحرمت اور اللہ کی غیرت

گزشتہ آیتِ کریمہ میں پروردگار نے ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ لیکن اس میں گھبرانے کی بات نہیں تمہارے سر پر اللہ کی رحمت کا سایہ ہے وہ تمہارا ولی بھی ہے نصیر بھی۔ اس آیت کریمہ کو پڑھتے ہوئے سب سے پہلے تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہود کے مختلف گروہ تھے اور ان کی گمراہیاں اور ان کی خباثتیں قدرِ مشترک رکھتے ہوئے الگ الگ بھی تھیں۔ ان میں سے وہ گروہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسِ مبارک میں آتا جاتا تھا۔ وہ جس طرح زبان آوری کے پردے میں اور الفاظ کا چکمہ دے کر اور لہجہ اور پیرایہ بدل کر اپنی خباثتِ نفس کا اظہار کرتا اور اس طرح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ومرتبہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ قرآنِ کریم نے اس آیتِ کریمہ میں ان کا چہرہ بے نقاب کیا ہے۔ مسلمان چونکہ اپنی شرافتِ نفس سے ان کے باقاعدہ آنحضرت کی مجالس میں آنے کے باعث خوش فہمی کا شکار تھے اور اگر کوئی بات کھٹکتی بھی تھی تو خود ہی اس کی تاویل بھی کر لیتے تھے اور یا ان کی طرف سے تاویلات پر اعتماد کر لیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو ان باتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے کیونکہ آپ کی ذہانت اور ژرف نگاہی کے ساتھ ساتھ نبوت کا نور بھی کارفرما تھا آپ کو یقیناً معلوم تھا کہ وہ دبی دبی زبان میں کیا حرکتیں کرتے ہیں۔ لیکن آپ اپنے علوِ مرتبت، کرامتِ نفس اور اعلیٰ اخلاقی تحمل کے باعث ان کی باتوں کا نوٹس لینے پر بھی تیار نہیں ہوتے تھے بلکہ مسلسل نظرانداز فرما رہے تھے پروردگار نے اپنے علمِ کامل کی وجہ سے ایک تو ان کی نام نہاد شرافت کا پردہ چاک کیا اور دوسرا اپنے ولی اور نصیر ہونے کا اس طرح ثبوت دیا کہ ان کی ان خباثتوں پر گرفت فرمائی جن سے حضور برابر غضِ بصر سے کام لے رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عزت وحرمت کے معاملے میں نہایت متحمل ثابت ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے اپنی ذات کا انتقام کبھی کسی سے نہیں لیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جہاں اس کے پیغمبر خاموش رہتے ہیں وہ خود مداخلت فرما کر پیغمبر کی عزت کی حفاظت فرماتا ہے۔ اور ان لوگوں پر لعنت فرماتا ہے جو اللہ کے نبی کی عزت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری جگہ میں قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ''جو لوگ اللہ اور اسکے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں جیسے یہود اپنی زبانی خباثت سے پہنچاتے تھے اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت فرمائی ہے''۔ چنانچہ یہاں بھی اللہ کی غیرت وحمیت اپنا کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔

Marfat.com

یہود کی قومی شخصیت کی شناخت

دوسری بات جو اس آیتِ کریمہ کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جیسے جیسے آدمی اس آیت پر غور کرتا ہے ویسے ویسے اس کے سامنے یہود کی قومی شخصیت کی تہیں کھلتی جاتی ہیں۔ اندازہ فرمایئے! یہود مدینے کا وہ گروہ ہے جو مدینہ کو Dominate کر رہا ہے۔ وہ ہی اعتبار سے مدینہ کی ساری آبادی پر چھایا ہوا ہے۔ بازاروں پر اس کا تسلط ہے، کاروبار اس کے ہاتھ میں ہے، بہت سے باغات اس کے قبضے میں ہیں، اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے عرب قبائل پر اس کا علمی رعب ہے، ان میں بڑے بڑے علما اور مشائخ ایسے موجود ہیں جن کی علمی وجاہت بھی مسلم ہے اور بزرگی کی دھوم بھی ہے۔ ان کے اپنے تعلیمی ادارے ''مِدراس'' کے نام سے جابجا کام کر رہے ہیں، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہیں دنیوی وجاہت بھی حاصل ہے اور دینی عزت اور حرمت بھی۔ ایسے گروہ سے جن کا پس منظر کتاب سے رشتہ اور پیغمبروں سے انتساب ہے کسی طرح بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اللہ کے آخری پیغمبر کی مجلس میں جسے وہ اپنی کتابوں کی گواہی کی وجہ سے اچھی طرح پہچانتے بھی ہیں کمینی حرکتوں کا ارتکاب کریں گے۔ دنیوی اعتبار سے مہذب اور تعلیم یافتہ آدمی کسی بھی بڑے آدمی کی مجلس میں جائے اور ہر چند اس سے ہزار اختلاف رکھتا ہو لیکن وہ کبھی بھی یہ حرکت نہیں کرے گا کہ باتوں باتوں میں الفاظ بگاڑ کر یا لہجہ بدل کر اس کی توہین کرنے کی کوشش کرے یا اس کے پیروکاروں کو اس سے گمراہ کرنے اور دور کرنے کی سعی کرے۔ ہاں! وہ شخص کہ تہذیب اور تعلیم جس کے پاس نہیں گئی اور وہ اپنے معاشرے کا ایک آوارہ اور بدچلن آدمی ہے اس سے آپ یہ ضرور توقع کرسکتے ہیں کہ وہ جہاں بھی جائے گا ایسی حرکت ضرور کرے گا یا اس طرح کی گری ہوئی حرکتیں وہ شخص یا وہ گروہ کرسکتا ہے جو اپنی خودساختہ عصبیتوں میں اندھا ہو چکا ہو۔ ان باتوں کو اگر ذہن میں رکھیں تو یہود کے بارے میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ بیشک دنیوی وجاہت کے مالک تھے اور اپنے پاس علم بھی رکھتے تھے بااین ہمہ! اخلاقی قدروں سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا اور وہ اپنے تعصبات کا اس بری طرح شکار تھے کہ ان کے لئے بری سے بری حرکت کرنا بھی کوئی مشکل بات نہ تھی۔ یہ ان کی ایسی قومی خصلت ہے جس نے آج تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑا اور معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نبیوں کی توہین کرنا اپنے مخالف کے حوالے سے ہر کمینی حرکت کر گزرنا اور ہمیشہ کسی نہ کسی سازش میں لگے رہنا، یہ ان کی وہ شناخت ہے جس سے وہ اپنی تاریخ کے اولین عہد میں بھی پہچانے جاتے تھے اور ہر دور میں برابر اس کے شواہد ملتے ہیں اور آج کے دور میں بھی، جب کہ تہذیب اور مجلسی آداب کو ترقی کرنے کا بہت زعم ہے، ان کے اندر اپنی اس شناخت کے اعتبار سے کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

پیغمبروں کی توہین یہود کے ملی مقاصد میں شامل ہے

میں آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک اور حقیقت کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اللہ کے نبیوں اور اس کے نیک بندوں سے طبعی تنفر، ان کی توہین کرنے کی کوشش اور دنیا میں ہر خیر کے سرچشمے کو ناکام کر دینے کا جذبہ جس طرح ہم یہود میں دیکھتے ہیں اسی طرح عیسائیت میں بھی نظر آتا ہے۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے تو یہ کہنا چاہئے کہ یہ خصائلِ بد یہودیت کی شناخت نہیں بلکہ یہ کفر کے آثار ہیں۔ جو ہمیں یہود میں بھی نظر آتے ہیں اور عیسائیوں میں بھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ انہیں بار بار اس بات سے تشویش لاحق ہوتی ہے اور وہ اسے بدلنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں کہ پاکستان میں پیغمبروں کی عزت کے تحفظ کا جو قانون بن چکا ہے اسے کسی نہ کسی طرح ختم کیا جائے۔ انہیں کے زیرِ اثر ہمارے وہ

Marfat.com

دانشور اور وہ حکمران جو سراسر مغرب کے پروردہ ہیں اور امریکہ کے زلہ خوار ہیں وہ بھی انہیں کی جگالی کرنے لگتے ہیں حالانکہ نہایت سادہ سی بات ہے کہ ہم اگر اپنے رسولِ پاک کی عزت و حرمت پر کسی طرح کا غبار آنا بھی برداشت نہیں کرتے بلکہ ہم تمام انبیاء کرام کی عزت و حرمت کے پاسبان ہیں تو اس میں آخر ان کا کیا نقصان ہے؟ انبیاء و رسل کی حفاظت یا ان کی عزت کرنے سے ان کا کیا بگڑ جاتا ہے؟ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم انہیں اس کی کھلی چھٹی دے دیں کہ یہ ہمارے رسول پاک کے بارے میں جو چاہیں یاوہ گوئی کریں؟ مسلمان تو اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ اس کے ایمان اور اس کی غیرت کا تقاضا ہے۔ بفرضِ محال اگر انہیں اس کی آزادی مل جائے تو انہیں اس سے آخر ملے گا کیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کا قومی نفسیاتی مسئلہ بن گیا ہے۔ جس طرح بچھو کسی کو ڈسے بغیر نہیں رہ سکتا اسی طرح یہ لوگ جب تک اللہ کے نبیوں کی توہین نہ کر لیں ان کے خبثِ باطن کو تسکین نہیں ملتی۔

عیسائی بھی یہود کے ہمنوا ہیں

لیکن سوال یہ ہے کہ یہود کی تو یہ فطرت بن چکی ہے لیکن عیسائی اس معاملے میں ان کے ہمنوا کیوں ہیں؟ جس آدمی کی نظر عیسائیت کی تاریخ پر ہو اس کے لئے یہ بات سمجھنا بہت آسان ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام پر بڑی محدود تعداد میں لوگ ایمان لائے۔ آپ نے اپنے بارہ حواریوں کو دینی ذمہ داریاں سونپیں۔ یہی لوگ عیسیٰ علیہ السلام کی علمی اور دینی وارثت کے امین اور جانشین ٹھہرے۔ لیکن عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد جس شخص نے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو عیسائیت کی شکل دے دی جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عیسائیت نہیں اسلام لے کر آئے تھے۔ وہ وہ تھا جو عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں سینٹ پال کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ ایک یہودی عالم تھا اور اپنے مذہبی خیالات میں نہایت متعصب تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام جب تک دنیا میں اپنی دعوت پیش کرتے رہے اس شخص نے اس دعوت کو ناکام کرنے کیلئے عیسیٰ علیہ السلام کی سب سے زیادہ مخالفت کی۔ لیکن جیسے ہی عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھا لئے گئے یا یہود اور نصاریٰ کے عقیدہ کے مطابق انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا تو اس کے تھوڑے عرصے بعد اس شخص نے ایک ڈھونگ رچایا کہ میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بادلوں میں دیکھا ہے میں ان کے ہاتھ پر ایمان لے آیا ہوں اور انہوں نے مجھے اپنا جانشین قرار دیا ہے چونکہ آدمی نہایت ہوشیار، پڑھا لکھا اور با اثر تھا اس لئے تمام حواریوں پر غالب آ گیا۔ وہ بچارے چیختے ہی رہے لیکن اس نے یہودیت ہی کو ایک نئی شکل دے کر عیسائیت کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس منظم طریقے سے اس کا پرچار کیا کہ لوگوں نے اسی کو حقیقت جانا اور بعد میں ایمان لانے والے اسی پر ایمان لاتے رہے اور حواریوں کی جو مرتب کردہ انجیلیں ان کے تصورات کے خلاف تھیں ان کو مٹا دیا گیا۔ اس طرح سے یہودیت، عیسائیت کے نام پر عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کے دل و دماغ میں اتار دی گئی اور آج تک عیسائی اسی عیسائیت پر چل رہے ہیں۔ لیکن یہ عیسائیت وہ مذہب یا وہ دین نہیں جسے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے۔ ان کا عقیدہ تثلیث، ان کا کفارہ کا عقیدہ، دین و دنیا میں جدائی وغیرہ وہ تصورات ہیں جو انہوں نے یہودیت سے لئے اور بعض محققین کے مطابق ہندومت سے لئے اور انہیں عیسائیت میں شامل کر لیا اور یہ سب کچھ ایک یہودی نے کیا جس نے عیسائی ہونے کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔ اس سے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ یہودیت اور عیسائیت میں باوجود الگ الگ مذہب ہونے کے مسلمانوں کے معاملے میں یک رنگی کیوں ہے؟ اور کیوں اللہ کے نبیوں کے بارے میں دونوں ہی دشمنی کا رویہ رکھتے ہیں؟ اور انہیں ایسا ہر قانون کھٹکتا ہے جس میں اللہ کے نبیوں کی عزت کا تحفظ کیا گیا ہو۔ میں نے جو بات عرض کی ہے اگر اس حقیقت کو قبول نہ کیا جائے تو پھر بعض باتوں کا جواب

Marfat.com

دکھائی نہیں دیتا۔ مثلاً عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں کیونکہ کوئی مرد ان کا باپ نہیں۔ لیکن یہود ان کے نسب پر طعن کرتے ہیں اور نہ صرف کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ایک بےنسب آدمی سمجھتے ہیں بلکہ ان کی والدہ کو بھی نعوذ باللہ من ذلک بدچلن عورت خیال کرتے ہیں۔ یہ اتنا بڑا الزام اور اس قدر تکلیف دہ بات ہے کہ کوئی بھی غیرت رکھنے والی قوم اس طرح کے الزام لگانے والوں سے کوئی تعلق رکھنے کی روادار نہیں ہوسکتی۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ قرآنِ کریم جس نے آکر عیسیٰ علیہ السلام کی عزت وحرمت واضح کی ان کو اللہ کا نبی ثابت کیا، ان کے حیرت انگیز معجزات کا ذکر کیا اور ان کی والدہ محترمہ کو عفت مآب اور صدیقہ قرار دیا۔ لیکن عیسائی مسلمانوں کے اس احسان کے باوجود جب بھی کوئی تعلق قائم کرتے اور رشتہ جوڑتے ہیں تو وہ یہود سے جوڑتے ہیں اور دونوں ملکر مسلمانوں سے دشمنی کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہودیت اور نصرانیت اصل میں ایک ہی شجرِ خبیث سے نکلنے والی شاخیں ہیں۔ مسلمانوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ یہودیت اور عیسائیت کے اس رشتے کو سمجھیں اور اپنی خارجہ پالیسی طے کرتے ہوئے اس نقطے کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں۔

یہود کی طرف سے مجلسی الفاظ کا غلط استعمال

اب اس آیتِ کریمہ کے الفاظ کے آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کیجئے اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے باطنی بغض اور مخفی کینے کا اظہار کرنے میں کس چابک دستی کا ثبوت دیا تھا۔ سیدھے سادے اور معصوم مجلسی الفاظ کو اس طرح توڑ مروڑ کر ادا کرتے تھے کہ سننے والا بڑی مشکل سے محسوس کرسکتا تھا کہ یہ بدباطن ان سادہ سے الفاظ سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ہر زبان میں الفاظ کو اچھے یا برے مقاصد میں استعمال کرنے کیلئے نیت اور ارادہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک ہی طرح کے الفاظ نیت میں خرابی آنے کے باعث برائی کے پیغامبر بن جاتے ہیں اور نیت میں اصلاح ہونے کی وجہ سے محبت اور نیکی کی علامت ٹھہرتے ہیں۔ عربوں کی مجالس میں بولے جانے والے الفاظ ان کے روزمرہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ہر آدمی سمجھتا تھا کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ مثلاً جب ان میں سے کوئی بڑا آدمی یا ان کا سردار چھوٹے لوگوں کو یا اپنے ماتحتوں کو کسی بات کا حکم دیتا تو سننے والے یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ ہم اس حکم کیلئے آمادہ عمل ہیں اور آپ ہماری اطاعت میں انشاء اللہ کوئی کمی نہیں دیکھیں گے۔ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہتے کہ ''ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی''۔ لیکن ان بدبخت یہود نے یہ رویہ اختیار کر رکھا تھا کہ جب حضور کی مجلس میں آتے تو اپنی سعادت مندی اور وفاداری کی نمائش کیلئے آگے بڑھ کر سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہتے تاکہ مسلمانوں کو ان کے اخلاص کا یقین آجائے۔ لیکن اپنے خبثِ باطن کی تسکین کیلئے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کی بجائے سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا کہتے۔ لب ولہجہ کو اس طرح بدلتے کہ سننے والے کو دونوں میں فرق کرنا مشکل ہوجاتا چونکہ دونوں کے حروف ہم آہنگ اور قریب المخرج ہیں اس وجہ سے اس تحریف میں ان کو کامیابی ہوجاتی۔ اسی طرح جب حضور کی مجلس میں سے کوئی صاحب آنحضرت سے کوئی بات کہنا چاہتے تو وہ کہتے اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ جس کا معنی یہ ہے ''آپ میری بات سنئے اور آپ ایسے محترم ہیں کہ آپ کو کوئی بات خلافِ مرضی نہیں سنائی جاسکتی''۔ لیکن یہود جب اس جملے کو استعمال کرتے تو وہ اس سے یہ مراد لیتے کہ ''ہماری بات سنئے اور تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں کوئی کچھ سنائے'' اور دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ ''خدا کرے تم بہرے ہوجاؤ''۔ بعض اہلِ علم نے اس کا اور مفہوم بھی بیان کیا ہے کہ اس فقرے کا لفظی معنی یہ ہے کہ ''سنئے وہ بات جو اس سے پہلے سنائی نہیں گئی''۔ جب کسی خطیب یا متکلم کو یہ فقرہ کوئی مخاطب کہتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ آپ نے ایک ایسی بلند بات کہی ہے جو اس سے پہلے کبھی سنائی نہیں گئی یا ایک سامع دوسرے سامع کو متوجہ کرکے یہ فقرہ بولتا اور مقصود اس کا یہ ہوتا کہ ذرا غور سے اس بات کو سنیے ایسی دانشمندانہ اور حکیمانہ

Marfat.com

بات اس سے پہلے کبھی ہمارے کانوں نے نہیں سنی۔ اس طرح لوگ اپنے خطیبوں کو داد دیتے یا اپنی طرف سے قدردانی کا ثبوت دیتے اور دوسروں کیلئے اس طرح تشویق اور ترغیب کا سامان کرتے۔ لیکن یہود اسی خوبصورت جملے کو اپنی بد باطنی کے باعث لہجہ بدل کر تمسخر کے انداز میں اس طرح ادا کرتے جس کا مفہوم یہ ہو جاتا کہ "ذرا سنیئے اس شخص کی بات جو پہلے کبھی نہیں سنی گئی۔ یعنی یہ شخص کیسی بے پر کی اڑا رہا ہے اور یہ بات اس قابل نہیں کہ اسے سنا جا سکے۔ اندازہ کیجئے کہ محض انداز اور لب ولہجہ کی تبدیلی سے کس طرح ایک معصوم لفظ کو بد باطنی کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔ پروردگار نے اس پر حکم دیا کہ یہ سارا فساد چونکہ غَیْرَ مُسْمَعٍ سے پیدا ہوتا ہے اور یہ بد باطن یہود اسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے آج کے بعد کسی کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ آنحضرت کی مجلس میں غَیْرَ مُسْمَعٍ کا استعمال کرے۔

عرب اپنی مجلسوں میں جب کسی بات کو سمجھنا چاہتے یا وہ کسی بات کو پوری طرح سن نہیں پائے اور وہ اس کو دوبارہ سننا چاہتے تو وہ کہتے رَاعِنَا ۔ صحابہ بھی آنحضرت کے سامنے یہ لفظ بولتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ آپ دوبارہ ارشاد فرمادیجئے، آپ ہماری رعایت فرمایئے تا کہ ہمیں سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔ لیکن ان بدبخت یہود نے رَاعِنَا کو زبان کے توڑ مروڑ کے ذریعے سے طنز کے قالب میں ڈھال دیا۔ وہ رَاعِنَا میں "ع" کے کسرہ کو ذرا دبا دیتے تو یہ لفظ رَاعِینَا بن جاتا۔ جس کا معنی ہے "ہمارا چرواہا" اتنے سے نازک فرق کو دوسرے سننے والے محسوس بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن یہود اس طرح کی حرکتوں سے اپنے طور پر خوش ہوتے تھے کہ ہم نے اپنے خبثِ باطن کے اظہار کیلئے ایک راستہ نکال لیا ہے اور اس طرح وہ اپنی بھڑاس نکالنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ پروردگار نے یہود کی اس شرارت کو روکنے کیلئے اس لفظ کو سرے سے مسلمانوں کے مجلسی الفاظ ہی سے خارج کر دیا اور اس کی جگہ اُنْظُرْنَا کے استعمال کی ہدایت فرمائی۔ جس کے معنی ہیں "ذرا ہمیں مہلت عنایت فرمایئے، ذرا ہم پر توجہ فرمایئے"۔ یعنی مفہوم کے لحاظ سے یہ ٹھیک ٹھیک رَاعِنَا کا قائم مقام ہے لیکن اس میں لہجہ کے بگاڑ سے غلط فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہیں۔

اس آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ اہلِ کتاب کا یہ گروہ اپنا علمی پس منظر رکھنے کے باعث آنحضرت کی مجلس میں جا کر جو کمینہ حرکتیں کرتا ہے اس کی ان سے ہرگز توقع نہیں ہو سکتی کیونکہ ایسی حرکتیں تو معمولی آدمی بھی نہیں کرتا۔ لیکن یہ ساری حرکتیں اس لئے کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے کفر اور بد اعمالیوں کے باعث اپنی قسمت پھوڑ لی ہے۔ پروردگار بڑے سے بڑے گناہ گاروں کو مہلت پر مہلت دیتا رہتا ہے۔ لیکن جب ان کا کفر عناد میں تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ اپنے کفر اور گمراہی پر عصبیت کے پیکر بن جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پیغمبر کی عزت بھی ان کے ہاتھ سے محفوظ نہیں رہتی تو پھر اللہ کا غضب بڑھکتا ہے تو ان پر لعنت کی پھٹکار ماری جاتی ہے۔ یہ لوگ بھی چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین تک پہنچ گئے ہیں اور یہ طریقے طریقے سے یہ حرکت کر گزرنے سے دریغ نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی پاداش میں ان پر لعنت فرمادی ہے۔ لعنت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ہدایت اور رحمت سے انہیں دور کر کے ان کی محرومی کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اسی لعنت کا نتیجہ دلوں پر مہر لگ جانے کی صورت میں نکلتا ہے۔ اب ان لوگوں سے ایمان کی کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ البتہ! ان میں ایک بہت معمولی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو کفر، دشمنی اور عناد کی آخری حد تک نہیں پہنچے ان کے بارے میں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایمان کی دولت سے بہرہ ور فرمائیں گے۔

Marfat.com

نبی پر طعن خود دین پر طعن ہے

اس آیتِ کریمہ میں آپ نے دیکھا ہے کہ یہود کی تمام خباثتیں اور شرارتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان کرنے اور ان کے مقام و مرتبہ کو ہدف بنانے کیلئے تھیں۔ لیکن قرآنِ کریم نے اسے طعناً فی الرسول نہیں بلکہ طعناً فی الدین کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ جس سے ایک بہت بڑی حقیقت سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے وہ یہ کہ نبی حقیقت میں مجسمۂ دین اور مظہرِ شریعت ہوتا ہے۔ اس کی زبان سے اللہ کا قانون بولتا ہے، اس کے عمل سے شریعت کو عملی شکل ملتی ہے، اس کی سعی و کاوش سے دین کو غلبہ ملتا ہے، اسی کی دعوت و تبلیغ سے دین لوگوں تک پہنچتا ہے اور لوگ حلقہ بگوشِ دین ہوتے ہیں، اس کی ذات دین کا پیغام بھی ہے اور دین کی شناخت بھی۔ جیسے جیسے اس کی ذات سربلند ہوگی ویسے ویسے اللہ کا دین سربلند ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی شخص اللہ کے نبی پر طعن توڑتا ہے اور اسے نشانہ بناتا ہے، وہ درحقیقت دین پر طعن کرتا ہے اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ جب ہم سابقہ امتوں کی گمراہیوں کی تاریخ پڑھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی گمراہی کا آغاز اللہ کی کتاب کے مٹنے سے نہیں ہوا بلکہ سب سے پہلے اللہ کے رسول سے ان کا تعلق ٹوٹا، اس کی شخصیت سے لاتعلق ہو گئے، اس کا اسوہ اور اس کی سنت ان کی زندگیوں سے نکل گئی۔ جس کے نتیجے میں کتاب سے بھی ان کا رشتہ قائم نہ رہا، کتاب باقی رہی بھی تو انہوں نے اسے موم کی ناک بنا کر رکھ دیا۔ امتِ مسلمہ کو بھی اس بات کی شدید فکر کرنی چاہئے اور اس آیت کے آئینہ میں تو ان کا احساس مزید تیز ہو جانا چاہیے کہ وہ اگر مسلمان کی حیثیت سے دنیا کی قوموں میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں اور انہیں واقعی ایک آبرومندانہ زندگی عزیز ہے تو پھر انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے اپنے رشتے کو کمزور نہیں ہونے دینا چاہیے اور ایسی ہر کوشش کو ناکام بنا دینا چاہیے۔ جس کے نتیجے میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام اور محبت میں کمی آتی ہو اور یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ حضور کی عزت و حرمت کا تحفظ یقیناً قوانین سے بھی ہونا چاہیے لیکن اس تحفظ کی اصل ضمانت مسلمانوں کے اس جذبے میں مضمر ہے جو جذبہ انہیں بعض دفعہ اللہ کے نبی کی عزت و حرمت کے لئے جان دینے پر اکساتا ہے۔ ظفر علی خان مرحوم نے اپنے بڑھاپے کے دنوں میں کانپتے ہوئے لہجے میں مسلمان امت کو پیغام دیتے ہوئے فی البدیہہ شعر کہے تھے۔

نماز اچھی روزہ اچھا و حج اچھا زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود ان کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝

Marfat.com

(اے وہ لوگو! جن کو کتاب دی گئی اس چیز پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتاری ہے تصدیق کرنے والی ان پیشگوئیوں کی جو خود تمہارے پاس موجود ہیں اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور ان کو ان کے پیچھے کی جانب الٹ دیں یا ان پر بھی اسی طرح لعنت کریں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کی اور اللہ کی بات شدنی ہے) (النسآء : ۴۷)

اتمام حجت

گزشتہ آیت کے آخر میں آپ نے دیکھا کہ پروردگار نے یہود پر لعنت فرمائی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایک دریچہ کھلا رکھا ہے: فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلاً ''لعنت کے سبب وہ ایمان کے اہل نہیں رہے لیکن کچھ لوگوں میں تھوڑی سی صلاحیت باقی ہے اور ان کی روح کی موت واقع ہونے میں کچھ سانس باقی ہیں جس کی وجہ سے ایک محدود تعداد ایمان لا سکتی ہے''۔ شاید انہیں سے خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے: ''اے وہ لوگو! جن کو کتاب دی گئی ہے ہماری نازل کردہ کتاب اور ہمارے مبعوث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ یہ تمہارے لئے آخری موقعہ ہے''۔ لیکن ساتھ ہی غضب ناک انداز میں فرمایا: اگر تم ایمان نہیں لاتے تو پھر یاد رکھو تمہاری پوری قوم کے اب تک کے طرز عمل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم کسی رحم کے مستحق نہیں ہو بلکہ تم اپنی بداعمالیوں اور بداطواریوں کے باعث اس قابل ہو گئے ہو کہ تمہارے چہرے بگاڑ دیئے جائیں اور تم پر سبت والوں کی طرح عذاب آئے اور تم ذلیل بندر بنا دیے جاؤ۔ سبت والوں کا ذکر اس سے پہلے سورۃ البقرۃ میں گزر چکا ہے۔ وہاں جن الفاظ میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اتنا مشہور اور اتنا عام تھا کہ اس کے ثبوت کیلئے کوئی بات کہنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ وہاں فرمایا: وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ (تم خوب جانتے ہو) یہ واقعہ تمہارا جانا پہچانا ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ساحلِ سمندر پر رہنے والوں نے کیسی کیسی نافرمانیاں کیں اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ نے کس طرح ان کی شکلیں بگاڑ کر انہیں بندر بنا دیا تھا اور پھر تم اس سے بھی ناواقف نہیں ہو کہ ان کا یہ انجام بعد کے آنے والوں کیلئے عبرت بن گیا تھا اور آج بھی تم اس واقعہ کی تفصیلات سے واقف ہو۔ اگر تم اس پر غور کرو تو تمہیں یہ بات سمجھنے میں دشواری نہیں ہو گی کہ تمہاری موجودہ بداعمالیاں اور بداطواریاں ان سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اگر ان کی شکلیں بگاڑ دی گئیں اور ان کے چہرے مسخ کیے گئے تو تم بھی یقیناً اس کے مستحق ہو چکے ہو۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے تمہارے انجام کے بارے میں تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ اب اگر تم اپنے دشمن نہیں ہو گئے ہو تو تم اپنے اس انجام سے بچنے کی کوشش کرو جو تمہارے سر پر تقدیر بن کر کھڑا ہے اور یہ تمہیں غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اللہ کو ایسی سزا دینے میں کوئی دشواری پیش آ سکتی ہے کیونکہ جب تم جانتے ہو کہ تمہی میں سے ایک گروہ اس انجام سے دوچار ہو چکا ہے اور اس وقت قدرتِ حق کو اپنے فیصلے کے نفاذ میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تو اب کیا پیش آ سکتی ہے۔ اس کے اور اس کے نفاذ میں کوئی فاصلہ نہیں ہوتا ادھر حکم ہوتا ہے ادھر نافذ ہو جاتا ہے۔ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلاً

چہروں کو مسخ کرنے کا مفہوم

بعض لوگوں کو اس میں یہ شبہ لاحق ہوا ہے کہ یہود کو جس سزا کی دھمکی دی گئی تھی وہ سزا ان پر نافذ تو نہیں ہوئی کیونکہ دورِ نبوت کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہود کے چہرے مسخ نہیں کیے گئے تو پھر آخر اس دھمکی کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ بعض علما نے تو یہ کہا کہ ان سزاؤں کا نفاذ آخرت میں ہو گا اور مِنْ قَبْلِ ہمیشہ کسی واقعہ کے واقع ہو جانے پر ہی دلالت نہیں کرتا بلکہ صرف اس کے ہو سکنے پر بھی دلالت کرتا ہے اور

Marfat.com

تہدید میں آتا ہے اور اس معنی میں اس کا استعمال قرآن وسنت میں کثرت سے ہوا ہے۔ بعض دیگر اہلِ علم کا خیال ہے کہ مرنے سے پہلے ہر یہودی کا چہرہ مسخ کیا جاتا ہے۔ یہ تمام اشکال طلب باتیں ہیں لیکن ہم نے جس طرح اس کی وضاحت کی ہے اگر اسے غور سے پڑھا جائے تو یہ بات سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ یہود سے یہ نہیں کہا گیا کہ تم اگر ایمان نہیں لاؤ گے تو ہم تمہارے چہرے بگاڑ دیں گے بلکہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری بداعمالیوں اور تمہاری سرکشیوں نے تو یقیناً تمہیں اس سزا کا مستحق بنا دیا ہے کیونکہ تم کسی طرح سے بھی سرکشی اور نافرمانی میں اصحابِ سبت سے کم نہیں ہو۔ رہی یہ بات کہ یہ سزا تم پر نافذ ہوگی یا نہیں اس کا تعلق سراسر اللہ کی مشیت اور اس کی حکمت سے ہے۔ اس کی مشیت اور حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ اصحاب السبت کو چہرے بگاڑ کر جس طرح بعد کے آنے والوں کیلئے عبرت بنایا گیا تھا اور ان کی غیر معمولی موت لوگوں کیلئے ایک سبق آموز واقعہ بن کر رہ گئی تھی۔ آج کے یہود کو عبرت بنایا جائے لیکن چہرے بگاڑ کر نہیں قومی تشخص بگاڑ کر ان کا جغرافیہ ان سے چھین کر، ان کی وجاہتوں کو ذلت میں تبدیل کر کے، ان کا وطن چھین کر اور مختلف قوموں میں ان کو بکھیر کر ہر قوم کی جانب سے ان کو پٹوا کر اور ان کا قتلِ عام کرا کر۔ اصحاب سبت کو صرف تین دن زندہ رکھا گیا اور انہوں نے اپنا عذاب تین دن تک دیکھا۔ لیکن انہیں ہزاروں سال کی زندگی دی گئی تا کہ ہزاروں سالوں میں آنے والی نسلیں ان کے انجام سے عبرت پکڑیں۔ آپ ذرا اندازہ فرمایئے! مدینے میں یہ کس شان وشوکت سے رہتے تھے۔ اپنی افرادی قوت، مالی حیثیت، سیاسی طاقت اور علمی وجاہت کی وجہ سے انہیں مدینہ میں غیر معمولی حیثیت حاصل تھی۔ اوس وخزرج ان کے ساہوکاری قرضوں میں بری طرح جکڑے ہوئے تھے، خود چونکہ امی محض تھے اس لئے ان کی علمی وجاہت سے ہمیشہ مرعوب رہتے تھے۔ یہود میں بعض سردار تو ایسے ظالم اور کمینہ ثابت ہوئے تھے کہ اوس وخزرج یا ان کی بعض شاخوں پر ان کے اثرات کا عالم یہ تھا کہ ان کی بیٹیاں سہاگ رات ان ظالموں کے گھروں میں گزارتی تھیں۔ عربوں کی غیرت وحمیت مشہور ہے اوس وخزرج بھی قحطانی عرب تھے۔ بایں ہمہ! یہ بے غیرتی اور بے حمیتی کا کاروبار مدینہ میں ہوتا تھا۔ بازاروں کے نرخ ان کی مرضی سے طے ہوتے تھے۔ مالِ تجارت پر پوری طرح ان کے مفادات کا قبضہ تھا۔ اوس وخزرج کی شادیاں ان کے سودی قرضوں کے بغیر نہیں ہو سکتی تھیں۔ جس قوم نے اتنی شان وشوکت سے صدیوں زندگی گزاری ہو، اس کیلئے حوادث کا یہ رنگ کہ سب سے پہلے بنوقینقاع کی عبداللہ بن ابی کے غیر معمولی اصرار پر جان بخشی تو کر دی گئی لیکن انہیں شہر بدر کر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اونٹوں پر لاد کر جو لے جا سکتے ہو لے جاؤ اس کے علاوہ تمہیں کچھ لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ پھر ایک وقت آیا کہ یہود کا دوسرا معزز قبیلہ بنونضیر اپنے انجام کی گرفت میں آیا اور ان کو بھی انہیں شرائط کے ساتھ مدینہ بدر کر دیا گیا اور یہ دونوں قبیلے خیبر میں جا کر آباد ہو گئے۔ تیسرا قبیلہ بنوقریظہ باقی رہ گیا۔ جنگِ خندق میں انہوں نے جس طرح عہد شکنی کی اور صاف اعلان کر دیا کہ ہم نہیں جانتے ''محمد'' کون ہے اور اس کے ساتھ ہونے والا عہد کیا ہے۔ انہوں نے آستین کا خنجر بن کر قریش کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا اور بروقت اگر اللہ کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو مسلمانوں کیلئے قیامت برپا ہو جاتی۔ ان کی عہد شکنی کی پاداش میں جب ان کا محاصرہ کیا گیا تو بجائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتماد کرنے کے انہوں نے اپنے پرانے حلیف حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے بارہ میں اصرار کیا کہ وہ ہمارا فیصلہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے وہ فیصلہ کیا جو ایک مخلص مومن کر سکتا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں تمہارا فیصلہ تمہاری کتاب تورات کے مطابق کروں گا۔ تورات کا فیصلہ یہ ہے کہ جس قوم پر عہد شکنی کا جرم ثابت ہو جائے اس کے بالغ مردوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کے بچوں اور عورتوں کو غلام بنا لیا جائے۔ چنانچہ اسی فیصلے پر عمل ہوا۔

Marfat.com

غور فرمائیے! قوموں کی اجتماعی عزت ،اجتماعی وقار ان کا اصل چہرہ ہوتا ہے۔کہاں تو یہود کا وہ چہرہ جس میں دولت، وجاہت، ہیبت، اورعزت کی علامتیں رخشندہ تھیں اور کہاں ان کا یہ چہرہ جس پر ملک بدری، شہر بدری، ذلت، نکبت اور قتلِ عام کے داغ دکھائی دیتے ہیں۔ان دونوں کا تقابل کیجئے اور پھر دیکھئے چہرے بگاڑنا اور کسے کہا جاتا ہے؟ جو بادشاہ اپنے تاج سے پہچانا جاتا ہے اسے مجرموں کے کٹہرے میں اگر جوتوں سے تواضع کی جائے تو اس کے چہرے کو کون پہچانے گا؟ ہوسکتا ہے چہرے بگاڑنے سے پروردگار نے ان کی پوری تاریخی اور قومی حیثیت کو بگاڑنا مراد لیا ہو۔اسی سے ملتی جلتی بات ہمارے متقدمین میں سے صاحب کشاف اور امام بیضاوی نے بھی کہی ہے۔ان کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ وجوھا سے مراد یہ ہے کہ ان کے سرداروں کو ذلیل وخوار کیا جائے گا اور ہم ان کی وجاہت واقبال کو سلب کرلیں گے اور ان پر ذلت وادبار نازل کریں گے۔حقیقی مفہوم تو اللہ بہتر جانتا ہے لیکن آج بھی باوجود اس کے کہ اسرائیل نام کی ایک حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔جنہیں وہ اپنے دنیوی خداؤں اور آقایانِ ولی نعمت کی پشتیبانی، مدد اور اعانت سے اسلحہ کی چھاؤنی میں بدلنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔اس کے باوجود وہ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی آباد ہیں کوئی شخص بھی ان کا ذکر عزت کے ساتھ کرنے کیلئے تیار نہیں۔سیاسی اور عالمی حالات کے تناظر نے یہود کو ایک خاص اہمیت دے دی ہے بلکہ بدمعاشوں کے اڈے کی طرح عربوں کی تباہی اور بربادی کیلئے امریکہ اور مغربی قوتیں انہیں استعمال کررہی ہیں۔جیسے ہی یہ حالات بدلے لوگ انشاءاللہ دیکھیں گے کہ انہیں قوتوں کے ہاتھوں ان بچھوؤں کا سر کچلنے کا قدرت کام لے گی کیونکہ یہود نے آج تک کبھی کسی سے وفا نہیں کی۔یہ بڑی طاقتیں آج ان کے بارے میں اگر قرارداد مذمت بھی پاس کرنے کی اجازت نہیں دیتیں لیکن دل سے ہر قوم جانتی ہے کہ یہ قوم قابلِ نفرت افراد کا گروہ ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَایَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ج
وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِافْتَرٰٓی اِثْمًا عَظِیْمًا o

(بے شک اللہ نہیں بخشے گا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور بخش دے گا اس کے علاوہ جس کیلئے چاہے گا اور جو شخص اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے وہ ایک بہت بڑے گناہ کا افتراء کرتا ہے) (النسآء : ۴۸)

یہود پر لعنت کا اصل سبب شرک ہے

سابقہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ یہود کی بداعمالیوں اور نافرمانیوں کے نتیجے میں اللہ نے صرف ان پر لعنت ہی نہیں فرمائی بلکہ یہ بھی فرمایا کہ تم اپنی سرکشی کے باعث اس بات کے مستحق ہوچکے ہو کہ تمہارے چہرے بگاڑ دیئے جائیں اور تمہاری شکلیں مسخ کردی جائیں۔پیش نظر آیتِ کریمہ میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہود اپنے اس برے انجام کو اچانک نہیں پہنچے اور ان کے اندر سرکشی بھی اچانک پیدا نہیں ہوئی۔یہ تمام بگاڑ اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ انہوں نے دین کی بنیاد اکھاڑ دی۔اسلام کی بنیاد جن بنیادی اعتقادات پر رکھی گئی ہے ان میں سب سے اہم عقیدہ ''عقیدۂ توحید'' ہے۔جب اس میں خرابی پیدا ہوتی ہے تو دین کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اور اس تصور کے بگڑنے یا کمزور ہونے سے اور اس کے دین سے رشتہ کمزور ہوجاتا ہے۔انسان کی پوری زندگی اور اس کے رویوں کا تعلق تمام تر اس بات سے ہے کہ وہ کون سی

Marfat.com

ہے جس کو وہ سب سے بڑا سمجھتا ہے، جسے وہ اپنا محسن خیال کرتا ہے، زندگی اور موت جس کے قبضے میں جانتا ہے، تمام اختیارات کا جسے مالک سمجھتا ہے، اس کے علم کو ہر غلطی سے پاک اور اس کی قدرت کو ہر نارسائی سے بالا سمجھتا ہے، جس کے بارے میں اسے یقین ہے کہ رہنمائی اور آئین دینے کا حق صرف اسی کو ہے کیونکہ اس کا علم ہر خطا سے پاک ہے اور اس کی ذات ہر مفاد سے بلند ہے اور وہی ہے جسے زندگی میں کئے ہوئے ہر عمل اور ہر فیصلے کے بارے میں جواب طلبی کا اختیار ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جس پر زندگی کے صحیح یا غلط ہونے کا انحصار ہے۔ اگر تو ان اصولی باتوں اور اساسی تصورات کو وہ اللہ وحدہٗ لاشریک سے متعلق سمجھتا ہے اور ان باتوں میں کسی اور کو شریک نہیں ٹھہراتا تو اس کی زندگی ایک مومن کی زندگی ہوگی اور اگر وہ ان باتوں کا مستحق دوسری قوتوں کو سمجھتا ہے تو پھر وہ قوتیں اس کی زندگی میں دخیل ہوں گی اور اس کے حسن و قبح کا تعین انہیں کے حوالے سے ہوگا۔

توحید کا مفہوم

توحید کی تین قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ ان تینوں کے حوالے سے پوری زندگی کے تصورات کو متعین کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ توحید فی الذات، ۲۔ توحید فی الصفات، ۳۔ توحید فی الحقوق

توحید فی الذات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ذات میں کوئی شریک نہیں۔ نہ کوئی اس کا باپ ہے نہ بیٹا نہ اس کی کوئی بیوی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے اپنی ذات میں تنہا ہے۔ باقی سب مخلوقات ہیں وہ خالق ہے۔ ہر چیز فانی ہے وہ باقی ہے۔ کوئی اس کے مشابہ نہیں۔ سب اس کے محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں۔

توحید فی الصفات کا مطلب یہ ہے کہ اس کی خصوصی صفات میں کوئی شریک نہیں۔ اس کی عمومی صفات میں بھی من کل الوجود کوئی اس جیسا نہیں اس کی خصوصی صفات میں اس کا بے عیب اور ہمہ گیر علم بھی ہے، اس میں کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یعنی کسی بزرگ یا کسی پیر کے ساتھ یہ اعتقاد رکھنا کہ ہمارے سب حال کی اسے ہر وقت خبر ہے۔ نجومی یا پنڈت سے غیب کی خبریں دریافت کرنا یا کسی بزرگ کے کلام میں فال دیکھ کر اس کو یقینی سمجھنا یا کسی کو دور سے پکارنا اور یہ سمجھنا کہ اس کو خبر ہوگئی ہے یا کسی کے نام کا روزہ رکھنا وغیرہ

توحید فی الحقوق کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات اور صفات سے جو حقوق لازم آتے ہیں اس میں کسی کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً جب ہم اس کی قدرتِ کاملہ کو مانتے ہیں تو اس سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ دنیا میں تصرف کا حق اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں۔ اس لئے کسی کو نفع یا نقصان کا مختار سمجھنا کسی سے مرادیں مانگنا، روزی اور اولاد مانگنا، یہ شرک فی الحقوق میں شامل ہے۔

اسی طرح جب ہم اللہ کو سب سے بڑا، سب سے زیادہ احترام کا مستحق اور پرستش اور پوجا کا تنہا مالک سمجھتے ہیں تو عبادت بھی اسی کی ہونی چاہیے۔ یہ وہ حق ہے جو ان صفات کو ماننے سے خود بخود ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے کسی کو سجدہ کرنا، کسی کی نماز پڑھنا، کسی کی بارگاہ کا طواف کرنا، کسی کے نام کا جانور چڑھانا، چڑھاوے چڑھانا، کسی کے نام کی منت ماننا، خدا کے حکم کے مقابلہ میں کسی دوسرے کے قول یا رسم کو ترجیح دینا کسی کے روبرو رکوع کی طرح جھکنا، کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا، دنیا کے کاروبار کو ستاروں کی تاثیر سے متاثر سمجھنا، اور کسی مہینہ کو منحوس سمجھنا وغیرہ، سب حرام ہے اور شرک ہے۔

Marfat.com

شرک افتراءِ عظیم

آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا کہ شرک اللہ پر ایک افتراءِ عظیم ہے، جس کو پروردگار کبھی معاف نہیں فرمائیں گے۔ افتراء کہتے ہیں ''جھوٹ باندھنے کو''۔ مشرک لوگ جب اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں تو ساتھ ہی یہ جھوٹ بھی باندھتے ہیں کہ اللہ ہی نے ہمیں اس کا اختیار دیا ہے۔ وہ اگر ایسا نہ چاہتا تو ہم کبھی ایسا کرنے پر قادر نہ ہوتے اور کبھی تو صاف صاف اس کے پیغمبروں کے واسطے سے یہ جھوٹ باندھا جاتا ہے کہ ان پیغمبروں نے ہمیں اس شرک کی تعلیم دی ہے۔ غور فرمایئے! جو قوم بھی اس طرح کے شرک کا ارتکاب کرے گی اس کی اعتقادی اور عملی زندگی میں وہ خرابیاں یقیناً پیدا ہوں گی۔ یہود کے حوالے سے جن خرابیوں کا ذکر ہو چکا ہے کیونکہ ان میں بھی یہ خرابیاں عقیدۂ توحید چھوڑنے اور شرک کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔

حاصل کلام یہ کہ جو قوم بھی اس مکروہ شرک میں مبتلا ہوگی اور اپنی پوری دینی زندگی کو تباہ کر دے گی اس کا مقدر اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کی طرف سے اس پر لعنت کی جائے۔

یہاں ایک بات یاد رکھنا بہت ضروری ہے وہ یہ کہ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اللہ شرک کو کبھی نہیں بخشے گا اس کے علاوہ بڑے سے بڑے گناہ کو بھی چاہے گا تو بخش دے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوسرے گناہوں پر آدمی دلیر ہو جائے اس لئے کہ اللہ کی نافرمانی اور اس کی معصیت پر دلیر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص نے اللہ کی کبریائی اور اس کے مطاع مطلق ہونے کا انکار کر دیا کیونکہ اگر وہ اللہ کو سب سے بڑا سمجھتا اور اسکی اطاعت کو حرفِ آخر جانتا تو کبھی اس کی نافرمانی کی جرأت نہ کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نافرمانی پر دلیر ہونا اور اس کی کبریائی تصور دل سے نکال دینا بجائے خود شرک ہے اور شرک کو تو اللہ کبھی معاف نہیں کرتا۔ مزید یہ بات کہ اللہ کی مشیت اللہ ہی کے چند مقرر کردہ قوانین کی پابند ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ میں حقوق اللہ کو تو معاف کر سکتا ہوں لیکن حقوق العباد کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ جن بندوں کے حقوق تلف کیئے گئے ہیں جب تک وہ معاف نہیں کریں گے اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا اور مزید یہ بھی فرمایا کہ میں گناہِ کبیرہ اس وقت معاف کرتا ہوں جب گناہ کرنے والا اس گناہ پر توبہ کرتا ہے۔

ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم توحید کو کبھی نقصان نہ پہنچنے دیں۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور اس کی نافرمانی پر کبھی دلیر نہ ہوں اور کبائر پر ہمیشہ توبہ کرنے کی کوشش کریں۔ محض خانہ پُری سے پروردگار کبھی معاف نہیں فرماتا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ ؕ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ۝

(کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ ٹھہراتے ہیں بلکہ اللہ ہی ہے جو پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا) (النسآء : ۴۹)

Marfat.com

اہل کتاب کے شرک کی مثال

اہلِ کتاب کے اللہ کے ساتھ شرک کرنے کی یہ ایک مثال بیان کی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو برابر پیدا فرمایا ہے اور ہر ایک کی نجات کیلئے ایمان وعمل کو لازم ٹھہرایا اور ایمان وعمل کی بنیاد پر ہی اس نے درجات عطا فرمائے اور انہیں دونوں کی وجہ سے قیامت کے دن جزاوسزا کا فیصلہ ہوگا۔جو اللہ کے ساتھ شریک نہیں ٹھہرائے گا ایمان کے تقاضوں کو پورا کرے گا اور اپنے نامۂ عمل کو اعمالِ صالحہ سے روشن کرے گا اور ساری زندگی اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری میں گزارے گا تو یہ وہ شخص ہوگا جسے قیامت کے دن پاک ٹھہرایا جائے گا اور یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ اپنی پاکیزگی کے باعث اس قابل ہے کہ اسے جنت میں بھیج دیا جائے۔لیکن جو حساب کتاب اور اعمال کے تول میں ناکام ثابت ہوا اور جس نے اپنا نامۂ عمل اعمال بد کی گندگیوں سے داغ دار کرلیا یا اپنے عقیدہ میں شرک کی غلاظت پیدا کرلی تو اللہ تعالیٰ اسے پاکیزہ نہیں ٹھہرائیں گے بلکہ اسے گندہ اور ناپاک قرار دے کر جہنم میں پھینک دیں گے لیکن یہود نے اپنے طور پر یہ عقیدہ بنا رکھا تھا کہ ہم اللہ کے چہیتے اور اس کے بیٹے ہیں۔اس لئے ہم دوسروں سے برتر اور برگزیدہ ہیں۔ہمارے ایمان وعمل میں چاہے کیسی خرابیاں کیوں نہ ہوں ہم چونکہ اللہ سے اور اس کے نبیوں سے انتساب رکھتے ہیں اس لئے ہماری پاکیزگی کبھی مجروح ہونے والی نہیں،ہم کیسی ہی زندگی گزاریں ہمیں جہنم کی آگ چھو بھی نہیں سکتی۔اس طرح کے خانہ ساز تصورات کے تحت انہوں نے اپنی زندگی کو ایمان وعمل سے بالکل بے نیاز کردیا تھا بلکہ وہ بندگی کے دائرے سے نکل کر الوہیت کے زمرے میں شامل ہوگئے تھے۔تزکیہ اور پاک ٹھہرانا یہ سراسر اللہ کی صفت ہے،لیکن وہ اسے اپنی صفت بنا چکے تھے۔دنیا میں جس طرح عزت وذلت کے فیصلے اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں اسی طرح آخرت میں بھی جزاوسزا کا فیصلہ اسی کے اختیار میں ہے لیکن انہوں نے اسے اپنے اختیار میں لے کر اپنے آپ کو اللہ کا شریک بنالیا تھا۔ان کے اس رویے کو شرک کی مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پوری زندگی شرک کی تصویر بن گئی تھی۔

آیت کے آخر میں ایک نہایت نازک بات ارشاد فرمائی گئی ہے وہ یہ کہ یہود یہ نہ سمجھیں کہ چونکہ انہوں نے شرک کا کاروبار جاری کر رکھا ہے اور ان کی زندگیوں میں سرکشی کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا اور اللہ نے ان پر لعنت کی پھٹکار ماری ہے۔بنابریں ہونا تو یہ چاہیے کہ ان کے ساتھ نہایت سخت سلوک کیا جائے لیکن یہاں فرمایا جارہا ہے کہ وہ اس بات کا اطمینان رکھیں کہ ہم ان کے ایک ایک عمل کو ترازو کے تول تولیں گے اور اگر انہوں نے کوئی بھی خیر کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی تو ان کے حق سے انہیں ہرگز محروم نہیں کیا جائے گا اور ان کے ساتھ ذرا برابر ناانصافی نہیں کی جائے گی۔

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۠

(دیکھئے!یہ اللہ پر کیسا جھوٹ باندھ رہے ہیں اور صریح گناہ ہونے کیلئے تو یہی کافی ہے) (النسآء : ۵۰)

اس سے پہلے کی آیت میں ان کے جس شرک کی مثال دی گئی ہے جس شرک کی وجہ سے ان کی پوری زندگی عمل اور اطاعت کی ذمہ داریوں سے بےگانہ ہوکر رہ گئی ہے،اس کی طرف اشارہ کرکے فرمایا گیا ہے کہ ذرا دیکھئے!یہ اپنے اس شرک کو بھی اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔انہوں نے جس طرح اپنے آپ کو عمل کی ذمہ داریوں سے فارغ کیا ہے اسے اپنی بےعملی یا بےدینی ماننے کیلئے تیار نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں

Marfat.com

کہ ہمیں اللہ نے اپنے چہیتا ہونے کی سند عطا کی ہے۔ہم اللہ کے بیٹے ہیں تو اسکے بیٹے اور چہیتے ہونے کی وجہ سے اللہ ہی نے ہمیں ان ذمہ داریوں سے فارغ کردیا ہے،اس طرح سے وہ اللہ پر کتنا بڑا جھوٹ باندھتے ہیں۔مزید فرمایا کہ ان کا اللہ کی طرف یہ جھوٹا انتساب یہود کے دوسرے جرائم سے قطع نظران کے مجرم ہونے کیلئے کافی ہے کیونکہ اللہ کا نام لے کراس کی نافرمانی کا جواز پیدا کرنا ایک انسان کیلئے اس سے بڑا جرم اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا
مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ
كَفَرُوا هٰٓؤُلَآءِ أَهْدٰى مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا سَبِيلًا ﴿٥١﴾ أُولٰٓئِكَ
الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۖ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيرًا ﴿٥٢﴾
أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾
أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ
اٰتَيْنَآ اٰلَ إِبْرٰهِيمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾
فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۗ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ
سَعِيرًا ﴿٥٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۗ كُلَّمَا
نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ
إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَآ
أَبَدًا ۖ لَهُمْ فِيهَآ أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ﴿٥٧﴾

Marfat.com

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ
بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ ۗ
إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿۵۸﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي
شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿۵۹﴾ ع

عربی رکوع ۸ (کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہیں کتابِ الٰہی کا ایک حصہ دیا گیا؟ یہ جِبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر تو یہ ہیں ○ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کردی ہے اور جن پر اللہ لعنت کردے تو تم ان کا کوئی مددگار نہیں پاسکتے ○ کیا ان کا کوئی حصہ ہے سلطنت میں؟ پھر تو یہ نہ دیں گے لوگوں کو ایک تل برابر ○ یا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں اس فضل پر جو اللہ نے ان کو بخشا تو ہم نے بخش دی آلِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت اور ہم نے بخش دی ان کو ایک عظیم سلطنت بھی ○ پس ان میں سے ایسے بھی ہیں جو اس پر ایمان لائے اور ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس سے منہ موڑا اور ایسوں کیلئے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے ○ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا، ہم ان کو آگ میں جھونک دیں گے۔ جس وقت جل جائیں گی ان کی کھالیں، تو ہم ان کو بدل دیں گے دوسری کھالیں تاکہ چکھتے رہیں عذاب۔ بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے ○ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ہم ان کو داخل کریں گے باغوں میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان کیلئے وہاں پاکیزہ عورتیں ہوں گی اور ہم ان کو گھنی چھاؤں میں رکھیں گے ○ بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کو ادا کرو اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ خوب بات ہے یہ جس کی اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے ○ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی' اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں' پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہوجائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ' اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو' یہ ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے)۔ (آیات ۵۱ تا ۵۹)

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا ٥ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَمَنْ یَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِیْرًا ٥

(کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہیں کتابِ الٰہی کا ایک حصہ دیا گیا؟ یہ جِبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر تو یہ ہیں ٥ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی ہے اور جن پر اللہ لعنت کر دے تو تم ان کا کوئی مددگار نہیں پا سکتے) (النسآء:۵۱تا۵۲)

جِبت اور طاغُوت کا مفہوم

آیتِ کریمہ کی تشریح سے پہلے جِبت اور طاغُوت کی تشریح کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اہلِ علم کی ایک رائے یہ ہے کہ جِبت کے اصل معنی ''بے حقیقت، بے اصل اور بے فائدہ چیز'' کے ہیں۔ اسلام کی زبان میں جادو، کہانت، فال گیری، ٹونے ٹوٹکے، شگون، مہورت اور تمام دوسری وہمی اور خیالی باتوں کو جِبت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

اَلنِّیَاقَۃُ وَالطَّرْقُ وَالطَّیْرُ مِنَ الْجِبْتِ

(جانوروں کی آوازوں سے فال لینا، زمین پر جانوروں کے نشاناتِ قدم سے شگون نکالنا اور فال گیری کے دوسرے طریقے سب جِبت کے قبیل سے ہیں)

طاغوت لغت کے اعتبار سے ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اپنی جائز حدود سے تجاوز کر گیا ہو قرآنِ کریم کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی وخداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ پھر طاغوت قرآنِ کریم میں طواغیت کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ طاغوت کی صرف ایک ہی قسم نہیں ہے۔ طاغوت ایک تو شیطان ہے جو اس کے سامنے نت نئی جھوٹی ترغیبات کا سدابہار باغ پیش کرتا ہے۔ دوسرا طاغوت آدمی کا اپنا نفس ہے، جو اسے جذبات وخواہشات کا غلام بنا کر زندگی کے ٹیڑھے سیدھے راستوں میں کھینچے کھینچے لیے پھرتا ہے اور بے شمار طاغوت باہر کی دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ جو قوت بھی اللہ کے مقابلے میں اپنی اطاعت کراتی ہے چاہے طاقت وجبر سے، چاہے خواشات کو اپیل کر کے۔ اسے قرآنِ کریم طاغوت کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔

بعض دیگر اہلِ علم کا خیال ہے کہ جِبت سے مراد اعمالِ سفلیہ مثلاً سحر، شعبدہ، ٹونے ٹوٹکے، رمل جفر، فال گیری، نجوم، آگ پر چلنا اس قسم کی دوسری خرافات ہیں۔ ہاتھ کی لکیروں کا علم بھی اسی میں شامل ہے۔ اعمالِ سفلیہ کے حوالے سے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کا تعلق بھی شیطانی قوتوں اور ارواحِ خبیثہ سے ہوتا ہے۔ اس طرح کے اعمال کا ارتکاب کرنے والوں کو شیطانی قوتوں اور ارواحِ خبیثہ سے مدد مانگنی پڑتی ہے بعض دفعہ وہ اپنے معمول کو بھی ایسے وظائف بتاتے ہیں جس میں ان قوتوں سے مدد مانگنا شامل ہوتا ہے۔ اس وضاحت کو اگر سامنے رکھا جائے تو یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ اس آیتِ کریمہ میں انہی قوتوں کو طاغوت کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

Marfat.com

بعض مفسرین نے اس بارے میں متعدد اقوال ذکر کیے ہیں۔

حضرت ابنِ عباسؓ، ابن جبیرؒ اور ابوالعالیہؒ فرماتے ہیں کہ جِبْت حبشی لغت میں ''ساحر'' کو کہتے ہیں اور طاغوت سے مراد ''کاہن'' ہیں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جِبْت سے مراد ''سحر'' ہے اور طَاغُوْت سے مراد ''شیطان''۔

حضرت مالک ابن انسؒ سے منقول ہے کہ اللہ کے سوا جن چیزوں کی عبادت کی جاتی ہے، ان چیزوں کو ''طَاغُوْت'' کہتے ہیں۔

امامِ قرطبی کی رائے یہ ہے کہ اصل میں جبت تو بت ہی کا نام تھا لیکن بعد میں اس کے استعمال میں وسعت آ گئی اور اللہ کے سوا دوسری عبادت کی جانے والی چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا۔

یہ جتنی آرا آپ نے دیکھی ہیں بظاہر ان میں اختلاف نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ شرک کبھی ارواحِ خبیثہ اور شیطانی قوتوں کے حوالے سے کیا جاتا ہے اور کبھی شرک بت پرستی کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور کبھی انسان اللہ کی بندگی کی طرح دوسری قوتوں کی بندگی کرنے لگتا ہے۔ جن سے وہ بے دیکھے ڈرتا ہے یا جن سے مفادات کا رشتہ ہے یا جن کے جبر اور اقتدار نے اسے اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ تمام صورتیں شرک کی ہیں۔ ان تمام صورتوں کو سمیٹتے ہوئے جِبْت اور طَاغُوْت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

یہود کی اصل بیماری

اس آیتِ کریمہ میں یہود کے دو مشرکانہ رویوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی اصل بیماری جس کی طرف اشارہ سابقہ آیت میں کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ وہ توحید کو چھوڑ چکے اور مختلف طریقوں سے مشرکانہ اعمال کا ارتکاب کر کے اپنی دینی حیثیت کو برباد کر چکے ہیں۔ لیکن ان مشرکانہ اعمال کا ذکر کرنے سے پہلے اظہارِ تعجب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ذرا یہود کو پہچاننے کی کوشش کرو یہ وہ لوگ ہیں جن کو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ عنایت کیا گیا تھا ان پر احکامِ شریعت اتارے گئے تھے یہ لوگ مذہب کے بنیادی عقائد اور اساسی روایات سے بہت حد تک باخبر تھے۔ ان سے اس بات کی تو توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ احکام کی اطاعت میں سستی کا ثبوت دیں، معصیت کا راستہ اختیار کریں یا ان کے کچھ طبقات میں انحراف تک نوبت پہنچ جائے لیکن یہ جانتے بوجھتے کہ توحید مذہب کی بنیاد ہے اور شرک ایک ایسی بدترین لعنت ہے جو انسان کی دنیا کو بھی اور آخرت کو بھی تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ بایں ہمہ! وہ اگر شرک کا ارتکاب کرتے ہیں یا مشرکوں کو موحدوں کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں تو یہ ایک ایسی انہونی ہے جس کا تصور مذہب کے علمبرداروں اور توحید کے پرستاروں سے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ امرِ واقعہ ہے کہ یہود نے مشرکانہ اعمال بھی کیے، مسلمان اور اسلام دشمنی میں بتوں کو سجدہ بھی کیا اور مسلمانوں کے مقابلے میں مشرکینِ مکہ کے ساتھ محبت کی پینگیں بھی بڑھائیں۔ صاحب روح المعانی نے لکھا ہے:

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہود کے سردار حیی بن اخطب اور کعب بن اشرف جنگِ احد کے بعد ایک جماعت کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ میں قریش سے ملنے گئے۔ کعب بن اشرف ابوسفیان کے پاس آیا اور اس نے نبی کریم ﷺ کے خلاف ان کے ساتھ تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔ مشرکینِ مکہ اپنی تمام گمراہیوں کے باوجود مردم شناس تو تھے۔ انہوں

Marfat.com

نے کہا کہ تم ایک دھوکہ دینے والی قوم ہو اگر تم واقعی اپنے قول میں سچے ہو تو ہمارے ان دو بتوں جبتا ورطاغوت کے سامنے سجدہ کرو۔ چنانچہ کعب بن اشرف نے قریش کو مطمئن کرنے کیلئے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد کعب نے قریش سے کہا کہ تیس آدمی تم میں اور تیس ہم میں سے سامنے آئیں تا کہ رب کعبہ کے ساتھ اس چیز کا عہد کریں کہ ہم سب مل کر محمد (ﷺ) کے خلاف جنگ کریں گے۔ کعب کی اس تجویز کو قریش نے پسند کیا اور اس طرح سے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرلیا۔ اس کے بعد ابوسفیان نے کعب سے کہا کہ تم اہلِ علم ہو تمہارے پاس اللہ کی کتاب ہے ہم تو بالکل جاہل ہیں اس لئے آپ ہمارے متعلق بتائیں کہ ہم حق پر چلنے والے ہیں یا محمد (ﷺ)؟ کعب نے پوچھا کہ تمہارا دین کیا ہے؟ ابوسفیان نے کہ ہم حاجیوں کیلئے اپنے اونٹوں کو ذبح کرتے ہیں اور ان کا دودھ پلاتے ہیں۔ مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں ،اپنے خویش واقربا کے تعلقات کو قائم رکھتے ہیں اور بیت اللہ کا طواف اور عمرہ کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف محمد (ﷺ) نے اپنے آبائی دین کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ اپنوں سے علیحدہ ہو چکا ہے اور اس نے ہمارے قدیم دین کے خلاف اپنا ایک نیا دین پیش کیا ہے۔ ان باتوں کو سن کر کعب بن اشرف نے کہا: تم لوگ حق پر ہو۔ محمد (ﷺ) (معاذ اللہ) گمراہ ہو چکا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات نازل فرما کر ان کے دجل وفریب کی مذمت کی۔"

یہود کی اسلام اور مسلمان دشمنی

اندازہ فرمائیے! یہود اہلِ کتاب میں سے ہیں۔ توحید کی تعلیم اور شرک کی مذمت سے تورات اب بھی معمور ہے۔ وہ مشرکینِ مکہ کی بت پرستی اور ان کے مشرکانہ عقائد کی ہمیشہ مذمت کرتے رہے ہیں۔ مذہب اور وحیِ الٰہی سے بالکل جاہل اور بے خبر ہونے کی وجہ سے انہیں اُمی کہہ کر ہمیشہ نفرت کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ لیکن اسلام دشمنی اور مسلمانوں سے عداوت نے انہیں یہاں تک پہنچایا کہ بتوں کو سجدہ کرنا ان کے نزدیک حرام ہونے کے باوجود اس لئے جائز ٹھہرا کہ اس کے بغیر اسلام دشمنی پر مبنی متحدہ محاذ قائم نہیں ہوسکتا تھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسلام توحید کا دین ہے، وہ شرک سے انتہائی نفرت کرنا سکھاتا ہے اس کے پیغمبر کی بنیادی تعلیم ہی یہ ہے۔ اس کے باوجود سیاسی ضرورت کے تحت جب مشرکینِ مکہ نے ان سے پوچھا کہ ہم ہدایت پر ہیں یا محمد (ﷺ)؟ اور جو کچھ انہوں نے اپنے مذہب کے بارے میں بتایا یہود خوب جانتے تھے کہ یہ چند اخلاق کی باتیں ہیں جس کا مذہب کے بنیادی عقائد سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن انہوں نے کھل کر مشرکینِ مکہ کو آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دیا اور آنحضرت ﷺ کو گمراہ ٹھہرایا۔ ان کے اس رویہ سے یہ بات سمجھنا نہایت آسان ہو جاتا ہے کہ اسلام دشمنی اور مسلمانوں سے عداوت یہود کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ دنیا کے بدترین لوگوں سے اسلام دشمنی کیلئے سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا کا ہر مذہب اسلام سے بہتر ہے اور یہ دشمنی ان کے دل ودماغ میں اس حد تک سرایت کر چکی ہے کہ انہوں نے اس کو اپنے مذہب اور اپنی خارجہ پالیسی کی اس وقت بھی بنیاد بنایا تھا اور آج تک بھی یہی بنیاد ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال میں ان کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی انہیں کے زیرِ اثر عیسائیوں نے بھی اسی پالیسی کو آج تک اپنائے رکھا کیونکہ میں اس سے پہلے اس بات کو واضح کر چکا ہوں کہ عیسائیت یہودیت کے اتنے گہرے اثرات ہیں کہ وہ یہودیت کا دوسرا ایڈیشن معلوم ہوتا ہے۔ ان کی دشمنی میں تو کوئی فرق واقع نہیں ہوا البتہ مسلمانو

Marfat.com

میں یہ فرق ضرور پیدا ہوا ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان بلکہ اس کے بعد بھی صدیوں تک مسلمان ان کی اسلام دشمنی کو کبھی نہیں بھولے وہ ان کے چہروں کو ہزار پردوں میں بھی پہچان لیتے تھے۔ وہ قرآنِ کریم کی عطا کردہ اس روشنی سے اچھی طرح بہرہ ور تھے۔

لتجدن اشدالناس عداوۃ للذین امنوا الیھود والذین اشرکوا

(تم مسلمانوں کی عداوت میں یہود اور مشرکوں کو سب سے شدید پاؤ گے)

اور بیسیوں جگہ اس بات کا حکم دیا:

یاایھاالذین امنوا لاتتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء بعض اولیاء بعض

(مسلمانو! یہود اور نصاریٰ کو کبھی اپنا ہمدرد اور خیر خواہ نہ سمجھنا اور انہیں کبھی دوست نہ بنانا وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور خیر خواہ ہیں لیکن تمہارے بدترین دشمن ہیں)

لیکن آج کے مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ سیاست دانوں اور حکمرانوں کی ایک بڑی تعداد بری طرح اس بصیرت سے محروم ہو چکی ہے۔ یہود و نصاریٰ کی دشمنی اپنی جگہ قائم ہے، لیکن ہم ان کی دشمنی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ انہوں نے زندگی کے ہر مرحلے پر مسلمانوں کو تباہ کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ اب تو وہ مسلمانوں کے دو ملکوں پر قبضہ بھی کر چکے ہیں۔ لیکن ہمارے بے بصیرتی کا عالم یہ ہے کہ ہم ان کی دشمنی کو بھی خیر خواہی سمجھتے ہیں۔ وہ قدم قدم پر دھوکہ دیتے ہیں لیکن ہمارے اعتماد میں کوئی کمی نہیں آتی۔ ہمارا حال تو یہ ہے:

بڑے وثوق سے دنیا فریب دیتی ہے
بڑے خلوص سے ہم اعتبار کرتے ہیں

آج تو انہوں نے پورے عالمِ اسلام کو لہو میں نہلا دیا ہے۔ ان کی عظمتیں خاک آلود کر دی ہیں۔ ان کے ادب و احترام کے مراکز ان کی بمباری کی زد میں ہیں۔ ان کے دین، تہذیب اور ثقافت کی ایک ایک بات انہیں کھٹکتی ہے اور وہ اسے مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن ہمارے دانشور اور ہمارے سیاستدان ان سے اب بھی وفا کی امید رکھتے ہیں۔

تم کو ان سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

قرآنِ کریم نے یہود و نصاریٰ دونوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ دونوں مسلمانوں سے کبھی خوش نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ مسلمان اپنا دین چھوڑ کر ان کا دین اختیار نہ کر لیں۔ قرآن کے نزول کے وقت یقیناً یہود و نصاریٰ کا یہی حال تھا۔ لیکن ہمارے قومی شاعر اقبال نے جس طرح آزادی سے پہلے یورپ کے مرکز میں رہ کر ان استعماری قوتوں کو دیکھا اور پہچانا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا۔

کرے قبول اگر دینِ مصطفٰی انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

Marfat.com

یہود ونصاریٰ کا اصل چہرہ پہچاننے کی ضرورت

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم یہود ونصاریٰ کا اصل چہرہ پہچانیں۔قرآن کی دی ہوئی فکر کے مطابق ان کی دشمنی سے بچنے کیلئے مناسب تدابیر اختیار کریں۔لیکن اس بدنصیبی کا تو کوئی علاج نہیں ہے کہ تدابیر اختیار کرنا تو بہت دور کی بات ہے ہم تو یہ سمجھنے کیلئے بھی تیار نہیں کہ یہود ونصاریٰ واقعی ہمارے دشمن ہیں۔جب تک ہماری فکر، ہماری سوچ، ہمارا ذہنی رویہ اور ہماری قوتِ فیصلہ ان کے طلسم سے آزاد نہیں ہوتی اس وقت تک ہم اپنی قسمت سنوارنے کیلئے کچھ نہیں کر سکتے۔

تاریخ کا طالب علم جب یہود ونصاریٰ کی تاریخ پڑھتا ہے اور پھر ان کے موجودہ رویے کو دیکھتا ہے تو اسے مسلمانوں کے خلاف ان کی پالیسیوں کو سمجھنے میں نہایت دشواری پیش آتی ہے۔وہ اس بات کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتا کہ قومیں اور ان کے افراد کوئی پتھر کے بنے ہوئے مجسمے تو نہیں ہوتے کہ حالات کے ساتھ ان میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔وہ تو ہر دور میں سوچنے سمجھنے کے مراحل سے گزرتے رہتے ہیں اور اسی سے ان کے بنیادی فیصلوں میں تبدیلی بھی آتی ہے۔یہود ونصاریٰ آخر مسلمانوں کے معاملے میں پتھر کے ہو کر کیوں رہ گئے ؟ قرآنِ کریم نے اس عقدہ کو کھولتے ہوئے فرمایا: ''یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت فرمائی ہے'' اور جن لوگوں پر اللہ لعنت فرمادیتے ہیں ان کی ہدایت کیلئے کوئی کوشش کبھی سودمند نہیں ہوتی۔تبلیغ ودعوت کی ہر کاوش ان کے سامنے بے بسی محسوس کرتی ہے۔یہی حال ان دونوں قوموں کا بھی ہے۔البتہ! آخری جملے میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے وہ یہ کہ مسلمان اگر اپنے عہدِ رفتہ کو تازہ کرلیں اور وہ حقیقی معنوں میں مسلمان بن جائیں اور اسلام کے سرچشموں سے صحیح معنی میں سیرابی کا انتظام کرلیں اور پھر اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے ان معاند قوتوں کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں تو تم دیکھو گے کہ ان قوتوں کو دنیا میں اپنا کوئی مددگار نہیں ملے گا۔ان کی یہ ساری طلسم آرائی فرعون کے جادوگروں کی رسیوں کے سانپ بن جانے کی طرح ہے۔وہ اس وقت تک لہراتی رہیں جب تک عصائے موسیٰ اژدھا بن کر ان کے سامنے نہیں آیا۔لیکن اس کے بعد پھر ان کی زندگی دم توڑ گئی۔غیر مسلم قوتیں اس لئے طاقتور ہیں کہ مسلمان کمزور ہیں۔جس دن مسلمانوں نے اپنے حقیقی سرچشمے سے تعلق پیدا کرلیا اس دن صورتحال بدل جائے گی۔

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۝

(کیا ان کا کوئی حصہ ہے سلطنت میں؟ پھر تو یہ نہ دیں گے لوگوں کو ایک تل برابر) (النسآء:۵۳)

نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ کا مفہوم

اس آیت کریمہ کے مختلف مطالب اہلِ علم نے بیان کیے ہیں۔اور ان میں سے ہر مطلب کیلئے اس آیت میں گنجائش موجود ہے۔سیاقِ کلام پر اگر آپ کی نظر ہے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہود کی اسلام اور مسلمان دشمنی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور وہ اٹھتے بیٹھتے اسلام اور مسلمانوں کے عروج پر اپنی جلن کا اظہار کرتے رہتے تھے اور جس کا لاوہ ان کے سینوں میں سلگتا تھا۔اس کا تو اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔الب

Marfat.com

قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو واشگاف کرتے ہوئے فرمایا کہ بغض اور نفرت ان کی زبانوں سے عیاں ہے۔لیکن جو کچھ ان کے سینوں میں ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ان کے اس بغض اور دشمنی کو دیکھتے ہوئے اور ان کے رویے کو سب کے سامنے رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا جارہا ہے: کہ کیا اللہ کی حکومت اور سلطنت میں کوئی حصہ ان کے قبضہ میں ہے؟ کہ یہ فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کون برسرِ ہدایت ہے اور کون نہیں ہے۔حالانکہ یہ خود بھی جانتے ہیں کہ ایسا کوئی اختیار ان کے ہاتھ میں نہیں ہے لیکن ان کی طبیعت کی خست اور ان کے بخل کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر ایسا کوئی اختیار ان کے پاس ہوتا تو بھلائی کی کوئی بات اور اللہ کی کوئی نعمت کبھی کسی کے نصیب میں نہ ہوتی اور وہ پھوٹی کوڑی بھی کسی کو نہ دیتے۔دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کیا ان کے پاس کسی ملک کی حکومت ہے؟ کہ دوسرے لوگ اس میں حصہ بٹانا چاہتے ہیں حالانکہ ان سے حکومت چھنے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔لیکن یہ اس طرح نفرت اور بغض کا اظہار کررہے ہیں جیسے مسلمان قدم قدم جو آگے بڑھ رہے ہیں تو وہ ان سے حکومت چھین لینا چاہتے ہیں اور یہ اپنی حکومت بچانے کیلئے مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہیں۔حالانکہ سوال صرف یہ ہے کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ اور اللہ نے دین کی عظمت سے کسے مالا مال کیا ہے؟ لیکن ان کی حق دشمنی دیکھئے کہ یہ اعترافِ حق کے لئے بھی تیار نہیں۔تیسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ الـمُـلْـکِ سے مراد ''اللہ کی حکومت اور سلطنت'' ہے۔وہ اپنی حاکمانہ حیثیت سے جسے چاہتا ہے نبوت عطا کرتا ہے،جس قوم کو چاہتا ہے اس نبوت کی پیروکار بنا کر حاملِ دعوت امت کے منصب پر فائز کردیتا ہے۔چنانچہ اس نے اپنے اس حق کو استعمال کرتے ہوئے آج آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو اپنے اس فضل سے نوازا ہے۔لیکن یہود کو ایسی آگ لگی ہے کہ وہ یوں سمجھتے ہیں گویا کہ ان کے اقتدار کو چیلنج کردیا گیا ہے۔اگر ان کے پاس واقعی ایسا کوئی اختیار ہوتا تو وہ یقیناً اپنی قومی خست کی وجہ سے کسی کے یہاں خیر کا سایہ بھی نہ پڑنے دیتے۔لیکن وہ خوب جانتے ہیں کہ ایسا کوئی اختیار ان کے پاس نہیں۔تو پھر جس طرح انہوں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت اور بغض سے بھرپور ایک لڑائی شروع کر رکھی ہے اس کا ہدف مسلمان نہیں اللہ کی ذات کو ہونا چاہیے کیونکہ مسلمانوں نے اپنے طور سے تو کوئی دعویٰ نہیں کیا ان میں پیغمبر تشریف لائے کتاب نازل ہوئی یہ سب اللہ کے فضل سے ہوا۔یہود کو اگر لڑائی لڑنی ہے تو اللہ سے لڑنی چاہیے اور یہ وہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ سے لڑائی کرکے کبھی کوئی نہیں جیت سکتا تو پھر آخر وہ اپنی ان حرکتوں سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اور ایک ایسی کوشش پر جس کا کبھی کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکل سکتا وہ کیوں اپنی صلاحیتیں برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟ کیا اتنی بات کو ان کی عقلیں سمجھنے سے قاصر ہیں؟ اس کا جواب اگلی آیتِ کریمہ میں دیا گیا ہے۔

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ۚ فَقَدْ اٰتَیْنَآ
اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا ۝

(یا یہ لوگوں پر حسد کررہے ہیں اس فضل پر جو اللہ نے ان کو بخشا تو ہم نے بخش دی آلِ ابراہیم کو
کتاب اور حکمت اور ہم نے بخش دی ان کو ایک عظیم سلطنت بھی) (النسآء:۵۴)

Marfat.com

یہود حسد کے مریض تھے

یہود کی دشمنی کا اصل سبب یہ ہے جسے اس آیت میں منکشف فرمایا گیا ہے کہ ان کی تمام فتنہ پروری اور ان کی مسلمان دشمنی پر مبنی یہ تمام حرکتیں اور سازشیں اس سبب سے ہیں کہ ان کے اندر کے حسد کی آگ انہیں چین نہیں لینے دیتی۔ حسد زوالِ نعمت کی تمنا کرنے کو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی شخص کو کسی کمال سے نوازا ہے، کسی نعمت سے مالا مال کیا ہے، کوئی خاص اس پر کرم فرمایا ہے، تو دوسرا آدمی یہ چاہتا ہے کہ یہ سب اس سے چھن جائے۔ اور یہ بالکل قلاش، نادار، اور حقیر آدمی ہو کر رہ جائے۔ اس خواہش کا نام "حسد" ہے۔ اگر تو صرف یہ خواہش ہو کہ جو کچھ اللہ نے اسے دیا ہے وہ اس کے پاس بھی رہے اور مجھے بھی پروردگار عطا فرمائے تو اسے رشک کہتے ہیں۔ اسلام نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن دوسرے کی نعمت پر جلنا اور اس کے زوال کی دعائیں یا تدبیریں کرنا یہ وہ کمینگی ہے جسے حسد کہا جاتا ہے اور جو اسلام کی نگاہ میں بدترین حرکت ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

ایاکم والحسد فان الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب

(تم حسد سے بچو اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے)

حسد ایک ایسی کمینی عادت ہے کہ جس میں مبتلا شخص دوسروں کا کچھ بگاڑے یا نہ بگاڑے لیکن اپنا کردار اپنی صحت اور اپنا سکون ضرور غارت کر لیتا ہے۔ اس کی دنیا بھی تباہ ہوتی ہے اور آخرت بھی۔ ٹھیک کہا کسی نے

حسد کی دنیا بری ہے اس کا ثمرہ ہے برا
اس مرض والے کی یکساں ہے حیات و موت بھی

یہود قوم اپنی اسی جبلت کے باعث صدیوں سے عبرت کا مرقع بنی ہوئی ہے۔ اس کی تمام کاوشیں ڈیڑھ ہزار سال سے دوسروں کی تباہی اور بربادی پر صرف ہو رہی ہیں جو اس کا رویہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں تھا وہی آج بھی ہے۔ اسی رویے کے باعث آنحضرت ﷺ کی نبوت کو وہ ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ انہیں زعم یہ تھا کہ نبوت بنی اسرائیل کا حق ہے، یہ جب بھی آتی ہے یا آئے گی بنی اسرائیل کے ہاں آئے گی۔ گویا وہ نبوت کو اپنی میراث سمجھتے تھے اور اس پر اپنا اختیار گمان کرتے تھے کہ یہ ہمارے ارادے اور اختیار کے بغیر کسی کو نہیں مل سکتی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ایک اُمّی شخص کو جس کا تعلق آلِ اسمٰعیل سے تھا اس عظیم منصب سے بہرہ ور فرمایا تو انہیں آگ لگ گئی اور یہ صدمہ ان کیلئے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے من حیث القوم یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم اس نبی کی نبوت چلنے نہیں دیں گے۔ گزشتہ کسی جگہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے عرض کر چکا ہوں کہ ان کے والد نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ یہ یقیناً وہی نبی ہیں جن کا ذکر ہماری کتابوں میں آیا ہے لیکن اس کے باوجود جب تک میری جان میں جان ہے میں ان کی نبوت چلنے نہیں دوں گا۔ چنانچہ اسی حسد کے باعث انہوں نے اپنی قومی زندگی کو تباہ کیا۔ دو قبیلوں کو مدینے سے نکلنا پڑا تیسرا قتل کے گھاٹ اتر گیا۔ دورِ فاروقی میں بالآخر انہیں جزیرۂ عرب سے بھی نکال دیا گیا۔ لیکن ان کے حسد کی آگ برابر بھڑکتی رہی۔ اللہ تعالیٰ اس آیتِ کریمہ میں فرما رہے ہیں کہ تم اگر اس حسد کی آگ میں جلنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو جلتے رہو ہم نے تو آلِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت بھی دے دی اور انہیں ملکِ عظیم سے بھی نواز دیا۔

Marfat.com

یہود اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ سلطنت اور حکومت کتاب اور نبوت کے لوازم میں سے ہے۔ جب بھی اللہ تعالیٰ کسی قوم میں نبی اور رسول بھیجتے ہیں اور پھر انہیں کتاب اور حکمت سے نوازتے ہیں تو وہ قوم اگر رسول کے ہاتھ پر ایمان لا کر اور کتابِ الٰہی کے احکام کے مطابق عمل کر کے اپنے آپ کو حزب اللہ بنالیتی ہے تو اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ ایسی امت کو حکومت اور سلطنت بھی عطا کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کے مختلف ادوار اس حقیقت کی شہادت دینے کیلئے کافی ہیں۔ چنانچہ یہود مسلمانوں کی مخالفت صرف اس لئے نہیں کر رہے تھے کہ وہ ایک نئی نبوت کو کیوں مان رہے ہیں بلکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس نبوت اور کتاب کے نتیجے میں مسلمانوں کو ایک ایسا اقتدار ملنے والا ہے جس کے بعد ہمارا زوال اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے گا۔

آلِ ابراہیم سے کون مراد ہے؟

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے کتاب وحکمت اور ملکِ عظیم دینے کا جو اعلان فرمایا ہے وہ آلِ ابراہیم کیلئے ہے اور آلِ ابراہیم جس طرح آلِ اسمٰعیل ہیں اسی طراح آلِ اسحٰق اور بنی اسرائیل بھی ہیں۔ تو پھر اس میں مسلمانوں یا آلِ اسمٰعیل کی تخصیص کا کیا معنی ہے؟ گر ان آیات پر معمولی تدبر سے بھی کام لیا جائے تو اس اعتراض کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ ذرا غور فرمایئے! ان آیات میں تنقید کس پر ہو رہی ہے؟ اور ان تمام تنبیہات کا ہدف کون ہے؟ ظاہر ہے وہ بنی اسرائیل ہیں۔ انہیں سے یہ بات کہی جارہی ہے کہ تم اپنے حسد اور بغض کی آگ میں جلتے ہو تو جلتے رہو ہم نے تو آلِ ابراہیم کو کتاب وحکمت اور ملکِ عظیم سے نواز دیا ہے۔ جن کو یہ تنبیہ کی جارہی ہے اور جنہیں سرزنش کی جارہی ہے کیا یہ نعمتیں بھی انہیں دی جارہی ہیں؟ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو بات کو سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہو چکا ہو۔ بنی اسرائیل تو اس تنقید اور سرزنش کے باعث اس نعمت سے محروم ہوگئے اور آلِ ابراہیم کا دوسرا حصہ صرف آلِ اسمٰعیل ہے تو خود بخود یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ یہاں آلِ ابراہیم سے آلِ اسمٰعیل ہی مراد ہیں۔

علاوہ ازیں! گزشتہ آیت سے پیوستہ آیت میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اللہ نے بنی اسرائیل پر لعنت فرمائی ہے۔ اور لعنت کا مفہوم کیا ہے؟ اللہ کی رحمت اور نعمت سے دور کر دینا''۔ تو جس قوم کو دو آیتیں پہلے رحمت سے دور کر دیا گیا اور وہ لعنت کی مورد ٹھہری ہے کیا اب کتاب وحکمت اور ملکِ عظیم اسے دیا جائے گا؟ یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو پھر خود بخود یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آلِ ابراہیم سے مراد اس آیتِ کریمہ میں آلِ اسمٰعیل ہیں۔

مزید برآں! یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہود نے اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی بجائے ہمیشہ حضرت اسحٰق سے ہی منسوب کیا ہے۔ تورات میں ہے کہ ابراہیم کی اولاد اسحٰق کے نام سے پکاری جائے گی۔ اس کے برعکس اہلِ عرب اپنے آپ کو ہمیشہ حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے اس انتساب پر فخر کیا اور اپنے آپ کو ملتِ ابراہیم کا وارث سمجھا۔ اور وہ یہ بھی بجا طور پر دعویٰ کرتے تھے کہ ہم جس گھر کے مجاور ہیں اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا اور جس شہر کے رہنے والے ہیں وہ شہر حضرت ابراہیم کی دعاؤں سے بسا تھا اور ایک مدت تک ان کا مسکن رہا۔ یہ تمام واضح شہادتیں ہیں جس سے اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ یہاں آلِ ابراہیم سے مراد اہلِ عرب، آلِ اسمٰعیل اور قریش ہیں۔

Marfat.com

تورات کو پڑھتے ہوئے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ پروردگار یہاں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم نے جس آلِ ابراہیم کو نوازنے اور ترقی دینے کا وعدہ فرمایا تھا وہ آلِ ابراہیم آلِ اسمٰعیل ہی تھے اور جس طرح ایک وقت میں حضرت ابراہیم کی ایک شاخ آلِ اسحٰق کو ہم نے فروغ دیا تھا اب وقت آ گیا تھا کہ تورات کے وعدے کے مطابق آلِ اسمٰعیل کو ترقی دیں اور نوازیں۔ تورات کی کتاب پیدائش اور باب ۲۲ میں یہ بات مندرجہ ذیل الفاظ میں مرقوم ہے۔

(اور خداوند کے فرشتے نے آسمان سے دوبارہ ابراہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لئے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کی مانند کر دوں گا اور تیری اولاد دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کہ تو نے میری بات مانی)

تورات کے اس بیان کو غور سے پڑھئے! صاف معلوم ہوتا ہے کہ برکت کا یہ وعدہ اس وقت کیا گیا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے امتحان میں پوری طرح اپنے اخلاص کو ثابت کیا۔ اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ وعدہ حضرت اسمٰعیل اور ان کی نسل سے متعلق ہے۔ اس وعدے میں تین باتوں کا ذکر ہے۔

بنی اسماعیل سے اللہ کے تین وعدے

۱۔ اللہ تعالیٰ ان کو ایک عظیم امت بنائے گا۔

۲۔ ان کو عظیم فتوحات سے نوازے گا اور دشمنوں کے پھاٹکوں پر ان کا قبضہ ہوگا۔

۳۔ اس نسل کے وسیلہ سے زمین کی قومیں برکت پائیں گی۔

تاریخ آپ کے سامنے کھلی پڑی ہے، ڈیڑھ ہزار سال پہلے کی دنیا پر نظر ڈالئے پھر دیکھئے کہ اللہ نے جو وعدہ تورات میں فرمایا تھا اور قرآنِ کریم کی صورت میں نبی اُمی ﷺ کی زبان سے جس کا اعلان کیا گیا وہ کس طرح پورا ہوا۔ حضور کی تشریف آوری کے بعد وہ کون سی امت ہے جو مکہ معظمہ کی سرزمین سے اٹھی اور چند ہی سالوں میں پورے جزیرہ عرب پر غالب آ گئی اور آج تک ہزاروں حوادث سے نبرد آزما ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت پر قائم ہے اور ساری کوششوں کے باوجود جس کی شناخت کو دھندلایا نہیں جا سکا۔

مزید دیکھئے! وہ کون سی امت ہے کہ نبی امی کے ظہور کے بعد جس نے دنیا میں فتوحات کے جھنڈے گاڑے اور جس نے دشمنوں کے پھاٹکوں پر قبضہ کیا۔ اس زمانے کی بڑی سلطنتیں قیصر و کسریٰ اور یمن تھیں۔ گنتی کے چند سالوں میں وہ کون سی امت ہے جس نے ان تینوں پھاٹکوں پر قبضہ کر لیا۔ کسریٰ کو ہمیشہ کیلئے ختم کر کے رکھ دیا، یمن مستقل اسلامی مملکت کا حصہ بن گیا اور قیصر مشرقِ وسطیٰ سے پاؤں سمیٹنے پر مجبور اور پھر ایک وقت آیا جب ایشیا میں اس کا اقتدار گل ہو گیا۔ یورپ نے صلیبی لڑائیوں کا ڈول ڈالا لیکن صلاح الدین ایوبی کی محدود قوت باوجود اسے بری طرح شکست کی ذلت اٹھانی پڑی اور عجیب بات یہ ہے کہ صحابہ کے ہاتھوں جو ممالک مفتوح ہوئے وہاں کا صرف جغرافیہ

Marfat.com

اسلامی مملکت میں شامل نہیں ہوا بلکہ وہاں کی زبان، وہاں کی تہذیب، وہاں کا تمدن اور وہاں کا مذہب بھی ہمیشہ کیلئے بدل گیا اور وہ ممالک آج بھی مسلمانوں کے قبضے میں ہیں۔ البتہ اندلس اور ہندوستان جیسے ملک جو بعد میں مسلمانوں نے فتح کیے وہ اپنی غفلت اور اسلام سے دوری کی وجہ سے بالآخران کے ہاتھ سے نکل گئے۔ بتایئے یہ کس امت کی کہانی ہے؟ اور دشمنوں کا کون سا پھاٹک ہے، جس پر اس امت نے قبضہ نہیں کیا؟

جن ممالک پر مسلمان قابض ہوئے وہاں تو یقیناً ایک نئی بہار آئی اور وہاں ایک نئی امت وجود میں آئی۔ لیکن جن ملکوں تک مسلمانوں کا تسلط نہ پہنچ سکا اور وہ مسلمانوں کے نظامِ زندگی سے محروم رہے ان میں جہاں کہیں بھی آپ حقوق کا تصور دیکھتے ہیں، عدل واحسان کا چرچا سنتے ہیں، انسان کی عظمت کے گن گائے جاتے ہیں۔ حقیقت ناشناسی اور کتمانِ حق کی بات اور ہے ورنہ تاریخ کا کوئی طالبعلم اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ جب تک مسلمان اندلس نہیں پہنچے تھے یورپ کن حالوں میں زندگی گزارتا تھا اور جب تک مسلمانوں کی کتابیں اصالتاً یا ترجے کی صورت میں یورپ میں نہیں پہنچیں اور تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کے نظریات، خیالات اور کتابیں عام پڑھائی نہیں گئیں، اس وقت تک یورپ سائنس کی ابجد سے بھی واقف نہ تھا۔ مسلمان تاتاری حملے کی زد میں آکر اپنے بیشتر کتب خانوں سے محروم ہوگئے۔ اندلس ان کے ہاتھ سے کیا نکلا، علم کا سرمایہ ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا اور پھر ایک زوال پذیر امت کی طرح انہوں نے کئی صدیاں غفلت کی نذر کردیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا علم مسلمانوں کے دشمنوں کے کام آیا اور خود مسلمانوں کی اگلی نسلیں اس سے محروم رہ گئیں۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

حکومت کا کیا رونا یہ تو اک عارضی شے تھی نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ
غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشہ کن کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

اس آیتِ کریمہ کا آخری جملہ کہ ہم نے آلِ ابراہیم کو ملکِ عظیم دے دیا ہے بجائے خود قرآنِ کریم کی حقانیت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی دلیل ہے۔ جب یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں تو کوئی شخص تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ مسلمان کبھی دنیا کی سب سے بڑی قوت ثابت ہوں گے اور اہلِ زمین کے فیصلے ان کی تائید کے بغیر ادھورے رہیں گے۔ ان کا لوہا ہر لوہے کو کاٹے گا اور ان کی علمی اور سیاسی وجاہت پوری دنیا میں مسلّم ہوگی۔ لیکن چند ہی سالوں میں اللہ کا یہ وعدہ جس طرح پورا ہوا اور پھر رفتہ رفتہ جس طرح اس نے وسعت پائی یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور وقت سے بہت پہلے ایسی کسی حقیقت کا انکشاف صرف نبوت ہی کی زبان سے ہوسکتا ہے اور اللہ ہی کی کتاب ایسی حتمی بات کی خبر دے سکتی ہے۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۝

(پس ان میں سے ایسے بھی ہیں جو اس پر ایمان لائے اور ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس سے منہ موڑا اور ایسوں کیلئے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے) (النسآء : ۵۵)

Marfat.com

یہاں آلِ اسماعیل مراد ہیں

اس آیتِ کریمہ کا تعلق آلِ اسماعیل سے ہے۔ آلِ اسماعیل میں سے ایک گروہ تو وہ ہے جو اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہوا جنہیں ہم اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ مکہ معظمہ سے آنے والے مہاجرین بھی ہیں اور مدینہ منورہ کے انصار بھی اور یہی وہ خوش نصیب لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کی نشر و اشاعت اس کی حفاظت اس کے غلبے بالآخر نظامِ زندگی کے طور پر اس کے نفاذ کی ایک ایک ذمہ داری کو ادا کیا اور دوسرا گروہ وہ ہے جو ابھی تک اس سے منہ موڑے ہوئے ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب ان منہ موڑنے والوں میں بہت سے لوگ اسلام کی آغوش میں آ جائیں گے اور وہی لوگ آئندہ اسلامی تحریک اور اسلامی انقلاب کے لئے قوت ثابت ہوں گے۔ لیکن جو لوگ آخر دم تک اسلام کی دولت سے محروم رہیں گے یا تو وہ جزیرہ عرب سے نکل بھاگیں گے یا ختم ہو جائیں گے۔ ان بدنصیبوں اور محروموں کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ میں داخل کرے گا۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ جب اس کا رسول اس قوم پر جس کی طرف وہ مبعوث ہوتا ہے، اتمامِ حجت کر دیتا ہے اور وہ قوم پھر بھی نہیں مانتی تو اللہ تعالیٰ بالعموم اس قوم پر عذاب بھیج کر اسے تباہ کر دیتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان پر دنیا میں کوئی عذاب نہیں آئے گا۔ ان کے لئے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کافی ہے۔ ان پر عذاب نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر جانے کے بعد بھی قبولِ اسلام کا سلسلہ رکا نہیں۔ دھیرے دھیرے لوگ اسلام کی آغوش میں اترتے چلے گئے لیکن فتح مکہ کے بعد جن لوگوں کو اسلام کی دولت نصیب نہ ہو سکی وہ یا تو تحلیل ہو گئے یا ملک چھوڑ گئے۔ دنیا میں تو یہ اللہ کے عذاب سے بچے رہے کیونکہ یہ اسلام کا راستہ نہ روک سکے اور ان کی انفرادی سرکشی اور غیر موثر مخالفت کے باوجود دنیا میں چھوٹی موٹی سزا ان کو دینا ضروری نہیں سمجھا گیا اس لئے فرمایا کہ ان کے لئے آخرت کی سزا کافی ہے اور وہ ایک ایسی بھڑکتی ہوئی آگ ہے کہ جس کے بعد کسی اور سزا کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگلی آیتِ کریمہ میں اسی سزا کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

(جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا، ہم ان کو آگ میں جھونک دیں گے۔ جس وقت جل جائیں گی ان کی کھالیں، تو ہم ان کو بدل دیں گے دوسری کھالیں تاکہ چکھتے رہیں عذاب۔ بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے) (النسآء : ۵۶)

ایمان نہ لانے والوں کا انجام

اللہ کے رسول کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کرنے والوں سے قیامت کے دن جو سلوک ہوگا اس کی ایک جھلک دکھائی جا رہی ہے کہ دنیا کی عیش و عشرت میں ڈوب جانے والے اور محض دنیا ہی کے عیش و عشرت کو اپنی منزل سمجھنے والے یہ گمان نہ کریں کہ ان کی یہ روش باقی رہے گی اور وہ ہمیشہ دنیا کے مزے لوٹنے میں مصروف رہیں گے۔ یہ چند روزہ زندگی فریبِ نظر سے زیادہ نہیں۔ آنکھ بند ہونے کی دیر

Marfat.com

اس کے بعد حقیقت سامنے آنے لگتی ہے۔اے کاش! انسان دنیا ہی میں اس بات کو سمجھ لے کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور پھر میری زندگی کی رہنمائی کیلئے اس نے رسول بھیجے اور کتابیں نازل کی ہیں وہ یقیناً ایک نہ ایک دن مجھ سے اپنے رسولوں کی دعوت کو قبول نہ کرنے کے بارے میں جواب طلب کرے گا اور جب میں کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکوں گا تو میرا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ میرے جیسے سارے انکار کرنے والوں کو ایک ایسی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔جس کی شدت اور استمرار کا عالم یہ ہوگا کہ جب جلنے والوں کی کھالیں جل جائیں گی تو کھالوں کے جل کر گر جانے سے جان نہیں چھوٹے گی کیونکہ جہنم ایک ایسی جگہ ہے جس کا عذاب ناقابلِ بیان شدید ہونے کے باوجود موت کا باعث نہیں بنے گا۔آدمی تمنا کرے گا کہ مجھے موت آجائے لیکن موت نہیں آئے گی۔لیکن اس سے بڑھ کر عذاب کے جس پہلو کا یہاں ذکر فرمایا جارہا ہے وہ یہ ہے کہ کھال کے جل جانے کے بعد شاید آگ کے عذاب کا احساس کم ہوجاتا۔لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جیسے ہی کسی کی کھال جلے گی ہم اس کے بدلے میں دوسری کھال پہنا دیں گے۔یہ اس لئے ہوگا تاکہ عذاب میں مبتلا شخص نئے سے نئے عذاب کا مزہ چکھے۔حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

(کھال جلنے اور کھال کے تبدیل ہونے کا یہ عمل اتنی تیزی سے ہوگا کہ ایک ساعت میں سو مرتبہ کھال تبدیل کی جائے گی)

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ آگ دن میں ستر ہزار مرتبہ ان کو کھائے گی جب ان کو کھا چکے گی تو ان لوگوں کو کہا جائے گا کہ تم پھر پہلی حالت کو لوٹ جاؤ پس وہ لوٹ جائیں گے۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جہنم کا عذاب کس قدر ہولناک، کس قدر تکلیف دہ اور کس قدر شدید ہوگا اور اس شدت پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہئے کیونکہ جو جہنم کا خالق ہے وہ عزیز اور زبردست ہے۔وہ جس چیز کو چاہے اور جیسا چاہے پیدا کرنے پر قادر ہے۔اس نے دنیا کی آگ میں جو جلن رکھی ہے انسان کے لئے وہ بھی ناقابلِ برداشت ہے اور جہنم کی آگ میں جلن کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔بخاری کی روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(اہلِ جہنم میں سب سے کم عذاب کے اعتبار سے وہ آدمی ہوگا جس کے تلووں میں آگ کی دو چنگاریاں ہوں گی جس کی وجہ سے اس کا دماغ ہانڈی کی طرح کھولتا ہوگا)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ○

(اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ہم ان کو داخل کریں گے باغوں میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ان کیلئے وہاں پاکیزہ عورتیں ہوں گی اور ہم ان کو گھنی چھاؤں میں رکھیں گے) (النسآء : ۵۷)

Marfat.com

ایمان لانے والوں پر انعام

اللہ کے رسول کی دعوت کا انکار کرنے والوں اور اس کی تکذیب کرنے والوں کے انجام کا ذکر کرنے کے بعد اب ان لوگوں کا ذکر کیا جارہا ہے جو اللہ کے رسول پر ایمان لائے اور جن کی زندگی کا ایک ایک عمل اس کی لائی ہوئی شریعت کے عین مطابق وجود میں آیا۔ یعنی ان کا اصل سرمایہ نہ حسب ونسب ہے اور نہ مال ودولت بلکہ ایمان وعمل وہ دولت ہے جس سے وہ مالا مال ہیں اور یہی وہ سکہ ہے جو قیامت کے دن چلے گا۔ جس کے پاس یہ دولت ہوگی وہ اس دن نوازا جائے گا اور جس کے پاس یہ دولت نہیں ہوگی اس کیلئے وہ ناکامی اور خسران کا دن ہوگا۔ اس سے اس بات کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل جو ایمان وعمل سے محروم ہوئے اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے حسب ونسب اور اپنے انتسابات کو آخرت میں کامیابی کا ذریعہ سمجھا۔ اسی گمراہی نے ان سے سیرت وکردار کی عظمت چھین لی اور اسی پندار نے نبی آخرالزمان پر ایمان لانے سے محروم رکھا۔ مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ تم ایسی کسی ایسی گمراہی میں مبتلا نہ ہونا۔ اسلام کے آجانے کے بعد تمام غلط دعوے اور تمام غلط انتسابات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے۔ اب یہاں کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں، سب انسان، انسان ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں۔ اب تعارف اپنے قبیلوں اور اپنے آباؤ اجداد کے حوالے سے نہیں ہوگا بلکہ آدمی کی ذاتی صلاحیت اس کا اصل تعارف ہوگی۔

دنیا اور آخرت میں ایمان وعمل یعنی تقویٰ عزت کا معیار ٹھہرے گا۔ جس آدمی کے پاس یہ دولت زیادہ ہوگی وہ یہاں بھی سرافراز ہوگا اور قیامت کے دن بھی شاد کام ہوگا۔ وہاں ایسے لوگوں کو ایسے باغوں میں داخل کیا جائے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔ ایک انسان اپنی رہائش کیلئے اس سے بہتر تصور نہیں کرسکتا کہ اس کے محل کے اردگرد باغات پھیلے ہوئے ہوں اور اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین اور احساس کی ٹھنڈک کیلئے اس کے نیچے اور دائیں بائیں نہریں بہتی ہوں۔

ازواج مطہرۃ کا مفہوم

اور تنہائیوں کی آبادی کیلئے ایسی رفیقہ حیات میسر ہو جو ہر لحاظ سے طہارت ونظافت کا پیکر ہو۔ جس طرح اس کا جسم اور اس کا لباس گندگی سے محفوظ اور ہر بدذوقی سے دور ہو اسی طرح اس کے اخلاق مکارم اخلاق کی تصویر، اس کا احساس محبت کا عکاس، اس کے افکار ذہنی الجھنوں سے آزاد اور اس کا رویہ انسانی آسودگی سے سیراب ہو۔ یہ وہ ہمہ نوعی تطہیر ہے جو شاید یہاں مراد لی جارہی ہے اور ان اہلِ جنت کی چہل قدمی کیلئے ایسے سایہ دار درخت ہوں گے جن کے سائے کو کبھی دھوپ متاثر نہیں کرسکے گی۔

ظِلًّا ظَلِيْلًا: ظل کے بعد ظليل کا لفظ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: شَمْسٌ شَامِسٌ، لَيْلٌ لَيْلٌ۔ اس کا معنی ہے "ہمیشہ رہنے والا سایہ"۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

ان فی الجنة لشجرة يسير الراكب فی ظلهامائة عام مايقطعها اقرأ و ان شئتم وظل ممدود

Marfat.com

(جنت میں ایک ایسا درخت ہے جس کے سایہ کو ایک سوار سو سال میں بھی طے نہ کر سکے گا۔ اگر آپ چاہیں تو یہ آیت وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ
ھیں)، (یعنی اس سے معنی واضح ہو جائے گا)۔

حضرت ربعی ابن انس فرماتے ہیں کہ ظِلًّا ظَلِيْلًا سے مراد عرشِ الٰہی کا سایہ ہے جو کبھی زائل نہیں ہوگا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا ○

(بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کو ادا کرو اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ خوب بات ہے یہ جس کی اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے) (النسآء : ۵۸)

گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسی دو نعمتوں سے نوازا ہے جن نعمتوں سے اس سے پہلے یہود نوازا گیا تھا۔ یعنی یہود کو ایک حاملِ دعوت امت بنایا گیا تھا اور شریعت الٰہی کی امانت ان کے سپرد کی گئی تھی اور پھر آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے ان کو حکومتیں بھی عطا فرمائی تھیں۔ اب یہی دونوں نعمتیں مسلمانوں کو عطا فرمائی جا رہی ہیں۔ حکومت سے تو یہود بہت مدت پہلے محروم ردیئے گئے اور شریعتِ الٰہی کی ذمہ داریوں سے اب ان کو معزول کیا جا رہا ہے اور مسلمان بیک وقت ان دونوں ذمہ داریوں سے رافراز اور گراں بار کیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ پیشِ نظر آیات میں مسلمانوں کو نصیحت کی جا رہی ہے کہ تم یہود کی طرح قومی اور گروہی صب کی بیماری میں مبتلا نہ ہونا۔ شریعتِ الٰہی کے ساتھ وہ رویہ اختیار نہ کرنا جو یہود نے اختیار کیا۔ کتاب کی معرفت تم سے جو عہود لئے لیے ہیں دیکھنا یہود کی طرح ان عہدوں کو نہ توڑنا۔

آیات کا شانِ نزول

چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں اس کیلئے دو بنیادی باتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک حق امانت کی ادائیگی کا اور دوسرا عدل وانصاف کی بداری اور بالادستی کا۔ لیکن ان دونوں باتوں کی وضاحت سے پہلے ہمارے قدیم مفسرین جو اس آیت کا شانِ نزول بیان کرتے ہیں اس میں رچہ اس آیت میں بیان کردہ نصائح اور ہدایات کا استقصاء نہیں ہوتا البتہ اس آیتِ کریمہ سے اس واقعہ پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ عثمان بن طلحہ جو بیت اللہ کے نگران اور چابی بردار تھے ان کا اپنا بیان ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ہم پیر اور جمعرات کے روز بیت اللہ کا دروازہ کھولا کرتے تھے اور لوگ اس میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کرتے تھے۔ ہجرت سے پہلے ایک روز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کچھ صحابہ کے ساتھ بیت اللہ میں داخل ہونے کیلئے تشریف لائے۔ عثمان نے آنحضرت کو اندر جانے سے روکا آپ نے بڑی بردباری کے ساتھ عثمان کے سخت کلمات کو برداشت کیا پھر فرمایا اے عثمان! شاید تم ایک روز یہ بیت اللہ کی چابی میرے ہاتھ میں دیکھو گے جبکہ مجھے اختیار ہوگا کہ میں جس کو چاہوں سپرد کردوں۔ عثمان بن طلحہ نے کہا کہ اگر ایسا ہو گیا تو قریش ہلاک اور ذلیل ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا نہیں! اس وقت قریش آباد اور عزت والے ہو جائیں گے۔

Marfat.com

فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان سے چابی طلب فرمائی تو ایک روایت تو یہ ہے کہ عثمان نے چابی سپرد کردی اور ساتھ ہی کہا کہ میں یہ امانت آپ کے سپرد کر رہا ہوں۔ لیکن بعض دوسری روایات میں یہ ہے کہ عثمان چابی لے کر بیت اللہ کے اوپر چڑھ گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زبردستی چابی اس کے ہاتھ سے لے کر آنحضرت کو دی۔ بیت اللہ میں داخلہ اور وہاں نماز ادا کرنے کے بعد جب حضور باہر تشریف لائے تو پھر چابی عثمان کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا: یہ چابی سنبھالو یہ قیامت تک تمہارے خاندان میں رہے گی۔ شخص تم سے یہ چابی چھینے گا وہ ظالم ہوگا۔ مقصد یہ تھا کہ کسی دوسرے شخص کو اس کا حق نہیں کہ تم سے یہ چابی لے لے۔ اس کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی کہ بیت اللہ کی خدمت کے صلہ میں تمہیں جو مال ملے اسے شرعی قاعدہ کے مطابق استعمال کرنا۔

عثمان بن طلحہ کہتے ہیں کہ جب یہ کنجی لے کر میں خوشی خوشی چلنے لگا تو آپ نے پھر مجھے آواز دی اور فرمایا کہ کیوں عثمان جو بات میں نے کہی تھی وہ پوری ہوئی یا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بے شک آپ کا ارشاد پورا ہوا اور اس وقت میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس روز جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ سے باہر تشریف لائے تو یہ آیت آپ کی زبان پر تھی۔ اس سے پہلے میں نے یہ آیت کبھی آپ سے نہ سنی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اس وقت جوفِ کعبہ میں آپ پر نازل ہوئی۔ بیت اللہ کی نگرانی اور اس کی چابی برداری اگرچہ عثمان کا کوئی حق نہ تھا کیونکہ اب تمام حقوق کا سرچشمہ اللہ اور اس کے رسول کی ذات تھی جس کو جو عطا فرمادیتے وہی اس کا حق بن جاتا۔ لیکن آپ نے عثمان کے ظاہری حق کو دیکھتے ہوئے جو خاندانی طور پر اس کے پاس تھا آپ نے اس آیت پر عمل کرتے ہوئے چابی اس کے حوالے کر دی حالانکہ اس وقت حضرتِ عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے آپ سے درخواست کی تھی کہ جس طرح بیت اللہ کی خدمت، سقایہ اور سدانہ ہمارے پاس ہے، یہ کنجی برداری کی خدمت بھی ہمیں عطا فرما دیجئے۔ مگر آپ نے ان کی درخواست رد کر کے کنجی عثمان بن طلحہ کو واپس فرمائی۔

یہ واقعہ بظاہر حقِ امانت کی ادائیگی کی بہترین مثال ہے کہ آج جبکہ تمام حقوق اور امانتیں آنحضرت کی تحویل میں ہیں لیکن آپ پرانے حوالوں کی بھی قدر فرما رہے ہیں۔ لیکن مراد اس آیت سے صرف یہی حکم دینا نہیں بلکہ جوفِ کعبہ میں اس آیت کا نزول بطورِ خاص یہ بتلانے کو کافی ہے کہ آج فتح مکہ کے بعد اللہ نے اسلام کو ایک ریاست میں تبدیل کر دیا ہے۔ آج آپ جس طرح ایک حاملِ دعوت امت کے رسول اور قائد ہیں اسی طرح ایک ملکِ عظیم کے مالک اور ایک ریاست کے سربراہ بھی ہیں۔ آپ نے اس ریاست کو ایسی بنیادیں فراہم کرنی ہیں ان طریقوں پر چلانا ہے جو آئندہ مسلمانوں کیلئے مشعلِ راہ ہوں گی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ آپ کو چند باتوں کا حکم دے رہا ہے جن پر عمل کرتے ہوئے آپ اس ریاست کو نمونے کی ریاست بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

امانت کا مفہوم

سب سے پہلا جو حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کے سپرد کرو)۔ اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلی جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ امانات امانت کی جمع ہے۔ امانت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ امانت صرف یہ نہیں کہ آپ کسی شخص کے پاس کوئی چیز رکھیں اور وہ آپ کو جوں کی توں واپس کر دے بلکہ اس کا مفہوم اس سے بہت وسیع ہے۔ تمام حقوق و فرائض خواہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہوں یا حقوق العباد سے انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے۔ اپنوں سے متعلق ہوں

Marfat.com

یا بے گانوں سے۔ مالی معاملات کی قسم سے ہوں یا سیاسی معاہدات کی قسم کے۔صلح وامن کے دور کے ہوں یا جنگ کے۔غرض جس نوعیت اور جس درجے کے حقوق وفرائض ہوں وہ سب امانت کے مفہوم میں داخل ہیں۔اس لحاظ سے اگر آپ غور فرمائیں تو آپ محسوس فرمائیں گے کہ عبادات بھی امانت ہیں۔تمام عائلی حقوق وفرائض تمام معاشرتی حقوق وفرائض، تمام تمدنی حقوق وفرائض، تمام سیاسی حقوق وفرائض، تمام حکومتی حقوق وفرائض، تمام قومی حقوق وفرائض، یہ سب امانات میں شامل ہیں۔اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ

(تم میں سے ہر کوئی ذمہ دار ہے اور تم میں ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا)

حکومت کے عہدے اور منصب جتنے ہیں وہ سب اللہ کی امانتیں ہیں۔جس کے امین وہ حکام اور افسر ہیں جن کے ہاتھ میں عزل ونصب کے اختیارات ہیں۔ان میں سے کسی کیلئے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کردے جو اپنی عملی یا علمی قابلیت کے اعتبار سے اس کا اہل نہ ہو بلکہ ان پر لازم ہے کہ ہر کام اور ہر عہدہ کیلئے اپنے دائرہ حکومت میں اہل کو تلاش کریں۔ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی اور پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی اور تعلق کی وجہ سے بغیر اہلیت معلوم کیے دے دیا اس پر اللہ کی لعنت ہے نہ اس کا فرض مقبول ہے نہ نفل۔یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہو جائے۔بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے کوئی عہدہ کسی شخص کے سپرد کیا حالانکہ اس کے علم میں تھا کہ دوسرا آدمی اس عہدہ کیلئے اس سے زیادہ قابل اور اہل ہے تو اس نے اللہ، اس کے رسول اور سب مسلمانوں کی خیانت کی۔خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل ملاحظہ فرمائیے کہ حضرتِ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سابقون الاولون میں سے ہیں اور آنحضرت کے ساتھ ان کی نہایت قربت تھی۔اس کے باوجود جب حضرتِ ابوذر نے آنحضرت سے درخواست کی کہ آپ مجھے کسی جگہ کا حاکم مقرر فرمائیں تو آپ نے فرمایا:

يَا اَبَاذَرٍ اِنَّكَ ضَعِيْفٌ وَاِنَّهَا اَمَانَةٌ وَاِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ اِلَّا مَنْ اَخَذَ بِحَقِّهَا وَاَدّٰى الَّذِىْ عَلَيْهِ فِيْهَا

(اے ابوذر! تم ایک کمزور آدمی ہو اور منصب ایک امانت ہے جس کی وجہ سے قیامت کے دن انتہائی ذلت اور رسوائی ہوگی (اس رسوائی سے صرف وہ بچے گا) جس نے اسے حق کے ساتھ لیا اور جس نے پھر اس کا پورا حق ادا کیا)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح منصب عطا کرنے والے اور ذمہ داریاں تفویض کرنے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ کسی شخص کو ایسی ذمہ داری پر فائز نہ کرے جس کا وہ اہل نہ ہو۔اسی طرح ذمہ داری اور عہدہ لینے والے کا بھی فرض ہے کہ وہ کسی ایسے منصب اور عہدے کی خواہش اور کوشش نہ کرے جس کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی اس میں صلاحیت نہ ہو اور اگر اس نے دھوکہ دے کر یا سفارش کے ذریعے ایسے کسی منصب کو حاصل کر لیا تو وہ جب تک اس منصب پر رہے گا اللہ کی ناراضگی کا ہدف بنا رہے گا اور قیامت کے دن سخت باز پرس سے گزارا جائے گا۔

Marfat.com

نااہلوں کو امانت سپرد کرنا خرابی کا اصل سبب ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی ادارہ ہو یا ملک اس کی خرابی کی بنیاد ہی یہ ہوتی ہے کہ اس میں ذمہ داریاں ان لوگوں کے سپرد کی جاتی ہیں جن میں ان کی ادائیگی کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاملات روز بروز بگڑتے جاتے ہیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیرِ اَھلِہٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ

(جب کاموں کی ذمہ داری نااہلوں کے سپرد کی جائے تو پھر قیامت کا انتظار کرو)

کیونکہ نااہلوں کی کوئی فوج بھی کسی کام پر لگادی جائے تو وہ کام کے بگاڑ میں اضافہ تو کرسکتی ہے اصلاح نہیں کرسکتی۔ ہمارے ملکی اور قومی معاملات روز بروز بگڑتے جارہے ہیں اور ہم نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے اس صورتحال سے دوچار ہیں۔ لیکن ہم کبھی اس پر غور کرنے کی زحمت نہیں کرتے حالانکہ معمولی عقل کا آدمی بھی حکومت کے ایوانوں سے لے کر معمولی دفاتر تک یہ صورتحال دیکھ رہا ہے کہ اکثر مناصب پر وہ لوگ فائز ہیں جو یا تو اس فیلڈ سے تعلق نہیں رکھتے اور یا اس کام کی ان میں صلاحیت نہیں۔ حکومت کا نظام چلانے کیلئے سیاسی سمجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور فوج کا نظام چلانے کیلئے عسکری علوم میں مہارت اور تجربے کی۔ لیکن اگر جرنیل سیاستدان لگادیئے جائیں اور حکومت جرنیلوں کے سپرد کردی جائے تو اس کا نتیجہ معلوم کرنے کیلئے کسی بزرجمہر کی ضرورت نہیں۔

جب تعلیمی ادارے جرنیلوں کے سپرد کردیئے جائیں اور انتظامی اداروں پر اساتذہ کو فائز کردیا جائے، وزارتِ صحت کسی تاجر کو دے دی جائے اور وزارتِ تجارت کسی ٹیکنوکریٹ کے حوالے کردی جائے اور یونیورسٹیوں کے چانسلر ایف اے پاس ہوں اور وزیرِ تعلیم تک میٹرک کی سطح کی تعلیم رکھتے ہوں اس طرح سے ہر شعبہ غیر متعلق اور نااہل لوگوں کے سپرد کردیا جائے تو اس سے مختلف نتائج نہیں نکل سکتے جن سے آج ہم گزر رہے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے طلبا نے ایک دفعہ صرف اس لئے گریجوایشن اور پوسٹ گریجوایشن کی ڈگریاں لینے سے انکار کردیا کیونکہ ڈگریاں ایوارڈ کرنے کیلئے جو گورنر صاحب چانسلر کی حیثیت سے تشریف لائے تھے وہ شاید ایف اے بھی نہ تھے اور ہمارے ملک میں یہ بھی لطیفہ ہوچکا ہے کہ ہمارے ملک کے وزیرِ تعلیم ایک ایسے صاحب رہ چکے ہیں جو میٹرک پاس تھے۔ انہیں انڈیا کے دورے پر جانا پڑا جہاں کے وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد تھے جن کے علم و فضل کا چرچا آج تک ان کی سیاسی مخالفت کے باوجود بھی جاری ہے۔ ان کے لئے بھی اور ہمارے وزیرِ تعلیم کیلئے بھی مجبوری تھی کہ ہم منصب ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے ملاقات کریں۔ ہمارے وزیرِ تعلیم صاحب ان کی ملاقات کو جاتے ہوئے سوچتے گئے کہ ابوالکلام چونکہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑے ادیب بھی ہیں بہتر ہے کہ میں ملاقات میں کوئی مصرع یا شعر ان کے سامنے ضرور پڑھوں۔ لیکن ان سے گفتگو کرتے ہوئے ایسے گھبرائے کہ ان سے اجازت چاہتے ہوئے فرمانے لگے۔

اچھا مولانا اب رستک ملیں گے گر خدا لایا

رخصت کا تلفظ تک بھول گئے اور انڈیا کے اخبارات نے اس کو خوب اچھالا اور پاکستان کی عزت میں خوب اضافہ ہوا۔

Marfat.com

ہمارے ملک کی وزارتوں پر اور یونیورسٹیوں کے منصب صدارت پر جو لوگ فائز ہوتے رہے ہیں اور اسی طرح ہمارے ملک کے کلیدی مناصب پر جن لوگوں کا قبضہ رہا اور آج بھی ہے اللہ کسی کو توفیق دے تو وہ اگر ان کی تفصیلی رپورٹ تیار کر سکے تو ایک ایسا گلدستۂ ظرافت تیار ہو گا جسے دیکھتے ہوئے ہم اپنے سارے غم بھول جائیں گے۔

امانت کی اہمیت

حقِ امانت کا یہ دیوالیہ اس قوم کے ہاتھوں انجام پذیر ہو رہا ہے جسے قرآنِ کریم کی ہدایت کے ساتھ ساتھ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس حد تک تاکید فرمائی تھی کہ صحابہ یہ فرماتے ہیں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خطبہ ارشاد نہیں فرمایا جس میں آپ نے یہ دو باتیں ارشاد نہ فرمائی ہوں۔

ا۔ لا ایمان لمن لا امانۃ لہ ''جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں''

۲۔ لا دین لمن لا عھد لہ ''جس شخص میں عہد کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں''

حقِ امانت میں عدل وانصاف پر زور

اس آیتِ کریمہ میں دوسرا جو حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے: وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ''جب تم لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے لگو تو عدل وانصاف کے ساتھ کیا کرو''۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس سے پہلے ہر سطح کے ملکی مناصب سپرد کرنے کیلئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر منصب اللہ کی سپرد کردہ ایک امانت ہے۔ اس میں خیانت مت کرنا۔ خیانت یہ ہے کہ اسے ایسے لوگوں کے سپرد نہ کرنا جن میں ان کی اہلیت نہ ہو اور جو اللہ سے ڈرنے والے نہ ہوں۔ اس حکم کے بعد اب یہ دوسرا حکم دیا جا رہا ہے کیونکہ جس ادارے میں حکمران اہل اور اللہ سے ڈرنے والے نہیں ہوں گے اس میں انصاف کی عمل داری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ایک چور کو اگر گھر کی نگرانی پر لگا دیں، ایک بے نماز کو مسجد کا امام بنا دیں، ایک جاہل اور علم دشمن کو تعلیمی ادارے کا سربراہ بنا دیں، اور آپ ایک ملحد اور اباحیت پسند کو وزارتِ مذہبی امور دے دیں، ایک منکرِ سنت کو نظریاتی کونسل کا چیئرمین بنا دیں، اور پھر آپ انہیں اداروں کی فلاح وترقی کے کام کو تیز کرنے کا حکم جاری کریں تو آپ خوب اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس حکم کا نتیجہ کیا ہو گا۔ اس لئے بنیادی بات یہ ہے کہ اگر مقصود ملک کے رہنے والوں میں عدل وانصاف کو عام کرنا اور ان کے معاملات کو عدل وانصاف کے مطابق چلانا ہے تو پھر سب سے پہلے ہر منصب پر اہل اور خدا سے ڈرنے والوں کو مقرر کرنا ہو گا۔ اگر عدالت کی کرسی پر ایسا منصف بیٹھا ہو جو جانتا ہو کہ عدل کرنے سے اللہ کے سامنے جوابدہی آسان ہو جائے گی اور اگر بے انصافی کروں گا تو اپنے آپ کو کند چھری سے ذبح کروں گا۔ تو ایسے آدمی سے آپ انصاف کی توقع کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ مقامی عدالتوں سے لے کر عدالتِ عظمیٰ تک راشی اور خائن لوگوں کو بٹھا دیں اور پھر یہ امید کریں کہ لوگوں کو انصاف ملے گا تو لوگوں کے ساتھ اس سے بڑا مذاق کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے سب سے پہلے حقِ امانت کی ادائیگی پر زور دیا گیا۔ جب ہر ذمہ داری پر اہل شخص فائز ہو گیا تو اب ان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے عدل وانصاف کے مطابق کرو اور یہ بھی یاد رہنا چاہئے کہ فیصلے صرف عدالتوں میں نہیں ہوتے ملک کے ہر ادارے میں ہوتے ہیں ایک کلرک سے لے کر چیف سیکرٹری تک بھی فیصلے کرتے ہیں ملک کا ہر تعلیمی ادارہ بچوں کی قسمتوں کے فیصلے کرتا ہے۔

Marfat.com

حکمران اور جج کو فیصلہ کرتے ہوئے صرف انصاف کے ترازو کے پلڑوں کو درست رکھنا ہے۔ اسے ہرگز یہ نہیں دیکھنا کہ فریقین میں بااثر کون ہے اور بے اثر کون ہے۔ کون سفارش لے کر آیا ہے اور کون سفارش سے محروم ہے۔ کس نے ایک بہت بڑے وکیل کو کھڑا کیا ہے اور کون ہے جو وکیل کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ انصاف جب تک بیرونی اثرات سے بے نیاز نہیں ہوتا اس وقت تک اس کا حق ادا کرنا ممکن نہیں۔ خلفاء راشدین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے درخشاں مثالیں قائم کی ہیں۔ فاروقِ اعظم ؓ جیسا عظیم حکمران خود عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ ہمارے گورنرز اور ہمارے حکمرانوں کی طرح اس نے اپنا کوئی ذاتی استحقاق نہیں رکھا اور جب عدالت کا جج اس کے احترام میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ برملا کہتا ہے کہ قاضی صاحب آپ نے یہ پہلی بے انصافی کی ہے کیونکہ آپ نے دوسرے فریق پر مجھے ترجیح دی ہے۔ حضرت علی ؓ ایک مقدمے میں خود عدالت میں فریق بن کر جاتے ہیں۔ فریقین کو مساوات دینے کی انتہا یہ ہے ایک یہودی حضرت علیؓ کے خلاف حضرت عمرِ فاروق ؓ کے پاس مقدمہ لے کر آتا ہے آپ یہودی کو سامنے کھڑا ہونے کا حکم دیتے ہیں اور حضرت علی سے فرماتے ہیں کہ ابوالحسن تم بھی اس کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ حضرت علی ؓ کھڑے تو ہو جاتے ہیں لیکن چہرے پر ناگواری کے آثار ہیں۔ فیصلے کے بعد حضرت فاروقِ اعظم ؓ نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ کیا تمہیں یہودی کے برابر کھڑا ہونا برا لگا؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: ایسا نہیں! مجھے جو بات بری لگی وہ اور تھی۔ وہ یہ کہ آپ نے یہودی کا تو نام لے کر کھڑا ہونے کا حکم دیا لیکن مجھے آپ نے ابوالحسن کہہ کر کنیت سے پکارا، جو لحاظ اور احترام کی علامت ہے۔ اس طرح سے فریقین میں مساوات نہ رہی، یہودی کیا سمجھے گا کہ اسلام میں مساوات نہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں بھی دیکھئے انصاف کا حکم دیتے ہوئے یہ نہیں فرمایا کہ مسلمانوں کے درمیان انصاف کرو بلکہ بین الناس فرمایا یعنی لوگوں کے درمیان انصاف کرو۔ ایک طرف اگر مسلم ہو اور دوسری طرف غیر مسلم حتیٰ کہ اگر ایک طرف امیر المومنین ہوں اور دوسری طرف غیر مسلم فیصلہ پھر بھی انصاف کے مطابق ہونا چاہیے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۟

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے) (النسآء : ۵۹)

تمہیدی کلمات

اسلام اپنے ماننے والوں کو جن بنیادوں پر اسلامی ریاست کی تعمیر کا حکم دیتا ہے اور جن بنیادی اُصولوں پر تمدن اور سیاسی نظام کی تشکیل کرتا ہے، نہایت اختصار اور ایجاز کے ساتھ ان بنیادی باتوں اور اساسی اصولوں کو اس آیت کریمہ میں ذکر فرما دیا گیا ہے۔ ان اُصولوں کو ذکر کرنے سے پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہیدی طور پر چند باتیں عرض کر دوں۔ جن کے سمجھ لینے کے بعد اسلام کے ان اساسی اُصولوں کو سمجھ لینا آسان ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

اسلام کے نزدیک سب سے اہم سوال جس کے حل پر انسان کی فلاح وبقا کا دارومدار ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی اطاعت کا اصل مرکز اقتدار کا اصل سرچشمہ کون ہے۔ یعنی وہ کون سی ذات یا وہ کون سی قوت ہے جس کی اطاعت کرنا اور احکام بجالانا انسانوں کے لیے ضروری ہے اور اسی بات پر انسانوں کی فلاح کا دارومدار ہے۔ اس لیے کہ یہ بات سمجھنا تو کوئی مشکل بات نہیں کہ انسان اجتماعیت چاہتا ہے۔ وہ جنگل کا نہیں بلکہ آبادیوں میں رہنے والی مخلوق ہے۔ وہ اپنا گھر بنا کر کسی کے پڑوس میں کسی محلے میں کسی آبادی میں محفوظ حالت میں رہنا چاہتا ہے۔ اس کے علاقات ہیں۔ اس کی قرابت کے رشتے ہیں۔ اس کے مفاداتی روابط ہیں۔ اس کے تعلقات میں ایک وسیع تنوع ہے جس کی وجہ سے وہ اجتماعیت کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ظاہر ہے کہ جہاں بھی اجتماعیت ہوگی اس اجتماعیت میں رہنے والوں کے کچھ حقوق فرائض بھی ہوں گے۔ ان کی کچھ حدودِ کار بھی ہوں گی۔ ان کے رہنے سہنے اور میل جول کے آداب بھی ہوں گے۔ یہیں سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ اگر انہی پابندیوں پر اجتماعیت کا دارومدار ہے تو ان پابندیوں پر عمل کرانے کے لیے کون سی چیزیں ضروری ہیں۔ اگر آپ غور فرمائیں تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ دو چیزیں ان میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں ایک یہ کہ اجتماعیت میں شریک لوگوں میں ایک ایسا آئین اور دستور نافذ ہو جو تمام کے حقوق وفرائض کی آگاہی دے اور ہر فرد اور ہر ادارے کے سامنے ان کے حدودِ کار کا تعین کرے۔ ہر شخص کو اندازہ ہو کہ اس کے فرائض کیا ہیں اور اس کے حقوق کیا ہیں اور اس کے انفرادی اور اجتماعی حقوق کی حدود کیا ہیں۔ وہ انفرادی زندگی میں کہاں تک آگے بڑھ سکتا ہے جس سے اجتماعیت مجروح نہ ہو۔

تین نظام ہائے حکومت

دوسری چیز جو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح آئین اور دستور اجتماعی اور انفرادی زندگی کی اساس ہے۔ اسی طرح ایک قوت حاکمہ کی بھی ضرورت ہے جو اس بات کی نگرانی کرے کہ کیا آئین اور دستور کی پابندی کی جارہی ہے یا نہیں۔ کیا افراد اور ادارے اپنی حدود سے تجاوز تو نہیں کررہے۔ کیا عدالتوں میں ان لوگوں کو انصاف مل رہا ہے یا نہیں جن کے ساتھ قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے زیادتی ہوئی ہے۔ اور اسی طرح اس اجتماعیت نے اپنے لیے زندگی گزارنے کے جو اصول وضع کیے ہیں کیا اس کی روح سمیت اس کا احترام کیا جارہا ہے۔ ان دو بنیادی چیزوں کی پابندی کے بغیر کوئی اجتماعیت بھی وجود میں نہیں آسکتی اور اگر آجائے تو باقی نہیں رہ سکتی۔ یہاں آکر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آئین وضع کرنے والی طاقت کون سی ہے اور وہ کون سی قوتِ حاکمہ ہے جس کا دیا ہوا آئین غیر مشروط اور واجب الاطاعت ہے اور اسی کے نام پر بننے والی حکومت اس آئین کی پابندی کرانے کی پابند ہے۔ دنیا نے آج تک اس کے مختلف جوابات دیے ہیں اور اسی کے نتیجے میں دنیا نے ہمیشہ مختلف نظاموں کا تجربہ کیا ہے۔ ایک وقت تھا جب دنیا میں صرف بادشاہت کا نظام چلتا تھا۔ بادشاہ ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو کسی کا انتخاب نہیں ہوتا۔ وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنی حکومت بنانے میں کامیاب ہوتا ہے اور پھر یہ حکومت وہ اپنے خاندان اور اولاد میں چھوڑ جاتا ہے۔ اس نظام کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسا آئین نافذ نہیں ہوتا جسے لوگ اپنی مرضی سے بناتے ہوں بلکہ بادشاہ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ آئین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر لوگوں سے وہ آئین کی تسوید وترتیب میں کام لیتا بھی ہے تو اوراق کے اس مجموعے کی اہمیت اس وقت تک ہوتی ہے جب تک بادشاہ کی اسے تائید حاصل رہتی ہے۔ لوگوں کا کام بادشاہ کی غیر مشروط اطاعت کرنا ہے۔ اس میں لوگوں کے حقوق وفرائض درحقیقت بادشاہ کی عطا اور دین ہوتے ہیں۔

Marfat.com

جب عسکریت کا دور آیا۔ جرنیلوں کو اپنی طاقت کا احساس ہونے لگا تو آمریت وجود میں آئی۔ کہنے کو تو یہ بادشاہت سے ایک مختلف چیز ہے کیونکہ اس میں میراث نہیں چلتی لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس میں اور بادشاہت میں کوئی اساسی فرق نہیں ہوتا۔ بادشاہت میں لوگ بادشاہ کی اطاعت کرتے ہیں اور آمریت میں آمر اور ڈکٹیٹر کی اطاعت کرتے ہیں۔ دونوں میں آئین اور قانون کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

تیسرا نظام حکومت جمہوریت کہلاتا ہے۔ یوں تو اسے عوام کی حکومت کہا جاتا ہے اور عوام کے نمائندے اپنی آزادانہ مرضی سے آئین بناتے ہیں اور حکومت اسی آئین کے مطابق نظام حکومت چلانے کی پابند ہوتی ہے۔ لیکن اکثر ممالک میں جمہوریت برسر اقتدار گروہ یا گروہ جسے طاقت کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے' کی لونڈی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ وہ آئین کو بھی موم کی ناک بنائے رکھتے ہیں اور جمہوریت کا نام لے کر اپنی خواہشات اور اپنی اغراض کے مطابق نظام حکومت چلاتے ہیں۔

اصل خرابی انسان کو غیر معمولی اختیارات کا مل جانا ہے

ہم نے تین نظامہائے حکومت کا ذکر کیا۔ ان تینوں میں ایک نقطۂ اشتراک پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ چاہے بادشاہت ہو' آمریت ہو' جمہوریت۔ ہر صورت میں اطاعت انسانوں کی کی جاتی ہے۔ انسان' انسان کی چاکری کرنے پر مجبور ہے۔ غلامی کا دور بظاہر ختم ہو گیا لیکن حقیقت میں غلامی کی شکلیں بدل گئیں لیکن اس کی روح پوری طرح زندہ ہے۔ بادشاہت اور آمریت میں تو یہ غلامی صاف نظر آتی ہے لیکن جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے' اس میں بھی سرچشمۂ اقتدار عوام کو کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ عوام کی مرضی سے چنے جانے والے لوگ انہی کی خواہشات کے مطابق قانون سازی کریں گے اور اسی قانون کی اطاعت تمام ملک کے رہنے والوں کو کرنی پڑے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک انسانوں نے جو نظام ہائے حکومت تشکیل دیے ہیں' ان کی بنیادی روح انسان کی غلامی یا اطاعت ہے۔ جہاں مکمل طور پر آج جمہوریت نافذ ہے' وہاں یہ دیکھ کر انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ عوام کے نام سے انسان کے سفلی جذبات اور خواہشات کی پیروی کی جا رہی ہے۔ اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا گیا ہے۔ ان جرائم کو سندِ جواز عطا کر دی گئی ہے' جن پر کبھی اللہ کا عذاب نازل ہو چکا ہے۔ انسانی زوال کے بدترین ادوار میں بھی جن برائیوں کو کبھی جائز قرار نہیں دیا جا سکا۔ آج باقاعدہ تالیوں کی گونج میں انہیں سندِ جواز دی جا رہی ہے۔ مرد و عورت کا ناجائز تعلق اور ناجائز اولاد قانونی اور اخلاقی طور پر عزت کے زینے چڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور نکاح اور اس کے نتیجے میں حلال اولاد آہستہ آہستہ مغرب میں بوجھ سمجھی جانے لگی ہے۔ کسی معاشرے میں جب مذہب نظر انداز ہوتا ہے تو اخلاقی حدود کا پامال ہونا یقینی ہو جاتا ہے اور جیسے جیسے اخلاقیات کا احترام ختم ہو جاتا ہے' ویسے ویسے لوگوں کی اکثریت خواہشات اور سفلی جذبات کی اسیر ہوتی جاتی ہے۔ جمہوریت میں فیصلے چونکہ اکثریت کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی آئینی کاوشیں' تہذیبی اظہار' سماجی رسوم اور ثقافتی علامتیں اخلاقی سطح سے گرتی چلی جا رہی ہیں۔ اس پوری تفصیل سے ہمیں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر انسان کی عظمت انسانیت کی بقا میں ہے اور انسانیت اخلاقیات کی پابندی کا دوسرا نام ہے' تو پھر ہمیں ایک ایسے نظام کو اختیار کرنا ہوگا' جس میں سرچشمۂ اقتدار اور سرچشمۂ آئین و قانون عوام نہ ہوں بلکہ وہ ذات ہو جو انسانوں کی خالق ہے۔ جس نے انسانی فطرت و جبلت کو پیدا فرمایا' جو انسانی طبیعت اور اس کے مزاج کو سمجھتی ہے۔ وہ خوب جانتی ہے کہ انسانی زندگی کی اصلاح کن اُصولوں کی پاسداری میں ہے۔ اور وہ کیا پابندیاں ہیں' جن کو اختیار کر لینے کے بعد انسانیت کا محفوظ سفر جاری رہ سکتا ہے۔ انسانوں کو حقوق بھی میسر آتے ہیں اور انسانی تہذیب بھی ترقی کرتی

Marfat.com

چونکہ خرابی کی ساری بنیاد انسانوں کے چند گروہوں کو غیر معمولی اختیارات کا مل جانا ہے اور یا تمام اچھے اور برے انسانوں کو ایک ہی سطح پر رکھ کر ان کی رائے کو یکساں وزن دے کر بنیادی فیصلوں میں انہیں شریک کرنا ہے۔ اسلام نے برائی کی اس بنیاد کو ختم کرنے کے لیے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے۔

حضرت ربعی ابن عامرؓ نے رستم کے دربار میں نہایت اختصار کے ساتھ اسے تین باتوں کی صورت میں بیان فرمایا تھا۔ اللہ کے اس عظیم بندے نے ان تین باتوں کی شکل میں قرآن و سنت کا ست نکال لیا ہے۔ رستم نے پوچھا کہ آپ ہمارے ملک پر حملہ کرنے کے ارادے سے کیوں آئے اور وہ کیا دعوت ہے جو آپ پیش کر رہے ہیں۔ آپ نے پہلی بات کے جواب میں جو کچھ کہا' وہ اس وقت پیش نظر نہیں۔ البتہ دوسری بات کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہم تین کام کرنا چاہتے ہیں۔ رستم نے کہا وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرایا جائے۔ تمام انسان ایک خدا کی مخلوق اور ایک باپ کی اولاد ہیں۔ کسی انسان کو کسی انسان پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ رنگ' جغرافیہ' نسل اور قوم یہ شناختیں ہیں۔ حقیقتِ انسان نہیں' ان کی وجہ سے انسان کو ادنیٰ و اعلیٰ میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ تم جس طرح تخت پر خدا بن کر بیٹھے ہو اور تمہارے درباری غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر تمہارے سامنے کھڑے ہیں اور تمہاری ہر خواہش اور تمہاری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ان کے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے' اسلام اس تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے کردار' اپنے حسنِ عمل اور اپنی جدوجہد کے نتیجے میں اپنا مقام پیدا کرو۔ کوئی آدمی یا کوئی طبقہ پیدائشی طور پر نہ بڑا ہو سکتا ہے اور نہ چھوٹا' تو ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی اور بندگی سے آزاد کر کے حریت اور آزادی کا وہ ماحول دینا چاہتے ہیں' جس میں انسان اپنی جدوجہد کے لیے ایک وسیع میدان پائے۔ اس کے سامنے کسب اور اکتساب کے تمام مواقع کھلے ہوں۔ جہد و عمل کے تمام امکانات موجود ہوں۔ اس آزادی کے نتیجے میں ہر انسان ہر گروہ اپنا مقام و مرتبہ کا جو تعین کرے گا وہی اس کا حقیقی مرتبہ ہو گا اور اسی سے انسانیت برگ و بار پیدا کرے گی۔ مزید فرمایا کہ ہم دوسرا کام یہ کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح ارباب اقتدار نے اور اقتدار پر فائز ایک طبقہ نے باقی انسانوں کو اپنا غلام بنا لیا ہے اور اپنے لئے کچھ مخصوص حقوق خاص کر لئے ہیں' جس سے باقی انسان محروم ہیں' اسی طرح ایک مذہبی طبقہ بھی ہے جو تقدس کا دعویدار ہے' جس نے اپنے لیے کچھ حقوق خاص کر لیے ہیں اور لوگوں کو اس فریب میں مبتلا کر دیا ہے کہ زمین و آسمان کے خالق کے ساتھ ہمارا کوئی خاص رشتہ ہے۔ ہماری رضا اور خوشنودی اس کی رضا ہے اس لیے ہمیں خوش کرنے کے لیے تمہیں نذر و نیاز اور ایک خاص قسم کا مذہبی ٹیکس ادا کرنا ہو گا جس کے نتیجے میں ہم تمہارے گناہوں کو بخشیں گے اور تم جنت میں داخل ہو سکو گے۔ حضرت ربعی بن عامرؓ نے فرمایا: ہم اس لیے آئے ہیں کہ ہم اس غلط مذہب کے ظلم و جور سے اور اس مذہبی طبقے کے تسلط سے انسان کو آزاد کریں اور انسانوں کو یہ بات سمجھائیں کہ یہاں کوئی پریسٹ کلاس نہیں ہے' یہاں کوئی مذہبی طبقہ نہیں ہے' یہاں کوئی برہمن نہیں کہ جو کوئی نسلی تفوق رکھتا ہو اور جسے کوئی خاص حقوق حاصل ہوں اور خدا کا کلام صرف انہی کی زبانوں پر جاری رہتا ہو اور مذہبی رسومات صرف انہی کے ذریعے انجام پا سکتی ہوں اور ان کے حضور قربانی اور دان کئے بغیر انسان اپنے خالق و مالک کی رضا حاصل نہ کر سکتا ہو۔ یہ مذہبی غلامی انسانوں نے خود پیدا کی ہے جس کے نتیجے میں ایک مذہبی طبقے کو ظلم کرنے کا حق ملا ہے اور باقی لوگ اس کے نتیجے میں مذہبی آزادی سے محروم ہو گئے ہیں۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اس مذہبی ظلم اور جور سے انسان کو نکال کر اسلام کے سایۂ عدل و احسان میں داخل کر دے۔ مزید فرمایا کہ تیسرا کام ہم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ انسان کو اس دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی فراخی میں داخل کر دیں۔ انسان کو اللہ نے عظیم مقاصد کے حصول کی آزادی بخشی تھی۔ اس کو وہ بلند پرواز عطا کی تھی' جس کے سامنے دنیا اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ہیچ تھی۔ وہ حقیقت میں آزادی رکھتا تھا' جس کی منزل آخرت تھی لیکن جب اسے دنیا کے تنگ نائے میں محصور کر دیا گیا تو اس کے نتیجے میں اس

Marfat.com

کی خوشیاں اس کے غم حتیٰ کہ اس کے مقاصد بھی مختصر ہوتے چلے گئے۔ وہ اس بچے کی طرح ہو گیا جو کھلونا ملنے سے خوش ہوتا اور کھلونا چھن جانے سے غمزدہ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی نگاہ میں کھلونا ہی اس کی دنیا ہے۔ ایک دنیادار آدمی جب دنیا ہی کو اپنی معراج سمجھ لیتا ہے اور اسی کا حصول اس کا مقصد بن جاتا ہے اور اس کی تمام توجہ اس گنبد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور اسی کا حصول اس کا مقصد بن جاتا ہے اور اس کی تمام توجہ اس گنبد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے تو یہ وہ غلامی ہے جو اس کو انسانیت کے حقیقی جوہر سے محروم کر دیتی ہے۔ یہاں کبھی وہ چند ٹکوں کے لیے لڑتا ہے۔ کبھی ایک قطعہ زمین کے لیے خون بہاتا ہے۔ کبھی عہدہ و منصب کے لیے دوسروں کی لاشیں گرانے سے بھی دریغ نہیں کرتا' کیونکہ وہ انہی چیزوں کو حقیقی مقاصد سمجھتا ہے۔ حضرت ربعی بن عامرؓ نے بتایا کہ یہ وہ چیزیں ہیں جس نے دنیا کو تاریک سے تاریک تر بنا دیا ہے۔ جب انسان کو اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ میری آزادی کا اصل مقصد آخرت ہے تو اس کے لیے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت کو چھوڑ دینا آسان ہو جائے گا۔ وہ آخرت کی خوشی کے لیے یہاں کی ہر خوشی قربان کر سکے گا۔ وہ جب یہ جانے گا کہ آخرت کی خوشی ایثار کرنے سے ملتی ہے' دوسروں کے گھروں میں چراغ جلانے سے ملتی ہے' کچھ چھین کر نہیں بلکہ کچھ دے کر ملتی ہے۔ حقیقی عظمت منصب و اقتدار میں نہیں بلکہ اس اقتدار کو آخرت کا ذریعہ بنانے میں ہے تو پھر ایسے آدمی کی نگاہوں میں آخرت کے مقصد کو اپنانے کا شعور اس طرح ابھرے گا کہ اسے یقین ہو جائے گا کہ میرا یہ مقصد میری زندگی سے بھی طویل ہے۔ ظاہر ہے کہ باقی تمام چیزیں زندگی سے قدر و قیمت میں کم ہیں۔ جب زندگی اس مقصد پر قربان کی جا سکتی ہے تو باقی چیزوں کی کیا حقیقت ہے۔ اقبالؒ نے شاید اسی کی طرف اشارہ کیا تھا:

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گمان لا الہ الا اللہ

میری ان گزارشات سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ انسانی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سرچشمۂ اقتدار کون ہے؟ غیر مشروط اطاعت کس کا حق ہے؟ کس کا آئین ہے جس کے مقابل میں کسی آئین کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کو اللہ نے انسانی بندگی سے آزاد پیدا فرمایا ہے کیونکہ اللہ کی بندگی ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے انسان کو حقیقی آزادی اور حقیقی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ اس حقیقی آزادی اور آسودگی کو یقینی بنانے کے لیے اس آیت کریمہ میں چند اُصول دیے گئے ہیں جو اسلامی تہذیب اور اسلامی تمدن کی بنیاد بھی ہیں اور اسلامی ریاست کی پہلی دفعہ بھی۔

اسلام میں امر و اطاعت کے مراکز

ا۔ اسلام میں حقیقی حاکمیت اور اطاعتِ کاملہ کا حق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے۔ وہی غیر مشروط مطاع ہے جس کی اطاعت کو کہیں بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنِ کریم نے ایک سے زیادہ جگہوں میں اس حقیقت کو دہرایا ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (حکم اور اطاعت صرف اللہ کے لیے ہے)۔ دوسری جگہ فرمایا اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (خبردار جس کی مخلوق ہے اسی کا امر ہے)۔ اس لیے مسلمانوں کی انفرادی زندگی اور اجتماعی نظام کا محور و مرکز خدا کی فرمانبرداری اور وفاداری کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس طرح سر صرف اسی کے سامنے جھکتا ہے اور دلوں کی دنیا اسی سے آباد ہوتی ہے اسی طرح تمام معاملات میں راہنمائی کا سرچشمہ اور اطاعت کا آستانہ صرف اسی کی ذات ہے۔ زندگی کی

Marfat.com

ضرورتوں کے تحت انسان کو اوراطاعتوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔لیکن ان میں لازمی شرط یہ ہے کہ ان میں سے کوئی اطاعت بھی اللہ کے احکام سے متصادم نہ ہو۔ بلکہ اپنی حقیقت میں غیر خدا کی تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کی مرہونِ منت اور اس کی تابع ہیں۔اور اگر کسی حلقۂ اطاعت میں شبہے کی گنجائش بھی پیدا ہو کہ اس میں غیر خدا کی اطاعت کو اہمیت مل سکتی ہے تو ایسا حلقۂ اطاعت توڑ کر پھینک دیا جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ (خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں ہے)۔

۲۔ اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسول کی اطاعت ہے۔رسول کی اطاعت کوئی مستقل بالذات اطاعت نہیں ہے۔کیونکہ وہ خود بھی اللہ ہی کا مطیع و فرمانبردار ہے۔اس کی اطاعت تو اس لیے کرنا ضروری ہے کہ دنیا میں اللہ کی اطاعت کی عملی صورت پیغمبر کی اطاعت کے سوا اور کوئی نہیں۔اسی کی زبان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے احکام کیا ہیں؟ اسی کے عمل سے یہ راہنمائی ملتی ہے کہ اللہ کے احکام پر عمل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ بندوں تک اللہ کے احکام اور فرامین پہنچنے کا کوئی مستند ذریعہ رسول اللہ کے سوا موجود نہیں۔اور احکام کی عملی صورت' اس کے مبہمات کی وضاحت' اس کے مجملات کی تفصیل اور اس کے قول کی عملی شکل صرف پیغمبر ہی کی ذات سے معلوم ہو سکتی ہے۔اس لیے جو شخص بھی اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کے لیے یہ بات از بس ضروری ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی اطاعت کرے۔یہ بات کہ نماز فرض ہے یہ بھی ہمیں اللہ کے رسول کے واسطے سے معلوم ہوئی ہے۔اور نماز پڑھنے کا طریقہ کیا ہے؟ نمازوں کی تعداد کیا ہے؟ اس کے فرائض' واجبات اور سنن کیا ہیں؟ اس کے اوقات کیا ہیں؟ پورا نظام صلوٰۃ کیا ہے؟ رسول کی راہنمائی کی بغیر ان میں سے کسی بات کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔اس لیے پروردگار نے ارشاد فرمایا مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (جو شخص رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے)۔اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ (جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی)۔

تاریخی حقیقت بھی یہ ہے کہ دنیا میں جب بھی کبھی کسی مذہب کو نقصان پہنچا ہے اور مذہب کے ماننے والوں نے اللہ کی اطاعت میں کمزوری دکھائی ہے اور آہستہ آہستہ خواہشات کے پیروکار بنتے چلے گئے اور اپنے دین کو انہوں نے موم کی ناک بنا دیا۔اور اللہ کی کتابیں ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئیں۔اس المیہ کا آغاز اس وقت ہوا جب ان کا تعلق اللہ کے رسول سے کمزور پڑا' رسول سے جذباتی رشتہ ٹوٹا' اس کی اطاعت اور پیروی تاویلوں کی نذر ہوگئی' رفتہ رفتہ اس کی سنت مٹتی چلی گئی۔پھر ایک وقت آیا کہ جب اللہ کی کتاب میں من مانی تاویلات کو روکنے کے لیے کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔عبادات تک کا نظام بدل ڈالا گیا' تصورات بگاڑ دیئے گئے' عقائد کو حقیقی روح سے بیگانہ کر دیا گیا۔پوری انسانی زندگی کے نظام کا مرکز و محور اگرچہ اللہ کی اطاعت ہے لیکن اس کی ظاہری شکل و صورت اور اس کی حقیقی روح کو باقی رکھنے کے لیے پیغمبر کی سنت کا محفوظ رہنا اور اس کی اطاعت کے جذبے کا باقی رہنا بے حد ضروری ہے۔اس لیے قرآن کریم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع پر یہاں تک زور دیا کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (اے پیغمبر ان سے کہہ دیجیے اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو پھر میری پیروی کرو' اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا)۔

Marfat.com

۳۔ مذکورہ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد ان کے ماتحت تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر لازم ہے وہ اولوالامر کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہو۔ اس آیت کریمہ میں غور فرمائیے اللہ اور رسول کے ساتھ تو مستقلاً اطیعوا کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت مستقل بالذات ہے لیکن اولوالامر کے ساتھ مستقل اطیعوا کا ذکر نہیں کیا گیا اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اولوالامر کی اطاعت مستقل بالذات نہیں ہے' بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ماتحت ہے۔ وہ کوئی ایسا حکم نہیں دے سکتے جو اللہ اور رسول کے احکام سے متصادم ہو یا ان کے مزاج اور روح سے ہٹا ہوا ہو۔ اسے ہر حکم دیتے ہوئے یہ بتانا ہوگا کہ میں جو حکم دے رہا ہوں اس کے لیے قرآن وسنت کی سند کیا ہے؟

اولوالامر سے کیا مراد ہے؟

اس بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اولوالامر سے کیا مراد ہے اسے سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ایک تمہیدی بات سمجھ لیجیے۔ جب بھی ہم اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں تو ہمارا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ہم سب سے پہلے قرآنِ کریم کو دیکھتے ہیں۔ اگر ہمیں واضح طور پر قرآنِ کریم میں کوئی حکم مل جاتا ہے تو ہم اس کی اطاعت میں سر جھکا دیتے ہیں۔ اور اگر قرآنِ کریم میں ہمیں واضح حکم نہیں ملتا تو پھر ہم احادیث پاک اور سنت رسول کو دیکھتے ہیں۔ تو اگر تو حدیث یا سنت میں ہمیں کوئی واضح حکم مل جاتا ہے جس کے سمجھنے اور جس پر عمل کرنے میں کوئی دشواری حائل نہیں ہوتی تو ہم اس پر بہ صمیم قلب عمل کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر اس میں کوئی واضح حکم نہیں ملتا تو پھر ہمارے لیے مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں ایک حکم تو موجود ہے لیکن وہ اس قدر واضح نہیں کہ ایک عام پڑھا لکھا آدمی اسے سمجھنے پر قادر ہو۔ کیونکہ قرآن کریم کا طریقہ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایک آیت دوسری آیت کی تشریح کرتی ہے یا کسی حدیث سے آیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آیت قرآنی کی ظاہری عبارت سے بات واضح نہیں ہوتی۔ البتہ اہل علم اور اہل بصیرت دلالۃ النص یا اقتضاء النص یا اشارۃ النص سے اس بات کو پا لیتے ہیں۔ لیکن عام قاری کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اور حدیث کے معاملے میں کبھی اس طرح کی صورت حال پیش آتی ہے کہ ایک ہی حکم سے متعلق ذخیرۂ احادیث میں متضاد روایات ملتی ہیں۔ اب ان میں یہ معلوم کرنا کہ کونسی روایت ناسخ ہے اور کونسی منسوخ؟ یا کونسی روایت اور درایت کے اعتبار سے قابل قبول ہے اور کونسی نہیں؟ ایسے تمام مواقع پر ہمیں مجتہدین اور قرآن وسنت کے ماہرین کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور ایسے لوگوں کو تلاش کرنا پڑتا ہے جنہوں نے قرآن وسنت کو سمجھنے اور اس کی ایک ایک مشکل کو سلجھانے میں زندگیاں کھپا دی ہوں۔ ایسی صورت حال میں اولوالامر سے مجتہدین قرآن وسنت اور ماہر علوم اسلامیہ مراد ہوں گے۔ اگر تو حکومت کے اندر خود ایسے ماہرین موجود ہیں جو اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہوں' پارلیمنٹ کا کوئی ذیلی ادارہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہو یا نظریاتی کونسل جیسی کوئی کمیٹی نہایت اخلاص سے اس طرح کی خدمت انجام دینے میں لگی ہوئی ہو تو وہ آزادانہ اپنی رائے کا ایسے معاملات میں اظہار کریں اور امت کے ثقہ اہل علم آزادانہ بحث ومباحثہ کے بعد ان معاملات پر پارلیمنٹ کو فیصلے تک پہنچنے میں مدد دیں۔ اس تفصیل سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہاں اولوالامر سے مراد یہ لوگ ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا۔ اگرچہ یہ علماء کی کاوشیں فقہی فتاویٰ کہلاتی ہیں اور علماء ہی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں لیکن حقیقت میں یہ قرآن وسنت سے ماخوذ' مستنبط اور مستفاد ہیں۔ قرآن وسنت سے علیحدہ نہیں۔

Marfat.com

زندگی کے بہت سارے معاملات ایسے ہیں جس میں اسلامی شریعت نے کوئی پابندی لگائی ہے اور نہ ان کے بارے میں کوئی حکم جاری فرمایا ہے۔ بلکہ ان پر عمل کرنے والوں کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہیں کریں۔ شریعت کی اصطلاح میں ایسے معاملات کو ''مباحات'' کہا جاتا ہے۔ دفاتر کے انتظامی معاملات' مختلف اداروں کی تشکیلات' انسانی ضرورتوں کے نئے نئے منصوبے مثلاً میونسپلیٹی' ریلوے اور ڈاکخانہ کے قوائد وضوابط' پولیس اسٹیشنوں کی تعداد' آبادکاری کے انتظامی معاملات ...... یہ سب مباحات ہیں۔ ان میں سے ایک ایک ادارے کو چلانے کے لیے ظاہر ہے انتظامی ڈھانچہ استوار کرنا ہوگا اور اس کے سربراہ بھی مقرر کرنے ہوں گے۔ اسی طرح عدالتی فیصلوں کے لیے جج یا تمدنی اور معاشرتی امور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار' غرضیکہ پورے ملک میں درجہ بدرجہ اجتماعی معاملات کو سنبھالنے والے تمام صاحب امر کہلاتے ہیں۔ علماء اور مجتہدین دینی معاملات کے حوالے سے اولوالامر ہیں اور باقی تمام ذمہ دار لوگ انتظامی حوالے سے اولوالامر کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ اگر ایک طرف ملکی نظام کی پابندی کرنے کے پابند ہیں تو ساتھ ہی اپنے سیرت و کردار اور مقاصد حیات کے حوالے سے اسلامی آداب زندگی اختیار کرنے کے مکلّف ہیں۔ ان تمام کا سررشتہ پارلیمنٹ اور کابینہ سے ہوتے ہوئے چیف ایگزیکٹو اور صدر مملکت سے وابستہ ہوتا ہے۔ اپنے بنیادی کردار کے حوالے سے وہ بھی باقی لوگوں کی طرح اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے پابند ہیں اور اجتہادی معاملات میں علماء کے اجتماعی فیصلوں کے مکلّف ہیں۔ ان کا براہِ راست تعلق اگرچہ مباحاتی امور سرانجام دینے سے ہوتا ہے لیکن دینی امور کا نفاذ بھی بہرصورت انہی کی ذمہ داری ہے اس لیے ان کے سیرت و کردار میں اگر کوئی ایسی کمزوری ہو جو پوری ریاست کے مزاج پر اثر انداز ہو سکتی ہو تو اسلام اسے کسی طرح بھی گوارا نہیں کرتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ ذیل ارشادات کو دیکھئے اس سے بات کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی:

السمع و الطاعة علی المرء المسلم فی ماحب و کره مالم یومر بمعصیة فاذا امر بمعصیة فلاسمع و لا طاعة (بخاری و مسلم)

(مسلمان کو لازم ہے کہ وہ اپنے اولوالامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند ہو تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سننا چاہیے نہ ماننا چاہیے)

لاطاعة فی معصیة انماالطاعة فی المعروف (بخاری و مسلم)

(خدا اور رسول کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت جو کچھ بھی ہے ''معروف'' میں ہے)

یکون علیکم امراء تعرفون وتنکرون فمن انکر فقد برئ ومن کره فقد سلم ولکن من رضی وتابع فقالوا افلا نقاتلهم قال لاما صلوا (مسلم)

(حضور ﷺ نے فرمایا تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضی کیا وہ بری الذمہ ہوا اور جس نے ان کا ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا پھر جب ایسے حکام کا دور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں)

Marfat.com

یعنی ترکِ نماز وہ علامت ہوگی جس سے صریح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وہ اطاعتِ خدا اور رسول سے باہر ہو گئے ہیں اور پھر ان کے خلاف جدوجہد کرنا درست ہوگا۔

شرار ائمتکم الذین تبغضونھم ویبغضونکم وتلعنونھم ویلعنونکم قلنا یارسول اللہ افلا ننابذھم عند ذلک؟ قال لاماافامو افیکم الصلوۃ الاما اقاموفیکم الصلوۃ (مسلم)

(حضور ﷺ نے فرمایا تمہارے بدترین سردار وہ ہیں جو تمہارے لئے مبغوض ہوں اور تم ان کے مبغوض ہو۔ تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! جب یہ صورت ہو تو کیا ہم ان کے مقابلہ پر نہ اٹھیں؟ فرمایا: نہیں! جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں نہیں۔ جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں)

اس حدیث میں اوپر والی شرط کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا اوپر کی حدیث سے گمان ہو سکتا تھا کہ اگر وہ اپنی انفرادی زندگی میں نماز کے پابند ہوں تو ان کے خلاف بغاوت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ حدیث بتاتی ہے کہ نماز پڑھنے سے مراد دراصل مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں نماز کا نظام قائم کرنا ہے یعنی صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ لوگ خود پابند نماز ہوں بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے تحت جو نظام حکومت چل رہا ہو وہ کم از کم اقامت صلوٰۃ کا انتظام کرے۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ ان کی حکومت اپنی اصولی نوعیت کے اعتبار سے ایک اسلامی حکومت ہے ورنہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ حکومت اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور اسے الٹ پھینکنے کی سعی مسلمانوں کے لئے جائز ہو جائے گی۔ اسی بات کو ایک اور روایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے من جملہ اور باتوں کے ایک اس امر کا عہد بھی لیا کہ

ان لاتنازع الأمر اھلہ الاان تروا کفرا بواحاعندکم من اللہ فیہ برھان

(ہم اپنے سرداروں اور حکام سے نزاع نہ کریں گے الا یہ کہ تم ان کے کاموں میں کھلا کھلا کفر دیکھو جس کی موجودگی میں ان کے خلاف تمہارے پاس خدا کے حضور پیش کرنے کیلئے دلیل موجود ہو) (بخاری و مسلم)

اختلاف کی صورت میں آخری مرجع اور سند

۴۔ چوتھی بات جو آیت زیرِ بحث میں ایک مستقل اور قطعی اصول کے طور پر طے کر دی گئی ہے یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند (Final authority) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ میں بھی نزاع واقع ہوگی اس میں فیصلہ کے لئے قرآن اور سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہوگا اس کے سامنے سب سر تسلیم خم کر دیں گے۔ اس طرح تمام مسائلِ زندگی میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو سند اور مرجع اور حرفِ آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظامِ زندگی سے ممیز کرتی ہے، جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جائے وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظام ہے۔

Marfat.com

اسی لیے اس آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ الخ تنازع کے معنی اختلاف رائے کے آتے ہیں۔ یعنی کسی معاملے میں کسی کی رائے کچھ ہو کسی کی کچھ' موقع دلیل ہے کہ یہاں اس سے مراد وہ اختلاف رائے ہے جو کسی معاملے میں حکم شریعت معین کرنے کے باب میں ہوسکتا ہے۔ مثلاً کسی نص شرعی کی تعبیر و تاویل میں اختلاف رائے ہو جائے۔ یا کسی امرِ اجتہادی میں اختلاف پیدا ہو جائے۔ یہ اختلاف قرآن کی کسی آیت یا رسول کی کسی سنت کی تاویل میں بھی ہوسکتا ہے اور غیر منصوص معاملات میں کتاب وسنت سے اوفق کے تعین میں بھی۔ علی ہذا القیاس یہ اولوالامر اور عوام کے درمیان بھی ہوسکتا ہے اور خود اولوالامر کے اندر آپس میں بھی ہوسکتا ہے۔ اس طرح کا جب کوئی اختلاف واقع ہو تو اس کے حل کے لیے امت کو یہ ہدایت ہوئی کہ اس معاملے کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔ ''اللہ ورسول کی طرف لوٹاؤ'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر کتاب وسنت کے نصوص میں اس معاملے کے لیے کوئی قطعی راہنمائی موجود نہیں ہے تو ان کے اشارات' مقتضیات' فحویٰ اور امثال نظائر کو پیش نظر رکھ کر اس میں اوفق بالکتب والسنة کا تعین کرو اور اس کو اختیار کرو۔ فرمایا کہ یہ طریقہ تاویل کے پہلو سے سب سے زیادہ بہتر و اعلیٰ ہے۔ اس لیے کہ ظن غالب یہی ہے کہ یہ بات اللہ ورسول کی بات کے موافق ہوگی اور اختلاف کا فیصلہ اس قانون کے مطابق ہوگا جو اسلام میں اصل قانون اور تمام فقہ واجتہاد کا مرکز ومرجع ہے اور یہی طریقہ ہے نظام اجتماعی وسیاسی میں حاکمیت الٰہی کے پوری مضبوطی کے ساتھ پکڑنے اور اعتصام بحبل اللّٰه کا اور یہی حقیقی توحید ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى

الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ
قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا
اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ
الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ
مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ
اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا
فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ

Marfat.com

قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ
وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ
وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ﴿٦٤﴾ فَلَا
وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ
ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا
تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾ وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ أَوِ
اخْرُجُوا مِن دِيَارِكُم مَّا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِّنْهُمْ ۖ وَلَوْ أَنَّهُمْ
فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيتًا ﴿٦٦﴾
وَإِذًا لَّآتَيْنَاهُم مِّن لَّدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٦٧﴾ وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا
مُّسْتَقِيمًا ﴿٦٨﴾ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ
أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ
وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ﴿٦٩﴾ ذَٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ
اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ عَلِيمًا ﴿٧٠﴾

عربی رکوع ۹ (اے نبی تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعوی تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اوران کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں ٥ اس وقت کیا ہوگا جب ان

Marfat.com

کے اعمال کی پاداش میں ان کو بھی مصیبت پہنچے گی' پھر یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ خدا کی قسم ہم نے تو صرف بہتری اور سازگاری چاہی۔ان لوگوں کے دلوں کے اندر جو کچھ ہے' اللہ اس سے خوب واقف ہے' ان سے اعراض کرو' ان کو سمجھاؤ اور ان سے خود ان کے بارے میں دل میں دھنسنے والی بات کرو ٥ اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور اگر وہ جب کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا' تمہاری خدمت میں حاضر ہوتے اور خدا سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی چاہتا تو وہ خدا کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے ٥ پس (اے پیغمبر) تیرے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ حاکم بنائیں آپ کو ہر اس جھگڑے میں جو پھوٹ پڑا ان کے درمیان۔ پھر نہ پائیں اپنے نفسوں میں تنگی اس سے جو فیصلہ آپ نے کیا اور تسلیم کرلیں دل وجان سے ٥ اور اگر ہم ان پر یہ فرض کرتے کہ اپنے آپ کو قتل کرو یا نکل جاؤ اپنے گھروں سے تو ان میں سے بہت تھوڑے ہی اس کی تعمیل کرتے۔اور اگر یہ لوگ وہ کرتے جس کی ہدایت کی جاتی ہے تو ان کے لیے یہ بات بہتر اور ایمان پر قدم جمانے والی ہوتی۔اور اس وقت ہم عطا کرتے انہیں اپنے پاس سے اجرِ عظیم اور ضرور ہی پہنچاتے انہیں سیدھے راستے پر اور جو اطاعت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ سب ساتھی۔ یہ اللہ کی طرف سے فضل ہے اور کافی ہے اللہ تعالیٰ جاننے والا) (آیات ٦٠ تا ٧٠)

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ ؕ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا ٥ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًا ٥ؐ

(اے نبی تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔شیطان انہیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں) (النسآء : ٦٠ تا ٦١)

سابقہ آیت کریمہ میں اسلامی زندگی کے جو بنیادی اُصول بیان فرمائے گئے ہیں' ان کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ ایک شخص جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔اس کے اسلام اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ غیر مشروط اطاعت صرف اللہ اور رسول کی کرتا ہے۔اس کے علاوہ کسی اور

Marfat.com

قانون کی اطاعت کرنے کا اولاً تو وہ مجاز نہیں اور اگر کہیں اس کی اجازت ہے تو اس شرط کے ساتھ کہ وہ قانون اللہ اور اس کے رسول کے احکام سے متصادم نہ ہو۔ اور اس کا مزاج اسلامی قانون کے مزاج سے مختلف نہ ہو۔ ایسی ہر حکومت اور ایسا ہر تخت و تاج جو اللہ اور رسول کی حکومت اور اطاعت سے انحراف کا راستہ دکھاتا ہو اور یا اس کے توڑ پر اپنی حکومت کا صور پھونکتا ہو اور اپنی غیر مشروط اطاعت کرانے پر زور دیتا ہو۔ اسے نہ صرف قبول نہیں کیا جا سکتا بلکہ ایسے ہر رشتۂ اطاعت کو توڑ پھینکنے کا حکم دیا گیا ہے اور ہر مسلمان، مسلمان ہوتے ہوئے اس بنیادی اُصول اور عہد کا پابند ہے۔ پیش نظر آیات کریمہ میں ان لوگوں کا پول کھولا جا رہا ہے جو اپنے تئیں مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور بڑی قوت سے یہ بات کہتے تھے کہ ہم اللہ اس کے رسول اور ان تمام کتابوں پر ایمان لائے ہیں، جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔ لیکن ان کا طرزِ عمل اپنے اس دعوے کے یکسر برعکس تھا۔ قرآن حکیم اظہار تعجب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے پیغمبر ذرا ان لوگوں کے طرزِ عمل کو دیکھئے اور پھر ان کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ چنانچہ ان کی حقیقت کو یوں تو ان آیات میں پوری طرح بے نقاب کر دیا گیا ہے لیکن مفسرین نے ان آیات کا جو شان نزول بیان کیا ہے، اس سے ان کے حالات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

آیات کا شانِ نزول

ان آیات کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ بشر نامی ایک منافق تھا، اس کا ایک یہودی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔ یہودی نے کہا کہ چلو تمہارے پیغمبر سے فیصلہ کرواتے ہیں۔ مگر بشر منافق نے اس کو قبول نہ کیا بلکہ کعب بن اشرف یہودی کے پاس جانے اور اس سے فیصلہ کرانے کی تجویز پیش کی۔ کعب بن اشرف یہود کا ایک سردار اور رسول کریم ﷺ اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ یہودی تو اپنے سردار کو چھوڑ کر آنحضرت ﷺ کا فیصلہ پسند کرے اور اپنے آپ کو مسلمان کہنے والا بشر آپ ﷺ کی بجائے یہودی سردار کا فیصلہ اختیار کرے، مگر راز اس میں یہ تھا کہ ان دونوں کو اس پر یقین تھا کہ رسولِ کریم ﷺ حق و انصاف کا فیصلہ کریں گے۔ اس میں کسی کی رُو رعایت یا غلط فہمی کا اندیشہ نہیں اور چونکہ اس جھگڑے میں یہودی حق پر تھا، اس لیے اس کو اپنے سردار کعب بن اشرف سے زیادہ اعتماد آنحضرت ﷺ پر تھا اور بشر منافق غلطی اور ناحق پر تھا، اس لیے جانتا تھا کہ آپ ﷺ کا فیصلہ میرے خلاف ہو گا اگرچہ میں مسلمان کہلاتا ہوں اور یہ یہودی ہے۔

ان دونوں میں باہمی گفتگو کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ دونوں اسی پر راضی ہو گئے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس حاضر ہو کر آپ ﷺ سے اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرائیں۔ مقدمہ آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچا۔ آپ ﷺ نے معاملہ کی تحقیق فرمائی، تو حق یہودی کا ثابت ہوا، اس کے حق میں فیصلہ دے دیا اور بشر کو جو بظاہر مسلمان تھا، ناکام کر دیا۔ اس لیے وہ اس فیصلہ پر راضی نہ ہوا اور ایک نئی راہ نکالی کہ کسی طرح یہودی کو اس بات پر راضی کر لیا جائے کہ ہم حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس فیصلہ کرانے چلیں۔ یہودی نے اس کو قبول کر لیا۔ راز اس میں یہ تھا کہ بشر نے یہ سمجھا ہوا تھا کہ حضرت عمرؓ کفار کے معاملہ میں سخت ہیں، وہ یہودی کے حق میں فیصلہ دینے کے بجائے میرے حق میں فیصلہ دیں گے۔

بہرکیف یہ دونوں اب حضرت فاروق اعظمؓ کے پاس پہنچے، یہودی نے حضرت فاروق اعظمؓ کے سامنے پورا واقعہ بیان کر دیا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ جناب رسول اللہ ﷺ فرما چکے ہیں، مگر یہ شخص اس پر مطمئن نہیں اور آپ کے پاس مقدمہ لایا ہے۔

Marfat.com

حضرت عمرؓ نے بشر سے پوچھا کہ کیا یہی واقعہ ہے؟ اس نے اقرار کیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا: اچھا ذرا ٹھہرو۔ میں آتا ہوں' گھر میں تشریف لے گئے اور ایک تلوار لے کر آئے اور اس منافق کا کام تمام کردیا اور فرمایا: ''جو شخص رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ پر راضی نہ ہو' اس کا یہی فیصلہ ہے۔'' (یہ واقعہ روح المعانی میں بروایت ثعلبی وابن ابی حاتم حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے)

منافقین کا اصل جرم

آیت کریمہ کے مفہوم اور شانِ نزول کی تفصیل کو سامنے رکھئے تو آپ کو یہ سمجھنے میں آسانی ہوجائے گی کہ وہ اصل جرم کیا ہے جس کی وجہ سے منافقین کو یہاں مطعون کیا جارہا ہے اور جس کی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ ایک منافق کا سر اڑانے پر مجبور ہوئے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کو دیکھتے ہوئے ایک مخلص مومن کے لیے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ دوسرے مسلمان کی جان لینے کی کوشش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جب یہ شکایت پہنچی کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک ایمان کے دعویدار کو قتل کردیا ہے تو حضور ﷺ نے برہم ہو کر فرمایا: ماکنت اظن ان عمر یجتری علی قتل رجل مومن (میں گمان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ عمر ایک مومن آدمی کے قتل پر جرأت کرے گا)۔ لیکن جب آپ کے سامنے اس منافق کا اصل جرم آیا اور قرآن کریم نے پوری صورتحال کو کھول کر بیان کردیا تو آنحضرت ﷺ بھی مطمئن ہوئے اور مسلمانوں کو بھی اطمینان ہوا کہ اس جرم کی سزا اس کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی۔ وہ جرم یہ ہے کہ یہ منافق لوگ اپنے معاملات کو فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کے پاس لے کے جاتے ہیں۔ حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ طاغوت یوں تو ہر ایسی سرکش قوت کو کہتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں اپنی غیر مشروط اطاعت پر اصرار کرے لیکن اس آیت کریمہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں طاغوت سے مراد وہ حاکم ہے جو قانونِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو اور وہ نظامِ عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو۔ لہٰذا یہ آیت اس معنی میں بالکل واضح ہے کہ جو عدالت طاغوت کی حیثیت رکھتی ہو' اس کے پاس اپنے معاملات فیصلہ کے لیے لے جانا ایمان کے منافی ہے اور خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کردے۔ قرآن کی رُو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت کا انکار دونوں لازم وملزوم ہیں۔ خدا اور طاغوت دونوں کے آگے بیک وقت جھکنا عین منافقت ہے۔ یہی بات شان نزول سے معلوم ہوتی ہے۔ جب حضرت عمر فاروقؓ کو یہ معلوم ہوا کہ اس شخص نے آنحضرت ﷺ کے فیصلہ کو ماننے سے انکار کیا اور پہلے یہ یہود کی عدالت میں جانا چاہتا تھا اور اب میرے پاس فیصلے کے لیے آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے رسول کے فیصلے کو یہ آخری سند ماننے سے انکار کرتا ہے اور کسی دوسرے کے فیصلے کو آپ کے فیصلے پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ وہ جرم ہے جسے شریعت کی زبان میں ارتداد کہتے ہیں۔ ایسے جرم کا ارتکاب کرنے والا مرتد کہلاتا ہے۔ کیونکہ ایمان نام ہے اللہ اور اس کے رسول کے فیصلوں پر سر جھکا دینے کا اور دل ودماغ کو سپرد کردینے کا۔ لیکن جب ایک شخص ایمان اور اسلام کے دعوے کے ساتھ ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے فیصلوں کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لا کر اس نے جو عہد کیا تھا' وہ عہد اس نے توڑ ڈالا۔ اس عہد کی وجہ سے جو اسے حقوقِ شہریت میسر تھے' وہ یقیناً اس سے چھین لیے جائیں گے اور اسلامی ریاست نے ایمان کے عوض جس طرح اس کی جان مال اور آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی تھی' وہ ختم ہوجائے گی۔ بلکہ دوسروں کے سامنے اس جرم کی شناعت کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے اسے وہ سزا دی جائے گی جو ہر قانون میں ملک

Marfat.com

کے باغی کو دی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسے شخص کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: من ارتد عن دینه فاقتلوه (جو آدمی اپنے دین سے پھر جائے اسے قتل کر دو) کیونکہ اسلام میں دین پرائیویٹ معاملہ نہیں بلکہ ریاست کا قانون اور دستور ہے۔ اسے چیلنج کرنے کی کسی طرح بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے اس حق کو استعمال کرتے ہوئے جو کوتوالِ شہر کے طور پر آپ کو حاصل تھا' اسے قتل کر دیا۔ اور آئندہ کے لیے مسلمانوں پر یہ بات واضح کر دی کہ ایمان کے دعویٰ بعد اللہ اور اس کے رسول کی حیثیت کو چیلنج کرنا اور دوسروں کو وہ حیثیت دینا جو درحقیقت اللہ اور اس کے رسول کی حیثیت ہے' اس کا اسلام میں کوئی جواز نہیں۔

وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا کا مفہوم

آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا: وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (شیطان انہیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے) اس جملے پر غور کرنے سے اس جملے کی بلاغت اور اس کے مفہوم کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک انسان کی زندگی مسجد تک محدود نہیں بلکہ گھر سے شروع ہو کر محلے' بازار' منڈیوں' تعلیمی اداروں' دفاتر' عدالتوں سے ہوتی ہوئی ایوان ہائے حکومت تک پھیلی ہوئی ہے۔ کوئی انسان بھی جو انسانی اجتماعیت کا حصہ ہے' وہ زندگی کی اس وسعت سے انکار نہیں کر سکتا۔ مسلمان انسان ہونے کے اعتبار سے اپنی زندگی میں ایسی ہی وسعت رکھتا ہے لیکن مسلمان ہونے کے حوالے سے اس کی اور عام انسان کی زندگی میں ایک فرق بھی ہے۔ عام انسان زندگی کے تمام دوائر میں اپنے ملکی قانون یا اپنے من مرضی کا مالک ہے۔ جو کچھ اس سے ملک کا قانون تقاضا کرتا ہے اور جس طرح اس کے مفادات محفوظ ہوتے اور خواہشات پھل ہوتی ہیں' اسی طرح وہ زندگی کو گزارنے کی کوشش بھی کرتا ہے اور اس کا مجاز بھی ہے۔ لیکن ایک مسلمان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ گھر کی انفرادی زندگی سے لے کر ایوان ہائے حکومت تک پھیلی ہوئی اجتماعیت میں کسی سطح پر بھی نہ تو ایسے ملکی قانون کی پیروی کر سکتا ہے' جو اللہ اور اس کے رسول کے قانون سے متصادم ہو۔ اور نہ اپنی اس طرح کی مرضی اختیار کر سکتا ہے جو اسے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی خلاف ورزی پر آمادہ کرے۔ اسے بہرصورت زندگی کے ہر دائرے میں اور ہر مقام پر صرف اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت کرنی ہے۔ اسی کا نام ایمان اور اسلام ہے۔ اگر ایک شخص اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود اسلامی قانون کو نظر انداز کر کے ایسی عدالتوں میں جاتا ہے جہاں غیر اسلامی قانون نافذ ہے اور جہاں طاغوت کے احکام چلتے ہیں' تو اس کا یہ رویہ صرف عدالتوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ زندگی کے تمام دوائر میں یہی رویہ اختیار کرے گا۔ جہاں چاہے گا غیر اللہ کے قوانین کی اطاعت کرے گا۔ جہاں چاہے گا اپنی خواہشات کی پرستش کرے گا۔ جہاں چاہے گا اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر اسلامی قانون کو توڑ کر پھینک دے گا۔ اس کا بدیہی نتیجہ یہی ہوگا کہ اس کی پوری زندگی مسجد کے علاوہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام سے آزاد' شیطان یا اپنی خواہشات کی پیروی میں گزرے گی۔ یہ وہ گمراہی ہے جو بظاہر غیر اسلامی عدالتوں میں اپنے معاملات کے لے جانے سے شروع ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ پوری زندگی اسلام کی پٹڑی سے اُتر کر شیطان کی پٹڑی پر چڑھ جاتی ہے اور ایک مسلمان اسلام سے اتنا دور نکل جاتا ہے کہ بعض دفعہ اسے پلٹنے کا راستہ بھی نہیں ملتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں کیا گیا ہے کہ منافقین کو دیکھو کہ دعویٰ اسلام کا رکھتے ہیں لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف آؤ۔ یعنی اللہ نے قرآن کریم میں جو احکام نازل کیے ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت

Marfat.com

سے جو اس کی تشریح اور تفسیر فرمائی اور جو اس کو عملی شکل و صورت عطا کی ہے' اس کی طرف آؤ' تو تم ان منافقین کو دیکھو گے کہ اس سے پہلو بچا کے نکل جاتے ہیں یعنی کسی طرح بھی اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ ان کا رویہ اس لیے پختہ ہو گیا ہے کہ انہوں نے یہود کی عدالتوں میں جانے کا جو جرم کیا تھا' شیطان نے اس سے فائدہ اُٹھایا اور ان کی پوری زندگی پر اس کی چھاپ لگا دی۔

یہ تنقید ہمارے لیے آئینہ ہے

ان آیات میں ان منافقوں پر تنقید ہو رہی ہے' جو آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے ہم عصر تھے اور ان کے دلوں میں چھپی ہوئی خیانتوں کو بے نقاب کیا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے اس تنقید پر ۱۴۰۰ سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا لیکن جب ہم آج کے مسلمان کی حالت دیکھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ تو ہماری حالت بیان کی جا رہی ہے۔ اندازہ فرمایئے کہ مسلمانوں کے تقریباً ساٹھ کے قریب ملک ہیں۔ ان تمام ملکوں میں واضح اکثریت مسلمانوں کی ہے اور مسلمانوں کی تعداد سوا ارب سے زیادہ ہے اور دنیا کے تمام قابل ذکر ساحلوں پر ان کا قبضہ ہے۔ اللہ کی بیش بہا نعمتیں ان کے ہر ملک میں فراوانی سے پائی جاتی ہیں۔ قدرت نے مسلمانوں کو نوازنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ ممکن ہے اس میں مسلمانوں کا امتحان بھی ہو۔ لیکن اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ سعودی عرب میں حدود اللہ کے اجرا کے علاوہ پوری دنیائے اسلام میں کہیں بھی اللہ کا قانون نافذ نہیں۔ بعض مسلمان ملک ایسے ہیں کہ جن میں اگر مساجد نہ ہوں تو شاید باہر سے آنے والا پہچان بھی نہ سکے کہ یہ کوئی مسلمان ملک ہے۔ کوئی ایسی غیر اسلامی حرکت' کوئی بے حیائی' کوئی بدعنوانی' کوئی خیانت ایسی نہیں جس کا ارتکاب مسلمان ملکوں میں نہیں ہوتا۔ اور بیشتر ممالک کے حکمران اسلام کا نام لیتے ہوئے بھی شرماتے ہیں۔ اکثر ممالک کے جدید تعلیم یافتہ لوگ' ان کے نام نہاد دانشور' ان کے ذرائع ابلاغ پر قابض مافیا امکانی حد تک لادینیت کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور اسلام کی جڑ کاٹنا اور اس کے بارے میں نئی نسل کے ذہنوں میں عجیب و غریب اشتباہات پیدا کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ اب تو نوبت بایں جا رسید کہ شرعی شکل و صورت رکھنا' شرعی لباس پہننا' علوم اسلامیہ کے ادارے قائم کرنا' انہیں سپورٹ کرنا' تبلیغ و دعوت کے کام میں شریک ہونا اور لادینی قوتوں پر تنقید کرنا ایک ایسا جرم بن گیا ہے جس سے بڑھ کر حکمرانوں کے نزدیک اور کوئی جرم نہیں۔ اکبر مرحوم نے تو شاید صرف شاعری کی تھی لیکن ان کا یہ شعر اب تو مسلمانوں کے حال کی منہ بولتی تصویر ہے:

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مسلمانوں کی ریاستیں اور حکومتیں جنہیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسلام کا امین' مبلغ اور منفذ ہونا چاہیے تھا اور جن کی ریاستوں میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مقابلے میں کسی اور حکم اور کسی قانون کی کوئی حیثیت نہیں ہونی چاہیے تھی اور جن کی شناخت اور جن کا فخر صرف اسلام ہونا چاہیے تھا اور جن کے دل و دماغ کے رشتے صرف اللہ اور اس کے رسول سے وابستہ ہونے چاہئیں تھے اور جن کے تعلیمی ادارے علوم عصریہ کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ کے بھی مرکز ہونے چاہئیں تھے۔ جن کے تہذیب و تمدن کی بنیادیں صرف اسلام سے پھوٹنی چاہئیں تھیں اور جن کی ثقافت آنحضرت ﷺ کے گھر اور آپ کے ماحول کی نمائندہ ہونی چاہیے تھی لیکن ان ریاستوں کو دیکھتے ہوئے یہ باتیں دیوانے کا خواب معلوم ہوتی ہیں۔ آج کے دانشوروں سے اگر یہ باتیں کہی جائیں تو ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترتیں۔ یہ تمام صورت حال یقیناً خون رلا دینے والی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ہم عصر منافقین تو یہودی عدالتوں میں جا کر قیامت تک کے لیے رسوا ہو گئے

Marfat.com

اور منافق کے نام سے پہچانے گئے لیکن آج کے مسلمان ان سے بڑھ کر منافقت رکھتے ہوئے کس نام سے پکارے جائیں گے۔ انہیں اگر شیطان دور تک گمراہی کے راستوں پر لے گیا تو آج کے مسلمان کی گمراہی کے راستوں میں کوئی روک یا اوٹ باقی رہ گئی ہے؟ کاش مسلمان اپنی اس حالت پر غور کریں۔ قرآن کریم کے آئینہ میں اپنی شکل پہچانیں اور قرآن کریم نے منافقین کی دنیا اور آخرت میں جس سزا کا ذکر کیا ہے اسے دیکھتے ہوئے عبرت حاصل کریں۔ اور عذاب کا وقت آنے سے پہلے اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش کریں' تو اللہ کی رحیمی اور کریمی سے کوئی بعید نہیں کہ وہ مسلمانوں کی حالت پر رحم فرمائے۔

فَکَیْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ یَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِیْقًا ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا ۢ بَلِیْغًا ○

(اس وقت کیا ہوگا جب ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو بھی مصیبت پہنچے گی' پھر یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ خدا کی قسم ہم نے تو صرف بہتری اور سازگاری چاہی۔ ان لوگوں کے دلوں کے اندر جو کچھ ہے' اللہ اس سے خوب واقف ہے' ان سے اعراض کرو' ان کو سمجھاؤ اور ان سے خود ان کے بارے میں دل میں دھنسنے والی بات کرو) (النسآء: ۶۲ تا ۶۳)

منافقین کو تنبیہ اور آگاہی

پروردگار منافقین کو آنے والے دنوں کا حوالہ دے کر اپنی حالت پر غور کرنے کی تلقین فرما رہے ہیں۔ آج تو ان کا حال یہ ہے کہ بڑھ چڑھ کر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے معاملات اللہ اور رسول کے سامنے پیش کرو تو کسی نہ کسی بہانے سے پہلو بچا کے نکل جاتے ہیں اور حتی الامکان ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنا کوئی معاملہ اللہ کے رسول کی عدالت میں لے کر نہ جائیں۔ حالانکہ ان کے ایمان کا تقاضا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی ہر بات کو حرزِ جان بنائیں اور انہی کے فیصلوں کو آخری سند اور اتھارٹی سمجھیں۔ لیکن اس وقت ان کا کیا حال ہوگا جب ان کے کرتوت ان کے راز افشا کردیں گے اور ان کے عزائم بے نقاب ہوجائیں گے اور ان کی اصلیت واضح ہوجائے گی۔ تو پھر یہ دوڑے دوڑے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں گے کیونکہ وہی ایک دروازہ ایسا ہے' جس میں رحمت کے سوا اور کچھ نہیں اور پھر جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اب تک جو رویہ اختیار کیا۔ آخر اس کا سبب کیا تھا کیونکہ تمہیں تو دعویٰ تھا مومن ہونے کا اور مومن ہو کر پھر طاغوت کے پاس اپنے معاملات لے کے جانا ان دونوں باتوں میں تو کوئی جوڑ نہیں تو پھر وہ دور از کار باتیں بنانے کی کوشش کریں گے' کہ ہمارے پیش نظر صرف مسلمانوں کی بھلائی تھی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں اور یہود کے درمیان اختلاف کی خلیج بڑھتی چلی جائے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یعنی ہمارے پیشِ نظر مصالحت اور موافقت کے سوا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس مصیبت اور اس طرح کے حالات پیش آنے کا مفہوم کیا ہے۔ بعض مفسرین کا گمان یہ ہے کہ جس طرح بشر صریحاً اللہ کے رسول کے فیصلے سے انکار کر کے حضرت عمرؓ کے غضب کا نشانہ بنا اور اپنے انجام کو پہنچا۔ باقی لوگ بھی کبھی نہ کبھی اپنے کرتوتوں

Marfat.com

کے باعث پکڑے جائیں گے۔ ان کی حرکتیں بھی کھل کے رہیں گی۔ وہ بھی بشر کی طرح اپنے برے انجام کو پہنچیں گے۔ لیکن ان آیات کریمہ پر گہرے تدبر سے اگر کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مستقبل کی ایک دھندلی سی تصویر دکھائی جا رہی ہے' جس کی تعبیر اگرچہ پردۂ غیب میں ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو خوب جانتے ہیں۔ یہ ان کی کرم نوازی ہے کہ وہ منافقین کو قبل از وقت مطلع فرما رہے ہیں اور جن لوگوں کی حالات پر نظر گہری تھی' ان کے لیے یہ باتیں بعید از قیاس نہ تھیں۔ بات یہ کہی جا رہی ہے کہ آج تو تم یہود کی پشت پناہی کے باعث اسلام کو اور مسلمانوں کو وہ اہمیت نہیں دے رہے جو بجا طور پر دینی چاہیے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں کہ جب اسلام کو غلبۂ عمومی حاصل ہو گا اور یہود آہستہ آہستہ اپنا دم خم کھو بیٹھیں گے اور انہیں مدینے سے جانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ اور ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ حکم دے دیا جائے گا کہ منافقین کے معاملہ میں وہ چشم پوشی اور اغماض کی روش بدل دیں اور جس طرح اب تک ان کو بہر صورت برداشت کرنے کی پالیسی چل رہی تھی' اسے چھوڑ کر احتساب شروع کر دیں۔ پھر منافقین کو اندازہ ہو گا کہ ہم جن کے بل بوتے پر شرارتیں کرتے رہے اور جن مسلمانوں کی کریم النفسی اور وسعت ظرف کے باعث مہلت سے فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں۔ اب صورت حال ایسی تبدیل ہوئی ہے کہ مسلمانوں نے اپنی روش بدل لی ہے اور یہود پشت پناہی کے لائق نہیں رہے۔ تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہو گا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر مختلف قسم کے عذر پیش کریں۔

قرآن کریم نے یہاں جس پیشگوئی کو ذکر فرمایا ہے۔ جنگ خندق کے بعد وہ وقت آ گیا کہ جب یہ پیشگوئی حقیقت کی شکل اختیار کر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ بنو نضیر اور بنو قینقاع کو پہلے شہر بدر کیا جا چکا تھا۔ بنو قریظہ قتل کر دیے گئے۔ اب مدینے کے ماحول کو خالص اسلامی ماحول میں تبدیل کرنے کا وقت آ گیا۔ اور حالات کا تقاضا ہوا کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کا مکمل غلبہ ہو۔ فتح مکہ کا معرکہ قریب آ رہا تھا۔ اس کی تیاری کے لیے آستین کے سانپوں کو برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے اب تیزی سے منافقین کا احتساب شروع ہوا اور اس وقت منافقین کو اندازہ ہوا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کریم النفسی اور نرم خوئی سے فائدہ نہ اٹھا کر بہت سخت غلطی کی۔ لیکن یہ وہ باتیں ہیں جو تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں' اس پیش گوئی میں ان باتوں کی تصویر دیکھی جا سکتی تھی۔ لیکن اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پروردگار فرما رہے ہیں کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں' آپ انہیں سن لیجیے لیکن ان کی حقیقت وہ نہیں جو کچھ کہا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے دلی ارادوں کو جانتا ہے۔ یہ تو یہ تاثر دے رہے ہیں کہ ہم تو اُمت کی خیر خواہی اور سازگاری کے جذبے سے یہ سب کچھ کرتے رہے۔ حالانکہ یہ منافقت اور طاغوت پرستی کا فساد تھا جو انہیں اسلام کی طرف سے یکسو نہیں ہونے دیتا تھا اور یہ دل میں اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ اسلام اور یہود کی اس کشمکش میں ہو سکتا ہے کہ یہود کا پلڑا بھاری ہو جائے تو پھر یہ ہماری پالیسی ہمارے کام آئے گی اور ہم انہیں اپنی موجودہ پالیسی کا حوالہ دے کر مفادات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور فرض کریں اگر مسلمان ہی غالب آتے ہیں تو تب بھی مسلمانوں میں ہمارا شامل رہنا ہمارے مفادات کی حفاظت کے لیے ضمانت بن جائے گا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ابھی ان سے کچھ نہ کہیے' البتہ انہیں نصیحت فرمایئے اور فہمائش کیجیے۔ البتہ اس نصیحت میں پہلے نرم روی اور شبنمی انداز کا غلبہ رہتا تھا' اب تھوڑی سی لہجے میں تبدیلی پیدا کیجیے۔ اور ان پر یہ حقیقت واضح کر دیجیے کہ ان سے جو کچھ کہا جا رہا ہے یہ خود ان کے لیے بہتر ہے' ان کی اس روش سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور ان کو یہ بات اس انداز میں فرمایئے جو دل میں دھنس جانے والی ہو یعنی دل میں وہ ایک چبھن محسوس کریں اور سمجھ لیں کہ اگر ہم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔

Marfat.com

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ۝

(اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور اگر وہ جب کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا' تمہاری خدمت میں حاضر ہوتے اور خدا سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی چاہتا تو وہ خدا کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے) (النسآء : ۶۴)

رسول کا حقیقی مقام ومرتبہ

اس آیت کریمہ میں پروردگار نے رسول کی حیثیت وعظمت کو پوری طرح نمایاں کردیا ہے۔ ارشاد فرمایا: کہ ہم نے جب بھی کوئی رسول بھیجا ہے تو صرف اس لیے نہیں بھیجا کہ اسے مان لیا جائے اور اس سے عقیدت ومحبت کا اظہار کیا جائے بلکہ رسول اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ اسے مانا بھی جائے' اس سے عقیدت بھی رکھی جائے اور اس سے محبت بھی کی جائے۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی اطاعت کی جائے کیونکہ صرف مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک اس کے ساتھ اطاعت شامل نہ ہو۔ اسی طرح وہ محبت اور عقیدت زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ نہیں جس کے ساتھ اطاعت کی تائید شامل نہ ہو۔ ایک آدمی کسی شخصیت کی عظمت تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے احکام کی تعمیل نہیں کرتا۔ کسی سے عقیدت ومحبت کا دم بھرتا ہے لیکن اس کی پیروی نہیں کرتا تو غور فرمایئے کہ اس مان لینے اور عقیدت ومحبت کے اظہار کرنے کا آخر کیا فائدہ ہے۔ رسول تو دنیا میں اس لیے آتا ہے تاکہ یہ ساری نسبتیں اس کے ساتھ قائم ہوں۔ وہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مکمل تبدیلی لانے کا پابند ہوتا ہے۔ اگر اس کے احکام کی تعمیل نہ کی جائے اور اس کی کسی ہدایت کو قبول نہ کیا جائے اور اس کو ماننے والے صرف زبانی جمع خرچ کرنے والے ہوں تو ایسے لوگوں کی زندگی میں کیا تبدیلی واقع ہوسکتی ہے اور ان کے واسطے سے کیسا انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ تو ہر رسول کے ساتھ ہے۔ کہ اطاعت رسول کو ماننے کی لازمی شرط ہے۔ لیکن وہ ذات گرامی جو سید الرسل بن کے دنیا میں آئی ہے' اس کی اطاعت نہ کرنے کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے۔ لیکن منافقین صرف یہ سمجھتے تھے کہ ایمان کا دعویٰ اور محبت وعقیدت کا اظہار بس ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے اور بدنصیبی سے آج کا مسلمان بھی یہی سمجھتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے معاملات میں شریعت کو دخیل ہونے کا کہیں موقع نہیں دیتا۔ وہ اپنی پوری زندگی کو اس سے آزاد رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن جب اسے خیال آتا ہے کہ میں آخر ایک مسلمان بھی ہوں تو وہ چند نعتیں پڑھ کر یعنی اظہار محبت وعقیدت کرکے سمجھتا ہے کہ میں نے آخرت کا سامان کرلیا ہے۔ ایک عرب شاعر نے نہایت تعجب سے اس دو عملی پر توجہ دلائی ہے۔ وہ کہتا ہے:

تَعۡصِی الرَّسُوۡلَ وَ اَنۡتَ تُظۡهِرُ حُبَّہٗ ۔۔۔ هٰذَا لَعَمۡرِیۡ فِی الزَّمَانِ بَدِیۡعٌ

لَوۡ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَاَطَعۡتَہٗ ۔۔۔ اِنَّ الۡمُحِبَّ لِمَنۡ يُحِبُّ مُطِيۡعٌ

(تو رسول کی نافرمانی کرتا ہے اور اس سے محبت کا اظہار بھی کرتا ہے میری بقا کی قسم زمانے میں یہ بالکل نئی بات ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو رسول کی اطاعت کرتا' کیونکہ محبت کرنے والا ہمیشہ اپنے محبوب کی اطاعت کرتا ہے)

Marfat.com

اسی بات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا۔ کل امتی یدخلون الجنۃ الا من ابیٰ۔ قالوا: یارسول اللہ ومن ابی؟ قال: من اطاعنی فقد دخل الجنۃ ومن عصانی فقد ابی (میری ساری اُمت جنت میں جائے گی' ہاں وہ نہیں جائے گا جس نے انکار کیا۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ کس نے انکار کیا؟ ارشاد فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے مجھے ماننے سے انکار کیا)

مختصر یہ کہ رسول' اللہ کی حاکمیتِ قانونی اور تشریعی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے۔ تو جو بھی اس کی نافرمانی کرتا ہے چونکہ یہ اللہ کی نافرمانی ہے' اس لحاظ سے وہ شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ رسول کی عدالت کو چھوڑ کر کسی اور عدالت میں اپنے معاملے کو فیصلے کے لیے لے کر جاتا ہے تو وہ اللہ کی حاکمیت کا انکار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اپنی جان پر اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں۔ اس لیے فرمایا کہ اگر یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر چکے' یعنی یہود کی عدالتوں میں جا کر انہوں نے اپنے آپ پر ظلم توڑا ہے تو اب بھی بچ نکلنے کا ایک راستہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اے پیغمبر وہ آپ کے پاس آئیں' پھر اللہ سے معافی مانگیں اور آپ بھی ان کے لیے اللہ سے استغفار کریں۔ تو یقیناً اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پائیں گے۔ آپ کے پاس انہیں آنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ انہوں نے آپ کی عدالت میں نہ آ کر حقیقت میں آپ کی رسالت کو چیلنج بھی کیا ہے اور آپ کا دل بھی دکھایا ہے۔ اس جرم کی تلافی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ سب سے پہلے آپ کے پاس آ کر آپ سے معافی نہ مانگیں اور آپ کو خوش نہ کریں۔ اور جب تک آپ ان کے لیے استغفار نہیں کریں گے' اس وقت اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں فرمائے گا۔ بعض اہلِ علم نے لکھا ہے کہ یہ آیت اگرچہ خاص منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کے الفاظ سے ایک عام ضابطہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور آپ اس کے لیے دعائے مغفرت کر دیں' اس کی مغفرت ضرور ہو جائے گی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیوی حیات کے زمانے میں ہو سکتی تھی' اسی طرح آج بھی روضۂ اقدس پر حاضری اسی حکم میں ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کر کے فارغ ہوئے تو اس کے تین روز بعد ایک گاؤں والا آیا اور قبر شریف کے پاس آ کر گر گیا اور زار زار روتے ہوئے آیت مذکورہ کا حوالہ دے کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ اگر گنہگار رسول کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور رسول اس کے لیے دعائے مغفرت کر دے تو اس کی مغفرت ہو جائے گی۔ اس لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ میرے لیے دعائے مغفرت فرمائیں۔ اس وقت جو لوگ حاضر تھے' ان کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں روضۂ اقدس کے اندر سے آواز آئی۔ قَدْ غُفِرَ لَکَ (کہ تمہاری مغفرت کر دی گئی) واللہ اعلم واحکم بالصواب۔ (بحر محیط)

فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ٥

(پس (اے پیغمبر) تیرے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ حاکم بنائیں آپ کو ہر اس جھگڑے میں جو پھوٹ پڑا ان کے درمیان۔ پھر نہ پائیں اپنے نفسوں میں تنگی اس سے جو فیصلہ آپ نے کیا اور تسلیم کر لیں دل و جان سے) (النسآء : ۶۵)

Marfat.com

وَ رَبِّکَ کا معنی ومفہوم

وَرَبِّکَ میں واؤ قسم کے لیے ہے۔اس سے پہلے لا زائد کہا جاتا ہے' لیکن یہ قسم کی تاکید کے لیے آتا ہے۔ہمارے متقدمین اس کو اسی معنی میں لیتے ہیں۔نفی ایمان پر دلالت کرنے کے لیے لا نفی کو دوبار ذکر کیا۔ایک بار قسم سے پہلے اور دوسری مرتبہ قسم کے بعد۔اس سے قسم کے ساتھ جو بات کہی جارہی ہے اس کی انتہائی تاکید بھی مقصود ہے اور تحسین کلام بھی۔

سابقہ آیتِ کریمہ میں رسول کی حیثیت کو بیان کیا گیا تھا۔رسول کو مان لینا یا اس سے عقیدت کا اظہار کرنا کافی نہیں بلکہ اس کی اطاعت بھی ضروری ہے۔اس آیتِ کریمہ میں اس مضمون کو پوری وسعت اور جامعیت کے ساتھ کھول دیا ہے۔اس میں سب سے پہلے ایک قاری کی نگاہ قسم پر پڑتی ہے کہ ''اے پیغمبر! تیرے رب کی قسم ہے۔'' اور اس کے بعد منافقین کے بارے میں ان کے عدمِ ایمان کا ذکر فرمایا گیا ہے۔سوال یہ ہے کہ قسم اس وقت کھائی جاتی ہے جب مخاطب کو بات کہنے والے کی بات کا اعتبار نہ ہو۔اور اس کے نزدیک قائل کی حیثیت ایسی معتبر نہ ہو کہ اس کی ذات کا حوالہ باقی ہر چیز سے مستغنی کر دے۔تو پھر بات کہنے والا اپنی بات کو موکد اور قابل اعتبار ٹھہرانے کے لیے قسم کا سہارا لیتا ہے۔لیکن جس کی ذات ہر طرح کے شک وشبہ سے بالا ہو اسے ان سہاروں کی ہرگز ضرورت نہیں ہوتی۔پروردگار کے بارے میں کوئی بدتر سے بدتر آدمی بھی تصور نہیں کرسکتا کہ اس کی کسی بات میں جھوٹ کا شائبہ بھی ہوسکتا ہے۔خود قرآنِ کریم نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ بات کہی ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (اللہ سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہوسکتی ہے)۔لیکن یہاں پروردگار بات کہنے سے پہلے قسم کھا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ قسم کے ذریعے اپنی بات کا اعتبار پیدا کر رہا ہے۔بلکہ یہاں دو وجہ سے قسم کھائی جارہی ہے۔ایک تو اس وجہ سے کہ منافقین کو اس بات کا اچھی طرح یقین آجائے کہ اللہ کے نزدیک وہ ایمان کسی طرح بھی قابلِ اعتبار نہیں جس میں اللہ کے رسول کی اطاعت اور محبت میں کمی ہو۔وہ ہزار ایمان کے دعوے کریں لیکن ایمان کے لیے لازمی سند وہ ہے جو اس آیت کریمہ میں آگے پیش فرمائی جارہی ہے۔اور دوسری وجہ قسم کھانے کی شاید یہ ہے کہ اس سے پہلے آیت نمبر ۶۳ میں پروردگار نے منافقین کی قسم کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ آپ کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے ایمان میں اور مسلمانوں کے ساتھ ہمارے رویے میں منافقت کا کوئی دخل نہیں ہے۔یہاں پروردگار نے منافقین کی اس جھوٹی قسم کی تردید سچی قسم کے ساتھ فرمائی ہے کہ وہ اپنا اعتبار جمانے کے لیے ہزار قسمیں کھائیں وہ سب جھوٹی ہیں۔سچی قسم یہ ہے کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہیں۔اور مزید یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ وَرَبِّکَ کے خطاب میں جس طرح پروردگار نے اپنی اضافت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی طرف فرمائی ہے اور جس طرح التفاتِ خاص کا ثبوت دیا ہے اس سے منافقین اور قیامت تک آنے والے انسانوں کو یہ بات بتلانا مقصود ہے کہ جس پیغمبر کی اطاعت اور محبت کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ اس کا مقام ومرتبہ اللہ کی نگاہ میں کیا ہے؟ قسم تو یقیناً اللہ کے نام کی ہوتی ہے اس لیے پروردگار یہ بھی فرماسکتے تھے کہ ''مجھے اپنی قسم ہے'' لیکن بطورِ خاص یہ فرمانا کہ ''تیرے رب کی قسم ہے'' اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس طرح دلنوازی اور عظمتِ شان کا اہتمام کیا گیا ہے اس کی وضاحت کے لیے تو شہپرِ جبریل چاہیے' انسانی زبان یا قلم میں اس کی طاقت نہیں کہ وہ اس کی نزاکتوں کا حق ادا کرسکے۔اس کے بعد ایمان کے ثبوت کے لیے تین باتیں ارشاد فرمائیں:

Marfat.com

ایمان کے ثبوت کے لیے تین شرائط

ا۔ کہ تمہارے ایمان کا اس وقت تک کوئی اعتبار نہیں جب تک تم اپنی زندگی کے تمام اختلافات میں اللہ کے رسول کو آخری حَکَم، سند اور اتھارٹی نہ سمجھو۔ اس میں دو باتیں انتہائی قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ بات کہ اللہ کے رسول کی فیصلہ کن حیثیت صرف عبادات یا خالص دینی امور میں نہیں، بلکہ اعتقادات سے لے کر معاملات تک اور پھر عدالتوں سے لے کر ایوان ہائے حکومت تک، قومی معاملات سے لیکر بین الاقوامی معاملات تک تک، کسی سطح پر بھی اور کسی دائرے میں بھی کوئی معاملہ سر اٹھائے جس میں امت کے اہلِ علم یا عوام اور حکمرانوں میں یہ اختلاف ہو جائے کہ اس معاملے میں راہِ صواب اور نقطۂ اعتدال کیا ہے؟ تو اس کے فیصلے کے لیے صرف اللہ کے رسول کی طرف لوٹنا ہوگا۔ اگرچہ رجوع سب سے پہلے قرآنِ حکیم کی طرف کیا جائے گا، لیکن قرآنِ کریم کے اصولوں کی عملی تعبیر، اس کے مبہمات کی وضاحت، اس کے مجملات کی تشریح، چونکہ یہ صرف اللہ کے رسول کا کام ہے اس لیے عملی طور پر اللہ کے رسول کی ذات ہی مرجع ہوگی۔ کوئی آدمی یا کوئی گروہ صرف اعتقادات یا عبادات میں تو اللہ کے رسول کی طرف دیکھتا ہے لیکن باقی پوری زندگی میں وہ اللہ کے رسول کو حَکَم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ منافق ہے اور اس کے ایمان کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اور دوسری یہ بات کہ کہ اگر کوئی شخص زندگی کے ہر معاملے میں زبانی طور پر تو اللہ کے رسول کی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے، لیکن عملی طور پر وہ اللہ کے رسول یعنی قرآن وسنت کو حقیقی اہمیت دینے اور واقعی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اظہارِ عقیدت ومحبت کا وقت آئے تو وہ سب سے پیش پیش ہو لیکن جب اس سے اجتماعی، تہذیبی، تمدنی، حکومتی اور تعلیمی معاملات میں آنحضرت یعنی قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے کے لیے کہا جائے تو وہ صاف پہلو بچا کر نکل جائے تو ایسا شخص بھی اللہ کی نگاہ میں مومن نہیں۔ مختصر یہ کہ زندگی کے تمام معاملات اور اختلافی امور میں جب تک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فیصلہ کن حیثیت تسلیم نہ کی جائے اس وقت تک ایمان ناقابلِ اعتبار رہتا ہے۔ اور ایسا شخص حقیقت میں مومن نہیں ہوتا۔

۲۔ دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں ایمان کے ثبوت کے لیے یہ فرمائی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حَکَم، سند اور اتھارٹی تسلیم کر لینا ہی کافی نہیں، بلکہ آپؐ کے فیصلوں کو جو قرآن وسنت کی شکل میں موجود ہیں اور قیامت تک کے لیے باقی رہیں گے انہیں دل وجان سے قبول کرنا بھی ضروری ہے۔ یعنی زبانی اقرار کافی نہیں بلکہ دل کی تصدیق اور دل کا میلان بھی ضروری ہے۔ جیسے ہی کسی معاملے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس معاملے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت یہ ہے تو اگر دل اسے قبول کرنے میں تنگی محسوس کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں نفاق موجود ہے۔ حقیقی ایمان کے لیے انشراحِ قلب اور طبیعت کا یکسو ہونا ضروری ہے۔ دنیا کے اہلِ علم اس کے بارے میں کوئی بھی رائے رکھیں، لیکن ایک مومن کے لیے اللہ کے رسول کی رائے کے مقابلے میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ دل میں اس کیفیت کا پیدا ہو جانا حقیقی ایمان ہے، جس کے بغیر اللہ کے یہاں ایمان کا اعتبار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی بات کا حکم دیتے تھے تو صحابہؓ فوراً سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہہ اٹھتے تھے اور ان کا انگ انگ اطاعت میں ڈوب جاتا تھا۔ وہ جیسے جیسے اطاعت کی کلفتوں سے گزرتے تھے ویسے ویسے ان کے دلوں کی مسرتوں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

Marfat.com

۳۔ تیسری چیز حقیقت میں متذکرہ دونوں چیزوں کا نتیجہ ہے۔ جب ایک شخص اللہ کے رسول کی اصل حیثیت کو تسلیم کر لیتا ہے پھر اللہ کے رسول کے ہر فیصلے پر وہ دل و جان سے جھک جاتا ہے اور آپ ﷺ کی ایک ایک ادا پر سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی پوری ذات کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں دے دیتا ہے' اپنی خواہشات سے دستبردار ہو جاتا ہے اور اپنے نفع وضرر کے پیمانوں کو توڑ کر پھینک دیتا ہے۔ اب اس کے سامنے نفع وہ ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نفع قرار دیں اور نقصان وہ ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نقصان قرار دیں۔ ان تین باتوں کا خلاصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرما دیا۔ ارشاد فرمایا لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ (تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کی خواہشاتِ نفس اس تعلیم اور شریعت کے تابع نہ ہو جائیں جسے میں لے کے آیا ہوں)۔ اس حدیث پر اگر غور کریں تو پوری زندگی اس میں سمٹ آتی ہے۔ گھر میں بھی حضور کی سنت حکومت کرتی نظر آتی ہے اور اجتماعی زندگی کے ہر ادارے میں اور حکومت کے ایوانوں میں بھی آنحضرت یعنی آپ ﷺ کی شریعت کا ڈنکا بجتا سنائی دیتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۙ وَّ اِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ وَّ لَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ○ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ؕ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ○

(اور اگر ہم ان پر یہ فرض کرتے کہ اپنے آپ کو قتل کرو یا نکل جاؤ اپنے گھروں سے تو ان میں سے بہت تھوڑے ہی اس کی تعمیل کرتے۔ اور اگر یہ لوگ وہ کرتے جس کی ہدایت کی جاتی ہے تو ان کے لیے یہ بات بہتر اور ایمان پر قدم جمانے والی ہوتی۔ اور اس وقت ہم عطا کرتے انہیں اپنے پاس سے اجرِ عظیم اور ضرور ہی پہنچاتے انہیں سیدھے راستے پر اور جو اطاعت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔ یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ سب ساتھی۔ یہ اللہ کی طرف سے فضل ہے اور کافی ہے اللہ تعالیٰ جاننے والا) (النساء: ٦٦ تا ٧٠)

نفاق کا اصل سبب

ان آیات میں سے پہلی آیت کریمہ میں منافقین کے اصل سببِ نفاق سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے۔ اور اس نفاق کی وضاحت کے لیے جو کچھ فرمایا گیا ہے اسے ہمارے مفسرین کرام نے دو طرح سے سلجھایا ہے۔ بعض مفسرینِ کرام اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کا مفہوم یہ مراد لیتے ہیں کہ قتل کرو اپنے نفسوں کو یعنی اپنے آپ کو قتل کرو اور اپنے اہلِ خانہ کو قتل کرو۔ اور اُخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ کا مطلب ہے اپنے گھروں سے نکل جاؤ۔ یعنی خود اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی قربانی اللہ کی خاطر دے ڈالو۔ اور اس قربانی دینے سے پہلے اپنے گھر بھی چھوڑ دو۔ یعنی سب کچھ اللہ

Marfat.com

راستے میں قربان کردو۔ مقصد یہ ہے کہ یہ منافقین معمولی سی آزمائش میں بھی ہمت ہار دیتے ہیں اور نفاق کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں اور اس سے ان کے ایمان کی قلعی کھل جاتی ہے۔ اگر کہیں ایسی شدید آزمائش سے انہیں دوچار کر دیا جاتا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی اور اپنی اہلِ خانہ کی گردنیں کاٹو اور خود ہی اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو چند آدمیوں کے سوا یہ سب اس امتحان میں ناکام ہو جاتے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہ کرام نے جب یہ آیت سنی تو بول اٹھے" لو فعل ربنا لفعلنا (اگر ہمارے رب نے ہمیں یہ حکم دیا تو ہم ضرور تعمیل کریں گے)۔ اور ایسا ہی ایمان افروز جواب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے صحابہ کا یہ جواب سنا تو اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا الایمان اثبت فی قلوب اھله من الجبال الرواسی (اہل ایمان کے دلوں میں ایمان مستحکم پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوطی سے جاگزیں ہے)۔

بعض دوسرے مفسرین نے اسے سیاقِ کلام سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ حقیقت میں یہ منافقین زیادہ تر یہود اور اطرافِ مدینہ کے قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر قسمت آزمائی کی خاطر مسلمانوں سے متعلق ہو گئے اور بڑھ چڑھ کر ایمان کا اظہار کرنے لگے۔ لیکن یہود اور قبائلی سرداروں کے ساتھ اپنے روابط کو چھوڑنے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہ تھے۔ اسی وجہ سے جب بھی انہیں موقع ملتا وہ اپنے معاملات اور مقدمات یہود یا اپنے قبائلی سرداروں کے پاس فیصلے کے لیے لے کے جاتے تھے۔ یہاں ان کے اسی نفاق کو نمایاں کیا جا رہا ہے کہ یہ منافقین کہنے کو تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اپنے سابق روابط و تعلقات سے کسی طرح دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ خاندان، برادری، قبیلہ اور قوم کی زنجیریں ابھی تک ان کے پاؤں میں پڑی ہیں۔ یہ وطن کی سرزمین کو اپنے دین و ایمان پر مقدم سمجھتے ہیں۔ بظاہر تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اخلاص اور اطاعت کا بڑھ چڑھ کر ثبوت دیتے ہیں، لیکن اگر ان پر یہ پابندی لگا دی جائے کہ تمہیں ہجرت کرنی ہے اور اسلام کی خاطر اپنوں سے بھی لڑنا پڑے تو اس سے دریغ نہیں کرنا تو تم دیکھو گے کہ ان کے ایمان و اخلاص کے سارے دعوے دھرے رہ جائیں گے۔ ان مفسرین کے نزدیک اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کا معنی اپنے آپ کو قتل کرنا نہیں بلکہ اپنے ان قرابت داروں کے خلاف تلوار نکالنا ہے جو اسلام کے رستے میں حائل ہوتے ہیں، چاہے ان سے کتنا بھی قریبی خونی رشتہ کیوں نہ ہو۔ کفر کے خلاف جہاد کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا امتحان ہے اور زندگی بھر کے نظریات و اعتقادات سے دستبردار ہو جانا بہت بڑی قربانی ہے لیکن اگر کسی قوم کو اپنی ہی قوم اور اپنے قرابت داروں سے لڑنے اور وطن چھوڑ کر ہجرت کرنے کا حکم دے دیا جائے تو اس ابتلاء و آزمائش کی گہرائی کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ اسی آزمائش کے حوالے سے ان کے ایمان کی آزمائش کی بات ہو رہی ہے۔ کہ اگر انہیں اس آزمائش میں ڈال دیا جاتا تو گنتی کے چند لوگوں کے سوا سب فیل ہو جاتے، لیکن مہاجرین اسی امتحان سے سرخرو ہو کر نکل چکے تھے۔ جنگِ بدر ان کے لیے سب سے بڑی آزمائش تھی۔ ہجرت کر کے وہ اپنے ایمان کا پہلے ہی ثبوت دے چکے تھے۔ لیکن جنگِ بدر میں جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو مسلمانوں نے دیکھا کہ ان کے اپنے ہی خونی رشتہ داران کے سامنے کھڑے تھے۔ اور آج سب سے بڑا امتحان یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی تلواریں اپنے قریبی عزیزوں کے خلاف بے نیام کرنا تھیں۔ ادھر مسلمانوں کی صف میں اگر حذیفہ تھے تو قریش کے لشکر کی کمان عتبہ کر رہا تھا جو حذیفہ کا باپ تھا۔ جب وہ سب سے آگے بڑھ کر اپنے بھائی اور بیٹے کے ساتھ مبارزت طلب ہوا تو حضرت حذیفہ برہنہ تلوار لے کر مقابلے کے لیے آگے بڑھے۔ لیکن حضور نے باپ کے مقابلے کے لیے بیٹے کو بھیجنا مناسب نہ سمجھا۔ عاص بن وائل جو حضرت عمر فاروق ؓ

Marfat.com

کا ماموں تھا۔ حضرت عمر فاروق کی تیغِ خون آشام اس کے خون میں رنگین تھی۔ عبدالرحمٰن حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے حضرت صدیق اکبر کو دیکھا گیا کہ آپ برہنہ تلوار لیے ہوئے اس کا تعاقب فرما رہے ہیں۔ غرضیکہ مہاجرین میں سے شائد ہی کوئی ایسا ہو جس کے خونی رشتہ داروں میں سے کوئی شخص اس کی تلوار کی زد میں نہ آیا ہو' لیکن یہ لوگ اسلام سے اپنا رشتہ اس طرح جوڑ چکے تھے کہ کوئی رشتہ بھی اس رشتے کے راستے میں حائل نہ ہوتا تھا۔ جب مسلمانوں نے اس طرح سے اپنے اخلاص اور فدائیت کا ثبوت مہیا کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ... کی صورت میں انہیں انعام سے نوازا۔ ان منافقین سے کہا جا رہا ہے کہ حقیقی ایمان دیکھنا ہو تو مہاجرین وانصار کو دیکھو جنھوں نے اللہ اور رسول کے مقابلے میں ہر رشتہ توڑ ڈالا اور آج قدم قدم پر اللہ کے انعامات کے وہ مستحق ہو گئے ہیں۔ اگر تم بھی اسی راستے پر چلو اور انہی باتوں پر عمل کرو جس پر مخلص مسلمان کر رہے ہیں اور یہ خاندان اور قبیلے اور قوم کی زنجیریں توڑ کر پھینک دو تو یہ تمہارے لیے اسی طرح بہتر ہو گا جیسے مسلمانوں کے لیے بہتر ثابت ہوا ہے۔ اور جب تم یہ سارے رشتے توڑ کر ایک اللہ کے ہو جاؤ گے تو پھر تمہیں اسلام پر ثابت قدم رہنا آسان ہو جائے گا۔ اور یہ جو قدم قدم پر تمہارے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں' کبھی تم مسلمانوں کی طرف دیکھتے ہو اور کبھی اپنے قوم اور قبیلہ کی طرف' اس کا سبب صرف یہ ہے کہ تم اپنے فیصلوں میں یکسو نہیں ہو۔ جس دن تم نے یکسوئی اختیار کر لی اسی دن اللہ تعالیٰ تمہیں بھی ان انعامات کا مستحق قرار دے گا جس سے مسلمان نوازے جا رہے ہیں۔ اور تمہیں اپنی طرف سے اجرِ عظیم سے نوازے گا اور تمہیں کرب والم کی اس کیفیت سے نجات دے کر جو تذبذب اور بے یقینی کے تھپیڑے کھانے والوں کا مقدر ہوتی ہے اس صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے گا جو اپنے مسافر کو جنت تک پہنچا کے چھوڑتا ہے۔

ایک اہم حقیقت

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ الخ اس آیتِ کریمہ میں ایک بہت بڑی حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ روئے سخن منافقین کی طرف ہی ہے اگرچہ خطاب کسی کو نہیں۔ انہیں کو سنا کر کہا جا رہا ہے کہ تمہیں اندازہ نہیں کہ تمہیں آج تک جن لوگوں کے ساتھ چلنے کا اتفاق ہوا ہے جن کی نسبتوں کو کسی طرح ختم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو اور جن کی رفاقتیں تمہارے لیے حاصلِ زندگی ہیں' وہ کس طرح کے اور کس قماش کے لوگ ہیں؟ ان میں ایک ایک آدمی مال پر جان دینے والا' حبِ جاہ کا مریض' اپنی ذات کے گنبد میں بند اور اپنی ہی قوم کے حصار میں محدود رہنے والا ہے۔ ہر شخص کی اپنی اپنی عصبیتیں ہیں' جنھیں وہ چھوڑنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتا۔ بظاہر نظر آنے والی رفاقتیں حقیقت میں مفادات کے بندھن ہیں۔ جیسے ہی یہ ٹوٹتے ہیں یا ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں تو تمام تعلقات دھرے رہ جاتے ہیں۔ کل کے دوست آج کے دشمن دکھائی دیتے ہیں۔ تمہیں اگر اپنی مذہبی عصبیت اور قومی تفاخر نے اندھا نہیں کر دیا تو تم ہر چیز اپنی نگاہوں سے دیکھ سکتے ہو۔ لیکن اسلام کی دعوت کے بعد جس گروہ اور قوم کے ساتھ تمہیں وابستہ ہونے کے لیے کہا جا رہا ہے اور تمام رشتے توڑ کر جس نئے رشتے کو قبول کرنے کے لیے تمہیں ترغیب دی جا رہی ہے تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ ان میں سے ایک ایک فرد کس سیرت و کردار کا حامل ہے اور اس قافلے کا ایک ایک راہی کس طرح اپنے دوسرے رفیقانِ سفر پر جان دیتا ہے۔ دنیا میں ان کی رفاقت بھی سب سے بڑی متاع ہے۔ لیکن آخرت میں ان کی رفاقت کے مقام و مرتبہ کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح پتھر اور لوہے سے رشتہ جوڑنے والا ہمیشہ ڈوبتا ہے اور تم موجودہ وابستگیوں کے سبب ڈوب رہے ہو اور جس طرح لکڑی سے رشتہ جوڑنے والا ہمیشہ تیرتا ہے اسلام اور مسلمانوں سے وابستگی دنیا کے خوفناک سمندر میں تیرنے کا سبب ہے

Marfat.com

محفوظ ذریعہ ہے۔ اور آج جو لوگ اس سے وابستہ ہو چکے ہیں انہیں غور سے دیکھو کس طرح ان میں سے ایک ایک آدمی پارس بن چکا ہے اور کس طرح ایک ایک شخص بقعۂ نور بن کر تاریکیوں میں روشنی کا سامان کر رہا ہے اور یہ پورا قافلہ روشنی کی قندیلوں کی طرح خود بھی روشنی میں سفر کر رہا ہے اور دوسرے لوگوں کے راستوں کو بھی روشن کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ چنانچہ اسی دوسرے قافلے کی خبر اس آیتِ کریمہ میں دی گئی ہے کہ اس قافلے والوں کا بنیادی اثاثہ اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ جو شخص بھی چاہے وہ عربی ہو یا عجمی' کالا ہو یا گورا' اللہ اور رسول کی اطاعت میں شریک ہو کر اس قافلے کا رفیق بن جاتا ہے تو اس کی قسمت کو ایسے چار چاند لگ جاتے ہیں کہ اس کے آگے چلنے والے لوگ اللہ کے نبی ہوتے ہیں اور اس کے دائیں بائیں صدیقوں' شہیدوں اور صالحین کا گروہ ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ہر طرف سے اپنے آپ کو اس قدر محفوظ پاتا ہے جس کا دنیا میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور یہ رفاقت کہیں ٹوٹنے والی نہیں۔ یہ لوگ دنیا میں جیتے ہیں تو اکٹھے' مرتے ہیں تو اکٹھے۔ آخرت میں رہیں گے تو تب بھی ایسے ہی عظیم لوگوں کا ساتھ ہوگا۔ ان میں سے انبیاءِ کرام کے تعارف کی تو ضرورت نہیں۔

صدیق کا تعارف

البتہ صدیق جس کی جمع صدیقین ہے فعیل کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا لغوی معنی نہایت راست باز اور راست گفتار ہے۔ اللہ کے مقاماتِ قرب میں سے اللہ کے نبیوں کے بعد یہ شائد سب سے بڑے مقام کا نام ہے۔ شیخ محمد عبدہ لکھتے ہیں ھم الذین زکت فطرتھم و اعتدلت امزجتھم و صفت سرائرھم حتیٰ انھم یمیزون بین الحق والباطل والخیر والشر بمجرد عروضه (صدیقین وہ لوگ ہیں جن کی فطرت اور جن کا باطن ہر گرد و غبار سے یوں پاک صاف ہوتا ہے کہ جب ان پر حق پیش کیا جاتا ہے تو بے ساختہ اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ خیر و شر کے درمیان انہیں التباس نہیں ہوتا بلکہ جیسے نگاہ سیاہ و سفید کے درمیان بے تکلف امتیاز کر لیتی ہے اسی طرح وہ حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کر لیتے ہیں)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صداقت پسندی اور حق پرستی کے اس معیار پر ہوتے ہیں اور ان کی طبیعت اس قالب میں اس طرح ڈھل جاتی ہے کہ وہ جب بھی چلتے ہیں تو صاف اور سیدھے راستے پر اور جب بھی ساتھ دیتے ہیں تو حق و انصاف کا اور جس چیز کو حق کے خلاف پاتے ہیں اس کے مقابلہ میں ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو واضح کرنے کے لیے کہ صدیق کا مزاج رسول کی تربیت میں رہ کر رسول کے مزاج کا پرتو بن جاتا ہے۔ ایک مثال سے واضح کیا ہے۔ فرمایا اس کو یوں سمجھو کہ اللہ کے نبی قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہیں اور آئینہ میں ان کا عکس دکھائی دے رہا ہے۔ وہ عکس نبی نہیں بلکہ نبی کا عکس ہے۔ اور اگر اس عکس کی کوئی محسوس اور مجسم مثال دیکھنی ہو تو اسے صدیق کہا جاسکتا ہے۔ اس لحاظ سے جس نے بھی کہا ٹھیک کہا۔

صدیق عکسِ حسنِ کمالِ محمد است

صدیق ہونے کا یہ مرتبہ یوں تو کئی صحابہ کو حاصل تھا' لیکن صدیقِ اکبر صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی تھے۔ ان کی زندگی کے وہ شب و روز جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گزرے اور وہ ماہ و سال جو آپؓ نے بطور خلیفۃ الرسولؐ کے گزارے' ان کا ایک ایک لمحہ آپؓ کے اس مقام کی خبر دیتا ہے۔ آپؓ کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی تو آپؓ نے بے تأمل حضورؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔ آپؓ نے

Marfat.com

معراج کی خبر سنی تو بغیر کسی تردد کے اس کی تصدیق کی۔ معاہدۂ حدیبیہ پر تمام صحابہ کرام کو دلی رنج پہنچا' لیکن ایک آپؓ تھے کہ آپؓ کو کوئی تردد نہ تھا بلکہ آپؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے سوال کرنے پر تیکھے انداز میں کہا تھا کہ ''بھلے آدمی حضور کے دامن سے وابستہ رہو' آپؐ اللہ کے رسول ہیں' آپؐ کوئی کام اللہ کے حکم کے بغیر نہیں کرتے۔'' اور دورِ خلافت میں آپؓ کا ایک ایک قدم' آپؓ کے مقام و مرتبہ کا عکاس تھا۔ آپؓ نے ایسے ایسے اقدامات بھی کیے کہ جلیل القدر صحابہ تک ان کی افادیت وحکمت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ لیکن بارگاہِ نبوت کے اس مجذوبؓ کا ایک ایک فیصلہ ہم آہنگِ تقدیر ثابت ہوا۔ آپؓ کی زندگی کے حالات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ صدیقِ اکبر کا مقام و مرتبہ کیا ہوتا ہے۔ اور ایک انسان انسان ہوتے ہوئے نبی کے بعد جس اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتا ہے اس اعلیٰ مقام کا حامل کس طرح کا شخص ہوتا ہے۔

شہید کا تعارف

اس قافلے کا تیسرا اہم فرد شہید کہلاتا ہے' جس کی جمع شہداء ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں الشھید فعیل بمعنی الفاعل وھو الذی یشھد بصحۃ دین اللہ تارۃ بالحجۃ والبیان واخری بالسیف والسنان و یقال للمقتول فی سبیل اللہ شھید من حیث انہ بذل نفسہ فی دین اللہ و شھادتہ لہ بانہ الحق و ماسواہ الباطل (شہید کا وزن فعیل بمعنی فاعل ہے۔ وہ شخص جو کبھی نورِ برہان اور قوتِ بیان سے اور کبھی شمشیر و سنان سے دینِ الٰہی کی حقانیت کی شہادت دے' وہ شہید کہلاتا ہے۔ اور راہِ حق میں قتل ہونے والے کو اسی مناسبت سے شہید کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی جان قربان کر کے دین کی حقانیت کی گواہی دی)۔

انسان کے پاس سب سے قیمتی چیز اس کی جان ہے۔ وہ ہر چیز کو جان کی حفاظت کے لیے قربان کر دیتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اس کی جان ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے۔ لیکن جب اللہ کے دین کی حفاظت کا سوال درپیش ہو اور اللہ کے دین کی حقانیت ثابت کرنا پیش نظر ہو تو وہ اس کی خاطر جان دے کر یہ گواہی دیتا ہے کہ میں اپنی جان سے بھی زیادہ اللہ کے دین کو قیمتی متاع سمجھتا ہوں۔ اس کی خاطر سب کچھ لٹایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ اپنی جان دے کر اللہ کے دین کے برحق ہونے کی ایک ایسی دلیل قائم کر جاتے ہیں جنہیں دنیا کی کوئی دلیل اور کوئی پراپیگنڈہ غلط ثابت نہیں کر سکتا۔

بنا کردند خوش رسے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کنند ایں عاشقانِ پاک طینت را

صالح سے کون مراد ہے؟

اس قافلے کا چوتھا ہمسفر الصالح ہے جس کی جمع الصالحین ہے۔ صالح سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے خیالات اور عقائد میں' اپنی نیت اور ارادوں میں اور اپنے اقوال و افعال میں راہِ راست پر قائم ہو جائے اور جو زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی شریعت کی راہنمائی میں فیصلہ کرے اور عمل کرنے کی کوشش کرے اور اپنے آپ کو اس کا پابند سمجھے۔

Marfat.com

وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا (اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی) یہاں بظاہر رفیق کی جگہ رفقا کا لفظ آنا چاہئے تھا کیونکہ رفقائے سفر چار قسموں پر مشتمل ہیں۔لیکن یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ رفیق ان الفاظ میں سے ہے جو واحد جمع اور جنس سب معنی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ تو یہاں رفیق اگر چہ واحد ہے لیکن معنی میں رفقا کے ہے۔جس شخص کو دنیا میں اور آخرت میں ایسے رفیقانِ سفر ملیں یا وہ ایسے عظیم قافلہ کا ایک فرد بننے کی سعادت حاصل کر سکے۔تو حقیقت یہ ہے کہ

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

شانِ نزول

دنیا کی چند روزہ زندگی کے لیے آدمی بہترین رفیقۂ سفر اور بہترین احباب کا انتخاب کرتا ہے اور جس کو یہ نعمتیں میسر آ جاتی ہیں اس سے بڑھ کر شاید ہی کوئی خوش نصیب آدمی ہو۔اسی طرح آخرت کی ابدی زندگی میں بھی یقیناً ہر صالح آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ جنت میں ایسے عظیم لوگوں کے ساتھ رہنے کا موقع عطا فرمائے۔پیغمبر تک یہ دعا کرتے رہے ہیں۔حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا سورۂ یوسف میں موجود ہے تَوَفَّنِیْ مُسْلِماً وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ اس لیے صحابہ کرام بھی انتہائی خواہش رکھتے تھے کہ جس طرح ہمیں دنیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور خدمت کی سعادت میسر ہے کاش جنت میں بھی یہ نعمت ہمیں میسر آئے۔حدیث شریف میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ پوچھی تو عرض کیا ''یارسول اللہ! کوئی جسمانی تکلیف نہیں نہ کوئی گھر کی پریشانی ہے۔البتہ ایک سوچ ہے جو مجھے چین نہیں لینے دیتی۔وہ یہ کہ جب آپؐ کا رخ زیبا آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے دنیا اندھیر ہو گئی۔میں فوراً زیارت کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں' لیکن مجھے رہ رہ کے یہ خیال آتا ہے کہ اگر اللہ نے مجھے جنت کی نعمت سے بہرہ ور فرمایا تو وہاں تو آپؐ اپنے مقامِ بلند میں ہوں گے اور یہ عاجز جنت کے کسی گوشہ میں پڑا ہوگا۔وہاں اگر یہ آنکھیں آپ کی زیارت سے مشرف نہ ہو سکیں تو جنت میں بھی کیا جی لگے گا۔جنت تو حقیقت میں وہ ہے جس میں محبوب کا دیدار نصیب ہو۔یہ وہ سوچ ہے جو مجھے ہر وقت پریشان رکھتی ہے۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خاموش ہو گئے۔لیکن کچھ دیر بعد جبرائیل امین یہ آیتِ کریمہ لے کر نازل ہوئے اور اس میں امت کو یہ خوشخبری سنائی گئی کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اطاعت کا رشتہ رکھنے والے ان شاء اللہ جنت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و وصال سے محروم نہیں رہیں گے۔ایسا ہی ایک اور واقعہ صحیح مسلم میں روایت کیا گیا ہے کہ حضرت کعب بن اسلمی رضی اللہ عنہ اکثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے تھے۔ایک رات تہجد کے وقت آپ کی خدمت میں وضو کا پانی' مسواک اور دیگر ضروریات پیش کیں تو آپؐ نے خوش ہو کر فرمایا'' مانگو کیا مانگتے ہو؟'' کعب اسلمیؓ نے عرض کیا ''حضور! میں جنت میں آپ کی صحبت چاہتا ہوں۔'' آپؐ نے فرمایا ''اور کچھ؟'' تو انہوں نے عرض کیا ''اور کچھ نہیں۔'' اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اگر تم جنت میں میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو اَعِنِّیْ عَلٰی نَفْسِکَ بِکَثْرَۃِ السُّجُوْدِ (تم نوافل کی کثرت سے میری مدد کرو) انشاء اللہ تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا''۔اور بھی ایسے خوش نصیب لوگوں کا تذکرہ حدیث میں ملتا ہے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سعادت کے حصول کی خواہش کی۔

Marfat.com

آخری آیتِ کریمہ میں فرمایا کہ ایمان وعمل کا سرمایہ جتنا کسی خوش نصیب کے پاس ہوگا وہ یقیناً اتنا ہی بہتر سے بہتر اجر وثواب سے نوازا جائے گا‘ لیکن انبیاء‘ صدیقین‘ شہداء اور صالحین کی معیت اور رفاقت‘ یہ اللہ کا وہ فضلِ خاص ہے جسے وہ چاہے گا عطا فرمائے گا۔ اور اللہ کا علم یہ جاننے کے لیے کافی ہے کہ کون خوش نصیب اس سعادت سے نوازا جانے کے قابل ہے۔ اس لیے اللہ اور رسول کی اطاعت اور محبت کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اس سے دعا کرتے رہنا چاہیے کہ یا اللہ! ہم مقدور بھر آپ کی اور آپ کے رسولِ پاک کی اطاعت ومحبت کا حق ادا کرنے میں کوشاں رہے ہیں۔ لیکن ہمیں اس پر بھروسہ نہیں۔ ہم آپ کے فضل کے امیدوار ہیں۔ اگر آپ نے کرم فرمایا تو بخشش بھی ہو جائے گی اور متذکرہ بالا صحبتِ مبارک سے بھی نوازے جائیں گے۔ ان شاء اللہ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ
فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ
فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ
اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ
لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ
مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ
يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾ وَ
مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ
الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا
مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ
وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ

Marfat.com

فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِي سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾ ع

عربی رکوع ۱۰ (اے ایمان والو! ہوشیار رہو (اپنے اسلحہ سنبھالو) اور جہاد کے لیے نکلو ٹکڑیوں کی صورت میں یا جماعتی شکل میں o اور بے شک تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ڈھیلے اور کمزور پڑ جاتے ہیں۔ پس تم کو اگر کوئی مصیبت پیش آئے تو وہ کہتے ہیں مجھ پر اللہ نے انعام کیا میں ان کے ساتھ شریک نہیں تھا اور اگر تمہیں کوئی اللہ کا فضل اور انعام پہنچے تو اس طرح کہ گویا تمہارے اور ان کے درمیان کوئی رشتۂ محبت ہے ہی نہیں' کہتے ہیں اے کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا کہ ایک بڑی کامیابی حاصل کر لیتا o پس چاہیے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے وہ لوگ اٹھیں جو دنیا کی زندگی آخرت کے لیے تج چکے ہوں۔ اور جو شخص بھی اللہ کی راہ میں لڑتا ہے' پھر قتل کیا جاتا ہے یا غالب رہتا ہے ہم عنقریب اس کو اجرِ عظیم عطا کریں گے o اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں جنگ نہیں کرتے حالانکہ کئی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ایسے بھی ہیں جو (ظلم سے تنگ آ کر) عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب! نکال ہمیں اس بستی سے ظالم ہیں جس کے رہنے والے اور بنا دے ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی دوست اور بنا دے ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار o جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے کفر کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں تو تم شیطان کے حامیوں سے لڑو۔ بیشک شیطان کی چال انتہائی کمزور ہوتی ہے) (آیات ۷۱ تا ۷۶)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا o

(اے ایمان والو! ہوشیار رہو (اپنے اسلحہ سنبھالو) اور جہاد کے لیے نکلو ٹکڑیوں کی صورت میں یا جماعتی شکل میں) (النسآء : ۷۱)

آیت کا پس منظر

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیاتِ کریمہ جنگ احد کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو مسلمانوں کی اپنی غلطیوں کے باعث بظاہر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمانوں کے ستر جلیل القدر اور بہادر صحابہ شہید ہو گئے۔ مشرکینِ مکہ اگرچہ اس شکست سے فائدہ نہ اٹھا سکے' لیکن مدینہ کے اطراف و اکناف میں رہنے والے قبائل کے حوصلے ضرور بڑھ گئے۔ اور قریش کو بھی اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے اپنی اس عارضی عزت اور شہرت کو مستحکم کرنے کے لیے مسلمانوں کے خلاف اپنی کوششوں کا دائرہ وسیع کر دیا۔ جو لوگ مسلمانوں کی طاقت کے خیال سے دبے ہوئے تھے انہوں نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ جا بجا مسلمانوں

Marfat.com

کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ جنگ میں شکست کے باعث جو زخم لگے تھے ابھی وہ مندمل نہ ہونے پائے تھے کہ مسلمانوں کے سامنے اپنے وقار کی بحالی اور اسلام کی عزت و حرمت کی بقا کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ان ناگفتہ بہ حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قرآنِ کریم نے ان آیات میں مسلمانوں کو کچھ ہدایات دی ہیں۔

مشکل الفاظ کی تشریح

ان ہدایات کو ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ چند مشکل الفاظ کی تشریح کر دی جائے۔ آیت میں ''حذر'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ''حِذْرٌ و حَذَرٌ'' دونوں ہم معنی ہیں۔ کسی خوفناک چیز سے چوکنا اور ہوشیار رہنے کو حِذر کہتے ہیں۔ خُذُوْا حِذْرَكُمْ کا معنی ہوگا کہ اپنی احتیاط اور ہوشیاری کو پوری طرح بروئے کار لاؤ یعنی ہوشیار رہو۔ بعض اہل علم کے نزدیک حِذرٌ کا اطلاق اصلاً تو دفاعی آلات پر ہوتا ہے جیسے زرہ بکتر، سپر اور خود وغیرہ۔ لیکن کثرتِ استعمال سے اب عام اسلحہ پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا ہے۔ یعنی تمام اسلحہ جو ہر طرح کی جنگی ضرورتوں کے کام آتا ہے مثلاً تیر، تفنگ، تلوار وغیرہ انہیں بھی حِذرٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے خُذُوْا حِذْرَكُمْ کا معنی ہے کہ اپنے آپ کو اسلحہ سے مسلح رکھو اور اپنا اسلحہ سنبھال کر تیار رہو۔ دونوں معنوں کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے یہاں دو ہدایات دی گئی ہیں۔

دو ہدایات

ایک تو یہ کہ جنگ احد کی شکست نے چونکہ تمہارے دشمن کو دلیر کر دیا ہے اور چھوٹے چھوٹے قبائل تمہارے خلاف سازشیں کرنے لگے ہیں تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تم کبھی بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو اور ہر وقت بیدار اور ہوشیار رہو۔ دشمن کبھی بھی اچانک تم پر حملہ کر سکتا ہے یا کسی تدبیر سے تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ یا بظاہر تم سے محبت کی پینگیں بڑھا کر تمہارے افراد کو گزند پہنچا سکتا ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ کبھی ان پر اعتماد نہ کرو۔ تبلیغ و دعوت کے کام میں بھی تم میں سے کوئی آدمی اکیلا وکیلا نہ نکلے۔ اور دوسری ہدایت یہ دی گئی کہ تمہیں ہر وقت مسلح رہنے کی کوشش کرنا چاہئے اور حالات کو دیکھتے ہوئے صورت حال کا جو بھی تقاضا ہو اس سے عہدہ برآ ہونے میں سستی نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ اب اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ تم دشمن کو اس بات کا یقین دلا دو کہ ہم سو نہیں رہے بلکہ پوری طرح بیدار ہیں اور جنگ احد نے ہمارے حوصلوں کو شکست نہیں کیا۔ ہم زخمی شیر کی طرح انگڑائی لے کر اٹھتے ہیں تو پہلے سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ کوئی بھی حادثہ ہمیں کمزور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ہماری قوت صرف اللہ پر اعتماد اور توکل ہے۔ جب تک اس ذات کی تائید ہمیں حاصل ہے ہم بڑے سے بڑے حادثے سے بھی کامیابی سے گذر جائیں گے۔ زندگی کا ثبوت دینے کے لیے تمہیں اگر فوج کے مختلف دستے بھیج کر شب خون مارنا پڑے یا گوریلا جنگ لڑنی پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کرنا۔ اور اگر یہ دیکھو کہ کوئی بڑا قبیلہ یا چند قبائل کا اجتماع تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو پوری جماعتی قوت کے ساتھ ان کا سامنا کرو۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے ان دونوں طریقوں پر پوری احتیاط لیکن انتہائی بیدار مغزی سے عمل کیا۔ آپ نے حالات کی تفتیش یا گوریلا جنگ کے لیے چھوٹے چھوٹے فوج کے دستوں کی صورت میں سرایا بھی بھیجے۔ اور بڑی جنگوں کے لیے غزوات بھی روانہ فرمائے جس میں بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان نئے جذبوں سے سرشار اور ان ہدایات سے بہرہ ور ہو کر اللہ پر بے پناہ اعتماد اور توکل کرتے ہوئے اٹھے اور ایک مختصر سے وقت میں

Marfat.com

جنگ احد سے پیدا ہونے والے اثرات کو یکسر بدل کے رکھ دیا۔ ان سرایا اور غزوات کی تفصیل دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان کوئی نہ کوئی جنگی اقدام کرتے نظر نہیں آتے۔ جاں سپاری اور سرفروشی کے درخشندہ واقعات سے ایک ایک لمحہ روشن دکھائی دیتا ہے۔ اگلی آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو جماعتی حیثیت سے محفوظ اور مضبوط بنانے کے لیے ایک اور ہدایت بھی دی جارہی ہے اور حالات سے گھونگھٹ بھی اٹھایا جارہا ہے۔

وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ۝ وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝

(اور بے شک تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ڈھیلے اور کمزور پڑ جاتے ہیں۔ پس تم کو اگر کوئی مصیبت پیش آئے تو وہ کہتے ہیں مجھ پر اللہ نے انعام کیا میں ان کے ساتھ شریک نہیں تھا اور اگر تمہیں کوئی اللہ کا فضل اور انعام پہنچے تو اس طرح کہ گویا تمہارے اور ان کے درمیان کوئی رشتۂ محبت ہے ہی نہیں' کہتے ہیں اے کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا کہ ایک بڑی کامیابی حاصل کر لیتا) (النسآء : ۷۲ تا ۷۳)

نفاق کی علامتیں

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو توجہ دلائی جارہی ہے کہ تمہیں چونکہ نہایت خطرناک حالات سے واسطہ پڑا ہے جس میں قدم قدم پر بڑے بڑے معرکے پیش آنے کا اندیشہ ہے اور یہ راستہ ایسے دشمنوں سے اٹا پڑا ہے کہ ان کا سامنا کرنے کے لیے جس طرح ایک مضبوط ایمان اور توکل ضروری ہے اسی طرح مسلمانوں کی صفوں میں انتہائی اتحاد و اتفاق' ہم آہنگی' ایمان و عمل میں کامل موافقت اور انتہائی یکسوئی کی ضرورت ہے۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے اور جنگِ احد میں تمہیں اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے کہ تمہاری صفوں میں مختلف النوع منافقین موجود ہیں' ان میں سے جن کے رشتے ابھی تک کافروں سے قائم ہیں' ان کے چہرے تو تم نے عبداللہ بن ابیٔ کے ساتھیوں کی شکل میں دیکھ لیے۔ لیکن ان کے علاوہ ایسے منافق بھی ہیں جو حوصلوں کے کمزور' ارادوں کے ناپختہ اور ایمان میں نامکمل ہیں۔ ابھی تک دنیوی مفادات سے بلند ہو کر صرف اللہ کی رضا کے حصول اور اسلامی تحریک کے مفادات کی خاطر انہوں نے جینا اور مرنا نہیں سیکھا۔ اور تمہیں خوب معلوم ہے کہ جس گروہ اور جماعت میں منافقین موجود ہوں ان کا کوئی قلعہ بھی محفوظ نہیں ہوتا۔ اس لیے تمہیں سب سے پہلے اپنی جماعتی شیرازہ بندی کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ ان میں جو کمزور لوگ ہیں ان پر نگاہ رہے۔ اولاً تو وہ کسی معرکے میں ساتھ نہ جانے پائیں اور اگر چلے جائیں تو ان کی پوری طرح نگرانی ہو' تاکہ ان کی کوئی کمزوری مسلمانوں کی صفوں میں دراڑیں پیدا کرنے کا سبب نہ بن سکے۔ پھر ان منافقوں کے نفاق کی کچھ علامتیں بھی بیان فرمائیں' جن میں سے ایک علامت یہ ہے کہ جب بھی حق و باطل کا معرکہ سامنے آتا ہے تو تم ان کو دیکھو گے کہ کسی نہ کسی بہانے پیچھے رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عجیب و غریب عذر پیش کرتے ہیں اور اگر وہ عذر مسموع نہ ہو سکیں تو پھر نہایت کسمساتے ہوئے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں' لیکن

Marfat.com

ان کا ہر قدم پیچھے کی طرف جاتا ہے۔ ان کے ارادوں کی کمزوری اور جنگ کے بارے میں ان کے خدشات نہ صرف انہیں حق و باطل کے معرکے میں بے کار کر دیتے ہیں بلکہ بعض دفعہ دوسروں پر بھی برا اثر ڈالتے ہیں۔ حالانکہ حق و باطل کے معرکے میں جانے والے لوگ راہ کی سختیوں کو نہیں دیکھا کرتے وہ تو انہیں سامانِ سفر کے طور پر ناگزیر سمجھتے ہیں۔ اور جب بھی کوئی مشکل پیش آتی ہے تو وہ ان کے لیے اجنبی نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اس راہ کی سنتیں ہیں جنہیں بہر حال پیش آنا ہے اور جو جہاد و قتال کے لیے سچی سوچ رکھتا ہے وہ رفقاء کے طور پر ایسے ہی لوگوں کو تلاش کرتا ہے۔ نہ ملیں تو افسوس کرتا ہے:

جو راہ کی سختی کو سامانِ سفر سمجھے
اے وائے تن آسانی کمیاب ہے وہ راہی

دوسری نشانی ان کی یہ ہے کہ اگر وہ کبھی جھوٹے سچے بہانوں سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور مسلمانوں کو معرکۂ حق و باطل میں کسی ناگوار صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے جیسا جنگِ اُحد میں ہوا تو یہ خوشی سے بغلیں بجاتے ہیں کہ اللہ نے ہم پر بڑا فضل کیا کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ نہیں تھے۔ ورنہ ہوسکتا تھا کہ ہم بھی کسی حادثے کا شکار ہو جاتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفاق کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ انہیں بہر صورت اپنی ذات عزیز ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی مصیبت سے بچ جائیں تو وہ سمجھتے ہیں سارا جہان بچ گیا۔ انہیں مسلمانوں پر کسی قیامت کا ٹوٹ جانا بھی دکھ نہیں پہنچاتا' بلکہ وہ اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے غم ان کے غم نہیں' ان کی اپنی ذات کے غم ان کے غم ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی جماعت کا حصہ نہیں سمجھا۔ وہ مسلمان کہلاتے ہوئے بھی اپنی الگ دنیا رکھتے ہیں۔ آج بھی آپ مسلمانوں میں ایسی ایک مستقل کلاس دیکھیں گے جنہیں مسلمانوں کے غم کبھی پریشان نہیں کرتے۔ مسلمان کہیں گاجر مولی کی طرح بھی کاٹے جا رہے ہوں تو وہ ان کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنے کیڑے مکوڑوں کے مرنے کو دی جاتی ہے' ان کی اپنی خوش فعلیوں میں کبھی کمی نہیں آتی۔ ان کی دلچسپیاں اپنی جگہ قائم رہتی ہیں۔

اسی آیت میں آگے چل کر تیسری نشانی بیان فرمائی گئی ہے کہ اگر وہ کسی جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ شریک نہیں اور مسلمانوں کو اس جنگ میں اللہ تعالیٰ فتح عطا فرماتے ہیں اور بہت سا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے۔ اب ہونا تو یہ چاہئے کہ وہ مسلمانوں کی فتح اور کامیابی پر خوشی کا اظہار کریں اور ان کی کامیابی کو اپنی کامیابی سمجھیں' لیکن اس کے برعکس ان کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں مسلمانوں کی کامیابی پر تو کوئی خوشی نہیں ہوتی' البتہ اس بات کا ضرور غم ہوتا ہے کہ میں اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ کیوں نہیں تھا۔ اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو یقیناً مجھے بھی مالِ غنیمت ہاتھ آتا اور یہی میرے نزدیک سب سے بڑی کامیابی ہے۔ ان کی اس بات کا حوالہ دیتے ہوئے درمیان میں ایک جملۂ معترضہ کے طور قرآنِ کریم نے ایک جملہ استعمال کیا ہے کَاَنْ لَّمْ تَکُنْۢ بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَهٗ مَوَدَّةٌ (گویا کہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان کوئی محبت کا رشتہ نہیں) یہی وہ حقیقت ہے جو منافق کی علامت ہے۔ اور یہی اس کی حقیقی پہچان ہے کہ نہ وہ مسلمانوں کے غموں میں اپنے آپ کو شریک سمجھتا ہے اور نہ مسلمانوں کی خوشیاں اس کی خوشیاں ہوتی ہیں۔ وہ بظاہر مسلمانوں کا رفیقِ کار اور ہمدرد و غمگسار ہوتا ہے' لیکن اس کا رویہ ایک حریف کا رویہ ہوتا ہے اور اس کے پیش نظر دنیوی مفادات کے سوا اور کوئی مفاد نہیں ہوتا۔ وہ آخرت کو صرف زبان کی حد تک مانتا ہے۔ وہ کسی عمل کا صلہ آخرت میں لینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اپنے لیے فوزِ عظیم دنیوی فائدے کو قرار دیتا ہے۔ ایسے لوگ ظاہر ہے اسلامی قافلے کے لیے ایک بوجھ کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان سے دشمن تو فائدہ اٹھا سکتا ہے مسلمانوں کو ان سے نقصان کے سوا اور کچھ نہیں پہنچ سکتا۔ اگلی آیت کریمہ میں اسی حقیقت کو مزید کھول دیا گیا ہے۔

Marfat.com

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

(پس چاہیئے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے وہ لوگ اٹھیں جو دنیا کی زندگی آخرت کے لیے تج چکے ہوں۔ اور جو شخص بھی اللہ کی راہ میں لڑتا ہے' پھر قتل کیا جاتا ہے یا غالب رہتا ہے ہم عنقریب اس کو اجرِ عظیم عطا کریں گے) (النسآء: ۷۴)

اللہ کی راہ میں لڑنے والے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟

اس آیتِ کریمہ میں ایک ایسی حقیقت کو بیان کیا جا رہا ہے جو معرکہ ہائے حق و باطل میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ کفر یا نفاق کے پیش نظر دنیوی مفادات کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ معمول کی زندگی میں محنت کرتا ہے' جان کھپاتا ہے تو مقصود صرف دنیا کمانا ہوتا ہے اور اگر کبھی وہ کسی معرکے میں شریک ہوتا ہے تو اس میں بھی اس کے پیش نظر جان دینا نہیں' بلکہ جان بچانا ہوتا ہے۔ وہ اس راستے میں کچھ کھونے کے لیے نہیں بلکہ کچھ پانے اور چھیننے کے لیے جاتا ہے۔ جس راستے میں جان و تن کے مراحل نظر آتے ہیں یا جس میں دنیا کے اجڑ جانے کا اندیشہ ہو وہ کبھی اس راستے کا مسافر نہیں ہوتا۔ اس کی ذات اول و آخر اس کی امید اور اس کا مقصود ہوتی ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا مقصد بھی اس کی ذات سے عظیم نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ اگر نفاق کا گھونگھٹ پہن کر مسلمانوں کی صفوں میں آ گھسیں تو یہ جگہ حقیقت میں ان کی جگہ نہیں۔ یہاں سے وہ نکلنے کے لیے اس طرح زور لگائیں گے جیسے کونین خالی معدے سے نکلنے کے لیے زور لگاتی ہے یا پرندہ پنجرے میں پھڑپھڑاتا ہے۔ کیونکہ حق و باطل کی کشمکش اور آویزش سے جو فضا پیدا ہوتی ہے وہ منافق کے لیے سازگار نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس ایمان قبول کرنے والا اگر شعور سے ایمان قبول کرتا ہے تو وہ پہلے ہی دن اس بات کو سمجھ لیتا ہے کہ میرا مقصود دنیا نہیں آخرت ہے۔ مجھے بندوں کو نہیں اللہ کو خوش رکھنا ہے۔ میں دنیا طلبی کے لیے اس راستے میں نہیں آیا' بلکہ میں دنیا کو قربان کر کے دین کی سربلندی کے لیے راستہ صاف کرنا چاہتا ہوں۔ دنیوی نعمتیں میری ضرورت تو ہو سکتی ہیں میرا مقصد نہیں۔ مقصد صرف اعلائے کلمۃ الحق اور اللہ کی رضا کا حصول ہے۔ یہ اتنا عظیم اور اتنا طویل مقصد ہے کہ وقت' توانائی' اور مال و دولت تو اس راستہ میں خرچ کرنا ہی پڑتے ہیں۔ اگر اس مقصد کے لیے جان بھی مانگ لی جائے تو وہ مقصد کی عظمت کو دیکھتے ہوئے بہت چھوٹی طلب ہے۔ یہ کشمکش کا راستہ ہے' یہ سب کچھ کھو کر کچھ پانے کا راستہ ہے اور یہ راستہ اس قدر طویل ہے کہ بعض دفعہ زندگی کا سفر راستے میں ختم ہو جاتا ہے اور یہ راستہ آگے نکل جاتا ہے۔ اس کی آخری منزل آخرت ہے۔ جس میں دنیا میں پیش کردہ قربانیاں اور اس راستے میں لگے ہوئے زخموں کا صلہ ملے گا اور اتنا ملے گا کہ آدمی تمنا کرے گا کاش مجھے ہزاروں زندگیاں مل جائیں اور وہ بھی میں اس راستے میں قربان کر دوں۔ اگر زندہ رہ کر اس راستے میں کامیابی ملتی ہے تو زندہ رہنا عزیز ہو جاتا ہے۔ اور اگر کلمۂ حق کی سربلندی سب کچھ قربان کر کے حاصل ہوتی ہے تو پھر جان دے دینا مقصد بن جاتا ہے۔ اس میں سود و زیاں کے پیمانے کام نہیں آتے۔ جو شخص ان پیمانوں سے ایمان کی وادی میں داخل ہوتا ہے اسے اس وادی سے کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ اس وادی سے وہ لوگ کامیاب اور کامران نکلتے ہیں جو یہاں پھول اگانے کے لیے پسینہ بہاتے ہیں' جو یہاں بہار لانے کے لیے خون دیتے ہیں' جو اس کی مٹی میں اپنے آپ کو فنا کر کے آنے والی نسلوں کے لیے بہار کا سایہ فراہم کر جاتے ہیں۔ یہ راستہ ان لوگوں کا راستہ ہے۔ جو اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں جو زندگی دی ہے وہ اسی راستے میں کھپانے کے لیے دی ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

Marfat.com

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

مختصر یہ کہ معرکۂ حق و باطل کی اس کشمکش میں صرف وہ لوگ شریک ہوسکتے ہیں اور وہ لوگ اس کا حق ادا کرسکتے ہیں جو حیاتِ دنیا کو آخرت کے بدلے میں بیچ چکے ہوں۔ وہ زندگی کو حیاتِ دنیا کے لیے نہیں گذارتے بلکہ حیاتِ دنیا کا ایک ایک لمحہ وہ آخرت کی تیاری کے لیے گذارتے ہیں اس لیے ان کی امیدیں قلیل ہوتی ہیں اور ان کے مقاصد جلیل ہوتے ہیں۔ مجلسوں میں نہایت چپ رہنے والے، گفتگو بظاہر نہایت کمزور لیکن غلبہ دین کی کاوشوں کے لیے نہایت سرگرم۔ وہ زبان کے زیادہ دھنی نہیں ہوتے البتہ تلوار کے دھنی دل کے غنی اور دنیا سے مستغنی ہوتے ہیں۔ وہ اس راز کو پا چکے ہیں کہ بجائے خود زندہ رہنا کوئی زندگی نہیں۔ زندگی وہ ہے جو مقصد کے فروغ میں کام آئے۔ یا مقصد کی سربلندی میں کام آجائے۔ بڑے سے بڑا حادثہ اور بڑے سے بڑا معرکہ بجائے انہیں سراسیمہ کرنے کے ان کے حوصلوں کی توانائی کا باعث بن جاتا ہے۔ مسلمان جب اسکندریہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے تو آخر شاہِ مصر مقوقس نے مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت عمرو بن العاص کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ اپنا ایک اہم وفد بھیجئے جن سے میں فیصلہ کن بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپؓ نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں ایک وفد روانہ فرمایا۔ مقوقس نے انہیں دھمکاتے ہوئے کہا کہ ایک طرف دریائے نیل نے تمہارا راستہ روک رکھا ہے دوسری طرف میں تمہارے سامنے ہوں اور تیسری طرف سے قیصر کی فوجیں پہنچا ہی چاہتی ہیں۔ اس طرح تم تین اطراف سے گھر گئے ہو۔ اب صرف تمہارے پاس پسپائی کا ایک راستہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم پسپا ہو جاؤ اور میں تم میں سے ہر افسر کو دو دینار اور ہر سپاہی کو ایک دینار دینے کو بھی تیار ہوں۔ یہ مجھے پسند نہیں کہ یہ سرزمین تمہارا قبرستان بنے۔ میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ ہوں اور اسی لیے میں نے تمہیں بلایا ہے۔ اس کی دھمکی آمیز یہ گفتگو سن کر بجائے سراسیمہ ہونے کے وفد کے تمام شرکاء کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا، تم بجائے پریشان ہونے کے خوش کس بات پر ہو رہے ہو؟ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''مقوقس! تمہیں غلطی فہمی ہے کہ ہم بھی شاید تمہاری طرح ملکوں کو فتح کرنے کے لیے نکلے ہیں اور یہ دنیا اور اس کی آسائشیں ہماری منزل ہیں۔ ہم لوگ دنیا کے نہیں آخرت کے مسافر ہیں۔ ہمیں تو ایک فرض یہاں کھینچ لایا ہے وہ یہ کہ ہم اللہ کا دین، اللہ کی سرزمین پر غالب کرنا چاہتے ہیں۔ تم اسے قبول کرلو ہم واپس پلٹ جائیں گے۔ اور اگر تم اللہ کا یہ دین عوام تک نہیں پہنچنے دینا چاہتے تو پھر تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ ہماری خوشی کا سبب یہ ہے کہ تم نے جو نقشہ کھینچا ہے اگر وہ صحیح ہے تو ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ ہماری منزل قریب آگئی ہے اس سرزمین کی قسمت میں شاید ابھی اللہ کی دین کی نعمت نہیں ہے۔ اور شاید اس سرزمین کو ابھی اللہ والوں کے خون کی ضرورت ہے۔ اگر اس خون دینے کے لیے اللہ نے ہمیں چن لیا ہے تو ہماری اس سے بڑھ کر خوش قسمتی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہم جو اپنے کندھوں پر سر کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں اگر اس کے راستے میں اتر جاتا ہے تو یہ ایک ایسی سعادت ہے جس کی مومن ہمیشہ تمنا کرتا ہے۔ اور اسی کے لیے وہ گھڑیاں گنتا رہتا ہے۔ اگر یہ سعادت ہمارے قریب کردی ہے تو ہمارے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کا اور کیا موقع ہوسکتا ہے۔'' درحقیقت یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اسلام نے تیار کیے، جو واقعی حیاتِ دنیا کو آخرت کے بدلے میں بیچ چکے تھے۔ یہ موت سے خوف کھانے کے بجائے اسے نوید جانفزا سمجھتے تھے۔ اور اس دنیا کی ایک بہت بڑی حقیقت یہ ہے کہ موت اسے شکار کرتی ہے جو موت سے ڈرتا ہے۔ اور جو موت سے نہیں ڈرتا موت اس سے منہ چھپاتی پھرتی ہے۔ اور حیاتِ دنیا پر ریجھنے والے لوگ ایسے لوگوں کا کبھی سامنا نہیں کرسکتے۔ اکبر نے ٹھیک کہا:

Marfat.com

جو دیکھی ہسٹری تو دل کو پھر کامل یقیں آیا
جسے مرنا نہیں آیا اسے جینا نہیں آیا

یہی وہ لوگ ہیں جو زندہ رہتے ہیں تو اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے اور قتل ہوتے ہیں تو اللہ کی کھیتی کی سیرابی کے لیے۔ ان کا خون جہاں جہاں بھی گرتا ہے وہیں وہیں اسلام اور انسانیت کی بہار آتی ہے۔

شہیدوں کے لہو سے جو زمیں سیراب ہوتی ہے
بڑی زرخیز ہوتی ہے بڑی شاداب ہوتی ہے

اور یہی لوگ اللہ کے اجرِ عظیم کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ اور جس اجر کو اللہ عظیم ٹھہرائے اس کی عظمت کو دنیا کے پیمانے نہیں ناپ سکتے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيرًا ۝

(اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں جنگ نہیں کرتے حالانکہ کئی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ایسے بھی ہیں جو (ظلم سے تنگ آ کر) عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب! نکال ہمیں اس بستی سے ظالم ہیں جس کے رہنے والے اور بنا دے ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی دوست اور بنا دے ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار) (النسآء:۷۵)

اس رکوع میں مضامین کی ترتیب

اس رکوع میں ترتیب مضامین پر غور کیجئے۔ سب سے پہلے ناموافق حالات میں احتیاط سے رہنے کا حکم دیا ہے اور ساتھ ہی دشمن کے جارحانہ اقدامات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلح رہنے اور جہاد کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور جہاد کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے یہاں تک فرمایا کہ تمہیں اس سلسلے میں گوریلا جنگ لڑنی پڑے تو لڑو اور اگر کسی بڑی روایتی جنگ کی نوبت آ جائے تو اس کے لیے پوری طرح تیار رہو۔ لیکن یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ تمہارے گرد و پیش میں دشمن قبائل کی ایک وسیع دنیا پھیلی ہوئی ہے۔ اور تمہاری حیثیت دشمنوں کے سمندر میں ایک جزیرے کی مانند ہے۔ تم بری طرح ان میں گھرے ہوئے ہو۔ لیکن تمہیں اپنی ایمانی قوت سے اس جال کو توڑ کر نکلنا اور ہر سطح پر زندگی کا ثبوت دینا ہے۔ اس کے لیے یہ بات ازبس ضروری ہے کہ تم اپنی صفوں کا اچھی طرح جائزہ لو۔ تمہاری صفوں میں ابھی تک منافقین اور کمزور ایمان والے لوگ موجود ہیں۔ جن کے دل و دماغ کے رشتے ابھی تک تمہارے ساتھ مستحکم نہیں ہو سکے۔ وہ بظاہر تمہارے ساتھ شریک رہتے ہیں لیکن جب کسی ابتلاء کا وقت آتا ہے تو اس سے بچ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی جنگ میں فتح عطا فرماتے ہیں اور مالِ غنیمت ملتا ہے تو نہایت تاسف کے ساتھ مالِ غنیمت سے محرومی کی شکایت کرتے ہیں۔ گویا ان کے پیش نظر صرف دنیا اور دنیوی فوائد ہیں۔ وہ دنیا کے لیے جیتے اور دنیا کے لیے مرتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم جس معرکۂ حق و باطل میں جان لڑا رہے ہو اس میں ایسے دنیا کے بندوں کا کوئی گذر نہیں۔ اس معرکے میں تو

Marfat.com

صرف وہ لوگ شریک ہو سکتے ہیں جن کا ہدف اور جن کی منزل آخرت ہو۔ اور وہ اپنی زندگی اور زندگی کے فوائد کو محض اللہ کی رضا کے لیے آخرت کے بدلے میں بیچ چکے ہوں۔ اور وہ اس بات کا یقین پیدا کر چکے ہوں کہ اصل اجر تو وہ ہے جو اللہ کی جانب سے ملتا ہے۔ دنیا کی آسائشیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ اگر ہم اللہ کے لیے اللہ کے راستے میں جان دے دیں یا غازی بن کر لوٹیں ہر صورت میں وہ اجر ہمارے انتظار میں ہے۔ اس عقیدے سے ان کے اندر وہ قوت پیدا ہوتی ہے جو موت پر بھی غالب آ جاتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو طاقت اور قوت کے اس سرچشمے سے وابستہ کرنے کے بعد اب براہِ راست حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر زندگی اللہ کے راستے میں سب کچھ قربان کر دینے اور خیر و شر کی اس کشمکش میں دیوانہ وار گزر جانے کا نام ہے تو پھر تمہیں انتظار کس بات کا ہے فی سبیل اللہ صرف یہی نہیں کہ تم اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کفار سے جنگ لڑو۔ یا کفار مرکزِ اسلام پر حملہ کر دیں تو تم مدافعت کرو۔ فی سبیل اللہ تو وہ جنگ بھی ہے جو فتنے کی سرکوبی کے لیے لڑی جائے۔ اور اسلام کے پیشِ نظر جو اصل ہدف ہے وہ یہی ہے کہ دنیا سے فتنہ ختم کر دیا جائے۔ قرآنِ کریم میں پروردگار کا ارشاد ہے وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (اور تم کافروں سے لڑو حتیٰ کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کا ہو کر رہ جائے) فتنہ سے مراد ہر اس قوت سے نبرد آزما ہونا اور اس کو کچلنا ہے جو اللہ کے بندوں کو اسلام کی طرف آنے نہیں دیتی اور اگر آ جائیں تو ظلم و ستم کے ذریعے ان کو اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرتی ہے اور مسلمانوں پر زندگی صرف اس لیے عذاب بنا دی جاتی ہے کہ تم نے اسلام قبول کر کے گویا قیامت کو دعوت دی ہے۔ ہم تمہیں صرف اس وقت زندہ رہنے کی اجازت دیں گے جب تم اسلام سے نکلنے کا اعلان کر دو۔ یہ وہ فتنہ ہے جس کی سرکوبی جہاد کا اصل مقصد ہے اور قتال فی سبیل اللہ میں اس کا مقام سب سے پہلا ہے۔ یہاں اسی کا حکم دیا جا رہا ہے کہ مکہ معظمہ اور دوسری بعض بستیوں میں بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کو اس لیے ظلم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ تم اسلام کا نام کیوں لیتے ہو؟ تم نے اللہ اور اس کے رسول کو ماننے کی جرأت کیسے کی ہے؟ اور وہ بے بس لوگ ان کے ظلم سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں پاتے۔ وہ بے بسی کے ساتھ شب و روز اللہ کو پکارتے ہیں کہ یا اللہ ہمیں اس بستی سے نکال جس کے حکمران اور جس کے طاقتور لوگ ایسے ظالم ہیں جو رات دن ہم پر مشقِ ستم کرتے ہیں۔ ہمارے پاس ان کے ظلم و ستم سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ ہم اس قدر بے بس ہیں کہ ہم نہ ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ یہاں سے نکلنے کی کوئی راہ پاتے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کی بے بسی اور کسمپرسی کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں کہ تم نے بھی ان کی چیخیں سنی ہوں گی اور ان پر گزرنے والی قیامت کی داستانیں تم تک بھی پہنچی ہوں گی۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ان کو وہاں سے نکالنے اور ان کو رہائی دلانے یا ان ظالموں کا پنجہ مروڑنے کے لیے قتال کیوں نہیں کرتے؟ یہ بھی قتال فی سبیل اللہ ہے بلکہ یہ قتال فی سبیل اللہ کی سب سے اعلیٰ شکل ہے۔ وہ بار بار اللہ سے اپنے لیے کسی مددگار اور کسی ہمدرد و غمگسار کے لیے التجائیں کرتے ہیں اور اس کا جواب دینا تم پہ لازم ہے۔ اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب مسلمان اپنے وطن میں رہنے کے باوجود محض اسلام کی خاطر وطن کے تحفظ سے محروم ہو جائیں اور ان کی جان و مال اور عزت ظالموں کے ہاتھ میں مباح ہو کر رہ جائے اور وہ خود اتنے بے بس اور بے کس ہوں کہ اس صورتِ حال کا مقابلہ نہ کر سکتے ہوں ان کے پاس سوائے اللہ کے بھروسے کے اور کوئی طاقت نہ ہو۔ تو پھر ہمسایہ ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اور جو مسلمان انہیں مظلومیت سے نکالنے کی طاقت رکھتے ہوں یا کسی طرح بھی ان کی اذیتوں میں کمی کا باعث بن سکتے ہوں اور پھر وہ اپنا فرض انجام دینے سے پہلو تہی کریں تو وہ شریعت کی زبان میں منافق ہیں۔ مسلمانوں پر جب جہاد فرض ہو جاتا ہے تو پھر ان کی حکومت سب سے پہلے مسئول ہوتی ہے اور اگر وہ اپنے فرض کو انجام دینے سے انکار کر دیتی ہے یا اس کا احساس نہیں کرتی تو پھر علماء اور قوم کو راہنمائی دینے والے اس مسئولیت سے گراں بار ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ عذر پیش کر کے

Marfat.com

کے یہاں نہیں چھوٹ سکیں گے کہ ہمارے حکمرانوں نے اس فرض کو نہیں پہچانا تھا۔ حکمرانوں کو اس پر مجبور کرنا اور ملک میں ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کرنا جس سے قوم میں عام بیداری پیدا ہو یہ علماء، صلحاء اور تمام رہنمائی دینے والے اداروں کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ اور اگر یہ لوگ بھی اپنی ذمہ داری سے پہلوتہی کریں اور عوام بھی اٹھنے سے انکار کر دیں تو پھر پوری قوم پر اللہ کی جانب سے ذلت مسلط کر دی جاتی ہے۔ آج مسلمان مجموعی طور پر اللہ کے اسی عذاب کی زد میں ہیں۔ نہ جانے کہاں کہاں مسلمانوں پر مظالم توڑے جا رہے ہیں۔ مسلمان قوت کے استعمال سے تو گریزاں ہیں ہی اخلاقی اور سیاسی امداد دینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ مسلمان مسلمان کی ہر طرح کی اعانت سے محروم ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اقلیتیں بری طرح پامال ہو رہی ہیں۔ چھوٹے ممالک بڑی طاقتوں کے نشانے پر ہیں۔ وہ جب چاہتے ہیں کسی مسلمان ملک پر آتش و آہن کی بارش برسانا شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے فرائض کا احساس کب پیدا ہوگا۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۟

(جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے کفر کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں تو تم شیطان کے حامیوں سے لڑو۔ بیشک شیطان کی چال انتہائی کمزور ہوتی ہے) (النسآء:۷۶)

ترتیب کے لحاظ سے آخری آیت

یہ اس رکوع کی آخری آیت ہے اور ترتیبِ مضامین کے لحاظ سے اس میں آخری بات ارشاد فرمائی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو جو آئے دن جنگیں لڑنی پڑتی ہیں کبھی اس قبیلے سے جنگ ہے اور کبھی اس قبیلے سے، کبھی ایک طرف سے کفر کی گھٹا چڑھ رہی ہے تو کبھی دوسری طرف سے کفر کی بادِ سموم نے چلنا شروع کر دیا ہے مسلمان برابر ان میں سے ہر ایک کی زد میں ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ مسلمانو! تمہیں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ مسلمان کا کام اللہ کے راستے میں جہاد و قتال کے سوا کچھ نہیں۔ اور کافر کا کام طاغوت اور شیطان کے لیے لڑنا ہے۔ روشنی چاہے شمع کی شکل میں ہو یا ایک ٹمٹماتے دیئے کی شکل میں اسے بہرصورت اندھیرے اور تاریکی سے لڑنا اور اس وقت تک جلنے کی کوشش کرنا ہے جب تک ماحول سے تاریکی دور نہ ہو جائے۔ بارش کا کام زمین کو سیراب کرنا ہے چاہے زمین کیسی بھی جھلسی ہوئی کیوں نہ ہو۔ ایک طبیب کا کام مریض کے مرض سے لڑنا ہے چاہے مریض برلبِ مرگ کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ایک مسلمان کا کام ہر طرح کے کفر سے نبرد آزما ہونا ہے۔ چاہے وہ نظریاتی کفر ہو اور چاہے وہ عملی کفر ہو چاہے اس نے ظلم کی چادر اوڑھ رکھی ہو اور چاہے اس نے سیاست کا لبادہ پہن رکھا ہو۔ ایک مومن کا کام ہر رنگ اور ہر صورت میں اپنے جہاد کو جاری رکھنا ہے، کبھی دماغی کاوشوں سے، کبھی قلبی توانائیوں سے کبھی علمی دلائل سے، کبھی سیاست کے صالح طور اطوار کے ساتھ۔ اور اگر معاملہ ظلم اور جارحیت تک پہنچ جائے تو پھر موجود طاقت سے کام لے کر۔ چاہے جان دینی پڑے یا جان لینی پڑے۔ یہی کام عہدِ نبوت میں بھی مسلمانوں کا تھا اور یہی کام قیامت تک مسلمانوں کا رہے گا۔ کیوں کہ ان کی پہچان ہی جہاد اور قتال فی سبیل اللہ

Marfat.com

ہے۔اس کے بغیر ایمان کا تحقق نہیں ہوتا۔جس طرح کفر نے آج تک اپنے طریقے نہیں بدلے عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ میں بھی اہل کتاب اور دیگر کفار اسلام اور مسلمان دشمنی میں اکٹھے تھے۔آج بھی اکٹھے ہیں۔ان سب کا مقابلہ مسلمانوں نے ایمان کی قوت سے کیا تھا۔آج بھی اسی قوت سے ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔کیونکہ صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہ آئی ہے نہ آئے گی۔اقبال نے ٹھیک کہا:

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریف پنجہ شکن نئے
وہی قوت اسد اللّٰہی وہ مرحبی وہی عنتری

مسلمان ریاستوں کے حکمران اور سیکولر سیاست دان آج کے کفر کے مقابلے میں چاہے کیسی خوش فہمی کا شکار ہوں اور وہ ہزار سمجھیں کہ کفر نے اسلام کو برداشت کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ مسلمانوں کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں لیکن اے کاش انہیں سوچنے کی توفیق نصیب ہو:

نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی نہ تم بدلے
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

یہ آگہی دینے کے بعد حکم دیا فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ (پس شیطان کے دوستوں سے لڑو) خیر کی پشت پناہ قوت رحمان ہے اور شر کا پشتیبان شیطان ہے۔مسلمانوں کے سر پر رحمان کا سایہ ہے اور کفر کے ساتھ شیطان کی قوتیں ہیں۔شیطان اپنے داؤ پیچ تو بدلتا ہے لیکن اپنے مقصد سے کبھی انحراف نہیں کرتا۔اس لیے مسلمانوں کو کبھی کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔اس لیے فرمایا کہ اگر ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے کہ لڑے بغیر چارۂ کار نہ ہو تو پھر بے تامل شیطان کی قوتوں سے لڑو۔اور ان کی قوتوں سے کبھی مرعوب ہونے کی غلطی نہ کرو۔شیطانی قوتیں چاہے کتنی عظیم بھی ہوں اور بظاہر ان کا چاہے کیسا ہی چرچا کیوں نہ ہو لیکن تم یاد رکھو تمہارے سروں پر اللہ کی نصرت کا سایہ ہے۔اور اس کے مقابلے میں شیطان کی قوتیں کبھی پائیدار نہیں ہو سکتیں۔اس لیے آخر آیت میں فرمایا کہ شیطان کی تدبیریں ہمیشہ بودی اور کمزور ہوتی ہیں ان سے خوفزدہ ہونے کی کبھی غلطی نہ کرنا۔البتہ اس میں دو شرطیں ہیں۔(۱) ایمان۔(۲) فی سبیل اللہ۔یعنی مسلمانوں کے دلوں میں ایمانی قوت موجود ہو۔وہ اللہ کے سوا کسی سے ڈرنا نہ جانتے ہوں۔ان کا سر اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔ان کے دل اللہ کی محبت سے دھڑکتے ہوں۔ان کی زبانوں پر صرف اللہ کے دین کے ترانے ہوں اور ان کی اجتماعی زندگی میں صرف اللہ کا قانون نافذ ہو۔اور دوسری شرط یہ کہ ان کا ہر کام فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی رضا کے لیے ہو۔وہ کافروں سے اللہ کے دین اور اس کی رضا کے لیے لڑتے ہوں اپنے ذاتی مفادات اور قومی مفادات ہرگز ان کے پیش نظر نہ ہوں۔ان دو شرطوں کے پورا کر دینے کے بعد شیطان کی تدبیریں اس لیے بیکار ہو کر رہ جاتی ہیں کہ اللہ کی نصرت و تائید صاف صاف نظر آنے لگتی ہے۔جنگ بدر میں شیطان نے مشرکین مکہ کو پوری طرح یقین دلایا "انی معکم لا غالب لکم الیوم" (میں تمہارے ساتھ ہوں آج تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا) لیکن جب اس نے فرشتوں کو اترتے دیکھا اور اللہ کی تائید و نصرت نظر آئی تو ابو جہل سے ہاتھ چھڑا کے بھاگا اور کہا "جو میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھتے۔" ہر دور کے مسلمانوں کی کامیابی کے لیے یہی دو شرطیں لازمی ہیں مقدور بھر ظاہری اسباب کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ان دو بنیادی شرطوں کو بروئے کار لانے سے تو میدانِ بدر کی طرح ہمیشہ فرشتے اتر سکتے ہیں۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ
يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا
لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى قف وَ
لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿٧٧﴾ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ
فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ
عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ
قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ
يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿٧٨﴾ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ
اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿٧٩﴾ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ
وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿٨٠﴾ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۫
فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ
تَقُوْلُ ؕ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى
اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٨١﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ
مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿٨٢﴾ وَاِذَا جَآءَهُمْ

Marfat.com

أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ
وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ
وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا
قَلِيلًا ﴿٨٣﴾ فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ ۚ وَحَرِّضِ
الْمُؤْمِنِينَ ۖ عَسَى اللَّهُ أَن يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَاللَّهُ
أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنكِيلًا ﴿٨٤﴾ مَّن يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُن
لَّهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا ۖ وَمَن يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُن لَّهُ كِفْلٌ
مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيتًا ﴿٨٥﴾ وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا
بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ﴿٨٦﴾
اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۗ
وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ﴿٨٧﴾ ع

عربی رکوع ۱۱ (کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا جاتا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر جب ان پر لڑائی فرض کردی گئی ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح اللہ سے ڈرا جاتا ہے یا اس سے بھی زیادہ۔ وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کردی؟ کچھ اور مہلت کیوں نہ دی؟ کہہ دو اس دنیا کی متاع بہت قلیل ہے اور جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے ان کے لیے آخرت اس سے کہیں بڑھ کر ہے اور تمہارے ساتھ ذرا بھی حق تلفی نہیں ہوگی ○ تم جہاں کہیں بھی ہوگے موت تمہیں پالے گی۔ اگرچہ تم مضبوط قلعوں کے اندر ہی ہو۔ اور اگر ان کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تمہارے سبب سے ہے۔ کہہ دیجیے ہر چیز اللہ کی جانب سے ہے۔ ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھنے کا نام ہی نہیں لیتے ○ تمہیں جو سکھ بھی پہنچتا ہے خدا کی طرف سے پہنچتا ہے اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ تمہارے

Marfat.com

اپنے نفس کی طرف سے پہنچتا ہے۔ اور اے رسولؐ ہم نے تم کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔ اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو ہم نے اس پر تم کو نگران مقرر نہیں کیا o اور کہتے ہیں کہ سر تسلیم خم ہے۔ پھر جب باہر نکلتے ہیں آپ کے پاس سے تو رات بھر مشورہ کرتا ہے ایک گروہ ان میں سے اپنے قول کے بالکل برعکس اور اللہ تعالیٰ لکھ رہا ہے جو وہ سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ پس آپ ان سے اعراض کریں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز o کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اور (اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ) اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ ضرور پاتے اس میں اختلاف کثیر o اور جب آتی ہے ان کے پاس کوئی بات امن سے یا خطرے سے متعلق تو وہ اسے پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ اس کو رسول اور اپنے اولوالامر کے سامنے پیش کرتے تو جو لوگ ان میں سے بات کی تہہ تک پہنچنے والے ہیں وہ ان کو اچھی طرح سمجھ لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے سے لوگوں کے سوا تم شیطان کا اتباع کرنے لگتے o اے پیغمبر اللہ کے راستے میں قتال کیجئے۔ تم پر اپنی جان کے سوا کسی کی ذمہ داری نہیں اور ابھارو ایمان والوں کو جہاد کے لیے۔ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ روک دے زور ان لوگوں کا جنہوں نے کفر کیا اور اللہ بڑے زور والا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے o جو کسی نیک کام کی سفارش کرے گا اس کے لیے اس میں سے حصہ ہے اور جو کوئی بری بات کی سفارش کرے گا اس کے لیے اس میں سے حصہ ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے o اور جب تمہیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعا دو یا اسی کو لوٹا دو۔ اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے o اللہ ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تم سب کو قیامت کے دن کی طرف لیجا کے رہے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ اور اللہ سے بڑھ کر سچی بات کہنے والا کون ہو سکتا ہے) (آیات ۷۷ تا ۸۷)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْ لَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۗ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا o

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا جاتا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر جب ان پر لڑائی فرض کر دی گئی ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح اللہ سے ڈرا جاتا ہے یا اس سے بھی زیادہ۔ وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی؟ کچھ اور مہلت کیوں نہ دی؟ کہہ دو اس دنیا کی متاع بہت قلیل ہے اور جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے ان کے لیے آخرت اس سے کہیں بڑھ کر ہے اور تمہارے ساتھ ذرا بھی حق تلفی نہیں ہوگی۔" (النسآء:۷۷)

Marfat.com

اس آیت کا پس منظر اور پیش منظر

گزشتہ سے پیوستہ آیت میں ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر نہ صرف قتال فرض فرمایا بلکہ ''مالکم'' کہہ کر اس پر اکسایا بھی اور ایک طرح سے تنبیہ بھی فرمائی کہ تمہارے سامنے اتنا بڑا ظلم ہو رہا ہے اور تمہارے اپنے دینی بھائیوں کو بری طرح اذیتیں پہنچائی جا رہی ہیں۔ تو ان کی آزادی کے لیے تم قتال کیوں نہیں کرتے۔ اب اس آیتِ کریمہ میں اس حکم کے پس منظر کی طرف بھی اشارہ ہے اور بعد کی صورتحال کو بھی واضح فرمایا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لیے قتال کا حکم آنے سے پہلے یقیناً مسلمانوں میں ان مظلوموں کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ کیونکہ یہ مظلوم مکہ معظمہ میں ہوں، گرد و نواح کے علاقوں میں یا دور دراز قبیلوں میں، ان کے قرابت دار اور جاننے پہچاننے والے لوگ تھے جو ہجرت کرنے کی طاقت رکھتے تھے وہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آ چکے تھے اور جو لوگ پیچھے اپنی بے بسی اور بے بضاعتی کے باعث اذیتوں کا شکار تھے ان کے حالات سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ پہلے اگر ان سے قرابت اور وطن کا رشتہ تھا تو اب ان رشتوں سے بڑھ کر دینی رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ اس لیے جب بھی وہ ان کو یاد کرتے تو دل گرفتہ ہو جاتے۔ اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے احساسات کا تذکرہ بھی کرتے ہوں۔ اس لحاظ سے ان ظلم رسیدہ لوگوں کا بار بار تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ہوتا ہو گا۔ ان کے لیے دعائیں بھی کی جاتی ہوں گی، دشمنوں کی اذیت رسانی پر غم و غصہ کا اظہار بھی کیا جاتا ہو گا اور کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست بھی کی جاتی ہو گی کہ آپ اللہ سے دعا فرمائیں کہ اللہ ہمیں قتال کی اجازت دے اور ان غم زدہ مسلمانوں کے غموں کے ازالے کی کوئی صورت پیدا فرمائے۔ مخلص مسلمانوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اس گفتگو میں منافقین بھی یقیناً موجود ہوتے۔ انہیں اپنے نفاق اور اپنے ایمان کی کمزوری کا بخوبی اندازہ تھا اور ساتھ ہی اس بات کی فکر بھی رہتی تھی کہ ہم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس سے مسلمانوں کو ہمارے نفاق کا شبہ ہونے لگے۔ چنانچہ جیسے ہی ان کی موجودگی میں اس طرح کی باتیں چھڑتیں تو وہ آگے بڑھ کر دشمنوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرتے۔ اور دشمن قبیلوں میں مصائب میں گھرے ہوئے مسلمانوں سے ہمدردی کا اظہار بھی کرتے۔ اور جب قتال کی بات ہوتی تو دوسرے لوگوں سے زیادہ جوش و خروش دکھاتے اور بڑھ چڑھ کر مطالبہ کرتے کہ ہمیں پہلی فرصت میں اس ظلم کا ازالہ کرنا چاہیے اور ان مظلوموں کو نجات دلانے کے لیے طاقت استعمال کرنی چاہیے۔

قتال سے پہلے معنوی، اخلاقی اور روحانی تیاری کے لیے نماز اور روزہ کا حکم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چوں کہ اللہ کے رسول تھے اس لیے آپ کوئی بھی اقدام اللہ کے حکم اور اس کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے آپ بظاہر ان جاں فروشوں کو تسلی دیتے ہوئے فرماتے کہ تمہارا جوش و جذبہ قابل قدر ہے اور تمہاری حمیت و غیرت میں بھی کوئی شبہ نہیں لیکن جب تک اللہ کی طرف سے حکم نہیں آ جاتا ہم کوئی سا بھی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اور مزید یہ کہ جنگ محض جوش و خروش اور دعوؤں سے نہیں لڑی جاتی، اس کے لیے تو مناسب تیاری کرنا ہو گی۔ تم سرِ دست اپنے ہاتھوں کو روک کے رکھو یعنی ابھی طاقت کے استعمال کا وقت نہیں آیا۔ یہ تیاری کا مرحلہ ہے۔ تیاری ایک تو وہ ہے جو اسلحہ کی فراہمی اور رسد و کمک کے انتظامات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے لیے سوچنا اور انتظام کرنا تو عمائدین حکومت کی ذمہ داری ہے، لیکن مسلمانوں پر جو تیاری فرض ہے وہ ان کی اپنی زندگیوں کے حوالے سے ہے۔ اور یہ تیاری دوسر

Marfat.com

تیاری تو بدرجہا ضروری ہے۔ کیونکہ میدانِ جنگ میں یا قوموں کے مقابلے میں فیصلہ کن چیز قوموں کا حوصلہ اور ان کا کردار ہوتا ہے۔ اور اللہ کی راہ میں لڑنے والے تو زیادہ تر اللہ کی ذات اور اپنے کردار پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔ ان کی اصل طاقت اللہ پر بے حد مضبوط ایمان' دل میں اس کے ساتھ بے پناہ محبت وعقیدت' ہر طرف سے کٹ کر اسی کے ساتھ وابستگی' زبان پر اس کی حمد کے ترانے' اعضاء وجوارح پر اس کے احکام کا نفاذ اور اسی کے لیے جینے اور مرنے کی تڑپ' یہ ساری چیزیں مل کر اخلاص وللہیت کہلاتی ہیں۔ اسی سے ایک ایسا فرد تیار ہوتا ہے جو فی سبیل اللہ جنگ لڑ سکتا ہے۔ اور اس کی جنگ کا مقصد نہ ذاتی شجاعت کا اظہار ہوتا ہے' نہ کسی علاقے پر قبضہ' بلکہ از اول تا آخر صرف اللہ کی رضا مطلوب ہوتی ہے' اسی کے لیے وہ جینا چاہتا ہے اور اسی کے لیے وہ موت سے کھیل جاتا ہے۔ ایسے افراد جب تیار ہو جاتے ہیں۔ تو پھر ان افراد میں مضبوط نظم واطاعت اور ناقابلِ شکست شیرازہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس سے وہ ایسی سیسہ پلائی دیوار بن جائیں جس میں شیطان یا دشمن کبھی نقب نہ لگا سکے۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر یہ ضرورت نماز سے پوری ہوتی ہے۔ دن میں پانچ دفعہ فرض نمازوں کے ساتھ ساتھ دن اور رات کے نوافل آدمی کی اندر للہیت پیدا کرتے ہیں۔ نمازوں میں تسبیح وتحمید' رکوع وسجود' قیام وقعود اور خضوع وخشوع میں استغراق' اخلاص کی تکمیل کرتے ہیں۔ مصروف اوقات سے نکل کر بار بار نماز کی حاضری اللہ سے بے پناہ وابستگی اور قوم میں شیرازہ بندی کو مضبوط بناتی ہے۔ پھر نماز میں قطار بندی اور صفوں کی برابری کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہونا' ہر طرح کے تفاوت کا مٹا دینا ایک امام کی اقتدا میں تمام حاضرین کا حرکت میں آنا' اس کے ایک اشارے پر اٹھنا' جھکنا' بیٹھنا اور سلام پھیرنا ایک ایسی مشق ہے جو فوج کے ڈسپلن کو پیدا کرتی ہے' جس میں جرنیل کے حکم کو آخری حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو جنگ کے لیے افراد کی تیاری میں سب سے اہم کردار ادا کرتی ہیں اور نماز کی پابندی سے ان میں سے ایک ایک چیز کا پیدا کیا جانا نہایت آسان ہے۔ افراد کی تیاری کے ساتھ ساتھ جنگ کے مصارف بھی بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ جن حکومتوں کے پاس بے پناہ وسائل ہیں وہ تو اپنے وسائل پر جنگی مصارف کا انحصار کر سکتے ہیں۔ لیکن مدینے کی ریاست کے پاس تو وسائل نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ ان کا اللہ کے بعد اگر کوئی وسیلہ تھا تو وہ مسلمانوں کے صدقات واجبہ اور نافلہ تھے۔ اسی سے معمول کی زندگی میں بھی کام چلایا جا رہا تھا اور اسی کی بنیاد پر جنگیں لڑی جا سکتی تھیں۔ مصارفِ جنگ کی تیاری کے لیے اس وسیلہ کی فراہمی کی ایک ہی صورت تھی کہ مسلمانوں میں انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اس جذبہ کو پیدا کرنے کا سب سے اہم ذریعہ زکوٰۃ کی ادائیگی کی پختہ عادت ہی بن سکتی تھی۔ اس لیے یہاں فرمایا کہ تم نماز کا اہتمام کرو اور ادائے زکوٰۃ کو اپنی عادت بنا دو۔ جب تمہیں زکوٰۃ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اس کی اصل روح کو سمجھنے کی توفیق ملے گی کہ زکوٰۃ کوئی بڑا مال نہیں محض اڑھائی فیصد ہے۔ لیکن اس سے یہ تربیت ملتی ہے کہ یہ مال میرا نہیں اللہ کا ہے۔ میرے پاس اس کی امانت ہے۔ عام معمول کی زندگی میں تو میں اڑھائی فیصد ادا کر کے سرخرو ہو جاتا ہوں' لیکن اگر ملک' ملت اور جہاد کی ضرورتوں کو اس سے زیادہ کی ضرورت پڑے تو میں اللہ کی اس امانت کو روکنے کا مجاز نہیں۔ یہی دونوں جذبے امت کی حقیقی روح اور اس کی حقیقی قوت کے ضامن ہیں۔ جس سے جہاد وقتال کی تیاری ممکن ہے۔ جب بھی مسلمانوں کو اللہ کے راستے میں کوئی جنگ درپیش ہو تو اسلحۂ جنگ اور رسد وکمک کے انتظامات کے ساتھ ساتھ یہی وہ اصل تیاری ہے جس سے اللہ کے راستے میں جنگ کی جا سکتی ہے۔ اور اگر مادی ضرورتوں کی تیاری تو مکمل ہو لیکن یہ معنوی' اخلاقی اور روحانی تیاری نہ کی جائے تو جہاد فی سبیل اللہ نام کی لڑائی بھی جہاد فی سبیل النفس بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسی جنگ کرنے والوں کے سر پر بے شک سبز پھریرا لہرا رہا ہو اور بے شک اس میں اللہ اکبر کے نعرے بھی گونج رہے ہوں لیکن اپنے مقصد اور اپنی روح کے اعتبار سے یہ محض ایک

Marfat.com

لڑائی ہوگی جہاد فی سبیل اللہ یا قتال فی سبیل اللہ نہیں ہوگا۔ یہ وہ بات تھی جو ان منافقین سے کہی جا رہی تھی۔ لیکن وہ محض اپنے نفاق پر پردہ ڈالنے کے لیے بار بار قتال کی اجازت طلب کر رہے تھے۔ اب جب کہ قتال ان پر فرض کر دیا گیا تو زبانی دعووں کی حقیقت کھلنے لگی۔ اب وہ مسلمانوں سے منہ چھپانے لگے کیونکہ قتال پکنک منانے کو تو نہیں کہتے' یہ تو جان و تن کی بازی ہے جسے کھیلنا منافقین کا کام نہیں۔ اس میں سر کندھوں سے اترتے ہیں' بازو کٹتے ہیں' جسم زخموں سے چور ہوتا ہے' دنیا اندھیر ہو جاتی ہے' ایسا خطرناک راستہ تو صرف وہ شخص اختیار کر سکتا ہے جو صرف اللہ سے ڈرتا اور صرف اسی سے محبت کرتا ہو۔ اب ان کا حال یہ ہو گیا کہ جنگ کی ہولناکیوں کا تصور انہیں ہراساں کرنے لگا۔ اور وہ اعدائے اسلام سے اس طرح خوف کھانے لگے جس طرح اللہ سے خوف کھانا چاہئے۔ بلکہ اللہ سے بڑھ کر لوگوں سے ڈرنے لگے۔ اگر ان کے دل میں صرف اللہ کا ڈر ہوتا تو دنیا سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ جن لوگوں کے دلوں میں اللہ کا خوف بس جاتا اور وہ لذتِ آشنائی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں تو انہیں تو دو عالم سے بیگانہ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ وہ قوت کے اصل سرچشمے سے آگاہ ہونے کے بعد نام نہاد دنیا کی قوتوں سے کبھی لرزاں و ترساں نہیں ہوتے۔ وہ بادشاہوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح بات کرتے ہیں گویا ان کی نگاہوں میں بادشاہ لکڑی کے کندوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے جنہیں تخت پر سجا کے بٹھا دیا گیا ہے۔ لیکن ان منافقین کے دلوں میں چونکہ اللہ کا تعلق پیدا نہیں ہو سکا اس لیے وہ عجیب بے چینی کا شکار ہیں۔ تنہائی میں ہم کلامی کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ الٰہی تو نے یہ قتال ہم پر کیوں فرض کر دیا؟ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ ابھی اس میں مزید تاخیر کی جاتی۔ کمزور آدمی جب کسی بڑے مقصد کی طرف بلایا جاتا ہے تو اس کی کمزوری کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ مقصد سے انکار کرنے کی بھی جرأت نہیں رکھتا اور نہ اس بلاوے پر لبیک کہنے کی ہمت پاتا ہے۔ تو پھر وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے اس طرح کی باتیں کرتا ہے کہ مجھے آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار نہیں۔ لیکن ابھی میرے حالات سازگار نہیں۔ مجھے ایک مختصر مدت کے لیے مہلت دے دیجئے اس کے بعد میں انشاء اللہ جو آپ کہیں گے کرنے کے لیے حاضر ہوں گا۔ حالانکہ مختصر مدت گزرنے کے بعد بھی نہ اس میں ہمت آئے گی نہ اس کی کمزوری دور ہو گی۔ یہ ایک دفع الوقتی ہے جس سے وہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ یہی حال اس وقت منافقین کا تھا۔

منافقین کا اصل روگ

لیکن ان کا جو اصل روگ تھا جس کی وجہ سے وہ سراسیمہ ہو رہے تھے قرآنِ کریم نے اس سے پردہ اٹھایا۔ فرمایا "قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى" (کہہ دیجئے متاعِ دنیا قلیل ہے اور آخرت اس کے لیے انتہائی بہتر ہے جس شخص کے دل میں اللہ کا خوف ہے) حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں جان دینے کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے انسانی ذہن کی ساخت بدلنے کی ضرورت ہے۔ انسانی ذہن کی ساخت جن تصورات کی دیواروں پر قائم ہے ان میں بنیادی بات یہ ہے کہ دنیا ایک حقیقت ہے اور آخرت محض ایک مفروضہ۔ مذہبی لوگوں نے ایک بہلاوا بنا رکھا ہے جس سے خود بھی بہلتے ہیں اور دوسروں کو بھی بہلاتے ہیں۔ غالب نے ایسے ہی لوگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

Marfat.com

آخرت کا چونکہ پوری طرح یقین پیدا نہیں ہوتا اس لیے باز پرس کا بھی خوف پیدا نہیں ہوتا۔ ہزار اس بات کو دہرایا جائے کہ اللہ ایک بات کو جانتا ہے۔ ہمارا نامۂ عمل تیار ہو رہا ہے' ہمارے دونوں کندھوں پر دو فرشتے ہماری پوری زندگی کی فائل تیار کرنے میں مصروف ہیں' سے ایک ایک عمل کے بارے میں باز پرس ہوگی' ہمارا ایک ایک احساس مجسم شکل میں ہمارے سامنے لا رکھا جائے گا۔ ان باتوں کو سن لیا جاتا ہے لیکن یہ باتیں حلق سے نیچے نہیں اترتیں۔ دنیا کی حقیقت چونکہ سامنے دکھائی دیتی ہے اس لیے انسان کو اسی کا یقین آتا ہے' اسی کی طلب میں محنت کرتا ہے مشقت اٹھاتا ہے اور جان کھپاتا ہے۔ اسی کی محرومی کو حقیقی محرومی سمجھتا ہے' اسی کے غم اور اسی کی خوشی کو خوشی محسوس کرتا ہے۔ ان دنیا کے معمولی فوائد کے لیے دیانت چھوڑ دینا انسان کا روزمرہ ہے۔ اس کی دلچسپیاں انسانی زندگی کا حاصل ہیں۔ اسی کی متاع کو حقیقی اور پا متاع سمجھتا ہے۔ اپنے سامنے جنازے اٹھتے بھی دیکھتا ہے لیکن اسے یقین نہیں آتا کہ میری بھی باری آئے گی۔ اپنے عزیزوں کو اپنے ھ سے لحد میں اتارتا ہے لیکن باہر نکل کر پھر دنیا میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ وہ احساسات اور تصورات ہیں جس سے ایک دنیا دار انسان کی ذہنی اخت تیار ہوتی ہے۔ منافقین سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم انہی تصورات کے تحت زندگی گزار رہے ہو حالانکہ تمہیں ایمان لانے کے بعد اس بات کا ین پیدا کر لینا چاہئے کہ متاع دنیا کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ چند روزہ کھیل ہے جو اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ نہ حکمران باقی رہے' نہ دولت مند' دگی جس طرح غریب کی گزرتی ہے امیر کی بھی گزرتی ہے۔ زندگی کا سفر ختم ہونے میں اتنی دیر بھی نہیں لگتی جتنی برف کے گھلنے میں یا بلبلے کے ٹنے میں۔ ایک شخص ساری عمر دولت جمع کرتا رہتا ہے۔ اچانک آگ لگ جاتی ہے اور دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ یا خود اس کی زندگی تمام ہو جاتی ہے تو وہ سب کچھ پیچھے رہ جانے والوں کے لیے چھوڑ جاتا ہے دولت جمع کرنے والا اور دولت ہی کے لیے جینے والا شخص ایک چوکیدار کا فرض نجام دیتا ہے۔ پہرہ داری کرتا رہتا ہے اور دوسروں کے حوالے کر کے چلا جاتا ہے۔ جب تک زندہ رہتا ہے اس بت کو پوجتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے اسی پوجا میں میری زندگی ہے۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

امر واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے دنیا کی حقیقت کو سمجھ لیا ان کے لیے دنیا بے حقیقت ہو کر رہ گئی۔ ان کے وقت میں برکت آ گئی' ان کی صلاحیتیں دولتِ دنیا کو جمع کرنے کی بجائے انسانیت کی خدمت میں صرف ہونے لگیں' وہ اس دھوکے اور فریب سے نکل گئے کہ دنیا کی حقیقت سب سے بڑی حقیقت ہے۔ ان کے لیے جینا بھی آسان ہو گیا اور مرنا بھی آسان ہو گیا۔ انہیں دولت ملتی ہے تو نہ جانے کس کس کے کام آتی ہے۔ اور اگر نانِ شبینہ پر گزارہ کرنا پڑتا ہے تو وہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ وہ جانتے ہیں کہ انسان انسانیت سے بلند ہوتا ہے۔ انسانی مفادات کے پتھر اسے ڈبونے کے کام آتے ہیں' سرافراز ہونے میں کوئی مدد نہیں دیتے۔ وہ اپنی ذات کی تعمیر میں لگا رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے :

تری ذات میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

منافقین کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ متاعِ دنیا کی خاطر اپنی عاقبت تباہ مت کرو۔ دنیا فانی ہے آخرت باقی ہے۔ متاعِ دنیا قلیل ہے' متاعِ آخرت ابدی اور سرمدی ہے۔ دنیا کی نعمتیں ناقابلِ یقین ہیں آخرت کی نعمتیں یقینی ہیں۔ دنیا ایک فریبِ نظر ہے آخرت سراسر یقین ہے دنیا تن پروری ہے اور آخرت من کا اجالا ہے' سوز و مستی کا عنوان ہے۔ جذب و شوق کا حاصل بھی اور جذب و شوق کا ذریعہ بھی۔

Marfat.com

من کی دنیا من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دنیا ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دنیا چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

جب تک من کی دنیا آباد نہیں ہوتی یعنی اس میں تقویٰ پیدا نہیں ہوتا اور صرف اللہ سے لو لگا کر آسودگی حاصل نہیں ہوتی اس وقت تک آخرت کا یقین پیدا نہیں ہوتا۔ منافقین سے کہا جا رہا ہے کہ متاعِ دنیا کی حرص چھوڑ و آخرت کی طلب اور آخرت کی تیاری زندگی کا عنوان بنالو اور ساتھ ہی اس بات کا یقین رکھو کہ اگر تم اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے اور تم نے آخرت ہی کو اپنا مقصود بنالیا اور اسی کے لیے محنت کرنا اور جان لڑانا شروع کر دیا تو یاد رکھو تمہیں ایک ایک بات کا ویسے ہی اجر ملے گا جیسے اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کو عطا فرماتا ہے۔ تمہارے ساتھ ذرہ برابر بھی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ تم اپنے اندر تبدیلی پیدا کر کے تو دیکھو کس طرح اللہ کی رحمت تم پر قربان ہوتی ہے۔ لیکن تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم نے جس طرح متاعِ دنیا سے جی لگا رکھا ہے اسی طرح تمہیں یہ بھی اندیشہ لگا رہتا ہے کہ اگر ہم نے مسلمانوں کی طرح جہاد و قتال میں حصہ لینا شروع کر دیا تو اس بات کا کیا بھروسہ ہے کہ ہماری زندگی محفوظ رہے گی۔ متاعِ دنیا اور متاعِ زندگی دونوں کے لیے عافیت اسی میں ہے کہ کبھی جہاد و قتال کا نام نہ لیا جائے۔

اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا ۝

”تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمہیں پالے گی۔ اگرچہ تم مضبوط قلعوں کے اندر ہی ہو۔ اور اگر ان کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تمہارے سبب سے ہے۔ کہہ دیجئے ہر چیز اللہ کی جانب سے ہے۔ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ (النساء:۷۸)

منافقین کی مزید علامات وخصوصیات

اس آیتِ کریمہ میں منافقین کے نفاق کی کچھ مزید علامات اور خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ دورِ صحابہ میں تو ان علامات کی مدد سے صحابہ منافقین کو پہچانتے تھے۔ کیونکہ خود ان کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے نتیجے میں ان میں سے کوئی کمزوری باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیے جب کسی کے اندر اس قسم کی علامات کو دیکھتے تھے تو کھٹک جاتے تھے۔ لیکن آج ہمارے دور میں ہمیں ان آیاتِ کریمہ سے دوگنی رہنمائی ملتی ہے۔ ایک تو یہ کہ مخلص مسلمان اپنے معاشرے اور اپنے مقتدر طبقے میں چھپے ہوئے منافقین کو آسانی سے پہچان سکتے تھے۔ اور دوسرا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے اندر کہیں نفاق کی علامتیں پیدا تو نہیں

Marfat.com

گئیں۔ لیکن اس کے لیے ایمان اور اخلاص کی فکر بنیادی چیز ہے۔ جب تک اس بات کا دھڑکا نہ لگا رہے کہ مجھے اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے وہ میرے صرف ظاہری اعمال کا ہی حساب نہیں لے گا بلکہ میرے سینے میں چھپے ہوئے رازوں کا بھی حساب لے گا اور میرے دل و دماغ کی گہرائیوں میں مچلنے والے جذبات کی بھی جواب طلبی کرے گا۔ اس وقت تک آدمی کبھی اپنا جائزہ لینے کی زحمت نہیں کرتا۔ وہ دوسروں پر تو بڑی جارحانہ تنقید کرتا ہے لیکن اپنے آپ کو ہمیشہ الاؤنس دیتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں منافقین کی پہلی علامتِ نفاق جس کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ منافق ہمیشہ موت سے خوف زدہ رہتا ہے۔ وہ کسی ایسے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا اور کسی ایسے اقدام میں شریک نہیں ہوتا جہاں اسے موت سے سامنا کرنا پڑے اور جہاں اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ موت خطرات میں مضمر ہے۔ اگر آپ اپنے آپ کو خطرات اور مہالک سے دور رکھیں گے تو ہمیشہ موت سے محفوظ رہیں گے۔ ایسا شخص کبھی کسی دریا میں نہیں اترتا کیونکہ اسے خدشہ ہے کہ دریا کا پانی ڈبو بھی سکتا ہے۔ وہ لمبے سفر پر نہیں جاتا اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ راستے میں راستہ کاٹنے والے بھی مل سکتے ہیں۔ اسی طرح کسی جنگ میں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ وہاں تو موت و حیات کی کشمکش ہوتی ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ موت صرف خطرات میں نہیں بلکہ موت کا ایک وقت مقرر ہے اس وقتِ مقرر پر تم اگر اپنے آپ کو مضبوط قلعوں میں بھی بند کر لو موت وہاں بھی آئے گی۔ جس طرح خطرات سے کھیلنے والے موت کا شکار ہوتے ہیں اسی طرح قلعوں میں بیٹھنے والے اور تخت و تاج پر براجمان بھی لقمۂ اجل بنتے ہیں۔ طبعی موت تو خیر اپنے وقت پر آتی ہے اور وہ ہر جگہ آتی ہے لیکن حادثاتی موت بھی صرف حادثات سے کھیلنے والوں کو نہیں آتی بلکہ ان لوگوں کو بھی آتی ہے جو حادثے کے نام سے بھی کانپتے ہیں۔ بظاہر اپنی حفاظت کے ہزار اسباب رکھتے ہوں لیکن جب حادثہ ہونا ہوتا ہے تو اسباب سارے دھرے رہ جاتے ہیں۔ امریکہ کا صدر کینیڈی تمام تر حفاظتی انتظامات کی موجودگی میں مارا گیا۔ سادات نے بظاہر اپنی حفاظت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی لیکن فوج اور ٹینکوں کی موجودگی میں مارا گیا۔ اندرا گاندھی کو اس کے باڈی گارڈ سے مروا دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے ۔

موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں
نے مجالِ شکوہ ہے نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے

موت کا وقت نہ آگے ہو سکتا ہے نہ پیچھے ہو سکتا ہے۔ تقدیر میں جو لکھا ہے وہی ہو کے رہتا ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے نہ جانے کتنی دفعہ موت سے آنکھیں چار کیں۔ بیسیوں جنگوں میں اپنے سے کئی گنا بڑی طاقت کا سامنا کیا اور ہمیشہ شہادت کی تمنا بھی کی۔ لیکن جب موت آئی تو بستر پر آئی اور آپ نہایت تاسف سے فرماتے تھے کہ میرے جسم کا کوئی حصہ زخموں سے خالی نہیں۔ لیکن آج میں بزدلوں کی طرح بستر پر جان دے رہا ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آدمی کوئی احتیاطی تدبیر بروئے کار نہ لائے۔ اور بلاوجہ اپنے آپ کو خطرات میں جھونک دے۔ اپنی زندگی کی حفاظت اور جان کو بچانا یہ انسان پر فرض ہے۔ لیکن موت کے خوف سے فرائض سے کنارہ کش رہنا اور کسی بڑے اقدام کی جرأت نہ کرنا اور ناگزیر ضرورتوں میں بھی مقاصد کو اہمیت دینے کی بجائے اپنی ذات کے تحفظ کو مقصد بنا لینا یہ وہ چیز ہے جسے یہاں

Marfat.com

نفاق سے تعبیر کیا گیا ہے اور منافقین سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ تمہیں موت کے خوف سے جہاد و قتال میں شریک ہونے سے نہیں چاہئے۔ کیونکہ جہاد و قتال ایک ایسا فریضہ ہے جس سے کلمۃ اللہ سر بلند ہوتا ہے' انسانیت کی زندگی دراز ہوتی ہے' ظلم کا راستہ بند ہوتا ہے اور کی زمین پر فتنہ ختم ہونے کے بعد اللہ کا دین غالب آ جاتا ہے۔ اسی کی عبادت کی پاکیزہ جگہیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ بظاہر یہ موت کا کھیل زندگی ضمانت بن جاتا ہے۔ جس طرح پیسہ خرچ کرنے سے پیسہ بڑھتا ہے' درخت کی شاخیں کاٹنے سے نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں' اسی طرح گردنیں کے سے انسانیت پہ بہار آتی ہے

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

منافقین کی دوسری علامت جو بیان فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے وَ اِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ یَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَیِّئَةٌ یَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِکَ ؕ قُلۡ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ (اور اگر انہیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں یہ اللہ کی جانب سے ہے اور کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں یہ تیرے سبب سے ہے۔ کہہ دیجئے سب کچھ اللہ کی جانب سے ہے) آیت کے اس حصے میں بظاہر ان ایک علامت بیان کی گئی ہے لیکن درحقیقت یہ دو علامتوں کا مجموعہ یا ایک علامت کے دو پہلو ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ منافقین بظاہر تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی قدرتِ کاملہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ پروردگار اپنی مرضی اور ارادے میں کسی کا پابند نہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ کبھی آدمی اس حکمت کو سمجھ سکتا ہے اور کبھی نہیں سمجھتا۔ لیکن ان کا حال یہ ہے جب انہیں کوئی بھلائی یا فائدہ پہنچتا ہے تو وہ اسے اللہ کی جانب سے قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کی نسبت اللہ کی طرف کرنا یہ بھی ان کی حالت دیکھ کر صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ محض رواروی میں اس کی نسبت وہ اللہ کی طرف کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کا دل اس پر یقین نہیں رکھتا۔ لیکن جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو تکلیف کو اللہ کی طرف منسوب کرنے کے بجائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اگر ان ایمان اس بات پر ہوتا کہ اللہ اپنے ارادوں میں کسی کا پابند نہیں اور دنیا میں جو کام بھی ہوتا ہے وہ اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ آسانیاں بھی اسی طرف سے آتی ہیں اور مشکلات بھی اس کی طرف سے آتی ہیں۔ کیونکہ دنیا میں کوئی کام بھی اس کے ارادے اور مشیت کے بغیر نہیں ہو سکتا الگ بات ہے کہ ہر کام کو اس کی رضا میسر نہیں۔ لیکن فاعلِ حقیقی تو اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ لیکن منافقین کا حال دیکھئے کہ انہوں دنیا کے معاملات کو بھی دو مشیتوں کے تابع کر دیا ہے۔ گویا ان کے نزدیک اس کائنات کا مالک اور حاکم ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔

اسی نفاق کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانتے ہیں اور رسول ماننے کا مطلب ہے کہ آپ ہر کام اللہ کے حکم کے مطابق کرتے ہیں۔ اس کام کے نتیجے میں اگر کوئی کامیابی ملتی ہے تو وہ اللہ کی جانب سے ہوتی ہے۔ اور اگر ناکامی سے واسطہ پڑتا ہے تو اس میں بھی اللہ کے رسول کی کوتاہی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یا تو وہ ناکامی مسلمانوں کی کسی کوتاہی کا نتیجہ ہوتی ہے اللہ کی طرف سے کوئی آزمائش ہوتی ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو اس کٹھالی میں ڈال کر کندن بنانا ہوتا ہے۔ لیکن منافقین کا حال دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول ماننے کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ہر کام اللہ کے حکم سے نہیں کرتے بلکہ اپنی مرضی سے کرتے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زبان سے آپ کی رسالت کا اقرار ضرور کرتے ہیں لیکن دل سے وہ آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے۔ ورنہ اس طرح دو عملی اور دو رنگی کا شکار نہ ہوتے۔ آخر میں فرمایا کہ ان کا یہ عجیب و غریب رویہ اور ان کی یہ بہکی بہکی باتیں اس لیے نہیں ہیں کہ وہ لوگ عقل

Marfat.com

خالی ہیں بلکہ اس لیے ہیں کہ نفاق نے ان کی ذہنی یکسوئی کو ختم کر کے رکھ دیا ہے اب کوئی سیدھی اور آسان بات بھی ان کے لیے سمجھنا آسان نہیں رہا ہے۔ کیونکہ اگر آدمی اپنی نگاہوں کا فوکس بدل لے تو دیکھنے کے باوجود بھی اسے دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح اگر دل و دماغ میں ہم آہنگی نہ رہے اور آدمی پریشان خیالی اور پریشان نظری کا شکار ہو جائے تو ہزار کوشش کے باوجود بھی آپ دیکھیں گے وہ کسی عقل اور سمجھ کی بات کے قریب بھی نہیں بھٹکتا۔ یہی کیفیت اس وقت منافقین کی تھی۔

مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ز وَمَآ اَصَابَکَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ ط وَاَرْسَلْنٰکَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ○ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰکَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ○

”تمہیں جو سکھ بھی پہنچتا ہے خدا کی طرف سے پہنچتا ہے اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ تمہارے اپنے نفس کی طرف سے پہنچتا ہے۔ اور اے رسولؐ ہم نے تم کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔ اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو ہم نے اس پر تم کو نگران مقرر نہیں کیا۔“ (النسآء:۷۹تا۸۰)

آیت میں بیان کردہ چند حقائق

اس آیتِ کریمہ میں نہایت مربوط انداز میں کئی حقائق کو منکشف فرمایا گیا ہے۔ ہم ایک ترتیب سے ان حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۔ سابقہ آیتِ کریمہ میں منافقین سے خطاب کر کے فرمایا گیا تھا کہ اگر انہیں کوئی بھلائی ملتی ہے اور فائدہ پہنچتا ہے تو وہ اسے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی تکلیف آتی یا کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو اس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے ہیں۔ اس طرح سے وہ اپنی حماقت کا اظہار بھی کرتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بے ادبی کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔ حماقت تو یہ ہے کہ اللہ جو ساری کائنات میں متصرف کامل اور مالکِ کل ہے اور دنیا میں کوئی کام اس کی مشیت کے بغیر نہیں ہوسکتا' یہ حسنہ اور سیئہ کے انتساب میں فرق کر کے اس حماقت کا ثبوت دے رہے ہیں کہ یہ کائنات دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک میں اللہ کی مشیت کارفرما ہے اور دوسرا حصہ اس کی مشیت سے آزاد ہے۔

اور بارگاہِ رسالت میں بے ادبی کا ارتکاب اس طرح سے کر رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول ماننے کے باوجود ان کے ہر کام کو اللہ کے حکم کے مطابق اور اس کی تائید سے مؤید نہیں سمجھتے۔ اس طرح سے وہ رسالت کے تصور میں حماقت کا ثبوت بھی دے رہے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی طرف برائی کا انتساب کر کے یہ الزام لگا رہے ہیں کہ آپ چونکہ اپنی مرضی سے جو چاہتے ہیں سو کرتے ہیں اس طرح سے جو نقصان ہوتا ہے وہ آپ کی بے تدبیری سے ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے بڑھ کر بے ادبی یا گستاخی نہیں ہوسکتی۔ اس سیاقِ کلام میں جب ہم پیشِ نظر آیتِ کریمہ کو دیکھتے ہیں کہ منافقین سے خطاب ختم کر کے اچانک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرمایا جا رہا ہے۔ تو یہ بات بالکل صاف دکھائی دیتی ہے کہ منافقین سے بے التفاتی کا سبب ان کی متذکرہ بالا دو باتیں ہیں

Marfat.com

ایک ان کی حماقت اور دوسرا ان کی گستاخی۔ کہ چونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے مقام کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو ایسے احمقوں سے خطاب کا کیا فائدہ؟ اور مزید یہ کہ وہ اللہ کے رسول کی بارگاہ میں گستاخی کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ اس لیے اب وہ اس قابل نہیں رہے کہ ان کی طرف پروردگار التفات فرمائیں اور انہیں خطاب کا مستحق سمجھیں۔ اور مزید یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ خطاب چونکہ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی استحقاق ہے' ان کے طفیل اور ان کی برکت سے مسلمان اس خطاب سے نوازے گئے اور منافقین کو اسلام ہی کے بارے میں یکسو کرنے کے لیے خطاب کی ضرورت محسوس کی گئی اور یا ان پر اتمام حجت کے لیے خطاب فرمایا گیا۔ جب ان میں سے کوئی بات بھی باقی نہ رہی تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات جو اصل اس کی مستحق ہے انہیں سے خطاب فرما کر اس حقیقت کو منکشف فرمایا گیا ہے جس میں منافقین الجھ کر رہ گئے تھے۔

۲۔ گزشتہ آیتِ کریمہ میں ان کی بات کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا تھا کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ اب اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ جو سکھ یا دکھ' اچھائی یا برائی' راحت یا مصیبت آپ کو پہنچتی ہے اس میں اچھائی اور راحت تو اللہ کی جانب سے ہے' لیکن جو مصیبت آپ کو پہنچتی ہے وہ آپ کے اپنے نفس کی طرف سے ہے۔ یہ بات بظاہر گزشتہ آیتِ کریمہ میں کہی ہوئی بات کے مخالف نظر آتی ہے۔ لیکن درحقیقت ان دونوں باتوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن اس بات کو سمجھنے کے لیے چند مقدمات کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔

چند مقدمات

الف۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا فاعل چاہے انسان ہو یا کوئی اور وہ اللہ کی مشیت سے وجود میں آ رہا ہے۔ انسان ہی کو دیکھ لیجئے وہ چاہے کسی اچھائی کا ارتکاب کرے یا برائی کا اس کے ہر عمل کے پیچھے جو قوت' ذہانت اور صلاحیت کارفرما ہے وہ اس کی ذاتی نہیں بلکہ اللہ کا عطیہ ہے۔ خود اس کا جسم و جان اللہ کی عنایت ہے۔ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ سب اس کے مالک نے پیدا کیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اللہ کی دی ہوئی قوت' صلاحیت اور ذہانت سے کرتا ہے۔ اس لحاظ سے انسان کے ہر عمل کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بظاہر اس کا فاعل انسان ہے لیکن حقیقت میں اس کا فاعل اللہ ہے۔ کیونکہ وہ اس کے لیے وسائل فراہم نہ کرتا یا اس کو بروئے کار آنے کی مہلت نہ دیتا تو یہ فعل کبھی وجود میں نہ آ سکتا۔ اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔

ب۔ انسان کسی نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے وسائل پیدا فرما دیتے ہیں اور کسی برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے اسباب پیدا کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن جب انسان نیکی کرتا ہے تو اللہ خوش ہوتا ہے اور اپنی خوشنودی سے نوازتا ہے کیونکہ یہ اس کی رحمت کا اقتضا ہے۔ لیکن جب انسان برائی کرتا ہے اگرچہ اس کے اسباب اللہ ہی کے پیدا کردہ ہیں اور وہ اللہ کی دی ہوئی مہلت سے برائی کرنے کے قابل ہوتا ہے' لیکن اس پر اللہ ناراض ہوتا ہے۔ اس لیے وہ نیکی پر جزاء دے گا اور برائی پر سزا دے گا۔

ج۔ نیکی چونکہ اس کی رحمت سے وجود میں آتی اور اس کی خوشنودی کا سبب بنتی ہے اس لیے اس کا انتساب اللہ کی طرف ہوتا ہے اور اس پر اللہ کی طرف سے عنایات کا نزول ہوتا ہے۔ برائی اگرچہ اس کی مہلت سے وجود میں آتی ہے لیکن وہ اس کی رحمت کا اقتضاء نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف اس کے اس فیصلے کا نتیجہ ہے کہ اس نے انسان کو ایک آزادی دے رکھی ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے وہ اس کے لیے اسباب فرا

Marfat.com

کردے گا۔ اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی۔ اس لیے وہ نیکی کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور برائی کو برائی کرنے والے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ انسان کی کوشش اور اس کے فیصلے سے وجود میں آئی ہے۔ اللہ کی رحمت کا اقتضاء اس کی تائید میں نہیں تھا۔ لیکن روکا اس لیے نہیں گیا کہ روکنے سے اس کی آزادی سلب ہوجاتی اور جزا اور سزا کا ترتب خلافِ حقیقت ٹھہرتا۔

ان مقدمات پر اگر غور کرلیا جائے تو یہ بات سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ یہ بات کیوں کہی جاتی ہے کہ سب کچھ اللہ کی جانب سے ہوتا ہے اور پھر اچھائی کہ جس کی نسبت اللہ کی طرف اور برائی کی نسبت نفس انسانی کی طرف کیوں کی جاتی ہے۔ ان اصولوں کو سمجھ لینے سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب اللہ کی رحمت اترتی ہے تو اس پر شکر ادا کرنے اور اپنی بندگی کے عمل میں اضافہ کرنے سے اس کی رحمت میں بھی اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اس لیے انسان اسی کی طرف متوجہ رہ کر مانگنے کا عمل جاری رکھتا ہے لیکن جب برائی اور بدعملی کے نتیجے میں دنیا میں کوئی سزا ملتی ہے تو آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس سے سزا کی شکایت کرتا ہے تو اسے توجہ اس کے اپنے نفس اور اپنی ذات کی طرف دلائی جاتی ہے۔ کہ تم ہم سے شکایت نہ کرو بلکہ اپنے آپ سے شکایت کرو۔ کیونکہ اس طرح کی سزائیں تمہاری اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں۔ اکبر نے ٹھیک کہا:

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اللہ کی گواہی

وَ اَرْسَلْنٰکَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا آیتِ کریمہ کے اس حصے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جارہی ہے اور منافقین کی طرف سے رخ پھیر کر ایک حقیقت کا اظہار کیا جارہا ہے۔ تسلی کی صورت یہ ہے کہ آپ سے کہا جارہا ہے کہ کافر اگر آپ پر ایمان نہیں لاتے یا منافق اپنے نفاق سے تائب نہیں ہوتے اور آپ کی نصیحتیں ان پر اثر انداز نہیں ہورہیں تو آپ کو ہرگز پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے آپ کو رسول بنا کے بھیجا ہے۔ رسول کا کام اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانا' ان کے دل و دماغ کو اس پیغام کی قبولیت کے لیے مقدور بھر آمادہ کرنا اور ان کی طرف سے آنے والے سوالات کا جواب دینا ہے۔ اور اگر وہ مخالفت کے طوفان اٹھائیں تو انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ہے۔ آپ نے نہایت حسن وخوبی سے ان میں سے ایک ایک فریضہ انجام دیا ہے۔ اس کے باوجود اگر یہ لوگ راہِ راست پر نہیں آتے تو آپ ہرگز دل گرفتہ نہ ہوں۔ ان کا ماننا یا نہ ماننا آپ کی رسالت کی گواہی کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آپ کی رسالت کے برحق ہونے اور آپ کے سچے رسول ہونے کے لیے کسی انسان کی نہیں اللہ کی گواہی کافی ہے۔ کسی شہنشاہ کی طرف سے اگر کوئی وائسرائے یا گورنر متعین ہو کر کسی علاقے میں پہنچتا ہے تو اس کے عہدہ و منصب کے لیے صرف یہ گواہی کافی ہے کہ اس کے پاس شہنشاہ کا فرمانِ تقرر موجود ہے۔ اس کے وائسرائے یا گورنر ہونے کے لیے لوگوں کے ماننے یا نہ ماننے کا کوئی تعلق نہیں۔ رہی یہ بات کہ پیغمبر کے لیے اللہ کی طرف سے اس کے منصب کی گواہی کیا ہوتی ہے؟ اگر دیدۂ بینا اور قلب سلیم میسر ہو تو اس گواہی کو دیکھنا اور سمجھنا نہایت آسان ہے۔ پیغمبر کی سب سے پہلی گواہی اس کی اپنی شخصیت ہے۔ دل میں اتر جانے والی شکل وصورت' آنکھوں میں بس جانے والی دل آویز شخصیت' دل و دماغ کو جھکا دینے والا سیرت و کردار' پتھروں کے ڈھیر میں ہیرے کی مانند چمکنے والی درخشاں زندگی' خود اپنی ذات میں ایک مستقل گواہی ہے۔ مزید برآں آپ پر اترنے والی کتاب اپنی فصاحت وبلاغت' اپنی وسعت و جامعیت اور اپنے مفہوم و معنی کے اعتبار سے بے مثل اور بے بدل' اپنے دیے ہوئے نظام شریعت کے اعتبار سے جامع و مانع اور اپنے علم اور مضامین کے تنوع کے اعتبار سے دماغوں کو حیرت میں ڈال دینے والی' اور دنیا کو اپنی مثال

Marfat.com

کا چیلنج دیکر گنگ کر دینے والی اور اپنی ہر حیثیت سے منفرد شان کی حامل کتاب سے بڑھ کر اور گواہی کیا ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب شہنشاہِ کائنات کا فرمان ہے جس نے آپ ؐ کے پیغمبر اور نبی ہونے کی شہادت دی ہے۔ علاوہ ازیں آپ ؐ کی دعوت پر آپ کی استقامت' بپھرے ہوئے حالات کے مقابلے میں آپ کا اطمینان اور صبر' اپنے جانی دشمنوں کے لیے ہدایت کی دعائیں اور چند ہی سالوں میں ایک کامیاب حیرت انگیز انقلاب ان میں سے کون سی چیز ہے جو آپ کی شہادت کی کے لیے کافی نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے

آپ ؐ کی رسالت چونکہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ جس کا انکار اہلِ کتاب جیسے دشمنوں سے بھی ممکن نہ ہوا۔ بدترین مخالف بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور رہے۔ اس لیے منافقین کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ یوں تو ہر رسول ہی دنیا میں اطاعت کرانے کے لیے آتا ہے لیکن یہ اللہ کا آخری اور عظیم رسول تو اس قدر شان کا مالک ہے کہ اس کی اطاعت کو اللہ نے اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ اور صاف فرمایا کہ جس نے اس رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے اس کی اطاعت سے روگردانی کی تو اے پیغمبر ہم نے آپ کو ان پر نگران بنا کے نہیں بھیجا کہ آپ یہ دیکھتے پھریں کہ کون آپ کی اطاعت کرتا ہے اور کون نہیں۔ آپ کی اطاعت چونکہ اللہ کی اطاعت ہے اس لیے یہ ہمارا کام ہے کہ ہمارے رسول کی کون اطاعت کرتا ہے اور کون نہیں کرتا۔ یہاں پہنچ کر خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ؐ کی اطاعت کو اپنی اطاعت ٹھہرایا ہے اور اس پر اپنے رسول کو نہیں خود اپنے آپ کو نگران بنا دیا ہے تو اس کی نگرانی کے نتیجے میں جو لوگ عدمِ اطاعت میں پکڑے جائیں گے ان کو جس طرح کا عذاب ہوگا اس کے تصور سے بھی کپکپی چھوٹ جاتی ہے۔ منافقین کو درحقیقت اسی انجام کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے کہ تم اپنے رویے کو درست کرو ورنہ اس انجام کے لیے تیار رہو۔

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ○

"اور کہتے ہیں کہ سرِ تسلیم خم ہے۔ پھر جب باہر نکلتے ہیں آپ کے پاس سے تو رات بھر مشورہ کرتا ہے ایک گروہ ان میں سے اپنے قول کے بالکل برعکس اور اللہ تعالیٰ لکھ رہا ہے جو وہ سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ پس آپ ان سے اعراض کریں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز۔" (النسآء:۸۱)

منافقین کا طرزِ عمل

گزشتہ آیت میں رسول کی برتر حیثیت کو پوری وضاحت سے کھول دیا گیا اور رسول کی اطاعت نہ کرنے پر جو انجام ہو سکتا ہے اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود منافقین کا رویہ یہ رہا جس کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ ان کے رویے کی پوری طرح نشاندہی کے لیے "طاعة" کو خبر کے طور پر لا کر مبتداء محذوف کر دیا گیا ہے تاکہ خبر پر پورا زور رہے اور یہ بات واضح ہو جائے کہ منافقین کے رویے میں منافقت کس حد تک اتری ہوئی ہے۔ منافقین جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ

Marfat.com

بات پر "طاعۃ" کا لفظ بولتے۔ ممکن ہے یہی لفظ بولتے ہوں یا اس کے ہم معنی الفاظ کا تکرار کرتے ہوں۔ لیکن مقصود یہ بتلانا ہے کہ وہ بات بات پر اپنی فدویت، فدائیت اور غیر مشروط اطاعت کا اظہار کرتے، کبھی کہتے سر تسلیم خم ہے، کبھی کہتے بجا ارشاد فرمایا، کبھی کہتے اس میں شبہ ہی کیا ہے، کبھی کہتے ہم ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ اطاعت کے مفہوم میں اس طرح کی تمام باتیں شامل ہیں۔ لیکن جب وہ حضور کی مجلس سے نکلتے اور اپنے لوگوں میں الگ ہو کر بیٹھتے تو رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر مشورے کرتے اور ان مشوروں میں جو کچھ طے کرتے یا جن عزائم کا اظہار کرتے ان میں سے ہر بات ان باتوں کے بالکل برعکس ہوتی جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کہتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں بات اطاعت کی ہوتی تو یہاں مشورے معصیت اور انکار کے ہوتے۔ بلکہ جن چیزوں سے اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور دعوت کو نقصان پہنچ سکتا، ان پر غور کرتے اور ان کو بروئے کار لانے کے لیے سازشیں کی جاتیں، تدبیریں لڑائی جاتیں اور منصوبے باندھے جاتے۔ یہ سب کچھ چونکہ رات کی تنہائی یا نہایت خفیہ طریقے سے ہوتا تھا اس لیے پروردگار نے انہی منصوبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھمکی کے انداز میں فرمایا کہ منافقین یہ سمجھتے ہیں کہ وہ نہایت خفیہ طریقے سے جو منصوبے تیار کرتے ہیں کسی کو ان کی خبر نہیں ہوتی۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ دنیا سے تو اپنے منصوبوں کو چھپا سکتے ہیں اور مسلمانوں کو بھی دھوکا دے سکتے ہیں لیکن اللہ کو تو دھوکا نہیں دے سکتے۔ وہ جو کچھ نہایت مخفی انداز میں رات کی تنہائی میں مشورے کرتے ہیں اللہ انہیں لکھ رہا ہے۔ اللہ کے لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے فرشتے اللہ کے حکم سے لکھ رہے ہیں۔ ان کی ایک ایک بات کو محفوظ کیا جا رہا ہے۔ قیامت کے دن یہ سارا ریکارڈ ان کے سامنے لا کر رکھ دیا جائیگا۔ تب انہیں اندازہ ہو گا کہ ہم نے جو سرگوشیوں میں باتیں کی تھیں وہ بھی آج ہمارے سامنے ہمارے نامۂ اعمال میں مرقوم ہیں۔ لیکن اس وقت کا احساس انہیں کوئی کام نہیں دے گا۔ ضرورت تو اس کی ہے کہ آج وہ اپنے رویے کو بدلنے کی کوشش کریں اور وہ اس بات کا یقین پیدا کر لیں کہ ان کی کوئی بات بھی اللہ سے مخفی نہیں۔ وہ جب چاہتا ہے ان کی ان سازشوں سے اپنے رسول کو آگاہ کر دیتا ہے۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ ان کی پروا کرنے کے بجائے ان سے اعراض کیجیے۔ وہ جو کرتے ہیں انہیں کرنے دیجیے۔ ان سے ڈرنے یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ صرف اللہ پر بھروسہ کریں۔ اللہ ہی آپ کا کارساز ہے۔ اور اللہ کی شان یہ ہے کہ جس کا وہ کارساز ہو اس کو کسی اور کی کارسازی کی حاجت نہیں رہتی۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ○

"کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اور (اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ) اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ ضرور پاتے اس میں اختلاف کثیر۔" (النسآء:۸۲)

منافقین کا فکری تضاد

قدم قدم پر منافقین کے فکری تضاد کو نمایاں کیا جا رہا ہے کہ ایک طرف تو وہ اللہ کے رسول کی ہر بات اور قرآنِ کریم کی ہر آیت پر سمعنا و اطعنا کہتے ہیں اور بار بار اپنی اطاعت اور فدویت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور قرآنِ کریم پر تنقید کرنے سے باز نہیں آتے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نہ وہ آپ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں اور نہ قرآنِ کریم کو اللہ کی کتاب سمجھتے ہیں۔ ان کے اس متضاد رویے اور منافقانہ طرزِ عمل پر ہونا تو یہ چاہیے کہ انہیں بالکل دھتکار دیا جائے اور

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں آنے سے روک دیا جائے لیکن قرآنِ کریم کے اس حیرت انگیز اسلوب کو دیکھتے ہوئے یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ یقیناً اللہ کی کتاب ہے۔ کون شخص ہے جو اس طرح کا رویہ رکھنے والے آدمی یا گروہ پر برہمی کا اظہار نہیں کرتا اور اپنے آپ کو ترکِ تعلق پر مجبور نہیں پاتا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب دل میں برہمی، کدورت یا غصہ بھڑک رہا ہو تو ایسی کیفیت میں ہر گفتگو اور ہر تحریر میں اس کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن یہاں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک جملہ پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے اعراض کی ہدایت کی جارہی تھی اور اس کے فوراً منافقین کو قرآنِ کریم میں تدبر کی دعوت دی جارہی ہے۔ بلکہ انہیں راستہ دکھایا جارہا ہے کہ اگر وہ قرآنِ کریم میں غور وفکر سے کام لیں تو انہیں یہ مانے بغیر چارہ نہیں رہے گا کہ یہ کتاب اللہ کی کتاب ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اس گرامی قدر ذات کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو بندوں کے جذبات سے منزہ اور بالا ہے۔

تدبرِ قرآن کا نتیجہ

رہی یہ بات کہ قرآنِ کریم میں اگر تدبر کیا جائے تو کس طرح سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ واقعی اس کتاب میں اختلاف کا کوئی پہلو نہیں اور اگر یہ کتاب اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو صرف یہی نہیں کہ اس میں اختلاف ہوتا بلکہ اختلافِ کثیر ہوتا۔ اس کے لیے چند باتوں پر غور کر لینا کافی ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ یہ قرآن کریم تیئس سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔ اس عرصے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حالات کی ضرورت کے تحت خطبے کی شکل میں اس کتاب کا کوئی حصہ نازل کر دیا جاتا۔ اور حالات اتنے متنوع، اس قدر ہنگامہ خیز اور پر آشوب رہے کہ کوئی ایک دن یا ایک ہفتہ بھی سکون سے نہ گزر سکا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم وستم کے وہ پہاڑ توڑے گئے کہ جس کی نظیر تاریخ میں ہمیں کہیں نہیں ملتی۔ پھر آپ کا تعلق بھی ایک طرح کے لوگوں سے نہیں رہا بلکہ مختلف قبائل، مختلف قوموں اور مختلف مذاہب سے آپ کو واسطہ پڑتا رہا۔ کبھی اذیتوں کے ہجوم میں ہیجان یا ہراس پیدا ہوتا، کبھی جنگوں کی ہولناکی میں حالات بے قابو ہونے لگتے، کبھی منافقین کی در پردہ سازشوں سے دل و دماغ زخمی ہونے لگتے۔ غرضیکہ حالات اور واقعات کا جوار بھاٹا ہر وقت سرگرم رہتا۔ انہی حالات میں کبھی صلح سے سابقہ پڑتا اور کبھی جنگ سے۔ کبھی فتح ہوتی کبھی پسپائی۔ کبھی خوف کے حالات ہوتے اور کبھی امن کی ہمواری۔ ایسے مختلف حالات اور گوناگوں مواقع پر مختلف مضامین پر مشتمل تقریریں نازل ہوتی رہیں۔ اور تقریروں کا دورانیہ بھی سالوں میں پھیلا ہوا۔ لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ اول سے آخر تک ساری تقریریں ایسی ہموار، یک رنگ اور باہم ایسی مربوط کہ آج بھی پڑھنے والا جب اسے پڑھتا ہے تو وہ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ یہ کتاب تیئس سالوں میں مختلف حالات میں آیات اور رکوعوں کی شکل میں نازل ہوتی رہی۔ جس میں دور دور تک حالات کا عکس دکھائی نہیں دیتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن حالات سے گزرتے رہے یقیناً ان کے مطابق آپؐ کے اندر جذبات موجزن ہوں گے لیکن اس کتاب میں اس کا دور دور تک شائبہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

دوسرا پہلو اس کتاب کے حوالے سے سوچ کا یہ ہے کہ اس کتاب میں ایک پورا نظامِ زندگی دیا گیا ہے۔ اس کی ایک ایک بات ایک ایک حکم اپنے اصول اور فروع میں اس قدر مستحکم اور مربوط کہ ریاضی اور اقلیدس کے فارمولے بھی اتنے مستحکم اور مربوط نہیں ہوسکتے۔ وہ جن عقائد کی تعلیم دیتا ہے وہ ایک دوسرے سے انتہائی وابستہ و پیوستہ ہیں۔ جن عبادات اور اطاعات کا حکم دیتا ہے وہ عقائد سے اس طرح پیدا ہوتے ہیں جیسے تنے سے شاخیں پھوٹتی ہیں۔ وہ جن اعمال واخلاق اور آداب کی تلقین کرتا ہے وہ اپنے اصول سے اس طرح ظہور میں آتے ہیں جس طرح ایک شے سے اس کے قدرتی اور فطرتی لوازم ظہور میں آتے ہیں۔

Marfat.com

تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس کی زبان قریش کی زبان ہے۔ لیکن قریش کیا ساری دنیا مل کر بھی اس زبان کی نقل نہیں کر سکتی۔ اس کا ایک ایک لفظ فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے۔ اس کا ایک ایک جملہ نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ اس کی ہر بات حرفِ آخر ہے۔ اور اس کا یہ چیلنج کہ تم اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ آج تک جواب سے محروم ہے اور ساری دنیا اس کے سامنے گنگ ہو کر رہ گئی ہے۔

اگر ان چند پہلوؤں پر غور کر لیا جائے اور غور کرنے والا عصبیت سے اندھا نہ ہو چکا ہو تو چاہے اس کے اندر نفاق کی بھٹی کیوں نہ سلگ رہی ہو وہ یہ اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ کتاب اللہ کی کتاب ہے۔ اور جس ذات عزیز پر اتری ہے وہ اللہ کے رسول ہیں۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ○

''اور جب آتی ہے ان کے پاس کوئی بات امن سے یا خطرے سے متعلق تو وہ اسے پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ اس کو رسول اور اپنے اولوالامر کے سامنے پیش کرتے تو جو لوگ ان میں سے بات کی تہہ تک پہنچنے والے ہیں وہ ان کو اچھی طرح سمجھ لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے سے لوگوں کے سوا تم شیطان کا اتباع کرنے لگتے۔'' (النسآء: ۸۳)

منافقین کی افواہوں سے دلچسپی

منافقین پر تنقید جاری ہے اور ان کے منافقانہ رویے سے مسلمانوں کو حالات کو سمجھنے اور صحیح راستہ اختیار کرنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ جس زمانے میں یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی ہے وہ مسلمانوں کے لیے انتہائی تشویشناک دور تھا۔ قریشِ مکہ تو عداوت سے اندھے ہو رہے تھے اور وہ کوئی موقع دشمنی کا ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے' لیکن ان کے ساتھ ساتھ یہود بھی اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے سے باز نہیں آتے تھے۔ وہ برابر قریشِ مکہ سے رابطے میں رہتے تھے اور دونوں قوتیں مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتی رہتی تھیں اور خود مدینے کے اندر منافقین مارِ آستین کا فرض انجام دے رہے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو اپنے مفادات کے ہاتھوں مجبور تھے اور کچھ لوگ ایسے تھے جنہیں یہود استعمال کر رہے تھے۔ قریشِ مکہ اور یہود کی دشمنی نے قریب و بعید کے قبائل کو بھی مسلمانوں پر دلیر کر دیا تھا۔ ان میں سے طاقتور قبائل برابر اس تاک میں تھے کہ موقع ملنے پر مسلمانوں پر حملہ کر دیں۔ مدینے کی ایک چھوٹی سی ریاست اور پوری سرزمین عرب اس کے خلاف دشمنی سے دہک رہی تھی۔ ایسی صورتِ حال میں جب کہ چہار طرف اندیشوں کی فصل اگ رہی ہو معمولی سی غیر ذمہ داری بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ منافقین تو اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہی تھے بعض سادہ دل مسلمان بھی اپنی سادگی کی وجہ سے ان کی باتوں میں شریک ہو جاتے تھے۔ چنانچہ منافقین نے اپنا یہ وطیرہ بنا لیا تھا کہ وہ آئے دن نئی نئی افواہیں گھڑتے اور انہیں پھیلاتے تھے۔ اچانک یہ افواہ پھیلا دی جاتی کہ فلاں قبیلہ مسلمانوں پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے' فلاں طرف سے حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے' فلاں جگہ دشمن کو گھات لگا کر بیٹھے دیکھا گیا ہے اور سادہ دل مسلمان باہمی ہمدردی اور خیر خواہی کے باعث ان افواہوں سے خود بھی

Marfat.com

مضطرب ہوتے اور دوسروں کو بھی اضطراب میں مبتلا کر دیتے۔ اور اس سے مقصود صرف یہ ہوتا کہ مسلسل خطرات کی افواہوں سے مسلمانوں کے حوصلے توڑ دیے جائیں۔ وہ جب محسوس کریں گے کہ ہم ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے ہیں تو اعصاب کے تحمل کی بھی ایک حد ہوتی ہے آخر وہ کب تک ان کا مقابلہ کرتے رہیں گے۔ آہستہ آہستہ وہ خوف کی گرفت میں آ کر عزائم کی بلندی سے محروم ہو جائیں گے۔ بجز چند سرفروشوں کے اور کوئی شخص بھی مسلسل ان افواہوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔

افواہ سازی قوم کا حوصلہ توڑنے کا مؤثر ذریعہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ حربی صلاحیت اور حربیت کے اعتبار سے ایک پسماندہ زمانہ ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آج حربی ماہرین یہ سمجھتے ہیں کہ جنگ صرف میدانِ جنگ میں نہیں لڑی جاتی بلکہ اصل میدانِ جنگ قوم کے دل ہوتے ہیں۔ اگر وہ پوری توانائی اور اولوالعزمی کے ساتھ اپنی فوج کی پشت پر کھڑے ہوتے ہیں تو فوج میدانِ جنگ سے پسپا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر قوم ہمت ہار دیتی ہے اور اس کے سیاستدان اور اصحابِ اقتدار اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو کر سمجھوتے کی میز پر آ جاتے ہیں تو فوج کی جیتی ہوئی بازی بھی شکست میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس لیے نئی فوجی تکنیک یہ ہے کہ گرم جنگ سے پہلے سرد جنگ لڑی جاتی ہے۔ دشمن قوم کے دماغوں کو مسخر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان کے سوچنے سمجھنے والے افراد کی رائے کو بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کے اندر پانچواں کالم تیار کیا جاتا ہے جن کا کام دشمن قوم کو ہر وقت افواہوں کی گرفت میں رکھنا ہوتا ہے اور افواہ سازی کے لیے مستقل سیل قائم کیے جاتے ہیں۔ جہاں بڑے بڑے دماغ عجیب وغریب افواہوں کو جنم دیتے ہیں اور پانچواں کالم اور ان کے جاسوس اسے دشمن قوم میں پھیلانے کا کام کرتے ہیں۔ آج اسے نہایت منظم طریقے سے کیا جا رہا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اگرچہ یہ برائی منظم طریقے سے انجام نہیں پا رہی تھی لیکن اس کی اہمیت اور افادیت ماہرین جنگ کی نگاہوں میں آج ہی کی طرح مسلم تھی۔ چنانچہ اسی اہمیت کے پیشِ نظر منافقین کے بارے میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب بھی ان کے پاس کوئی خبر پہنچتی ہے تو وہ اسے مسلمانوں میں پھیلانے کے لیے دوڑ بھاگ میں لگ جاتے ہیں۔ اس سے مسلمانوں کو یہ تربیت دی جا رہی ہے کہ منافقین تو دشمن کے ایجنٹوں کی طرح تمہارے حوصلے شکست کرنے کے لیے یہ حرکت کریں گے۔ لیکن تمہیں ان کے دیکھا دیکھی کبھی اس میں شریک ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اس بات کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے تمہارا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ جب بھی اس طرح کی بات سنو تو سب سے پہلے قرآنِ کریم کی ہدایت کے مطابق یہ جاننے کی کوشش کرو کہ خبر لانے والا کون ہے۔ اگر کوئی فاسق یعنی بدکردار اور غیر معتبر آدمی ہے تو اس کی خبر کو مت قبول کرو۔ اور مزید یہ کہ جس بات کو سنو اسے بلاتحقیق دوسرے سے کہنا شروع نہ کر دو کیونکہ جس طرح جھوٹ ایک بدترین برائی ہے اور اللہ کے یہاں اس کی بڑی سزا ہے اسی طرح وہ آدمی بھی جھوٹوں میں شمار ہوگا جو ہر سنی ہوئی بات کو بلاتحقیق دوسروں سے کہنا شروع کر دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ (کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ جو سنے کہنا شروع کر دے) جنگ کے دنوں میں اس طرح کی بے احتیاطی بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ مگر عام دنوں میں بھی اسلام مسلمانوں کا جو مزاج پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں اس بے احتیاطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ اسلام کے نزدیک جھوٹ بدترین لعنت ہے اور جھوٹ بولنے والا لعنت کا سزاوار ہے۔ اس لیے ہر وہ بات جس پر جھوٹ کا شبہ بھی ہوتا ہو یا جھوٹ پر منتج ہو سکتی ہو یا جس سے جھوٹ کا مزاج پیدا ہوا اسلام ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ ایسا رویہ زندگی کے ہر دائرے میں مشکلات پیدا کرتا ہے۔ گھروں میں جہاں چند افراد بستے ہوں ایک آدمی بھی اس مزاج کا ہو تو گھر میں ناچاقی اور بے اتفاقی کا ماحول پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اور اگر معاشرے میں یہ رویہ عام ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ کوئی گھر، کوئی دفتر اور کوئی ادارہ

Marfat.com

ت کی خرابی سے محفوظ نہیں رہتا۔اس لیے اسلام کی یہ ہدایت صرف جنگی حالات تک محدود نہیں بلکہ پوری زندگی پر حاوی ہیں۔اور ہم دیکھتے ہیں جب بھی کسی بھی معاشرے میں اس ہدایت کی خلاف ورزی ہوئی ہے تو ضرور تلخ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔سب سے پاکیزہ معاشرہ عہد نبوت کا مرہ ہے۔لیکن اس میں بھی ہمیں ایسی مثالیں ملتی ہیں جس میں سے ایک مثال کو اس آیت کے شانِ نزول کے طور پر بھی مفسرین بیان کرتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دینی بھائی گئی رات حضرت عمرؓ کے دروازے پر آئے دستک دی۔آپ گھبرا کر باہر نکلے اور گھبراہٹ میں پوچھا لاں قبیلے نے حملہ کر دیا ہے؟انہوں نے کہا نہیں اس سے بے بھی بڑی بات ہوگئی۔پوچھا وہ کیا؟ کہنے لگے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ں کو طلاق دے دی ہے۔یہ سن کر حضرت عمرؓ کا دل بیٹھ گیا۔ان کی پریشانی دوگونہ تھی۔ایک تو پریشانی کا سبب وہی تھا جو تمام مسلمانوں کے لیے تھا نحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں خدا نہ کرے ایسی کیا بات ہوگئی ہے جب کہ وہ گھر پوری انسانیت کے لیے نمونہ ہے کہ آپ اپنی بیویوں کو دینے پر مجبور ہو گئے۔اس سے دشمن فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے اور مسلمانوں کے معاشرے میں نہایت پریشان کن صورتحال پیدا ہو سکتی ہے۔اور پریشانی کا سبب یہ تھا کہ آپؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں تھیں۔صبح حضرت عمرؓ مسجد میں پہنچے تو لوگوں کو مدمے سے نڈھال پایا۔ہر آدمی یہی سمجھتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔آپؓ پریشانی میں باہر نکلے ہوا کہ گھر کے اوپر کے کمرے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔سیڑھی کے پاس ایک لڑکا دربان کے فرائض انجام دے رہا تھا۔آپؓ ں سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کرو میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔اس نے واپس آ کر بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہیں دیا۔آپؓ پھر مسجد میں جا بیٹھے۔چین نہ آیا کچھ دیر کے بعد لوٹ کر آئے اور پھر اجازت مانگی اور نہ ملی۔تیسری دفعہ پھر حاضر ہوئے اور واز میں پکار کر کہا کہ حضور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں حفصہؓ کی سفارش کے لیے آیا ہوں تو آپ مجھے حکم دیجیے میں اس کا سر اتار کر حاضر کر دیتا ہوں آپؐ نے اجازت دی۔حضرت عمرؓ نے بڑے ادب سے جا کر پوچھا کہ کیا جناب نے بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔آپؐ نے فرمایا نہیں۔آپؓ ت خوش ہوئے اور مسلمانوں کو آ کر اطلاع دی کہ تمہیں کسی نے غلط خبر دی ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں کو طلاق نہیں دی ہے۔اس تمام اہلِ مسجد کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔اس ایک بات سے اندازہ کیجیے کہ بلاتحقیق بات کے پھیلا دینے سے کتنے بڑے حادثے پیش آ سکتے اور جنگ کے زمانے میں تو اس کی خطرناکی کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اس آیتِ کریمہ میں منافقین کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ جس طرح خوف کی باتیں لوگوں میں اڑاتے ہیں اسی طرح امن علق کوئی بات ہو تو اسے بھی بلاتحقیق لے اڑتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ دشمن ہمیشہ صرف ایسی افواہیں نہیں پھیلاتا جس سے قوم کے توڑنا مقصود ہوتے ہیں بلکہ وہ اس طرح کی افواہیں بھی اڑاتا ہے جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ حالات چاہے جتنے بھی نامساعد ہیں لیکن وہ لوں میں یہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں جنگ کا دور دور تک کوئی امکان نہیں اور ہماری ی ناقابلِ تسخیر ہو چکی ہے کہ کسی دشمن کو کبھی ہماری سرحدوں پر پاؤں رکھنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔وہ ہماری اسلحی برتری اور ہماری فوجی سے پوری طرح آگاہ ہے۔وہ جانتا ہے کہ اس قوم سے ٹکر لینا سر پھوڑنے کے سوا کچھ نہیں۔اس طرح کی افواہیں پھیلا کر مسلمانوں کو کی کوشش کی جاتی ہے۔اور پھر اندر ہی اندر دشمن کے ایجنٹ اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور پتہ اس وقت چلتا ہے جب اس سوئی ہوئی قوم پر ی تاریکی میں دشمن وار کر دیتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی جب کہ ہر چہار طرف خطرات امڈ رہے تھے ایسے لوگ بھی تھے جو آج کی طرح انوں کو سلائے رکھنا چاہتے تھے۔اس لیے وہ ہر طرف خیریت کی افواہیں اڑاتے تھے اور جو لوگ خطرات کی بات کرتے تھے ان کو دشمن کا

Marfat.com

پھیلائی جاتی تھیں۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا کہ افواہ خوف کی ہو یا امن کی جب بھی ایسی کوئی بات تمہارے پاس پہنچے تو تمہیں منافقین کی طرح سے پھیلانے کے بجائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر صورتِ حال عرض کرنی چاہیے اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم واقفیت کے باعث ان تک نہ پہنچ سکو تو پھر ان لوگوں تک ایسی باتوں کو پہنچاؤ جن کے سپرد ایسے معاملات کیے گئے ہوں۔ جنہیں قرآن کریم کی زبان میں "اولوالامر" کہا گیا ہے۔ (اور ہم سورۃ النسآء آیت نمبر 59 کی تشریح میں اولوالامر کے مفہوم کی وضاحت کر چکے ہیں) جن میں حکام، فقہاء اور قضاۃ بھی شامل ہیں اور وہ لوگ بھی جن کے سپرد انتظامی ذمہ داریاں ہیں۔ عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ میں چونکہ دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں تھی اس لیے انتظامی ذمہ داریاں بھی انہی لوگوں کے سپرد کی جاتی تھی جو علوم اسلامیہ سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ البتہ ایک بات جو توجہ کے لائق تھی اور جس کو بطورِ خاص اس آیتِ کریمہ میں بیان کیا گیا ہے کہ "تمہیں اولوالامر میں سے ان لوگوں کے پاس ایسے معاملات کو لے کر جانا چاہیے جنہیں اللہ نے استنباط کی صلاحیت سے بہرہ ور فرمایا ہے" استنباط کا معنی کنواں کھود کر اس سے پانی نکالنا اور کسی پوشیدہ چیز کو باہر لانا ہے۔ پھر اس مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی بات کی تہہ کو پہنچنے اور اس کی حقیقت پانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو ایسے نازک معلومات کسی کمزور آدمی کے پاس لے جانے سے فائدہ ہوتا ہے اور نہ ایسے آدمی کے پاس جو انتظامی صلاحیت تو رکھتا ہے لیکن بات کی تہہ تک اتر کر حقیقت معلوم کرنے کی صلاحیت سے تہی دامن ہو۔ اس کے لیے علم بھی درکار ہوتا ہے اور تجربہ بھی اور بطورِ خاص خداداد صلاحیت بھی۔ ایسے لوگوں کے پاس جب اس طرح کی معلومات پہنچتی ہیں تو وہ غور و فکر کے بعد معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ جو کچھ پھیلایا جا رہا ہے اس کی اصل حقیقت کیا ہے اور پھیلانے سے مقصود کیا ہے اور اس کے پیچھے کون لوگ کام کر رہے ہیں۔ مختلف مصادر کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہو جاتا ہے کہ بات کی اصل حقیقت کیا ہے۔

فضل اللہ کا مفہوم

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ الخ اس کا ایک مفہوم تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ منافقین افواہ سازی اور افواہوں کی اشاعت میں اس حد تک سرگرم ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے پوری طرح اپنے کارندے ان کے ساتھ لگا رکھے ہیں اور ان کے دل و دماغ پوری طرح آلۂ کار بنا لیا ہے۔ اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان کے پروپیگنڈے کی شدت کو دیکھتے ہوئے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ تم شیطان کا حصہ بن جاتے اور جو کچھ منافقین چاہتے ہیں ان کے اثرات کو تم بھی قبول کرنے لگتے۔

دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد ایمان میں ثابت قدمی اور اس کے تقاضوں پر عمل یہ اللہ کا وہ فضل و کرم ہے جس کے نتیجے میں ایک مومن میں خاص مزاج پیدا ہوتا ہے کہ شیطان کا کوئی وار بھی اس پر کارگر نہیں ہوتا۔ اس کا ایمان ایک ایسا پیمانۂ فکر بن جاتا ہے جس سے وہ ہر بات کو بڑی آسانی سے اندازہ کر کے جانچ لیتا ہے۔ اور اس کی ایمانی دانش بڑی آسانی سے فیصلہ کر لیتی ہے کہ جو بات بھی جاری کی گئی وہ شیطان کی طرف سے ہے یا اس کی کوئی حقیقت بھی ہے۔ اس مزاج اور اس دانش کا نصیب ہونا اللہ کے رسول کی دعوت کی قبولیت اور پروردگار کے فضل و احسان کا نتیجہ ہے۔ اگر تم اللہ کے رسولؐ کے اتباع میں کامل نہ ہوتے تو یقیناً تمہیں یہ دولت نہ ملتی اور تم اللہ کے فضل و کرم کے مستحق نہ ٹھہرتے اور پھر اس بات کا اندیشہ تھا کہ تم بھی منافقین کی طرح شیطان کے اتباع میں مبتلا ہو جاتے۔ لیکن اب اللہ کے فضل سے منافقین کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہو رہی ہیں۔

Marfat.com

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۗ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝

''اے پیغمبر اللہ کے راستے میں قتال کیجئے۔تم پر اپنی جان کے سوا کسی کی ذمہ داری نہیں اور ابھارو ایمان والوں کو جہاد کے لیے۔عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ روک دے زور ان لوگوں کا جنہوں نے کفر کیا اور اللہ بڑے زور والا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے۔'' (النسآء:۸۴)

دو حقیقتیں

اس آیتِ کریمہ کا اندازِ بیان مختلف حقائق کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن ہم ان میں سے دو کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔

۱۔ اس رکوع کے آغاز میں ہم نے پڑھا ہے کہ منافقین بڑے جوش و جذبے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استدعا کرتے تھے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں قتال کی اجازت دے۔ ہمارے بھائیوں پر کفار بے روک ٹوک مظالم توڑ رہے ہیں۔انہیں اس بات کی بالکل پرواہ نہیں کہ مسلمانوں میں اس کا ردعمل بھی ہو سکتا ہے۔ ہماری عفو و درگزر کی پالیسی نے انہیں بہت دلیر کر دیا ہے۔آخر ان مظالم کو ہم کب تک برداشت کریں گے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تم ابھی اپنے ہاتھوں کو روک کے رکھو البتہ نماز اور زکوٰۃ کی پابندی سے اس جذبے کو پیدا کرنے کی کوشش جاری رکھو جو جذبۂ جہاد و قتال کی روح ہے اور جس جذبے کے بغیر آدمی میدانِ جنگ میں استقامت نہیں دکھا سکتا۔لیکن جب اللہ کی طرف سے جہاد کا حکم آ گیا اور قتال فرض کر دیا گیا تو منافقین پس و پیش کرنے لگے۔ان کے دعوے چونکہ صرف زبانی حد تک تھے اس لیے جب عملی ثبوت کی بات آئی اور قربانی کا وقت آیا تو ان کے نفاق نے ان کا راستہ روک لیا۔مسلمان کسی بھی غزوے کے لیے نکلتے تو منافقین حیلوں بہانوں سے پیچھے رہ جانے کی کوشش کرتے اور ان کی یہ روش نئے نئے مخلص مسلمانوں کے لیے بھی تردد کا باعث بنتی۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فطری طور پر اس صورت حال سے سخت کبیدہ دل گرفتہ اور پریشان ہوتے۔چنانچہ منافقین پر تعریض کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر یہ منافقین قتال کے لیے نکلنے پر آمادہ نہیں تو آپ تنہا نکل کھڑے ہوں۔منافقین کو شاید یہ خیال ہے کہ ان کی شرکت کے بغیر اسلامی جہاد و قتال کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔یہ ان کی خام خیالی ہے۔آپ اللہ کے رسول ہیں۔رسول اور اس کے مخلص ساتھیوں کی پشت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔اس کی تائید و نصرت ان کے ہمرکاب ہوتی ہے اور اللہ کی قدرت ایسی بے پناہ ہے کہ اس سے مقابلہ کرنے کی کسی میں تاب نہیں۔وہ اگر چاہے تو اکیلا ہی ان تمام کفار کا زور توڑ سکتا ہے اور انہیں سخت سزا دے سکتا ہے۔

۲۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ بتانا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی سازشوں اور اسلام کے خلاف ان کی کارروائیوں سے جب قتال مسلمانوں پر فرض ہو جائے تو پھر اس کی اہمیت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اسباب کی فراہمی تک اسے ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔افرادی قوت اگر محدود ہو اور وسائل جنگ بھی نہ ہونے کے برابر ہوں تب بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ کفار سے ٹکرایا جائے اور اللہ کی دی ہوئی حقانیت کو خون دے کر ثابت کر دیا جائے۔یہ صحیح ہے کہ اگر مقابلے کی کوئی صورت بالکل ممکن نہ ہو اور وسائل بے حد محدود ہوں تو عام مسلمانوں پر قتال فرض نہیں ہوتا۔لیکن اللہ کا رسول چونکہ مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ بن کے آیا ہے اس پر یہ بات فرض کر دی گئی ہے کہ وسائل کی کمی قتال کے راستے میں

Marfat.com

حائل نہیں ہونی چاہئے۔ اگر بہ فرضِ محال رسول تنہا بھی ہوں تب بھی ان کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ اللہ کے راستے میں لڑنے کے لیے نکلیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ افرادی قوت کی بے حد کمی اور وسائلِ جنگ ناپید ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور مسلمانوں پر جہاد فرض نہیں فرماتے جس طرح مکی زندگی میں فرض نہیں ہوا۔ لیکن جب جہاد فرض کر دیا جاتا ہے تو پھر رسول کو تنہا بھی نکلنا پڑے تو اسے نکلنے کا مکلف بنایا گیا ہے۔ کیونکہ قوموں کی زندگی میں بڑے بڑے کارنامے اور ایثار و قربانی کی محیر العقول مثالیں اور سیرت و کردار کے درخشاں کردار حقیقی زندگی کا باعث بنتے ہیں۔ جس طرح مینارے کے سر پر چمکتی ہوئی روشنی دور سے نظر آتی ہے اور گم کردہ راہ مسافر اسے دیکھ کر راستے کا تعین کرتے ہیں اسی طرح پیغمبروں اور ان کے متبعین کی درخشاں مثالیں مشعل راہ بنتی ہیں۔

اسی بات کو نمایاں کرنے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سرفروشانہ نعرہ لگوایا گیا اور پھر انہوں نے اسی نعرے کو عملی صورت دینے کے لیے پوری زندگی اس کے مطابق گزاری۔ وہ نعرہ ہے "قل ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی لله رب العٰلمین لا شریک له و بذلک امرت و انا اول المسلمین" (کہہ دیجئے میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین کے لیے ہے اس کا کوئی شریک نہیں مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں) اللہ کی توحید کا داعی اور توحید کا پرستار آغازِ نبوت میں تنہا اللہ کا نبی ہوتا ہے وہ تنہا اپنی ذات میں پورے دین کی تصویر بن کر اس کی نمائندگی کرتا ہے اور اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات کو اپنے جسم و جان پر جھیلتا ہے۔ پھر جیسے جیسے افراد ملتے جاتے ہیں قافلہ بنتا جاتا ہے۔ پھر اس قافلے کے ہر فرد میں یہی روح پیدا کرنے کے لیے انہیں یہ دعا سکھائی جاتی ہے "واجعلنا للمتقین اماما" (الٰہی مجھے متقیوں کا امام بنا) اس راستے پر چلنے والے صاحبِ کردار لوگ جب کبھی کردار کی عظمتوں کا نمونہ تلاش کریں تو وہ میری طرف دیکھیں۔ جب انہیں تقویٰ کی زندگی گزارتے ہوئے مشکلات پریشان کریں تو میرا صبر ان کے لیے راہنما ہو۔ جب کبھی اس راستے میں جان دینے کی بات آئے اور سوچنے والے پس و پیش کرنے لگیں تو میری قربانی ان کے لیے مہمیز بن جائے۔ اس آیتِ کریمہ میں شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ اب چونکہ جہاد فرض ہو چکا قطع نظر اس سے کہ منافقین کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں آپ سب سے پہلے اس راستے میں نکلنے کے مکلف بنائے گئے ہیں۔ جھلستے ہوئے صحرا میں گھٹا جھوم کے اٹھتی ہے لیکن برسنے والا ایک ایک قطرہ صحرا کی گرمی کو دیکھتے ہوئے زمین پر آنے کی جرأت نہیں کرتا۔ لیکن جب ایک قطرہ جرأت کر کے برس جاتا ہے تو پھر موسلا دھار بارش ہوتی ہے۔ بند راستوں کو کھولنے والے اولوالعزم زیادہ نہیں ہوتے۔ لیکن ان کی قربانیاں ان گنت لوگوں کے لیے حوصلے کا سامان بن جاتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی پیغمبر کو ایک بات کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ منافقین کو چھوڑیے آپ کے کام کا دار و مدار ان پر نہیں اللہ کی تائید و نصرت پر ہے۔ البتہ یہ آپ کی ذمہ داری کہ صاحبِ ایمان لوگوں کو اس راستے پر چلنے کے لیے انگیخت کیجئے۔ انہیں ترغیب دیجئے۔ یہ ناممکن ہے کہ آپ کی ترغیب پر وہ آپ کے ساتھ چلنے پر تیار نہ ہوں۔ اسی لیے ایک اور جگہ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ "اے پیغمبر آپ کے لیے اللہ اور مخلص مسلمان کافی ہیں، وہی آپ کا اثاثہ ہیں۔ وہ تھوڑے ہیں یا زیادہ اللہ کی قوت آپ کے ساتھ ہے۔ آپ تھوڑے بھی ہوں گے تو اس کی قوت کافروں کا زور توڑ دے گی" اسی حکم کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تنہا بھی لڑنا پڑے تو اس وقت تک لڑوں گا جب تک میری گردن میرے کندھے سے اتر نہیں جاتی۔ اور آپ کی ترغیب ہی کا اثر تھا کہ صحابہ کی صورت میں ایک ایسی سرفروشوں کی جماعت تیار ہوئی کہ جن سے فدا کار اور سرفروش لوگ چشمِ فلک نے کبھی نہیں دیکھے۔ ہمیں یہاں رک کر تھوڑی سی غور کرنے کی زحمت گوارا کر لینی چاہئے کہ اللہ

Marfat.com

کے لیے حالات کی نامساعدت کی وجہ سے اپنے رسول کو تنہا نکلنے کا حکم دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی جان دینے تک اس فرض کی ادائیگی پر کمر بستہ رہے اور آپ کی ترغیب اور تاکید نے ہی سرفروشوں کا بے مثال قافلہ تیار کیا ہے۔ اور اسی سرفروشی کے نتیجے میں صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اسلام زندہ ہے۔ لیکن آج ہم مغرب اور امریکہ کے زیر اثر اسی جذبۂ بے پناہ اور اسی قطعی فرض کو دہشت گردی کا نام دے کر ذلت کی پستیوں میں اتر جانا چاہتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر نے پہلے ہی خطبے میں ارشاد فرمایا تھا کہ جب تم جہاد چھوڑ دو گے تو ذلیل ہو جاؤ گے۔ آج امت مسلمہ نہ جانے کیوں اپنے ہاتھوں ذلت کا سامان کر رہی ہے اور سمجھتی یہ ہے کہ اس طرح شاید ہماری بقا کا سامان ہو جائے حالانکہ جیسے جیسے یہ جذبہ ہم سے رخصت ہوتا جا رہا ہے ویسے ویسے ہم نہ صرف غیر محفوظ ہوتے جا رہے ہیں بلکہ ہلاکت کی اتھاہ وادیوں میں اترتے چلے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ہمارے دین اور ہماری تاریخ کا فیصلہ بالکل اس کے برعکس ہے۔

جو دیکھی ہسٹری تو دل کو پھر کامل یقیں آیا
جسے مرنا نہیں آیا اسے جینا نہیں آیا

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ○

”جو کسی نیک کام کی سفارش کرے گا اس کے لیے اس میں سے حصہ ہے اور جو کوئی بری بات کی سفارش کرے گا اس کے لیے اس میں سے حصہ ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔“ (النسآء:۸۵)

شفاعت کا معنی و مفہوم

شفاعت کے لفظی معنی ملنے یا ملانے کے ہیں۔ اسی مفہوم سے ترقی کر کے کسی بات کی تائید و حمایت اور کسی غریب اور کمزور کی بے کسی میں اپنی مدد ملا کر اسے قوی کر دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ سیاقِ کلام کو دیکھتے ہوئے یہ مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ کے رسول کی تشریف آوری کے بعد انسان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو اللہ کے رسول پر ایمان لائے اور دوسرے وہ لوگ جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور آپ کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ان کے بس میں تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کی تعداد ابھی چونکہ کم تھی اور اکثر ایمان لانے والے اپنی مالی اور عرفی حیثیت سے بھی نہایت فروتر تھے اس لیے مخالفین کو انہیں ستانے اور اذیت پہنچانے میں کوئی روک نہیں تھی۔ یہاں ان دونوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ دو گروہ تمہارے سامنے ہیں ان میں ایک کمزور ہے ایک طاقتور ہے ایک برسر حق ہے اور دوسرا برسر باطل ہے۔ طاقتور گروہ کمزوروں کو حق پر ہونے کے باوجود اپنی طاقت اور مال و دولت سے کام لے کر مٹا دینا چاہتا ہے۔ جو لوگ ابھی حق و باطل کے اس معرکے میں غیر جانبدار بنے بیٹھے ہیں انہیں اب یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ کس کا ساتھ دیں۔ لیکن ساتھ دینے سے پہلے وہ سوچ لیں کہ ایک طرف حسنہ ہے اور دوسری طرف سیئہ ہے۔ یعنی ایک طرف اچھائی، نیکی اور حق ہے اور دوسری طرف برائی اور باطل ہے۔ وہ جس کا بھی ساتھ دیں گے اور جس کی بھی تائید کریں گے ان کا شمار اسی گروہ میں ہو گا۔ اگر وہ حق کی تائید کرتے ہیں اور برسر حق گروہ میں شامل ہو کر اس کی قوت میں اضافہ کرتے ہیں تو انہیں حق کی تائید و نصرت کرنے کا ثواب ملے گا اور برسر

Marfat.com

حق گروہ کے لیے اللہ نے جو انعامات اور درجات رکھے ہیں یہ ان میں برابر کے شریک ہونگے۔ لیکن اگر یہ اس گروہ میں شامل ہونے یا اس کی تائید کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں جو خیر کی ہر قوت کے خلاف اور برائی کی نمائندگی کر رہے ہیں تو پھر جس قدر ان کی تائید کریں گے اور ان کی قوت کا سامان بنیں گے اسی قدر ان کے اعمال میں ان کا حصہ ہوگا اور جب اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال کی سزا دے گا تو یہ اس سزا میں بھی برابر کے حصہ دار ہوں گے۔ رہی یہ بات کہ اس وقت حق کی قوت کمزور اور برسر باطل گروہ مضبوط ہے اس لیے شائد وہ ہر طرح کی سزا سے بچ جائیں۔ یہ غلط فہمی ہے جس سے انہیں نکل جانا چاہیے۔ اللہ کی ذات ہمہ مقتدر ہے۔ اس کی قوتوں کا کوئی اندازہ نہیں۔ وہ جب سزا دینے پہ آتا ہے تو اس کی سزا سے بچنے کے لیے کوئی جائے امان نہیں ہوتی۔ یہ تو وہ مفہوم ہے جس کی طرف سیاقِ کلام ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس میں منافقین کو سوچنے کی دعوت دی گئی ہے کہ تم اپنے طرزِ عمل پر غور کرو اور سوچو کہ تم کس گروہ کے لیے تائید و قوت کا سامان بنے ہوئے ہو۔ اسی کے مطابق تمہارا انجام ہوگا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم کی ہر آیتِ کریمہ اپنی ذات میں ایک مکمل اور علیحدہ حیثیت بھی رکھتی ہے۔

سفارش کا صحیح مفہوم

اس لحاظ سے یہاں شفاعت سے وہ سفارش بھی مراد لی جاسکتی ہے جس کا چلن اور رواج ہر دور اور ہر معاشرے میں رہا ہے اور جس کا ذکر احادیث میں بھی موجود ہے۔ صحیح بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد منقول ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا اشفعوا فلتوجروا و یقضی الله علی لسان نبیه ما شآء (تم سفارش کیا کرو تمہیں ثواب ملے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے ذریعے جو فیصلے فرمائے اس پر راضی رہو) اس حدیث پاک میں شفاعت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں چونکہ شفاعت یا سفارش کا غلط مفہوم لے لیا گیا ہے اور اس کا غلط استعمال ہو رہا ہے اس لیے کسی بھی شریف آدمی سے سفارش کے لیے کہا جائے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ مجھے ایک بری بات کی طرف بلایا جا رہا ہے۔ حالانکہ شفاعت یا سفارش کا مفہوم یہ ہے کہ ایک آدمی اپنا حق حاصل کرنے کے لیے حق دینے والے تک پہنچنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ دوسرا آدمی اس کی مدد کرتے ہوئے اس کی بات متعلقہ افسر یا اتھارٹی تک پہنچا دیتا ہے اور ساتھ ہی اس کے کلمہ خیر بھی کہتا ہے۔ یہ وہ سفارش ہے جس کی شریعت اجازت بھی دیتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم بھی دیا ہے۔ اس کی حیثیت بھلائی کے کام پر دلالت کرنے کی ہے۔ یعنی ایک کمزور آدمی جو اپنی بات سمجھا نہیں سکتا یا اسے متعلقہ دفتر تک پہنچا نہیں سکتا آپ نے اس کی بات یا اس کی درخواست متعلقہ دفتر پہنچا دی اور فیصلہ کرنے والی شخصیات کو آپ نے مناسب معلومات بھی پہنچا دیں تو آپ نے ایک نیکی پر رہنمائی کی ہے' ایک کمزور آدمی کی مدد کی ہے اور فیصلہ کرنے والوں کو فیصلہ کرنے میں آسانی پیدا کی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے اس عمل پر اجر و ثواب سے نوازے گا۔ البتہ سفارش کے لیے چند شرائط ہیں:

۱۔ سفارش کرنے والے کو سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ جس بات کی سفارش کر رہا ہے کیا وہ بات صحیح ہے' وہ واقعی مانگنے والے کا حق ہے اور اس سے کسی دوسرے کے حق کو نقصان تو نہیں پہنچے گا۔

۲۔ اسے سفارش کرتے ہوئے صرف حقیقت بیان کرنے تک محدود رہنا چاہیے۔ حقدار کے حق کو اپنی معلومات کی حد تک ثابت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن اس کے بعد وہ اس معاملے کو فیصلہ کرنے والوں پر چھوڑ دے۔ ان پر دباؤ نہ ڈالے۔ وہ اگر دیانت داری سے فیصلہ اس کے خلاف کر دیں تو اپنے دل میں ان کے لیے ناراضگی پیدا نہ ہونے دے اور اسے اپنی انا کا مسئلہ بناتے ہوئے ان کی مخالفت کرے

Marfat.com

نہ شروع کردے۔ اس سے پہلے ہم نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا کہ تم میرے پاس لوگوں کی سفارش کروتا کہ معاملے کو سمجھنے میں مجھے مدد ملے۔ معاملے کی وضاحت کے بعد پھر تم اس بات پر اصرار نہ کرو کہ فیصلہ تمہاری رائے کے مطابق ہونا چاہیے۔ ممکن ہے تم جس چیز کو حق سمجھ رہے ہو فیصلہ کرنے والوں کے ذرائع کے مطابق وہ حق نہ ہو۔ اس لیے فیصلہ کرنے والوں کو فی الجملہ آزادی ملنی چاہیے۔ ہر فیصلہ کرنے والا اپنی جگہ ایک عدالت کا فرض انجام دیتا ہے اور عدالت پر دباؤ ڈالنا اور اپنے اثر و اختیار کا استعمال کرنا ہر قانون میں جرم ہے اور اسلام تو اس کی شدید مذمت کرتا ہے۔

۳۔ سفارش کرنے والا اپنی سفارش کی قیمت وصول نہ کرے۔ بلکہ وہ یہ سمجھ کر سفارش کرے کہ میں ایک نیکی کا کام کر رہا ہوں اور ایک فرض انجام دے رہا ہوں۔ مجھے معاوضہ اپنے اللہ سے لینا ہے اور اس کا وعدہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ”کان اللہ فی عون عبدہ ما دام فی عون اخیہ“ (اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بندے کی امداد میں لگا رہتا ہے جب تک وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کی امداد میں لگا رہے) اس لیے کوئی آدمی اگر معاوضہ لے کر سفارش کرتا ہے تو یہ رشوت ہے جو اسلامی نقطہ نگاہ سے بہت بڑا جرم ہے۔ جس کے لینے اور دینے والے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنمی کہا ہے۔ اور اگر وہ سفارش محض اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایسے شخص کو ڈھیروں انعامات سے نوازے گا۔ اسلام میں کمزور اور نادار انسانوں کی مدد کے لیے ہر طرح کی شفاعت اور ہر طرح کی مدد و تائید کا حکم دیا گیا ہے اور اسے بہت بڑی نیکی قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اعتکاف میں تھے۔ ایک صاحب نے آکر کہا کہ مجھے فلاں شخص کا قرض دینا ہے۔ قرض کی تاریخ قریب آگئی ہے لیکن میری مالی حالت ایسی نہیں کہ میں قرض ادا کر سکوں۔ آپ اگر انہیں کہہ دیں تو یقیناً قرض کی مہلت میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ اس طرح میں ایک بڑی مشکل سے نجات پا جاؤں گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اسی وقت اس کے ساتھ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس شخص نے عرض کیا کہ حضرت آپؓ تو اعتکاف میں ہیں۔ آپ مسجد سے باہر نہیں نکل سکتے۔ آپؓ کس طرح میرے ساتھ جائیں گے۔ تو آپؓ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے فرمایا کہ اعتکاف کی قضا ممکن ہے زندگی رہی تو اگلے سال انشاء اللہ اس اعتکاف کی قضا کروں گا لیکن تیرے کام کی قضا ممکن نہیں۔ تیری پریشانی کا تقاضا یہ ہے کہ میں اعتکاف توڑ کر تیرے ساتھ جاؤں۔ چنانچہ آپؓ اس کے ساتھ چلے گئے۔ اسی طرح برائی اور ظلم کے حق میں سفارش بدترین گناہ ہے اور اسی کو شفاعت سیئہ کہا گیا ہے۔ جس طرح شفاعت حسنہ پر عظیم اجر و ثواب کی امید ہے اسی طرح شفاعت سیئہ پر بڑی سخت تہدید بھی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”من اعان علی قتل مومن بشطر کلمۃ القیٰ اللہ مکتوب بین عینیہ ائس من رحمۃ اللہ“ (جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل میں ایک کلمہ سے بھی مدد کی تو وہ قیامت میں حق تعالیٰ کی پیشی میں اس طرح لایا جائے گا کہ اس کی پیشانی پر یہ لکھا ہوگا کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم اور مایوس ہے)

عملی سفارش تو ایک بڑی نیکی ہے ہی' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا کہ کسی مسلمان کی حاجت روائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا بھی شفاعت حسنہ میں داخل ہے اور دعا کرنے والے کو بھی اجر ملتا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ”جب کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے لیے کوئی دعائے خیر کرتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے ”ولک بمثل“ (یعنی اللہ تعالیٰ تیری بھی حاجت پوری فرمائے)

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ○

Marfat.com

(اور جب تمہیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعا دو یا اسی کو لوٹا دو۔
اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے) (النسآء:۸۶)

''تحیۃ'' باب تفعیل کا مصدر ہے۔ اس کا اصل معنی ''کسی کو زندگی کی دعا دینا'' ہے۔ ''حَیَّاکَ اللّٰہُ'' کا دعائیہ کلمہ اسی سے بنا ہے جس کا معنی ہے ''اللہ تمہیں زندہ رکھے'' یا ''اللہ تمہاری عمر دراز کرے''۔

سلام کے حکم کا پس منظر

گزشتہ رکوع میں ہم نے پڑھا ہے کہ منافقین کی مختلف عادات وخصوصیات کو بیان کرنے اور مسلمانوں کے خلاف ان کی در پردہ سازشوں کو بے نقاب کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ آپ ان کی سازشوں کی پرواہ نہ کریں' البتہ ان سے اعراض کا رویہ اختیار کریں۔ آپ کا بھروسہ اللہ پر ہونا چاہیے۔ وہی آپ کا کارساز ہے' اس کی تائید ونصرت اگر میسر ہے تو پھر یہ منافقین آپ کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ اس لیے ان کی مخالفت سے آپ نہ اثر قبول کریں اور نہ ابھی ان کے خلاف کوئی اقدام کریں' البتہ وہ شفقت اور توجہ جس کی پھوار ہر ایک پر برستی رہتی ہے اس میں آپ کمی فرما دیں اور ان سے اعراض اور بے نیازی کا رویہ اختیار کریں تاکہ ان کو اندازہ ہو جائے کہ آپ ان کی سازشوں اور شرارتوں سے بے خبر نہیں ہیں۔

مسلمان چونکہ ہر معاملے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے تھے اور آپ کی ایک ایک بات اور ایک ایک ادا پر ان کی نظر رہتی تھی۔ وہ جیسے ہی منافقین سے آپ کو اعراض کرتے ہوئے دیکھیں گے تو انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ آپ یقیناً ان سے ناراض ہیں اور آپ کی ناراضگی کسی سے بھی اپنی ذات کی وجہ سے تو نہیں ہوتی بلکہ اس کا سبب غیرتِ دینی یا اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی یقیناً اس بات کا خطرہ تھا کہ مسلمان بھی منافقین سے اپنا رویہ بدل لیں اور جو لوگ مسلمانوں میں زیادہ پُرجوش ہیں وہ ہو سکتا ہے منافقین کے خلاف کوئی اقدام کر ڈالیں۔ ابھی حالات اس سطح تک نہیں پہنچے تھے کہ منافقین کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ کے ذریعے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی کہ منافقین کا طرزِ عمل کچھ بھی ہو تمہیں بہرحال اپنے طرزِ عمل میں سختی یا بیگانگی پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ تمہاری حیثیت ایک داعی اور مبلغ کی ہے۔ دوسروں کی طرف سے اگر تمہیں تلخیاں بھی ملیں تو تمہیں اس کا جواب تلخی سے نہیں دینا چاہیے۔ اس سے معاملات ہمیشہ بگڑتے ہیں سدھرتے نہیں۔ اس لیے جب تم یہ دیکھو کہ کوئی تمہیں احترام کے ساتھ دعا دے رہا ہے تو تم بھی اس کی دعا کا جواب دعا سے دو۔ بلکہ تمہاری دعا میں اس کے لیے زیادہ محبت کا اظہار ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہ کر سکو تو اسی کے دعائیہ کلمات کو دہرا دو۔

سلام مسلمان کی شناخت

اس آیتِ کریمہ میں بظاہر یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر تمہیں کوئی دعائیہ کلمات سے سلام کرتا ہے تو تمہیں بھی ایسے ہی دعائیہ کلمات سے جواب دینا چاہیے۔ اور اس کی ضرورت اس وقت کے تلخ حالات میں مسلمانوں کو تلخی کا رویہ پیدا کرنے سے روکنا تھا۔ لیکن جمہور مفسرین کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے کہ اس وقت اس کی ضرورت اس لیے پیدا ہوئی' لیکن درحقیقت یہ آیتِ کریمہ بنیاد ہے اس طریقِ سلام کی جسے اسلام نے مسلمانوں میں رواج دیا اور جو مسلمانوں کی قومی اور ملی شناخت کا ذریعہ بن گیا۔

Marfat.com

دنیا میں بسنے والی تمام قوموں میں اس بات کا احساس پایا جاتا ہے کہ ان کی قوم کے دو افراد بھی جب آپس میں ملیں تو باہمی تعارف، شناخت اور اعتماد کا کوئی ایسا ذریعہ ہونا چاہئے جس سے بیگانگی دور کرنے میں مدد ملے۔ چنانچہ مختلف قوموں نے اپنے اپنے طریقے کے مطابق کچھ الفاظ اختیار کر رکھے ہیں۔ مثلاً دو انگریز جب آپس میں ملتے ہیں تو وقت کے حوالے سے ایک دوسرے کو دعا دیتے ہیں۔ صبح کو Good Morning کہیں گے دوپہر کو Good Noon سہ پہر کو Good Afternoon شام کو Good Evening اور رات کو Good Night۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت کے بدلنے سے ان کا دعائیہ کلمہ بھی بدل جاتا ہے۔ یہی حال عربوں کا بھی تھا۔ وہ عام طور پر دعائیہ کلمہ ''حَیَّاکَ اللّٰہ'' سلام کے طور پر استعمال کرتے۔ کبھی ''اَنْعَمَ اللّٰہُ بِکَ عَیْنًا'' کہتے۔ کبھی ''انعم صباحا'' کہتے اور کبھی ''انعم مسـاء''۔ یعنی ان کے سلام بھی صبح و شام کے فرق سے بدلتے رہتے۔ ہندوؤں میں آپ دیکھیں گے ان کے عام لوگ ''نمستے'' کہتے ہیں اور ان کے زیادہ مذہبی لوگ دوسرے سے ملتے ہوئے ''رام رام'' کہتے ہیں۔ ان مثالوں میں آپ نے دیکھا کہ ہر قوم نے باہمی تعارف اور آپس میں موانست کے اظہار کے لیے سلام کے کچھ طریقے مقرر کر رکھے ہیں۔ جن میں دو چیزیں بڑی نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ باہمی ملاقات کے وقت وہ ایک دوسرے کو دعا دیتے ہیں۔ لیکن یہ دعا وقت کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ اس لیے وقت بدلنے سے دعا بھی بدل جاتی ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ بعض قوموں نے اسے اپنے مذہب کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لیے وہ ملاقات کے وقت اپنے مذہب کی کسی بنیادی بات کا حوالہ دیتے ہیں۔ جس سے تعارف یا موانست میں شاید کوئی مدد ملتی ہے یا نہیں ملتی البتہ مذہب کا اظہار ضرور ہو جاتا ہے۔ لیکن اسلام نے سلام کے جس طریقے کو متعارف کرایا اور مسلمانوں پر اسے لازم کیا وہ صرف ملاقات کا ہی ذریعہ نہیں بلکہ اس میں اتنی وسعت اور جامعیت پائی جاتی ہے کہ جس کا عام قوموں میں دور دور تک تصور نہیں پایا جاتا۔ اس میں بیک وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے' تذکیر بھی' مسلمان بھائی سے اظہارِ تعلق بھی ہے اور اس کے لیے دعا اور ضمانت بھی۔ ان تمام حوالوں سے جب ہم سلام کو دیکھتے ہیں تو اس کی جامعیت کو دیکھتے ہوئے حیرت ہونے لگتی ہے۔ اب ہم اس کی وضاحت کے لیے چند باتیں عرض کرتے ہیں۔

سلام کا مفہوم اور اس کی جامعیت

۱۔ سلام اسمائے حسنٰی میں سے ہے۔ جب آدمی کسی کو سلام کہتا ہے تو وہ گویا السلام کا لفظ بول کر اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ اور اگر وہ اس کی معنویت پر غور کرے تو اس کے احساس میں مزید وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ کا ذکر آدمی میں تذکیر کا کام بھی کرتا ہے۔ یعنی اسے یاد دلاتا ہے کہ تم اللہ کے بندے ہو خود رَو یا آزاد مخلوق نہیں ہو۔ اللہ کی طرف سے جس طرح تم پر اس کے حقوق عائد کیے گئے ہیں اسی طرح بندوں کے حقوق بھی عائد کیے گئے ہیں دیکھو اللہ کا نام لے کر جب تم کسی بندے سے ہمکلام ہوتے ہو تو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو مجروح نہ ہونے دینا۔ اور مزید یہ کہ تم اس کی معنویت پر غور کرو تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ تم نے السلام کا لفظ بول کر کتنی بڑی ذمہ داری قبول کی ہے۔ ابن العربی نے احکام القرآن میں ذکر کیا ہے کہ ''السلام علیکم کے معنی ہیں ''اللہ رقیب علیکم'' (اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ہے) جب تم نے اسے اللہ کے محافظ ہونے کی خبر دی تو پھر اگر تمہاری طرف سے اسے کوئی بھی نقصان پہنچا یا تمہاری نیت میں اس کے حوالے سے کوئی بھی فساد پیدا ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے اللہ کی حفاظت کو چیلنج کیا ہے۔ اس صورت میں یہ معاملہ تمہارے اور دوسرے آدمی کے درمیان نہیں رہے گا بلکہ تمہارے اور اللہ کے درمیان ہوگا۔ تم جیسے جیسے اس کی حفاظت کے حصار کو توڑو گے ویسے ویسے تم خود غیر محفوظ ہوتے جاؤ گے۔ اس لحاظ سے آپ دیکھیں کہ السلام

Marfat.com

علیکم کہہ کر آدمی کتنی بڑی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ ایک طرف اللہ کو یاد کرتا ہے اور دوسری طرف اس کے حوالے سے اپنے ملنے والے کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کی تعریف یہ فرمائی ''المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ'' (مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں) ابن العربی نے احکام القرآن میں امام ابن عیینہ کا یہ قول نقل کیا ہے ''اتدری ماالسلام؟ یقول انت آمن منی'' (تم جانتے ہو کہ سلام کیا چیز ہے؟ سلام کہنے والا یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے مامون ہو) یعنی میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ میری طرف سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بلکہ حتیٰ المقدور میں تمہاری حفاظت کروں گا۔

۲۔ سلام دو مسلمانوں کے درمیان اظہارِ تعارف بھی ہے۔ جب ایک مسلمان دوسرے کو السلام علیکم کہتا ہے تو وہ دراصل ایک علامت کا اظہار کرتا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں اور میرا تعلق امت مسلمہ سے ہے۔ اور جب دوسرا مسلمان وعلیکم السلام کہتا ہے تو وہ درحقیقت اس کے سلام کو قبول کر کے اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کرتا ہے اور اس طرح سے دونوں یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم دونوں ایک ہی امت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارا خدا' ہمارا رسول اور ہمارا دین ایک ہے۔ ہمارے حسن و قبح کے معیارات ایک ہیں۔ ہمارے تحفظات یکساں ہیں۔ ہمارے مقاصد میں ہم آہنگی ہے۔ ہماری اجتماعی مصلحتیں یکساں ہیں۔ اس ایک لفظ سے یکسانیت اور وحدت کے تمام حوالے ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں ان دونوں کے درمیان سے اجنبیت کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں۔ وہ دشمن کے دیس میں ہوں تو محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں ایک محفوظ پناہ مل گئی ہے۔ اور اگر اپنوں میں ہوں تو محبت کا زمزم بہنے لگتا ہے۔

۳۔ السلام کا لفظ دعا بھی ہے۔ اور اس دعا میں بڑی وسعت ہے۔ جب ایک آدمی دوسرے کو سلام کہتا ہے تو وہ اس کے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی کی دعا مانگتا ہے۔ اسے دنیا میں ہر دکھ اور ہر تکلیف سے محفوظ دیکھنا چاہتا ہے۔ اور آخرت میں اسے جہنم کے عذاب سے بچانا چاہتا ہے۔ اس کی دعا صبح و شام میں محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ پوری زندگی پر محیط ہوتی ہے۔ اور پھر دنیا سے آگے بڑھ کر آخرت کی بھلائیوں تک دراز ہو جاتی ہے۔ انہی تینوں حوالوں سے پروردگار نے سلام کو مسلمانوں کے لیے نہ صرف علامت بنایا' بلکہ اس کو عبادت کا درجہ بھی دیا اور اسی کو ایک دوسرے کی حفاظت کی ضمانت بنا دیا اور اس کے عام کرنے اور اس کو رواج دینے کے لیے اس کی انتہائی تاکید فرمائی اور فضائل بیان فرمائے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک مومن نہ ہو اور تمہارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ میں تم کو ایسی چیز بتاتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کر لو تو تم میں آپس میں محبت قائم ہو جائے گی۔ وہ یہ ہے کہ آپس میں سلام عام کرو' ہر مسلمان کو سلام کرو خواہ اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو۔''

سلام کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے اس پر نیکیوں کی عطاو بخشش کا ذکر بھی فرمایا۔ آپ کا ارشاد ہے ''عن ابی امامۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ان اولیٰ الناس باللہ من بدأ بالسلام'' (حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں میں اللہ کے قرب اور اس کی رحمت کا زیادہ مستحق وہ بندہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے)

ایک دوسری حدیث میں جو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''البادیٔ بالسلام بریٔ الکبر'' (سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے بری ہے)

Marfat.com

سلام کو مزید موثر بنانے اور مسلمانوں کو رحمتوں سے نوازنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں مزید دعاؤں کا اضافہ فرمایا اور اس پر مزید اجر وثواب کی امید دلائی۔ اور آپؐ نے اپنے عمل سے مسلمانوں کے دل و دماغ میں اسے راسخ فرمایا۔ عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا "السلام علیکم" آپؐ نے اس کے سلام کا جواب دیا پھر وہ مجلس میں بیٹھ گیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا "دس" (یعنی اس بندے کے لیے اس کے سلام کی وجہ سے دس نیکیاں لکھی گئیں) پھر ایک اور آدمی آیا اس نے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" آپؐ نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ پھر وہ آدمی بیٹھ گیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا "بیس" (یعنی اس کے لیے بیس نیکیاں لکھی گئیں) پھر ایک تیسرا آدمی آیا اس نے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ" آپؐ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور وہ مجلس میں بیٹھ گیا تو آپؐ نے فرمایا "تیس" (یعنی اس کے لیے تیس نیکیاں ثابت ہوگئیں) اندازہ فرمایئے کہ جیسے جیسے ایک آدمی اپنے دوسرے بھائی کے لیے دعاؤں میں اضافہ کرتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی اپنی نیکیوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اسی تاکید وترغیب کا نتیجہ تھا کہ صحابہ میں سلام صرف ایک علامت بن کر نہیں رہ گیا تھا بلکہ وہ اسے نیکیوں کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر زیادہ سے زیادہ سلام کہتے اور سلام سنتے تھے۔" امام مالکؒ نے ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے طفیل کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ان کا طریقہ تھا کہ وہ ہمیں ساتھ لے کر بازار جاتے تھے۔ اور جس دکان اور جس کباڑیے اور جس فقیر ومسکین کے پاس سے گزرتے اس کو بس سلام کرتے اور کچھ خرید وفروخت کیے بغیر واپس آجاتے۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو معمول کے مطابق مجھے ساتھ لیکر بازار جانے لگے تو میں نے عرض کیا کہ آپ بازار جا کر کیا کریں گے؟ نہ تو آپ کسی دکان پر کھڑے ہوتے ہیں نہ کسی چیز کا سودا کرتے ہیں' نہ بھاؤ ہی کی بات کرتے ہیں اور بازار کی مجلسوں میں بھی نہیں بیٹھتے (پھر آپ بازار کس لیے جاتے ہیں؟) یہیں بیٹھے باتیں ہوں اور ہم استفادہ کریں۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ہم تو صرف اس غرض اور اس نیت سے بازار جاتے ہیں کہ جو سامنے پڑے اس کو سلام کریں (اور ہر سلام پر کم از کم دس نیکیاں کما کر اللہ کی رحمتیں اور بندگانِ خدا کے جوابی سلاموں کی برکتیں حاصل کریں)

یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ متذکرہ بالا حدیث میں آپ نے دیکھا کہ دعاؤں کے اضافے سے اجر وثواب میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ لیکن ان دعاؤں میں اضافہ صرف تین کی حد تک محدود ہے یعنی وبرکاتہٗ تک۔ مزید اضافے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے عمل سے مزید اس کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ جب کسی نے ان کے سامنے تین دعاؤں پر اضافہ کرنے کی کوشش کی تو آپؓ نے فرمایا "ان السلام قد انتھی من البرکۃ" (سلام لفظ برکۃ پر ختم ہوجاتا ہے اس سے زیادہ کہنا مسنون نہیں) سلام کا موقع بجائے خود اس کا تقاضا کرتا ہے کہ سلام مختصر ہونا چاہیے۔ اس میں اتنی زیادتی مناسب نہیں جو کسی کام میں مخل ہو یا سننے والے پر بوجھ بن جائے۔

جس طرح ملاقات کے وقت سلام کہنا سنت اور اس کا جواب دینا واجب ہے اور یہ مسلمانوں کے طرزِ معاشرت اور ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے اسی طرح سلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دوسرے مواقع کے لیے بھی مسنون بنایا ہے۔ اب ہم ایک ترتیب سے ان مواقع کا ذکر کرتے ہیں:

Marfat.com

سلام ملاقات کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے بھی

ا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "یا بنی اذا دخلت علی اھلک فسلم یکون برکۃ علیک و علی اھل بیتک" (بیٹا جب تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ تو سلام کرو یہ تمہارے لیے باعث برکت ہوگا اور تمہارے گھر والوں کے لیے) ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب گھر سے جانے لگو تو سلام کر کے نکلو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر میں داخل ہونے کے آداب میں یہ بھی ایک ادب ہے کہ اہل خانہ کو سلام کرو۔ اور بعض احادیث سے ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلام کہنے اور دعا کرنے سے گھر بہت سی آفات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور جنات اس گھر میں بسیرا نہیں کر سکتے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت بھی فرمائی کہ جب کسی سے ملاقات کے لیے اس کے گھر یا کسی مجلس میں جانا پڑے تو پہلے سلام کہو اور اجازت مانگو۔ سلام اور اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہونا یا مجلس میں جا کر بیٹھ جانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے آداب کے خلاف ہے۔ کوئی آدمی چاہے گھر میں اکیلا رہتا ہو بغیر سلام اور اجازت کے گھر میں داخل ہونا اس کے لیے اذیت کا باعث ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ اس وقت مناسب حالت میں نہ ہو یا اس کی مصروفیت ملنے کی اجازت نہ دیتی ہو۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استیذان کی پابندی کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ "تین دفعہ سلام کرو اگر جواب نہ آئے تو واپس پلٹ جاؤ اور برا نہ مانو۔" اور یہ سلام کہنا اور اجازت طلب کرنا بعض مواقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نہایت تاکید فرمائی ہے اور جب کسی نے اس میں تساہل برتا تو آپ نے اسے باہر بھیج دیا کہ دوبارہ اجازت لے کر اندر آؤ۔ فتح مکہ کے بعد حضور وادی مکہ کے بالائی حصے میں ٹھہرے ہوئے تھے کلدہ بن حنبل کہتے ہیں کہ میں صفوان بن امیہ کی جانب سے چند تحائف لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں سلام کہے اور اجازت لیے بغیر اندر داخل ہو گیا اور آپ کے پاس پہنچ گیا۔ آپ نے فرمایا تم واپس جاؤ اور قاعدہ کے مطابق "السلام علیکم أ أدخل" کہہ کے اجازت مانگو۔ کلدہ چونکہ ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے انہیں ان آداب سے آگاہی نہیں تھی اس لیے وہ حسب سابق اجازت طلب کیے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے لیکن آپ نے انہیں باہر بھیج دیا اور سلام اور اجازت کے بعد اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔ اسی مضمون کی اور بھی متعدد احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے سلام کہنا اور اجازت طلب کرنا مسلمانوں کی ثقافت کے بنیادی عناصر میں سے تھا اور جب کسی نے اس پر عمل میں کوتاہی کی تو آپ نے اس پر تنبیہ فرمائی۔ لیکن آج یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مسلمان معاشرے میں نیچے سے لے کر اوپر تک ان آداب سے لاپرواہی برتی جاتی ہے۔

سلام کے لیے کچھ ضوابط

۳۔ سلام کہنے کے کچھ آداب اور ضابطے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سلام صرف ملاقات کا ذریعہ ہی نہیں، بلکہ تربیت کا ذریعہ بھی ہے۔ انسان کی بہت بڑی کمزوری جو اسے بہت سی نیکیوں سے محروم کر دیتی ہے وہ "انا" ہے۔ جیسے ہی طبیعت میں غرور اور نخوت کا فساد پیدا ہوتا ہے انسانیت کا احترام، انسانی اقدار کا احترام، اخلاق حمیدہ کا احترام اور ہمدردی، خیر خواہی، محبت اور مودت کے جذبات سلب ہونے لگتے ہیں۔ آدمی اپنے ذات کے گنبد میں اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ

Marfat.com

نے فرمایا ''جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا۔'' ہر مسلمان کو سلام کہنا اور پھر سلام میں پہل کرنا تکبر کی لعنت کو ختم کر دیتا ہے۔ اس لیے آپؐ نے سلام کے آداب میں یہ بات شامل فرمائی کہ چھوٹا بڑے کو سلام کہے۔ کیونکہ یہ احترام اور اخلاق کا تقاضا ہے۔ اور جب چھوٹا بڑے کو سلام نہیں کہتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں غیر معمولی تکبر داخل ہو گیا ہے۔ مزید فرمایا کہ گزرنے والا بیٹھنے والے کو سلام کرے۔ تاکہ وہ فٹ پاتھوں پر بیٹھنے والوں کو حقیر نہ سمجھے۔ سواری پر سوار پیدل چلنے والے کو سلام کہے بشرطیکہ سواری ایسی ہو جس سے سلام کہا جا سکتا ہو۔ اس سے سوار اور سواری سے محروم لوگوں میں فرق ختم ہو جاتا ہے۔ تحقیر کے جذبات بھی مٹ جاتے ہیں اور حسد کو بھی اپنی جگہ بنانے کا موقع نہیں ملتا۔ اسی طرح چھوٹی جماعت بڑی جماعت والوں کو سلام کرے۔ کیونکہ تھوڑے لوگوں کو بڑے لوگوں کی نسبت سلام کرنے میں آسانی ہے۔

انہی آداب میں یہ بھی واضح فرمایا کہ سلام کہنا ایک بہت بڑی نیکی ہے لیکن بعض حالتیں ایسی ہوتی ہیں جس میں سلام کہنا مناسب نہیں ہوتا۔ تو ایسے وقت میں سلام کہنے کی اجازت نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص اگر پیشاب یا استنجا کر رہا ہو تو اسے سلام نہیں کہنا چاہئے۔ اور اگر کوئی یہ غلطی کر گزرے تو پیشاب کرنے والے کے لیے اجازت نہیں کہ وہ اس کا جواب دے۔ کیونکہ سلام اللہ کے ناموں میں سے ایک ہے' اسے کسی ایسی جگہ استعمال کرنا جو احترام یا پاکیزگی کی جگہ نہیں وہ اس کی توہین کرنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح سونے والے کو سلام نہیں کہنا چاہئے تاکہ اس کی نیند نہ کھلے۔ اور اگر وہاں کچھ بیدار لوگ بھی بیٹھے ہیں تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ اس طرح ہلکی آواز میں سلام کہا جائے کہ جاگنے والے سن لیں اور سونے والے کی نیند خراب نہ ہو۔ کسی نماز پڑھتے ہوئے آدمی کو سلام نہ کہا جائے۔ اور اگر کوئی دوسرے لوگ پاس بیٹھے ہوں تو نہایت ہلکی آواز میں سلام کہا جائے۔ کسی اسلامی موضوع پر کوئی درس یا تقریر ہو رہی ہو تو سلام کہنا مناسب نہیں۔ کوئی قرآنِ کریم پڑھ رہا ہو تو سلام کہا جا سکتا ہے اور پڑھنے والا جواب بھی دے سکتا ہے لیکن اگر وہ قرآنِ پاک میں تدبر اور تفکر میں مستغرق ہو تو پھر اسے ہرگز سلام نہیں کہنا چاہئے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص لائبریری میں جائے تو ہلکی آواز میں سلام کہے جس سے پڑھنے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ مختصر یہ کہ عبادت یا تعلیم میں مصروف یا نیند اور آرام میں مستغرق یا کسی اور اچھی مصروفیت میں کھو جانے والوں کو سلام کے ذریعے سے پریشان کرنے سے روکا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر میں داخل ہوتے اور اگر آپ کی زوجہ محترمہ سو رہی ہوتیں تو آپؐ نہایت ہلکی آواز میں سلام کہتے تاکہ سلام سے گھر میں برکت تو پیدا ہو لیکن سونے والوں کی نیند نہ کھلے۔

حاصلِ کلام یہ کہ سلام مسلمانوں کی پہچان' باہمی محبت اور موانست کا ذریعہ' مسلمان بھائی کی دوسرے بھائی کے لیے دعا اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے درمیان ہم آہنگی کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس نے مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی تکمیل اگرچہ مصافحہ سے ہوتی ہے اور اس میں مزید گہرائی بعض مواقع پر معانقہ اور تقبیل سے وجود میں آتی ہے۔ لیکن ہم اس کی تفصیلات عرض کرنے سے قاصر ہیں ورنہ یہ بحث بہت دور تک پھیل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ؕ لَیَجْمَعَنَّکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ لَا رَیْبَ فِیْہِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا ۝

''اللہ ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تم سب کو قیامت کے دن کی طرف لیجا کے رہے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ اور اللہ سے بڑھ کر سچی بات کہنے والا کون ہو سکتا ہے۔'' (النسآء:۸۷)

Marfat.com

منافقین کے نفاق کا اصل سبب

مسلمانوں کو گزشتہ آیتِ کریمہ میں منافقین سے ترکِ تعلق سے روکا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جس طرح پہلے ان سے محبت سے پیش آتے تھے اسی محبت کو باقی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمان آہستہ آہستہ قرآنِ کریم کے اسلوبِ بیان اور منافقین پر تنقید سے منافقین کے رویے کا گہری نظروں سے جائزہ لینے لگے تھے۔ مخلصین کے گروہ میں اگر کوئی غیر مخلص آدمی چھپا بیٹھا ہو اور مخلصین کو اس پر شبہ ہونے لگے تو یقیناً ان کا اس کے ساتھ میل جول اور تعلق کی نوعیت میں فرق آ جاتا ہے۔ موجودہ صورتِ حال میں مسلمان بھی اسی کیفیت سے دوچار تھے۔ قرآنِ کریم نے ان کے ساتھ سلام کا حکم دے کر انہیں اپنے رویے میں تبدیلی لانے سے روکا اور اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو ایک بہت اہم حقیقت کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے کہ مقصود منافقین کو اپنے سے کاٹنا نہیں بلکہ اصلاح ہے۔ اور اصلاح تمہارے طرزِ عمل میں تبدیلی سے نہیں ہوگی بلکہ اس سے ہوگی کہ جو سبب ان کے بگاڑ کا ہے اسے دور کرنے پر پوری توجہ دو۔ وہ سبب یہ ہے کہ منافقین جو اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر یکسو نہیں ہو رہے اور ان کے معمولات میں بعض دفعہ نفاق جھلکنے لگتا ہے اور وہ بہانے بہانے سے جہاد و قتال سے بچ نکلنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے اندر ابھی تک اللہ کی الوہیت اور آخرت پر یقین پوری طرح جگہ نہیں بنا سکا۔ وہ اللہ کو مانتے ہیں اور اسی کے لیے تمہارے ساتھ نمازیں بھی پڑھتے ہیں' لیکن جس طرح اسے ماننے کا حق ہے اس طرح نہیں مانتے۔ وہ اس بات پر یقین نہیں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ مطاعِ مطلق ہے اور ہم اس کی غیر مشروط بندگی کے پابند ہیں اس بندگی اور اطاعت میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس کا رسول اس کا نمائندہ ہے۔ اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ اس کے کسی حکم سے انحراف اللہ کے حکم سے انحراف کے برابر ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ اللہ کا علم ایسا وسیع ہے کہ ہم ہر وقت اس کی نگاہوں میں ہیں۔ وہ ہمارے ایک ایک عمل کو جانتا ہے اور ہمیں ہر لحہ دیکھتا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا اور جانتا ہے اسی کے مطابق ہمارا نامۂ عمل تیار ہو رہا ہے۔ تیسری یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ایسی ہمہ گیر ہے کہ وہ تمام انسانوں کو جس طرح پیدا کرنے اور مارنے پر قادر ہے اسی طرح دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی کب مرا اور کس سرزمین میں دفن ہو کر خاک ہو گیا۔ اس کی قدرت کے لیے یہ بات کوئی مشکل نہیں کہ وہ قیامت میں ان سب کو اٹھا کر ایک میدان میں جمع کرے گا جسے محشر یا میدانِ حشر کہتے ہیں۔ اور اس کے قیامت برپا کرنے' میدانِ حشر میں ایک ایک شخص کا حساب کرنے اور اس کے جزا و سزا دینے میں کوئی شبہ نہیں۔ سب لوگ اپنا اپنا نامۂ عمل ہاتھوں میں لیے اپنے اپنے انجام کو پہنچیں گے اور چوتھی یہ بات کہ پروردگار نے جو کچھ قرآنِ کریم میں نازل کیا اس کی ایک ایک بات سچی اور ایک ایک حکم حق ہے۔ کیونکہ صدق اللہ کی صفت ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی سچا نہیں۔ یہ وہ بنیادیں ہیں جس پر اسلامی عقائد' عبادات اور پوری زندگی کے معاملات کی تعمیر ہوتی ہے۔ اور منافقین کی تمام کمزوریوں کا سبب صرف یہ ہے کہ ان کی یہ بنیادیں پختہ نہیں۔ وہ ریت کی بنیاد پر کھڑے ہیں۔ اس لیے جب جب ریت ان کے پاؤں کے نیچے سے پھسلتی ہے ان کے اعمال میں دراڑیں آنے لگتی ہیں۔ انکے معاملات کی دیواریں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان کی ان بنیادی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ جب وہ اپنے عقائد اور اپنی اساسی باتوں میں پختہ ہو جائیں پھر خود بخود ان کا ہر عمل اخلاص کی تصویر ہو گا۔ وہ خود نفاق کو ایک لعنت سمجھیں گے اور اللہ کے ساتھ ظاہر و باطن اپنا معاملہ درست کر لیں گے۔ جب تک یہ بنیادیں استوار نہیں ہوں گی تو محض سخن سازی سے ان کی زندگی میں اخلاص نہیں آ سکتا۔ اکبر نے ٹھیک کہا تھا ؎

Marfat.com

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

آج بھی اگر امت کی بگڑی ہوئی حالت کا ہم جائزہ لیں تو ان کی تمام تر اخلاقی اور معاملات کی خرابیوں کا یہی سبب آپ کو ملے گا کہ وہ بنیادی، نظریاتی اعتقادات میں کمزوریوں کا شکار ہیں۔ اللہ ہم سب کو اپنی عافیت میں رکھے۔ (آمین)

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ

فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ
اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝88 وَدُّوْا
لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاۗءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ
اَوْلِيَاۗءَ حَتّٰي يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ
وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّ
لَا نَصِيْرًا ۝89ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ
مِّيْثَاقٌ اَوْ جَاۗءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا
قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ
اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ
اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝90 سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ
يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ۭ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا

Marfat.com

فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَ يُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

عربی رکوع ۱۲ (پس تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم منافقین کے بارے میں دو گروہ ہو گئے ہو اللہ نے تو انہیں ان کے کرتوتوں کے باعث پیچھے لوٹا دیا ہے۔ کیا تم ان کو ہدایت دینا چاہتے ہو جنہیں اللہ نے گمراہ کیا ہے اور جن کو اللہ گمراہ کر دے تم ان کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتے o وہ تو یہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش تم بھی کافر ہو جاؤ جیسے وہ کافر ہوئے کہ تم سب برابر ہو جاؤ۔ پس تم ان میں سے کسی کو اپنا ساتھی نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔ اگر وہ اس سے اعراض کریں تو ان کو گرفتار کرو اور قتل کرو جہاں کہیں بھی پاؤ۔ اور ان میں سے کسی کو ساتھی اور مددگار نہ بناؤ o صرف وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جن کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہو جن کے ساتھ تمہارا کوئی معاہدہ ہے یا وہ لوگ جو تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ نہ اپنے اندر تم سے لڑنے کی ہمت پائیں اور نہ ہی اپنی قوم ہی سے۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر دلیر کر دیتا تو وہ تم سے لڑتے۔ پس اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں تم سے جنگ نہ کریں، تمہارے ساتھ صلح جویانہ رویہ رکھیں تو اللہ تم کو بھی ان کے خلاف کسی اقدام کی اجازت نہیں دیتا o اور دوسرے کچھ ایسے لوگوں کو بھی تم پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی محفوظ رہیں اور اپنی قوم سے بھی محفوظ رہیں۔ لیکن جب جب فتنے کی طرف موڑے جاتے ہیں اس میں گر پڑتے ہیں۔ پس اگر یہ تم سے کنارہ کش نہ رہیں تم سے صلح جویانہ رویہ نہ رکھیں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو تم ان کو گرفتار کرو اور قتل کرو جہاں کہیں پاؤ۔ یہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تم کو کھلا اختیار دیا ہے) (آیات ۸۸ تا ۹۱)

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَ اللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا o

"پس تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم منافقین کے بارے میں دو گروہ ہو گئے ہو اللہ نے تو انہیں ان کے کرتوتوں کے باعث پیچھے لوٹا دیا ہے۔ کیا تم ان کو ہدایت دینا چاہتے ہو جنہیں اللہ نے گمراہ کیا ہے اور جن کو اللہ گمراہ کر دے تم ان کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتے۔" (النسآء:۸۸)

Marfat.com

ہجرت نہ کرنے والے منافقین کے بارے میں مسلمانوں کی دو رائے

ان آیات میں ان لوگوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو مکہ معظمہ یا کسی اور بستی میں مسلمان تو ہو گئے لیکن ہجرت کا حکم ان تک پہنچ جانے کے باوجود وہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ نہیں آئے۔ ان پر یہ بات بہت گراں گزری کہ وہ اپنے قبیلے کو چھوڑ دیں' اپنی زندگی بھر کے اثاثے سے محروم ہو جائیں' گھر سے بے گھر ہو جائیں اور تمام رشتہ داریوں اور تمام راحتوں سے اپنے آپ کو محروم کر لیں۔ ایک نئی جگہ' نیا شہر جہاں کے رہنے والے لوگوں سے پیشگی کوئی تعلق نہیں۔ وہاں کا ماحول پہلے ماحول سے مختلف اور پھر خالی ہاتھ وہاں پہنچ کر ضروریاتِ زندگی کی کفالت کا انتظام کیا ہو گا اکیلا آدمی بھی ایسے مسائل کا سامنا نہیں کر سکتا چہ جائیکہ بچوں سمیت آدمی وہاں پہنچ جائے اور در در کی ٹھوکریں کھائے صرف اس بنیاد پر کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہجرت کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ یہ کام بہت مشکل ہے۔ چنانچہ انہوں نے محض ایمان کی خاطر ہجرت کرنا گوارا نہ کیا' اپنے آپ کو مسلمان کہتے رہے لیکن ان کی تمام ترجیحات اور تمام معمولات وہی رہے جو غیر مسلموں کے تھے۔ اور جب ان پر دباؤ پڑتا تو وہ ان تمام کارروائیوں میں شریک ہوتے جو ان کی قوم مسلمانوں کے خلاف انجام دیتی۔ ان لوگوں کے بارے میں صحابہ میں رائے تقسیم ہو گئی۔ کچھ لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ یہ صحیح ہے کہ وہ لوگ ہجرت کر کے یہاں نہیں آئے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں نے اسلام قبول کیا اور وہ ابھی تک اسلام پر قائم ہیں۔ ہمیں ان سے تعلق باقی رکھنا چاہئے اور جہاں تک ممکن ہو ان سے روابط قائم رکھنے چاہئیں۔ اور دوسری رائے یہ تھی کہ چونکہ ایمان کی تکمیل کے لیے ہجرت ضروری ہے انہوں نے اگر اپنی دنیا کو دین اور ایمان پر ترجیح دی ہے اور وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے باعث ہجرت کرنے پر آمادہ نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مفادات اور دنیا کے آدمی ہیں اللہ اور اس کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاں تک ان کے اسلام کے دعوے اور اقرار کا تعلق ہے وہ سراسر منافقت ہے۔ اگر اس میں سچائی ہوتی تو وہ یقیناً ہماری طرح ہجرت کرتے۔ قرآنِ کریم نے یہاں صحابہ کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان لوگوں کے بارے میں دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے ہو۔ حالانکہ ان کا معاملہ بالکل واضح ہے۔ انہوں نے ایمان کی طرف قدم بڑھایا' اس کے دائرے میں داخل ہونے کا ارادہ کیا لیکن اس کی سرحد سے واپس لوٹ گئے۔ انہوں نے اپنی دنیا کو دین اور ایمان پر قربان کرنے کا ارادہ نہیں کیا' بلکہ دنیا کو ترجیح دی اور اللہ کے احکام کو نظر انداز کر دیا۔ ان کے اس رویے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے پھر انہیں کفر کی طرف لوٹا دیا۔ رَکَسَ الشَّیْءَ کے معنی ہیں "چیز کو الٹ دیا" اَرْکَسَہٗ "اس کو اوندھا کر دیا" یعنی سابقہ حال پر لوٹا دیا۔ وَاللّٰہُ اَرْکَسَھُمْ کا مطلب بھی یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کی طرف بڑھنا چاہا لیکن ان کی دنیا کی محبت نے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ ان کی اس کمزوری یا فیصلے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے انہیں ایمان سے محروم کر دیا اور وہ جہاں سے چلے تھے وہیں واپس لوٹ گئے۔

اس کے بعد مسلمانوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ جس کے کفر اور گمراہی کا فیصلہ کر چکا ہے تم اسے ہدایت دے دو ظاہر ہے کہ تم اللہ کے فیصلے کو بدل نہیں سکتے۔" اور پھر یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ اللہ نے جو ان کی نامرادی کا فیصلہ کیا ہے یہ ان کے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ وہ اپنے کرتوتوں کے باعث جس سزا کے مستحق ٹھہرے ہیں تم ان سے رشتہ داری یا تعلق رکھنے کے باوجود انہیں اس سزا سے نکال نہیں سکتے۔

Marfat.com

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝

''وہ تو یہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش تم بھی کافر ہو جاؤ جیسے وہ کافر ہوئے کہ تم سب برابر ہو جاؤ۔ پس تم ان میں سے کسی کو اپنا ساتھی نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔ اگر وہ اس سے اعراض کریں تو ان کو گرفتار کرو اور قتل کرو جہاں کہیں بھی پاؤ۔ اور ان میں سے کسی کو ساتھی اور مددگار نہ بناؤ۔'' (النسآء:۸۹)

سابقہ آیت کے مضمون کو ہی آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ تم ان کے ساتھ تعلق رکھنا اور خیر خواہی کرنا چاہتے ہو اور ان کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اسی طرح وہ تمہیں بھی کافر بنا دیں تا کہ تم اور وہ برابر ہو جائیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا۔

تم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ان سے تعلق رکھنے کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ تو کفر سے نکلنے کے لیے تیار نہیں البتہ تمہیں وہ کفر کی طرف کھینچنے کی ضرور کوشش کریں گے۔ تو اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود تو ڈوبے ہیں تمہیں بھی ڈبو دیں گے۔ اس لیے یاد رکھو ان سے کسی طرح کا کوئی تعلق قائم کرنے کی کوشش نہ کرو۔ وہ تمہارے لیے اسی طرح بیگانہ ہیں جس طرح باقی کافر تمہارے لیے بیگانہ ہیں۔ ان سے تعلق کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ اپنے ایمان کی سچائی کا ثبوت دینے کے لیے ہجرت کریں۔ اپنی دنیا کو دین پر قربان کر دیں اور دین کی خاطر بالکل یکسو ہو جائیں۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے اور ہجرت کے لیے کسی طرح تیار نہیں تو پھر وہ تمہارے بدترین دشمن ہیں دوسرے کافروں کی طرح انہیں بھی جہاں پاؤ گرفتار کرو اور قتل کرو۔ اور ان کے ساتھ کسی طرح کی مروت کا تعلق مت رکھو اور ان سے کسی مدد کی امید مت باندھو۔

ہجرت مدارِ ایمان

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ہجرت کو مدارِ ایمان اور ایمان کی کسوٹی کیوں بنایا جا رہا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو اللہ کی طرف بلائیں' اللہ کی بندگی کی دعوت دیں اور ان کو اس بات کا قائل کریں کہ تم ازاول تا آخر اللہ کے بندے ہو اور تمہیں اپنی پوری زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارنی چاہئے۔ اور جب انسانوں کی ایک معقول تعداد جمع ہو جائے تو پھر ان کے لیے ایک خطۂ زمین تلاش کیا جائے جہاں وہ اللہ کی مرضی کے مطابق ایک حکومت قائم کریں اور انفرادی اور اجتماعی زندگی اس حکومت کی نگرانی میں اللہ کے احکام کے مطابق گزاریں۔ اپنے گھروں کی زندگی اسلام کے دیے ہوئے اصول معاشرت پر قائم کریں اور اجتماعی زندگی کا ایک ایک ادارہ اس آئین اور قانون کے مطابق وجود میں لائیں جس کی ہدایت اسلامی شریعت نے دی ہے۔ اور پھر ہر ادارے کو اسلامی احکام کے مطابق چلانے کی کوشش کریں۔ اس طرح سے جہاں جہاں بھی اللہ اقتدار دیتا جائے وہاں وہاں کی سرزمین کو اللہ کے احکام کی سرزمین بنا دیں اور ممکن حد تک اللہ کی زمین پر اس طرح اس کی اطاعت' عبادت اور بندگی عام ہو جائے کہ کہیں شیطان اور طاغوت کی بندگی کا نشان باقی نہ رہے۔

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی تصورات کے مطابق اہلِ مکہ کو دین کی دعوت دی۔ چند سعید روحیں اسلام لے آئیں لیکن بیشتر نے اسلام قبول کرنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ ایمان لانے والوں کی زندگی بھی دشوار کردی۔ آپؐ نے تیرہ سال تک شب و روز مکہ اور اس کے گردونواح کے رہنے والوں کو اسلام کی طرف بلایا' لیکن جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا رہنا وہاں دوبھر کردیا اور آپؐ کے قتل کے منصوبے باندھنے لگے تو پہلے آپؐ نے مسلمانوں کو وہاں سے نکل کر کسی عافیت کدہ میں جانے کی اجازت دی اور جب اہلِ مدینہ نے آپ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تو آپؐ نے اس کو غنیمت جانا اور مدینے کی طرف ہجرت کر گئے۔ چنانچہ جیسے ہی یہ ایک چھوٹا سا شہر اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے میسر آیا تو آپؐ نے ہر جگہ کے مسلمانوں کو اللہ کا یہ حکم پہنچایا کہ اب تمہیں ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچنا ہوگا ورنہ تمہارے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا کیونکہ تم کافروں میں رہ کر اسلامی زندگی نہیں گزار سکتے۔ اور اسلام کے جو نئے نئے احکام نازل ہو رہے ہیں ان سے باخبر نہیں ہو سکتے۔ اور اسلام کو اپنے تحفظ' بقا اور اپنے دائرے کو پھیلانے کے لیے جس اجتماعی قوت کی ضرورت ہے وہ وجود میں نہیں آسکتی جب تک تمام مسلمان مدینے کو اپنا مرکز نہ بنالیں۔ اس حکم کے بعد ہر وہ شخص جو ایمان لایا اور اس میں اتنی سکت اور طاقت تھی کہ وہ مدینے تک ہجرت کرسکتا تھا تو اس پر ہجرت فرض ہوگئی۔ اور اگر وہ ہجرت کے وسائل رکھتے ہوئے بھی ہجرت کرنے پر آمادہ نہ ہوا تو اسے منافق ٹھہرایا گیا۔ البتہ جو لوگ کمزور اور بے وسیلہ تھے انہیں مستضعفین کہا گیا جن کا آگے ذکر آرہا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام نے ہجرت کو مدارِ ایمان کیوں بنایا۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ دین پر عمل کیا جاسکتا تھا نہ دینی احکام سے آگاہی ہوسکتی تھی اور نہ وہ اجتماعی قوت وجود میں آسکتی تھی جس کی بنیاد پر اسلامی ریاست کا تحفظ ہوسکتا تھا اور اس اسلامی انقلاب کو پوری دنیا میں پھیلایا جاسکتا تھا۔ لیکن جب مکہ معظمہ فتح ہوگیا اور جزیرۂ عرب کے رہنے والے مسلمانوں کو اپنے اپنے علاقوں میں اسلامی زندگی گزارنے کی آزادی میسر آگئی تو مدینے کی طرف ہجرت کا حکم منسوخ ہوگیا۔ اس لیے آج مسلمانوں میں ہجرت کا یہ حکم باقی نہیں۔ البتہ دو باتیں ہیں جو قیامت تک باقی رہیں گی۔ ایک یہ بات کہ اگر کوئی آدمی اپنے اسلامی ملک کو چھوڑ کر محض کمانے کی خاطر کسی دارالکفر میں جاتا ہے اور وہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزارنا ممکن نہیں اور قدم قدم پر اس کے بچوں کے بگڑنے کے اسباب موجود ہیں۔ تو ایسی صورت میں اپنے اور اپنے بچوں کے دین اور اخلاق کو بچانے کے لیے دارالکفر میں ٹھہرنا جائز نہیں رہتا۔ اپنے وطن واپس آنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسے ہم ہجرت تو نہیں کہہ سکتے' کیونکہ یہ کسی دوسرے ملک کی طرف ہجرت نہیں بلکہ اپنے وطن کی طرف مراجعت ہے۔ البتہ اگر اپنا وطن ایسی صورت اختیار کر جائے کہ وہاں اسلامی زندگی مشکل ہو جائے تو پھر اگر کوئی دوسرا ملک اس وطن کے رہنے والوں کے لیے اپنے دروازے کھول دے اور ان کے لیے اسلامی زندگی کے امکانات پیدا کردے تو تب بھی اپنا وطن چھوڑ کر وہاں جانا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایک مومن کا حقیقی وطن وہ ہے جہاں اس کی اسلامی زندگی کے امکانات ہیں۔ اور جہاں یہ امکان نہ ہوں وہ وطن ہوتے ہوئے بھی درندوں کا بھٹ ہے۔

اور دوسری یہ بات کہ وطن سے کسی دوسرے ملک کی طرف ہجرت کرنے کا حکم تو اب باقی نہیں البتہ گناہوں سے نیکی کی طرف آنا' بری زندگی سے اچھی زندگی کی طرف منتقل ہونا' اس کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمایا اور یہ قیامت تک باقی ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''المهاجر من هجر ما نهى الله عنه '' (یعنی مہاجر وہ ہے جو ان تمام چیزوں سے پرہیز کرے جن کو اللہ نے حرام کیا ہے) اور یہ ہجرت قیامت تک باقی رہے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''لا تنقطع الهجرة حتى تنقطع التوبة '' (ہجرت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک توبہ کی قبولیت کا وقت باقی رہے گا)

Marfat.com

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ م بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ
اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ
اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَ اَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝

''صرف وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جن کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہو جن کے ساتھ تمہارا کوئی معاہدہ ہے یا وہ لوگ جو تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ نہ اپنے اندر تم سے لڑنے کی ہمت پائیں اور نہ ہی اپنی قوم ہی سے۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر دلیر کر دیتا تو وہ تم سے لڑتے۔ پس اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں تم سے جنگ نہ کریں' تمہارے ساتھ صلح جویانہ رویہ رکھیں تو اللہ تم کو بھی ان کے خلاف کسی اقدام کی اجازت نہیں دیتا۔'' (النسآء:۹۰)

اس آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کا حکم بیان کیا جا رہا ہے جو مذکورہ بالا اخذ وقتل کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو اس قوم یا قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدۂ صلح ہے اور یا اس قبیلے کے پاس جا کر پناہ لے لیں اور وہ قبیلہ انہیں اپنے پناہ میں لے لے۔ اور دوسرے وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ معاہدہ صلح تو نہ ہو البتہ وہ مسلمانوں کے پاس آ کر اپنی کمزوری کا اظہار کریں اور مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلائیں کہ ہم نہ آپ سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے۔ ہم لڑائی سے یکسر دور رہنا چاہتے ہیں۔ اگر لڑائی چھڑ جائے تو نہ ہم آپ کا ساتھ دیں گے اور نہ ہم آپ کے خلاف اپنی قوم کا ساتھ دیں گے۔ ان دونوں گروہوں کے بارے میں حکم دیا گیا کہ اگر وہ لوگ اپنے معاہدے اور اپنے اقرار پر قائم رہیں تو تم بھی ان سے کنارہ کش رہو۔ جنہوں نے معاہدہ کیا ہے وہ تو معاہدے کی وجہ سے مسلمانوں سے محفوظ ہوں گے اور جن لوگوں نے اپنی بے بسی اور پس ہمتی کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ صلح سے رہنے کا ارادہ کیا ہے مسلمان ان سے بھی کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ ان کے خاموش رہنے کو غنیمت سمجھا جائے گا۔ کیونکہ یہ بھی تو ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو جرأت دے دیتا اور وہ مسلمانوں پر اپنی قوم کے ساتھ مل کر چڑھ دوڑتے۔ اب اگر وہ مسلمانوں سے تعرض نہیں کرتے اور لڑائی میں اپنی قوم کا ساتھ نہیں دیتے اور اپنے صلح جویانہ رویے پر قائم رہتے ہیں کہ پروردگار فرماتے ہیں تو تمہیں بھی ان کے خلاف اقدام کا کوئی حق نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ ان سے محبت اور آشتی کے تعلقات بڑھانے کی اجازت ہے نہیں بلکہ صرف یہ اجازت دی گئی ہے کہ تم ان کے خلاف لڑ نہیں سکتے ہو اور اپنے ہاتھوں کو ان سے روکے رکھو۔ لیکن ان سے محبت اور پیار کی پینگیں بڑھانے کی اجازت نہیں۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ
اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَ يُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ
وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝

Marfat.com

''اور دوسرے کچھ ایسے لوگوں کو بھی تم پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی محفوظ رہیں اور اپنی قوم سے بھی محفوظ رہیں۔لیکن جب جب فتنے کی طرف موڑے جاتے ہیں اس میں گر پڑتے ہیں۔پس اگر یہ تم سے کنارہ کش نہ رہیں تم سے صلح جو یانہ رو یہ نہ رکھیں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو تم ان کو گرفتار کرو اور قتل کرو جہاں کہیں پاؤ۔یہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تم کو کھلا اختیار دیا ہے۔'' (النسآء:۹۱)

اس آیتِ کریمہ میں ایک اور طرح کے منافقین کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں سے بھی بنا کے رکھنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم سے بھی۔یعنی اپنے آپ کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کے سامنے بظاہر غیر جانبداری کے مدعی ہیں۔لیکن حقیقت میں وہ غیر جانبدار نہیں۔کیونکہ جب بھی ان کی قوم مسلمانوں کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی کرنا چاہتی ہے تو نہ صرف ان کی ہمدردیاں اپنی قوم کے ساتھ ہوتی ہیں بلکہ وہ پوری طرح اس لڑائی میں شریک ہوتے ہیں۔ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ اس رعایت کے مستحق نہیں ہیں جس کا ذکر پہلی آیتِ کریمہ میں کیا گیا ہے۔اگر تم دیکھو کہ غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھنے کے باوجود یہ تمہاری دشمنی اور مخاصمت میں اپنی قوم کے ساتھ شریک ہیں اور وہ مسلمانوں کی ایذاء دہی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تو پھر یہ بھی کھلے ہوئے دشمنوں کے حکم میں ہی شامل ہیں۔تم انہیں جہاں پاؤ گرفتار کرو اور قتل کرو۔ان کو گرفتار کرنے اور قتل کرنے کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں کھلا اختیار دیا ہے۔تم اپنے اختیار کو پوری طرح استعمال کر سکتے ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان چار آیتوں میں تین طرح کے لوگوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

۱۔ جو ہجرت کی قدرت کے باوجود ایمان لانے کے بعد ہجرت نہ کریں۔یا اگر ہجرت کر جائیں تو پھر دارالاسلام سے نکل کر دارالحرب چلے جائیں۔

۲۔ دوسرے وہ لوگ جو مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرلیں یا ایسا معاہدہ کرنے والوں سے معاہدہ کرلیں۔

۳۔ جو دفع الوقتی کی غرض سے صلح کرلیں اور جب مسلمانوں کے خلاف جنگ کی دعوت دی جائے تو اس میں شریک ہو جائیں اور اپنے عہد پر قائم نہ رہیں۔

پہلے فریق کا حکم عام کفار کی طرح ہے۔دوسرا فریق قتل اور گرفتاری کے حکم سے مستثنیٰ ہے۔کیونکہ یہ مسلمانوں سے معاہدہ کر چکا ہے۔ اور تیسرا فریق اسی سزا کا مستحق ہے جو پہلے فریق کے لیے تھی۔لیکن حقیقت میں ان آیتوں میں دو حکم بیان کیے گئے ہیں۔ایک عدم صلح کی صورت میں قتال اور دوسرا مصالحت کے وقت قتال نہ کرنا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ

Marfat.com

بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ
رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ
تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا
مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ
لَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ
لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ
كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ
اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ
اَنْفُسِهِمْ عَلَي الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰي ۭ وَ
فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَي الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ
مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ ع

عربی رکوع ۱۳ (اور کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے الا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے۔ اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کے ذمہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور خون بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ الا یہ کہ وہ خون بہا معاف کر دے۔ لیکن اگر وہ مسلمان مقتول تمہاری دشمن قوم کا فرد تھا اور وہ مومن تھا

Marfat.com

تو ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی قوم کا فرد تھا جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے تو خون بہا بھی ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا بھی۔ اور جو شخص غلام نہ پائے وہ پے در پے دو مہینوں کے روزے رکھے۔ یہ اللہ کی طرف سے ٹھہرائی ہوئی توبہ ہے۔ اللہ علیم و دانا ہے ○ اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزاء جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے۔ اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے ○ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم خدا کی راہ میں نکلا کرو تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ اور جو تمہیں سلام کرے اسے فوراً نہ کہہ دیا کرو کہ تم مومن نہیں ہو۔ تم دنیوی زندگی کا سامان چاہتے ہو اللہ کے پاس بہت سے اموالِ غنیمت ہیں۔ تم بھی اس سے پہلے اسی طرح تھے پس اللہ نے تم پر احسان فرمایا تو تحقیق کر لیا کرو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے ○ مسلمانوں میں سے غیر معذور بیٹھ رہنے والے اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں۔ مال و جان سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ فضیلت کا بخشا ہے اور سب سے وعدہ فرمایا ہے اللہ نے بھلائی کا اور فضیلت دی ہے اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر اجر عظیم سے۔ اس کی طرف سے بلند درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ (آیات ۹۲ تا ۹۶)

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَئًا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَئًا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۗ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۗ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ ۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○

"اور کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے الا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے۔ اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کے ذمہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور خون بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ الا یہ کہ وہ خون بہا معاف کر دے۔ لیکن اگر وہ مسلمان مقتول تمہاری دشمن قوم کا فرد تھا اور وہ مومن تھا تو ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی قوم کا فرد تھا جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے تو خون بہا بھی ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا بھی۔ اور جو شخص غلام نہ پائے وہ پے در پے دو مہینوں کے روزے رکھے۔ یہ اللہ کی طرف سے ٹھہرائی ہوئی توبہ ہے۔ اللہ علیم و دانا ہے۔" (النساء: ۹۲)

Marfat.com

قتل عمد کا تصور بھی مسلمان کے لیے روا نہیں

سابقہ آیات میں ان نام نہاد مسلمانوں کے قتل کی اجازت دی گئی تھی جنھوں نے بظاہر اسلام قبول تو کیا لیکن وہ رسمی اسلام سے آگے بڑھنے کو تیار نہ تھے۔ دینی تقاضوں کو پورا کرنے اور اسلامی تحریک کی توانائی کے لیے ہجرت ایک لازمی تقاضا بھی تھا اور اللہ اور رسول کی جانب سے ٹھہرایا ہوا فرض بھی وہ اس کی ادائیگی کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے۔ لیکن ایسے منافقین یا نام نہاد مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم علاقوں میں مخلص مسلمان بھی موجود تھے جو دل و جان سے ایمان لائے تھے اور وہ ہر وقت ہجرت کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ لیکن حالات کی مجبوریاں ان کے قدموں کی زنجیر بن گئی تھیں۔ وہ کوشش کے باوجود اپنے لیے کوئی راستہ نہ پاتے تھے۔ جب مسلمانوں کا ایسے قبیلوں سے واسطہ پڑتا جن میں ایسے مخلص مسلمان موجود تھے تو بعض دفعہ انجانے میں کسی مسلمان کے قتل کا واقعہ بھی پیش آ جاتا' چنانچہ پیش نظر آیات میں دو باتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک تو یہ بات کہ کسی مسلمان کے لیے ہرگز اس بات کی گنجائش نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کرے۔ قتل کرنا ایک آخری حرکت ہے جس سے انسانیت کے رشتے کٹ جاتے ہیں اور قتل کرنے والا اگر ظلماً قتل کرتا ہے تو اسے بجا طور پر انسانیت کا دشمن کہنا چاہیے۔ درندہ اگر کسی کو چیر پھاڑتا اور کسی کی جان لیتا ہے تو اسے یہ رعایت دی جا سکتی ہے کہ درندگی اس کی فطرت ہے۔ اس سے اس کے علاوہ اور کس چیز کی توقع کی جا سکتی ہے؟ لیکن انسان اُنس سے بنا ہے۔ اس کی فطرت میں محبت اور خیر خواہی گوندھی گئی ہے۔ وہ جب قتل کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ انسان نہیں رہتا درندوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور مذہبی زبان میں اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اور اسلام چونکہ امن کا دین ہے اس لیے جو امن کی حدود سے تجاوز کرتا ہے اس کا اسلام سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے تعلق کٹ جاتا ہے اور وہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کی برادری سے نکل جاتا ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''من حمل علینا اسلاح فلیس منا'' (جو آدمی ہم پر ہتھیار اٹھاتا ہے وہ ہم میں سے نہیں) قتل تو ایک آخری بات ہے ارادۂ قتل سے جو آدمی ہتھیار اٹھاتا ہے یعنی تلوار سونتا ہے یا بندوق کی نالی سیدھی کرتا ہے وہ اس حرکت سے اپنا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور مسلمانوں سے کاٹ لیتا ہے۔ اس لیے اس پر تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کو قتل کر دے۔

قتلِ خطا اور اس کی سزا

البتہ دنیا اچھے برے اتفاقات سے معمور ہے۔ اس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے۔ کسی نے یہ سمجھا کہ کہ جھاڑی کے پیچھے کوئی درندہ بیٹھا ہے اس نے فائر کر دیا۔ معلوم ہوا درندہ نہیں کوئی مسلمان بھائی تھا جو کسی ضرورت کے لیے بیٹھا تھا یا اس نے کسی شکار پر فائر کیا لیکن اڑتی ہوئی گولی اندھے قتل کا باعث بن گئی۔ یا ہنگامی حالات میں اس نے کسی کافر کو نشانہ بنایا لیکن مسلمان نشانہ بن گیا۔ اس طرح کے اتفاقات یا غلطیوں سے مسلمان کے ہاتھ سے مسلمان مارا جا سکتا ہے۔ اس میں یقیناً مارنے والے کے ارادے کا دخل نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود شریعت نے اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ ایک مسلمان کا خون رائیگاں جائے۔ اس نے حکم دیا کہ جس نے کسی مسلمان کو غلطی سے بھی قتل کیا اس پر دو چیزیں لازم ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ خون بہا (دیت) ادا کرے۔ اور یہ خون بہا مقتول کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ مرحوم ایک گھر کا کفیل ہو اس کے مرنے کے بعد گھر لاوارث ہو گیا۔ ان کی کسی حد تک تلافی اس رقم سے ہو سکے

Marfat.com

ہے جو خون بہا کے طور پر انہیں ادا کی جائے گی۔ اور دوسری چیز یہ کہ وہ ایک غلام آزاد کرے۔ قرآنِ کریم کے نزول کے وقت دنیا میں غلامی کا رواج تھا۔ اسلام نے مختلف طریقوں سے اس رواج کو روکا۔ غلاموں کے حقوق مقرر کیے' غلاموں کی آزادی ایک نیکی بنادی گئی' غلاموں کو حق دیا گیا کہ وہ اپنے آقا سے معاملہ طے کر کے اپنی غلامی کا راستہ نکالیں اور مالکوں کو پابند کیا کہ وہ ایسی کوششوں کو ناکام نہ ہونے دیں۔ مزید یہ کہ جہاں کہیں کسی حکم کی تعمیل میں کوتاہی سے یا حکم کے توڑنے سے کفارہ لازم آتا تھا عموماً اس میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح آہستہ آہستہ غلامی ختم ہوگئی۔ چنانچہ انہی میں سے قتل کے واقعہ میں بھی غلام کو آزاد کرنے کا حکم دیا گیا۔ دیت اور خون بہا تو وارثوں کے لیے ایک وقتی امداد تھی اور خون کی تلافی تھی' لیکن غلام کو آزاد کرنا یہ اس جرم کا خمیازہ تھا۔ جو قاتل سے سرزد ہوا۔ اور پھر اس خون بہا کی ادائیگی کو قاتل پر اس قدر لازم ٹھہرایا کہ مقتول کے وارثوں کے سوا کسی کو اس میں مداخلت کی اجازت نہیں دی گئی۔ نہ کوئی عدالت اس میں مداخلت کرسکتی ہے اور نہ حکومت اس میں رکاوٹ پیدا کرسکتی ہے' بلکہ حکومتی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ قاتل سے مقتول کے وارثوں کو خون بہا کی ادائیگی کا انتظام کرے۔ البتہ مقتول کے وارثوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اگر قاتل کو معاف کردیں تو خون بہا معاف ہوسکتا ہے۔

ان دو صورتوں سے اسلام نے قتل خطا کا بھی بہت حد تک راستہ روک دیا۔ جب ایک مسلمان نے یہ دیکھا ہے کہ قتل خطا اگرچہ بغیر ارادے کے ہوتا ہے لیکن اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے' اس کی ایک بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے اور ساتھ اس کے یہ گناہ بھی ہے جس کی تلافی کے لیے غلام آزاد کرنا ضروری ہے۔ اور ہر آدمی کے لیے خون بہا کی ادائیگی آسان ہے اور نہ کسی مسلمان کے لیے اللہ کی ناراضگی قابل برداشت ہے تو ایسی صورت میں اس فعل کے ارتکاب کی جرأت بڑی مشکل ہوگئی۔

آیتِ کریمہ میں قتل خطا کی دوسری صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ قتل خطا کی صورت میں مقتول ہونے والا اگر تمہارے دشمن قوم کا فرد ہو لیکن مسلمان ہو اور دشمنوں سے تصادم کے دوران غلطی سے کسی کے ہاتھ سے مارا جائے تو ایسی صورت میں اس کا خون بہا ادا کرنا لازم نہیں۔ کیونکہ خون بہا ایک معاملہ ہے جو دشمنوں کے قبیلے' ملک یا علاقے میں جا کر طے نہیں کیا جاسکتا۔ خون بہا وارثوں کے سپرد کیا جاتا ہے لیکن باہمی دشمنی اور لڑائی کے باعث وارثوں تک پہنچنا ممکن نہیں۔ اگر وارثوں سے رابطہ ہوسکتا تو ممکن تھا کہ وہ معاف کردیتے اور اگر وہ معاف نہ کرتے تو خون بہا ان کے سپرد کیا جاتا۔ یہ صورتیں جنگ کے زمانے میں چونکہ ممکن نہیں اس لیے خون بہا کو ایسے قتل خطا میں لازم نہیں ٹھہرایا گیا۔ البتہ یہ ممکن نہیں کہ ایک مسلمان کے قتل کا احساس بھی نہ کیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اس کے خون کی کوئی قیمت نہیں۔ اس لیے ایک مومن غلام آزاد کرنا لازم ٹھہرایا گیا۔ مومن اس لیے کہ مقتول مومن ہے۔ اور آزاد کرنے کی پابندی اس لیے تاکہ قتل خطا کا ارتکاب کرنے والے کو یہ احساس ہو کہ مجھ سے یہ غلطی ہوئی ہے وہ انجانے میں سہی لیکن ایک گناہ ہوا ہے اس کی تلافی اسی صورت میں ممکن ہے کہ میں اللہ سے اپنی غلطی کی معافی مانگوں' ندامت کا اظہار کروں اور ساتھ ہی ایک غلام خرید کے آزاد کروں کہ میرے ہاتھوں اگر ایک زندگی ضائع ہوئی ہے تو دوسری زندگی کو آزادی دے کر میں اسے حقیقی زندگی سے بہرہ ور کررہا ہوں۔

قتل خطا کی تیسری صورت یہ ہے کہ غلطی سے قتل ہونے والا مومن ہے لیکن اس کا تعلق ایک ایسی دشمن قوم سے ہے جس سے مسلمانوں کا معاہدہ ہے۔ معاہدہ کی موجودگی مین چونکہ اس کے وارثوں سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے اس لیے خون بہا ادا کرنا بھی لازم ہوگا اور ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا بھی۔

Marfat.com

پہلی اور دوسری صورت میں آپ نے دیکھا کہ خون بہا کا ذکر آیا ہے۔ اور تینوں صورتوں میں غلام آزاد کرنے کا۔ اس لیے دونوں باتوں کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ جہاں تک خون بہا کی تفصیل کا تعلق ہے تو معلوم ہونا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خون بہا کی مقدار سو اونٹ یا دو سو گائیں یا دو ہزار بکریاں مقرر فرمائی ہیں۔ اگر دوسری کسی شکل میں کوئی شخص خون بہا دینا چاہے تو اس کی مقدار انہی چیزوں کی بازاری قیمت کے لحاظ سے مقرر کی جائے گی۔ مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نقد خون بہا دینے والوں کے لیے آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم مقرر تھے۔ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے فرمایا کہ اونٹوں کی قیمت اب بڑھ گئی ہے لہٰذا اب سونے کے سکے میں ایک ہزار دینار اور چاندی کے سکے میں بارہ ہزار درہم خون بہا دلوایا جائے گا۔

جہاں تک غلام آزاد کرنے کا تعلق ہے اس سلسلے میں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ پہلی تو یہ بات کہ اگر تو کوئی شخص غلام آزاد کرنے کی استطاعت رکھتا ہے اور غلام بھی موجود ہے تو پھر تو اسے غلام ہی آزاد کرنا ہوگا۔ لیکن اگر کوئی اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو پھر اسی آیت کے آخر میں فرمایا کہ اسے دو مہینے کے پے در پے یعنی مسلسل روزے رکھنے ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ کسی وجہ سے روزہ چھوڑ دے تو اسے نئے سرے سے روزے شروع کرنا ہوں گے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ غلاموں کی موجودگی میں اگر کوئی شخص غلام خرید کر آزاد کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو وہ تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے' لیکن آج جبکہ غلامی ختم ہو چکی ہے اب جو شخص غلام آزاد کرنے کی مقدرت رکھتا ہے' غلامی ختم ہو جانے کی وجہ سے اب وہ کیا کرے گا؟ کیونکہ اب تو کوشش کے باوجود بھی غلام میسر نہیں آ سکتا۔ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے جس میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ لیکن اس میں مناسب رائے یہی معلوم ہوتی ہے کہ ایسا شخص غلام کی قیمت کے مطابق صدقہ کرے اور یہ صدقہ غریب اور نادار مسلمانوں کے قرضوں کی ادائیگی اور ان کے رہن شدہ مکانوں اور زمینوں کو چھڑانے پر صرف کیا جائے۔ اور اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو ان لوگوں کی اس رقم سے آزادی کا سامان کیا جائے جو بے گناہ پکڑے گئے ہوں اور کوئی ان کے کیسوں کی پیروی کرنے والا نہ ہو یا وہ اپنی قید کی مدت گزار چکے ہوں لیکن محض جرمانے کی ادائیگی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی رہائی رکی ہوئی ہو۔ یہ بھی ایک طرح کے غلام ہیں اگر انہیں صدقے کی اس رقم سے آزادی نصیب ہو جائے تو یہ غلام کی آزادی کا بہترین بدل ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ یہاں توبہ کا لفظ مفعول واقع ہوا ہے لیکن اس کا فعل مذکور نہیں۔ عربی کا قاعدہ یہ ہے کہ جب بھی مفعول فعل کے بغیر آئے تو عموماً اس پر خاص تاکید اور زور دینا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ اگر کسی قتل خطا کے مرتکب غلام خریدنے کی استطاعت نہیں تو بہر صورت دو مہینوں کے لگاتار روزے رکھنے چاہئیں۔ یہ بات کسی شخص پر بھی شاق نہیں گزرنی چاہئے اور اس سے لاپرواہی برتنی چاہئے کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ توبہ ہے۔ قتل مومن غلطی ہی سے سہی عظیم گناہ ہے۔ اس گناہ کو دھونے کے لیے صرف خون بہا کافی نہیں۔ اس کے لیے غلام کو آزاد کرنا چاہئے اور اگر اس کی مقدرت نہ ہو تو لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے جائیں تاکہ دل پر لگا ہوا گناہ کا داغ اچھی طرح دھل جائے اور آدمی بار بار اللہ سے رجوع کرے کہ میرے ہاتھوں ایک بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے اگرچہ میرے ارادے کو اس میں دخل نہیں تھا لیکن یہ اتنا بڑا نقصان ہے جو ان جانے میں مجھ سے ہوا' میں ہر روزے کے ساتھ اس کے لیے مغفرت طلب کرنا چاہتا ہوں اور اس کے احساس کو زندہ رکھ کر اپنے آپ کو اس کے گناہ سے صاف کرنا چاہتا ہوں۔

Marfat.com

وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا۝

''اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزاء جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے۔ اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔'' (النسآء:۹۳)

قتلِ عمد کی سزا اور اس جرم کی سنگینی

قتل خطا کے احکام بیان کرنے کے بعد قتل عمد کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ جو مسلمان کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے گا اس کی سزا جہنم ہے وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہے۔ اور اس کے لیے دردناک عذاب اللہ نے تیار کر رکھا ہے۔ قرآنِ کریم نے کفار کے بارے میں جس سزا کا ذکر کیا ہے وہ بعینہٖ یہی ہے۔ ان پر اللہ کا غضب بھی بھڑکے گا' وہ لعنت کے مستحق بھی ہوں گے' انہیں جہنم کی ابدی سزا بھی دی جائے گی اور وہ بدترین عذاب کا شکار ہوں گے۔ اور یہاں جس قتل کا ذکر ہو رہا ہے اس کا ارتکاب کرنے والا کافر نہیں مومن ہے' لیکن اس کو سزا کافروں جیسی دی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے جو حقوق ہیں ان میں سب سے بڑا حق جان کا احترام ہے۔ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل کر دیتا ہے تو وہ گویا دوسرے مسلمان کا سب سے بڑا حق چھین لیتا ہے۔ حقوق العباد میں قاعدہ یہ ہے کہ جو آدمی کسی شخص کی حق شکنی یا حق تلفی کرتا ہے تو اس کی معافی کی اس کے سوا کوئی صورت ممکن نہیں کہ جس کا اس نے نقصان کیا ہے یا جس کو اذیت دی ہے خود اسی سے معافی مانگے۔ کیونکہ حقوق العباد میں اللہ تعالیٰ بھی مداخلت نہیں کرتے۔ جس کا حق چھینا گیا ہے وہی معافی دے گا تو اللہ معاف فرمائیں گے اور اگر وہ معاف نہیں کرے گا تو اللہ معاف نہیں فرمائیں گے۔ اور یہاں حال یہ ہے کہ جو اس گناہ کو معاف کر سکتا ہے وہ دنیا سے چلا گیا ہے۔ اس کے وارث قصاص یا دیت کو تو معاف کر سکتے ہیں لیکن اس گناہ کو معاف نہیں کر سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب قاتل کا مقتول سے قیامت کے دن آمنا سامنا ہو گا۔ جہاں معافی کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ مقتول قاتل سے اللہ کے سامنے اپنا حق مانگے گا اور وہاں چونکہ حق کی ادائیگی ناممکن ہے اس لیے پروردگار اس عظیم جرم کے بدلے میں اسے وہ سزا دیں گے جو ایک کافر کو دی جاتی ہے۔

ہمارے علماءِ کرام قرآن وسنت کی بعض دوسری وضاحتوں کے پیش نظر یہ کہتے ہیں کہ ایک مومن جو ایمان کی حالت میں مرتا ہے اس نے چاہے کتنے بھی کبائر کا ارتکاب کیوں نہ کیا ہو وہ اپنے ایمان کی وجہ سے ایک نہ ایک دن جنت میں ضرور جائے گا۔ وہ اپنی بد اعمالیوں کی سزا بھگتے گا لیکن بالآخر اللہ کی رحمت اسے اپنی آغوش میں لے لے گی اور اسے جہنم سے نکال دیا جائے گا۔ اس اصول کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قتل عمد کی حقیقی سزا تو یہی ہے جو اس آیت کریمہ میں بیان کی گئی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس کا نفاذ نہیں فرمائیں گے۔ وہ اپنے اصولِ مغفرت کے مطابق قاتل کو سخت سے سخت سزا دیں گے لیکن اس کے ایمان کا لحاظ کرتے ہوئے اسے ہمیشہ جہنم میں نہیں رکھیں گے بلکہ ایک نہ ایک دن اس کی مغفرت ہو جائے گی۔

Marfat.com

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم خدا کی راہ میں نکلا کرو تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ اور جو تمہیں سلام کرے اسے فوراً نہ کہہ دیا کرو کہ تم مومن نہیں ہو۔ تم دنیوی زندگی کا سامان چاہتے ہو اللہ کے پاس بہت سے اموالِ غنیمت ہیں۔ تم بھی اس سے پہلے اسی طرح تھے پس اللہ نے تم پر احسان فرمایا تو تحقیق کر لیا کرو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔'' (النسآء:۹۴)

سلام کہنے والوں کو مسلمان سمجھو اور قتل مت کرو

اس آیتِ کریمہ کے نزول کے وقت مسلمان ایک عجیب صورتِ حال سے دوچار تھے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت تو ہجرت کر کے مدینہ آ چکی تھی لیکن ابھی تک کچھ ایسے مسلمان بھی تھے جو اپنی حقیقی مجبوریوں کے باعث ہجرت کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔ مشرکین مکہ نے عرب کے بیشتر قبائل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ لگا رکھی تھی۔ اس لیے مسلمان مجبور تھے کہ وقتاً فوقتاً کبھی سرایا کی شکل میں اور کبھی غزوات کی صورت میں ایسے قبیلوں پر حملہ کریں جن کے بارے میں اطلاعات ملتی تھیں کہ وہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ ایک طرف دشمنوں کے عزائم کے باعث مسلمان حملہ کرنے پر مجبور تھے اور دوسری طرف وہاں گھرے ہوئے مسلمانوں کی جان کی بھی فکر تھی کہ اس حملہ کی صورت میں انہیں کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ مزید پیچیدگی یہ تھی کہ اس بات کا بھی شدید امکان تھا کہ ہم بعض علامتوں کے باعث کسی کو مسلمان سمجھ کے اس سے عین حالت جنگ میں ہاتھ روک لیں، لیکن وہ حقیقت میں کافر ہو اور موقع پا کر ہاتھ روکنے والے کا سر قلم کر دے۔ اس طرح کے حالات میں مسلمانوں سے غلطیوں کا صدور بھی ہو رہا تھا۔ جہاد کے سفر میں کوئی شخص بکریاں چراتا ہوا مل گیا، اسے معلوم نہیں تھا کہ یہاں سے مسلمانوں کا لشکر گزر رہا ہے، مسلمان مصارفِ جنگ اور زندگی کی باقی ضروریات کے لیے شدید تہی دامن تھے۔ اس لیے زندگی کی بقا اور جہاد کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جب بھی کوئی موقع ملتا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ اسی مصلحت کے پیش نظر جب کوئی بکریاں چراتا ہوا شخص کافروں کے علاقے میں نظر آتا تو حالتِ جنگ میں چونکہ لوگوں کو قتل کرنا اور ان کا مال چھین لینا جائز ہوتا یہ اس کی طرف آگے بڑھتے تو وہ سلام کہہ دیتا یا لا الہ الا اللہ کہہ دیتا تو ایسی صورت میں مسلمان یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ یہ شخص اپنی جان اور اپنا مال ہم سے بچانا چاہتا ہے چنانچہ یہ اسے قتل کر دیتے اور اس کا مال چھین کر لے آتے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ جنگ چھڑ گئی اور کافر مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ لے آئے جو اپنا اسلام اخفاء میں رکھتے تھے۔ اگر وہ ان کے سامنے اپنے اسلام کا اعلان کرتے تو وہ شاید پہلے انہیں قتل کر دیتے ایسے مسلمان جنگ میں شریک ہونے پر مجبور تھے۔ لیکن جب عین جنگ کے دوران کسی مسلمان سے ان کا سامنا ہوتا تو وہ ا

Marfat.com

دیکھتے ہی فوراً اسلام کہتے تا کہ مسلمان یہ سمجھ جائیں کہ ہم بھی ان کے بھائی ہیں کیونکہ اسلام نے سلام کو مسلمانوں کے لیے شعار اور علامت کی حیثیت دے دی تھی اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دیکھ کر جب سلام کہتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ میں تمہارے ہی گروہ کا آدمی ہوں' تمہارا دوست اور ہمدرد ہوں۔ میرے پاس تمہارے لیے سلامتی اور عافیت کے علاوہ کچھ نہیں لہٰذا نہ تم مجھ سے دشمنی کرو اور نہ میری طرف سے عداوت اور ضرر کا اندیشہ رکھو۔ چنانچہ انہی احساسات کے ساتھ وہ مسلمان سلام کہتا اور اس کے پاس اس کے سوا بچ نکلنے کا اور کوئی راستہ بھی نہ تھا کیونکہ سامنے مسلمان تھے اور پیچھے کافر۔ لیکن بعض دفعہ مسلمان یہ سمجھ کر کہ یہ شاید ہمیں فریب دے رہا ہے وہ اسے قتل کر دیتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے موقعوں پر شدید تنبیہ فرمائی۔ غالباً حضرت اسامہ اور ایک دفعہ حضرت خالد بن ولیدؓ سے کچھ ایسے ہی ملتے جلتے الفاظ فرمائے جس کا مفہوم یہ تھا کہ تم نے جسے سلام یا کلمہ سن کر بھی قتل کر دیا ہے جب وہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے تمہارے خلاف اپنا کلمہ لے کر آئے گا تو تم اس وقت کیا جواب دو گے؟ اور پھر آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور کہا ''یا اللہ میں اس خون سے بری ہوں۔'' آپ کی یہ تنبیہ دل دہلا دینے کے لیے کافی تھی۔ لیکن چونکہ یہ انفرادی واقعات تھے مجموعی طور پر اس طرح کی کوتاہیوں کا ازالہ نہ ہو سکا۔ چنانچہ پروردگار نے مداخلت فرمائی اور اس آیتِ کریمہ میں مستقلاً چند احکام نازل فرمائے۔ پہلا حکم یہ دیا کہ مسلمانو! کسی بھی قبیلے پر حملہ کرنے سے پہلے اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو کہ وہاں مسلمان تو نہیں اور مزید یہ کہ اگر اس بات کا امکان ہو کہ اس قبیلے میں مسلمان بھی موجود ہیں تو پھر جس طرح حدیث میں آیا ہے کہ اس بستی یا اس قبیلے پر حملہ کرنے سے پہلے اذان کہو تا کہ مسلمان باخبر ہو جائیں اور وہ اپنے بچاؤ کی تدبیر کر لیں اور یا بروقت مسلمانوں سے رابطہ کر لیں اور دوسرا حکم یہ دیا کہ اگر عین حالت جنگ میں کوئی شخص تمہیں سلام کہہ دے یعنی وہ اپنے اسلام کا اظہار کرے اور سلام کے ذریعے اپنے مسلمان ہونے کی خبر دے تو جنگ کی حالت میں اگرچہ ہر سلام کہنے والے کا اعتبار کرنا مشکل ہے اس سے کچھ نقصان بھی ہو سکتا ہے لیکن تم ہر طرح کے نقصان کا سامنا کرتے ہوئے اس سلام کہنے والے کے سلام کی پاسداری کرو' اسے مسلمان سمجھو اور اسے اپنی حفاظت میں لے لو۔ اس کے سلام پر بے اعتباری کرتے ہوئے یہ مت کہو کہ تم مومن نہیں جو ہمیں فریب دے رہے ہو۔ تمہیں اس کے قتل کرنے سے زیادہ سے زیادہ اس کا اسلحہ' اس کی وردی اور اس کے پاس جو کچھ ہے وہ مل سکتا ہے۔ لیکن یاد رکھو یہ بہت معمولی فائدہ ہے۔ جس کے لیے کسی مسلمان کی جان کو خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ اگر تم ان خطرات کو سامنا کرتے ہوئے ایک مسلمان کی جان بچاتے ہو تو تمہارے لیے اللہ کے پاس بے شمار غنیمتیں ہیں' ان گنت نعمتیں ہیں' اللہ کی رضا ہے' اجر و ثواب کے خزانے ہیں۔ اور پھر یہ بات بھی سوچو کہ جس طرح آج ایک شخص اپنی جان بچانے کے لیے سلام کے ذریعے کوشش کر رہا ہے کیونکہ اپنے لوگوں میں اپنے ایمان کی اظہار کی ہمت نہیں پاتا تم بھی تو اس سے پہلے ایسے ہی حالات سے گزرے ہو دشمن کے ڈر سے اپنے اسلام کو چھپانے پر مجبور تھے۔ اللہ نے تم پر احسان کیا' تمہیں ایک اجتماعیت کا حصہ بنا دیا' اب تم اللہ کے فضل و کرم سے دین کی علمبرداری کر رہے ہو اس احسان کی شکر گزاری کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ ابھی تک اس صورتِ حال سے دوچار ہیں ان سے نرمی سے پیش آؤ' ان کے ایمان پر بھروسہ کرو' ان کی جان بچانے کے لیے اگر خطرات بھی مول لینے پڑیں تو اس سے دریغ نہ کرو اور یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تمہارے ہر طرح کے اعمال سے باخبر ہے۔ کوتاہیوں کو بھی دیکھتا ہے نیکیوں کو بھی جانتا ہے۔ اس سلسلے میں جو نیکی انجام دو گے اس کی جزا پاؤ گے اور کوتاہی کرو گے تو اللہ کی طرف سے سزا کا اندیشہ ہے۔

Marfat.com

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ
وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ
دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۠

''مسلمانوں میں سے غیر معذور بیٹھ رہنے والے اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں۔ مال و جان سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ فضیلت کا بخشا ہے اور سب سے وعدہ فرمایا ہے اللہ نے بھلائی کا اور فضیلت دی ہے اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر اجر عظیم سے۔ اس کی طرف سے بلند درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔'' (النسآء: ۹۵ تا ۹۶)

جہاد کی ترغیب اور اس کے مختلف درجات

اس آیتِ کریمہ کو سمجھنے سے پہلے ایک ضروری بات کو جان لیجئے کہ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ نے جو جہاد فرض فرمایا ہے اس کے مختلف درجات ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ کسی طاقت نے مسلمان ملک پر حملہ کر دیا ہے یا کسی قوم سے متعلق موثق ذرائع سے یہ اطلاع ملی ہے کہ وہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ ہے۔ بس آج کل میں ان کی طرف سے حملہ ہونے والا ہے یا مسلمانوں کے ہمسایہ ملک میں جہاں مسلمان آباد ہیں کوئی غیر مسلم ملک حملہ کر دے اور ہمسایہ مسلمان ملک میں اپنے دفاع کی طاقت نہ ہو۔ ایسی تمام صورتوں میں مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ مسلمان حکومت یا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس جہاد کا اعلان کرے اور اس کا انتظام کرے۔ لیکن اس میں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کیا اس جہاد کے لیے ملک کے ہر صحت مند شہری کو نکلنا ضروری ہے یا ایک متعین تعداد چلی جائے تو دفاع یا اقدام کی ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔ اگر تو دوسری صورت ہے یعنی ساری قوم کے ہر فرد کی شرکت ضروری نہیں بلکہ ایک متعین تعداد اس مقصد کے لیے کافی ہے تو پھر ایسے جہاد کو فرضِ کفایہ کہتے ہیں یعنی ضرورت کے مطابق مجاہدین کے چلے جانے سے باقی لوگوں سے اس جہاد کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ اور اگر حالات ایسے شدید ہو جائیں کہ قوم کے ایک ایک نوجوان کو اس میں شریک ہونا ضروری ہو ورنہ اس کے بغیر نہ ملک بچتا ہے اور نہ مسلمان محفوظ رہتے ہیں تو پھر جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ فرضِ عین ہونے کی صورت میں حکومت کو نفیرِ عام سے کام لینا ہوتا ہے۔ یعنی سب کو نکلنے کا حکم دیا جاتا ہے' جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پروردگار نے جنگ تبوک کے موقعے پر نفیر عام فرمایا تھا۔ ایسی صورت میں کوئی مسلمان بھی پیچھے نہیں رہ سکتا اور جو مسلمان بغیر کسی شرعی عذر کے پیچھے رہے گا اسے منافق سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر جہاد فرضِ کفایہ ہے تو پھر مسلمانوں کو نکلنے کی ترغیب دی جاتی ہے' لیکن ہر آدمی پر یہ جہاد فرض نہیں ہوتا ضرورت کے مطابق لوگ جہاد کے لیے نکل جائیں تو نماز جنازہ کی طرح باقی لوگوں سے یہ ذمہ داری اتر جائے گی۔ وہ اپنی جائز ضرورتوں میں مصروف رہیں تو نہ حکومت ان سے تعرض کرے گی نہ کوئی مسلمان ان پر تنقید کر سکتا ہے۔ البتہ یہ بات ضروری ہے کہ پیچھے رہ جانے والے ایسے لوگ جن کے پاس پیچھے رہ جانے کا کوئی شرعی عذر نہیں اور جہاد کے لیے جانے والے اجر و ثواب اور مرتبے کے اعتبار سے برابر نہیں۔ اگر پیچھے رہ جانے

Marfat.com

والے تصنیف وتالیف جیسے اہم کام میں مصروف ہوں، تعلیم وتعلم میں لگے ہوئے ہوں یا اس لیے کاروبار میں مشغول ہوں تاکہ مجاہدین کی مدد کی جا سکے۔ یہ سارے کام نہ صرف جائز ہیں بلکہ اجر وثواب کے مستحق بھی ہیں لیکن اللہ کے راستے میں سفر کرنا، سفر کی صعوبت اٹھانا، موسم کی شدت برداشت کرنا اور پھر اللہ کی رضا کے لیے اپنی جان تک پیش کر دینا یہ ایک ایسا کام ہے کہ جس کی ہمسری کا دعویٰ کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ نے گھروں میں بیٹھ رہنے والے لیکن جائز مقاصد کو پورا کرنے والوں کے لیے اجر وثواب تو رکھا ہے لیکن یہ اجر وثواب میں مجاہدین کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے مجاہدین کو قاعدین پر اجر عظیم کی فضیلت دی ہے، ان کے لیے درجات ہیں، مراتب ہیں، اللہ کی مغفرت ہے، اس کی رحمت ہے لیکن گھروں میں بیٹھ رہنے والے یقیناً اجر وثواب کے مستحق ہیں لیکن جو کچھ اللہ نے مجاہدین کے لیے رکھا ہے وہ اس کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ اس میں ایک طرح سے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب بھی دی جا رہی ہے۔ اور یہ تصور بھی دیا جا رہا ہے کہ زندگی کے تمام جائز کام کرنے کے ہیں اور تمہیں ان میں حصہ لینا چاہیے اور تمام ذمہ داریاں ادا کرنے کی ہیں، تمہیں ان کی ادائیگی کی فکر کرنی چاہیے۔ لیکن جب جہاد فرضِ کفایہ بھی ہو جائے تو پھر جو شخص اللہ کے قرب کا خواہش مند ہے اور وہ بیش از بیش اجر وثواب چاہتا ہے اسے جہاد کے لیے نکلنا چاہیے۔ یہ وہ نیکی ہے کہ جس کے برابر کوئی فضیلت نہیں۔ اور یہ وہ کام ہے جس کے ساتھ قوموں کی عزتیں وابستہ ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ
تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۖ قَالُوْا كُنَّا
مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوْٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً
فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۚ فَأُولٰٓئِكَ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿٩٧﴾
إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿٩٨﴾ فَأُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّعْفُوَ
عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿٩٩﴾ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۚ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ
مُهَاجِرًا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهٗ

Marfat.com

عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٠٠﴾ ع

عربی رکوع ۱۴ (بے شک جن لوگوں کی فرشتے جان قبض کریں گے اس حال میں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہوں گے' وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں پڑے رہے؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم زمین میں بے بس تھے۔ وہ کہیں گے کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ہاں وہ بے بس مرد اور عورتیں اور بچے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکتے تھے اور نہ کوئی راہ پا سکتے تھے۔ بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگذر کرنے والا ہے ○ اور جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بڑے بڑے ٹھکانے اور وسعت پائے گا۔ اور جو شخص اپنے گھر سے مہاجر بن کے نکلے اور پھر اسے راستے میں ہی موت آ جائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ثابت ہو گیا۔ اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے) (آیات ۹۷ تا ۱۰۰)

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ○ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ○ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ○

"بے شک جن لوگوں کی فرشتے جان قبض کریں گے اس حال میں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہوں گے' وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں پڑے رہے؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم زمین میں بے بس تھے۔ وہ کہیں گے کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ہاں وہ بے بس مرد اور عورتیں اور بچے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکتے تھے اور نہ کوئی راہ پا سکتے تھے۔ بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگذر کرنے والا ہے۔" (النسآء: ۹۷ تا ۹۹)

تمام غیر معذور مسلمانوں کو ہجرت کا حکم ترغیب اور ترہیب کے ذریعے

اس آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کو جو اسلام لانے کے باوجود کسی شرعی مجبوری کے نہ ہوتے ہوئے بھی ہجرت کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے آخری دفعہ ہجرت پر اکسایا گیا ہے۔ ترغیب بھی دی گئی ہے اور ترہیب سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس آیتِ کریمہ کو پڑھتے ہوئے آدمی کا دل لرزتا ہے اور اگر ایمان کی کچھ بھی رمق باقی ہو تو چند باتیں اس سے بڑی آسانی سے سمجھ میں آتی ہیں۔ سب سے بڑی بات جس پر زور معلو

Marfat.com

ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی ایک کافر کی زندگی کی طرح صرف زندگی کی آسائشوں کے حاصل کرنے کا نام نہیں۔ حیوان کی طرح کھانے پینے اور کسی بھٹ میں زندگی گزار دینے اور بچے پیدا کرنے اور پالنے کا نام نہیں۔ یہ اگرچہ حیوانی ضرورتیں ہیں جو انسان کے ساتھ بھی لاحق ہیں۔ لیکن ایک مسلمان کی زندگی ان ضرورتوں کے حصول کے بعد مقاصد پورا کرنے کی زندگی ہے۔ اللہ نے جو سب سے بڑا فرض ایک مسلمان پر عائد کیا ہے وہ یہ ہے کہ اسے زندگی گزارنے کے جو آداب سکھائے گئے ہیں اور اس سلسلے میں جن فرائض و واجبات کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی زندگی کی جو منزل ٹھہرائی گئی ہے انہی مقاصد کا حصول اور انہی کا عکاس طرزِ زندگی اور اسی منزل کی طرف مسلسل رواں دواں رہنے کی کوشش اور خواہش وہ زندگی ہے جس کا ایک مسلمان کو مکلف بنایا گیا ہے۔ اگر اسے ایسا وطن میسر ہے جس میں وہ اسلامی آداب کے مطابق اسلامی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے پوری اسلامی زندگی گزارنے پر قادر ہے تو پھر تو اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے اور اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں لگا رہنا چاہئے' لیکن اگر وہ کسی ایسے وطن میں رہتا ہے جہاں اس کے لیے اسلامی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنا ممکن نہیں تو اب اس کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اسلام کو اس سرزمین پر غالب کرنے اور نظام کفر کو نظام اسلام میں تبدیل کرنے کی امکانی حد تک جدوجہد کرتا رہے۔ جس طرح انبیاء علیہم السلام اور ان پر ایمان لانے والے اپنی افرادی کمی اور مالی و سیاسی بے بسی کے باوجود ہر حال میں کرتے رہے۔ اس جدوجہد کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اسے اس سے سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ کامیابی نصیب ہو جائے تو اللہ کا انعام ہے اور اگر کامیابی نہ ملے اسی راستے میں زندگی کھپا دینا یا اس مقصد پر زندگی قربان کر دینا اس کا مقصد ہونا چاہئے۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ اس وطن کو چھوڑ کر ایسے وطن میں جانے کی کوشش کرے جہاں اسے پوری اسلامی زندگی کے امکانات نظر آتے ہوں اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ وہاں میں اسلامی فرائض کی ادائیگی کر سکتا ہوں۔ اپنے وطن سے نکل کر محض غلبۂ دین اور اللہ کی رضا کی خاطر ایک ایسی جگہ کو وطن بنانا جس میں اللہ کا دین غالب ہو اور اسلامی زندگی کے تقاضے پورے کیے جا سکتے ہوں اسی کو ہجرت کہتے ہیں۔ جو شخص بھی ہجرت کر سکتا ہو یعنی اس کے پاس اتنے وسائل میسر ہیں کہ وہ وطن سے نکلنے اور دارالسلام پہنچنے پر قادر ہے لیکن وہ پھر بھی ہجرت نہ کرے محض وطن کی محبت اور اپنے مال و دولت کی ہوس اسے نکلنے کی اجازت نہ دے اور وہ اسی کو بے بسی سمجھ کر اپنے وطن میں قیام پذیر رہے تو یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں یہاں فرمایا گیا ہے کہ جب فرشتے ان کی روح قبض کریں گے تو وہ ان سے پوچھیں گے کہ تمہاری زندگی کا مقصد کھانا پینا تو نہیں تھا بلکہ اسلامی زندگی گذارنا تھا اور اس کے امکانات تمہارے وطن میں بالکل نہ تھے تو پھر تم یہاں پڑے کیا کرتے رہے ہو؟ تم نے یہاں رہ کر اپنی زندگی پر ظلم کیا ہے کیونکہ زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اسے اللہ کے احکام کے مطابق گذارا جائے اور اسلامی زندگی کے ایک ایک تقاضے کو پورا کیا جائے۔ لیکن تم نے چھپ چھپ کر نمازیں پڑھنے کو ہی اسلامی زندگی سمجھ لیا اور زندگی اس طرح گزاری کہ جس پر نظام کفر کا غلبہ تھا۔ یہ وہ ظلم ہے جو تم نے اپنے اوپر ڈھایا کہ تمہیں اللہ نے ایک دین دے کر دنیا پر غالب آنے کا رستہ دکھایا لیکن تم نے کفر کے سائے میں سانس لینے اور چھپ کر نمازیں پڑھنے کو اسلامی زندگی سمجھ لیا۔ متحدہ ہندوستان میں بعض لوگ یہی سمجھتے تھے کہ ہماری مسجدیں ہیں' بزرگوں کے مزار ہیں' مدارس ہیں' ہمیں نمازیں پڑھنے کی اجازت ہے اور ہم کس بات کی آزادی چاہتے ہیں تو اقبال نے کہا تھا۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
بے چارہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

Marfat.com

وہ جواب میں کہیں گے کہ ہم اپنے وطن میں بڑے بے بس تھے۔ فرشتے ان کی بات کو ٹوکتے ہوئے کہیں گے کہ ہم تمہاری بے بسی کو سمجھتے ہیں۔ تم اپنے دنیوی مفادات کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے اور اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہو کر تم دارالسلام جانے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ تمہاری بے بسی ہوس کی بے بسی تھی۔ تم دنیوی فوائد سے دستبردار ہونے کو بے بسی کا نام دیتے ہو اور کنویں کے مینڈک کی طرح تم اپنے وطن اور اپنے گھر سے باہر دیکھنے کی ہمت سے محروم ہو' کیا تمہیں معلوم نہ تھا کہ اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے۔ تمہارے سامنے مدینہ دارالسلام کے طور پر موجود تھا' اس نے اپنی آغوش تمہارے لیے کھول رکھی تھی۔ لیکن اگر کسی دور میں دارالسلام نہ بھی ہو تو کیا زمین میں کوئی پہاڑ یا جنگل نہیں جہاں تم درختوں کے پتے کھا کے اور بکریوں کا دودھ پی کے زندگی گزار سکو۔ لیکن اللہ کے احکام کی تعمیل کی تمہیں آزادی میسر ہو اور کفر کے احکام کی اطاعت سے تم بچے رہو۔

یہ صحیح ہے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان لانے والوں کے لیے ہجرت کو فرض قرار دیا تھا اور اسے ایمان کی علامت بنا دیا تھا اور جس نے ہجرت کی استطاعت کے باوجود ہجرت نہیں کی اسے منافق قرار دیا گیا۔ آج یقیناً یہ صورتِ حال نہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ اپنا وطن چھوڑ کر مدینے کی اسلامی ریاست کی طرف ہجرت کرنا بذاتِ خود تو کوئی مقصد نہ تھا' اس کی اصل علت تو یہ تھی کہ وہاں اسلامی نظامِ زندگی کو بروئے کار نہیں لایا جا سکتا تھا۔ کفر کا شکنجہ مسلمانوں کو اس طرح جکڑے ہوئے تھا کہ انفرادی طور پر بھی چھپ چھپ کر اسلامی احکام پر عمل کیا جا رہا تھا۔ اور جہاں تک اجتماعی زندگی کا تعلق ہے اس میں تو اسلامی احکام کو بروئے کار لانے کا تصور بھی مشکل تھا۔ اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہجرت کا حکم دیا تا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی اسلامی احکام کے مطابق گزارنے کی آزادی ہو اور اسلامی احکام کے مطابق اجتماعی ادارے وجود میں لائے جائیں اور ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی جو اسلام نے عطا کیا تھا اسے بلا کم و کاست نافذ کیا جائے۔ یہ وہ علت ہے جو ہجرت کی فرضیت کا باعث بنی۔ آج اگر کسی ملک میں مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے مسلمانوں کی صورتِ حال سے دوچار ہوں اور انہیں اسلامی زندگی گزارنے کے لیے ایک آزاد وطن کی ضرورت محسوس ہو تو ایسی صورت میں مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک آزاد ملک کے حصول کے لیے کوشش کریں اور وہاں اسلامی زندگی کو پوری طرح بروئے کار لانے کے لیے اسلامی نظام کو نافذ کریں۔ اسی مقصد کی خاطر ہندوستان کے مسلمانوں نے پاکستان کی طرف ہجرت کی تھی اور اسی مقصد کے لیے پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ رہی یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ''لاہجرۃ بعد الفتح'' (یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے) یہ حدیث کوئی دائمی حکم نہیں' بلکہ اس وقت کے حالات کے تناظر میں آپؐ نے ایسا ارشاد فرمایا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ فتح مکہ کے بعد عرب میں کفر کا زور ٹوٹ گیا اور قریب قریب پورا ملک اسلام کے زیرِ نگیں گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہجرت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لیکن اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے تمام حالات میں قیامت تک کے لیے ہجرت کی فرضیت منسوخ ہو گئی ہے۔

جن لوگوں نے اپنے لیے ''مستضعفین'' کا لفظ محض بہانہ سازی کے لیے اختیار کیا تھا انہیں سخت سرزنش کی گئی اور ان کے انجام کے بارے میں فرمایا کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ اندازہ فرمایئے کہ یہ لوگ کلمہ گو ہیں' نمازیں پڑھتے ہیں' ممکن ہے اور بھی بھلے کام کرتے ہوں لیکن جرم صرف یہ تھا کہ انہوں نے اسلام کی بالادستی اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے اپنے آپ کو پیش نہیں کیا۔ نظامِ کفر سے پوری طرح ناطہ توڑ کر اپنے آپ کو نظامِ اسلام سے وابستہ نہیں کیا۔ دنیا کی آسائشوں اور راحتوں کو اپنا مقصد بنایا

Marfat.com

اللہ کے دین کے لیے دنیا کو قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں پھینک دیے گئے۔

کاش آج مسلمان اس بات پر غور کریں کہ ہم ساٹھ سے زیادہ اپنے آزاد ممالک رکھتے ہیں اور کسی ایک مسلمان ملک میں بھی اسلام کا نظام زندگی نافذ نہیں۔ انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی کے ایک ایک گوشے تک نظام کفر کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ لیکن ہمیں اس سے کبھی تشویش نہیں ہوئی۔ ہم ملکی وسائل کی کمیابی کا رونا روتے ہیں غربت بڑھ جانے پر دہائی دیتے ہیں' ہمارا معیارِ زندگی اتنا نہیں بڑھ پا رہا جس کی ہم توقع کرتے ہیں اس سے ہمیں شدید شکایت ہے۔ لیکن وہ غلبۂ دین اور اسلامی نظام جو ایک مسلمان کی زندگی کا اصل ہدف اور مقصد ہے اس کا ایک ایک تسمہ ٹوٹ رہا ہے' ایک ایک تقاضا پامال ہو رہا ہے' ہمیں اس سلسلے میں کوئی تشویش نہیں ہماری غالب اکثریت اس حوالے سے بالکل بے فکر ہے' اللہ ہی بہتر جانتا ہے کل کو ہمارا انجام کیا ہونے والا ہے۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا سے ان حقیقی مستضعفین کا ذکر کیا جا رہا ہے جو واقعتاً بے بس ہیں۔ جن میں مرد بھی ہیں' عورتیں بھی ہیں' بچے بھی ہیں۔ وہ ایسی بے بسی کی زندگی گزار رہے ہیں کہ کوشش اور خواہش کے باوجود ہجرت کے لیے کوئی راستہ نہیں پاتے' انہیں کوئی تدبیر نہیں سوجھتی' نظامِ کفر کے شکنجے میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ انہیں آواز نکالنے کی بھی ہمت نہیں' اللہ کی نگاہ میں یہ لوگ واقعی بے بس ہیں اور ان کی بے بسی کا لحاظ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ امید ہے اللہ تعالیٰ ان سے عفو و درگزر کا سلوک کرے گا۔ کیونکہ وہ ذات درگزر کرنے والی اور رحم کرنے والی ہے۔ وہ کسی شخص پر ایسی ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتی جس کو وہ اٹھا نہ سکے۔ یہ بے بس لوگ چونکہ ہجرت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اس لیے وہ کوشش اور خواہش کے باوجود ہجرت کرنے کے لیے کوئی راستہ نہ نکال سکے۔ اللہ جو رحیم و کریم ہونے کے ساتھ ساتھ عادل اور منصف بھی ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ان کی بے بسی کے باوجود انہیں سزا دے۔ یہاں لفظ اگرچہ عسیٰ آیا ہے جو امید اور توقع کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن بادشاہ جب کسی کو امید دلاتے ہیں تو اس شخص کے گھر میں شادیانے بجنے لگتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بادشاہوں کے منہ پر امید کا لفظ دوسروں کی زبانوں پر یقین سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو سب سے بڑا ہے۔ اس کی طرف سے امید کا لفظ یقیناً ایک ایسا سہارا ہے جس سے بڑھ کر کوئی سہارا نہیں ہو سکتا۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ
وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ
فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

"اور جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بڑے بڑے ٹھکانے اور وسعت پائے گا۔ اور جو شخص اپنے گھر سے مہاجر بن کے نکلے اور پھر اسے راستے میں ہی موت آ جائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ثابت ہو گیا۔ اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" (النسآء : ۱۰۰)

Marfat.com

ہجرت پر دنیوی اور اخروی برکات کے دعوے

پہلے ترہیب سے کام لیا گیا اب ترغیب دی جا رہی ہے۔ ترغیب کے سلسلے میں قرآن میں دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ جو آدمی اللہ کے راستے میں ہجرت کرتا ہے یعنی اس کا مقصد صرف اللہ کی رضا کا حصول' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض اٹھانا' مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا حصہ بننا اور وقت کے ساتھ ساتھ نازل ہونے والے احکام کے لیے اپنے آپ کو آمادہ رکھنا ہے۔ ایسے آدمی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیش بہا اخروی نعمتیں رکھی ہیں۔ سورہ البقرہ میں ہجرت اور جہاد کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا "اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَۃَ اللّٰہِ" (یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں) اور سورہ التوبہ میں ارشاد فرمایا "اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ" (یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے پاس بڑے درجہ میں ہیں اور یہی لوگ کامیاب اور بامراد ہیں) ایک مومن کے لیے اخروی کامیابی اور اخروی نعمتیں ہی اصل مقصود ہیں۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے اخروی نعمتوں کی نوید کے ساتھ ساتھ دنیوی نعمتوں کا بھی وعدہ فرمایا۔ سورہ النحل میں ارشاد فرمایا "وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا فِی اللّٰہِ مِنْم بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّھُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّلَاَجْرُ الْاٰخِرَۃِ اَکْبَرُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ" (جن لوگوں نے اللہ کے لیے ہجرت کی اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا ثواب تو بہت بڑا ہے۔ کاش یہ لوگ سمجھ لیتے) دنیوی نعمتوں کے حوالے سے ہی دوسرا وعدہ پیش نظر آیت کریمہ میں کیا گیا ہے۔ اس میں انعام کے طور پر دو باتوں کا ذکر فرمایا گیا کہ جو شخص اللہ کے راستے میں ہجرت کرے گا وہ پائے گا زمین میں (۱) مُرٰغَمًا کَثِیْرًا (۲) سَعَۃً۔ معلوم ہوتا ہے یہ دو الگ الگ نعمتیں ہیں۔ مراغم مصدر ہے جس کے معنی ہیں ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف منتقل ہونا اور منتقل ہونے کی جگہ کو بھی مراغم کہہ دیا جاتا ہے۔ اس لیے بعض اہلِ علم نے اس کا ترجمہ پناہ گاہ کیا ہے۔ لیکن صاحبِ کشاف معنی میں تو خاص فرق نہیں کرتے لیکن وجہ تسمیہ بہت خوب بیان کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مراغم کا لفظ رَغِمَ سے نکلا ہے۔ اور عربی محاورات میں "رَغِمَ اَنفُہٗ" (اس کی ناک خاک آلود ہو) ہم اکثر پڑھتے ہیں۔ اسی نسبت سے صاحبِ کشاف فرماتے ہیں "مراغما: مهاجرا و طريقا يراغم بسلوكه قومه او يفارقهم على رغم انوفهم" (یعنی مراغم کا معنی ہجرت گاہ یا ہجرت کا راستہ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ کافر جو ہجرت کرنے سے اسے بزور روک رہے ہیں ان کی ناک کو خاک میں ملا کر اس نے ہجرت کی) اس لحاظ سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو شخص اللہ کے راستے میں ہجرت کرتا ہے وہ اپنا گھر اور اپنا وطن اور اپنا زندگی بھر کا اثاثہ چھوڑ کے نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسے اللہ پر توکل رکھنا چاہئے اور اسے امید رکھنی چاہئے کہ وہ جہاں بھی ہجرت کر کے جائے گا وہاں اسے گھر ملے گا' اسے غذائی ضروریات مہیا ہوں گی' اسے دربدر کی ٹھوکریں نہیں کھانا پڑیں گی' بلکہ اسے ایک ایسا وطن میسر آئے گا جس میں اسے اللہ کے دین کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی ہوگی۔ وہ اس وطن کو اپنا کہہ سکے گا' اس کے دائیں بائیں اصحاب ایمان ہوں گے جو اس کے دست و بازو ہوں گے' وہ حفاظت کے ایسے حصار میں ہوگا کہ اسے دنیا کا کوئی غم پریشان نہیں کرے گا۔ دوسرا لفظ "سَعَۃً" اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ہر چیز میں وسعت عطا فرمائے گا اور وسعت اسی وقت نصیب ہو سکتی ہے جب اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو غلبہ اور سربلندی عطا فرمائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے مکہ معظمہ یا دوسرے قبیلوں سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ کو اپنا وطن بنا اللہ نے انہیں ساری نعمتیں عطا فرمائیں' چند ہی سالوں میں پورا جزیرۂ عرب ان کے قدموں میں ڈال دیا اور دیکھتے دیکھتے عجم کی قوتیں بھی ان کے سامنے سرنگوں ہو گئیں۔ جس قوم نے کبھی کسی ملک کی طرف رخ اس ارادے سے نہیں کیا تھا کہ ہم اس کو فتح کریں گے بلکہ قبائلی لڑائیوں

Marfat.com

سوا وہ فتوحات کا اور کوئی تصور نہیں رکھتے تھے' دنیا کے ایک کونے میں الگ تھلگ ایک جزیرے میں سمٹ کر انہوں نے صدیاں گزار دی تھیں اب اچانک صرف دس سالوں میں بارہ لاکھ مربع میل کے علاقے میں وہ حکمران ہو گئے اور اس کے بعد خلافتِ راشدہ میں یہ قافلہ بڑھتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ خیر کا ایک ایسا طوفان بن گیا کہ مزاحمت کی تمام قوتیں اس کے سامنے دم توڑ گئیں۔ اتنی بڑی عزت اور غلبہ و سربلندی کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ لوگوں نے دنیا کو اپنا مقصود نہیں بنایا بایں ہمہ دنیا بھر کی نعمتیں ان کے قدموں میں ڈھیر ہوتی چلی گئیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو کبھی بھوک کی شدت سے بے ہوش ہو جاتے تھے اور کھانے کے لیے روٹی میسر نہیں آتی تھی وہ مختلف علاقوں کے گورنر رہے۔ خود اپنی سابقہ زندگی کا ذکر کر کے اپنے آپ کو مخاطب فرماتے کہ اے ابو ہریرہ تو وہی ہے نا کہ فلاں قبیلہ کا نوکر تھا اور تجھے تنخواہ کے طور پر صرف پیٹ بھرنے کے لیے روٹی ملتی اور تیری ڈیوٹی یہ تھی کہ جب وہ لوگ سفر پہ جائیں تو تو ان کی سواریوں کے ساتھ پیدل چلے اور جب وہ کسی منزل پہ اتریں تو تو ان کے لیے جلانے کی لکڑیاں چن کر لائے۔ آج اسلام کی بدولت تو کہاں سے کہاں پہنچ گیا کہ لوگ تجھے امام اور امیر المؤمنین کہہ کر پکارتے ہیں۔

ان نعمتوں کے وعدے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں ایک اور بات بھی ارشاد فرمائی ہے کہ یہ ہمارے وعدے یقیناً ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو ہجرت کا سفر کر کے ''دار الهجرة'' میں پہنچ جائیں۔ لیکن اگر کوئی شخص گھر سے نکلتے ہی یا سفر کے دوران ''دار الهجرة'' پہنچنے سے پہلے پہلے اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے تو اس سے ہمارا وعدہ یہ ہے کہ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (کہ اس کا اجر اللہ کے ذمے ثابت ہو گیا) یعنی جتنی اخروی نعمتیں اللہ نے مہاجر کے لیے لکھی ہیں وہ ان تمام سے فیضیاب ہو گا۔ اور اپنے اخلاص کے مطابق نہ جانے کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ بعض روایات کے مطابق یہ آیتِ کریمہ حضرت خالد بن حزام رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جو ہجرت حبشہ کے ارادے سے گھر سے نکلے لیکن راستہ میں سانپ نے کاٹ لیا جس سے ان کی موت واقع ہو گئی۔ لیکن اللہ نے ان کی ہجرت کو قبول فرمایا اور ان کے لیے اجر و ثواب کی تصویب فرمائی۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ
فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ
اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝١٠١
وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ
مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۣ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَاۗىِٕكُمْ
وَلْتَاْتِ طَاۗىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا

Marfat.com

حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ
أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً ۚ وَ
لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰٓ
أَن تَضَعُوٓا أَسْلِحَتَكُمْ ۖ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ
عَذَابًا مُّهِينًا ﴿١٠٢﴾ فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا
وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ ۚ إِنَّ الصَّلَاةَ
كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا ﴿١٠٣﴾ وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ
إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ وَتَرْجُونَ مِنَ
اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٠٤﴾ ع

عربی رکوع ۱۵ (اور جب تم سفر میں نکلو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز میں قصر کرو۔ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں فتنہ میں ڈال دیں گے بیشک کافر تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں ٥ اور اے نبی! جب آپ مسلمانوں کے درمیان ہوں اور (حالت جنگ میں) نماز پڑھانے کھڑے ہوں تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اسلحہ لیے رہے پھر وہ جب سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آ کر تمہارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنا اسلحہ لیے رہے۔ کیونکہ کافر یہ چاہتے ہیں کہ اگر تم غافل ہو جاؤ اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ اور تم پر کوئی حرج نہیں اگر تمہیں بارش کی وجہ سے تکلیف ہو یا بیمار ہو جاؤ تو تم اپنے ہتھیار اتار کر رکھ دو اور اپنے بچاؤ کو ملحوظ رکھو۔ یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے ٥ پس جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے۔ پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ تو پھر پوری نماز قائم کرو۔ بیشک نماز مومنوں پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض ہے ٥ اور دشمن کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اگر تم تکلیف اٹھاتے ہو تو وہ بھی تکلیف اٹھاتے ہیں جس طرح تم تکلیف اٹھاتے ہو۔ اور تم خدا سے وہ توقع رکھتے ہو جو توقع وہ نہیں رکھتے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے) (آیات ۱۰۱ تا ۱۰۴)

Marfat.com

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ○

''اور جب تم سفر میں نکلو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز میں قصر کرو۔ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں فتنہ میں ڈال دیں گے بیشک کافر تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔'' (النسآء:۱۰۱)

آیت کا ربط

جہاد اور ہجرت کا مضمون جاری ہے۔ اسی سیاقِ کلام میں نماز کا ذکر آ گیا ہے۔ بظاہر وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ہجرت بھی ایک سفر کا نام ہے اور جہاد میں سفر بھی ہوتا ہے اور دشمن کی طرف سے حملے کا اندیشہ بھی۔ اس لیے دونوں کے حوالے سے نمازِ قصر کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ ہجرت کا سفر ہو یا کوئی اور تمہیں نماز قصر کرنے کی اجازت ہے اور اسی طرح اگر جنگ کے لیے بیشک لمبا سفر درپیش نہ ہو لیکن دشمن کی طرف سے حملے کے اندیشے کے باعث ایک خوف کی کیفیت ہو تو صلاۃ الخوف پڑھنے کی بھی اجازت ہے۔ اور صلاۃ الخوف میں نماز قصر کی جائے گی۔ لیکن اگر تدبر کی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پیشِ نظر ہجرت ہو یا جہاد' ان دونوں میں حقیقی روح پیدا کرنے اور صحیح معنی میں اسے ہجرت اور جہاد بنانے میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ ایک بندے کا اللہ سے رشتہ ہے۔ جسے ہم بندگی کہتے ہیں یہ تعلق اور یہ رشتہ جتنا خالص اور جتنا مضبوط ہوتا جاتا ہے اتنا ہی وہ عمل اللہ کے ہاں زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہوتا جاتا ہے۔ بلکہ جس عمل کی قبولیت کی امید کی جا سکتی ہے وہ صرف وہ عمل ہے جس میں اللہ کے ساتھ اخلاص پایا جاتا ہو۔ ہجرت میں اگر یہ روح باقی نہ رہے تو وہ صرف ایک نقل مکانی ہے اور اگر جہاد سے یہ روح نکل جائے تو وہ جہاد ''فساد فی الارض'' بن جاتا ہے۔ حالانکہ جہاد کا اصل مقصد اللہ کی زمین سے فساد ختم کرنا ہے۔ بظاہر یہ خونریزی ہے لیکن حقیقت میں خونریزی روکنے کا ایک ذریعہ ہے۔

نماز ہجرت اور جہاد کی روح ہے

نماز ایک ایسی عبادت ہے جو انسان کا تعلق اللہ سے قائم کرنے میں سب سے مؤثر عامل ہے۔ آدمی نیت باندھتے وقت پھر رکوع و سجود کرتے وقت پھر قیام و قعود میں اللہ کے ذکر کے سوا اور کچھ نہیں کرتا۔ اسی کی تسبیح کرتا ہے' اسی کی کتاب کی تلاوت کرتا ہے' اسی سے دعائیں کرتا ہے' اسی سے استغفار کرتا ہے اور اسی کے تصور میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی مشق ہے جو اگر شعور کے ساتھ کی جائے تو کرنے والے کا دل و دماغ اللہ کے تعلق کے حوالے سے تقویٰ اور اخلاص کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ اور مزید یہ کہ یہاں ذکر صرف نماز کا نہیں بلکہ باجماعت نماز کا ہے۔ اس سے جماعت کا اہتمام اور جماعت کی پابندی کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔ اور یہی جماعت امت میں شیرازہ بندی کا ذریعہ بنتی ہے۔ اور یہی نماز کی صفیں فوج میں نظم و ضبط پیدا کرتی ہیں۔ اور فوج کی صفیں نماز کی صفوں کی یاد دلا کر دلوں میں سوز و گداز پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو نماز' ہجرت اور جہاد دونوں کی روح پیدا کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ اس لیے ہجرت اور جہاد کے سیاق و سباق میں نماز کا ذکر اجنبی نہیں بلکہ روح کی مانند ہے۔

Marfat.com

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ کا مفہوم

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ (اور جب تم سفر میں نکلو) آیت کے یہ الفاظ جہاد کے سفر کے لیے مخصوص نہیں۔ بلکہ ہر سفر کے لیے یہی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔ البتہ جہاں صرف جہاد کا ذکر مقصود ہو وہاں "ضربتم فی سبیل اللہ" کہا جاتا ہے کہ جب تم اللہ کے راستے میں نکلو' یعنی جب تم جہاد کے لیے نکلو۔ تو ضربتم فی الارض کا استعمال بجائے خود اس بات کی دلیل ہے' کہ یہاں مقصود صرف جہاد کا سفر نہیں بلکہ ہر وہ سفر مراد ہے جو کسی بھی اردے سے کیا جائے اور جہاد کا سفر بھی اس میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آگے نماز میں جو قصر کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے اس کا تعلق صرف صلاۃ الخوف سے نہیں بلکہ ہر نماز سے ہے۔ اور احادیث اور امت کا تعامل بھی اس بات پر شاہد ہے کہ قصر صرف صلاۃ الخوف میں ہی جائز نہیں بلکہ ہر نماز میں قصر جائز ہے جو سفر کے دوران ہو۔ اس لیے ہم سب سے پہلے زمانہ امن کے سفر میں قصر کی تفصیل عرض کرتے ہیں۔

جو نمازیں چار رکعت پر مشتمل ہیں ان میں قصر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں دو رکعتیں پڑھی جائیں گی۔ اور جو نمازیں تین یا دو پر مشتمل ہیں ان میں قصر نہیں ہو گی۔ البتہ فرض رکعتوں کے علاوہ جہاں تک سنتوں اور نوافل کا تعلق ہے اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ فجر کی سنتیں اور عشاء کے وتر تو آپ التزام سے ادا فرماتے تھے۔ مگر باقی نمازوں میں آپؐ صرف فرض پڑھتے تھے' سنتیں پڑھنا آپؐ سے ثابت نہیں۔ البتہ نفل نمازوں کا جب بھی موقع ملتا پڑھ لیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ سواری پر بیٹھے ہوئے بھی نوافل پڑھتے رہتے تھے۔ اسی بناء پر حضرت عبداللہ بن عمر نے لوگوں کو سفر میں فجر کے سوا دوسرے اوقات کی سنتیں پڑھنے سے منع کیا ہے۔ مگر اکثر علماء ترک اور فعل دونوں کو جائز قرار دیتے ہیں اور اسے ہر شخص کے اختیار پر چھوڑتے ہیں کہ وہ چاہے تو پڑھے اور چاہے تو نہ پڑھے۔ حنفیہ کا مختار مذہب یہ ہے کہ مسافر جب راستہ طے کر رہا ہو تو سنتیں نہ پڑھنا افضل ہے اور جب کسی مقام پر جا کر ٹھہر جائے اور اطمینان میسر آ جائے تو پھر سنتیں پڑھنا افضل ہے۔

بعض آئمہ کرام کا خیال یہ ہے کہ نماز قصر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سفر کرنے والے کا سفر فی سبیل اللہ ہو۔ یعنی وہ کسی جائز اور پسندیدہ مقصد کے لیے سفر کر رہا ہو۔ لیکن اگر کسی ایسے مقصد کے لیے سفر کر رہا ہو جو شرعاً ناجائز ہو تو اس میں قصر کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا اسے کوئی حق نہیں۔ لیکن حنفیہ کہتے ہیں کہ قصر ہر سفر میں کیا جا سکتا ہے۔ سفر کی نوعیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ سفر کا جائز یا ناجائز ہونا بجائے خود ایک عمل ہے جس کی الگ باز پرس ہو گی۔ اور نماز ایک الگ عمل ہے جس کے قصر ہونے کا دارومدار صرف اس بات پر ہے کہ آدمی مسافر ہو' قطع نظر اس سے کہ اس کا سفر جائز ہے یا ناجائز۔

فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اس سے بعض اہل علم نے یہ سمجھا ہے کہ سفر میں قصر کرنا ضروری نہیں ہے۔ اگر ضروری ہوتا تو یہ نہ فرمایا جاتا کہ قصر کرنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اس سے تو صرف اجازت معلوم ہوتی ہے۔ آدمی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے چاہے نہ اٹھائے۔ امام حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قصر کرنا واجب ہے۔ ان کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں ہمیشہ قصر فرمایا اور کسی معتبر روایت میں یہ منقول نہیں کہ آپ نے کبھی سفر میں چار رکعتیں پڑھی ہوں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ سفروں میں رہا ہوں' میں نے کبھی

Marfat.com

نہیں دیکھا کہ انہوں نے سفر میں قصر نہ کیا ہو اور دیگر صحابہ سے اس کی تائید میں بہت سی روایات ملتی ہیں۔ ان کثیر روایات کے خلاف دو روایتیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قصر اور اتمام دونوں درست ہیں۔ لیکن یہ روایتیں سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کے علاوہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ثابت شدہ مسلک کے خلاف ہیں۔

دوسری دلیل امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کی یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ''فلا جناح علیکم'' کے حوالے سے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''صدقة تصدق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته'' (یہ قصر کی اجازت ایک انعام ہے جو اللہ نے تمہیں بخشا ہے لہٰذا اس کے انعام کو قبول کرو) بادشاہوں کے انعام رد کردینا یا لوٹا دینا توہین سمجھا جاتا ہے اور ایسا کرنے والا گرفت میں آجاتا ہے۔ اللہ جیسے شہنشاہِ کائنات کے انعام کو تو دل و جان سے قبول کرنا چاہیئے۔ اور اس پر شکر بھی ادا کرنا چاہیئے کہ اللہ نے ہم کمزور لوگوں پر کیسے کیسے انعامات کیے ہیں۔ رہی یہ بات کہ آخر یہ جملہ کیوں ارشاد فرمایا گیا تو اس کی مثال اس سے پہلے بھی ہم اسی سورت میں پڑھ چکے ہیں۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کے حوالے سے پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ ''صفا اور اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں تو تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم ان دونوں کے درمیان سعی کرو۔'' تو بعض صحابہ نے اس سے یہ سمجھا کہ سعی کرنا ضروری نہیں بلکہ ہمیں اختیار دے دیا گیا ہے کہ چاہیں تو سعی کریں چاہیں تو نہ کریں۔ لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے انکی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا کہ ''یہاں اختیار نہیں دیا گیا بلکہ ایک غلط فہمی کا ازالہ فرمایا گیا ہے۔ مسلمان جب عمرہ کی قضا کرنے کے لیے سات ہجری میں مکہ معظمہ میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ مشرکین مکہ نے صفا اور مروہ پر دو بت رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام اساف اور دوسرے کا نام نائلہ تھا۔ ان کو خیال گزرا کہ اگر ہم نے صفا و مروہ کی سعی کی تو یہ دونوں بتوں کے طواف کے مترادف ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم سعی نہ کریں کیونکہ بتوں کا طواف اسلام میں سب سے بڑا جرم ہے۔ اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی کہ ان بتوں کی موجودگی میں تمہارے لیے سعی کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ کیونکہ سعی مناسک حج میں سے ہے اور اس کی ادائیگی واجب ہے۔ یہاں بھی ایک اشتباہ کا ازالہ مقصود ہے۔ وہ یہ کہ بعض مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ قصر کرنے کی اجازت اسے ہے جو پوری نماز نہ پڑھ سکتا ہو۔ یہ ایک سہولت ہے جو کمزوروں کو دی گئی ہے۔ لیکن جو پوری نماز پڑھ سکتا ہو اسے پوری نماز پڑھنی چاہیئے۔ اور استطاعت کے ہوتے ہوئے قصر کرنا شاید گناہ کا باعث نہ ہو۔ ان کا اشتباہ دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ تم اگر قصر کرو تو تمہارے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں ہوگی۔ یہ تو ایک حکم کی تعمیل ہے اسلام تو تعمیلِ حکم کا نام ہے۔ اور اپنے آپ کو پوری طرح سے اللہ کے سپرد کردینے کا نام ہے۔ وہ دو کا حکم دے تو دو پڑھو اور چار کا حکم دے تو چار پڑھنا اسلام کے حکم کا تقاضا ہے۔ مقصود رکعتوں کی تعداد نہیں، مقصود تو وہ اطاعت ہے جو مکمل خشوع و خضوع سے کی جائے۔

حالتِ سفر میں قصر کے حوالے سے ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ کتنے سفر پر قصر کیا جائے۔ یعنی مقدارِ سفر کیا ہو؟ ظاہریہ کے نزدیک تو ہر سفر میں قصر کیا جاسکتا ہے چاہے وہ چند میل پر مشتمل کیوں نہ ہو۔ البتہ احناف کے نزدیک ایسے سفر پر قصر کرنے کی اجازت ہے جس کی مسافت میں پیدل یا اونٹ کی سواری سے تین دن صرف ہوتے ہوں۔ اس کا اندازہ ۵۴ میل لگایا گیا ہے، لیکن فتویٰ ۴۸ میل پر ہے۔ یہی غالباً امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی موقف ہے۔

Marfat.com

ایک بحث یہ ہے کہ مسافر کب تک مسافر رہتا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کوئی صریح حکم مروی نہیں۔ اس لیے اس میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ کی نیتِ قیام پر پوری نماز پڑھنے کا حکم دیتے ہیں۔ اور اگر کسی جگہ آدمی مجبوراً رکا ہوا ہو مثلاً کہیں پہاڑوں پر گیا اور برف باری کی وجہ سے راستے بند ہو گئے یا اور کوئی ایسا حادثہ ہو گیا کہ وہ واپس آنا چاہتا ہے لیکن آ نہیں پاتا۔ لیکن روزانہ یہ کوشش کرتا ہے کہ موقع ملے تو چلا جاؤں۔ اس طرح سے چاہے کتنا بھی وقت گزر جائے نماز قصر ہی کی جائے گی۔

اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں فتنہ میں مبتلا کر دیں گے) یعنی میدانِ جنگ میں ہر وقت اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ غنیم کہیں حملہ نہ کر دے۔ ایسی صورت میں لمبی نماز پڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ قصر کرنے کا حکم دیا گیا۔ بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ یہ صلاۃ الخوف صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مشروع تھی اب اس کی اجازت نہیں ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب قریب تواتر سے یہ بات ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امن اور خوف دونوں حالتوں میں قصر فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ''ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم خرج من المدینة الی مكة لا یخاف الا رب العالمین فصلی ركعتین'' (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے اور اس وقت رب العالمین کے سوا کسی کا خوف نہ تھا مگر آپ نے دو ہی رکعتیں پڑھیں)

وَاِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْیَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْیَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْكُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ۝

''اور اے نبی! جب آپ مسلمانوں کے درمیان ہوں اور (حالت جنگ میں) نماز پڑھانے کھڑے ہوں تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اسلحہ لیے رہے پھر وہ جب سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آ کر تمہارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنا اسلحہ لیے رہے۔ کیونکہ کافر یہ چاہتے ہیں کہ اگر تم غافل ہو جاؤ اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ اور تم پر کوئی حرج نہیں اگر تمہیں بارش کی وجہ سے تکلیف ہو یا بیمار ہو جاؤ تو تم اپنے ہتھیار اتار کر رکھ دو اور اپنے بچاؤ کو ملحوظ رکھو۔ یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔'' (النسآء:۱۰۲)

وَاِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ (اے پیغمبر جب آپ ان میں ہوں اور پھر ان کو نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آگے نماز کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کی وجہ سے ضروری تھا۔ کیونکہ آپ کی موجودگی میں کسی دوسرے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جا سکتی اور خود مسلمانوں کا جو آپؐ سے عقیدت و محبت کا رشتہ تھا اس کی وجہ سے ہر سپاہی

Marfat.com

شدید خواہش ہوتی تھی کہ میں آپؐ کے پیچھے نماز پڑھوں۔اور حالت جنگ میں اس خواہش میں اس لیے بھی اور اضافہ ہو جاتا تھا کیونکہ ہر سپاہی یہ سمجھتا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ اس جنگ میں مجھے شہادت نصیب ہو اور زندگی کی یہ میری آخری نماز ہو تو میں کیوں نہ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھوں۔لیکن آج جبکہ جنگ کے حالات بدل گئے ہیں اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی فوج میں موجود نہیں ہوں گے تو اب جس طریقے سے بھی نماز پڑھی جاسکتی ہو نماز پڑھنی چاہئے۔الگ الگ جماعتیں مختلف آئمہ کے پیچھے حالات کے مطابق پڑھی جاسکتی ہیں۔الگ الگ کمپنیاں اور بٹالینز الگ الگ جماعت کا اہتمام کریں۔اور اگر جماعت نہ ہوسکتی ہو تو اپنے اپنے مورچوں میں الگ الگ نماز پڑھ لیں لیکن نماز پڑھنا بہر حال ضروری ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ خود اس بات سے ہوتا ہے کہ اللہ نے عین جنگ کے دوران صلاۃ الخوف پڑھنے کا حکم دیا اور جنگ خندق میں شدید تیر اندازی کے باعث آپ نماز نہیں پڑھ سکے تھے تو آپؐ اس پر اس قدر دل گرفتہ تھے کہ آپؐ نے دشمنوں کے حق میں بددعا دیتے ہوئے فرمایا ''اللہ ان کے گھر انگاروں سے بھر دے انہوں نے ہماری نماز قضاء کر دی۔'' البتہ بعض لوگ اس آیت سے یہ سمجھتے ہیں کہ صلاۃ الخوف کا جواز صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کی وجہ سے تھا اب سرے سے اس نماز کا کوئی جواز نہیں ہے' یہ بات سراسر غلط ہے۔کیونکہ حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ صحابہ کرام نے آپ کی وفات کے بعد مختلف مواقع پر صلاۃ الخوف پڑھی۔

رہی یہ بات کہ صلاۃ الخوف پڑھنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حالات میں مختلف طریقوں سے نماز پڑھائی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طریقے سے حالات کے مطابق نماز پڑھنا ممکن ہو اسی طرح امام کو نماز پڑھانی چاہئے۔اس سلسلے میں نماز کے کئی طریقے بیان کیے گئے ہیں۔لیکن ان میں جو زیادہ معروف ہیں وہ چار ہیں۔

۱۔ایک طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصہ امام کی ساتھ نماز پڑھے اور دوسرا حصہ دشمن کے مقابلہ پر رہے۔پھر جب ایک رکعت پوری ہو جائے تو پہلا حصہ سلام پھیر کر چلا جائے اور دوسرا حصہ آکر دوسری رکعت امام کے ساتھ پوری کرے۔اس طرح امام کی دو رکعتیں ہوں گی اور فوج کی ایک رکعت۔لیکن اس طریقے کو اکثر آئمہ نے دو وجہ سے قبول نہیں کیا ایک تو یہ کہ اس طرح سے امام اور مقتدی کی نیت میں موافقت نہیں رہتی۔امام دو رکعت پڑھتا ہے اور ظاہر ہے اسی کی نیت کرتا ہے اور مقتدی ایک رکعت پڑھے گا اور ایک ہی رکعت کی نیت کرے گا۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک رکعت کی نماز سلام میں مشروع نہیں۔مزید یہ کہ اس آیت کریمہ کے الفاظ اس کے متحمل نہیں ہوتے۔اس میں فرمایا گیا ہے ''فاذا سجدوا'' کہ جب پہلے گروہ کے لوگ ایک رکعت پڑھ چکیں تو وہ پیچھے چلے جائیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی ان کی نماز باقی ہے۔اگر ان کی نماز کے اختتام کی طرف اشارہ کرتا ہوتا تو ''فاذا سجدت'' ہونا چاہئے تھا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر چلا جائے پھر دوسرا حصہ حصہ آکر ایک رکعت امام کے پیچھے پڑھے' پھر دونوں حصے باری باری سے آکر اپنی چھوٹی ہوئی ایک ایک رکعت بطورِ خود ادا کریں۔اس طرح دونوں کی ایک ایک رکعت امام کے پیچھے ادا ہوگی اور ایک ایک رکعت انفرادی۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے اور جب امام دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہو تو مقتدی بطورِ خود ایک رکعت مع تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیں۔پھر دوسرا حصہ آکر اس حال میں امام کے پیچھے کھڑا ہو کہ ابھی امام دوسری ہی رکعت میں ہو اور یہ لوگ بقیہ نماز امام کے ساتھ ادا کرنے کے بعد ایک رکعت خود اٹھ کر پڑھ لیں۔اس صورت میں امام کو دوسری رکعت میں طویل قیام کرنا ہوگا۔یہ دونوں

Marfat.com

طریقے یعنی نمبر دو اور نمبر تین قرآن کریم میں دی گئی تفصیل کے مطابق معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ دوسرے طریقے کو حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اختیار کیا ہے اور احناف بھی اسی کو اختیار کرتے ہیں۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصہ امام کے ساتھ دو رکعتیں ادا کرے اور تشہد کے بعد سلام پھیر کر چلا جائے۔ پھر دوسرا حصہ تیسری رکعت میں آ کر شریک ہو اور امام کے ساتھ سلام پھیرے۔ اس طرح امام کی چار اور فوج کی دو دو رکعتیں ہوں گی۔ لیکن اس طریقے میں بھی وہی سقم موجود ہے جس کا ہم پہلے طریقے میں ذکر کر چکے ہیں۔ کہ اس طریقے میں امام اور مقتدی کی نیت اور نماز میں موافقت نہیں رہتی۔ امام چار رکعت کی امامت کرتا ہے اور مقتدی دو رکعت میں اقتدا کر کے فارغ ہو جاتے ہیں۔

ہم نے روایات سے جو طریقے ثابت ہیں ان میں سے مشہور چار طریقوں کا ذکر کر دیا ہے۔

یہ بات یاد رہے کہ صلاۃ الخوف کا یہ حکم اس صورت میں ہے کہ دشمن کے حملہ کا خطرہ تو ہو لیکن عملاً معرکہ قتال گرم نہ ہو۔ یعنی ابھی لڑائی چھڑی نہ ہو۔ لیکن اگر لڑائی چھڑ چکی ہو، تیر اندازی ہو رہی ہو، یا گولیاں چل رہی ہوں تو اس صورت میں حنفیہ کے نزدیک نماز موخر کر دی جائے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ثابت ہے کہ آپؐ نے غزوۂ خندق کے موقع پر چار نمازیں قضا فرمائیں اور پھر موقع پا کر علی الترتیب انہیں قضا کیا۔ حالانکہ غزوۂ خندق سے پہلے صلاۃ الخوف کا حکم آ چکا تھا۔ مزید یہ بات بھی یاد رہے کہ جس طرح حالتِ جنگ میں صلاۃ الخوف پڑھنے کی اجازت ہے اسی طرح اگر خوف کی کوئی اور صورت پیدا ہو جائے مثلاً کوئی شیر یا اژدھا راستہ روک لے یا قزاق اور ڈاکو راستہ روک کر بیٹھ جائیں اور کسی وقت بھی قافلے پر حملے کا اندیشہ ہو یا اس کے علاوہ خوف کی کوئی اور صورت پیدا ہو جائے تو ایسی حالت میں بھی صلاۃ الخوف پڑھی جا سکتی ہے۔

آیت میں نماز اور مسلح رہنے پر زور دیا گیا ہے

اس آیتِ کریمہ میں آپ نے دیکھا کہ دو باتوں پر زور دیا جا رہا ہے۔ ایک تو یہ بات کہ حالات کیسے بھی شدید ہو جائیں اور خطرہ سر پر کیوں نہ آ پہنچے اگر کسی حد تک بھی نماز پڑھنے کی گنجائش ہو تو نماز پڑھنا ضروری ہے۔ اگر جماعت ہو سکتی ہو تو جماعت کا اہتمام واجب ہے اور اگر جماعت ممکن نہ ہو تو الگ الگ نماز پڑھنا ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نگاہ میں نماز چونکہ تعلق باللہ کا سب سے بڑا ذریعہ اور اللہ سے وفاداری کا اظہار ہے اس لیے نہایت خطرناک حالات میں بھی اسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ مزید برآں خطرے کی حالت میں انسان سب سے زیادہ مدد کا محتاج ہوتا ہے اور ایک مسلمان ہمیشہ اپنے اللہ سے مدد مانگتا ہے۔ نماز میں جب وہ قیام میں ہوتا ہے تو وہ اللہ سے درخواست کرتا ہوا کہتا ہے ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) قیام کی حالت اللہ کے سامنے اظہارِ غلامی کی حالت ہے۔ ایسی صورت میں اللہ سے جو مدد مانگی جائے گی وہ بے نیاز ذات اپنے غلاموں کو مایوس نہیں کرے گی۔ تو نماز اس لیے بھی ضروری ٹھہرائی گئی تاکہ ایسے خطرے کی حالت میں مسلمان اللہ سے مدد مانگ سکیں۔ دوسری بات جو اس آیت میں تاکید سے کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تمہیں نماز کی حالت میں بھی مسلح رہنا چاہیے۔ ہتھیار اتارنے کی کبھی غلطی نہ کرنا۔ حتیٰ کہ اگر بارش یا بیماری کے باعث تمہیں ہتھیار اٹھانے سے زحمت ہوتی ہو اور اسے تکلیف کا باعث محسوس کرو تو پھر تمہیں اجازت ہے کہ ہتھیار اتار دو۔ لیکن ''حذر'' سے غافل پھر بھی نہ ہونا

Marfat.com

حذر سے مراد دفاعی آلات جنگ بھی ہیں اور ہر ممکن احتیاط بھی۔ ہتھیار اتار کر بھی تمہاری ہوشیاری اور بے دار مغزی میں کوئی کمی نہیں آنی چاہئے۔ حالات کو سونگھتے رہو اور ہتھیاروں کو اپنے اتنا قریب رکھو کہ جیسے ہی خطرہ محسوس کرو فوراً ہتھیار اٹھالو۔ اس تاکید کی وجہ یہ ہے کہ کافر اس انتظار میں ہیں کہ جیسے ہی تم نماز میں مشغول ہو کر حالات سے بے خبر اور اسلحہ سے خالی ہو جاؤ تو وہ اچانک یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ غیر مسلح آدمی فوری طور پر مسلح نہیں ہو سکتا اور غیر مسلح، مسلح آدمی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نماز کی پابندی اور اسلحہ کی پابندی کا حکم پہلو بہ پہلو دیا جا رہا ہے۔ نماز کے ساتھ ساتھ بار بار مسلح رہنے کی تاکید کی جا رہی ہے۔

اسلام تدبیر اور توکل کا حسین امتزاج

اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسلام دراصل تدبیر اور توکل کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ وہ ایک طرف تو مومن کو یہ عقیدہ دیتا ہے کہ تمہارے تمام معاملات کا سررشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اُس کا ارادہ اسباب پر حکمرانی کرتا ہے۔ اسباب سے تعلق ٹوٹ جائے لیکن اللہ سے تعلق ٹوٹنے نہ پائے۔ وہی تمہاری مدد کرتا ہے اور وہی تمہیں فتح و نصرت سے نوازتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ آلاتِ جنگ کی بہم رسانی تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہ تمہارے فرائض میں سے ایک فرض ہے۔ اس میں کوتاہی کرو گے تو اللہ کے ہاں جوابدہی کرنا پڑے گی اور ممکن وسائلِ جنگ ساتھ لے کر میدانِ جنگ میں اترو۔ جنگ کے جو بظاہر اسباب ہو سکتے ہیں ان سے غفلت مت کرو۔ لیکن بھروسہ وسائل جنگ پر نہیں اللہ پر رکھو۔ تمہاری حقیقی کامرانی اسی کے ہاتھ میں ہے لیکن وسائل جنگ کی فراہمی بھی اسی کا حکم ہے۔ حکم بجالاؤ گے تو اس کی نصرت آئے گی اور نافرمانی کرو گے تو اس کی تائید و نصرت سے محروم ہو جاؤ گے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان اللہ کی تائید و نصرت حاصل کرنے کے لیے ان دونوں باتوں کے پابند ہیں۔ وہ امکانی حد تک حالات کے تقاضوں کے مطابق آلاتِ جنگ تیار کریں "اَعِدُّوْا لَھُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ" کے حکم کے تحت امت مسلمہ ہر دور میں آلاتِ جنگ تیار کرنے کی پابند ہے۔ تلوار کے دور میں تلوار تیار کرنا ضروری تھا، گھوڑوں کے زمانے میں گھوڑے پالنا فرض تھا اور آج کے دور میں ایٹمی طاقت بننا اور ٹینک تیار کرنا مسلمانوں کی شرعی ذمہ داری ہے۔ یہ اسی طرح فرض ہے جیسے نماز پڑھنا فرض ہے۔ اس میں کوتاہی کا خمیازہ دنیا میں بھی بھگتنا پڑے گا اور آخرت میں بھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہر سطح پر نماز کا اہتمام کرنا ہو گا۔ اور نماز چونکہ منکرات سے روکتی ہے اس لیے تمام منکرات کا خاتمہ کرنا ہو گا۔ یہ دو باتیں ہر دور میں فتح و نصرت کی ضمانت رہی ہیں اور آج بھی یہی ضمانت ہیں۔ اللہ کے قوانین ہر دور میں یکساں ہیں۔ سچ کہا ظفر علی خان نے:

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

آخر میں فرمایا کہ اطمینان کے طور پر یہ بات یاد رکھو کہ تم اگر اپنی مستعدی نماز کی پابندی اور اللہ کی اطاعت میں کوئی کمی نہ آنے دو تو یقیناً تمہیں اللہ کی نصرت شاملِ حال ہو گی۔ جہاں تک کافروں کا تعلق ہے ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب اللہ نے پہلے ہی تیار کر رکھا ہے۔ وہ تو اس عذاب سے اس وقت تک بچے رہتے ہیں جب تک امت مسلمہ اپنا فرض انجام نہیں دیتی۔ لیکن جیسے ہی امت اپنا فرض انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اپنے فرض کے تقاضوں کو بروئے کار لاتی ہے تو کافروں کے لیے اللہ کا عذاب حرکت میں آ جاتا ہے۔ یہ امت مسلمہ کے لیے ایک ایسی حوصلہ افزائی ہے جس پر جتنا بھی اللہ کا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

Marfat.com

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ○

"پس جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے۔ پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ تو پھر پوری نماز قائم کرو، بیشک نماز مومنوں پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض ہے۔" (النسآء:١٠٣)

صلاۃ الخوف میں کمی کی تلافی ذکر اللہ کی کثرت سے

جب تم نماز پڑھ چکو سے مراد یہ ہے کہ تم نے خوف کے باعث صلاۃ الخوف پڑھی ہے۔ جس میں امام کے ساتھ ایک رکعت ادا کی اور باقی ایک ایک رکعت اپنے طور پر اور وہ بھی رواروی میں۔ ایک تو نماز کا قصر کرنا اور پھر اسے بھی غیر مطمئن انداز میں پڑھنا کہ ایک طرف دھیان نماز کی طرف اور دوسری طرف دھیان دشمن کے حملے کی طرف۔ اس سے یقیناً طبیعت کی یکسوئی میں فرق آتا ہے اور ذکر اللہ میں کمی واقع ہوتی ہے۔ چنانچہ ان دونوں باتوں کی تلافی کے لیے دو حکم دیے۔ پہلا حکم تو یہ دیا کہ جب تک جنگ کی کیفیت جاری ہے تمہیں نماز قصر کے ساتھ ساتھ ہر حالت میں اللہ کا ذکر جاری رکھنا چاہیے۔ تم کھڑے ہو، بیٹھے ہو، لیٹے ہو، کوئی وقت بھی اللہ کی یاد سے غفلت میں نہ گزرے۔ تمہارے اعضاء و جوارح دشمن کے دفاع میں مصروف ہوں لیکن تمہاری زبان اور تمہارا دل اللہ کی یاد میں مشغول رہنا چاہیے۔ اسی کا ذکر دلوں کو اطمینان دیتا ہے۔ وہیں سے حوصلے کی دولت ملتی ہے۔ وہی ہے جو قدموں میں استقامت پیدا کرتا ہے اور اللہ ہی کی ذات ہے جو دشمن کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھانے والی ہے۔ اس لیے اس کی ذات اور اس کے ذکر سے زبان اور دل غافل نہ ہونے پائیں۔ اور دوسرا حکم یہ دیا کہ جب جنگ ختم ہو جائے یا رک جائے اور دشمن کا خطرہ ٹل جائے اور تمہیں اطمینان کی کیفیت محسوس ہو تو اب صلاۃ الخوف نہیں بلکہ تمہیں معمول کی مکمل نماز پڑھنی چاہیے۔ نماز کے پورے ارکان ادا ہونے چاہئیں۔ واجبات، سنن اور آداب صلاۃ کا پورا اہتمام ہونا چاہیے۔ صلاۃ الخوف میں وقت کی پوری پابندی مشکل ہو جاتی ہے لیکن اب تمہیں ہر نماز اپنے وقت پہ ادا کرنا ہوگی۔ کیونکہ وقت کے داخل ہونے سے نماز فرض ہوتی ہے۔ ہر نماز کا وقت اس نماز کی فرضیت کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں پر وقت کی پابندی کے ساتھ نماز فرض کی گئی ہے۔ اس لیے اب اس میں کمی بیشی نہیں ہونی چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام من جانب اللہ ہیں

اس میں ایک بات نہایت توجہ کے لائق ہے وہ یہ کہ یہ فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں پر نماز وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نماز کا ایک وقت مقرر ہے۔ اس کا ایک آغاز ہے اور ایک اختتام ہے۔ سوال یہ ہے کہ نمازوں کے یہ اوقات کس نے مقرر کیے ہیں۔ قرآن کریم نے تو کہیں صراحت کے ساتھ اس کا ذکر نہیں فرمایا۔ نمازوں کے اوقات اللہ کے رسول نے مقرر فرمائے ہیں۔ اور اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اوقات کی پابندی کے ساتھ مسلمانوں پر نماز اللہ نے فرض فرمائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازوں کے جو اوقات مقرر کیے اور مسلمانوں پر انہیں فرض فرمایا وہ بعینہٖ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ فریضہ ہے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کریم میں اور بھی بعض جگہ فرمائی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معاملے میں جو بھی حکم دیتے ہیں وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں دیتے بلکہ وہ اللہ کی جانب سے دیتے ہیں۔ اور اس حکم کی اطاعت اسی طرح ضروری ہے جس طرح اللہ کے حکم کی اطاعت ضروری ہے۔

Marfat.com

وَلَا تَهِنُوْا فِى ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

''اور دشمن کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اگر تم تکلیف اٹھاتے ہو تو وہ بھی تکلیف اٹھاتے ہیں جس طرح تم تکلیف اٹھاتے ہو۔ اور تم خدا سے وہ توقع رکھتے ہو جو توقع وہ نہیں رکھتے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔'' (النسآء:۱۰۴)

القوم کا معنیٰ

اس آیتِ کریمہ میں ''القوم'' کا لفظ آیا ہے جس کا ترجمہ ہم نے دشمن کیا ہے۔ کیونکہ آیت کا سیاق وسباق اس بات پر دلالت کر رہا ہے' بات دشمن کی ہو رہی ہے اسی کو اب قوم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے سورۃ آل عمران میں اس لفظ کو اسی معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔ ارشاد ہے ''اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ'' (اگر تمہیں کوئی زخم لگا تو کوئی تعجب کی بات نہیں آخر دشمن کو بھی اسی طرح کا زخم لگ چکا ہے)

دشمن کے تعاقب کا حکم اور اہمیت

جنگ کے نتیجے میں جنگ کے دونوں فریق زخمی ہوتے ہیں۔ دونوں طرف سے لاشیں گرتی ہیں۔ دونوں زخم اٹھاتے ہیں۔ نقصان دونوں کا ہوتا ہے' کسی کا کم کسی کا زیادہ۔ البتہ جب ایک فریق جنگ سے پسپا ہو جاتا ہے تو پھر اس شکست کو مکمل کرنے کے لیے فاتح فریق بھاگنے والوں کا تعاقب کرتا ہے۔ اسی تعاقب سے فتح تکمیل پذیر ہوتی ہے۔ اور اگر تعاقب نہ کیا جائے تو اس بات کا بہت امکان ہوتا ہے کہ دشمن مجتمع ہو کر دوبارہ حملہ کر دے۔ اور یہ حملہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب وہ حملہ کرے گا تو وہ مسلح ہوگا اور فاتح لشکر اپنی فتح کے زعم میں ہتھیار کھول چکا ہوگا۔ جس طرح جنگ احد میں جیتی ہوئی جنگ شکست میں تبدیل ہو گئی۔ چنانچہ اسی تناظر میں حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر دشمن پسپائی اختیار کرے اور میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے تو تمہیں اس کے تعاقب میں کمزوری نہیں دکھانا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ تم زخموں سے چور ہو لیکن زخمی تو وہ بھی ہیں۔ تم نے اگر اس میں کمزوری دکھائی تو دشمن کو جمع ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔ اور پھر اس وقت تم جو ان کی کمر توڑ سکتے ہو یہ موقع اللہ جانتا ہے پھر کب ہاتھ آتا ہے۔ اس لیے ایسے موقعوں پر زخموں سے نڈھال ہونے کے باوجود بھی تعاقب میں بزدلی اور تھڑدلا پن نہیں دکھانا چاہیے۔

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ تمہیں ایک ایسی خوش قسمتی اور سعادت حاصل ہے جس سے تمہارا دشمن محروم ہے۔ وہ یہ کہ دشمن تو اپنے لیے لڑ رہا ہے یا شیطان کے لیے دونوں صورتوں میں اس کے زخموں کی تلافی کرنے والا کوئی نہیں۔ وہ خود اپنے زخم چاٹے گا اور ایک ایک زخم کو محرومی سمجھ کر غم واندوہ کی دلدل میں اترتا چلا جائے گا۔ لیکن تمہارا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ تم حق کی سربلندی کے لیے لڑ رہے ہو۔ تمہارا ایک ایک زخم جنت کا پھول بننے والا ہے۔ تمہارے پاؤں میں چبھنے والا ایک ایک کانٹا جنت کی ابدی نعمتوں میں تبدیل ہونے والا ہے۔ تمہیں کل ان تکلیفوں کا جو بدلہ ملے گا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق تم میں ہر شخص اس بات کی آرزو کرے گا کہ کاش اللہ کے راستے میں میری کھال قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتی تاکہ آج میں اس کا زیادہ سے زیادہ اجر وثواب حاصل کر سکتا۔ تو تم تو اپنی ہر تکلیف پر اللہ سے امیدیں رکھتے ہو۔ لیکن تمہارے دشمن کو تو اللہ سے کوئی امید نہیں۔ تمہاری یہی امید تمہارے لیے سب سے بڑے سہارے کا باعث ہے۔ اور ان

Marfat.com

کی ناامیدی ان کے لیے موت کا باعث ہے۔ وہ تو مالِ غنیمت کے لالچ اور فتح کی امید میں بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ اور جب اس سے محروم رہتے ہیں تو پھر ان کی ناامیدی کا کچھ نہ پوچھیے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ

الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرٰىكَ اللّٰهُ ۚ وَلَا تَكُن
لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ﴿۱۰۵﴾ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۖ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُورًا
رَّحِيمًا ﴿۱۰۶﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللّٰهَ
لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿۱۰۷﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَ
لَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضٰى
مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰٓأَنتُمْ
هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۟ فَمَن يُجَادِلُ اللّٰهَ
عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿۱۰۹﴾ وَمَن يَعْمَلْ
سُوٓءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُۥ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿۱۱۰﴾
وَمَن يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُۥ عَلٰى نَفْسِهِۦ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا
حَكِيمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَن يَكْسِبْ خَطِيٓئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِۦ بَرِيٓئًا فَقَدِ
احْتَمَلَ بُهْتٰنًا وَّإِثْمًا مُّبِينًا ﴿۱۱۲﴾

Marfat.com

عربی رکوع ١٦ (اے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تا کہ تم فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان اس کے مطابق جو کچھ اللہ نے تمہیں دکھایا ہے۔تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑے والے نہ بنو۔اور اللہ سے استغفار کرو وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔تم حمایت نہ کرو ان لوگوں کی جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں۔اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ کر اس بات کا مشورہ کرتے ہیں جس سے وہ راضی نہیں۔اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے قابو میں ہے ٥ یہ تم ہو جنہوں نے دنیا کی زندگی میں ان کی مدافعت کی تو قیامت کے دن اللہ سے کون ان کی مدافعت کرے گا۔یا کون ان کا ذمہ دار بنے گا ٥ اور جو کسی برائی کا ارتکاب کرے یا اپنی جان پر ظلم ڈھائے، پھر اللہ سے مغفرت چاہے۔تو وہ اللہ کو بخشنے والا رحم کرنے والا پائے گا ٥ اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر آتا ہے۔اور اللہ علیم و حکیم ہے ٥ اور جو کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کرتا ہے پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگاتا ہے تو اس نے اپنے سر ایک بہت بڑا بہتان اور صریح گناہ لیا ہے) (آیات ١٠٥ تا ١١٢)

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ۝ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۝ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَھُوَ مَعَھُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ۝

"اے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تا کہ تم فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان اس کے مطابق جو کچھ اللہ نے تمہیں دکھایا ہے۔تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو۔اور اللہ سے استغفار کرو وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔تم حمایت نہ کرو ان لوگوں کی جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں۔اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ کر اس بات کا مشورہ کرتے ہیں جس سے وہ راضی نہیں۔اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے قابو میں ہے۔" (النسآء:١٠٥تا١٠٨)

سلسلہ بیان تو جہاد کے حوالے سے جاری ہے لیکن جہاد کے لیے مسلمانوں کی صفوں کو کسی بھی مارِ آستین سے محفوظ رکھنا ایک بہت بڑی ضرورت ہے۔اس لیے قرآنِ کریم حسب ضرورت منافقین کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔اور مختلف حوالوں سے ان کی نشاندہی کرتا رہتا ہے۔تا کہ وہ خود ہی چھٹ جائیں یا مسلمان ان کے پہچاننے میں غلطی نہ کریں اور اس بات پر بھی قرآن کریم تنقید کرتا ہے کہ مخلص مسلمان بھی بعض دفعہ منافقین کے طرزِ عمل کو سمجھنے میں غلطی کر جاتے ہیں اور اپنی سادگی اور سچائی کے باعث ان کے بارے میں حسن ظن رکھنے لگتے ہیں۔اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ کسی کا مسلمان کہلانا ہی شاید مسلمانوں کی معاونت کے لیے کافی ہے۔وہ مسلمان کہلا کر چونکہ مسلمانوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے تو مسلمان اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ ہم ہر طرح سے اس کی حمایت کریں۔چنانچہ ان آیات میں بھی ایسے ہی ایک واقعے کے حوالے سے تنقید بھی کی جارہی ہے اور ہدایات بھی دی جارہی ہیں۔

Marfat.com

شانِ نزول

واقعہ یہ ہوا کہ مدینہ میں ایک خاندان بنوابیرق کے نام سے معروف تھا۔ بعض اہلِ علم نے اس خاندان کو بنوظفر کا نام دیا ہے۔ اس خاندان کا تعلق انصار سے تھا۔ ان میں سے ایک شخص جس کا نام طعمہ یا بشیر بن ابیرق تھا۔ اس نے حضرت قتادہ بن نعمان کے چچا رفاعہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں نقب لگا کر چوری کی۔ مدینے میں گندم کا آٹا بہت کمیاب تھا۔ کبھی کبھی شام سے آتا تو خوشحال لوگ خرید کر خود کھاتے یا مہمانوں کے لیے رکھ لیتے، عام لوگوں کی دسترس میں نہ تھا۔ مدینے میں عام طور پر جو کا آٹا کھایا جاتا یا کھجوریں کھائی جاتی تھیں۔ حضرت رفاعہ نے کہیں سے گیہوں کا کچھ آٹا خرید کر ایک تھیلے میں اپنے لیے رکھ لیا اور اسی تھیلے میں کچھ اسلحہ وغیرہ ڈال کر ایک چھوٹی کھوٹھڑی میں محفوظ کر لیا۔ بشیر بن ابیرق کو کسی طرح معلوم ہو گیا تو اس نے رات کو نقب لگا کر یہ تھیلا نکال لیا۔ اور ساتھ حرکت یہ کی کہ اس تھیلے کا ایک کونا پھاڑ کر یہودی کے گھر تک تھوڑا تھوڑا آٹا بکھیر دیا تا کہ تحقیق کرنے پر یہ معلوم ہو سکے کہ یہ آٹا اسی گھر میں گیا ہے۔ صبح کو حضرت رفاعہ نے دیکھا کہ ان کے گھر میں نقب لگی ہے اور وہ سامان غائب ہے تو انہوں نے محلّہ میں تفتیش شروع کی۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ آج رات ہم نے بنوابیرق کے گھر میں دیر تک آگ جلتی ہوئی دیکھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہی آٹا پکتا رہا۔ بنوابیرق کو جب اس کی اطلاع ملی کہ ہمارا نام لیا جا رہا ہے تو انہوں نے جو اسلحہ چرایا تھا وہ بھی اس یہودی کے گھر میں امانت رکھوا دیا اور پھر لوگوں کے تحقیق کرنے پر پہلے تو انکار کرتے رہے اور جب بات زیادہ بڑھی تو یہودی پر الزام لگایا کہ تم اس کی گھر کی تلاشی لے کے دیکھو یہ سب کچھ اس کے گھر سے ملے گا۔ چنانچہ یہودی کے گھر کی تلاشی لی گئی تو اس کے گھر سے وہ سامان نکلا تو اس نے بتایا کہ یہ سامان تو بنوابیرق نے میرے پاس رکھوایا ہے۔

حضرت قتادہ اور حضرت رفاعہ کو کسی وجہ سے یہ غالب گمان تھا کہ یہ چوری بنوابیرق نے کی ہے۔ ممکن ہے ان کے علم میں یہ بات ہو جسے ترمذی نے روایت کیا ہے کہ ''یہ بشیر بن ابیرق درحقیقت منافق تھا۔ مدینہ میں رہتے ہوئے بھی صحابہ کرام کی توہین میں اشعار لکھ کر دوسروں کے ناموں سے اس کی اشاعت کیا کرتا تھا'' چنانچہ حضرت قتادہ اور حضرت رفاعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر چوری کا واقعہ عرض کیا اور بنوابیرق پر اپنے شبہے کا اظہار کیا۔ بنوابیرق کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آ کر عرض کی کہ حضور ہم مسلمان ہیں اور مسروقہ مال ایک یہودی کے گھر سے برآمد ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود حضرت رفاعہ اور قتادہ ہم پر الزام لگا رہے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ یہودی کی برأت کی جا رہی ہے اور ہمیں ملزم ٹھہرایا جا رہا ہے۔ آپ انہیں روکیں کہ یہ بلاثبوت ہم پر الزام نہ لگائیں۔ خاندانِ ابیرق کے باقی لوگوں نے کچھ اپنے خاندان کی عصبیت کے باعث اور کچھ اس خیال سے کہ بشیر بہرحال مسلمان ہے وہ ایسا کام کس طرح کر سکتا ہے۔ انہوں نے بشیر کی حمایت جاری رکھی۔ اور بعض دوسرے مسلمان بھی جو اس کے نفاق سے واقف نہ تھے اسے مسلمان سمجھ کر اسے بری قرار دیتے تھے اور یہودی کو یہودی ہونے کی وجہ سے مجرم ٹھہراتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی اس مسلسل پروپیگنڈے کے باعث اس طرف رجحان ہونے لگا کہ یہ کام اس مسلمان کا نہیں بلکہ یہودی کا ہے۔ اسی تاثر کے باعث جب حضرت قتادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ تم بغیر ثبوت اور دلیل کے ایک مسلمان گھرانے پر چوری کا الزام کیوں لگا رہے ہو؟ چنانچہ حضرت قتادہ اس پر اس قدر رنجیدہ ہوئے کہ وہ بھی اور حضرت رفاعہ بھی اپنے گھر بیٹھ گئے اور انہیں اس بات پر شدید دکھ ہوا اور وہ اس پر افسوس کرنے لگے کہ کاش میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہ گیا ہوتا۔ اس پر یہ آیاتِ کریمہ نازل ہوئیں اور

Marfat.com

پروردگار نے اس میں براہِ راست مداخلت فرمائی۔ وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لوگوں کی گواہیوں کے باعث متاثر ہو جانا اور یہ خیال کرنا کہ یہودی کو مجرم ٹھہرا کر اس پر حد جاری کر دی جائے شرعی نقطۂ نگاہ سے کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ کیونکہ قاضی فیصلہ کرنے کے لیے حالات اور گواہیوں کو دیکھتا ہے اور اسی کے مطابق فیصلہ کرنے کا پابند ہے۔ اور اگر جھوٹے گواہ قاضی سے غلط فیصلہ کروا دیں تو عنداللہ قاضی قصور وار نہیں ٹھہرتا بلکہ قیامت کے دن ان جھوٹے گواہوں کو پکڑا جائے گا۔ اس معاملے میں بھی اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشیر کے حق میں اور یہودی کے خلاف فیصلہ دے دیتے تو یقیناً آپ حق بجانب ہوتے۔ لیکن جب یہ معاملہ پیش آیا اس وقت اسلام اور کفر کے درمیان ایک زبردست کشمکش برپا تھی۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روداد مقدمہ کے مطابق یہودی کے خلاف فیصلہ فرما دیتے تو اسلام کے مخالفوں کو آپؐ کے اور تمام مسلمانوں کے خلاف حتیٰ کہ خود اسلام کے خلاف ایک زبردست اخلاقی حربہ ہاتھ آ جاتا۔ وہ یہ کہتے پھرتے کہ چھوڑیے جناب یہاں بھی صرف دعوے ہی دعوے ہیں۔ لیکن جب کوئی فیصلہ کن وقت آتا ہے تو وہی جتھہ بندی اور عصبیت کام کرتی دکھائی دیتی ہے اور اپنے ہی گروہ کی حمایت کی جاتی ہے۔ حالانکہ رات دن اسی کے خلاف تبلیغ بھی جاری رہتی ہے کہ مسلمانوں کو گروہ پرستی نہیں کرنی چاہیے بلکہ حق کی حمایت میں عدل وانصاف سے کام لینا چاہیے۔ اس لیے پہلی آیتِ کریمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعہ کی اصل حقیقت بتا کر ارشاد فرمایا ہے کہ آپؐ کی ذات قیامت تک کے لیے حق اور عدل کا نمونہ ہے۔ اللہ نے آپ کے سامنے عدل واحسان کی ایک ایک بات کو اس طرح واضح کر دیا ہے جیسے آپ نے اسے آنکھوں سے دیکھا ہو۔ اس لیے آپ کی طرف سے ان جانے میں بھی کوئی کوتاہی عظیم نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ ظاہری حالات اور قرائن کی بنا پر مسلمانوں کے حق میں اور یہودی کے خلاف آپ کا رجحان اگرچہ کوئی گناہ نہ تھا لیکن آپؐ کی ذات کی عظمت کے باعث اس کے نتائج نہایت خطرناک ہو سکتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حالات سے مطلع کرنا ضروری سمجھا۔ لیکن آپ جو تاثر قائم کر چکے ہیں اس پر آپ اللہ سے استغفار کریں اور آئندہ کے لیے نہایت احتیاط سے کام لیتے ہوئے لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کریں کہ یہ کہیں جھوٹے اور خیانت کار تو نہیں۔ اللہ کو ایسے لوگوں کی حمایت ہرگز پسند نہیں۔ کیونکہ خائن کی حمایت دراصل خیانت کی حمایت ہے جس سے دیانت، حق اور عدل تباہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

خطاب حضور سے، روئے سخن منافقین کی طرف

یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہیے وہ یہ کہ خطاب اگرچہ اس تنبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ لیکن روئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جن کی وجہ سے آپ کو یہ تاثر قائم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن پروردگار انہیں چونکہ خطاب کا اہل نہیں سمجھتے اس لیے آپ کو خطاب فرما کر انہیں بتلانا مقصود ہے۔ کہ تمہارا رویہ کس قدر غلط تھا۔ اسی لیے براہِ راست ان کے طرزِ عمل کی نشاندہی بھی فرمائی کہ آپ جن کی حمایت کا ارادہ فرما رہے تھے ان کا حال تو یہ ہے کہ وہ باوجود مسلمان کہلانے کے راتوں کو چھپ چھپ کر ان باتوں کے مشورے کرتے تھے جو اللہ کو ناپسند ہیں۔ کہ اپنے آدمی کی ناجائز حمایت کی جائے اور فلاں فلاں آدمی پر الزام دھرا جائے۔ یہودی کے کافر ہونے کو اچھالا جائے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی ہمدردیاں اپنے حق میں ہموار کی جائیں۔ اور یہ مشورے وہ اپنے گھروں میں چھپ کے کرتے تھے اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ دوسرے مسلمانوں کو اس کی اطلاع نہ ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی نادانی دیکھو کہ اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں لیکن اس بات کا یقین نہیں رکھتے کہ وہ لوگوں سے تو چھپ سکتے ہیں لیکن اللہ سے تو نہیں چھپ سکتے۔ کیونکہ وہ تو ہر حال میں ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جو کچھ بھی

Marfat.com

وہ کرتے ہیں ان کا کوئی عمل بھی اللہ کے احاطہ علم سے باہر نہیں اور نہ یہ لوگ اللہ کی گرفت سے آزاد ہیں۔ پہلے منہ پھیر کر انہیں تنبیہ فرمائی جا رہی تھی اب ارتقاءِ کلام کے ساتھ ساتھ گفتگو کا رخ براہِ راست ان کی طرف پھر گیا ہے۔ اور انہیں خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے:

هٰٓاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلۡتُمۡ عَنۡهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ فَمَنۡ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنۡهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَمۡ مَّنۡ يَّكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ وَكِيۡلًا ○

''یہ تم ہو جنہوں نے دنیا کی زندگی میں ان کی مدافعت کی تو قیامت کے دن اللہ سے کون ان کی مدافعت کرے گا۔ یا کون ان کا ذمہ دار بنے گا۔'' (النسآء:۱۰۹)

ھا حرف تنبیہ ہے۔ یہ جملہ کے شروع میں آتا ہے۔ اور مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو ہوشیار کیا جائے کہ وہ کان کھول کر بات سنے۔

ان آیات میں دو دفعہ ''لا تجادل'' اور ''جادلتم'' ایک ہی فعل سے نکلنے والے لفظ آئے ہیں جن کا مصدر مجادلہ ہے۔ قرآن پاک میں یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا معنی مناظرہ، کٹ حجتی اور جھگڑنا بھی ہوتا ہے اور ادب و احترام یا محبت سے کسی سے شکوہ کرنا یا اصرار کرنا بھی ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کا استعمال صرف اصرار کرنے کے معنی میں ہے۔ اور دوسرے لوگوں کے حوالے سے جھگڑا کرنے کے معنی میں ہے۔

حمایت کرنے والوں کو تنبیہ

اس آیتِ کریمہ میں بنو ابیرق کی حمایت کرنے والوں کو تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ تم نے خاندانی عصبیت کے جوش میں تو دنیا میں ان کی حمایت کر لی لیکن یہ معاملہ یہیں تو ختم نہیں ہو جائے گا قیامت کے دن جب یہ معاملہ اللہ کے حضور پیش ہوگا وہاں بتلاؤ تم میں سے کون ان کی حمایت کرے گا یا کون ان کے کام آنے کی کوشش کرے گا۔ وہاں تو وہ اپنے جرم میں پکڑا جائے گا اور تم اپنی ناجائز حمایت میں پکڑے جاؤ گے تم دونوں نے ایک بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اپنے اپنے جرائم سے توبہ کر کے اپنی آخرت کو سنوار لو۔

وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ○

''اور جو کسی برائی کا ارتکاب کرے یا اپنی جان پر ظلم ڈھائے، پھر اللہ سے مغفرت چاہے۔ تو وہ اللہ کو بخشنے والا رحم کرنے والا پائے گا۔'' (النسآء:۱۱۰)

قرآنِ کریم کا حکیمانہ اسلوب

سابقہ آیات میں درجہ بدرجہ تنقید کا حق ادا کرنے کے بعد ایک اصولی بات ارشاد فرمائی جو قرآن کریم کا عام حکیمانہ اسلوب ہے کہ جب کسی برائی پر نکیر کرتا ہے اور پھر اس کے انجام سے ڈراتا ہے تو مخاطب کو مایوس نہیں ہونے دیتا۔ ساتھ ہی اسے مغفرت کا راستہ بھی دکھاتا ہے۔ یہاں بھی یہی فرمایا کہ تمہاری غلطیاں کوتاہیاں اور حدود سے تجاوز اپنی جگہ لیکن تمہیں اللہ کی بے پایاں رحمت کے حوالے سے یہ بات و

Marfat.com

رکھنی چاہئے کہ جو شخص کوئی بھی گناہ کرتا ہے اس کا تعلق چاہے حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے' وہ اگر اپنے گناہ پر اصرار نہیں کرتا بلکہ اللہ سے مغفرت کا طلبگار رہوتا ہے تو وہ یقیناً اپنے رب کو رحم کرنے والا اور درگزر کرنے والا پائے گا۔ یہ انسانوں کی ریت ہے کہ وہ زیادتی کرنے والوں کو جلدی معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اللہ کی رحمت تو ایسی بے ساختہ ہے کہ جب بھی کوئی اسے اپنی طرف اخلاص سے متوجہ کرتا ہے تو وہ گھٹا بن کر برس جاتی ہے۔ لیکن جو بدنصیب اس رحمت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتا اس کے بارے میں ارشاد فرمایا:

وَ مَنۡ یَّکۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا یَکۡسِبُہٗ عَلٰی نَفۡسِہٖ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ۝

اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر آتا ہے۔ اور اللہ علیم وحکیم ہے۔'' (النسآء:۱۱۱)

گناہ کرنے والے کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ جب بھی اللہ کا کوئی حکم توڑتا ہے یا اللہ کے کسی بندے کی حق تلفی کرتا ہے تو وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑتا اور نہ وہ مسلمانوں کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کی حفاظت میں ہیں۔ البتہ اس کی ہر کرتوت کا وبال اسی پر پڑے گا۔ دنیا میں رسوائی اس کا مقدر ہوگی اور ایک وقت آئے گا جب وہ ہر چیز سے تہی دامن ہو جائے گا اور آخرت میں جہنم کے عذاب کا سزاوار ہوگا۔ اللہ علیم ہے وہ جب پکڑے گا تو انجانے میں نہیں پکڑے گا' ہر شخص کا ایک ایک عمل اس کے علم میں ہے۔ وہ حکیم بھی ہے اس لیے پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا۔

وَ مَنۡ یَّکۡسِبۡ خَطِیۡٓـَٔۃً اَوۡ اِثۡمًا ثُمَّ یَرۡمِ بِہٖ بَرِیۡٓــًٔا فَقَدِ احۡتَمَلَ بُہۡتَانًا وَّ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا ۝

''اور جو کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کرتا ہے پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگاتا ہے تو اس نے اپنے سر ایک بہت بڑا بہتان اور صریح گناہ لیا ہے۔'' (النسآء:۱۱۲)

اور جو شخص اپنے گناہ کی معافی مانگنے اور اس پر نادم ہونے کی بجائے مزید حرکت یہ کرتا ہے کہ دنیا کی نگاہوں میں اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے اپنے گناہ کا الزام کسی دوسرے بے گناہ پر لگا دیتا ہے جیسے اس واقعے میں بنی ابیرق نے کیا کہ بجائے اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے اس نے اپنے جرم کی تہمت ایک یہودی پر لگادی اور یہودی کے کفر کو نمایاں کر کے اپنے جیسے منافقین اور کمزور مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرلیں۔ اللہ فرماتا ہے جو شخص بھی ایسی حرکت کرتا ہے تو وہ دوہرے جرم میں پکڑا جائے گا۔ ایک تو اس جرم کی پاداش میں جس کا اس نے ارتکاب کیا اور دوسرا بے گناہ پر جھوٹ باندھنے اور بہتان لگانے کے جرم میں۔ یعنی اس نے اپنے اصل جرم پر ایک جھوٹ اور بہتان کا اضافہ کر لیا۔ تو جو شخص استغفار کی بجائے گناہوں میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی گرفت بھی سخت ہوتی جاتی ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بشیر بن ابیرق جس نے چوری کی تھی وہ بجائے استغفار کرنے کے مدینہ سے بھاگ کر مکہ چلا گیا اور مشرکین مکہ کے ساتھ مل گیا۔ پہلے وہ منافق تھا تو اب کھلا کافر ہو گیا اور اگر پہلے مسلمان تھا تو اب مرتد ہو گیا۔ تفسیر بحرِ محیط میں ہے کہ اللہ اور رسول کی مخالفت کے وبال نے بشیر بن ابیرق کو مکہ میں بھی چین سے نہ رہنے دیا' جس عورت کے مکان پر جا کے ٹھہرا تھا اس کو واقعہ کی خبر ہوئی تو اس نے بھی اپنے گھر سے نکال دیا۔ اسی طرح پھرتے پھرتے آخر اس نے ایک اور شخص کے مکان میں نقب لگائی تو دیوار اس کے اوپر گر گئی اور وہیں دب کر مر گیا۔ یہ انجام ہوا اس شخص کا جس نے توبہ کی بجائے سرکشی کا راستہ اختیار کیا۔

Marfat.com

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ
لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ
وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾
لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ
اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ
اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ
بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ
مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ ع

عربی رکوع ۱۷ (اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تہیہ کر لیا تھا۔ کہ وہ تمہیں غلط فہمی میں ڈال دیں۔ حالانکہ وہ غلط فہمی میں نہیں ڈالتے مگر اپنے آپ کو اور تمہیں ضرر نہیں پہنچا سکتے کچھ بھی اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور تمہیں وہ چیز سکھائی ہے جو تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کا تم پر فضل عظیم ہے o نہیں ہے کوئی بھلائی ان کی اکثر سرگوشیوں میں بجز ان لوگوں کے جو حکم دیں صدقہ دینے کا یا نیک کام کا یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کا۔ اور جو اللہ کی رضا جوئی میں ایسا کریں گے تو ہم ان کو اجر عظیم عطا فرمائیں گے o اور جو شخص مخالفت کرے رسول کی اس کے بعد کہ روشن ہو گئی اس کے لیے ہدایت اور پیروی کرے مسلمانوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی تو ہم اس کو اسی راہ پر ڈالیں گے جس پر وہ پڑا اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے) (آیات ۱۱۳ تا ۱۱۵)

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ

Marfat.com

اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَضُرُّوۡنَكَ مِنۡ شَىۡءٍ‌ ؕ وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡـكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ‌ ؕ وَكَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ عَظِيۡمًا ○

"اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تہیہ کرلیا تھا۔ کہ وہ تمہیں غلط فہمی میں ڈال دیں۔ حالانکہ وہ غلط فہمی میں نہیں ڈالتے مگر اپنے آپ کو اور تمہیں ضرر نہیں پہنچا سکتے کچھ بھی اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور تمہیں وہ چیز سکھائی ہے جو تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کا تم پر فضل عظیم ہے۔" (النسآء:۱۱۳)

اس رکوع کے مضمون کا تعلق بھی گزشتہ رکوع کے مضمون سے ہے۔ بلکہ کہنا چاہئے ایک ہی واقعہ ہے دونوں رکوعوں میں جس کے حوالے سے ہدایات دی جارہی ہیں۔ جس شخص نے چوری کی تھی اس کے قبیلے اور اس کے حمایتیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی پوری کوشش کی۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتے کہ جس شخص پر چوری کا الزام لگایا جارہا ہے وہ مسلمان ہے' اس کا قبیلہ مسلمان ہے' اس کا کہنا یہ ہے کہ یہ چوری میں نے نہیں کی بلکہ یہودی نے کی ہے اور یہودی کے گھر سے مسروقہ سامان بھی برآمد ہو چکا ہے سامان کا برآمد ہونا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہودی ہی اس جرم کا مرتکب ہے اور مزید یہ بات کہ اگر وہ جرم سے انکار کرتا ہے تو انکار تو یہ شخص بھی کررہا ہے جس پر الزام لگایا جارہا ہے تو دو انکار کرنے والوں میں ایک یہودی ہے اور ایک مسلمان۔ دونوں میں اعتبار کس کا ہونا چاہئے؟ مسلمان کا یا یہودی کا؟ یہ وہ منطق تھی جس کی بنیاد پر وہ اپنا کیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کررہے تھے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دلائل سے جس طرح دوسرے مسلمان متاثر ہو گئے تھے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سوچنا شروع کر دیا تھا' لیکن اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ اپنے رسول کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونے دیتا اور اگر اس کا امکان پیدا ہو جائے تو وہ خود مداخلت کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی پروردگار نے مداخلت فرمائی اور جو اصل واقعہ تھا اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع فرمایا۔ یہی وہ بات ہے جس کا یہاں ذکر فرمایا جارہا ہے کہ اگر اللہ کا فضل آپ پر نہ ہوتا اور وہ فضل یہ ہے کہ اللہ اپنے پیغمبر کی غلطیوں سے حفاظت کرتا ہے۔ تو کچھ لوگوں نے تو آپ کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا سارا سامان کر دیا تھا۔ اور وہ ہر ممکن طریقے سے آپ سے غلط فیصلہ کروانا چاہتے تھے۔ لیکن اللہ کے فضل کی موجودگی میں وہ اس میں کس طرح کامیاب ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اللہ نے انہیں ناکام کر دیا اور صحیح صورتحال اپنے پیغمبر پر واضح کر دی۔ مزید فرمایا کہ اگر بفرض محال وہ آپ سے غلط فیصلہ کروا بھی لیتے تو اس سے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچتا' کیونکہ ایک قاضی اور منصف کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ معاملے کو امکانی حد تک سمجھنے کی کوشش کرے اور پھر اگر مدعی کے پاس گواہ ہوں تو گواہوں کے مطابق فیصلہ کرے۔ اور اگر گواہ نہ ہوں تو پھر مدعا علیہ سے قسم لے اور اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ اگر مدعی جھوٹے گواہوں کے ذریعے اپنے حق میں فیصلہ کروا لے یا مدعا علیہ جھوٹی قسم اٹھا کر فیصلہ اپنے حق میں کرا دے تو اس میں الزام اور گناہ جھوٹ بولنے والے اور غلط فیصلے کے لیے کوشش کرنے والوں پر آئے گا قاضی پر نہیں۔ یہ لوگ بھی جھوٹ بول کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غلط فیصلہ لے لیتے ہیں تو اس کا گناہ اور نقصان ان کے ذمے ہے حضور کا وہ کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے تو اے پیغمبر آپ کو ہر طرح سے غلط فہمی میں مبتلا کر کے آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی' لیکن آپ پر چونکہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے اس لیے وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے اور آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ البتہ اپنی ان ناجائز کوششوں سے انہوں نے اپنی آخرت ضرور تباہ کر لی۔ آپ کا تو کچھ نہ بگاڑ سکے

Marfat.com

لیکن خود اپنا سب کچھ بگاڑ لیا۔ کیونکہ دوسروں کو گمراہ کرنے والے جب اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوتے اور جادۂ حق پر استوار رہنے والوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ خود ان کی اپنی گمراہی اور اپنی بدقسمتی اس قدر مستحکم ہو جاتی ہے کہ اب اس سے نکلنا ان کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اس کے بعد اللہ نے اپنے اس احسان کا ذکر فرمایا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر فرمایا گیا اور آپ کے واسطے سے ساری دنیا کو اس کا فیض پہنچا۔ وہ احسان یہ ہے کہ اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور آپ کو وہ کچھ سکھایا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے۔ کتاب سے مراد تو قرآنِ کریم ہے۔ لیکن حکمت سے مراد قرآنِ کریم نہیں بلکہ قرآنِ کریم کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔ جس کو ''واؤ'' کے عطف کے ساتھ لایا گیا اور ہم جانتے ہیں کہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت ہوتی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حکمت کتاب سے ایک زائد چیز ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ زائد ہونے کے باوجود قرآنِ کریم سے الگ یا بیگانہ نہیں' بلکہ قرآنِ کریم سے ہی ماخوذ اور مستنبط ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم میں گہری نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمت کا اطلاق اس گہری بصیرت پر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو عطا فرماتے ہیں' جس کے نتیجے میں پیغمبر اللہ کی شریعت کے اصولی احکام کو جزئیات کی تفصیل دیتا ہے اور اس کو ٹھیک اسی طرح نافذ کرتا اور عملی شکل دیتا ہے جس طرح اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ اگرچہ اس بصیرت کا راہنما وہ علم ہوتا ہے جو بغیر الفاظ کے اس کے دل پر اترتا ہے' لیکن اس سے ایک پورا نظام اور ایک عمل کی ہیئت کو مستنبط کرنا اللہ کے رسول کی بصیرت اور حکمت کا کمال ہوتا ہے۔

اسی طرح حکمت کا لفظ اس قوت وصلاحیت پر بھی بولا جاتا ہے جس قوت وصلاحیت سے انسان معاملات کا فیصلہ حق کے مطابق کرتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں پروردگار نے قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا ''وَ اٰتَیۡنٰهُ الۡحِکۡمَةَ وَ فَصۡلَ الۡخِطَابِ'' (ہم نے اس کو حکمت عطا کی اور فیصلۂ معاملات کی صلاحیت بھی بخشی) یہ ''فَصۡلَ الۡخِطَابِ'' حکمت کا بیان معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح اللہ اپنے پیغمبر کو اخلاق کی ایسی پاکیزگی اور تہذیب کی ایسی شائستگی عطا فرماتا ہے جس کا پوری دنیا میں کہیں نشان تک نہیں ہوتا۔ یہ بھی اسی حکمت کا ثمرہ ہے۔ مختصر یہ کہ اللہ نے جس طرح قرآنِ کریم کی شکل میں علم' قانون اور تہذیب کا ایک خزانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا ہے اسی طرح آپ کو حکمت کی صورت میں گہری بصیرت' بلند اخلاق اور فیصلۂ معاملات کی صلاحیت بھی بخشی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے علماء نے حدیث اور سنت قرار دیا ہے۔ اور آپ کو وہ کچھ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کے رسول کا علم جیسا اور جتنا بھی ہو وہ اللہ کی عطا ہوتا ہے ذاتی نہیں ہوتا' اسی لیے قرآنِ کریم میں پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ علم کے خزانے عطا فرمائے لیکن نبوت سے پہلے آپ کا حال یہ تھا کہ ''ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان'' (آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے) نبوت سے پہلے کی بے خبری کا یہ عالم تھا اور نبوت کے بعد رفتہ رفتہ اللہ کی طرف سے علم نازل ہوتا گیا اور اب آپ کا حال یہ ہے کہ خود پروردگار آپ ﷺ پر اپنے اس فضل کا ذکر فرماتے ہیں اور اسے اپنی رحمت قرار دیتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کا رسول دنیا میں کسی کا شاگرد نہیں ہوتا۔ وہ براہِ راست تلمیذ رحمان ہوتا ہے۔ اللہ کا علم اس کے دل پر اترتا ہے یا حضرت جبرائیل علیہ السلام کے واسطے سے آتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ آپ ﷺ کا اپنے پروردگار سے ایسا بھی تعلق ہوتا ہے جس میں کسی مقرب فرشتے کا بھی گزر نہیں ہو سکتا۔ کسی عالم کے علم کی وسعت اور اس کی پختگی کے حوالے کے لیے ہمیشہ اس کے استاد کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ وہ اتنے بڑے عالم کا شاگرد ہے یقیناً وہ خود بڑا عالم ہوگا۔ جس ذاتِ عزیز کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ براہِ راست اللہ سے علم حاصل کرتی ہے تو اس کی علم کی وسعتوں

Marfat.com

گہرائی کا کیا اندازہ ہوسکتا ہے؟ اس لیے اجمالی طور پر صرف یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ اللہ نے اپنے آخری رسول کو وہ کچھ عطا فرمایا ہے جو آپ کی شان کے لائق تھا۔ اور اس میں کوئی نبی اور کوئی رسول بھی آپ کا ہمسر نہیں۔ لیکن ہم آپ کے علم کو ناپنے کی گستاخی نہیں کر سکتے اور نہ ایسا دعویٰ کر سکتے ہیں جس میں اللہ کے علم کے ساتھ ساتھ برابری کا شبہ بھی ہونے لگے۔

لَاخَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ ۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ○

''نہیں ہے کوئی بھلائی ان کی اکثر سرگوشیوں میں بجز ان لوگوں کے جو حکم دیں صدقہ دینے کا یا نیک کام کا یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کا۔ اور جو اللہ کی رضا جوئی میں ایسا کریں گے تو ہم ان کو اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔'' (النسآء ۴:۱۱۴)

گزشتہ رکوع کی ایک آیت میں فرمایا تھا کہ چور کی حمایت کرنے والے دراصل منافق ہیں اور یہ راتوں کو چھپ چھپ کر ایسی باتوں کے مشورے کرتے ہیں جنہیں اللہ پسند نہیں کرتا۔ یعنی وہ خلاف اسلام باتیں ہوتی ہیں۔ یہاں اس بات کو مزید کھول دیا گیا ہے کہ یہ منافق لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ ''نجویٰ'' سرگوشی کو کہتے ہیں۔ یعنی رازداری کے انداز میں کسی سے کوئی بات کرنا۔ اس میں بظاہر کوئی قباحت نہیں کیونکہ زندگی میں بسا اوقات رازداری میں بات کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اچھے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور برے لوگ بھی۔ البتہ اس میں برائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سرگوشی غلط باتوں کی کی جائے۔ منافقین کی عادت تھی کہ مسلمانوں کے خلاف جب کوئی بات کہنا اور دل کی بڑھاس نکالنا چاہتے تو ہمیشہ رازداری کے انداز میں ایک دوسرے کے کان میں باتیں کرتے۔ اس لیے یہاں قرآن کریم نے اصولاً یہ خبر دی کہ ان لوگوں کا حال عام طور پر یہ ہے کہ یہ جب بھی سرگوشیاں کرتے ہیں تو عموماً اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یا کسی برائی کو پھیلانے کے لیے کرتے ہیں' ان کی اکثر سرگوشیوں میں خیر نہیں ہوتی۔ اور پھر مسلمانوں کو سرگوشیوں کے حوالے سے وہ تعلیم بھی دے دی جس کی ضرورت تھی۔ اور اشارتاً یہ بھی بتا دیا کہ یہ لوگ سرگوشیوں میں کس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ تعلیم تو یہ دی کہ رازداری سے بات کرنا برا نہیں' البتہ اس میں ہونا یہ چاہئے کہ آدمی دوسروں سے فرداً فرداً ملے' علیحدگی میں ملاقاتیں کرے تو عنوان یہ ہونا چاہئے کہ ہمارے اندر کتنے لوگ کسمپرسی کا شکار ہیں۔ کتنے گھر ایسے ہیں جن میں چولہا نہیں جلتا۔ کتنی ایسی اجتماعی ضرورتیں ہیں جو لوگوں کے مالی تعاون کی محتاج ہیں۔ ہمیں آپس میں کوشش کرنی چاہئے کہ مالی تعاون کی ایک فضا پیدا کریں تاکہ مسلمانوں کی یہ ساری ضرورتیں پوری ہونے لگیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو یہاں ''اَمَرَ بِصَدَقَةٍ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ایک دوسرے کو صدقہ اور خیرات کرنے کا مشورہ دو اور دوسری بات فرمائی کہ آپس کی سرگوشیوں میں معروف کا ذکر ہونا چاہئے۔ معروف سے مراد یہ ہے کہ اصلاحی منصوبوں اور نیکی کے کاموں کو عملی جامہ پہنانے کی تدبیریں کی جائیں۔ ایک ایک فرد سے مل کر ہر اچھے کام میں تعاون کی فضا پیدا کی جائے۔ اور تیسری بات فرمائی ''اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ'' جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں عموماً تلخیاں پائی جاتی ہیں۔ فتنہ و فساد کی آئے دن آگ بڑھکتی رہتی ہے۔ ہمیں مل بیٹھ کر سوچنا چاہئے کہ اسے کیسے فرو کیا جائے اور لوگوں میں کس طرح محبت کی فضا پیدا کی جائے کہ لوگ ایک دوسرے کی ساتھ معاملات درست کرنے کی کوشش کریں۔ معروف کا لفظ اگرچہ ہر نیکی کو شامل ہے لیکن ناراض آدمیوں میں صلح کرانے کا الگ سے ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ وہ کام ہے جو سب کاموں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ ''کیا میں تمہیں ایسا کام نہ بتاؤں جس کا درجہ روزہ' نماز اور صدقہ سے بھی افضل ہے۔''

Marfat.com

صحابہ نے عرض کیا ''ضرور فرمائیے۔'' تو آپؐ نے فرمایا ''وہ کام اصلاح ذات البین ''یعنی دو شخصوں کے درمیان کوئی رنجش پیدا ہو جائے تو اس کو دور کرنے کی کوشش کرنا اور ان کی حالات کو درست کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ یہ سب سے بڑی نیکی ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا ''فساد ذات البین ھی الحالقة'' (لوگوں کا آپس میں جھگڑا فساد مونڈ دینے والی چیز ہے) پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ''یہ جھگڑا سر کو نہیں مونڈتا بلکہ انسان کے دین کو مونڈ ڈالتا ہے'' اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اسلام میں جھوٹ بولنا بدترین گناہ ہے۔ لیکن دو شخصوں میں صلح کرانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صلح کرانے والا جب دو فریقوں سے ملے گا تو ہر فریق یقیناً دوسرے کی برائی کرے گا۔ صلح کرانے والے کو حضور نے اجازت دی ہے کہ دونوں فریق تو ایک دوسرے کو برا بھلا کہیں گے لیکن تم دونوں سے باری باری یہ کہو کہ ''تم تو بہت ناراض ہو اور دوسرے کے بارے میں بہت سخت باتیں کہہ رہے ہو لیکن وہ شخص تو تمہاری بہت تعریف کرتا ہے اور اسے اس بات کا شدید رنج ہے کہ ہمارے تعلقات آپس میں کیوں بگڑ گئے۔ اس طرح جب دونوں سے بات کی جائے گی تو یقیناً دونوں نرم پڑ جائیں گے اور صلح کی امکانات بڑھ جائیں گے۔

ان تین باتوں کا ذکر اس طرح فرمایا گیا ہے کہ سرگوشی کرنے کی اگر ضرورت پیش آئے تو سرگوشی ان امور پر ہونی چاہیے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو مسلمانوں کے فکرمندی کے موضوعات ہونے چاہئیں۔ لیکن بالواسطہ یہ بتانا بھی مقصود معلوم ہوتا ہے کہ منافقین جب آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں تو ان کے سرگوشیوں کے موضوع بالکل اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ وہ بجائے مسلمانوں سے مالی تعاون اور ان کی ضروریات کے لیے کوئی راستہ نکالنے کے وہ ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ جہاں جہاں سے بھی ان سے مالی تعاون روکا جا سکتا ہے اس کے لیے مقدور بھر کوشش کی جائے۔ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کا تذکرہ تو سورۃ المنافقون میں موجود ہے۔ اس نے اپنے احباب کو یہ مشورہ دیا ہوتا ''لا تنفقوا علی من عند رسول الله'' (جو لوگ اللہ کے رسول کے پاس ہیں (یعنی مہاجرین) ان پر خرچ مت کرو) یہ بھوکے ننگے لوگ ہیں جب تم ہاتھ کھینچ لو گے تو یہ خود ہی چلتے بنیں گے۔ اسی طرح ان کی سرگوشیوں کا موضوع کوئی معروف نہیں ہوتا بلکہ ان کی سرگوشیاں مسلمانوں میں منکرات پھیلانے کے لیے ہوتی ہیں۔ آج کے منافقین کو بھی دیکھ لیجیے جن کے قبضے میں ذرائع ابلاغ ہیں وہ بھی بڑی بلند جگہوں پر بیٹھ کر مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانے اور دوسرے منکرات کو عام کرنے کی منصوبہ بندی میں لگے رہتے ہیں اور اسی کو بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔ تیسری بات ارشاد فرمائی کہ ان کی سرگوشیاں اصلاح بین الناس کے لیے نہیں ہوتیں، بلکہ افساد بین الناس کے لیے ہوتی ہیں۔ وہ مسلمانوں کو ہمیشہ لڑانے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ منافقین کا طرز عمل تو یہی ہے جس کا تذکرہ ہو چکا، لیکن جو شخص مسلمانوں کی مالی ضرورتوں کے لیے پریشان ہے اور اس کا کوئی راستہ نکالنا چاہتا ہے وہ ایک ایک نیکی کے لیے لوگوں کے ذہنوں کو ہموار کرنے کی تدبیر کرتا ہے اور اس کی تمام کوششیں لوگوں کے معاملات اور تعلقات کو درست کرنے میں صرف ہوتی ہیں۔ اور وہ یہ سب کچھ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے تو ہم اس کو اجر عظیم عطا کریں گے۔ یہ کام ایسے ہیں جن کا کرنے والا یقیناً ایک بہت بڑے اجر کا مستحق ہو جاتا ہے۔

وَ مَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ یَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِیْرًا ۟

Marfat.com

''اور جو شخص مخالفت کرے رسول کی اس کے بعد کہ روشن ہوگئی اس کے لیے ہدایت اور پیروی کرے مسلمانوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی تو ہم اس کو اسی راہ پر ڈالیں گے جس پر وہ پڑا اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔'' (النسآء:١١٥)

کہا جاتا ہے کہ یہ آیت اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی (جس کا ذکر گزشتہ رکوع میں ہوا) جس نے چوری کی تھی، لیکن اپنے جرم کا اعتراف کرنے کی بجائے الزام ایک یہودی پر لگا دیا' لیکن قرآنِ کریم نے جب اس واقعے کی اصل حقیقت کو ظاہر کر دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے حق میں اور اس شخص کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ اب بجائے اس کے کہ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا' اسے جاہلیت کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ وہ مکہ معظمہ بھاگ گیا اور مشرکین مکہ کے ساتھ جا ملا۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اگر وہ اس سے پہلے مسلمان تھا تو مرتد ہو گیا اور اگر وہ منافق تھا تو اب کافر ہو گیا۔ اور وہیں پھر ایک گھر میں چوری کرتے ہوئے اس کے اوپر دیوار آ گری اور اس کے نیچے آ کر وہ مر گیا۔ اور یہ انجام اس کا اس لیے ہوا کہ اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر کافروں کے راستہ پر چل پڑا۔

شانِ نزول سے قطع نظر اس آیت میں چند بنیادی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ اللہ کا رسول دنیا میں ہدایت کی شناخت بن کے آتا ہے۔ شناخت کیسی بھی مکمل ہو پہچاننے والوں کی نگاہیں یکساں نہیں ہوتیں اس لیے کوئی جلدی پہچان لیتا ہے اور کوئی دیر بعد پہچانتا ہے اور جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہو وہ ساری عمر بھی نہیں پہچان پاتا۔ لیکن جو شخص ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد بھی رسول کی مخالفت کرتا ہے تو وہ درحقیقت اللہ کی مخالفت کرتا ہے کیونکہ رسول اپنی بات نہیں کرتا اس کی ہر بات اللہ کی بات ہوتی ہے۔ اسی طرح جو رسول پر ایمان لاتے ہیں وہ جس راستے پر چلتے ہیں وہی راستہ رسول کا راستہ ہے اور وہی راستہ اللہ کی ہدایت کا راستہ ہے۔ اب جو شخص رسول کی مخالفت میں دھڑے بندی شروع کر دے اور بجائے انکا اتباع کرنے کے اپنے گروہ اور اپنے دھڑے کے ساتھ چلنا شروع کر دے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنی الگ پارٹی بنا لے ایسا شخص اس قابل نہیں رہتا کہ وہ ہدایت قبول کر سکے۔ یا ہدایت کے راستہ پر چل سکے۔ اس کی مخالفت اسے اللہ اور اس کے رسول کے مقابل لا کھڑا کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے پوری طرح شیطان کو اپنا امام مان لیا ہے اور اس نے اپنی باگ ڈور شیطان کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسی صورت حال میں ہمارا قانونِ ہدایت وضلالت حرکت میں آتا ہے تو پھر ہم اسے اسی راستے کی طرف پھیر دیتے ہیں جس پر وہ چلنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص ہدایت کا راستہ اختیار کرتا ہے وہ دراصل اپنا ہاتھ اللہ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور اللہ کو اپنا ولی بنا لیتا ہے۔ اللہ پھر اسے ہر طرح کی تاریکی سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور اسے ہر گمراہی سے بچاتا ہے۔ لیکن جو شخص اپنا ولی شیطان کو بنا لیتا ہے اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے تو شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا مستقل ساتھی بن جاتا ہے اور اسے ہر روشنی سے بچا کر تاریکی کی طرف لے کے جاتا ہے۔ دنیا کی ہر برائی اس کے لیے آسان ہو جاتی ہے اور ہر نیکی اسے بری لگنے لگتی ہے۔ اس کی یہ کیفیت بالآخر اسے جہنم کا مسافر بنا دیتی ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ پھر ہم ایسے شخص کو جہنم میں ڈال دیتے ہیں اور جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔

Marfat.com

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ

أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ
بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ إِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ
إِلَّآ إِنٰثًا ۚ وَإِنْ يَّدْعُوْنَ إِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ
لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّلَأُضِلَّنَّهُمْ وَ
لَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ
فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ؕ وَمَا
يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ إِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ أُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۫ وَلَا
يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ
أَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾ لَيْسَ
بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَآ أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَ
لَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ
مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ
الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ أَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ

Marfat.com

وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ
اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾

عربی رکوع ۱۸ (بے شک اللہ نہیں بخشے گا اس بات کو کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے۔ اور بخش دے گا اس کے سوا جس کو چاہے گا۔ اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا وہ بہک کر دور جا پڑا o وہ اللہ کے سوا نہیں پکارتے مگر دیویوں کو۔ اور وہ نہیں پکارتے مگر شیطانِ سرکش کو جس پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ اور اس نے کہہ رکھا ہے کہ میں ہتھیا کے رہوں گا تیرے بندوں میں سے ایک معین حصہ اور ان کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا اور ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنساؤں گا اور ان کو سمجھاؤں گا پس وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور ان کو سمجھاؤں گا۔ پس وہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت کو بگاڑیں گے۔ اور جو شخص شیطان کو کارساز بناتا ہے اللہ کو چھوڑ کر تو وہ کھلی ہوئی نامرادی میں جا پڑا o وہ لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انہیں امیدیں دلاتا ہے' اور شیطان کے وعدے سرتاسر فریب ہیں o ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے' جس سے خلاصی کی کوئی صورت یہ نہ پائیں گے o اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہوگا o نہ تمہاری امیدوں پر مدار ہے نہ اہل کتاب کی امیدوں پر' جو کوئی برائی کرے گا اس کی سزا پائے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے مقابل کوئی کارساز اور مددگار نہ پا سکے گا o اور جو نیکی کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہے یہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی o اور اس سے بڑھ کر کون ہوگا دین کے اعتبار سے جس نے اپنی ذات اللہ کے سپرد کر دی۔ اس حال میں کہ وہ خوب کار بھی ہو اور ابراہیم (علیہ السلام) کی ملت کی پیروی کرے جو بالکل یکسو تھا اور اللہ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا دوست بنایا اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے) (آیات ۱۱۶ تا ۱۲۶)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ
وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا o

"بے شک اللہ نہیں بخشے گا اس بات کو کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے۔ اور بخش دے گا اس کے سوا جس کو چاہے گا۔ اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا وہ بہک کر دور جا پڑا۔" (النسآء:۱۱۶)

Marfat.com

ربطِ کلام

سابقہ آیات میں فرمایا گیا ہے کہ جو منافقین اللہ کی ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد بھی رسول کی مخالفت کرتے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف اپنی الگ راہ نکالنا چاہتے ہیں' بلکہ ان کے مقابلے میں اپنی ایک پارٹی کھڑی کرنا چاہتے ہیں' اللہ تعالیٰ ایسے منافقین کو جہنم میں ڈالیں گے۔ اس پر سوال پیدا ہوا کہ وہ ایسا بڑا جرم کیا ہے جس کی سزا جہنم سے کم نہیں۔ ان آیات میں اس کا جواب ارشاد فرمایا گیا ہے۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کی ہدایت کے خلاف کوئی ہدایت اختیار کرنا اس کے رسول کے خلاف کسی اور کو رسالت کا حق دینا اور مومنوں سے الگ ایک راہ اختیار کرنا اور اپنی ایک پارٹی بنانا یہ سراسر اللہ کے اختیارات میں شرکت کرنے والی بات ہے۔ رسول بھیجنا ہدایت نازل کرنا اور رسول کے ماننے والوں کو زندگی کا ایک نظام دینا اور اس پر انہیں چلنے کا پابند کرنا یہ سراسر اللہ کے اختیارات ہیں۔ منافقین یہ اختیارات جب کسی اور کو دیتے ہیں اور اسے وہی حیثیت دے کر اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں تو وہ درحقیقت اسے اللہ کا شریک بناتے ہیں اور اس طرح شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور شرک چونکہ کفر کے بعد سب سے بڑا جرم ہے جس کی سزا جہنم ہے اس لیے فرمایا گیا کہ ایسے لوگوں کو جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

شرک کی کبھی بخشش نہیں ہو گی

اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ پہلی یہ بات کہ شرک اللہ کی نگاہ میں اتنا بڑا جرم ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کبھی معاف کرنے کا ارادہ بھی نہیں فرمائیں گے۔ کیونکہ شرک ایک ایسی جسارت ہے جس میں اللہ کی ذات اس کی صفات اور اس کے حقوق کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ شرک کرنے والے انہی تینوں حیثیتوں میں کسی نہ کسی حیثیت سے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اللہ کی ذات کے مقابلے میں کسی اور کو خدا مانتے ہیں یا اللہ کی مخصوص صفات میں دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں اور یا اللہ کی صفات سے جو حقوق لازم آتے ہیں وہ حقوق کسی اور کے لیے ثابت کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی اعتبار سے بھی شرک کرنا اللہ کے خلاف صریح بغاوت ہے۔ بغاوت تو کفر بھی ہے' اسی وجہ سے کافر کی بھی کبھی مغفرت نہیں ہو گی۔ لیکن مشرک کی مغفرت نہ ہونے کا ذکر اس لیے بار بار کیا جاتا ہے کہ مشرک بظاہر اللہ کو ماننے کا اعلان کرتا ہے۔ بعض دفعہ اس کی عبادت بھی کرتا ہے' اس کی تسبیحات بھی پڑھتا ہے اور اس کا احترام بھی بجا لاتا ہے' لیکن اسے اس طرح نہیں مانتا جیسے اسے ماننے کا حق ہے۔ ایک ایسے شخص کو بادشاہ مان لیا جائے جو بادشاہ نہ ہو تو اس کے لیے تو یہ بہت بڑا اعزاز ہے لیکن اگر کسی شہنشاہِ مطلق سے یہ کہا جائے کہ ہم آپ کو بادشاہ مانتے ہیں' لیکن فلاں فلاں کو بھی بادشاہ سمجھتے ہیں تو اس شہنشاہِ مطلق کی اس سے بڑی توہین کوئی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ اس کی ذات اور اس کی صفات اور اس کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش ہے۔ اور اس کی حقیقی حیثیت کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔

باقی گناہوں کو بخشنے کا امکان ظاہر فرمایا ہے وعدہ نہیں

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ شرک کے علاوہ یا شرک سے نیچے جتنے اور گناہ اور جرائم ہیں اللہ اگر چاہے گا تو اس کے مرتکب کو بخش دے گا۔ لیکن اس بات کو سمجھنے میں چند در چند غلطیاں کارفرما ہیں' جن کی اصلاح ضروری ہے۔ پہلی تو یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے باقی گناہوں کے بخشنے کا امکان ظاہر فرمایا ہے وعدہ نہیں فرمایا۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ شہنشاہ جب کسی چیز کو عطا کرنے کا امکان ظاہر کرتے ہیں تو ان کی

Marfat.com

شانِ کریمی اورشانِ بے نیازی کو دیکھتے ہوئے امیدیں جوان ہوجاتی اور آرزوئیں کھل اٹھتی ہیں اور گمان یقین کو چھونے لگتا ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فیصلے کو اپنی مشیت کے ساتھ مشروط کیا ہے اور قرآنِ کریم میں ہم یہ بات پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کی حکمت سے الگ نہیں۔

مشیت حکمت کی پابند ہے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہوتا وہی ہے جو اس کی مشیت چاہتی ہے لیکن اس کی مشیت چونکہ حکمت کی پابند ہے اس لیے اس کی حکمت نے جو قوانین و آداب مقرر کر رکھے ہیں وہ اس کی مخالفت کبھی نہیں کرتی۔ اور تیسری یہ بات کہ شرک کے علاوہ باقی گناہوں کو بخشنے کا ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے کہ ایک مومن جس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہے وہ قیامت کے دن بڑے بڑے گناہوں کی موجودگی میں پہلے ہی مرحلہ میں جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور قرآنِ کریم کی نصوص سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو آدمی فرائض کا تارک ہوا اور کبائر کا ارتکاب کرتا رہا' قیامت کے دن اسے ان بداعمالیوں کی پاداش میں جہنم میں اس وقت تک رکھا جائے گا جب تک وہ ان گناہوں کی سزا نہ بھگت لے گا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہیں کہ وہ چاہیں تو ان تمام جرائم کی سزا معاف فرما دیں لیکن اس کا قانون یہی ہے کہ وہ فرائض کے ترک پر بھی سزا دے گا اور کبائر کے ارتکاب پر بھی مواخذہ کرے گا۔ جب اس گنہگار کا دامن ان گناہوں کی آلودگی سے صاف ہو جائے گا تو پھر اس کی مغفرت فرما دی جائے گی اور اسے جنت میں بھیج دیا جائے گا۔

جہنم کے عذاب کی شدت کا استحضار ضروری ہے

ان غلطیوں کے ازالے کے بعد ایک اور بات بھی کہنا ضروری ہے وہ یہ کہ مسلمانوں میں عام طور پر جہنم کے عذاب کی طرف سے ایک لاپرواہی سی پائی جاتی ہے۔ جب بھی کبھی عذاب کا ذکر ہوتا ہے تو عام طور پر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں پر سزا دیں گے لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ سزا کے بعد مغفرت ہو جائے گی۔ اور جب مغفرت کا ہونا یقینی ہے۔ اور اللہ کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے تو پھر جہنم کی سزا کی چنداں فکر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ رویہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔ پروردگار نے بنی اسرائیل کی گمراہیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بالکل اسی رویے کا نہایت افسوس سے ذکر فرمایا ہے۔ انہوں نے جہنم کو ایسا لگتا ہے کہ غسل خانہ سمجھ رکھا ہے کہ وہاں داخل کیے جائیں گے اور نہا دھو کے واپس نکل آئیں گے۔ حالانکہ وہ ایسا دار العذاب ہے جس کے عذاب کی شدت کا تو کیا کہنا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ''جس شخص کو سب سے ہلکا عذاب ہوگا اسے آگ کا جوتا پہنایا جائے گا جس کی تپش سے اس کا دماغ اس طرح ابلے گا جیسے دیگچی میں پانی ابلتا ہے۔ جہنم کی بعض وادیاں ایسی ہیں جس کی آگ کی تپش اور جس کے عذاب کی شدت سے باقی جہنم پناہ مانگتا ہے۔ جہنم کا اگر ایک شعلہ زمین پر گر جائے تو ساری زمین بھسم ہو جائے۔ اس کے تصور سے بھی کپکپی طاری ہو جانی چاہیے چہ جائیکہ اسے اس طرح ہلکے انداز میں لیا جائے کہ جیسے ایک فارمیلٹی ہے جسے پورا کیا جائے گا۔ ورنہ اصل چیز تو اللہ کی بخشش ہے۔ جس سے ہم نوازے جائیں گے۔

Marfat.com

دور کی گمراہی میں پڑنے کا مفہوم

تیسری بات اس آیت کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ جو شخص شرک کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت بہت دور کی گمراہی میں جا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو آدمی شرم وحیا سے عاری ہو جاتا ہے وہ صرف بے حیا بنتا ہے ضروری نہیں کہ بد معاملہ بھی ہو جائے۔ اسی طرح جو شخص نماز چھوڑ دیتا ہے یہ صحیح ہے کہ اس کے ذہن میں اللہ کی وفاداری کا جذبہ ماند پڑنے لگتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ بے حیا بھی ہو جائے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر گمراہی کا ایک طبعی نتیجہ ہے اور اس کا ایک دائرہ ہے۔ لیکن شرک ایک ایسا فساد اور ایک ایسی گمراہی ہے جس سے زندگی کا ہر دائرہ اور ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے۔ اللہ کی ذات وصفات اور اس کے حقوق میں شرک کا اثر عبادات پر بھی پڑتا ہے' معاملات پر بھی' اخلاق پر بھی' طرز زندگی پر بھی' معاشرتی طور اطوار پر بھی حرام اور حلال کے طریقوں پر بھی اور حکومت اور ریاست کے آئین وقانون پر بھی۔ کیونکہ جس پاور ہاؤس سے زندگی کی ایک ایک کرن نصیب ہوتی ہے اور جس مینارۂ نور سے راستے روشن ہوتے ہیں اور جس سرچشمۂ علوم سے علم کی وادیاں جگمگاتی ہیں اور جس سرچشمۂ حیات سے زندگی کو صراطِ مستقیم ملتی ہے اس میں شرکت یقیناً پوری زندگی کو نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ تلپٹ کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک ایسی گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے جس گمراہی کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اللہ سے دور اور شیطان کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ جنت سے محروم اور جہنم کا مستحق ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر دور کی گمراہی اور کیا ہوگی؟

اِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَ اِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا شَیْطٰنًا مَّرِیْدًا ۝ لَّعَنَہُ اللّٰہُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِکَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا ۝ وَّلَاُضِلَّنَّھُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّھُمْ وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَیُبَتِّکُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰہِ ؕ وَمَنْ یَّتَّخِذِ الشَّیْطٰنَ وَلِیًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِیْنًا ۝ؕ

"وہ اللہ کے سوا نہیں پکارتے مگر دیویوں کو۔ اور وہ نہیں پکارتے مگر شیطانِ سرکش کو جس پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ اور اس نے کہہ رکھا ہے کہ میں ہتھیا کے رہوں گا تیرے بندوں میں سے ایک معین حصہ اور ان کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا اور ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنساؤں گا اور ان کو سمجھاؤں گا پس وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور ان کو سمجھاؤں گا۔ پس وہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت کو بگاڑیں گے۔ اور جو شخص شیطان کو کارساز بناتا ہے اللہ کو چھوڑ کر تو وہ کھلی ہوئی نامرادی میں جا پڑا۔" (النسآء: ۱۱۷ تا ۱۱۹)

شرک کا بوداپن

شرک کی مذمت کے بعد ان آیات میں بعض مشرکانہ اعمال اور رسوم کی وضاحت فرمانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی صراحت فرمائی کہ اللہ کے مقابلے میں ان لوگوں نے جو شرک کا کاروبار جاری کر رکھا ہے اس میں نہ صرف بوداپن پایا جاتا ہے' بلکہ یہ انتہائی سنجیدہ اور لغو حرکت معلوم ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت تمام دنیا میں شرک رائج تھا اور توحید کی حقیقی معر

Marfat.com

کہیں بھی نظر نہیں آتی تھی۔ چین' ہندوستان' مصر اور بابل ونینوا وغیرہ مشرکانہ عقائد اور اعمال میں زیادہ شہرت رکھتے تھے۔ ان کی دیو مالا میں سب سے زیادہ شہرت دیویوں کی نظر آتی ہے۔ عرب چونکہ ان ملکوں میں کاروباری ضرورتوں کے تحت آتے جاتے تھے' وہ ان کی مشرکانہ رسوم سے بھی متاثر ہوئے اور ان کے یہاں بھی دیویوں کا تصور اس طرح رائج ہوا کہ باقی تمام مشرکانہ تصورات پر غالب آ گیا۔ وہ سب سے زیادہ فرشتوں کو پوجتے تھے اور انہیں اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور پھر شاید انہیں کے تصور میں بعض بت تراش رکھے تھے' ان میں سے اکثر مؤنث خیال کیے جاتے تھے۔ مثلاً لات' منات' عزیٰ وغیرہ ان کے یہاں دیویوں کے نام تھے۔ اور یہی دیویاں خدائی نظام پر زیادہ تر حاوی نظر آتی تھیں اور ان کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ دیویوں کے پاس بہت سارے اختیارات ہیں اور زندگی کی بیشتر ضروریات انہیں کے ہاتھوں میں ہیں۔ وہ اپنے ماننے اور پوجا کرنے والوں پر جب خوش ہوتی ہیں تو ان کی ضروریات پوری کر دیتی ہیں۔ اور اگر کبھی بڑے خدا سے کوئی بات منوانے کی ضرورت پڑتی ہے تو یہ چونکہ اس کی بیٹیاں ہیں اس لیے ضد کر کے بھی اپنے باپ کو آمادہ کر لیتی ہیں۔ قیامت کے بارے میں بھی ان کا یہی تصور تھا کہ اولاً تو قیامت آئے گی ہی نہیں اور اگر آ بھی گئی تو اللہ کی بیٹیاں اور یہ دیویاں ہمیں خدا کے عذاب سے بچا لیں گی۔ اس عقیدے کی کمزوری اور بودا پن کا آپ اس سے اندازہ لگائیے کہ عربی زبان میں ''اناث'' انثیٰ کی جمع ہے جس کا لغوی مفہوم نرم و نازک اور ڈھیلی ڈھالی چیز کے ہیں۔ اور عام طور پر اس کا استعمال عورت کے لیے ہوتا ہے۔ اور عربوں کے یہاں عورت نہایت کمزور' ناقص العقل اور ہر معاملے میں مرد سے فروتر سمجھی جاتی تھی۔ اب جس لفظ کا مصداق ان کے یہاں ان منفی صفات کا حامل تھا اس لفظ کا اطلاق ان نام نہاد دیویوں پر کرنا جن سے وہ مرادیں مانگتے اور استمداد کرتے تھے کس قدر بودا پن کا ثبوت تھا۔ اور مزید لغویت اس میں یہ ہے کہ اس وقت کی دنیا میں عموماً اور عرب میں خصوصاً عورت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ بعض قبیلوں میں اسے پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا جاتا اور جہاں باقی رکھا جاتا تھا وہاں بھی ہوس کے کھلونے سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ بایں ہمہ حیرانی کی بات ہے کہ اپنے معبودوں کو مونث نام دیے گئے اور مونث ہی کے طور پر پکارا جاتا تھا اور باقی مشرک قوموں کی طرح ہر ضرورت کے لیے دیویوں کا تصور اختراع کر رکھا تھا' انہیں کی وہ پوجا کرتے تھے اور انہیں کو وہ اپنی ضرورتوں کے لیے پکارتے تھے۔

شیطان کو پکارنے کا مفہوم

مزید فرمایا کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ پوجا تو دیویوں کی کرتے ہیں اور مرادیں بھی انہیں سے مانگتے ہیں لیکن ان کی نکیل جس کے ہاتھ میں ہے وہ دیویاں نہیں بلکہ شیطان رجیم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ لوگ شیطان کو اپنا معبود نہیں سمجھتے اور نہ اس کے آگے مراسم پرستش بجالاتے ہیں اور نہ کوئی اسے الوہیت کا درجہ دیتا ہے' لیکن اسے پکارنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے پیچھے چلنے والا ہر شخص اپنے نفس کی باگیں اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے' جدھر وہ چلاتا ہے ادھر چلتا ہے۔ گویا یہ اس کا بندہ ہے اور وہ اس کا خدا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کے احکام کی بے چون وچرا اطاعت اور اندھی پیروی کرنے کا نام بھی عبادت ہے۔ اور جو شخص اس طرح کی اطاعت کرتا ہے وہ دراصل اس کی عبادت بجالاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پروردگار نے خود شیطان کا تعارف بھی کروایا کہ ایک طرف تو عرب اللہ کو ارض وسما اور انسانوں کا خالق تسلیم کرتے تھے۔ اور دوسری

Marfat.com

طرف زندگی کی باگ ڈور اس شیطان کے ہاتھ میں دے رکھی تھی جس نے تخلیق آدم کے وقت ہی سرکشی دکھائی اور حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اور پھر جب اللہ نے اس کے اس تمرد اور سرکشی پر لعنت فرمائی تو بجائے خوفزدہ ہونے اور توبہ کرنے کے اس نے دھمکی دی کہ میں تیرے بندوں کو مختلف طریقوں سے گمراہ کروں گا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شرک جہاں کہیں بھی اور جس شکل میں بھی پایا جاتا ہے اس کا امام درحقیقت شیطان ہی ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر اس کا ذکر فرمایا ہے۔ ہم صرف سورۂ اعراف سے چند آیتوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ پروردگار ارشاد فرماتے ہیں:

قَالَ مَا مَنَعَکَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُکَ ؕ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ o قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا یَکُوْنُ لَکَ اَنْ تَتَکَبَّرَ فِیْهَا فَاخْرُجْ اِنَّکَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ o قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ o قَالَ اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ o قَالَ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَ o ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَکْثَرَهُمْ شٰکِرِیْنَ o قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَکَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْکُمْ اَجْمَعِیْنَ o

''اللہ نے پوچھا کہ جب میں نے تجھے سجدہ کا حکم دیا تو تجھے سجدے سے کس چیز نے روکا؟ شیطان نے جواب دیا کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے بنایا ہے۔ خدا نے فرمایا تو یہاں سے اتر تجھے یہ حق نہیں ہے کہ تو اس میں اپنی بڑائی کا گھمنڈ کرے۔ پس تو یہاں سے نکل جا تو خوار ہونے والوں میں سے ہے۔ اس نے کہا مجھے لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک مہلت دے دے۔ خدا نے فرمایا تجھے مہلت دی گئی۔ شیطان نے کہا چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے اس وجہ سے میں ان کی گھات میں تیری سیدھی راہ میں بیٹھوں گا' پھر میں ان کے آگے سے' ان کے پیچھے سے' ان کے دائیں سے' ان کے بائیں سے ان پر گھیرے ڈالوں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ خدا نے فرمایا تو ذلیل وخوار ہو کر یہاں سے دور ہو ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔'' (الاعراف: ۱۲ تا ۱۸)

ان آیات کو غور سے پڑھیے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیطان اول روز سے اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کے معاملے میں کتنا پرجوش ہے اور وہ اولادِ آدم سے کس قدر کینہ' بغض اور پرخاش رکھتا ہے۔ اور اس کی جرأت کی داد دینی چاہیئے کہ اس نے اپنے ارادوں کو مخفی نہیں رکھا۔ اس کا اعلان بھی کسی اور جگہ نہیں بلکہ اس ذات کے سامنے کیا ہے جس کی بندگی کرنے اور عبادت بجالانے کا انسان کو مکلف بنایا گیا ہے۔ اور شیطان یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا عذاب کتنا بے پناہ ہے اور اس کی ناراضگی ناقابل برداشت ہے۔ بااین ہمہ اس نے کھل کر اپنی دشمنی کا اظہار کیا اور جس جس طرح سے وہ اولادِ آدم کو گمراہ کرنا چاہتا تھا ان میں سے ایک ایک بات کا ذکر کیا۔ ان آیاتِ کریمہ میں جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں چند باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

Marfat.com

شیطان کا بندوں سے مقررہ حصہ لینے کا مفہوم

پہلی بات یہ کہ میں تیرے بندوں میں اپنا مقرر حصہ لے کے رہوں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تو نے انسانوں کو زندگی کی مہلت دی ہے میں ان کے اوقات میں سے اپنے لیے اوقات لینے کی کوشش کروں گا۔ یعنی انہیں اس بات کا موقع نہیں دوں گا کہ وہ اپنے اوقات کو تیری بندگی میں صرف کریں۔ بلکہ میں ان کی اس طرح برین واشنگ کروں گا اور ان کے دلچسپی کے موضوعات میں ایسی تبدیلیاں لاؤں گا کہ وہ ایسے مشاغل خود بخود اختیار کریں گے جس میں ان کے اوقات کا ایک معتدبہ حصہ ان کاموں میں صرف ہوگا جن کاموں کا تعلق تیری بندگی اور تیری رضا کی حصول کے طریقوں سے ہرگز نہیں ہوگا۔ بلکہ ان کا تعلق ان موضوعات سے ہے۔ جس سے شیطنت پنپتی اور انسانیت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسی طرح ان کی محنتوں، کوششوں، قوتوں اور قابلیتوں میں بھی اپنا حصہ لگا کے چھوڑوں گا۔ وہ خود میرے طریقے کو اختیار کرنے اور آگے بڑھانے پر محنت کریں گے۔ اس کے لیے مساعی بروئے کار لائیں گے، ان کی ذہنی صلاحیتیں اور جسمانی قوتیں میرے پروگرام میں صرف ہوں گی۔ میں ان کے مال کا بیشتر حصہ اپنے پروگرام کے لیے صرف کرنے کے راستے نکالوں گا اور ان کی اولادوں میں اس طرح حصہ بٹاؤں گا کہ ہر باپ اپنے بیٹے کو نیک دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن میں اس کے ذہن میں یہ بات ڈالوں گا کہ نیکی بہت اچھی بات ہے لیکن دنیا کے ساتھ چلنا اور وقت کا ساتھ دینا یہ تمہاری ضرورت ہے۔ وہ جب دنیا کے ساتھ چلنے کی کوشش کرے گا تو پھر وہ اپنی اولاد کو ان اداروں میں بھیجے گا جس میں اللہ کی بندگی کم اور میری بندگی زیادہ ہوگی۔ اس طرح انسانی زندگی کے ہر شعبے میں اپنا حصہ لگانے کے لیے کوشش کروں گا۔

آرزوؤں کا جال

پھر اس نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ میں انہیں گمراہ کروں گا۔ ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنساؤں گا اور آرزوؤں کا جال تو ایسی خطرناک چیز ہے کہ جو اس میں پھنس گیا وہ موت سے پہلے کبھی نکلنے پر قادر نہیں ہوگا۔ بجز اس کے کہ اللہ کسی پر اپنا رحم فرمائے۔ مثلاً جس کی آرزو دولت کا حصول بن جاتی ہے وہ اپنی صحت، توانائی اور ذہانت سب کچھ دولت کے حصول کے لیے نچوڑ دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اسی مقصد کے حصول میں اسے یہ بھی احساس نہیں رہتا کہ میرے عزیز رشتے چھوٹ رہے ہیں، میری اقدار بگڑتی جا رہی ہیں۔ میری زندگی میں اور کسی مقصد کے لیے جگہ نہیں رہی اور میری صحت بھی اس مصروفیت نے تباہ کر ڈالی۔ اس جال کا ایک ایک حلقہ اسے اس طرح اپنے اندر جکڑتا ہے کہ وہ موت کی وادی میں داخل ہونے سے پہلے تک اس سے نکلنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اسی پر مختلف آرزوؤں کو قیاس کر لیجیے۔ آرزوؤں کے جال میں پھنسانا شیطان کا وہ خطرناک حربہ ہے کہ جس کے ادراک کے لیے بھی اللہ کی مدد کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے مزید کہا کہ میں اولادِ آدم کو مشورہ دوں گا اور انہیں سمجھاؤں گا اور وہ جانوروں کے کان کاٹیں گے۔ یعنی وہ جانوروں کے بارے میں ایسے فیصلے کریں گے اور ایسے ایسے تصورات اختیار کریں گے جن کا انہیں ہرگز اختیار نہیں اور انہی کے واسطے سے وہ شرک کی دلدل میں اترتے چلے جائیں گے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ عربوں نے بہت سے مشرکانہ تصورات اپنا رکھے تھے ان میں سے ایک تصور یہ بھی تھا کہ جب اونٹنی پانچ یا دس بچے جن لیتی تو وہ اس کے کان پھاڑ کر اپنے دیوتا کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس سے کام لینا حرام سمجھتے تھے۔ اسی طرح جس اونٹ کے نطفہ سے دس بچے ہو جاتے اسے بھی دیوتا کے نام پر پُن کر دیا

Marfat.com

جا تا تھا۔ اور کان چیرنا اس بات کی علامت تھی کہ یہ پن کیا ہوا جانور ہے۔ یہ مشرکانہ حرکت تو آج تک ہمارے معاشرے میں پائی جاتی ہے۔ آپ نے کئی دفعہ سڑکوں پر گائیاں کھلی پھرتی دیکھی ہوں گی۔ ان کے اگرچہ کان تو نہیں پھاڑے جاتے لیکن کسی کے نام پر انہیں کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ تصور ہمارے یہاں ہندوؤں سے آیا ہے۔ وہ یہاں سے چلے گئے لیکن ہم ابھی تک ان کے تصورات سے نجات نہیں پا سکے۔

خدائی ساخت میں تبدیلی کا مفہوم

شیطان نے مزید کہا کہ میں انہیں حکم دوں گا یا مشورہ دوں گا (کیونکہ امر کا معنی حکم دینا بھی ہوتا ہے اور مشورہ دینا بھی اور دلوں میں وسوسہ ڈالنا بھی) کہ وہ خدائی ساخت میں ردوبدل کریں۔ خدائی ساخت میں تبدیلی کا اصولی مفہوم اللہ کی فطرت کو بدلنا ہے۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے۔ لیکن اس کے تحت یوں تو بہت ساری چیزیں شامل ہیں' لیکن صاحب تفہیم القرآن نے نہایت سلاست سے چند باتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''خدائی ساخت میں ردوبدل کرنے کا مطلب اشیاء کی پیدائشی بناوٹ میں ردوبدل کرنا نہیں ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے تب تو پوری انسانی تہذیب ہی شیطان کے اغوا کا نتیجہ قرار پائے گی۔ اس لیے کہ تہذیب تو نام ہی ان تصرفات کا ہے جو انسان خدا کی بنائی ہوئی چیزوں میں کرتا ہے۔ دراصل اس جگہ جس ردوبدل کو شیطانی فعل قرار دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کسی چیز سے وہ کام لے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا نہیں کیا ہے۔ اور کسی چیز سے وہ کام نہ لے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ تمام افعال جو انسان اشیاء کی فطرت کے خلاف کرتا ہے اور وہ تمام صورتیں جو وہ منشاءِ فطرت سے گریز کے لیے اختیار کرتا ہے اس آیت کی رو سے شیطان کی گمراہ کن تحریکات کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً عمل قوم لوط' ضبط ولادت' رہبانیت' برہم چرج' مردوں اور عورتوں کا بانجھ کرنا' مردوں کو خواجہ سرا بنانا' عورتوں کو ان خدمات سے منحرف کرنا جو فطرت نے ان کے سپرد کی ہیں اور انہیں تمدن کے ان شعبوں میں گھسیٹ لانا جن کے لیے مرد پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے بیشمار افعال جو شیطان کے شاگرد دنیا میں کر رہے ہیں' دراصل یہ معنی رکھتے ہیں کہ یہ لوگ خالق کائنات کے ٹھہرائے ہوئے قوانین کو غلط سمجھتے ہیں اور ان میں اصلاح فرمانا چاہتے ہیں۔'' (ماخوذ از تفہیم القرآن)

اولادِ آدم کے بارے میں شیطان کے عزائم اور اس کے گمراہی کے طریقوں کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ جو شخص شیطان کی شیطنت کو سمجھنے کے بعد بھی اللہ کو چھوڑ کر اسے اپنا ولی بناتا ہے' یعنی اسے اپنا کارساز اور ہمدرد اور غمگسار سمجھتا ہے اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ وہ صریح نقصان میں پڑ گیا۔ اور اس نے ایک ایسا فیصلہ کیا اور ایسا راستہ اختیار کیا ہے جس کا نتیجہ سوائے نامرادی اور تباہی کے اور کچھ نہیں۔

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۗ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝

''وہ لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انہیں امیدیں دلاتا ہے' اور شیطان کے وعدے سرتاسر فریب ہیں۔'' (النسآء:١٢٠)

Marfat.com

شیطان کا کاروبارِ ضلالت......وعدے کرنا اور امیدیں دلانا

بات کو سمیٹتے ہوئے فرمایا کہ شیطان کا سارا کاروبارِ ضلالت صرف دو چیزوں پر چلتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ جھوٹے وعدے کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ امیدوں کے سبز باغ دکھاتا ہے۔ جس شخص نے مال و دولت ہی کو زندگی کا حقیقی مقصد بنالیا ہے اور اس کے سوا باقی ہر چیز ثانوی ہو کر رہ گئی ہے آپ کبھی اس سے بات کر کے دیکھ لیجئے' آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ اس کے سامنے دولت کے حصول اور اس کے نتیجے میں زندگی کا ایک ایسا خوبصورت نقشہ ہے' جس کی حیثیت فریبِ نظر سے زیادہ نہیں اور اسے اس پر ایسا محکم یقین ہے جس میں شکست کا کوئی امکان نہیں۔ وہ اپنے آپ کو قارون اور شداد سے بڑھ کر دولت کے بل بوتے پر اپنے تصور کے مطابق کامیاب آدمی دیکھنے کا یقین رکھتا ہے۔

اسی طرح جس آدمی نے اقتدار کو اپنا معبود بنالیا ہے آپ اس کی زندگی کے طور اطوار کو دیکھ لیجئے کہ وہ اقتدار کی ہوس کے سوا باقی ہر چیز کو بھول چکا ہوگا۔ اسے اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنے میں تامل نہیں ہوگا۔ آپ اس کی زندگی کا گہرائی میں جا کر مطالعہ کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ شیطان کے وعدوں کی گرفت میں آچکا ہے۔ جس طرح سراب کے پیچھے بھاگنے والا فریب نظر سے کبھی جان نہیں چھڑا سکتا اس طرح ہر وہ شخص جو شیطان کے وعدے پر اعتبار کرتا ہے اور اس کی دی ہوئی امیدوں میں بہکتا ہے اسے بھی اس فریب نظر سے نکلنے کا کبھی موقع نہیں نکلتا اور بالآخر اسی میں برباد ہو جاتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ

اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ ۡ وَلَا یَجِدُوْنَ عَنْھَا مَحِیْصًا ۝

''ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے' جس سے خلاصی کی کوئی صورت یہ نہ پائیں گے۔'' (النسآء:۱۲۱)

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا ۝

''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔
وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہوگا۔'' (النسآء:۱۲۲)

شیطان کی پرفریب چالوں' اس کے وعدوں اور اس کی امیدوں کے بہلاووں کا ذکر فرمانے کے بعد فرمایا جا رہا ہے کہ نجات پانے والے شیطان کے وعدوں پر بھروسہ کرنے والے لوگ نہیں' ان کی حیثیت تو فریب نظر سے زیادہ نہیں۔ اور فریب نظر کے پیچھے بھاگنے والا ہمیشہ ہلاک ہوتا ہے۔ حقیقی نجات پانے والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں۔ یعنی جن جن بنیادی حقیقتوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان سب کو دل کے اطمینان کے ساتھ مانیں اور پھر جیسے جیسے اسلامی شریعت نے احکام دیے ہیں ان پر عمل کریں تو یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بات شیطان کی وعدوں کی طرح فریب نظر نہیں ہے۔ بلکہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے۔ اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنی بات میں سچا ہو گا۔ اس کی فرمائی ہوئی ہر بات پتھر پر لکیر ہے۔ اور اس کا ہر حرف حرف آخر ہے۔ اس لیے حقیقی انجام اس شخص کو نصیب ہوگا جو اللہ کے وعدوں پر اعتماد کرے گا' اسی پر ایمان لائے گا اور اسی کے احکام پر عمل کرے گا۔

Marfat.com

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ
وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○

''نہ تمہاری امیدوں پر مدار ہے نہ اہل کتاب کی امیدوں پر' جو کوئی برائی کرے گا اس کی سزا پائے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے مقابل کوئی کارساز اور مددگار نہ پا سکے گا۔'' (النسآء:۱۲۳)

شانِ نزول

یوں تو اس آیتِ کریمہ میں ایک اصولی بات فرمائی گئی ہے لیکن ہمارے مفسرین کرام نے ایک شانِ نزول بھی لکھا ہے جس سے بات مزید واضح ہو جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ کچھ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان مفاخرت کی گفتگو ہونے لگی۔ اہل کتاب نے کہا ''ہم تم سے افضل و اشرف ہیں۔ کیونکہ ہمارے نبی تمہارے نبی سے پہلے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے اتری ہے۔'' مسلمانوں نے کہا کہ ''ہم تم سب سے افضل ہیں اس لیے کہ ہمارے نبی خاتم النبیینؐ ہیں اور ہماری کتاب آخری کتاب ہے۔ جس نے پہلی سب کتابوں کو منسوخ کر دیا ہے۔'' اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب کو ایسے ہی تصورات نے عمل کی زندگی سے بیگانہ کر دیا۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ ہم چونکہ انبیاء کرام کی اولاد ہیں' ہمارے پاس آسمانی کتابیں ہیں' اس لیے ہم سب سے افضل و اشرف ہیں۔ قیامت کے دن ہم سے اولاً تو باز پرس ہوگی ہی نہیں اور اگر ہوئی بھی تو ہمارے آباؤ اجداد ہمیں چھڑا لیں گے۔ مسلمانوں اور اہل کتاب دونوں سے خطاب کرتے ہوئے یہاں فرمایا گیا ہے کہ ایسی آرزوئیں نہ اہل کتاب کے کام آئیں اور نہ اے مسلمانو! تمہارے کام آئیں گی۔ اللہ کسی قوم کے بارے میں یہ نہیں دیکھتا کہ اس کا رشتہ کس سے ہے بلکہ وہ تو یہ دیکھتا ہے کہ ان کے اعمال کیسے ہیں؟ اللہ کی شریعت' اس کے احکام اور اس کی جزا و سزا کا طریقہ بالکل بے لاگ ہے۔ جب اس کے سامنے کوئی شخص یا کوئی قوم لائی جائے گی تو وہ اس کا شجرہ نسب نہیں دیکھے گا' بلکہ اس کا نامہ عمل دیکھے گا۔ جس شخص نے بھی کوئی برائی کی ہوگی اسے اس کی سزا ضرور دی جائے گی۔ پھر اس سزا سے بچنے کے لیے نہ انہیں کوئی ولی' یعنی کارساز ملے گا اور نہ کوئی مددگار ملے گا جن کے بل بوتے پر اہل کتاب نے بدمستیوں کا طریقہ اختیار کیا۔ وہ اس روز ان کے کام نہیں آئیں گے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی تو صحابہ سخت پریشان ہوئے' جامع ترمذی اور تفسیر ابن جریر نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ آیت سنائی تو ان پر ایسا اثر ہوا جیسے ان کی کمر ٹوٹ گئی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے محسوس فرمایا اور پوچھا ''کیا بات ہے؟'' صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا ''حضور! ہم میں ایسا کون شخص ہے جس سے کبھی نہ کبھی برائی کا صدور نہیں ہوتا۔ اور جب ہر برائی کی جزا ملنا ضروری ہے تو ہم میں سے کون بچ سکے گا؟'' آپؐ نے فرمایا ''ابوبکر! آپ اور آپ کے مومن بھائی پریشان نہ ہوں۔ کیونکہ دنیا کی تکالیف کے ذریعہ آپ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔'' ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ''کیا تم لوگ بیمار نہیں ہوتے؟ کیا تمہیں کوئی مصیبت اور غم نہیں پہنچتا؟'' صدیق اکبرؓ نے عرض کیا'' بیشک سب چیزیں لاحق ہوتی ہیں۔'' آپؐ نے فرمایا ''بس یہی جزا ہے تمہاری برائیوں کی۔'' ایک اور حدیث میں ہے کہ ''بندہ کو جو بخار ہوتا ہے یا کوئی اور تکلیف پہنچتی ہے یا کوئی کانٹا لگتا ہے تو اس کے گناہوں کفارہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی شخص اپنی کوئی چیز ایک جیب میں تلاش کرے مگر دوسری جیب میں ملے اتنی مشقت بھی اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔''

Marfat.com

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ○

''اور جو نیکی کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہے یہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔'' (النسآء:۱۲۴)

اس آیتِ کریمہ نے پہلی آیتِ کریمہ کے مضمون کو مکمل کیا ہے۔ اس میں صرف یہ فرمایا گیا تھا کہ جو شخص بھی کوئی برائی کرے گا اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ لیکن ایمان کا ذکر نہیں کیا۔ اور اس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ اس معاملے میں کافر اور مومن اور سابقہ اہل کتاب شاید سب برابر ہیں۔ کیونکہ بات صرف عمل کی کی گئی ہے۔ لیکن اس آیتِ کریمہ نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا۔ اس میں پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی گئی کہ نجات کا دارومدار کسی نسبت پر نہیں' اعمال پر ہے۔ اور یہ وہ ہمہ گیر اور انقلاب انگیز اعلان ہے جو اسلام سے پہلے اس اہمیت کے ساتھ کہیں سنائی نہیں دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ افراد اور اقوام کی پہچان ان کے حسب و نسب' انکی قوت و شوکت اور ان کی نسبتیں نہیں' بلکہ حسن عمل اور حسن کردار ہے۔ یہ نہیں دیکھا جائے گا یہ شخص کون ہے' یہ دیکھا جائے گا کہ اس کا کردار کیا ہے' اس کی صلاحیتیں کیسی ہیں۔ اور دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اس بنیادی شناخت میں مرد اور عورت کی تخصیص نہیں۔ بلکہ دونوں میں سے جو بھی اپنے آپ کو حسن عمل اور حسن کردار سے آراستہ کرے گا وہی اللہ کے ہاں نجات کا مستحق بنے گا اور مسلمان معاشرے میں اسے ہی عزت نصیب ہوگی۔ اور تیسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ اس عمل کی بنیاد ایمان پر ہے۔ اگر وہ شخص صاحب ایمان نہیں تو اس کے عمل کا کوئی اعتبار نہیں۔ آخری پیغمبر اور آخری کتاب آ جانے کے بعد یہ ضروری ہے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والے اور دوسرے انبیاء پر ایمان رکھنے والے اس آخری پیغمبر اور آخری شریعت پر ایمان لائیں۔ اور اگر وہ اس سے انکار کریں گے تو محض ان کا عمل ان کی نجات کے لیے کافی نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ ان شرائط کو پورا کر دیں تو پھر عربی اور عجمی اور کالے گورے میں کوئی تقسیم نہیں ہوگی۔ اللہ کے یہاں سب کو ایمان و عمل کا اجر ملے گا اور کسی کے ساتھ ذرہ برابر بھی بے انصافی نہیں ہوگی۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ○ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ مُّحِيْطًا ○

''اور اس سے بڑھ کر کون ہوگا دین کے اعتبار سے جس نے اپنی ذات اللہ کے سپرد کر دی۔ اس حال میں کہ وہ خوب کار بھی ہو اور ابراہیم (علیہ السلام) کی ملت کی پیروی کرے جو بالکل یکسو تھا اور اللہ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا دوست بنایا اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے۔'' (النسآء:۱۲۵تا۱۲۶)

سب سے بہتر انسان

اس آیتِ کریمہ نے سابقہ آیات کے مضمون کو تکمیل کی معراج تک پہنچا دیا ہے اور اس بات کا بھی جواب دے دیا کہ تم جو آپس میں افضلیت کی بحث میں پڑے ہوئے ہو ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ دین کے اعتبار سے کون بہتر ہے۔ اس کی دو علامتیں بیان فرمائی ہیں' ایک تو یہ فرمایا کہ دین کے اعتبار سے سب سے بہتر وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دل و جان سے جسم کی پوری

Marfat.com

توانائیوں کے ساتھ اس راستے پر پڑ گیا جس راستے کا نام اسلام ہے۔ اور جسے قرآن وسنت نے واضح کیا ہے۔ پھر صرف اس راستے کا مسافر ہی نہیں بنا' بلکہ اس نے اپنا سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیا اور پورے اخلاص کے ساتھ وہ اللہ کی رضا کو اپنی منزل بنا کر شریعت کے سفر پر چل نکلا ہے۔ اور دوسری علامت یہ ہے کہ وہ شریعت پر عمل نہ تو خود ساختہ طریقے سے کرتا ہے کہ جیسے شریعت سمجھ لیا ویسے عمل کر لیا' بلکہ وہ عمل کرنے میں پوری احتیاط سے کام لیتا ہے اس کا کوئی عمل سنت سے ہٹا ہوا نہیں' اور دوسری یہ بات کہ عمل کرنے میں روایتی طریقے کا پابند نہیں کہ رواروی میں جیسے لوگ کر رہے ہیں ویسے ہی اس نے بھی کر لیا۔ جس طرح عادتاً بعض نیکیاں کر لی جاتی ہیں اسی طرح وہ بھی عادتاً بعض نیکیوں کو کر لیتا ہے لیکن اس کی اصل روح اس میں موجود نہیں ہوتی۔ یہاں اسے ''محسن'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ محسن وہ ہوتا ہے جو ہر نیکی کو صحیح طریقے کے ساتھ ساتھ اس کے آداب اور حسن کے ساتھ انجام دے۔ جسے سنت کی زبان میں ''مقام احسان'' کہا گیا ہے۔ جس شخص میں یہ دو علامتیں پائی جائیں کہ وہ ظاہر کے اعتبار سے شریعت و سنت کا پابند اور عمل کو بدرجہ کمال انجام دینے والا اور باطن کے اعتبار سے اخلاص کا پیکر ہو۔ یہ وہ دولت ہے جو انسان کو اصل عزت و کرامت کا مستحق بناتی ہے۔ اور یہی ملت ابراہیمی کی پیروی ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے اپنا خلیل بنایا تھا اور انکو وہ مقام عطا فرمایا تھا جو اس وقت تک کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ اور یہ مقام انہیں اس لیے ملا تھا کہ وہ ہر طرف سے کٹ کر اللہ کے ہو گئے تھے۔

دوسری آیتِ کریمہ میں ان تمام باتوں کا حاصل ذکر فرمایا گیا ہے۔ کہ اللہ کے یہاں قبولیت کا سب سے بڑا درجہ یہ ٹھہرا کہ آدمی ظاہر و باطن سے اللہ کا ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقامات و مراتب اللہ کی ذات سے قرب و بعد کے حوالے سے طے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا غلام ہے' اللہ کی ملکیت ہے۔ اللہ کا محتاج ہے۔ اور اللہ نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ جب ہر چیز اس کے احاطے اور اس کے تصرف میں ہے تو جو شخص اپنے آپ کو اس کے قریب کرنے میں کامیاب ہو جائے وہی ہر طرح کے مقام و مرتبہ کا مستحق ہو گا۔

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِى النِّسَآءِ ؕ قُلِ

اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ فِىْ يَتٰمَى

النِّسَآءِ الّٰتِىْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ

تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا

لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ

عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ ۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ

Marfat.com

وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسُ الشُّحَّ ۚ وَإِن تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ
كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٢٨﴾ وَلَن تَسْتَطِيعُوا أَن تَعْدِلُوا بَيْنَ
النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ۖ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا
كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ وَإِن تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٢٩﴾
وَإِن يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّن سَعَتِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا
حَكِيمًا ﴿١٣٠﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا
الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنِ اتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَإِن
تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ
غَنِيًّا حَمِيدًا ﴿١٣١﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَكَفَىٰ
بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿١٣٢﴾ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِينَ ۚ
وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ قَدِيرًا ﴿١٣٣﴾ مَّن كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا
فَعِندَ اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿١٣٤﴾ ع

عربی رکوع ١٩ (اورلوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے ان کے بارے میں (اور یاددلاتا ہے) وہ احکام جو پڑھے جاتے ہیں تم پر ان یتیم بچیوں کے متعلق جنہیں تم نہیں دیتے ہو وہ حق جو ان کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور رغبت رکھتے ہو کہ خود ان سے نکاح کرلو اور (یاددلاتا ہے تمہیں احکام) کمزور بچوں کے متعلق اور یہ کہ تم قائم رہو یتیموں کے معاملے میں احسان پر اور جو تم بھلائی کروگے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے ○ اور اگر کوئی عورت اندیشہ کرے اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا تو کوئی مضائقہ نہیں ان دونوں پر کہ آپس میں صلح کرلیں۔ صلح بہرحال بہتر ہے۔ طبیعتوں میں حرص رچی بسی ہوئی ہے۔ اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو

Marfat.com

بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے اچھی طرح واقف ہے ٥ اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ پورا پورا عدل کرو بیویوں کے درمیان اگرچہ تم اس کی بہت خواہش بھی کرو۔ تو یہ نہ کرو کہ جھک جاؤ پوری طرح جھک جانا ایک ہی بیوی کی طرف اور چھوڑ دو دوسری کو جیسے وہ درمیان میں لٹک رہی ہو۔ اگر تم اپنا طرزِ عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ٥ اور اگر دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اپنی وسیع قدرت سے دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ وسیع بخشش والا حکمت والا ہے ٥ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ بے شک ہم نے حکم دیا تھا ان لوگوں کو جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی۔ اور تمہیں بھی کہ اللہ سے ڈرو۔ اور اگر تم انکار کرتے ہو تو بے شک اللہ کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے ہر تعریف کا مستحق ہے ٥ اور اللہ ہی مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور کارسازی کے لیے بس وہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے۔ اور وہ اس کی پوری قدرت رکھتا ہے ٥ جو دنیا کے صلے کا طلبگار ہے تو اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا صلہ موجود ہے۔ اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے) (آیات ۱۲۷ تا ۱۳۴)

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ٥

''اور لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے ان کے بارے میں (اور یاد دلاتا ہے) وہ احکام جو پڑھے جاتے ہیں تم پر ان یتیم بچیوں کے متعلق جنہیں تم نہیں دیتے ہو وہ حق جو ان کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور رغبت رکھتے ہو کہ خود ان سے نکاح کر لو اور (یاد دلاتا ہے تمہیں احکام) کمزور بچوں کے متعلق اور یہ کہ تم قائم رہو یتیموں کے معاملے میں احسان پر اور جو تم بھلائی کرو گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے۔'' (النسآء:۱۲۷)

ترجمہ سے متعلق

اس آیت کریمہ کی وضاحت سے پہلے ترجمہ کے حوالے سے ایک بات ذہن نشین فرمالیجئے۔ ''فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ'' آیتِ کریمہ کے اس حصہ کا ترجمہ دو طرح سے کیا جاتا ہے اور وہ دونوں ہی صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ (اللہ تعالیٰ تمہیں یاد دلاتا ہے ان یتیم بچیوں کے بارے میں جنہیں تم ان کا حق نہیں دیتے ہو اور خواہش رکھتے ہو کہ خود ان سے نکاح کر لو) اور دوسرا ترجمہ یہ ہے (اللہ تعالیٰ تمہیں یاد دلاتا ہے ان عورتوں کے یتیموں کے بارے میں جن کا تم حق ادا نہیں کرتے ہو اور خواہش رکھتے ہو کہ خود ان سے نکاح کر لو)

Marfat.com

اور ترجمے میں ایک فرق اور بھی ہے اس کی بھی ترجمے میں گنجائش موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ ''وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ'' (تم خواہش رکھتے ہو کہ خود ان سے نکاح کرلو) اور دوسرا ترجمہ یہ ہے (تم ان سے نکاح کرنے سے اعراض کرتے ہو) یہاں چونکہ ''ترغبون'' کا کوئی صلہ ''عن'' یا ''الی'' سے ذکر نہیں کیا گیا' اس لیے دونوں ترجموں کی گنجائش موجود ہے۔

ربطِ کلام

اس عظیم سورت میں آپ نے دیکھا کہ اس میں معاشرے کی تنظیم' تاسیس اور تطہیر سے متعلق احکام اور ہدایات دی گئیں۔ مختلف ضمنی مباحث کے ساتھ ساتھ احکام وہدایات کا سلسلہ مسلسل جاری رہا' جو گزشتہ رکوع سے اتمام کو پہنچا۔ اب اس رکوع اور اس آیتِ کریمہ سے جو کچھ فرمایا جا رہا ہے اس کی حیثیت خاتمۂ سورت کی ہے۔ اس سورت میں نازل ہونے والے احکام سے متعلق جو سوالات مختلف وقتوں میں پیدا ہوئے ان کا جواب دیا جا رہا ہے اور اس وقت کے حالات کے مطابق منافقوں اور اہل کتاب کو آخری تنبیہات ہدایات کی صورت میں کی جا رہی ہیں تا کہ وہ اہل کتاب اسلام اور مسلمانوں سے عناد اور عداوت کے انجام پر غور کرلیں اور منافقین اگر ہو سکے تو اپنی اصلاح پر توجہ دیں۔

اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلے یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اے پیغمبر لوگ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں۔ ''یستفتون'' فعل مضارع ہے جس کا مصدر ہے ''استفتاء'' جب کوئی آدمی کسی معاملے میں شریعت کا حکم معلوم کرنے کے لیے سوال کرتا ہے تو اسے استفتا کہتے ہیں۔ اور مفتی جب اس سوال کا جواب دیتا ہے تو اسے ''فتویٰ'' کہتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ لوگوں کو بعض سوالات درپیش ہیں وہ آپ سے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس بارے میں اسلامی شریعت کیا حکم دیتی ہے؟ اور آپ جانتے ہیں کہ اسلامی شریعت کے چار ماخذ ہیں۔ قرآن اور سنت' اجماع اور قیاس۔ آج جب کسی عالم سے اس طرح کا سوال کیا جاتا ہے تو وہ قرآن وسنت' اجماع اور قیاس کے حوالوں سے اس کا جواب دیتا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی حوالے کی ضرورت نہیں۔ اللہ کا حکم بھی آپ کی زبان سے ادا ہوتا ہے اور خود آپ کا اپنا حکم اللہ کی طرف سے دل میں اترتا ہے اور آپ اسے ادا فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے آپؐ سے کچھ سوالات کیے۔ لیکن وہ سوالات کیا ہیں؟ قرآنِ کریم نے اس کا ذکر نہیں فرمایا۔ قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ بالعموم سوال کی تفصیل بیان نہیں کرتا' البتہ جواب کی وضاحت خود سوال کو متعین کر دیتی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔

اس آیتِ کریمہ میں سوال کا جواب دینے سے پہلے جن احکام سے متعلق سوالات کیے جا رہے ہیں' ان پر عمل کرنے کی یاد دہانی کرائی جا رہی ہے اور تاکید فرمائی جا رہی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ سب سے پہلے پروردگار تمہیں ان احکام کی یاد دلاتا ہے جو قرآنِ کریم میں پڑھے جاتے ہیں تم ان کی تلاوت کرتے ہو اور سورہ النساء کے آغاز میں آیت نمبر ۲' ۳ اور ۴ میں وہ احکام موجود ہیں۔ ان آیات میں یتیموں کے حقوق کی ادائیگی پر زور دیا گیا ہے' جو بچیاں یتیم رہ جاتی ہیں اور ان کے باپوں کے مرنے سے ان کی مائیں بیوہ ہو جاتی ہیں ان دونوں کے بارے میں احکام دیے گئے ہیں اور یہ تاکید کی گئی ہے کہ تم اگر ان بیوگان سے نکاح کرو یا یتیم بچیوں سے نکاح کرو تو ان کا حق مہر ادا کرو اور ان کے معاملات میں عدل سے کام لو۔ اور اس سے پہلے اگر تمہاری کوئی ایک بیوی یا بیویاں موجود ہیں تو انہیں یتیم یا لاوارث سمجھ کر نظر انداز مت کرو' بلکہ ان کو وہی حق دو جو تمہاری پہلی بیوی کو میسر ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ اسلام لانے سے پہلے تو بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں تھی' تم جتنی چاہتے تھے بیویاں رکھتے تھے لیکن اب تمہیں چار سے زیادہ بیویاں ایک وقت میں رکھنے کی اجازت نہیں۔ اور اس کے ساتھ مزید شرط یہ ہے کہ ان میں

Marfat.com

انصاف کرو اور برابری کا سلوک کرو۔ ان احکام کے بارے میں مسلمانوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم اگر یتیم بچیوں یا ان کی ماؤں سے نکاح کرتے ہیں تو صرف اس لیے کرتے ہیں تاکہ انہیں ایک عزت کی زندگی میسر آئے اور انہیں اپنے تحفظ کا احساس ہو۔ اور اگر یتیم بچوں کی ماؤں سے نکاح کیا جاتا ہے تو اس کا سبب بھی یہ ہوتا ہے کہ ہمارے بچوں کی مائیں ان یتیم بچوں پر ظلم نہ کریں۔ یا کم از کم اپنے بچوں کے مقابلے میں انہیں نظر انداز نہ کریں۔ جب وہ خود گھر میں بیوی کی حیثیت سے موجود ہوں گی تو وہ یتیموں یعنی اپنے بچوں کی مناسب دیکھ بھال کر سکیں گی اور ان کے معاملات چونکہ انہی کے ہاتھوں میں ہوں گے اس لیے بچوں کو یہ شکایت نہیں ہوگی کہ دوسرے بچے یا ان کی مائیں ان پر ظلم کرتی ہیں۔ جو ہم نے یتیم بچیوں یا یتیموں کی ماؤں سے نکاح کا ذکر کیا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ بھی دونوں مطالب کے متحمل ہیں اور روایات بھی دونوں کی تائید کرتی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ بچیاں اگر خوبصورت اور مالدار ہوتیں تو بچیوں کے سرپرست ان سے اس لیے نکاح کر لیتے کہ ایک تو ان کے جمال سے فائدہ اٹھائیں گے اور دوسرا ان کا مال بھی ان کے قبضے میں رہے گا۔ اور اگر وہ بدصورت ہوتیں تو ان کے مال پر قبضہ رکھنے کے لیے کسی سے ان کا نکاح حتی الامکان نہیں ہونے دیتے تھے۔ اور اگر کسی سے نکاح کرتے بھی تھے تو ایسے گرے پڑے شخص سے جو ان سے اس کے حقوق کا مطالبہ نہ کر سکے۔ اور انہی الفاظ سے بعض اہل علم نے یتیموں کی ماؤں یعنی بیوگان سے نکاح مراد ہے تاکہ یتیموں کی دیکھ بھال کا مسئلہ حل ہو سکے۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ ہم نے ان سے نکاح اپنی ضرورت کے تحت نہیں کیا کیونکہ ہمارے پاس تو پہلے ہی خوش جمال بیویاں موجود تھیں۔ ان سے نکاح تو انہی کی مصلحت کی خاطر کیا گیا۔ تو اس صورت میں ہم پر حق مہر کی ادائیگی اور عدل کی شرط نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ پہلے تو سورہ النسآء کے آغاز میں ذکر کیے گئے احکام کی طرف توجہ دلائی گئی کہ ان میں سے کوئی حکم بھی وقتی نہیں۔ اگر تمہیں کوئی خاتون پسند نہیں تو تمہیں ہرگز اس سے نکاح نہیں کرنا چاہیے اور اگر کیا ہے تو پھر اس کے تمام حقوق ادا کرنا ضروری ہیں۔ اس لیے تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ ان سے انصاف سے پیش آؤ اور جو یتیم بچے تمہاری تحویل میں ہیں وہ ابھی اتنے بے بس اور کمزور ہیں کہ تم سے خود کوئی مطالبہ نہیں کر سکتے۔ ان کے حقوق ادا کرو اور ان کے تمام معاملات کی نگہداشت کرو۔ اور آخر میں فرمایا کہ یتیم بچوں اور بچیوں اور ان کی ماؤں کے ساتھ جو بھی تم حسن سلوک کرو گے اور ان کے اموال اور حقوق کی نگہداشت کرو گے تو اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز بھی اوجھل نہیں۔ وہ تمہاری تمام نیکیوں اور احسانات کو جانتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جانتے ہوئے بھی تمہیں اس کا اجر و ثواب عطا نہ کرے۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر حوصلہ افزائی کرنے والا قدردان اور کوئی نہیں۔

وَ اِنِ امْرَاَۃٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَآ اَنْ یُّصْلِحَا بَیْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَ الصُّلْحُ خَیْرٌ ؕ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝

"اور اگر کوئی عورت اندیشہ کرے اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا تو کوئی مضائقہ نہیں ان دونوں پر کہ آپس میں صلح کر لیں۔ صلح بہر حال بہتر ہے۔ طبیعتوں میں حرص رچی بسی ہوئی ہے۔ اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے اچھی طرح واقف ہے۔" (النسآء: ۱۲۸)

Marfat.com

سابقہ آیتِ کریمہ کی وضاحت میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ سورۃ النسآء کی ابتدائی آیات میں یتیموں کی مصلحت کے پیش نظر جو احکام دیے گئے تھے ان میں چونکہ یتیم بچیوں یا ان کی ماؤں سے نکاح کی بھی اجازت دی گئی تھی تو اس سلسلے میں تین پابندیاں بھی لگائی گئی تھیں۔ ایک یہ کہ بیویوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کر دی گئی۔ دوسری یہ کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لیے عدل کو شرط قرار دیا گیا اور تیسرے یہ کہ حق مہر کی ادائیگی لازم ٹھہرائی گئی۔ چنانچہ جب اس پر سوال ہوا تو انہی آیات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا۔ سوال اگرچہ ان خاص احکام کے حوالے سے ہوا تھا لیکن شوہر کا کسی بیوی سے مساویانہ سلوک نہ کرنے کا سبب صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی یتیم بچے کی ماں ہے اور یتیموں کی مصلحت کے پیش نظر اس سے نکاح کیا گیا ہے بلکہ اس کے اسباب اور بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک بیوی بانجھ ہے یا دائمی مریض ہے یا زن وشو کے قابل نہیں رہی یا اس کی شکل و صورت واجبی سی ہے تو قرآنِ کریم نے اپنی عادت کے مطابق ان اسباب اور فطری اعذار کو سامنے رکھتے ہوئے چند اصولی احکام دیے کہ اگر بیوی یہ محسوس کرے کہ میری کسی کمزوری کے باعث شوہر کا تعلق مجھ سے کمزور ہوتا جا رہا ہے اور اندیشہ ہے کہ وہ یا تو مجھے چھوڑ دے گا اور یا مجھے بالکل معلق بنا کر رکھ دے گا تو ایسی صورت میں پروردگار اجازت دیتے ہیں کہ میاں بیوی دونوں کے لیے کوئی حرج نہیں کہ بجائے عقد نکاح توڑنے کے وہ کسی سمجھوتے پر راضی ہو جائیں، مثلاً بیوی اسے اپنا حق مہر معاف کر دے یا کم کر دے یا وہ دوسری بیوی کے حق میں اپنے حقوقِ زوجیت سے دستبردار ہو جائے یا دوسری بیوی کے برابر تمام مراعات لینے کا اصرار چھوڑ دے۔ اس طرح کوئی بھی مصالحت کی صورت نکل آئے تو بہتر یہ ہے کہ اسے قبول کر لیا جائے کیونکہ عقد نکاح کو آخر حد تک بچانا مسلمان معاشرے، اولاد اور میاں بیوی کی مصلحت کا تقاضا ہے۔ کسی گھر کے اجڑ جانے سے ایک ایسا راستہ کھل جاتا ہے جس کے اثرات بعض دفعہ نہایت ناگوار صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ایک حکمت کی بات ارشاد فرمائی گئی۔ ''شُحّ'' کا ترجمہ ''بخل'' بھی ہو سکتا ہے اور ''حرص'' بھی۔ بخل کا معنی ہے ادائے حقوق میں تنگدلی دکھانا۔ یہ رویہ بہرحال مذموم ہے۔ اللہ کے نیک بندے ہمیشہ اپنے آپ کو بخل سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک حرص کا تعلق ہے حرص ایک اضافی چیز ہے۔ یہ اچھی بھی ہوتی ہے بری بھی۔ نیکی کی حرص، ہر خیر میں سبقت کی حرص، یہ وہ چیز ہے جو ایک مومن کا مطلوب ہے۔ اس کا تعلق انسانی فطرت سے ہے۔ یہ اگر نہ رہے تو فطرت گہنا کر رہ جائے۔ لیکن اگر ایک شخص اپنی ذات کی حرص میں مبتلا ہے اور وہ ہر صورت میں اپنی بات منوانا چاہتا ہے تو ایسے شخص کے ساتھ گزر بسر کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ دوسرا فریق ایثار اور قربانی سے کام لے۔ اس لیے بیوی کو حکم دیا گیا کہ اگر شوہر کی حرص بڑھ گئی ہے چاہے اس کے جائز اسباب بھی ہوں تو اب اس گھر کی بقا کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ تم ایثار سے کام لو اور اپنے جائز حقوق سے دستبردار ہو کر کوئی تصفیہ کر لو تا کہ اس گھر میں رہ سکو۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تمہارا ایثار شوہر کو بدلنے پر مجبور کر دے۔

عورت ایثار تو کر سکتی ہے لیکن اس کے تحمل کی بھی ایک حد ہے۔ اس لیے اس پر زیادہ بار ڈالنا قرینِ انصاف نہیں۔ اس مصلحت کے پیش نظر فرمایا گیا کہ ہم نے اگرچہ عورت کو ایثار کی ترغیب دی ہے لیکن احسان و تقویٰ اور ایثار و قربانی درحقیقت مرد کے زیادہ شایانِ شان ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنی فتوت اور مردانگی کی لاج رکھے۔ اور بجائے اس کے کہ بیوی کو ایثار و قربانی کی وجہ سے اپنے اوپر ایک اخلاقی تفوق دے دے اسے چاہیے کہ ہر نیکی میں اس کے لیے نمونہ بنے۔ جائز شکایات بھی ہوں تو ان سے درگزر کرے اور حتی الامکان ہر نیکی میں سبقت کی کوشش کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو یقیناً اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کا مستحق ٹھہرے گا۔ کیونکہ وہ ان دونوں کی ایک ایک بات کو جانتا ہے اور دیکھتا ہے۔

Marfat.com

وَ لَنۡ تَسۡتَطِیۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَیۡنَ النِّسَآءِ وَ لَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِیۡلُوۡا کُلَّ الۡمَیۡلِ فَتَذَرُوۡہَا کَالۡمُعَلَّقَۃِ ؕ وَ اِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ○

''اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ پورا پورا عدل کرو بیویوں کے درمیان اگرچہ تم اس کی بہت خواہش بھی کرو۔ تو یہ نہ کرو کہ جھک جاؤ پوری طرح جھک جانا ایک ہی بیوی کی طرف اور چھوڑ دو دوسری کو جیسے وہ درمیان میں لٹک رہی ہو۔ اگر تم اپنا طرزِ عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔'' (النسآء:۱۲۹)

قرآنِ کریم نے بیویوں میں جو عدل اور مساویانہ برتاؤ کرنے کا حکم دیا اس سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس حکم پر عمل کس طرح ممکن ہے؟ لوگوں نے اپنے طور پر یہ سمجھا کہ اس حکم کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی معاملات میں بھی اپنی تمام بیویوں سے یکساں سلوک کرے۔ جو کچھ ایک بیوی کو دے وہی دوسری بیوی کو دے۔ ایک جیسا لباس' ایک جیسی رہائش' ایک جیسی غذا اور ایک جیسا برتاؤ۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے۔ اور دوسری یہ بات کہ جس طرح کی محبت اور محبت کے جذبات ایک بیوی کے لیے اپنے دل میں رکھو' بالکل اسی طرح کے جذبات دوسری کے لیے بھی رکھو۔ صرف یہی نہیں کہ بیویوں میں باریاں مقرر کر دو اور اس میں کسی کو کسی پر ترجیح نہ دو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ تمہارا قلبی رجحان بھی ہر ایک کی طرف یکساں ہونا چاہئے۔ دوسری چیز چونکہ آدمی کے بس میں نہیں' فرض کیجئے ایک بیوی خوبصورت ہے اور دوسری بدصورت' ایک جوان ہے اور دوسری سن رسیدہ' ایک دائم المرض ہے اور دوسری تندرست' ایک بدمزاج ہے اور دوسری خوش مزاج' ایک خوش سلیقہ ہے اور دوسری پھوہڑ' اسی طرح کے اور بھی اختلاف اور تفاوت کے اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں دونوں طرح کی بیویوں کے ساتھ یکساں قلبی رجحان اور محبت کیسے ہو سکتی ہے۔ ایک خوبصورت' تعلیم یافتہ' سلیقہ شعار' حسن کلام سے دل موہ لینے والی بیوی کے ساتھ شوہر کو جو تعلق خاطر ہو سکتا ہے وہ ان صفات سے محروم بیوی کے ساتھ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اگرچہ حسن سلوک بھی طبعی رجحان اور جذباتِ محبت کا عکاس ہوتا ہے۔ جو بیوی اچھی لگتی ہے اس سے خود بخود سلوک بھی اچھا ہو گا اور جو بیوی پسند نہیں اس کے ساتھ سلوک میں بھی یقیناً سرد مہری ہو گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کا لحاظ فرماتے ہوئے صاف صاف فرمایا کہ تمہیں اس بات کا حکم ہی کب دیا گیا ہے کہ تم تمام بیویوں سے دل کے رجحان اور جذباتِ محبت میں یکسانی رکھو۔ تم اگر چاہو بھی تو ایسا نہیں کر سکتے۔ لیکن تمہیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں کہ تم ایک ہی بیوی کی طرف جھک کر رہ جاؤ۔ اسی سے بات کرو' اسی کی تنہائیوں میں شرکت کرو' وہی تمہاری توجہ کا مرکز ہو اور دوسری بیوی گھر میں اس طرح رہے جیسے کوئی گری پڑی چیز ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ تمہارا رویہ اس طرح کا ہو جیسے وہ نہ بیوی ہے اور نہ غیر ہے بلکہ درمیان میں اسے معلق کر کے رکھ دو کہ نہ اسے طلاق دو اور نہ بیوی کے حقوق دو۔ قلبی رجحان چونکہ تمہارے بس میں نہیں اس لیے اس پر تو گرفت نہیں ہو گی لیکن سلوک اور معاملات میں یکسانی چونکہ تمہارے بس میں ہے اس لیے اس میں تمہیں کسی بیوی کو دوسری بیوی پر ترجیح نہیں دینا چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نو بیویاں ہوتے ہوئے بھی کبھی کسی بیوی کو شکایت کا موقع نہ دیا۔ عصر کے بعد سب بیویوں سے ملنے کا معمول تھا۔ سب کی باریاں مقرر تھیں۔ سفر میں ساتھ جانے کا موقع اسے ملتا جس کا نام قرعہ اندازی میں نکلتا۔ سال بھر کا غلہ سب پر برابر تقسیم کر دیا جاتا۔ ازواجِ مطہرات میں سے ہماری ماں یہی سمجھتی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کی نظر سب سے زیادہ اس پر ہے۔ مرض الوفات میں آپؐ جب ہر بیوی کے گھر میں

Marfat.com

جانے کے قابل نہ رہے تو آپؐ نے سب کو جمع کر کے اجازت لی کہ آپ مجھے عائشہؓ کے گھر میں رہنے کی اجازت دے دیں۔ چنانچہ سب نے بخوشی اجازت دی تو آپؐ نے پھر بیماری کے ایام وہیں گزارے اور وہیں آپؐ نے جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہی طریقہ سلف صالحین اور خلف صالحین کا رہا۔ تمام بزرگانِ دین ہمیشہ اپنے اہلِ خانہ سے محبت کا سلوک کرتے رہے اور اگر بیویاں ایک سے زیادہ تھیں تو ہمیشہ منصفانہ برتاؤ کیا۔ ایک بزرگ کے بارے میں میں نے پڑھا کہ ان کے پاس دو خربوزے آئے۔ آپ نے دونوں کو کاٹا اور دونوں کا ایک ایک ٹکڑا اپنی دونوں بیویوں کے گھر بھیجا۔ دیکھنے والوں نے پوچھا کہ حضرت! دو ٹکڑے مل کر بھی ایک ہی تربوز بنتا ہے تو آپ نے ایک ایک تربوز ایک ایک گھر میں کیوں نہ بھیج دیا۔ فرمایا ہوسکتا تھا کہ ایک تربوز میٹھا نکلتا اور دوسرا پھیکا۔ تو دونوں کے ساتھ حسن سلوک میں برابری نہ ہوتی۔ اس لیے میں نے دونوں کو کاٹ کر برابر برابر دونوں کو بھیج دیا۔ تاکہ دونوں جیسے بھی ہوں دونوں کے حصے میں آئیں۔ اس طرح سے قلبی رجحان کی پابندی تو نہیں لگائی البتہ سلوک اور معاشرت میں برابری کرنے کا حکم دیا۔ لیکن اس میں بھی کبھی نہ کبھی کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ اس لیے حکم دیا کہ تمہیں اپنے طرزِ عمل کا ہمیشہ جائزہ لیتے رہنا چاہئے اور ہر وقت اپنی اصلاح کی فکر جاری رہنی چاہئے اور ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے ہوسکتا ہے تمہیں اپنی کوتاہیوں کا احساس نہ ہوسکے۔ اگر یہ اصلاح اور تقویٰ کی کوشش جاری رہی تو اللہ سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ غلطیوں سے صرفِ نظر فرمائے اور رحم اور درگذر کا سلوک فرمائے۔

وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ○

''اور اگر دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اپنی وسیع قدرت سے دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ وسیع بخشش والا حکمت والا ہے۔'' (النسآء:۱۳۰)

بیوی کی طرف سے تمام تر ایثار و قربانی یا شوہر کی طرف سے احسان و مروت کے باوجود دونوں میں علیحدگی ناگزیر ہو جائے اور نبھا کی ہر صورت ناکام ہو جائے تو پھر دونوں کو سوچ سمجھ کر علیحدگی کا فیصلہ کر لینا چاہئے۔ اسلام نے جو طریقِ معاشرت رائج کیا ہے اور مسلمانوں کو جن آدابِ معاشرت سے مہذب بنایا ہے اس میں اس بات پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ حتیٰ الامکان ایک گھر وجود میں آنے کے بعد تباہ نہیں ہونا چاہئے۔ جو بھی ممکن صورت ہو میاں بیوی کے تعلق کو باقی رکھنے کے لیے بروئے کار لانی چاہئے۔ لیکن اگر طبیعتوں کی ناموافقت اور مزاجوں کی ناآشنائی اس حد تک پہنچ جائے کہ علیحدگی کے بغیر کوئی صورت نظر نہ آئے تو پھر عقد نکاح کے ٹوٹنے کو شرافت' تہذیب اور خاندانی روایات کے ٹوٹنے کا ذریعہ نہیں بننا چاہئے۔ اولاً تو میاں بیوی مل کر علیحدگی کا فیصلہ کر لیں۔ اور اگر جانبین کے جذبات میں آگ لگی ہوئی ہو تو پھر دونوں خاندانوں کے بڑوں کی ذمہ داری ہے کہ معقول طریقے سے علیحدگی کا انتظام کریں۔ اور میاں بیوی کو ایسے موقع پر خاص طور پر سہارا دیا گیا ہے کہ اگر ان کے لیے علیحدگی کے سوا کوئی چارہ نہ رہے تو وہ کڑھ کڑھ کر اپنی زندگی کو عذاب نہ بنائیں۔ بیوی یہ نہ سمجھے کہ گھر کی یہ چھت میرے سر پر نہ رہی تو وقت کی دھوپ مجھے جھلسا دے گی۔ آوارہ نگاہیں میرا تعاقب کریں گی۔ ممکن ہے دوسرا کوئی جیون ساتھی میسر نہ آئے اور شوہر بھی یہ گمان نہ کرے کہ ایک خاتون کو طلاق دینے کے بعد کون مجھ پر اعتماد کرے گا اور کون اپنی بیٹی دینے کے لیے ایک ایسے آدمی کو تیار ہو گا جو ایک دفعہ ناکام ہو چکا ہے۔ اور اگر شادی ہو بھی گئی تو کیا جاسکتا ہے کہ اس کا انجام بھی پہلی شادی جیسا نہ ہو۔ فرمایا علیحدگی اگر ضروری ہے تو پھر یہ اندیشے اور وسوسے تمہارے فیصلے اور راستے میں رکاوٹ

Marfat.com

نہیں بننے چاہئیں۔ معاملہ عزت نفس اور خودداری کے ساتھ طے ہونا چاہئے۔ تم نے چاہتوں سے یہ عقد باندھا تھا' چاہتیں ختم ہو گئیں امیدیں ختم نہیں ہونی چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پناہ ہے اس کے لیے کوئی بعید نہیں کہ وہ دونوں کو ایک دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے۔ خاتون کو اچھا شوہر نصیب ہو اور مرد کو اچھی بیوی مل جائے اور دونوں کے گھر آباد ہو جائیں۔ دل اللہ کے قبضے میں ہیں' امکانات بھی وہی پیدا فرماتا ہے اس لیے اس سے بہتری کی امید رکھو اور اس کے لیے دعائیں مانگتے رہو۔ اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور حکمت والا ہے۔ وہ اپنی وسعتوں سے تمہیں نوازے گا اور اپنی حکمت و دانش کے ساتھ تمہارے ساتھ معاملہ کرے گا۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِیَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِیًّا حَمِیْدًا ○

''اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ بے شک ہم نے حکم دیا تھا ان لوگوں کو جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی۔ اور تمہیں بھی کہ اللہ سے ڈرو۔ اور اگر تم انکار کرتے ہو تو بے شک اللہ کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے' اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے ہر تعریف کا مستحق ہے۔'' (النسآء:۱۳۱)

انسان میں اللہ تعالیٰ نے خیر کے داعیات بھی رکھے ہیں اور شر کے بھی۔ ان دونوں کو بروئے کار لانے کے لیے دونوں کی تائید و حمایت کے عوامل بھی رکھے گئے ہیں۔ عقل شعور اور تمیز کی صلاحیتیں دے کر فی الجملہ آزادی عطا کی گئی ہے کہ جو چاہو راستہ اختیار کرو۔ لیکن تمہارے اختیار کردہ راستے کے مطابق عناصر قدرت تمہارے لیے ہموار ہوتے جائیں گے اور اسی کے مطابق تمہارے ساتھ آخرت میں سلوک ہوگا۔

انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ چونکہ رحم و کرم کا ہے اس لیے اس نے ان کی ہدایت اور نجات کو آسان بنانے کے لیے انبیاء کرام مبعوث کیے اور اپنی کتابیں نازل کیں۔ انسان کے بگاڑ کا سب سے بڑا سبب خواہش نفس کی پیروی اور شیطان کی وسوسہ اندازی کی وجہ سے راستہ اختیار کرنا ہے۔ خواہش نفس کی پیروی میں چونکہ ایک لذت اور آسانی ہے اس لیے انسان اس کی طرف لپکتا ہے۔ اور وہ یہ بات سوچنے کی زحمت نہیں کرتا کہ اس کے اس رویے کا انجام کیا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہشات بڑھتی چلی جاتی ہیں اور شیطان کو زیادہ سے زیادہ گمراہ کرنے کے مواقع ملتے چلے جاتے ہیں۔ میاں بیوی کا نازک تعلق اس کی بہترین مثال ہے۔ میاں بیوی دونوں یا ان میں سے ایک اگر خواہش نفس کی پیروی اور شیطان کے اتباع میں حدود سے تجاوز کر جاتا ہے تو گھر کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا' لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ انہیں کبھی انجام کی فکر کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ لیکن جب شیطان انہیں علیحدگی تک پہنچا دیتا ہے اور جانبین میں نفرتوں کی آگ بھڑک اٹھتی ہے تو تب انہیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہم نے غلط راستہ اختیار کر کے خود اپنی زندگی برباد کی ہے۔ زندگی کے مجموعی سفر کے لیے عموماً اور عائلی زندگی کے لیے خصوصاً اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ زمین و آسمان کی ہر مخلوق اللہ کی مملوک ہے۔ اللہ ان سب کا آقا ہے۔ اسے بجا طور پر انہیں حکم دینے کا حق پہنچتا ہے اسی حق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جن امتوں کو بھی کتاب دی انہیں اس بات کا حکم دیا اور مسلمانوں کو اب کتاب دی گئی ہے انہیں بھی حکم دیا ہے کہ خواہشات نفس اور شیطان کی پیروی کرنے کی بجائے اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اس کی نافرمانی کے انجام سے ڈرو۔ اس کے احکام

Marfat.com

زنجیریں اپنے قدموں میں ڈال لو۔ خواہش نفس کو اس کی رضا کے سامنے سپر انداز کر دو۔ شیطان اللہ کا باغی اور تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس کی پیروی کرنے کی بجائے اللہ کے احکام کی پیروی کرو۔ اور دل کی اس طرح تطہیر اور تعمیر کرو کہ وہ نیکی کی طرف لپکتا چلا جائے اور گناہ کی ہر بات سے اسے نفرت ہو جائے۔ یہی حکم پہلے بھی دیا گیا اور تمہیں بھی دیا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے تم اپنے اللہ کو راضی کر سکتے ہو اور اسی سے تم اپنی عائلی زندگی سے لے کر زندگی کے تمام دائروں میں کامیابی سے عہدہ برآ ہو سکتے ہو۔ اور اگر تمہیں اس بنیادی حقیقت کو ماننے سے انکار ہو تو پھر اس حقیقت کا سامنا کرو اور تمہارے پاس اس کے خلاف کوئی دلیل ہو تو اسے پیش کرو کہ اللہ ہی کی مخلوق اور مملوک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سب کو زندگی وہیں سے ملی ہے، ہر مخلوق اسی سے غذا پاتی ہے اللہ ہی کی حفاظت سے ہر مخلوق زندہ ہے اور انسان بھی اسی کی حفاظت میں اور اسی کی توفیق سے زندگی کے فرائض ادا کر رہا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے انکار کرنا ایک بدیہی بات سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ انکار کے باوجود انسانوں کی طرف اپنے نبی بھیجتا اور کتابیں نازل کرتا ہے تو کیا اس میں اس کی اپنی کوئی ذاتی احتیاج ہے جس کی وجہ سے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے؟ فرمایا کہ اس کی اپنی کوئی احتیاج نہیں کیونکہ وہ تو غنی اور بے نیاز ہے۔ چونکہ وہ حمید بھی ہے اس لیے بے نیاز ہونے کے باوجود ساری مخلوق کو اپنے جود و کرم سے نواز رہا ہے۔ وہ انکار بھی کرتے ہیں تب بھی انہیں ہدایت عطا فرماتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی تباہی سے بچ جائیں۔

وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیۡلًا ۝ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ اَیُّہَا النَّاسُ وَیَاۡتِ بِاٰخَرِیۡنَ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی ذٰلِکَ قَدِیۡرًا ۝

"اور اللہ ہی مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور کارسازی کے لیے بس وہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے۔ اور وہ اس کی پوری قدرت رکھتا ہے۔" (النسآء: ۱۳۲ تا ۱۳۳)

اس آیت کریمہ میں جو حقیقت سابقہ آیت میں بیان فرمائی تھی اسے تیسری دفعہ دہرایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے جب بھی خودسری دکھائی ہے اور اپنی طاقت و قوت کے زعم میں کمزور انسانوں پر مظالم توڑے ہیں۔ اور خود طاغوت بن کر لوگوں کو اپنی بندگی پر مجبور کیا ہے۔ اور اپنے جیسے انسانوں کو اپنے غلام بنا کر انہیں ایک فروختنی چیز بنا دیا ہے اور یا انسانیت کی تذلیل کرتے ہوئے تراشے ہوئے بتوں کے سامنے سر جھکایا ہے، کبھی مظاہر قدرت کی پوجا کی ہے، کبھی دیوتاؤں سے مرادیں مانگی ہیں اور کبھی جنات سے پناہ طلب کی ہے، یعنی کبھی تو اتنی خودسری اختیار کی کہ خود خدا بن گیا اور کبھی اتنی فروتنی میں اترا کہ پتھروں تک کو مسجود بنا لیا۔ اور کبھی ایسا ہوا کہ اللہ کو معبود سمجھا، حاکم بھی مانا لیکن اس کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے سے انکار کر دیا۔ اللہ کے مقابلے میں شیطان کے احکام کا اتباع کیا۔ اپنے وضعی قوانین کے مطابق زندگی گزاری۔ اپنی عدالتوں میں طاغوتی نظام کے مطابق فیصلے کیے اور کرائے۔ انسانی زندگی میں یہ تینوں قباحتیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب انسان اس بنیادی تصور سے تہی دامن ہو جاتا ہے کہ آسمان اور زمین کی تمام مخلوقات اللہ ہی کی ملکیت ہیں۔ اسی کی مخلوق، اسی کی مملوک، اسی کی اطاعت گزار اور اسی کے سامنے جواب دہ ہیں۔ چونکہ اسی تصور کے دماغوں سے نکل جانے کے باعث انسان گمراہی کا راستہ اختیار کرتا ہے اور

Marfat.com

... بنیادی بیماری ہے جس نے انسانیت کو مریض بنایا ہے۔ اس لیے تین دفعہ اس کے علاج کو دہرایا گیا اور بار بار تنبیہ کی گئی کہ اس بنیادی
تصور کے درست ہونے سے ... انسانیت کی پوری تعمیر تباہی کا شکار ہوتی ہے۔ اس لئے جب تک اس خشت اول کو درست نہیں کیا جائے گا اس
وقت تک انسان کی بگڑی قسمت کبھی نہیں بنے گی۔

... کریمہ میں ... قرآن کے طالب علم کو اچھی طرح اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح کائنات کی
ہر چیز اپنی مرضی سے وجود میں نہیں آئی اسی طرح کسی چیز کی بقا بھی اس کی اپنی مرضی سے وابستہ نہیں۔ اللہ جس چیز کو چاہتا ہے تخلیق فرماتا
ہے اور جب چاہتا ہے مٹا دیتا ہے۔ زمین بھی اسی نے بنائی ہے اور اس پر بسنے والے بھی اسی نے بسائے ہیں۔ جب تک وہ زندگی کی
مہلت دیتا ہے ... قوم بھی زندگی گزارتی ہے اور اپنے گھروں اور اپنے شہروں میں آباد رہتی ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ اس کی
... فیصلہ ... قرآن کی تباہی ... خاص طور پر رسول کی بعثت کے بعد رسول جس علاقے اور جس قوم کی طرف
مبعوث ہوتے ہیں ... رسول کی دعوت کو قبول کرنے یا رد کرنے پر ہوتا ہے۔ اگر وہ قبول کر لیتے ہیں تو زندگی دراز ہو جاتی
ہے اور اگر وہ ... رسول کی ... تو اس قوم کو عذاب کے ذریعے تباہ کر دیا جاتا ہے۔ قوم نوح، قوم عاد، قوم
ثمود ... چھوڑ ... تجارتی اسفار میں ان علاقوں سے گزرتے تھے۔ ذرا غور کریں کہ یہ قومیں
... جب یہ زمین صفحہ ہستی سے مٹا دی گئیں اور آج ان علاقوں میں دوسری قومیں آباد ہیں اسی طرح
... اللہ چاہے تو تمہیں بھی مٹا دے اور تمہاری جگہ دوسری کسی قوم کو بسا دے۔ اللہ اس پر قادر ہے۔ اس کے لیے کسی قوم کو مٹا دینا اور اس کی جگہ
... کھنڈرات صرف دیکھنے کے لیے نہیں کہ یہاں کبھی صنعت و حرفت، تجارت
... بلند و بالا ... یہاں بھی زندہ انسان رہتے تھے۔ ذرا غور کرو وہ کیوں مٹا دیے گئے؟ یہاں کچھ نہ کچھ
عبرت حاصل کرنے ... جائے

عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝

"جو دنیا کے ثواب کا طلبگار ہے تو اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا صلہ موجود ہے۔ اللہ سننے
والا اور دیکھنے والا ہے۔" (النساء: ۱۳۴)

اس کی قدرت کا عالم تو یہی ہے کہ وہ جب تک چاہے کسی کو اس دنیا میں زندگی گزارنے دے اور جب چاہے انہیں مٹا کر ان کی جگہ
دوسری قوم کو لا بسائے۔ لیکن اس وقت اس نے اپنا رسول بھیج کر تمہارے سامنے دونوں راستے کھول دیے ہیں۔ اگر رسول کی دعوت کو قبول
کرتے ہو تو اس میں دنیا بھی ہے اور آخرت بھی۔ اور اگر تم اس کا انکار کر کے صرف دنیا اور اس کی نعمتوں کے حصول کے طلبگار ہو تو تمہیں معلوم
ہونا چاہیے کہ دنیا بھی اسی کے قبضے میں ہے اور آخرت بھی اسی کے قبضے میں۔ سوچنے کی بات ہے اس لیے اگر کوئی صرف دنیا طلبی کا راستہ اختیار

ہے تو وہ فوراً اس کا رستہ نہیں روکتا بلکہ اسے دنیا کی طلب میں بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ البتہ جو شخص اللہ کی رسول کا اتباع کر کے آخرت کا مسافر بنتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا اور آخرت دونوں سے نوازتے ہیں۔ تو کس قدر عجیب بات ہے کہ تمہیں جس جگہ سے دنیا اور آخرت دونوں کی نعمتیں مل سکتی ہیں تم اس سے منہ پھیر چکے ہو۔ اور جو رویہ تمہیں آخرت سے محروم کر رہا ہے اس کی طرف بگٹٹ بھاگے جا رہے ہو۔ کاش تمہیں معلوم ہو سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ کیونکہ تمہارا ہر عمل اور تمہاری ہر بات اللہ سن بھی رہا ہے اور دیکھ بھی رہا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ
لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا
اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ
وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿١٣٥﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ
نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ
يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ
ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿١٣٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ
اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ
وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ؕ ﴿١٣٧﴾ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا
اَلِيْمَا ۙ ﴿١٣٨﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ
اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ ﴿١٣٩﴾ وَقَدْ نَزَّلَ
عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ

Marfat.com

بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ
اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ
جَمِيْعًا ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ
قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ
نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ ع

عربی رکوع ۲۰ (اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے بنو اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے اگرچہ یہ شہادت تمہارے اپنے نفسوں کے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہو۔ کوئی امیر ہو یا غریب اللہ ہی دونوں کا سب سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ پس تم خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ۔ اور اگر تم ہیر پھیر کرو یا منہ موڑو تو بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے ○ اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے اتاری۔ اور جو اللہ اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اس کے رسولوں اور روزِ آخرت کا انکار کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا ○ بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر کفر کیا پھر ایمان لائے پھر کفر کیا پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ ان کی مغفرت فرمانے والا ہے اور نہ ان کو راہ دکھانے والا ہے ○ منافقوں کو مژدہ سناؤ کہ ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے جو کافروں کو دوست بناتے ہیں مسلمانوں کے مقابلے میں۔ یا وہ تلاش کرتے ہیں ان کے پاس عزت؟ تو بے شک عزت سب کی سب اللہ کے لیے ہے۔ اللہ نازل کر چکا ہے تم پر کتاب میں یہ حکم کہ جب تم سنو اللہ کی آیتوں کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو مت بیٹھو ان لوگوں کے ساتھ یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ ورنہ تم بھی انہی کی طرح ہو گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اکٹھا کرنے والا ہے سب منافقوں اور سب کافروں کو جہنم میں۔ وہ منافق جو انتظار کر رہے ہیں تمہارے لیے گردشوں کا۔ اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور کافروں کو کوئی جیت ہو جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم پر چھائے نہیں رہے اور

Marfat.com

ہم نے مسلمانوں سے تم کو بچایا نہیں؟ تو اللہ ہی فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن اور اللہ کافروں کو مومنوں پر کوئی راہ نہیں دے گا) (آیات ۱۳۵ تا ۱۴۱)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَ لَوْعَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْتُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝

’’اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے بنو اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے اگر چہ یہ شہادت تمہارے اپنے نفسوں کے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہو۔ کوئی امیر ہو یا غریب اللہ ہی دونوں کا سب سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ پس تم خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ۔ اور اگر تم ہیر پھیر کرو یا منہ موڑو تو بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔‘‘ (النسآء:۱۳۵)

کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو اس فریضۂ منصبی کا احساس دلایا جا رہا ہے جس پر بنی اسرائیل کی معزولی کے بعد انہیں فائز کیا گیا۔

’’قَوّٰم‘‘ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ ’’قِسط‘‘ عدل اور انصاف کو کہتے ہیں۔ یعنی صاحب حق کو ٹھیک ٹھیک اس کا حق ادا کرنا۔ اس لحاظ سے اس آیت کریمہ کے پہلے جملے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مضبوطی سے انصاف پر قائم رہنے والے بنو۔ اور دوسرا معنی یہ کہ تم دنیا میں انصاف کے علمبردار بنو۔ اگر پہلا معنی کریں تو پھر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ معاملہ یتیموں کا ہو یا بیوگان کا' بیوی کا ہو یا کسی اور کا' مسلمانوں کو ہر صورت میں انصاف کا ترازو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کیونکہ ان کے دین نے ان کی پہچان ہی یہ قائم کی ہے کہ وہ کسی معاملے اور کسی حالت میں بھی ناانصافی کبھی نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ انصاف کو مستحکم کرنے یا کسی صاحب حق کا حق دلوانے کے لیے انہیں گواہی دینے کی بھی ضرورت پڑے تو وہ یہ سمجھ کر گواہی دیتے ہیں کہ ہم یہ گواہی کسی شخص کے لیے نہیں' بلکہ اللہ کے لیے دے رہے ہیں۔ وہ ہماری گواہی کے ایک ایک لفظ کو سن رہا ہے' گواہی کے پیچھے مخفی جذبے کو جانتا ہے اور ہماری صحیح یا غلط گواہی پر قیامت کے دن ہمارے انجام کا فیصلہ ہوگا۔ اس لیے وہ کبھی بھی غلط گواہی دینے کی جرأت نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ اگر ان کی گواہی یا انصاف کا قیام ان کی اپنی ذات کے لیے نقصان کا باعث بنے یا اس کی زد والدین یا قریبی عزیزوں پر پڑے دوسرا فریق چاہے امیر ہو یا غریب وہ کسی حال میں بھی انصاف سے سرمو انحراف نہیں کرتے اور کبھی گواہی میں جانبداری یا جھوٹ بولنے کا تصور نہیں کر سکتے۔ اس رویے کو مسلمانوں کی شناخت قرار دے کر مزید اس کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

اور اگر ترجمہ دوسرا کیا جائے تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہاں قسط سے مراد حق وعدل کی وہ میزان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی شکل میں عطا فرمائی ہے۔ مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار بنایا جا رہا ہے کہ ان کا کوئی قول یا عمل اس میزان سے ہٹا ہوا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ زندگی کے ہر معاملے میں اسی حق کی میزان کو جاری وساری اور قائم و نافذ کرنے کے پابند ہیں۔ انفرادی زندگی پر بھی اسی کا غلبہ ہو اور اجتماعی زندگی پر بھی یہی حکمران ہو۔

Marfat.com

اور پھر اسی پر بس نہیں کہ انہیں اپنی زندگیوں میں اس کتاب سے راہنمائی لینا ہے اور اسے وہ حاکمانہ حیثیت دینی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کا کوئی معاشرہ اس سے انحراف نہ کر سکے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مسلمانوں سے جہاں تک ممکن ہو سکے وہ اللہ کی اس کتاب' اس دین اور اس میزان کے حق ہونے کی گواہی دیں۔ غیر مسلموں کے سامنے علمی دلائل اور اپنے اجتماعی رویے سے ثابت کر دیں کہ حقوق و معاملات میں اگر کوئی چیز انسانوں کو عدل اور انصاف پر قائم رکھتی ہے اور انسانی معاشرہ جس کی وجہ سے آسودہ زندگی گزارتا ہے اور لوگ ایک دوسرے سے دکھی ہونے اور الجھنے کے بجائے ایک دوسرے کے ہمدرد و غمگسار بن جاتے ہیں اور جرائم کا بیج تک ان کے معاشرے اور سماج میں مارا جاتا ہے تو وہ یہی کتاب اور میزانِ حق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ حق و باطل کے اس میزان کو انفرادی و اجتماعی عمل کی شکل میں اگلی نسلوں تک منتقل کریں تاکہ جب ان کے پاس اللہ کے نبی کی دعوت' اس کا اسوہ اور اللہ کی کتاب پہنچے تو وہ اس خلجان میں مبتلا نہ ہوں کہ ممکن ہے آج کے دور میں اس کتاب پر عمل کرنا ممکن نہ ہو۔ یہ اپنی افادیت کی عمر گزار چکی ہو' آج کی مشکلات اور مسائل کا حل اس کی وسعتوں میں ناپید ہو۔ کیونکہ جب بھی کوئی نظام تھیوری کی شکل میں کسی بھی قوم کے سپرد کیا جاتا ہے وہ اگر اس تھیوری کی صداقت پر ایمان بھی رکھتی ہے تب بھی اس کے قابلِ عمل ہونے کے بارے میں ہمیشہ شش و پنج میں مبتلا رہتی ہے جب تک کہ اسے عمل کی شکل میں کامیابی سے ہمکنار ہوتے دیکھ نہیں لیتی۔ اس لیے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس نظامِ حق پر اس طرح مخلصانہ زندگی گزاریں اور اس کے ایک ایک حکم کو انفرادی اجتماعی زندگی کو اس طرح کامیابی سے ہمکنار کر کے دکھائیں اور زندگی کا ایک ایک شعبہ اس کی رہنمائی میں اس طرح کامیابی سے چلا کر دکھائیں کہ یہ تسلسل و تعامل جب اگلی نسل تک منتقل ہو تو انہیں اس کے قابلِ عمل ہونے میں کوئی شک و شبہ لاحق نہ ہو۔

قانون یا نظام کوئی سا بھی ہو جب تک اس کے چلانے والے ہاتھ مضبوط' غیر جانبدار اور مخلص نہ ہوں اور ان کے اندر اس کے اجراء و تنفیذ کا بے پناہ جذبہ کارفرما نہ ہو اور وہ اس راستے میں پیش آنے والے موانع پر قابو پانے کی ہمت نہ رکھتے ہوں اس وقت تک کوئی سا قانون و نظام چل نہیں سکتا۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی اختصار سے ان رکاوٹوں کو ذکر فرمایا گیا جو بالعموم ناکامی کا سبب بنا کرتی ہیں۔ کسی بھی گواہی اور انصاف کے کسی پہلو کے اجراء میں بھی سب سے پہلی رکاوٹ آدمی کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ وہ حق اور انصاف کے بارے میں بہت بلند آہنگ ہوتا ہے۔ لیکن جیسے ہی اس کی زد اس کی اپنی ذات' اس کی اولاد یا اس کے کسی مفاد پر پڑتی نظر آتی ہے تو پھر وہ بچ نکلنے کے راستے تلاش کرتا ہے۔ تاویلیں ڈھونڈی جاتی ہیں' چور دروازے تلاش کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر اس انصاف کی زد والدین یا قریبی رشتہ داروں پر پڑتی ہے تب بھی آدمی کا حق پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ والدین' قریبی عزیز یا احباب کا دباؤ بعض دفعہ اس قدر خطرناک صورت اختیار کر جاتا ہے کہ آدمی اس کے سامنے بالکل بے بس دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح امیر اور غریب کا فرق بھی ہر معاشرے کے ترازو کو متاثر کرنے کا ایک معمول رہا ہے۔ امیر اگر کوئی جرم کرتا ہے تو عموماً قانون مکڑی کا جالا بن جاتا ہے اور اگر غریب پکڑا جاتا ہے تو یہ لوہے کی زنجیر میں ڈھل جاتا ہے۔ اور بعض دفعہ غریبوں کی ناروا ہمدردیاں بھی بہت بڑا مسئلہ بن جاتی ہیں۔ جس طرح دنیا میں بااثر لوگوں نے ہر سطح پر خرابیاں پیدا کی ہیں اسی طرح کمزور طبقوں کی یونینز نے ہماری قریبی تاریخ میں بڑے بڑے مسائل پیدا کیے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا ہے کہ جب انہی کمزوروں اور مظلوموں کو اقتدار ملتا ہے تو وہ طبقہ امراء سے بھی بڑھ کر ظالم ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ اصل چیز تو اس کلمۂ حق اور میزانِ حق سے وابستگی ہے۔ جس طبقے کا تعلق اس سے ٹوٹ جاتا ہے وہی طبقہ معاشرے کے لیے سوہانِ روح بن جاتا ہے۔ اقبال نے شاید اسی سے متاثر ہو کر کہا۔

Marfat.com

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

مقصود صرف یہ ہے کہ کسی طرح بھی ہوائے نفس کی پیروی مت کرو۔ ایسی پیروی جو تمہیں عدل اور انصاف سے منحرف کر دے۔ یہ ہے وہ حکم جو بطورِ خاص حق سے وابستگی کو باقی رکھنے کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ اتباعِ ہواء وہ برائی ہے جس سے باقی ساری برائیاں پھوٹتی ہیں۔ کوئی شخص یا کوئی معاشرہ جب ہوائے نفس کے اتباع میں مبتلا ہو کر حق سے پہلوتہی کرتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ نظامِ حق کو جو اس کی کتاب اور پیغمبر کی سنت میں محفوظ ہوتا ہے بگاڑنے اور مسخ کرنے کی کوشش کی جائے' ترمیم اور تحریف کا راستہ کھولا جائے' ایسی حرکتیں کی جائیں جس سے اس کی اصل شکل بدل جائے' اس کے بعد یہ مطالبہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے کہ اس حق پر قائم رہا جائے اور اللہ کے لیے اس کی گواہی دی جائے۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ اسے بگاڑنے کی کوشش تو نہ کی جائے' البتہ زندگی کے معاملات سے اسے خارج کر دیا جائے۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ مذہب اور دین کا ہمارے دنیوی کاموں سے کیا رشتہ؟ مذہبی معاملات' مذہبی رسوم' پوجا پاٹ اور دعا و مناجات کے طریقے تو مذہب سے لیے جائیں' لیکن نظامِ تعلیم' نظامِ عدالت' اصولِ معاشرت' طریقِ سیاست اور طریقِ حکومت کا مذہب اور دین سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ آج کے دور میں سب سے بڑا افسون جس نے دماغوں کو معطل کر کے رکھ دیا ہے وہ یہی ہے۔ پڑھے لکھے لوگ یکسو ہیں کہ ہم مذہب کی چند رسمیں اور مذہبی تہوار' مذہب کے طریقے کے مطابق مناتے ہیں بس اس کے علاوہ اور کیا چاہیے؟ عیسائیوں کے پاس چونکہ چند رسومِ عبادت کے سوا مذہب کی اور کوئی چیز موجود نہیں تھی اس لیے انہوں نے مذہب کو اجتماعی اداروں سے خارج کرنا اپنی ضرورت بھی سمجھا اور اسی سے انہوں نے مذہب کی اجتماعی گرفت سے نجات حاصل کر لی۔ اور یہی وہ فتنہ ہے جس میں آج پورا عالمِ اسلام گرفتار ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ جس امت مسلمہ کو حق کی گواہ بنا کر نظامِ حق پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا تھا اور جس نے یہ روشنی پوری دنیا تک پہنچائی تھی وہ اپنے گھر کا دیا بجھا کر گہری نیند سو رہی ہے اور اسے بالکل احساس نہیں کہ مجھے اللہ نے اتنا عظیم منصب عطا فرمایا تھا اس منصب سے روگردانی کرنے کے بعد ذلت و نکبت میرا مقدر بن کر رہ گئی ہے۔ حالانکہ اللہ کی قانون کے نفاذ اور میزانِ حق کی پاسداری پر قرآنِ کریم کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا زور دیا تھا اور اپنے عمل سے جس طرح اس کی نزاکتوں کو واضح کیا تھا اس کی ایک مختصر مثال اس ایک واقعے میں ملتی ہے جسے بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے۔ (جب ایک مخزومیہ عورت نے چوری کی تو اس کے معاملے کی قریش کو بڑی فکر ہوئی۔ لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کون ایسا شخص ہو سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کرے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اس کی جرأت صرف اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کر سکتے ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے چہیتے ہیں۔ لوگوں کے کہنے پر اسامہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اسامہ تم اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود میں سے ایک حد کے معاملے میں سفارش کرنے آئے ہو؟'' پھر آپؐ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا ''لوگو! تم سے پہلے قوموں کو اسی چیز نے تباہ کیا کہ ان کا حال یہ ہو گیا تھا اگر ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ خدا کی قسم! میں ایسا نہیں کرنے کا۔ میں تو اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔'')

Marfat.com

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا۝

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے اتاری۔ اور جو اللہ اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں' اس کے رسولوں اور روزِ آخرت کا انکار کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔'' (النسآء:۱۳۶)

صاحب ایمان لوگوں کو ایمان لانے کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو صاحب ایمان کہہ کر خطاب فرمایا گیا ہے اور اس کے بعد انہیں پھر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ سرسری نظر میں یہ بات بہت عجیب سے معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ پہلے ہی صاحب ایمان ہیں انہیں دوبارہ ایمان لانے کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی آدمی کپڑے پہنے کھڑا ہو اسے یہ کہا جائے کپڑے پہن کے آؤ۔ حقیقت یہ ہے یہاں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں تعجب یا اجنبیت کی کوئی بات نہیں۔ سب سے پہلے تو لفظی حیثیت سے دیکھئے۔ عربی زبان کا یہ طریقہ ہے کہ فعل کبھی اپنے ابتدائی اور ظاہری معنی میں استعمال ہوتا اور کبھی حقیقی اور کامل معنی میں۔ یہاں '' یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا '' میں ''اٰمَنُوْا'' ابتدائی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور اس کے بعد ''اٰمِنُوْا'' حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

معنوی حیثیت سے اگر آپ دیکھیں تو ایمان کا لفظی معنی تو ہے صرف مان لینا۔ یعنی زبان سے اقرار کر لینا۔ دل کی تصدیق' دماغ کا اطمینان اور عمل کی تائید بے شک اس میں شامل نہ ہو۔ ایک آدمی یہ کہتا ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول کو مانتا ہوں اور میں مسلمان ہوں۔ تو سننے والا اسے مومن سمجھے گا چاہے اس کے دل و دماغ کی کوئی بھی کیفیت ہو اور خواہ اس نے پوری زندگی اسلام کے مطابق کوئی کام نہ کیا ہو۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس میں خطاب عام مسلمانوں سے ہے جن میں منافقین بھی شامل ہیں۔ اور یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خطاب صرف منافقین سے ہو۔ وہ چونکہ اپنے آپ کو مومن کہتے تھے اور مسلمانوں میں بڑھ چڑھ کر اپنے ایمان کا یقین بھی دلاتے تھے۔ تو پروردگار نے انہیں خطاب اسی حیثیت سے کیا ہے کہ ''اے وہ لوگو جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہو تم واقعی اگر اپنے دعوے میں مخلص ہو تو پھر اس میں حقیقت بھی پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ محض ایمان کا دعویٰ کرنے سے ایک ایسی صورت وجود میں آ جاتی ہے جو حقیقت سے خالی ہے۔ لیکن صورت بے حقیقت کا تو دنیا میں کوئی اعتبار نہیں اللہ کے ہاں کیا اعتبار ہو گا۔ بازار میں پلاسٹک کے بنے ہوئے خوبصورت پھل ملتے ہیں' دیکھنے میں ایسا لگتا ہے جیسے یہ سچ مچ کا کیلا' سیب' انگور یا نارنگی ہے' لیکن نہ اس میں خوشبو' نہ اس میں مزہ' نہ وہ کھانے کے قابل' اس سے بچے کھیل تو سکتے ہیں لیکن کوئی عقلمند آدمی انہیں پھل سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ کھلونوں کی شکل میں درندے نظر آتے ہیں' ہاتھی' چیتے' شیر' بعض دفعہ بچے انہیں دیکھ کے ڈر جاتے ہیں' لیکن سمجھدار آدمی جانتا ہے کہ یہ محض صورتیں ہیں جو حقیقت سے خالی ہیں۔ اسی پر ایمان کو قیاس کر لیجئے۔

Marfat.com

ایمان کی ایک حقیقت ہے اور ایک صورت۔ صورت صرف مان لینے کا نام ہے اور حقیقت وہ ہے جو انسان کی شخصیت کو مکمل طور پر تبدیل کر دیتی ہے۔ انسان کی سوچ' رویہ' احساسات' محبت ونفرت کے حوالے' تعلقات کی دنیا' پسند و ناپسند' زندگی کا ایک ایک عمل' غرضیکہ ہر چیز بدل کے رہ جاتی ہے۔ وہ شخص جو صرف ذاتی غم کو جانتا ہے ایمان کی حقیقت آ جانے کے بعد وہ اجتماعی غم سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس کی منزل دنیا نہیں آخرت بن جاتی ہے۔ اب وہ دنیا چھن جانے سے نہیں روتا' بلکہ نماز قضا ہونے سے روتا ہے۔ رات کے پچھلے پہر اسے نیند میٹھی معلوم نہیں ہوتی' بلکہ اس کی آنکھوں سے برسنے والی برکھا اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرتی ہے۔ یہاں اسی حقیقت کی طرف آنے کی دعوت دی گئی ہے کہ بے شک زبان سے ایمان کا اقرار کر چکے ہو لیکن اگر تم حقیقت میں ایمان سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہو تو پھر ضروری ہے اللہ اس کے رسول' قرآنِ کریم اور پہلی آسمانی کتابوں پر بھی اس طرح ایمان لاؤ جس طرح ایمان لانے کا حق ہے۔ لیکن اگر زبان سے اقرار کے بعد بھی تمہارے اندر اقرار وانکار کی وہی مصنوعی دنیا باقی رہتی ہے تو پھر تم حقیقت میں مومن نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو شخص اللہ' اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کرتا ہے اسے ایمان تو کیا نصیب ہوگا وہ تو بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ کیونکہ ایمان اور کفر کے درمیان فرق کرنے والی چیز انہی حقائق کو تسلیم کرنا ہے۔ جس نے ان کا انکار کر دیا اس نے تو تاریک رات میں اپنے ہاتھ کی مشعل توڑ ڈالی۔ اب وہ جیسے جیسے ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوا چلے گا ویسے ویسے وہ اپنے راستے سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اس آیت میں ایمان کے جن اجزاء کا ذکر کیا گیا ہے اور کتابوں کے نزول کے لیے ''اَنْزَلَ'' اور ''نَزَّلَ'' دو فعل ذکر کیے گئے ہیں۔ ان تمام باتوں کی تفصیل اس سے پہلے ہم مختلف مقامات پر پڑھ چکے ہیں۔ اس لیے میں اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ۝

''بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر کفر کیا پھر ایمان لائے پھر کفر کیا پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ ان کی مغفرت فرمانے والا ہے اور نہ ان کو راہ دکھانے والا ہے۔'' (النسآء: ۱۳۷)

سابقہ آیت کے اصحاب ایمان کے کردار کی تصویر

اس آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کی تصویر کھینچی گئی ہے جنہیں سابقہ آیت میں ایمان کے دعویٰ کے باوجود حقیقی ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ ان کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان لائے' پھر کفر کیا۔ پھر ایمان لائے پھر کفر کیا۔ پھر کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے۔ ہمارے بعض مفسرین نے اس کا ایک مطلب تو یہ لیا ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں کہ وہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے' پھر بچھڑے کی پوجا کر کے کافر ہو گئے۔ عجل پرستی سے توبہ کر کے پھر مسلمان ہوئے' ان کی نسلیں عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لا کر پھر کافر ہو گئیں۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بظاہر ایمان لا کر اور حقیقت میں کفر کا رویہ اختیار کر کے کفر میں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔ لیکن بعض مفسرین اسے منافقین کا ذہنی رویہ قرار دیتے ہیں کہ انہوں نے دین کو ایک غیر سنجیدہ تفریح سمجھ رکھا ہے۔ گویا

Marfat.com

ایک کھلونا ہے جس سے وہ اپنے تخیلات یا اپنی خواہشات کے مطابق کھیلتے رہتے ہیں۔ جب فضائے دماغی میں ایک لہر اٹھی مسلمان ہو گئے' جب دوسری لہر اٹھی کافر بن گئے۔ یا جب فائدہ مسلمان بن جانے میں نظر آیا مسلمان بن گئے اور جب معبودِ منفعت نے دوسری طرف جلوہ دکھایا تو اس کی پوجا کرنے کے لیے بے تکلف اسی طرف چلے گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے پاس نہ مغفرت ہے نہ ہدایت۔

بعض اہلِ علم نے اسے ذہنی رویہ ہی سمجھا ہے۔ لیکن ان کی تعبیر یہ ہے کہ یہ منافقین ہیں جنھوں نے ایمان وکفر کو ہمیشہ کھیل سمجھا ہے۔ ایک کھیل تو وہ ہے جو تورات کے ساتھ پہلے کھیل چکے ہیں۔ اسے مانا بھی اور اسے بگاڑا بھی۔ اور دوسرا کھیل یہ ہے جو وہ اسلام کے ساتھ کھیل رہے ہیں کہ پہلے آگے بڑھ کر اس کے ماننے کا اقرار کیا اور اب رات دن اس کے خلاف سازشیں کرنے کے درپے ہیں۔ انہوں نے اپنے رویے سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ اب اللہ کی رحمت کے مستحق نہیں رہے۔ اس لیے پروردگار نے فرمایا کہ اللہ نہ تو ان کی مغفرت فرمائے گا اور نہ ان کے لیے ہدایت کا کوئی اور راستہ کھولے گا۔ یہ اسلام دشمنی میں جس طرح بڑھتے جا رہے ہیں ان کی یہی روش بالآخر انہیں جہنم لے جائے گی۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ڮ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۙ۝ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ڮ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝

''منافقوں کو مژدہ سناؤ کہ ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے جو کافروں کو دوست بناتے ہیں مسلمانوں کے مقابلے میں۔ یا وہ تلاش کرتے ہیں ان کے پاس عزت؟ تو بے شک عزت سب کی سب اللہ کے لیے ہے۔ اللہ نازل کر چکا ہے تم پر کتاب میں یہ حکم کہ جب تم سنو اللہ کی آیتوں کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو مت بیٹھو ان لوگوں کے ساتھ یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ ورنہ تم بھی انہی کی طرح ہو گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اکٹھا کرنے والا ہے سب منافقوں اور سب کافروں کو جہنم میں۔ وہ منافق جو انتظار کر رہے ہیں تمہارے لیے گردشوں کا۔ اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور کافروں کو کوئی جیت ہو جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم پر چھائے نہیں رہے اور ہم نے مسلمانوں سے تم کو بچایا نہیں؟ تو اللہ ہی فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن اور اللہ کافروں کو مومنوں پر کوئی راہ نہیں دے گا۔'' (النسآء: ۱۳۸ تا ۱۴۱)

Marfat.com

گزشتہ آیاتِ کریمہ میں جن لوگوں پر تنقید کی گئی اور جنہیں حقیقی ایمان لانے کی دعوت دی گئی پیش نظر آیتِ کریمہ نے واضح کر دیا کہ مراد اس سے منافقین ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ اللہ نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اس کے بعد ان کی علامتیں بیان فرمائی ہیں۔ ہم آج کسی کے بارے میں حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ منافق ہے۔ لیکن ان علامتوں کے ذکر نے منافقین کی پہچان آسان کر دی ہے۔ ہم کسی پر منافق ہونے کا فتویٰ نہ بھی دیں جب بھی مسلمان ایسے منافقین کو پہچان کر اپنی صفوں کو درست کر سکتے ہیں۔ اور اجتماعی پالیسیاں بناتے ہوئے اور قومی معاملات کا فیصلہ کرتے ہوئے ایسے لوگوں کے بارے میں ہوشیار اور چوکنا رہ سکتے ہیں۔ جب تک وہ مسلمانوں کے مشترکہ مطالبات کا ساتھ دیں تو انہیں ساتھ لیا جائے لیکن نہایت بیدار مغزی سے ان کی ایک ایک حرکت کا مطالعہ کیا جائے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسے ہوشیار منافق ساتھ چلتے چلتے مسلمانوں کی سادگی سے اس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں کہ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کیا ہاتھ کر گئے؟ اور کچھ نہیں تو مسلمانوں کے باہمی فیصلوں اور ان کے اندر کے احساسات سے باخبر ہو کر دشمن کو اپنے دفاعی اقدامات کرنے میں مدد بہم پہنچاتے ہیں۔

منافقین کی پہلی علامت

سب سے پہلی علامت یہ بیان فرمائی گئی کہ تم ایسے منافقین کو دیکھو گے جن کا رجحان اور جن کی دوستیاں مسلمانوں کے مقابلے میں کافروں یعنی مسلمانوں کے دشمنوں سے ہوتی ہیں۔ جب بھی انہیں موقع ملتا ہے یہ ان کی صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں' بہانے بہانے سے ان سے راہ و رسم پیدا کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمعصر منافقین زیادہ تر یہود سے تعلقات رکھنے اور بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ عبداللہ بن ابیؑ نے تو ایک دفعہ صاف کہہ بھی دیا کہ ہم یہود سے تعلقات توڑ کر کسی مصیبت کا شکار نہیں ہونا چاہتے۔ کیونکہ ابھی یہ بات واضح نہیں ہے کہ حق و باطل کی اس کشمکش میں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ ممکن ہے مسلمانوں کو غلبہ مل جائے اور ممکن ہے یہود یا مشرکین ان پر غالب آ جائیں تو ہم صرف مسلمانوں کے ساتھ نتھی ہو کر اپنا مستقبل مخدوش نہیں بنانا چاہتے۔ بلکہ اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین بظاہر اللہ اور رسول پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن کافروں کی ایسی مجالس میں شریک ہوتے ہیں جہاں اللہ کی آیات کے خلاف بکواس کی جاتی ہے اور اللہ کے دین کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ اور یہ ان کے پاس صرف اس لیے جاتے ہیں کہ ان کے ساتھ راہ و رسم کو اپنے لیے عزت کی علامت سمجھتے ہیں۔ وہ چونکہ مدینہ اور اطرافِ مدینہ میں اپنی ایک حیثیت اور ایک اثر رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ اپنے آپ کو ان سے وابستہ رکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑے لوگوں کی پناہ لے رکھی ہے۔ عربی زبان میں ''عزۃ'' کا لفظ ذلت کے متضاد کے طور پر ہی استعمال نہیں ہوتا' بلکہ اس میں عزت کا مفہوم کسی شخص کو ایسی حیثیت کا مالک سمجھنا ہے جب کہ کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ منافقین یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں یہ تحفظ انہی کے ساتھ رہ کر حاصل ہو سکتا ہے۔ پروردگار فرماتے ہیں کہ اگر یہ واقعی مومن ہیں تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ عزت' دبدبہ اور غلبہ سراسر اللہ کی ذات کے لیے ہے۔ یہ دولت جسے بھی ملتی ہے اسی کی عطا سے ملتی ہے۔ اور مزید فرمایا کہ ہم اس سے پہلے سورہ الانعام کی آیت نمبر ۶۸ میں یہ حکم نازل کر چکے ہیں کہ ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی کا جذباتی رشتہ بھی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ جڑ جائے۔ اس کی حمیت و غیرت کبھی گوارا نہ کرے کہ کوئی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے دین سے متعلق نازیبا بات کہنے کی جرأت کر سکے۔ اور اگر کوئی ایسی حرکت کرے تو اگر طاقت میسر ہو تو کہنے والی زبان نہیں رہنی چاہیے۔ اور طاقت میسر نہ ہو تو پھر ایمانی غیرت و حمیت کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ

Marfat.com

ایسی مجلسوں میں شرکت کا تصور بھی نہ کیا جائے۔ اور اگر کبھی بھول کر ایسی کسی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہو ہی جائے تو یاد آنے پر فوراً اٹھ جائے۔ لیکن اس واضح حکم کے باوجود ان کا رویہ یہ تھا کہ یہ یہود یا دوسرے منافقین کی مجالس میں جاتے' وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے میں نامناسب باتیں کہی جاتیں اور مذاق اڑایا جاتا' لیکن ان کے سر پر جوں تک نہ رینگتی۔ اگر ان میں ایمان کی رتی بھی ہوتی تو یہ کبھی ایسی مجالس میں بیٹھنا گوارا نہ کرتے۔ لیکن ان کی ایسی مجالس میں شرکت اور پھر ایسی باتوں کا برداشت کرنا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی زبانوں پر ایمان کا اقرار ضرور موجود ہے' لیکن ان کے دلوں میں بالکل ایمان نہیں۔ اس لیے فرمایا کہ اگر تم یہ سب کچھ سن کر برداشت کرتے ہو تو پھر تم انہی میں سے ہو۔ جیسے وہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دشمن ہیں تم بھی دشمن ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں منافقین کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنے مومن اور مسلم ہونے کا دعویٰ صرف اس لیے کرتے ہیں تاکہ مسلمان معاشرے سے جو فوائد اٹھائے جا سکتے ہیں ان میں کمی نہ آنے پائے۔ ورنہ ان کا قلبی رشتہ اور ان کا دماغی رجحان چونکہ مفادات کے تابع ہے اس لیے وقت کی غالب قوت چاہے وہ اسلام اور مسلمانوں کی کیسی ہی بدترین دشمن کیوں نہ ہو یہ ان سے اپنا تعلق عزت اور فخر کی علامت سمجھتے ہیں۔ ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور ان کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہمیں آپ متعصب مسلمان نہ سمجھیں' اسلام سے ہمارا محض نام کا رشتہ ہے' ہماری دلچسپیاں اور وفاداریاں تو سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اسلام اور کفر کی کشمکش میں آپ دیکھیں گے کہ ہمارا وزن آپ کے پلڑے میں ہوگا۔ ہمیں آپ کا قرب عزیز ہے۔ اس کے لیے ہمیں مسلمانوں کو خون میں بھی نہلانا پڑے اور ان کی عزت وحرمت کا سودا کرنا پڑے تو ہمیں اس سے بھی دریغ نہیں ہے۔ غلامی کے زمانے میں بھی ہمارے جاگیر دار' ہمارے وڈیرے' حتیٰ کہ بعض علماء اور بعض گدی نشین بھی اسی نفاق کا شکار تھے۔ اور انہی کی وجہ سے انگریز تعداد کے اعتبار سے محدود ہونے کے باوجود دو سو سال تک حکومت کرتا رہا۔ ظفر علی خان نے اسی صورتِ حال سے آزردہ ہو کر کہا تھا:

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہِ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا
تمسخر کرنے والے دین سے ہی گر مہذب ہیں
تو ان تہذیب کے پتلوں سے مجھ جیسا گنوار اچھا

اور آج مسلمان جس صورتِ حال سے دوچار ہیں اس میں بھی ہمارے نام نہاد حکمران' ہمارا طبقۂ امراء' ہمارے سیاستدانوں کی اکثریت' ہمارے بعض علماء و مشائخ یہی کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی اتنی واضح تنقید اور تنبیہ کے بعد بھی ان مسلمان کہلانے والے منافقین پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

منافقین کی دوسری علامت

منافقین کی دوسری علامت یہ بیان فرمائی ہے کہ ان کی ہمدردیاں اور خیر خواہیاں مسلمانوں کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے اولیاءِ نعمت کے ساتھ ہوتی ہیں۔ یعنی اس قوت کے ساتھ جو علاقے کی غالب کافر قوت ہے۔ اور مسلمان جن کے ساتھ حق و باطل کی کشمکش میں مصروف ہیں۔ یہ ہمیشہ اس کے انتظار میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچے اور ہم مسلمانوں کے دشمن اور اپنے آقاؤں کے پاس جا کر انہیں یقین

Marfat.com

دلائیں کہ مسلمانوں کو جو شکست ہوئی ہے اور آپ کو فتح ہوئی ہے اس میں ہمارا بھی ایک کردار ہے؟ اگر ہم پیچھے رہ کر تمہارے لیے یہ کام نہ کرتے اور مسلمانوں سے تمہیں محفوظ نہ رکھتے تو یقیناً تمہارے لیے فتح حاصل کرنا مشکل ہوتا۔ اور اگر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوتی ہے تو مسلمانوں کے پاس آ کر مال غنیمت میں حصہ بٹانے کے لیے بار بار یقین دلاتے ہیں کہ ہم تو اس معرکے میں قدم قدم پر آپ کے معاون و مددگار رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ایسے منافقین اور کفار کو جہنم میں جمع کریں گے۔ اور اسی دن اللہ ان کے تمام کرتوتوں سے پردہ اٹھائے گا اور ہر دیکھنے والی نگاہ دیکھے گی کہ یہ لوگ حقیقت میں کس قدر مسلمانوں کے دشمن تھے۔

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَإِذَا قَامُوْٓا إِلَى
الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ
إِلَّا قَلِيْلًا ۙ ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى
هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾ يٰٓأَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ
أَتُرِيْدُوْنَ أَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ
فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ إِلَّا الَّذِيْنَ
تَابُوْا وَأَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَأَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَأُولٰٓئِكَ
مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ أَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا
يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾
لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۚ وَ
كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ إِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوْهُ أَوْ
تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ

Marfat.com

يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ
رُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ
اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ
حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ
اُجُوْرَهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ ع

عربی رکوع ۲۱ (بے شک منافقین اللہ سے چالبازی کرنا چاہتے ہیں حالانکہ چال وہ ان سے چل رہا ہے۔اور جب یہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کھڑے ہوتے ہیں کاہل بن کر محض لوگوں کو دکھانے کے لیے اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں کفر اور ایمان کے درمیان' نہ ادھر ہیں نہ ادھر۔اور جسے اللہ گمراہ کر دے تم ہرگز اس کے لیے کوئی راستہ نہیں پا سکتے ٥ اے ایمان والو! مومنوں کے مقابلے میں کافروں کو دوست نہ بناؤ۔کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو ٥ بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔اور تم ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔البتہ وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر لیا تو یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہیں اور اللہ ایمان والوں کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔کیا کرے گا اللہ تمہیں عذاب دے کر اگر تم شکر گزاری اختیار کرو اور ایمان لے آؤ۔اللہ تو بڑا قدردان اور سب کچھ جاننے والا ہے ٥ اللہ بدزبانی کو پسند نہیں کرتا مگر وہ شخص جس پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔اگر تم کوئی نیکی ظاہر کرو یا اسے پوشیدہ رکھو یا کسی برائی سے درگزر کرو تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور قدرت رکھنے والا ہے ٥ بے شک جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور چاہتے ہیں کہ فرق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی راہ نکالیں۔

Marfat.com

یہی لوگ درحقیقت پکے کافر ہیں۔اور ہم نے ان کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اوران میں سے کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے یہی لوگ ہیں عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں ان کا اجر دے گا۔اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے) (آیات ۱۴۲ تا ۱۵۲)

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ۙ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝

”بے شک منافقین اللہ سے چالبازی کرنا چاہتے ہیں حالانکہ چال وہ ان سے چل رہا ہے۔اور جب یہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کھڑے ہوتے ہیں کاہل بن کر محض لوگوں کو دکھانے کے لیے اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں کفر اور ایمان کے درمیان' نہ ادھر ہیں نہ ادھر۔اور جسے اللہ گمراہ کر دے تم ہرگز اس کے لیے کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔“ (النسآء:۱۴۲تا۱۴۳)

ربطِ کلام

سلسلۂ کلام منافقین سے متعلق ہے۔انہی کی علامتیں اور خصوصیات بیان کی جا رہی ہیں۔ان آیات کے نزول کے وقت مسلمان حق و باطل کی شدید کشمکش سے گزر رہے تھے۔مشرکین مکہ اڑوس پڑوس کے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرتے رہتے تھے اور یہود سے بھی ان کی مراسلت جاری رہتی تھی۔اور یہود اپنے طور پر بھی مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے۔وہ مختلف طریقوں سے اسلام کے راستے میں روڑے اٹکانے اور مسلمانوں کو پریشان کرنے کی سازشیں کرتے رہتے تھے۔ان سازشوں کا ایک اہم عنصر مسلمانوں کی صفوں میں منافقین کا وجود تھا جو یہود ہی سے آئے تھے یا یہود کے زیر اثر تھے۔حق و باطل کی یہ کشمکش چونکہ مسلح تصادم کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی اس لحاظ سے شدید ضرورت تھی کہ مسلمان اپنی صفوں میں چھپے ہوئے آستین کے سانپوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگاہ رہیں۔اس لیے منافقین کی شناخت کے لیے ان کی علامتوں اور صفات کو وقتاً فوقتاً بیان کیا جا رہا تھا' لیکن ساتھ ہی یہ کوشش بھی جاری تھی کہ وہ کمزور مسلمان جو یہود کے آلۂ کار نہیں' لیکن ابھی تک ان کے ایمان میں وہ استحکام پیدا نہیں ہو سکا جو حق و باطل کی کشمکش میں کام آنے والا سرمایہ ہے۔ان کے ایمان کی کمزوری کو دور کرنے کے لیے ان علامتوں کے ذریعے بالواسطہ انہیں سمجھایا جا رہا ہے کہ تمہارے اندر اگر یہ کمزوریاں باقی ہیں تو یہ نفاق کی علامتیں ہیں۔تمہیں پہلی فرصت میں ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہیے۔اور مسلمانوں میں ایک معتدبہ تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو منافقین کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔انہیں منافقین کی علامتوں کے ساتھ ساتھ منافقین کے عزائم کے بارے میں آگاہ کیا جا رہا ہے تاکہ وہ بھی منافقین کے بارے میں یکسو ہو جائیں۔

Marfat.com

منافقین کی جسارت

چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلی بات ان کے عزائم کے حوالہ سے ہی کہی جا رہی ہے کہ یہ منافق لوگ ایسے نہیں ہیں کہ جو سادگی میں دوسروں کے ہاتھوں میں استعمال ہو رہے ہوں۔ بلکہ ان کی جسارتوں کا عالم تو یہ ہے کہ یہ اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ چالبازی کر رہے ہیں۔ نہ جانے انہوں نے یہ کیسے گمان کر لیا ہے کہ اللہ کو ان کی خفیہ کاروائیوں کا علم نہیں ہوتا اور وہ ان کے سینے میں چھپے ہوئے رازوں سے واقف نہیں۔ اگر انہیں اس بات کا یقین ہوتا کہ اللہ تو ہر وقت' ہر حال میں ان کی ایک ایک بات سے آگاہ رہتا ہے تو پھر وہ اللہ کو دھوکا دینے کا تصور بھی کیسے کر سکتے تھے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب کسی شخص یا کسی گروہ کی آنکھوں پر دنیا کے مفادات اور ہوس اقتدار کی پٹی باندھ دی جاتی ہے تو وہ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتا۔ مسلمانوں میں طبقۂ امراء' سیاستدانوں اور ارباب حل وعقد کو دیکھ لیجئے' یہ تمام لوگ بفضلہ تعالیٰ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی ایک ایک حرکت اللہ کے سامنے ہے اور انہیں اس سے بھی انکار نہیں کہ قیامت آئے گی اور اللہ کے سامنے ایک ایک بات کا جواب دینا ہو گا۔ بایں ہمہ وہ سیاست کے کھیل اور ہوس زر میں مبتلا ہو کر اور اقتدار کی مصلحتوں کی خاطر جو کچھ کر گزرتے ہیں اس کی کسی مسلمان سے توقع نہیں ہو سکتی۔ ان کے اس رویے کو دیکھ کر اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ ہم اپنے اعمال کے پس پردہ جو محرکات رکھتے ہیں' اللہ کو ان کی کیا خبر؟ اور یہی بے خبری کا تصور انہیں ہر غلط کام کرنے پر اکساتا اور ہمت دیتا ہے' کچھ ایسا ہی حال منافقین کا بھی تھا کہ وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کر رہے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

خدع اللہ کا مفہوم

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ اللہ کو کیا دھوکا دیں گے اور اس کے ساتھ کیا چال بازی کریں گے' البتہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ چال چل رہا ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب ''خدع'' کے لفظ کا انتساب اللہ کی طرف ہو تو اس کا معنی دھوکا دینا نہیں ہوتا بلکہ اس کا لازمی معنی مراد ہوتا ہے۔ لازمی معنی سے مراد یہ ہے کہ اللہ ان سے دھوکا نہیں کرتا بلکہ ان کے دھوکے کی سزا دیتا ہے کہ وہ ان کی ایک ایک بات کو محفوظ کر رہا ہے' ان کا نامۂ عمل ان کی ان حرکتوں سے لبریز ہو رہا ہے۔ وہ قیامت کے دن اپنے اس نامۂ عمل سمیت اللہ کی عدالت میں حاضر ہوں گے تو تب انہیں ایک ایک کرتوت کی سزا دی جائے گی۔ اور انہیں اپنے ایک ایک عمل کا بدلہ ملے گا۔ اور دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ تو اپنی تدبیروں اور حرکتوں سے اللہ کے ساتھ چالبازی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں' لیکن اللہ کی چال یہ ہے کہ وہ ان کی ڈور ڈھیلی چھوڑتا جا رہا ہے۔ وہ جیسے جیسے اپنے برے ارادوں کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں اللہ ان کے لیے راستے کھولتا چلا جا رہا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے ارادوں میں کامیاب ہو رہے ہیں' حالانکہ وہ اس انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں جو جہنم کی صورت میں ان کے انتظار میں ہے۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ مچھلی کا شکاری کنڈی کی نوک پر گوشت کا ٹکڑا لگا کنڈی پانی میں پھینکتا ہے۔ مچھلی گوشت کھانے کے لیے لپکتی ہے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ میری ضیافت کی گئی ہے۔ چنانچہ جیسے ہی کنڈی کو منہ مارتی ہے شکاری ڈور ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ مجھے کھلایا جا رہا ہے۔ حالانکہ شکاری یہ چاہتا ہے کہ کانٹا اچھی طرح اس کے حلق میں اتر جائے تو پھر میں ڈور کھینچوں۔ چنانچہ جب یہ کانٹا اس کے حلق میں اتر جاتا ہے تو شکاری ڈور کھینچ لیتا ہے۔ لیکن مچھلی آخر وقت تک یہی سمجھتی رہتی ہے کہ یہ میرے کھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔

Marfat.com

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمہ پہ شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

اللہ تعالیٰ بھی ان کی رسی دراز کرتا جاتا ہے تاکہ کانٹا اچھی طرح ان کے حلق میں اتر جائے اور جب وقت آئے گا تو وہ رسی کھینچ لے گا۔ پھر انہیں تڑپنے کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔ یہ ہے وہ اللہ کی چال جسے منافقین اور اہلِ دنیا سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہتے ہیں۔

نماز اسلام کی علامت ہے

اپنے نفاق کو چھپانے کے لیے منافقین ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد جو سب سے پہلا فرض ایک مسلمان کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ نماز ہے اور جو علامت بنا رہتا ہے اس بات کی کہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والا اپنے دعوے میں سچا ہے یا جھوٹا؟ کیا وہ واقعی اللہ کا وفادار ہے یا محض دکھاوے کے لیے دعویٰ کر رہا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اذان سننے کے بعد کسی شخص کا گھر میں بیٹھ رہنا اور بغیر کسی عذرِ شرعی کے جماعت میں شامل نہ ہونا ایک ایسا گناہ تھا جس کا تصور بھی مسلمانوں کے لیے مشکل تھا۔ چنانچہ جب وہ دیکھتے کہ کوئی شخص جماعت میں مسلسل شریک نہیں ہوتا تو انہیں خیال ہوتا کہ وہ بیمار ہوگا۔ چنانچہ وہ عیادت کے لیے اس کے گھر کا رخ کرتے۔ لیکن اگر انہیں محسوس ہونے لگتا کہ غیر حاضر ہونے والا شخص بغیر کسی عذر کے غیر حاضر ہوتا ہے تو مسلمانوں کو اس کے نفاق کا یقین ہو جاتا تھا۔ یہ نماز تھی جو مخلص اور غیر مخلص میں فرق کرتی تھی۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بارے میں فرمایا ''الصلوٰة فارق بين الحق و الباطل'' (نماز حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے) تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ صدیوں میں مسلمانوں میں بہت سی کمزوریاں پیدا ہوئیں، ہر طرح کے عیوب ان میں پیدا ہو گئے، لیکن مسلمان ملکوں میں استعمار آنے سے پہلے کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمان بے نماز بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی مسلمان ماں بے نماز بچہ نہیں جنتی تھی۔ مسلمان گھروں میں اور مسلمان آبادیوں میں بے نماز آدمی پنپ نہیں سکتا تھا۔ یہ ایک ایسا عیب تھا جو مسلمان کو نکو بنا دیتا تھا۔ لیکن اس بات پر جتنا بھی صدمے کا اظہار کیا جائے کم ہے کہ وہ بدعملی یعنی ترکِ نماز جس کے ارتکاب کا کسی عام مسلمان سے بھی تصور نہیں ہو سکتا تھا آج مسلمانوں کے رہنما اور سیاسی لیڈر کھلم کھلا ترکِ نماز میں مبتلا ہیں۔ اور وہ اس کو محسوس ہی نہیں کرتے کہ نماز کی پابندی بھی کوئی ضروری چیز ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان نہ صرف انہیں برداشت کرتے ہیں بلکہ انہیں اپنا رہنما بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں منافقین نہ چاہتے ہوئے بھی نماز پڑھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے۔ البتہ مخلص مسلمانوں کی نمازوں اور ان کی نمازوں میں فرق یہ تھا کہ وہ خوش دلی اور آمادگی سے نماز کے لیے نہیں آتے تھے، بلکہ وہ اس طرح آتے جیسے خود نہیں آ رہے بلکہ انہیں کوئی کھینچ کے لا رہا ہے۔ وہ نماز کے لیے اٹھتے تو کاہل بن کر، ڈھیلے ڈھالے الکساتے ہوئے، جیسے آدمی کسی ایسے کام کو کرتا ہے جسے وہ کرنا چاہتا نہ ہو۔ عین وقت پر مسجد میں پہنچتے، جماعت میں شامل ہوتے اور جیسے ہی جماعت ختم ہوتی جوتے اٹھا کر باہر نکل آتے۔ نماز میں خاموشی سے امام کے پیچھے کھڑے رہتے لیکن نہ وہ نماز سے پہلے پہنچتے تاکہ کوئی تسبیحات کر سکیں اور نہ بعد میں ٹھہرتے تاکہ اللہ کی یاد میں کچھ وقت گزاریں۔ مجبوراً اگر اللہ کو یاد کرتے بھی تو بہت معمولی سا۔ اللہ اپنی پناہ میں رکھے آج مسلمانوں کا طرزِ عمل منافقین سے بھی بدتر ہے۔ وہ تو نماز کے لیے آتے تھے، آج مسلمانوں کی اکثریت بے نماز

Marfat.com

ہے۔ اور جو مسجدوں میں آتے بھی ہیں ضروری نہیں کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں اور اگر جماعت میں شامل ہوں تو امام صاحب کے سلام پھیرتے ہی باہر کا رخ کرتے ہیں اور ہر شخص دوسرے سے آگے نکلنے کی فکر میں ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث مبارکہ میں اس رویے کو ''نفاق'' فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے ''المؤمن فی المسجد کالسمک فی الماء والمنافق فی المسجد کالطیر فی القفس'' (مومن مسجد میں ایسا ہوتا ہے جیسے مچھلی پانی میں اور منافق مسجد میں ایسے ہوتا ہے جیسے پرندہ پنجرے میں) مچھلی کبھی پانی سے نکلنا پسند نہیں کرتی۔ وہ جانتی ہے کہ باہر موت ہے۔ اور منافق مسجد میں ایسے ہوتا ہے جیسے پرندہ پنجرے پھڑ پھڑاتا ہے اور موقعے کے انتظار میں ہوتا ہے کہ کہیں دروازہ کھلا رہ جائے تو میں نکل بھاگوں۔

منافق کی نماز محض دکھاوا ہے

اس کے بعد منافقین کی نماز پڑھنے کی اصل وجہ بھی بیان فرمادی گئی کہ وہ نماز محض مسلمانوں کو دکھانے کے لیے پڑھتے ہیں۔ مقصود اللہ کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان انہیں دیکھیں اور حاضری لگادیں تاکہ انہیں اطمینان ہو جائے کہ ہم مسلمان ہیں منافق نہیں۔ آگے ان کی بے بسی کی تصویر کھینچی گئی ہے کہ اس رویے نے انہیں کس قدر اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے کہ اسلام اور کفر کے درمیان ڈانواں ڈول اور ہچکولے کھاتے پھر رہے ہیں۔ نہ ادھر کے ہیں، نہ ادھر کے۔ کبھی مسلمانوں میں آکے یقین دلاتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اور کبھی کافروں کو جاکے اطمینان دلاتے ہیں کہ ہماری ساری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔

سنت اللہ

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی کی موجودگی اور صحابہ کا ہر وقت کا ساتھ ان بدنصیبوں کو اسلام کے بارے میں مطمئن کیوں نہیں کر دیتا؟ اور یہ اطمینان کے ساتھ ایک راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے؟ آیت کے آخر میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ جو شخص سوچ سمجھ کر اپنی مرضی اور ارادے کے ساتھ ایک راستے پر چلنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ زبردستی اسے اپنی مرضی پر نہیں چلاتا۔ اس نے اپنے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں اتار کر حق کا ایک ایک گوشہ واضح کر دیا ہے۔ اور خیر و شر کا ایک ایک پہلو واضح کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی جو آدمی خیر اور اسلام سے منہ پھیر کر باطل کے راستے پر چلنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ زبردستی اسلام کے راستے پر کبھی نہیں ڈالتا۔ کیونکہ ہر شخص کا امتحان اس آزادی اور اختیار میں ہے جو اللہ تعالیٰ نے خیر و شر کے فیصلے میں اسے عطا کر رکھا ہے اس لیے نہ تو وہ کسی کو زبردستی مسلمان بناتا ہے اور نہ زبردستی کافر بناتا ہے۔ اور جب کوئی شخص اللہ سے کفر اور انحراف کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور پیغمبر کی دعوت اور کتاب کا اعجاز بھی اسے اپیل نہیں کرتا اور وہ اپنے راستے پر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے تو پھر ایک ایسا وقت آتا ہے جب اللہ تعالیٰ ہدایت سے اس کی محرومی کا فیصلہ فرما دیتے ہیں۔ اس فیصلے کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ اب اس کی گمراہی جسے اس نے خود اختیار کیا تھا اس کے اپنے اختیار میں نہیں رہی بلکہ اللہ کا فیصلہ بن گئی ہے۔ تو اللہ کے فیصلے کو نہ تو وہ خود بدل سکتا ہے نہ کوئی اور بدل سکتا ہے۔ تو یہاں اسی سنت اللہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے کرتوتوں سے اپنے آپ کو اللہ کے فیصلے کے حوالے کر دیا ہے اس لیے اب ان کے لیے ہدایت کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔

Marfat.com

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِينَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ اَتُرِيدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِينًا ○

''اے ایمان والو! مومنوں کے مقابلے میں کافروں کو دوست نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو۔'' (النسآء:۱۴۴)

دوست نہ بنانے کا مفہوم

اولیاء ولی کی جمع ہے۔ ولی کا معنی ہے ''دوست' ہمراز' مددگار''۔ قرآنِ کریم میں متعدد مواقع پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔ اور اس آیت کریمہ میں بھی شدت کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت شاید آگے چل کر کسی اور جگہ آئے اس وقت صرف دو باتیں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں کو کبھی بھی غیر مسلموں کے ساتھ ایسا تعلق پیدا نہیں کرنا چاہئے جس کو ''بطانة'' کہا جاتا ہے۔ یعنی مسلمان حکمران کافروں کے اتنے قریب ہو جائیں کہ اپنے راز ان تک پہنچانے لگیں۔ اور اپنی کمزوریاں کھول کر ان کے سامنے رکھ دیں اور اپنے ملک کے بعض ایسے گوشے جنہیں پردۂ حجاب میں رہنا چاہئے وہ ان کی فورسز کے سامنے کھول دیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ جب کبھی اختلافات پیدا ہوں تو دشمن ان اسرار و رموز سے واقفیت کی وجہ سے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچانا چاہے پہنچائے۔ اور مسلمان چونکہ اپنی کمزوریاں ان کے سامنے کھول چکے ہیں اس لیے اس کا ازالہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

دوسری بات یہ کہ عام معمول کے تعلقات غیر مسلموں سے بنا لینے میں کوئی حرج نہیں۔ دنیا کا نظام اسی طرح چلتا ہے کہ ملک ملک سے حکومتیں حکومتوں سے مختلف قسم کے تعلقات رکھتی ہیں۔ اس لیے کہ کوئی ملک بھی اپنی تمام ضرورتوں میں خود کفیل نہیں ہوتا۔ لین دین کا سلسلہ ملکوں میں بھی جاری رہتا ہے اور اب تو حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں کہ پوری دنیا سمٹ کر ایک گاؤں بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن ایسے تعلقات جس کی زد مسلمانوں پر پڑتی ہو اور کافر ان تعلقات کی وجہ سے مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کر سکتا ہو اسطرح کے تعلقات رکھنے کی ہرگز اجازت نہیں۔ بقاءِ باہمی کی پالیسی ایک حکمت اور ایک مصلحت ہے۔ لیکن اس کا نقصان کسی دوسرے مسلمان ملک یا مسلمان رعایا کو اگر پہنچنے کا اندیشہ بھی پیدا ہو جائے تو ایسے تعلقات ناجائز ہو جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے بالمقابل کفار سے دوستی دلیلِ کفر ہے

اس آیتِ کریمہ میں اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ تم مسلمانوں کے خلاف کافروں کو دوست نہ بناؤ۔ وہ چونکہ آج کل مسلمانوں کو ہر طرح سے نقصان پہنچانے کی تدبیریں کر رہے ہیں اور تم ایک طرح سے حالت جنگ میں ہو۔ ایسی حالت میں تمہارا ان سے تعلق صریحاً کفر کی حمایت اور اسلام سے دشمنی ہے۔ اور یہ وہ جرم ہے جو کبھی قابلِ معافی نہیں ہوتا۔ بے عملی یا بدعملی' گوارا ہو سکتی ہے لیکن اسلام کے مفادات کو نقصان پہنچانے کے لیے کسی کے ہاتھ میں کھیلنا یہ نرم سے نرم الفاظ میں غداری ہے۔ اسے تو کبھی کوئی ملک یا کوئی قوم برداشت نہیں کرتی۔ اگر تم نے یہ رویہ نہ بدلا اور اپنے تعلقات تم نے یہود سے نہ توڑے اور اپنی دلی ہمدردیاں تم نے مسلمانوں سے وابستہ نہ کیں تو یہ ایک ایسا جرم ہے جس کے نتیجے میں تم پروردگار کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو گے کہ وہ تمہاری ہدایت سے محرومی کا فیصلہ کر دے اور یا تمہیں اپنے عذاب کا نشانہ بنا دے۔

Marfat.com

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ۙ o
اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِیْنَهُمْ لِلّٰهِ
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ وَسَوْفَ یُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا o
مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِیْمًا o

''بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔اور تم ہر گز ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔البتہ وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کرلی اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑلیا اور اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کرلیا تو یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہیں اور اللہ ایمان والوں کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔کیا کرے گا اللہ تمہیں عذاب دے کر اگر تم شکر گزاری اختیار کرو اور ایمان لے آؤ۔اللہ تو بڑا قدردان اور سب کچھ جاننے والا ہے۔'' (النسآء:۱۴۵تا۱۴۷)

''الدَّرَک'' اور ''الدَّرْک'' دونوں لغتیں ہیں۔ بلندی کی طرف جو یکے بعد دیگرے درجے ہوتے ہیں انہیں اہل عرب درجات کہتے ہیں اور پستی کی طرف یکے بعد دیگرے جو درجے ہوتے ہیں انہیں ''دَرَکات'' کہتے ہیں۔

درک کا معنی

درک کے معنی ''اقصی قعرِ الشیئ'' یعنی کسی شے کا سب سے نچلا حصہ۔اور اسفل نے اس میں مزید تاکید پیدا کردی۔جہنم کے پستی کی طرف مختلف طبقات کے نام یہ ہیں (۱)......جہنم۔(۲)......لظی۔(۳)......حطمہ۔(۴)......سعیر۔(۵)......سقر۔(۶)......جحیم۔(۷) ہاویہ۔یہ سب سے نچلا درجہ ہے جو منافقین کا ٹھکانہ ہے۔

منافقین کا انجام

معلوم ہوتا ہے یہ منافقین کو آخری تنبیہ ہے کہ تم نہ جانے کیا سمجھتے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نفاق اللہ کے یہاں تمام جرائم میں سے بدترین جرم ہے۔اس کا ارتکاب کرنے والا کافروں سے بھی زیادہ سخت عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔جہنم کا سب سے نچلا درجہ جس سے خود جہنم بھی پناہ مانگتا ہے اس درجے میں انہیں رکھا جائے گا۔انہوں نے اگرچہ کلمہ پڑھا' اللہ اور رسول کا اقرار کیا' مسلمانوں کے ساتھ بظاہر نمازیں بھی پڑھیں' لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کے ساتھ ان کا یہ ظاہری تعلق نہ صرف یہ کہ کام نہیں آئے گا بلکہ بدترین جرم شمار ہوگا اور ان سے یہ کہا جائے گا کہ تم نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر بظاہر مسلمان بن کر مارِ آستین کی طرح مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔اللہ کے رسول کو پس پردہ اذیتیں پہنچائیں۔شمع اسلام کو بجھانے اور کفر کو غالب و منصور کرنے میں تمام طاقتیں صرف کرڈالیں۔اس لیے تمہارا انجام بھی سب سے خطرناک ہوگا۔اور تم ایک ایسی بے بسی کی کیفیت میں مبتلا کیے جاؤ گے جس میں تمہارا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

انسانوں کے جس گروہ کے اس طرح کے جرائم ہوں ان کے لیے معافی کا ہر دروازہ بند ہوجاتا ہے۔لیکن اللہ کے کرم اور اس رحمت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ وہ ایسے بڑے مجرموں کو بھی مایوس نہیں کرنا چاہتا۔بلکہ فرمایا کہ ہم تمہیں پھر ایک موقع دینا چاہتے ہیں کہ تم اپنی حرکتوں سے توبہ کرلو' اپنے گناہوں کی اللہ سے گڑگڑا کر معافی مانگو۔اور اس توبہ کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اپنی ایک ایک بدعملی کی اصلا

Marfat.com

کرو۔ اور اللہ کی رسی یعنی اس کے دین کو مضبوطی سے تھام لو۔ اور اللہ اور اس کے رسول سے مخلصانہ اطاعت کا رشتہ قائم کرو۔ اگر تم نے اس طرح اپنے آپ کو پوری طرح بدل دیا تو تمہارے گزشتہ کرتوتوں کا تم سے حساب نہیں لیا جائے گا۔ تم نے جو بڑے بڑے نقصانات پہنچائے ہیں ان کا انتقام نہیں لیا جائے گا' بلکہ تمہارے تمام جرائم کو عفو و درگزر سے مٹا دیا جائے گا اور تمہیں ان لوگوں کے ساتھ کھڑے ہونے کا موقع ملے گا جن میں ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین جیسے فرشتہ صفت مجاہد اور ایثار پیشہ مخلصین موجود ہیں۔ وہ برسوں کی قربانیوں کے بعد جہاں کھڑے ہیں تم توبہ کے بعد وہیں ان کے ساتھ کھڑے ہو گے۔ اور جب اللہ قیامت کے دن انہیں بے پناہ اجر سے نوازے گا تو اس اجر عظیم سے تم بھی نوازے جاؤ گے۔ اور آخری آیت میں منافقین کی طرف التفات فرمایا اور رحمت کی انتہا کر دی اور نہایت پیار سے فرمایا کہ اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟ وہ جذبۂ انتقام سے پاک ہے۔ اس لیے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے کسی کو عذاب نہیں دیتا اور نہ کوئی اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اس لیے کسی کو مٹا کر اسے سکون نہیں ملتا کہ میں نے اپنی برابری کرنے والے کو مٹا دیا ہے۔ وہ ان تمام جذبات اور تاثرات سے پاک ہے۔ تمہاری بندگی کے تقاضے اور تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ تم شکر بجا لاؤ۔ اور ایمان سے اس شکر کو مستحکم کرو۔ اگر تم یہ دونوں صفات اپنے اندر پیدا کر لو تو تم اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق ہو جاؤ گے۔ کیونکہ وہ بہت شکر قبول کرنے والا اور ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝
اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۝

''اللہ بدزبانی کو پسند نہیں کرتا مگر وہ شخص جس پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اگر تم کوئی نیکی ظاہر کر دیا اسے پوشیدہ رکھو یا کسی برائی سے درگزر کرو تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔'' (النسآء: ۱۴۸ تا ۱۴۹)

ان آیتوں کی تشریح میں صاحب تدبر قرآن نے جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے۔ اس لیے ہم اسی کو نقل کر رہے ہیں:

تعینِ اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار صرف مظلوم کے لیے جائز ہے

''یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی ایک تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ آیت ۸۶ میں گزر چکی ہے۔ جس طرح وہاں منافقین سے جب اعراض کا حکم ہوا تو ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ جو تمہیں سلام کرے تم اس کے سلام کا جواب دو اور مقصود اس سے یہ تھا کہ مبادا پرجوش مسلمان ان لوگوں سے سلام کلام ہی بند کر دیں جن پر ان کو منافقت کا شبہ ہو جائے۔ اسی طرح یہاں اوپر والی آیات میں منافقین کے لیے چونکہ ''فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ'' تک کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس سے اس بات کا اندیشہ تھا کہ مسلمان علانیہ سخت الفاظ میں منافقین کی برائیوں کا اظہار و اعلان شروع کر دیں گے۔ اس وجہ سے یہ ہدایت کر دی گئی کہ تعینِ اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار صرف مظلوم کے لیے جائز ہے' دوسروں کے لیے اللہ اس کو پسند نہیں فرماتا۔

یہ بات چونکہ جماعتی زندگی کے نہایت اہم مسائل میں سے ہے' اس وجہ سے اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

Marfat.com

جماعتی زندگی کی ایک اہم ہدایت

جماعتی زندگی میں کسی گروہ کے اندر اگر کوئی ایسی برائی جڑ پکڑ رہی ہو یا پکڑ چکی ہو جو پوری جماعت کے لیے خطرہ بن سکتی ہو تو اس کا تدارک ضروری ہوتا ہے اور اس تدارک کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس برائی کی قباحت و شناعت اس کے نتائج بد اور اس کے مرتکبین کے انجام کو اچھی طرح واضح کر دیا جائے تاکہ جماعت کے افراد اس کے شر سے محفوظ رہیں' لیکن ساتھ ہی اس امر کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ جماعت کے عام افراد عام صیغہ سے کہی ہوئی بات کو مجرد اپنے اندازے' قیاس اور گمان کی بنا پر معین اشخاص پر منطبق کرنا نہ شروع کر دیں۔ اس سے نہ صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ بہت سے بے گناہ اشخاص تہمتوں کے ہدف بن جائیں گے بلکہ جماعت میں انتشار و فساد پیدا ہو جانے کا خطرہ بھی ہوگا۔ یہاں منافقین سے متعلق جو باتیں بیان ہوئی ہیں' دیکھ لیجئے' بالکل عام صیغے سے بیان ہوئی ہیں اور مقصود یہ ہے کہ جو لوگ یہ حرکتیں کر رہے ہیں وہ اگر اپنی اصلاح کرنا چاہیں تو اصلاح کر لیں اور اگر وہ اصلاح نہ کریں تو کم از کم مسلمان اپنے آپ کو ان فتنوں سے محفوظ رکھیں۔ اس حد تک یہ چیز نہ صرف یہ کہ ٹھیک ہے بلکہ جماعتی بقا کے لیے ناگزیر ہے' لیکن اگر یہی چیز یہ شکل اختیار کر لے کہ اس کو دلیل بنا کر عام افراد تعین کے ساتھ ایک دوسرے کو ہدف مطاعن بنانا شروع کر دیں کہ تو منافق ہے' تو کافر ہو گیا اور فلاں ''فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ'' کا سزاوار ہے۔ تو پوری جماعت میں ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔ اس فتنے کی سدباب کے لیے یہ ہدایت فرما دی گئی کہ تعین اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار و اعلان صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جس پر شخصاً ظلم ہوا ہے۔ اس صورت میں ظلم' ظالم اور مظلوم تینوں متعین ہوں گے اور قانون اس کا مداوا کر سکے گا۔ جب تک یہ شکل نہ ہو بات عام صیغے ہی سے کہنی چاہئے' جس طرح قرآن نے کہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں بھی جب اس طرح کی کوئی برائی آتی تو آپ ہمیشہ عام صیغہ ہی سے اس پر لوگوں کو ملامت فرماتے۔ آپ کا عام انداز کلام یہ ہوتا ''مَا بَالُ قَوْمٍ یَفْعَلُوْنَ کَذَا وَ کَذَا'' (ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو اس طرح کے کام کرتے ہیں) البتہ جب کوئی متعین شخص کسی متعین جرم کے ساتھ سامنے آتا تو اس پر قانون کے مطابق گرفت فرماتے۔

صفاتِ الٰہی کے ذکر سے مقصود ان کا لازم ہے

''وَ کَانَ اللّٰہُ سَمِیْعًا عَلِیْمًا'' بطور تنبیہ ہے۔ یعنی کوئی شخص اگر اس ہدایت کے خلاف روش اختیار کرے گا تو وہ یاد رکھے کہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ہم ایک سے زیادہ مقامات پر یہ اصول بیان کر چکے ہیں کہ اس طرح جب صفاتِ الٰہی کا حوالہ آتا ہے تو مقصود اس سے ان کا لازم ہوتا ہے۔ یعنی جب خدا سب کچھ سنتا اور جانتا ہے تو اس پر وہ گرفت بھی لازماً فرمائے گا۔''

پسندیدہ روش کا بیان

اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا الخ ''خدا کو جو روش ناپسند ہے اس کو بیان فرمانے کے بعد یہ پسندیدہ روش کا بیان ہے۔ فرمایا کہ پسندیدہ روش یہ ہے کہ آدمی اچھی بات کا اظہار کرے' اچھا جذبہ دل میں پرورش کرے اور دوسرے کی برائیوں سے درگزر کرے۔ اس کے بعد اپنی دو صفتوں ''عفو اور قدیر'' کا حوالہ دیا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ خدا

Marfat.com

ہر طرح کی قدرت رکھنے کے باوجود لوگوں کی برائیوں سے درگزر فرماتا ہے۔ اس وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ اس کی ان صفات کا عکس اس کے بندوں کے اندر بھی پایا جائے۔ آدمی طاقت رکھتا ہو کہ وہ کسی کو ترکی بہ ترکی جواب دے سکے' لیکن اس کے باوجود وہ درگزر کر جائے تو یہ عفو ہے۔'' (ماخوذ از: تدبر قرآن)

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ۝ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ یُؤْتِیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝

''بے شک جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور چاہتے ہیں کہ فرق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی راہ نکالیں۔ یہی لوگ درحقیقت پکے کافر ہیں۔ اور ہم نے ان کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے یہی لوگ ہیں عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں ان کا اجر دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔'' (النسآء: ۱۵۰ تا ۱۵۲)

کفر کی اقسام

اس سے پہلے مشرکین اور منافقین پر تنقید گزر چکی ہے۔ مشرکین عرب نے خود اپنا نام مشرک اختیار کر کے اپنے عقائد کے بارے میں کوئی ابہام نہیں رہنے دیا۔ اور منافقین پر ایک طویل تنقید اور ان کی مختلف صفات اور علامتوں کا ذکر بھی ہم نے پڑھا ہے۔ جس کے بعد ان کی پہچان اور ان کے تعین میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ البتہ کفر کی کوئی ایک شکل نہیں۔ مختلف قسم کے عقائد کے حاملین کو کافر کہا گیا۔ اس لیے بعض دفعہ کافر کی پہچان میں غلطی ہو جاتی ہے۔ اور اہل کتاب تو خود اپنے بارے میں کفر کے حوالے سے غلط فہمیاں پیدا کرتے تھے۔ سورۂ بقرہ میں دوسرے رکوع کی پہلی آیت میں ''وَمِنَ النَّاسِ'' کے لفظ سے انہیں کا دعویٰ ذکر کیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور آخرت کو مانتے ہیں تو پھر ہم مومن نہیں تو اور کیا ہیں؟ لیکن قرآنِ کریم نے انہیں کافر قرار دیا۔ خود مسلمانوں کے اندر بھی معلوم ہوتا ہے یہ غلط فہمی پائی جاتی تھی کہ اہل کتاب پیغمبروں کو اور کتابوں کو مانتے ہیں' آخرت کو تسلیم کرتے ہیں تو اپنی ساری غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود دوسرے کافروں جیسے تو نہیں ہو سکتے۔ یقیناً ان میں اور دوسرے کفار میں فرق ہے اور ہمیں اس فرق کا لحاظ کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے کفر کی ہر تقسیم کو ذکر فرمانے کے بعد اس کے حاملین کو کافر قرار دیا۔ فرمایا کچھ کافر تو ایسے ہیں جو نہ اللہ کو مانتے ہیں نہ اس کے رسولوں کو مانتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے کافر ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔ وہ کیمونسٹوں اور ملحدین کی طرح کائنات کی عجیب وغریب توجیہہ

Marfat.com

کرتے ہوں گے لیکن ہمیں اس وقت اس سے سروکار نہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر تو ایمان رکھتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے، لیکن اس کے رسولوں کو نہیں مانتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ نے اس کائنات کو پیدا کیا، بے شمار مخلوقات پیدا فرمائیں۔ انہی میں سے انسان کو بڑی عظمت کے ساتھ پیدا فرمایا اور اسے جوہرِ عقل سے نوازا۔ کائنات کی ہر مخلوق کو زندگی گزارنے کے لیے حواس کی رہنمائی بخشی اور انسان کو عقل اور ادراک کی قوت دے کر ان سب پر بالادست بنا دیا۔ اب انسان اس بات کا مجاز ہے کہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر جیسے چاہے زندگی گزارے۔ وہ اپنے لیے جیسے چاہے آئین و قانون بنائے، زندگی کے مختلف شعبوں کو اجتماعی دانش کے مطابق اتفاق کے ساتھ چلانے کی کوشش کرے۔ رسالت اور نبوت کی رہنمائی کی انسانوں کو کوئی ضرورت نہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو ماننے کے ساتھ ساتھ نبوت و رسالت کو بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم جس نبی کو چاہیں گے مانیں گے اور جس کو نہیں چاہیں گے نہیں مانیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کے اس حق کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ انسانوں کی اصلاح کے لیے رسول بھیجے، لیکن اسے علی الاطلاق تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں رسولوں پر ایمان ہم اپنی شرائط پر لائیں گے، خدا کی شرائط پر نہیں۔ ہم ایمان کی شرائط بھی اپنی صوابدید پر مقرر کریں گے۔ اس طرح سے وہ اسلام اور کفر کے درمیان ایک راستہ نکالنا چاہتے ہیں کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں اور رسالت و نبوت کو بھی تسلیم کرتے ہیں اس لیے کہ یہ اسلام کا تقاضا ہے۔ لیکن کس نبی کو ماننا ہے اور کسے نہیں ماننا اس کا فیصلہ ہم اپنی صوابدید سے کریں گے۔ اس طرح سے وہ کفر اور اسلام کو اکٹھا کرنا چاہتے تھے۔ اسلام کا تقاضا تو بالکل واضح اور سادہ سا ہے۔ کہ تم اگر مسلم ہو تو اللہ کی ہر بات کو مانو اور کافر ہو تو پھر تم اپنی مرضی میں آزاد ہو۔ مسلم ہونے کا دعویٰ کرنے کے بعد اللہ کے کسی حکم کے مقابلے میں چون و چرا کی گنجائش نہیں رہتی۔ وہ جب بھی اور جس کو بھی نبی یا رسول بنا کے بھیجے، اس پر ایمان لانا اللہ پر ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ اور اس میں ذرا سی حیل و حجت ایمان کو کفر سے بدل دیتی ہے۔ ان اہل کتاب نے موسیٰ علیہ السلام کو مانا اور عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے سے انکار کر دیا۔ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو تسلیم کیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد یہود و نصاریٰ دونوں نے آپ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ اس طرح سے دونوں کافر ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو پیغمبر بھی اللہ کی طرف سے آیا اس پر ایمان لانا ایمان کا تقاضا تھا۔ اور اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ان پر بھی ایمان لانا ایمان کا تقاضا ہے۔ جو شخص بھی ایمان کے کسی تقاضے سے بھی انکار کرتا ہے وہ بالکل اسی طرح کافر ہے جیسے اللہ کا انکار کرنے والا کافر ہے۔ کیونکہ اگر وہ ایمان اپنی شرائط پر لانا چاہتا ہے اور ایمان کے لیے پیغمبر کا انتخاب بھی خود کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں بندہ بھی ہے اور خدا بھی۔ کیونکہ جب وہ ایمان لاتا ہے تو بندہ بن جاتا ہے اور جب وہ اللہ کے کسی رسول کا انکار کرنا اور پھر ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا اپنا حق سمجھتا ہے تو وہ اللہ کی خدائی میں اپنے آپ کو شریک کرتا ہے۔ اور یہ جرم چونکہ اہل کتاب کر رہے ہیں اس لیے فرمایا کہ یہ لوگ پکے اور صریح کافر ہیں۔ اس لیے کسی کو ان کے کفر میں شبہ نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ کے یہاں اجر و ثواب اور نجات کے مستحق صرف وہ لوگ ہوں گے جو اللہ اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لائے اور ان کے درمیان انہوں نے کوئی تفریق نہیں کی۔ انہوں نے مکمل طور پر اپنے آپ کو مسلم ثابت کیا۔ اور ایمان کو اپنی شرائط سے وابستہ نہیں کیا بلکہ ہر حال میں اللہ کی مخلصانہ اطاعت کی۔

Marfat.com

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ

اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ
مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ
ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ
ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿١٥٣﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ
بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ
لَا تَعْدُوْا فِى السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿١٥٤﴾ فَبِمَا
نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ
حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ
فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۪﴿١٥٥﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا
عَظِيْمًا ۙ﴿١٥٦﴾ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ
اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ
الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ
اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۙ﴿١٥٧﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٥٨﴾ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا
لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ

Marfat.com

شَهِيْدًا ﴿١٥٩﴾ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ
طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿١٦٠﴾
وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ
بِالْبَاطِلِ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٦١﴾ لٰكِنِ
الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ
اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَنُؤْتِيْهِمْ
اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١٦٢﴾

عربی رکوع ۲۲ (اہل کتاب آپ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ براہِ راست آسمان سے ایک کتاب اتاریں (اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں) انہوں نے مطالبہ کیا تھا موسیٰ (علیہ السلام) سے اس سے بھی بڑا۔ انہوں نے کہا تھا ہمیں تم اللہ کو کھلم کھلا دکھا دو۔ تو ان کو بجلی کی کڑک نے اس زیادتی کے باعث آ پکڑا۔ پھر انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا۔ اس کے بعد کہ آ چکی تھیں ان کے پاس بڑی بڑی نشانیاں۔ پھر بھی ہم نے اس سے درگزر کیا۔ اور موسیٰ (علیہ السلام) کو ہم نے نہایت واضح حجت عطا کی۔ اور ہم نے ان کے اوپر طور کو معلق کیا ان کے عہد کے ساتھ اور ہم نے ان سے کہا کہ دروازے میں داخل ہو سر جھکائے ہوئے۔ اور ہم نے ان سے کہا کہ سبت کے معاملے میں حد سے نہ بڑھنا۔ اور ہم نے ان سے ایک مضبوط عہد لیا۔ پس بوجہ اس کے کہ انہوں نے اپنے عہد کو توڑا بوجہ اس کے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا۔ بوجہ اس کے کہ انہوں نے انبیاء کو قتل کیا اور بوجہ اس کے کہ انہوں نے کہا ہمارے دل تو بند ہیں۔ بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے تو وہ کم ہی ایمان لائیں گے ٥ اور بوجہ ان کے کفر کے اور بوجہ ان کے مریم پر ایک بہتانِ عظیم لگانے کے اور ان کے اس دعویٰ کے سبب سے کہ ہم نے مسیح ابن مریم اللہ کے رسول کو قتل کیا۔ حالانکہ نہ تو انہوں نے اس کو قتل کیا نہ سولی دی۔ بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ ہو گیا اور جو لوگ اس کے بارے میں اختلاف کر رہے

Marfat.com

ہیں وہ اس کے معاملہ میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو اس بارے میں کوئی قطعی علم نہیں۔ بس گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس کو ہرگز قتل نہیں کیا' بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا۔ اور اللہ غالب اور حکیم ہے ○ اور اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا ○ پس بسبب ان یہودی بن جانے والوں کے ظلم کے ہم نے بعض پاکیزہ چیزیں ان پر حرام کر دیں جو ان کے لیے حلال کی گئی تھیں اور بسبب اس کے کہ وہ اللہ کے راستے سے بہت روکتے تھے اور بوجہ ان کے سود لینے کے حالانکہ انہیں اس سے روکا گیا تھا اور بوجہ اس کے کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھاتے تھے اور ہم نے ان جیسے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ○ البتہ ان میں جو علم میں راسخ اور صاحب ایمان ہیں وہ ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی۔ اور خاص کر نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والے' یہ لوگ ہیں جن کو ہم اجرِ عظیم عطا کریں گے) (آیات ۱۵۳ تا ۱۶۲)

يَسْـئَلُكَ اَهْـلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ○ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِى السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ○ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ○

''اہل کتاب آپ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ براہِ راست آسمان سے ایک کتاب اتاریں (اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں) انہوں نے مطالبہ کیا تھا موسیٰ (علیہ السلام) سے اس سے بھی بڑا۔ انہوں نے کہا تھا ہمیں تم اللہ کو کھلم کھلا دکھا دو۔ تو ان کو بجلی کی کڑک نے اس زیادتی کے باعث آ پکڑا۔ پھر انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا۔ اس کے بعد کہ آ چکی تھیں ان کے پاس بڑی بڑی نشانیاں۔ پھر بھی ہم نے اس سے درگزر کیا۔ اور موسیٰ (علیہ السلام) کو ہم نے نہایت واضح حجت عطا کی۔ اور ہم نے ان کے اوپر طور کو معلق کیا ان کے عہد کے ساتھ اور ہم نے ان سے کہا کہ دروازے میں داخل ہو سر جھکائے ہوئے۔ اور ہم نے ان سے کہا کہ سبت کے معاملے میں حد سے نہ بڑھنا۔ اور ہم نے ان سے ایک مضبوط عہد لیا۔ پس بوجہ اس کے کہ انہوں نے اپنے عہد کو توڑا بوجہ اس کے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا۔ بوجہ اس کے کہ انہوں نے انبیاء کو قتل کیا اور بوجہ اس کے کہ انہوں نے کہا ہمارے دل تو بند ہیں۔ بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے تو وہ کم ہی ایمان لائیں گے۔'' (النسآء:۱۵۳تا۱۵۵)

Marfat.com

شانِ نزول

مفسرین بیان کرتے ہیں کہ کعب بن اشرف جو یہودیوں کے ایک قبیلے کا سردار تھا' چند اور یہودیوں کو ہمراہ لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ ہم آپؐ پر ایمان لانے کے لیے تیار ہیں' بس آپؐ ہماری ایک چھوٹی سی شرط پوری کر دیجئے۔ وہ شرط یہ ہے کہ جس طرح ہمارے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام پر لکھی ہوئی تورات آسمان سے نازل ہوئی تھی آپ بھی ایسی ہی کوئی کتاب اتر وادیں جو مرتب اور مجلد شکل میں ہو۔ تو ہم آج ہی ایمان لے آئیں گے۔

اہل کتاب کی تاریخ سے استشہاد

ان کے اس مطالبے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تعجب ہوا تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ یہود کے اس مطالبے سے آپ کو متعجب نہیں ہونا چاہئے' کیونکہ وہ تو اپنی قومی تاریخ اور قومی مزاج کے مطابق آپؐ سے مطالبات کر رہے ہیں اور مزید بھی کریں گے۔ آپؐ سے تو صرف کتاب اتارنے کا مطالبہ کیا ہے' موسیٰ علیہ السلام سے تو وہ اس سے بڑے بڑے مطالبات کر چکے ہیں۔ اللہ کے لیے کتاب اتارنا کوئی مشکل کام نہیں اور لوگوں کا اس کتاب کو تحریری شکل میں دیکھنا اور پڑھنا بھی ایک ممکن امر ہے۔ یہود تو اس سے پہلے ایسا مطالبہ کر چکے ہیں جسے دیکھنے کی انسانوں میں طاقت نہیں۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہم اس وقت آپؐ پر ایمان لانے میں مطمئن ہوں گے جب ہماری نگاہیں کھلم کھلا اللہ کو دیکھیں گی۔ آپ اگر ہم سے ایمان چاہتے ہیں تو پھر اللہ کو کھلم کھلا ہماری نظروں کے سامنے لے آیئے تاکہ ہم اسے دیکھ سکیں۔ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ انسانی نظر میں تو سورج کو دیکھنے کی طاقت نہیں اور آسمانوں کی بلندیوں کو آج تک انسان نہ دیکھ سکا۔ جو کچھ انسانوں نے آج تک دیکھا ہے وہ ان دیکھی چیزوں کی نسبت بہت کم ہے۔ تو جب وہ چیزیں جو دیکھی جاسکتی ہیں انسان انہیں دیکھنے پر قادر نہیں تو وہ اللہ کی ذات کو کیسے دیکھ سکتا ہے جب کہ وہ جسم سے پاک ہے اور زمان و مکان اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ کائنات کی ہر چیز اس کے احاطۂ قدرت میں ہے' لیکن وہ کسی مخلوق کے احاطۂ قدرت میں نہیں آسکتا۔ ''لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر'' (آنکھیں اسے نہیں گھیر سکتیں وہ سب آنکھوں کو گھیرے ہوئے ہے' وہ لطیف ہے (اس لیے نظر نہیں آتا) وہ خبیر ہے (اس لیے سب سے باخبر ہے) انہوں نے جب اس مطالبے پر اصرار کیا تو بجلی کے ایک کڑکے نے انہیں آ دبوچا' سب بے ہوش ہو کر گر گئے یا سب مار دیے گئے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی آہ وزاری اور بار بار دعاؤں سے اللہ نے انہیں دوبارہ زندہ فرمایا۔ پھر اس سے عجیب بات یہ کہ انہوں نے کوہِ طور پر اللہ کا جلال خود اپنے اوپر برستا دیکھا' پہاڑ ان کے سامنے ریزہ ریزہ ہوا' ہجرت کے سفر میں جب بحر قلزم نے راستہ روک لیا تو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح عصائے موسیٰ سے اللہ تعالیٰ نے بحر قلزم کو خشک کر دیا اور بنی اسرائیل نہایت اطمینان سے قلزم کو پار کر گئے۔ اور جب فرعون اور اس کی فوجیں ان کا تعاقب کرتے ہوئے قلزم میں داخل ہو گئیں تو ان کی آنکھوں کے سامنے ان کو ڈبو دیا گیا۔ پھر صحرائے تیہ میں جب کہ ان کے پاس زندگی گزارنے کے اسباب نہیں تھے اللہ نے ان کے سروں پر بادل کا سایہ کیا' کھانے کو من وسلویٰ عطا فرمایا'

Marfat.com

پینے کے لیے ایک چٹان سے بارہ چشمے رواں کر دیے۔ یہ ساری نشانیاں انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اس کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں سامری نے سونے کا ایک گوسالہ بنا کر ان کے سامنے کھڑا کر دیا اور اس کے سوراخوں سے ہوا کے گزرنے سے ''باں باں'' کی آواز آنے لگی تو سامری نے ان سے کہا کہ یہی تمہارا خدا ہے جو تمہیں مصر سے نکال کے لایا۔ موسیٰ تو نہ جانے کہاں جا کے گم ہو گئے۔ سامری کے گمراہ کرنے سے ان کی ایک بڑی تعداد اس گوسالہ کے سامنے جھک گئی اور اس کی پوجا کرنے لگی۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس سے بھی درگزر کیا اور موسیٰ (علیہ السلام) کو نہایت واضح حجت عطا کی تا کہ ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ حجت سے مراد آپ کے واضح معجزات بھی ہو سکتے ہیں اور تورات بھی۔ چنانچہ تورات لے کر موسیٰ علیہ السلام جب ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے تورات کے احکام پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور عجیب و غریب بہانے بنا کر لیت و لعل سے کام لینے لگے۔ اللہ فرماتا ہے کہ پھر ہم نے ان کے سروں پر کوہِ طور معلق کر دیا۔ اور یہ دھمکی دی کہ تم چونکہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا چکے ہو اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام ماننے کا عہد کر چکے ہو۔ ہم نے وہ عہد بھی ان کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اس عہد کے مطابق تورات کو قبول کرو ورنہ کوہِ طور کے نیچے تمہیں کچل دیا جائے گا۔ جب انہوں نے یہ کیفیت دیکھی تو تب انہوں نے تورات کو قبول کیا۔ پھر ہم نے ان کو حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اس سے مراد یا تو خیمۂ عبادت کا دروازہ ہے اور یا پھر اس شہر کا پھاٹک ہے جسے سب سے پہلے بنی اسرائیل نے فتح کیا اور انہیں حکم دیا گیا کہ فاتحانہ جاہ و جلال دکھانے کے بجائے نہایت عاجزی اور فروتنی سے اس طرح شہر میں داخل ہو کہ دیکھنے والوں کو یقین آئے کہ یہ اللہ کے نیک اور عاجز بندے ہیں۔ پھر ہم نے تمہیں سبت یعنی ہفتہ کی تعظیم و تکریم کا حکم دے کر پابند کیا کہ اس دن کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ اس دن تمہارے چولہے نہیں جلنے چاہئیں، تمہیں روزے سے رہنا چاہیے، تمہیں دنیا کا کوئی کام نہیں کرنا بلکہ یہ دن عبادت میں گزارنا ہے اور ایک خاص بستی کے رہنے والوں کو حکم دیا کہ تم ہفتے کے دن مچھلی کا شکار نہیں کرو گے۔ اور ان احکام کے ساتھ تاکید کی گئی کہ دیکھنا ان احکام کی نافرمانی نہ کرنا اور تمہارے لیے جو حدود مقرر کر دی گئی ہیں ان حدود سے تجاوز نہ کرنا۔ اور اس پر ہم نے ان سے پختہ عہد بھی لیا، لیکن انہوں نے اس عہد کو بھی توڑ ڈالا اللہ کی آیات کا انکار کیا اور بسا اوقات انبیاء کو بے گناہ قتل کیا اور ان کی سرکشی یہاں تک پہنچی کہ نہایت تکبر اور نخوت سے پیغمبر کی دعوت کو ٹھکراتے ہوئے کہا کہ تم جو کچھ کہتے ہو یہ ہمارے دلوں میں داخل نہیں ہوتا کیونکہ ہمارے دل پہلے ہی ہدایت سے لبریز ہیں، اس میں تمہاری فضول باتوں کے داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔ یہ وہ واقعات ہیں جو سورۂ بقرہ اور سورہ اعراف میں کہیں اختصار سے اور کہیں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

واقعات بیان کرنے کا مقصود

یہاں مقصود صرف ان واقعات کا حوالہ دے کر یہ بتلانا ہے کہ جس قوم کی تاریخ اس طرح کے مطالبات اور اس طرح کے جرائم سے بھرپور ہو ان کے اخلاف اگر آج آپ سے قرآنِ کریم کے کتابی شکل میں نازل کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ یہ تو یوں سمجھئے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ البتہ ان کی اس تاریخ سے یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے معجزات دیکھ کر بھی ہدایت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے آج اگر ان کا مطالبہ پورا بھی کر دیا جائے تو اے پیغمبر آپ یہ خیال نہ کیجئے کہ یہ ہدایت کو قبول

Marfat.com

کرلیں گے۔ بلکہ یہ اپنی تاریخ کو بدلنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ یہ وہی کچھ کریں گے جو ان کے اسلاف کرتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی مسلسل بدعہدیوں، سرکشیوں، بغاوتوں اور بداعمالیوں کے سبب اللہ نے ان پر لعنت کردی تھی۔ اس لعنت کی گرفت اتنی شدید ہے کہ اب یہ لوگ ایمان قبول نہیں کرسکتے۔ البتہ چند ایسے خوش نصیب ضرور ہوں گے جو اپنی اصلاح کی وجہ سے ایمان کی دولت پائیں گے۔

وَّ بِکُفْرِہِمْ وَ قَوْلِہِمْ عَلٰی مَرْیَمَ بُہْتَانًا عَظِیْمًا ۝ وَّقَوْلِہِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ۚ وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَہُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ ؕ مَا لَہُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ۝

"اور بوجہ ان کے کفر کے اور بوجہ ان کے مریم پر ایک بہتانِ عظیم لگانے کے اور ان کے اس دعویٰ کے سبب سے کہ ہم نے مسیح ابن مریم اللہ کے رسول کو قتل کیا۔ حالانکہ نہ تو انہوں نے اس کو قتل کیا نہ سولی دی۔ بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ ہوگیا اور جو لوگ اس کے بارے میں اختلاف کررہے ہیں وہ اس کے معاملہ میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو اس بارے میں کوئی قطعی علم نہیں۔ بس گمان کی پیروی کررہے ہیں۔ انہوں نے اس کو ہرگز قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا۔ اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔" (النسآء:۱۵۶ تا ۱۵۸)

سابقہ آیتِ کریمہ میں یہود کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات کو بیان کرکے یہ بتلایا گیا ہے کہ اس قوم کی سرشت میں یہ بات شامل رہی ہے کہ انہوں نے اللہ کے نبیوں کے بڑے بڑے معجزات دیکھے، لیکن اس کے باوجود ہدایت قبول کرنے یا ہدایت پر ثابت قدم رہنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اور اللہ سے سرکشی اور دین سے بغاوت ان کی اس انتہا کو پہنچی کہ بالآخر اللہ کی لعنت کا کوڑا ان پر برسا اور ہدایت سے محروم کردیے گئے۔

یہود کے کفر پر ولادتِ مسیح سے استدلال

اب اس آیتِ کریمہ میں ان کے اسی بدترین قومی مزاج اور قابلِ نفرت رویہ کا ذکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے کیا جارہا ہے۔ کہ ان بدبختوں نے اللہ کے کسی نبی اور کسی رسول کے ساتھ بھی کبھی شرافت کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ اور اس پر حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے پیغمبروں کے ساتھ قتل جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب اور بڑے بڑے الزامات لگانے کی جرأت اس حال میں کی کہ یہ اس پیغمبر کے بارے میں یقین کے ساتھ جانتے تھے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ بے خبری میں کوئی شخص یا کوئی قوم کسی جرام کا ارتکاب کرے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس نے بے خبری میں ایسا کیا، اگر اسے حقیقت کا علم ہوتا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے۔ لیکن ان بدبختوں کا حال تو یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا جان بوجھ کر اور علم کی پوری روشنی میں کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ان کے سامنے ہوئی۔ اور ان کی والدہ اور ان کے خاندان کی شرافت نسبی اور کرامت حسبی سے یہ پوری طرح آگاہ تھے۔ حضرت مریم سے بچپن سے جوان ہونے تک جو حیرت انگیز کرامات ظہور میں آتی رہیں یہ اس سے بھی واقف تھے۔ حضرت مریم ان کی نگاہوں میں ایک پاکیزہ عفیفہ اور مقدس خاتون تھیں۔ وہ جیسے ہی ان کے سامنے ایک نوزائیدہ بچے کو

Marfat.com

لے کے آئیں اور انہیں معلوم ہوا کہ یہ ان کا اپنا بچہ ہے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی' کیونکہ یہ لوگ جانتے تھے کہ مریم کنواری لڑکی ہیں۔ انہوں نے انتہائی تعجب اور برہمی کے انداز میں کہا" یَا اُخْتَ هَارُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا "(اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدچلن تھی) تو نے یہ کیا حرکت کی؟ اور کنوارپن میں یہ کس کے بچے کو جنم دیا۔ حضرت مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا کہ اسے ہی پوچھ لو۔ انہوں نے حیران ہو کر کہا کہ ایک نومولود سے ہم کیسے بات کریں؟ اس پر قرآنِ کریم کہتا ہے' جس سے زیادہ سچی کتاب دنیا میں کوئی نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام گویا ہوئے اور اپنے پنگوڑھے سے بولے" اِنِّیْ عَبْدُاللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا "(میں اللہ کا بندہ ہوں' مجھے اللہ نے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے) اس حیرت انگیز گواہی کے بعد زبانیں بند ہو گئیں اور لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اس بچے کی پیدائش بغیر باپ کے ایک غیر معمولی معجزہ ہے۔ یہ بچہ نہ صرف کہ پاکیزہ ہے اور اس کی ماں ہر طرح کے گناہ سے پاک ہے بلکہ یہ اللہ کی ایک غیر معمولی نشانی ہے جسے اللہ نے بچپن میں نبوت دی ہے اور کتاب سے نوازا ہے اور اس کی ذات اور اس کی کتاب آگے چل کر دنیا کی ہدایت کا سامان بنے گی۔ چنانچہ اسی یقین اور اطمینان کے باعث تیس سال تک قومِ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر کوئی الزام نہیں لگایا۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے اللہ کی طرف بلانا شروع کیا اور اپنی نبوت کی دعوت دینا شروع کی اور یہود کے احبار و رحبان کو ان کی غلطیوں پر ٹوکا اور ان کے علماء و فقہاء کو ان کی ریاکاریوں اور بداعمالیوں پر ملامت اور ان کی عوام و خواص سب کو اس اخلاقی زوال پر متنبہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے تو تب قومِ یہود نے اپنے بدنما داغوں کا علاج کرنے اور اپنی بداعمالیوں کی اصلاح کرنے کی بجائے اس آئینے پر تھوکنا شروع کر دیا اور اسے توڑ ڈالنا چاہا جو انہیں ان کی اصل شکل دکھا رہا تھا۔ چنانچہ وہ طرح طرح کے گھٹیا حربوں اور ناپاک ہتھیاروں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات مبارک پر حملہ آور ہوئے اور اس وقت انہوں نے آپ کی والدہ پر نعوذ باللہ زانیہ ہونے کا الزام لگایا اور آپؑ کو معاذ اللہ ولد الزنا کہنے لگے۔ ان کا یہ بہتان چونکہ کسی حقیقی شبہ کا نتیجہ نہ تھا' کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اصل حقیقت کیا ہے اور وہ دل میں حضرت مریم اور ان کے صاحبزادے کی پاکیزگی کا یقین رکھتے تھے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے اس الزام کو بہتانِ عظیم قرار دیا۔

رسول اللہ کی توجیہ

اور دوسرا جرم جس کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے سینہ بجا کر یہ کہا کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کو قتل کیا ہے۔ اس میں مفسرین کی ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ مسیح اور رسول اللہ کا لفظ ان کا نہیں' بلکہ پروردگار کی جانب سے اضافہ ہے تاکہ ان کے جرم کی شناعت کو لوگوں کو سامنے پوری طرح نمایاں کر دی جائے کہ یہ وہ بدترین قوم ہے جو مسیح ابن مریم کے قتل کا دعویٰ کرتی ہے جب کہ دل سے اس بات کو سمجھتی ہے کہ وہ مسیح بھی ہیں اور رسول اللہ بھی۔ بعض دیگر مفسرین یہ کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ انہی کا قول ہے۔ یعنی جب انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا دعویٰ کیا تو انہوں نے صرف یہ نہیں کہا کہ ہم نے ابن مریم کو قتل کیا ہے۔ بلکہ یہ کہا کہ ہم نے رسول اللہ کو قتل کیا ہے۔ بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کوئی قوم کسی شخص کو نبی جانتے اور مانتے ہوئے بھی قتل کر دے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بگڑی ہوئی قوموں کے انداز و اطوار ہوتے ہی کچھ عجیب ہیں۔ وہ اپنے درمیان کسی ایسے شخص کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے جو ان کی برائیوں پر انہیں ٹوکے اور ناجائز کاموں سے انہیں روکے۔ تلمود میں لکھا ہے کہ بخت نصر نے جب بیت المقدس فتح کیا تو وہ ہیکل سلیمانی میں داخل ہوا اور اس کی سیر کرنے لگا۔ عین قربان گاہ کے سامنے ایک جگہ دیوار پر اسے ایک تیر کا نشان نظر آیا۔ اس نے یہودیوں سے پوچھا یہ کیسا نشان ہے؟

Marfat.com

انہوں نے جواب دیا یہاں زکریا نبی کو ہم نے قتل کیا تھا۔ وہ ہماری برائیوں پر ہمیں ملامت کرتا تھا۔ آخر جب ہم اس کی ملامتوں سے تنگ آ گئے تو ہم نے اسے مار ڈالا۔ تاریخ ہمیں اور بھی انبیاءِ کرام کے ایسے واقعات سے باخبر کرتی ہے کہ جن کی قوموں نے محض ان کی ہدایت اور تنقید سے تنگ آ کر انہیں قتل کر ڈالا یا ملک سے نکال دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل یا صلیب دینے کی تردید

قرآنِ کریم نے یہود کے اس دعوے (کہ ہم نے مسیح ابن مریم کو قتل کیا ہے) کی صاف صاف تردید فرمائی۔ اور آپ کی موت کے چونکہ دو امکان ظاہر کیے جاتے تھے کہ آپ کو صلیب پر چڑھایا گیا یا آپ کو قتل کیا گیا۔ اور یا قتل کے اضافے کا شاید مفہوم یہ ہے کہ صلیب پر صرف چڑھایا ہی نہیں گیا' بلکہ باقاعدہ آپ کو صلیب دیا گیا اور صلیب پر ہی آپ کی موت واقع ہوئی۔ تیسرا آپ کی موت کا امکان طبعی موت کی صورت میں ہو سکتا ہے اس کا یہودیوں یا عیسائیوں میں کوئی بھی قائل نہیں رہا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں امکانات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ نہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا اور نہ انہوں نے آپ کو صلیب دیا۔ بلکہ اصل حقیقت کیا ہے؟ اسے آگے چل کر بیان فرمایا کہ اللہ نے مسیح ابن مریم کو زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا۔ اور یہ لوگ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ رہی یہ بات کہ انہوں نے یہ دعویٰ کیوں ہے کہ انہوں نے انہیں قتل کیا ہے یا صلیب دیا ہے؟ اور عیسائی بھی عقیدت کے باوجود انتہائی نادانی کے ساتھ ان کے اس دعوے کی تائید کرتے ہیں۔ البتہ ان کی تاویلیں اپنی ہیں۔

لٰكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ کا مفہوم

قرآنِ کریم نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ درحقیقت معاملہ ان پر مشتبہ ہو گیا۔ اس اشتباہ کی اصل حقیقت کیا ہے؟ یقینی علم تو اللہ کے پاس ہے' ہمارے مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہود حضرت مسیح کے دھوکے میں کسی اور کو سولی پر چڑھا گئے اور حضرت مسیح بچ نکلے۔ لیکن یہ شخص کون تھا؟ اور اس دھوکے کی صورت کیا ہوئی؟ اس کا تصریحی جواب نہ قرآنِ مجید میں ہے' نہ کسی صحیح حدیث میں۔ اب اس کے چارہ نہیں رہتا کہ تاریخ کی روشنی مین واقعہ کی جزئیات کو ایک ایک کر کے لایا جائے اور اس وقت کے پس منظر کو سامنے رکھا جائے اور جو صورتِ واقعہ نسبتاً زیادہ قرین قیاس اور مطابق مقتضائے حال ہو اسی کو ترجیحی طور پر اختیار کیا جائے۔ تفسیر ماجدی کے مصنف محترم کی تحقیق اس معاملے میں یہ ہے:

> ''پہلی بات اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یروشلم کے لوگوں سے ملتے جلتے کم تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ عوام تو عوام خواص بھی آپ کو پوری طرح پہچانتے نہ تھے۔ چنانچہ جب آپ کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس کے لیے اکابر یہود اور متعدد سپاہیوں کا ایک پورا گروہ اس ضرورت کے لیے کافی ثابت نہ ہوا۔ بلکہ آپ کی شناخت کے لیے آپ ہی کی مختصر سی پارٹی کے ایک منافق و غدار کو ساتھ لینا پڑا۔ یہ ایک خالص تاریخی حقیقت ہے امام المفسرین امام رازی اس راز سے بھی واقف ہیں۔ فرماتے ہیں ''والناس ماکانوا یعرفون المسیح الا بالاسم بانہ کان قلیل المخالطۃ للناس ''(کبیر) متی اور مرقس دونوں انجیلوں میں ہے کہ گرفتار کرنے والی پارٹی میں سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے ایک بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لئے ہوئے سپاہیوں کی شامل تھی۔ اس پر بھی گرفتاری اور

Marfat.com

شناخت کے لیے انہیں یہوداہ منافق کا سہارا ڈھونڈنا پڑا اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب یہ پلٹن اور پیادے وہاں پہنچے تو '' یسوع نے ان سے پھر پوچھا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو؟ وہ بولے یسوع ناصری کو۔ یسوع نے جواب دیا میں تم سے کہہ تو چکا ہوں کہ میں ہی ہوں'' (۱۸: ۳۔۸) حضرت مسیح کا تعظیمی تخیل تو بہت بعد کی پیداوار ہے' معاصر مخالفین و معاندین کی نظر میں آپ کی حیثیت صرف یسوع ناصری نامی ایک بدنام و غیر معروف مجرم کی تھی۔ وہ سامنے موجود تھا اور پھر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا۔ حالانکہ سب آئے تھے اسی کی تلاش میں۔

دوسری بات خیال رکھنے کی یہ ہے کہ حضرت کو یا بالفاظ دیگر یسوع ناصری کو تبدیل ہیئت میں خاص ملکہ تھا۔ انجیلوں میں حضرت کی اسی قدرت کو بہ طورِ معجزہ بیان کیا گیا ہے۔ ''چھ دن کے بعد یسوع نے پطرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا اور انہیں ایک اونچے پہاڑ پر الگ لے گیا۔ اور ان کے سامنے اس کی صورت بدل گئی اور اس کا چہرہ سورج کی مانند چمکا۔'' (متی ۱۷: ۱۔۲) ''جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اسکے چہرے کی صورت بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید براق ہوگئی۔'' (لوقا ۹: ۲۹' نیز مرق ۹: ۲) یہ معجزہ تھا یا نہ تھا۔ یہ ایک الگ بحث ہے بہر حال آپ کو نفس قدرت اس پر حاصل تھی۔

تیسرے اس تاریخی حقیقت کا استحضار ذہن میں کر لیا جائے کہ ملک (شام و فلسطین) کی آبادی اس وقت اسرائیلیوں' یہودیوں کی تھی اور اس برادری کے ایک فرد آپ بھی تھے۔ لیکن ملک پر حکومت رومیوں کی تھی اور اعلیٰ عہدہ دار اور پولیس اور فوج رومیوں پر مشتمل تھی۔ اور یہ رومی نہ صرف مشرک یعنی دین و عقیدہ میں اسرائیلیوں سے مختلف تھے' بلکہ صورت' شکل' وضع و لباس' زبان و معاشرت وغیرہ میں بھی ان سے ایسے ہی الگ تھے جیسے آج انگریز' ہندوستانیوں سے مختلف و ممتاز ہیں اور جس طرح آج ہندوستانیوں کو سب فوجی گورے یکساں اور گوروں کو سارے ''کالے'' ایک سے معلوم ہوتے ہیں' بدیسی رومی سپاہیوں اور فوجیوں کی نظر میں سب یہود یہود اور اسرائیلی اسرائیلی بھی ایک ہی تھے۔

چوتھی کڑی اس سلسلہ کی یہ ملائیے کہ جس مقام پر رومی عدالت تھی وہاں سے سرکاری سولی گھر فاصلہ پر تھا' اور سولی یا صلیب جس کی شکل انگریزی چھاپہ کے بڑے حرف ٹی (T) کے مشابہ یا ریلوے سگنل سے ملتی جلتی ہوتی تھی' وہ سولی گھر میں پوری گڑی ہوئی نہیں ہوتی تھی' صرف اس کا سیدھا اور کھڑا ستون زمین میں گڑا ہوا رہتا تھا۔ باقی جو لکڑی اس کے اوپر آڑی آڑی پڑتی تھی اس کے لیے قاعدہ یہ تھا کہ وہ مجرم کو عدالت سے اپنے اوپر لاد کر سولی گھر تک لانی پڑتی تھی۔ یہاں تک جو کچھ عرض ہوا اس پر ایک نظر دوبارہ کر کے امورِ ذیل کو بھی نظر کے سامنے لے آیئے:

(۱)...... حکم جب سنایا گیا ہے جمعہ کا دن تھا اور دن آخر ہو رہا تھا اور یہود کو جلدی تھی کہ ہر طرح فراغت پا کر شاموں شام گھر واپس آ جائیں۔ جمعہ کی شام ہی سے ان کا یوم السبت شروع ہو جاتا تھا اور یوم السبت کے حدود کے اندر مجرم کی سزا دہی وغیرہ بھی ممنوع تھی اور پھر یہود کا اہم تہوار' عید فسح بھی شروع ہو رہی تھی۔ غرض یہود کو اس کی بہت ہی عجلت تھی کہ کسی طرح ان کا یہ مجرم جلد سے جلد سولی پا کر شام سے قبل ہی دفن ہو جائے۔

Marfat.com

(۲)......لاغر و ناتوان مجرم (یعنی خود حضرت مسیح) کے لیے ممکن نہ تھا کہ اتنی وزنی لکڑی لاد کر اتنا فاصلہ یہود کی خاطر خواہ تیزی سے طے کر سکیں۔ خصوصاً جب کہ یہودی بچے اور شریر قسم کے یہود خود بھی قدم قدم پر انہیں چھیڑتے جاتے اور ان کا رستہ کھوٹا کرتے جاتے۔ اب اس ساری صورتِ حال کو اس تفصیل کے ساتھ پیش نظر رکھ کر فرمائیے کہ رومی سپاہی جو مجرم' بلکہ مجرموں کو (آپ کے ساتھ سولی کے لیے دو مجرم اور بھی تھے) حراست میں لیے ہوئے تھے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ رعایا میں سے نہیں بلکہ حاکم قوم کے افراد تھے ایسے موقع پر کیا کرتے؟ خود تو اپنے اوپر وہ سولی والی لکڑی کا بوجھ لادنے سے رہے۔ انہوں نے وہی کیا جو ان کی جگہ پر کوئی بھی ان جیسا انسان کرتا۔ انہوں نے مجمع ہی میں سے کسی بدتمیز یہودی کو پکڑ لیا اور صلیب کی لکڑی اسی پر لاد دی...... انگریز گارد ایسے موقع پر یعنی کسی ہندوستانی مجرم کو حراست میں لیے جاتا ہوتا تو کیا کرتا؟ یہی کرتا کہ بھیڑ میں کسی ہندوستانی ہی کو پکڑ لیتا اور اس پر لاد دیتا۔ یہ محض قیاس و قرینہ نہیں' انجیلوں میں اتنے جزو کی تصریح موجود ہے۔ ''انہیں شمعون نام ایک کرینی آدمی ملا' اسے بیگار میں پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے۔'' (متی۔۲۷: ۳۲) ''اور شمعون نام ایک کرینی آدمی اسکندر اور روفس کا باپ دہات سے آتے ہوئے ادھر سے گزرا۔ انہوں نے اسے بیگار میں پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے'' (مرقس۔۱۵: ۲۱) ''اور جب اس کو لیے جاتے تھے تو انہوں نے شمعون نام ایک کرینی کو جو دہات سے آتا تھا پکڑ کے صلیب اسی پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے چلے'' (لوقا ۲۳: ۲۶) جب یہ مجمع (جو یقیناً کوئی باقاعدہ و منظم مجمع نہیں' بلکہ عوام کی ایک بھیڑ تھا) اس افراتفری کے ساتھ ایک دوسرے کو ریلتا پیلتا مجرم سے چھیڑ چھاڑ کرتا' اس سے تمسخر کرتا ہوا' سولی گھر کے پھاٹک پر پہنچا تو رومی پولیس گارڈ جو ساتھ تھا' اب اس کی ڈیوٹی ختم ہوگئی۔ اب یہاں سے جیل کے سنتریوں کا عمل و دخل شروع ہوتا ہے۔ وہ کیا جانیں کہ یسوع ناصری کس کا نام ہے۔ وہ اپنے حسب دستور مجرم اسی کو سمجھے جس کے اوپر صلیب لدی ہوئی تھی......ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو متحضر کر لیجیے کہ جیل کے رومی سپاہیوں کے لیے سب یہودی اجنبی ہی تھے اور اس لیے باہم دگر ہم شکل اور یکساں۔ انہیں ایک اسرائیلی (یسوع ناصری) اور دوسرے اسرائیلی (شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ نہایت آسان تھا۔ انہین دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق ہی نہیں نظر آ سکتا تھا۔ شمعون نے یقیناً واویلا مچایا ہوگا لیکن ادھر مجمع کا شور و ہنگامہ ادھر جیل کے سپاہیوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت' اور پھر سولی پر لٹکا دینے کی جلدی' اسی افراتفری کے عالم میں اسی شمعون کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا گیا اور وہ چیختا چلاتا رہا۔ حضرت مسیح قدرۃً اس ہڑبونگ میں دشمنوں کے ہاتھ سے رہا ہو گئے اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ٹامک ٹویاں مارتے رہ گئے ''وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ'' یہ عقیدہ نو ایجاد نہیں۔ خود مسیحیوں ہی کا ایک قدیم ترین فرقہ باسلیدیہ کے نام سے گزرا ہے۔ (بانی فرقہ کا سال وفات ۱۲۰ء) وہ اسی عقیدہ کا قائل تھا اور کھلم کھلا کہتا کہ مصلوب حضرت مسیح علیہ السلام نہیں ہوئے' بلکہ شمعون کروینی ہوا ہے۔ قرآن مجید نے اسی عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کیا ہے۔'' (ماخوذ از: تفسیر ماجدی)

Marfat.com

اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ کا مفہوم

''وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ'' یہاں اختلاف کرنے والوں سے مراد عیسائی ہیں۔ان کا حال یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ یہود کے دعویٰ کی تائید کرتے ہوئے تسلیم کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دیا گیا اور دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کے بارے میں کسی ایک قول پر متفق نہیں ہیں۔ان کا کسی ایک قول پر متفق نہ ہونا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اصل حقیقت ان پر مشتبہ ہے۔اور وہ اس اشتباہ سے آج تک نہیں نکل سکے۔ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر جو شخص چڑھایا گیا وہ مسیح نہ تھا' بلکہ مسیح کی شکل میں کوئی شخص تھا۔کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر چڑھایا تو مسیح ہی کو گیا تھا مگر ان کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی۔ بلکہ اتارے جانے کے بعد ان میں جان باقی تھی۔کوئی کہتا ہے کہ انہوں نے صلیب پر وفات پائی اور پھر وہ جی اٹھے اور کم و بیش دس مرتبہ اپنے مختلف حواریوں سے ملے اور باتیں کیں۔کوئی کہتا ہے کہ صلیب کی موت مسیح کے جسم انسانی پر واقع ہوئی اور وہ دفن ہوا مگر الوہیت کی روح جو اس میں تھی وہ اٹھا لی گئی۔اور کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مسیح علیہ السلام جسم سمیت زندہ ہوئے اور جسم سمیت اٹھائے گئے۔ان تمام اقوال کو دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی مختلف باتیں ان میں مشہور نہ ہوتیں۔قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ان کے ان مختلف اقوال کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس حقیقت کا علم نہیں بلکہ ان کے سارے علم کلام کی بنیاد ظن و گمان پر ہے۔یقینی علم صرف یہ ہے کہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کر سکے۔یعنی وہ ان کی جان لینا چاہتے تھے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔بلکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھا لیا۔اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ بات کوئی مشکل نہیں کہ وہ ایک زندہ انسان کو آسمانوں پر اٹھا لے یا کائنات کے کسی گوشے میں صدیوں تک زندہ موجود رکھے اس لیے کہ وہ عزیز اور غالب ہے اور حکمت والا ہے۔جہاں تک اپنی طرف اٹھانے کا تعلق ہے بعض لوگوں نے اسے محض ترقی درجات و مراتب کے معنی میں لیا ہے۔حالانکہ یہ بات عربیت کے خلاف ہے۔کیونکہ عربی زبان میں جہاں رفع کے لفظ کو ترقی درجات کے معنی میں استعمال کرنا ہو وہاں اس کو صلہ کے بغیر استعمال کیا جاتا ہے۔جیسے حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ''ورفعناه مكانًا عليًا'' (ہم نے اسے بلند مرتبے پر اٹھایا) لیکن جب رفع کو جسم مع الروح کے اٹھانے کے معنی میں استعمال کیا جائے تو پھر اس کے ساتھ الیٰ کا صلہ آتا ہے جیسے پیش نظر آیت میں ہم دیکھ رہے ہیں۔

آیت کے آخر میں عزیز حکیم کی صفات کا ذکر یہ بتلانے کے لیے کافی ہے کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا جو دنیا میں اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا اور غیر معمولی واقعہ کیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا گیا۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۝

''اور اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔'' (النسآء:۱۵۹)

Marfat.com

آیت کے مختلف تراجم کی وضاحت

اس آیتِ کریمہ کے پہلے فقرے کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو آپ متن کے نیچے دیکھ رہے ہیں اور دوسرا ترجمہ اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے۔'' سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اہل کتاب سے کون مراد ہیں؟ سلسلۂ کلام کو دیکھتے ہوئے تو یہ کہنا چاہئے کہ اس سے مراد یہود ہیں۔ لیکن جملہ معترضہ میں چونکہ نصاریٰ کا بھی ذکر آیا ہے اس حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں اہل کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ دونوں ہیں۔

آیتِ کریمہ کا مفہوم پہلے ترجمہ کے اعتبار سے تو یہ ہے کہ ''کوئی یہودی یا عیسائی ایسا نہیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لے آئے۔'' اس صورت میں مراد اس سے یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام قربِ قیامت میں دوبارہ تشریف لائیں گے' دجال سے آپ کا معرکہ ہوگا' دجال آپ کے ہاتھوں قتل ہوگا' یہودی یا تو ایمان لے آئیں گے یا قتل کر دیے جائیں گے اور عیسائیوں پر چونکہ اصل معاملہ کھل جائے گا اس لیے وہ سب ایمان لے آئیں گے۔ پھر چند سال تک عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں زندہ رہیں گے اور آپ عادل حکمران کی طرح حکومت کریں گے۔ جب آپ کی طبعی موت کا وقت آئے گا تو اس سے پہلے پہلے کوئی یہودی یا عیسائی ایسا نہیں ہوگا جو آپ پر ایمان نہ لا چکا ہو اور اس وقت آپ پر ایمان لانے کا مطلب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہے۔ کیونکہ جو شخص بھی عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا نبی مانے گا وہ یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بھی مانے گا۔

دوسرے ترجمے کے حوالے سے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ''اہل کتاب میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہوگا جسے موت کے وقت رسالت مسیح کے بارے میں حقیقت سے آگاہ نہ کر دیا جائے۔'' چنانچہ اہل کتاب میں سے جس شخص کو بھی موت آئے گی اس وقت اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ میں جو کچھ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارہ میں کہتا رہا ہوں وہ سب غلط تھا۔ وہ ایک پاک دامن عفیفہ کے بیٹے' صحیح النسب اللہ کے نبی تھے' وہ اپنی ذات میں ایک انسان تھے' وہ نہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے تھے' ان کی حیثیت صرف یہ تھی کہ وہ باقی رسولوں کی طرح ایک رسول تھے۔ یہ حقیقت موت کے وقت ہر ایک پر کھول دی جائے گی' لیکن چونکہ موت کے وقت جب عالم برزخ کی چیزیں نظر آنے لگیں اور آنے والے حالات منکشف ہونے لگیں تو اس وقت کا ایمان معتبر نہیں ہوتا۔ اگرچہ اہل کتاب اصل حقیقت سے آگاہ ہو جائیں گے اور اس پر ایمان بھی لے آئیں گے' لیکن یہ ایمان ان کے کام نہیں آئے گا۔ یہ وہ مفہوم ہے جو متعدد صحابہ' تابعین اور اکابر مفسرین سے منقول ہے۔

بعض اہل علم ایک تیسرا مفہوم مراد لیتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ''لَیُؤْمِنَنَّ'' سے ایمان مراد نہیں' بلکہ یقین مراد ہے۔ جس طرح قرآنِ کریم میں سورۃ النمل میں متکبر کافروں کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ اپنے ظلم اور گھمنڈ کے سبب سے اللہ کے رسول کے معجزات کا انکار کرتے ہیں' لیکن ان کے دل اس پر یقین رکھتے ہیں۔ یہاں بھی اسی طرح کا یقین مراد ہے اور آیت میں جو ضمیریں آئی ہیں ان کے مرجع میں اختلاف ہے۔ وہ ''بِہٖ'' کی ضمیر کا مرجع قرآنِ مجید کو اور ''مَوْتِہٖ'' کی ضمیر کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آج یہ اہل کتاب قرآن اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت تسلیم کرنے کے لیے یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ وہ آسمان سے کتاب اتار کر دکھائیں۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب یہ لوگ قرآن اور پیغمبر کی کہی ہوئی ایک ایک بات کو واقعات کی شکل میں اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور

Marfat.com

قرآن ان کے لیے جس رسوائی و نامرادی اور جس ذلت و شکست کی خبر دے رہا ہے وہ پیغمبر کے دنیا سے اٹھنے سے پہلے پہلے اس طرح ان کی آنکھوں کی سامنے آجائے گی کہ اس کو جھٹلانا ان کے لیے ممکن نہیں رہے گا۔ اگرچہ ایمان کی سعادت انہیں پھر بھی نصیب نہیں ہوگی لیکن دل سے ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔

آیت کے دوسرے جملے کا مفہوم پہلے دونوں ترجموں کے حوالے سے یہ ہوگا کہ ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں گواہی دیں گے اور بتلائیں گے کہ آپ اللہ کی طرف سے جو پیغام ہدایت ان کے لیے لے کے آئے تھے انہوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا اور خود عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی زندگی میں کیا سلوک کیا اور یہی وہ گواہی ہے جس کا تفصیلی ذکر سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں ہے۔ اور تیسرے ترجمے کی صورت میں اس جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن ان تمام لوگوں پر گواہی دیں گے اور آپ بتلائیں گے کہ انہوں نے یہود و نصاریٰ پر اللہ کے دین کی ایک ایک بات کی گواہی دی تھی اور انہیں کھول کے بتایا تھا کہ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جس عناد یا جس غلو میں مبتلا ہو گئے ہو وہ سراسر غلط ہے۔ اگرچہ تمام انبیاء اپنی اپنی امتوں پر شہادت دیں گے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم الانبیاء ہیں اس لیے آپؐ کی شہادت ایک اجتماعی شہادت ہوگی جس سے تمام امتوں پر حجت قائم ہو جائے گی۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۝ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

''پس بسبب ان یہودی بن جانے والوں کے ظلم کے ہم نے بعض پاکیزہ چیزیں ان پر حرام کر دیں جو ان کے لیے حلال کی گئی تھیں اور بسبب اس کے کہ وہ اللہ کے راستے سے بہت روکتے تھے اور بوجہ ان کے سود لینے کے حالانکہ انہیں اس سے روکا گیا تھا اور بوجہ اس کے کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھاتے تھے اور ہم نے ان جیسے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔'' (النسآء: ۱۶۰ تا ۱۶۱)

یہود کی سرکشی کی وجہ سے بعض طیبات کی ممانعت

گزشتہ آیت کی حیثیت جملہ معترضہ کی تھی۔ اس کے بعد پھر وہی سلسلۂ تقریر شروع ہو گیا ہے۔ اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے یہود پر ایسی پاکیزہ نعمتیں بھی حرام کر دی تھیں جنہیں پہلے ان کے لیے حلال کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کی سرکشی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ جس طرح کسی شخص کے بگاڑ کو روکنے کے لیے اس پر سختی کی جاتی اور پابندیاں لگائی جاتی ہیں اسی طرح اس قوم کو بھی تنبیہ کے لیے بعض حلال چیزوں سے محروم کر دیا گیا تھا۔ لیکن ان کی یہ محرومی یا ان پر ان سختیوں کا کیا جانا اللہ کی طرف سے ظلم نہیں تھا' بلکہ ان کے ظلم اور سرکشی کی سزا تھی۔ اور مقصود انہیں اس سرکشی سے روکنا تھا۔ اس کے بعد چند جملوں میں ان کے اس سرکش رویے کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے۔ سب سے پہلا ان کا جرم یہ بتایا گیا کہ وہ صرف خود ہی اللہ کے راستے سے منحرف نہیں تھے بلکہ ان کی بیباکی کا عالم یہ تھا کہ وہ اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی

Marfat.com

سرکشی کے راستے پر ڈالتے اور انہیں ترغیب دیتے تھے کہ اللہ کے احکام کی نافرمانی کی جائے۔ چونکہ اس قوم پر ان کے اسی رویے کے باعث لعنت کی گئی ہے اس کا آج تک اثر یہ ہے کہ جہاں بھی اللہ کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے کوئی تحریک اٹھتی ہے تو عموماً اس کے پیچھے یہودی دماغ اور یہودی سرمایہ کام کرتا نظر آتا ہے۔ اور خیر کی ہر قوت کا راستہ روکنے اور انہیں ناکام کرنے کے لیے یہودی ہی سب سے پیش پیش ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ سامنے آ کر مخالفت کم کرتے ہیں لیکن پس پردہ رہ کر اس مخالفت کے اصل دماغ وہی ہوتے ہیں۔ ہماری قریبی تاریخ میں ایک ایسا نظام جو سراسر منفی بنیادوں پر اٹھا اور جس نے ستر سال تک نوع انسانی کو بے پناہ نقصان پہنچایا بہت کچھ شکست ریخت اور ہزیمت اٹھانے کے بعد بھی وہ پوری طرح ختم نہیں ہوا میری مراد کمیونزم ہے' جس نے دنیا میں پہلی مرتبہ اللہ کے وجود کے انکار پر نظامِ زندگی کی بنیاد رکھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس کا بانی اور سرغنہ بھی کارل مارکس ایک یہودی تھا۔ اور اسی طرح ایک دوسرا نظام زندگی جس نے عقل کے نام پر دنیا کو گمراہ کرنے کی کوشش کی اور جس نے ہر سطح پر اخلاق کا انکار کیا اس گمراہی کا امام بھی فرائیڈ ایک یہودی تھا۔

دوسرا جرم ان کا یہ بتایا گیا ہے کہ وہ سود لیتے تھے' حالانکہ انہیں اس سے روکا گیا تھا۔ تورات میں سود کی ممانعت کے احکام آج تک موجود ہیں۔ مثلاً "اگر تو میرے لوگوں میں سے جس کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے کچھ قرض دیوے تو اس سے بیاجیوں کی طرح سلوک مت کر اور سود مت لے۔" (خروج ۲۲:۲۵) "تو اس سے سود اور نفع مت لے اپنے خدا سے ڈرتا کہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے۔ تو اسے سود پر روپیہ قرض مت دے' نہ اسے نفع کے لیے کھانا کھلا۔" (احبار ۲۵:۳۶:۳۷) عجیب بات یہ ہے کہ ان احکام کے باوجود بھی یہودی دنیا کی سب سے بڑی سود خور قوم ہے۔ اور اپنی تنگدلی اور سنگدلی کے لیے مشہور ہے۔ اور ان کے شایلاک دنیا کے ادبیات میں ضرب المثل بن گئے ہیں۔

اور تیسرا جرم ان کا یہ بیان فرمایا گیا کہ وہ لوگوں کے مال ناجائز طریقے سے ہضم کر جاتے تھے۔ تورات میں سود' رشوت' خیانت وغیرہ آمدنی کے جن ذریعوں کو حرام قرار دیا گیا تھا انہی کو اختیار کر کے وہ دنیا کے ذرائع پر بہت حد تک قابض ہو چکے ہیں۔

ان کے یہ جرائم ہیں جس کی وجہ سے اللہ نے ان پر بہت ساری حلال نعمتیں حرام کر دیں۔ یہاں اگرچہ ان نعمتوں کا ذکر نہیں فرمایا گیا لیکن سورہ الانعام آیت نمبر ۱۴۶ میں ان کا ذکر آنے والا ہے۔ وہیں انشاءاللہ تفصیلی بحث ہوگی۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ جو لوگ کفر کی روش پر قائم رہیں گے اور اپنی رویے میں تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کریں گے ہم نے انکے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے قیامت میں جو ہونے والا ہے اس کا ذکر بھی قرآن کریم میں بار بار کیا گیا ہے اور دنیا میں جس طرح اس قوم کو عبرت بنا دیا گیا وہ بھی نگاہِ بصیرت رکھنے والوں پر مخفی نہیں اسرائیل کی صورت میں انہیں اپنی خباثتوں کے اظہار کا ایک موقع ملا ہے' وہ وقت دور نہیں جب ان کا یہی رویہ پوری دنیا کو اس بات پر آمادہ کر دے گا کہ ان کو پھر اسی عذاب کی نذر کر دیا جائے اور پھر اسی انجام سے دوچار کر دیا جائے جو اللہ کی طرف سے ان کا اصل مقدر ہے۔

لٰکِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِکَ سَنُؤْتِیْهِمْ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝

Marfat.com

''البتہ ان میں جو علم میں راسخ اور صاحب ایمان ہیں وہ ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی۔ اور خاص کر نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والے' یہ لوگ ہیں جن کو ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔'' (النسآء:۱۶۲)

قرآن کریم کی تنقید میں عدل

قرآنِ کریم صرف اپنے احکام اور حکمتوں کے بیان میں عدل واحسان کا ایک نادر واعلیٰ نمونہ نہیں بلکہ وہ تاریخی واقعات بیان کرنے اور امتوں پر تنقید کے معاملے میں بھی بے مثل نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہود پر ہم نے ایک سخت تنقید پڑھی اور ان کی انفرادی اور قومی گمراہیوں اور بداعمالیوں کو بھی تفصیل سے دیکھا۔ جس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عوام تو بگاڑ کی انتہا کو پہنچے ہی تھے خواص میں بھی کوئی ایسا قابل ذکر طبقہ باقی نہیں رہا تھا جن سے کوئی امید کی جاسکتی' لیکن قرآنِ کریم نے اپنے بے میل عدل سے کام لیتے ہوئے واضح فرمایا کہ اس قوم میں کچھ بہتر لوگ بھی تھے اگرچہ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ ان میں بڑے بڑے اہل علم موجود تھے لیکن دنیاداری نے ان کی علمی خصوصیات اور عملی تشخصات کو فنا کردیا تھا۔ انہوں نے اپنے علم وفکر کو حصولِ زر کا ذریعہ بنا رکھا تھا' لیکن ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو صرف اہلِ علم نہیں بلکہ رسوخ فی العلم رکھتے تھے۔ بگاڑ اور زوال کے اس جھکڑ میں وہ خیر کی آخری علامت کی طرح مضبوطی سے قائم رہے اور ہر طرح کے حالات کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ اور عام لوگوں میں بھی کچھ ایسے صاحب ایمان اور سلیم الفطرت لوگ موجود تھے جنہوں نے اپنے آپ کو یہود کے عام بگاڑ سے محفوظ رکھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور سابقہ آسمانی کتابوں پر بھی ایمان رکھتے تھے اور اللہ سے ان کا چونکہ بے پناہ تعلق تھا اس لیے وہ بطورِ خاص نمازوں سے محبت کرنے والے اور دل لگانے والے تھے۔ ''والمقیمن الصلوۃ'' کا عطف ''المؤمنون'' پر ہے۔ اس لیے اسے نحوی طور پر ''المقیمون'' ہونا چاہیے' لیکن لفظ کی اعرابی حالت کو بدل کر پروردگار نے ان کی خاص صفت کی طرف اشارہ فرمایا۔ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ بعض دفعہ حالتِ رفعی کو بغیر کسی سبب کے حالتِ نصبی سے تبدیل کردیتے ہیں اور اسے ''علی سبیل الاختصاص یا علی سبیل المدح'' کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں خاص طور پر اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ یہ لوگ اپنی باقی عملی خصوصیات کے ساتھ ساتھ نمازوں کی بہت پابندی کرنے والے ہیں۔ نماز کا جو اسلام میں مقام ومرتبہ ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو قیامِ صلوۃ میں اختصاص رکھتا ہے وہ یقیناً پوری شریعت پر عمل کرنے میں کسی کمزوری کا شکار نہیں ہوتا۔ قرآنِ کریم میں اور بھی کئی جگہ اس اسلوب سے کام گیا ہے۔ سورہ بقرہ میں بھی اس کی مثال گزر چکی ہے۔ ان کے خصائص کو ذکر کرنے کے بعد آخر میں فرمایا'' کہ یہ اس راندۂ درگاہ قوم کے افراد ہونے کے باوجود اپنے ایمان وعمل سے اس قابل ہوگئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اجر عظیم سے نوازیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور قرآنِ کریم میں مختلف مواقع پر ان کی تعریف فرمائی۔

Marfat.com

إِنَّآ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ كَمَآ أَوۡحَيۡنَآ إِلٰى نُوۡحٍ
وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ۚ وَاَوۡحَيۡنَآ اِلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَ
اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَعِيۡسٰى وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡنُسَ وَ
هٰرُوۡنَ وَسُلَيۡمٰنَ ۚ وَاٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ۚ ﴿١٦٣﴾ وَرُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ
عَلَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ وَرُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَيۡكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ
مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا ۚ ﴿١٦٤﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ لِئَلَّا يَكُوۡنَ
لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿١٦٥﴾
لٰكِنِ اللّٰهُ يَشۡهَدُ بِمَآ اَنۡزَلَ اِلَيۡكَ اَنۡزَلَهٗ بِعِلۡمِهٖ ۚ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ
يَشۡهَدُوۡنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا ؕ ﴿١٦٦﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا
عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ قَدۡ ضَلُّوۡا ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا ﴿١٦٧﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا
وَظَلَمُوۡا لَمۡ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغۡفِرَ لَهُمۡ وَلَا لِيَهۡدِيَهُمۡ طَرِيۡقًا ۙ ﴿١٦٨﴾
اِلَّا طَرِيۡقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَآ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ
يَسِيۡرًا ﴿١٦٩﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمُ الرَّسُوۡلُ بِالۡحَقِّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ
فَاٰمِنُوۡا خَيۡرًا لَّكُمۡ ؕ وَاِنۡ تَكۡفُرُوۡا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ
وَالۡاَرۡضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿١٧٠﴾ يٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا
فِىۡ دِيۡنِكُمۡ وَلَا تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَقَّ ؕ اِنَّمَا الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى

Marfat.com

ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾

عربی رکوع ۲۳ (اے پیغمبرؐ) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح (علیہ السلام) اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف وحی کی تھی۔ اور ہم نے وحی کی ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان (علیہم السلام) کی طرف اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو زبور دی۔ اور ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی بھیجی جن کا حال ہم تم کو پہلے سنا چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کو حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا۔ اور موسیٰ (علیہ السلام) سے تو اللہ نے کلام کیا ٥ اللہ نے بھیجا ہے رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ہوشیار کرنے والے بنا کر، تاکہ نہ رہے لوگوں کے لیے اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت۔ اللہ غالب اور حکیم ہے ٥ لیکن اللہ گواہی دیتا ہے اس چیز کی جو اس نے تم پر اتاری ہے کہ اس نے اس کو اپنے علم سے نازل کیا ہے۔ اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں۔ اور گواہی کو تو اللہ ہی کافی ہے۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑے، جن لوگوں نے کفر کیا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ان کو نہ تو خدا بخشنے والا ہے اور نہ جہنم کے سوا جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ان کو کوئی اور راستہ دکھانے والا ہے۔ اور اللہ کے لیے یہ بات آسان ہے ٥ اے لوگو تمہارے پاس یہ رسول تمہارے رب کی طرف سے حق لے کر آ گیا ہے پس ایمان لے آؤ، یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور اگر انکار کرتے ہو تو بے شک اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا ہے حکمت والا ہے ٥ اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو مت کرو اور اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ ڈالو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم تو اللہ کے رسول اور اس کے کلمہ ہیں۔ جسے اس نے مریم کی طرف القا فرمایا۔ اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں، پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تثلیث کا دعویٰ نہ کرو۔ باز آ جاؤ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ معبود تو بس تنہا اللہ ہی ہے۔ وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی اولاد ہو۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ کافی کارساز ہے۔ (آیات ۱۶۳ تا ۱۷۱)

Marfat.com

اِنَّـآ اَوْحَیْنَـآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْم بَعْدِہٖ ۚ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِیْسٰی وَاَیُّوْبَ وَیُوْنُسَ وَھٰرُوْنَ وَسُلَیْمٰنَ ۚ وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ ۚ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰھُمْ عَلَیْکَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْھُمْ عَلَیْکَ ؕ وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا ۝ ۚ

’’(اے پیغمبرؐ) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح (علیہ السلام) اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف وحی کی تھی۔ اور ہم نے وحی کی ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان (علیہم السلام) کی طرف اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو زبور دی۔ اور ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی بھیجی جن کا حال ہم تم کو پہلے سنا چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کو حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا۔ اور موسیٰ (علیہ السلام) سے تو اللہ نے کلام کیا۔‘‘ (النسآء: ۱۶۳ تا ۱۶۴)

یہود کے مطالبہ کا جواب ایک دوسرے پہلو سے

گزشتہ رکوع میں یہود کا یہ مطالبہ گزر چکا کہ ہم آپ پر اس صورت میں ایمان لائیں گے کہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے کتاب اتار کے دکھائیں۔ آسمان سے ایک کتاب اترے جو بالکل مرتب اور مجلد شکل میں عام کتابوں کی طرح ایک کتاب ہو، ہم اسے نازل ہوتا بھی دیکھیں اور اسے چھو کر اور پڑھ کر بھی دیکھیں۔ اس کے جواب میں ان کے ان کارناموں کا تفصیل سے ذکر فرمایا گیا جس پر انہیں شرم آنی چاہئے۔ اور اب ایک دوسرے پہلو سے ان کے اسی مطالبے کا جواب دیا گیا ہے۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ تاریخ نبوت سے واقف نہیں ہیں وہ تو شاید اس بات کو نہ سمجھ سکیں، لیکن تم اہل کتاب تو اچھی طرح اس بات کو جانتے ہو کہ خود بنی اسرائیل میں سے ایک بڑی تعداد اللہ کے نبیوں اور رسولوں کی اٹھائی گئی ہے۔ اور خود تمہاری کتاب تورات میں کتنے انبیاءِ کرام کے صحائف موجود ہیں اور ان میں وہ مشہور رسول جن کے ناموں سے تم واقف ہو ان سب کو نام بہ نام گن کر فرمایا گیا ہے کہ یہ وہ رسول ہیں، جن پر کتابیں اتریں اور تم ان سے اچھی طرح واقف ہو۔ اور ان سب کا ذکر تورات میں موجود ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام پر جو کتاب نازل ہوئی یہود اسے مانیں یا نہ مانیں لیکن عیسائی تو اسے مانتے ہیں۔ اور جو کتاب حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی اس کا ذکر خود تورات میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ کتنے ایسے صحیفے ہیں جنہیں عہد عتیق میں شامل کیا گیا ہے اور تم ان سب سے واقف ہو۔ ان میں سے کسی رسول کے بارے میں تم بتا سکتے ہو کہ ان کی امت نے ان سے یہ مطالبہ کیا ہو اور پھر پروردگار نے ان کے سامنے کتاب اتار کے دکھائی ہو۔ ہر پیغمبر کو جب بھی مانا گیا تو اس کی سچائی اور اس کی سیرت کی پاکیزگی اور اس کی بے عیب شخصیت کی وجہ سے مانا گیا۔ اور اس کی کتاب پر جو لوگ ایمان لائے وہ کتاب کی اعجازی حیثیت کو دیکھ کر ایمان لائے۔ لیکن اس طرح کا بے ہودہ مطالبہ کبھی کسی نے نہیں کیا۔ یا کم از کم کسی کتاب کے اس طرح نازل ہونے کا کوئی واقعہ تاریخ مذہب میں شامل نہیں۔ ان تمام انبیاء میں ایک موسیٰ علیہ السلام خاص خصوصیت کے حامل ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا، لیکن یہ کلام بھی رودررو نہیں تھا بلکہ من وراءِ حجاب تھا جس

Marfat.com

موسیٰ علیہ السلام اپنے کانوں سے سنتے تھے' یہ ان کا اختصاص اور امتیاز ہے۔ لیکن اے یہود اس پر بھی تمہارے آباؤ اجداد کا حال یہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ جب تک خدا ہم سے رودررو ہو کر کلام نہ کرے ہم کس طرح باور کریں کہ وہ تم سے کلام کرتا ہے۔ اللہ نے انہیں تورات عطا فرمائی تو اسے وہ خود کوہِ طور سے لے کے آئے' اسے لوگوں کے سامنے نازل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ جن حقائق پر ایمان لانا ایمان کی بنیاد ہے اور وہ اصلاً انسانوں کی آزمائش بھی ہے اسے پروردگار اس طرح عام نہیں کرتا اور محسوس شکل نہیں دیتا کہ جس سے ایمان کی آزمائش ہی ختم ہو کر رہ جائے۔ حاصل کلام یہ کہ جب انبیاء کی پوری تاریخ میں کبھی اس طرح کا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا اور اگر کبھی کیا بھی گیا تو اسے پورا نہیں کیا گیا تو تم آخر کس بنیاد پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کا لایعنی مطالبہ کر رہے ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام انبیاء اپنے سیرت و کردار اور اپنی تعلیم میں ایک اشتراک رکھتے ہیں اور تمام اپنی خصوصیات میں یکساں ہیں۔ ان کی انفرادی سیرت سے لے کر ان کے دعوتی کارناموں تک اور ان کے اعلیٰ اخلاق سے لیکر ان کی قوموں کے ردِعمل تک ہر چیز میں وہ بالکل ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ یہی یکسانیت پیغمبروں کی علامت ہے اور یہی ان کی صداقت کی دلیل ہے۔ جس بات کا نام ونشان ان کی پوری تاریخ میں کہیں دکھائی نہ دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز یا وہ دعویٰ نبوت اور رسالت سے میل نہیں کرتا۔ اہل کتاب چونکہ معتدبہ انبیاءِ کرام کو جانتے ہیں' ان کی کتاب میں نبوت کی تاریخ پھیلی ہوئی ہے اور وہ خوب سمجھتے ہیں کہ انبیاءِ کرام کی یکساں علامتیں کیا ہوتی ہیں اور وہ کن خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اس لیے ان کی طرف سے ایسے کسی مطالبے کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ راہِ راست سے ہٹ چکے ہیں' اخلاص ان کے اندر سے نکل چکا ہے۔ ورنہ وہ اس طرح کی کوئی کہنے کی جرأت نہ کرتے۔

یہاں جن انبیاءِ کرام کا ذکر کیا گیا ہے ان کی تعداد صرف گیارہ ہے۔ اور قرآنِ کریم میں ان کے علاوہ بھی انبیاء ورسل کا ذکر ہے۔ لیکن اصولی طور پر قرآنِ کریم نے بیان فرمایا ہے "لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ" (ہر قوم کی طرف کوئی نہ کوئی ہدایت دینے والا ضرور آیا ہے) اس لحاظ سے جہاں جہاں بھی انسانوں کی آبادی ہے وہاں یقیناً اللہ کے نبی اور رسول آئے ہیں۔ لیکن ان میں سے نمایاں ترین افراد کا ذکر کر دیا گیا جن کی اہل کتاب میں عام شہرت تھی۔ ان میں حضرت ابراہیم' حضرت اسماعیل' حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام تو ایک تاریخی ترتیب رکھتے ہیں۔ اور ان میں نسبی رشتہ بھی ہے۔ یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ لیکن اس کے بعد حضرت عیسیٰ' حضرت ایوب' حضرت یونس اور ہارون علیہم السلام میں صفاتی ترتیب ہے۔ یہ تمام بزرگ مختلف قسم کی آزمائشوں میں مبتلا کیے گئے اور تمام تائید الٰہی سے نوازے گئے۔ اس کے بعد حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام میں نسبت یہ ہے کہ دونوں باپ بیٹا ہیں' دونوں نبی ہیں اور دونوں بادشاہ ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر باپ ہونے کی حیثیت سے پہلے آنا چاہیے تھا لیکن ان کے ذکر کو صرف اس لیے موخر کیا گیا تاکہ اللہ نے ان پر زبور نازل کر کے جو اختصاص عطا فرمایا اس کو ذکر کیا جائے۔ زبور اپنی بہت ساری خصوصیات کی وجہ سے ایک منفرد کتاب ہے۔ لیکن موجودہ بائبل میں زبور کے نام سے جو کتاب پائی جاتی ہے وہ ساری کی ساری زبورِ داؤد نہیں ہے۔ اس میں بکثرت مزامیر دوسرے لوگوں کے بھی بھر دیے گئے ہیں اور وہ اپنے اپنے مصنفین کی طرف منسوب ہیں۔ البتہ جن مزامیر کے بارے میں تصریح ہے کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ہیں ان کے اندر فی الواقع کلام حق کی روشنی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے ایک تو اس خصوصیت کے باعث جو موسیٰ علیہ السلام کا اختصاص ہے اور دوسرا اس لیے کہ ان کی حالات بہت حد تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے مشابہ ہیں۔ اس لیے قرآنِ کریم بار بار موسیٰ علیہ السلام کے حالات کا تذکرہ کرتا ہے۔

Marfat.com

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ○

''اللہ نے بھیجا ہے رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ہوشیار کرنے والے بنا کر' تاکہ نہ رہے لوگوں کے لیے اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت۔ اللہ غالب اور حکیم ہے۔'' (النسآء:۱۶۵)

رسولوں کے بھیجنے کا مقصد

اس آیتِ کریمہ میں دو باتیں واضح فرمائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ رسولوں کے بھیجنے کا مقصد کیا تھا؟ اور دوسری یہ بات کہ ان کو بھیجنے کی ضرورت کیا تھی؟ رسولوں کے بھیجنے کا مقصد اور رسولوں کا مشن یہ تھا کہ وہ انسانوں کو یہ بتانے کے لیے بھیجے جاتے تھے کہ تمہیں اللہ نے باقی تمام مخلوقات پر ایک شرف اور فضیلت بخشی ہے۔ تم کسی صحرا کے خودرو پودے نہیں ہو' بلکہ اللہ نے تمہارے جدامجد کو اپنے دست قدرت سے بنایا' پھر اس میں روح پھونکی' فرشتوں کا اسے مسجود بنایا اور زمین پر اسے اپنا خلیفہ اور نبی بنا کر بھیجا۔ وہیں سے اس نبوت و رسالت اور ہدایت کے سلسلے کا آغاز ہوا اور ہر آنے والے نبی نے انسانوں پر واضح کیا کہ تم ایک مکلّف مخلوق ہو' اللہ نے تمہیں زندگی گزارنے کا ایک ضابطہ عطا فرمایا ہے جسے شریعت کہتے ہیں۔ تم اگر اپنی زندگی میں اس کی اطاعت کرتے اور ان احکام کی پابندی کرتے ہو تو تمہیں زندگی میں بھی آسانیاں ملیں گی' آسودگی نصیب ہوگی' حقوق و فرائض کی ادائیگی سے اس زمین کے رہنے والے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک اور ایک دوسرے کی خوشیوں کا باعث ہوں گے۔ ہمدردی اور غمگساری ان کی زندگیوں کے دکھوں کو آسان کر دے گی' تم جب یہ زندگی گزار کے اپنے اللہ کے پاس پہنچو گے تو وہاں ایسی ایسی نعمتیں اور ایسی خوشیاں تمہاری انتظار میں ہوں گی جن کا کبھی تصور بھی تمہارے دل و دماغ میں نہیں گزرا ہوگا۔ اس کامیاب زندگی کی بشارت دینے کے لیے اللہ کے نبی تشرف لاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی وہ یہ بتانے کے لیے آتے ہیں کہ تم نے اگر اپنے مالک' اپنے آقا اور اپنے معبودِ حقیقی کو نہ پہچانا' اس کے احکام کی اطاعت نہ کی' اس کی نازل کردہ شریعت کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ نہ کیا تو تم دنیا میں بھی دکھ بھری زندگی گزارو گے' ہمدردی و غمگساری کے بجائے ایذاء دہی اور خوں ریزی کا چلن عام ہو جائے گا' انسان حیوان اور درندے بن جائیں گے' ہر طرف تباہی مچ جائے گی' بر و بحر میں فساد پھیل جائے گا' ہر طاقت ور کمزور کا شکار کرے گا اور ہر ظالم کے ہاتھوں کمزور پناہ مانگیں گے اور جب تم یہ زندگی گزار کے اللہ کے حضور پہنچو گے تو وہاں سخت جواب دہی کے مراحل سے گزرو گے' ناکامی کی صورت میں جہنم کا وہ عذاب تمہارا مقدر بن جائے گا جس کی ہولناکی کا تم آج تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ ہے وہ مشن جسے لیکر دنیا میں انبیاء و رسل آتے تھے۔

رسولوں کی بعثت کی ضرورت

اور اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ انسانوں سے سوال کرے گا بتاؤ تم نے زندگی کیسے گزاری تمہاری زندگی میرے احکام کی تعمیل میں گزری یا اس کی نافرمانی میں اور اگر تم نے میرے احکام کو توڑا ہے تو آج تمہیں اس کا ہولناک انجام دیکھنا ہوگا۔ اگر لوگوں تک اس پورے پراسس کی خبر پہلے نہیں پہنچی ہوگی اور لوگ کسی ضابطۂ حیات اور شریعت سے واقف نہیں ہوں گے اور انہیں اس بات

Marfat.com

علم نہیں ہوگا کہ ہمارا ایک آقا اور رازق بھی ہے۔ جس کا دیا ہم کھاتے ہیں اور اسی کے دیئے ہوئے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کے پابند ہیں تو جب ایسے بے خبر لوگوں کو جواب دہی کے لیے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا تو وہ پروردگار سے کہنے کی جرأت کریں گے کہ جن باتوں کا ہم سے سوال کیا جارہا ہے' ہمیں تو ان باتوں کا کوئی علم نہیں تھا' ہم تو نہیں جانتے تھے کہ ہمارا ایک آقا بھی ہے' ہم اسی کے احکام کے پابند ہیں' ہمارا ایک معبود بھی ہے۔ جس کی ہمیں بندگی بجالانا ہے' ہمیں تو کسی بتانے والے نے ان باتوں کی خبر نہیں دی تھی اور کسی ہادی نے ہماری سامنے ہدایت کا راستہ نہیں کھولا تھا' تو جن باتوں کے بارے میں ہمیں بتایا نہیں گیا آج ہم سے اس کا سوال کیوں کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سب سے زیادہ عدل وانصاف کی حامل ہے۔ وہ کسی سے بے انصافی نہیں کرسکتی۔ جب اس کے بندے یہ کہتے کہ ہمیں تو اُن باتوں کی کوئی خبر تک نہ تھی جس کا ہم سے جواب طلب کیا جارہا ہے تو پروردگار نہ تو ان سے کوئی بات پوچھ سکتے اور نہ انہیں سزا دے سکتے ہیں۔ اس ضرورت کے تحت پروردگار نے رسول بھیجے' انہوں نے انتہائی مصائب اور مخالفتوں کے ہجوم میں بھی لوگوں تک اللہ کا دین پہنچایا اور ان کے سامنے یہ بات واضح کی کہ تمہارا ایک خالق و مالک ہے' وہ ایسی اور ایسی صفات کا حامل ہے' اس کی خوشی ان باتوں میں ہے اور وہ ان باتوں سے ناراض ہوتا ہے' تم اس کی رضا حاصل کرلو گے تو اخروی نعمتوں سے شادکام ٹھہرو گے اور اگر تم نے اسے ناراض کردیا تو ابدی جہنم تمہارا مقدر ہوگا۔ اس ضرورت کے تحت اللہ نے اپنے رسول بھیجے اور دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہ رہا جس میں اس کے بشارت دینے اور ڈرانے والے نہ آئے ہوں۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کے بعد چونکہ نبوت ختم ہوگئی تو وہ ذمہ داری جو انبیاء ورسل ادا کرتے تھے وہ اس امت کے سپرد کردی گئی۔ اور اس امت کو اس بات کا پابند کردیا گیا کہ دنیا کے ایک ایک کونے میں تمہیں اللہ کا دین پہنچانا ہے تاکہ کل کو کوئی شخص اللہ کے سامنے حجت بازی نہ کرسکے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ شاہ فیصل مرحوم کے چچا شاہ عبداللہ حج کے موقع پر منیٰ میں یا حج سے فراغت کے بعد ریاض میں دنیا بھر سے آئے ہوئے علماء کو علمی مجالس میں مدعو کرتے اور ان سے علمی موضوعات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب کہ دنیائے اسلام کے بڑے بڑے علماء موجود تھے اور اتفاق سے ان علماء میں سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمۃ بھی موجود تھے۔ میرا گمان یہ ہے کہ مولانا اس کے بعد اپنی علالت کی وجہ سے سعودی مملکت کا سفر نہیں کرسکے۔ شاہ عبداللہ نے پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ آج بھی افریقہ کے بعض جزیروں میں ایسے لوگ موجود ہیں جن تک اللہ کے دین کی دعوت نہیں پہنچی اور وہ کچھ نہیں جانتے کہ اسلام کیا ہے؟ تو قیامت کے دن کیا تعالیٰ ایسے لوگوں سے بھی سوال کرے گا؟ علماء نے اس کے مختلف جوابات دیئے۔ میزبان نے سب سے آخر میں مولانا مودودی مرحوم سے بھی پوچھا کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ یہ تو میں نہیں جانتا اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے کیا پوچھیں گے؟ لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ ہم سے کیا پوچھا جائے گا؟ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کے حکمرانوں اور ان کے ذمہ دار لوگوں سے یہ سوال کریں گے کہ میں نے تمہیں ڈیڑھ عرب کے قریب افرادی قوت عطا کی تھی' ساٹھ کے قریب تمہیں ملک بخشے تھے' سمندر کے تمام قابل ذکر ساحلوں پر تمہارا قبضہ تھا' تمہارے پاؤں تلے زرسیال بہتا تھا' دولت کے خزانے میں نے تمہارے ہاتھوں میں دے دیئے تھے' لیکن ان تمام وسائل کے باوجود دنیا میں ایسے لوگ بھی تھے جن تک میرا دین نہیں پہنچا' بتاؤ تم کہاں مرگئے تھے؟ تم نے ان وسائل کو کہاں استعمال کیا؟ تمہارے خزانے کہاں لٹتے رہے؟ تم آخری امت ہونے کی وجہ سے اس امانت کے امین بنائے گئے تھے' تمہیں شہادت حق کے منصب پر فائز کیا گیا تھا' تم نے اس شہادت کا حق کہاں تک ادا کیا؟ کہا جاتا ہے کہ مولانا کی یہ بات سن کر شاہ عبداللہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کے بعد رابطہ عالم اسلامی جیسا ادارہ وجود میں آیا۔ مدینہ یونیورسٹی جیسی درسگاہ قائم ہوئی اور وہاں سے فارغ ہوکر نکلنے والوں کو دنیا بھر کے ممالک میں مبلغ اور مندوب بنا کر بھیجا جانے لگا۔

Marfat.com

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ نے تمہیں عقل اور فطرت کی رہنمائی سے نوازا ہے۔ خیروشر کی معرفت تمہارے اندر ودیعت کی ہے۔ وہ اگر اپنے رسول نہ بھیجتا اور اس کے باجود تمہیں نافرمانیوں کی سزا میں پکڑ لیتا تو کوئی شخص اس کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہ کرتا۔ اور کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ غالب اور عزیز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ چونکہ وہ حکیم بھی ہے اس لیے اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ کسی کو اتمام حجت کے بغیر سزا نہ دے۔ انبیاء کرام کو بھیج کر اور کتابیں اتار کر اس نے انسانوں پر حجت تمام کردی' تاکہ کسی شخص کو عذر باقی نہ رہے۔

لٰکِنِ اللّٰہُ یَشْھَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَیْکَ اَنْزَلَہٗ بِعِلْمِہٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یَشْھَدُوْنَ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ طَرِیْقًا ۝ اِلَّا طَرِیْقَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ؕ وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرًا ۝

"لیکن اللہ گواہی دیتا ہے اس چیز کی جو اس نے تم پر اتاری ہے کہ اس نے اس کو اپنے علم سے نازل کیا ہے۔ اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں۔ اور گواہی کو تو اللہ ہی کافی ہے۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑے؛ جن لوگوں نے کفر کیا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ان کو نہ تو خدا بخشنے والا ہے اور نہ جہنم کے سوا جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ان کو کوئی اور راستہ دکھانے والا ہے۔ اور اللہ کے لیے یہ بات آسان ہے۔" (النسآء:۱۶۶تا۱۶۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

سابقہ آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم رسولوں کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجتے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا میں اسی مقصد کے لیے بھیجے گئے ہیں آپ اس عظیم قافلے کے آخری فرد اور سالار ہیں۔ آپ کے بعد سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا ہے۔ اگر لوگوں نے آپ کی دعوت سے ہدایت حاصل نہ کی تو آپ کے بعد ہدایت کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ اس میں جہاں لوگوں کے لیے تنبیہ ہے وہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک فکر مندی کی بات بھی ہے۔ کہ یہ بدبخت لوگ اگر میری دعوت پر ایمان نہیں لاتے تو میرے بعد تو کوئی سمجھانے والا نہیں آئے گا جو جگر کا خون پی پی کر ان کی ہدایت کا سامان کرے اور ان کی طرف سے دکھ اٹھا اٹھا کر ان کے لیے دعائیں مانگے۔ البتہ اس بات کا امکان ہے کہ ان کی ناقدری اور ناشکری کے باعث اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل کر دے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر یہ لوگ آپ کی نبوت کی گواہی نہیں دیتے اور یہ آپ کو ماننے کے لیے تیار نہیں اور عجیب وغریب اعتراضات اور شبہات آپ کی نبوت پر وارد کر رہے ہیں تو آپ ہرگز اس کی پرواہ نہ کریں۔ یہ لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ آپ کی حقانیت کی گواہی دیں۔ اور اس بات کو سمجھ سکیں کہ واقعی آپ اللہ کے نبی ہیں۔ اس کی گواہی خود اللہ دیتا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ آپ

Marfat.com

پر جو وحی اتری ہے یہ کسی انسانی وسوسہ کا نتیجہ نہیں' بلکہ اللہ نے اپنے علم سے اسے نازل فرمایا ہے۔ اس میں کسی دغدغۂ شیطانی کی کوئی آمیزش نہیں۔ اس کا تعلق علم الٰہی کے اس سرچشمہ سے ہے جس سے تمام رسول فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔ اور اس پر اللہ کے فرشتے بھی گواہ ہیں۔ فرشتوں کا سردار جب اس وحی کو لے کر اترتا ہے تو ہزاروں فرشتے اس کے ہمرکاب ہوتے ہیں۔

اللہ اور فرشتوں کی گواہی کا ادراک

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی پر جب یہ وحی اترتی ہے تو یقیناً اللہ اس کا گواہ ہوتا ہے اور فرشتے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں' لیکن انکار کرنے والوں پر اس گواہی کا کیا اثر ہوسکتا ہے؟ انہیں اس بات کا کس طرح احساس ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وحی کے گواہ ہیں اور فرشتے بھی اس کی گواہی دے رہے ہیں لیکن جو آدمی تھوڑی سی بصیرت رکھتا ہے' اس سے اللہ اور اس کے فرشتوں کی یہ گواہی مخفی نہیں رہ سکتی۔ ایک امی نبی کی زبان سے ایسے کلام کا جاری ہو جانا جس کا جواب لانا انسانی بس کی بات نہیں اور بڑے بڑے فصیح و بلیغ جس کے سامنے گنگ ہو کر رہ گئے پھر اس نبی کا ایک ایسے ماحول میں ہر لحاظ سے ایسی پاکیزہ زندگی گزارنا جس کا تصور بھی اس ماحول میں نہ کیا جاسکتا ہو اور پھر اس کے ہاتھ سے ایسے معجزات کا ظہور جس کے لیے صرف اللہ کے فرشتے ہی کافی ہوسکتے ہوں' یہ اللہ اور اس کے فرشتوں کی گواہی نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اہل دنیا پیغمبر پر اترنے والی وحی کے بارے میں ہزار اشتباہات کا اظہار کریں' یہ امر واقعہ ہے کہ خود پیغمبر کو کبھی اس میں اشتباہ لاحق نہیں ہوتا۔ وہ کلامِ الٰہی کو اپنے دل میں محسوس کرتا ہے اور فرشتوں کی آوازوں کو اپنے کانوں سے سنتا ہے۔ وہ افق کے پار آیاتِ الٰہی کو دیکھتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کے اندر ایک ایسا یقین پیدا ہوتا ہے کہ ساری دنیا کی مخالفتوں کے طوفان بھی اس میں تزلزل پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ پیغمبر کا یہ یقین اور اطمینان بجائے خود ایک صاحب بصیرت کے لیے اللہ کی گواہی ہے۔ دنیا ساری بھی پیغمبر کو ماننے سے انکار کر دے لیکن پیغمبر کے اطمینان کے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے۔ اور اس گواہی کے اثرات پیغمبر کے باطن پر محیط تو ہوتے ہی ہیں پیغمبر کے واسطے سے اس کا اثر مخالفین تک بھی پہنچتا ہے۔ وہ بے شک ایمان نہ لائیں لیکن اپنی زبان سے پیغمبر کو جھوٹا کہنے کی جرأت بہت کم کرتے ہیں۔ ان کی سرکشی اور نفرت انہیں جھکنے نہیں دیتی لیکن ان کے دل اس یقین سے بہرہ ور ہوتے ہیں کہ پیغمبر کی دعوت ایک سچی دعوت ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ جو لوگ ایسی یقینی اور کھلی دعوت کو بھی ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے خود بھی رکتے ہیں اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں۔ وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑے' اب ان کو اس گمراہی سے نکالنے والا شاید کوئی نہ ہو۔ اور جن لوگوں نے اس دعوت کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا انہوں نے دراصل اپنے ساتھ ظلم کیا۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی نہ مغفرت فرمائیں گے اور نہ انہیں اس الجھن سے نکلنے کا کوئی راستہ دیں گے' اب ان کے سامنے ایک ہی راستہ ہے اور وہ جہنم کا راستہ ہے' جس پر یہ چلتے ہوئے بالآخر جہنم رسید ہو جائیں گے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

"اے لوگو تمہارے پاس یہ رسول تمہارے رب کی طرف سے حق لے کر آ گیا ہے پس ایمان لے آؤ' یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور اگر انکار کرتے ہو تو بے شک اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا ہے حکمت والا ہے۔" (النسآء:۱۷۰)

Marfat.com

ایک عام تنبیہ جس میں روئے سخن نصاریٰ کی طرف ہے

اس آیتِ کریمہ میں اگرچہ خطاب تمام انسانوں سے ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہے اور ان میں بھی بطورِ خاص نصاریٰ کو توجہ دلائی جارہی ہے کہ تم نے آج تک اپنی شریعتوں میں نہ جانے کیسی کیسی تحریفات کی ہیں۔ اور تمہارے اہل علم جانتے ہیں کہ تم نے حق کو بے میل نہیں رہنے دیا۔ صرف احکام ہی میں کمی بیشی نہیں کی بلکہ دین کے بنیادی تصورات تک بدل ڈالے۔ اللہ کے رسول کی حیثیت کو کیا سے کیا بنا دیا۔ تمہیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ یہ رسول حق لے کر آیا ہے اور جن باتوں کو تم نے بگاڑ دیا تھا اس کو صحیح شکل وصورت میں واضح کررہا ہے اور جن حقائق کو تم مسخ کر چکے ہو ان میں سے ایک ایک حقیقت کو دلائل و براہین کے ساتھ تمہارے سامنے ثابت کر رہا ہے۔ اب تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ایمان لے آؤ۔ اللہ کے اس آخری رسول کو مانو اور آخری شریعت کو تسلیم کرلو۔ لیکن اگر تم اپنے مذہبی تعصبات کا شکار ہو کر ایمان لانے سے انکار کرتے ہو تو پھر یاد رکھو کہ تم اللہ کا کچھ نہیں بگاڑو گے کیونکہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کی مخلوق اور اس کی مملوک ہے۔ اور کائنات کا ایک ایک انچ اس کے قبضے میں ہے اور ایک ایک مخلوق اس کے قابو میں ہے۔ تم اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ وہ سب کے اعمال سے واقف ہے اور جب جزاء وسزا دینے پر آئے گا تو اپنے علم کے مطابق جزا دے گا۔ لیکن اب اگر وہ پکڑنے میں جلدی نہیں کررہا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ حکیم ہے' ابھی اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ڈھیل دی جائے۔ اسی ڈھیل کی وجہ سے تمہیں مہلت ملی ہوئی ہے' لیکن تمہیں اس میں دلیر نہیں ہونا چاہئے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۫ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۟

''اے اہل کتاب اپنے دین میں غلومت کرو اور اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ ڈالو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم تو اللہ کے رسول اور اس کے کلمہ ہیں۔ جسے اس نے مریم کی طرف القا فرمایا۔ اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں' پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تثلیث کا دعویٰ نہ کرو۔ باز آجاؤ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ معبود تو بس تنہا اللہ ہی ہے۔ وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی اولاد ہو۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ کافی کارساز ہے۔'' (النسآء:171)

عیسائیوں کا اصل روگ غلو ہے

اس آیتِ کریمہ میں اہل کتاب سے مراد نصاریٰ ہیں۔ انہیں خطاب کرکے ان کے ایک ایک غلط عقیدے کا ذکر فرمایا اور اس کی اصلاح فرمائی ہے۔ یہ آیتِ کریمہ اتنی واضح' اس قدر سہل اور اس قدر مدلل ہے کہ ہدایت حاصل کرنے والوں کے لیے ہدایت سے بڑھ کر شاید کہیں اور روشنی کا سامان نہ ہو۔ سب سے پہلے تو اصل مرض کی نشاندہی فرمائی گئی کہ غلو نہ کرو۔ غلو کہتے ہیں کہ

Marfat.com

میں جس چیز کا جو درجہ و مرتبہ یا جو وزن و مقام ہو اس کو بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے۔ عیسائیوں کے تمام عقائد کی خرابی کا اصل سبب یہی ہے کہ یہود نے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دشمنی میں غلو کیا تھا عیسائیوں نے اس سے بڑھ کر ان کی محبت میں غلو کیا۔ اور اس غلو کے نتیجے میں عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عجیب و غریب عقائد اختیار کر لیے۔ اس لیے فرمایا کہ اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کسی اور بات کو منسوب نہ کرو۔ کیونکہ تم نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ کی جانب جو باتیں منسوب کر رکھی ہیں وہ ہرگز حق نہیں۔ حق صرف یہ ہے کہ عیسیٰ ابن مریم ہیں۔ یعنی وہ حضرت مریم کے بیٹے اور اللہ کے رسول ہیں اور اس کے کلمہ ہیں۔ لیکن تم نے نہ جانے انہیں کیا سے کیا بنا دیا ہے؟ جو شخص ایک عورت کا بیٹا ہے وہ خدا کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے اور جس عورت سے انسانی اولاد ہوتی ہے اور وہ دوسری عورتوں کی طرح کھاتی پیتی اور ان تمام عوارض اور لوازم کا شکار ہوتی ہے جس سے دوسری عورتیں دوچار ہوتی ہیں وہ عورت خدا کیسے ہو سکتی ہے؟ پروردگار نے حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ فرمایا۔ تو اللہ کے کلمہ کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے اپنا حکم حضرت مریم کے رِحم پر نازل فرمایا کہ کسی مرد کے نطفہ سے سیراب ہوئے بغیر حمل کا استقرار قبول کر لے۔ لیکن تم نے بیہودگی یہ کی کہ کلمہ کو حکم کے معنی میں لینے کے بجائے یونانی فلسفہ سے متاثر ہو کر کلام کے معنی میں لیا اور پھر اسے رفتہ رفتہ اللہ کی ذاتی صفتِ کلام میں بدل دیا۔ اور اس سے یہ قیاس کیا کہ اللہ کی اس ذاتی صفت نے حضرت مریم کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کی جو مسیح کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح مسیح کو الوہیت کے مقام پر فائز کر دیا۔ حالانکہ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اللہ نے حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے محض اپنے کلمہ ''کُن'' سے پیدا فرمایا۔ اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کو کلمہ ''کن'' یعنی اپنے حکم سے پیدا فرمایا ہے۔ انسانوں کے جدامجد حضرت آدم علیہ السلام بھی کلمہ کن سے پیدا ہوئے۔ حضرت عیسیٰ کے تو والد نہیں تھے والدہ تو تھیں لیکن حضرت آدم علیہ السلام کے نہ والد تھے نہ والدہ۔ انہیں اللہ نے کلمہ کن سے پیدا فرمایا تو وہ نہ خدا کے بیٹے ہوئے اور نہ خدا ٹھہرے۔ لیکن حضرت عیسیٰ کو تم نے اسی کلمہ کا سہارا لے کر خدا بنا ڈالا۔

اس کے بعد دوسرا لفظ ہے ''روح منہ'' (کہ وہ اللہ کی جانب سے روح ہیں) اس سے عیسائیوں نے عقیدہ بنا لیا چونکہ انہیں خدا کی طرف سے ایک روح کہا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی روح ہیں۔ انہوں نے ''روح من اللہ'' کو ''روح اللہ'' قرار دے دیا۔ اور اس کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی روح مقدس تھی۔ جو مسیح کے اندر حلول کر گئی تھی۔ اس طرح اللہ اور مسیح کے ساتھ ایک تیسرا خدا روح القدس کو بنا ڈالا گیا۔ حالانکہ جس طرح اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام میں اپنی روح پھونکنے کا ذکر فرمایا ہے اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرشتوں کو اللہ نے حکم دیا ''نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین'' (جب میں اس میں اپنی روح ڈال دوں تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں اپنی روح ڈالی۔ تو اس سے روح القدس کے نام سے ایک خدا وجود میں آ گیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام میں اپنی روح ڈالی تو ان کے بارے میں تو عیسائیوں نے ایسا کوئی عقیدہ اختیار نہیں کیا حالانکہ بات صاف ہے۔ جس کو بھی زندگی ملتی ہے وہ اللہ کی روح کی نسبت سے ہی ملتی ہے۔ اسی روح کو اپنے خاص بندوں میں تعظیم و تکریم اور تقرب الٰہی کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی طرف نسبت دے دیتے ہیں۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اس نسبت سے شاید یہ بتانا بھی مقصود تھا کہ ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وہ پاکیزہ روح عطا کی ہے جو بدی سے ناآشنا، سراسر حقانیت اور از سرتاپا فضیلت اخلاق کی حامل ہے۔

Marfat.com

ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ عیسیٰ علیہ السلام بھی باقی رسولوں کی طرح ایک رسول تھے اور تثلیث کے دعوے سے باز آجاؤ۔ معبود تو بس وہی ایک اللہ ہے نہ اس کا کوئی شریک ہے' نہ کوئی ہمسر۔ وہ اس بات سے پاک ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو' کیونکہ اولاد اپنے باپ کا عکاس ہوتی ہے اور باپ اپنی اولاد کی جوانی کا محتاج ہوتا ہے۔ اللہ ہر احتیاج سے پاک ہے۔ دنیا میں ہر چیز اس کی ملکیت ہے' زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ سب اس کے حکم کا اسیر ہے۔ ساری دنیا کی کارسازی کے لیے اللہ کی ذات تنہا کافی ہے۔ تم نے اس قسم کے بیہودہ تصورات آخر کس بنیاد پر پیدا کیے؟ تمام رسولوں کی تعلیمات کو دیکھو تمہیں کہیں تثلیث کا سراغ نہیں ملے گا۔ تو آخر یہ فتنہ تم نے کہاں سے اختراع کر لیا؟ جب وہ اپنی ذات اور صفات میں کامل اور اپنی خلق کی کارسازی کے لیے کافی ہے تو پھر تم نے شرک کی گنجائش کہاں سے نکالی؟ لیکن عیسائیوں نے اپنے لیے ایک ایسی الجھن پیدا کر لی ہے اور اٹھارہ سو سال سے اس کے ایسے اسیر ہوئے ہیں کہ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ وہ ایک طرف تو توحید کو مانتے ہیں کیونکہ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال صریح طور پر توحید کو ثابت کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ تثلیث کے بھی قائل ہیں انہوں نے مسیح اور روح القدس کی الوہیت کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے ساتھ شامل کر کے تثلیث کا عقیدہ گھڑ لیا ہے۔ ایک طرف توحید اور دوسری طرف تثلیث یہ ایک ایسی چیستان ہے جس کا کوئی حل ممکن نہیں۔ تین میں ایک اور ایک میں تین اس لایعنی بات کو کون سلجھا سکتا ہے۔ لیکن ایک پوری امت ہے جو اس پر اصرار کیے چلی جا رہی ہے۔

لَنْ
يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ
الْمُقَرَّبُوْنَ ۗ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ
اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿١٧٢﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ
اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا
وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ ﴿١٧٣﴾ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿١٧٤﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ
بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿١٧٥﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ

Marfat.com

وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۶﴾ يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ
قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِى الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ
وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ
لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنْ
كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ ع

عربی رکوع ۲۴ (مسیح (علیہ السلام) ہرگز عار نہیں سمجھتے کہ وہ اللہ کے بندہ ہوں اور نہ مقرب ترین فرشتے۔ جو اللہ کی بندگی کو عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو اللہ ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔ پس جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے تو اللہ انہیں ان کا پورا پورا اجر دے گا اور اپنے فضل سے انہیں مزید عطا کرے گا۔ اور رہے وہ لوگ جنہوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا پس اللہ ان کو عذاب دے گا دردناک عذاب۔ اور وہ اللہ کے بالمقابل نہ کسی کو اپنا دوست پائیں گے نہ مددگار ○ اے لوگو! آ گئی تمہارے پاس ایک روشن دلیل تمہارے رب کی طرف سے اور ہم تم پر ایک کھلا ہوا نور نازل کر چکے ہیں۔ تو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اسے انہوں نے مضبوط پکڑا اللہ انہیں ضرور اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور انہیں ہدایت کرے گا اپنی طرف سیدھے راستے کی ○ اے پیغمبر لوگ آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں کہو اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے کلالہ (کی میراث) کے بارے میں۔ اگر کوئی ایسا آدمی فوت ہو جائے جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو بہن کا نصف حصہ ہے اس کے ترکہ میں سے اور وہ اپنی بہن کا وارث ہو گا اگر اس بہن کی کوئی اولاد نہ ہو۔ پھر اگر دو بہنیں ہیں تو ان دونوں کو دو تہائی ملے گا اس سے جو اس نے چھوڑا اور اگر وارث ہوں بہن بھائی مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد (بھائی) کا حصہ دو عورتوں (بہنوں) کے حصہ کے برابر ہے۔ بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تاکہ گمراہ نہ ہو جاؤ۔ اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے) (آیات ۱۷۲ تا ۱۷۶)

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ
عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ○ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوْا

Marfat.com

الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ۝ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ۝

"مسیح (علیہ السلام) ہرگز عار نہیں سمجھتے کہ وہ اللہ کے بندہ ہوں اور نہ مقرب ترین فرشتے۔ جو اللہ کی بندگی کو عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو اللہ ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔ پس جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے تو اللہ انہیں ان کا پورا پورا اجر دے گا اور اپنے فضل سے انہیں مزید عطا کرے گا۔ اور رہے وہ لوگ جنہوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا پس اللہ ان کو عذاب دے گا دردناک عذاب۔ اور وہ اللہ کے بالمقابل نہ کسی کو اپنا دوست پائیں گے نہ مددگار۔" (النسآء ۴:۱۷۲ تا ۱۷۴)

قوموں کی گمراہی کا ایک سبب

قوموں کی گمراہی کا ایک سبب تو یہ رہا کہ ان کے پندارِ نفس اور غرورِ عقل نے انہیں اللہ کی ذات کے سامنے جھکنے پر آمادہ نہ ہونے دیا۔ کائنات کی تخلیق کی اپنی عقل سے عجیب وغریب توجیہات کیں۔ اور اگر ان میں سے کسی نے اللہ کو بطور خالق تسلیم بھی کیا تو انسانی زندگی کے راہنما اور ضابطۂ حیات دینے والے کی حیثیت سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں پیدا کر کے اور کائنات کو حرکت دے کر فارغ ہو گیا اب کائنات کے ساتھ انسان کے تعلق اور خود انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے راہنما اصول اور ضوابطِ کار بنانے کا کام خود سے انجام دینا ہے۔ اس کی عقل ودانش اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ ہر بات کی حقیقت کو سمجھے اور زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے طریق کار طے کرے۔ اور جہاں کہیں دشواری پیش آئے باہمی مشاورت سے اس کا راستہ نکالے۔ لیکن ہر حال میں اسے زندگی اسی طرح اور اسی طریقے سے گزارنی ہے جس کی راہنمائی انسانی عقل مہیا کرے۔ یہ وہ طبقہ ہے جنہوں نے انسانی عقل ودانش کی حقیقت سمجھنے میں کوتاہی کی۔ اور اس پر وہ بوجھ ڈال دیا جس کی وہ متحمل نہیں ہو سکتی۔ اور اسے راہنمائی کے لیے زندگی کے ان دوائر میں کھینچ لیا گیا جو دوائر اس کی حدود سے ماوراء اور اس کی رسائی سے بالا تھے۔ نتیجہ معلوم ہے کہ اس طرح سے انسان نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں اور ایسے ایسے فیصلے کیے جس نے انسانیت کی قسمت کھوٹی کر دی۔

دوسرا سبب

انسانوں کی دوسری قسم یا دوسرا طبقہ وہ ہے جنہوں نے اس بات کو تو تسلیم کیا کہ عقل ودانش کی راہنمائی محسوسات اور معقولات میں تو کام دے سکتی ہے لیکن مابعد الطبیعات اور عالم غیب سے تعلق رکھنے والے مسائل میں اس کی راہنمائی نہ صرف ناکافی ہے بلکہ خطرناک بھی ہے۔ اس لیے ان مسائل کے حل کے لیے یہ لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور اس کی نازل کردہ کتابوں کو تسلیم کیا۔ ان میں سے جو لوگ جادۂ مستقیم پر قائم رہے اور مذہب کی ہدایات کو علی حالہٖ اور کما حقہ تسلیم کیا وہ تو اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں، اللہ ان کی دنیا میں بھی مدد فرماتا ہے اور آخرت میں بھی ان کو سرخرو فرمائے گا۔ لیکن ان میں سے ایسے لوگوں کی بھی بڑی تعداد

Marfat.com

جو اپنے انبیاء اور مذہبی راہنماؤں کو مان لینے کے بعد انکی دی ہوئی ہدایات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور پھر ان کی عظمت اور ان کے کارناموں کو دیکھتے ہوئے ایسے غلو کا شکار ہوتے ہیں کہ اللہ کا نام تو برائے وزن بیت رہ جاتا ہے ساری عقیدتوں اور محبتوں کا مرکز ذات نبوت بن جاتی ہے۔ ان میں وہ ایسے ایسے خصائص، ملکات اور صلاحیتوں کو تسلیم کرنے لگتے ہیں جن کا رشتہ اللہ کی صفات سے ہے۔ بعض دفعہ تو انہیں خدا ہی قرار دے دیتے ہیں، لیکن اگر گمراہی میں اتنی دور نہیں بھٹکتے تو خدا کی صفات میں شرکت تو ان لوگوں کے نزدیک نبوت یا بزرگی کا لازمہ ہے۔ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی محیر العقول پیدائش، آپ کا پنگوڑھے میں باتیں کرنا اور نبوت کے اعلان کے بعد آپ کے حیرت انگیز معجزات ان کے غلو کا سبب بنے۔ اور انہوں نے یقین کر لیا کہ جس ذات میں ایسی خارق عادت صفات پائی جاتی ہیں وہ اگر خدا نہیں تو خدا کا بیٹا اور خدا جیسا ضرور ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایسی عظمتوں کی مالک شخصیت اللہ کی بندہ کہلائے اور اس کی بندگی بجا لائے۔ چنانچہ یہ لوگ بشریت اور عبدیت کو ایک کمتر مرتبہ سمجھ کر اپنی ممدوح شخصیت کو اس سے بالا قرار دینے کوششوں میں لگ جاتے ہیں۔ عیسائی تو اس غلو کی سب سے اعلیٰ مثال ہیں لیکن باقی امتیں بھی اس فتنہ سے محفوظ نہ رہیں۔ ان کے لیے ہمیشہ یہ بات فتنہ کا باعث بنی رہی کہ اللہ کا نبی اپنی ایسی ایسی عظمتوں کے باوجود اللہ کا بندہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ یقیناً اللہ کے بندوں سے کسی برتر مقام کا حامل ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو قوموں کے لیے مزلۂ قدم بنی اور یہیں پہنچ کر پاؤں پھسلنے لگتے ہیں۔ امت مسلمہ کو دیکھ لیجئے باوجود اس کے کہ انہیں حامل دعوت امت قرار دیا گیا اور توحید کی امانت ان کے سپرد کی گئی اور قرآنِ کریم نے سب سے زیادہ زور کلمۂ توحید کے تحفظ پر دیا اور جن جن راہوں سے گمراہی پیدا ہو سکتی تھی وہیں وہیں نشاندہی فرما کر بچنے کی تلقین فرمائی۔ بایں ہمہ امت مسلمہ آج جس طرح اس میدان میں ٹھوکریں کھا رہی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت سے پوری طرح بہرہ ور تھے، اس لیے آپ نے اپنے مرض الوفات میں بار بار اس کی طرف توجہ دلائی اور یہود و نصاریٰ پر بیماری کے دوران آپ ؐ لعنت فرماتے رہے کہ ان لوگوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔ عیسائیوں کی گمراہیوں کی طرف آپ ؐ نے بطورِ خاص متوجہ فرمایا جسے حالی مرحوم نے نظم کرتے ہوئے لکھا۔

تم اوروں کی مانند دھوکا نہ کھانا
کسی کو خدا کا نہ بیٹا بنانا
مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا
بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا
سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ
اسی طرح میں بھی ہوں اک اس کا بندہ
مجھے حق نے دی ہے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

Marfat.com

مقام بندگی

ایک روایت میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات مقام قرب کی انتہا تک پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا "بِمَآ اُشَرِّفُکَ یَا مُحَمَّد " (اے محمدؐ! میں آج تجھے کس اعزاز سے مشرف کروں؟) تو حضور نے عرض کی "بِنِسْبَتِیْ اِلَیْکَ بِالْعُبُوْدِیَّۃِ " (مجھے اپنا بندہ ہونے کا شرف عطا فرما) شاید یہی حکمت ہے کہ جس آیت میں معراج کا ذکر ہے وہاں حضور کو اپنا بندہ کہہ کر ذکر فرمایا گیا ہے۔ پیش نظر آیت کریمہ میں اسی حقیقت کو بیان فرمایا گیا ہے کہ تم نے مسیح اور بعض مقرب فرشتوں کو اللہ کے ساتھ شریک کر دیا اور تمہیں یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ وہ اپنی اس قدر بڑائی کے باوجود پھر بھی اپنے آپ کو اللہ کا بندہ کہیں۔ فرمایا تمہیں تو یہ بات عجیب اس لیے لگتی ہے کہ تمہیں اس حقیقت کا ادراک نہیں کہ انبیاء کرام' فرشتوں اور بزرگانِ دین کو جو عظمتیں نصیب ہوتی ہیں وہ ان کی بندگی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ وہ جیسے جیسے اللہ کی بندگی میں ترقی کرتے چلے جاتے ہیں' ویسے ویسے ان کے مقامات بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ عبدیت ہی چونکہ مقاماتِ عظمت کا مقدمہ ہے اور یہی تمام عظمتوں کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ مسیح علیہ السلام کو اللہ کی بندگی بجا لانے اور اللہ کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالنے سے انکار ہو۔ اور وہ اس بات کو اپنے لیے عار سمجھیں۔ جو چیز ان کے لیے وجہِ شرف ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جو شخص بھی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا ہے اور وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا ہو کر تکبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سب کو اپنے حضور اکٹھا کریں گے۔ کاش تم اس دن انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ اس وقت ان کی کیا کیفیت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ انہیں کٹہرے میں کھڑا کر کے پوچھے گا "لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمِ" (بتاؤ آج کس کی حکومت ہے؟) سروری' بڑائی اور عظمت کا مالک بتاؤ آج کون ہے؟ آج کہاں ہیں تکبر کرنے والے اور کہاں ہیں وہ جن کو تم عبدیت سے بالا سمجھتے تھے؟ تب سب اللہ کے حضور لرزاں و ترساں کھڑے ہوں گے اور اللہ کے جلال سے کانپ رہے ہوں گے۔ اس روز وہ لوگ اللہ کے عرش کے سائے میں ہوں گے اور بعض ایسے ہوں گے جن پر اللہ کی رحمت سایہ فگن ہوگی' یہ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ پر ایمان لائے اور اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزاری۔ ان کا ایک ایک لمحہ اللہ کی فرمانبرداری میں گزرا انہیں اللہ تعالیٰ ان کے ایمان و عمل کا نہ صرف پورا پورا بدلہ دے گا بلکہ اپنے فضل و کرم سے اس بدلے میں اضافہ بھی کرے گا لیکن جن لوگوں نے اللہ کی بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا اللہ ان کو ایسا عذاب دے گا کہ خود عذاب بھی اس سے تکلیف محسوس کرے گا۔ وہاں یہ لوگ چیخیں گے اور مدد کے لیے ان ہستیوں کو پکاریں گے جنہیں وہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے رہے لیکن وہ کسی کو اپنا حمایتی اور مددگار نہیں پائیں گے۔ اس دن کوئی بھی اللہ کے جلال کے سامنے دم نہیں مار سکے گا۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ۝
فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ
وَفَضْلٍ ۙ وَّیَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ۝

Marfat.com

”اے لوگو! آ گئی تمہارے پاس ایک روشن دلیل تمہارے رب کی طرف سے اور ہم تم پر ایک کھلا ہوا نور نازل کر چکے ہیں۔ تو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اسے انہوں نے مضبوط پکڑا اللہ انہیں ضرور اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور انہیں ہدایت کرے گا اپنی طرف سیدھے راستے کی۔“ (النسآء: ۴: ۱۷۴ تا ۱۷۵)

برہان اور نور سے مراد

اس آیتِ کریمہ میں خطاب تو پوری نوعِ انسانی کو ہے لیکن اس سے پہلے کی آیات میں چونکہ نصاریٰ کے باطل عقائد پر تنقید کی گئی ہے اس لیے روئے سخن ان کی طرف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے تمام دنیا کے لوگو! اور خاص طور پر عیسائیو! تمہاری طرف تمارے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل آ گئی ہے۔ اور ہم نے تمہاری طرف ایک واضح روشنی اور نور بھی نازل کیا ہے۔ یہاں روشن دلیل سے مراد آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ اور نورِ مبین سے مراد قرآنِ کریم ہے۔ قرآنِ کریم اپنی ہدایت اور حکمت کے ساتھ دل و دماغ کی گتھلیاں سلجھاتا' الجھنیں دور کرتا اور اڑچنوں کے بل نکالتا ہے۔ انسان بعض دفعہ جدید مسائل کے حل میں علم کی مختلف وادیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے۔ جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر قرآن کریم کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اسے بار بار پڑھتا ہے اور اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر غور و فکر کرتا ہے تو اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے آنے والی کتاب بعض دفعہ چند جملوں میں لاینحل عقدوں کو کھول کر رکھ دیتی ہے۔ اور دل و دماغ کی تاروں کو اس چابک دستی سے چھیڑتی ہے کہ تمام اڑچنیں اور الجھنیں کافور ہو جاتی ہیں۔ اور پھر ایک ایسا مرتب اور منظم ضابطۂ حیات عطا کرتی ہے جس کے کسی شعبے میں اندھیرے کے سائے باقی نہیں رہتے۔ اور جہاں تک تعلق ہے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تو وہ قرآنِ کریم جیسی حکمت و دانش کی کتاب کو عملی شکل اس کامیابی سے عطا فرماتے ہیں کہ کتاب کی حکمت و دانش زندگی میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ جن مغیبات کو عقل تسلیم کرنے سے عاجز ہے' ذاتِ نبوت کا یقین و ایقان ان کی قبولیت کے لیے آمادگی پیدا کرتا ہے اور راہِ حق کے مسافر کو جب کبھی مشکلات کا سامنا کرنا دشوار محسوس ہونے لگتا ہے تو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی استقامت اور آپ کا اطمینان روشنی کا سامان کرتا ہے۔ اہل کتاب بصیرت کھو چکے' اپنے پیغمبروں کی سنت گم کر چکے۔ اللہ کی کتاب کو بازیچۂ اطفال بنا دیا۔ اور خواہشات کی دلدل میں ایسے دھنسے کہ نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ ان کی خوش قسمتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ان کی راہنمائی کے لیے موجود ہے۔ اور قرآنِ کریم جیسی کتاب آئین' قانون' تہذیب اور اخلاق کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے میسر ہے۔ اب بھی اگر علم و حکمت کے ان سرچشموں اور راہنمائی کے روشن میناروں سے فائدہ نہیں اٹھایا جائے گا تو زندگی اندھیروں میں ڈوب جائے گی۔ اور انسانیت کی ایک ایک قدر دم توڑ جائے گی۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِى الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۝

Marfat.com

''اے پیغمبر لوگ آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں کہو اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے کلالہ (کی میراث) کے بارے میں۔ اگر کوئی ایسا آدمی فوت ہو جائے جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو بہن کا نصف حصہ ہے اس کے ترکہ میں سے اور وہ اپنی بہن کا وارث ہو گا اگر اس بہن کی کوئی اولاد نہ ہو۔ پھر اگر دو بہنیں ہیں تو ان دونوں کو دو تہائی ملے گا اس سے جو اس نے چھوڑا اور اگر وارث ہوں بہن بھائی مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد (بھائی) کا حصہ دو عورتوں (بہنوں) کے حصہ کے برابر ہے۔ بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تاکہ گمراہ نہ ہو جاؤ۔ اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔'' (النسآء:۱۷۶)

کلالہ سے متعلق سوال کا جواب

اس سے پہلے کی آیت پر سورۃ النسآء مکمل ہوگئی۔ یہ آیتِ کریمہ احکامِ میراث کے ایک خاص مسئلہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہاں اسے بطورِ ضمیمہ لگایا گیا ہے۔ اس سورت کی ابتداء میں احکامِ میراث میں کلالہ کی میراث کا ذکر بھی آیا ہے۔ لوگوں نے اس سلسلے میں بعض سوالات کیے جس سے ان کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ان سوالات کی وضاحت کے لیے یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی اور اس نے کلالہ کے مسائل کو مکمل کر دیا۔ لیکن اس کا نزول سورۃ النسآء کی تکمیل کے کئی سال بعد ہوا۔ کلالہ کی تعریف کے بارے میں صحابہؓ میں اختلاف رہا۔ بعض کی رائے میں کلالہ وہ شخص ہے جو بے اولاد بھی ہو اور جس کے باپ اور دادا بھی زندہ نہ ہوں۔ اور بعض کے نزدیک کلالہ اسے کہتے ہیں جس کی اولاد نہ ہو باپ دادا بے شک زندہ ہوں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے پہلی تعریف کے حق میں رائے دی۔ اس پر صحابہ کا تقریباً اتفاق ہو گیا اور قرآنِ پاک سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ اس آیتِ کریمہ میں کلالہ کی بہن کو اس کی میراث میں نصف حصہ دیا گیا ہے۔ احکامِ میراث کی رو سے اگر باپ زندہ ہوتا تو بہن کو کوئی حصہ نہیں ملتا۔ تو بہن کا نصف حصہ اس بات کی دلیل ہے کہ کلالہ وہی ہوتا ہے جس کے اصول و فروع میں کوئی بھی نہ ہو۔ اس سے پہلے سورۃ النسآء میں کلالہ کی بہن کو چھٹا حصہ دیا گیا ہے اور یہاں نصف دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں بہن سے مراد حقیقی بہن ہے اور یا وہ بہن مراد ہے جو باپ کی طرف سے ہو اور وہاں جس بہن کے حصے کا ذکر ہے وہ وہ بہن ہے جو ماں کی طرف سے ہو۔ اور علم الفرائض کی زبان میں کہنا چاہیئے کہ سورۃ النسآء میں اخیافی بہن کا ذکر ہے اور یہاں عینی اور علاتی بہن کا ذکر ہے۔ اور دونوں کا حصہ الگ الگ ہے۔ بہن کو نصف حصہ دینے کے بعد بقیہ نصف اگر کوئی عصبہ ہو یعنی چچا' چچا زاد بھائی وغیرہ تو ان کو ملے گا ورنہ یہ نصف بھی بہن کی طرف لوٹ آئے گا۔

اور اگر دو بہنیں ہوں تو انہیں وراثت میں سے دو تہائی ملے گا۔ اور بقیہ ایک ثلث عصبہ کو ملے گا اور اگر عصبہ کوئی نہ ہو تو پھر یہ تیسرا ثلث بھی انہی دونوں بہنوں کو ملے گا۔ اور یہ یاد رہے کہ بہنیں دو ہوں یا دو سے زیادہ سب کا ایک ہی حکم ہے۔

اگر کلالہ کے وارثوں میں بھائی اور بہن دونوں ہوں تو بھائی کو دو حصے اور بہن کو ایک حصہ ملے گا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے یہ تمام احکام کھول کر بیان کر دیے ہیں تاکہ تم کسی گمراہی میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ اور سورۃ النسآء میں احکام میراث کا تین جگہ ذکر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عربوں میں چونکہ احکامِ میراث کے معاملے میں بہت افراط و تفریط تھی۔ اور کمزور وارث ظلم کا شکار ہوتے تھے اس لیے قرآنِ کریم نے تین جگہ ان مسائل کو بیان فرمایا تاکہ مسلمان کسی گمراہی کا شکار نہ ہوں۔ لیکن اس بات پر جتنا بھی دکھ کا اظہار کیا جائے تھوڑا ہے کہ آج مسلمان

Marfat.com

میراث کی تقسیم میں نہ صرف گمراہی میں مبتلا ہو گئے بلکہ کمزور وارثوں کے ساتھ انہوں نے بھی ظلم کا رویہ اختیار کر لیا۔ صنف نازک اُس وقت بھی محرومی کا شکار تھی اور اسلام نے اس کی محرومیوں سے اسے نجات دی اور آج پھر عملی طور پر اسے میراث سے محروم کر دیا گیا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ یعنی تمہیں جو نظام زندگی دیا جا رہا ہے اور احکامِ میراث جو تم پر نافذ کیے گئے ہیں یہ کسی ایسے قانون ساز کی تخلیق نہیں جس کی معلومات ناقص اور جس کا علم نارسا ہو۔ بلکہ یہ اس پروردگار کے نازل کردہ احکام ہیں، جو ہر حکم کی رعایتوں اور مصلحتوں سے واقف ہے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْمَآئِدَۃِ

(۵)

Marfat.com

Marfat.com

فہرست مضامین

سورۃ کا نام:........................ 1
شانِ نزول/زمانہ نزول:........................ 1
کون سے جانور حرام ہیں؟........................ 12
حلال جانور کس وقت حرام ہے؟........................ 12
احرام:........................ 12
صرف اللہ جس چیز کو چاہے حرام قرار دے سکتا ہے:........................ 13
شعائر اللہ کی تعریف:........................ 14
اَشْھُرِ حَرَم:........................ 15
شعائر اللہ کی تعظیم ہر حال میں لازم ہے:........................ 15
مسلمان کی زندگی کا اصل مقصد:........................ 16
صرف نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو:........................ 16
نیکی کیا ہے؟........................ 17
حرام جانوروں کی تفصیل:........................ 18
شراب اور جواء ہر حال میں حرام ہیں:........................ 19
فسق:........................ 19
قوموں کی زندگی کا خطرناک ترین لمحہ:........................ 20
فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ:........................ 20
تکمیلِ دین اور عرفہ کا دن:........................ 21
لفظ دین کا اطلاق:........................ 22
دین کا صحیح مفہوم:........................ 23
قدیم الہامی کتابوں میں حضور ﷺ کی بشارت:........................ 25
اسلام قیامت تک ہر دور کا دین ہے:........................ 27
اسلام کیا ہے؟........................ 27
اسلام میں شکار کا طریقہ:........................ 30
کسی جانور یا پرندے کا پکڑا شکار حلال ہے:........................ 32
مُكَلِّبِيْنَ کا اصل مفہوم:........................ 32
غیر مسلم اور مسلم کے شکاری جانور میں فرق:........................ 33
قرآن میں ''مُحْصَنٰت'' کی اصطلاح کے تین معنی:........................ 37
اسلامی تہذیب کی بنیاد نماز ہے:........................ 42
وضو کا طریقہ:........................ 43
وضو میں پاؤں دھونا فرض ہے:........................ 44
حالت جنابت میں غسل کا حکم:........................ 45
تیمم کی حالتوں کا بیان:........................ 45
تیمم کا طریقہ:........................ 46
تیمم سے مقصود روح کی طہارت ہے:........................ 47
مسلمانوں پر اللہ کی سب سے بڑی نعمت:........................ 48
ہمارا اللہ سے کیا ہوا عہد:........................ 48
بحیثیت امت مسلمہ ہماری اصل ذمہ داری:........................ 51
مسلمانوں کا مقصد جہاد:........................ 52
عدل کے بغیر تقویٰ ممکن نہیں:........................ 53
سمع و اطاعت اور اجتماعی عدل پر اللہ کا وعدہ:........................ 54
ایمان اور عمل صالح کا اجر:........................ 54
توکل علی اللہ رکھنے والوں سے اللہ کا وعدہ:........................ 56
نقیب:........................ 59
نقیب کی ذمہ داریاں:........................ 59
اللہ کن کے ساتھ ہوتا ہے:........................ 59
''نماز'' اللہ پر ایمان کے اظہار کی ابتداء:........................ 60
''ترکِ نماز'' امت مسلمہ کے زوال کی پہلی نشانی:........................ 61
''زکوٰۃ'' حبِ الٰہی کے اظہار کا دوسرا ذریعہ:........................ 62
انسان کی سب سے بڑی چیز عظمت کردار ہے:........................ 64
قرآن میں ''ایمان'' کے دو معنی:........................ 64
نبی کی مدد کرنے سے مراد:........................ 66

Marfat.com

اللہ کو قرضِ حسنہ دینے کا فائدہ: 68
عہد وفا پورا کرنے والوں پر اللہ کا انعام: 69
سَوَاءَ السَّبِيْل: 70
کوئی سرکش گروہ اللہ کا چہیتا نہیں ہوتا: 73
اللہ کے عذاب کی پہلی نشانی دلوں کا سخت ہو جانا ہے: 74
اہل کتاب کے دل کی سختی تاریخ کے آئینے میں: 75
ہمارے دلوں کی کیفیت موجودہ حالات کے تناظر میں: 75
اللہ کی کتاب اور ہماری روش: 77
محسنین کی بہترین مثال: 78
لفظ نصاریٰ کی تاریخ: 79
دین اخوت کی بنیاد ہے: 79
نصاریٰ کا سب سے بڑا جرم توحید سے روگردانی: 82
سینٹ پال کی سازش: 82
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے بڑا معجزہ
حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش ہے: 83
اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں تو
حضرت یحییٰ علیہ السلام کیوں نہیں؟ 84
موحد کون؟ 86
یہود و نصاریٰ کی تنزلی کا اصل سبب: 89
بحیثیت قوم ہم تنزلی کا شکار کیوں؟ 90
اللہ کی طرف سے یہود و نصاریٰ کے زعمِ باطل کا جواب: 92
تمہید: 95
بنی اسرائیل پر اللہ کے تین عظیم احسان: 96
کوہِ سینا پر بنی اسرائیل کی پرورش: 98
بنی اسرائیل کا جہاد سے انکار: 98
''غلامی'' بنی اسرائیل کی بزدلی کی اصل وجہ: 99
اہل ایمان صرف اللہ سے ڈرتے ہیں: 100
''توکل علی اللہ اور مقدور بھر کوشش'' فضل الٰہی کے
نزول کیلئے شرط: 101
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم کا کورا جواب: 102
بنی اسرائیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیزاری: 103
انکار جہاد پر بنی اسرائیل کو سزا: 103
تاریخِ بنی اسرائیل اور مسلمانانِ پاکستان: 104
تمہید: 109
قصہ ہابیل اور قابیل کی بنیاد ''حسد'': 110
تاریخ پر مورخین کے ظلم: 111
تاریخی روایات میں قصہ ہابیل و قابیل: 111
حسد ایک شدید ترین جذبہ ہے: 113
تمام اعمال صالح کی قبولیت کی بنیاد ''تقویٰ'' ہے: 114
تورات میں قصہ ہابیل و قابیل: 115
قتل ناحق معاشرے کے بگاڑ کی نشانی ہوتا ہے: 117
حدود کسے کہتے ہیں؟ 119
قصاص کیا ہے؟ 119
تعزیرات کیا ہیں؟ 119
قتل نفس اور معاشرے میں فساد پھیلانے والوں کی سزائیں: 120
قرآن کا طرزِ خطاب فطری اور نفسیاتی ہے: 121
چوری کی حد کس وقت لاگو ہوتی ہے؟ 126
اسلام صرف ترغیب ہی نہیں دیتا بلکہ ترہیب سے بھی کام لیتا ہے: . 127
توبہ کے بعد ایک مجرم سے اسلامی معاشرے کا سلوک: 129
خلوص نیت سے دین کا کام کرنے والوں کیلئے تسلی: 131
سَمّٰعُوْنَ سے مراد کون لوگ ہیں: 132
علماء یہود کا کردار: 133
گناہ کی روش پر ضد کا انجام: 135
جھوٹ اور رشوت کی تباہ کاریاں: 136
تمہید: 139
تورات علم و ہدایت کا سرچشمہ تھی: 140
قرآن میں لفظ ہدایت کے استعمال: 141
یہود کے تورات سے فائدہ نہ اٹھا پانے کے

Marfat.com

تین بنیادی اسباب اور ہم: 142
جو شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہ کافر ہیں: 146
نفاذ شریعت میں کے سب سے مشکل مرحلہ سزاؤں کا نفاذ ہوتا ہے: 149
تورات اور انجیل بھی ہدایت اور نور تھیں: 150
فاسق کون ہوتا ہے؟ 152
قرآنِ پاک کی تین حیثیتیں: 153
فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے مراد: 155
"وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ" میں خطاب امت مسلمہ سے ہے: 155
شریعتوں میں اختلاف انسانوں کیلئے امتحان ہے: 156
قرآن سے امت مسلمہ کا سلوک: 158
یہود کی بدنیتی کا انجام: 160
انسان کی کامیابی کا انحصار اپنے مقصد حیات سے
سنجیدہ وابستگی سے ہے: 162
مسلمان کا مقصد حیات: 163
یہود و نصاریٰ کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہوتے: 164
ولی کسے کہتے ہیں؟ 165
مسلمانوں کی آپسی نا اتفاقی اور یہود و نصاریٰ سے دوستی کے نتیجے میں پیدا
ہونے والی ہولناک صورت حال: 166
منافق کے تمام اعمال صالح ضائع ہو جاتے ہیں: 169
دین کا کام کرنے والوں کی صفات: 170
مسلمان قوم کے دوست: 175
آخری فتح مومنین ہی کی ہوگی: 176
تمہید: 179
یہود و نصاریٰ کی مسلمانوں سے وجہ دشمنی: 182
یہود کی نافرمانیوں کی سزا: 183
برائی کے خلاف جدوجہد کرنے والا ہی اللہ کے عذاب
سے بچتا ہے: 185
امت مسلمہ اور طاغوت کی پرستش: 186
امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت: 188
علماء اور مشائخ کی تباہی کی جڑ، گناہ کی بات اور حرام خوری ہیں: ... 189
یہود پر اللہ کی لعنت اور دور حاضر میں اس کے اثرات: 190
نفاذ شریعت کی برکات: 195
مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ سے مراد قرآن وسنت دونوں ہیں: ... 195
کسی چیز کو قائم کرنے سے کیا مراد ہے؟ 197
تمہید: 200
رسول کا اصل کام: 201
اللہ تعالیٰ نے خود دشمنوں سے حضور ﷺ کی حفاظت فرمائی: 203
اللہ کافروں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حفاظت کرتا ہے: 203
شہادتِ حق کے منصب پر فائز امت کا اصل کام: 204
بنی اسرائیل کو قرآن نافذ کرنے کا حکم اور ان کا رد عمل: 205
صٰبِئُوْن کون تھے؟ 208
اللہ کے ہاں خاندانی نسب اور گروہی نسبت کی کوئی وقعت نہیں: ... 209
وحدتِ ادیان کا بھونڈا نظریہ: 209
کیا ایمانیات میں اللہ کے ساتھ کسی اور چیز پر ایمان ضروری ہے؟ . 210
تمام رسولوں پر ایمان نہ لانے والا کافر ہے: 210
حضور ﷺ پر ایمان لانے کی حقیقت: 211
بنی اسرائیل کا رسولوں اور نبیوں سے سلوک
'امت مسلمہ کیلئے عبرت: 212
بنی اسرائیل کے سدھرنے کا آخری موقع: 214
تاریخ بنی اسرائیل: 215
بخت نصر کا حملہ: 216
انیتوکس اپی کا حملہ: 217
تاریخ بنی اسرائیل امت مسلمہ کیلئے آئینہ: 217
نصاریٰ کا عقیدہ "حلول": 218
نصاریٰ کا عقیدہ "اقانیم ثلاثہ": 218
حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل حیثیت: 219
عبادت کس کی کرنی چاہیے؟ 221
نصاریٰ کی اصل بیماری "غلو": 221

Marfat.com

اس رکوع سے امت مسلمہ کو کیا سبق ملتا ہے؟ 221
تمہید: 223
بنی اسرائیل پر تمام انبیاء نے لعنت کی: 224
لعنت کے دو مفہوم: 226
بنی اسرائیل پر لعنت کی وجوہات: 226
کہیں خدانخواستہ ہم بھی اللہ کی لعنت کی طرف تو نہیں بڑھ رہے: 228
انسان کا ذوق اسکے اعمال کا سرچشمہ ہوتا ہے: 229
جب کوئی حاملِ مذہب قوم لامذہب کو دوست بنالے: 230
نصاریٰ کون تھے؟ 233
آج کے عیسائی نصاریٰ نہیں: 235
انسان کی اصل کامیابی: 237
صحابہ ﷺ کی سب سے بڑی خواہش: 238
تمہید: 240
اسلام میں ترک دنیا کا کوئی تصور نہیں: 241
طیبات کو اپنے اوپر حرام قرار دے لینے کے تین درجے: 242
حدود سے تجاوز کی تین صورتیں: 243
قسم کی تین اقسام: 246
قسم کا کفارہ: 247
حرمتِ شراب: 249
جوا' قمار اور ازلام کی حرمت: 251
آستانہ کی حرمت: 252
شراب اور جوئے کے تین یقینی نتائج: 253
اللہ تعالیٰ کن لوگوں کو پسند کرتے ہیں؟ 257
تمہید: 260
اللہ پر ایمان کی کیفیت اور اس کے ثمرات: 263
قوانین حلت وحرمت ہر دور اور ہر زمانے کیلئے ہیں: 264
حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت: 266
حالتِ احرام میں شکار کا کفارہ: 266
آج امتِ مسلمہ کی سب سے بڑی آزمائش: 268
احرام کی حالت میں بحری شکار جائز ہے: 269
''کعبہ'' کو مرکزِ اسلام بنایا گیا ہے: 270
اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہی نہیں عادل بھی ہے: 273
خبیث کتنا ہی زیادہ ہو طیب کے مقابلے میں کچھ نہیں: 276
تمہید: 280
سوال کرنے کی ممانعت کی دو بنیادی وجوہ: 281
سورۃ المائدہ کے دو بنیادی مضامین: 284
آباء کی اندھی تقلید: 286
امت مسلمہ کی ذمہ داری اور اس کی نوعیت 288
امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والے کی اصل پہچان ''اپنی دینی حالت پر فکر مند رہنا'': 290
برائی کو دیکھ کر چپ ہو جانے والوں کا انجام: 290
دورانِ سفر موت آجانے کی صورت میں وصیت کا طریقِ کار: 291
شہادت کے قانون کے متعلق چند اہم نکات: 293
اسلام قانون دیتے وقت ہر دور اور ہر زمان کو مدنظر رکھتا ہے: 294
تمہید: 297
بارگاہِ الٰہی میں جوابدہی کا تصور اور اس کی عظمت 298
علمِ غیب کی حقیقت: 300
یہود اور عیسائیوں پر اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت: 302
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات: 303
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا مذہب اسلام تھا: 307
تمہید: 10
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی عدالت میں: 11
عبرانی زبان میں ''اب'' اور ''ابن'' کا مطلب: 13
انسان کی فلاح کا حقیقی نسخہ: 14

Marfat.com

تعارف/زمانہ نزول اور مندرجات سورۃ المائدہ

سورۃ کا نام:

اس سورۃ کا نام ''المائدۃ'' ہے۔عربی زبان میں ''مائدۃ'' دسترخوان (Dining Table) یا خوان نعمت کو کہتے ہیں۔قرآن مجید میں سورتوں کے جتنے بھی نام ہیں وہ ان سورتوں کے عنوانات نہیں ہیں بلکہ صرف نام ہیں اور نام کا مقصد مسمّٰی کا تعارف ہوتا ہے۔مثلاً آپ ایک شخص کا نام برکت علی رکھتے ہیں۔جب بھی آپ اس کو ڈھونڈنے نکلیں گے تو آپ علی کی برکت ڈھونڈتے نہیں پھریں گے بلکہ آپ اس نام (برکت علی) کے مسمّٰی کو تلاش کریں گے۔ضروری نہیں ہے کہ جو نام ہو مسمّٰی بالکل اس کے مطابق ہو بلکہ نام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی نام پکارا جائے تو اس نام سے اس کا مسمّٰی ہی مراد ہو۔قرآن کریم کی عام سورتوں کا یہی حال ہے کہ محض تعارف/پہچان اور تعین کیلئے سورۃ کا ایک نام رکھا گیا ہے اور اس نام کا اس سورۃ کے مضامین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اس سورۃ کے نام میں بھی یہی بات ہے کہ المائدۃ کا لفظ اس سورۃ کی دو آیات میں آیا ہے مثلاً

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ج وَارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَO (المائدہ:114)

یا اس سے پہلے ایک آیت میں آیا ہے کہ:

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ط قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَO (المائدۃ:112)

مختصر یہ کہ چونکہ اس سورۃ میں دو دفعہ مائدہ کا لفظ آیا اسی لئے اس کا نام ''مائدہ'' رکھ دیا گیا تا کہ یہ پہچان ہو جائے کہ یہ وہ سورۃ ہے جس میں ''مائدہ'' کا ذکر آیا ہے۔اس سے مراد یہ بالکل نہیں ہے کہ اس میں مائدہ پر کوئی مقالہ لکھا گیا ہے۔

شانِ نزول/زمانۂ نزول:

روایات اور خود اس سورۃ کے مندرجات پر نظر ڈالیں تو دونوں سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ سورۃ سن ۶ ہجری کے آخر یا ۷ ہجری کے شروع میں نازل ہوئی ہے۔اس سورۃ کے نزول سے متصلاً قبل یعنی ذیقعدہ ۶ ہجری میں آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمرہ کیلئے مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔جب قریش کو معلوم ہوا کہ آپ ﷺ عمرہ کی نیت سے مکہ آرہے ہیں اور حدیبیہ کے مقام تک پہنچ چکے ہیں تو انہوں نے اپنی ضد اور ناحق انا کی وجہ سے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم کسی قیمت پر بھی مسلمانوں کو عمرہ نہیں کرنے دیں گے۔ادھر حضور ﷺ کے پیش نظر اس سفر کا مقصد یہ تھا کہ حج اور عمرہ کیلئے مکہ کا راستہ مسلمانوں پر کھلنا چاہئے کیونکہ یہ ایک بڑا ظلم ہے کہ قریش نے یہ راستہ مسلمانوں کیلئے بند کر رکھا ہے۔لیکن ذیقعدہ چونکہ اشھر حرم میں سے ایک مہینہ ہے اسلئے یہ بات بھی حضور ﷺ کے پیش نظر تھی کہ ہمیں اس مہینے کے تقدس کو ہر حال میں ملحوظ خاطر رکھنا ہے۔لہٰذا ہر ممکن طریقے سے جنگ سے احتراز کیا جائے۔

Marfat.com

دوسری بات یہ بھی تھی جسے بعد میں خود قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہیں لڑنا پڑتا تو تمہیں اندازہ نہیں تھا کہ کتنے لوگ مکہ میں ایسے ہیں جو مسلمان ہو چکے ہیں اور عین ممکن تھا کہ تم ان کو نادانی سے انجانے میں روند ڈالتے یا قتل کر دیتے اور اس طرح تمہارے ہاتھ اپنے ہی بھائیوں کے خون سے رنگے جاتے۔ اسلئے پروردگار کو بالکل منظور نہیں تھا کہ تم کوئی ایسا اقدام کرو جس سے نوبت جنگ تک پہنچ جائے۔ دوسری طرف قریش نے صلح کی ایسی ایسی شرائط رکھیں جس سے مقصود مسلمانوں کو اشتعال دلانا تھا تاکہ وہ اشتعال میں آ کر کسی جنگی اقدام پر مجبور ہو جائیں اور ہم پورے عرب میں یہ مشہور کر دیں کہ دیکھیں جی! یہ کیسے لوگ ہیں جن کو کعبہ کی سرزمین کا کوئی احترام ہے اور نہ اشہر حرم کا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو ان تمام شرانگیزیوں سے محفوظ فرمایا اور بعض ایسی شرائط کو بھی قبول کر لیا گیا جن کو عام حالات میں قبول کرنا مناسب تصور نہیں کیا جاتا۔ بہرحال ایک صلح ہو گئی اور قریش اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ لکھا گیا۔ اس معاہدے کو بہ ظاہر یہ سمجھا گیا کہ یہ مسلمانوں کی شکست ہے۔ لیکن قرآن مجید نے اس کو فتحِ مبین قرار دیا اور کچھ ہی مہینوں میں لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ جسے ہم شکست سمجھ رہے تھے وہ شکست نہیں تھی بلکہ فتح مبین تھی۔ اس بات کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ صرف دو سال تک یہ معاہدہ رہا اور دو سال پورے ہونے سے قبل ہی اہل مکہ نے چند ایسی حرکات کیں کہ یہ معاہدہ ختم ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعد مکہ فتح فرمایا۔ ان دو سالوں میں مسلمانوں کو جو کامیابیاں حاصل ہوئیں ان کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب یہ معاہدہ ہوا آپ ﷺ کے ساتھ کل چودہ سو یا پندرہ سو صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) تھے اور اس سے قبل جنگِ خندق میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد تین ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کی تیرہ برس مکہ میں اور چھ برس مدینہ میں یعنی 19 برس کی محنت کا ثمر کل تین ہزار صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) تھے۔ لیکن صلح حدیبیہ کے صرف دو سال بعد حضور ﷺ نے معاہدہ ختم ہونے پر جب مکہ فتح کرنے کا ارادہ فرمایا تو آپ ﷺ کے ساتھ اس موقع پر جو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین مکہ فتح کرنے گئے ان کی تعداد دس ہزار سے زیادہ تھی۔ اس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انیس برس کی محنت کا نتیجہ تو کل تین ہزار آدمی تھے اور معاہدے کے بعد صرف دو سال میں سات ہزار سے زائد افراد نے اسلام قبول کیا۔ اب اس کو آپ فتح مبین نہیں تو اور کیا کہیں گے؟ اسی لئے حدیبیہ سے نکلتے ہی راستے میں جو آیات نازل ہوئیں اس میں فرمایا: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (الفتح ۴۸: 1) آیات کے نازل ہوتے ہی آپؐ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلایا کیونکہ اس معاہدے پر سب سے زیادہ آپؓ ہی مضطرب تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ آیات سنو۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آیات سنیں تو حیران ہو کر پوچھا کہ حضور! کیا یہ فتح مبین ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! یہ فتح مبین ہے۔ بعد میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اکثر فرماتے تھے کہ:

"انسان کا علم کتنا محدود ہے کہ جسے ہم شکست سمجھتے تھے اللہ تعالیٰ نے اسے فتح مبین قرار دیا اور وقت نے ثابت کر دیا کہ واقعی یہ فتح مبین تھی۔"

بہرحال اگلے دو سالوں میں صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی۔ معاہدے سے قبل مسلمان کسی قبیلے سے رابطہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اکثر قبیلے مکہ والوں کے زیر اثر تھے۔ لیکن معاہدے کے بعد مسلمانوں کا ان سے ملنا جلنا، انہیں اسلام کی دعوت دینا اور انہیں اپنے اخلاق سے متاثر کرنے کا موقع مل گیا، اس کے نتیجے میں بند راستے کھل گئے اور مسلمانوں کی تبلیغ و دعوت سے لوگوں نے تیزی کے ساتھ اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ اب اس نئی صورت حال میں اس دور کے مطابق احکامات کا اترنا ناگزیر تھا چنانچہ اس سورۃ کے ذریعے ان احکامات کو نازل کیا گیا۔

دوسری بات یہ ذہن میں رکھیں کہ اس واقعہ کے بعد جب کہ مسلمان عمرے کیلئے گئے اور عمرہ کئے بغیر احرام کھول کر ان کو واپس آنا پڑا اور دو

Marfat.com

بیت اللہ تک نہیں جا سکے اس کا مسلمانوں کو بے حد رنج تھا۔ یہ قدرتی عمل ہے کہ جب انسان کو اس کے کسی جائز حق سے محروم کیا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کے اندر ایک اشتعال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ انتقام لینے کی کوشش کرتا ہے اور مزید یہ بات بھی کہ اب مسلمان محض ایک بے دست و پا مذہبی گروہ نہیں تھا بلکہ اِن کی حدود ایک طرف نجد، دوسری طرف شام، تیسری طرف ساحل بحر احمر اور چوتھی طرف مکہ معظمہ سے تھوڑی دور تک پھیل گئیں تھیں۔ اب مسلمان اس قابل ہو چکے تھے کہ وہ اپنے سیاسی اور بین الجماعتی فیصلے خود آزادی سے کر بھی سکتے تھے اور انہیں بروئے کار بھی لا سکتے تھے۔

تیسری بات یہ ذہن نشین کر لیں کہ مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑا فتنہ اور پریشانی کی بات یہ تھی کہ خود مدینہ کے اندر یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ جو غلبہ و اثر بھی رکھتے تھے اور مال و زر بھی یعنی ان کے پاس صرف جنگجو افراد یا اسلحہ ہی زیادہ نہیں تھا بلکہ ان کے پاس مال و دولت کی بھی فراوانی تھی، جس کی وجہ سے ساری تجارت پر وہ قابض تھے اور انصار کے بہت سارے باغات ان کے پاس گروی تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ علم و فضل کے مالک بھی تھے کیونکہ اللہ کی کتاب تورات کی شکل میں ان کے پاس موجود تھی اور ان کے تعلیمی ادارے ''مدارس'' کے نام سے جا بجا کام کر رہے تھے، اس لئے ان کی اگلی نسلیں بھی پڑھی ہوئی تھیں اور ان کے مقابل تمام لوگ ان پڑھ تھے چاہے وہ قریش ہوں یا اوس و خزرج کے لوگ۔ یہی وجہ تھی کہ یہود کا پورے عرب میں ایک اثر تھا اور وہ جب چاہتے تھے، وہاں کے امن کو متزلزل کر کے مسلمانوں کیلئے پریشانیاں پیدا کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ جنگِ بدر ''الفرقان'' کی حیثیت رکھتی تھی اور اس سے مسلمانوں کو ایک بہت بڑا سہارا ملا اور غیر مسلموں پر اس کا گہرا اثر بھی پڑا تھا، جس سے ان کے اعصاب چٹخنے لگے تھے۔ لیکن اس کے برعکس اگر آپ یہود پر نظر ڈالیں تو ان پر جنگ بدر کا بالکل الٹا اثر پڑا اور بجائے یہ کہ وہ مرعوب ہوتے بنو قینقاع قبیلے نے پہلے سے بھی زیادہ سرکشی، آپ ﷺ کے متعلق یاوہ گوئی اور مسلمان خواتین سے بدتمیزی کرنا شروع کر دی۔ اسی لئے حضور ﷺ کو سب سے پہلے ان کے خلاف طاقت استعمال کرنا پڑی اور اس طرح سن ۶ ہجری سے قبل ہی ان تینوں قبیلوں سے مدینہ کو پاک کر دیا گیا اور اس کے نتیجے میں مدینہ کے اندر مسلمانوں کو ایک امن اور استحکام نصیب ہو گیا۔ یعنی اس سورۃ کے نزول سے قبل نہ صرف یہ کہ باہر کی حدود وسیع ہوئیں بلکہ اندر بھی ایک استحکام نصیب ہوا۔ اس لئے مسلمان اب اگر کوئی بھی پالیسی طے کرنا چاہتے تو بہت آسانی اور آزادی سے اسے عمل میں لا سکتے تھے۔

چوتھی بات جو اس سورۃ کے شانِ نزول کے متعلق ذہن میں ہونی چاہیے وہ یہ تھی کہ پورے قریش کی اقدامی قوت جنگِ خندق یعنی جنگِ احزاب کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ عرب کی تاریخ میں ہمیں کہیں اس کی کوئی اور مثال نظر نہیں آتی جس میں عرب نے دس ہزار، بارہ ہزار یا بعض روایات کے مطابق چوبیس ہزار کا لشکر لے کر کسی کے خلاف چڑھائی کی ہو۔ عربوں کی پوری تاریخ اس کی مثال سے خالی ہے۔ یعنی اتنی بڑی تعداد لے کر کسی پر عربوں نے کبھی حملہ نہیں کیا تھا بجز مسلمانوں کے اور یہ جنگ سن ۵ ہجری میں ہوئی۔ مسلمانوں کی تعداد اس جنگ میں تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ایک زوردار طوفان باد و باراں کی شکل میں آئی جس سے ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور قریش محاصرہ ختم کر کے بھاگ گئے۔ اس وقت حضور ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ آج کے بعد قریش تمہارے خلاف کبھی چڑھائی نہیں کر سکیں گے، یہ اقدام کی قوت کھو چکے ہیں، اب تم ہی ان پر حملہ آور ہو گے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی اور سپہ سالار ہو گا جس نے اس طرح (Mid Stream) میں کھڑے ہو کر کبھی ایسی حیرت انگیز پیشن گوئی کی ہو جیسی آنحضرت ﷺ نے کی اور وہ بھی کس وقت؟ قریش کی اس اقدامی قوت کے کھو جانے کی وجہ سے بھی مسلمانوں کو ایک استحکام نصیب ہوا اور مسلمان ایک غالب قوت بن گئے لیکن ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب کوئی قوم غالب قوت بنتی ہے اس وقت اس کو اخلاقی طور پر توانا کرنے کی سخت ضرورت ہوتی ہے ورنہ ماضی کے مظلوم مستقبل کے ظالم بن جاتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جہاں کہیں بھی مزدوروں اور بے بس لوگوں کے ہاتھوں انقلاب آیا تو غالب آنے کے بعد ان

Marfat.com

بے بسوں نے وہی ظلم سرمایہ داروں پر ڈھائے جو سرمایہ داران پر ڈھاتے رہے تھے۔ اب جبکہ مسلمان اپنے ضعف سے نکل چکے تھے' اقتدار کی قوت کو پہنچ چکے تھے' رفتہ رفتہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے تھے اور اب وہ علاقے کی سب سے توانا قوت تھے لہٰذا اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر ان کو اس وقت پوری طرح حسنِ اخلاق سے مزین نہ کیا گیا اور اللہ کا خوف پوری طرح ان کے دلوں میں پیدا نہ کیا گیا تو یہ بھی آنے والے وقت میں وہی تاریخ دہرائیں گے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ اقبال نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو، پھر کیا
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

یعنی کوہ کن بھی جب پرویز بنے گا تو اس کے طریقے بھی وہی ظالمانہ ہوں گے۔ ان تمام وجوہات کے پیش نظر ضروری تھا کہ ایک ایسی سورۃ نازل ہو جس میں ایسے احکامات کئے جائیں جن میں مسلمانوں کو عدل کرنے' اللہ سے ڈرنے' عام انسانوں کے حقوق کی پاسداری کرنے کی تعلیم دی جاتی۔ چنانچہ اس سورۃ میں سب سے پہلے اسی بات کی تعلیم دی گئی۔

پھر عام طور پر آپ دیکھتے ہیں کہ جب کوئی قوم برسرِ اقتدار آتی ہے تو اسے سب سے زیادہ اپنے سر کی کلغی' اپنا عہدہ و منصب اور اپنی مادی قوتوں کا اظہار کرنا عزیز ہوتا ہے اور وہ اپنے ملک کو اپنی ذات کے حوالے سے بڑا بنانا چاہتی ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتی کہ جن بنیادوں اور نظریات پر انہوں نے ملک کو اٹھایا ہے بالآخر وہ نظریات ہی اظہار کی شکل اختیار کریں اور ان نظریات کے سامنے اپنی ذات' عہدہ و منصب اور مادی کروفر سب کچھ ماند پڑ جائے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس کا پابند کر دیا کہ دیکھنا! تم ایک نظریہ کی قوت سے وجود میں آئے ہو' اسی نظریے کی وجہ سے یہ ملک جس کا وجود پہلے دنیا میں نہیں تھا تمہیں دیا گیا ہے اور یاد رکھنا! یہ ملک بنا ہے صرف اللہ کی کبریائی' حضور ﷺ کی رسالت اور آخرت میں جواب دہی کے تصور کے نام پر، اگر تم نے اللہ کی کبریائی کو چھوڑ کر اس میں اپنی کبریائی کو بلند کرنے کی کوشش کی تو یہیں سے تم گمراہی میں پڑ جاؤ گے۔

اسی سلسلے میں شعائر اللہ کے احترام کا حکم دیا گیا ہے تاکہ مسلمان شعوری طور پر جان لیں کہ ان کی اصل شناخت اور بنیاد کیا ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جس کو انہوں نے بدرجۂ علامت باقی رکھنا ہے؟

مزید یہ کہ اب جبکہ مسلمان ایک طاقت اور ایک امت بن گئے ہیں تو اب ان کی اپنی ایک تہذیب اور ان کا ایک تمدن بن گیا ہے اور ان کی اپنی ایک معاشرت وجود میں آ گئی ہے۔ پورے ملک میں عبادات کا ایک نظام وجود میں آ گیا ہے' عدالتوں نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ لوگوں کی نشست و برخاست کے طریقے رائج کر دیئے گئے ہیں' ان کے ایک دوسرے پر حقوق مقرر ہو گئے ہیں اور فرائض کا بھی تعین ہو گیا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے بھی بنیادی احکامات دے دیئے گئے ہیں' یعنی تہذیب و تمدن کی کوئی بنیادی چیز ایسی نہیں جس کو بیان نہ کر دیا گیا ہو۔ اب صرف ان احکامات کی تکمیل کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ تمہیں بہر صورت ایک آزادانہ زندگی بسر کرنی ہے۔ لہٰذا نہ تمہیں دوسروں پر ظلم کرنا ہے اور نہ اپنی تہذیب و تمدن اور اصولِ علم کے حوالے سے کسی سے کوئی سمجھوتا (Compromise) کرنا ہے۔ چنانچہ اسی حوالے سے تکمیلِ دین کا اعلان بھی اس سورۃ میں کیا گیا اور اس تہذیب و تمدن کے استحکام کیلئے جو تمام تکمیلی احکامات ضروری تھے وہ بھی سب دے دیئے گئے۔

Marfat.com

اس کے ساتھ ساتھ ایک یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ اس سورۃ میں جابجا اہل کتاب پر تنقید بھی کی گئی ہے اور مسلمانوں کو یاد دلایا جارہا ہے کہ مسلمانو! تم نے اللہ تعالیٰ سے عہد وقرار کرکے جو یہ نئی زندگی اختیار کی ہے' اب اس عہد وقرار کو پوری زندگی نبھانا اور اپنے پیچھے ایسے نشانات چھوڑ جانا جس سے آئندہ آنے والی نسلیں سبق حاصل کرسکیں اور وہ نشانات ان کو جادۂ ومنزل کی خبر دیتے رہیں۔

یہود پر تنقید بھی اس لئے کی گئی کہ مسلمانوں کو معلوم ہوجائے کہ یہود پر بھی ایک وقت ایسا آیا تھا جب ان کو دنیا کی امامت پر فائز کیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے اللہ سے اس امامت کے حوالے سے جو عہد وپیماں کیے تھے ان کو پورا نہیں کیا' نتیجہ تمہارے سامنے ہے کہ انہیں اس منصب امامت سے معزول کردیا گیا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ باور بھی کرایا کہ دیکھو! اگر تم بھی اس منصب امامت پر فائز ہوکر عہد وپیماں کو توڑو گے تو تمہیں بھی ہم معزول کرکے تمہاری جگہ اور قوم کو لے آئیں گے اور اسے اللہ تعالیٰ یہ توفیق دے گا کہ وہ امامت کے منصب پر فائز ہوکر اللہ کے دین کی سربلندی کا فریضہ انجام دے۔ اس لئے اس سورۃ میں جہاں بار بار عدل کرنے کا حکم دیا گیا' وہاں بار بار عہد وپیماں کو پورا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے اور پہلی امتوں پر اسی نظریے کے تحت تنقید بھی کی گئی ہے تاکہ امت مسلمہ کو معلوم ہو کہ پہلی امتوں نے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں اور کیا چیزیں ان کیلئے مزلۂ قدم ثابت ہوئی ہیں۔

Marfat.com

عِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّسِتَّ عَشَرَ رُكُوْعًا ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سُوْرَةُ الْمَآئِدَةِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّ

سورۂ مائدہ مدنی ہے اور اس میں شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ ایک سو بیس آیتیں اور سولہ رکوع ہیں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ

اے ایمان والو! اپنے اقراروں کو پورا کرو۔ تمہارے لیے چارپائے جانور (جو چرنے والے ہیں)

الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ

حلال کر دیئے گئے ہیں بجز ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ مگر احرام (حج) میں شکار کو حلال نہ جاننا

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَاۗىِٕرَ

خدا جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ مومنو! خدا کے نام کی چیزوں کی بے حرمتی نہ کرنا

اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَاۗىِٕدَ وَلَآ اٰۗمِّيْنَ

اور نہ ادب کے مہینے کی اور نہ قربانی کے جانوروں کی اور نہ ان جانوروں کی (جو خدا کی نذر کر دیئے گئے ہوں

الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۭ وَاِذَا

اور) جن کے گلوں میں پٹے بندھے ہوں اور نہ ان لوگوں کی جو عزت کے گھر (یعنی بیت اللہ) کو جا رہے ہوں (اور) اپنے

حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ۭ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ

پروردگار کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلبگار ہوں۔ اور جب احرام اتار دو تو (پھر اختیار ہے کہ) شکار کرو۔ اور

عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ

لوگوں کی دشمنی اس وجہ سے کہ انہوں نے تم کو عزت والی مسجد سے روکا تھا تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان پر

وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ

زیادتی کرنے لگو۔ اور (دیکھو) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی

اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ② حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَ

باتوں میں مدد نہ کیا کرو اور خدا سے ڈرتے رہو۔ کچھ شک نہیں کہ خدا کا عذاب سخت ہے۔ تم پر مرا ہوا جانور اور (بہتا) لہو اور

Marfat.com

لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ

سؤر کا گوشت اور جس چیز پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے اور جو چوٹ لگ کر مر جائے

وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ وَمَا ذُبِحَ

اور جو گر کر مر جائے اور جو سینگ لگ کر مر جائے یہ سب حرام ہیں اور وہ جانور بھی جس کو درندے پھاڑ کھائیں۔ مگر جس کو تم مرنے

عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۭ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۭ اَلْيَوْمَ

سے پہلے ذبح کر لو۔ اور وہ جانور بھی جو تھان پر ذبح کیا جائے اور یہ بھی کہ پاسوں سے قسمت معلوم کرو۔ یہ سب گناہ

يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ

(کے کام) ہیں آج کافر تمہارے دین سے نا اُمید ہو گئے ہیں تو اُن سے مت ڈرو اور مجھی سے ڈرتے رہو۔ (اور) آج ہم

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ

نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لیے

لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ

اسلام کو دین پسند کیا۔ ہاں جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) گناہ کی طرف مائل

لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ③

نہ ہو تو خدا بخشنے والا مہربان ہے

آیت:۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۵ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ○

Marfat.com

''اے ایمان والو! اپنے وعدوں کو پورا کرو۔ حلال کر دیئے گئے ہیں تم پر مویشی قسم کے جانور' مگر وہ جو (آگے) تمہیں بیان کئے جائیں گے۔ حلال نہ جانو شکار کو اس حالت میں جبکہ تم (حالت) احرام میں ہو۔ بے شک اللہ حکم دیتا ہے جس (چیز) کا وہ ارادہ کرتا ہے''۔

یہ سورۃ جیسا کہ تعارف میں واضح کیا جا چکا ہے عہد و میثاق کی سورۃ ہے۔ ظاہر ہے کہ عہد و میثاق صرف ان لوگوں سے لیا جا سکتا ہے جو عہد و میثاق کی حقیقت کے قائل' اس کے ایفا کی اہمیت کو تسلیم کرنے والے' اس کی شکست و ریخت کے نقصانات کو سمجھنے والے اور اس سے بچنے والے ہوں۔ یہ کیفیت کسی بھی انسان میں دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور دائرہ اسلام میں داخل ہونا ایمان کہلاتا ہے اور ایمان لانے والوں کو مومن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس لئے اس سورۃ میں عہد و میثاق کے ایفا کا حکم دینے سے پہلے خطاب مومنوں سے کیا گیا ہے کیونکہ وہی اس کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ایمان کی تفصیل کیا ہے اور ایمان لانے سے کن کن چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے۔ ایمان کا معنی تو صرف ماننا ہے لیکن قرآن کریم اور شریعت اسلامیہ نے اس کا استعمال صرف ماننے پر نہیں کیا بلکہ سچے دل سے ماننا اور یقین کرنا بھی اس کی حقیقت میں داخل ہے۔ اگر زبان سے صرف اقرار کر لیا جائے لیکن دل اس کی تصدیق نہ کرے اور دماغ اس پر یقین نہ لائے تو یہ لفظی ایمان ہے حقیقی ایمان نہیں۔ بقول اقبال

؎ تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الّا
لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

اب رہی یہ بات کہ ایمان لانے سے کن کن چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے تو قرآن مجید میں پوری طرح اس بات کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ مختصراً یہ کہ ایمان سے مراد اولاً اللہ کو ماننا ہے۔ محض اس کے وجود کو ماننا نہیں بلکہ اسے اس حیثیت سے ماننا ہے کہ وہی ایک خدا ہے۔ خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اس کا مستحق ہے کہ انسان اس کی عبادت' بندگی اور اطاعت بجا لائے۔ وہی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے والا ہے۔ بندے کو اسی سے دعا مانگنی چاہیئے اور اسی پر توکل کرنا چاہیئے۔ وہی حکم دینے اور منع کرنے والا ہے۔ بندے کا فرض ہے کہ اس کے حکم کی اطاعت کرے اور جس چیز سے اس نے منع کیا ہے اس سے رک جائے۔ وہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے۔ اس سے انسان کا کوئی فعل تو درکنار' وہ مقصد اور نیت بھی مخفی نہیں ہے جس کے ساتھ اس نے کوئی فعل کیا ہے۔ ثانیاً ''رسول کو ماننا'' اس حیثیت سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مامور کیا ہوا ہادی و رہنما ہے اور جس چیز کی تعلیم بھی اس نے دی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے' برحق ہے اور واجب التسلیم ہے۔ اسی ایمان بالرسالت میں ملائکہ' انبیاء اور کتب الٰہیہ اور خود قرآن پر بھی ایمان لانا شامل ہے کیونکہ یہ ان تعلیمات میں سے ہے جو اللہ کے رسول نے دی ہیں۔ ثالثاً آخرت کو ماننا اس حیثیت سے کہ انسان کی موجودہ زندگی پہلی اور آخری زندگی نہیں ہے' بلکہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا ہے' اپنے ان اعمال کا جو اس نے دنیا کی اس زندگی میں کیے ہیں اللہ کو حساب دینا ہے اور اس محاسبہ میں جو لوگ نیک قرار پائیں انہیں جزا اور جو بد قرار پائیں ان کو سزا ملنی ہے۔ یہ ایمان اخلاق اور سیرت و کردار کے لئے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دیتا ہے جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہے ورنہ جہاں سرے سے یہ ایمان ہی موجود نہ ہو وہاں انسان کی زندگی خواہ کتنی ہی خوشنما کیوں نہ ہو اس کا حال ایک بے لنگر کے جہاز کا سا ہوتا ہے جو موجوں کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہیں قرار نہیں پکڑ سکتا۔

یہ وہ تین بنیادی اعتقادات ہیں جن کو یقین اور ایقان کے ساتھ ماننا اور دل و دماغ کو ان کے تابع کر دینا یہ ایمان کی حقیقت ہے اور یہی ایمان کا مطالبہ بھی ہے۔ جو لوگ اس مطالبہ کو قبول کر لیتے ہیں اور اپنی پوری شخصیت پر اس ایمان کی چھاپ لگا دیتے ہیں وہ لوگ مومن ہیں اور اس سورۃ میں ایسے ہی لوگوں سے ایفائے عقود کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

Marfat.com

عقود عقد کی جمع ہے، عقد کا معنی ہے ''باندھنا''۔ عہد و پیمان کو بھی چونکہ پورا کرنے کیلئے باندھا جاتا ہے اس لئے اسے عقد بھی کہتے ہیں اور عہد بھی۔ بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ بندش اور پابندی کیا ہے۔ اس لحاظ سے عقود کا ترجمہ پابندیاں ہوگا۔ یعنی اللہ کی طرف سے جو پابندیاں بندوں پر لگائی گئی ہیں ان کو پورا کرنے کا بندوں سے عہد لیا گیا ہے۔ البتہ! عقد کا لفظ عہد و میثاق کے الفاظ کے مقابلے میں عام ہے۔ اس میں قول وقرار، قسم اور کسی معاملے میں گواہی کی ذمہ داری سے لے کر اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان عہد و میثاق تک سب کچھ شامل ہے۔ اس تفصیل کو اگر سمیٹا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ عہد یا عقد کی تین قسمیں ہیں:

1- **اللہ سے عہد:** جس طرح ہم نے اللہ سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ ہم آپ ہی کی عبادت کریں گے' آپ ہی سے استعانت کریں گے' حلت و حرمت کیلئے صرف آپ کی ذات کو سند سمجھیں گے' آپ کے احکام کو حرف آخر جانیں گے اور اس کے مقابلے میں کسی بڑی سے بڑی اتھارٹی کے احکام کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیں گے۔ اجتماعی اور انفرادی زندگی میں صرف آپ کی راہنمائی ہماری راہنما ہوگی اور اسی کو دنیا و آخرت میں اپنے لئے سربلندی کا ذریعہ سمجھیں گے۔

2- **اپنے ساتھ عہد:** یہ وہ عہد اور معاہدہ ہے جو ایک انسان خود اپنے نفس کے ساتھ کرتا ہے۔ مثلاً کسی چیز کی نذر اپنے ذمہ مان لینا یا حلفاً کوئی چیز اپنے ذمہ لازم کر لینا یا کسی وعدے سے اپنے آپ کو پابند کر لینا۔

3- **دوسروں کے ساتھ عہد:** جیسے ہم باہمی ایک دوسرے سے لین دین کرتے ہیں۔ معاملات کے ایفا کیلئے باہمی وعدے ہوتے ہیں۔ قرض یا امانت میں کبھی زبانی وعدے ہوتے ہیں اور کبھی دستاویزی اور یہ معاملات کبھی افراد کے درمیان ہوتے ہیں کبھی دو گروہوں میں' کبھی دو قوموں یا دو ملکوں میں یہ سب عہود اور عقود ہیں اور اس تیسری قسم میں داخل ہیں۔

مختصر یہ کہ عہد اور عقد کی نوعیت کچھ بھی ہو وہ چاہے اللہ کے ساتھ باندھا ہوا' اپنے جسم و جان پر خود لازم کیا ہو یا ایک دوسرے سے اس کا باہمی تعلق ہو پھر چاہے اس میں شریک اپنے ہوں یا بیگانے، مسلمان ہوں یا کافر۔ ہر صورت میں ہر نوعیت کے عہد کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور مزید یہ کہ خطاب پوری امت کو ہو رہا ہے اور اس وقت ہو رہا ہے جب کہ وہ ایک تیزی سے ابھرتی ہوئی قوت ہے اور صاف نظر آ رہا ہے کہ چند سالوں میں پورا جزیرۂ عرب اس کے زیر نگیں ہوگا اور کفر کی مرکزی طاقتیں سرنگوں ہو جائیں گی اور یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ جزیرۂ عرب اس امت کا بیس (Base) بنے جس سے اس انقلاب کے اثرات پوری دنیا میں پھیلیں۔ ایسی صورت حال میں یہ بہت ضروری تھا کہ اس امت کو عہد و پیمان کی پابندیوں کا خوگر بنایا جاتا کیونکہ جب بھی مظلوم و مقہور قومیں طاقت اور قوت سے بہرہ ور ہوتی ہیں اور انقلاب کے منہ زور گھوڑے پر سوار ہو کر وہ دنیا کو زیر کرنے کیلئے نکلتی ہیں تو پھر اخلاقی قوتیں بالعموم ان کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں لیکن امت مسلمہ چونکہ ایک حامل دعوت امت اور شہادتِ حق کا علمبردار گروہ اور عدل اجتماعی کے پیغامبر کی حیثیت سے اٹھائی جا رہی تھی اور یہ نعمتیں پوری دنیا میں اس کے واسطے سے عام کی جانی مقصود تھیں تو بہت ضروری تھا کہ اس کو اس طرح اللہ کے عہد و میثاق سے وابستہ کر دیا جاتا کہ وہ طاقت کے نشے میں مبتلا ہو کر کبھی بھی حق سے انحراف کرنے کی جرأت نہ کرے۔ اس لئے پوری شدت کے ساتھ حکم دیا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴿اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو' اپنے وعدوں کو پورا کرو﴾

چاہے وہ وعدے اللہ کے ساتھ ہیں یا بندوں کے ساتھ۔ اسی صورت میں تم خلافت علی منهاج النبوت قائم کر سکو گے اور اگر تم نے اللہ

Marfat.com

سے کیے گئے وعدوں سے پہلوتہی کی تو پھر یہ تمہاری اپنی حکومت ہوگی نیابت الٰہی نہیں ہوگی حالانکہ تمہیں ایک ایسے گروہ کے طور پر اٹھایا گیا ہے جنہوں نے اللہ کی حاکمیت کو قائم کرنا ہے۔ دنیا تمہارے طرز عمل سے یہ محسوس کرے کہ تم حاکم ہو کر بھی حاکم نہیں ہو بلکہ اللہ کے بندے ہو اور تمہارا کام اللہ کے احکام نافذ کرنا ہے اپنی حکومت قائم کرنا نہیں ہے۔

آگے فرمایا: اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ ﴿حلال کردیئے گئے ہیں تم پر مویشی قسم کے جانور﴾

عجیب بات ہے کہ بات یہاں سے شروع کی گئی ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ ایک بڑی ذمہ داری دینے والا ہے اس نازک ذمہ داری کا تقاضہ ہے کہ تم اللہ سے کیے ہوئے اس عہد و پیمان کی حفاظت کرو جس کو بنی اسرائیل نے بری طرح پامال کیا۔ دیکھنا تم ہرگز ایسا نہ کرنا لیکن اس کے فوراً بعد جو بات شروع کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ''حلال کردیئے گئے ہیں تم پر مویشی قسم کے جانور''۔ اس جملے کا آیت کے پہلے حصے سے بظاہر کوئی ربط نظر نہیں آتا لیکن اگر تھوڑا سا تدبر کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ جب ہم کسی کا اقتدار تسلیم کرتے ہیں تو چند علامتیں ہیں جو اس کے اقتدار کی علامات کہلاتی ہیں اور انہی کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ اس صاحب اقتدار کو تسلیم کیا گیا ہے یا نہیں۔ ان علامات میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ حلت و حرمت کا اختیار آپ کس کو دیتے ہیں یعنی وہ کون سی قوت ہے جس کو یہ اختیار ہے کہ وہ جس کو چاہے حلال کہے جس کو چاہے حرام' جسے چاہے جائز کہہ دے' جسے چاہے ناجائز ٹھہرا دے اور جس چیز کی چاہے اجازت دے اور جس چیز سے چاہے روک دے یعنی جس چیز کا چاہے اثبات کردے اور جس چیز کی چاہے نفی کردے۔ جس قوت کیلئے یہ اختیارات تسلیم کیے جاتے ہیں اسی کو صاحب اقتدار سمجھا جاتا ہے کیونکہ اقتدار انہی اختیارات کے حامل ہونے کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اگر رویہ یہ اختیار کیا جائے کہ ایک آدمی کو تخت اقتدار پر بٹھا دیا جائے۔ اسکے احترام میں کوئی کمی نہ ہو۔ باقاعدہ اس کی حکومت کے نعرے بھی لگیں لیکن اسے کسی بات پر بالکل اختیار نہ ہو یعنی اختیار نام کی کوئی چیز اسے تفویض نہ کی جائے۔ آپ خود اندازہ لگائیے کہ کیا ایسے آدمی کو صاحب اقتدار کہا جاسکتا ہے؟ اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے 1857ء کی جنگِ آزادی سے قبل برصغیر پاک و ہند کے دارالحکومت دہلی میں جب بھی کوئی حکم صادر کیا جاتا تو اس کا اعلان اس طرح ہوتا تھا۔ لوگو! ملک اللہ کا' بادشاہت بہادر شاہ ظفر کی اور حکم ایسٹ انڈیا کمپنی کا۔ یہ وہ مذاق تھا جو بادشاہ کے ساتھ کیا جا رہا تھا اور جسکے ردعمل کے طور پر جنگ آزادی وقوع پذیر ہوئی۔ یہاں یہی تصور دینا مقصود ہے کہ اس دنیا میں کوئی ایسٹ انڈیا کمپنی نہیں' یہاں ایک ہی حاکم اعلیٰ ہے جسے تم اللہ کے نام سے یاد کرتے ہو۔ اسکے اقتدار کو نہ تو کوئی چیلنج کرسکتا ہے نہ اس میں دخیل ہوسکتا ہے تم اسی پر ایمان لائے ہو' اسی سے غیر مشروط اطاعت کا عہد اور عقد باندھا ہے۔ جانوروں کی حلت و حرمت اسی کے اقتدار اعلیٰ اور تمہاری غیر مشروط اطاعت کی علامت ہے۔

مزید اگر تدبر سے کام لیا جائے تو یہیں سے ایک بہت بڑی حقیقت کا بھی انکشاف ہوتا ہے جس کے سمجھ لینے سے امت مسلمہ میں در آنے والی بہت ساری اجتماعی گمراہیوں کا تدارک بھی ہوسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مسلمانوں کا جو عہد و پیماں ہے وہ صرف یہ نہیں ہے کہ ہم اس کی حاکمیت اعلیٰ اور کبریائی کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے نام کا وظیفہ کرتے ہیں' اسی سے مناجات کرتے ہیں۔ ضرورت پڑے تو تنہائی میں اسے پکارتے ہیں لیکن اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کوئی فیصلہ یا عمل کرنے سے پہلے ہم یہ سوچنے کی کبھی زحمت نہیں کرتے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس میں کہیں اس کے حکم کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی یعنی ہمیں اس کی بڑائی تسلیم ہے لیکن اس کا اقتدار تسلیم نہیں' اس کا احترام سر آنکھوں پر لیکن اس کے احکام کی اطاعت ہمارے لئے ممکن نہیں۔ کسی بھی ذات کے ساتھ یہ طرز عمل کہ اسے مانا جائے لیکن اطاعت نہ کی جائے اسے عقیدہ کہتے ہیں' دین نہیں کہتے۔ مذہب تک قوت سے بیگانہ رہتا ہے وہ صرف ایک عقیدہ ہے لیکن جب اسے حاکمیت اور اقتدار مل جاتا ہے اور وہ کسی قوم کا اجتماعی چلن بن جاتا ہے اور جس

Marfat.com

کرنے نہ کرنے پر احتساب حرکت میں آتا ہے اسے دین کہتے ہیں اور پھر عقیدہ اور عمل میں جب مطابقت پیدا ہو جاتی ہے تو انسانی زندگی میں دوعملی ختم ہو جاتی ہے۔ اب وہ قوت جس کے سامنے مسجدوں میں سر جھکتے ہیں اسی کا حکم عدالتوں میں گونجتا ہے' حکومت کے ایوانوں میں اسی کے مطابق پالیسیاں ڈھلتی ہیں' وہی تہذیب اور تمدن کی بنیاد بنتا ہے۔ حلت و حرمت کی بحث چھیڑ کر اسی تصور کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ اس سورۃ کے نزول سے پہلے اسلام ایک عقیدے کے طور پر پہچانا جاتا تھا لیکن اس سورۃ کے نزول کے زمانہ میں اسلام مسلمانوں کے دلوں کا صرف عقیدہ نہیں رہا تھا بلکہ وہ خود ریاست کا راہنما یا مذہب بلکہ خود ریاست بن چکا تھا۔ چنانچہ اسلام جب مذہب سے بڑھ کر ریاست بن جاتا ہے تو پھر یہ قوت کہ کونسی چیز صحیح ہے اور کونسی غلط اور کونسی چیز حلال ہے اور کونسی حرام' یہ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اللہ کے بندے اس کے نائب بن کر زبان سے اس کا حکم دیتے ہیں اور حکومت کی طاقت اسے نافذ کرتی ہے لیکن تختِ حکومت پر بیٹھنے والا شخص کبھی اپنے آپ کو حلت و حرمت کی اتھارٹی نہیں سمجھتا۔ چنانچہ تمام خلفائے راشدین کو دیکھ لیجئے وہ اپنے خطبات میں برملا اس بات کا اظہار کرتے تھے: لوگو! جب تک ہم تمہیں اللہ کی اطاعت کی طرف بلائیں تم پر ہماری اطاعت لازم ہے لیکن جب تمہیں ہم اپنی ذات اور اپنی اطاعت کی طرف دعوت دیں تو تم پر ہماری اطاعت بالکل جائز نہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو قرآن ہم میں پیدا کرنا چاہتا ہے مگر اس ملک کے پڑھے لکھے لوگوں کو یہ بات سمجھ نہیں آتی یعنی جب بھی اس ملک میں یہ بات اٹھتی ہے کہ یہاں اسلامی نظام آنا چاہیے تو آپ نے کئی نام نہاد دانشوروں سے یہ سنا ہوگا کہ ہم نماز پڑھتے ہیں' روزہ رکھتے ہیں' ہوسکے تو حج بھی کر لیتے ہیں، اللہ کو مانتے ہیں، اس کے رسول کو مانتے ہیں' قرآن پاک کی تلاوت بھی کر لیتے ہیں اور اسلام کیا ہے؟ خرابی وہی ہے جس کا ذکر کیا گیا کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب تو موجود ہے اور اس کتاب کا ایک ایک لفظ ہمارے دلوں کے عقیدے میں شامل ہے لیکن ملک کے نظام میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں۔ جب تک اللہ کی کتاب خود ریاست یا مذہب ریاست نہ بن جائے کہ اس کی مخالفت کرتے ہوئے انسان کو یہ خوف لاحق ہو کہ اگر میں نے اس کی مخالفت کی تو احتسابی ادارے فوراً میری طرف متوجہ ہوں گے۔ ہوسکتا ہے مجھے پس دیوارِ زنداں جانا پڑے۔ جب تک اس طرح کا خوف اللہ کے بیان کردہ احکامات کے مطابق ہمیں لاحق نہیں ہوتا' مذہب ریاست نہیں بن سکتا اور یہی وہ فرق ہے جو ہمیں سمجھ میں نہیں آتا۔

جیسا کہ ہم تعارف میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ سورۃ حدیبیہ کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی جس میں قریش نے مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روک دیا تھا اور آئندہ سال عمرہ کی اجازت دی تھی، اب چونکہ مسلمانوں کو عمرہ کرنے کیلئے جانا تھا تو اس ضرورت کو دیکھتے ہوئے پروردگار نے اس سورۃ میں کسی حد تک تفصیل سے عمرے اور حج کے احکام بیان فرما دیئے ہیں تاکہ مسلمان مناسکِ عمرہ اور مناسکِ حج کی ادائیگی میں کسی کوتاہی کا شکار نہ ہوں۔ اس لئے ارشاد فرمایا:

اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ

﴿تمہارے لئے انعام کی قسم کے تمام چوپائے حلال ٹھہرائے گئے بجز ان کے جن کا حکم تم کو پڑھ کر سنایا جا رہا ہے ناجائز کرتے ہوئے شکار کو حالتِ احرام میں﴾

''انعام'' (مویشی) کا لفظ عربی زبان میں اونٹ' گائے' بھیڑ اور بکری پر بولا جاتا ہے اور 'بھیمة'' کا اطلاق ہر چرنے والے چوپائے پر ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہوتا کہ انعام تمہارے لئے حلال کئے گئے تو اس سے صرف وہی چار جانور حلال ہوتے جنہیں عربی میں 'انعام' کہتے ہیں۔ لیکن حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے کہ ''مویشی کی قسم کے چرندہ چوپائے تم پر حلال کئے گئے''۔ اس سے حکم وسیع ہو جاتا ہے اور وہ سب چرندہ جانور اس کے دائرے میں آ جاتے ہیں جو مویشی کی نوعیت کے ہوں یعنی جو کچلیاں نہ رکھتے ہوں' حیوانی غذا کے بجائے نباتی غذا کھاتے ہوں اور دوسری حیوانی

Marfat.com

خصوصیات میں انعام عرب سے مماثلت رکھتے ہوں۔ نیز اس سے اشارۃً یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ وہ چوپائے جو مویشیوں کے برعکس کچلیاں رکھتے ہوں اور دوسرے جانوروں کو مار کر کھاتے ہوں' حلال نہیں ہیں۔ اسی اشارے کو نبی ﷺ نے واضح کر کے حدیث میں صاف حکم دے دیا کہ درندے حرام ہیں۔ اسی طرح حضور ﷺ نے ان پرندوں کو بھی حرام قرار دیا جن کے پنجے ہوتے ہیں اور جو دوسرے جانوروں کا شکار کر کے کھاتے ہیں یا مردار خور ہوتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ

نهی رسول الله ﷺ عن کل ذی ناب من السباع و کل ذی مخلب من الطیر

دوسرے متعدد صحابہ سے بھی اس کی تائید میں روایات منقول ہیں۔

کون سے جانور حرام ہیں؟

معلوم ہوا کہ مویشی قسم کے تمام جانور حلال ہیں سوائے ان چند کے۔ 1- چیرنے پھاڑنے والے' 2- شکار کرنے والے' 3- مردار خور' 4- حیوانی غذا کھانے والے۔ ان چار طرح کے جانوروں کے علاوہ باقی تمام جانور اللہ نے حلال کر دیئے۔ ان میں سے بھی وہ جانور حرام ہیں جن کا آگے بیان آ رہا ہے۔ فرمایا:

اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ ﴿(سوائے ان کے) جو آگے تمہیں بیان کئے جائیں گے﴾

حلال جانور کس وقت حرام ہے؟

یہاں ان حلال جانوروں کی بھی تفصیل بیان کر دی گئی ہے جو عام طور پر تو حلال ہیں لیکن بعض خاص عوامل کی وجہ سے وہ بھی حرام ہو جاتے ہیں یعنی جانور حلال تو ہے لیکن وقتی طور پر اس میں حرمت پیدا ہو جاتی ہے۔

غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ''حلال نہ جانو شکار کو جب کہ تم احرام میں ہو'' یعنی جب کوئی انسان حالت احرام میں ہو تو اس کے لئے ہر طرح کے حلال جانور کا گوشت تو حلال ہے لیکن وہ اس حلال جانور کا شکار نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوا کہ حالت احرام میں انسان ہرن وغیرہ کا گوشت تو کھا سکتا ہے لیکن خود شکار کرنا اس کے لئے حلال نہیں اور نہ ہی وہ کسی کو کسی شکار کی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ مثلاً حالت احرام میں کوئی انسان دیکھتا ہے کہ ایک ہرن دوڑا جا رہا ہے' اب وہ کسی ایسے انسان کو جو حالت احرام میں نہیں ہے اس کے متعلق اشارۃً بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ تم اس ہرن کو شکار کر لو کیونکہ احرام باندھ لینے کے بعد انسان اللہ کے آگے بالکل بے بس اور معطلِ محض ہو جاتا ہے اور اللہ کے عشق میں دیوانہ ہو جاتا ہے' اس لئے اس کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کوئی فرزانگی کا کام کرے۔ ویسے بھی احرام شعائر اللہ میں سے ہے اور یہ اس کی توہین بھی ہے کہ تم ایسا کام کرو جو اس حالت میں کرنے کی اجازت نہیں۔

احرام:

حج یا عمرہ کی نیت کرنا اور تلبیہ کہنا احرام کہلاتا ہے۔ لیکن اس کی علامت کے طور پر جو لوگ حج و عمرے کیلئے جاتے ہیں' وہ ایک خاص قسم کا لباس زیب تن کرتے ہیں جس میں نیچے ایک تہبند باندھتے اور اوپر ایک چادر اوڑھ لیتے ہیں۔ اس لباس کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ یہ رنگ دار نہیں ہوتا بلکہ سفید ہوتا ہے اور سلا ہوا تو بالکل بھی نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں بہت ساری حلال چیزیں حرام ہو جاتی ہیں مثلاً 1- شکار' 2- حجامت' 3- خوشبو' 4- زینت آرائش اور قضاء شہوت' اس کے علاوہ بھی کچھ پابندیاں ہیں جن کو اہل علم نے بڑی تفصیل سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

Marfat.com

صرف اللہ جس چیز کو چاہے حرام قرار دے سکتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ ﴿بے شک اللہ حکم دیتا ہے جس چیز کا وہ ارادہ کرتا ہے﴾

یہ بہت بڑی بات ہے جس کا یہاں صرف دو لفظوں میں ذکر کیا گیا۔ ایک تو یہ کہ جب آدمی حلال وحرام کی تفصیلات پڑھتا ہے تو لازماً یہ سوال اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اللہ نے بعض جانوروں کو حلال اور بعض جانوروں کو حرام قرار دیا؟ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اصل بات کو چھوڑ کر اس وجہ کی تلاش میں نکل پڑتا ہے جس وجہ سے وہ جانور حلال یا حرام قرار دیئے گئے۔ چنانچہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے حلال اور حرام جانوروں میں وہ وجوہ تلاش کرنے کی کوششیں کی ہیں جن کی وجہ سے انہیں حلال یا حرام قرار دیا گیا۔ لیکن میرے نزدیک یہ محض اپنا وقت ضائع کرنے والی بات ہے۔ قرآن نے اس آیت میں یہ عقدہ فاش کر دیا ہے۔ فرمایا: دیکھو! کسی چیز کو حلال کرنا یا حرام کرنا اس سبب سے نہیں ہے کہ اس میں کوئی خاص بات ہے بلکہ اصل میں جو بات ہے اور جو ساری حکمتوں سے بڑی حکمت ہے وہ یہ ہے کہ صرف اللہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جس چیز کا جو چاہے حکم دے۔ وہی مطاع مطلق ہے۔ اس کی شان ہی یہ ہے کہ

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ ھُمْ یُسْئَلُوْنَ ﴿اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا البتہ وہ سب سے پوچھے گا﴾ (الانبیاء:23)

یعنی اس کی شان یہ ہے کہ وہ سب سے سوال کرے گا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ لیکن اس سے پوچھا جائے کہ آپ نے یہ کیوں کیا؟ یہ کسی کی مجال نہیں کیونکہ اس نے کسی کو یہ حق دیا ہی نہیں۔ یہ حق اس نے صرف اپنے لئے رکھا ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ جس کام کو چاہے کرنے کا حکم دے اور جس کام سے چاہے روک دے۔ اسی لئے کہا: ''اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ'' تم اس کے پیچھے مت پڑو کہ اس نے کس بات کو کیوں حلال کیا اور کس کو کیوں حرام کیا؟ بلکہ یہ جان لو کہ یہ اس کی شان ہے اور اس کی شان کا ظہور یوں ہی ہوتا ہے کہ وہ جس بات کا چاہے حکم دے۔ یہ الگ بات ہے اور یہ ہمارا عقیدہ بھی ہے کہ جس بات کے جائز ہونے کا اللہ نے حکم دیا' اس کا جائز ہونا انسانی زندگی کیلئے بہتر تھا اور جن باتوں کے ناجائز ہونے کا حکم دیا' ان کا ناجائز ہونا ہی انسانی زندگی کیلئے بہتر تھا۔

البتہ! یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ حلال وحرام میں حفظان صحت کے اصولوں کی بھی ایک اہمیت ہے لیکن حلت وحرمت کا مدار صرف اس بات پر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس سے بھی بڑی ایک اور حقیقت ہے۔ وہ یہ ہے کہ بہت ساری چیزوں کو اس لئے حرام قرار دیا ہے کہ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے' ضمیر کی زندگی اور توانائی کے اعتبار سے' وہ چیزیں نقصان دہ تھیں۔ یعنی بہت ساری چیزیں ان میں ایسی ہیں جو ضمیر کو مردہ کر دیتی ہیں' بہت ساری چیزیں ان میں ایسی ہیں جو انسان کے عمل کو مفلوج کر دیتی ہیں' بہت ساری ان میں چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے ذہن کو گندا کر دیتی ہیں۔ اب ان سب باتوں کو معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ کس چیز کا اخلاقیات پر' ایمان کی نورانیت اور ضمیر کی بیداری پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ان باتوں کو جاننے کے متعلق ہم قیامت تک بھی کوشش کرتے رہیں تو نہیں جان سکتے۔ آپ حرام چیزوں کی فہرست پر نظر ڈالیں تو آپ کو خود معلوم ہوگا کہ بعض چیزیں تو حفظان صحت کی وجہ سے حرام کی گئیں' لیکن بہت سی چیزوں کو شرک کی وجہ سے حرام کیا گیا' جن میں سے چند کی تفصیل آگے بیان ہو رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ جن چیزوں میں شرک کی آمیزش ہوگی وہ انسان کے اخلاق کیلئے تباہ کن ہیں۔ اب یہ جاننا کہ وہ تباہ کن کیوں ہیں یا کتنی تباہ کن ہیں؟ یہ جاننے کیلئے ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی ذریعہ ہمیں عطا ہوا ہے اور وہ ہے ''اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ'' کہ اللہ جانتا ہے کہ ہماری اخلاقیات کیلئے کیا چیز اچھی ہے اور کیا بری۔ چونکہ وہی جانتا ہے' اس لئے اسے ہی یہ حق ہے کہ جس چیز کا چاہے حکم دے اور جس چیز کو

Marfat.com

چاہے روک دے۔

آیت:۲ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ وَ لَاۤ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۝

''اے ایمان والو! اللہ کے شعائر (علامات) کی بے حرمتی نہ کرنا اور نہ (بے حرمتی کرنا) مقدس مہینے کی۔ اور نہ (بے حرمتی کرنا) ہدی کی اور (بے حرمتی کرنا) پٹوں (والے جانوروں) کی۔ اور نہ (بے حرمتی کرنا) ان لوگوں کی جو بیت الحرام کی طرف قصد کر کے جا رہے ہیں، محض اپنے رب کا فضل اور اس کی رضامندی چاہتے ہیں۔ اور جب حلال ہو جاؤ (احرام کھول لو) پس تم شکار کرو اور نہ تمہیں اکسائے (یہ بات) عداوت و دشمنی پر (اس) قوم کہ (وہ) تم کو روکتی تھی مسجد حرام سے اور مدد کرو ایک دوسرے کی نیکی اور پرہیزگاری (کے کاموں) میں اور نہ مدد کرو ایک دوسرے کی گناہ اور سرکشی (کے کاموں) میں۔ اللہ سے ڈرو۔ بیشک اللہ کا عذاب (بہت) سخت ہے''۔

گزشتہ آیت کی تشریح میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ کسی بھی صاحب اقتدار کے اقتدار کو تسلیم کرنے کی علامت یہ ہے کہ آپ اس کو صحیح جائز ناجائز اور حلت و حرمت کی اتھارٹی تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔ تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے صاحب اقتدار کے اقتدار کو تسلیم کر لیا اور تسلیم نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اس کے اقتدار کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اب اس دوسری آیت کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ خدا پرستی اور اللہ کے عطا کردہ نظام زندگی سے وفاداری کی کچھ علامتیں ہیں جن کا احترام کرنا اور ان سے واقعی وابستگی باقی رکھنا اللہ کو اور اللہ کے دین کو قبول کرنے کے مترادف ہے۔ ان علامتوں کو شعائر اللہ کا نام دے کر ان کے احترام کا حکم دیا گیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ پہلے شعائر کا مفہوم سمجھ لیا جائے تا کہ شعائر اللہ کی اہمیت کا احساس ہو۔

شعائر اللہ کی تعریف:

شعائر ''شَعِیْرَۃ'' کی جمع ہے اور ''شعائر'' ان چیزوں کو کہتے ہیں جو کسی بھی ملک، قوم اور مذہب کے رویوں، اس کی حکومت، اس کی حاکمیت اور اس کی عام عزت و افتخار کی علامت ہوتے ہیں۔ مثلاً ملک کا جھنڈا، فوج کی وردی، ملک کی مہر، ملک کا سکہ، عبادت گاہیں، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کی اگر کوئی بے حرمتی کرے تو کوئی ملک و قوم اس کو گوارا نہیں کرتے۔ جیسے کہ روس جب دنیا کے سر پر سوار تھا تو سب جانتے تھے کہ ہتھوڑا اور درانتی اس کی علامتیں ہیں اسلئے اسکی بے حرمتی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی طرح کسی بھی مذہب کی کچھ علامات ہوتی ہیں۔ مثلاً عیسائیت ہی کو دیکھ لیں، صلیب، قربان گاہ اور گرجا ان کی عزت کی علامتیں ہیں۔ سکھوں میں کیس کڑے، کرپان اور گردوارے، ہندوؤں میں چوٹی، زنار اور مندر وغیرہ ان کی علامتیں اور شعائر ہیں۔

اسی طرح اسلام نے جن چیزوں کو اللہ اور دین کی عظمت کی علامتیں قرار دیا ہے، یہاں ان میں سے چند چیزوں کا ذکر ہے، حتیٰ کہ حضور کے حوالے سے اگر میں ایک بات کہوں، آپ اس پر غور کریں کیونکہ کسی بھی بات پر غور کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، وہ یہ کہ داڑھی کو شعائر اسلام میں شامل کیا گیا ہے۔ یعنی داڑھی نہ رکھنا اور بات ہے، لیکن داڑھی کی توہین کرنا خلاف ایمان ہی نہیں، ناقابل برداشت بھی ہے۔ یہ شعائر اللہ میں سے ہے کیونکہ اس کا

Marfat.com

تعلق حضور ﷺ کی ذات مبارکہ سے ہے اور اس کی بے حرمتی کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے چہرے کا مذاق اڑایا جارہا ہے۔اسی طرح اور بہت سی چیزیں جن کا تعلق اللہ' حضور ﷺ اور اسلام سے ہے' وہ سب چیزیں شعائر اللہ ہیں۔مثلاً ''صفا و مروہ'' اس کی پہچان ہیں اسی لئے ان کو اللہ کے شعائر قرار دیا گیا۔

شَھرِ حُرُمْ:

''شَھر'' کی جمع ''اَشْھُر'' ہے۔یہ چار مہینے ہیں 1-ذیقعد' 2-ذی الحجہ' 3-محرم' 4-رجب۔پہلے تین مسلسل اور ایک الگ ہے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّھُوْرِ عِنْدَ اللّٰہِ اثْنَا عَشَرَ شَھْرًا فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْھَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ط

اللہ نے جس دن آسمان وزمین کو پیدا کیا تھا' اسی دن سے اس نے اس کے بارہ مہینے طے کر دیئے تھے اور ان میں چار مہینے عزت والے رکھے تھے'' (التوبہ:36)۔

ان میں لڑائی کی اجازت نہیں لیکن اگر کبھی لڑائی ناگزیر ہو جائے تو یہ ایک مجبوری ہے لیکن ان کو لڑائی کے لئے کبھی حلال نہ سمجھنا۔ان چار مہینوں میں سے کوئی سا بھی مہینہ ہو اس کی عزت کو پامال نہ کرنا۔اگرچہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ حضور ﷺ کی شریعت میں اس حکم کو منسوخ کر دیا گیا ہے۔لیکن محتاط اہل علم یہ کہتے ہیں کہ اگر ان مہینوں میں لڑائی کی ضرورت پڑے بھی تو اس سے احتیاط کرنی چاہئے۔

وَلَا الْھَدْیَ وَلَا الْقَلَآئِدَ ﴿اور نہ (بے حرمتی کرنا) ہدی کی اور نہ (بے حرمتی کرنا) پٹوں (والے جانوروں) کی﴾

ھَدْی وہ جانور ہے جو اس زمانے میں عمرہ کرنے یا حج کرنے والے اللہ کے نام پر قربانی کیلئے ساتھ لے کر جایا کرتے تھے۔اب زمانہ ترقی یافتہ ہو گیا ہے لہٰذا لوگ اپنے ساتھ تو جانور لے کر نہیں جاتے البتہ وہیں سے جانور خرید کر قربانی کی جاتی ہے ''ہدی'' اسی قربانی کے جانور کو کہتے ہیں۔

قَلَآئِدْ جمع ہے ''قلادہ'' کی۔''قلادہ'' اس پٹے کو کہتے ہیں جو جانور کے گلے میں ڈالا جاتا ہے۔عرب کا رواج یہ تھا کہ وہ اس جانور کے گلے میں پٹہ ڈال دیتے جسے اللہ کے نام پر قربانی کیلئے لے جایا جارہا ہوتا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ قربانی کا جانور ہے اور کوئی اس سے تعرض نہ کرے۔اس لئے آیت کا ترجمہ تو بظاہر یہ ہے کہ نہ بے حرمتی کرو پٹوں کی لیکن اصل میں کہا جارہا ہے کہ نہ بے حرمتی کرو پٹوں والے جانوروں کی۔اس لئے یہاں مضاف محذوف ہے اور وہ ہے ''ذوات''۔یعنی وَلَا ذَوَاتَ الْقَلَآئِدَ ''نہ بے حرمتی کرنا پٹوں والے جانوروں کی'' مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی جانور کے گلے میں پٹہ دیکھو تو جان لو کہ یہ جانور اللہ کے نام پر قربانی کیلئے جارہا ہے۔اس کی توہین نہ کرنا' اسے کوئی نقصان نہ پہنچانا۔

وَلَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ رِضْوَانًا ط

﴿اور نہ (بے حرمتی کرنا) ان لوگوں کی جو بیت الحرام کی طرف قصد (سفر) کر کے جارہے ہوں (اور وہ) محض اپنے رب کا فضل اور اس کی رضامندی چاہتے ہوں﴾

آٰمِّیْنَ کا مطلب ہوتا ہے ''قصد کرنے والے'' یعنی جو لوگ عمرے یا حج کیلئے جارہے ہیں' ان کو راستہ میں تنگ مت کرنا۔

شعائر اللہ کی تعظیم ہر حال میں لازم ہے:

وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ط جب تم احرام کھول کر حلال ہو جاؤ تو اب تم شکار کر سکتے ہو کیونکہ حالت احرام میں شکار ممنوع تھا' اب جائز ہے۔اسی طرح احرام کی وجہ سے جو دوسری پابندیاں تھیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ احرام سے نکلنے سے عدل واحسان کی پابندیاں بھی

Marfat.com

ختم ہوگئیں۔اس کی وضاحت کیلئے ارشاد فرمایا:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا

﴿اور نہ تمہیں اکسائے کسی قوم کی دشمنی کہ تم حد سے تجاوز کرو اس بات پر کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا﴾

اس آیت میں مختلف باتیں ہیں کیونکہ یہ سورۃ غالباً ۶ ہجری کے آخر میں یا ۷ ہجری کے شروع میں نازل ہوئی ہے۔اس وقت مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک طاقت فراہم کردی تھی اور اس سے قبل کفار نے مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ظاہر ہے کہ وہ زخم بھی ہرا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ حج کے مہینوں میں عرب جب اپنی عادت کے مطابق عمرہ یا حج کرنے جائیں تو مسلمان یہ سوچیں کہ اگر انہوں نے ہمارے لئے اللہ کے گھر کو ممنوع قرار دے دیا تھا تو ہم بھی انہیں حج نہیں کرنے دیں گے۔بہت سارے قبائل کا راستہ مکہ جانے کیلئے مدینے کے پاس سے گزرتا تھا۔اگر مسلمان چاہتے تو بڑی آسانی سے ان کا راستہ بند کر سکتے تھے۔فرمایا کہ تمہارا اصل کام شعائر اللہ کا احترام ہے‘ جو خود بھی کرنا ہے اور دوسروں سے بھی کروانا ہے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ شعائر اللہ کا احترام اس قدر ضروری ہے کہ وہ لوگ بھی جو بے دین ہیں‘ جو اللہ‘ اس کے رسول اور اللہ کے دین کو نہیں مانتے‘ ان کی اپنی عبادت (جو کہ بلاشبہ غلط ہے) میں بھی جتنا حصہ شعائر اللہ کا ہے‘ اس کا احترام ضروری ہے‘ اس بارے میں قانون شکنی نہیں کرنی یعنی اگر وہ ھدی (قربانی کا جانور) لے کر جا رہے ہیں تو اس میں اتنی بات تو ٹھیک ہے کہ حج کیلئے قربانی کا جانور جانا چاہیئے۔اگر وہ احرام باندھ کر جا رہے ہیں تو یہ اللہ کے سامنے عاجزی کا ایسا ذریعہ ہے جسے تم بھی درست خیال کرتے ہو‘ اس لئے ان کی کسی ایسی چیز کو نقصان مت پہنچاؤ۔

مسلمان کی زندگی کا اصل مقصد:

یعنی مسلمان کو ایک طریقہ سکھلایا گیا کہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کا نفاذ‘ تمہاری زندگی کا اصل مقصد ہے۔دوسرے مذاہب کے ساتھ ظاہر ہے تمہارا تمام باتوں میں اتفاق تو نہیں ہو سکتا‘ لیکن اتنی مخالفت کرو جتنی ضروری ہو۔ان کی خدا پرستی میں اگرچہ شرک کی آمیزش ہے‘ اس کی مخالفت شرک کی وجہ سے ہونی چاہیئے‘ نہ کہ خدا پرستی کی وجہ سے۔اسلئے جتنے خدا پرستی کے اجزاء ان میں موجود ہیں‘ ان کی عزت وحرمت کا پاس رکھنا تمہارے لئے بھی ضروری ہے۔جیسے مندر اور گرجے وغیرہ میں وہ جا کر دیوتاؤں اور حضرت مریم علیہا السلام کو پوجتے ہیں‘ یہ غلط ہے۔لیکن یہ مندر اور گرجے بنائے اللہ کی یاد کیلئے جاتے ہیں‘ لہٰذا دیکھنا! کہیں اس میں ہونے والے شرک سے مشتعل ہو کر انہیں کوئی نقصان مت پہنچانا۔جو باتیں ان میں درست ہیں ان کی قدر کرو اور ان کو نقصان مت پہنچاؤ۔

دوسری بات یہ کہی کہ اگر دشمن نے تمہارے ساتھ حد سے تجاوز کر کے ظلم کا راستہ اختیار کیا ہے تو برائی کا بدلہ برائی سے نہیں ہونا چاہیئے برائی کے بدلے میں اگر نیکی کی گنجائش ہے‘ تو عدل کا تقاضا یہ ہے کہ وہاں نیکی کرنی چاہیئے۔جیسے اگر انہوں نے تمہیں بیت اللہ سے روکا ہے تو اس کا بدلہ یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ تم بھی انہیں بیت اللہ سے روک دو بلکہ انہیں جانے دو‘ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارا اخلاق دیکھ کر راہ راست پر آجائیں۔

صرف نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو:

فرمایا کہ آئندہ زندگی گزارنے کیلئے تمہارے رویے کی بنیاد تعاون پہ ہونی چاہیئے۔تعاون انسانی زندگی کی بقا کیلئے ایک لازمی امر ہے۔جس زندگی میں تعاون نہیں ہے‘ وہ زندگی گزر ہی نہیں سکتی۔جیسے درس قرآن کی مجلس بہت سارے احباب کے تعاون سے وجود میں آتی ہے۔کسی انسان

Marfat.com

لگائیں، کسی نے لاؤڈ سپیکر چلایا، کوئی درس دے رہا ہے، کوئی سن رہا ہے۔ یہ سارا تعاون ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ اگر تعاون نہ ہوتو درس ہو ہی نہ پائے۔ کوئی بڑے سے بڑا آدمی چھوٹے سے چھوٹے تعاون سے مستغنی نہیں ہے۔ بادشاہ جو تخت پر براجمان ہے اس کا تخت بھی کسی بڑھئی نے بنایا ہے۔ انواع واقسام کے کھانے جن سے وہ لذت حاصل کرتا ہے وہ کسی کے پکائے بغیر نہیں پکتے۔ ایک دانۂ گندم بھی کسان کے علاوہ کئی چیزوں اور کئی افراد کا محتاج ہے۔ فوج، پولیس، اجتماعی ادارے یہ سب تعاون کی مختلف شکلیں ہیں۔ لیکن یہی تعاون جب منفی بنیادوں پر اٹھتا ہے تو انسان نہیں بلکہ انسانیت کو پامال کر کے رکھ دیتا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ مل کر ڈاکے ڈالنے کیلئے ایک گروہ بنالیں۔ یہ بھی تعاون کی ایک شکل ہے۔ جس سے ظلم کا دروازہ کھلے گا اور نجانے کہاں تک جائے گا۔ اسلئے اسلام نے کہا کہ ''تعاون تو کرو مگر نیکی اور تقویٰ میں''۔

نیکی کیا ہے؟

عام آدمی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا کیوں کہ یہ ایک عام لفظ ہے۔ نیکی ''فعل الخیرات'' اچھائیاں کرنے کو کہتے ہیں اور تقوی ''ترک المنکرات'' برائیاں چھوڑنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ تم تعاون کرو نیکیوں کو فروغ دینے اور برائیوں کی جڑ مارنے میں اور جس تعاون سے اسلام نے روکا ہے وہ یہ ہے ''ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان '' اثم کہتے ہیں ''گناہ اور نافرمانی کرنے کو'' اور عدوان کہتے ہیں ''حد سے گزر جانے کو'' یعنی ظلم کرنے کو۔ مطلب یہ ہوا کہ نہ ظلم کرو اور نہ گناہ کرو۔ گناہ بجائے خود انسانیت کیلئے داغ ہے اگر اس میں تعاون کیا جائے تو اس کے نقصانات کی وسعت کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ظلم میں تعاون نہ کرو۔ یہی وجہ ہے کہ ظالم حکمرانوں کی نوکری کو ہمارے علماءِ سلف نے حرام قرار دیا ہے۔

منصور نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو کہا تھا کہ میں اپنے بعد سلطنت کا دوسرا بڑا عہدہ آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ آپ کو چیف جسٹس بناتا ہوں، میرا حکم بھی آپ کی مہر کے بغیر نہیں چلے گا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ مجھے نہیں چاہئے۔ اس نے اصرار کیا، لیکن امام صاحب نہ مانے، حتیٰ کہ اس نے قسم کھا لی کہ آپ کو یہ عہدہ ضرور قبول کرنا ہوگا۔ آپ نے بھی جواباً قسم اٹھائی کہ میں اسے ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ وزیر اعظم نے کہا کہ عقل سے کام لو امیر المؤمنین کے مقابلے میں قسم کھاتے ہو؟ آپ نے فرمایا وہ مجھ سے زیادہ آسانی سے کفارہ دے سکتے ہیں۔ بالآخر منصور نے انہیں قید میں ڈال دیا حتیٰ کہ زہر دے کر مار ڈالا۔ لیکن امام صاحب نے اس کا عہدۂ قضاء قبول نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کا کوئی حکم میری مہر کے بغیر نہیں چلے گا اور وہ ظلم کا حکم دے گا، مجھے مجبوراً مہر لگانی پڑے گی اور اس طرح میں بھی ظلم میں شریک ہو جاؤں گا۔ امام صاحب نے فرمایا تھا کہ امیر المؤمنین آپ اس بات کو سمجھیں، یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کسی کے ناحق قتل کا حکم دیں اور میں اس پر مہر لگادوں۔ آپ اس کیلئے اگر مجھے دجلہ میں ڈبونے کا حکم دیں گے، تو میں ڈوبنا پسند کروں گا لیکن اس ظلم کا حصہ نہیں بنوں گا۔ حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد تو یہاں تک ہے کہ اگر کوئی آدمی ظلم کی تقویت کا باعث بنا یا ظالم کے ساتھ چلا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو بلائے گا (ظالم کو بھی اور ان کا ساتھ دینے والوں کو بھی اور جنہوں نے قلم دوات بھی تیار کی انہیں بھی بلائے گا) اور تابوت میں بند کر کے ان سب کو جہنم میں پھینک دے گا۔ اندازہ کریں کہ ظلم کا ساتھ دینے کا معنی کیا ہے اور ہم ظلم کا کس کس طرح ساتھ دے رہے ہیں؟

''وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ '' ہوسکتا ہے کہ تم دنیا میں تو ظلم کر کے آرام سے بیٹھ جاؤ، لیکن یہ خیال رکھنا کہ ایک بہت بڑی ذات تمہاری نگران ہے، اس کے سامنے جواب دہی کی تیاری کرنا، وہ بڑا سخت عذاب دینے والی ہے۔

آیت:۳ حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃُ وَالدَّمُ وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِیۡرِ وَمَاۤ اُہِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰہِ بِہٖ وَالۡمُنۡخَنِقَۃُ وَالۡمَوۡقُوۡذَۃُ وَالۡمُتَرَدِّیَۃُ وَالنَّطِیۡحَۃُ وَمَاۤ اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَکَّیۡتُمۡ ۟ وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ وَاَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ ؕ ذٰلِکُمۡ فِسۡقٌ ؕ اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ دِیۡنِکُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡہُمۡ وَاخۡشَوۡنِ ؕ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ

Marfat.com

الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ O ''تم پر مُردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور حرام کیا گیا جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مرا ہو اور جو چوٹ سے مرا ہو اور جو گر کر مرا ہو اور جو کسی (جانور کے) سینگ سے مرا ہو اور جس کو کسی درندے نے کھایا ہو بجز اس کے جس کو تم نے ذبح کر لیا ہو اور (حرام کیا گیا) جو کسی تھان (آستانہ) پر ذبح کیا گیا ہو اور (حرام کیا گیا) یہ کہ تقسیم کرو (حصہ ایک دوسرے کو) تیروں کے ذریعے سے۔ یہ سب باتیں فسق (گناہ) ہیں۔ آج یہ کافر تمہارے دین سے مایوس ہو گئے' سو تم ان سے نہ ڈرو مجھ ہی سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو بطور دین پسند کیا ہے۔ تو جو شخص بھوک کی وجہ سے مجبور ہو جائے لیکن گناہ کی طرف مائل نہ ہو تو بے شک اللہ بخشنے والا ہے' رحم کرنے والا ہے''۔

حرام جانوروں کی تفصیل:

اب کچھ حرام جانوروں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

1- ''مَیتۃ'' یہ وہ جانور ہے جو طبعی موت مر جائے۔

2- ''اَلدَّمَ'' خون۔ اس سے مراد وہ خون ہے جسے قرآن 'دما مسفوحاً'' کہتا ہے۔ یعنی بہتا ہوا خون اور وہ خون جو جما ہوا ہو' جیسے جگر وغیرہ۔ یہ خون حلال ہے۔ حدیث پاک میں ہے ''تمام مردہ جانور تم پر حرام ہیں سوائے مچھلی اور ٹڈی کے (یہ مردہ حالت میں بھی حلال ہیں)۔ تمام خون تم پر حرام ہیں سوائے تلی' طحال اور جگر کے''۔

3- ''لَحْمُ الْخِنْزِیْرِ'' اس کی ہر چیز حرام ہے۔

4- ''مَآ اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ'' ہر وہ جانور حرام ہے جس پر اللہ کے علاوہ کسی اور کا نام لیا جائے یعنی ذبح کے وقت اللہ کی بجائے کسی دیوتا کا یا اپنے کسی بڑے کا نام لیا جائے۔

آگے کچھ خاص قسم کے مرداروں کا ذکر ہے جو حرام ہیں کیونکہ اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ ایسے ''دانشور'' بھی دنیا میں آئیں گے جو یہ کہیں گے کہ وہ جانور تو حرام ہے جو طبعی موت مر جائے' لیکن جو گلا گھٹ کے مر جائے' یہ تو دوسری قسم کا مردار ہے' اسے تو حلال ہونا چاہئے۔ چنانچہ اسی سے انہوں نے کہا کہ جھٹکے کا گوشت حلال ہے حالانکہ جھٹکا گلا گھونٹ کر مارنے کی ایک صورت ہے۔

5- ''اَلْمُنْخَنِقَۃُ'' جو جانور گلا گھٹ کے مر جائے' حرام ہے۔

6- ''اَلْمَوْقُوْذَۃُ'' جو چوٹ کھا کے مر جائے یعنی حادثاتی موت سے جیسے کسی چیز سے ٹکرا کے مر گیا۔

7- ''اَلْمُتَرَدِّیَۃُ'' بلندی سے گر کر مرنے والا جانور بھی حرام ہے۔

8- ''اَلنَّطِیْحَۃُ'' کوئی جانور کسی جانور کو مار دے' جیسے سینگ لگنے سے مر گیا یا ٹکر لگنے سے زخمی ہو کے مر گیا۔ دونوں طرح سے مرنے والے کو علماء نے حرام قرار دیا ہے۔

9- ''وَمَآ اَکَلَ السَّبُعُ'' ایسا جانور جسے کوئی درندہ چیر پھاڑ دے۔ یہ جانور بھی حرام ہے۔

اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ اگر جان نکلنے سے قبل جانور کو ذبح کر دیا گیا' یعنی شہ رگ کاٹ دی' تو مذکورہ بالا تمام جانور حلال ہو سکتے ہیں۔

جب شہ رگ کاٹ دی جاتی ہے تو جسم سے تمام خون نچڑ نچڑ کر نکل جاتا ہے۔ خون کا کوئی قطرہ جسم میں باقی نہیں رہ جاتا۔ لیکن جب وہ اچانک

Marfat.com

جاتا ہے جیسے مشین پہ پٹے کے ساتھ چھریاں لگی ہوئی ہیں اور مرغیوں کی گردنیں کاٹی جارہی ہیں۔ مغرب سے اکثر اسلامی ملکوں میں اسی طرح کا گوشت درآمد ہوتا ہے یہ حرام ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے گلا کاٹ دیا گیا یا گھونٹ دیا گیا۔ اس طرح خون جسم کے اندر باقی رہتا ہے جو انسانی صحت کے نقطہ نظر سے درست نہیں ہے۔

10- ''وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ'' ایسا جانور جسے استھانوں (آستانوں) پر ذبح کیا جائے۔ بعض لوگوں کا خیالِ باطل یہ ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہے جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے۔ اگر یہ درست ہوتا تو ابھی اسی آیت میں تو گزرا ہے کہ ''وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ'' پھر دوبارہ اس کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دراصل اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی کسی بھی جگہ پر جا کر جانور ذبح کیا جائے جس کے بارے میں ذبح کرنے والے کا خیال ہو کہ یہ جگہ بہت عزت والے دیوتاؤں کی ہے یا یہ جگہ بڑی عظمت والی ہے یا جیسے عام خیال ہے کہ بڑی سخت جگہ ہے کہ وہاں جا کر اگر ہم ذبح نہ کریں تو کوئی بیماری آجائے گی۔ یہ حرام ہے اور یہی اس آیت کا مطلب ہے۔

شراب اور جوا ہر حال میں حرام ہیں:

وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْأَزْلَامِ ''تیروں اور پانسوں کے ذریعے قسمت کا حال معلوم کرنا تم پر حرام ہے''۔ اس آیت کا ایک ترجمہ تو یہ ہے۔ دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ حرام ہے تم پر کہ بانٹو حصہ ایک دوسرے کو تیروں اور پانسوں کے ذریعے۔ یہ دونوں ترجمے درست ہیں لیکن دوسرا ترجمہ میرے نزدیک زیادہ درست ہے اور یہی بات زیادہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہاں یہ بات نہیں ہو رہی کہ کیا چیز حرام ہے اور کیا حرام نہیں ہے بلکہ بات یہ ہو رہی ہے کہ کون کون سی قسم کے گوشت حرام ہیں۔

فسق:

''ذٰلِكُمْ فِسْقٌ'' یہ ساری باتیں جو اوپر گزریں یہ فسق ہیں۔ ہمارے ہاں فسق کے عام طور پر دو استعمال ہیں۔

1- قرآن کا استعمال 2- فقہ کی اصطلاح۔

فقہ کی اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ یہ برائی ہے کفر نہیں ہے۔ یعنی حالت ایمان میں انسان بعض برائیوں کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے اس کو فسق کہتے ہیں۔ لیکن قرآن میں فسق حد سے گزر جانے کو کہتے ہیں۔

یہاں آیت میں مراد قرآنی فسق ہے۔ فقہ کا فسق یہاں مراد نہیں ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں فسق بعض دفعہ کفر کیلئے بولا جاتا ہے اور بعض دفعہ بدعملی کیلئے۔ یہاں ''فسق'' کفر کے معنی میں ہے کہ اللہ کی قائم کردہ حدود کو پامال کرنا اور جو جی میں آئے کرتے چلے جانا یہ کفر ہے۔ اگر لغت کا سہارا لیں تو عربی لغت میں ایک محاورہ ہے ''فسقت الرطبة عن القشرة'' کہ انگشت شہادت کی پور پر ایک کھجور رکھ کے انگوٹھے سے دبائی اور اس کی گٹھلی پھدک کے دور جا گری۔ ''رطب'' تر کھجور کو کہتے ہیں۔ ''فسق'' کا معنی پھدک کر اچھل کر نکل جانا ہے یعنی آدمی اللہ کی تمام حدود کو پھلانگتا ہوا نکل جائے اسے فسق کہتے ہیں۔ یہاں یہی فسق مراد ہے۔

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ط

﴿آج مایوس ہو گئے ہیں کافر تمہارے دین سے ان سے مت ڈرو مجھ ہی سے ڈرو﴾

Marfat.com

مایوس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئیں یعنی ۶ ہجری کے آخر میں یا ۷ ہجری کے شروع میں یا بعض روایات کے مطابق حجۃ الوداع کے موقع پر۔ شاید یہ جملہ بھی حصہ ہو آنے والے جملے کا۔ میرا گمان یہ ہے کہ یہ اسی کا حصہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج ہم نے تمہیں اتنی قوت دے دی ہے کہ تمہارے احوال فکر و عمل مرتب ہو گئے۔ تمہاری سیاسی‘ تمدنی‘ تہذیبی زندگی ہر طرح سے منظم ہو گئی۔ سیاسی طور پر تمہارے استحکام کا یہ حال ہے کہ دنیا تمہاری قوت کو تسلیم کر رہی ہے۔ اب ایسا نہیں ہے کہ تمہیں کسی سے مفاہمت کرنی پڑے یا جیسا کہ کافر پہلے سوچا کرتے تھے کہ انہیں ڈرا دھمکا کے یا بہلا پھسلا کے واپس اپنے دین میں لے آئیں گے۔ وہ زمانہ اب گیا۔ وہ تمہیں واپس آنے کا نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ جانتے ہیں تم ہر لحاظ سے ان سے زیادہ مضبوط ہو۔ تم اور تمہارا دین مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہے جو ہر طرح سے مکمل و مرتب ہو گیا ہے اور یہ نافذ ہو چکا اللہ کی زمین پر۔ وہ لوگ اب مایوس ہو گئے ہیں کہ تمہیں کسی طرح بہلا پھسلا سکیں۔ البتہ! تمہیں ایک بات سوچنی ہے کہ قوموں کی زندگی میں جو بڑا خطرناک لمحہ ہوتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ جب وہ زوال کا شکار ہوتی ہیں تو وہ اپنے نظریات پر مکمل اعتماد کی بجائے دریوزہ گری کرنے لگتی ہیں۔

قوموں کی زندگی کا خطرناک ترین لمحہ:

اللہ نے ان کو ایک نظریاتی قوت دے رکھی ہوتی ہے اور سینکڑوں سالوں کی تاریخ ان کی پشت پر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود جب کوئی نیا فکری انقلاب آتا ہے تو وہ اس سے متاثر ہو کر اپنی فکری بنیادوں کو متزلزل کرنے لگتی ہیں۔ اس کی نمایاں مثال عباسی دور ہے، جب ہمارا یونانیوں سے واسطہ پڑا تو ہمارے یہاں بڑے بڑے دانشور پیدا ہوئے جنہوں نے یونانی فلسفہ پڑھا اور اس سے متاثر ہو کر اسلام کی بہت ساری باتوں کے بارے میں عقیدے کی کمزوری کا شکار ہوئے اور جب تک امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ جیسے لوگ نہیں اٹھے انہوں نے دریوزہ گری نہیں چھوڑی۔ اخوان الصفاء جیسی تحریکوں کے نام سے نہ جانے کیا کیا فتنے اٹھتے رہے۔ اصل بات یہ تھی کہ ان کی بنیادیں غیر مستحکم ہو گئی تھیں اور انہوں نے یہ رویہ چھوڑ دیا تھا کہ ''فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِ'' یعنی صرف اللہ کی پرواہ کریں‘ کسی اور کو پلے نہ باندھیں۔ اسی زوال کا پھر ایک دوسرا دور آیا جو ہمیں غلامی کے دور میں دیکھنا پڑا کہ مغربی دنیا سے بہت سے افکار ہم پر بارش کی صورت برسنے لگے۔ جو بات گوری چمڑی والے کی زبان سے نکلی‘ ہم نے یہ سمجھا کہ یہ آسمان سے اتری ہے۔ لندن کا آسمان ہمارے لئے ایسا ہو گیا جیسے خدا کا آسمان ہے۔ اس کی ہر بات وحی الٰہی قرار پائی۔ مثلاً ''ڈارون'' جس نے انسان کے ارتقا کی ایک بے ہودہ تھیوری پیش کی۔ آج سے پچاس‘ ساٹھ برس پہلے ہمارا کوئی دانشور اس کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن آج اسے برسر عام کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ''بے وقوف'' آدمی تھا۔ نجانے کس کس کے اقوال ہیں جو قانونی‘ تہذیبی اور تمدنی حوالوں سے یہاں منتقل ہوئے اور ہم اس کی دریوزہ گری آج بھی کر رہے ہیں۔

بات صرف دریوزہ گری تک ختم نہیں ہوتی کیونکہ اس سے تو صرف فکری توانائی متاثر ہوتی ہے۔ یہاں تو اجتماعی زندگی کا ہر شعبہ غیروں کی ز[د] میں ہے۔

فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِ:

مولانا محمد علی جوہر رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ مولانا سے ملنے گیا اچانک ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ مولانا زار و قطار رو رہے ہیں۔ میں نے جلدی سے اپنے قدم پیچھے ہٹائے کہ آدمی پر بعض

Marfat.com

ماؤف لمحے ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ اپنے احساسات کی گرفت میں ہوتا ہے۔ میں باہر کھڑا انتظار کرنے لگا۔ جب ان کے آنسوؤں کا سیلاب نہ رکا' حتیٰ کہ ہچکی بندھ گئی' مجھے پریشانی ہونے لگی' آخر میں اندر داخل ہو گیا۔ میرے پاؤں کی آہٹ سن کر انہوں نے سر اٹھایا اور مجھے دیکھ کر اپنے آپ کو سنبھالنے لگے اور بڑی دیر تک اپنے آپ کو سنبھالتے رہے۔ جب وہ نارمل ہو گئے تو میں نے عرض کی کہ حضرت! ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ آپ نے رو رو کر اپنا حال برا کر لیا؟ انہوں نے قرآن کی طرف اشارہ کیا جو سامنے کھلا تھا اور اس کے اوراق بھیگ رہے تھے' میں نے دیکھا تو یہی آیت تھی ''فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ'' مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے مجھے بتلائیں؟ مولانا نے فرمایا کہ یہاں اللہ نے ہمیں کتنے بڑے انعام سے نوازا ہے' تکمیل دین' اتمام نعمت اور ہمارے لئے دین اسلام کو پسند کرنا اور اس ساری نعمت کی شرط صرف یہ ہے کہ ''ان سے نہ ڈرو' مجھ ہی سے ڈرو'' یعنی کسی اور کی فکری' سیاسی' تہذیبی' تمدنی' معاشی اور معاشرتی قوت کو اپنے سے برتر خیال کر کے اپنی تمام سرفرازیوں کو کہیں زہر آلود نہ کر لینا' اپنی تاریخ کو کہیں رسوا نہ کر لینا۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میرے ایمان پر نجانے کیسے کیسے غیروں کے اثرات ہیں۔ میری عبادات' میرے گھر کی زندگی' میری تہذیب و معاشرت تک میں سیاسی اثرات داخل ہو گئے ہیں یعنی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جسے ہم نے مغربی تہذیب کیلئے کھول نہ دیا ہو۔ جب میں اپنی قوم کی یہ حالت دیکھتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں کہ یا اللہ! تیرا انعام تو مذکورہ بالا شرط کے ساتھ مشروط تھا۔ ہم تو اب تک اس مرحلے تک پہنچے ہی نہیں' ہمارے لئے یہ انعام کس کام کا؟ یہ وہ چیز ہے جو مجھے خون کے آنسو رلاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہی وہ چیز ہے جس نے ان سے یہ لافانی شعر کہلوایا تھا:

؎ توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

تکمیلِ دین اور عرفہ کا دن:

فرمایا آج میں نے تم پر تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔ ''الیوم'' سے مراد کوئی خاص دن نہیں ہے۔ اس سے مراد وہ دن یا وہ زمانہ یا وہ دور ہے جس سے اس وقت مسلمان گزر رہے تھے۔ مفسرین کہتے ہیں یہ قرآن کی آخری آیت ان معنوں میں مشہور ہوئی کہ اس کے بعد احکام کی کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ لیکن ترغیب و ترہیب کے حوالے سے بعد میں بھی چند آیات ضرور نازل ہوئی ہیں' لیکن اس آیت کے نزول سے احکام مکمل کر لئے گئے' نظام فکر و عمل مکمل ہو گیا۔ یہ آیت ۹ ذی الحجہ حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔ ذی الحجہ کی پہلی دس تاریخیں اللہ کی نظر میں بہت فضیلت والی ہیں اور یوم عرفہ یعنی ۹ ذی الحجہ ان سب سے مکرم اور معزز دن ہے۔ عرفہ یا عرفات حرم کے ایک حصے کے ساتھ متصل ہے بلکہ حرم کا ایک حصہ اس میں شامل ہے۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی' یہ عصر کے بعد کا وقت اور جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کا دن بذات خود قبولیت دعا کا دن ہے۔ حدیث میں ہے کہ جمعہ کے دن اور عصر کے بعد خصوصاً قبولیت دعا کے لمحات ہوتے ہیں۔ اس وقت حضور ﷺ اپنی اونٹنی پر سوار جبل رحمت کے سائے میں تھے' جو کہ بڑی فضیلت کا حامل ایک پہاڑ ہے۔ ان فضیلتوں کے ہجوم میں یہ آیت نازل ہوئی اور اس آیت نے احکامات کو مکمل کر دیا۔ اس آیت کی اہمیت کے پیش نظر چند یہود نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر یہ تکمیل دین کی آیت کہیں ہماری کتاب میں نازل ہوتی تو ہم اس کو عید کا دن بنا لیتے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں جانتا ہوں اور ہم سب مسلمان جانتے ہیں کہ یہ آیت کس دن نازل ہوئی ہے' یہ جمعہ کا دن ہے' جو ہمارے لئے عید کا ہی دن ہے اور عرفہ کا دن ہے' یہ اس سے بھی بڑھ کر ہمارے لئے عید کا دن ہے' تو ہمارے لئے اس میں دو عیدیں جمع ہو گئیں' لیکن ہم اپنے تہوار اس طرح نہیں بنایا کرتے' ہمارے تہوار اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے مقرر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جو مقرر کر دیئے گئے ہیں تہوار تو وہی رہیں گے لیکن اس دن کا احترام اور خوشی تو پہلے سے ہی ہماری تاریخ میں موجود ہے۔ اس حوالے سے اس آیت کی بڑی اہمیت ہے معنوی لحاظ سے بھی اور ظاہری فضائل کے حوالے سے بھی۔

Marfat.com

لفظ دین کا اطلاق:

دین کا لفظ عربی زبان اور عربوں کے ہاں چار معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

1- اس کا پہلا معنی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ ہے۔ مثلاً قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ

﴿وہی ذات گرامی ہے جو ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ تم اسے اس طرح پکارو کہ تم اس کیلئے اقتدار کو خالص سمجھتے ہو﴾ (المؤمن 65:40)

اگر تم نے کسی اور کو اس کے اقتدار میں شریک سمجھا تو گویا تم نے اس کی صحیح حقیقت کا یقین نہیں کیا تو جب بھی اسے پکارو یہ سمجھ کر پکارو کہ دین اور اقتدار اعلیٰ کا مالک صرف وہ ہے۔ اس اقتدار اعلیٰ میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

2- دوسرا معنی اطاعت وتسلیم ہے جو پہلے معنی کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی حاکمیت اور اقتدار کے مقابلے میں جو اطاعت کی جاتی اور تسلیم کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے' اسے بھی دین کہتے ہیں۔ مثلاً سورۃ الزمر میں ہے کہ

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ

﴿مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ ہی کی عبادت کروں اس کیلئے اپنے دین اور اطاعت کو سراسر خالص کرتے ہوئے﴾ (الزمر 11:39)

جس طرح اللہ کے اقتدار اعلیٰ میں کوئی شریک نہیں ہے' اسی طرح اللہ کے حضور میری تسلیم واطاعت اور عبادت میں بھی کوئی شریک نہیں ہے۔ میں کسی کو اس (اللہ) کے علاوہ سجدے کے لائق نہیں سمجھتا اور میری پیشانی سوائے اللہ کے کسی کے آگے جھک نہیں سکتی۔

3- دین کا تیسرا معنی نظام فکر وعمل اور نظام تہذیب وتمدن ہے۔ یعنی آپ جسکی اطاعت کرتے اور جس کے آگے جھکتے ہیں' جس کو آپ سب کچھ سمجھتے ہیں اور اسکی اطاعت میں جس طرح زندگی گزارتے ہیں اور اس اطاعت کے نتیجے میں جو نظام فکر وعمل وجود میں آتا ہے' اس نظام فکر وعمل اور نظام تہذیب وتمدن کو دین کہتے ہیں۔ ان معنوں میں قرآن مجید نے اسے کئی جگہ اختیار کیا ہے۔ فرمایا:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (یوسف: 40:12)

یعنی اس کائنات میں حکم صرف اللہ کا ہے۔ ہماری ذات' احساسات اور خیالات واختیارات پر اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چل سکتا۔ اس نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی مت کرو۔ یہ رویہ کہ اسے مقتدر اعلیٰ جان کر صرف اسی کی بندگی کی جائے اور صرف اسی کا حکم بجالایا جائے اور صرف اسی کا قانون چلے' اس رویئے کو ''دین قیم'' کہتے ہیں۔

4- دین کا چوتھا معنی قانون ہے۔ مثلاً سورۃ النور کے شروع میں فرمایا:

﴿زنا کرنے والی عورت ہو یا زنا کرنے والا مرد جو بھی یہ حرکت کرے اگر وہ کنوارے ہیں تو انہیں سو کوڑے لگاؤ﴾

اور کوڑے لگاتے وقت تمہیں کوئی خیر خواہی اور ہمدردی نہ آ پکڑے کہ اسے کوڑے لگیں گے تو اس کا کیا حال ہوگا' اس کی تو چمڑی اتر جائے گی۔ اللہ کے دین کو نافذ کرتے ہوئے تمہیں ہمدردی' نرمی اور خیر خواہی نہیں دکھانی چاہئے کیونکہ اس وقت اس کے دین کا تقاضہ یہی ہے کہ مجرم کو کوڑے لگیں اگر یہ ضروری نہ ہوتا تو وہ ذات جو ارحم واکرم ہے' کبھی اس کا حکم نہ دیتی' تمہیں تو اس کے قانون کی اطاعت کرنی ہے' ہمدرد وغمگسار بن کر اس کے قانون کو توڑنا

Marfat.com

نہیں ہے۔اسی طرح سورۃ یوسف میں ہے:

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ (یوسف: 76:12)

جب یوسف علیہ السلام نے یہ چاہا کہ ان کا چھوٹا بھائی بن یامین جو اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ آیا ہے' وہ اس کو اپنے پاس روک لیں' لیکن اس وقت بادشاہ کا جو قانون چل رہا تھا اس میں کوئی گنجائش نہ تھی کہ وہ اسے روک لیتے۔لہٰذا انہوں نے ایک تدبیر کے ذریعے اس کو روکا جو قرآن میں ذکر کی گئی ہے۔فرمایا کہ ہم نے یوسف کو ایک تدبیر سکھائی' ایک طریقہ بتایا کیونکہ وہ بادشاہ کے دین کی پابندی کرتے ہوئے' اسے (اپنے بھائی کو) کبھی نہیں روک سکتے تھے۔غور کیجئے! یہاں دین الملک بادشاہ اور ریاست کے قانون کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

5- اسی طرح دین کا پانچواں معنی مکافات عمل ہے یعنی اگر آپ اس قانون کی پیروی کر کے اس ذات کو راضی کر لیں تو آپ کو جزا میں کیا ملے گا؟ اور اگر آپ اس کی معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں تو سزا کے طور پر آپ کے ساتھ کیا ہوگا؟ یہ ہے مکافاتِ عمل۔اس مکافاتِ عمل کو بھی دین کہتے ہیں۔

جب ہم کہتے ہیں مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو اس کا مطلب ہے کہ وہ یوم جزا کا مالک ہے' قیامت کا مالک ہے۔ان معنوں میں بھی یہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے:

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ o وَّ اِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ o (الذاریات: 51:6-5)

﴿جس سے تمہیں ڈرایا جا رہا ہے کہ قیامت آ کر رہے گی' دیکھو! یہ بالکل سچی بات ہے اور یاد رکھو! دین واقع ہونے والا ہے﴾

دین سے مراد قیامت' روز جزا اور سزا ہے۔تو یہ پانچ معنی ہیں جن کیلئے دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔دین کا پہلا معنی ہے: حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ' دوسرا معنی ہے: حاکمیت کے مقابلے میں تسلیم واطاعت' تیسرا معنی ہے: وہ نظام فکر وعمل جو اس حاکمیت کے زیر سایہ وجود میں آتا ہے' چوتھا معنی ہے: وہ قانون جو حاکم کی طرف سے اپنی رعایا کو دیا جاتا ہے اور پانچواں مفہوم مکافات عمل ہے۔دین کے لفظ کو سمجھنے کیلئے ان پانچوں معانی کو جمع کر لیں کیونکہ ان میں سے کوئی ایک معنی بھی دین کے اس مفہوم کو پوری طرح ادا نہیں کرتا جو مفہوم قرآن کریم اسے دینا چاہتا ہے اور مشکل یہ ہے کہ دین کا ترجمہ ومفہوم بیان کرنے کیلئے کوئی لفظ نہ اردو میں' نہ فارسی میں' نہ انگریزی میں اور نہ کسی اور زبان میں ایسا موجود نہیں جو دین کا مفہوم پوری طرح ادا کر سکے۔

دین کا صحیح مفہوم:

اس لئے جب ہم ان پانچوں معنوں کو جمع کرتے ہیں تو دین کا صحیح مفہوم ادا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ جل جلالہٗ وہ ذات ہے جو اقتدارِ اعلیٰ کی مالک ہے' اس کے اقتدار کو کوئی دوسرا اقتدار ہرگز چیلنج نہیں کر سکتا۔وہ اقتدار کسی ایک پہلو سے نہیں ہے بلکہ وہ ہمہ جہت' ہمہ پہلو اور ہمہ گیر ہے' جتنا بھی ہمارا علم اور ہماری دانش اس کا ادراک کر سکتے ہیں ہر حوالے سے اقتدارِ اعلیٰ کا مالک وہی اللہ ہے۔اس کی خوبصورت توجیہ مولانا حالی کے اشعار میں ہے جن میں انہوں نے خوبصورت انداز میں ایک حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے بات کو سمجھایا ہے۔

ہے ذات واحد عبادت کے لائق زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اپنی اس سے لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

Marfat.com

اسی پر ہمیشہ بھروسہ کرو تم اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم
مبرّا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

یہ ہے وہ اقتدار اعلیٰ جو صرف اللہ کی ذات کو زیب دیتا ہے جسے اقبال کی زبان میں سروری کہتے ہیں

سروری زیبا فقط اسی ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

معلوم ہوا کہ اقتدار اعلیٰ کا مالک وہی ہے، اسی کے سامنے سر جھکانا ہے۔ ہمارا سر' ہماری پوری ذات' ہمارے احساسات' ہمارا تمام اثر ورسوخ کسی کے سامنے نہیں جھکنا چاہئے' سوائے اللہ کے۔ جب ہم اس کو سب کچھ مانتے ہیں تو لازمی ہے کہ ہم اس کے احکامات کی اطاعت کریں اور اپنی مرضیات کو اسی کی مرضی کے تابع کر دیں، اپنی خواہشات سے اس کی رضا کیلئے دستبردار ہو جائیں۔

یہاں ایک اور بات سمجھ لینا بہت ضروری ہے وہ یہ کہ دین صرف شریعت کا نام نہیں کیونکہ شریعت احکامات' اوامر ونواہی اور پسند وناپسند کا نام ہے' لیکن جب ہم اس پر عمل کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں ایک تہذیب وجود میں آتی ہے اور اس تہذیب میں شریعت کے اجتماعی عوامل پر عمل کرتے ہوئے جہاں ایک تمدن وجود میں آتا ہے وہیں ایک ثقافت بھی جنم لیتی ہے جو قوموں کے مزاج کے خاص انداز میں ڈھلنے کی وجہ سے خود بخود درونما ہوتی ہے جسے آپ کلچر بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہ سب چیزیں ظاہر ہے احکامات کا حصہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ تینوں چیزیں شریعت پر عمل ہی سے وجود میں آتی ہیں۔ ان چیزوں کے وجود میں آنے کے بعد جو قومی تشخص بنتا اور قوم کی ایک خاص ہیئت وجود میں آتی ہے' اس ہیئت پر جب اللہ کے نام کی مہر لگ جائے تو اس کو دین کہتے ہیں۔ شریعت اللہ کے احکامات پر عمل کا ایک طریقہ ہے جو اللہ کی رضا کے حصول کیلئے اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن مجموعی طرز فکر' مجموعی نظام فکر وعمل اور مجموعی تہذیب وتمدن جو قوموں کے تشخص میں دیکھا جاتا ہے' اس کا سب سے اہم آئینہ' جس میں اسے دیکھ کر سمجھا بھی جا سکتا ہے وہ ذات رسالت مآب ﷺ کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے کتابیں اتاریں تو کتابوں کے ساتھ رسول بھی مبعوث کئے۔ اسلئے کہ کتاب کے ذریعے دین اور قانون تو دیا جا سکتا ہے لیکن دین بہ ہمہ جہت نہیں کیونکہ وسعتِ دین تو اس پر عمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والی چیز ہے۔ پہلے ایک شخصیت بنتی ہے' پھر یہ شخصیت ڈھل کر ایک امت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لئے جب ان تمام چیزوں کو ہم سمجھ لیتے ہیں تو دین کا تصور واضح ہوتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ دیکھو! ہم نے دین کو بھی مکمل کیا ہے اور اپنی نعمت کو بھی تم پر تمام کیا ہے۔ دین کو مکمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ہم جو شریعت اور احکام دیتے رہے اور تمام انبیاء شریعت پر عمل کی شکل میں ایک تہذیب پیدا کرتے اور آداب زندگی کی تعلیم دیتے رہے۔ مگر زمانہ بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ حضور ﷺ ٹھیک اس موقع پر تشریف لائے ہیں جبکہ قدامت پیچھے رہ گئی تھی اور جدت حضور ﷺ کے انتظار میں تھی۔ اب حضور اکرم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ گذشتہ سارے سرمائے کو آنے والے لوگوں کیلئے جدت کا لباس پہنا کر اور اجتہادی طرز فکر کا نور دے کر آپ انسانی فکری متاع کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ یہ شریعت بھی ہے اور دین بھی۔ دین تو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا اور اس کی مجموعی شکل حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں آ کر مرتب ہوئی اور شریعت کا بھی اتمام ہو گیا کیونکہ ہر نئے رسول

Marfat.com

کے ساتھ نئی شریعت آتی رہی اور پہلی شریعتیں منسوخ ہوتی رہیں اور آخری شریعت جب اترنا شروع ہوئی تو اس کا آغاز غار حرا کی تنہائی سے ہوا۔ جب پہلی وحی آئی:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (العلق: 1:96)

اور اس کا اتمام ہو رہا ہے اس آیت سے

اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدۃ: 3:5)

یا سورۃ النصر سے' 23 سال میں جب یہ وحی مکمل ہوگئی تو اللہ کی سب سے بڑی نعمت (شریعت) کا بھی اتمام ہوگیا اور اس کی مجموعی ساخت جس کا نام دین ہے' وہ بھی حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ مکمل ہوگیا۔ اسلئے دونوں کے بارے میں فرمایا کہ اللہ کی یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ جو چیز اللہ نے کسی کو مکمل شکل میں عطا نہیں فرمائی تھی' وہ تمہیں دی گئی ہے۔

قدیم الہامی کتابوں میں حضور ﷺ کی بشارت:

پہلی آسمانی کتابیں آج بھی ہمارے پاس کسی حد تک عہد نامہ قدیم و عہد نامہ جدید کے نام سے موجود ہیں۔ عہد نامہ قدیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ کہلوایا گیا کہ

﴿خداوند تیرا خدا! تیرے درمیان تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا' تم اس کی طرف کان دھرنا﴾

یعنی میں تکمیلی شان میں نہیں آیا' میرے ساتھ تکمیلی ہدایت نہیں آئی' ہدایت کسی اور کے ساتھ مکمل ہوگی۔ وہ میری طرح ایک پیغمبر بن کر آئے گا اور آئے گا بھی تیرے بھائیوں میں سے۔ بھائی کون ہیں؟ وہ ہیں ''بنی اسماعیل'' کہ تم حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہو اور وہ تمہارے بھائی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا' تم ان کی طرف کان دھرنا۔ میں یہ دعویٰ لے کر نہیں آیا کہ میرے بعد کوئی نہیں آئے گا' بلکہ میں تمہیں یہ بتانے کیلئے آیا ہوں کہ میرے بعد اور نبی آئے گا۔ یعنی جتنے پیغمبر آئے' ہر ایک نے یہ کہا کہ میرے بعد آنے والا آئے گا' ایک حضور اکرم ﷺ ہی ہیں جب آپ تشریف لائے تو فرمایا کہ قصر نبوت جو اللہ نے مکمل کردیا تھا' اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی' جو آدمی اسے دیکھتا تھا حیرت میں ڈوب جاتا تھا کہ اتنے خوبصورت محل کو ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ کر بدنما کیوں بنا دیا گیا ہے فرمایا کہ وہ آخری اینٹ میں ہوں' آج وہ قصر نبوت مکمل ہوگیا:

انا خاتم النبیین لا نبیَّ بعدی ﴿میں آخری نبی ہوں' میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا﴾

لیکن آپ ﷺ سے پہلے پیغمبر یہ بات نہیں کہتے تھے۔ ہر پیغمبر اور ہر رسول خاص طور پر یہ کہتا رہا کہ ''میرے بعد آنے والا آئے گا''۔ کتاب استثناء کی آیات 15 تا 18 میں مزید فرمایا کہ میں ان کیلئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ جیسا ایک نبی برپا کروں گا (یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا جا رہا ہے)' اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور اس سے میں جو کچھ کہوں گا وہ سب کچھ وہ ان لوگوں سے کہے گا۔ اپنے کلام کو اس کے منہ میں ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تو لکھی ہوئی تورات تختیوں کی شکل میں نازل ہوئی تھی چونکہ موسیٰ علیہ السلام ایک شاہانہ گھر میں پلے بڑھے تھے' شہزادوں کے ساتھ ان کی باقاعدہ تعلیم بھی ہوئی تھی' وہ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اس لئے انہیں لکھے ہوئے ''احکام عشرۃ'' دیئے گئے۔ ان کے منہ میں اللہ کا کلام نہیں ڈالا گیا بلکہ لکھا ہوا دیا گیا کہ اسے پڑھو اور لوگوں تک پہنچاؤ۔ یہ صرف آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ہے کہ اللہ کا کلام آپ کے منہ میں ڈالا گیا اور آپ نے اسے اپنے منہ سے ادا فرمایا اور جب حضور اکرم ﷺ پر وحی اترتی تو آپ اسے جلدی جلدی پڑھنے کی کوشش کرتے تھے کہ میں کہیں بھول نہ جاؤں تو اس

Marfat.com

ضمن میں آیات نازل ہوئیں:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖo اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗo

﴿اپنی زبان کو جلدی جلدی حرکت نہ دیا کریں کہ کہیں آپ بھول نہ جائیں' قرآن کریم کا جمع کرنا اور اسے پڑھانا ہماری ذمہ داری ہے﴾ (القیامۃ: 17-16)

پھر آگے فرمایا کہ

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿پھر اس کا بیان کرنا بھی ہمارے ذمے ہے﴾ (القیامۃ:19)

اور قرآن کریم کا بیان حدیث اور سنت ہے۔تو جس طرح قرآن کا پڑھانا اور جمع کرنا اللہ نے اپنے ذمے لیا ہے' اسی طرح اسے کھول کر بیان کرنا بھی اللہ نے اپنے ذمے لیا ہے۔اسی سے ثابت ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کی حدیث اور سنت بھی قرآن کی طرح محفوظ ہے کیونکہ اللہ نے اسے بھی اپنے ذمے لیا ہے۔

انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں اپنے رب سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا ''فارقلیط'' بخشے' اس کے لفظی معنی ''احمد'' ہیں۔یہ حضور ﷺ کا نام ہے جو انجیل میں آیا ہے اور قرآن کریم نے اسے دہرایا بلکہ اس کا ترجمہ کیا ہے۔اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں نے اپنی کتاب میں تحریف کی ہے ورنہ ہو سکتا ہے کہ ہو بہو ہی الفاظ جو قرآن نے بیان کئے ہیں' وہی انجیل میں بھی ہوں مگر وہ الفاظ بدل دیئے گئے ہوں۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا:

وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ

﴿اور میں تمہیں بشارت دینے کیلئے آیا ہوں کہ میرے بعد ایک رسول آئے گا جس کا نام احمد ہوگا﴾ (الصف:6)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں اللہ سے دعا کروں گا کہ تمہیں دوسرا فارقلیط بخشے جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔وہ میرے اور دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام کی طرح واپس نہیں جائے گا یعنی اس کی شریعت منسوخ نہیں ہوگی اور وہ قیامت تک بنی نوع انسانی کے ساتھ چلے گی۔ عیسیٰ علیہ السلام کی اس بشارت کو دیکھنا چاہیں تو یوحنا کی انجیل میں آیات 14 تا 16 دیکھ لیں۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو اگر میں تم سے کہوں تو تم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔یعنی آج اگر میں تمہیں جہاد کی باتیں کہنے لگوں تو وہ تم برداشت نہیں کر سکو گے کیونکہ وہ دور رومی حکومت کا تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو برداشت نہیں کر رہی تھی چہ جائیکہ آپ کی شریعت کو برداشت کرتی۔انہوں نے کہا کہ اصلی شریعت تم برداشت نہیں کر سکتے' وہ جب سچائی کی روح آئے گی تو تمہیں سچائی کی ساری باتیں بتائے گی کیونکہ وہ اپنی طرف سے نہیں کہے گی' وہ جو کچھ کہے گی اللہ کی طرف سے کہے گی۔یہ ہو بہو ترجمہ ہے سورۃ النجم کی آیت کا

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰىo

﴿ہمارا رسول اپنی خواہش نفس سے کبھی نہیں بولتا۔جب بھی وہ بولتا ہے تو وہ اللہ کی وحی ہوتی ہے۔(النجم:4-3)﴾

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قرآن کریم کا یہ کہنا ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ﴾ یہ فی الواقع کتنا بڑا اعزاز ہے اس امت کیلئے کہ باتیں کسی رسول یا پیغمبر نے نہیں کہیں بلکہ جو یہ خبر دینے کیلئے آیا کہ میرے بعد آنے والا آرہا ہے۔جب حضور اکرم ﷺ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے ایک

Marfat.com

مرتبہ بھی نہیں فرمایا کہ میرے بعد کوئی آئے گا بلکہ یہ فرمایا کہ میں آچکا ہوں اب میرے اور قیامت کے درمیان صرف اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا یہ دو انگلیوں کے درمیان ہے یعنی میرے بعد اب قیامت ہی آئے گی اور کوئی نہیں آئے گا اور عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو وہ بھی حضور ﷺ کے امتی ہونے کی حیثیت سے آئیں گے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تورات پڑھ کر سنانا چاہی تو حضور ﷺ نے برہم ہو کر فرمایا کہ

﴿ کیا تمہیں آج بھی تورات کی ہدایت کی ضرورت ہے؟ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ پر قرآن اتارا ہے! آج اگر موسیٰ بھی آجائیں تو انہیں بھی میری اتباع کے بغیر چارا نہیں ہوگا ﴾

اسلام قیامت تک ہر دور کا دین ہے:

یہ باتیں ہمارے لئے بڑے اعزاز اور فخر کی ہیں، لیکن ساتھ ہی بڑی ندامت کی بھی ہیں کہ جس قوم کا دین اور نظام فکر و عمل مکمل ہو گیا جس کا تہذیب و تمدن مکمل ہو گیا، جس کی شریعت مکمل ہو گئی، کیا اسے ضرورت ہے کسی اور کی طرف دیکھنے کی یا کیا اس کیلئے اس بات کی گنجائش ہے کہ کبھی اس کے دانشور اور پڑھے لکھے اور ماہرین قانون اس طرح کی باتیں کہنے لگیں کہ آج کے دور میں یہ قانون نہیں چل سکتا؟ دنیا کے سارے ماہرین مل کر جو قانون بھی بنائیں گے وہ چند سال تک چلے گا، پھر اس میں ترمیم کرنا پڑے گی، ورنہ وہ چل نہیں سکتا۔ 1925ء میں امریکہ اگر حرمت شراب کا قانون پاس کرتا ہے تو آٹھ سال کے بعد اسے واپس لینا پڑتا ہے کیونکہ دنیا کا بنایا ہوا کوئی بھی قانون کبھی دیرپا اور مستحکم نہیں ہوتا۔ یہ صرف اللہ کا قانون ہی ہے جو تکمیلی شان لے کر آیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسان میں لحہ بہ لحہ اور صدیاں بہ صدیاں کیا تبدیلیاں آئیں گی، اللہ نے اس میں اتنی لچک رکھی ہے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کو اجتہاد کی اجازت دی ہے کہ جب نئے مسائل پیدا ہوں تو قرآن اور سنت نے تمہیں جو اصول دے دیئے ہیں اور تمہیں دین کا جو ایک مزاج سمجھا دیا ہے، اس مزاج آشنائی کو سامنے رکھتے ہوئے ماہرین قانون جو صاحب فتویٰ بھی ہوں اور صاحب تقویٰ بھی، جدید مسائل میں اجتہاد کریں۔ جس معاملے پر علماء اجتہاد کر کے اجماع کر لیں تو وہ قوانین بالکل قرآن و سنت کی طرح سمجھے جائیں۔ اگر اسے اکثریتی رائے مل جائے، تب بھی وہ قانون کا حصہ بننے کیلئے کافی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قیامت تک ہمیں دین میں تشنگی محسوس نہیں ہوگی، اسلئے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ قرآن و سنت میں اس کا جواب موجود نہ ہو یا اس کے نظائر موجود نہ ہوں یا اس کیلئے قیاس یا استنباط کے وسائط موجود نہ ہوں۔ یہ چیزیں موجود ہیں اس لئے قیامت تک کسی تشنگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری نیتوں میں کھوٹ پیدا ہو جائے اور ہم اس کا نیا ایڈیشن تیار کرنا شروع کر دیں۔

اسلام کیا ہے؟

مزید فرمایا: میں نے تمہارے لئے اسلام کو بطور دین پسند کیا ہے۔ اس کے کئی مفہوم ممکن ہیں۔ لیکن ان میں جو نہایت واضح اور دل کو لگتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کا معنی ہے ''خود سپردگی''۔ جو عمل کی اصل روح ہے۔ جو آدمی اپنے آپ کو اللہ کے دین کے سپرد نہیں کرتا وہ اس پر عمل کیا کرے گا؟ تو اپنے آپ کو دین کے سپرد کر دینا ہی اسلام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے پوری طرح اسلام کو اپنا طریقہ اور پسند و ناپسند کا معیار بنایا ہے، اور ہر معاملہ میں اسلام کو ہی ہمیشہ سامنے رکھا ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کو سن کر بے ساختہ روئے۔ عام مسلمان تو بہت خوش ہوئے کہ اللہ نے دین کو مکمل کر دیا ہے۔ جب ان اصحاب کو روتے ہوئے دیکھا تو حضور ﷺ نے پوچھا: تم کیوں رو رہے ہو؟ انہوں نے کہا ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ آپ تو ہمیں دین دینے کیلئے تشریف لائے تھے، آپ چونکہ اللہ کے رسول تھے اس لئے آپ کی ذمہ داری اللہ کا دین اس دنیا تک پہنچانا تھی۔ جب یہ ذمہ داری پوری ہو گئی، تکمیل دین کا کام مکمل ہو گیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ اب آپ کو واپس بلا لیا جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے

Marfat.com

فرمایا: تم نے ٹھیک سمجھا۔ اس کے ٹھیک اکیاسی دن کے بعد حضور ﷺ کا وصال ہوگیا۔ ان 23 سالوں میں جیسے جیسے مسلمان اسلام کی آغوش میں آتے گئے' انہوں نے فی الواقع اپنی زندگیاں اس طرح گزاریں کہ ازاول تا آخر اپنے آپ کو مسلم ثابت کیا۔ چاہے ان کے سروں پر تلواریں کیوں نہ کوندی ہوں' مگر انہوں نے کبھی دین سے منہ نہیں موڑا' نہ کبھی بحیثیت مسلمان اپنی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کی۔ چاہے کتنی ہی بڑی مصیبت کیوں نہ ان پر آئی لیکن انہوں نے اپنے آپ کو مسلم یعنی اللہ کا فرمانبردار بندہ ثابت کیا۔ اللہ فرماتا ہے کہ چونکہ تم اپنے آپ کو مسلم ثابت کر چکے ہو اور یہ ثابت کر چکے ہو کہ تمہاری زندگی کا اگر کوئی عنوان (Title) ہوسکتا ہے تو وہ اسلام ہے' اس لئے میں نے تمہارے لئے وہ دین پسند کیا ہے جس کا نام ہی اسلام ہے۔ گویا تمہیں سرٹیفکیٹ دے دیا ہے کہ تم سے بہتر فداکار' تم سے زیادہ سرفروش' تم سے زیادہ اس دین پر جان دینے والے اور تم سے زیادہ اس دین کی علمبردار کوئی اور امت نہیں ہوسکتی۔ اس لئے تم وہ امت ہو جسے یہ دین دیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اللہ نے یہ دین تمہارے سپرد کیا ہے۔ یہ دین اللہ کی امانت ہے' اب تم جانو اور تمہاری نسلیں جانیں کہ تم آئندہ اس کے ساتھ کیا کرتے ہو۔

حاصل کلام یہ کہ اس آیت کریمہ کے آغاز میں متعدد محرمات شرعیہ کو بیان کیا گیا ہے۔ مزید تاکید اور تکمیلی بحث کے طور پر بعض محرمات کا اعادہ کیا گیا اور پھر میتہ کی تفصیل بتاتے ہوئے یہ وضاحت فرمائی کہ جس طرح طبعی موت سے مرا ہوا جانور مردار ہے اسی طرح ناگہانی اور اتفاقی حوادث سے مرے ہوئے جانور بھی حرام ہیں۔ مزید فرمایا کہ کسی درندے کا پھاڑا ہوا جانور اگر تم زندہ حالت میں اسے ذبح نہ کرسکو جس طرح یہ حرام ہے اس طرح کسی استھان پر پیش کی ہوئی قربانی اور جوئے کے ذریعے سے تقسیم کیا ہوا گوشت بھی حرام ہے۔ آیت کے آغاز میں ان حرمتوں کی تفصیل اس لئے بیان کی گئی کہ انہی حرمتوں سے کفار سے کامل معاشرتی انقطاع ممکن تھا اور جب تک یہ انقطاع مکمل نہ ہوتا مسلمانوں کا قومی تشخص اجاگر نہیں ہوسکتا تھا یہ بات اگرچہ دشمنوں کے درمیان رہتے ہوئے ایسے ہی مشکل تھی جیسے دریا میں رہتے ہوئے مگرمچھ سے بیر مشکل ہوتا ہے اس لئے ان حرمتوں کے بیان کے درمیان سلسلۂ کلام کو روک کر دو باتیں کہنا بہت ضروری تھا چنانچہ پروردگار نے دو باتیں ارشاد فرمائیں ایک تو یہ بات کہ اب کفار تم سے اور تمہارے دین سے مایوس ہو چکے ہیں اب ان کے اندر یہ دم خم باقی نہیں رہا ہے کہ تمہارے دین کو مغلوب کرنے یا اس کو کچھ نرم بنانے کا حوصلہ کریں اب اگر کچھ کریں گے بھی تو وہ بجھتے دیئے کی آخری لو ہوگی۔ اس لئے ان کی پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں صرف میری ہی پرواہ کرنا اور دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ اب اللہ کا دین تکمیل کی حد کو پہنچ گیا اور تمہاری شریعت اتمام کی منزل کو پہنچ گئی اور اسلام کو خدا نے تمہارے لئے دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔ ان درمیانی اور ضروری باتوں کو ارشاد فرمانے کے بعد پھر ان محرمات شرعیہ کے ذکر کے حوالے سے ایک آخری بات کہی جارہی ہے جس کی کسی وقت بھی ضرورت پیش آسکتی تھی اگرچہ اس کا وقوع کم کم ہوتا ہے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا:

فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

﴿بس جو بھوک میں مضطر ہو کر بغیر گناہ کی طرف مائل ہوئے کوئی حرام چیز کھالے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے﴾

مخمصہ کے معنی ''بھوک'' کے ہیں' بھوک سے مضطر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی بھوک کی ایسی مصیبت میں گرفتار ہوجائے کہ موت یا حرام میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی اور راہ بظاہر باقی ہی نہ رہ جائے' ظاہر ہے زندگی میں یہ کیفیت بہت کم پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے بارے میں معلوم تو ہونا چاہئے کہ شریعت کا حکم کیا ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ اگر ایسی حالت سے کبھی واسطہ پڑ ہی جائے تو حرام چیزوں میں سے کسی سے بھی فائدہ اٹھا کر جان بچانے کی اجازت ہے۔ البتہ! اس کے ساتھ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ کی قید اسی مضمون کو ظاہر کررہی ہے جس کا ذکر سورۃ البقرہ میں غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کے الفاظ سے کیا گیا ہے یعنی اس اضطرار میں حرام سے فائدہ اٹھانے والا نہ تو دل سے چاہنے والا بنے اور نہ سدِ رمق کی حد سے آگے بڑھے۔

Marfat.com

امریکہ اور بعض یورپی ملکوں میں شرعی ذبیحہ کا گوشت بعض دفعہ میسر نہیں آتا وہاں کے بعض ایسے دانشوروں نے جو پیٹ سے سوچنے کے عادی ہیں انہوں نے اس اجازت کا مفہوم یہ سمجھا کہ اگر شرعی ذبیحہ کا گوشت میسر نہیں تو چونکہ گوشت کے بغیر زندگی گزرنا مشکل ہے اس لئے جو بھی حرام گوشت میسر آئے اس کا کھالینا جائز ہے حالانکہ اس آیت کریمہ میں مَخْمَصَةٍ کا لفظ صاف صاف یہ بات بتارہا ہے کہ جہاں دوسرے غذائی بدل موجود ہیں یعنی مچھلی، سبزی اور دال وغیرہ وہاں محض اس عذر کی بنا پر کہ شرعی ذبیحہ کا گوشت میسر نہیں آتا ناجائز کو جائز بنا دینے کا حق کسی کو نہیں دیتا۔ گوشت زندگی کی بقاء کیلئے ناگزیر نہیں؛ دوسری غذاؤں سے نہ صرف زندگی بلکہ صحت بھی نہایت اعلیٰ معیار پر قائم رکھی جاسکتی ہے۔ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ کی قید اس حقیقت کو ظاہر کررہی ہے کہ رخصت بہرحال رخصت ہے اور حرام بہر شکل حرام ہے نہ کوئی حرام چیز شیر مادر بن سکتی ہے اور نہ رخصت کوئی ابدی پروانہ ہے اس لئے یہ بات کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ رفع اضطرار کی حد سے آگے بڑھے اگر ان پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی شخص کسی حرام سے اپنی زندگی بچالے گا تو اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ لیکن اگر اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر اپنے حظِ نفس کی راہیں کھولے گا تو اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے۔ یہ اجازت اس کیلئے قیامت کے دن عذر خواہ نہیں بنے گی۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ

ف ۲ ۔ تم سے پوچھتے ہیں کہ کون کون سی چیزیں اُن کے لیے

قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ

حلال ہیں (اُن سے) کہہ دو کہ سب پاکیزہ چیزیں تم کو حلال ہیں۔ اور وہ (شکار) بھی حلال ہے جو تمہارے لیے اُن

تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ

شکاری جانوروں نے پکڑا ہو جن کو تم نے سدھا رکھا ہو اور جس (طریق) سے خدا نے تمہیں (شکار کرنا) سکھایا ہے

وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴﴾

اس طریق سے تم نے اُن کو سکھایا ہو تو جو شکار وہ تمہارے لیے پکڑ رکھیں اُس کو کھا لیا کرو اور (شکاری جانوروں کو

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ

چھوڑتے وقت) خدا کا نام لیا کرو۔ اور خدا سے ڈرتے رہو۔ بیشک خدا جلد حساب لینے والا ہے ف۳۔ آج تمہارے لیے سب

Marfat.com

لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ

پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں۔ اور اہل کتاب کا کھانا بھی تم کو حلال ہے اور تمہارا کھانا اُن کو حلال ہے۔ اور پاک دامن

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ إِذَا

مومن عورتیں اور پاک دامن اہل کتاب عورتیں بھی (حلال ہیں) جب کہ

آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي

اُن کا مہر دے دو۔ اور اُن سے عفت قائم رکھنی مقصود ہو نہ کھلی بدکاری کرنی اور نہ

أَخْدَانٍ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي

چھپی دوستی کرنی۔ اور جو شخص ایمان سے منکر ہوا اُس کے عمل ضائع ہو گئے اور وہ آخرت میں

الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝٥

نقصان پانے والوں میں ہوگا۔

آیت:۴ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ ۖ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُم مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللَّهُ ۖ فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ ”تم سے پوچھتے ہیں کہ کون کون سی چیزیں ان کیلئے حلال ہیں؟ کہہ دیجئے کہ تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے حلال ہیں اور ان سدھے ہوئے شکاری جانوروں کا شکار جو شکار پر چھوڑے جاتے ہیں۔ تم ان کو اس طریقہ پر سکھاتے ہو جو تمہیں اللہ نے سکھایا ہے۔ تو جو شکار وہ تمہارے لئے پکڑ رکھیں اس کو کھا لیا کرو (اور شکاری جانور چھوڑتے وقت) اللہ کا نام لے لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے“۔

اسلام میں شکار کا طریقہ

یہ ایک سوال ہے جس کا جواب دیا گیا ہے۔ سوال اختصار سے اور جواب وضاحت کے ساتھ ہے۔ یہ قرآن کا خاص اسلوب ہے کہ وہ عموماً سوال ذکر ہی نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی ہے تو نہایت اختصار سے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ صحابہ رضوان اللہ اجمعین اس قدر مزاج شناسِ قرآن اور مزاج شناسِ رسول ﷺ ہو چکے تھے کہ انہیں قرآن اور آنحضرت ﷺ کی بات سمجھنے میں بہت کم دشواری پیش آتی تھی۔ اس لئے پورے قرآن پاک میں صحابہ کی طرف سے جو سوال ہوئے ہیں، وہ کل نو ہیں۔ تئیس سالوں کے عرصے میں مجموعی طور پر جو سوالات ہوئے ہیں ان کی تعداد غالباً سترہ ہے۔ جس طرح آدمی کسی چیز کا مزاج آشنا ہو جاتا ہے اور وہ چیز اسے فوراً سمجھ میں آ جاتی ہے بالکل اسی طرح صحابہ رضوان اللہ اجمعین مزاج شناسِ رسول ﷺ بھی تھے اور مزاج شناس قرآن بھی۔ لیکن جب کہیں بات الجھتی تھی چونکہ معاملہ آخرت کا تھا اس لئے پوچھ بھی لیتے تھے۔ یہاں یہ بات الجھی کہ یہ جو کہا گیا کہ جس کو درندہ کھالے اور وہ مر جائے تو حلال نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ زندہ تمہارے قابو میں آ جائے تو پھر تم ذبح کر کے اسے پاک کر سکتے ہو۔ اس سے سوال پیدا ہوا کہ اگر درندے کے زخمی کرنے سے وہ جانور مر جائے تو وہ حرام ہے تو کیا درندے کے ذریعے شکار کرنا بھی جائز ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ عربوں کی زندگی کے گذر بسر کا دارومدار تین باتوں پر تھا۔ ایک تجارت، دوسرا گلہ بانی اور تیسرا شکار۔ ان کا شکار ہمارے ہاں کے جاگیردار اور زمیندار کا سا نہیں تھا، جنہیں کچھ اور نہیں سوجھتا تو شکار کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ عربوں کا تو یہ حال تھا کہ ان کی تو غذائی ضرورت ہی ایک حد تک شکار سے پوری ہوتی تھی۔

Marfat.com

عدی بن حاتم طائی جب مسلمان ہوئے تو وہ بڑے شکاری تھے اور نجد کے علاقے میں شکار ہوتا بھی زیادہ تھا' اس لئے ان کی گزر بسر کا بہت بڑا ذریعہ شکار تھا انہوں نے یہ سوال کیا کہ حضور! میں کتے کے ذریعے شکار کرتا ہوں اور کتا ایک درندہ ہے۔ جب وہ شکار پکڑے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ زندہ ہی میرے پاس لے آئے۔ جو جانور اس نے پکڑا ہے اگرچہ اپنی ذات میں وہ حلال ہے' مگر اس کے پکڑنے سے اگر وہ مر گیا تو وہ اس آیت کے حوالے سے تو حرام ہو جائے گا؟ سوال تو صرف اتنا ہی تھا' لیکن قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ اس سے ایک بوند مانگی جاتی ہے تو وہ بارش برسا دیتا ہے۔ سوال تو یہ تھا کہ کتے کے ذریعے کئے جانے والے شکار کے بارے میں وضاحت ہو جائے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے شکار کے حوالے سے ساری اصولی باتیں بیان فرما دیں بلکہ یہ بھی فرما دیا کہ ساتھ یہ بھی جان لو کہ حلال اور حرام کی بنیاد کیا ہے؟ کچھ لوگ تو وہ ہیں جنہیں مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے' انہیں تو جانے دیجئے۔ لیکن کچھ لوگ وہ ہیں جو مذہب کے بہت مخلص پیروکار ہیں لیکن ان کے گہرے تقشف کے باعث ان میں ایک خاص مزاج پروان (Develop) چڑھتا ہے' ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب تک ان کو بتا نہ دیا جائے کہ شریعت نے اس چیز کو حلال کیا ہے' وہ اس وقت تک وہم کا شکار رہتے ہیں کہ پتہ نہیں یہ حلال ہے یا حرام۔ یعنی ان کی فکری بنیاد دراصل انہیں یہود سے ملی ہے' جنہوں نے اپنی شریعت میں بہت پابندیاں لگالی تھیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہر چیز حرام ہے' بجز اس کے جسے شریعت نے حلال قرار دے دیا یعنی جب تک کسی چیز کے حلال ہونے کی سند ہمارے پاس نہیں ہے' وہ چیز حرام ہے۔ قرآن کریم نے اس صورت حال کو بالکل بدل ڈالا اور یہی وجہ ہے کہ قیامت تک یہ دین چل سکتا ہے۔ فرمایا: لوگو! تمہارے لئے ہر چیز حلال ہے' سوائے اس کے جسے اللہ نے حرام کر دیا۔ تم ڈھونڈتے ہو حلال کیا ہے حالانکہ تمہیں یہ دیکھنا چاہئے کہ حرام کیا ہے۔ البتہ! حلت کی چند شرطیں ہیں۔ اللہ نے چونکہ تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے حلال کر دی ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے یہ دیکھو کہ وہ چیز طیب اور پاکیزہ ہے یا نہیں' اگر وہ چیز طیب اور پاکیزہ ہے تو سمجھ لو کہ وہ حلال ہے اور اس میں یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے کہ قرآن اور حدیث میں اس کا ذکر آیا ہے یا نہیں' صرف اسے طیب ہونا چاہئے۔ جتنی چیزیں اللہ نے حلال کی ہیں' وہ ساری طیب ہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ جانور ایسا نہیں ہونا چاہئے جس جانور کی شکل پر لوگوں کی شکلیں تبدیل یعنی بگاڑ دی گئیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب قوموں پر عذاب آیا تو بعض قوموں کے چہرے بگاڑ کے بعض جانوروں کی شکلوں جیسے بنا دیئے گئے' یہ جانور مستقلاً حرام ہیں۔ مثلاً یہود کے ایک گروہ پر عذاب آیا

وَجَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَالۡخَنَازِيۡرَ ﴿انہیں اللہ نے بندروں اور خنزیروں کی شکل میں بدل دیا﴾

اس لئے سور اور بندر سارے حرام ہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ جانور جو خود شکار کرتے ہیں اور گوشت کھاتے ہیں یعنی تمام کچلیوں والے جانور' جنہیں ہم درندہ کہتے ہیں' حرام ہیں۔ اس طرح وہ سارے جانور جو پنجے رکھتے ہیں اور پنجوں کے ذریعے شکار پکڑتے ہیں' جیسے باز' عقاب اور شکرا وغیرہ سب حرام ہیں۔ اسی طرح تمام مردار خور جانور حرام ہیں کیونکہ ان کی فطرت میں پاکیزگی کہاں رہ سکتی ہے؟ اس طرح وہ عام جانور جو زمین کھود کھود کر گندگی کھاتے ہیں' حرام ہیں اور ہر وہ جانور جسے انسان کی فطرت سلیمہ قبول کرنے سے انکار کر دے' حرام ہے۔ ایسی فطرت جو شریعتِ الٰہی کے مطابق عمل کرنے کی وجہ سے خاص قالب میں ڈھل جاتی ہے' اس کا ایک مزاج بن جاتا ہے' آپ اس کے سامنے کوئی ایسی چیز لائیں گے جو حرام کے قریب ہے تو وہ اس سے گھن کھائے گا' اس کو وہ کبھی قبول نہیں کرے گا۔ یہ اس طبیعت کی بات نہیں ہے جو شراب پی پی کر اپنا سب کچھ بگاڑ چکی ہے' اسے تو چائے بری لگے گی شراب اچھی لگے گی۔ بات فطرتِ سلیمہ کی ہو رہی ہے اور فطرتِ سلیمہ کی نمائندہ شخصیات چونکہ دنیا میں اللہ کے نبی ہوتے ہیں' وہ چونکہ معصوم ہوتے ہیں اس لئے جس چیز سے انہوں نے طبعاً اپنے آپ کو کھانے سے روکا ہے' انسان کو اس سے رک جانا چاہئے' اس کا مطلب ہے کہ وہ پاکیزہ نہیں ہے' اس میں

Marfat.com

کوئی نہ کوئی گندگی ہے اور آخری بات یہ کہ جو جانور پاکیزہ ہو لیکن اس میں غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے کی وجہ سے یا کسی استھان پر ذبح کرنے کی وجہ سے گندگی آئی ہو اس میں معنوی گندگی ہے۔ یہ بھی طیبات میں شامل نہیں ہے، تو جو چیزیں طیبات میں شامل نہیں ہیں، وہ ساری حرام ہیں۔ باقی ہر طیب و طاہر چیز حلال ہے۔

کسی جانور یا پرندے کا پکڑا شکار حلال ہے

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ سے اصل سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ یہاں ''جَوَارِحْ'' کا لفظ آیا جو ''جَارِحْ'' کی جمع ہے، درندے کو کہتے ہیں۔ صرف کتا ہی درندہ نہیں ہے، آپ چاہیں تو چیتا، ریچھ، باز، عقاب وغیرہ سے شکار کریں۔ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ تم نے اسے سدھایا ہو۔ سدھے ہوئے جانور کی اور نا سدھے جانور کی پہچان درندوں میں سے یہ ہے کہ جب تم اسے جانور پکڑنے کیلئے چھوڑو مثلاً خرگوش پر چھوڑتے ہو تو وہ اسے پکڑ کر اپنے مالک کے پاس لائے، خود اس میں سے بالکل نہ کھائے۔ اگر اس میں سے خود کھاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سدھایا ہوا نہیں ہے، ابھی اس کی تربیت (Training) مکمل نہیں ہوئی ہے۔ حضرت عدی بن حاتم کے سوال کے جواب میں حضور اکرم ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ تم اگر اپنا جانور چھوڑو اور وہ جانور اس میں سے خود کھالے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی اس کی تربیت (Training) میں کمی ہے، تم اسکو مت کھانا، وہ تمہارے لئے حرام ہے۔ اگر وہ شکار کو محفوظ حالت میں تمہارے پاس پکڑ کر لے آئے تو پھر ٹھیک ہے۔ پرندوں کیلئے فرمایا کہ جب تم پرندے کو کسی پرندے کو پکڑنے کیلئے چھوڑو اور وہ ابھی اڑا ہی ہو اور اتنی دور گیا ہو کہ تمہاری آواز سن سکتا ہو، تم اسے کہو واپس آجا۔ اگر وہ تمہارے کہنے پر واپس آجاتا ہے تو اس کا پکڑا ہوا جانور حلال ہے، اگرچہ وہ مرجائے اور اگر وہ واپس نہیں آتا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ سدھایا ہوا جانور نہیں ہے، اب اگر وہ پکڑ کر لے بھی آئے تو تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔ ان باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے چار پانچ باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔

مُكَلِّبِيْنَ کا اصل مفہوم

پہلی بات یہ کہ سدھائے ہوئے جانور کا شکار حلال ہے، غیر سدھائے ہوئے کا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ تم اس کو شکار پر خود چھوڑو، اگر وہ شکار کو دیکھ کر خود ہی دوڑ پڑے اور شکار مار لائے تو وہ تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔ یہ بات ہم نے لفظ ''مُكَلِّبِيْنَ'' سے لی ہے۔ عام طور پر لوگ اس کا ترجمہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا مفہوم سمجھ لیں کیونکہ اس کا ترجمہ اردو زبان کی گرفت میں آتا بھی نہیں ہے۔ مُكَلِّبِيْنَ ''تکلیب'' سے ہے، جس کا لفظی معنی ''کتے کو تربیت (Training) دینا ہے'' پھر اس کا استعمال شکاری جانوروں کی تربیت کیلئے عام ہو گیا خواہ کتا ہو یا شکاری درندوں اور پرندوں میں سے کوئی اور جانور۔ اس سے فقہاء نے یہ سمجھا کہ اگر کوئی اپنے سدھائے ہوئے جانور کو خود چھوڑے گا تو اس کا پکڑا ہوا جانور حلال ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا۔ تیسری بات یہ فرمائی کہ اگر وہ زخمی کر کے لے آئے مگر جانور زندہ ہو اب تم اسے ''بسم اللہ'' پڑھ کر خود ذبح کرو گے تو وہ حلال ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا۔ ایک اور بات جسے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شکاری درندے کا پکڑا ہوا جانور زخمی بھی ہو، اگر وہ زخمی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے، ظاہر ہے گلا گھٹ کر مرا ہوا جانور حرام ہے۔ پانچویں بات یہ کہ جب تم اسے چھوڑو ''بسم اللہ'' پڑھ کر چھوڑو، اگر تم ''بسم اللہ'' پڑھ کر نہیں چھوڑا تب بھی اس کا پکڑا ہوا جانور حلال نہیں ہوگا۔

Marfat.com

غیر مسلم اور مسلم کے شکاری جانور میں فرق:

اب آیت کو ایک اور پہلو سے ذرا ملاحظہ کریں۔ فرمایا کہ

''تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں پاکیزہ چیزیں (اور پھر سوال کا جواب دیا اور) وہ شکاری جانور جن کو تم سدھاتے ہو اور اسے خود چھوڑتے ہو اور شکار کو پکڑنے کیلئے جن کو تم تعلیم دیتے ہو اس تعلیم میں سے جو اللہ نے تمہیں دی ہے''

اس سے بعض مفسرین نے بڑی خوبصورت بات سمجھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مربی اور تربیت دینے والا جسے تربیت دیتا ہے اس کا ذوق تربیت اس میں منتقل ضرور ہوتا ہے۔ خواہ وہ انسان ہو یا حیوان کیونکہ جب استاد کسی کو تربیت دے گا تو اس کا ذوق بھی علم کے ساتھ منتقل ہو گا۔ فرمایا کہ اللہ نے تمہیں سکھایا پڑھایا' تم نے قرآن اور حضور ﷺ کی صحبت سے ساری باتیں سیکھیں' اب دیکھو! تم جب اپنے جانوروں کو تربیت دو (تربیت تو غیر مسلم بھی اپنے جانوروں کو دیتے ہیں) تو تمہارے تربیت یافتہ جانور اور غیر مسلم کے تربیت یافتہ جانور میں ذوق کے اعتبار سے فرق ہونا چاہئے اور وہ فرق یہ ہے کہ غیر مسلم جب اپنے جانور کو چھوڑتا ہے تو وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ میں کس شکار کو پکڑ رہا ہوں۔ لیکن جب مسلمان اپنا جانور چھوڑتا ہے تو اس کا سدھایا ہوا جانور یہ خیال رکھتا ہے کہ میں خرگوش پکڑوں' بجو نہ پکڑوں۔ اسے پتہ ہے کہ بجو پکڑ کر لے بھی جاؤں تو میرا مالک نہیں کھائے گا کیونکہ بجوفی نفسہٖ حرام ہے' طیبات میں سے نہیں ہے کیونکہ وہ مردار کھاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ جیسے تمہارے ذوق میں اور غیر مسلم کے ذوق میں فرق ہے' ایسے ہی تمہارے سدھائے ہوئے جانور میں اور غیر مسلم کے سدھائے ہوئے جانور کے ذوق میں بھی فرق ہونا چاہئے اور اس فرق کو تربیت دینے والے اچھی طرح جانتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا: فَكُلُوا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ امساک کے معنی ''روکنے اور تھامنے'' کے ہیں جب اس کے ساتھ علی آئے جیسا کہ اُمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ میں ہے تو اس کے اندر اختصاص کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے یعنی کسی خاص شے کو کسی خاص کیلئے روک یا سینت رکھنا۔ اب یہ سوال کا اصل جواب ہے فرمایا کہ اگر مذکورہ شرائط کے مطابق تربیت کیا ہوا جانور ہو تو اس کے کئے ہوئے شکاروں میں سے وہ شکار تمہارے لئے جائز ہو گا جو وہ خاص تمہارے لئے روک رکھے اور اگر وہ شکاری جانور شکار میں سے کچھ کھا لے تو وہ شکار جائز نہ ہو گا کیونکہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عدی ابن حاتم کے سوال پر ارشاد فرمایا تھا کہ اگر شکاری جانور نے شکار میں سے کچھ کھا لیا ہو تو مت کھاؤ کیونکہ اس نے شکار کو دراصل اپنے لئے پکڑا ہے (تمہارے لئے نہیں)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شکار میں سے شکاری جانور کھا لے تو اس جانور کا کھانا حلال نہیں رہتا۔

اس کے بعد پروردگار نے ارشاد فرمایا: وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اس میں ضمیر مجرور کے مرجع سے متعلق اختلاف کرتے ہوئے بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا تعلق علمتم من الجوارح سے ہے یعنی جس جانور کو چھوڑنا ہے پہلے اس پر بسم اللہ پڑھو بعض لوگوں نے کہا کہ نہیں اس کا مرجع مَآ اَمْسَكْنَ ہے یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ جب تم شکار کو پکڑ لو اسے ذبح کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھو۔ لیکن اس قول میں ضعف محسوس ہوتا ہے کیونکہ اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس کا تعلق فَكُلُوا سے ہے کہ جب اسے کھانے لگو تو ''بسم اللہ'' پڑھو حالانکہ یہ بات اس لئے زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتی کہ کھاتے' پیتے وقت کیا پڑھنا چاہئے کیا نہیں پڑھنا' اس کا تعلق آداب سے ہے اور قرآن کریم عام طور پر آداب کا ذکر نہیں کرتا' احکام کا ذکر کرتا ہے۔ آداب ہمیں حدیث اور سنت سے معلوم ہوتے ہیں' اس لئے درست بات یہ ہے کہ اس کا تعلق مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ سے ہے

Marfat.com

یعنی جب تم سدھایا ہوا جانور چھوڑنے لگو تو "بسم اللہ" پڑھو۔ اس کی تائید میں آنحضرت ﷺ کی ایک حدیث ہے جو حضرت عدی سے مروی ہے۔ "حضرت عدی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے پوچھا کہ میں اپنے سدھائے ہوئے کتے کو شکار پر چھوڑوں اور کوئی دوسرا کتا بھی اس میں شریک بن جائے تو اس کا کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا ایسا شکار نہ کھانا کیونکہ تم نے اللہ کا نام اپنے کتے پر لیا ہے دوسرے کتے پر نہیں لیا"۔ شکار کرنا عرب کی شدید ضرورت رہی ہے اور جب ضرورت کے تحت آدمی کسی جانور کو پکڑتا ہے تو پھر وہ احتیاطوں کی زیادہ پرواہ نہیں کرتا' صرف بھوک اور ضرورت اس کے سر پر مسلط ہوتی ہے اور وہ ایسے معاملات میں حدود کو نظر انداز بھی کر جاتا ہے' اس لئے فرمایا کہ حدود کو نظر انداز نہ کرنا تم ہزار اس سے لاپرواہی کرو اللہ تو جانتا ہے' اس لئے اللہ سے ڈرتے رہنا' بے شک اللہ جلدی حساب لینے والا ہے۔

آیت:۵ اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمۡ ۪ وَطَعَامُکُمۡ حِلٌّ لَّهُمۡ ۫ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ اِذَاۤ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ مُحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ وَلَا مُتَّخِذِیۡۤ اَخۡدَانٍ ؕ وَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَهُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ۝ "آج تمہارے لئے سب پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور اہل کتاب کا کھانا بھی (بشرطیکہ طیبات میں سے ہو) تم پر حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کیلئے حلال ہے اور پاک دامن مومن عورتیں اور پاک دامن اہل کتاب عورتیں بھی (حلال ہیں) جبکہ ان کا مہر دے دو اور ان سے عفت قائم رکھنی مقصود ہو نہ کھلی بدکاری کرنی اور نہ چھپی دوستی کرنی (مقصود ہو) اور جو شخص ایمان کا منکر ہوا' اس کے عمل ضائع ہو گئے اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا"۔

اس آیت کریمہ میں حلال و حرام کے حوالے سے چند ایسے معاشرتی مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے جن کا تعلق بنیادی طور پر اہل کتاب کے ساتھ ہے اور یہ ایسے نازک مسائل ہیں جن میں معمولی سی غلطی سے بین الاقوامی تعلقات بھی متاثر ہو سکتے ہیں اور امت مسلمہ کے اپنے مزاج پر بھی غلط اثرات مرتب ہو سکتے ہیں اس لئے ان معاشرتی مسائل کا ذکر کرنے سے پہلے ارشاد فرمایا گیا اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ حالانکہ گزشتہ آیت میں یہی جملہ پہلے گزر چکا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ بلاوجہ تکرار کلام کا عیب ہے اور قرآن کریم تو ایسے ہر عیب سے مبرا ہے' یہاں اس تکرار سے کیوں کام لیا گیا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کریمہ میں جن مسائل کو چھیڑا جا رہا ہے ان کی بنیاد ہی طیبات اور خبائث پر ہے اور اس میں معمولی فروگزاشت بڑے سنگین نتائج پیدا کر سکتی ہے اس لئے جس ہدایت سے ان نتائج کو روکا جا سکتا تھا اس کا سب سے پہلے ذکر فرمایا گیا اب ہم ان میں سے چند ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

1- امتیں جب نئی نئی وجود میں آتی ہیں تو انہیں اپنی انفرادیت اور تفرد کا شدید احساس ہوتا ہے چونکہ ان کے مزاج میں جذبۂ انقلاب غالب ہوتا ہے اس لئے یا تو وہ انقلاب برآمد کرتی ہیں اور یا پھر دوسری قوموں سے فاصلے پر رہتی ہیں امت مسلمہ ایک داعی جماعت کے طور پر وجود میں آئی تھی ضروری تھا کہ اسے ایسے کسی بھی احساس سے بچایا جائے اس لئے بالواسطہ اسے یہ احساس دلایا جا رہا ہے کہ تم اگر الگ تھلگ رہو گے تو دعوت کا کام متاثر ہوگا اس لئے تمہیں دوسری قوموں سے میل ملاپ رکھنا ہے اور ان کے ساتھ تعلقات قائم کرنے ہیں اور یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ جب تعلقات قائم کئے جاتے ہیں تو اس کا آغاز باہمی مجلسی زندگی سے ہوتا ہے جس میں ضیافتِ طبع کیلئے کھانا پینا اور کھلانا پلانا لازمی باتیں ہیں اور پھر یہی میل جول ہے جو بڑھتے بڑھتے صہری تعلقات تک بھی پہنچ جاتا ہے اور یہ دونوں چیزیں یعنی ضیافت و مناکحت کے طور اطوار اور حلال و حرام کے مسائل ہر قوم کے اپنے ہوتے ہیں جب ایک قوم کا فرد دوسری قوم کے کسی فرد سے ملنے جاتا ہے اور وہ حق مہمانی ادا کرتے ہوئے کھانے پینے کی چیزیں سامنے لا کر رکھتا ہے تو وہ یقیناً ایسی چیزیں

Marfat.com

ہوں گی جوان کے اپنے مذہب کے مطابق حلال اور طیب ہوں گی۔ اس لئے یہاں ایک مختصر سے جملے سے دو ہدایات دی جارہی ہیں۔ پہلی ہدایت یہ دی کہ مسلمانو! جب تمہیں دوسری قوموں کے ساتھ ایسی صورت حال سے واسطہ پڑے تو دیکھنا بعض دوسری قوموں کی طرح چھوت چھات کو اپنا طریقہ نہ بنانا ہر انسان بنیادی طور پر اولاد آدم میں ہونے کی وجہ سے انسانی شرف کا حامل ہے اس کے ساتھ لگنے اور چھو جانے سے کوئی انسان ناپاک نہیں ہوتا اور نہ کوئی برتن ناپاک ہوتا ہے اس لئے تمہیں دوسری قوموں سے میل جول میں ایسے کسی احساس سے معرا رہنا چاہئے تاکہ تمہارے تعلقات آگے بڑھیں اور تمہارا دعوتی عمل نتائج پیدا کر سکے اور دوسری یہ ہدایت دی کہ تمہارے سامنے دسترخوان پر تمہارا میزبان جو بھی لا کر رکھے اس میں مہمان ہونے کے ناطے سے ہر چیز کا کھالینا اور ہر چیز کا استعمال تمہارے لئے ہرگز جائز نہیں بلکہ تمہیں اسی سورۃ المائدہ میں بتادیا گیا ہے کہ حرام چیزیں کیا ہیں اور حلال کیا ہیں۔ طیبات کیا ہیں اور خبائث کیا ہیں۔ جتنی چیزیں حلال ہیں وہ ساری طیبات ہیں اور جتنی حرام ہیں وہ سب خبائث میں شامل ہیں اس لئے تمہیں یہ تاکید کی جارہی ہے کہ تم دوسری قوموں سے حسن سلوک اور مروت سے پیش آؤ لیکن طیبات کی ہمیشہ پابندی کرو اس میں کسی کمی بیشی کی ہرگز گنجائش نہیں۔

ایک اور بہت اہم حقیقت جس کی طرف اس آیت کریمہ کا پہلا لفظ اَلْیَوْمَ ہماری راہنمائی کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ بار دگر اس بات کا دہرانا کہ تمہارے لئے طیبات حلال کر دی گئی ہیں اور اسے آج کہہ کر دہرانا اس میں دراصل ایک تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ یہود نے اپنے فاسد مزاج کے تقاضوں سے بعض طیبات کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تھا اور بعض خبائث اپنے لئے جائز ٹھہرالی تھیں اور ان کی ضد سرکشی اور کٹ حجتی کے باعث اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر بعض پابندیاں بھی عائد کی گئی تھیں۔ تورات میں آنحضرت ﷺ کی بعثت سے متعلق جو پیشین گوئیاں کی گئیں ان میں ایک پیشگوئی یہ تھی کہ جب وہ آخری نبی آئیں گے تو اہل کتاب کو طیبات و خبائث سے متعلق خدا کے امر و نہی سے آگاہ کریں گے اور حلال و حرام کے بارے میں ان تمام پابندیوں اور بیڑیوں سے ان کو آزاد کر دیں گے جو انہوں نے اپنے اوپر یا تو از خود عائد کر رکھی ہیں یا ان کی سرکشی کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کر دی ہیں۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں یہ جو طعام اور محصنات کی حلت کا حکم دیا جارہا ہے یہ انہی پیش گوئیوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور رسول اللہ ﷺ کی زبان سے وعدے کو ایفا کیا جارہا ہے۔ اور اَلْیَوْمَ سے اسی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں مجلسی زندگی میں پیدا ہونے والے معاشرتی مسئلے کو لیا جارہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ص وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ز

﴿جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے ان کا طعام تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا طعام ان کیلئے حلال ہے﴾

سابقہ توضیحات کی روشنی میں اس جملے کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے لیکن نجانے کیوں مصر کے بعض مفتیانِ کرام نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے عجیب دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک بات تو یہ ارشاد فرمائی کہ یہاں طعام سے مراد کھانے کی ہر چیز ہے چاہے وہ حرام ہو یا حلال۔ جو کچھ بھی اہلِ کتاب کے دسترخوان پر موجود ہے مسلمانوں کو اجازت دے دی گئی ہے کہ تم شوق سے اسے تناول کر سکتے ہو اور دوسری یہ بات کہ اہل کتاب سے دنیا کے تمام اہل مذاہب مراد ہیں جس کسی کو بھی اہل کتاب ہونے کا دعویٰ ہے یعنی وہ اپنے پاس کوئی سی مذہبی کتاب رکھتا ہے وہ اہل کتاب میں شامل ہے یہ دونوں باتیں اگر کسی جاہل نے کہی ہوتیں تو چنداں تعجب نہ ہوتا لیکن اس کے کہنے والے چونکہ بڑے بڑے مفتیانِ کرام ہیں اس لئے حیرت ہوتی ہے کہ جو چیزیں مسلمانوں کیلئے حرام کی گئی ہیں یا وہ طیبات نہیں بلکہ خبائث میں شامل ہیں اور مسلمان انہیں استعمال نہیں کر سکتے اہل کتاب کے دسترخوان پر بیٹھ کر آخر ان کیلئے کیسے حلال ہو جائیں گی؟ پھر تو ہمیں حلت و حرمت کی پوری بساط ہی لپیٹنی پڑے گی۔ ظاہر ہے بقائمی ہوش و حواس کوئی مسلمان اس کے بارے

Marfat.com

میں سوچ بھی نہیں سکتا اور جہاں تک کھانے پینے کی ایسی اشیاء ہیں جن کا تعلق زمین کی مفید نباتات یا پھلوں سے ہے تو اس میں اہل کتاب کی کیا تخصیص ہے چاہے اسے مذہب کے منکرین یا مشرکین بھی بازار میں سپلائی کریں یا کسی طرح مسلمانوں کو کھانے کیلئے پیش کریں اس کے کھانے میں تو کوئی شرعی رکاوٹ نہیں اس لئے ہمیں سوچنا ہوگا کہ طعام سے آخر کیا مراد ہے اور اہل کتاب کن لوگوں کو کہتے ہیں؟ جہاں تک کتاب کا تعلق ہے کتاب ہر نوشتے کا نام نہیں بلکہ اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جو اللہ کی طرف سے اس کے رسولوں پر نازل ہوئیں اور جنہیں خود قرآن کریم نے تسلیم بھی کیا ہے اس لئے کہ بعض ایسے گروہ ہیں جن کے حوالے سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ کسی کتاب کے ماننے والے ہیں جیسے صابی یا زردشتی لیکن قرآن کریم نے بطور اہلِ کتاب ان کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح بعض کتابوں کے بارے میں آج کی دنیا میں دعویٰ کیا جارہا ہے کہ ان کا تعلق شاید آسمانی کتابوں سے ہے مثلاً بحرِ مردار کی غاروں سے کوئی پرانے نوشتے ملے ہیں جن کے بارے میں بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ یہ شاید حضرت ادریس علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب کے حصے ہیں حالانکہ جس زبان میں وہ نوشتے ہیں وہ آج تک پڑھی نہیں جاسکی۔ ایسے بے سند دعووں سے کسی کتاب کو آسمانی کتاب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے قرآن کریم میں جنہیں اہلِ کتاب کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔ ان سے مراد صرف یہود اور نصاریٰ ہیں اس کے علاوہ کسی اور کتاب کو کتاب اللہ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ اس کے ماننے والوں کو اہل کتاب سمجھ کر ان کے ساتھ وہ تعلقات قائم کئے جاسکتے ہیں جن کا اس آیت کریمہ میں ذکر ہے۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں جو احکام دیئے گئے ہیں وہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے متعلق ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ طعام سے کیا مراد ہے؟ طعام کے لغوی معنی ''کھانے کی چیز'' کے ہیں اور عربی لغت کے اعتبار سے یقیناً اس میں ہر قسم کے کھانے کی چیزیں شامل ہیں لیکن جمہور امت کے نزدیک اس جگہ طعام سے مراد صرف ''اہل کتاب کا ذبیحہ'' ہے کیونکہ گوشت کے سوا دوسری اشیائے خوردنی میں اہلِ کتاب اور دوسرے کفار میں کوئی امتیاز اور فرق نہیں۔ کھانے پینے کی خشک چیزیں گیہوں، چنا، چاول اور پھل وغیرہ ہر کافر کے ہاتھ کا بھی حلال اور جائز ہے۔ امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس کی صراحت کی ہے۔

مختصر یہ کہ طعامِ اہلِ کتاب سے مراد اس آیت میں بہ اتفاق علمائے تفسیر وہ طعام ہے جس کی حلت مذہب اور عقیدہ پر موقوف ہے یعنی ذبیحہ، اس لئے اس طعام میں اہلِ کتاب کے ساتھ امتیازی معاملہ کیا گیا کیونکہ وہ بھی اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان کے مدعی ہیں اگرچہ ان کی تحریفات نے ان کے دعویٰ کو مجروح کردیا ہے۔ یہاں تک کہ شرک اور کفر میں مبتلا ہوگئے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ان کے دین میں سینکڑوں تحریفات ہونے کے باوجود اس مسئلے میں ان کا مذہب بھی اسلام کے بالکل مطابق ہے۔ یعنی وہ ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا عقیدۃً ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے بغیر جانور کو مردار اور حرام قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم کے نزول کے وقت تورات اور انجیل جس حالت میں ان کے پاس موجود تھی اور آج بھی چند تبدیلیوں کے ساتھ یہ دونوں کتابیں جس حالت میں موجود ہیں اس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ بائبل کے عہد نامہ قدیم و جدید جو موجودہ زمانہ کے یہود و نصاریٰ دونوں کے نزدیک مسلّم ہے اس میں ذبیحہ کے متعلق یہ احکام موجود ہیں۔

1- جو جانور خود بخود مر گیا ہے اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو ان کی چربی تو کام میں لاسکتے ہو لیکن اسے کسی حال میں نہ کھانا۔ (احبار:۲۴)

2- پر گوشت کو تو اپنے سب پھاٹکوں کے اندر اپنے دل کی رغبت اور خداوند اپنے دی ہوئی برکت کے موافق کھا سکے گا...... لیکن تم خون کو بالکل نہ کھانا۔ (استثنا:۱۲-۱۵)

3- تم بتوں کی قربانیوں کے گوشت، لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں اور حرام کاری سے پرہیز کرو۔ (عہد نامہ جدید کتاب اعمال:۱۵-۲۹)

Marfat.com

4- عیسائیوں کا سب سے بڑا پیشوا پولس کرنتھیون کے نام پہلے خط میں لکھتا ہے کہ جو قربانی غیر قومیں کرتی ہیں شیاطین کیلئے کرتی ہیں نہ کہ خدا کیلئے اور میں نہیں چاہتا کہ تم شیاطین کے شریک ہو۔ تم خداوند کے پیالے اور شیاطین کے پیالے دونوں میں سے نہیں پی سکتے۔
(کرنتھیون: ۱۰-۲۰-۲۰)

5- کتاب اعمال حوارین میں ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ کر کے لکھا ہے کہ وہ صرف بتوں کی قربانی کے گوشت سے' لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں اور حرام کاری سے اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔ (اعمال: ۲۱-۲۵)

آج کے امریکہ اور یورپ میں اگرچہ یہود اور عیسائی آباد ہیں جو آج بھی اپنے پاس آسمانی کتابیں رکھتے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ ان کی کتابوں میں یہ احکام آج بھی موجود ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مذہب کے ان احکام کو زندگی سے بالکل خارج کر دیا ہے اسلئے آج وہ جانوروں کی حلت وحرمت اور ان کے ذبح کرنے کے معاملے میں جن طریقوں پر عمل کر رہے ہیں وہ اہل کتاب کا طریقہ نہیں بلکہ ایک ایسی قوم کا طریقہ ہے جو اپنی کتابوں سے منحرف ہو چکی ہے۔

میں نے اس سے پہلے عرض کیا ہے کہ مجلسی زندگی کا میل جول قوموں میں بالعموم صِہری رشتوں تک پہنچ جاتا ہے اس لئے ضروری تھا کہ اس کیلئے بھی احکام دے دیئے جائیں۔ چنانچہ اس اہم مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

﴿اور شریف عورتیں مسلمان عورتوں میں سے اور شریف عورتیں ان اہل کتاب میں' سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی' تمہارے لئے حلال ہیں۔﴾

قرآن میں ''مُحْصَنٰت'' کی اصطلاح کے تین معنی:

''مُحصنٰت'' کا لفظ قرآن کریم نے تین معنوں میں استعمال کیا ہے: 1- کبھی اس کا معنی ہوتا ہے ''شادی شدہ عورتیں'' 2- کبھی اس کا معنی ہوتا ہے ''آزاد عورتیں'' 3- کبھی اس کا معنی ہوتا ہے ''پاک دامن عورتیں''۔ یہاں یہ ''پاکدامن عورتوں'' کے معنی میں ہے۔ یعنی

﴿تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں پاکدامن عورتیں مسلمانوں میں سے اور پاکدامن عورتیں ان میں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے۔﴾

البتہ! علماء یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی کی پاکدامنی میں شبہ ہو جائے تو اس سے نکاح حلال تو ہے۔ لیکن ایک مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ جب وہ پاکدامنی سے محروم ایک مسلمان عورت کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہے تو پھر اہلِ کتاب فاحشہ عورت کو قبول کیوں کرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرونِ اولیٰ میں امت کا عمل اسی بات پر رہا ہے اور جب بھی انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی ہے تو خلفاء راشدین نے روکا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صاف طور پر فرمایا کہ ''بنی تغلب'' کے عیسائیوں کی عورتوں سے بالکل نکاح نہ کیا جائے اور ان کا ذبیحہ بھی نہ کھایا جائے کیونکہ وہ اپنی شریعت پر بالکل عمل نہیں کرتے۔ عیسائیت سے انہوں نے شراب نوشی کے سوا کچھ نہیں لیا چونکہ وہ خود اپنی شریعت پر عمل نہیں کرتے' اس لئے تم بھی ان کی عورتوں سے نکاح نہ کرو اور نہ ان کا ذبیحہ کھاؤ۔ آج آپ دیکھ لیں کہ اکثر اہل کتاب کا حال کیا ہے؟ یعنی وہ بنیادی طور پر اہل کتاب ہیں ہی نہیں' بلکہ انہیں لبرل کہہ لیجئے یا سیکولر کہہ لیجئے۔ وہ اپنی انجیل اور تورات کو نہیں مانتے۔ میرے بھائی نے ایک بار بتایا کہ انگلینڈ میں جب میں اپنی ڈیوٹی پر جاتا تو وہاں کا منیجر مجھے Priest سمجھتے ہوئے میرا بڑا احترام کرتا۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتا کہ میں چائے اس کے ساتھ پیوں۔ جب رمضان آیا تو حسب معمول اس نے مجھے چائے پر بلایا۔ میں نے کہا کہ میں

Marfat.com

آپ کے ساتھ چائے نہیں پی سکتا۔ اس نے پوچھا: کیا بات ہے؟ میں نے کہا: میں روزے سے ہوں۔ وہ کہنے لگا کہ ''روزہ'' کیا ہوتا ہے؟ میں نے اسے کسی حد تک سمجھایا کہ ہم طلوع فجر سے غروب آفتاب تک کچھ کھاتے پیتے نہیں۔ اس نے کہا کہ آپ کو کیا ہو جاتا ہے' کیوں نہیں کھاتے پیتے؟ تو میرے بھائی نے سمجھانے کیلئے کہا کہ تمہارے مذہب میں بھی تو ''روزہ'' ہے' تمہاری انجیل میں ''روزے'' کے متعلق لکھا ہے۔ اس نے پوچھا: کیا تم انجیل پڑھتے ہو؟ بھائی نے جواب دیا: ہاں۔ کہا کہ ہم تو پڑھتے نہیں' تم کیوں پڑھتے ہو؟ معلوم ہوا کہ ان کی عام زندگی سے انجیل نکل چکی ہے۔ اس لئے وہ اہلِ کتاب کے حکم میں نہیں ہیں۔

﴿مدائن کے فتح ہونے کے بعد حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ (یہ وہی جلیل القدر صحابی ہیں' عراق میں آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے ان کے جسد خاکی کو نکالا گیا اور دوسری جگہ منتقل کیا گیا تھا اور ہزارہا لوگوں نے دیکھا تھا کہ ان کی آنکھوں کی چمک اب بھی موجود تھی) جب وہاں پہنچے تو ضرورت کے تحت انہوں نے وہاں ایک عیسائی عورت سے شادی کر لی۔ حضرت عمر فاروق ﷺ کو پتہ چلا تو انہوں نے خط لکھا کہ اس کو طلاق دے دو' تم نے اچھا نہیں کیا۔ انہوں نے جواب میں پوچھا کہ امیر المومنین! کیا یہ میرے لئے حرام ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ جواب میں لکھا کہ میں تمہیں قسم دے کر یہ بات کہتا ہوں کہ تم میرا یہ خط ہاتھ سے رکھنے سے پہلے اپنی بیوی کو طلاق دے دو اور لکھا کہ اس کی دو وجوہات ہیں: ایک وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں پاکدامنی نہیں ہے۔ یہ عورتیں تمہارے گھروں میں آئیں گی تو عفت و حرمت تمہارے گھروں سے رخصت ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ اس علاقے کی عورتیں بڑی خوبصورت ہیں' تمہاری پہلی بیویاں جو عرب کی ہیں' وہ اتنی خوبصورت نہیں ہیں۔ جب تم انہیں گھروں میں لاؤ گے تو تمہاری عرب بیویوں کی عزت کہاں رہے گی' ان کیلئے فتنے پیدا ہو جائیں گے' اسلئے اس راستے پر مت چلو۔﴾ (بحوالہ ''کتاب الآثار'' از امام محمد رحمۃ اللہ)۔

یہاں ایک اور پہلو پر توجہ دینا بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی اس آیت سے کتابیات سے نکاح کی اجازت یقیناً ثابت ہوتی ہے لیکن اگر تھوڑے سے تدبر سے کام لیا جائے اور صحابہ کے طرزِ عمل کو سامنے رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے یہ اجازت عَلٰی سَبِیْلِ التَنَزل دی ہے اس میں نکاح کرنے والے' اس کی آل اولاد اور خاندان کے دین و ایمان کیلئے جو خطرہ مخفی ہے' وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلمان مردوں کو تو کتابیات سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے لیکن مسلمان عورت کو کسی صورت میں بھی کسی غیر مسلم سے نکاح کی اجازت نہیں دی گئی یہ چیز اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اجازت صرف ایک اجازت ہے کوئی مستحسن چیز نہیں اگر ماحول اسلامی تہذیب و معاشرت کا ہو اور آدمی کسی نیک چال چلن کی کتابیہ سے نکاح کر لے تو اس میں مضائقہ نہیں لیکن کافرانہ ماحول میں جہاں کفر اور اہل کفر کا غلبہ ہو اس قسم کا نکاح چاہے اس آیت کے الفاظ کے خلاف نہ ہو لیکن اس کی روح اور اس کے موقع و محل کے خلاف ضرور ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:

اِذَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَلَا مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ ط

﴿بشرطیکہ ان کو قیدِ نکاح میں لا کر ان کے مہران کو دو نہ کہ بدکاری کرتے ہوئے اور آشنائی گانٹھتے ہوئے۔﴾

یعنی مسلمان عورتوں اور کتابیات سے نکاح کی دو شرطیں ہیں اور یہ دونوں شرطیں بیک وقت مطلوب ہیں۔ ایک یہ کہ نکاح مال یعنی مہر کے ساتھ ہو اور دوسری یہ کہ اس نکاح سے مقصود عورت کو اپنی حمایت و حفاظت میں لینا ہے نہ کہ وقتی طور پر شہوت رانی کر کے محض ہیجان نفس کو تسکین دینا۔ مقصود یہ ہے کہ نکاح کے معاملے کو ایک سنجیدہ معاہدے کی حیثیت حاصل ہو جائے اس کو لڑکوں کا کھیل نہ بنایا جا سکے کیونکہ جس معاملے کے ساتھ ادائے مال کی

Marfat.com

شرط لگی ہو اور اس ادائے مال کی حیثیت محض ایک تبرع اور احسان کی نہ ہو بلکہ ایک فریضہ کی ہو یہاں تک کہ اگر وہ مذکور نہ بھی ہو جب بھی لازماً مضمر سمجھا جائے اور عورت کی حیثیت عرفی کے اعتبار سے اس کی ادائیگی واجب قرار پائے تو شرعاً و عرفاً وہ ایک اہم اور سنجیدہ معاملہ بن جاتا ہے۔ یہ وہ مصلحتیں ہیں جس کی وجہ سے مہر کی شرط لازم ٹھہرائی گئی۔ جن لوگوں کی نظر ان مصلحتوں کی طرف نہیں گئی وہ سمجھتے ہیں کہ اس شرط نے عورت کو ایک خرید نی وفروختنی شے کے درجے تک گرا دیا ہے۔ یہ خیال محض ناسمجھی کا نتیجہ ہے۔ یہ شرط تو ایک آگاہی ہے کہ جو بھی عورت کے حرم میں قدم رکھنا چاہے وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر قدم رکھے۔ ایسے سنجیدہ معاملے میں کسی مذاق کی گنجائش نہیں ہے۔

مہر کے بعد دوسری شرط احصان کی لگائی گئی ہے کیونکہ نکاح کا اصل مقصد اسی شکل میں پورا ہوتا ہے جب اس کے ساتھ احصان پایا جائے یعنی ایک مرد ایک عورت کو سنجیدہ ارادے اور زندگی بھر کے سنجوگ کے عزم کے ساتھ اپنی حفاظت وحمایت میں لے اور عورت اسی شعور وارادہ کے ساتھ اسکے حصنِ حمایت میں داخل ہو اس احصان کے بغیر عورت اور مرد کے تعلق سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جو قدرت نے اس سے پورا کرانا چاہا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے ایک وقتی اور عارضی تعلق پیدا کرتا ہے اور اس کیلئے اس نے نکاح کی رسم بھی پوری کی ہے اور اسکو مال بھی دیا ہے لیکن وہ احصان کا جذبہ نہیں رکھتا تو یقین کیجئے کہ اس نے جنسی تلذذ اور جنسی ہوس کو پورا کرنے کیلئے ایک موقعہ تو پیدا کر لیا ہے لیکن جو شریعت اور فطرت کا اصل مقصود ہے وہ اس سے کوسوں دور ہے۔ اسی لئے اس کے ساتھ یہ قید لگائی گئی غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۔

سفح کا لغوی معنی بہانے کے ہیں اسی سے مسافحت ہے جس کے معنی عیاشی اور بدکاری کے ہیں اسلیئے کہ اس میں بھی عورت اور مرد محض تلذذ کو مقصد قرار دے کر اپنا مادہ منویہ برباد کرتے ہیں اور اس کا آغاز چونکہ خفیہ آشنائیوں سے ہوتا ہے اس لئے اس کو روکنے کیلئے فرمایا:

وَلَا مُتَّخِذِىٓ اَخْدَانٍ ﴿نہ وہ چھپ کر آشنائی کرنے والے ہوں﴾

کیونکہ نکاح جس طرح معاشرے کو اخلاقی قلعوں میں محصور کرتا ہے اور وہ تمام برائیاں جو عفت وعصمت کے دامن کو تار تار کرتی ہیں ان کے راستوں پر پہرے بٹھا کر مرد وعورت کے تطہیر عمل کا سامان کرتا ہے وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ بدکاریوں کا ہر راستہ بند کر دیا جائے اور چھپی آشنائیاں چاہے وہ مخلوط اجتماع کے نتیجے میں ہوں یا نوجوان بچیوں کے نوجوان لڑکوں سے پڑھنے کے نتیجے میں ہوں جسے ٹیوشن کی شکل دے کر اس خطرناک برائی کو گویا سند جواز دے دی ہے اس کا راستہ بند کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ز وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ O

﴿اور جو ایمان کے ساتھ کفر کرے گا اس کا عمل ڈھے جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں ہوگا﴾

اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ آدمی اللہ اور رسول کو ماننے کا دعویٰ بھی کرے اور ساتھ ہی اللہ اور رسول کے احکام کے صریح خلاف محض اپنی خواہشات کے اتباع میں قانون وشریعت ایجاد کر کے اس پر عمل پیرا بھی ہو۔ یہ وہی ایمان ہے جس کا قرآن کریم نے سورۃ البقرۃ میں ذکر کیا کہ

﴿تم اللہ کی کتاب کی کسی بات کو مانتے ہو اور کسی بات کا انکار کر دیتے ہو﴾

اس کا مقصود شاید یہ ہوتا ہے کہ ایسا آدمی یہ چاہتا ہے کہ ایمان کا دعویٰ بھی باقی رہے اور کفر سے تعلق بھی نہ ٹوٹے۔ گویا اس کا ایمان یا اس کا عملی رویہ کفر اور ایمان کا ایک ملغوبہ ہے۔ اس پر تنبیہ کی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایمان صرف وہ معتبر ہے جو اللہ تعالیٰ کی شرائط پر ہو۔ جو لوگ اپنی شرائط پر ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان ان مدعیان ایمان کے منہ پر پھینک مارا جائے گا اور اس قسم کے ایمان کے تحت کئے ہوئے سارے اعمال اللہ کے ہاں ڈھے جائیں گے۔

Marfat.com

دوسرا مفہوم اس کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دینے کے باوجود یہ تنبیہ کی جارہی ہے کہ جو شخص کتابیات سے نکاح کرے اسے اپنے ایمان واخلاق کی طرف سے بےفکر نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس بات کا بہت امکان ہے کہ کافر بیوی کے عشق میں مبتلا ہو کر یا اس کے عقائد واعمال سے متاثر ہو کر وہ اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے یا اخلاق ومعاشرت میں ایسی روش پر چل پڑے جو ایمان کے منافی ہو چنانچہ ہمارے گردوپیش میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جو لوگ باہر سے بیگمات ساتھ لے کر آئے۔ ان کا اپنے والدین اور اپنے عزیز واقارب سے معاشرتی ناطہ تو ٹوٹا ہی تھا وہ اسلامی روایات سے بھی بے بہرہ ہو گئے اور مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ غیر مسلم عورتوں نے حکمرانوں کے حرم میں داخل ہو کر وہ فتنے اٹھائے جن کے زخم آج تک ٹیس دے رہے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى

مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا

الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا

کرو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو اور سر کا مسح کر

بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ

لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھو لیا کرو) اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو (نہا کر) پاک ہو

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ

جایا کرو اور اگر بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلاء سے ہو کر

الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا

آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمہیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اس سے منہ

طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ

اور ہاتھوں کا مسح (یعنی تیمم) کر لو۔ خدا تم پر کسی طرح

لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ

کی تنگی نہیں کرنی چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں

نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر کرو۔ اور خدا نے جو تم پر احسان کیے ہیں ان

Marfat.com

وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

کو یاد کرو اور اُس عہد کو بھی جس کا تم سے قول لیا تھا (یعنی) جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے (خدا کا حکم) سُن لیا اور قبول

وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ⑦ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

کیا۔ اور خدا سے ڈرو۔ کچھ شک نہیں کہ خدا دلوں کی باتوں (تک) سے واقف ہے ۔ اے ایمان والو!

آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ

خُدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس

شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ

بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے

وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ⑧ وَعَدَ اللَّهُ

اور خدا سے ڈرتے رہو کچھ شک نہیں کہ خدا تمہارے سب اعمال سے خبردار ہے۔ جو لوگ ایمان

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ

لائے اور نیک کام کرتے رہے اُن سے خُدا نے وعدہ فرمایا ہے کہ اُن کے لیے بخشش اور اجر

عَظِيمٌ ⑨ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ

عظیم ہے۔ اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ جہنمی

الْجَحِيمِ ⑩ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ

ہیں۔ اے ایمان والو! خُدا نے جو تم پر احسان کیا ہے اس کو یاد کرو

إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَن يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ

جب ایک جماعت نے ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کریں تو اُس نے اُن کے ہاتھ روک دیئے

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ⑪

اور خُدا سے ڈرتے رہو۔ اور مومنوں کو خُدا ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے۔

Marfat.com

آیت:۶ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَیْدِیْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَكُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾ اے اہل ایمان! جب تم نماز کا قصد کیا کرو تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولیا کرو اور سر کا مسح کرلیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھولیا کرو) اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو (نہا کر) پاک ہو جایا کرو اور اگر بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلاء سے ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمہیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور تیمم کرلو یعنی اس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح کرلو۔ اللہ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر کرو۔ ﴿

اسلامی تہذیب کی بنیاد نماز ہے:

اس سے پہلی آیتوں میں ہم نے کھانے پینے کی اشیاء اور عورتوں کے حوالے سے طیبات اور خبائث کا ذکر پڑھا۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ کونسی کھانے کی چیزیں ہمارے لئے طیب اور حلال ہیں اور کون سی خبیث ہیں۔ اسی طرح کن عورتوں سے نکاح ہو سکتا ہے اور کن سے نہیں ہو سکتا۔ یہ گویا جنس اور شکم سے متعلق جسمانی ضرورتوں کی ایک تہذیب کا ذکر ہے۔ اب اس آیت میں ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ تمہاری معنوی' اخلاقی اور روحانی بھی ایک تہذیب ہے' جس کا سارا دارومدار نماز پر ہے۔ یعنی نماز سے اس تہذیب اور تطہیر کا آغاز ہوتا ہے جو قرآن کریم کے پیش نظر ہے اور نماز کے آغاز کیلئے ضروری ہے کہ وضو کیا جائے حالانکہ نماز سے مقصود تو انسان کی روحانی تطہیر ہے' یعنی آدمی کے اندر کی پاکیزگی۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ظاہر آدمی کے باطن پر اور باطن آدمی کے ظاہر پر اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ اگر آدمی ظاہری طور پر گندا ہو' ممکن نہیں کہ وہ باطنی طور پر پاک رہ سکے اور جو باطنی طور پر گندا ہو ممکن نہیں کہ وہ ظاہری طور پر پاک ہو۔ اس لئے جا بجا قرآن کریم ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی صفائی کا حکم دیتا ہے۔ اسلام نے باطنی صفائی کے ساتھ ساتھ ظاہری صفائی پر جس قدر زور دیا ہے' اتنا زور کسی اور مذہب یا تہذیب نے نہیں دیا۔ میرے علم میں نہیں کہ کسی بھی مذہب نے طہارت کو نصف ایمان قرار دیا ہو۔ طہارت کی جو تفصیلات ہمیں مہیا کی گئی ہیں' ان کو دیکھتے ہوئے تو صاف نظر آتا ہے کہ جس قدر طہارت کی تفصیلات طے کرتے ہوئے اسلام نے عرق ریزی اور جزرسی سے کام لیا ہے' دوسرے مذاہب میں اس کا دور دور تک کوئی نشان نہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی کہہ لیجئے کہ اسلام میں جن چیزوں پر بہت زیادہ زور دیا گیا تھا' ہم نے ان کے بارے میں اتنی ہی زیادہ بے تعلقی اختیار کر رکھی ہے۔ بہر حال تہذیب نفس کیلئے ضروری ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور چونکہ نماز میں اللہ کے آگے حاضر ہونا ہے' اس کیلئے ظاہری صفائی ضروری ہے۔ ظاہری صفائی کے دو ذرائع ہیں: ایک وضو اور دوسرا غسل۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وضو یا غسل کیلئے پانی نہ ملے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پانی میسر ہو' لیکن آدمی استعمال کرنے پر قادر نہ ہو' مثلاً کسی بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ یہ مسائل ہیں جنہیں اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ

قَامَ کا لفظ جس سے قُمْتُمْ بنا ہے' اس کے ساتھ جب اِلٰی کا صیغہ آتا ہے تو اس کا معنی ہوتا ہے ''ارادہ کرنا''۔ فرمایا: اے مسلمانو! جب تم نماز کا ارادہ کرو اور نماز کا اہتمام کرنا چاہو تو دیکھو! یونہی بغیر وضو اور بغیر ظاہری تطہیر کے اللہ کے سامنے جا کر کھڑے مت ہو جانا بلکہ اس کیلئے پہلے تمہیں وضو کرنا ہے' اپنے کچھ اعضا دھونے ہیں۔ یہاں ایک بات ذہن میں رکھئے کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی باوضو تھا' لیکن اسے یاد نہیں رہا کہ اس کا وضو ٹو

Marfat.com

چکا ہے لہٰذا اس نے نماز پڑھ لی۔ کچھ دیر بعد اسے اگر یاد آ جائے کہ میرا تو وضو ٹوٹ چکا تھا اور میں نے بے خیالی میں نماز پڑھ لی ہے تو اسے نماز لوٹا لینی چاہئے' اس سے گناہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر کوئی آدمی جانتا تھا کہ میں بے وضو ہوں یا مجھ پر غسل واجب ہے اور اس نے پھر بھی جان بوجھ کر نماز پڑھنے کی کوشش کی تو یہ بہت بڑا جرم (گناہ) ہے' اس سے آدمی کافر ہو جاتا ہے یعنی قصداً اللہ کے سامنے ناپاکی کی حالت میں آنا اتنی بڑی جسارت ہے کہ اس میں عمل تو برباد ہوتا ہی ہے' ایمان بھی جاتا رہتا ہے۔

وضو کا طریقہ:

اسی لئے یہاں واضح طور پر فرمایا جارہا ہے کہ جب تم نماز کا ارادہ کرو تو سب سے پہلے وضو کرو۔ یہاں چار چیزیں بیان کی گئی ہیں اور یہ اصل میں وضو کے چار فرائض ہیں۔ وضو میں باقی چیزیں' سنتیں اور مستحبات ہیں جنہیں آداب کہا جاتا ہے ان کی تعلیم قرآن پاک نہیں دیتا' ان کی تعلیم پیغمبر دیتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ احکام کا ذکر قرآن پاک کرتا ہے اور آداب کا ذکر سنت کرتی ہے۔ وضو میں جن چیزوں کا کرنا فرض ہے وہ چار ہیں' ان کا ذکر قرآنِ پاک نے کر دیا ہے اور جن چیزوں کا تعلق آداب سے ہے' جنہیں ہم سنتیں یا مستحبات کہتے ہیں' ان کا ذکر آنحضرت ﷺ نے کرتے ہوئے فرمایا کہ جب وضو کا ارادہ کرو تو سب سے پہلے ہاتھ دھوؤ۔ ظاہر ہے جب ہاتھ ہی پلید ہوں گے اور تم ہاتھوں سے پانی اٹھا کر منہ پر ڈالو گے تو وہ بھی پلید ہو جائے گا یا جس برتن میں ہاتھ ڈالو گے اس کو بھی پلید کر دو گے' اس لئے سب سے پہلے ہاتھ دھوؤ چونکہ حکم دیا جارہا ہے چہرے کو دھونے کا اور آدمی کا منہ اور ناک بھی چہرے میں شامل ہے' اس لئے اس کی وضاحت حضور اکرم ﷺ نے فرمائی کہ کلی کرو' اس کے بعد ناک میں پانی ڈالو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو وضو مکروہ ہو جائے گا اور نماز بھی مکروہ ہو جائے گی۔ یہ آداب حضور اکرم ﷺ نے ہمیں سکھائے۔ کوئی بھی حدیث کی کتاب کھول کر اس کے 'باب الوضو' میں آپ جا بجا دیکھ سکتے ہیں کہ خلفائے راشدین سے لے کر عام اصحابِ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تک نے ان احکام اور آداب کو جو آنحضرت ﷺ نے دیئے' بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے یعنی ان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو بعد میں وضع کی گئی ہو اور اس پر امت کا تعامل نہ رہا ہو۔ ایک تو یہ کہ اسے زبانی طور پر تواتر کے ساتھ ذکر کیا گیا اور دوسرے یہ کہ امت کا عمل آگے منتقل ہوتا رہا ہے۔ نماز بھی عمل اور قول دونوں شکلوں سے منتقل ہوئی ہے اور وضو بھی قول اور عمل' دونوں سے آگے منتقل ہوا ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس سے متعلق کئی روایات ہیں۔ اسی طرح حضرت ابوذر' حضرت عمر اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کافی روایات ہیں جن میں انہوں نے لوگوں سے فرمایا کہ آؤ! میں تمہیں وضو کر کے دکھاؤں کہ حضور ﷺ کا وضو کیسا ہوتا تھا۔ اس لئے وضو کے بارے میں جتنی بھی روایات ہیں' ان کے بارے میں یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ وہ ہم تک تواتر کے ساتھ پہنچی ہیں۔ تواتر یہ ہوتا ہے کہ کسی بات کو آگے ذکر اور روایت کرنے والے اس کثرت اور اتنی بڑی تعداد میں ہوں کہ انسان اس کا تصور بھی نہ کر سکے کہ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کبھی جھوٹ پر جمع ہو سکتی ہے یعنی جسے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد نقل کرنے والی ہو' اسے تواتر کہتے ہیں اور اگر یہ تواتر دوہرا ہو جائے یعنی ایک تواتر قولی اور دوسرا عملی۔ تواتر قولی یہ کہ لوگ مسلسل اس بات کو بیان کرتے رہیں' جیسے حضرت عمر' حضرت علی رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ دیکھو! میں تمہیں بتاتا ہوں کہ حضور اکرم ﷺ کیسے وضو فرماتے تھے۔ تواتر عملی یہ ہے کہ اسے کر کے بھی دکھایا جائے یعنی یہ لوگ وضو کر کے بھی دکھاتے تھے۔ وضو بیان کرنے اور کر کے دکھانے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ کوئی آدمی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگ کبھی جھوٹ پر جمع ہو سکتے ہیں۔ اس لئے جس چیز کو تواتر کے ساتھ ذکر کیا جائے' یاد رکھئے! اس کا انکار کفر ہوتا ہے۔ قرآن کریم بھی ہم تک ان دونوں قسم کے تواتر سے پہنچا ہے' تواتر قولی سے بھی اور عملی سے بھی۔ اسی طرح نماز اور وضو بھی ہم تک قولی اور عملی تواتر سے پہنچے ہیں۔

Marfat.com

اس لئے سب سے پہلے فرمایا کہ تم ہاتھ دھونے' کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے (استنشاق) کے بعد اپنا پورا چہرہ دھوؤ' یعنی پیشانی کے بالوں سے کانوں کی لوؤں اور نیچے ٹھوڑی تک کا پورا چہرہ دھونے کے بارے میں فرمایا کہ "فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ" اپنے چہروں کو دھولو اور چہرے کو دھونے کے بعد دوسرا کام یہ کرنا کہ اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو۔ ہمارے ہاتھ کلائیوں تک ہیں۔ یہاں چونکہ "اِلَى الْمَرَافِقِ" کا ذکر ہے' لہٰذا یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں کہنیاں بھی شامل ہیں۔ یاد رکھیئے! اگر اس کا کچھ حصہ بھی خشک رہ جائے گا تو وضو نہیں ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ﴾ "اور اپنے سروں کا مسح کرو"۔ مسح "ہاتھ پھیرنے" کو کہتے ہیں۔ کسی عضو پر پانی والا (گیلا) ہاتھ پھیرنا مسح کہلاتا ہے۔ فرمایا کہ اپنے سروں کا مسح کرو۔

وضو میں پاؤں دھونا فرض ہے:

پھر فرمایا: ﴿وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ "اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھو لیا کرو"۔ یہاں دو تین باتیں بہت اہم ہیں۔ ہمارے ہاں اہل علم کا ایک طبقہ ایسا ہے جو یہ کہتا ہے کہ اصل میں اَرْجُلَكُمْ نہیں بلکہ اَرْجُلِكُمْ بالکسر ہے اور اس کا عطف "بِرُءُوْسِكُمْ" پر ہے' اَيْدِيَكُمْ پر نہیں۔ جمہور اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ اَرْجُلِكُمْ بالکسر نہیں بلکہ اَرْجُلَكُمْ بالفتح ہے اور اس کا عطف اَيْدِيَكُمْ پر ہے بِرُءُوْسِكُمْ پر نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دونوں میں فرق کیا ہے؟ اگر ہم اسے "اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ" پڑھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاؤں کا دھونا بھی فرض ہے۔ لیکن اگر ہم اسے "اَرْجُلِكُمْ" پڑھتے ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ پاؤں کا دھونا فرض نہیں بلکہ اس کا مسح کرنا فرض ہے۔ لیکن ہم سب لوگ "اَرْجُلَكُمْ" پڑھتے ہیں اور پاؤں کا دھونا فرض سمجھتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جتنی احادیث تواتر سے ہم تک پہنچی ہیں' ان سب میں کہیں "اَرْجُلِكُمْ" کا ذکر نہیں' ان میں اَرْجُلَكُمْ لام کے فتح کے ساتھ مذکور ہے۔ اب جو روایات ہمیں متواتر پہنچی ہوں ان کا انکار کفر ہوگا۔ اگر کوئی آدمی کسی خاص حوالے سے ان کی علمی تاویل کرے تو اسے کفر تو نہیں کہا جا سکتا' لیکن یہ گمراہی تو پھر بھی ہوگی۔ اسلئے کہ ہم کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ متواتر روایت میں کہیں غلطی رہ گئی ہو۔ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تواتر سے "اَرْجُلَكُمْ" پڑھتے رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ یہی وہ روایت ہے جس کو ہمیں قبول کرنا ہوگا۔ دوسرے جو قرآء کی مختلف روایات ہم تک پہنچی ہیں' ان میں بھی جو قرأت تواتر سے ثابت ہے' وہ اَرْجُلَكُمْ کی ہے۔ نیز آنحضرت ﷺ کا خود پاؤں دھونا بھی تواتر سے ثابت ہے جبکہ ایک دفعہ بھی حضور اکرم ﷺ کا مسح کرنا ثابت نہیں' ظاہر ہے ہم اسی پر عمل کریں گے۔ رہی یہ بات کہ یہاں قرآن کریم نے آخر اسے بعد میں کیوں ذکر کیا؟ تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہمیں یہ بات بتانا مقصود ہے کہ جس طرح چہرے کا دھونا' ہاتھوں کا کہنیوں تک دھونا' سر کا مسح کرنا اور پھر پاؤں کا دھونا فرض ہے' اسی طرح اس کی بیان کردہ ترتیب بھی ضروری ہے۔ اسی ترتیب کی طرف اشارہ کرنے کے لئے وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ کو درمیان میں لایا گیا۔ اگر اسے بعد میں لے جایا جاتا تو پھر ترتیب کا ذکر نہ ہو پاتا۔ اس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ ترتیب فطری بھی ہے اور شرعی بھی ہے یعنی شریعت اور قرآن کریم نے بھی اسے لازم کیا ہے اور فطری ترتیب بھی یہی ہے کہ آپ پہلے منہ دھوئیں' پھر ہاتھ دھوئیں' پھر سر کا مسح کریں' پھر پاؤں دھوئیں۔ بالکل یہی ترتیب قرآن کریم نے ملحوظ رکھی ہے' اس ترتیب کو ذکر کرنے کیلئے اس کو درمیان میں ذکر کیا گیا ہے۔ کوئی آدمی کہہ سکتا ہے "عربیت" کے لحاظ سے اگر اسے "اَرْجُلِكُمْ" لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھ لیا جائے تو کیا حرج ہے؟ حرج یہ ہے کہ صحیح عربی زبان کا ذوق اسے قبول نہیں کرتا کیونکہ جہاں بھی مسح کا حکم دیا جاتا ہے اس کے ساتھ یہ ذکر نہیں کیا جاتا کہ مسح کہاں تک کرنا ہے؟ دھونے میں تو ابتداء و انتہاء کا ذکر ہے' مسح میں نہیں۔ مثلاً دیکھئے! اس کے بعد اسی آیت میں آگے آ رہا ہے:

Marfat.com

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ﴿اگر تم بیمار ہو سفر میں ہو بیت الخلاء سے آئے ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمہیں پانی نہیں ملتا تو پاک مٹی کا قصد کرو وہ اس طرح کہ تم مسح کرو اپنے چہروں کا اور اپنے ہاتھوں کا﴾

غور کریں کہ یہاں ہاتھوں کے مسح کے حکم میں "اِلَى الْمَرَافِقِ" کے الفاظ نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ مسح میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ مسح کہاں سے کہاں تک کرنا ہے۔ "مسح" صرف ہاتھ پھیر دینے کا نام ہے۔ اسی طرح اگر "وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ" میں پاؤں کا مسح مقصود ہوتا تو اِلَى الْكَعْبَيْنِ کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ جیسے آگے چل کر آپ نے دیکھا کہ جہاں مسح کا ذکر آیا وہاں "اِلَى الْمَرَافِقِ" کے الفاظ کو ختم کر دیا گیا۔ مختصر یہ کہ پاؤں دھونے کا حکم امت تک متواتر سنت سے پہنچا ہے اور اَرْجُلَكُمْ (بالفتح) کی قرآت بھی تواتر سے ثابت ہے اور اعلیٰ عربیت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ یہ تین حوالے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ "اَرْجُلَكُمْ ہے اَرْجُلِكُمْ" نہیں یعنی مسح ہم صرف اپنے سروں کا کریں گے جہاں تک پاؤں کا تعلق ہے اسے دھویا جائے گا۔

حالت جنابت میں غسل کا حکم:

فرمایا: وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ "اگر تم حالت جنابت میں ہو تو پاک ہو جاؤ"۔

جُنُبًا کا مطلب ہوتا ہے: اجنبی اور بیگانہ۔ یہ واحد جمع، مذکر مؤنث سب میں ایک ہی حالت میں رہتا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور قرآنِ کریم نے بھی اس معنی میں اس کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ" (النساء:36)

﴿جو قریبی ہمسایہ ہے اس کے بھی حقوق ہیں اور جو اجنبی ہمسایہ ہے اس کے بھی حقوق ہیں﴾

تو یہاں "جُنُب" اجنبی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح یہ لفظ جو اجنبی کیلئے استعمال ہوتا ہے یہی جنابت والے کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جنابت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی شادی شدہ ہے اور وہ اپنی بیوی سے ہم بستری کرے اور جو شادی شدہ نہیں ہے وہ ویسے ہی ناپاک ہو جائے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ شخص حالت جنابت میں ہے اور اسے جنبی کہتے ہیں۔ یہاں فرمایا گیا کہ اگر تم میں سے کوئی جُنبی ہو جائے تو "فَاطَّهَّرُوْا" اب یہ بات کافی نہیں ہے کہ تم وضو کر لو ورنہ فَاطْهَرُوْا کہا جاتا۔ عربی کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی مصدر یا مادہ کے الفاظ میں کثرت کر دی جاتی ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ کثرت معنی پر دلالت کرتی ہے۔ یہاں پر بھی جب اسکے الفاظ میں کثرت ہوگی تو اس کا معنی یہ نہیں کہ آپ صرف وضو کریں بلکہ معنی یہ ہے کہ آپ غسل کریں یعنی اگر وضو ٹوٹ گیا ہے تو اس کیلئے تو وضو کافی ہے لیکن اگر جنابت ہو گئی ہے تو اب صرف وضو کافی نہیں بلکہ اب آپ کو غسل کرنا ہوگا۔ یہ تو وہ مفہوم ہے جو الفاظ بتاتے ہیں اور جہاں تک ان الفاظ کے حوالے سے آنحضرت ﷺ کا عمل اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عمل کا تعلق ہے وہ بھی اسی بات کی تائید کرتا ہے کہ جنابت میں صرف وضو کافی نہیں ہوتا بلکہ اس میں غسل کرنا ضروری ہے۔

تیمّم کی حالتوں کا بیان:

حدث اصغر ہو یا حدث اکبر یا حالت جنابت پاکیزگی کیلئے وضو یا غسل ضروری ہے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پانی دستیاب نہیں ہوتا یا کبھی ایسی

Marfat.com

مجبوری لاحق ہوتی ہے کہ پانی ہوتے ہوئے بھی استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ایسی صورت حال میں پاکیزگی حاصل کرنے کے کیا احکام ہیں اب ان کو ذکر کیا جارہا ہے۔

1- فرمایا:''وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى ''اگر تم بیمار ہو یعنی پانی تو ہے لیکن اس کا استعمال تمہیں مزید بیمار کرسکتا ہے۔اب تمہیں اس کے استعمال کی اجازت نہیں ہے یا یہ ضروری نہیں کہ تم اس کا استعمال کرو۔اگر تم بلاوجہ پانی استعمال کر کے اپنی بیماری کو بڑھادو گے اور اس سے اللہ نہ کرے تمہاری موت واقع ہو جائے تو تم اس کے ذمہ دار ٹھہرو گے۔حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص سفر میں سر پر چوٹ لگنے سے زخمی ہوگیا اور اس کا سر پھٹ گیا۔لیکن وہ ساتھ جُنبی بھی ہوگیا یا پہلے سے جُنبی تھا۔اب صبح کی نماز کا جب وقت ہوا تو اس نے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے؟سر پھٹا ہوا ہے پانی نقصان دے گا۔ان کو اس مسئلے کا علم نہیں تھا۔انہوں نے کہا کہ نماز پڑھنی بھی ضروری ہے اور اس کیلئے طہارت بھی ضروری ہے چنانچہ اسے نہلا دیا۔نہلانے سے اس کی تکلیف اتنی بڑھی کہ بالآخر اس کی موت واقع ہوگئی۔آنحضرت ﷺ کو علم ہوا تو آپ ﷺ اس قدر برہم ہوئے کہ فرمایا:اگر تمہاری بے علمی اور بے خبری تمہارا عذر نہ ہوتی تو میں تمہیں اس کے انتقام میں قتل کروادیتا۔تم نے ایک آدمی کی جان لے لی۔اس لئے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی حالت جنابت میں ہے اور ساتھ ہی بیمار بھی ہے اور اسے پانی تکلیف دیتا ہے تو اسے پانی استعمال نہیں کرنا چاہئے۔لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ طبیب اور ڈاکٹر سے رائے لے خود سے اس کا فیصلہ نہ کرے۔

2- فرمایا:اَوْ عَلٰى سَفَرٍ ''اگر آدمی سفر کی حالت میں ہو''۔اس میں بھی علماء اختلاف کرتے ہیں کہ بندے کا سفر کی حالت میں ہونے سے کیا مراد ہے؟مثلاً سفر اگر ہوائی جہاز کا ہے یا ٹرین کا ہے اعلان ہوتا ہے کہ جلدی جہاز یا ٹرین میں پہنچو اور ادھر آپ نے ابھی وضو کرنا ہے۔پانی میسر تو ہے لیکن اگر آپ وضو کرتے ہیں تو آپ کو فلائٹ کے نکل جانے یا کسی اور دشواری (Disturbance) کا خدشہ ہے۔اب بعض علماء کہتے ہیں کہ اس صورت میں اگر جلدی سے تیمم کرلیا جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں اس سے نماز پڑھی جاسکتی ہے جبکہ بعض علماء کہتے ہیں کہ چونکہ یہ کوئی حقیقی عذر نہیں ہے اس لئے اس وقت آپ یہ کرسکتے ہیں کہ نماز قضا کرلیں لیکن تیمم نہ کریں اور جب آپ پانی استعمال کرسکتے ہوں تو وضو کرنے کے بعد نماز ادا کریں۔

3- ''اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ'' غَائِطُ دراصل ''نشیبی زمین'' کو کہتے ہیں۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ دیہات میں رہتے ہیں ان کے ہاں ہمارے گھروں کی طرح گھروں کے اندر بیت الخلاء (Toilet) کا انتظام نہیں ہوتا وہ اپنی حاجت کیلئے باہر کھلی زمین پر جاتے ہیں۔اس مقصد کیلئے وہ ہمیشہ نشیبی زمین تلاش کرتے ہیں تاکہ نشیبی زمین میں اتر جائیں اور اپنے آپ کو چھپا کر رفع حاجت کریں تاکہ کسی دوسرے کی نگاہ ان کے ستر پر نہ پڑ سکے۔جب مدینہ منورہ میں یہ احکام نازل ہو رہے تھے تو یہ بھی گاؤں کی طرح کا ایک قصبہ تھا جس میں لوگ رفع حاجت کیلئے باہر جاتے تھے اور اس مقصد کیلئے وہ کھجوروں کے جھنڈ میں داخل ہوتے یا کوئی نشیبی زمین دیکھتے۔اسلئے عربی میں اس لفظ یعنی ''غائط'' کا استعمال عام ہوگیا جس کا ترجمہ ''جائے ضرورت'' کیا جاتا ہے۔

4- فرمایا: اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ ''یا تم نے بیویوں سے مباشرت کی ہو''۔ان تمام صورتوں میں اگر تمہیں پانی کی کمیابی کے باعث دوڑ دھوپ کے بعد بھی پانی نہ ملے اور نماز کا وقت نکل جانے کا اندیشہ ہو تو پھر تم تیمم کرلو۔

تیمّم کا طریقہ:

تیمم کے معنی قصد کرنے کے ہیں۔فرمایا پھر تم قصد کرو ''صَعِيْدًا طَيِّبًا'' پاک زمین کی سطح کا۔مراد یہ ہے کہ پاک (صاف) زمین پر ہاتھ

Marfat.com

یا زمین کی جنس سے جو چیزیں ہیں' ان میں سے کسی پر ہاتھ مار کر تیمّم کرو اور تیمّم یہ ہے: فَامْسَحُوْا بِوُجُوْھِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِنْهُ ﴿مسح کرو اپنے چہروں اور ہاتھوں کا اسی (زمین) سے﴾ اور سنت سے اس کا طریقہ جو ہمیں تواتر کے ساتھ ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ پاک مٹی پر ہاتھ مارو اور دونوں ہاتھ اپنے منہ پر پھیر لو پھر مٹی پر ہاتھ مارو اور اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر کہنیوں تک پھیر لو۔ اب اس میں ظاہر ہے کہ اگر ہاتھ پورا نہ بھی پھر سکا' کہیں کوئی جگہ رہ بھی گئی تو مسح پھر بھی ہو جائے گا۔ لیکن اگر وضو کرتے ہوئے کوئی جگہ خشک رہ جائے' تو وضو نہیں ہوتا۔ یہ تو ہیں احکام جن کا میں نے سادہ سے انداز میں ذکر کر دیا ہے' اس کے بعد اس کی حکمت کا بیان ہے۔

"مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ O" اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کر دے کہ تمہیں یہ کہے کہ وضو اور غسل میں تمہیں ہر صورت میں پانی استعمال کرنا ہے' چاہے تمہیں پانی ملے یا نہ ملے۔ ظاہر ہے یہ بہت بڑی تنگی کی بات ہے۔ فرض کریں سفر میں پانی دستیاب نہیں یا کوئی اور ایسی مجبوری ہو گئی ہے تو پھر آپ کیا کریں گے؟ اللہ نے اس میں سہولت پیدا کر دی۔

تیمّم سے مقصود روح کی طہارت ہے:

فرمایا اللہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں طہارت عطا کرے' تمہیں پاکیزہ بنا دے۔ یعنی نماز سے پہلے ضروری ہے کہ تمہیں پاکیزگی عطا کی جائے۔ پاک ہونے کیلئے ظاہر ہے پانی شرط ہے اور پانی ملتا نہیں تو پھر تیمّم کرو۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ مٹی مجھے کچھ گندا تو کر سکتی ہے' پاکیزہ کیا بنائے گی؟ لیکن یہ ایک احساس کہ اللہ کے سامنے گندگی کی حالت میں نہیں جایا جا سکتا' یہ احساس مٹی پر ہاتھ مارتے ہوئے' منہ اور ہاتھوں پر مٹی لگے ہاتھ پھیرتے ہوئے ضرور دل پر تطہیر کا عمل کرے گا کہ چلو مجھ سے جو بن پڑا' وہ تو میں نے کیا۔ یہ عمل آدمی کے اندر طہارت اور تطہیر کو بروئے کار لاتا ہے اور یہی دراصل مقصود ہے۔ فرمایا کہ اگر ہم تمہیں یہ حکم دیتے کہ ہر صورت میں تمہیں پانی استعمال کرنا ہے' پھر اگر پانی نہ ملتا' بالخصوص عرب کی دنیا میں' تو تم ایک مصیبت میں پڑ جاتے۔ اب ہم نے تمہیں سہولت عطا کر دی اور اس کے ساتھ ساتھ مزید یہ نعمت عطا کی کہ مسائل طہارت کے حوالے سے احکام شریعت کو مکمل کر دیا۔ جہاں تک اہل کتاب کا تعلق ہے' وہ اس کے دور دور تک قائل نہیں تھے بلکہ وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ جب تیمّم کے یہ احکام نازل ہوئے تو انہوں نے یہاں تک کہا کہ تم اس حد تک بگڑے ہوئے لوگ ہو کہ تم سے تو مشرکین مکہ اچھے ہیں' کم از کم وہ یہ حرکت تو نہیں کرتے کہ ناپاکی کی حالت میں مٹی استعمال کرنا شروع کر دیں۔ انہوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا' حتیٰ کہ اس کا اثر اوس اور خزرج تک نے لیا۔ جب ان کے سردار حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ حضور ﷺ! حالت جنابت میں تیمّم اور عورتوں کا مخصوص ایام میں گھر کی زندگی میں شرکت وغیرہ شرعی سہولتوں کا یہود بہت مذاق اڑاتے ہیں اور طعن و تشنیع سے کام لیتے ہیں۔ کیا آپ ہمیں اس کی اجازت دیں گے کہ جب ہم ان کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں تو ہم ان باتوں پر عمل نہ کریں؟ اس بات سے آپ اندازہ کریں کہ مدینے کے رہنے والے لوگوں پر ان کی تہذیب کی گرفت کس قدر شدید تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب انہوں نے یہ بات پوچھی تو حضور ﷺ کے چہرے پر اس قدر ناگواری ظاہر ہوئی (کہ آپ کا چہرہ مبارک غصے سے دمکنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چہرہ مبارک پر انار نچوڑ دیا گیا ہے)۔ اس پر سعد بن معاذ اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ فوراً وہاں سے اٹھ گئے۔ آپ اپنی برہمی سے یہ تأثر دینا چاہتے تھے کہ اگر تم یہود کی تہذیبی گرفت نہیں توڑ سکتے تو دنیا کی تہذیبوں کی بالادستی کا اثر کیسے ختم کرو گے؟ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تہذیب' اپنے طور اطوار اور اپنے آداب زندگی کو بالادست بنانا اسلام کا عین مطلوب ہے' چاہے وہ وضو اور طہارت کے حوالے سے ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ اس کے بغیر تکمیل شریعت اور اتمام نعمت کا عمل بے معنی ہو کر رہ جائے گا حالانکہ یہی وہ احسان خداوندی ہے جس کا بندوں پر شکر لازم ہے۔

Marfat.com

آیت:۷ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ O ﴿اور اللہ نے جو تم پر احسان کئے ہیں ان کو یاد کرو اور اس عہد کو بھی جس کا تم نے قول (اقرار) کیا تھا۔ جب تم نے کہا تھا! ہم نے (اللہ کا حکم) سن لیا اور قبول کر لیا اور اللہ سے ڈرو' کچھ شک نہیں کہ اللہ دلوں کی باتوں تک سے واقف ہے﴾

مسلمانوں پر اللہ کی سب سے بڑی نعمت:

اس کے بعد فرمایا: تم یاد رکھو اللہ کی اس نعمت کو جو اس نے تم پر کی ہے۔ وہ نعمت تکمیلِ شریعت کی نعمت ہے۔ یہ اللہ کی وہ نعمت ہے جو کسی پچھلی امت کو عطا نہیں ہوئی۔ فرمایا کہ اگر تم اللہ کی اس نعمت کی قدردانی کرنا چاہتے ہو تو نہ صرف تم اس نعمت کو برابر یاد رکھو بلکہ محسوس کرو کہ یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے یہ نعمت عطا کی ہے۔ اب اگر یہ بات یاد رکھو گے تو اس پر عمل کرتے ہوئے تمہیں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوگی۔ میں یہاں اس کا ترجمہ ''یاد کرو'' نہیں ''یاد رکھو'' کر رہا ہوں۔ قرآن نے اور بھی کئی جگہ اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ میں ہر جگہ اس کا یہی صحیح ترجمہ سمجھتا ہوں' یا کم از کم مکمل ترجمہ سمجھتا ہوں۔ مثلاً وہ کہتا ہے:

''فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ'' ﴿تم مجھے یاد رکھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا﴾ (البقرۃ:152)

اگر تم مجھے یاد نہیں رکھو گے تو آگے آپ خود پُر (Fill up) کر لیجئے کہ کیا ہوگا؟ کلام کے یہ تیور ''یاد رکھنے'' کے ترجمہ سے پیدا ہوتے ہیں' ورنہ نہیں۔ صرف یہ نہیں کہ تم مجھے یاد کرو' میں تمہیں یاد کروں گا بلکہ تم مجھے یاد رکھو گے' تو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ اگر تم مجھے بھول گئے' تو جیسے تاثیر نے کہا تھا کہ

بھولنا مت تاثیر کی باتیں بھول گئے تو یاد کرو گے

دوسری بات جو خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے وہ یہ کہ: ''وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ'' اس میثاق کو کبھی نہ بھولنا' ہمیشہ یاد رکھنا جس کو اللہ نے تم سے مضبوطی سے لیا ہے۔ یہ میثاق دوہرا ہے: ایک حصہ یہ ہے جو اس آیت میں بیان ہوا ہے' دوسرا اگلی آیات میں آ رہا ہے۔ یہ باہم بڑی مربوط آیتیں ہیں' پتہ نہیں ہم انہیں الگ الگ کیوں سمجھ لیتے ہیں۔ اگلی آیات میں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم اسے یاد رکھو گے' تو یہ چیزیں تمہیں ملیں گی اور اگر یاد نہیں رکھو گے' اللہ کی نعمت نہیں جانو گے' تو جہنم والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

ہمارا اللہ سے کیا ہوا عہد:

یاد رکھنے کی چیزیں یہ ہیں ایک اللہ کی شریعت کا اتمام (تکمیل دین) ہونا اور دوسرا یہ کہ تم اسلام کے دائرے میں کیسے داخل ہوئے ہو؟ بے شمار لوگ ایسے ہیں جو اسلام کے دائرے سے باہر ہیں جبکہ اللہ نے تمہیں یہ توفیق بخشی ہے کہ تم اسلام قبول کر چکے ہو۔ اسلام قبول کرنا اصل میں ایک عہد اور میثاق ہے اور وہ اس طرح کہ جب تم نے کہا:

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

﴿میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ یا اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں﴾

تیری قدرتوں سے بالا کسی کی قدرت نہیں' تیرے حکم سے بڑھ کر کسی کا حکم نہیں۔ ظاہر ہے جب تیری قدرت بے پناہ ہے تو تیری قدرت

Marfat.com

سامنے جھکنے کی بجائے کسی اور کے سامنے کیوں جھکوں؟ تیرے در کے سوا کسی اور کے در پر کیوں جاؤں؟اس لئے کہ جب میں تجھے ''اللہ'' مان چکا تو کسی اور سے تعلق پیدا کرنا میرے لئے ناروا بات ہے۔ کہا: دیکھنا! یہ جو تم نے ایک معاہدہ کرلیا ہے' یہ بڑا کٹھن معاہدہ ہے' یہ آسان نہیں ہے۔ آدمی کی پوری زندگی ایک دوسرے ڈگر پر پڑ جاتی ہے' پہلی زندگی میں تو آدمی کبھی شیطان سے تعلق جوڑتا ہے' کبھی طاغوت سے اور نجانے کس کس اقتدار سے پینگیں بڑھاتا ہے۔ کبھی نفسِ انسانی کی خواہشات کی پیروی کرتا ہے۔ کبھی وہ نجانے کن کن آستانوں پر سر جھکاتا ہے۔ لیکن جب وہ لا الہ الا اللہ کہہ دیتا ہے تو ہر آستانہ ٹوٹ جاتا ہے۔ بالکل ایک نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اگر کوئی اسے اپنے سامنے جھکانا چاہے تو وہ اسے پاؤں کی ٹھوکر پر رکھتا ہے' کہ تم کون ہو؟ پھر وہ دنیا کا بے پناہ قوت والا انسان بن کر اٹھتا ہے۔ پھر اس کا سر صرف اسی بڑی قوت والے کے سامنے جھکتا ہے' باقی تو اس کی نگاہ میں کٹھ پتلیوں کے تماشے ہیں' جن کی اس کی نگاہ میں ذرہ بھر بھی حقیقت و وقعت نہیں ہوتی۔ جیسے ہم نے دیکھا کہ ایران اور روما اُس وقت کی سپر طاقتیں تھیں۔ لیکن جب مسلمان ان کے درباروں میں پہنچے تو کس بے اعتنائی اور بے نیازی سے گئے۔ ربعی ابن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب رستم سے ملنے کیلئے تشریف لے گئے تو اس نے آپ کے استقبال کیلئے دربار کو بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے سجایا' بڑے دبیز قالین بچھائے گئے' بڑے خوبصورت شامیانے تانے گئے' بڑے بڑے تکیے رکھے گئے۔ آپ ایک چھوٹے قد کے گھوڑے پر سوار تھے' ایک بڑے تکیے کا فیتہ نکالا اور اس سے اس کو باندھ کر آگے بڑھے' ان کے ہاتھ میں نیزہ تھا وہ نیزے کی ''انی'' کو اس طرح مارتے ہوئے گئے کہ جگہ جگہ سے قالین پھٹتا چلا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں پرواہ ہی نہیں کہ میں کہاں ہوں۔ جا کر کہا: السلام علیکم۔ وہ حیران ہوئے کہ یہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے ان کی گردن جھکانا چاہی تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گردن اکڑا لی اور کہا کہ میں تمہارا مہمان بن کر آیا ہوں اور تمہیں اگر اس طرح میرا آنا منظور نہیں ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ پھر رستم سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہم لوگ تو اس کے عادی نہیں ہیں کہ ایک آدمی تخت پر خدا بن کر بیٹھے اور باقی لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں۔ ہم تو برابری کے قائل ہیں۔ انسانی تفریق اور اونچ نیچ کو ہم بالکل گوارا نہیں کرتے۔ جب اس تمام گفتگو کا ترجمہ کیا گیا تو یہ ان کیلئے بالکل نئی باتیں تھیں۔ دربار میں سناٹا طاری ہو گیا کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟ اس واقعے کو بیان کرنے کا اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ جن لوگوں نے اس عہد و میثاق سے اپنا تعلق جوڑا اور جب تک انہوں نے اس کو یاد رکھا' وہ دنیا کی سب سے بڑی قوم اور دنیا سے بے نیاز افراد تھے۔ وہ کسی سے ڈرنا' کسی کے سامنے خم ہونا جانتے ہی نہ تھے۔ وہ صرف یہ جانتے تھے کہ ایک ہی ذات ہے جس کے سامنے سر جھکایا جا سکتا ہے' جس سے مانگا جا سکتا ہے' جس سے امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ رہی یہ بات کہ کس کا طریقہ اختیار کیا جائے' وہ بھی ذات ایک ہی ہے جس کا نام نامی ﴿ محمد ﷺ ﴾ ہے۔ ان کے سوا ہم اور کسی کا اتباع نہیں کریں گے کیونکہ وہی ایک ذات ہے جو دانائے سبل ختم الرسل اور مولائے کل ہے۔ اسے چھوڑ کر ہم سایوں کے پیچھے کیوں بھاگیں۔ مختصر یہ کہ عہد سے وابستگی اور اتباعِ رسول ہی ان کی قوت کا سرچشمہ اور شریعت پر عمل کو آسان کرنے کا ذریعہ تھا۔

تم بھی جب تک اس عہد سے وابستہ ہو اور یہ تمہارے دلوں کی رونق اور زندگی ہے تو سمجھ لو یہ چیزیں تمہیں دشوار نہیں لگیں گی بلکہ پھر تم لپکتے ہوئے ان چیزوں پر عمل کرو گے۔ لیکن اگر یہ عہد و پیمان ہی مرجھا کر رہ جائے تو پھر اس شریعت پر عمل کرنا انتہائی دشوار لگتا ہے۔ اسی لئے اس عہد و پیمان کی بار بار تازگی کیلئے اور اللہ سے اس عہد وفا کی تجدید کیلئے نماز فرض فرمائی کیونکہ نماز عملی طور پر ایک ایسی مشق ہے جس میں توحید کا اقرار ہے' اس کی بنیاد ہی اللّٰہ اکبر ہے' یہ ہماری ساری کوتاہیوں کا علاج ہے یعنی میں کسی کے سامنے جھکتا کیوں ہوں؟ اس لئے کہ اسے بڑا مانتا ہوں۔ میں کسی کے سامنے ہاتھ کیوں پھیلاتا ہوں؟ اس لئے کہ اسے بڑا مانتا ہوں۔ کسی کی فرمانبرداری کیوں کرتا ہوں؟ اس لئے کہ اسے بڑا مانتا ہوں۔ میں کسی سے ڈرتا کیوں ہوں؟ اس لئے کہ

Marfat.com

اسے بڑا مانتا ہوں۔ کسی کی تہذیب پر کیوں چلنا چاہتا ہوں؟ اس لئے کہ اس کی تہذیب کو میں ایک بڑی تہذیب سمجھتا ہوں۔ جب میں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لوں کہ بڑائی تو صرف اللہ کو زیب دیتی ہے' اس کے سوا کوئی بڑا نہیں اور وہ بہ ہمہ وجوہ اور بہ ہمہ جہت بڑا ہے' کسی ایک حوالے سے نہیں' تو میرے سارے خدشات خود بخود دور ہو جائیں گے اور ہم اس کی پریکٹس نماز کے ذریعے کرتے ہیں۔ جب ہم ''اللہ اکبر'' کہہ کر نماز شروع کرتے ہیں یعنی میں تھکا ہارا آ کر جب مسجد میں یہ کہتا ہوں ''اللہ اکبر'' تو ساری دنیا کو دھتکار کر صرف اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اب بتایئے! میرا رشتہ کس سے ہے؟ ایک قطرہ جو سمندر سے باہر ہے' اسے ایک چھٹانک ریت بھی چوس سکتی ہے۔ جب وہ قطرہ سمندر میں گر جاتا ہے تو وہ سمندر کا ایک حصہ ہے جو سمندر کی طاقت ہے' وہ اس قطرے کی طاقت ہے۔ جب میں اللہ سے وابستہ ہو جاتا ہوں تو میرا رشتہ اب اللہ سے جڑ گیا۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں' کارکشا و کارساز

بندہ تو بندہ ہی رہتا ہے' لیکن جب وہ اس رشتے کو اوڑھ لیتا ہے تو پھر وہ رشتہ اس کا بھرم قائم رکھتا ہے۔ پھر وہ اسے کہیں ڈولنے نہیں دیتا' کسی کے سامنے سرنگوں نہیں ہونے دیتا۔

یہ تو ہے ہمارا عہد و پیماں جو ہم میں سے ہر ایک فرد نے' صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر آج تک جس نے بھی اپنے آپ کو مومن کہا' اللہ سے اپنا تعلق جوڑا اس نے یہ عہد و پیماں کیا اور نماز سے ہم پانچ وقت اس عہد و پیماں کی تجدید کرتے ہیں تا کہ یہ تعلق کہیں کمزور نہ ہونے پائے۔ لیکن بطور امت مسلمہ کے ہمارا ایک تشخص بھی ہے۔ ہم ہر وقت اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں' اس کے نمازی ہیں۔ اکثر ہم سے کہا جاتا ہے کہ خدائی فوجدار بننے کی کیا ضرورت ہے؟ یاد رکھئے! ہم خدائی فوجدار ہیں۔ یہ تو ہمارے افراد کی قوت ہے' لیکن امت کے حوالے سے اور اجتماعی حیثیت سے ہمارا ایک تشخص ہے۔ ان دونوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا گیا ہے تا کہ ہم اسے کبھی نہ بھولیں کہ افراد اس وقت تک کام کے ہیں جب تک وہ اجتماعی تشخص کا حصہ ہوں اور اگر وہ الگ الگ ہیں تو بکھری ہوئی موجیں ہیں' جنہیں کہیں بھی ریت چوس سکتی ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

فرد جب تک ملت کی آرزوؤں' امنگوں' مقاصد اور اہداف کے ساتھ قائم رہے' اس کا بھی تشخص قائم رہتا ہے۔ اگر وہ کٹ کر ایک نیا راستہ بنا لے تو پھر یہ صرف ایک فرد رہ جاتا ہے بے سہارا اور اجنبی۔ یہی بات یہاں کہی گئی ہے کہ تم افراد تھے' اب جب تم نے عہد و پیمان کر لیا ہے' اس کے بعد تم ایک امت بن گئے ہو۔ اب تمہارا ایک الگ تشخص ہے۔

آیت:۸ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُونُوا۟ قَوَّٰمِينَ لِلَّهِ شُهَدَآءَ بِٱلْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَـَٔانُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا۟ ۚ ٱعْدِلُوا۟ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ○ ﴿اے ایمان والو! اللہ کیلئے انصاف کی گواہی دینے کو کھڑے ہو جایا کرو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہارے سب اعمال سے خبردار ہے﴾

Marfat.com

بحیثیت امت مسلمہ ہماری اصل ذمہ داری:

مسلمانو! تم انصاف کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جاؤ جس طرح تم اللہ کے فرمانبردار بندے بن کر صرف اسی کے سامنے جھکتے ہو اسی طرح تمہارا کام انصاف کی علمبرداری بھی ہے۔ تم اللہ کے سامنے جتنا جھکو گے اللہ تمہیں اتنا ہی سربلند کرے گا اور تمہاری یہ سربلندی انصاف کو دنیا میں عام کرنے کیلئے ہوگی اور یہ انصاف کو عام کرنا" لِلّٰهِ شُهَدَآءَ " اللہ کے گواہ کی حیثیت سے ہوگا کیونکہ اللہ نے ہمیں عدل کی حکمرانی کیلئے چنا ہے۔ ہم جب انصاف عام کریں گے تو گویا اللہ کی صفتِ (عدل) کی گواہی دیں گے اور یہ گواہی دیتے ہوئے اگر کبھی ہمیں سر کٹوانے تک بھی جانا پڑے تو ہم اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے اور اگر کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس تعلق کو نبھانے کی پوزیشن میں نہیں یا نبھانا نہیں چاہتے۔ اقبال نے اس کو بڑی خوبصورت تعبیر دی ہے

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی، ز خاکی بیش ازاں خواہی

بندگی کا مقام فرشتوں کو ملا ہے اور ہم نمازیں پڑھتے ہوئے اس پر عمل کرتے ہیں۔ بندے ہم بھی ہیں، لیکن صرف بندے نہیں، ہم اجتماعی زندگی میں کچھ اور بھی ہیں۔ لیکن فرشتے صرف بندے ہیں، وہ بندگی سے انحراف کر ہی نہیں سکتے۔ ان کی کوئی اجتماعی زندگی نہیں ہے بلکہ جہاں جہاں، جس جس فرشتے کو جس عمل پر لگا دیا گیا ہے وہ صرف وہی کام کر رہا ہے، اگر وہ قیام میں ہے تو قیام میں ہی اس کی ساری زندگی گزرے گی، اگر قعود میں ہے تو قعود میں ہی اس کی ساری زندگی کٹے گی اور کسی دوسری ڈیوٹی پر ہے تو وہ تمام عمر وہیں پر لگا رہے گا۔ لیکن یہ دیکھنا کہ مجھے اجتماعی زندگی کا حصہ بن کر کیا کرنا ہے؟ کہا: تمہارا ایک مقام تو بندگی کا ہے اور دوسرا مقام یہ ہے کہ تم صرف بندے ہی نہیں ہو بلکہ تم اللہ سے عشق کا دعویٰ بھی کرتے ہو۔ لہٰذا فرشتوں سے اللہ صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی بندگی کریں، مگر تم سے اللہ کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ مسلمانوں سے اللہ کے اس تقاضے کو اقبال یوں بیان کرتا ہے کہ

ازاں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا
شہادت بر وجودِ خود زخونِ دوستاں خواہی

کہا: وہ اپنی ساری بے نیازیوں کے باوجود چاہتا یہ ہے کہ جو اس کے دوست اور نام لیوا ہیں، جنہوں نے اس کا دین قبول کیا ہے اور" سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا " کہہ کر اپنا نام اس کے دوستوں کی فہرست میں لکھوا لیا ہے، جو اپنے آپ کو مومن اور مسلم کہتے ہیں، ان سے اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ جواب تک میرا نام لے کر مجھے یاد کرتے رہے ہیں اور لوگوں کو بتاتے رہے ہیں کہ اللہ ہے، اب میں انہیں یہ کہتا ہوں کہ اگر تمہیں خون کا آخری قطرہ بہا کر بھی یہ ثابت کرنا پڑے کہ اللہ ہے، تو تمہیں اس سے بھی دریغ نہیں کرنا۔ نوریوں سے اس کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ تم خون کا آخری قطرہ بہا ڈالو اور تم اس راستے میں اپنی جانیں دو بلکہ اس کا یہ تقاضہ خاکیوں سے ہے کہ تم سے میرا تعلق صرف آقا اور ملازم کی حد تک نہیں، اگر میرے دین کی بالادستی کیلئے تمہیں کبھی تصادم کی حد تک بھی جانا پڑے، جس میں تمہیں اپنی جان دینی، سر کٹوانا پڑ جائے تو اللہ اس کا مطالبہ اپنے عاشقوں سے کرتا ہے کہ وہ میرے عشق میں اپنی جانوں کے نذرانے دیں۔ تو ہم سے بھی اس بات کا مطالبہ اس وقت ہوگا جب ہم دنیا میں عدل کی حکمرانی قائم کرنے کیلئے اٹھیں گے۔ کہا: تمہارا کام یہ ہے کہ تم اللہ کے گواہ بن کر انصاف کی علمبرداری کیلئے اٹھو۔ تم خود تو بے انصافی کیا کرو گے، کہیں اور بھی بے انصافی کی اجازت ہرگز مت دینا۔ اگر دنیا میں کہیں بے انصافی ہوتی ہے اور تم بے انصافی کرنے والوں کے معین بن جاتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے جو عہد کیا تھا، تم اس پر قائم نہ رہے۔ تم تو " سَمِعْنَا

Marfat.com

وَاَطَعۡنَا'' کا بھی انکار کر رہے ہو چہ جائیکہ کہ تم عدل کی حکمرانی کیلئے اپنا فرض انجام دو۔

یہ آیت سورۃ النساء میں بھی گزری ہے۔ اس میں پہلی بات تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک دوسرے پیرائے میں کہی گئی ہے' وہاں فرمایا تھا: ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ'' (النساء:135) مسلمانو! تمہیں انصاف کا گواہ بن کر اٹھنا ہے اور انصاف کی علمبرداری قائم کرنی ہے۔ اس سلسلے میں یہ ہوسکتا ہے کہ جب تم انصاف کی گواہی دینے کیلئے اٹھو تو یہ تمہاری اپنی برادریوں اور خود تمہارے یا تمہارے والدین کے خلاف ہو۔ ہوسکتا ہے تمہارے اقرباء کے خلاف ہو' لیکن تمہیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ عدل اور انصاف کیا ہے؟ بات جس کے بھی خلاف جائے' تمہیں فیصلہ وہی کرنا ہے جو اسلام چاہتا ہے۔

دو چیزیں سب سے زیادہ عدل وانصاف کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ 1- اپنوں کے رشتے اور 2- دوسروں کی دشمنی۔ فرمایا: اگر اپنوں کے رشتے بھی راستے میں رکاوٹ بنیں تو دیکھنا! اس کی پرواہ نہیں کرنا' اگرچہ تم خود بھی اس کا ہدف کیوں نہ ہو' چاہے اس کی ضرب اپنے پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ جیسے آنحضرت ﷺ نے فاطمہ بنت قیس کے مقدمے میں فرمایا تھا' جس کی سفارش کی گئی تھی کہ یہ قیس کی نوجوان لڑکی ہے' آپ اسے چھوڑ دیں۔ اس پر حضور اکرم ﷺ نے برہم ہوکر فرمایا تھا کہ یہ تو فاطمہ بنت قیس ہے' اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کا ارتکاب کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ اس لئے قرآن کریم یہ کہتا ہے: ''وَلَوۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَوِ الۡوَالِدَیۡنِ وَالۡاَقۡرَبِیۡنَ'' چاہے ضرب تمہارے اپنے آپ پر' اپنے والدین پر اور اپنے عزیزوں پر کیوں نہ پڑتی ہو' تمہیں بہرحال انصاف کو نافذ کرنا ہے۔ اسی طرح اگر تم انصاف کیلئے اٹھتے ہو اور دیکھتے ہو کہ انصاف کا فائدہ میرے دشمن کو پہنچ رہا ہے' اب بھی انصاف کو بروئے کار لاؤ گے' چاہے دشمن کو فائدہ ہو اور تمہارے اپنوں کو نقصان پہنچے۔ یہاں فرمایا: مسلمانو! عدل کے قائم کرنے والے' اللہ کے گواہ بن کر اٹھو یعنی تم خدائی فوجدار بن کر اٹھو کیونکہ یہ تمہارا اپنا کام نہیں بلکہ اللہ کا کام ہے۔

مسلمانوں کا مقصد جہاد:

وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ''اور تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کسی قوم کی دشمنی کہ تم عدل کرنے سے رک جاؤ''

اگر دشمن قوم کا کوئی معاملہ ہو اور تم دیکھو کہ اس سے فائدہ دشمن قوم کو پہنچ رہا ہے تو لوگوں کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم عدل سے ہاتھ روک لو۔ یہ جو قرآن کریم کہتا ہے کہ دشمنوں کا معاملہ بھی ہو' تب بھی عدل کرو۔ یہ صرف ایک نصیحت نہیں بلکہ مسلمانوں نے اس پر عمل کرتے ہوئے عدل کی ایسی ایسی مثالیں قائم کی ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ روس کی جو چھ ریاستیں آزاد ہوئیں' یہ وہ علاقہ ہے جسے ولید بن عبدالملک اور سلیمان بن عبدالملک کے زمانے میں مسلمانوں نے فتح کیا۔ جب یہ علاقہ فتح ہوگیا اور اس کے بعد عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ آیا تو ان کو اس علاقے کے مذہبی رہنماؤں کی طرف سے ایک شکایت پہنچی کہ جب مسلمان کسی علاقہ پر چڑھائی کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ پیغام دیتے ہیں کہ یہ (اللہ کا دین) ایک ہوا ہے' جسے روک کر بیٹھے ہو' یہ ایک روشنی ہے' جس کے تم دشمن بن گئے ہو۔ تم اللہ کے اس دین کو قبول کرلو تو ہمارے بھائی ہو یا دوسروں کے لئے راستہ خالی کردو' حکومت ہمارے حوالے کردو اور تم ہمیں اپنی حفاظت کے بدلے ایک ٹیکس دو' جس کا نام جزیہ ہے (یہ بالعموم زکوۃ سے کم ہوتا ہے)۔ اس کے بدلے ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے کہ تم فوجی خدمت سرانجام دو' جبکہ مسلمان زکوۃ بھی دے گا اور فوجی خدمت بھی سرانجام دے گا۔ اگر وہ لوگ ٹیکس دینے پر آمادہ ہوجائیں' پھر ان سے حکومت تو لے لی جاتی ہے' مگر پھر ان کی ہر طرح سے حفاظت کی جاتی ہے۔ اگر وہ اس کیلئے بھی تیار نہ ہوں اور کہیں کہ ہم تو لڑیں گے اب یہ آخری مرحلہ ہے جس میں مسلمان لڑنے کیلئے تلوار نکالتا ہے۔ پھر تلوار جو فیصلہ کرتی ہے' وہی ہوتا ہے۔ کہا: یہ ہے وہ شریعت' جس کو ہم نے آپ

Marfat.com

پیغمبر کی تعلیم کی روشنی میں سمجھا ہے۔ لیکن جب آپ کی فوجیں ہمارے علاقے میں آئیں تو انہوں نے ہمیں اس قسم کا کوئی نوٹس نہیں دیا کہ ہماری یہ شرائط مان لو ورنہ ہم آپ پر حملہ کریں گے۔ وہ ایک طوفان کی طرح آئے اور ہمیں روندتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ہم جانتے تو تھے کہ اسلامی افواج چلی آ رہی ہیں' ہم اس کے مقابل تیار بھی تھے' لیکن انہوں نے اپنے پیغمبر کی اس ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ انہوں نے ہمیں روند ڈالا اور سارا علاقہ فتح کر لیا۔ اب یہ اسلامی مملکت کا ایک حصہ تو ہے' لیکن اس میں وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو کرنا چاہئے تھا۔ اس لئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس علاقے کے فتح کرنے میں بے انصافی سے کام لیا گیا ہے۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس یہ شکایت پہنچی تو آپ نے اس علاقے کے گورنر کو لکھا کہ صحیح صورت حال کے بارے میں مطلع کریں۔ وہ سچے لوگ تھے' انہوں نے لکھا کہ یہ جو شکایت کی گئی ہے' یہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے' مسلمانوں کی آبادیاں بس گئیں' مساجد بن گئیں' رشتے قائم ہو گئے اور پراپرٹیز بن گئیں۔ مسلمانوں کو یہاں رہتے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا۔ اب یہاں مسلمانوں کی حکومت ہے۔ بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اب ان باتوں سے کیا فائدہ؟ چند دنوں کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز کی جانب سے حکم آیا کہ مسلمانو! تم نے سنت محمدی ﷺ پر عمل نہ کر کے بہت بڑی خیانت کی ہے۔ تم نے ایک جرم کیا ہے اور میں چونکہ عدل قائم کرنے کیلئے اٹھا ہوں' میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ اسلئے تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اپنی فوجیں لے کر اس سارے علاقے سے اتنی دور نکل جاؤ کہ اگر دوبارہ انہیں تمہارا مقابلہ کرنا پڑے' تو وہ تیاری کر سکیں۔ اس حکم کے بعد سینکڑوں میل کا علاقہ مسلمانوں نے اپنی قلمرو سے نکال دیا اور وہاں سے فوجیں لے کر بہت دور نکل گئے۔ انہیں موقع دیا گیا کہ تم جب تک تیاری کرنا چاہتے ہو' کر لو۔ چنانچہ جب ان کی تیاریاں مکمل ہو گئیں' اب ان کے سامنے پورا طریقہ (Process) بروئے کار لایا گیا اور ان کے سامنے اسلام پیش کیا گیا کہ اب بتلاؤ کیا کہتے ہو؟ اسلام کی برکتوں کا ذکر کیا گیا اور وہ چونکہ مسلمانوں کو پہلے بھی دیکھ چکے تھے کہ یہ ہیں کیسے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تو کچھ لوگ مسلمان ہوئے تھے اور کچھ نہیں ہوئے تھے' اب جب اس طریقہ (Process) پر عمل کیا گیا تو ایک آدمی بھی ایسا نہ بچا جسے اللہ نے اسلام کی توفیق نہ دی ہو۔

یہ تھا مسلمانوں کا طرز عمل جب وہ دنیا میں بالادست قوت تھے' وہ نہ صرف غریبوں کو انصاف دیتے تھے بلکہ انہوں نے انصاف کی حکمرانی قائم کی تھی۔

عدل کے بغیر تقویٰ ممکن نہیں:

فرمایا کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر مجبور نہ کرے کہ تم عدل چھوڑ بیٹھو۔ عدل کرو کہ یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ تقویٰ اصل میں پورے دینِ اسلام کی روح ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو مسلمانوں میں پیدا کرنا مقصود ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ عقائد' عبادات اور معاملات کے حوالے سے آدمی اللہ سے ڈرنے لگے اور کبھی اس کی نافرمانی کا سوچ بھی نہ سکے۔ یہ روح پیدا کرنا تقویٰ کہلاتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ اگر تم اجتماعی زندگی میں تقویٰ پیدا کرنا چاہتے ہو تو یاد رکھو! وہ کبھی عدل کی حکمرانی کے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔ ایک غریب کو اگر انصاف نہیں ملے گا تو وہ تقویٰ کہاں سے سیکھے گا؟ ایک جج عدالت میں بیٹھ کر انصاف نہیں کرتا تو وہ کہاں کا متقی ہے؟ گواہ جھوٹی گواہیاں دیتے ہیں تو ان میں تقویٰ کہاں سے آئے گا؟ استاد اپنی تعلیم کو عبادت کی بجائے تجارت سمجھتا ہے تو اس میں تقویٰ کہاں ہے؟ اگر تم ہر شعبہ زندگی میں تقویٰ لانا چاہتے ہو تو ضروری ہے کہ عدل کی حکمرانی ہو' انصاف کی بالادستی ہو۔ اگر عدل و انصاف نہیں ہوگا تو تمہاری زندگیوں میں تقویٰ ہرگز نہیں آ سکے گا؟ اس طرح اسلام کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ کا تقویٰ پیدا ہو۔ رہی یہ بات کہ تم کہو کہ ہم متقی ہیں۔ تو یاد رکھو! تمہارے کہنے سے کیا ہوگا؟ اللہ تو جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ تمہارے اعمال سے اس سے بڑھ کر کون

Marfat.com

واقف ہے۔وہ جانتا ہے تم میں تقویٰ کی حکمرانی ہے یا غیر تقویٰ کی۔

آیت:9 وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ O ''جولوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان کیلئے بخشش اور اجر عظیم ہے''۔

سمع واطاعت اور اجتماعی عدل پر اللہ کا وعدہ:

اوپر جو باتیں بیان فرمائی گئی ہیں ان کا نتیجہ یہاں بیان ہو رہا ہے کہ اگر تم اپنے اندر تقویٰ پیدا کرو گے اور وہ بھی اس طرح کہ عدل کی حکمرانی قائم کرنے کے بعد تم واقعی اپنے عہد و پیمان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر تازہ رکھو گے اور اگر تم نے پوری زندگی اس طرح اختیار کی کہ تم نے جو اللہ سے اقرار کیا تھا کہ یا اللہ! تیری سنیں گے اور تیری اطاعت کریں گے۔کسی اور کی نہ سنیں گے نہ اطاعت کریں گے۔جیسے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا:

لا طاعة لمخلوقٍ فی معصية الخالق ''خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہو سکتی''

چاہے وہ کتنا بڑا حکمران کیوں نہ ہو۔اطاعت صرف اللہ کی ہوگی۔حکمرانوں کی اطاعت صرف اس معاملے میں ہو سکتی ہے جب کہ وہ اللہ کے احکام کے مطابق حکم دیں۔فرمایا کہ اگر تم نے اقرار کیا اور اجتماعی عدل کے مطابق زندگی گزاری یہ دو کام کئے تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ تمہیں نہ صرف یہ کہ بخش دے گا بلکہ تمہیں تمہارے ان اعمال کا بہترین صلہ دے گا۔

ایمان اور عمل صالح کا اجر:

بنیادی عقائد یعنی توحید رسالت اور آخرت کا زبان سے اقرار اور دل سے ان کی تصدیق ایمان کہلاتا ہے اور اس ایمان کے مطابق شریعت کے احکام پر عمل کو عمل صالح کہا جاتا ہے۔عمل چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑا بھی۔نماز پڑھنے کو بھی عمل صالح اور عدل کی حکمرانی کو بھی عمل صالح کہتے ہیں۔کوئی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی عمل صالح ہے اگر وہ اللہ کی شریعت کے مطابق ہو اور اس کی رضا کیلئے کیا جائے اور کوئی بڑے سے بڑا عمل بھی جو پوری قوم اللہ رضا کے حصول کیلئے کرتی ہے وہ بھی عمل صالح ہے۔اس لئے کہ وہ اس عہد و قرار کے مطابق ہے جسے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہہ کر ذکر کیا گیا ہے کہا اگر تم ایمان اور عمل صالح کے تقاضوں کو پورا کیا تو ہم تمہیں بڑا انعام دیں گے۔

غور کیجئے! دنیا کا معمولی حکمران بھی کبھی اپنے کسی ملازم سے کسی بات کا وعدہ نہیں کرتا اور اگر ملازم یہ کہے کہ جناب! آپ وعدہ کریں کہ میرے ساتھ اچھا سلوک کریں گے تو وہ اسے ویسے ہی نکال دے گا کہ بدبخت! تو مجھ سے وعدے کا مطالبہ کرتا ہے؟ تیری یہ جرأت! تجھے جو بھی میں دے دوں وہ میری عطا اور بخشش ہے۔تو اس قابل کہاں کہ تو مجھ سے کسی وعدے کا مطالبہ کرنے لگے۔اب آپ اندازہ کریں کہ کہاں مخلوق اور کہاں خالق کہاں ایک اور کہاں اللہ کی ذات کہاں یہ دنیا کی بوسیدہ زمین پر رہتی ہوئی تو میں اور کہاں عرش معلیٰ پر جلوہ افروز اللہ کی ذات گرامی۔میں جلوہ افروز اسلئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ اللہ وہاں بیٹھا ہوا ہے بلکہ اسلئے کہ عرش معلیٰ اس کی قدرتوں کی جلوہ گاہ اور اس کی ذات کی تجلی گاہ ہے۔وہ اتنی بڑی ذات ہے کہ بندوں کی کیا حیثیت کہ اس سے کسی بھی قسم کے وعدے کا مطالبہ کریں؟ لیکن اللہ کا کرم دیکھئے! فرمایا کہ اگر تم نے یہ دونوں کام اپنے ذمے لے لئے کہ ہم کبھی سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کی مخالفت نہیں کریں گے اور کبھی عدل سے اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گے تو میں بھی تم سے ایک وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک تم ایمان اور عمل صالح کی زندگی گزارو گے دو چیزیں تمہارے لئے ہوں گی ایک میں (اللہ) تمہیں مغفرت سے نوازوں گا۔اس راستے میں تم سے کوئی چھوٹی موٹی کوتاہیاں بھی ہوں گی لیکن تم نے

Marfat.com

نہیں نہیں کیا ہوگا تو اللہ ان سے درگزر فرمائے گا اور دوسرا یہ کہ جو اچھے اعمال تم کرو گے اس کے بدلے اللہ بہت بڑا اجر دے گا۔

جب کوئی آدمی کسی چیز کو بڑی کہتا ہے تو اس کا بڑا کہنا اس کی ذات کی بڑائی کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی بچہ جب کہتا ہے کہ مجھے بڑا کھلونا لا دو' تو وہ بچے کے لحاظ سے بڑا ہوگا' لیکن جب اس کا باپ کہتا ہے کہ میں کوئی بڑی چیز چاہتا ہوں تو ممکن ہے کہ وہ بڑی چیز شاید پوری آبادی میں نہ سما سکے۔ اسی طرح جب ایک بادشاہ کسی چیز کو عظیم کہتا ہے تو اس کی عظمت اس کی اپنی عظمت کا پرتو ہوگی۔

اب اندازہ فرمائیں کہ اگر ہر ایک کی وسعت اس کے اپنے مطابق ہے۔ تو اللہ کی وسعت کیا ہے؟ اس کی عظمت کا کیا ٹھکانہ ہے؟ جب وہ یہ کہتا ہے کہ لوگو! تمہاری غلطیاں بھی معاف کروں گا۔ تم اقتصادی میدان میں بھی جو غلطیاں کرو گے میں اسے بھی درگزر کروں گا اور تمہاری ترقی کے پہیئے کو گھومنے سے نہیں روکوں گا۔ تم اجتماعی زندگی میں ٹھوکریں کھاؤ گے' میں تمہیں اس کی بھی سمجھ عطا کروں گا۔ قرآن مجید میں بھی ایک جگہ فرمایا:

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ

''اگر تم تقویٰ کی دولت حاصل کر لو تو اللہ تمہیں ایک ایسی قوت تمیز عطا کرے گا جس کے نتیجے میں تم اپنی زندگی میں اجتماعی غلطیوں سے بچ جاؤ گے'' (الانفال: 29)۔

یعنی اللہ تمہاری راہنمائی کرے گا اور تم ٹھوکریں نہیں کھاؤ گے' صحیح راستے پر چلو گے اور اگر کبھی غلطیاں ہو بھی جائیں گی تو اللہ تمہاری ان برائیوں کو مٹا ڈالے گا۔ اس کا اللہ نے قرآن میں جابجا وعدہ کیا ہے۔

فرمایا: دیکھو! میں تمہیں بہت بڑا اجر دوں گا اور یہ بڑا اجر تمہاری حیثیت کے لحاظ سے نہیں' میری اپنی ذات کے حوالے سے ہوگا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ جب اللہ کسی کو بڑا اجر دے گا تو وہ کیا ہوگا؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ وہ دینے پر آتا ہے تو موسیٰ علیہ السلام آگ لینے جاتے ہیں اور اللہ انہیں پیغمبری دے دیتا ہے۔ شداد بدبخت سمندر میں بہتے ہوئے ایک تختے پر ایک بالکل بے بس اور بے کس بچہ پیدا ہوا تھا' لیکن جب وہ دینے پر آیا تو اسے دنیا کی حکومت دے دی اور اس نے اللہ کے مقابلے میں جنت بنا ڈالی اور جب وہ چھیننے پر آیا تو اپنی ہی تیار کی ہوئی جنت دیکھنے کیلئے جب شداد آیا تو ابھی اس کا ایک پاؤں اندر اور دوسرا باہر ہی تھا کہ حکم دیا کہ اس کی جان قبض کر لو۔ کہا: میرا ان بندوں سے وعدہ ہے کہ اگر وہ ان دو وعدوں کو پورا کریں تو ''لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ'' ان کیلئے مغفرت بھی ہے اور اجر عظیم بھی' لیکن ساتھ ہی یہ بھی اگلی آیت میں فرما دیا:

آیت: ۱۰ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ O ''جن لوگوں نے ہماری (واضح) آیات (وعدوں) کے بعد بھی کفر کا راستہ اختیار کیا یہی جہنم (میں جانے) والے ہیں''۔

روئے سخن یہاں مسلمانوں کی طرف ہے کیونکہ یہاں کافروں کی بات نہیں ہو رہی۔ سیاق و سباق بتاتے ہیں کہ یہاں مسلمانوں کی بات ہو رہی ہے' یعنی ان مسلمانوں نے اگر کفر کا راستہ اختیار کیا اور احکام کو پس پشت ڈال دیا اور انہیں جھٹلایا اور جو کچھ ہم نے قرآن کریم میں کہا ہے' اس کا مذاق اڑایا' بلکہ اسے بدلنے کی کوشش کی تو یہی لوگ ہیں جہنم والے' جنہیں ہم جہنم میں ڈالیں گے۔

آیت: ۱۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ O ''اے ایمان والو! اللہ نے جو تم پر احسان کیا ہے' اسے یاد کرو۔ جب ایک جماعت نے ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کرے تو اس (اللہ) نے ان کے ہاتھ روک دیئے' اور اللہ (ہی) سے ڈرتے رہو اور مومنوں کو (صرف) اللہ ہی پر بھروسہ

Marfat.com

رکھنا چاہئے''۔

توکل علی اللہ رکھنے والوں سے اللہ کا وعدہ:

دیکھئے! یہاں اللہ نے بار بار جس نعمت کا ذکر کیا ہے' وہ ہے تکمیلِ دین کی نعمت۔ اسی تکمیل دین کے حوالے سے امت محمدیہ ﷺ پر بہت سارے انعامات کی بشارت۔ اس حوالے سے ایک وعدہ بھی کیا گیا۔ اب اس وعدے کی مثال دی جارہی ہے۔ وعدہ یہ کیا تھا کہ لوگو! ہم نے تم پر دین کو مکمل کر دیا ہے اور تمہیں اتنی طاقت دے دی ہے کہ

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ (المائدة: 3)

﴿آج دنیا اس بات سے مایوس ہوگئی ہے کہ وہ زبردستی تمہیں اپنے دین اور طریقے پر لا سکتے ہیں﴾

اب تمہارا دین ایک بالادست دین ہے۔ اب تمہارا ایک ایک بول دنیا میں غالب آئے گا۔ تم علم اور سیاست کے زور سے ایک بالادست قوت بن چکے ہو۔ البتہ! صرف ایک احتیاط کرنا کہ ان باطل قوتوں میں سے کسی سے نہ ڈرنا' جب بھی ڈرنا مجھ سے ڈرنا۔ اگر تم مجھ سے ڈرو گے' یہ تمہارے خلاف (بھلے ہزار سازشیں کریں) ناکام رہیں گی۔

اب دیکھیں! یہ باتیں کتنی واضح ہیں کہ اگر تم مجھ سے ڈرو گے تو یہ لوگ تمہارے خلاف کچھ بھی کرنا چاہیں' کچھ نہیں کر سکیں گے۔ سازشیں ہوں گی' لیکن میں تمہیں بچاؤں گا۔ اب اس کی مثال دی جارہی ہے۔ فرمایا: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یاد کرو جب ایک قوم نے ارادہ کیا کہ وہ پھیلا دے تم تک اپنے ہاتھ۔ مطلب یہ کہ اس قوم کے کچھ لوگوں نے تم پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا' مگر تمہیں اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔ اللہ نے کہا تھا کہ ''مجھ سے ڈرنا'' اب اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ تمہیں بچاتا۔ لہٰذا اس نے ان کے ہاتھوں کو تم تک پہنچنے سے روک دیا۔ تمہارا وعدہ کیا ہے؟ کہ تم میرے ہو کر جیو گے اور میرا وعدہ کیا ہے؟ کسی کو تم پر غالب نہیں آنے دوں گا۔

اس آیت کی تفسیر میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کئی واقعات بیان کئے ہیں کہ ایک جنگ میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میدان میں پھیل گئے۔ آپ ﷺ نے بھی ایک درخت پر تلوار لٹکا دی اور چادر ڈال کر نیچے آرام کرنے کیلئے لیٹ گئے۔ کہیں سے دوسرے قبیلے کا کوئی فرد حضور ﷺ کو ڈھونڈتا ہوا نکل آیا۔ اس نے تلوار اتاری اور نیام سے نکال کر کہنے لگا:

من يمنعك يا محمد؟ ﴿اے محمد (ﷺ)! تجھے اب کون بچائے گا؟﴾

اب اندازہ کریں کہ تلوار اس کے ہاتھ میں ہے اور اس بدو کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔ حضور ﷺ بڑے آرام سے فرماتے ہیں: میرا اللہ مجھے بچائے گا۔ اس کے ہاتھ میں تھرتھری آئی۔ اس نے تلوار نیام میں ڈال دی اور پاس بیٹھ کر معافیاں مانگنے لگا۔

اسی طرح ایک مرتبہ بنونضیر نے حضور اکرم ﷺ کو ایک معاہدے کیلئے بلایا۔ جس دیوار کے نیچے بٹھایا' اس پر لوگوں کو چڑھا دیا کہ اوپر سے پتھر گرا کر حضور اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو مار ڈالیں۔ جبرائیل علیہ السلام نے اطلاع دی جس پر حضور اکرم ﷺ اٹھ کر چلے آئے۔ جس سیاق و سباق میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں' اس زمانے کی بات ہے جب حضور اکرم ﷺ عمرہ کرنے کی نیت سے گئے تھے۔ اس وقت بھی راستے میں خالد بن ولید نے دو سو آدمیوں کو لے کر اچانک نماز کی حالت میں حضور ﷺ پر حملہ کیا۔ نجانے کیا ہوا؟ وہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا کچھ نہیں بگاڑ سکے بلکہ

Marfat.com

سارے کے سارے گرفتار ہو گئے۔ یہ مختلف واقعات اس طرف اشارے ہیں کہ اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ میں تمہیں بچاؤں گا' یہ میری ذمہ داری ہے' لیکن تمہیں میرے ہو کر رہنا ہے۔ بس آئندہ بھی اللہ سے ہی ڈرتے رہنا اور مومنوں کو چاہئے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔ معلوم ہوا کہ اللہ کے اس وعدے کی بس دو ہی شرائط ہیں' ایک اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا اور دوسرا اللہ پر توکل کرنا۔ یاد رکھیں توکل کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تیاری نہ کرنا۔ بلکہ

؎ توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
پھر اس خنجر کی تیزی کو مقدر کے حوالے کر

توکل یہ نہیں کہ آپ پچاس سال سوئے رہیں اور جب حالات بگڑنے لگیں تو کبھی اس سے مدد مانگیں' کبھی اس سے مدد مانگیں۔ یاد رکھیں! جو حکمران بھی کسی اسلامی حکومت کو چلاتا ہو اور وہ علمی اور عملی لحاظ سے ملک کی حفاظت کیلئے جو کچھ کر سکتا تھا' اس کا سامان نہیں کرتا' یقین جانئے! وہ تارکِ صلوٰۃ سے بڑا مجرم ہے کیونکہ نماز نہ پڑھنا کسی ایک آدمی کا جرم ہے اور ملک کو دفاعی نقطہ نظر سے کمزور رکھنا' یہ اس کے مقابلے میں بہت بڑا جرم ہے کیونکہ اس کا بھی حکم قرآن میں اللہ نے دیا ہے۔ فرمایا:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (الانفال: 60)

﴿یہ امر ہے کہ تیاری کرو' اتنی تیاری کہ تمہارا دشمن تم سے کانپنے اور ڈرنے لگے﴾

فرمایا کہ تیاری کے بعد توکل کرو یعنی اسباب کی فراہمی میں کمی نہ رہے لیکن بھروسہ اسباب پر نہیں بلکہ مسبب الاسباب یعنی اللہ تعالیٰ پر ہو اور زندگی کے تمام اعمال اور تمام شعبے اسی کے تقویٰ کے آئینہ دار ہوں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ پروردگار کی طرف سے تائید و نصرت کا نزول نہ ہو۔

ٹھیک کہا ظفر علی خاں نے۔

؎ یثرب سے اب بھی گونجتی ہے یہ صدا سنو!
وہ جو خدا کے ہو گئے، ان کا خدا ہوا

وَلَقَدْ اَخَذَ
اور خدا نے

اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا
بنی اسرائیل سے اقرار لیا اور اُن میں ہم نے بارہ سردار مقرر کیے۔

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ
پھر خدا نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے

وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا
اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ گے اور اُن کی مدد کرو گے اور خدا کو قرضِ حسنہ دو گے تو میں تم

Marfat.com

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ

تمہارے گناہ دُور کر دُوں گا اور تم کو بہشتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہہ

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ

رہی ہیں پھر جس نے اس کے بعد تم میں سے کفر کیا وہ سیدھے رستے سے بھٹک

السَّبِيْلِ ﴿١٢﴾

گیا

آیت:۱۲ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ۭ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ O ''اسی طرح اللہ نے بنی اسرائیل سے بھی ایک عہد لیا تھا اور ہم نے ان میں سے بارہ نقیب (نگران) اٹھائے اور اللہ نے فرمایا: بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم رکھو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے اور میرے رسولوں پہ ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھا قرض دو گے تو میں تم سے ضرور تمہارے گناہوں کو دور کر دوں گا اور تمہیں ان باغات میں ضرور داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ پھر اسکے بعد تم میں سے جس نے بھی کفر کیا تو بیشک وہ صراط مستقیم سے دور (نکل گیا) جا پڑا''۔

اس سے پہلے سورۃ مائدہ کی ساتویں آیت میں مسلمانوں سے ایک عہد لیا گیا تھا جس میں زندگی کے انفرادی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اجتماعی معاملات پہ بھی بہت واضح میثاق تھا۔ اس رکوع کے آغاز میں یہ بات بتانا مقصود ہے کہ مسلمان اس میثاق کو یونہی ایک فارمیلٹی نہ سمجھیں بلکہ تاریخ کے پس منظر میں اچھی طرح جانچ لیں کہ یہ عہد و میثاق اس امت محمدیہ ﷺ سے پہلا نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے جب بھی کسی امت کو اس دعوت کے منصب پہ فائز کیا گیا' ان سے ایسا ہی عہد لیا گیا' اسی کے نتیجے میں ایک تاریخ مرتب ہوتی رہی اور اسی حوالہ سے جو نمایاں خدمات امتوں نے سرانجام دیں' انہی کا صلہ ان امتوں کو ملا اور جہاں جہاں ان امتوں نے ٹھوکریں کھائیں' انہیں کی پاداش میں ان کے ساتھ سزا اور عذاب کا معاملہ ہوتا رہا۔ اگر آج ہم اس آئینہ میں اپنی موجودہ صورتحال کا جائزہ لیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس سے کوئی سبق نہ سیکھ سکیں۔

بنی اسرائیل سے جب یہ عہد و میثاق لیا گیا تو وہ بارہ قبیلوں پر مشتمل ایک قوم تھی۔ یعنی پہلے سے نسلی اعتبار سے یا انتظامی نقطہ نگاہ سے وہ بارہ قبیلوں پر مشتمل تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ ان میں موجود پہلے سے کسی انتظام کو مجروح نہ کیا جائے بلکہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس انتظام کی نوعیت بدل دی جائے۔ پہلے ان بارہ سرداروں کی عام ذمہ داریاں قبیلے کی خاندانی ضرورتوں کے حوالے سے ہوں گی' لیکن اب ان میں ایک نیا شعور اور ایک نئی معنویت پیدا کی گئی جس کے اظہار کیلئے ایک نیا معنی خیز نام ان کیلئے تجویز کیا گیا جسے قرآن کریم نے ''نقیب'' کے نام سے ذکر کیا۔

توریت میں سردار کا لفظ آیا ہے' ہوسکتا ہے اپنے نزول کے وقت جبکہ توریت عبرانی یا کسی اور زبان میں نازل ہوئی تو اس میں اسی کا ہم معنی لفظ ہو' لیکن بعد میں ترجمہ در ترجمہ توریت جب ہم تک پہنچی تو وہ لفظ سردار کی صورت میں منقول ہوا حالانکہ سردار کے لفظ میں وہ وسعت نہیں ہے۔ سردار صرف

Marfat.com

سردار ہوتا ہے' اس سے کسی معنویت کا اظہار نہیں ہوتا۔ جبکہ قرآن کریم نے "نقیب" کا لفظ استعمال کیا ہے' جو ہمیں بتاتا ہے کہ اصل میں ان کو کیا ذمہ داریاں دی گئیں۔

نقیب

نَقَبَ : ﴿کھوج لگانا' ٹوہ لگانا' جستجو کرنا' حالات سے واقفیت حاصل کرنا اور پھر اس کے مطابق آگے انتظامات کرنا﴾ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا ان کی ذمہ داری یہ ٹھہرائی گئی تھی کہ تمہیں اچھی طرح اپنے قبیلے کے لوگوں کے بارے میں یہ کھوج لگانا ہے کہ ان سے جو عہد و اقرار لیا گیا ہے' اس اقرار میں یہ کہیں کمی بیشی تو نہیں کر رہے یا یہ اس میں کہیں کسی کمزوری کا شکار تو نہیں ہو رہے۔ اب اصلاً ایک نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے' اللہ کے ساتھ عہد و اقرار کی وابستگی کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ اس عہد میں یہ لوگ کیسے ہیں؟ لہٰذا سرداروں سے کہا جا رہا ہے کہ تمہیں اس عہد کے معاملے میں لوگوں کی ٹوہ میں رہنا ہے اور جستجو کرنا ہے' اس کے نتیجے میں جو ظاہر ہو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچانا ہے اور پھر مل کر ان کی ساری کمزوریوں کا علاج کرنا ہے۔

نقیب کی ذمہ داریاں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی یہی سنت رہی ہے اور آپ ﷺ نے بھی اسی سنت پہ عمل کرتے ہوئے (بیعت عقبہ ثانیہ) کے وقت (مدینہ سے) آنے والے لوگوں پر بارہ آدمی بطور نقیب مقرر فرمائے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے بھی جو بارہ حواری مشہور ہیں' وہ بھی دراصل اس امت کے بارہ نقیب تھے' جن کے سپرد یہی ذمہ داری کی گئی تھی۔ امتوں کی روایت یہ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو اپنے دور کے لوگوں میں کوئی حیثیت بخشتا ہے' خواہ وہ حیثیت سیاسی ہو یا مادی' برادری کے اعتبار سے ہو یا اجتماعیت عامہ کے اعتبار سے' ان تمام کو اللہ اس ذمہ داری کے حوالے سے ماتحت لوگوں پر نقیب بناتا ہے۔ یہ بات میں بڑے اصرار سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اپنے پورے معاشرتی نظام کو نہ صرف بری طرح توڑا ہے' بلکہ اس کی اسلامی روح کو بھی نکال باہر کیا ہے۔ تاریخ اسلامی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیاسی رہنما صرف سیاسی داؤ پیچ کے لئے نہیں تھے' بلکہ ان پر دینی' معاشرتی' معاشی' تہذیبی و تمدنی ذمہ داریاں تھیں اور ان کا کام یہ تھا کہ جو لوگ بھی ان کے پیروکار ہوں انہیں یہ چیک کریں کہ وہ لوگ اسلامی نقطہ نگاہ اور مصلحت عامہ کے حوالے سے کہاں تک صاحب الرائے اور عزم و ہمت کے حامل ہیں' کہاں تک ایفائے عہد کر رہے ہیں اور کہاں کہاں ان میں کمزوریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ یہ کام نہ صرف سیاسی رہنماؤں بلکہ ارباب حکومت' بیوروکریٹس' برادریوں کے رہنماؤں اور علماء و مشائخ کو بھی کرنا تھا' لیکن دیکھ لیجئے کہ کوئی شعبہ ایسا باقی نہیں رہا جنہوں نے یہ نقیب ہونے کا فرض انجام دیا ہو یا آج تک کوئی کوشش بھی کی ہو بلکہ ہر شعبہ اپنے اپنے مفادات کے حوالے سے اپنا دائرہ اثر بڑھانے کی فکر میں تو لگا رہتا ہے' مگر اپنے اصل عہد و فرائض کا کسی کو احساس نہیں اور اللہ نے فرمایا:

﴿میں تمہارے ساتھ ہوں﴾

اللہ کن کے ساتھ ہوتا ہے

یہ اس عہد و میثاق کا بیان ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا۔ اس میں نماز کے اہتمام' زکوٰۃ کی ادائیگی' آئندہ آنے والے رسولوں پر ایمان اور ان کی تائید اور خدا کی راہ میں انفاق کا عہد لیا گیا ہے اور اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی معیت کا وعدہ فرمایا ہے۔ لیکن سب سے پہلے ذکر اپنی معیت کا کیا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ میں اس کو دو طرح سے لیتا ہوں۔

Marfat.com

اس کا ایک مطلب یہ ہے جس کا اظہار حضور ﷺ نے اس وقت فرمایا کہ جب آپ ﷺ غارِ ثور میں گھر گئے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سوا آپ کے ساتھ کوئی نہیں۔ دو فرد ہیں اور جان کے ہزاروں دشمن' آپ ﷺ کی تلاش میں ہیں' حتیٰ کہ جب وہ غار ثور کے دھانے پر پہنچ گئے' اس قدر قریب کہ وہ لوگ باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے اور اندر آپ ﷺ سن رہے تھے اور وہ غار نشیب میں تھا لہٰذا جب کوئی چٹان پر کھڑا ہوتا تو اس کی پنڈلیاں غار کے اندر نظر آتیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دیکھ رہے تھے اور صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ان میں اور ہم میں فاصلہ ہی کتنا ہے' ذرا بھی جھکے تو ہمیں دیکھ لیں گے۔ لیکن اللہ کے کام نیارے ہیں۔ ذرا اندازہ فرمائیے! ہم ہمیشہ بڑی قوتوں پہ نگاہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہاں دیکھئے اس وقت مکہ کی سب سے بڑی قوت جو ہزارہا جنگجو افراد پر مشتمل ہے' ان کے نمائندہ لوگ اس غار کے کمزور سے دھانے پہ کھڑے ہیں اور ان کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں' اگر حائل ہے بھی تو کیا؟ صرف دو چیزیں: ایک یہ کہ اس غار کے منہ پر مکڑی نے (اللہ کے حکم سے) جالا بُن دیا (یہ پہلا قلعہ ہے جسے حضور ﷺ کی حفاظت کیلئے بنایا گیا' جسے قرآن خود کہتا ہے کہ ''گھروں میں سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے''۔ لیکن اللہ جب کسی کو بچانے پہ آتا ہے تو وہ مکڑی کے کمزور گھر کے ذریعے بڑے بڑے قلعے والوں سے اس کو محفوظ کر لیتا ہے)۔ ڈھونڈنے والوں نے سوچا کہ رات کے کسی حصہ میں بھی اگر اس غار میں کوئی داخل ہوا ہوتا تو کیا یہ مکڑی کا جالا سلامت رہتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے کوئی نہیں گزرا۔ اب جب غار کے دوسرے دہانے پہ دیکھا تو وہاں فاختہ نے انڈے دے رکھے تھے' انہوں نے اندازہ لگایا کہ اگر وہ یہاں سے گزرتے تو گھونسلہ ضرور ٹوٹتا۔ یہ دو کمزور سی چیزیں ہیں' جن کے ذریعے اللہ نے ایک بہت طاقتور دشمن کے مقابلے میں ان کی حفاظت فرمائی اور جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور! دشمن تو سر پہ پہنچ گئے تو اسی سنت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ لَا تَحْزَنْ ''میری فکر نہ کرو''۔ ''حزن'' دوسرے کی فکر میں گھلنے اور اس کیلئے غم کھانے کو کہتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ''اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ تم جب اس عہد و اقرار کو پورا کرنے کی فکر کرو تو یہ نہ بھولنا کہ اللہ جس طرح نصرت و اعانت کی شکل میں تمہارے ساتھ ہے' اسی طرح وہ نگراں کے طور پر بھی تمہارے ساتھ ہے یعنی یہ نہ سمجھنا کہ تم جو چاہو کر ڈالو' تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تمہارے ساتھ ہے' وہ ہر دم تمہیں دیکھ رہا ہے کہ کیا تم ان ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے واقعی اخلاص کا دامن تھامے ہوئے ہو' تمہارے اندر کوئی چور دروازے تو نہیں ہیں' ایسا تو نہیں کہ عمل کچھ اور ہے اور ارادے کچھ اور ہوں' یہ تو نہیں کہ کہا کچھ جا رہا ہے اور دل میں کچھ اور چھپا ہوا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر جان لو! یہ ساری باتیں اللہ سے ہرگز مخفی نہیں ہیں' ''اِنِّی مَعَکُم'' ﴿بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں﴾ لہٰذا یاد رکھنا! تم کوئی کام چوری سے نہ کر سکو گے اور نیت کا فتور تمہیں بچا نہیں سکے گا۔ اصل چیز یہ ہے کہ ایمان ایسا پختہ ہو کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کے قریب جانے اور اللہ کو اپنے قریب سمجھے۔ مشکلات میں ہو تو یقین رکھے کہ اس کی نگہبانی میں میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا' کبھی کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرے اور عمل کرتے ہوئے کبھی اس سے لاپرواہ نہ ہو۔ یہی وہ احساسات ہیں جنہیں ایمان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

''نماز'' اللہ پر ایمان کے اظہار کی ابتدا

ایمان کے بعد ظاہر ہے کہ دوسرا مرحلہ عمل کا آتا ہے جو ایمان کے تمام مقتضیات کا حامل ہے۔ عمل' ایمان کا نتیجہ بھی ہے اور ایمان کی دلیل بھی۔ عمل کی مختلف شکلیں ہیں جس کی تفصیل طوالانی ہے لیکن عمل کی اہم تر صورت نماز ہے۔ اس لئے یہاں قرآن کریم نے اعمال کے ضمن میں سب سے پہلے فرمایا کہ ''لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ'' یعنی تمہارے اس اقرار کا کوئی بھروسہ نہیں ہے اور اس پر تم چل بھی نہ سکو گے تاوقتیکہ تم یہ کام نہ کرو یعنی تم نماز قائم کرو اور یہی وہ عمل ہے جس کی وجہ سے اللہ تمہارا ساتھ دے گا۔ پورے اسلام کی روح کو جس ایک عمل میں بند کر دیا گیا ہے' وہ نماز ہے۔ یہ نماز ہی ہے جو ہمیں

Marfat.com

اسلامی زندگی پہ اکساتی اور آمادہ کرتی رہتی ہے' بشرطیکہ ہم نماز کو سوچ سمجھ کر پڑھیں کیونکہ نماز کی اصل روح یہ ہے کہ اللہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے' سیاسی طور پر بھی' معاشی طور پر بھی' تہذیبی و تمدنی طور پر بھی' کوئی ذات اس سے بڑی نہیں ہے۔ اگر صرف اتنی سی بات قبول کر لی جائے تو سارے بکھیڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ جب آدمی ایمان لاتا ہے تو جو چیز سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے' وہ نماز ہے۔ یعنی فرض کریں کہ کسی نے دن چڑھے ایمان قبول کیا ہے' اب جونہی ظہر کا وقت آئے گا تو سب سے پہلے اس پر نماز فرض ہوگی اور اگر عصر کے وقت کیا ہے تو عصر کی نماز فرض ہوگی۔ غرض کسی بھی لمحے ایمان قبول کیا جائے' سب سے پہلے نماز ہی فرض ہوتی ہے۔ نماز میں کھڑے ہو کر جب آدمی ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہتا ہے تو گویا وہ ساری دنیا کو پیچھے پھینک دیتا ہے۔ نمازی کا یہ عمل اس بات کا اظہار ہے کہ وہ اپنے عمل سے یہ کہہ رہا ہے کہ اے دنیا کی تمام قوتو! میں تمہیں پس پشت پھینک کر اعلان کرتا ہوں کہ آج کے بعد میری زندگی میں اللہ ہی سب سے بڑا ہے' لہٰذا یہ سر تمہارے سامنے نہیں جھک سکتا' میں تمہاری قوتوں سے نہیں ڈرتا کیونکہ تمہاری قوتیں اللہ کی قوت سے بڑی نہیں۔ میں تمہارے تخت کو خاطر میں نہیں لاتا' اس لئے کہ تمہارا تخت اللہ کے تخت سے بڑا نہیں ہے۔

جب ایک مومن اللہ اکبر کہتا ہے تو ایک نئی سحر طلوع ہوتی ہے۔ تمام تخت و تاج اچھل جاتے ہیں' تمام قوتیں سمٹ جاتی ہیں' انسانیت کا ایک نیا سرمایہ وجود میں آتا ہے اور ایک نماز پڑھنے والا جب کہتا ہے ''اللہ اکبر'' اور ہاتھ باندھ کر اللہ کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے تو اللہ ہی کی غلامی کا عہد کر کے تمام غلامیوں سے اپنی جان چھڑا لیتا ہے۔ اس لئے پہلا اقرار یہ لیا کہ تمہیں نماز قائم کرنی ہے اور یہ بھی ذہن نشین کر لیں کہ جب بھی امت مسلمہ بنی ہے تو اس پر سب سے پہلے نماز فرض ہوئی ہے اور جب بھی ان کی معزولی کا وقت قریب آیا' یعنی انہوں نے اپنے آپ کو نااہل ثابت کیا اور ان کی جگہ اللہ نے دوسری قوموں کو اٹھایا تو اس کی وجہ نمازوں کا ضائع کر دینا ہی ٹھہرا ہے۔

''ترکِ نماز'' امت مسلمہ کے زوال کی پہلی نشانی

قرآن کریم بنی اسرائیل کی تاریخ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ

﴿پھر اچھے لوگوں کے بعد برے جانشین آئے' انہوں نے نماز کو ضائع کر دیا'' (مریم 59:11)﴾

''خلف'' برے جانشین کو کہتے ہیں یعنی بنی اسرائیل کو معزول اس لئے کیا گیا کہ بعد میں آنے والے نالائق' ناخلف واقع ہوئے اور انہوں نے سب سے پہلے یہ کیا کہ نمازیں ضائع کر دیں۔

آج ہم میں بالخصوص بیوروکریٹس' حکمران' پڑھے لکھے طبقے بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں جس چیز کی قدر و قیمت سب سے کم ہو گئی ہے' وہ نماز کی پابندی ہے۔ بڑی بڑی میٹنگز میں ایک ایک چیز پہ دھیان دیا جائے گا' چائے کے لوازمات تک کا خیال رکھا جائے گا' مگر جس بات کی پرواہ نہیں کی جاتی' وہ نماز ہے۔ اذانیں گونج رہی ہوتی ہیں مگر بہت کم نماز کی توفیق ہوتی ہے حالانکہ اسلامی معاشرے میں حکومت وقت کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اقامت صلوٰۃ کا اہتمام کرے اور اس میں ذرا نرمی نہ کرے۔

اسی لئے ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

﴿میرا جی چاہتا ہے کہ میں کسی کو جماعت کرانے کیلئے کہوں اور خود جا کر ان گھروں کو آگ لگا دوں جہاں لوگ گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں اور جماعت میں شامل نہیں ہوتے' میں ایسا ضرور کر گزرتا اگر مجھے گھروں میں عورتوں' بچوں' بوڑھوں اور مریضوں کا

Marfat.com

خیال نہ ہوتا﴾

غور کریں کہ یہ الفاظ ان کے منہ سے نکل رہے ہیں جو کبھی دشمن کیلئے بھی بددعا نہیں کرتے' وہ اپنے لوگوں کیلئے سراپا غضب بنے ہوئے ہیں کیونکہ حضور ﷺ جانتے تھے کہ یہی چیز اس امت کو امت بنانے والی اور اسلام میں ڈھالنے والی ہے اور یہی اگر نکل گئی تو پھر اس امت کی معزولی کو کوئی نہیں روک سکے گا۔

''زکوٰۃ'' حبِ الٰہی کے اظہار کا دوسرا ذریعہ

وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ ''اور تم زکوٰۃ ادا کرو' انسان کا ایک رشتہ تو اپنے اللہ سے قلب و دماغ کا رشتہ ہے جو اگر استوار ہو جائے تو باقی تمام رشتے خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ لیکن نجانے کیا بات ہے کہ انسان قلبی و ذہنی رشتے کو کسی حد تک استوار رکھتا بھی ہے' لیکن مالی رشتے کے معاملے میں کمزور ثابت ہوتا ہے۔ ماں باپ سے انسان کتنی محبت رکھتا ہے' لیکن اکثر دیکھا ہے کہ جب بچے کمانے لگیں تو والدین سے پیسہ چھپا چھپا کے رکھتے ہیں۔ پیسے کی محبت بعض اوقات جان کی محبت پہ غالب آ جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم جہاں نماز پہ زور دیتا ہے' وہاں ساتھ ساتھ زکوٰۃ پہ بھی زور دیتا ہے۔ قرآن کریم میں اسی (۸۰) مقامات پہ دونوں کو بیک وقت حکم کے انداز میں بیان فرمایا گیا ہے کہ تم اپنے ایمان کو قائم نہیں رکھ سکتے تاوقتیکہ کہ تم نماز پڑھو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ جب تک تمہارا کمایا ہوا مال' جائیداد' تمہاری ایک ایک مادی چیز' جس سے تمہارے قلب و دماغ کے رشتے ہیں' اللہ سے وابستہ نہ ہو جائے' اس وقت تک تمہاری ایمانی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اور دیکھا بھی یہی گیا ہے کہ اچھے اچھے نیک لوگ مادی معاملات میں آ کر کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ تہجد گزار لوگ تک اپنی وراثت میں بیٹیوں کو حصہ نہیں دیتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ

﴿ہر امت کی ایک آزمائش ہے اور ہمیشہ امتیں آزمائش میں ناکام ہو کر گرتی رہی ہیں' تمہاری آزمائش یہ ہے کہ تمہیں دولتِ دنیا سے آزمایا جائے گا﴾

آنحضرت ﷺ کی مشہور حدیث ہے:

ما الفقرُ اَخشیٰ علیکم ولکنی اَخشیٰ اَن تُبسَطَ عَلَیکم الدُّنیا کما بُسِطَت عَلیٰ من قبلکم فَتَنَافَسُوهَا کما تَنَا فَسُوهَا فتُهلِكَکم کما اهلَکتهم

﴿میں اس بات سے نہیں ڈرتا کہ تم بھوکوں مر جاؤ گے بلکہ مجھے اندیشہ اس بات کا ہے کہ تم پر دولت دنیا کھول دی جائے گی جس طرح تم سے پہلی قوموں پر کھولی گئی پھر اس دنیا طلبی میں اور دوسروں سے آگے بڑھنے میں ایک ریس میں لگ جاؤ گے جس طرح پہلی قومیں لگی رہیں یہ صورت حال بالآخر تمہیں تباہ کر دے گی جیسا اس نے پہلی قوموں کو کیا﴾

اس حدیث پاک میں سب سے پہلی یہ بات ارشاد فرمائی گئی کہ مجھے اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ تمہیں وسائل کی کمی اور فاقہ کشی تباہ کر دے گی کیونکہ وسائل کی کمی نے قوموں کیلئے مشکلات تو پیدا کی ہیں ان کی تباہی کا سامان کبھی نہیں کیا اور اب امت مسلمہ کا حال یہ ہے کہ وہ دوسری کافر قوموں کی طرح رات دن اس فکر میں غلطاں و پیچاں ہے کہ ہم اپنے وسائل میں کس طرح اضافہ کریں کیونکہ اگر ہمارے وسائل ہماری آبادی کی تعداد کے مطابق نہ ہوئے تو ہم تباہ ہو جائیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہم آبادی کی کمی کیلئے اور وسائل کی افزونی کیلئے کوشاں ہیں لیکن برسوں سے جو نتیجہ نکل رہا ہے وہ یہ ہے کہ آبادی بڑھتی جا رہی ہے اور وسائل بظاہر کم ہوتے جا رہے ہیں۔

Marfat.com

دوسری بات آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمائی کہ مجھے اندیشہ اس بات کا ہے کہ تم میں دولت کی ریل پیل ہوگی، تمہارے وسائل میں اضافہ ہوگا تیل کے چشمے تمہارے پاؤں کے نیچے سے ابلیں گے، زمین اپنے خزانے اگلنا شروع کر دے گی لیکن جیسے جیسے ان وسائل میں اضافہ ہوتا جائے گا ویسے ویسے تمہاری ہوسِ دنیا فزوں تر ہوتی جائے گی۔ دولت کی بہتات سے بجائے آسودگی پیدا ہونے کے استسقاء کے مرض کی طرح حب دنیا ایک بحران کی شکل اختیار کر لے گی۔ تم میں سے ہر شخص اپنی موجودہ حالت پر قناعت کی بجائے دوسرے جیسا بننے یا اس سے آگے بڑھنے کی فکر میں لگ جائے گا۔ سائیکل والا موٹر سائیکل کی خواہش میں، موٹر سائیکل والا کار کی خواہش میں اور کار والا بڑی کار کی فکر میں یا ہر سال ماڈل بدلنے کی ہوس میں اندھا ہو جائے گا۔ ہر گھر والا اس بات پر پریشان ہوگا کہ میرے گھر کی منڈیر دوسرے گھر کے برابر یا اونچی کیوں نہیں۔ اس کے نتیجے میں اگر وہ اپنا گھر اونچا کرے گا تو پڑوسی اسے اپنی توہین سمجھتے ہوئے اور ایک منزل اپنے گھر کی اٹھالے گا اس طرح یہ پورا معاشرہ ایک ایسی دوڑ میں لگ جائے گا جو پورے معاشرے کو تھکا کے مار ڈالے گی اور منزلیں اٹھانے کا مقابلہ بالآخر مکینوں سمیت مکانوں کو زمیں بوس کر دے گا۔ آخر میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اسی ہوس دنیا اور اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر نے پہلی قوموں کو تباہ کیا یہی تمہیں بھی تباہ کر کے چھوڑے گی۔

اگر امت مسلمہ کو اس صورت حال سے بچنا ہے تو اسے وسائل رزق کو ضرورت سمجھ کر حاصل ضرور کرنا چاہئے اور دنیا کو ترقی دینا بھی کوئی گناہ نہیں لیکن یہ بات نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ مسلمان کا اصل سرمایہ وہ عظمت کردار ہے جو اسلامی شریعت پر عمل کرنے کے نتیجہ میں اور اللہ اس کے رسول ﷺ اس کے دین اور مخلوق خدا کی خدمت کو ترجیح دینے سے پیدا ہوتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے ہمیشہ امت مسلمہ کو زندگی کے ہر میدان میں فلاح و کامرانی سے نوازا۔ اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا

زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں ‏ ‏ ‏ سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
قلندری سے ہوا ہے، تونگری سے نہیں ‏ ‏ ‏ کہ جب بھی جوہر مرا دنیا میں آشکار ہوا

ہماری تاریخ گواہ ہے کہ ہم جب بھی اٹھے ہیں بے سروسامانی سے اٹھے ہیں۔ میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک بھی دور ہم پہ ایسا نہیں گزرا کہ جس کیلئے ہم یہ کہہ سکتے ہوں کہ ہم طاقتور ہو کر یا وسائل کی فراوانی کے ساتھ اٹھے ہوں۔ ہمیشہ ہمارے پاس وسائل کم رہے، لیکن کردار کی عظمتیں زیادہ رہیں۔

افغانستان نے ولید بن عبدالملک کے زمانے میں خراج دینا بند کر دیا، یہ بنی امیہ کا سنہری دور تھا۔ ولید بن عبدالملک نے سفارت بھیجی جنہوں نے آ کے وہاں کے حکمران سے گفتگو کی تو اس حکمران نے ایک سوال کیا کہ "تم سے پہلے جو لوگ خراج وصول کرنے آتے تھے، وہ چھوٹے قد کے گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے جبکہ تم بڑے قد و قامت کے ترکی گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے ہو۔ ان کی جوتیاں تک ٹوٹی ہوتی تھیں اور تم زرق برق لباس میں ملبوس ہو۔ ان کے چہرے عبادت کے نور سے روشن ہوتے تھے (واضح رہے یہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مفتوح ہوئے تھے) لیکن ان کے پیٹ چپکے ہوئے تھے، تم ماشاء اللہ خوب تنومند ہو۔ تم ہر لحاظ سے ان سے زیادہ خوشحال دکھائی دیتے ہو، لیکن وہ اتنے خوشحال نظر نہیں آتے تھے۔ یہ فرق کیا ہے؟"

انہوں نے سینہ بجا کر کہا کہ وہ ہماری بدحالی کا زمانہ تھا، یہ ہماری خوشحالی کا زمانہ ہے۔ اب وہاں کوئی بھوکا نہیں، اب تم ہر ایک کو ایسا ہی زرق برق لباس پہنے توانا و تندرست اور خوشحال دیکھو گے۔

اس حکمران نے یہ سن کر کہا کہ "ہاں! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم ہر لحاظ سے ان سے زیادہ جسیم و جیم ہو، تم ان سے زیادہ تنومند اور طاقتور لوگ ہو، مگر

Marfat.com

وہ تم سے زیادہ وعدے کے پکے تھے' وہ تم سے زیادہ صاحبِ کردار تھے' ان میں تم سے زیادہ معنوی اور روحانی قوت تھی' وہی لوگ اس قابل تھے کہ ہم سے خراج وصول کر سکتے۔ تم ہم سے خراج وصول نہیں کر سکتے''۔ چنانچہ اس نے یہ کہہ کر مسلمانوں کی سب سے ترقی یافتہ حکومت کو خراج دینے سے انکار کر دیا اور اس طرح مسلمان پچاس سال تک اس حکومت سے خراج وصول نہ کر سکے۔

انسان کی سب سے بڑی چیز عظمت کردار ہے

قرونِ اولیٰ میں مسلمان اس یقین سے بہرہ ور تھے کہ جن لوگوں میں عہد واقرار کی پابندی ہو' وہی نماز وزکوٰۃ کا اہتمام کرتے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو اس عہد کے پالن ہار اور اس عہد پر پورا اترنے والے ہیں' یہی دنیا کی اصل طاقت ہیں' دنیا ان کے سامنے سمٹتی ہے اور جب ان کے گھوڑے دوڑتے ہیں تو زمین ان کے سامنے لپٹنے لگتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں انہوں نے لاکھوں مربع میل علاقہ فتح کیا' لیکن ایک بھی علاقہ ایسا نہیں جہاں مسلمانوں کے خلاف بغاوت ہوئی ہو بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ جو علاقے خلافت راشدہ میں فتح ہوئے' وہ آج تک مسلمانوں کے علاقے ہیں۔ وہ عرب ملک نہیں تھے لیکن آج عرب ملک کے طور پر معروف ہیں۔ یہ لیبیا' سوڈان' مصر' عرب ملک تو نہیں' یہ تو افریقی ملک ہیں' جو خلافتِ راشدہ کے زمانے میں زیرِ نگیں آئے' انہوں نے اپنی زبانیں تک بدل ڈالیں اور آج خود کو عرب کہتے ہیں۔ انہیں زبان بدلنے پر کسی نے مجبور تو نہیں کیا تھا۔ زبان ہی کیا' ان ملکوں کا سب کچھ بدل کر رہ گیا۔ لیکن ہندوستان اور اندلس جیسے ملک جو بعد کے لوگوں نے فتح کیے' ان میں فاتحین گردنیں جھکاتے رہے لیکن دلوں کو جھکانے کی انہوں نے کوئی فکر نہیں کی' نتیجہ یہ ہے کہ یہ ممالک آج بھی کافر ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ عظمتِ کردار سب سے بڑی حکومت ہے اور یہ عظمت کردار' اقامت صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے پیدا ہوتی ہے۔ فرمایا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تو اس سے تمہارے دل اور اجڑے گھروندے آباد ہوں گے۔ یہ دونوں قوتیں جب ساتھ مل کر چلیں گی تو اسلامی معاشرے میں خوشحالی کی ایسی لہر اٹھے گی کہ کوئی کسی سے شاکی نہیں رہے گا' لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ظاہر ہے کہ وہی کچھ ہوگا جو آج ہم اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں۔

وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ ''اور تم میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے'' یعنی اس دور کے لوگوں سے اقرار لینے کے بعد آنے والی نسلوں کے بارے میں خلاء نہیں چھوڑا گیا۔ یہ اقرار بنی اسرائیل سے اس لئے لیا گیا کیونکہ اس کے بعد بھی نبیوں اور رسولوں نے آنا تھا۔ لیکن یہ ذہن میں رہے کہ یہاں اگرچہ آنے والے تمام رسولوں پر ایمان کا تذکرہ ہے' لیکن بطور خاص اہل کتاب سے آنحضرت ﷺ پر ایمان کا عہد لیا جا رہا ہے کہ دیکھو! جب ہم نے تمہیں امت کی سرفرازی بخشی تو اسی دن کہا تھا کہ رسول آئیں گے' آخر میں جا کر ختم الرسل آئیں گے' خاص طور پر تمہیں ان کا ساتھ دینا ہوگا۔ لیکن تم نے کیا کیا' تم نے مختلف اوقات وادوار میں رسولوں کو' انبیاء کو قتل کیا اور اب آخر میں جو کچھ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کر رہے ہو' وہ تو سب کے سامنے کی بات ہے۔ تم اپنے عہد واقرار سے پھر رہے ہو اور عہد بھی وہ جس سے تمہاری ملی زندگی کا آغاز ہوا۔

قرآن میں ''ایمان'' کے دو معنی

یہاں چونکہ ایمان کا ذکر ہو رہا ہے اس لئے بہتر ہے کہ ایمان کے مفہوم ومعنی کو واضح کر دیا جائے۔ لغت میں ایمان کا لفظ دو طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ 1- اٰمَنَ لَہٗ 2- اٰمَنَ بِہٖ۔

1- اٰمَنَ لَہٗ کا معنی ہے صَدَّقَہٗ وَ اعْتَمَدَ عَلَیْہِ جس پر تم ایمان لائے ہو تم نے اس پر اعتماد کیا اور اس کی تصدیق کی یعنی تم اس کی جس بات کو بھی مان رہے ہو وہ اس لئے نہیں مان رہے کہ تمہاری عقل اسے تسلیم کرتی ہے یا تمہارا تجربہ اس کی تائید کرتا ہے بلکہ تم اس کی ہر بات کو صرف اس

Marfat.com

اعتماد پر مانتے ہو۔ تم یہ تسلیم کر چکے ہو کہ اس کی زبان سے کبھی غلط لفظ نہیں نکل سکتا' اس کی کہی ہوئی بات کبھی جھوٹ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اگر وہ ایسی بات کہے جو عقل وغیرہ کیلئے قابل تسلیم نہ ہو یا وقت کا چلن اس کے موافق نہ ہو تو ان دونوں چیزوں کو تم غلط سمجھ کر رد کر دو لیکن اس کی بات کو اس لئے قبول کر لو کہ تم اس پر اعتماد رکھتے ہو اسلئے اس کی بات کی تائید کیلئے تمہیں کسی اور طرف سے تائید کی ضرورت نہیں اور اسکے ساتھ ساتھ یہ بات بھی کہ اس کے اعتماد پر تم جس چیز کو بھی مانو اسے دل کی تصدیق کے ساتھ مانو یعنی اسے صرف زبان کا اقرار اور دماغ کی تائید ہی شامل نہ ہو بلکہ دل کی تصدیق بھی اسے میسر ہو۔ رسول اللہ ﷺ پر ایمان کا یہی مفہوم ہے کہ ہم آپ پر ایمان لائے ہیں تو آپ کا ایک ایک ارشاد اور ایک ایک عمل اسلئے ہمارے لئے قابل تسلیم ہے وہ آپ کا ارشاد اور عمل ہے اور ہم نے دین کو آپ کے اعتماد پر قبول کیا ہے ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ دنیا اس کے بارے میں کیا کہتی ہے اور خود میری عقل اس کو سمجھ سکتی ہے یا نہیں کیونکہ جب میں نے ان پر اعتماد کر لیا ہے کہ ان پر اللہ کی وحی اترتی ہے اور ان کی زبان سے خدا کا قانون بولتا ہے تو اب میرے لئے کسی اور کی طرف دیکھنا اس اعتماد میں خیانت ہے اور مزید یہ بات کہ میں آپ کی ہر بات کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کروں گا کیونکہ دل کی تصدیق ایمان کا لازمی حصہ ہے۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ سود کو اللہ اور اسکے رسول نے حرام قرار دیا ہے۔ مجھے آنحضرت ﷺ کی ذات اور آپ کی زبان پر چونکہ اعتماد ہے اسلئے میں دل کی گہرائیوں سے اس حکم کو ماننے پر مجبور ہوں۔ اگر میں اس میں یہ بحث لے کر بیٹھ جاؤں کہ یہ حکم آج کے دور میں قابل عمل ہے یا نہیں اور اگر میں نے اسے قبول کر لیا تو غیر مسلم دنیا کے ساتھ ہمارے معاشی تعلقات متاثر ہونے کا اندیشہ ہے اور میں ان باتوں کو واقعی اہمیت دینا شروع کر دوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے رسول پر میرے ایمان میں کمزوری ہے میں نے ایمان کے مفہوم کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

-2 اٰمَنَ بِهٖ اس کا معنی ہے اَيْقَنَ بِهٖ۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ جس پر ایمان لائے ہیں اس کی ہر ہر بات کو آپ صرف مان کے ہی نہیں دیں گے بلکہ اس پر یقین بھی لائیں گے یعنی آپ اس اطمینان سے بہرہ ور ہوں گے کہ میں جس بات کو مان رہا ہوں پورے یقین اور ایقان سے مان رہا ہوں اور یقین آدمی کے اطمینان کی آخری قوت کا نام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یقین کی سطح ایک نہیں ہوتی وہ کبھی علم الیقین ہوتا ہے کبھی عین الیقین اور کبھی حق الیقین۔ ہر صاحب ایمان اپنی اپنی ہمت اور مقدر کے مطابق ان تینوں میں سے کسی کے ساتھ موصوف ہوتا ہے البتہ جو چیز ہر ایمان لانے والے کیلئے ضروری ہے وہ فی الجملہ ایسا یقین ہے جس میں کبھی کسی شک اور ارتیاب کا کاشانہ چھپ سکے۔ جس میں علم و دانش کے نام پر بڑے سے بڑا دباؤ بھی اثر انداز نہ ہو سکے۔ افراد اور قوموں کیلئے یہی وہ سب سے بڑی نعمت ہے جو ان کیلئے قوت کا سامان بنتی ہے۔ مشکل سے مشکل حالات میں ان کو سہارا دیتی ہے اور اگر یہ دولت میسر نہیں آتی تو پھر ایمان محض زبان کی ورزش' دماغ کا تعیش اور دل کا روگ ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے اقبال نے بے یقینی قرار دے کر اسے غلامی سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔

؎ سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

امت بنی اسرائیل سے تو عہد لیا گیا کہ آنے والے انبیاء و رسل پر ایمان لاؤ' مگر ہم چونکہ آخری امت ہیں اس لئے ہم سے تمام انبیاء و رسل پر فی الجملہ ایمان کے ساتھ ایسا ایمان جو اطاعت و اتباع پر مشتمل ہو اس کا عہد صرف رسول اللہ ﷺ کے بارے میں لیا گیا کہ ان کو یقین و اعتماد کے ساتھ مانو۔ ان کے سوا تمہارا کوئی آئیڈیل نہیں ہے۔ تمہارا کوئی نصب العین نہیں' سوائے اس کے جو اللہ کے رسول ﷺ نے تمہیں دیا۔ تمہاری زندگی کا کوئی حوالہ معتبر نہیں' سوائے ذات رسالت مآب ﷺ کے۔ انہوں نے جس طرح زندگی گزاری ہے' اس کے پورے ادوار تمہارے سامنے ہیں۔ وہی تمہاری روشنی کا

Marfat.com

سامان ہیں' وہی تمہارے لئے مینارہ نور ہیں۔ جب تک تم اس یقین سے بہرہ ور نہیں ہو گے' تب تک نہ جانے کتنے ہیروز ہیں جو تمہاری منزل کھوٹی کرتے رہیں گے' کتنے دانشور ہیں جو روز تمہاری دانش کو بگاڑیں گے۔

نبی کی مدد کرنے سے مراد

وَعَزَّرْتُمُوهُمْ ''اور تم ان (آنے والے رسولوں) کی مدد بھی کرو گے''۔ اس مدد کے معاملے میں بھی غلط فہمی پائی جاتی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مدد یہی ہے کہ حضور ﷺ کی زندگی کی حفاظت کرو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہ فرض بھی اس طرح انجام دیا کہ کارلائل جیسے متعصب مؤرخ کو بھی یہ لکھنا پڑا کہ

﴿عیسائی اس بات کو جتنی جلدی سمجھ لیں اچھا ہے کہ محمد ﷺ کے ساتھی مسیح کے حواری نہیں تھے' جو اس کو لوگوں میں چھوڑ کر خود بھاگ گئے بلکہ انہوں نے تلواروں کی چھاؤں میں محمد ﷺ کی حفاظت کی' ان کے دائیں سے' بائیں سے' آگے سے' پیچھے سے برابر ان کی نصرت وحفاظت کی اور سائے کی طرح ان کے ساتھ رہے حتیٰ کہ ان کے لائے ہوئے دین کو بارہ لاکھ مربع میل کے علاقے میں غالب کر دیا﴾

سید عطا اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تو یہ حال تھا کہ اگر آنحضرت ﷺ ان سے کہیں یہ کہہ دیتے کہ اپنی کھالوں کے مجھے جوتے بنوا دو تو یقیناً وہ اس سے بھی دریغ نہ کرتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضور ﷺ کی ذات کی حفاظت میں انہوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ لیکن غیر معمولی حالات اور ناگہانی حوادث میں خود پروردگار نے فرشتوں کے ذریعے آپ کی حفاظت فرمائی صرف ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ ایک دن ابوجہل نے حلفاً کہا کہ آج اگر محمد ﷺ نے میرے سامنے نماز پڑھنے اور سجدہ کرنے کی کوشش کی تو میں (نعوذ باللہ) ان کا سر کچل دوں گا۔ چنانچہ حضور ﷺ جب کعبہ تشریف لائے تو یہ لوگ انتظار میں تھے۔ حضور ﷺ جب سجدے میں گئے تو وہ بدبخت آپ پر حملہ کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔ جیسے ہی قریب ہوا تو ہاتھوں سے کسی چیز کو ہٹاتا ہوا' نہایت سراسیمہ پیچھے ہٹا۔ لوگوں نے پوچھا: آخر ہوا کیا؟ اس نے کہا کہ جیسے ہی میں محمد (ﷺ) کے قریب ہوا تو میں نے دیکھا کہ آگ کی لپٹ اور کچھ پر میری طرف بڑھ رہے ہیں' کچھ برچھے میری طرف رخ کر رہے ہیں' مجھے لگا کہ ایک لحہ بھی میں یہاں رکا تو میری بوٹیاں اڑا دی جائیں گی۔ بعد میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ خوش قسمت تھا بچ نکلا' اگر مجھ پر حملہ کرتا تو فرشتے اس کے پرزے اڑا دیتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں بھی حضور ﷺ کی حفاظت اللہ کی جانب سے اسکے فرشتے کرتے تھے اور جہاں تک مدینہ کا تعلق ہے تو وہاں تو خطرات مکہ کی نسبت بہت بڑھ گئے تھے اور ان لوگوں سے واسطہ پڑ گیا تھا جن سے آج ہمیں واسطہ پڑا ہوا ہے یعنی یہود جیسے سازشی گروہ سے اور عیسائی ان کے آلہ کار تھے۔

یہ گروہ ہمیشہ سے سازشی گروہ رہا ہے۔ یہ خود تو کم سامنے آتا ہے، دوسروں کو زیادہ استعمال کرتا ہے۔ ان لوگوں کی وجہ سے مدینہ میں کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا تھا کہ جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پریشان نہیں ہوتے تھے۔ حضور ذرا آنکھوں سے اوجھل ہوتے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پریشان ہو جاتے اور تلاش شروع کر دیتے کہ کہیں آپ کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ ایسے ہی ایک موقع پر حضور ﷺ نے عشاء کی نماز کے بعد فرمایا کہ آج کوئی آدمی پہرہ دے تا کہ میں دو گھڑی کیلئے سو جاؤں' اندازہ لگایئے کہ خطرات کس قدر بڑھ گئے تھے' چنانچہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ہتھیار باندھے اور حضور ﷺ کے گھر کے باہر کھڑے ہو کر پہرہ دینے لگے۔ تھوڑی دیر بعد حضور ﷺ نے سر باہر نکالا اور کہا کہ ''سعد! چلے جاؤ' اللہ نے مجھے

Marfat.com

حفاظت کا وعدہ کرلیا ہے اور یہ آیت پڑھی:

واللہ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ﴿اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا﴾ (المائدۃ: 67).

اب جبکہ حضور ﷺ کی ذات کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ لے لی' فرشتے ہمہ وقت حفاظت کرنے لگے' اس لئے اس کی چنداں فکر نہ تھی۔ یہاں جو کہا جا رہا ہے "عَزَّرْتُمُوْهُمْ" تو مطلب یہ ہے کہ تم ان کا احترام بجالاؤ' ان کی مدد کرو' یعنی جس دین کو لے کر حضور ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور جسے دنیا میں نافذ و قائم کرنا تھا اور تمام پہلے ادیان کے مقابلے میں اس دین کو قوت دینا تھی اور ہر سطح پر اسے غالب کرنا تھا' غلبہ عمومی سے لے کر غلبہ خصوصی تک کی فکر کرنا تھی' اس کیلئے ظاہر ہے کہ آپ کو ہر موقع پر ایک ایک آدمی کی ضرورت تھی۔ مثلاً فوجیں اگر دشمنوں کے مقابلے میں بھیجنی ہیں' مددگار نہیں ہوں گے تو کون جائے گا؟ عدالتوں میں عادل جج بٹھانے ہیں' افراد نہیں ہوں گے تو پھر یہ کام کون کرے گا؟ شہر کی حفاظت کرنی ہے' لوگ نہیں ہوں گے تو ناکہ بندی کون کرے گا؟ نمازیں پڑھنی' پڑھانی ہیں' ہر طرح کے فتنوں پر نگاہ رکھنی ہے اور پورے ملک کے ہر گوشے کو صحیح نہج پر استوار کر کے انتظام چلانا ہے' اس کیلئے افراد کی ضرورت ہے۔ کہا کہ تمہارا اصل کام یہ ہے کہ تم وہ افراد بنو' تمام دین کے غلبہ کیلئے پیغمبر کے دست و بازو بنو' تم حضور ﷺ کے لشکر بنو اور ان کے مشیر بنو۔ تم اگر قدم قدم پر مدد کرو گے تو یہ گاڑی آگے چلے گی' ورنہ نہیں چل سکتی۔

نوح علیہ السلام اپنی امت کی اصلاح کیوں نہ کر سکے؟ اسلئے کہ ساڑھے نو سو سال میں صرف (۸۰) آدمی ایمان لائے۔ عیسیٰ علیہ السلام رومی قوت کے مقابلے میں کیوں نہ اٹھ سکے اور کیوں نہ اپنی حکومت قائم کر سکے؟ اسلئے کہ دس بارہ حواریوں اور چند عقیدت مندوں کے سوا کوئی آپ کا ساتھ دینے کیلئے تیار نہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس سے صورتحال کو کیسے بدلا جا سکتا تھا؟ انقلاب سب سے پہلے افرادی قوت کو دیکھتا ہے' ان کے اخلاص اور کام کرنے والوں کی محنت کو دیکھتا ہے۔

چنانچہ حضور کی حیات مبارکہ میں بھی مسلمانوں نے یہ فرض انجام دیا اور آپ کے بعد بھی جب دین کے بقا استحکام اور اجراء و نفاذ کیلئے اس کی ضرورت پڑی تو اصحابِ عزیمت ہمیشہ اس فرض کی انجام دہی کیلئے اٹھتے رہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد جب اسلامی نظامِ خلافت میں بگاڑ پیدا ہوا حالانکہ اس وقت فتوحات جاری تھیں' حج ادا ہو رہے تھے' نمازیں قائم تھیں' لیکن اسلامی حکومت کا یعنی شورائیت کا اور خلافت علیٰ منہاج النبوت کا حلیہ بگڑنے لگا تو سیدنا حسین ابن علی رضی اللہ عنہما نے دیکھا کہ اسلام کے ایک شعبہ میں آج نقب لگائی جاری ہے' اگر آج اسے نہ روکا گیا تو کل یہ پورا اسلام کا محل مسمار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ آج اللہ کے دین کی مدد کے حوالے سے سب سے بڑی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے کیونکہ میں حضور ﷺ کا نواسہ ہوں اور دنیا میری طرف دیکھ رہی ہے' کوفہ والوں نے مجھے بلایا ہے حالانکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ میں خطرات کی طرف بڑھ رہا ہوں اور جانتے تھے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لوگوں نے سمجھانے کی کوشش کی تو فرمایا کہ میں سب جانتا ہوں لیکن مجھے فرض پکار رہا ہے۔ دیکھ لیں کہ صرف اس بات کو دہرانے کیلئے کہ دین کی مدد کیسے کی جا سکتی ہے' آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی جان کا نذرانہ تک دے دیا۔ اب قیامت تک کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ نامساعد حالات میں دین کی مدد کیونکر ہو سکتی ہے؟ اسی طرح ہماری قریبی تاریخ میں سید احمد شہید اور ان کے ساتھیوں نے اس کو دہرایا۔ پھر یحییٰ تھانیسری اور جعفر تھانیسری کے گروہ نے' پھر علمائے بنگال نے' اسی طرح علمائے دیوبند' علمائے بریلی' علمائے ندوہ اور 1857ء میں چودہ ہزار علماء نے پھانسی پر لٹک کر دین کی مدد کی تھی' اسی طرح ہمیشہ دین کی مدد کی جاتی رہے گی۔ اس کے بعد فرمایا:

اَقۡرَضۡتُمُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا ﴿اللہ کو قرض حسنہ دو گے﴾

Marfat.com

اندازہ کر لیجئے کہ یہ عہد واقرار بنی اسرائیل کے زمانے سے شروع ہو کر آج تک ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ اس راہ پر چلنے والے کو جان کی قربانی بھی دینا پڑتی ہے اور مال کی قربانی بھی۔ صرف زکوٰۃ دینے سے اس کا حق ادا نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ دینے سے تو صرف ہمارے ضروری ادارے چل سکتے ہیں۔ رہی اجتماعی ذمہ داریاں تو اگر وہ حکومت ادا نہ کرے تو مسلمانوں کو خود ادا کرنا پڑتی ہیں۔ زکوٰۃ تو فرض عین ہے اور اس کے علاوہ باقی اجتماعی ذمہ داریوں کے لئے مال خرچ کرنا فرض کفایہ ہے۔

دیکھیں زکوٰۃ کا حکم پہلے گزر چکا ہے اور اب قرض حسنہ کی بات ہو رہی ہے اور یہ عہد واقرار کا حصہ ہے۔ صرف یہ سوچنا کہ میں نے اڑھائی فیصد زکوٰۃ نکال دی ہے' باقی سارے لاکھوں کروڑوں میرے اپنے ہیں' میں ان کا جو چاہے کروں۔ ایسا نہیں ہے۔

اگر ملک پر حملہ ہو جائے اور حکومت ہم سے تقاضہ کرے کہ انڈیا بڑھتا چلا آ رہا ہے اور باقی قوتیں اس کی ہمنوا ہیں اور ہمارے وسائل کافی نہیں ہیں۔ تو ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم جائز حد تک تو اپنی آمدنی میں سے اپنی ضروریات کیلئے روکیں' باقی سب کچھ حکومت کو دے دیں۔ یہ حکومت پر احسان نہیں بلکہ یہ ہماری شرعی ذمہ داری ہے۔ یہ فرض کفایہ ہے۔ فرمایا کہ ایسے موقع پر تم اللہ کو قرض دو یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اللہ ہم سے قرض مانگ رہا ہے حالانکہ وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں نے دیا تھا' لاؤ واپس کرو۔

اللہ کو قرض حسنہ دینے کا فائدہ

قرض اس کو کہتے ہیں جس کی ادائیگی لازم ہو' اللہ نے اس کا نام قرض شاید رکھا ہی اس لئے ہے کہ ہم قیامت میں واپسی کیلئے گزارش کر سکیں بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ فرض کریں میں فرض کفایہ میں مال دے کر کسی وجہ سے پریشان حال ہو جاتا ہوں تو تہجد میں میں اللہ سے کہہ سکتا ہوں یا اللہ! تو تو بڑا کریم ہے' میں نے تجھے قرض دیا تھا' تو تو بڑھا چڑھا کر لوٹانے والا ہے' پھر یہ کیا بات ہے کہ میں پریشان حالی کا شکار ہوں۔ یقین جانو کہ اس کے بعد پریشانی زیادہ دیر تک نہ رہے گی۔

حدیث میں آتا ہے حضور ﷺ نماز اشراق سے فارغ ہو کر اٹھنے لگے تو ایک صحابی ابوالدحداح رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور کہا کہ حضور ﷺ! اللہ قرض مانگتا ہے؟ فرمایا: ہاں! بولے: کیا واقعی' آپ اس کے گواہ ہیں؟ فرمایا: ہاں! میں اس کا گواہ ہوں۔ بولے: میرے پاس ایک باغ ہے' جس میں میرا گھر بھی ہے۔ اس میں چھ سو پودے کھجور کے اور باقی دوسری فصلیں بھی ہیں' یہ باغ بڑا ہی نفع دینے والا ہے اور اسی پر میری گزر بسر بھی ہے۔ آپ ﷺ کو گواہ بنا کر آپ ﷺ کے ہاتھ پر وعدہ کرتا ہوں کہ میں یہ باغ اللہ کو بطور قرض دیتا ہوں۔ حضور ﷺ نے اظہار تحسین فرمایا، دعا دی پھر وہ گھر پہنچے تو باغ کے کنارے کھڑے ہو کر (اپنی بیوی کو) آواز دی: یا اُم الدحداح!۔ وہ آئیں کہ خیریت تو ہے کہ اندر نہیں آتے' باہر سے بلا رہے ہیں کہنے لگے: سب کچھ چھوڑ کر اور بچوں کو لے کر باہر نکل آؤ۔ میں نے یہ باغ' مال اور گھر سمیت اللہ کو دے دیا ہے۔ وہ بولیں: ابوالدحداح! ''تم نے بڑا کاروبار کیا ہے''۔ یہ ہے اللہ کو قرض دینا۔

فرمایا کہ جہاں تم باقی ذمہ داریاں ادا کرو گے' وہاں تمہیں یہ بھی ذمہ داری ادا کرنی ہے کہ وقت پڑنے پر تم اللہ کو قرض حسنہ بھی دو۔ قرض کی وضاحت تو میں نے کر دی اور ''قرض حسنہ'' اس دولت میں سے دینا ہے جو حلال ذرائع سے کمائی ہو اور پورے دل کی آمادگی کے ساتھ دینا ہے اور استطاعت سے بڑھ کر دینا ہے۔ ضروری نہیں وہ لاکھوں میں ہو' دمڑیوں میں بھی ہو' لینے والا تو اللہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دینے والا کن جذبات کے ساتھ دے رہا ہے۔

Marfat.com

حدیث میں آتا ہے کہ جب حضور ﷺ نے جنگِ تبوک کے لئے اپیل فرمائی تو عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے دل کھول کر مال دیا۔ حضور ﷺ ان میں سے کچھ اشرفیوں کو اپنے ہاتھوں پر الٹتے پلٹتے تھے اور ساتھ ہی فرماتے تھے کہ عثمان آج کے بعد تمہارا کوئی گناہ تمہیں نقصان نہ دے گا اور جنت کی بشارت دی۔ لیکن اسی دوران ایک صاحب ایسے بھی آئے جنہوں نے خشک کھجوروں کی ایک پوٹلی حضور ﷺ کو پیش کی اور کہا کہ میں تو بالکل مفلوک الحال آدمی ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے اور یہ کھجوریں میں دن بھر مزدوری کر کے لایا ہوں۔ حضور ﷺ اس پوٹلی کو لے کر بے حد خوش ہوئے اور کہا کہ لوگوں کے عطیات کا جو ڈھیر لگا ہے ان کھجوروں کو اس پر بکھیر دو۔ مجھے اللہ سے امید ہے کہ اس کے اخلاص کی وجہ سے اللہ سب کو قبول فرمائے گا۔

عہدوفا پورا کرنے والوں پر اللہ کا انعام

فرمایا کہ تم جب یہ سب کچھ کر گزرو گے تو پھر اللہ تمہارے ساتھ ایک وعدہ کرتا ہے۔ دیکھئے! یہ وعدہ وہ ہستی کر رہی ہے جس کے وعدوں کے شکست ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ہماری اور پچھلی قوموں (بنی اسرائیل) کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب تک ان قوموں نے اپنے یہ وعدے پورے کئے' اللہ نے کوئی نعمت ایسی نہیں ہے جو ان سے روک کر رکھی ہو۔ امتوں کی سیادت تک سے نوازا اور جہاں تک ہماری تاریخ کا تعلق ہے۔ ہم تو اٹھے ہی صحرا و بیاباں سے تھے۔ جس میں سوائے محرومیوں کے کچھ بھی نہیں تھا' خوشحالی کا نام و نشان نہیں' یہاں تک کہ کبھی بھی دنیا کی کسی فاتح قوم نے اس طرف نظر تک نہ کی۔ نہ وہاں کوئی قانون تھا' نہ اخلاقی قدریں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شریعت کو فراموش ہوئے صدیاں بیت گئیں تھیں۔ اڑھائی ہزار سال کے بعد وہاں سے ایک روحانی قوت اٹھی۔ ایسی بنجر سرزمین سے کسی غالب قوت کا اٹھ کھڑے ہونا' یہ معمہ آج تک عمرانی ماہرین کیلئے ایک دردِ سر بنا ہوا ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ اللہ کے وعدوں کا ایفا اور اظہار ہے اس کا ہمیشہ سے یہ وعدہ ہے کہ جو اس عہد کی بنیادوں پہ اٹھے گا' ہم اس کو توانائی عطا کریں گے' اس کو عزت دیں گے۔ دیکھ لیں کہ مسلمانوں کو اللہ نے کیسے عزت بخشی' عرب کے اونٹ چرانے والے بدو' قیصر و کسریٰ کے گریبان نوچتے نظر آئے۔

اونٹوں کے چرانے والوں نے اس شخص کی صحبت میں رہ کر
قیصر کے تخت کو روندا کسریٰ کا گریباں چاک کیا

انقلاب کے دوش پر سوار ہو کر جب کوئی قوم نکلتی ہے تو اس سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں اس لئے فرمایا:

لَاُ كَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ﴿اگر تم سے غلطیاں ہو بھی جائیں تو وہ میں تم سے دور کر دوں گا (مٹا دوں گا)﴾

فرمایا کہ جب تم ان بنیادوں پر چلو گے تو ہم تمہیں سب کچھ عطا کریں گے اور اگر یہ سب کرتے ہوئے تم سے غلطیاں بھی ہوئیں' جو ظاہر ہے کہ ضرور ہوں گی' اس لئے کہ آدمی ہزار اخلاص سے کام کرے' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر چال لڑکھڑاہٹ سے پاک ہو۔ ذاتِ نبوت کے علاوہ کوئی معصوم نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اگرچہ اللہ نے محفوظ رکھا' لیکن کہیں کہیں انہیں بھی ٹھوکریں لگیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ لوگ گناہوں' خطاؤں پر اصرار کرنے والے نہیں تھے۔ فوراً اللہ کی طرف پلٹتے تھے۔ اس لئے فرمایا:

لَاُ كَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ﴿اگر تم سے غلطیاں ہو بھی جائیں تو وہ میں تم سے دور کر دوں گا (مٹا دوں گا)﴾

مٹانے کا مطلب یہ ہے کہ اگر انفرادی زندگی میں غلطیاں ہوں گی تو جنت میں جانے میں رکاوٹ نہیں بنیں گی اور اجتماعی زندگی میں ہوں تو میں اس کے اثرات کو ابھرنے نہیں دوں گا اور ہوتا یہی ہے کہ جب اجتماعی طور پر ملت کا شعور ٹھیک طور پر کام کر رہا ہو تو تھوڑے بہت غلط فیصلے بھی ہو جائیں تو یہ شعور ان کو اپنی لپیٹ میں لے کر ملیامیٹ کر دیتا ہے۔

Marfat.com

وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ''اور میں تمہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوگی''۔

اولاً تو یہ جنت کا وعدہ ہے اور اگر ہم اس کو استعارہ سمجھیں تو مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے عہد واقرار پر کاربند رہے تو میں تم کو ایسی آزادیاں دوں گا اور تمہارے معاشرے کو ایسی خوشحالی عطا کروں گا اور دلوں کو ایسا سکون بخشوں گا کہ ہر آدمی اپنی جگہ یوں محسوس کرے گا کہ جیسے وہ جنت میں ہے' خواہ صحرا میں رہتا ہو' مگر یوں محسوس کرے گا کہ میرے نیچے سے نہریں رواں ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے عراق کے لوگوں کی طرف سے وہاں کے گورنر نے مطالبہ کیا کہ مجھے فنڈ دیجئے' میں چاہتا ہوں کہ اچھی حکومت آئی ہے اور اللہ نے خوشحالی دی ہے تو میں شہروں کو خوبصورت بناؤں۔ فرمانے لگے کہ ''تم ان شہر والوں میں انصاف کرو' جس کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے اور انصاف کیلئے گواہ بن کر رہو اور اگر تم نے انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا تو یہ شہر اور اس کے رہنے والے خود بخود خوبصورت ہو جائیں گے''۔ یعنی جہاں انسان ایک دوسرے کے غمخوار ہوں' وہ شہر خوبصورت ہوتے ہیں اور جہاں آبادیاں خوبصورت ہوں' لیکن ہر ایک دوسرے کے گھر کو لوٹنے کی فکر میں ہو' وہاں خوبصورتی کے کیا معنی؟ اگر ہم دولت کی کثرت کو خوبصورتی سمجھتے ہیں تو یاد رکھیئے جہاں بھی حب دنیا کے نتیجے میں دولت آتی ہے وہاں پر یہ تقسیم بھی ضرور آتی ہے۔

اِس طرف بھی آدمی ہیں' اُس طرف بھی آدمی
اِن کے بوٹوں پہ چمک ہے' اُن کے چہروں پر نہیں

فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فرمایا: اے بنی اسرائیل اور امت محمدیہ ﷺ کے لوگو! (میں دونوں کو ساتھ ساتھ شریک کر رہا ہوں) تم میں سے جس کسی نے بھی' انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر اب اس کے بعد کفر کا راستہ اختیار کیا تو وارننگ دیتے ہوئے فرمایا کہ پھر یاد رکھو!

سَوَآءَ السَّبِيْلِ

فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ''وہ سَوَآءَ السَّبِيْلِ کو گم کر بیٹھا'' عام طور پر'' سَوَاءَ السَّبِيْلِ '' کا معنی سیدھا راستہ کیا جاتا ہے' میں نے اس کا معنی ''توسط و اعتدال کی شاہراہ'' کیا ہے۔ بظاہر یہ ایک چھوٹا سا لفظ ہے' مگر حقیقت میں یہ ایک بہت بڑا لفظ ہے۔

دیکھئے! انسان اگر اپنے آپ پر غور کرے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر ایک عالم اصغر رکھتا ہے' جس میں اس کی بے شمار قوتیں اور توانائیاں ہیں۔ دماغی قوتیں' قلبی توانائیاں' احساسات کی دولت' خواہشات کی فراوانی' ناآسودہ امنگیں اور نہ جانے کیا کیا آرزوئیں ہیں' ایک سمٹی ہوئی کائنات ہے جو اس کے اندر مضمر ہے۔ ظاہر ہے یہ اپنا ایک راستہ بھی بنانا چاہتی ہے۔ دنیا کے تمام انسان ان قوتوں سے مالا مال ہیں۔ یہ تمام مل کر جب ایک ایک راستہ بنانا چاہتے ہیں تو احساسات' احساسات سے ٹکراتے ہیں' توانائیاں' توانائیوں سے الجھتی ہیں' اس کے نتیجے میں بجائے اس کے کہ سب انسان ایک راستہ اختیار کریں' ہر آدمی ایک مختلف راستے پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ خود انسان کا اپنا حال یہ ہے کہ اگر اس کی قلبی امنگیں کوئی ایک راستہ اختیار کرتی ہیں تو خواہشات اس کو دوسری طرف ہانکتی ہیں۔ اگر اسے صحیح ماحول کا پس منظر میسر نہیں آتا تو دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر غلط رجحانات اس پہ غالب آجاتے ہیں اور قلبی کیفیتیں دب کر رہ جاتی ہیں' اگرچہ وہ کچھ وقت تک زور لگاتی ہیں کہ میں سیدھے راستے پر چلوں' لیکن دوسرے عوامل انسان کو دوسری طرف کھینچ کر لے جاتے ہیں' حتیٰ کہ اس کو کھینچتے کھینچتے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بعض اوقات اس انتہا تک لے جاتے ہیں جہاں جا کر اسے احساس ہوتا ہے کہ میں تو غلط راستے پر آ گیا۔ اب پھر وہ پلٹ کے جب دوسرے راستے پر چلنا چاہتا ہے تو وہ قوتیں اس کو کھینچ کھینچ کر دوسرے راستے پر لے

Marfat.com

جاتی ہیں اور اس کو دوسری انتہاء تک پہنچا دیتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ نکلتا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ سیدھا راستہ اختیار کر سکے اس کی قوتیں' توانائیاں' احساسات اور اندر باہر کی قوتیں اس کو کھینچ کر کبھی ایک دیوار کے ساتھ لگا دیتی ہیں اور کبھی دوسری دیوار کے ساتھ' انہی منحنی راستوں پر چلتے چلتے اس کی عمر بیت جاتی ہے۔

یہی انساں ہے سلطاں بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں
یہی شاہکار ہے تیرے ہنر کا

ان بہت سے ٹیڑھے اور غلط راستوں کے درمیان ایک ایسی راہ جو بالکل وسط میں واقع ہو' جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ' اس کے تمام جذبات و رجحانات کے ساتھ' اس کی روح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ اور اس کی زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہو' جس کے اندر کوئی ٹیڑھ' کوئی کجی' کسی پہلو کی بے جا رعایت اور کسی دوسرے پہلو کے ساتھ ظلم اور بے انصافی نہ ہو' انسانی زندگی کے صحیح ارتقا اور اس کی کامیابی و بامرادی سخت ضروری ہے۔ انسان کی عین فطرت اس راہ کی طالب ہے اور مختلف ٹیڑھے راستوں سے بار بار اس کے بغاوت کرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اس سیدھی شاہراہ کو ڈھونڈتی ہے۔ مگر انسان خود اس شاہراہ کو معلوم کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس کی طرف صرف اللہ راہنمائی کر سکتا ہے اور اللہ نے اپنے رسول اسی لئے بھیجے ہیں کہ اس راہِ راست کی طرف انسان کی راہنمائی کریں۔

قرآن اسی راہ کو سَوَآءَ السَّبِیۡلِ اور صراطِ مستقیم کہتا ہے۔ یہ شاہراہ دنیا کی اس زندگی سے لے کر آخرت کی دوسری زندگی تک بے شمار ٹیڑھے راستوں کے درمیان سے سیدھی گزرتی چلی جاتی ہے۔ جو اس پر چلا' وہ یہاں راست رو اور آخرت میں کامیاب و بامراد ہے اور جس نے اس راہ کو گم کر دیا' وہ یہاں غلط بیں' غلط رو اور غلط کار ہے اور آخرت میں لامحالہ اسے دوزخ میں جانا ہے کیونکہ زندگی کے تمام ٹیڑھے راستے دوزخ ہی کی طرف جاتے ہیں۔

فَبِمَا نَقۡضِہِمۡ مِّیۡثَاقَہُمۡ لَعَنّٰہُمۡ وَ جَعَلۡنَا قُلُوۡبَہُمۡ
تو اُن لوگوں کے عہد توڑ دینے کے سبب ہم نے اُن پر لعنت کی اور اُن کے دلوں
قٰسِیَۃً ۚ یُحَرِّفُوۡنَ الۡکَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِہٖ ۙ وَ نَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا
کو سخت کر دیا یہ لوگ کلمات (کتاب) کو اپنے مقامات سے بدل دیتے ہیں۔ اور جن باتوں کی اُن کو نصیحت
ذُکِّرُوۡا بِہٖ ۚ وَ لَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَۃٍ مِّنۡہُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡہُمۡ
کی گئی تھی اُن کا بھی ایک حصہ فراموش کر بیٹھے اور تھوڑے آدمیوں کے سوا ہمیشہ تم اُن کی (ایک نہ ایک) خیانت
فَاعۡفُ عَنۡہُمۡ وَ اصۡفَحۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۳﴾ وَ
کی خبر پاتے رہتے ہو۔ تو اُن کی خطائیں معاف کر دو اور (اُن سے) درگزر کرو۔ کہ خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا

Marfat.com

مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا

ہے۔ اور جو لوگ (اپنے تئیں) کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ ہم نے اُن سے بھی عہد لیا تھا مگر انہوں نے بھی اُس

ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ

نصیحت کا جو اُن کو کی گئی تھی ایک حصہ فراموش کر دیا تو ہم نے اُن کے باہم قیامت تک کے لیے دشمنی اور کینہ ڈال

الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿١٤﴾ يٰٓاَهْلَ

دیا۔ اور جو کچھ وہ کرتے رہے خدا عنقریب اُن کو اس سے آگاہ کرے گا ف۔ اے اہل کتاب

الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ

تمہارے پاس ہمارے پیغمبر (آخر الزمان) آگئے ہیں کہ جو کچھ تم کتاب (الٰہی) میں سے چھپاتے تھے وہ اس

تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ڛ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ

میں سے بہت کچھ تمہیں کھول کھول کر بتا دیتے ہیں اور تمہارے بہت سے قصور معاف کر دیتے ہیں بیشک تمہارے

اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٥﴾ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ

پاس خدا کی طرف سے نُور اور روشن کتاب آ چکی ہے۔ جس سے خدا اپنی رضا پر چلنے والوں کو نجات کے رستے دکھاتا

سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ

ہے اور اپنے حکم سے اندھیرے میں سے نکال کر روشنی کی طرف لے

يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٦﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ

جاتا اور اُن کو سیدھے رستے پر چلاتا ہے۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ عیسیٰؑ

اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ

بن مریمؑ خدا ہیں وہ بیشک کافر ہیں۔ (اُن سے) کہہ دو کہ اگر خدا عیسیٰؑ بن مریمؑ اور اُن کی

شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَ

والدہ کو اور جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کو ہلاک کرنا چاہے تو اُس کے آگے کس کی

Marfat.com

مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ؕ وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
پیش چل سکتی ہے؟ اور آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں میں ہے سب پر
وَمَا بَیْنَھُمَا ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۷﴾
خدا ہی کی بادشاہی ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اور خدا ہر چیز پر قادر ہے

آیت:۱۳ فَبِمَا نَقْضِھِمْ مِّیْثَاقَھُمْ لَعَنّٰھُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَھُمْ قٰسِیَةً ج یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ لا وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوْا بِہٖ ج وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْھُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْھُمْ فَاعْفُ عَنْھُمْ وَاصْفَحْ ط اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ O

''ان کی عہد شکنی کے باعث ہم نے ان پر لعنت کی اور ہم نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ وہ لوگ کلام کو اس کے مواقع سے بدلتے ہیں۔ اور انہوں نے اس نصیحت کا بیشتر حصہ بھلا دیا ہے۔ جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی۔ آپ (ﷺ) کو ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہی ہوتی رہے گی۔ مگر (ان میں) تھوڑے ہیں جو بچے ہوئے ہیں۔ سو ان کو معاف کر دیجئے اور ان سے درگزر فرمائیے۔ بے شک اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔

کوئی سرکش گروہ اللہ کا چہیتا نہیں ہوتا

اللہ تعالیٰ ہمیشہ جب کسی قوم کو (خواہ وہ مسلمان ہوں یا بنی اسرائیل) داعی کے منصب پر فائز کرتا ہے تو ان سے ایک عہد لیا کرتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہمیں اس عہد کی یاددہانی کرائی گئی ہے کہ دیکھو! بالکل اسی طرح کا عہد ہم نے بنی اسرائیل سے بھی لیا تھا اور پھر جب انہوں نے اس سے انحراف کرتے ہوئے عہد شکنی کی تو ان پر اللہ کا عذاب آیا۔ دراصل ان سب باتوں سے امت مسلمہ کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اب تم جس منصب پر فائز ہو' تمہارے علاوہ دوسری کوئی قوم اس منصب پر فائز نہیں۔ تم آخری رسول کی آخری امت ہو' اگر تم نے اس منصب کی عہد شکنی کی تو کچھ عجب نہیں کہ تم پر بھی اسی طرح عذاب الٰہی آ جائے اور جس طرح آج تم بنی اسرائیل کی جگہ فائز کئے گئے ہو' کل تمہاری جگہ کسی اور کو فائز کر دیا جائے۔

اللہ نے ہمیشہ اپنے دین کا کام انسانوں ہی سے لیا ہے اور چونکہ اس کی کسی قوم سے رشتہ داری نہیں ہے' لہٰذا ناروا عنایت بھی کسی پر نہیں ہوتی۔ اللہ کا قانون اور سنت یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم اور گروہ اس کے ساتھ کئے گئے عہدوں کو پورا کرتا ہے' تب تک اللہ کی بے پایاں عنایات اس کے شامل حال رہتی ہیں اور جب کوئی گروہ اس سے سرکشی کرتا ہے تو پھر وہ گروہ خواہ ہزار ہا نبیوں کی اولاد ہی کیوں نہ ہو یا اس امت کا رشتہ نبی آخرالزماں ہی سے کیوں نہ ہو' وہ ان کو اس عظیم منصب سے معزول کر دیتا ہے۔

ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ عربوں نے جب نااہلی کا ثبوت دیا تو بغداد سرنگوں ہو گیا اور تاتاریوں کے ہاتھوں ان پر ایسی تباہی لائی گئی کہ لگتا تھا کہ دین اسلام کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہے گا۔ لیکن اللہ کی یہی سنت غالب آئی اور اللہ کا قانون حرکت میں آیا اور اس نے خود تاتاریوں کو اسلام کی دولت

Marfat.com

بخشی اور انہی میں سے ایسے لوگ اٹھائے جو تاریخ کے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے بالآخر خلافت عثمانیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن جب انہوں نے بھی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کوتاہی برتی تو قدرت نے ان کو بھی ختم کر دیا۔ نتیجتاً آج تمام امت مسلمہ اپنی گردن میں ذلت کا طوق ڈالے اپنی سزا سے گزر رہی ہے اور تاریخ اس بات کے انتظار میں ہے کہ دیکھیں! امت مسلمہ کا کونسا گروہ اس عظیم ذمہ داری کی ادائیگی کیلئے آگے بڑھتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ چون (54) سال پہلے اللہ نے اس ملک کے رہنے والوں کو شاید اسی ذمہ داری کی ادائیگی کیلئے چنا تھا۔

یہ آیات ہمیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ لوگو! اپنے منصب کو سمجھو' اپنے میثاق کو یاد رکھو۔ اس میں تمہاری عزت وزندگی کی بقا ہے۔

ان آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا' مگر انہوں نے جب عہد شکنی کا ارتکاب کیا تو پھر ان کے ساتھ کیا ہوا؟ ان نکات پر نظر رکھتے ہوئے ہم ان آیات کو دیکھتے ہیں۔ فرمایا کہ ہم نے جب یہ ذمہ داری ان پر ڈالی اور ان سے عہد لیا تو کہا تھا کہ

﴿میں تمہارے ساتھ ہوں' ہر وقت تمہاری مدد کروں گا۔ لیکن میری کچھ شرائط ہیں اور وہ یہ کہ تم نماز پڑھتے رہنا، زکوٰۃ ادا کرتے رہنا' جو انبیاء ہم بھیجیں گے' ان پر ایمان لانا' ان کے دست راست بننا اور اللہ کو قرض حسنہ دیتے رہنا﴾

مگر ان لوگوں نے ان میں سے ایک ایک عہد کو توڑا۔ نہ اللہ کے بھیجے ہوئے قاصدوں کی مدد کی' نہ دین کے احیاء اور نفاذ کیلئے ہاتھ پاؤں ہلائے' نہ اقامت صلوٰۃ کی پابندی کی اور نہ ہی اقامت زکوٰۃ پر قائم رہے یعنی ان کے ذمے صرف اللہ سے وفاداری کرنا تھا۔ جب انہوں نے اللہ کی وفاداری کو چھوڑ کر نجانے اور کس کس سے وفاداری شروع کر دی تو انہیں سخت ترین سزا دی گئی۔ فرمایا کہ ہم نے سزا کے طور پر ان پر لعنت کی۔ ایک اور جگہ اس کی وضاحت کیلئے اللہ نے قرآن میں یہ الفاظ استعمال کئے ہیں:

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ق وَبَآءُ وْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط

﴿ہم نے ان پر ذلت اور مسکنت کی پھٹکار ماری اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے (البقرۃ:61)﴾

یعنی لعنت کی ایک صورت ذلت' مسکنت اور غضب ہے۔ گویا اللہ جس قوم کو سزا دینا چاہتا ہے' اسے اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے۔

اب بنی اسرائیل ہی کی تاریخ دیکھیں کہ کہاں تو وہ حال کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کچھ زمانے قبل تک' پھر موسیٰ علیہ السلام سے لے کر باقی پوری تاریخ میں اللہ نے اس قوم کو کتنی سربلندیوں سے نوازا' اعزازات عطا کئے اور انہیں اپنا چہیتا بنا کر پالا' یہاں تک کہ ان کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ شاید ہمارا اللہ سے کوئی رشتہ ہے اور کہاں پھر یہ حال کہ اللہ سے عہد شکنی اور بے وفائی اور اللہ کی بجائے دوسروں سے تعلقات استوار کرنے کے باعث اللہ نے ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا اور رحمت کی دوری کے باعث ان کے دل سخت کر دیئے گئے۔

اللہ کے عذاب کی پہلی نشانی دلوں کا سخت ہو جانا ہے

جب بھی کوئی امت یا افراد اللہ کی رحمت سے دور کئے جاتے ہیں اور اس کے غضب کا شکار ہوتے ہیں تو اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ ان کے دلوں کو سخت کر دیتا ہے کیونکہ جب بھی کوئی اللہ سے کئے گئے عہد سے اعراض وانحراف کرتا ہے تو اللہ اس کے نفس لوامہ کو حکم دیتا ہے کہ تم اس کو ملامت کرو کہ یہ لوٹ آئے۔ لیکن جب آدمی ضمیر کی بات بھی نہیں سنتا اور قرآن سے دور ہوتا چلا جاتا ہے تو مسلسل اس کے اس عمل سے قانون قدرت حرکت میں آتا ہے اور غفلت کا ایک سیاہ دھبہ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے۔ اب اگر تو وہ شخص فوراً اللہ سے توبہ کر لے' تو وہ دھبہ ہٹا دیا جاتا ہے اور اگر وہ ایک گناہ کے بعد دوسر

Marfat.com

گناہ کرتا ہے تو دوسرا دھبہ پڑ جاتا ہے۔ اگر وہ پھر بھی نیکی کی طرف نہیں آتا اور توبہ نہیں کرتا تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر اس شخص کا دل مسلسل داغ داغ ہوتا چلا جاتا ہے' حتیٰ کہ ایک دن ایسا آتا ہے کہ اس کا دل قبولیت کی استعداد سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی کو دلوں پر مہر لگنا کہتے ہیں۔ یاد رکھئے! مہر لگنے کا فیصلہ تو اللہ کی جانب سے ہوتا ہے' مگر اس کا سبب وہ برا آدمی خود بنتا ہے جو مسلسل گناہ سے اپنے دل کے شفاف آئینے کو داغ دار کر کے اس کی نورانیت کھو دیتا ہے کیونکہ اللہ کسی پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔

یہی معاملہ بنی اسرائیل کے ساتھ بھی ہوا کہ انہوں نے اپنی مسلسل نافرمانیوں کے باعث خود کو اللہ کی رحمت سے دور کر لیا اور اللہ نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ اب انہیں نصیحت بھی کرو تو یوں لگتا ہے کہ جیسے آپ کسی پتھر سے مخاطب ہیں۔ گویا ایک دیوار ہے جس سے آپ سر پٹخ رہے ہیں۔ جو لوگ دعوت و تبلیغ کا تجربہ رکھتے ہیں' وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ بعض اوقات ایسے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑ جاتا ہے کہ ان میں قبولیت کی کوئی رمق دکھائی نہیں دیتی اور انسان سوچتا ہے کہ کاش! میں نے اس شخص کو دعوت ہی نہ دی ہوتی۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی محرومی کا فیصلہ کیا جا چکا ہوتا ہے اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا جاتا ہے۔

اہل کتاب کے دل کی سختی تاریخ کے آئینے میں

بعض مقامات پر قرآن نے انسانوں کے دلوں کی سختی کو پتھروں سے بھی بڑھ کر بتایا ہے اور واقعی ایسا دیکھا گیا کہ انسان جب کسی پر ظلم توڑنے پر آتا ہے تو درندوں سے ہزار درجہ بڑھ کر درندہ بن جاتا ہے۔ مثلاً وہ لوگ یا حکومتیں جو دنیا میں حقوق کا چارٹر لئے پھرتے ہیں' کسی ملک میں مارشل لاء آئے تو وہاں کے رہنے والوں کے حقوق کی فکر انہیں ستانے لگتی ہے' لیکن خود جب انہی حقوق کے علمبرداروں کو کسی قوم پر حکومت یا جارحیت کا موقع ملتا ہے تو پھر ظلم کا کوئی ایسا ریکارڈ نہیں رہ جاتا جو توڑا نہ جاتا ہو۔ مثلاً کبھی جیتے جی انسانوں کو کسی مہذب قوم نے پنجروں میں بند نہیں کیا ہوگا' کبھی کسی کے مسلمان ہونے کے جرم میں ان کی داڑھیاں نہیں مونڈھی ہوں گی' کبھی ان کو برہنہ کر کے ان کی تصویریں نہیں لی گئی ہوں گی' کبھی اسرائیل کی طرح کسی اور قوم نے زندہ بچوں کو اٹھا کر زندہ حالت میں ان کے اعضاء ان کے جسموں سے نکال کر ان کی لاشوں سے فائدہ نہیں اٹھایا ہوگا۔ یہ بات کوئی نئی نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی لیبیا کے جنگلوں میں انہی اہلِ کتاب کہ جن کا یہاں ذکر ہے (کہ ان کا دل سخت کر دیا گیا) انہی لوگوں نے طرابلس کے میدانوں میں ہوائی جہاز سے ہزاروں کی تعداد میں انسانوں کو زندہ گرایا اور وہ لوگ تڑپ تڑپ کے بھوک سے مرے' مگر ان حقوق کے علمبردار مہذب لوگوں نے کبھی نہ پوچھا کہ ان کی لاشیں کہاں گئیں۔ 1857ء میں صرف دہلی میں چودہ ہزار علماء کو اس طرح پھانسی پر لٹکایا گیا تھا کہ جب انہیں رسہ باندھ کر لٹکا دیا جاتا تو نیچے آگ سلگائی جاتی اور جب ان کی لاشیں جل کر چُر مُر ہو جاتیں تو انگریز عورتیں نیچے کھڑے ہو کر تالیاں پیٹتی تھیں کہ انگریزی کا آٹھ بن گیا۔

ہمارے دلوں کی کیفیت موجودہ حالات کے تناظر میں:

ان اہل کتاب نے جب بیت المقدس پر قبضہ کیا تھا تو ان کی فوج اس حال میں یروشلم اور بیت المقدس میں داخل ہوئی تھی کہ ان کے گھوڑوں کے صرف پاؤں ہی نہیں' پنڈلیاں تک خون میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ گلیوں میں خون کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ پھر جب انہی سے نوے (90) سال کے بعد صلاح الدین ایوبی نے اللہ کے اس گھر کو آزاد کروایا تو مصنف سٹینلے پول لکھتا ہے کہ صلاح الدین ایوبی صرف اپنے زمانے کا ہی نہیں بلکہ تمام زمانوں کا بڑا آدمی تھا۔ وہ لکھتا ہے:

Marfat.com

صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس نے کسی ایک آدمی کی نکسیر تک بھی نہیں پھوٹنے دی اور پکڑے جانے والے تمام قیدیوں میں سے کچھ کو اس کے بھائی عادل نے اور زیادہ تر کو خود اس نے فدیہ دے کر آزاد کرایا بلکہ قیدیوں کو رخصت کرتے ہوئے ضرورت کا سامان اور پیسے تک دیئے کہ وہ حالات کی بہتری تک گذارہ کرسکیں۔

ہم تو ایسی تاریخ رکھنے والے لوگ ہیں، مگر پھر بھی ہم نے کبھی حقوق کی پاسداری کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن وہ لوگ جن کے دل اللہ نے سخت کر دیئے، ہم نے ان کے چہرے کل تک تاریخ میں دیکھے تھے اور آج سورج کی روشنی میں کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ واقعی وہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو اور اپنے بھائی بندوں کو یہ بات سمجھانی چاہئے کہ جس طرح آج پورے عالم میں مسلمانوں پر ظلم کا بازار گرم ہے اور اس کے خلاف کسی اسلامی ریاست سے کوئی مؤثر آواز بلند نہیں ہو رہی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے دل بھی سخت ہو گئے ہوں، کیونکہ قرآن ہم ہی سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے:

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ لا وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ط وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ O ﴿کیا مسلمانوں پر ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پسیج جائیں اور نرم پڑ جائیں اور مسلمان کہیں ایسے نہ ہو جائیں جیسے کہ ان سے پہلے اہل کتاب تھے کہ جب انحراف اور معصیتوں کی عمر دراز ہوتی چلی گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور پھر ان کے بیشتر لوگ نافرمان ہی نکلے﴾ (الحدید: 16)

ہمیں فکر کرنی چاہئے کہ کہیں ہم بھی تو ایسے نہیں ہو گئے۔

ایسی قوم جس پر اللہ لعنت کر دے، نتیجتاً اس کا دل اس حد تک سخت ہو جاتا ہے کہ اللہ کی کتابیں بھی اس کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہتیں۔ چنانچہ جب اہل کتاب اس لعنت کا شکار ہوئے تو نماز جیسا فریضہ نہ صرف ان کے عمل سے نکل گیا، بلکہ تورات سے اس کی فرضیت تک کا ذکر نکال باہر کیا۔ مسلمانوں سے دشمنی اور حسد کے مرض میں مبتلا ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی دعوت، مرکز دعوت، ان کی عظیم قربانی اور بیت اللہ تک کی تاریخ بالکل بدل کر رکھ دی۔

پھر فرمایا کہ ''انہوں نے بھلا دیا اس نصیحت کا بیشتر حصہ، جو انہیں نصیحت کی گئی تھی''۔ قرآن کریم سے پہلے جس کتاب کو الکتاب کہا جاتا ہے، وہ توریت ہے، انجیل اس کا ضمنی ایڈیشن ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو توریت کی شریعت پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا تھا، کیونکہ انجیل میں شریعت نہیں آئی۔ اس لئے جس کتاب میں تحریف کا ذکر ہے، وہ توریت ہے اور اسی کے بیشتر حصہ کو بھلا دیا گیا تھا اور جب میثاق ہی توڑ ڈالا گیا تو پھر توریت سے ان کا کیا تعلق باقی رہتا؟ اسی میثاق کی بدولت تو وہ کتاب کے پابند کیے گئے تھے۔ مگر جب انہوں نے میثاق توڑا تو پھر کتاب سے جس طرح کا تعلق چاہا، رکھا، جب چاہا توڑ دیا۔ جو حکم چاہا لے لیا، جو چاہا چھوڑ دیا۔

اور یہاں ''حَظًّا'' کا دوسرا معنی نصیب لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ نے جس چیز کے ذریعے ان کی قسمت بنائی، اس کو بھلا کر یا اس کے بہت سے احکام عمل میں نہ لا کر اپنی قسمت بگاڑ لی۔

قرآن کریم اہلِ کتاب کے اس قصے اور روش کی داستان محض یونہی نہیں سنا رہا بلکہ دراصل اس سے امت محمدیہ علی صاحبھا السلام کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ دیکھو! تم یہ روش ہرگز اختیار نہ کرنا۔

Marfat.com

آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

﴿جس راستے سے اہل کتاب میں کمزوریاں آئیں' انہی راستوں سے تم میں بھی آئیں گی۔ دیکھنا! ان راستوں پر نہ چلنا یا ان دراڑوں کو نہ کھلنے دینا۔﴾

ایک اور جگہ فرمایا کہ

﴿مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ تم ان راستوں سے ضرور گزرو گے اور ان بلوں میں ضرور گھسو گے جن میں وہ (اہل کتاب) گھس کر رہے اور تباہ ہوئے﴾

اللہ کی کتاب اور ہماری روش

میں بار بار اس طرف توجہ دلاتا ہوں کہ ہمیں اپنے آپ پر نظر رکھنی چاہئے کہ اعمال واحکام میں انہوں نے جس طرح توریت کو ایک کھیل بنا کر رکھ دیا تھا کہ جس بات پر عمل نہ کرنا چاہتے' اسے تاویل کی سان پر چڑھا کر کچھ سے کچھ بنا دیتے اور جن چیزوں کو بالکل نظرانداز کرنا چاہتے' تو ان کو سرے سے کتاب سے نکال دیتے اور اگر باقی رکھتے تو پھر اسے قانون کی شکل نہ بننے دیتے۔ کہیں ہمارا طرز عمل بھی ایسا تو نہیں؟ اگر صاف صاف بات کہی جائے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ تو بالکل ہماری کہانی ہے۔ اللہ کی کتاب ہمارے پاس بھی موجود ہے۔ اس میں معاملات' عبادات' معاشرت' معیشت' سیاست' قومی اور بین الاقوامی آداب سب کچھ موجود ہے۔ زندگی کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہے' وہ تمام کی تمام اس کتاب اور آپ ﷺ کی سنت میں موجود ہیں۔ لیکن ہم نے اس سے عبادات تو لے لیں' مگر اس نے عدالت کا جو نظام دیا تھا' حدود اللہ اور شرعی قوانین دیئے تھے' وہ کہاں ہیں؟ سیاست وحکمرانی کا جو ڈھانچہ اور خدوخال دیئے' وہ کیا ہوئے؟ اس نے ہمیں پوری ایک معیشت دی تھی' جس میں سود کا کوئی تصور نہیں تھا' وہ کہاں گم ہوگئی؟ اس نے ہمیں ایک معاشرت دی تھی' جس میں مردوزن کے اختلاط کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔ اس نے عورتوں کو حیاء کی ایک چادر پہنائی تھی' غیرت کا غازہ بخشا تھا' وہ قصہ پارینہ بن گیا۔ کتاب اللہ ہمارے گھروں میں تو موجود ہے' مگر دلوں سے دور ہے۔ وہ جس زبان میں ہے' ہم اس زبان سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ اسی کو اللہ فرماتا ہے کہ ''انہوں نے اس کتاب کا بیشتر حصہ بھلا دیا یا یہ کہ بیشتر سے فائدہ اٹھانا چھوڑ دیا۔'' ہم نے بھی یہی کیا ہے۔

اہل کتاب کی ان تمام حرکات سے آگاہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ سے مخاطب ہیں اور فرماتے ہیں کہ ''آپ برابر ان کی کسی نہ کسی خیانت پر مطلع ہوتے رہتے ہیں' یعنی ہم آپ کو مطلع کرتے رہتے ہیں تاکہ جہاں ضرورت ہو آپ اس کی اصلاح کر دیں تاکہ تکمیل دین کا کام انجام پذیر ہو۔

اس کے ساتھ ہی فرمایا: ''آپ ان کو معاف فرما دیجئے اور درگزر کیجئے''۔ بات یہ ہے کہ جب مجھے یہ معلوم ہو کہ میرے فلاں ہمسائے نے میرے ماں باپ کے چھوڑے ہوئے خزانے میں سے خیانت کا ارتکاب کیا ہے تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میرے ذہن میں نفرت کا کیسا لاوا ابلے گا اور دل کبھی آمادہ نہ ہوگا کہ میں ان لوگوں سے ملوں' چاہے وہ رشتے میں میرے چچا کے بیٹے ہی کیوں نہ ہوں .... یہ بنی اسرائیل بنی اسماعیل کے چچا زاد ہی تو تھے۔ جب آپ ﷺ اور مسلمانوں نے قرآن کے ذریعے یہ جانا کہ انہوں نے کتاب اللہ کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے' بالخصوص آنحضرت ﷺ کے متعلق جو کچھ توریت میں موجود تھا' اس میں سے شاید ہی کوئی بات باقی چھوڑی ہو تو ظاہر ہے کہ ایک ناگواری کی فضاء پیدا ہوئی ہوگی اور خود آنحضرت ﷺ پر اس کا اثر ہوا ہوگا۔ اس لئے اللہ نے دکھ اور غصے کے انسانی جذبے کو بھڑکنے سے روکنے کیلئے درگزر کرنے کا حکم دیا' جس کا بظاہر خطاب تو آپ ﷺ سے ہے مگر دراصل اس وقت کی پوری امت مسلمہ سے خطاب ہے کہ دیکھو! ایسے کسی جذبے سے مغلوب ہو کر اپنی دعوت وتبلیغ کے فریضے میں کمی بیشی نہ کرنا۔

Marfat.com

آپ داعی ہیں اپنا کام جاری رکھئے۔ یہ مرحلہ چونکہ دعوت وتبلیغ کا تھا لہٰذا پردہ پوشی اور درگزر کا حکم دیا گیا۔ مزید تحقیق تفتیش سے بھی روک دیا گیا کہ فی الحال اس میں نہ پڑیئے بلکہ درگزر سے کام لیجئے۔ یہ الگ بات ہے کہ آگے چل کر سورۃ التوبہ میں وہ مرحلہ بھی آیا کہ اللہ نے ایسے لوگوں کو سزا دینے کا حکم دے دیا اور آپ ﷺ کی طبیعت کی نرمی دیکھتے ہوئے حکم ہوا کہ اب نرمی نہ برتیں بلکہ سختی کریں۔ مگر چونکہ ابھی اس آیت کے نزول کے وقت دعوت اپنی تکمیل کو نہیں پہنچی تھی لہٰذا اتمام حجت کا وقت نہیں آیا تھا۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ دعوت کا اصول یہ ہے کہ دوسری طرف سے چاہے کیسی ہی باتیں سننے میں آئیں مگر آپ کبھی اشتعال کا شکار نہ ہوں بلکہ نہایت صبر وتحمل کے ساتھ دعوت جاری رکھیں۔

آگے فرمایا کہ "بے شک اللہ احسان کا معاملہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔ اللہ کا اصول یہ ہے کہ وہ بدلہ لینے کی اجازت تو دیتا ہے مگر اس کے یہاں اس کی محبت کے مستحق وہ ہوتے ہیں جو احسان کیا کرتے ہیں۔

محسنین کی بہترین مثال

"محسنین" کے میں تین ترجمے کرتا ہوں: نیکوکار خوب کار احسان کرنے والے۔ نیکی یہ ہے کہ آپ ان کے ساتھ نیکی کریں لیکن اگر آپ گرفت کر لیں تو بھی ٹھیک ہے۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ آپ خوب کار ہوں اور خوب کاری یہ ہے کہ آپ ایسے معاملے میں جہاں بدلہ لیا جانا ہو وہاں رحم اور مروت کریں۔ تیسری بات یہ کہ صرف اسی پر اکتفا نہ کریں کہ رحم ومروت کا سلسلہ جاری رکھیں بلکہ اس سے بڑھ کر ان کے ساتھ احسانات بھی کریں۔

ایک مرتبہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ ان کا غلام اندر سے کھانا لا رہا تھا کہ ایک گرم گرم شوربے کا پیالہ لئے وہ جب آپ کے قریب پہنچا تو نجانے کیسے وہ برتن ہاتھ سے چھوٹ کر آپ کی کمر پر جا گرا۔ ایسے لگا جیسے کھال تک اتر گئی ہو۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ غلام خاندان نبوت میں پلا تھا وہ جانتا تھا کہ قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ اس نے ایک آیت قرآنی کا پہلا جملہ تلاوت کیا:

"وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ" ﴿جو اللہ والے ہوتے ہیں وہ غصے کو پی جایا کرتے ہیں﴾

بس یہ جملہ سننے کی دیر تھی کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے سر جھکا دیا۔ غلام نے دیکھا کہ لوہا گرم ہے تو اس نے فوراً آیت کا اگلا ٹکڑا پڑھا:

"وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ" ﴿وہ لوگوں کو معاف بھی کر دیا کرتے ہیں﴾

حضرت حسن رضی اللہ عنہ بولے: جا میں نے تجھے معاف کر دیا۔ اب اس غلام نے آیت کا تیسرا ٹکڑا پڑھا:

"وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ" ﴿اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے﴾ (آل عمران: 134)

کہنے لگے کہ جا میں نے تجھے آزاد کیا۔

یہی بات یہاں بیان کی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ حضور ﷺ سے بڑھ کر اخلاق کس کے ہیں اس لئے کہ جو سند قرآن نے آپ ﷺ کو جاری کی ہے وہ دنیا میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی کہ "آپ تو خلق عظیم کے مالک ہیں" تو اسی لئے حکم ہوا کہ آپ تو خلق عظیم کے پیکر ہیں لہٰذا احسان کریں۔

آیت:۱۴ وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُ

Marfat.com

الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ O ''وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان سے بھی عہد لیا، لیکن انہوں نے بھی اس کا بیشتر حصہ بھلا دیا، اس کتاب سے جس سے ان کو نصیحت کی گئی تھی۔ تب ہم نے ان میں بھڑکا دی بغض اور عداوت قیامت کے دن تک کے لئے اور عنقریب اللہ ان کو بتائے گا جو کرتوت وہ کرتے رہے''۔

لفظ نصاریٰ کی تاریخ

جس طرح کا عہد و پیمان ہم سے اور یہود سے لیا گیا، وہی عہد و پیمان نصاریٰ سے بھی لیا گیا۔ یہاں اس کی تاریخ کو بیان کیا جا رہا ہے۔ لفظ نصاریٰ کے حوالے سے معترضین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کو تم لوگ بہت سنجیدہ کتاب کہتے ہو اور کہتے ہو کہ قرآن کسی کو آزار نہیں پہنچاتا تو پھر یہ لفظ ''نصاریٰ'' ہمارے لئے کیوں استعمال ہوا ہے؟ یہ تو توہین آمیز لفظ ہے۔ پہلا جواب تو یہ ہے کہ قرآن کریم یہ نہیں کہتا کہ تم نصاریٰ ہو، بلکہ یہ کہتا کہ جن لوگوں نے یہ کہا کہ ''ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان سے عہد لیا''۔ اب اگر لفظ نصاریٰ کے استعمال کی ذمہ داری ہے تو تمہارے ہی آباؤ اجداد پر ہے، جنہوں نے یہ لفظ استعمال کیا۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ قرآن تاریخ بیان کرتے ہوئے جھوٹ بولے جیسے تم بولتے ہو؟

دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ اصلاً یہ لفظ ''ناصری'' کی جمع ہے اور یہ ناصرہ گاؤں کی طرف منسوب ہے جو گلیلی کے علاقے میں واقع ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کی توہین و تذلیل کیلئے نصاریٰ کے نام سے انہیں پکارنا شروع کیا تھا اب قرآن بھی اسی نسبت سے انہیں نصاریٰ کہہ رہا ہے۔ مگر ایسے لوگوں کو علم ہونا چاہئے کہ جب قرآن، نصاریٰ کہتا ہے تو اس کی نسبت ''مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ'' کی طرف کرتا ہے، جن کی قرآن نے بار بار تعریف کی ہے اور جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری کہا گیا ہے۔ قرآن کی رو سے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحابہ تھے اور جن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ سوال کیا تھا کہ

''مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ'' ''تم میں سے کون ہے جو اللہ کی دعوت پیش کرنے کیلئے میرا ساتھ دے گا'' (الصف:14)

نصرت دین کی وجہ سے یہ لوگ انصار کہلائے، جیسے کہ اہل مدینہ بھی انصار کہلائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں نے ایک مدت تک اپنا کوئی نام نہیں رکھا۔ وہ خود کو بنی اسرائیل ہی سمجھتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے شاگرد، درویش یا پھر کبھی مقدس کا لفظ استعمال کیا۔

دین اخوت کی بنیاد ہے

فرمایا کہ ''وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں، ان سے ہم نے عہد لیا''۔ مگر آگے چل کر سینٹ پال کے عقیدے پر چلنے والے لوگ جب آئے تو انہوں نے بھی وہی حرکت کی جو اس سے پہلے یہود کر چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

''فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ''

﴿تب ہم نے ان میں بھڑکا دی بغض اور عداوت قیامت کے دن تک کیلئے۔ اور عنقریب اللہ ان کو بتائے گا جو کرتوت وہ کرتے رہے۔﴾

یہاں یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ کسی کے درمیان خود سے بغض و عداوت پیدا کرتا ہے، بلکہ یہ کہ دنیا میں اخوت پیدا کرنے کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو نہ تو وہ زبان ہے کیونکہ سب کی زبانیں ایک نہیں، نہ جغرافیہ کیونکہ ساری دنیا ایک جگہ پیدا نہیں ہوتی۔ رنگ و نسل بھی نہیں کیونکہ دنیا ایک رنگ و نسل سے تعلق

Marfat.com

نہیں رکھتی۔ مفادات اور رشتے بھی نہیں کہ یہ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اگر اس کی کوئی بنیاد ہے تو وہ دین ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حبش سے آئے حضرت حسن رضی اللہ عنہ بصرہ سے اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ روم سے۔ یہ سب مسلمانوں کے سر کے تاج ہیں۔ لیکن ابولہب و ابوجہل ان کے اپنے بھائی بندوں میں سے تھے، مگر راندۂ درگاہ اور واجب القتل ٹھہرے۔ لہٰذا اخوت دین سے بنتی اور میثاق سے باقی رہتی ہے۔

قانون قدرت یہ ہے کہ تم دین پر چلو اور اس پر عمل کرو اخوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا ہوگی۔ دیکھیں کہ قرآن کریم کہتا ہے:

وَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ ۙ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیۡنَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ عَزِیۡزٌ حَكِیۡمٌ

﴿اور الفت ڈال دی ان کے دلوں میں۔ اگر تم سب کچھ خرچ کر دیتے جو زمین میں ہے ان کے دلوں میں الفت نہ ڈال سکتے، لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت ڈال دی۔ بے شک وہ غالب، حکمت والا ہے۔ (الانفال:63)﴾

یہ محبت دین کے حوالے سے پیدا ہوتی ہے، جیسے مہاجر و انصار میں بھائی چارہ پیدا ہوا۔

قرآن میں اللہ نے فرمایا کہ

﴿اے نبی ﷺ! اگر آپ دنیا کا سارا مال خرچ کر کے بھی ان کے دلوں میں الفت ڈالنا چاہتے تو نہیں ڈال سکتے تھے۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ان کو آپ کی معرفت دین دیا اور اسی کے حوالے سے ان کے دلوں میں گداز پیدا کیا (اور وہ بھائی بھائی بن گئے)۔ وہ غالب، حکمت والا ہے۔﴾

اسی لئے اس نے کہا کہ اگر تم دین قائم کرو گے تو میں تمہارے درمیان محبت ڈالوں گا اور اگر دین نہیں رہے گا تو اخوت بھی نہیں رہے گی۔ اخوت چاہتے ہو تو دین کے واسطے سے اخوت پیدا کرو ورنہ قیامت تک بغض و عناد کا شکار رہو گے۔

ممکن ہے پڑھنے والوں کے دلوں میں یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ وہ تو اب اس موجودہ دور میں اکٹھے ہو گئے ہیں، جبکہ ہم فرقہ فرقہ ہیں اور انہیں سزا ملی تو کیا ہمیں نہیں ملے گی؟

پہلی بات تو یہ کہ وہ اکٹھے ہوئے بے دین ہو کر۔ ان کے وقتی مفادات ہیں جن کی بنیاد پر وہ اکٹھے کھڑے ہیں۔ اگر وہ حقیقتاً اکٹھے ہوتے تو ان ہم مذہبوں سے دو جنگیں کبھی نہ لڑتے۔ اب ان کی کوشش یہ ہے کہ تیسری جنگ ہمارے یہاں لڑی جائے، ورنہ وہ اکٹھے نہیں ہیں۔

دوسری بات یہ کہ یہاں یہ نہیں کہا جا رہا کہ انہوں نے میثاق کو توڑا تو ان کو سزا ملی اور اے مسلمانو! اگر تم بھی ایسا کرو گے تو تمہیں سزا نہیں ملے گی۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ باوجود اس کے کہ اللہ کی کتاب تمہارے پاس محفوظ ہے، اگر تم نے بھی عہد و میثاق کی پرواہ نہ کی تو تمہارا حال بھی کچھ ان سے مختلف نہ ہوگا۔

یہ قرآن مرکھپ جانے والوں کے قصے اسی لئے تو سناتا ہے کہ ہم اس سے نصیحت حاصل کریں اور خود کو ان برے اعمال اور نتائج سے بچالیں وہ پچھلے لوگ کر گزرے۔ اگر ہم بھی شیعہ و سنی بن کر اس میثاق کو توڑیں گے تو ہمارے درمیان بھی مستقل بغض و عداوت رہے گی۔

آیت:۱۵ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ؕ قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ۙ ''اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول (محمد ﷺ) آ گیا ہے۔ (دیکھو!) وہ باتیں تم اپنی کتاب میں سے چھپاتے رہے ہو وہ سب باتیں وہ بیان کر رہا ہے اور زیادہ تر باتوں سے درگزر کر رہا ہے۔ جان لو! تمہارے پاس اللہ کی طرف

Marfat.com

اور کتابِ مبین آ گئی''۔

فرمایا: اے اہل کتاب! تم نے جو کچھ اپنے دین اور اپنی کتاب کا حشر کیا سو کیا' اب تمہارے پاس ایک نادر موقع ہے جو پھر کبھی نہ آئے گا کہ اللہ نے اپنا آخری رسول اور کتاب بھیجی ہے اور تمہارے علماء جانتے ہیں کہ یہ وہی کتاب اور وہی رسول ہے جس کا ذکر تمہارے انبیاء کرتے رہے۔ لہٰذا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس مصیبت سے نکل جاؤ اور دیکھو! وہ باتیں جو تم اپنی کتاب میں سے چھپاتے رہے ہو' وہ سب باتیں ہمارا یہ نبی بیان کر رہا ہے اور زیادہ تر باتوں سے درگزر کر رہا ہے کیونکہ دراصل تمہیں شرمندہ کرنا مقصد نہیں ہے' بلکہ جو ضروری باتیں ہیں' محمد ﷺ وہی بیان کر رہے ہیں تاکہ تم جان سکو کہ تمہارے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے۔

فرمایا: ''تمہارے پاس نور اور کتاب آ گئی ہے''۔ یہاں ''نور'' سے مراد قرآن کریم ہے' اس لئے کہ دیگر مقامات پر قرآن کریم نے توریت اور انجیل کو بھی نور کہا ہے۔

''کتاب مبین'' اور ''نور'' دونوں لفظ قرآن کیلئے استعمال ہوئے ہیں۔ مبین سے مراد ایسی کتاب جو خفیہ گتھیوں کو کھولتی ہے' جن کو آج تک نہ سلجھایا جا سکا۔ ''نور'' یہ کہ حضور ﷺ اس کتاب میں ہدایت کا وہ نور لے کر آئے ہیں جو تمہاری فکری اور ذہنی روشنی کا سامان ہے اور ''کتاب مبین'' اس طرح کہ اسلامی شریعت بھی لے کر آئے ہیں' جس کا تعلق عمل سے ہے۔ گویا یہ قرآن کریم فکری الجھنوں اور ذہنی نارسائی کی بھول بھلیوں میں حقیقت وصداقت کی روشنی دینے کی وجہ سے نور ہے اور انسانی زندگی کی دستوری' قانونی اور عملی رہنمائی شریعت اسلامی کی صورت میں مہیا فرمانے کے باعث کتاب مبین ہے۔

آیت:۱۶ يَّهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ''اس کے ذریعے اللہ اس قوم کو سلامتی کے راستوں کی ہدایت دے گا جو اس کی رضا کی پیروی کرے گی۔ اور جن ذہنی ظلمتوں کا تم شکار ہو' اللہ تمہیں ان سے نکال کر نور کی طرف لے جائے گا اور صراط مستقیم کی طرف ہدایت دے گا''۔

فرمایا: یہ کتاب ان لوگوں کو فائدہ پہنچائے گی جو ذہنی آلودگیوں سے ماورا ہو کر اللہ کی رضا چاہتے ہوں گے۔ ورنہ یہ کتاب ہاتھوں میں ہو گی بھی تو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ یہ صراط مستقیم صرف اللہ کے رسول ﷺ اور اس کی کتاب سے ملے گا' جس سے تم سلامتی کی طرف چلو گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ صرف اللہ ہی کی رضا کے طالب ہونا اور اسی سے توفیق مانگنا۔ اکبر نے ٹھیک کہا تھا

ے کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہو گا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو ہوا' ہوا کرم سے تیرے
جو ہو گا تیرے کرم سے ہو گا

یہ کرم اللہ ہی کی توفیق ہے اور اسی کو ملتا ہے جو اس کو اللہ سے طلب کرے۔

آیت:۱۷ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ''بے شک کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تو مسیح ابن مریم ہے۔ (اے نبی ﷺ! ان سے کہہ دیجئے کہ) کون اللہ

Marfat.com

سے کچھ بھی اختیار رکھتا ہے کہ اگر وہ ارادہ کرے کہ وہ ہلاک کردے مسیح ابن مریم اور اس کی ماں کو اور جتنے زمین میں ہیں' ان سب کو۔ اور اللہ کیلئے ہی ہے زمین و آسمان کی سلطنت اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے۔ وہ جس چیز کو چاہتا ہے' پیدا کرتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

اس آیت کا ربط پچھلی آیتوں سے جاننے کیلئے ہمیں پچھلی آیات کو ذہن میں رکھنا پڑے گا جن میں ہم نے ایک آیت پڑھی تھی جس میں پروردگار عالم نے یہ فرمایا تھا کہ

﴿مسلمانو! جس طرح ہم نے تم سے عہد لیا ہے' اسی طرح ہم نے یہود سے اور ان لوگوں سے بھی عہد لیا تھا جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں﴾ (المائدۃ:14)

نصاریٰ کا سب سے بڑا جرم توحید سے روگردانی

وہ عہد کیا تھا' اس کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ مختصراً یہ کہ جتنے بنیادی عقائد ہیں اور اللہ کی اطاعت و بندگی کے حوالے سے جتنی بنیادی باتیں ہیں' ان تمام کا عہد لیا گیا تھا کہ اس کی پابندی کرنا۔ اس آیت میں اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح یہود نے عہد شکنی کا ارتکاب کیا' اسی طرح عیسائیوں نے بھی اس میثاق کو بری طرح پامال کیا اور تمام زندگی اس میثاق کے بالکل برعکس گزاری۔ چنانچہ اس عہد شکنی کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ انہوں نے دین کی بنیاد یعنی ''توحید'' کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکا اور اس کو اس طرح اپنی زندگیوں سے خارج کیا کہ اس کا کوئی تصور ہی باقی نہ رہا۔ اسی حوالے سے قرآن کریم میں ارشاد ہے: ''لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ''یعنی عیسائیوں نے یہ کفر اختیار کیا کہ جس کو ہم اللہ کہتے ہیں' وہ کوئی اور نہیں' وہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔ یعنی مسیح ابن مریم انسان نہیں' اللہ کے رسول نہیں' بلکہ وہ خود پروردگار ہیں۔ اصلاً ان کا نام خدا ہی ہے یعنی جس (مسیح ابن مریم) کو ہم انسان کی شکل میں دیکھتے رہے' وہ تو ان کی ظاہری شکل وصورت تھی' حقیقت میں وہ اللہ ہیں۔ فرمایا کہ توحید کی یہ پامالی اس عہد شکنی کی سب سے بڑی بات تھی حالانکہ اللہ نے اپنے بارے میں ان سے یہ عہد لیا تھا کہ اللہ کی ذات میں کوئی شریک ہے اور نہ ہی اس کی صفات میں۔ اس کی مخلوقات میں سے کسی کو بھی' خواہ وہ اپنی ذات وصفات میں کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو' اگر الوہیت کے منصب پر فائز کر دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ توحید ختم۔ توحید تو اتنا نازک رشتہ ہے کہ وہ تو معمولی سی بات کو بھی برداشت نہیں کرتا' چہ جائیکہ سرے سے یہ کہہ دیا جائے کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہیں۔

سینٹ پال کی سازش

بنیادی بات وہی ہے جو میں نے پچھلی آیت کی تشریح میں بھی کہی تھی کہ جن لوگوں نے یہ کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں' وہ اصل میں نصاریٰ نہیں تھے' یہ صرف ان کا دعویٰ تھا۔ نصاریٰ تو اصل میں شمعون رضا کے ماننے والے تھے' جس کی انہوں نے خود تکفیر کی اور انہیں عیسائیت سے نکال دیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے کئی سالوں کے بعد عیسائیت کا جو ایک نیا ایڈیشن تیار ہوا' اس کا بانی 'سینٹ پال' تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو دعوت پیش کی تھی' اس دعوت کو ان کے حواریوں نے آگے بڑھایا اور جس طرح انہوں نے اللہ کی کتاب کو پیش کیا' سینٹ پال نے اس کی بالکل تحریف کر دی اور عقیدے تک بدل ڈالے۔ یہ دیکھ کر کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خرقِ عادت کے طور پر دنیا میں تشریف لائے ہیں (ان کا کوئی باپ نہیں ہے) اور یہ کہ خود انجیل نے انہیں روح اللہ قرار دیا ہے' ان تمام چیزوں کو یکجا کر کے اس نے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ مسیح ابن مریم جس کو تم ایک انسان اور پیغمبر سمجھتے ہو' وہ کوئی انسان یا پیغمبر نہیں بلکہ خود اللہ کی ذات ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ انسان ہوتے تو ان کا کوئی باپ ہوتا' وہ اپنے اند

Marfat.com

دوسرے انسانوں کی سی صفات رکھتے۔ یہ جو ہم ان میں غیر معمولی باتیں دیکھتے ہیں، خاص طور پر یہ جو ان کی پیدائش کا معاملہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسان نہیں ہیں۔ لہٰذا سینٹ پال نے ان کو اللہ قرار دے دیا یعنی یوں کہہ لیجئے کہ بنیادی طور پر اس کا تصور حلول اور اتحاد پر مبنی ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ کی ذات خود مسیح ابن مریم میں حلول کر گئی اور اس نے مسیح اور ذات پروردگار کو یکجا کر کے یہ ایک شکل اختیار کی ہے۔ وہ آسمانوں پہ اپنے رب کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ اصل میں وہ اللہ ہی ہے، جس نے دنیا میں انسانوں کی ہدایت کیلئے انسانی شکل میں خود آنا پسند کیا۔ اصلاً وہ انسان نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے جب یہ دیکھا کہ خود انجیل میں ان کے اور بھی رشتے اور علامات ہیں مثلاً ان کی والدہ ہیں اور روح القدس جو ان پر اترتا ہے، تو انہوں نے سوچا کہ اب اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی ذات صرف مسیح ہے تو پھر ان کی والدہ اور روح القدس کو ہم کیا کریں گے؟ پھر لوگ ہم سے پوچھیں گے کہ یہ کیا ہے؟ اگر مسیح واقعی خدا ہے تو خدا کی تو ماں نہیں ہوتی۔ یہ ماں کہاں سے آ گئی؟ لہٰذا انہوں نے ان تینوں کو الوہیت کے رشتے میں شریک کرنے کیلئے تثلیث کا عقیدہ تیار کیا۔ گویا یوں کہہ لیجئے کہ ان کے عقیدے کی ایک روح ہے اور ایک اس کی تعبیر ہے۔ عقیدے کی روح تو یہ ہے کہ خود پروردگار مسیح ابن مریم ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ مسیح ابنِ مریم ہی اصل میں پروردگار ہے، جس کا ذاتی نام اللہ ہے، جبکہ صفاتی نام بہت سے ہیں اور ان کی تعبیر انہوں نے یہ اختیار کی کہ روح القدس + عیسیٰ علیہ السلام + ان کی والدہ، یہ تینوں مل کر الوہیت کو مکمل کرتے ہیں۔ یہی وہ عقیدہ ہے جس کو وہ تین میں ایک اور ایک میں تین کہتے ہیں، جو ظاہر ہے کہ کسی کے پلے پڑنے والی بات نہیں۔ درحقیقت اس سارے کھیل کا مقصد یہی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا مانتے ہیں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جب اللہ کے پیغمبر کو ہی اللہ بنا ڈالا تو میثاق توحید کا تو نام ونشان بھی باقی نہیں رہا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے استدلال کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ غضب اور عتاب کا رنگ اختیار کیا کہ تمہیں شرم نہیں آتی کہ کیا کہہ رہے ہو، اسلئے کہ یہ رشتہ اتنا پاکیزہ ہے اگر اس پر ضرب پڑتی ہے تو پروردگار غضبناک ہو جاتا ہے کیونکہ یہ تو سیدھا ذات خداوندی پر حملہ ہے اور اگر اس پہ اللہ کا غضب بھڑک اٹھے تو کیا دنیا میں کوئی چیز ہے جو تمہیں اللہ کے غضب سے بچا سکے؟ بلکہ کہا کہ جس مسیح ابن مریم کو تم نے خدا بنا دیا اور اس کی ماں کو خدائی میں شریک ٹھہرایا، اگر اللہ کا غضب بھڑکے اور وہ یہ چاہے کہ میں مسیح یا اس کی ماں کو ہلاک کر دوں بلکہ دنیا کی ہر مخلوق کو ہلاک کر دوں تو کیا دنیا کی کسی مخلوق میں اس بات کی طاقت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ روک لے؟

پروردگار تو وہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں سب کی زندگی ہے اور جس کے ایک ادنیٰ اشارے سے انبیاء کو بھی موت آ سکتی ہے۔ مسیح ابن مریم، اگرچہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے، مگر پیدا کرنے والے نے ہی انہیں پیدا کیا۔ بغیر باپ کے پیدا ہونا ان کی خوبی نہیں، بلکہ خوبی تو اس پروردگار کی ہے جو بغیر باپ کے پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے بڑا معجزہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش ہے

اس سے آگے فرمایا: "یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" کسی کے غیر معمولی طریقے سے پیدا ہو جانے پر اس کی اصل حیثیت تبدیل نہیں ہو جاتی کیونکہ صفت خلق کا مالک تو اللہ ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے، جیسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ قرآن کریم نے ایک اور جگہ اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ" (ال عمران: 59) تمہیں اس بات سے شبہ پیدا ہو رہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اگر انسان ہوتے تو ان کی ماں کی طرح ان کا باپ بھی ہوتا۔ فرمایا کہ اگر بغیر باپ کے پیدا ہونے سے کوئی انسان، انسان نہیں رہتا بلکہ خدا بن جاتا ہے تو پھر تم بتاؤ کہ تم آدم علیہ السلام کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ عیسیٰ علیہ السلام کی تو ماں ہے، آدم علیہ السلام کی تو ماں بھی نہیں تھی۔ اگر یہ خدا ہیں تو آدم علیہ السلام کیا ہیں؟

اللہ کے یہاں عیسیٰ علیہ السلام کی مثال ایسے ہے جیسے آدم علیہ السلام کی کہ اس نے چاہا تو آدم علیہ السلام کو بغیر ماں باپ کے پیدا کر دیا اور چاہا

Marfat.com

تو عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کر دیا۔ یہ تو اس کی شان قدرت ہے جس کا اظہار کہیں کسی صورت میں ہوتا ہے اور کہیں کسی صورت میں۔ بجائے اس کے کہ اس بات سے اللہ کی کبریائی اور الوہیت پر زیادہ یقین کرتے، تم تو اور الجھ کر رہ گئے۔ کہنا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ خداوند ذوالجلال کتنا عظیم ہے اور کیسا قادر مطلق ہے کہ کسی چیز کا محتاج نہیں۔ وہ جس طرح چاہے کسی کو پیدا کر سکتا ہے۔

اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں تو حضرت یحییٰ علیہ السلام کیوں نہیں؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خالہ زاد بھائی حضرت یحییٰ علیہ السلام جوان سے چند سال پہلے دنیا میں تشریف لائے، وہ پیدا ہوتے ہی اللہ کے نبی تھے، جس کی گواہی قرآن نے دی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام اس طرح پیدا ہوئے کہ ان کے والد گرامی حضرت زکریا علیہ السلام جن کی عمر نوے سال تھی اور اب وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا۔ ان کی بیوی بھی قریب قریب ان کی عمر کی تھیں اور بانجھ ہو چکی تھیں۔ ان کے ہاں کسی بچے کے پیدا ہونے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ لیکن نجانے انہیں کیا خیال آیا کہ جب حضرت مریم علیہا السلام کو دیکھا کہ گرمیوں کے موسم میں سردیوں کے اور سردیوں کے موسم میں گرمیوں کے پھل ان کے سامنے رکھے ہوتے ہیں تو انہوں نے مریم علیہا السلام سے پوچھا کہ ''یہ پھل تمہارے پاس کہاں سے آئے ہیں؟'' وہ کہنے لگیں کہ ''یہ پھل وہ ذات بھیجتی ہے جو موسموں کی محتاج نہیں۔ وہ جب چاہے جو پھل چاہے پیدا کر سکتی ہے۔'' بس ان کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور خیال آیا کہ یا اللہ! جب تو پھل دینے میں کسی موسم کا محتاج نہیں ہے تو اولاد دینے میں عمروں کا محتاج کیونکر ہو سکتا ہے۔ میری عمر اگرچہ اس قابل نہیں کہ میرے یہاں بچہ پیدا ہو، مگر تیری قدرت تو بانجھ نہیں۔ اس پر انہوں نے دعا کی:

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰی

''وہیں کھڑے کھڑے زکریا نے اپنے رب سے دعا کی' اس نے کہا: اے میرے رب! مجھے اپنے پاس سے پاک اولاد عطا کر، تو بے شک دعا سننے والا ہے۔ تو انہیں آواز دی فرشتوں نے جب وہ حجرہ میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے' کہ اللہ تمہیں یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے'' (آل عمران: 39-38)

اب دیکھئے کہ اتنی بڑی بشارت پر حضرت زکریا خوش تو ہوئے' لیکن ساتھ ہی طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہوا اور کہنے لگے کہ میرے یہاں پیدا ہوگا' وہ کیسے؟ میرا حال تو یہ ہے کہ میری ہڈیوں میں گودا تک نہیں رہا' سر میرا ہلنے لگا ہے اور میری بیوی بانجھ ہو چکی ہے؟ جواب ملا ہم جب دیتے آتے ہیں تو اسی طرح دیا کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ مجھے کوئی علامت بتا دیجئے۔ فرمایا کہ علامت یہ ہے کہ تین دن تک آپ کسی سے کوئی بات نہیں کریں گے' اگر کوئی آپ سے بات پوچھے تو اشارے سے اس کو جواب دیں۔ اور شب و روز اللہ کی تسبیح میں لگے رہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد اللہ نے انہیں بیٹا عطا کر دیا۔ اب غور کیجئے کہ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ان کا نہ کوئی باپ ہے نہ ماں کیونکہ ماں اگر بانجھ ہے تو ماں کیسے ہوگی؟ باپ کا سر ہلتا ہے' ہڈیوں میں گودا تک نہیں رہا' قوت بالکل جواب دے گئی ہے تو ظاہر ہے وہ باپ کیسے بنے گا؟ اللہ نے ان کو واسطہ بنا کر انہیں بیٹا دیا ہے' لیکن حقیقتاً وہ ماں باپ نہیں ہیں۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں تو پھر حضرت یحییٰ علیہ السلام خدا کیوں نہیں؟ پھر ان کو موت بھی کس طرح آئی؟ زندگی میں بھی اتنے فقیر اور قلندر تھے کبھی لباس ہی پہننے کو نہ ملا۔ ایک کمبل تھا جس کو ادھر ادھر سے کانٹوں سے اٹکا کر' درمیان میں سوراخ کر کے اوڑھ لیتے۔ کبھی انہوں نے کوئی خوراک نہ کھائی' بس جنگل میں چلے جاتے اور وہاں سے شہد مل جاتا تو پی لیتے یا پتے توڑ کر کھا لیتے۔ دنیا نے ایسا درویش صفت انسان پھر نہیں دیکھا۔

Marfat.com

جاہ وجلال کا عالم یہ تھا کہ وقت کی حکومتیں ان کے سامنے کانپتی تھیں۔ بادشاہوں کوان کی بداعمالیوں پر اعلانیہ ٹوکتے تھے بالآخر حاکم وقت نے اپنی محبوبہ کے کہنے پر ان کا سر قلم کر کے طشتری میں رکھ کر اس کے سامنے پیش کر دیا۔ اس محبوبہ نے یہ شرط رکھی تھی کہ میں اپنے آپ کو تب تیرے سپرد کروں گی جب تو اس خدار سیدہ آدمی (جو اپنے وقت کا سب سے سچا اور پاکیزہ انسان تھا) کا سر میرے سامنے لا کر پیش کرے گا۔

اب دیکھئے کہ پیدائش سراسر اللہ کی قدرت کا ظہور ہے اور موت بھی کیسی آئی ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ یہ تو میری قدرت ہے کہ جس کو جیسے چاہوں پیدا کر دوں۔ اس میں پیدا ہونے والے کا کیا کمال ہے؟ تم بجائے اس کے کہ پیدا ہونے والے کے پیچھے لگو پیدا کرنے والے کو تلاش کرو۔

آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا:

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے﴾

اللہ کی صفتِ قدرت پر مکمل یقین رکھنا توحید کی روح ہے مخلوقات کے بارے میں جہاں کہیں بھی شرک کی آمیزش دکھائی دیتی ہے اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو قادر مطلق ماننے کا تصور اور عقیدہ دھندلا گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں مخلوقات کو اللہ کی قدرت کا مظہر جان کر اس کے بارے میں ایسے ایسے تصورات قائم کر لئے گئے ہیں جس سے توحید کی عمارت تباہ ہو کر رہ گئی ہے اور ایسا بالعموم اس وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے کسی کو کوئی عظمت، کوئی رفعت، کوئی کمال، کوئی معجزہ اور کرامت عطا کرتا ہے اور یہ صفات عام طور پر چونکہ اللہ کے بندوں اور بالخصوص اللہ اپنے نبیوں کو عطا کرتا ہے اس لئے دنیا نے ہمیشہ اللہ کے ولیوں اور اس کے پیغمبروں کو اس کی صفات میں شریک کر کے شرک کا ارتکاب کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی غیر معمولی ولادت اور پھر آپ سے غیر معمولی معجزات کے ظہور کے باعث عیسائیوں نے انہیں خدائی منصب پر فائز کر دیا اور ان کے بارے میں ایسے عقیدے اختیار کر لئے جو صرف اللہ کی ذات کیلئے زیبا ہیں اگر عیسائیوں کی نظر اس بات پر ہوتی کہ اللہ جسے چاہتا ہے جیسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جو وہ چاہتا ہے وہ کمالات عطا فرما دیتا ہے لیکن یہ کمالات کسی کا ذاتی وصف نہیں بلکہ اللہ کی قدرت کا اظہار ہے اس لئے حقیقی قدرت اور طاقت صرف اللہ کو میسر ہے باقی جہاں کہیں اس کا پرتو دکھائی دیتا ہے وہ صرف اللہ کی دین ہے لیکن اہل کتاب نے اس بات کو نہ سمجھ کر بار بار شرک کا ارتکاب کیا۔ ہم چونکہ آخری امت ہیں اور ہمیں بطور خاص توحید کا امین اور علمبردار بنایا گیا ہے اس لئے آنحضرت ﷺ اس بات پر بہت پریشان رہتے تھے کہ کہیں یہ امت بھی اہل کتاب کی طرح شرک کی دلدل میں نہ اتر جائے کیونکہ امتیں ایک ہی طرح سے سفر کرتی ہیں ان میں حوادث کا وقوع پذیر ہونا اور خرابیوں کا در آنا یہ بالعموم ایک ہی طرح سے ہوتا ہے اس لئے آخری دنوں میں جبکہ حضور دنیا سے سفر فرمانے والے تھے سننے والوں نے یہ بات حضور ﷺ کی زبان مبارک سے ایک سے زیادہ مرتبہ سنی کہ اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائے انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔ مقصود یہ تھا کہ میری امت اس طرف سے ہوشیار رہے اور اس کے کسی طبقے میں ایسی کوئی بات پیدا نہ ہونے پائے۔ بعض مواقع پر تو آپ نے اہل کتاب کا نام لیتے ہوئے نصیحت فرمائی جس کا ترجمہ حالی مرحوم نے کیا ہے

تم اوروں کی مانند دھوکہ نہ کھانا کسی کو خدا کا نہ بیٹا بنانا
میری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا
سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ اسی طرح میں بھی ہوں اک اس کا بندہ
مجھے حق نے دی ہے بس اتنی بزرگی کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

Marfat.com

لیکن افسوس یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اس قدر تاکیدی نصیحتوں کے باوجود اس امت نے آنحضرت ﷺ تو کیا اپنے بزرگوں کے بارے میں بھی شرکیہ کلمات کہنے اور شرک آمیز حرکتیں کرنے سے گریز نہیں کیا۔ ہمارے بڑے بڑے وہ بزرگ جنہوں نے ہمیں واقعی دین سکھایا اور جن کی محنتوں اور مہربانیوں سے آج ہم مسلمان ہیں ان کے مزارات پر جا کر دیکھ لیجئے، شیطان نے ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد کس طرح ان سے انتقام لینے کی کوشش کی۔ وہاں ایسے ایسے افعال کا ارتکاب ہوتا ہے اور ایسی ایسی باتیں کہی جاتی ہیں کہ آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ یا اللہ یہ وہ امت ہے جسے قیامت تک کیلئے توحید کا علمبردار بنایا گیا ہے۔ پنجاب کے مشہور بزرگوں میں ایک حضرت پیر فرید بھی گزرے ہیں جن کا مزار کوٹ مٹھن میں ہے۔ ایک پنجابی شاعر ان کی تعریف میں جو کچھ کہتا ہے اسے پڑھ کر اندازہ فرمائیے اس سے بڑھ کر شرک اور کیا ہو سکتا ہے۔ شاعر صاحب فرماتے ہیں۔

چاچڑ شہر مدینہ ڈِسدا' کوٹ مٹھن بیت اللہ ظاہر دے وچ پیر فریدن' باطن دے وچ اللہ

اور ایک اردو کے شاعر فرماتے ہیں اور انہوں نے یہ ارشاد آنحضرت ﷺ کے بارے میں فرمایا۔

جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر اتر پڑا مدینہ میں مصطفٰی ہو کر

یہ محض نمونے کے طور پر میں نے دو شعر نقل کئے ہیں واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کا مشرکانہ لٹریچر نثر اور نظم دونوں میں بڑی بہتات سے ہمارے ملک میں پھیلا ہوا ہے اگر ایسی باتیں عیسائیوں میں پھیلائی جاتیں تو سمجھ میں آنے والی بات تھی لیکن یہ اس امت میں پھیلائی جارہی ہیں جسے قیامت تک توحید کی امانت کی پاسداری کرنی ہے اور اسے ہر طرح کے نقصان سے محفوظ رکھنا ہے۔ بالخصوص پاکستان جس کے قومی شاعر نے اپنی ذمہ داری کے حوالے سے فخر کرتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

اللہ ہی بہتر جانتا ہے وہ توحید کی امانت کہاں ہے' وہ سینے کہاں ہیں جو اس امانت کے امین تھے اور وہ قوم کہاں ہے جو اس توحید کی وجہ سے اپنے آپ کے بارے میں یہ تصور رکھتی ہے کہ توحید کے اس تعلق کے باعث اسے مٹانا آسان نہیں ہے۔

موحد کون؟

موحد تو وہ ہوتا ہے جو اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتا' جس کا ہاتھ اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے نہیں پھیلتا اور جس کے دل کی دنیا اللہ کے سوا اور کسی سے آباد نہیں ہوتی۔ موحد وہ ہوتا ہے جو اللہ کے رسولوں کے سوا کسی کو اپنا آئیڈیل نہیں مانتا۔ موحد وہ ہے کہ جس کے سامنے اشرفیوں کے توڑے رکھ دیئے جائیں' تو وہ اس کے ایمان کی شمع کو خرید نہ سکیں اور اگر اس کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جائیں تو یہ اذیت بھی اس سے توحید کے سرمائے کو چھین نہ سکے۔ اگر موحد اس کو کہتے ہیں تو آپ اندازہ فرمائیے کہ ہم میں توحید کہاں ہے؟ جس طرح پہلی آسمانی کتابوں کو ماننے والی امتوں سے عہد و پیمان لیا گیا اور انہوں نے جس طرح اس کو توڑا تو میں بڑی دردمندی سے کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے عقائد پر غور کر کے دیکھ لینا چاہئے کہ کہیں ہم بھی انہی کمزوریوں کا شکار تو نہیں ہو گئے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ قُلْ

اور یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں کہو کہ پھر

Marfat.com

فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ۖ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ ۚ

وہ تمہاری بد اعمالیوں کے سبب تمہیں عذاب کیوں دیتا ہے (نہیں) بلکہ تم اس کی مخلوقات میں

يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ

(دوسروں کی طرح کے) انسان ہو۔ وہ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے۔ اور آسمان اور زمین اور

وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿١٨﴾ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ

جو کچھ ان دونوں میں ہے سب پر خدا ہی کی حکومت ہے اور (سب کو) اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اے اہل کتاب

جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا

(پیغمبروں کے آنے کا سلسلہ) جو ایک عرصے تک منقطع رہا تو (اب) تمہارے پاس ہمارے پیغمبر آگئے ہیں جو

مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ ۖ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ ۗ وَاللَّهُ

تم سے (ہمارے احکام) بیان کرتے ہیں تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری یا ڈر سنانے والا نہیں آیا۔ سو اب

عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٩﴾ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ

تمہارے پاس خوشخبری اور ڈر سنانے والے آگئے ہیں۔ اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو

اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ

تم پر خدا نے جو احسان کیے ہیں ان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں پیغمبر پیدا کیے اور تمہیں بادشاہ

مُلُوكًا وَآتَاكُمْ مَا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿٢٠﴾ يَا قَوْمِ

بنایا۔ اور تم کو اتنا کچھ عنایت کیا کہ اہل عالم میں سے کسی کو نہیں دیا۔ تو بھائیو!

ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا

تم ارض مقدس (یعنی ملک شام) میں جسے خدا نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے چل داخل ہو اور

عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ ﴿٢١﴾ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّ فِيهَا

(دیکھنا مقابلے کے وقت) پیٹھ نہ پھیر دینا ورنہ نقصان میں پڑ جاؤ گے۔ وہ کہنے لگے کہ موسیٰ! وہاں تو بڑے زبردست

Marfat.com

قَوْمًا جَبَّارِينَ ۖ وَإِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا ۚ

لوگ (رہتے) ہیں اور جب تک وہ اس سرزمین سے نکل جائیں ہم وہاں جا نہیں سکتے۔ ہاں اگر وہ

فَإِنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ﴿٢٢﴾ قَالَ رَجُلَانِ مِنَ

سے نکل جائیں تو ہم جا داخل ہوں گے۔ جو لوگ خدا سے ڈرتے تھے اُن میں

الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ

سے دو شخص جن پر خدا کی عنایت تھی کہنے لگے کہ ان لوگوں پر دروازے کے رستے سے حملہ کر دو

فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا

جب تم دروازے میں داخل ہو گئے تو فتح تمہاری ہے اور خدا ہی پر بھروسا رکھو بشرطیکہ

إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٣﴾ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا أَبَدًا

صاحب ایمان ہو۔ وہ بولے کہ موسیٰ جب تک وہ لوگ وہاں ہیں ہم کبھی وہاں نہیں

مَا دَامُوا فِيهَا ۖ فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا

جا سکتے اگر لڑنا ہی ضرور ہے تو تم اور تمہارا خدا جاؤ اور لڑو ہم یہیں بیٹھے

قَاعِدُونَ ﴿٢٤﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي ۖ فَافْرُقْ

رہیں گے۔ موسیٰ نے (خدا سے) التجا کی کہ پروردگار میں اپنے اور اپنے بھائی کے سوا اور کسی پر اختیار

بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٥﴾ قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ

نہیں رکھتا تو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں جدائی کر دے۔ خدا نے فرمایا کہ وہ ملک اُن پر چالیس برس تک کے

أَرْبَعِينَ سَنَةً ۚ يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ

لیے حرام کر دیا گیا کہ وہاں جانے نہ پائیں گے اور جنگل کی زمین میں سرگرداں پھرتے رہیں گے تو ان نافرمان

الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾

لوگوں کے حال پر افسوس نہ کرو۔

Marfat.com

گزشتہ آیات میں قرآن کریم ہمیں اہل کتاب کے بار بار نقض عہد کی داستان سناتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود سے اپنی عبادت اور اطاعت کا عہد لیا تو انہوں نے اسے بار بار توڑا اور اس کی کئی مثالیں بیان فرمائیں۔ اسی طرح نصاریٰ سے بھی اسی طرح کا عہد لیا گیا تو اس کی ایک مثال گزشتہ آیت میں بیان کی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ توحید جس پر پورے دین کا مدار ہے انہوں نے اسے ہی بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ قرآن پاک کا پڑھنے والا یہ پڑھ کر حیران ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ جیسی امتیں جن میں بار بار اللہ کے نبی اور رسول آئے اور ان میں کتابیں اترتی رہیں، صحیفے نازل ہوتے رہے جس سے بار بار انہیں اللہ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کی یاددہانی ہوتی رہی، پھر آخر کیا وجہ ہے کہ وہ اپنے عہد و پیمان پر ثابت قدم نہ رہ سکے اور بار بار انہوں نے اسے توڑ کر اللہ کے عذاب کو دعوت دی۔ چنانچہ اب جو آیت آ رہی ہے اس میں پروردگار نے ان (یہود و نصاریٰ) کی اس مشترکہ گمراہی کا ذکر فرمایا ہے جو پوری طرح ان دونوں میں موجود تھی اور اسی گمراہی کے باعث یہ بار بار نقض عہد کا مختلف شکلوں میں ارتکاب کرتے رہے۔

آیت:۱۸ وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ز وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ O ''اور یہود اور نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ ''ہم خدا کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں''۔ ان سے پوچھو کہ پھر وہ تمہیں تمہارے جرائم پر سزا کیوں دیتا ہے؟ بلکہ (حقیقت تو یہ ہے کہ) تم بھی اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں سے بشر ہو وہ جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا اللہ ہی کیلئے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کی بادشاہی اور اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے''۔

یہود و نصاریٰ کی تنزلی کا اصل سبب

ارشاد فرمایا:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ

﴿''اور یہود اور نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں﴾

یعنی ان کی اصل بیماری ان کا یہ زعم باطل ہے کہ ہماری دنیوی اور اخروی کامیابی کیلئے ایمان و عمل کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں اور وہ اپنے بیٹوں اور اپنے چہیتوں سے کوئی باز پرس نہیں کیا کرتا۔ اس زعمِ باطل نے ان کو ایمان و عمل کی ذمہ داریوں سے یکسر بے نیاز کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب ایمان و عمل کا احساس ہی جاتا رہا تو پھر عہد و پیمان کی پابندی کیسے باقی رہتی۔ اس لئے کہ ان سے جو عہد و پیماں لئے جاتے رہے ان میں تو ان دو باتوں پر ہی زور دیا جاتا رہا' ایک ایمان پر اور دوسرا مختلف قسم کے اعمال صالحہ پر۔ لیکن جب ان کے اندر اس بنیادی تصور نے جگہ بنالی کہ تم سے کوئی باز پرس ہونے والی نہیں ہے بلکہ تمہیں یہاں بھی اپنے چہیتوں کی طرح رکھا جائے گا اور آخرت میں بھی تمہارا استقبال اللہ کے بیٹوں اور اس کے چہیتوں کی طرح ہوگا۔ یہ کہنے کو تو ایک زعمِ باطل اور محض ایک بیہودہ تصور ہے' لیکن اگر یہ کسی بھی قوم کا عقیدہ بن جائے تو پھر اسے دنیا کی کوئی طاقت بے عملی سے نہیں روک سکتی حالانکہ دنیا میں ایک معمولی سے معمولی انسان بھی بڑی آسانی سے اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ یہاں آدمی کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس کے اپنے کرتوتوں ہی کا پھل اور اپنی کمائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ اچھے اعمال کرتا ہے تو اچھے صلے سے نوازا جاتا ہے اور اگر وہ برے اعمال یعنی برائیاں' بداخلاقیاں اور بداطواریاں اختیار کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں اسے مختلف مصائب سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ قدرت کا ایک فطری قانون ہے' جس سے کسی کو بھی رستگاری نہیں

Marfat.com

کیونکہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بحیثیت قوم ہم تنزلی کا شکار کیوں؟

لیکن اگر کسی کم عقل آدمی کے دماغ میں یہ تصور سما جائے کہ میں کوئی سا کام کرنے کا بھی پابند نہیں ہوں بلکہ یہاں مجھے ہر چیز بغیر کئے کے ملے گی تو آپ ایسے آدمی سے کسی بھی عمل کی توقع نہیں کر سکتے' وہ شخص دھرتی کا بوجھ بن جائے گا اور اپنے پرائے اسے ایک ناکارہ چیز سمجھ کر اپنے سے دور کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر خدانہ کرے یہ برائی کسی قوم میں پھیل جائے تو وہ قوم باقی قوموں کیلئے ایک عبرت کا سامان بن جاتی ہے' جب تک باقی رہتی ہے دوسروں کی دست نگر ہو کر جیتی ہے اور بالآخر جب اپنے منطقی انجام کو پہنچتی ہے تو دوسرے ان کی تباہی پر غم کھانے کی بجائے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں "خس کم جہاں پاک" اور اگر یہ بیماری مذہبی معاملات میں پیدا ہو جائے تو پھر ایسی قوم نماز' روزہ یعنی عبادات سے یکسر لاتعلق ہو کر نہ صرف بے عملی کا شکار ہو جاتی ہے بلکہ برائیوں کے جہنم میں ڈوب جاتی ہے اور انسانی معاملات میں تمام جذباتِ خیر سے تہی دامن ہو کر حقوق و فرائض سے یکسر لاتعلق ہو جاتی ہے۔ یہی حال ان اہل کتاب کا بھی ہوا کہ ان کی مذہبی زندگی بھی تباہ ہوئی اور ان کی تہذیب اور تمدن بھی اس لعنت کے برے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ عجیب بات یہ ہے کہ بظاہر تو یہ بات نہایت بے عقلی اور بے سمجھی کی معلوم ہوتی ہے' لیکن ہم جب بھی قوموں کے عروج و زوال کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ قومیں جب بھی تنزلی کا شکار ہوتی ہیں تو ان میں اس برائی کو ہم پوری طرح کارفرما دیکھتے ہیں کہ وہ پھر ایسے ہی سہاروں کے ذریعے سے جیتی ہیں کیونکہ ہر وہ شخص جو آخرت پر یقین رکھتا ہے اسکے اندر یہ کسک کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتی ہے کہ یہ دنیا میں تو جیسی گزری سو گزری آخرت سے جب معاملہ پڑے گا تو وہاں کیا ہوگا۔ اسلئے وہ اپنی اس کسک کو بہلانے کیلئے اس طرح کے سہارے اختیار کرتا ہے جیسے ان اہل کتاب نے اختیار کر رکھے تھے کہ ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں آخرت کی باز پرس سے ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔

انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کہ ایسے ہی سہارے اس امت نے بھی اختیار کر لئے ہیں جسے پوری دنیا کی امامت پر فائز کیا گیا ہے اور قیامت تک جس نے دنیا کو ہدایت دینے کا فرض انجام دینا ہے۔ اس میں وہ بگڑے ہوئے مذہبی لوگ جو علم کے بغیر نجات کے تصورات رکھتے ہیں' ان کا تو خیر ذکر فضول ہے' شکایت تو ان سے ہے جنہیں ہم اپنا دانشور طبقہ کہتے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے لوگ نہایت خوبصورت پیرائے میں اس طرح کی بے سر باتیں کہتے ہوئے نہیں شرماتے۔ اردو زبان کا سب سے بڑا شاعر اسی تصور کی نمائندگی کرتے ہوئے کہتا ہے

کہاں کا آنا کہاں کا جانا' فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری' کوئی ہمارا وطن نہیں ہے

بلکہ مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

Marfat.com

جب ایک ایسا شخص جس کے آباؤ اجداد عجمی ہیں اور جس کے نسب میں کوئی قابل فخر بات بھی نہیں پائی جاتی' وہ اس طرح کی باتیں کہتا ہے تو پھر بنی اسرائیل کی اس گمراہی کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کیونکہ وہ تو انبیاء کی اولاد تھے' وہ جب دیکھتے تھے کہ ہمارے آباؤ اجداد میں ہزاروں انبیاء کرام آ چکے ہیں اور ہمارے گھروں میں کتنی کتابیں اتر چکی ہیں تو وہ اس زعم باطل کو اختیار کرتے ہوئے کس طرح شرما سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں شریعت کی پابندی کا احساس اس وقت تک موجود رہا جب تک وہ اس طرح کے بیہودہ تصورات سے بچے رہے اور انہیں اللہ سے کئے ہوئے عہود اور مواثیق یاد رہے اور بار بار اس کی یاد دہانی ان کو ایمان و عمل پر آمادہ کرتی رہی۔ لیکن یہ تصور جب ان میں کمزور پڑ گیا تو پھر نہ صرف یہ لوگ عملی پابندیوں سے بے نیاز ہوئے بلکہ ان کی جسارتیں اس حد تک بڑھ گئیں کہ انہوں نے اللہ کی کتابوں میں تحریف تک کر ڈالی اور احکام خداوندی کو اپنی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنا ڈالا اور جب اللہ کی طرف سے آنے والے انبیاء نے انہیں سرزنش کی اور انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی تو ان بدبختوں نے انہیں قتل تک کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ ان کی صدیوں کی تاریخ اللہ کے عظیم بندوں پر ان کے مظالم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ اور یہی حال ہم مسلمانوں کا بھی دیکھتے ہیں کہ ان کے سامنے بھی جب تک اللہ کے سامنے جواب دہی کا تصور پوری توانائی سے زندہ رہا' ان کے حکمران تختِ حکومت پر بیٹھ کر بھی لرزہ براندام رہتے تھے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں ہم بار بار اس کی مثالیں دیکھتے ہیں اور شاید اسی احساس نے آنحضرت ﷺ کو مجبور کیا کہ آپ اس بنیادی کمزوری کی طرف بار بار امت کی توجہ دلائیں۔ چنانچہ جب بھی ایسا کوئی موقع آیا تو آپ نے ہمیشہ اس پر توجہ دلائی۔ حدیث میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک دفعہ اپنے خاندان کے جستہ جستہ لوگوں کو اپنے گھر دعوت پر بلایا تو آپ ﷺ نے ان کے سامنے خطاب کرتے ہوئے بطور خاص یہ بات فرمائی کہ

﴿اے میرے چچا! اور اے میری پھوپھی صفیہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا)! اور اے میری بیٹی فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا)! تم میرے مال میں سے جو چاہو میں تمہیں دینے کو تیار ہوں' لیکن اگر تم نے ایمان و عمل کا سرمایہ اپنے یہاں جمع نہیں کیا تو میں کل قیامت کے دن اللہ کے سامنے تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔﴾

آپ کے چچا حضرت ابو طالب نے امکانی حد تک مشرکین مکہ کے خلاف آپ کی حفاظت کی اور ان کے شر سے آپ ﷺ کو بچانے کیلئے ہر ممکن مدد دی۔ ان کے احسانات کو دیکھتے ہوئے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ شاید یہی احسانات ان کی نجات کیلئے کافی ہیں' لیکن جب ہم حدیث میں یہ واقعہ پڑھتے ہیں تو ہمیں بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اللہ کے یہاں سرخروئی کیلئے بنیادی چیز ایمان و عمل ہی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ابو طالب کے آخری وقت میں ان کے پاس بیٹھ کر ان کو ایمان کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ''چچا آپ میرے کان ہی میں کلمہ پڑھ دیں تاکہ میں اللہ کے سامنے آپ کی سفارش کر سکوں لیکن اگر آپ ایمان نہ لائے تو پھر معاملہ بڑا مشکل ہے''۔ پاس ہی قریش کے سردار بیٹھے تھے وہ فوراً بول پڑے کہ شیخ کیا آپ آخری وقت میں عبدالمطلب کا دین چھوڑ دیں گے۔ ان کے اصرار پر بالآخر ابو طالب یہ کہہ کر دنیا سے رخصت ہو گئے کہ میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں۔ آنحضرت ﷺ کو یہ سن کر بہت رنج ہوا' آپ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے اور یہ فرما کر رہ گئے کہ ''میں اس وقت تک اپنے چچا کیلئے استغفار کروں گا جب تک پروردگار مجھے اس سے روک نہ دے''۔ ان تمام ترغیبات اور تاکیدات کے باوجود اس امت محمدیہ کے ایک بڑے حصے کو جس چیز نے تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا ہے وہ یہی تصورات ہیں کہ ''ہمارے رسول پاک ﷺ اللہ کے محبوب ہیں' ہم ان کی لاڈلی امت ہیں اور قیامت کے دن وہ ہماری شفاعت فرمائیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری بخشش میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو''۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ ہمارے رسول پاک ﷺ حبیب اللہ ہیں اور ہمیں اللہ نے خیر الامم قرار دیا ہے' لیکن اللہ کے یہاں نجات کا دارومدار' خیر الامم ہونے کا امتیاز اور رسول پاک ﷺ کی شفاعت کا

Marfat.com

استحقاق صرف ایمان اور اعمال صالحہ کی پابندی سے پیدا ہوتا ہے' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ جب کسی فرد یا کسی قوم کو بلند مرتبہ عطا کرتا ہے تو اس کی ذمہ داریاں بھی دوسروں سے بڑھ کر ہوتی ہیں کیونکہ

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

اس امت کو صرف ایمان اور عمل صالحہ ہی نہیں بچائیں گے بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کے نفاذ کی عملی کوششیں اللہ کے یہاں سرخروئی کیلئے لازمی شرائط ہیں اور جہاں تک اس امت کے افراد کا تعلق ہے ان میں سب سے بڑی نسبی شرافت ذات رسالت مآب ﷺ سے قرابت کا تعلق ہے' ابھی پیچھے حدیث گزر چکی ہے کہ یہ تعلق بھی ایمان وعمل کے بغیر کام نہیں آئے گا۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ ایمان وعمل کی توفیق بخشے تو یقیناً ایک سیدزادہ اپنے درجات میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے گا۔ لیکن اگر ایمان وعمل سے بے نیاز رہا تو یہی قرابت داری اللہ کے یہاں زیادہ ناراضگی کا سبب بنے گی کیونکہ پروردگار ان سیدزاروں اور اس امت کے بڑے لوگوں کو اسی نسبت سے پکڑے گا اور پوچھے گا کہ تم نہ صرف اپنے پاس اللہ کی کتاب رکھتے تھے بلکہ تمہیں صاحب کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نسبی تعلق بھی حاصل تھا۔ اس لئے جب تمہارے سامنے دین کی دھجیاں اڑائی جاتی تھیں تو تمہیں غیرت کیوں نہیں آتی تھی؟ تمہیں تو دوسروں سے بڑھ کر اللہ کے دین کے بارے میں غیرت مند ہونا چاہئے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے ملک کے مشہور ادیب احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم کے جناب سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب مرحوم کے ساتھ بڑے قریبی تعلقات تھے اور دونوں سید بھی تھے۔ شاہ صاحب ایک دفعہ لاہور میں انہی کے مہمان تھے۔ جب واپس جانے لگے تو نجانے کیا خیال آیا' شاہ صاحب نے پطرس مرحوم سے کہا کہ پطرس یہ قرآن تمہارے گھر میں نازل ہوا اور عجیب بات ہے کہ تم نماز بھی نہیں پڑھتے' تم ہی اگر اس کی لاج نہیں رکھو گے تو اور کون رکھے گا؟ پطرس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور شاہ صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا کہ شاہ جی آج رک جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد ان کی زندگی میں واضح تبدیلی آ گئی۔ حاصل کلام یہ کہ قوموں میں مصنوعی سہارے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نہایت ہی مہلک ثابت ہوتے ہیں اور انہی سہاروں نے اہل کتاب کی مذہبی اور ملی زندگی میں نہایت تباہ کن کردار ادا کیا۔

اللہ کی طرف سے یہود ونصاریٰ کے زعمِ باطل کا جواب

قرآن کریم ان کی اس بنیادی کمزوری کا ذکر کرنے کے بعد اس پر تنقید کرتے ہوئے سمجھانے کے انداز میں کہتا ہے کہ اگر تم واقعی اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہو تو پھر تمہارے گناہوں پر اللہ تمہیں عذاب کیوں دیتا رہا ہے کیونکہ خدا کے محبوب اور چہیتے ہونے کے سبب سے تو تمہیں خدا کے ہر طرح کے مواخذے اور عذاب سے بری ہونا چاہئے تھا۔ تم دنیا میں جو چاہے سو کرتے لیکن کبھی عذاب کا کوڑا تمہاری پشت پر نہ برستا۔ لیکن یہاں تو تمہاری پوری تاریخ اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جب بھی تم نے خدا سے سرکشی کی' تو اس نے تمہیں نہایت عبرت انگیز سزائیں دیں۔ ایسی عبرت انگیز سزائیں کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں ایسی سزاؤں کی مثال نہیں ملتی۔ کبھی رومیوں اور اہل بابل کے ہاتھوں اور کبھی ایرانیوں کے ہاتھوں' پوری قوم کی غلامی' پوری قوم کی صحرا گردی' پوری قوم کی جلاوطنی اور متعدد بار پوری قوم کا قتل عام اور بیت المقدس کی عبرت انگیز تباہی' یہ سارے واقعات تو وہ ہیں جس پر خود اہل کتاب کا لٹریچر شاہد ہے۔ اس کے بعد کی تاریخ میں بھی تاریخ کے مختلف ادوار میں اور دنیا کے مختلف ممالک میں ہم یہود کا قتل عام ہوتا دیکھتے ہیں۔ اگر یہ لوگ ایسے ہی اللہ کے چہیتے ہوتے اور انبیاء کی اولاد ہونے کی وجہ سے انہیں کوئی خاص اعزاز مل چکا ہوتا تو پھر اللہ کی طرف سے ان پر یہ بار بار عذاب کے کوڑے نہ برستے اور وہ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق دنیا میں ذلت اور مسکنت کی تصویر نہ بن جاتے۔

Marfat.com

ممکن ہے یہاں کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ آج تو انہیں روئے زمین پر ایک ملک میسر ہے، جس میں ان کی اپنی حکومت ہے اور وہ اتنی طاقت پکڑ چکے ہیں کہ تمام عرب ممالک نہ صرف ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے بلکہ مسلسل ان کیلئے اس کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے' اب تو ذلت اور مسکنت کی تصویر یہود نہیں بلکہ خود عرب بنے ہوئے ہیں اور پورا عالم اسلام تباہ کن صورتحال سے دوچار ہے۔ اس لئے قرآن کریم کا یہ کہنا کہ وہ جہاں بھی ہوں ان پر ذلت اور مسکنت کی پھٹکار ماردی گئی ہے کہاں تک صحیح ہے۔ قرآن کریم نے اس کا جواب دیا ہے:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (ال عمران 112:3)

﴿ان پر ذلت کی پھٹکار ماردی گئی ہے وہ جہاں بھی ہوں بجز اس کے کہ وہ اللہ کی رسی کو پکڑ لیں یا بندوں کی رسی کو پکڑ لیں﴾

یعنی یہ جو پروردگار نے ان پر ذلت اور مسکنت کی پھٹکار ماری ہے اس سے بچنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی رسی کو پکڑ لیں یعنی اسلام قبول کرلیں پھر ظاہر ہے وہ یہود نہیں ہوں گے' بلکہ مسلمان ہوں گے اور ان کی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ ہوگی اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ لوگوں کی رسی پکڑ لیں یعنی کسی بڑے ملک کی پناہ میں آجائیں جو ان کو اپنا آلہ کار بنالے' ان کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف اپنے عزائم پورے کرتا ہے اور ان کو مسلمانوں سے تحفظ فراہم کرے۔ چنانچہ اسرائیل کے نام سے جو عرب کی سرزمین میں ایک ناسور پیدا کیا گیا ہے اس کی حیثیت ایک آزاد ریاست کی نہیں بلکہ امریکہ اور برطانیہ کی گماشتہ ریاست کی ہے۔ یہ انہی کی چھتری کے نیچے پھل پھول رہا ہے۔ آج اگر امریکہ اس کی پشت پناہی چھوڑ دے تو اسرائیل کیلئے اپنا وجود قائم رکھنا مشکل ہو جائے کیونکہ اس کی حیثیت عربوں کے مقابلے میں ایک گٹھلی سے زیادہ نہیں اگر وہ مل کر اس پر تھوکنا شروع کر دیں تو وہ اس میں بہہ جائے۔ جنگِ رمضان میں سادات نے برملا یہ بات کہی تھی کہ میں اسرائیل سے تو لڑ سکتا ہوں لیکن امریکہ سے نہیں لڑ سکتا یعنی وہ مسلسل اپنے مقبوضہ علاقے اسرائیل سے واگزار کروا رہا تھا کہ امریکہ پوری طاقت سے حرکت میں آیا اور اس نے مصر کے ریڈار تک جام کر ڈالے۔ لیکن اللہ کا وعدہ ایک دائمی وعدہ ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ برطانیہ اپنی طاقت کھوتا جا رہا ہے' امریکہ بھی ہمیشہ نہیں رہے گا جب یہ طاقتیں اپنی حقیقی قوت کھو بیٹھیں گی تو پھر اسرائیل کو اپنے انجام سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

اہل کتاب کو ان کی تاریخ کا آئینہ دکھانے کے بعد ایک سامنے کی بات کہی جا رہی ہے کہ تم اس غلط فہمی سے نکلو کہ تم باقی انسانوں سے الگ کوئی مخلوق ہو اور تمہارے لئے ایمان و عمل کی کوئی پابندی نہیں' تمہیں حقیقت پسند ہونا چاہئے اور یہ سمجھ لینا چاہئے:

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ﴿بلکہ تم بھی اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں سے بشر ہو﴾

یعنی تم کوئی مافوق الفطرت مخلوق نہیں ہو بلکہ عام انسانوں کی طرح انسان ہو' جس طرح باقی انسانوں سے قیامت کے دن مواخذہ ہوگا' تم سے بھی ہوگا۔ رہی اللہ کے یہاں مغفرت اور بخشش' تو اس کیلئے کسی کی قرابت داری کام نہیں دیتی بلکہ

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ﴿اللہ جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے﴾ (البقرۃ 284:2)

اس لئے بخشش اور عذاب کے فیصلے اس کی مشیت کے پابند ہیں' تمہاری نسبتوں کے نہیں اور پھر یہ بھی جان لینا چاہئے کہ اللہ نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنی مشیت کو بھی اپنے قانون کا پابند کر رکھا ہے اور اس کا قانون یہی ہے کہ وہ بخشش اور عذاب کا فیصلہ افراد اور قوموں کے ایمان و عمل کو دیکھ کر کرتا ہے۔ جس کا ایمان و عمل جس سلوک کا سزاوار ہوگا وہ اسی سے بہرہ ور کیا جائے گا۔ اس قانون مغفرت کی ایک دفعہ یہ ہے کہ ''اللہ مشرک کو کبھی نہیں بخشے گا'' تو اہل کتاب کو تفصیلات میں جائے بغیر اتنی بات تو سمجھ لینی چاہئے کہ انہوں نے جس طرح اللہ کی حاکمیت میں دوسروں کو شریک ٹھہرایا

Marfat.com

حتیٰ کہ اس کی ذات وصفات میں نجانے کس کس کو شریک کر لیا ہے اور پھر مصنوعی سہارے تجویز کر کے اللہ کے عہد ہی کو توڑ ڈالا اس کو سامنے رکھتے ہوئے وہ اپنے انجام کے بارے میں بڑی آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ان کیلئے یہ بات سمجھنا دشوار نہیں ہو سکتا کہ جب اللہ کا شریک کوئی نہیں اور مغفرت و عذاب سراسر اللہ کی مشیت کے تابع ہے اور اس کی مشیت میں شرک کی کوئی گنجائش نہیں تو پھر شرک کرتے ہوئے یہ سمجھنا کہ دنیا میں ایسے سہارے بھی ہیں جو شرک جیسے جرم کے ارتکاب کے بعد بھی انہیں اللہ کے عذاب سے بچا سکتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کائنات کا اللہ ہی مالک نہیں کوئی اور بھی ہے۔ اس لئے ارشاد فرمایا:

لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا ؕ وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ

﴿آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اللہ ہی کا ہے۔﴾

یعنی اسی کی ملکیت ہے اور اسی کی حکومت کے ماتحت ہے اور بالآخر اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کائنات کے مالک کی موجودگی میں کسی اور کی کیا مجال کہ وہ اس قانون میں دخل دے سکے اور وہ اللہ کو مجبور کر سکے کہ وہ اپنے قانون سے ہٹ کر اس کی مرضی سے ان اہل کتاب کی بخشش کرے اور پھر یہ بھی ممکن نہیں کہ یہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کی پناہ لے سکیں چونکہ انہیں بہر حال اللہ ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے' اس لئے اس کے مواخذہ سے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ عقل کی بات یہ ہے کہ جب یہ سب کچھ ہو کے رہنا ہے تو پھر آج ہی سے اس کی تیاری کیوں نہ کی جائے۔

آیت:۱۹ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ عَلٰی فَتْرَۃٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّ لَا نَذِیْرٍ ز فَقَدْ جَآءَکُمْ بَشِیْرٌ وَّ نَذِیْرٌ ط وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ O ''اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول رسولوں کے وقفے کے بعد تمہارے لئے دین کو واضح کرتا ہوا آ گیا ہے' مبادا تم کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ہوشیار کرنے والا تو آیا ہی نہیں' دیکھ لو! ایک بشیر و نذیر تمہارے پاس آ گیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

اس آیت کریمہ میں ایک جملہ استعمال ہوا ہے عَلٰی فَتْرَۃٍ مِّنَ الرُّسُلِ رسولوں کے ایک وقفے کے بعد۔ ''فَتْرَۃٌ'' اس وقفے کو کہتے ہیں جو ایک چیز کے ظہور کے بعد سے اس کے دوسرے ظہور تک کا درمیانی وقفہ ہوتا ہے مثلاً باری کے بخار کے دو حملوں کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے' اس کو فترہ کہتے ہیں۔ آیت میں اس سے مراد وہ وقفہ ہے جو دو نبیوں کی بعثت کے درمیان ہوتا ہے۔ یوں تو ہر دو نبیوں کے درمیان وقفہ معمول کی بات ہے' لیکن یہاں بطور خاص اس کا ذکر اسلئے کیا جا رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول اللہ ﷺ کی بعثت مبارکہ تک اس خطہ میں کوئی رسول نہیں آیا اور یہ تقریباً پونے چھ صدیوں پر محیط وقفہ ہے۔ اہل کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے جن گمراہیوں میں مبتلا ہو چکے تھے اور وقتاً فوقتاً اس کی سزائیں بھی بھگت چکے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد ان کی اصلاح کی ایک صورت پیدا ہوئی تھی' لیکن اس طویل وقفے میں انہوں نے نہ صرف اس اصلاح کی تمام مساعی کو ضائع کر ڈالا بلکہ یہود نے بالخصوص بجائے عیسیٰ علیہ السلام کی اصلاح کو قبول کرنے کے ان کے ساتھ اور ان کی دعوت کے ساتھ نہایت خطرناک دشمنی کا رویہ اختیار کیا۔ اسلئے ان میں کسی تبدیلی کے عمل کے واقع ہو جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' البتہ اہل کتاب کے دوسرے گروہ یعنی نصاریٰ میں اس کی امید کی جا سکتی تھی۔ لیکن پال کی سازش اور اس پر مبنی کاوشوں سے عیسائیت کا جس طرح حلیہ بگڑا اس نے تمام تر اصلاح کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ چنانچہ اس وقفہ میں وہ ساری خباثتیں اور گمراہیاں ان میں راہ پا گئیں جو کسی بھی بگڑی ہوئی امت میں تصور کی جا سکتی ہیں۔ اس پوری صورت حال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ اے اہل کتاب اب تمہیں سنبھلنے کا ایک آخری موقع مل رہا ہے۔ اگر اس سے فائدہ

Marfat.com

اٹھالوتو تمہاری دنیا بھی بن سکتی ہے اور آخرت میں بھی تم سرخرو ہو جاؤ گے اور وہ آخری موقع یہ ہے کہ تمہارے پاس ہمارا آخری رسول آ گیا ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ تمہارے علماء وفقہاء نے تورات وانجیل میں جو خیانتیں کی ہیں اور جن حقیقتوں کو چھپایا ہے وہ انہیں کھول کھول کر بیان کر رہا ہے اور جن روحانی عقدوں کو کھولنے میں تمہیں محرومی کا سامنا رہا ہے وہ ایک ایک عقدے کو اس طرح کھول رہا ہے کہ بقول شاعر

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا

وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

تمہارے لئے یہ نادر موقع ہے کہ تم اللہ کے نبی پر ایمان لاؤ اور اپنی قسمت بنالو' کیونکہ آج اگر تم نے یہ موقع ضائع کر دیا تو یاد رکھو! اس کے بعد نہ نبوت ہوگی' نہ رسالت' نہ کوئی نئی امت بنے گی' نہ کوئی نئی شریعت نافذ ہوگی' نہ آسمان زمین سے دوبارہ ہمکلام ہوگا۔ اس نبی کی تشریف آوری سے تم پر ایک اتمام حجت ہو رہا ہے' جس کے بعد تم قیامت کے دن یہ نہیں کہہ سکو گے کہ ہمارے پاس کوئی بشیر اور نذیر نہیں آیا تھا۔ چنانچہ اب جو آنے والا آیا ہے وہ بشیر بھی ہے اور نذیر بھی' وہ تمہارے لئے بشارتیں لے کر آیا ہے' تم اس کی دعوت قبول کر لو۔ لیکن اگر تمہیں اس کی دعوت قبول کرنے سے انکار ہو تو پھر جان لو کہ وہ تمہیں انذار بھی کرنے آیا ہے کیونکہ تمہاری اپنی کتاب یعنی تورات کی خبر کے مطابق وہ اپنے ساتھ آتشیں شریعت لے کر آیا ہے، جس کے نتیجے میں تمہیں جہاد وقتال کے معرکوں سے گزرنا پڑے گا اس میں نہ جانے کتنے سر اڑیں گے اور جو بچ رہیں گے انہیں ملک بدر ہونا پڑے گا۔

تم اہل کتاب ہو۔ تم اپنی کتاب کے مطالعے سے اس نبی کی علامتوں سے واقف ہو اور پھر نبی کی جو عام پہچان کے حوالے ہوتے ہیں' تم ان سے بھی آگاہ ہو۔ جو ایک نبی کی دعوت کا اصول ہوتے ہیں' اس سے بھی واقف ہو۔ ان تمام باتوں کے آئینے میں اس نبی کو پہچاننا چاہو تو تمہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ لیکن اگر تم اپنے حسد کے پھپھولے پھوڑتے رہے کہ انبیاء تو بنی اسرائیل میں آتے تھے' یہ آخری رسول بنی اسماعیل میں کیوں آ گیا؟ تو اس طرح کی باتوں سے تم اللہ کو تو مجبور نہیں کر سکتے اس لئے کہ اللہ تو ہر بات پر قادر ہے وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ البتہ ایسی باتوں سے تم اپنی دنیا اور عاقبت ضرور تباہ کر لو گے۔

تمہید:

سورۃ المائدہ چھٹے پارے کے آٹھویں رکوع میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے اہم واقعہ سے دو باتوں کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔ پہلی بات یہ کہ اس سے پہلے کی آیات میں اگرچہ بنی اسرائیل پر اتمام حجت کر دیا گیا ہے۔ لیکن ان کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ مختلف ادوار میں انہوں نے اس طرح بار بار اللہ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کو توڑا ہے اور پھر اس پر خوفناک سزائیں بھی برداشت کی ہیں کہ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے ان سے کسی خیر کی توقع کرنا بہت مشکل ہے اور دوسری بات جس کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے' وہ یہ ہے کہ یہ نوزائیدہ امت محمدیہ جسے اب حامل دعوت امت کے طور پر دنیا کی اصلاح کیلئے اٹھایا جا رہا ہے اور جس نے اب وہی فرض انجام دینا ہے' جو اس سے پہلے بنی اسرائیل دے چکے۔ انہوں نے جس طرح اس میں ٹھوکریں کھائیں اور بالآخر اس سے معزول کئے گئے۔ ان کی داستان کے اہم حوالوں سے اس امت کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھو! تم ایسی صورت حال اپنے اندر کبھی پیدا نہ ہونے دینا' ورنہ تمہارا انجام بھی وہی ہوگا جو اس امت کا تمہارے سامنے ہوا۔ اس واقعہ میں یہود کو ان پر کئے جانے والے چند احسانات کے تذکرے سے اس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ پروردگار نے مختلف اوقات میں تمہارے اسلاف اور اکابر پر کیسے کیسے انعامات کئے اور انہیں کیسے کیسے احسانات سے نوازا تھا۔ جس فرد اور جس قوم میں انسانیت دم نہ توڑ چکی ہو وہ کبھی احسان فراموشی جیسے جرم کا ارتکاب نہیں کرتی۔ لیکن جب کوئی قوم احسان فراموش ہو جاتی ہے' تو

Marfat.com

پھر اس سے کسی اچھی بات کی توقع کرنا ایک کارِ عبث ہے۔

آیت:۲۰ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ق وَّ اٰتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ O ''اور یاد کرو! جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اے میرے ہم قومو! اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد کرو کہ اس نے تم میں نبی اٹھائے اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ کچھ بخشا جو دنیا والوں میں سے کسی کو نہیں بخشا''۔

بنی اسرائیل پر اللہ کے تین عظیم احسان

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل پر تین احسانات کا ذکر فرمایا۔

1- پہلا احسان یہ کہ ''اس نے تم میں انبیاء اٹھائے''۔ انبیاء اس زمین پر اللہ کے قاصد کی حیثیت سے انسانوں کو اللہ کے پیغام پہنچاتے اور اس کے ذریعے سے انسانی اصلاح کا کام انجام دیتے ہیں۔ وہ خود بھی انسان ہوتے ہیں اور انسانوں کی طرف اللہ کے قاصد اور نمائندہ بن کے آتے ہیں۔ توجہ اس بات کی طرف دلائی جارہی ہے کہ انسانوں میں سے کسی انسان کا اللہ کے نمائندہ بن کے آنا یہ اتنے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ پوری نوع انسانی اس پر جتنا فخر کرے کم ہے جبکہ یہاں تو بطور خاص انسانوں میں سے نمائندہ بنانے کی بات نہیں کی جارہی بلکہ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہا جارہا ہے کہ اللہ نے تم میں سے اپنے انبیاء یعنی نمائندے اٹھائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بطور قوم اللہ کو کتنی عزیز اور اہل زمین میں کس قدر عزت کی مالک ہو کہ اس نے نمائندے چنے تو تم میں سے چنے۔ کسی قبیلے یا کسی بستی سے کوئی بادشاہ اگر اپنا سفیر چن لیتا ہے تو پوری بستی اس پر فخر کرتی اور اتراتی ہے اور اگر خالق کائنات کسی قوم میں سے اپنا نمائندہ اور سفیر چن لے تو اسے بجا طور پر ناز کرنے اور فخر کرنے کا حق ہے۔

2- دوسرا احسان یہ فرمایا کہ ''ہم نے تمہیں صرف دنیا پر روحانی سیادت کیلئے ہی نہیں چنا بلکہ تمہیں حکومتیں اور بادشاہتیں بھی بخشیں''۔ جس قوم کو روحانی اور معنوی سیادت کے ساتھ اقتدار بھی دے دیا جائے اس قوم کیلئے انقلاب برپا کرنا اور اپنے مقاصد کے مطابق نیا انسانی معاشرہ وجود میں لانا کوئی مشکل کام نہیں رہتا اور یہ وہ احسان ہے جو قدرت بہت کم قوموں پر کیا کرتی ہے۔

3- تیسرا احسان یہ فرمایا جس کو پہلے بیان کئے گئے دونوں احسانات کا نتیجہ کہنا چاہیے کہ ''تمہیں وہ کچھ دیا جو اس وقت کی دنیا میں کسی اور کو نہیں دیا'' مراد یہ ہے کہ تمہیں حامل دعوت امت کی حیثیت سے مخصوص کر لیا گیا اور دنیا بھر کی رہنمائی اور ان کی ہدایت کا کام تمہارے سپرد کیا گیا۔ یہ تینوں احسانات ایسے ہیں کہ جن پر یہ قوم جتنا فخر کرے کم ہے۔

ان احسانات کے حوالے سے اس آیت کریمہ کے الفاظ پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان تینوں احسانات کو اللہ تعالیٰ نے ماضی کے افعال سے ذکر فرمایا ہے۔ اس کا بظاہر مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں احسانات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے گزرنے والے بنی اسرائیل پر گئے تھے اور جن کا بطور احسان قوم موسیٰ کو ذکر سنایا جارہا ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم تاریخ کو دیکھتے ہیں تو یہ بات غلط معلوم نہیں ہوتی 'اگرچہ وہ پوری تاریخ اس وقت محفوظ حالت میں نہیں ہے' لیکن پھر بھی ہم اتنا جانتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام لڑکپن میں حادثاتی طور پر کنعان سے نکلے' غلام بنے' بکتے بکتے مصر پہنچ گئے' وہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں غلامی اور جیل کے راستے سے اپنی قدرت خاصہ سے اقتدار تک پہنچادیا۔ چنانچہ اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے اپنے خاندان اور اپنے محترم والدین کو مصر بلا لیا۔ وہاں پر ان کی اولاد خوب پھلی پھولی اور معلوم ہوتا ہے کہ کئی نسلوں تک ان میں نبوت بھی رہی اور حکومت بھی۔ اس طرح وہ اس وقت کی معلوم دنیا کی قیادت کرتے رہے۔

Marfat.com

دوسری سوچ یہ ہے کہ یہاں فعل ماضی مستقبل کے معنی میں ہے اور یہ قرآن کریم کا عام اسلوب ہے کہ وہ جس بات کو مستقبل میں یقینی طور پر وقوع پذیر ہونے کی خبر دینا چاہتا ہے اس کو فعل ماضی میں بیان کرتا ہے' جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ بات تو مستقبل میں واقع ہوگی لیکن تم اس کو یوں جانو کہ گویا یہ واقع ہو چکی ہے۔ یہ انداز بیاں اس کے حتمی ہونے کا غماز ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورتحال ہے بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اب قوم موسیٰ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شکل میں نبوت تو دے ہی چکا لیکن یہ نبوت کا سلسلہ دراز ہوتا جائے گا اور نسلوں تک چلے گا اور پھر انہی کی نسلوں میں بادشاہ اٹھیں گے اور اللہ انہیں اقتدار سے نوازے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی کم ہمتی اور کوتاہ فکری کے باعث اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ان کو اقتدار نہ مل سکا' لیکن موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام نے مسلسل فتوحات کا سلسلہ شروع کیا حتیٰ کہ فلسطین پر قابض ہو گئے۔ اس طرح سے بنی اسرائیل کے اقتدار کا آغاز ہوا جو تاریخ کے مختلف نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے حضرت سلیمان علیہ السلام کی حیرت انگیز بادشاہی تک پہنچا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نہ صرف انسانوں پر حکومت بخشی بلکہ بیک وقت جنات اور جانور تک ان کے زیر نگیں تھے اور آپ کو پروردگار نے ایسا بے مثل اقتدار عطا کیا کہ جس کی کوئی نظیر نہ اس سے پہلے موجود تھی' نہ بعد میں پیدا ہو سکی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دن نماز پڑھاتے ہوئے آنحضرت ﷺ آگے بڑھے پھر پیچھے ہٹے تو صحابہ کے استفسار پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شیطان جن میری نماز توڑنے کیلئے حملہ آور ہوا تھا میں نے چاہا کہ اسے پکڑ کر باندھ دوں لیکن پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان کی دعا یاد آئی کہ یا اللہ میرے بعد کسی کو مجھ جیسی حکومت نہ دینا۔ یعنی ایسی حکومت جس میں جنات بھی زیر نگیں ہوں۔ مختصر یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد مسلسل بنی اسرائیل میں انبیاء بھی آئے، انہیں اللہ نے اقتدار بھی دیا اور امامت و قیادت بھی انہی کے پاس رہی۔

ایک تیسری رائے یہ ہے کہ اس وقت جس عظیم احسان کی طرف بنی اسرائیل کو متوجہ کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ وہ کل تک غلامی کی ذلت کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ فرعونی اور قبطی ایسے ایسے مظالم ان پر توڑ رہے تھے جو کسی بھی قوم کو عزت سے محروم کرنے اور اس کو تباہ کرنے کیلئے کافی ہوتے ہیں۔ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسول بنا کے بھیجا اور ان کے واسطے سے ان کو مصر سے نکالا۔ اب یہ وادی سینا میں اس قابل ہیں کہ اگر چاہیں تو اپنی اولوالعزمی اور ارادہ اور عمل کی پختگی سے اپنے لئے وہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں' جس کا اس آیت میں ذکر کیا جا رہا ہے۔ قدرت ان پر مہربان ہے۔ صرف ان کے جوش عمل کا انتظار ہے۔ جیسے ہی انہوں نے اپنے آپ کو اس قابل ثابت کر دیا وہ سارے مذکورہ انعامات سے نوازے جائیں گے۔ اس آیت کریمہ میں ان تمام باتوں کے احتمالات موجود ہیں۔ ہم کوئی سا مفہوم مراد لے لیں آیت کے الفاظ اس کے متحمل ہو سکتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اسلوب کے لحاظ سے بھی ایک بات توجہ طلب ہے۔ وہ یہ کہ سلسلۂ نبوت کی تعبیر کیلئے تو فرمایا:

جَعَلَ فِيكُمْ اَنْبِيَاءَ ﴿تم میں انبیاء بنائے﴾

لیکن سلسلہ بادشاہی کی تعبیر کیلئے فرمایا:

وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ﴿اور تم کو بادشاہ بنایا﴾

ان دونوں اسلوبوں پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نبوت ایک مرتبۂ اختصاص ہے جو صرف اسی سے مخصوص ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس منصب پر فائز فرماتا ہے' دوسرے اس میں شریک نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس بادشاہی ایک منصب اجتماعی ہے' جس میں بادشاہ کے ساتھ اس کی پوری قوم حصہ دار ہوتی ہے۔ اگر کسی بادشاہی میں قوم شریک نہ ہو تو وہ استبداد اور مطلق العنانی ہے۔

آیت: ۲۱ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا

Marfat.com

خٰسِرِیۡنَ O ''اے میرے ہم قومو! اس مقدس سرزمین میں داخل ہوجاؤ' جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے اور پیٹھ پیچھے نہ پھرو۔ ورنہ! نامرادوں میں سے ہوکر رہ جاؤ گے''۔

کوہِ سینا پر بنی اسرائیل کی پرورش

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر بحرِ قلزم سے نکلے اور جزیرہ نما سینا میں داخل ہوئے' آپ کی منزل کوہ سینا تھی' جسے ہم ''کوہِ طور'' کہتے ہیں۔ آپ اس کے دامن میں جا کر ٹھہرنا چاہتے تھے۔ یہ صحرا ایسا نہیں تھا کہ سرے سے اس میں انسانوں کا نشان نہ ہو بلکہ راستے میں بہت سی بستیاں بھی تھیں جن میں بعض قبائل آباد تھے اور ان بستیوں کے نام بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ چنانچہ آپ مارہ' ایلیم اور عیدیم کی بستیوں سے ہوتے ہوئے کوہ سینا کی طرف آئے اور ایک سال سے بھی زائد مدت تک اس مقام پر ٹھہرے رہے۔ یہیں پر تورات کے بیشتر احکام نازل ہوئے اور یہیں وہ بڑے بڑے معجزات پیش آئے جس کا قرآن کریم نے بھی ذکر کیا ہے اور تاریخ بھی اس کا ذکر کرتی ہے۔ مثلاً ابر کا سایہ کرنا' چٹان سے بارہ چشموں کا پھوٹنا' من وسلویٰ کا نازل ہونا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر ایسے ایسے احسانات کئے ہیں' جس کی مثال ہمیں اور کہیں نہیں ملتی۔ ورنہ انسانوں کا یہ ہجوم کہ اسرائیلی روایات کے مطابق اس کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچتی ہے۔ اچانک صحرائے سینا میں پہنچا ہے' جہاں زندگی گزارنے کے کوئی امکانات نہیں۔ اگر اس طرح قدرت ان کی پاسبانی نہ کرتی اور ان کو زندگی گزارنے کے امکانات مہیا نہ کرتی تو یہ بھوک اور پیاس کی شدت اور موسمی حملوں سے ہلاک ہو جاتے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی ملک میں کوئی ایسا بڑا حادثہ ہو جاتا ہے' جس کے نتیجے میں وہاں سے چند لاکھ مہاجرین نکلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو جس پڑوسی ملک میں مہاجرین کا یہ قافلہ داخل ہوتا ہے' وہ ملک سراپا احتجاج بن جاتا ہے اور نتیجۃً اس کی استعانت اور استمداد کا دائرہ پوری دنیا تک پھیل جاتا ہے' اقوام متحدہ حرکت میں آتی ہے' تب بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہونے پاتا حالانکہ آج کی دنیا کے پاس وسائلِ رزق اور وسائلِ مواصلات کی وہ فراوانی ہے جس کا اس دور میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن قدرت کی کارفرمائی دیکھئے کہ اس نے اتنی بڑی تعداد میں ایک امت کو زندہ رکھا اور اپنی طرف سے اس پر ایسے حیرت انگیز انتظامات کئے جس کا تصور بھی آج مشکل ہے۔

''من'' یعنی ایک طرح کی گوند نما چیز زمین پر گرتی اور یہ اس کو اٹھا کر اس کی روٹی بنا لیتے جو حلوے سے زیادہ لذیذ ہوتی تھی۔ ''سَلْوٰی'' بٹیر کی طرح کا ایک پرندہ تھا جو ان کے خیموں سے ٹکرا ٹکرا کے گرتا اور یہ اس کے گوشت سے محظوظ ہوتے۔ پانی انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اسے عصائے موسیٰ کی ضرب سے اللہ تعالیٰ نے ایک چٹان سے بارہ چشموں کی صورت میں ایسے رواں کر دیا کہ ہر قبیلے کیلئے الگ الگ گھاٹ مقرر کر دیئے گئے۔

بنی اسرائیل کا جہاد سے انکار

اسی کوہِ سینا میں جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی معرفت بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا کہ تم ارضِ مقدسہ یعنی فلسطین کی طرف جاؤ اور اسے فتح کر لو' اللہ نے اسے تمہارے لئے لکھ دیا ہے۔ یعنی اسے تمہاری میراث بنا دیا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لئے ہوئے تبعیر اور حصیرات کے راستے جب دشت فاران میں تشریف لائے تو وہاں آپ نے اپنی قوم کو یہ حکم سنایا اور وہیں آپ نے ان میں سے بارہ نقیب مقرر فرمائے' اور انہیں فلسطین کے حالات معلوم کرنے کیلئے روانہ فرمایا۔ یہ بارہ افراد پر مشتمل وفد کئی دن گزارنے کے بعد (بعض روایات کے مطابق چالیس دن تک) فلسطین سے

Marfat.com

مختلف علاقوں کا جائزہ لینے کے بعد واپس آیا اور قادس جو دشت فاران کا آخری علاقہ ہے' وہاں آ کر انہوں نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ حضرت یوشع اور کالب کے سوا پورے وفد کی رپورٹ نہایت حوصلہ شکن تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اس علاقے میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں' بڑا خوشحال علاقہ ہے' نعمتوں کی فراوانی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم نے وہاں بنی عناق کی نسل کے لوگوں کو دیکھا ہے (جن کو تورات اور قرآن کریم نے ''جبار'' کہا ہے)

''جبار'' عربی زبان میں کھجور کے ان درختوں کو کہتے ہیں جو بہت قد آور ہوں اور بڑا سایہ دیں۔ انسانوں میں بھی ''جبار'' بڑے مضبوط اور قد آور لوگوں کیلئے بولا جاتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایسے قد و قامت کے لوگ ہیں کہ ہم ان کی نظروں میں ایسے لگتے تھے جیسے ٹڈے۔ کہنے لگے کہ اگر وہ لوگ وہاں نہ ہوں تو وہاں کی خوشحالی اور فارغ البالی کے باعث ہم ہروقت وہاں جانے کیلئے تیار ہیں۔ لیکن ان کی موجودگی میں ہم وہاں جائیں' یہ نہیں ہوسکتا کیونکہ ان کی موجودگی میں جانے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہاں جا کر ہم ان کی تلواروں کا قیمہ بنیں۔ چنانچہ یہ ساری قوم رات بھر روتی رہی اور موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کرتی رہی کہ تم ہمیں یہاں اس لئے لائے تھے کہ ہمارا قیمہ بنواؤ اور اس کے بعد ہماری بیویاں اور بیٹیاں ان کی لونڈیاں اور بچے غلام بن جائیں اور پھر آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بنالیں اور مصر کو لوٹ چلیں۔ اس پر ان بارہ نقیبوں (سرداروں) میں سے جو فلسطین کے دورے پر بھیجے گئے تھے۔ دو سردار یوشع اور کالب اٹھے اور انہوں نے اس بزدلی پر قوم کو ملامت کی۔ کالب نے کہا چلو ہم ایک دم جا کر اس ملک پر قبضہ کرلیں کیونکہ ہم اس قابل ہیں کہ اس پر تصرف کریں۔ پھر دونوں نے یک زبان ہو کر کہا اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا۔ صرف یہ ہونا چاہئے کہ تم خداوند خدا سے بغاوت نہ کرو اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو اور ہمارے ساتھ خداوند ہے' سو ان کا خوف نہ کرو۔ مگر قوم نے جواب یہ دیا کہ انہیں سنگسار کردو۔

آیت ۲۲: قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ ''وہ بولے کہ اس میں تو بڑے زور آور لوگ ہیں۔ ہم اس میں نہیں داخل ہونے کے' جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم داخل ہوں گے''۔

''غلامی'' بنی اسرائیل کی بزدلی کی اصل وجہ

بنی اسرائیل کی یہ حالت دیکھ کر اور ان کی روداد پڑھ کر آدمی کو حیرت ہوتی ہے کہ ایک قوم جو اللہ کے نبی پر ایمان لاچکی ہے اور مسلسل اس پر اللہ کی نعمتیں برس رہی ہیں' وحی الٰہی اتر رہی ہے اور آنے والے مستقبل کیلئے انہیں ایک قائدامت کے طور پر تیار کیا جارہا ہے۔ بایں ہمہ ان کی بزدلی کا یہ عالم ہے کہ وہ کسی بھی معرکہ کارزار میں اترنے کیلئے تیار نہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح اب تک ہر کام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے انجام پذیر ہوا ہے' یہ مرحلہ بھی اسی طرح سر ہوجانا چاہئے۔ بحر قلزم اگر عصائے موسیٰ سے پایاب ہوسکتا ہے تو فلسطین بھی ایسے ہی معجزے سے فتح کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں آخر اس مصیبت میں کیوں ڈالا جارہا ہے۔ ان میں یہ جو بزدلی اور اجتماعی کمزوری دکھائی دیتی ہے' آدمی کو اس پر حیرت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اس میں ایسی کوئی بات نہیں جو سمجھ میں آنے والی نہ ہو۔ جس آدمی نے بھی قوموں کی تاریخ پڑھی ہے' وہ خوب جانتا ہے کہ آزادی قوموں کو خوداعتمادی دیتی ہے۔ اپنی قسمت آپ بنانے کا حوصلہ دیتی ہے اور اپنے قومی تشخص کو باقی رکھنے کیلئے بڑے سے بڑے معرکے میں اتر جانا ان کیلئے کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ وہ جانتے ہیں۔

Marfat.com

بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں

لیکن جب کوئی قوم غلامی کا شکار ہوتی ہے تو وہ صرف قومی تشخص ہی سے نہیں' بلکہ قومیت کے احساس سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔ وہ انسانوں کا ایک ایسا ہجوم ہوتا ہے جن کی ضرورت صرف کھانا پینا اور زندہ رہنا ہے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ قومی آزادی' قومی خود اعتمادی' قومی وقار اور روئے زمین پر عزت و سربلندی سے زندہ رہنا کیا چیزیں ہیں۔ وہ ان چیزوں کو کتابی علم سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے۔ اس لئے جب بھی انہیں کبھی کسی ایسے معرکے میں شامل ہونے کیلئے کہا جائے جہاں ایثار' سرفروشی اور جاں سپاری کے مراحل درپیش ہوں۔ وہ ان سے کوسوں دور بھاگتی ہیں کیونکہ غلامی ان کے اندر ان خصائل میں سے کسی چیز کو باقی نہیں رہنے دیتی' بلکہ وہ یہ تک بھول جاتی ہیں کہ حسن و خوبی کے معیارات کیا ہیں اور عزت اور ذلت کس چیز کا نام ہے۔ اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا تھا

غلامی کیا ہے ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے' ہے وہی زیبا

بنی اسرائیل چونکہ تاریخ کے اس جبر کا شکار تھے اور وہ آزادی کے خصائص سے یکسر محروم ہو چکے تھے اور اب تک انہوں نے ہر کام معجزات سے ہی ہوتا دیکھا تھا' اس لئے وہ کسی بھی ایسے معرکہ کارزار میں شامل ہونے کو تیار نہ تھے' جس میں انہیں خطرات سے دوچار ہونا پڑے۔ اس لئے باوجود اللہ کے اس وعدے کے کہ یہ فلسطین کی سرزمین تمہارے لئے مقدر کر دی گئی ہے' بس ضرورت صرف یہ ہے کہ تم کسی حد تک اولوالعزمی کا ثبوت دو۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ ہم ایسی کسی مہم میں شامل ہونے کیلئے تیار نہیں۔

ہر چند کہ یہ پوری قوم بزدلی کی تصویر بن گئی۔ لیکن اللہ کا قانون یہ معلوم ہوتا ہے کہ قومیں ہزار تنزل کا شکار ہو جائیں' ان میں کچھ نہ کچھ نمو کے لوگ باقی رکھے جاتے ہیں تاکہ وہ آخری دم تک قوم کے سامنے اتمام حجت کا فرض انجام دیتے رہیں۔ چنانچہ جو بارہ افراد کا ایک وفد فلسطین کے حالات کا جائزہ لینے کیلئے بھیجا گیا تھا ان میں سے دو افراد ایسے تھے جنہوں نے ان کا حوصلہ بندھانے کی کوشش کی۔

آیت:۲۳ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیۡنَ یَخَافُوۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمَا ادۡخُلُوۡا عَلَیۡہِمُ الۡبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلۡتُمُوۡہُ فَاِنَّکُمۡ غٰلِبُوۡنَ ۬ۚ وَ عَلَی اللّٰہِ فَتَوَکَّلُوۡۤا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۝ ''دو شخصوں نے' جو تھے تو انہی ڈرنے والوں ہی میں سے اور اللہ کا ان پر فضل تھا' للکارا کہ ان پر چڑھائی کر کے شہر کے پھاٹک میں گھس جاؤ۔ جب تم اس میں گھس جاؤ گے تو تمہی غالب رہو گے اور اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم مومن ہو''۔

تاریخی روایات میں ہے کہ ان دونو جوانوں کا نام یوشع اور کالب تھا۔ حضرت یوشع حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نبوت سے سرفراز ہوئے۔ یہ دونوں بنی اسرائیل کی قوم سے ہی تعلق رکھتے تھے اور دونوں غلامی کے زخم بھی سہہ چکے تھے۔ اس کے باوجود حیرت ہے کہ اللہ نے ان میں ایک اولوالعزم اور صداقت شعار قوم کے افراد کی خصوصیات زندہ رکھیں۔ ایسی خصوصیات کا وجود غلام قوم کے افراد میں بجائے خود بہت نادر ہے۔ یہ اسی کے نصیب میں ہوتا ہے جس پر اللہ اپنا فضل فرمائے۔ چنانچہ ان پر بھی اللہ نے اپنا فضل فرمایا اور انہوں نے قوم کو ڈھارس بندھانے اور اپنے فرض کی انجام دہی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور ان کو دو حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی۔

اہلِ ایمان صرف اللہ سے ڈرتے ہیں

لیکن اس سے پہلے ایک اور بات پر توجہ دینا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اس آیت کریمہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یہ دونوں افراد ان لوگوں میں

Marfat.com

تھے جو ڈرنے والے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس سے ڈرتے تھے؟ تاکہ معلوم ہو کہ ان کا تعلق کس گروہ سے تھا۔ ایک بات جو زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تھے اپنی ہی قوم کے انہی لوگوں میں سے جو کسی بھی سرفروشی کے کام میں شریک ہونے سے ڈرتے تھے۔ ان کے اندر یہ حس مر چکی تھی کہ قومی سربلندی کیلئے افرادِ قوم کو جانگسل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور صداقت شعاری کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ لیکن اللہ نے ان پر اپنا فضل فرمایا اور یہ انہی میں سے ہونے کے باوجود سرفروشی کا راستہ اختیار کر رہے تھے۔

دوسرا مطلب اس کا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں اللہ سے ڈرنے والے لوگوں میں سے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قوم بنی اسرائیل میں کوئی ایک گروہ تھا' جو اللہ سے ڈرتا تھا اور یہ ان لوگوں میں سے تھے' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں خیر و شر کے حوالے سے ہمیشہ دو گروہ رہے ہیں۔ اہلِ خیر کا گروہ دنیا کی کسی قوت سے کبھی نہیں ڈرتا۔ بلکہ وہ ہمیشہ اللہ سے ڈرتا ہے اور اس گروہ کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوتا ہے۔ ہر دور میں اس کا وجود ہمیں ملتا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوہ طور پر ان کو نبوت سے سرفراز کیا گیا تو ان کو معجزہ عطا کرتے ہوئے پروردگار نے فرمایا کہ اے موسیٰ! اپنا عصا پھینکو۔ جیسے ہی عصا پھینکا گیا وہ ایک اژدھا بن گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کیلئے یہ ایک نہایت حیرت انگیز اور ڈرا دینے والا واقعہ تھا۔ ویسے بھی آپ عجیب صورتحال سے دوچار کر دیئے گئے تھے کہ اچانک انہیں اللہ سے ہم کلامی کا موقع ملا اللہ کا کلام سرتاپا جلال ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے حصار میں تھے کہ اچانک یہ واقعہ پیش آیا۔ خوف آپ پر غالب آیا اور آپ ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہاں پروردگار نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا:

يَا مُوسٰى لَا تَخَفْ إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝

﴿اے موسیٰ مت ڈر میرے یہاں پیغمبر ڈرا نہیں کرتے﴾ (النمل 10:27)

اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحب ایمان لوگوں کا اور ان کی طرف مبعوث ہونے والوں کا ہمیشہ یہ نشان رہا ہے کہ وہ اللہ کے سوا ہر طرح کے خوف سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں قرآن کریم نے جادوگروں کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کے ایمان لانے کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے' اس میں بھی سب سے بڑی بات جس سے ہمارے ایمان کو روشنی ملتی ہے' وہ یہ ہے کہ جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کو معجزاتی شکل میں دیکھا اور سمجھ گئے کہ یہ جادو نہیں بلکہ نبوت ہے تو پھر انہوں نے فرعون کے سارے جاہ و جلال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا نہ صرف اعلان کیا بلکہ اللہ کے حضور سجدے میں گر گئے۔ فرعون نے جب ان کو اپنی قوت اور جبروت سے ڈرانے کیلئے دھمکیاں دیں تو انہوں نے صاف کہا کہ بادشاہ آپ جو چاہیں کر گزریں ہم اس ذات پر ایمان لا چکے ہیں جس کے بعد کسی اور سے ڈرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مختصر یہ کہ اہل حق کا یہ وہ قافلہ ہے جن کی علامت یہ ہے کہ وہ اللہ کے سوا نہ کسی کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور نہ کسی سے خوف زدہ ہوتے ہیں۔

"توکل علی اللہ اور مقدور بھر کوشش" فضل الٰہی کے نزول کیلئے شرط

یہ دونوں نوجوان بھی اسی قافلۂ حق کے مسافروں میں سے تھے۔ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ آپ کو دو کام کرنے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فلسطین پر چڑھ دوڑو اور اس کی فصیل پر یلغار کرتے ہوئے اس کے بڑے گیٹ میں گھس جاؤ۔ وہاں تک پہنچنا تمہارا کام ہے' اس لئے کہ تمہیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کے بعد کیا ہوتا ہے' یہ تمہارا کام نہیں بلکہ یہ سراسر اللہ کی ذات کا فیصلہ ہے۔ اگر تمہارے اندر

Marfat.com

اخلاص ہوا اور تم نے توکل اور بھروسہ کو پوری طرح بروئے کار لاتے ہوئے اپنی کوششوں میں کوئی کمی نہ کی تو یقیناً اللہ تمہیں فتح سے ہمکنار کرے گا اور تم میں سے جن لوگوں کو وہ زیادہ بلند مرتبہ دینا چاہے گا ان کو شہادت سے بہرہ مند فرمائے گا۔ لیکن تمہارا کام یہ ہے کہ ایک دفعہ شہر پر چڑھ دوڑو۔ یہ بالکل اللہ کی وہی سنت ہے جو ہم یوسف علیہ السلام کے واقعے میں دیکھتے ہیں کہ زلیخا نے ان کو گناہ کی دعوت دی اور اس سے بچ نکلنے کے تمام امکانات ان کے سامنے مسدود کر دیئے۔ اب بظاہر حضرت یوسف علیہ السلام کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اللہ کی طرف سے ان کے دل میں یہ خیال ڈالا گیا کہ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ ہر بند دروازے تک دوڑتے ہوئے پہنچ جاؤ' اس کے بعد اس کے تالوں کو توڑنا اور دروازوں کو کھولنا' یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ شرط یہ ہے کہ تمہارے اعتماد علی اللہ اور تمہاری کوشش میں کوئی کمی نہیں آنی چاہیے۔

بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام دروازے پر دوڑتے ہوئے پہنچتے تو دروازہ ان کیلئے کھل جاتا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ان کی کوششوں کے نتیجے میں ان کو محفوظ رکھا۔

ہم اپنی اسلامی تاریخ میں بھی قدم قدم پر اس کے شواہد دیکھتے ہیں۔ خود جنگ بدر میں مسلمانوں کے پاس وسائل جنگ کے حوالے سے تہی دامنی کے سوا اور کیا تھا۔ افرادی قوت ایک تہائی سے بھی کم تھی۔ مقابلے کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن ان کی اصل قوت کیا تھی؟ وہی جس کا ابھی ذکر ہو رہا ہے۔ حفیظ نے اس کی ٹھیک منظر کشی کی ہے:

تھے ان کے پاس دو گھوڑے' چھ زرہیں' آٹھ شمشیریں
پلٹنے آئے تھے' یہ آج دنیا بھر کی تقدیریں
نہتے تھے' مگر تسکین و اطمینان رکھتے تھے
کہ ساماں پر نہیں' ایمان پر ایمان رکھتے تھے

یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے عرض کیا تھا کہ یا اللہ! سالہا سال کی محنت کا ثمر آپ کے حضور لے آیا ہوں' اب ان کو بچانا اور ان کی مدد فرمانا آپ کے ذمہ ہے۔ انہی حقائق کی طرف ان نوجوانوں نے اپنی قوم کو ہر چند متوجہ کیا۔ لیکن غلامی کی زخم خوردہ یہ قوم چونکہ ملی خصوصیات سے بالکل محروم ہو چکی تھی' اسلئے انہوں نے نہ صرف اس نصیحت کو قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا:

آیت: ۲۴ قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ

''وہ بولے کہ اے موسیٰ! ہم اس میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے' جب تک وہ اس میں موجود ہیں۔ تو تم اور تمہارا خداوند جا کر لڑو' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم کا کورا جواب

تورات میں بھی ان کے جواب کا ذکر کیا گیا ہے' جو اگرچہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ لیکن ان کی پست ہمتی اور بزدلی کا پوری طرح آئینہ دار ہے۔ تورات میں ہے

Marfat.com

﴿تب ساری جماعت زور زور سے چیخنے لگی اور وہ لوگ اس رات روتے ہی رہے اور کل بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون کی شکایت کرنے لگے اور ساری جماعت ان سے کہنے لگی ہائے کاش! ہم مصر ہی میں مرجاتے' کاش! اس بیابان میں ہی مرجاتے۔ خداوند کیوں ہم کو اس ملک میں لے جاکر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے۔﴾

اندازہ فرمایئے! جس قوم کی بزدلی اور دہشت زدگی کا یہ عالم ہو' انہیں موسیٰ علیہ السلام جیسا عظیم پیغمبر اور یوشع اور کالب جیسے مجاہد بھی اٹھانے سے قاصر رہتے ہیں۔ زندہ قوموں میں اگر تنزل کے آثار ظاہر ہونے لگیں تو بڑے لوگوں کے پند و نصائح اور مجاہدین کی حوصلہ مندیوں سے ان کا ازالہ ممکن ہے۔ لیکن جو قوم تنزل کی آخری حد کو پہنچ جاتی ہے' وہ گویا مرجاتی ہے۔ ایسے لوگوں میں کسی مسیحائی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی یہ حالت دیکھتے ہوئے اور ان کا آخری جواب سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی غم اور صدمے میں ڈوب گئے تب آپ نے اللہ سے دعا مانگی:

آیت:۲۵ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ○ ''موسیٰ نے دعا کی اے میرے پروردگار! میرا اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر کچھ زور نہیں' پس تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان علیحدگی کردے''۔

بنی اسرائیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیزاری

علیحدگی کردینے کا مفہوم جو سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ مجھے ان کی قیادت و اصلاح کے بارِ عظیم سے سبکدوش کردیا جائے کیونکہ اتنی طویل جدوجہد اور اتنے بیشمار خوارق و عجائب کے بعد بھی ان کی بے یقینی کا یہ عالم ہے کہ ایک شخص بھی بات سننے کیلئے تیار نہیں اور جنہیں اپنی زندگی کی بقاء اور اپنے خورد و نوش کی فکر کے سوا اور کسی چیز کی فکر نہیں تو ایسے حیوانوں سے کون سے معرکے کی امید کی جاسکتی ہے اور ایسے پتھروں میں کیا جونک لگائی جاسکتی ہے۔ اس لئے مجھے ان کی ذمہ داریوں سے فارغ کردیا جائے۔ حضرت ہارون علیہ السلام چونکہ خود اللہ کے مقرر کردہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وزیر بھی تھے اور پیغمبر بھی' اس لئے آپ نے بطور خاص اس کا ذکر کیا۔ اس لئے کہ پیغمبر ہونے کی وجہ سے ان کے ایثار و سرفروشی میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ وہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی طرح معصوم تھے۔ اب اگر یہ دعا قبول کرلی جاتی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اٹھالیا جاتا اور یا ان کو ہجرت کا حکم دے دیا جاتا تو اللہ کے قانون کے مطابق بنی اسرائیل پر عذاب نازل ہوجاتا۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا تو قبول نہ فرمائی گئی اور اس طرح بنی اسرائیل کو ہلاکت کے عذاب سے تو بچالیا گیا۔ لیکن ان کی ناقدری اور بے یقینی کی سزا ان کو چالیس سال تک اس سرزمین میں سرگرداں رہنے اور فلسطین سے محرومی کی شکل میں دی گئی۔

آیت:۲۶ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ○ ''فرمایا کہ یہ سرزمین ان پر چالیس سال کیلئے حرام ٹھہری۔ یہ لوگ زمین میں بھٹکتے پھریں گے۔ پس تو ان نافرمان لوگوں کا غم نہ کھا''۔

انکارِ جہاد پر بنی اسرائیل کو سزا

تورات نے بھی اس کا ذکر کیا ہے:

﴿اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا میں کب تک اس خبیث گروہ کو جو میری شکایت کرتا رہتا ہے' برداشت کروں۔ بنی اسرائیل جو میرے برخلاف شکایتیں کرتے رہتے ہیں' میں نے سب شکایتیں سنیں' سو تم ان سے کہہ دو خداوند کہتا ہے مجھے اپنی

Marfat.com

حیات کی قسم ہے کہ جیسے تم نے میرے سنتے کہا میں تم سے ضرور ویسا ہی کروں گا۔ تمہاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہیں گے اور تمہاری ساری تعداد میں سے یعنی بیس برس سے لے کر اس سے اوپر اوپر کی عمر کے تم سب جتنے گنے گئے اور مجھ پر شکایت کرتے رہے' ان میں سے کوئی اس ملک میں جس کی بابت میں نے قسم کھائی تھی کہ تم کو وہاں بساؤں گا' جانے نہ پائے گا' سوائے یفنہ کے بیٹے کالب اور نون کے بیٹے یشوع کے اور تمہارے بال بچے جن کی بابت تم نے یہ کہا کہ وہ تو لوٹ کا مال ٹھہریں گے' ان کو میں وہاں پہنچاؤں گا اور جس ملک کو تم نے حقیر جانا' وہ اس کی حقیقت پہچانیں گے اور تمہارا یہ حال ہوگا کہ تمہاری لاشیں اس بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمہارے لڑکے بالے چالیس برس تک بیابان میں پھرتے اور تمہاری زناکاریوں کا پھل پاتے رہیں گے ﴾

(گنتی باب ۱۴۔ ۲۷۔ ۳۴)

تاریخِ بنی اسرائیل اور مسلمانانِ پاکستان

جب ہم اس پوری صورت حال پر تدبر کی نگاہ ڈالتے ہیں' جس میں بنی اسرائیل کا کردار بھی ہمارے سامنے ہے اور اس پر انہیں ملنے والی سزا بھی پیشِ نظر ہے تو چند باتیں بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہیں جنہیں اس امت محمدیہ کو عبرت آموزی کی خاطر سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اگرچہ یہ امت بڑی تیزی سے اس انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ لیکن پھر بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے اسلئے ہم چند سبق آموز باتوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے کردار کا یہ بودہ پن جس نے ان سے اولوالعزمی اور سرفروشی کے تمام جذبات چھین لئے۔ یہ نتیجہ ہے ان کی اس غلامی کا جس کا وہ ایک طویل عرصہ تک شکار رہے۔ جس نے انہیں زندگی کے اجتماعی حسن سے یکسر محروم کر کے رکھ دیا۔ اس غلامی کی حقیقت پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں تو استعمار کے نتیجے میں قوم سیاسی طور پر غلامی کا شکار ہوتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ سیاسی غلامی ہمہ جہت غلامی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں قوم ذہنی صلاحیتوں سے لے کر عملی صلاحیتوں تک زندگی کے ہر دائرہ میں عضو معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہم چونکہ خود دو سو سالہ غلامی کی ایک طویل رات کاٹ چکے ہیں اس لئے ہم اس کے اثرات اور نتائج کو بہت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ہمیں اس سیاسی غلامی سے آزاد ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے' لیکن اس کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فرنگی استعمار نے اس قوم کو دو سو سال تک جس طرح قومی و ملی خصوصیات سے محروم کیا' بالخصوص تعلیمی اداروں میں جس طرح تعلیم دی اور پھر تعلیم یافتہ طبقہ کو جس تربیت سے گزارا' اس کے نتیجے میں ایک خاص ذہنی ڈھانچہ تیار ہوا' جس میں اجتہادی فکر کی بجائے استعماری آقاؤں کی تقلیدِ محض کا ایک ذوق پیدا ہوا۔ جس کا مقصد یہ ٹھہرا کہ مسلمانوں کو اور سب کچھ رہنے دیا جائے' لیکن مسلمان نہ رہنے دیا جائے۔ تعلیمی اداروں کو ایسے نصابِ تعلیم سے مسلح کیا جائے جس کے نتیجے میں وہاں سے تعلیم پا کر نکلنے والا نوجوان یقین و ایمان کی روح سے خالی' شکوک وارتیاب کا پیکر' ملی خصوصیات سے یکسر بے بہرہ اور غیرت و حمیت کے جذبات سے لاتعلق ہو۔ اسے وحیِ الٰہی میں قدم قدم پر شک ہو' لیکن آسمان مغرب سے اترنے والی ہر بات اس کیلئے زادِ آخرت سے کم نہ ہو اور اس تعلیم کو افرادِ قوم کو بدلنے کیلئے ایسے موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا جس سے قومی خودی یکسر پامال ہو کر رہ گئی۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر

Marfat.com

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

نتیجتہً ایک ایسی قوم جس کے پاس وحی الٰہی پر مبنی ایک نظام زندگی تھا' جس کی اپنی ایک تہذیب تھی' اپنا تمدن تھا' جس کے اپنے اجتماعی ادارے تھے' جس کے پاس دنیا کی سب سے زیادہ پاکیزہ شخصیتیں آئیڈیل کے طور پر موجود تھیں' جس کی راہیں علم کے نور سے روشن اور عمل کی قوت سے توانا تھیں' وہ غلامی کے ہمہ پہلو اثرات سے اس حد تک متاثر ہوئی کہ نہ صرف یہ کہ نصف صدی کے بعد بھی اس کے تعلیم یافتہ اصحاب و دانشوروں کو اپنے راستے کے تعین میں مشکل پیش آ رہی ہے' بلکہ وہ اپنی منزل تک کو بھول گئے ہیں۔ انہیں معلوم ہی نہیں کہ ہماری اصل حقیقت کیا ہے اور ہمیں کہاں جانا ہے۔ اسی لئے اقبال نے شیخ حرم کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس امت کے نوجوان کے اصل مرض کو سمجھا جائے اور پھر اس کے علاج کی فکر کی جائے۔ کیونکہ غلامی نے اس کو بری طرح کھیل کھیل کر رکھ دیا ہے۔ اس نے کہا تھا

اے شیخ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے سبق انہیں خود شکنی' خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

چنانچہ یہی وہ اصل مرض ہے اور جو قوم بھی اس مرض میں مبتلا ہوتی ہے' اس کے اصلاح پذیر ہونے کے امکانات اگر یکسر ختم نہیں ہوتے تو دھندلا ضرور جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل اس ابتلا میں مبتلا ہوئے اور اپنے انجام کو پہنچے اور آج ہم اسی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ سیاسی غلامی سے آزادی کے باوجود بھی ہم تا حال تعلیمی' تہذیبی' قانونی اور تمدنی غلامی کا بری طرح شکار ہیں اور اسی وجہ سے اپنی منزل کی طرف بڑھنا اور سمت سفر کا تعین کرنا ہمارے لئے روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ بنی اسرائیل کا یہ انجام ہمیں توجہ دلا رہا ہے کہ قدرت بہت دیر تک مہلت نہیں دیا کرتی۔ اگر آبرومندانہ زندگی عزیز ہے تو اپنی اصلاح کی کوشش کرو۔

دوسری چیز جو ہمیں اس واقعہ میں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے' وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو یہ سزا دی گئی کہ تم چالیس سال تک اسی وادیٔ سینا اور صحرائے تیہ میں سرگرداں رہو گے' تاوقتیکہ تم میں بیس سال سے بڑی عمر کے لوگ موت کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس میں حیرت کی بات یہ ہے کہ چالیس سال میں لوگ پیدل بھی دنیا بھر کا سفر کر لیتے ہیں' لیکن بنی اسرائیل فی الواقع اڑتیس سال تک اسی صحرا میں بھٹکتے رہے۔ اسی دوران پہلے حضرت ہارون علیہ السلام اور اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انتقال فرمایا اور یہ اس وقت تک صرف وادی اردن تک پہنچ سکے۔ چالیس سال پورے ہونے کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں ان کو اللہ نے فلسطین فتح کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ نہایت عبرت کا مقام ہے کہ ایک قوم جو ہوش و حواس رکھتی

Marfat.com

ہے' اللہ کے نبی کی قیادت اسے میسر ہے' لیکن وہ ایک محدود سے صحرا میں سال ہا سال تک سرگردانی کی سزا میں مبتلا رہتی ہے۔ اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب بھی کوئی اللہ پر ایمان لانے والی اور اس کے ساتھ عہد و پیمان میں جکڑی ہوئی قوم' اس سے انحراف کا راستہ اختیار کرتی ہے اور بجائے اس کے کہ وہ راست بازی کے ساتھ راہ کی مشقتوں کو سامانِ سفر سمجھ کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے' وہ نہ صرف پسپائی کا سفر اختیار کر لیتی ہے بلکہ بغاوت پر اتر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت اس سے عقل و خرد کا جوہر چھین لیتی ہے' اسے قوت فیصلہ سے محروم کر دیا جاتا ہے' انہیں راستہ دکھانے والے لوگ راستہ دکھاتے ہیں' لیکن وہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی دیکھنے سے محروم رہتے ہیں۔ آج ہم شاید اللہ نہ کرے اسی عذاب کا شکار ہیں۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ ہم نے یہ ملک کیوں بنایا تھا۔ ہماری منزل کیا تھی۔ اللہ سے ہم نے کیا وعدے کیے تھے اور ہمارے مقاصد کیا تھے۔ لیکن اس امت کی ایک بہت بڑی تعداد نے بالکل اس کی الٹی سمت سفر شروع کر رکھا ہے اور ہمارے ارباب اقتدار اس طبقے کی نہ صرف حوصلہ افزائی کر رہے ہیں' بلکہ انہیں باقاعدہ سپورٹ کیا جا رہا ہے اور جو انہیں ان کے عہد و پیمان کی یاد دلانا چاہتا ہے' اس کیلئے زنجیریں تیار کی جا رہی ہیں اور ملک کے سفر کا حال یہ ہے کہ جہاں ہم ترپن (53) سال پہلے کھڑے تھے یا تو وہیں کھڑے ہیں اور یا شاید اس سے بھی پیچھے جا چکے ہیں۔ منیر نیازی نے ٹھیک کہا تھا:

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

تیسری چیز جس کی طرف قرآنی آیات ہمیں توجہ دلا رہی ہیں' وہ یہ ہے کہ اولوالعزمیوں کا سفر اور وفا شعاریوں کے معرکے اور اجتماعی زندگی کی ذمہ داریوں کی ادائیگی' یہ غلامی میں پلے ہوئے لوگوں کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی قوم آپ اپنی دشمن نہیں ہوتی تو اسے نوجوان نسل کو وفا شعاری اور جفاکشی کے ماحول میں تربیت دے کر ان مقاصد کے حصول میں شب و روز کھپا دینا چاہیے' جو اس قوم کے مقاصد کا درجہ رکھتے ہیں اور جس سے اس قوم کی اجتماعی زندگی عبارت ہوتی ہے۔ کیونکہ ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا اور اجتماعی مخالفتوں کا سامنا کرنا اور عہد رفتہ کی عظمتوں کو واپس لانا اور جہاد اور سرفروشی کو زندگی کا معمول بنانا' یہ غلامی کے مارے ہوئے لوگوں کا کام نہیں ہے۔ اس کے لئے تو ایسے نوجوان چاہئیں جنہیں فاقہ کشی اور سرفروشی کا خطرہ کبھی منزل سے ہٹا نہ سکے بلکہ اپنے مقصد کی لگن ان کے دلوں میں ایسی فروزاں رہے کہ وہ کسی بھی خطرے سے کھیلنے کیلئے ہر وقت تیار رہیں۔ اور

جو راہ کی سختی کو سامان سفر سمجھیں

بنی اسرائیل کو اس لئے صحرا میں چالیس سال تک سرگرداں رکھا گیا تاکہ نوجوانوں کا ایک ایسا قافلہ تیار کیا جائے جو صحرا میں پل کر جوان ہوا اور پہاڑوں کی بلندیاں اس کے عزم کو ہمیشہ توانائی عطا کرتی رہیں کیونکہ

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا

اور (اے محمدؐ) اُن کو آدم کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) کے حالات (جو بالکل

Marfat.com

قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ
پیچے رہیں) پڑھ کر سنادو کہ جب ان دونوں نے (خدا کی جناب میں) کچھ نیازیں چڑھائیں تو ایک کی نیاز تو قبول ہوئی
لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ لَئِنْۢ
اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی (تب قابیل ہابیل سے) کہنے لگا کہ میں تجھے قتل کردوں گا اُس نے کہا کہ خدا پرہیزگاروں ہی کی (نیاز)
بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ
قبول فرمایا کرتا ہے ف۲ اور اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے مجھ پر ہاتھ چلائے گا تو میں تجھ کو قتل کرنے کے لیے تجھ پر ہاتھ نہیں
لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ
چلاؤں گا مجھے تو خدائے رب العالمین سے ڈر لگتا ہے ف۳۔ میں چاہتا ہوں کہ تو میرے
تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ
گناہ میں بھی ماخوذ ہو اور اپنے گناہ میں بھی پھر (زمرۂ) اہل دوزخ میں ہو اور ظالموں
جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ ۚ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ
کی یہی سزا ہے ف۴۔ مگر اُس کے نفس نے اُس کو بھائی کے قتل ہی کی ترغیب دی تو اُس نے
فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي
اُسے قتل کردیا اور خسارہ اُٹھانے والوں میں ہوگیا۔ اب خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین کریدنے لگا
الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى
تاکہ اُسے دکھائے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کیونکر چھپائے۔ کہنے لگا اے ہے مجھ
اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ
سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس کوّے کے برابر ہوتا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا
اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ ۚۛ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ ۚ كَتَبْنَا
دیتا پھر وہ پشیمان ہوا ف۱۔ اس (قتل) کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل

Marfat.com

عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ

پر یہ حکم نازل کیا کہ جو شخص کسی کو (ناحق) قتل کرے گا (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے

فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا

یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے اُس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا۔ اور جو اُس کی زندگانی کا مُوجب

فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ

ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگانی کا مُوجب ہوا۔ اور ان لوگوں کے پاس ہمارے پیغمبر روشن دلیلیں لا چکے ہیں پھر

اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا

اس کے بعد بھی ان میں بہت سے لوگ ملک میں حدِ اعتدال سے نکل جاتے ہیں ۳۲۔ جو لوگ خدا

الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا

اور اُس کے رسُول سے لڑائی کریں اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں اُن کی یہی سزا ہے کہ قتل کر

اَنْ يُّقَتَّلُوْۤا اَوْ يُصَلَّبُوْۤا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ

دیئے جائیں یا سُولی چڑھا دیئے جائیں یا اُن کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیئے

اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى

جائیں یا ملک سے نکال دیئے جائیں۔ یہ تو دُنیا میں اُن کی رُسوائی ہے اور آخرت میں اُن کے

الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا

لیے بڑا (بھاری) عذاب (تیار) ہے ۳۳۔ ہاں جن لوگوں نے اس سے پیشتر کہ تمہارے قابو آجائیں توبہ

عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا

کرلی تو جان رکھو کہ خدا بخشنے والا مہربان ہے ۳۴۔ اے ایمان والو! خدا سے

اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِىْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ

ڈرتے رہو اور اس کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ تلاش کرتے رہو اور اس کے رستے میں جہاد کرو

Marfat.com

تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا

تاکہ رستگاری پاؤ ۔ جو لوگ کافر ہیں اگر اُن کے پاس رُوئے زمین کے تمام خزانے اور اس کا سب مال و متاع

وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِیَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ

ہو اور اس کے ساتھ اسی قدر اور بھی ہو تاکہ قیامت کے روز عذاب سے رستگاری حاصل کرنے کا بدلہ دیں تو اُن

وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۳۶﴾ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَ مَا

سے قبول نہیں کیا جائے گا اور اُن کو درد دینے والا عذاب ہوگا ۔ (ہر چند) چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں مگر اس

هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنْهَا٘ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ﴿۳۷﴾

سے نہیں نکل سکیں گے ۔ اور اُن کے لیے ہمیشہ کا عذاب ہے ۔

تمہید

اس سے پیشتر کے رکوع میں بنی اسرائیل کے بارے میں ہمیں یہ بتایا گیا کہ اللہ نے ان پر بے شمار انعامات فرمائے' تورات ان پر نازل کی گئی' موسیٰ علیہ السلام جیسا جلیل القدر نبی ان کی طرف مبعوث ہوا۔ لیکن اس کے باوجود جب انہیں فلسطین کو فتح کرنے کا حکم دیا گیا تو صرف اس لئے انہوں نے اس حکم پر عمل کرنے سے انکار کر دیا کہ فلسطین میں ایک طاقتور قوم آباد ہے۔ ہم اپنے اندر اس کے مقابلے کی ہمت نہیں پاتے۔ جس کے نتیجے میں انہیں یہ سزا دی گئی کہ بیس سال کی عمر سے اوپر کے تمام لوگ اسی صحرائے تیہ میں سرگرداں رہیں گے اور یہیں ان کو موت آئے گی۔ فلسطین کو فتح کرنے کی توفیق ان کی اولاد کو ہوگی' لیکن یہ اس سے محروم رہیں گے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ تمام بنی اسرائیل کے لوگ فرعون کی غلامی میں وہ تمام خصائص کھو چکے تھے' جن کے نتیجے میں قومی خودداری' خوداعتمادی اور سرفروشی جیسے خصائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے پروردگار نے یہ حکم دیا کہ یہ ہر طرح کی آزادی کی خصوصیات سے بے بہرہ لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر کسی آزاد ملک کی ذمہ داری ڈالی جائے۔ کیونکہ آزادی کی ذمہ داریوں کا بوجھ یا معرکہ کارزار میں سرخرو ہونے کی سعادت صرف ان کو نصیب ہوتی ہے جو آزاد فضا میں جیتے ہیں اور صحرائی زندگی میں تربیت پاتے ہیں۔

امت مسلمہ کو یہ سبق دیا گیا کہ تم اپنی شہری زندگی میں دیکھنا کبھی جفاکوشی' سرفروشی اور جاں سپاری کی صفات کو اپنے اندر سے جانے نہ دینا' ورنہ تمہارا انجام بھی بنی اسرائیل سے مختلف نہ ہوگا۔ جس رکوع کو اب ہم پڑھنے لگے ہیں اس میں پروردگار نے حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا قصہ بیان کیا ہے' جس میں ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا تھا۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جس طرح اجتماعی زندگی میں سرفروشی اور ایثار و قربانی بنیادی صفات ہیں' جس کے بغیر کوئی قوم اپنا تشخص باقی نہیں رکھ سکتی' اسی طرح انفرادی زندگی کے باہمی معاملات میں ہمواری' حسد' بغض سے دوری' اخلاص اور بےنفسی اس کی بقا کی ضامن ہیں۔ بنی اسرائیل اگر اجتماعی خصائص کھو دینے کی وجہ سے اللہ کے عذاب کے مستحق ٹھہرے تو قابیل انفرادی صفات سے محروم ہو کر شخصی نامرادی کی علامت بن گیا۔ اس لئے امت مسلمہ کو جہاں بنی اسرائیل کے انجام سے سبق سیکھنا ہے وہیں انہیں یہ بات بھی ذہن نشین کرنی ہے کہ کوئی اجتماعی زندگی' انفرادی زندگی کی اصلاح کے بغیر استوار نہیں ہوتی۔ اجتماعی زندگی ایک کشتی کی مانند ہے اور انفرادی زندگی کشتی کے تختوں کی طرح۔ اگر کشتی کے تختے دیمک زدہ ہیں تو کشتی کبھی مضبوط اور پائیدار نہیں ہو سکتی۔

دوسری بات جو آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے قصے میں بہت نمایاں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ دونوں حقیقی بھائی کا رشتہ رکھتے تھے۔ لیکن

Marfat.com

جب ایک نے اپنی کمزوریوں کے علاج کی بجائے اپنے بھائی کی خوبیوں سے حسد کرنا شروع کیا اور اپنی محرومیوں کا سبب اپنے بھائی کی نیکیوں کو سمجھا تو نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے ایک ایسا فعل سرزد ہوا جس سے اس کی دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہوگئیں۔ اس قصے کے ذریعے بنی اسرائیل کو بتایا جارہا ہے کہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ دونوں میں ہم نسل ہونے کا رشتہ ہے لیکن بنی اسرائیل صرف اس لئے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کیلئے تیار نہیں کہ وہ بجائے بنی اسرائیل کے بنی اسماعیل میں کیوں پیدا ہوگئے۔ نبوت تو ہمارے گھر میں آنا تھی' یہ بنی اسماعیل میں کیسے چلی گئی۔ ان کو بھی اسی طرح حسد کا دورہ پڑا جیسے قابیل کو پڑا تھا۔ وہ یہ بات بھول گئے کہ نبوت سراسر اللہ کا عطا کردہ ایک اختصاص ہے جس میں کسی کی ذاتی پسند و ناپسند کا کوئی دخل نہیں۔ پہلے اگر اس نے بنی اسرائیل سے پیغمبر اٹھائے تو اب یہ سعادت اگر اس نے بنی اسماعیل کے گھر میں منتقل کردی ہے تو دین داری کا تقاضہ تو یہ ہے کہ بنی اسرائیل اسے آگے بڑھ کر اور اپنی متاع جان کر اس کی پیروی کریں نہ کہ حسد کی آگ میں جل کر اپنی قسمت کو آگ لگا دیں۔ چنانچہ یہ بات سمجھانے کیلئے اس واقعہ کو بیان کیا جارہا ہے۔

آیت: ۲۷ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَىْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ مـ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ط قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ط قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ O ''اور ان کو آدم کے دو بیٹوں کی سرگزشت اس کی حکمت کے ساتھ سناؤ' جب کہ ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قربانی قبول نہیں ہوئی۔ وہ بولا کہ میں تجھے قتل کر کے رہوں گا۔ اس نے جواب دیا اللہ تو صرف اپنے متقی بندوں کی قربانی قبول کرتا ہے''۔

قصہ ہابیل اور قابیل کی بنیاد ''حسد''

اس آیت کریمہ میں سرگزشت کیلئے نَبَاَ کا لفظ استعمال ہوا ہے نَبَاَ کسی عام خبر پر نہیں' بلکہ بہت ہی اہم خبر پر بولا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ قیامت کیلئے النَّبَاُ الْعَظِيْم کا لفظ بولا ہے۔ اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے صرف دو لڑکوں کا قصہ بیان کیا ہے اور اس کو نَبَاَ یعنی بہت اہم خبر قرار دینا' بظاہر یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو یہ بات عجیب نہیں لگتی بلکہ ایک بہت اہم حقیقت کی طرف نشاندہی کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسانی رویئے یا انسانی معاملات کی ساری خرابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آدمی اپنی کمزوری کو سمجھنے کی بجائے اس کا ذمہ دار دوسرے کی نیک نامی کو ٹھہرائے اور بجائے اپنی اصلاح کرنے کے حسد کے مرض میں مبتلا ہو جائے۔ اگر یہ کیفیت کسی بھی آدمی میں پیدا ہوتی ہے تو کبھی بھی اس کی اصلاح کی امید نہیں کی جاسکتی یہ ایک ایسا بخار ہے کہ جب کسی بھی انسان یا کسی بھی قوم کے دماغ کو چڑھتا ہے تو عدل اور احسان کا خون کئے بغیر نہیں اترتا اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ اس حسد کے نتیجے میں دوسرا شخص ظلم کا شکار ہوتا ہے' لیکن حسد کے مریض کو اس سے کوئی آسودگی نہیں ملتی' بلکہ وہ خود اپنی آگ میں جلتا رہتا ہے۔

مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اگرچہ ان دو لڑکوں میں سے ایک لڑکے میں اس مرض کی نشاندہی کی گئی ہے' مگر فی الحقیقت تمام افراد انسانی یا تمام اقوام عالم اسی مرض کا شکار ہیں۔ دنیا میں ہمیشہ انسانوں کے دو ہی گروہ رہے ہیں۔ ایک وہ گروہ جس کی زندگی نیکی اور بھلائی سے عبارت ہے اور وہ دوسرے کی برائی کو بھی حتی الامکان نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دوسرے کے ظلم کو بھی اس وقت تک برداشت کرتا ہے' جب تک وہ دوسرے مظالم کا پیش خیمہ نہیں بن جاتا۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو ہمیشہ دوسروں کی خوبیوں سے جلتا اور اپنی اصلاح کی بجائے دوسروں کی خوبیوں کو محرومیوں کا سبب سمجھتا ہے یہی دو گروہ ہمیشہ خیر و شر کی علامت رہے ہیں۔ چونکہ ان دونوں کا آغاز ہابیل اور قابیل کے رویئے سے ہوا ہے'

Marfat.com

قرآنِ کریم نے اسے ایک بہت اہم واقعہ قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو انسانی رویئے اتنے ہی قدیم ہیں، جتنی کہ خود انسان کی تاریخ۔

تاریخ پر مورخین کے ظلم

دوسرا لفظ جو اس آیت کریمہ میں بہت توجہ طلب ہے وہ بِالْحَقِّ ہے ارشاد ہوا ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ﴿انہیں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ حق کے ساتھ پڑھ کے سنائیے۔﴾

یہاں حق کا لفظ دو باتوں کی طرف رہنمائی کر رہا ہے ایک یہ کہ آپ اس اہم واقعہ کو بالکل ویسے ہی بیان کیجئے جیسا وہ واقعہ میں ہے۔ اس میں اپنی طرف سے کوئی پیوندکاری ہرگز نہ کیجئے کیونکہ کوئی بھی تاریخی سرگزشت اپنا صحیح اثر اس وقت پیدا کرتی ہے جب اسے اسی طرح بیان کیا جائے جس طرح حقیقت میں وہ واقع ہوئی ہے اور اگر اپنی طرف سے اس کی اثر اندازی کو نمایاں کرنے کیلئے کوئی بھی اضافہ کیا جائے گا تو عین ممکن ہے کہ سرگزشت کسی اور بات کی غمازی کر رہی ہو اور یہ اضافہ اسے کسی اور طرف لے جائے۔ ایسی صورت میں اس سرگزشت کو سنانے کا فائدہ کیا ہوگا۔ اب مشکل یہ ہے کہ ہم نے ہمیشہ اسی انداز سے تاریخ پر مہربانیاں کی ہیں۔ تاریخ کا کوئی کردار اگر اپنا ممدوح ہے تو اس کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے اس میں ایسے ایسے اضافے کئے کہ حقیقت سے اس کا تعلق ختم ہو گیا اور اگر وہ مورخ کی نگاہ میں ناپسندیدہ کردار ہے تو اس کی تصویر بگاڑنے میں مورخ نے پورا زورِ قلم صرف کر دیا۔ نتیجتاً تاریخ ہر مورخ کے ذاتی تأثرات کا اظہار بن کر رہ گئی ہے۔ اس لئے بالحق کے لفظ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ دنیا بھر میں تاریخ پر یہ ظلم ہوتا رہا، حتیٰ کہ آسمانی کتابیں بھی اس سے محفوظ نہ رہیں۔ اس لئے اس واقعہ کو اسی طرح بیان کیجئے جیسا وہ حقیقت میں ہے۔ اور دوسری بات جو اس سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ کا مقصد محض قصہ گوئی اور اس کے نتیجے میں تفریحِ طبع نہیں ہے بلکہ مقصود اس سے نصیحت یا عبرت حاصل کرنا ہے۔ اسلئے صرف ایک واقعہ کو سادہ انداز میں بیان کر دینا اور اس کے عبرت خیز اور نصیحت آموز پہلوؤں کو نمایاں نہ کرنا یہ تاریخ کی کوئی خدمت نہیں۔ فرمایا کہ اس واقعہ کو اس طرح بیان کرو کہ جس میں حق یعنی نصیحت اور عبرت اپنی ذات میں نمایاں ہو جائیں۔ چنانچہ قرآن پاک کے بیان کردہ اس قصے کو جب ہم دیکھتے ہیں اور پھر اس کا مقابلہ تورات کے بیان کردہ قصے سے کرتے ہیں تو یہ حقیقت مزید واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اگرچہ اس واقعہ کو اپنے اسلوب کے مطابق نہایت اختصار سے بیان کیا ہے، لیکن اس سے سرگزشت کے وہ پہلو جو سرگزشت کی جان ہیں انہیں نمایاں کر کے نصیحت و عبرت کا سامان کر دیا گیا ہے۔

تاریخی روایات میں قصہٴ ہابیل و قابیل

پہلی آسمانی کتابوں اور تاریخی روایات کو دیکھتے ہوئے جو پورا قصہ سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو اولاد عطا کی جس میں بیٹیاں بھی تھیں اور بیٹے بھی۔ ظاہر ہے کہ سب ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کی وجہ سے آپس میں بہن بھائی تھے اور بہن بھائی کا چونکہ آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا اس لئے سوال پیدا ہوا کہ ان کا آپس میں نکاح کیسے کیا جائے اور اگر نکاح نہ کیا جائے تو نسل انسانی کی بقا کا کیا انتظام ہوگا۔ چنانچہ پروردگار نے حکم دیا کہ ایک دفعہ جو بیٹا اور بیٹی پیدا ہو وہ آپس میں بہن بھائی ہوں گے اور جب دوسری دفعہ بیٹا اور بیٹی پیدا ہوں وہ آپس میں تو بہن بھائی ہوں گے لیکن پہلے پیدا ہونے والوں کیلئے اجنبی اور نامحرم ہوں گے۔ اس لئے ان دونوں میں نکاح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ پیش آیا کہ اللہ نے ہابیل اور قابیل کی شکل میں دو بیٹے عطا فرمائے۔ ہابیل کے ساتھ جوڑکی پیدا ہوئی وہ بدصورت تھی اور جوڑکی قابیل کے ساتھ پیدا ہوئی وہ خوبصورت تھی۔ جب دونوں کے نکاح کا وقت آیا تو قاعدے کے مطابق قابیل کی شادی ہابیل کی بہن کے ساتھ اور ہابیل کی شادی قابیل کی بہن سے ساتھ قرار پائی۔ ہابیل کی

Marfat.com

بہن چونکہ خوبصورت نہیں تھی اس لئے قابیل نے اس سے نکاح کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میری بہن چونکہ خوبصورت ہے اس لئے میں خود اس سے نکاح کروں گا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ہر چند سمجھایا کہ نادان نہ بنو تمہارا نکاح اپنی بہن سے نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب اس نے کسی طرح بھی ماننے سے انکار کر دیا تو حضرت آدم علیہ السلام نے اتمام حجت کیلئے دونوں کو قربانیاں کرنے کا حکم دیا۔ دونوں نے اپنی اپنی قربانیاں ان کی اپنی شریعت کے مطابق ایک ٹیلے کی چوٹی پر جا کر رکھ دیں۔ آسمان سے ایک آگ آئی اور اس نے ہابیل کی قربانی کو جلا دیا گویا اس کو قبول کر لیا گیا کیونکہ یہی قبولیت کی علامت تھی اور قابیل کی قربانی کو آگ نے نہیں جلایا' گویا اسے قبول نہیں کیا گیا۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انبیاء کے یہاں جو قربانی قبول کی جاتی تھی اس کی علامت یہی تھی کہ آسمان سے ایک آگ آ کر اسے جلا دیتی تھی۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے آنحضرت ﷺ پر جو اعتراضات کئے ان میں ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اگر آپ اللہ کے سچے نبی ہیں تو پھر آپ کی قربانی کو آگ کیوں نہیں جلاتی اور ہم تو آپؐ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم خود یہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔

اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُهُ النَّارُ ط

﴿ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں' یہاں تک کہ وہ ہمارے پاس قربانی لائے جسے آگ کھالے ﴾ (آل عمران 3:۱۸۳)

لیکن یہ سلسلہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ختم کر دیا گیا اور قربانی کا گوشت کھانے کی اجازت دے دی گئی۔ مختصر یہ کہ جب قابیل کی قربانی قبول نہیں کی گئی تو اسے حسد کا بخار چڑھا اور اس نے اپنے بھائی کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کہا: لَاَقْتُلَنَّكَ ''میں تجھے ضرور قتل کروں گا''۔ جواب میں ہابیل نے کہا:

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿ اللہ تو قربانی صرف متقین سے قبول کرتا ہے ﴾

یعنی تمہیں میرے قتل کے درپے ہونے کی بجائے قربانی کی عدم قبولیت کی اصل وجہ سمجھنی چاہیے' وہ میری ذات نہیں بلکہ تمہارے اندر اخلاص کا نہ ہونا ہے۔ اب اگر تم مجھے قتل بھی کر دو گے تو اس سے تمہاری قربانی قبول تو نہیں ہو جائے گی بلکہ یہ تو اس سے بھی بڑا جرم ہوگا اس لئے تمہیں اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے اور اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اندازہ فرمایئے کہ یہ کتنے واضح دو رویئے ہیں۔ ایک رویہ پوری طرح نفسانیت کا آئینہ دار ہے اور وہ خواہش نفس میں ڈوب کر دوسرے کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ دوسرا رویہ سراسر اللہ سے ڈرنے اور اس کی رضا کیلئے اس کا تقویٰ پیدا کرنے کی فکر کا غماز ہے۔ یہی دونوں رویئے شر اور خیر کی علامت ہیں۔ اس سے ایک اور بات کی طرف راہنمائی ہوتی ہے وہ یہ کہ آج کا مؤرخ اور دانشور یہ کہتا ہے کہ آج کا انسان جو توحید کا پرستار اور خیر کا علمبردار ہے' یہ اپنی اس منزل تک نجانے کتنے ہزاروں سال کے سفر کے بعد پہنچا ہے۔ شروع شروع میں انسان نجانے کس کس کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا تھا' نجانے کس کس مظہر قدرت کے سامنے جھکتا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ توحید تک آیا۔ لیکن اس واقعہ سے ہمیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ انسانی کے پہلے دو افراد ہیں جو خیر اور شر کی پوری طرح نمائندگی کر رہے ہیں۔ جو بات ہابیل نے قابیل سے کہی کہ کوئی نیک عمل بھی اخلاص کے بغیر قبول نہیں ہوتا۔ وہی سب سے آخر میں آنے والی کتاب قرآن کریم نے ہمیں بتائی کہ تم جو قربانیاں دیتے ہو ان کا گوشت اور پوست اللہ کو نہیں پہنچتا:

وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْكُمْ ﴿ بلکہ تمہارا تقویٰ اللہ تک پہنچتا ہے ﴾ (الحج: 37).

یعنی وہی ہابیل کی بات قرآن کریم اس امت کو سمجھا رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو جب دنیا میں بھیجا گیا تھا تو اللہ اور اس

Marfat.com

صفات اور انسان کا اپنے اللہ سے تعلق اور عبودیت اور الوہیت کے مابین رشتے کی پوری تفہیم کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔

آیت:۲۸-۲۹ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ۝ ''اگر تم مجھے قتل کرنے کیلئے مجھ پر دست درازی کرو گے تو میں تم کو قتل کرنے کیلئے تم پر دست درازی کرنے والا نہیں۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں''۔ ''میں چاہتا ہوں کہ میرا گناہ اور اپنا گناہ دونوں تم ہی لے کر لوٹو اور جہنم والوں میں سے بنو۔ یہی سزا ہے ظالموں کی''۔

اگر تم میرے بھائی ہو کر بھی صرف اتنی بات پر کہ تمہاری قربانی قبول نہیں ہوئی اور میری قربانی قبول کر لی گئی اور تم میرے قتل کے درپے ہو گئے ہو تو دیکھو اگر تم مجھ پر دست درازی کرو گے' تاکہ تم مجھے قتل کر دو تو میں تمہیں قتل کرنے کیلئے تم پر دست درازی نہیں کروں گا۔ یعنی میں اس رشتے کو کبھی نہیں بھول سکتا جو میرے اور تیرے درمیان ہے۔ ایک تو یہ کہ تم میرے بھائی ہو' دوسرا یہ کہ میرے اور تمہارے درمیان ایک دین کا رشتہ ہے اور تیسری بات یہ کہ بغیر کسی وجہ کے کوئی انسان کسی انسان کو قتل نہیں کر سکتا۔ تم اگر بغیر کسی وجہ کے میرے قتل کا ارادہ رکھتے ہو تو میں تمہارے قتل کا ارادہ نہیں کر سکتا۔ البتہ! اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی آدمی اگر کسی دوسرے پر قتل کے ارادے سے حملہ آور ہو تو وہ اپنا دفاع بھی نہ کرے' یہ تو سراسر اپنے قتل میں معاون بننے کے مترادف ہے۔ کسی شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ یہاں جو نہایت حکمت کی بات بیان کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی کے بارے میں یہ خبر ہو کہ وہ آپ کے قتل کا ارادہ رکھتا ہے تو محض اس کے ارادہ کرنے سے آپ کیلئے اس کا قتل مباح نہیں ہو جاتا۔ آپ اس سے بچنے کی تدبیر تو کر سکتے ہیں' لیکن اس خیال سے کہ وہ آپ کو قتل نہ کر دے' آپ اسے پہلے قتل کر دیں' اس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں کچھ مسلمانوں نے چند خوارج کو باتیں کرتے ہوئے سنا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل کی قسمیں کھا رہے تھے کہ اگر ہمیں موقع ملا تو ہم انہیں قتل کر کے چھوڑیں گے۔ مسلمان انہیں پکڑ کر حضرت علیؓ کی خدمت میں لے گئے اور بتلایا کہ یہ آپ کے قتل کا ارادہ کر رہے تھے' اس لئے آپ انہیں قتل کروا دیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں کس جرم میں انہیں قتل کروا دوں؟ کیا انہوں نے واقعی مجھے قتل کر دیا ہے؟ اندازہ فرمائیے کہ اس آیت میں بھی پہلی نسل انسانی کا ایک شخص کس قدر پر حکمت باتیں کہہ رہا ہے۔

آیت:۳۰ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ ''بالآخر اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا اور وہ اس کو قتل کر کے نامرادوں میں سے ہو گیا''۔

حسد ایک شدید ترین جذبہ ہے:

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ ﴿بالآخر اسے اس کے نفس نے آمادہ کر ہی لیا﴾

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس انتہائی اقدام پر آسانی سے تیار نہیں ہو گیا' بلکہ اسے ایک بڑی کشمکش سے گزرنا پڑا کیونکہ انسانی فطرت یہ ہے کہ اللہ نے انسان میں دو طرح کے داعیات رکھے ہیں۔ ایک اس کو نیکی کی طرف بلاتا ہے اور دوسرا اس کو برائی کی دعوت دیتا ہے اور جب آدمی اس برائی کی دعوت کو قبول کرنے لگتا ہے اور کسی برے فعل کے ارتکاب کیلئے اقدام کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا خیر کا جذبہ اسے اس سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے ہم نفس لوامہ یا ضمیر کہتے ہیں۔ جسے قدرت نے ایک چوکیدار کی طرح انسان کے اندر بٹھا دیا ہے۔ اگر کبھی اس کی عقل خواہشات نفس سے مغلوب ہو کر یا مفادات کی اسیر ہو کر اسے برائی پر آمادہ کرتی ہے تو ضمیر کا کام یہ ہے کہ وہ اسے اس فعل کے ارتکاب سے روکے۔ چنانچہ ہم اپنے تجربات سے اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب ایک ملازم آدمی پہلے پہل رشوت لینے کا ارادہ کرتا ہے تو نجانے اسے کتنی دفعہ اپنے ارادے کو توڑنا پڑتا ہے۔ آخر ایک وقت آتا

Marfat.com

ہے کہ وہ اس سے باز آجاتا ہے یا اسے کر گزرتا ہے۔ پہلی دفعہ گناہ ہمیشہ ایسے ہی مراحل سے گزرتا ہے اور جب بار بار آدمی اس کا ارتکاب کرتا ہے تو پھر نفس لوامہ خاموش ہو جاتا ہے' کیونکہ انسان کو جس آزمائش میں ڈالا گیا ہے' اس میں جس طرح اس کیلئے نیکی کے مراحل آسان کئے گئے ہیں' اسی طرح برائی کے ارتکاب سے بھی اسے جبراً نہیں روکا جاتا' صرف نفس لوامہ اور ضمیر سے اسے رکنے کے اشارے ملتے ہیں اور جب وہ ان اشاروں کی پرواہ نہیں کرتا تو پھر اس کا راستہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی ہابیل نے نجانے کتنے دن اس کشمکش میں گزارے آخر وہ ایک پیغمبر کا بیٹا تھا اپنے اندر خیر کے جذبات بھی رکھتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے حسد کا جذبہ اتنا شدید ہے جو گھر کی تربیت' آغوش مادر کے اثرات' باپ کی نصیحتیں' ہر چیز کو مٹا کے رکھ دیتا ہے۔ اس سے بنی اسرائیل کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ یہی حسد کا جذبہ ہے' جس نے تمہیں ہر طرح کے خیر کے جذبات سے عاری کر دیا ہے۔ تم اپنی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کی نشانیاں دیکھتے ہوئے بجائے ان سے اثر لینے کے تمہارے حسد کے جذبے میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے تمہیں قابیل کے انجام کو دیکھتے ہوئے اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ کہیں تم بھی اس کی طرح اپنی تخریبی کارروائیوں کے نتیجے میں نامراد ہو کر نہ رہ جاؤ۔ قابیل اپنے اس جذبہ حسد پر قابو نہ پا سکا بالآخر اپنے بھائی کو قتل کر دیا اور نامرادوں میں سے ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے' دنیا میں دو ہی قافلے ہیں۔ ایک بامراد لوگوں کا قافلہ ہے' جو نیکی کی دعوت کو سمجھتا ہے' اللہ اور اسکے رسول کے احکام پر عمل کرتا ہے اور بالآخر فوز و فلاح سے بہرہ ور ہو جاتا ہے اور دوسرا ایسے نامرادوں کا قافلہ ہے کہ جب وہ اندھوں کی طرح برائی کی راہوں پر بڑھتا چلا جاتا ہے تو اللہ فرماتا ہے کہ ہم پھر ان پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں' جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتا ہے۔

قصہ ہابیل و قابیل سے کیا سبق ملتا ہے

تمام اعمال صالح کی قبولیت کی بنیاد "تقویٰ" ہے

جب ہم اس پورے واقعہ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں چند چیزیں نہایت واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ جن میں سب سے نمایاں بات تقویٰ ہے۔ ہابیل اپنے بھائی قابیل کو اس نہایت اہم حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ دیکھو! اللہ کے یہاں اعمال بھی اور دعائیں بھی صرف تقویٰ کے طفیل قبول ہوتی ہیں یہی تمام عبادات کا حاصل ہے' یہی بندگی کی روح اور یہی ہر مذہب کی جان ہے۔ تم اگر اپنے اندر تقویٰ یعنی اللہ کا خوف' نیکی کی طرف میلان' خوشنودیٔ رب کی تڑپ اور برائی کے انتہا درجے کا تنفر پیدا کر لو تو تم دیکھو گے کہ تمہاری زندگی میں کتنا بڑا انقلاب آ گیا ہے۔ یہی بات آنحضرت ﷺ نے ایک سے زیادہ مواقع پر ارشاد فرمائی اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہمیشہ اس کو حرز جان بنائے رکھتے تھے۔ ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لوگوں نے دیکھا کہ وہ آخری لمحوں میں نہایت رقت کا شکار تھے۔ کسی نے ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اللہ نے آپ کو عظیم اعمال خیر کی سعادت بخشی ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ آپ جہاد میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ اس لئے آپ کو اللہ کی رحمت سے امید رکھنی چاہئے' ایسی دل گرفتگی کی کیا وجہ ہے؟ فرمانے لگے تم نے نہیں سنا:

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿اللہ صرف متقین سے اعمال قبول کرتا ہے۔﴾

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم نے جیسے کچھ اعمال کئے ہیں' اس میں تقویٰ کہاں تک شامل تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ لوگوں کو تقویٰ کی نصیحت فرماتے اور بار بار اس پر توجہ دلاتے تھے کہ "لوگو! تقویٰ کی دعوت دینے والے تو بہت ہیں' لیکن تقویٰ پر عمل کرنے والے تھوڑے ہیں" ہم اپنی عملی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ قدم قدم پر خواہشات کا ہجوم ہوتا ہے' مفادات کی ہوس اکساتی ہے' حرام ذرائع سے دنوں میں دولت مند ہو جانے کی خواہش بار بار راہ سے ہٹاتی ہے ایسے تمام مواقع پر اگر کوئی چیز آدمی کو راہ راست پر رکھتی ہے تو وہ صرف تقویٰ یعنی اللہ کا خوف ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف

Marfat.com

اپنے بھائی کو متوجہ کر رہا ہے بلکہ انسانی اقدار کی تاریخ کے اوراق پر تقویٰ و خشیت کا اولین سبق لکھ رہا ہے۔

دوسری چیز جو ہابیل کے کردار سے بہت نمایاں ہے وہ اس کا رویہ ہے۔ جس سے تقویٰ چھن چھن کر نکل رہا ہے کہ اس نے نہ صرف اپنے بھائی کو آخر حد تک اس گناہ سے روکنے کی کوشش کی بلکہ اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دی۔ حتیٰ کہ اس راستے میں جان دے کر آنے والی نسلوں کو بتا رہا ہے کہ میں یہ رویہ اس لئے اختیار کر رہا ہوں کہ میں رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ یہی باتیں پوری انسانی زندگی کو بدلنے کی ضامن ہیں اور اللہ کے اس عظیم بندے نے تاریخ کے پہلے ورق کے طور پر نوع انسانی کو یہ ہدیہ کی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ چند سطروں میں قرآنِ کریم نے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ لیکن اس کے وہ پہلو جو نصیحت اور عبرت کیلئے ضروری تھے' اس نے ان کو ذکر کر دیا اور غیر متعلقہ باتوں کو چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس ہم تورات کو دیکھتے ہیں تو اس میں واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن کسی نصیحت اور کسی عبرت پر زور دینا تو دور کی بات ہے' سرسری طور پر بھی کسی نصیحت یا عبرت کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ تورات میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

تورات میں قصہ ہابیل وقابیل

﴿ اور آدم اپنی بیوی حوا کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور اس کے قائین پیدا ہوا۔ تب اس نے کہا مجھے خداوند سے ایک مرد ملا۔ پھر قائین کا بھائی ہابل پیدا ہوا اور ہابل بھیڑ بکریوں کا چرواہا اور قائین کسان تھا۔ چند روز کے بعد یوں ہوا کہ قائین اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل اور اس کے ہدیے کو منظور کیا۔ پر قائین کو اور اس کے ہدیے کو منظور نہ کیا۔ اس لئے قائین نہایت غضب ناک ہوا اور اس کا منہ بگڑا اور خداوند نے قائین سے کہا تو کیوں غضب ناک ہوا؟ اور تیرا منہ کیوں بگڑا ہوا ہے؟ اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہوگا؟ اور اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازے پر دبکا بیٹھا ہے اور تیرا مشتاق ہے' پر تو اس پر غالب آ اور قائین نے اپنے بھائی ہابل پر حملہ کیا اور اسے قتل کر ڈالا۔ تب خداوند نے قائین سے کہا کہ تیرا بھائی ہابل کہاں ہے؟ اس نے کہا مجھے معلوم نہیں' کیا میں اپنے بھائی کا محافظ ہوں؟ پھر اس نے کہا تو نے یہ کیا کیا؟ تیرے بھائی کا خون زمین سے مجھ کو پکارتا ہے اور اب تو زمین کی طرف سے لعنتی ہوا' جس نے اپنا منہ پسارا کہ تیرے ہاتھ سے تیرے بھائی کا خون لے۔ جب تو زمین کو جوتے گا تو اب وہ تجھے اپنی پیداوار نہ دے گی اور زمین پر تو خانہ خراب اور آوارہ ہوگا۔ ﴾ (کتاب پیدائش باب ۴' ۱-۱۲)

ہابیل کے قتل کا واقعہ چونکہ زمین پر پہلا واقعہ تھا' اس لئے قابیل نہ جان سکا کہ میں اس لاش کے ساتھ اب کیا کروں۔ اس کے ذہن میں یقیناً دو خیالات پریشانی پیدا کر رہے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ اس لاش کو میں کہیں چھپا دوں تاکہ میرے گرامی قدر والد کو اس کا علم نہ ہو سکے اور وہ مجھے اس پر سرزنش نہ کریں۔ تورات سے ہمیں اس کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے' اس لئے وہ پریشان پھرتا تھا کہ آخر اس کی لاش میں کہاں چھپاؤں۔ لیکن اسے کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی اس لئے بعض اہل تاویل نے اسرائیلی روایات کا سہارا لیتے ہوئے ایک لمبی کہانی لکھ ڈالی' جس کی حیثیت ایجادِ بندہ کے سوا کچھ نہیں۔ دوسرا تصور جو اس کو پریشان کرتا تھا' وہ یہ بات تھی کہ قتل کرنے کو تو وہ کر بیٹھا' لیکن اب وہ اسے ٹھکانے لگانا چاہتا ہے' وہ کیسے لگائے۔ اس لئے کہ ابھی تک اس کے سامنے تکفین و تدفین کے عمل کی نوبت نہیں آئی تھی۔

آیت:۳۱ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِى الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِىْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ

Marfat.com

اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْاَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ O ''پھر اللہ نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین میں کرید تا تھا تا کہ وہ اس کو دکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح چھپائے۔ وہ بولا کہ ہائے میری کمبختی! کیا میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو ڈھانپ دیتا۔ سو وہ اس پر شرمسار ہوا''۔

کوے کے اس عمل نے قابیل کے سامنے ایک طریقہ واضح کیا کہ تم اگر اس لاش کو ٹھکانے لگانا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم زمین کو کھود اس میں گڑھا بنا کر اس میں لاش کو رکھ کر اوپر مٹی ڈال دو۔ اس طرح لاش انسانی نگاہوں سے چھپ بھی جائے گی اور ٹھکانے بھی لگ جائے گی۔ اس سے ایک عجیب بات ذہن میں آتی ہے کہ پروردگار نے انسانوں کی راہنمائی کیلئے اپنے پیغمبر بھیجے اور کتابیں اتاریں تا کہ انسانوں کو انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارتے ہوئے کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ لیکن انسان کی فطرت عجیب واقع ہوئی ہے یہ اللہ کے نبیوں کی راہنمائی کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور پھر نتیجتاً کوے کی راہنمائی کو قبول کرنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ کی راہنمائی کو قبول نہیں کرتے' وہ ہر گری پڑی راہنمائی کو قبول کرنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ یہ انسان کا ایسا حیرت انگیز رویہ ہے جس کی تاویل کرنا مشکل ہے کہ وہ انکار کرنے پر آتا ہے تو اللہ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے اور جب جھکنے پہ آتا ہے تو پتھروں کے سامنے جھک جاتا ہے۔ یعنی خالق کائنات سے سرتابی اور سرکشی اور بتوں کے سامنے بندگی اور عبادت اگر واقعی یہی انسان کی کہانی ہے تو پھر پیغمبروں کی راہنمائی سے انحراف کر کے آخر انسان اپنی منزل کو کیسے پا سکتا ہے۔

اس آیت کریمہ کے آخری لفظ سے ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ انسان وقتی طور پر خواہشات نفس کا اسیر ہو کر بعض دفعہ ایسا کام کر گزرتا ہے جسے کرنے پر اسے بے حد اصرار ہوتا ہے۔ حقیقت میں وہ کام اس کی فطرت کی آواز نہیں ہوتا اور نہ عقل و شعور اسے تسلیم کرتے ہیں خواہشات کا غلبہ ایسی شدید چیز ہے کہ وہ وقتی طور پر انسان سے اپنی اطاعت کروالیتا ہے۔ جب یہ غلبہ اپنا اثر کھونے لگتا ہے یا جب آدمی وہ عمل کر گزرتا ہے تو پھر اسے اس پر ندامت ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ندامت اصلاً اس کی انسانیت کا دوسرا نام ہے اور اس کی فطرت کی پکار ہے۔ اس لئے جب بھی کسی کو اس راستے پر چلنے اور انسانوں کو راہنمائی دینے کا موقع میسر آئے تو اسے لوگوں کی معصیت میں ڈوبی ہوئی زندگی کو دیکھ کر کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے اسے کام جاری رکھنا چاہئے اور اس وقت کا انتظار کرنا چاہئے' جب یہ معصیت کا بحران اپنی عمر گزار کے ٹلے اور ندامت کا مرحلہ آئے تو یہ ٹھیک وہ وقت ہے جب بگڑے ہوئے انسانوں کو دوبارہ ان کی منزل کی طرف لایا جا سکتا ہے۔

ہابیل اور قابیل کے اس واقعہ نے اگرچہ ہمارے سامنے بہت ساری حکمتیں اور عبرتیں نمایاں کی ہیں لیکن ان میں جو بالکل ایک سامنے کی بات ہے وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے آغاز ہی سے انسان کی یہ سرشت ہمارے سامنے واضح ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر دو طرح کے جذبات رکھتا ہے اور ان حوالوں سے دو انسانی رویے وجود میں آتے ہیں۔ ایک ہے خدا ترسی اور حق و عدل پر قائم رہنے کا رویہ اور دوسرا ہے سنگدلی اور دوسروں کے خون بہانے کا رویہ۔ ہابیل اور قابیل انہی دونوں رویوں کے نمائندہ ہیں اور آج تک بھی انسان انہی دونوں رویوں کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے صحیح رویے کی حفاظت اور غلط رویے کی اصلاح کیلئے ضروری تھا کہ وحی الٰہی کی راہنمائی ظہور میں آتی جس میں صحیح رویے پر جزا اور انعام کا ذکر ہوتا اور غلط رویے پر گرفت ہوتی۔

آیت: ۳۲ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ

Marfat.com

بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ O ''اس وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ فرض کیا کہ جس کسی نے کسی کو قتل کیا' بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سب کو قتل کیا اور جس نے اس کو بچایا تو گویا اس نے سب کو بچایا اور ہمارے رسول ان کے پاس واضح احکام لے کر آئے۔لیکن اس کے باوجود ان میں بہت سے ہیں جو زیادتیاں کرتے رہے''۔

قتلِ ناحق معاشرے کے بگاڑ کی نشانی ہوتا ہے

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہابیل اور قابیل کے اس واقعہ کی وجہ سے قصاص کا یہ حکم نازل ہوا حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ بنی اسرائیل تو ہابیل اور قابیل کے واقعہ سے ہزاروں سال بعد وجود میں آئے اور تورات اس واقعہ کے ہزاروں سال بعد نازل ہوئی اور پھر یہ بھی ہے کہ قصاص کا یہ حکم صرف بنی اسرائیل ہی پر نازل نہیں ہوا بلکہ تورات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی امت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امت پر بھی یہی قانون نافذ تھا۔یعنی اس سے پہلے کوئی امت ایسی نہیں گزری جس پر یہ حکم اتارا نہ گیا ہو۔اس لئے یہاں اس حکم کے نزول کا تو کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا' خاص طور پر اس واقعہ کے حوالے سے' کیونکہ یہ حکم تو پہلے سے شریعتوں میں موجود رہا ہے۔البتہ اس واقعہ کے حوالے سے مقصود اس ذہنیت کا حوالہ دینا ہے جس ذہنیت نے ہابیل کو قتل کیا اور یہ ذہنیت انسانوں میں ہر دور میں زندہ رہی۔اس لئے جب بنی اسرائیل کو حاملِ دعوت امت کے طور پر اٹھایا گیا تو انہیں صرف یہ حکم نہیں دیا گیا بلکہ یہاں اس کا فلسفہ اور اس کی حکمت و مصلحت بیان کی گئی اور امت بنی اسرائیل کو یہ حکمت واضح کر کے بتلایا گیا ہے کہ وہ ذہنیت جو دوسروں کیلئے جان لیوا ثابت ہوتی ہے اور جس کی نگاہ میں انسانی جان' انسانی مال اور انسانی آبرو کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی' اس کی سنگینی کو محسوس کیا جانا چاہئے۔انہیں نہ صرف خود اس سے بچنا چاہئے بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ نوع انسانی کو اس سے بچائیں۔اس لئے ارشاد فرمایا: کہ کسی ایک جان کا ناحق قتل یہ اصلاً پوری نوع انسانی کا قتل ہے اور کسی ایک جان کی حفاظت پوری نوع انسانی کی حفاظت ہے اس فلسفے اور حکمت کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم غور کرتے ہیں تو جو چند باتیں ہمارے سامنے واضح ہوتی ہیں۔ان میں پہلی بات یہ کہ جب بھی کسی آبادی میں قتل نفس کا واقعہ پیش آئے تو اس آبادی کے رہنے والوں میں ایک بے چینی اور ہلچل پیدا ہو جانی چاہئے کیونکہ یہ واقعہ صرف ایک انسانی جان کا ضیاع نہیں' بلکہ یہ علامت ہے اس بات کی کہ اس بستی کے رہنے والوں میں کسی کی جان بھی محفوظ نہیں کیونکہ انسانوں میں جب ایک کا خون بہتا ہے تو یہ گویا اس بات کی خبر دیتا ہے کہ اس کے بعد کسی دوسرے کا خون بھی بہہ سکتا ہے کیونکہ یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک کے بعد دو تین چار کا وجود نہ ہو۔اس لئے اس بستی کے اربابِ بست و کشاد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ فوراً قاتل کو پکڑیں اور قانون قصاص کو بروئے کار لا کر انسانی جان کیلئے جو خطرہ پیدا ہوا ہے' اس کا سدباب کریں۔

دوسری بات جو سمجھ میں آتی ہے' وہ یہ کہ قتل نفس چونکہ نوع انسانی کے قتل کے مترادف ہے' اس لئے کسی گھر میں اگر کوئی قتل ہو جاتا ہے تو یہ ذمہ داری صرف اہل خانہ کی نہیں کہ وہ اس کا کھوج لگائیں بلکہ اس ذمہ داری میں پوری آبادی اور بستی شریک ہے۔انہیں یہ محسوس کرنا چاہئے کہ جس بھیڑیے نے ایک کی جان لی ہے وہ اس بستی میں کسی دوسرے کی جان بھی لے سکتا ہے۔اس لئے اس بھیڑیے کو اپنے انجام تک پہنچانا' پوری بستی کی ذمہ داری ہے۔

تیسری بات جو اس سے سمجھ میں آتی ہے' وہ یہ ہے کہ کسی اور کے گھر میں قتل نفس کو یہ سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ قتل میرے گھر میں نہیں ہوا' جس گھر میں ہوا ہے یہ اسی کی ذمہ داری ہے۔بلکہ اخوت اسلامی کا تقاضہ یہ ہے کہ اس گھر کے مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھا جائے اور اس میں جو مقدور بھر حمایت و مدافعت ہو سکتی ہے' اس سے دریغ نہ کیا جائے اور اگر اس میں کچھ خرچ کرنے کی نوبت بھی آ جائے تو اس میں بخل سے کام لینا' خود اپنی جان کو غیر محفوظ کرنا' بلکہ پوری نوع انسانی کو غیر محفوظ کرنا ہے۔

Marfat.com

اسی طرح چوتھی بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اگر کسی آدمی کو اس قتل کے بارے میں کوئی بھی آگاہی ہے تو اس کی گواہی دینا اس کی شرعی اور اخلاقی ذمہ داری ہے اور اگر خدانخواستہ وہ اس کے برعکس جھوٹی گواہی دیتا ہے یا قاتل کی ضمانت دیتا ہے یا قاتل کو پناہ دیتا ہے یا قاتل کی دانستہ وکالت کرتا ہے تو وہ اس جرم میں برابر کا شریک ہے اور اگر کوئی عدالت دانستہ ایسے مجرم کو بری کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نوع انسانی کے قاتل کو بری کرتی ہے اور عین ممکن ہے کہ کل کو اس قاتل کا شکار کسی جج کا بیٹا' کسی جھوٹے گواہ کا بیٹا یا کسی پناہ دینے والے کا بیٹا بنے۔

پانچویں بات جو اس سے سمجھ میں آتی ہے' وہ یہ کہ مقتول کے اعزاء واقربا کی مدد کرنا اور ان کی ڈھارس بندھانا' یہ دراصل نوع انسانی کی حمایت و مدافعت کے برابر ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے قرآن کریم نے زندگی قرار دیا ہے۔ جو معاشرہ آپ اپنا دشمن نہیں ہے' اسے یقیناً ان تمام حقائق کو حرز جان بنانا چاہئے اور اسے معاشرے میں بیداری کی ایک ایسی لہر اٹھا دینی چاہئے جس کے نتیجے میں دوسروں کے ساتھ ہونے والے جرائم کے بارے میں لاتعلقی اور بے نیازی کے رویے کو ایک جرم سمجھا جائے اور معاونت اور خیر خواہی کو اپنے باقی فرائض کی طرح ایک فرض سمجھ کر ادا کیا جائے اور اس پر صرف اللہ سے اجر کی امید رکھی جائے۔

اس آیت کے آخری حصے میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے صرف قصاص کا حکم دے کر بنی اسرائیل کو نہیں چھوڑ دیا بلکہ ہم مسلسل ان کی طرف یاددہانی کیلئے رسول بھیجتے رہے۔ تاکہ وہ کل کلاں کو یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ ہمیں اگرچہ قتل نفس کی سنگینی سے آگاہ کیا گیا تھا۔ لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ہماری نسلیں اسے بھول گئیں۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے اس عذر کو ختم کرنے کیلئے وقتاً فوقتاً اپنے رسول بھیجے وہ برابر ان کو یاد دلاتے رہے کہ دیکھنا اگر انسانی زندگی کی حفاظت مطلوب ہے اور انسان کو ایک آبرومندانہ زندگی دینا ہماری منزل ہے تو پھر کبھی بھی قتل نفس کی سنگینی کو کمزور نہ پڑنے دینا اور ہمیشہ قصاص کے حکم کو عمل جاری رکھنا۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ بنی اسرائیل نے اس ساری آگاہی کے باوجود ظلم اور اسراف سے کبھی کنارہ کشی نہ کی۔ تاریخ ان کے مظالم کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جب ان کی سلطنت کو زوال آیا اور دو مستقل حکومتیں یہود اور اسرائیل کے نام سے قائم ہو گئیں تو انہوں نے صدیوں تک ایک دوسرے کا خون بہایا' بلکہ ان کی شقاوت کی انتہا یہ ہے کہ جو اللہ کے نبی ان کی اصلاح کیلئے اٹھتے رہے' ان میں سے بیشتر کو انہوں نے قتل کر ڈالا اور شقاوت و بدبختی کی ان کی یہ عادت آج تک رکی نہیں۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت مبارکہ کے بعد ان کے تینوں قبیلے جو مدینہ میں آباد تھے ان کو جب بھی موقع ملا انہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کیا۔ غزوۂ خندق میں پورے عرب سے جو سیلِ بلا مدینے کی طرف اُمڈ کے آیا' وہ انہی اہل کتاب کا لایا ہوا تھا۔ ان میں سے ہر قبیلے نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں۔ بنو خزاعہ نے تو مسلمانوں کی تباہی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ حتیٰ کہ مختلف معاملات میں جب کبھی نبی کریم ﷺ کو ان سے کسی امر کا تصفیہ کرنے کیلئے ان کی آبادی میں جانا پڑا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کو قتل کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس لئے فرمایا جا رہا ہے:

ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ

﴿(پیغمبروں کے بار بار آنے اور سمجھانے کے باوجود) ان میں سے بیشتر اس کے بعد بھی ہمیشہ زمین میں اسراف اور زیادتیاں کرتے رہے۔﴾

اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار ہدایات کے نزول کے باوجود انسانی تاریخ ظلم وستم اور خوں ریزی کی داستان ہے' جس کے بہت بڑے نمائندے بنی اسرائیل ہیں۔ اس لئے انسانوں کو راہ راست پر رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ جہاں انہیں حکمت و مصلحت کی باتیں سمجھائی جائیں' وعظ و نصیحت سے ان کے

Marfat.com

موم کیے جائیں' وہیں ان کیلئے سخت سزائیں بھی مقرر کی جائیں تا کہ بگڑے ہوئے لوگ اپنے انجام کو پہنچیں اور باقی لوگ اس سے عبرت پکڑیں۔

آیت:۳۳ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ یَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ اَرۡجُلُہُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ ذٰلِکَ لَہُمۡ خِزۡیٌ فِی الدُّنۡیَا وَ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ۙ

''ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کرتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں' بس یہ ہے کہ عبرت ناک طور پر قتل کیے جائیں یا سولی پر لٹکائیں جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے باہر نکال دیئے جائیں۔ یہ ان کیلئے اس دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کیلئے ایک عذاب عظیم ہے''۔

حدود کسے کہتے ہیں؟

انسانی جرائم کی مختلف شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کوئی آدمی اللہ کے قانون کو توڑتا ہوا کسی دوسرے انسان کے ساتھ زیادتی کرتا ہے' چاہے وہ زیادتی اتلاف جان کی شکل میں ہو' اتلاف مال کی شکل میں ہو یا عزت وآبرو کے نقصان پہنچانے کی شکل میں۔ ان تمام جرائم میں اسلام کے عام قانون کے مطابق مجرموں کو سزا دی جاتی ہے۔ جس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان پر حد نافذ کی جائے اور دوسرا یہ ہے کہ ان پر تعزیر جاری کی جائے۔ لیکن ہمارے یہاں قانون کی مروجہ زبان میں چونکہ تمام ایسے قوانین کو تعزیرات ہی کہا جاتا ہے' جیسے تعزیرات برطانیہ یا تعزیرات پاکستان۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کی وضاحت کر دی جائے۔ بات یہ ہے کہ آدمی جب کوئی جرم کرتا ہے تو اس میں وہ اللہ کی نافرمانی بھی کرتا ہے اور کسی دوسرے انسان کا نقصان بھی کرتا ہے۔ اب اگر اس جرم میں اللہ کی معصیت اور اس کی نافرمانی کا حصہ زیادہ ہے تو اس پر جو سزا دی جاتی ہے اس کو حد کہتے ہیں' جس کی جمع حدود ہے۔ یہ حدود چار ہیں۔ حد زنا' حد سرقہ' حد قذف اور حد خمر۔

قصاص کیا ہے؟

جس جرم میں انسانی نقصان غالب ہوتا ہے اور اللہ کی نافرمانی کسی حد تک کم نمایاں ہوتی ہے' اس میں جو سزا دی جاتی ہے' اسے قصاص کہتے ہیں۔ جیسے کسی کے قتل یا کسی کو زخمی کرنے پر دی جانے والی سزا۔ مزید برآں اس میں ایک اور فرق بھی پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ قصاص میں مقتول کے وارث اور کسی زخم کی صورت میں خود زخمی' اپنے مجرم کو معاف کر سکتا ہے لیکن حدود میں جب وہ معاملہ عدالت تک پہنچ جائے تو پھر کسی کو معاف کرنے کا اختیار نہیں رہتا کیونکہ اس میں اللہ کی نافرمانی غالب ہے۔ اس لئے اس کے سوا کوئی اور معاف نہیں کر سکتا۔

تعزیرات کیا ہیں؟

وہ جرائم یا گناہ کی باتیں جنہیں اسلام نے قابل مذمت قرار دیا یا ان پر لعنت فرمائی یا ان پر جہنم کی وعید سنائی' لیکن ان پر کوئی سزا مقرر نہیں فرمائی' اس میں حکومت کو پارلیمنٹ کی معرفت یا عدالت کی معرفت خود سے سزا دینے کا اختیار حاصل ہے بشرطیکہ ان تمام رعایتوں کو پیشِ نظر رکھا جائے جس کی فقہا نے تصریح کر دی ہے۔ ایسی سزا کو تعزیر کہتے ہیں۔ عام جرائم میں جیسے پہلے ذکر کیا گیا' حدود' قصاص یا تعزیرات کے تحت سزا دی جاتی ہے لیکن جب جرم کی

Marfat.com

نوعیت یہ ہو کہ کوئی شخص یا گروہ یا جتھہ جرأت و جسارت، ڈھٹائی اور بے باکی کے ساتھ اس نظام حق و باطل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے جو اللہ اور رسول نے قائم فرمایا ہے یا کوئی شخص یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے شر و فساد سے علاقہ کے امن اور نظام کو درہم برہم کر دے لوگ اس کے ہاتھوں اپنی جان، مال، عزت اور آبرو کی طرف سے ہر وقت خطرے میں مبتلا رہیں۔ قتل، ڈکیتی، راہزنی، آتش زنی، اغوا، زنا، تخریب، ترہیب اور اس نوع کے سنگین جرائم جو حکومت کیلئے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیں، ان کو قرآن کی زبان میں محاربہ کہتے ہیں۔ پیش نظر آیت کریمہ میں عام جرائم کے حوالے سے نہیں بلکہ اس محاربہ کے حوالے سے سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف سزاؤں کا ذکر ہے اور اسلام نے عدالت کو اس بات کا اختیار دیا ہے کہ وہ حالات کی نوعیت اور بدامنی اور قانون شکنی کے موجود اور متوقع اثرات کے لحاظ سے، ان میں سے جو سزا مناسب سمجھے نافذ کرے۔ ان میں سے پہلی سزا یہ ہے۔

قتل نفس اور معاشرے میں فساد پھیلانے والوں کی سزائیں

1 اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا ''یہ لوگ بدترین طریقے سے قتل کئے جائیں'' کیونکہ یہ لفظ تقتیل سے ہے۔ قتل تو عام قتل کو کہتے ہیں اور تقتیل شر تقتیل کے معنی میں ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایسے مجرم کو عبرت آمیز اور سبق آموز طریقے پر قتل کیا جائے، جس سے دوسروں کو سبق ملے۔ اس سے صرف وہ طریقہ قتل مستثنیٰ ہے، جس سے آنحضرت ﷺ نے روکا ہے۔ وہ ہے آگ میں جلانا۔ اس کے علاوہ دوسرے سب طریقے جو بدمعاشوں کو عبرت دلانے اور دہشت زدہ کرنے کیلئے آج کی دنیا میں مروج ہیں، وہ سب استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

2- اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا یہاں بھی یہ لفظ صلب سے نہیں بلکہ تصلیب سے بنا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے مجرموں کو سزا دیتے ہوئے نہایت اذیت ناک طریقے سے سولی دی جائے۔ جس سے مجرم دہشت زدہ ہو اور دوسرے لوگ عبرت پکڑیں۔

3- اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَ اَرۡجُلُهُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ ''ان کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ دیئے جائیں''۔

4- اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ یعنی اگر حکومت مناسب سمجھے تو ان کو سزا دینے کی بجائے، جلاوطن کر دیا جائے۔ لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی دینی بصیرت سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ بعض دفعہ ایسے لوگوں کو جلاوطن کر نا دینی اور سیاسی نقطہ نگاہ سے خلاف مصلحت ہوتا ہے۔ اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ ان کو قید میں ڈال دیا جائے اور اس وقت تک قید میں رکھا جائے، جب تک ان کے اصلاح یافتہ ہونے کی امید نہ ہو جائے اور پھر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس طرح کے حالات میں سزا بھی انفرادی حیثیت سے نہیں، بلکہ گروہی حیثیت سے دی جائے۔ اگر قتل، اغوا، زنا، آتش زنی، تخریب کے واقعات پیش آئے ہوں تو یہ جستجو نہیں کی جائے گی کہ متعین طور پر ان جرائم کا ارتکاب کن ہاتھوں سے ہوا، بلکہ ان کی ذمہ داری میں باغی گروہ کا ہر فرد شریک سمجھا جائے گا اور اسی حیثیت سے ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا۔ مزید یہ ارشاد فرمایا کہ یہ سزائیں ان کیلئے دنیا میں رسوائی کا باعث ہوں گی۔ اہل دنیا کی نظر میں یہ لوگ پہلے کیسے بھی معتبر ہوں، اب قانون کی گرفت میں آنے کے بعد ان کا ظاہری اعتبار ختم ہو جائے گا۔ جب تک یہ اپنی اصلاح نہیں کر لیتے، انہیں کسی بھی عزت کے مقام پر فائز ہونے کا موقع نہیں ملے گا اور آخرت میں ان کیلئے عذاب عظیم ہے۔

آیت: ۳۴ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَیۡهِمۡ ۚ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝ ''مگر جو لوگ تمہارے قابو پانے سے پہلے ہی توبہ کر لیں تو سمجھ لو کہ اللہ مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے''۔

اگر یہ باغی لوگ اور یہ بڑے بڑے جرائم پیشہ افراد حکومت کی دسترس میں آنے سے پہلے توبہ کر کے اپنے رویے کی اصلاح کر لیں تو پھر ان

Marfat.com

خلاف ان کے سابق رویہ کی بنا پر ان کو یہ سخت سزائیں نہیں دی جائیں گی۔ بلکہ ان کے ساتھ رحم اور مروت کا معاملہ ہو گا۔ البتہ ان لوگوں نے جو دوسرے لوگوں کو نقصان پہنچایا ہے' یہ اگر خود اس کا اعتراف کر لیں یا اس کے گواہ موجود ہوں تو پھر اسلام کے عام قانون کے تحت ان کے ساتھ معاملہ ہو گا اور لوگوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی ہیں' حتی الامکان ان کی تلافی کر دی جائے گی۔

اس رکوع کی اختتامی آیت میں (جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں) حرابہ کی حد کا ذکر کیا گیا ہے۔ نئے رکوع میں تین آیات کے بعد سرقہ یعنی چوری کی حد کا ذکر آ رہا ہے۔ لیکن اس کے درمیان میں تنبیہ اور تذکیر پر مشتمل تین آیات آ رہی ہیں۔ جس میں ہمارے لئے سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا آخر وہ اسلوب کیا ہے کہ جس میں ہم یہ حیرت انگیز بات دیکھتے ہیں کہ قانونی دفعات کا ذکر کرتے ہوئے دفعتاً تنبیہ و تذکیر شروع ہو جاتی ہے۔

قرآن کا طرزِ خطاب فطری اور نفسیاتی ہے

بات یہ ہے کہ قرآن کریم اپنے اسلوب کلام میں دنیا کی واحد کتاب ہے' جس کی نقل کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی تمام کتابیں کسی نہ کسی ایک موضوع پہ لکھی جاتی ہیں۔ اس کی تمام ضمنی باتیں اور تمام تر تفصیلات اسی موضوع سے متعلق ہوتی ہیں لیکن قرآن کریم کسی ایک موضوع پر بند نہیں۔ وہ زندگی کے تمام مسائل کو زیر بحث لاتا ہے' پھر اس پر محاکمہ کرتا ہے اور اس کے بارے میں رہنمائی دیتا ہے۔ زندگی کے مسائل چونکہ متنوع ہیں اور شاخ در شاخ پھیلے ہوئے ہیں' اس لئے بظاہر اس میں ایک بے ترتیبی کا احساس ہوتا ہے اور لوگ یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ قرآن مجید ایک غیر مربوط کتاب ہے حالانکہ قرآن کریم کا بھی ایک ہی موضوع ہے اور وہ ہے حضرت انسان۔ اس لئے انسان کے حوالے سے جب بحث کی جائے گی تو اس کے احساسات اور انفعالات سے لے کر اس کی قومی اور بین الاقوامی ضرورتوں تک کو زیر بحث لایا جائے گا۔ اس لئے جیسے جیسے اس کی ضرورت کا تقاضا ہو گا' ویسے ویسے بحث طویل ہوتی جائے گی اور اس کا اسلوب بدلتا جائے گا۔ مزید یہ کہ قرآن کریم کسی انسان کی تصنیف نہیں' بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس کلام کا متکلم چونکہ انسانی فطرت اور انسانی نفسیات کا خالق ہے' اس لئے وہ اس کو بہ تمام و کمال جانتا ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ انسانی طبیعتیں کسی بھی پابندی کو آسانی سے قبول نہیں کرتیں' تاوقتیکہ ان کے دل و دماغ اس کی قبولیت کیلئے آمادہ نہ ہوں۔ اس لئے جب وہ کسی بات کا حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ تقویٰ کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ پھر اپنی ذات کا حوالہ دے کر اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ پھر اپنی نعمتوں اور احسانات کا ذکر کر کے اس پر جواب طلبی کا احساس اور اسکی جوابدہی کا یقین پیدا کرتا ہے۔ اس طرح دل میں گداز کی ایسی کیفیت پیدا ہوتی اور سوز کی ایسی روح مچلنے لگتی ہے' جس کے بعد کسی بھی حکم کو قبول کرنا انسانی طبیعت کیلئے آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی ہم اسی اسلوب کلام کو ملاحظہ کر رہے ہیں اور پھر مزید یہ بھی دیکھتے ہیں کہ انسانی معاشرے کو صحیح نہج پر استوار کرنے اور صحیح راہ پر چلانے کیلئے احکام و قوانین کی صورت میں ہدایات بھی دی جا رہی ہیں اور عمل نہ کرنے یا مخالفت کرنے کی شکل میں حدود اور سزاؤں کا ذکر بھی کیا جا رہا ہے کیونکہ کوئی بھی انسانی معاشرہ محض نصیحت یا محض قانون دینے پر زندگی کے سفر کو ہموار نہیں رکھ سکتا۔ تاوقتیکہ اسے قانون توڑنے کی صورت میں اپنی سزا اور دار و گیر کا یقین نہ ہو۔ جب کہ دوسرے تمام معاشرے قوانین کی تفہیم پر تو زور دیتے ہیں' لیکن اس کیلئے ایمانی قوت یعنی دلوں میں آمادگی پیدا نہیں کرتے۔ نتیجتاً اپنے سارے وسائل کی فراوانی کے باوجود قانون کی بالادستی اور اس پر عمل کو بروئے کار لانے میں ناکام رہتے ہیں۔

غالباً 1925ء کی بات ہے کہ امریکہ نے شراب خانہ خراب کے معاشرے پر اثرات بد کو دیکھتے ہوئے اس پر پابندی کا بل پارلیمنٹ ہاؤس سے منظور کروایا۔ پھر اس پر عمل کی ترغیبات کے لیے اپنے تمام ذرائع ابلاغ کو وقف کر دیا۔ جو کاوشیں ممکن ہو سکتی تھیں کی گئیں۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شراب نوشی کی عادت بد میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور شراب پینے والوں کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ شراب خانے سرکاری طور پر تو

Marfat.com

بند کر دیے گئے تھے' لیکن اب گھر گھر میں شراب کی بھٹیاں کھل گئیں اور شراب کشید ہونے لگی۔ بالآخر انہی برعکس اثرات کو دیکھتے ہوئے امریکہ کی پارلیمنٹ نے آٹھ سال کے بعد شراب کے اس بل کو واپس لے لیا۔ اس کے برعکس صدیوں پہلے مدینہ منورہ میں شراب کی ممانعت کا ایک تجربہ ہوا۔ قرآنِ کریم کی آیات نازل ہوئیں' جن میں حرمت شراب کا ذکر کیا گیا تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ان آیات کے کانوں تک پہنچنے کی دیر تھی کہ لبوں تک آئے ہوئے جام گر گئے اور چھلکتی ہوئی شراب کے مٹکے ٹوٹ گئے۔ لوگوں نے نہ صرف پینا پلانا چھوڑا بلکہ اس کی تجارت تک ممنوع ہو گئی۔ اس کے برتن تک توڑ ڈالے۔ ان دونوں طرح کے طرزِ عمل کو جب ہم دیکھتے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن کریم فطری اور نفسیاتی اسلوب کیوں اختیار کرتا ہے' جس میں احکام کے ساتھ ساتھ وہ طبیعتوں کے گداز کا سامان بھی کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی کیا گیا ہے۔

قربِ الٰہی کے حصول کے ذرائع

سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۳۸ میں چوری کی سزا کو بیان کرنے سے پہلے تین آیتوں میں طبیعتوں میں گداز اور آمادگی پیدا کرنے کیلئے تنبیہ اور تذکیر سے کام لیا گیا ہے۔

آیت:۳۵ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کے قرب کا وسیلہ تلاش کرو اور اسی کے راستے پر سرگرم کار رہو۔ امید ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے''۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ ﴿اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو﴾

1- تقویٰ: اس میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی۔ چنانچہ سب سے پہلے اہل ایمان کو تقویٰ کی تاکید کی گئی ہے جو ظاہر ہے کہ اسلام اور ایمان کی روح اور عملی زندگی کا حاصل ہے۔ تقویٰ اصل میں احکام کو مستعدی سے بجالانے اور اس کے نتیجے میں دل و دماغ میں احکام کی نافرمانی کی صورت میں اللہ کی ناراضگی کے گہرے تصور کو پیدا کرنے کا نام ہے اور یہی اسلام کی پیدا کردہ عملی زندگی کا حاصل بھی ہے کیونکہ جس انسان میں یہ تصور راسخ ہو جائے کہ میں اس لئے اللہ کے احکام پر عمل کرنا چاہتا ہوں تاکہ میں اس کی خوشنودی حاصل کرلوں اور اس کی ناراضگی سے بچ کر دنیوی اور اخروی عذاب سے بچ جاؤں' ایسی طبیعت پر شیطان کا حملہ' نفس کے وسوسے' حالات کا پریشر اور خواہشوں کے بہلاوے جلدی اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ یہ وہ قلعہ ہے' جس میں انسانی کردار اور حسنِ عمل کی دولت محفوظ کر دی جاتی ہے اور اس کی اٹھائی ہوئی فصیلیں سیرت و کردار کے مخالف حملوں کے بچاؤ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں لیکن یہ تقویٰ محض ایک خواہش سے آگے نہیں بڑھ سکتا یا محض زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ نہیں ہوگا' تاوقتیکہ طبیعت میں اللہ کے تقرب کے حصول کی امنگ نہ جاگ اٹھے۔

2- وسیلہ: اس لئے دوسرا حکم یہ دیا: وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ ''اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو''۔ وسیلہ' وسلٌ'' سے مشتق ہے' جس کا معنی ہوتا ہے ملنا یا جڑنا۔ یہ سین کے ساتھ بھی آتا ہے اور ص کے ساتھ بھی۔ البتہ جب سین کے ساتھ آتا ہے تو اس میں رغبت اور محبت کا معنی بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے وسیلہ وہ چیز ہے جو کسی کو کسی دوسرے سے محبت اور رغبت کے ساتھ ملا دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کو ملانے والی سب سے بڑی چیز ایمان اور اطاعت یا ایمان اور عمل صالح ہے۔ حضرت حذیفہ' حضرت قتادہ' حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم اجمعین بلکہ اکثر سلف صالحین سے یہی مفہوم منقول ہے۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا کہ اس میں محبت اور رغبت کا معنی بھی شامل ہے۔ اس سے استدلال کرتے ہوئے علماء نے لکھا کہ

Marfat.com

ایمان اور عمل صالح جو اللہ کے تقرب کا ذریعہ بنتا ہے' اس میں ضروری ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت شامل ہو اور اللہ کی محبت اور اس کے رسول کی محبت چونکہ اتباع رسول کے سوا نصیب نہیں ہوتی' اس لئے دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ اللہ کے تقرب کا سب سے بڑا ذریعہ اتباع رسول ﷺ ہے۔ اس آیت کے اس ٹکڑے میں مزید ہم یہ دیکھتے ہیں کہ "اِلَيْهِ" کو پہلے لایا گیا ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کا تقرب حاصل کرو کیونکہ کسی اور کے تقرب کی خواہش' ایمان اور اعتقادات کی جڑ کھود کے رکھ دیتی ہے۔ اس لئے قرآن پاک میں بار بار اس بات کی تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ تم جو اللہ کی ذات کو چھوڑ کر دوسروں پر اعتقاد رکھتے ہو اور یہ سمجھ کر کہ وہ تمہیں قیامت کے دن سرخرو کر دیں گے اور اللہ کے عذاب سے بچا لیں گے' ان کا تقرب ڈھونڈنا تم نے شروع کر رکھا ہے۔ یہ چیز تمہارے لئے یہاں بھی نقصان دہ ہے اور قیامت میں بھی تباہ کن ثابت ہوگی۔ چنانچہ مشرکین مکہ سے خاص طور پر کہا گیا ہے کہ جن فرشتوں کو تم اللہ کی بیٹیاں سمجھ کر پکارتے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ اللہ کی یہ بیٹیاں' تمہیں اللہ کے عذاب سے بچا لیں گی' تمہیں معلوم ہونا چاہئے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ط

﴿یہ (فرشتے) وہ (مخلوق) ہیں جو ہر وقت اللہ کو پکارتے ہیں اور اس کے تقرب کو تلاش کرتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں﴾ (بنی اسرائیل 57:17)

اس لئے ایک مومن کیلئے اصل منزل صرف اللہ کا تقرب اور اس کی تلاش ہے۔ جن قوموں نے بھی اس ذات وحدہ لاشریک کے سوا کسی اور کا تقرب تلاش کیا' انہوں نے دنیا بھی گنوائی اور عاقبت بھی تباہ کر لی۔ اس لئے فرمایا کہ اسی کا تقرب تلاش کرو۔

3- جہاد: تیسرا حکم یہ دیا: وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ کہ "اسی کے راستے پر سرگرم کار رہو"۔ مراد یہ ہے کہ اس کا راستہ پوری زندگی میں اسی کی اطاعت' اسی کی عبادت' اسی کے دین کی نشر و اشاعت' اجتماعی زندگی میں اسی کے دین کا غلبہ اور انفرادی اور اجتماعی اداروں میں اسی کی شریعت کا نفاذ' پھر اس راستے میں آنے والی مشکلات کے خلاف جدوجہد' کبھی دماغی کاوشوں سے' کبھی قلم کی جولانیوں سے' کبھی پسینہ بہا کر اور اگر کبھی ضرورت پڑے تو قوت کا استعمال کرتے ہوئے خون دے کر۔ یعنی ایک ہمہ جہت سرگرمی کا راستہ ہے' جس میں نہ کہیں ماندگی کے وقفے ہیں اور نہ شکست و ریخت کے مرحلے کیونکہ اس کے بغیر ایمان و عمل کو اس طرح بروئے کار نہیں لایا جا سکتا جس سے اللہ کے تقرب کو حاصل کیا جا سکتا ہے اور جس کے نتیجے میں تقویٰ کی دولت نصیب ہو سکتی ہے۔ لیکن جب آدمی بہ ہمہ تن اللہ ہی کے راستے پر پڑ جاتا ہے اور وہی اس کی منزل و مقصود بن جاتا ہے' پھر اللہ کی طرف سے یہ امید دلائی جاتی ہے:

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿امید ہے تم کامیاب ہو جاؤ گے﴾

یہاں کامیابی کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں' ایک یہ کہ تم دنیوی زندگی میں اسلامی زندگی کو اس کے مطلوبہ نتائج سمیت گزارنے میں کامیاب ہو جاؤ گے اور دوسرا یہ کہ اللہ کے یہاں قیامت کو تم اس کی جنت کو حاصل کرنے اور اس کی خوشنودی کا استحقاق پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور حقیقی معنوں میں جدوجہد کو اپنا شعار نہ بنا سکے تو پھر اندیشہ ہے کہ تم اس راستے کے مسافر بننے کے بجائے کفر کے راستے کے مسافر بن جاؤ گے' اللہ کی نعمتیں تمہیں ملیں گی لیکن تم شکر گزاری کی بجائے کفران نعمت کرو گے۔ اپنی عقل اور قوت تمیز کو اللہ اور اس کے دین کو سمجھنے کی بجائے اس سے مختلف راستے میں صرف کرو گے۔

ترغیب اور ترہیب کے اس عمل کو طبیعتوں کی آمادگی کیلئے پوری طرح بروئے کار لا کر اور سننے والوں کو سراپا گداز بنا کر پھر حد سرقہ یعنی چوری کی سزا کا ذکر فرمایا اب کوئی وجہ نہیں کہ آدمی اس سزا کو سنے اور اس سے پوری طرح اثر قبول کئے بغیر رہ سکے۔

Marfat.com

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ

اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت

فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ

اُن کے ہاتھ کاٹ ڈالو یہ اُن کے فعلوں کی سزا اور خدا کی طرف سے عبرت ہے۔ اور خدا

حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ

زبردست (اور) صاحب حکمت ہے۔ اور جو شخص گناہ کے بعد توبہ کرے اور نیکوکار ہوجائے تو خدا اس کو معاف کر

عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ

دے گا کچھ شک نہیں کہ خدا بخشنے والا مہربان ہے۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ

میں خدا ہی کی سلطنت ہے۔ جس کو چاہے عذاب کرے اور جسے چاہے بخش دے۔ اور خدا ہر

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ

چیز پر قادر ہے۔ اے پیغمبر جو لوگ کفر میں جلدی کرتے

يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ

ہیں (کچھ تو) اُن میں سے (ہیں) جو منہ سے کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں لیکن اُن کے

تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛۚ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ

دل مومن نہیں ہیں۔ اور (کچھ) اُن میں سے جو یہودی ہیں۔ اُن کی وجہ سے غمناک نہ ہونا۔ یہ غلط باتیں

لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ

بنانے کے لیے جاسوسی کرتے پھرتے ہیں اور ایسے لوگوں (کے بہکانے) کے لیے جاسوس بنے ہیں جو ابھی تمہارے پاس

يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا

نہیں آئے (صحیح) باتوں کو اُن کے مقامات میں ثابت ہونے (کے بعد) بدل دیتے ہیں اور (لوگوں سے) کہتے ہیں کہ اگر تم کو یہی حکم

Marfat.com

وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ اُولٰۗىِٕكَ

ملے تو اُسے قبول کر لینا اور اگر یہ نہ ملے تو اس سے احتراز کرنا۔ اور اگر کسی کو خدا گمراہ کرنا چاہے تو اُس کے لیے تم کچھ بھی خدا سے

الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ۭ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ښ

(ہدایت کا) اختیار نہیں رکھتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے پاک کرنا نہیں چاہا۔ ان کے لیے دُنیا میں بھی

وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ

ذلت ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے ف۱۔ (یہ) جھوٹی باتیں بنانے کے لیے جاسوسی کرنے والے

لِلسُّحْتِ ۭ فَاِنْ جَاۗءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ

اور (رشوت کا) حرام مال کھانے والے ہیں۔ اگر یہ تمہارے پاس (کوئی مقدمہ فیصل کرانے کو) آئیں تو تم اُن میں فیصلہ

تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَـيْـــًٔا ۭ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ

کر دینا یا اعراض کرنا۔ اور اگر اُن سے اعراض کرو گے تو وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اور اگر فیصلہ کرنا چاہو تو

بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَكَيْفَ

انصاف کا فیصلہ کرنا۔ کہ خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ف۲۔ اور یہ تم سے (اپنے

يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ

مقدمات) کیونکر فیصل کرائیں گے جب کہ خود اُن کے پاس تورات (موجود) ہے جس میں خدا کا حکم (لکھا ہوا ہے (یہ

مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ

اُسے جانتے ہیں پھر اس کے بعد اس سے پھر جاتے ہیں اور یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے۔ بیشک ہم نے تورات

فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ

نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی ہے اسی کے مطابق انبیاء جو (خدا کے) فرمانبردار تھے

هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ

یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں۔ اور مشائخ اور علماء بھی کیونکہ وہ کتاب خدا کے نگہبان مقرر کیے گئے تھے اور

Marfat.com

وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا

اس پر گواہ تھے (یعنی حکم الٰہی کا یقین رکھتے تھے) تو تم لوگوں سے مت ڈرنا اور مجھی سے ڈرتے رہنا اور میری

تَشْتَرُوا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لینا۔ اور جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾

دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔

آیت: ۳۸ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

''اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت، پس ان کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کے کرتوت کی جزا اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے''۔

چوری کی حد کس وقت لاگو ہوتی ہے؟

قرآنِ کریم کا عام انداز یہ ہے کہ وہ صرف مردوں کو خطاب کر کے احکام دیتا ہے اور عورتیں بھی ان احکام میں شامل ہوتی ہیں۔ لیکن حدود کے نفاذ میں چونکہ بہت احتیاط برتی گئی ہے اسلئے یہاں مردوں اور عورتوں کو الگ الگ ذکر فرمایا گیا ہے' تا کہ کہیں اس شبے کا سہارا نہ لیا جائے کہ چوری کی سزا صرف مردوں پر نافذ ہوگی' عورتوں پر نہیں ہوگی اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ السارق اور السارقہ یہ صفت کے صیغے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو چور قرار دینے کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ ایسی چیز کی چوری کرے جو قدرو قیمت کی حامل ہو۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے کسی معمولی چیز پر کبھی حد سرقہ کو جاری کرنے کا حکم نہیں دیا۔ یعنی ایک آدمی راستے میں کسی درخت سے پھل توڑ لیتا ہے' کسی کے ٹال سے چند لکڑیاں اٹھالیتا ہے' سبزی کی دکان سے کوئی سبزی چرا لیتا ہے' ان ناشائستہ افعال پر عدالت سزا تو دے سکتی ہے' لیکن حد جاری نہیں کرسکتی کیونکہ اس کو حقیقت میں ایسی چوری قرار نہیں دیا جاسکتا' جس پر اتنی بڑی سزا دی جاسکے۔ پھر قرآن وسنت سے فقہا نے چوری کا جو مفہوم سمجھا ہے' اس کے پیش نظر انہوں نے اس پر چند شرائط عائد کی ہیں کہ اُس چیز کی چوری کو شرعی طور پر چوری قرار دیا جائے گا' جو کسی کی ذاتی ملکیت ہو۔ اگر اس میں چوری کرنے والے کا کسی حد تک بھی اشتراک ہو یا وہ چیز رفاہ عامہ سے تعلق رکھتی ہو' اس پر یہ حد جاری نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ کسی محفوظ مال کی چوری کی گئی ہو۔ اگر وہ چوری کی چیز مال تو ہے' لیکن اسے باہر ڈال دیا گیا ہے یا مثلاً بھینسیں باہر چرنے کیلئے چھوڑ دی گئی ہیں اور کوئی ساتھ محافظ نہیں ہے تو ایسی چوری پر بھی اور کوئی سزا تو دی جا سکتی ہے' لیکن حد جاری نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح جیب تراش چاہے وہ کسی کو ہزاروں لاکھوں سے محروم کردے یا کفن چور جو ایک نہایت سنگین چوری کرتا ہے جو ہر طرح مذمت کے قابل ہے' لیکن چونکہ یہ پوری طرح حفاظت میں نہیں ہے' اس لئے اس پر بھی ہاتھ نہیں کاٹے جاسکتے۔ اسی طرح اس سزا کے اجرا کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس چیز کو چھپا کر چرایا گیا ہو۔ اگر سرِعام اور جبر سے چرایا جائے تو وہ ڈاکہ ہے' چوری نہیں۔ اس کی سزا اور ہے۔ اس کے علاوہ فقہ میں اس کی مزید شرائط کو دیکھا جاسکتا ہے۔ پھر اس جرم کے ثبوت کیلئے بھی' باقی تمام حدود کی طرح بہت احتیاط سے کام لیا گیا ہے اگر ثبوت میں ذرا سا

Marfat.com

بھی شبہ پڑ جائے' تو حد کا اجراء روک دیا جاتا ہے کیونکہ شبہ کا فائدہ ہمیشہ ملزم کو پہنچتا ہے۔ مزید یہ کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ چوری کرنے والا نابالغ یا اس کے دماغ میں فتور ہے' جب بھی اس کو اس سزا سے بچایا جائے گا اور اگر یہ شبہ ہو جائے کہ چوری کرنے والا چوری کرنے میں اختیار نہیں رکھتا تھا' بلکہ جبراً اس سے چوری کروائی گئی یا وہ اضطرار کا شکار تھا کہ اگر وہ چوری نہ کرتا تو ضرورت کے ہاتھوں ہلاک ہو جاتا' تب بھی یہ سزا اس پر نافذ نہیں ہو سکے گی کیونکہ اسلام میں حدود نافذ کرنے سے مقصود لوگوں کو سزائیں دینا نہیں بلکہ لوگوں میں ایک ایسا کریکٹر پیدا کرنا ہے کہ جس سے وہ خود ہی ایسے گناہ سے بچیں اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کو ایسی بنیادوں پر اٹھانا مقصود ہے' جس میں اس طرح کے گناہوں کا وقوع اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جائے۔

اسلام صرف ترغیب ہی نہیں دیتا بلکہ ترہیب سے بھی کام لیتا ہے

انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ دعوت و نصیحت سے وقتی اثر ضرور قبول کرتی ہے لیکن حالات کا دباؤ اور خواہشات کی فراوانی اس اثر کو دیر پا نہیں رہنے دیتی اس کیلئے ضروری ہے کہ ترغیب کے ساتھ ساتھ ترہیب سے بھی کام لیا جائے۔ ترہیب کا سب سے اہم عنصر منکرات کے ارتکاب پر سزا کا نفاذ ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو انسان کو برائی کے ارتکاب سے پہلے سوچنے اور رکنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب چور کو یہ بات معلوم ہو کہ میں اگر چوری کے جرم میں پکڑا گیا تو مجھے سخت سزا ملے گی تو وہ کبھی بھی چوری کے ارتکاب میں جلد بازی سے کام نہیں لے گا۔ مزید برآں معاشرے کو اس لعنت سے محفوظ رکھنے کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ مجرم کو ملنے والی سزا اس کیلئے سامان عبرت بن جائے۔ وہ جب بھی اس سزا کے تصور کو ذہن میں تازہ کرے تو اس کے جسم پر کپکپی چھوٹ جائے اور اس کے دل کی حرکت رک رک کر چلنے لگے۔ اگر ان دو باتوں کا اہتمام کر لیا جائے تو پھر امید کی جا سکتی ہے کہ افراد معاشرہ بہت حد تک اس لعنت سے بچ جائیں گے۔ اس لئے قرآن پاک کی اس آیت کریمہ میں ان دونوں باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے فرمایا: جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ یہ چوری کی سزا چور کیلئے اس کے عمل کا بدلہ ہے' لیکن معاشرے کیلئے سامان عبرت ہے۔ چور نے جو حرکت کی ہے' اس کیلئے چونکہ اس نے دراز دستی سے کام لیتے ہوئے حدود سے تجاوز کیا ہے' اس لئے اس کا ہاتھ اب باقی نہیں رہ سکتا اور چونکہ خطرہ ہے کہ دیگر افرادِ معاشرہ بھی اس کا ارتکاب نہ کرنے لگیں' اس لئے علانیہ ہاتھ کاٹنا لوگوں کو عبرت دلانے کی ایک ترکیب ہے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو چوری کی وارداتیں کبھی نہیں رکیں گی۔ جیسا کہ آج پوری دنیا میں چوری کے مجرموں کو قید و بند کی سزائیں بھی ملتی ہیں' جرمانے بھی ہوتے ہیں' مار پیٹ بھی ہوتی ہے' مگر یہ جرم ہے کہ روز بروز دیگر جرائم کی طرح بڑھتا ہی جا رہا ہے جیلیں جرائم کی درسگاہیں بن کر رہ گئی ہیں اور معاشرہ اس بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ چوری کا یہ جرم صرف ایک جرم نہیں بلکہ کئی جرائم کا عنوان ہے۔ اگر اس کو نہ روکا جائے تو بہت سارے جرائم کو وقوع پذیر ہونے اور بہت ساری محرومیوں کو معاشرے میں در آنے سے نہیں روکا جا سکتا۔ فرض کریں ایک بیوہ جس نے اپنی بیٹی کو پالتے ہوئے عمر کا بیشتر حصہ گزارا' جب بیٹی جوان ہو گئی تو اس نے اس کے ہاتھ پیلے کرنے کیلئے گھروں میں برتن مانجھے' کپڑے دھوئے' پیسہ پیسہ جمع کیا اور اپنی حیثیت کے مطابق اس کیلئے جہیز بنایا۔ شادی کے دن طے ہو گئے تو چور نے آ کر اس کے گھر کی روشنی بجھا دی۔ اب یہ بظاہر ایک جرم ہے' لیکن حقیقت میں اس جرم کے نتیجے میں ایک بیوہ کی آرزوؤں اور ایک جوان لڑکی کے سپنوں کی شکست و ریخت کا جو صدمہ چھپا ہوا ہے اور جس کے نتائج نامعلوم کس طرح اخلاقی تباہی کی شکل میں نکلیں گے' اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ لیکن ہمارے گرد و پیش میں ایسی کئی کہانیاں ہیں جن کو سن کر اور دیکھ کر بڑی آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور بیوہ ماں نے اس لئے اپنی زندگی بھر کا زیور اور اثاثہ چھپا کے رکھا تھا کہ میرا بیٹا' جب اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے کالج یا یونیورسٹی جائے گا تو اس کے اخراجات میں کام آئیں گے۔ لیکن ایک چور کا ہاتھ جہاں ماں کی ساری امیدوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے' وہاں عین ممکن ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے

Marfat.com

دروازے پر کھڑا ہونے والا یہ نوجوان معاشرے سے انتقام لینے کیلئے ایک خطرناک مجرم کی صورت اختیار کر جائے۔ اس لئے ہمارا پروردگار جو خالقِ فطرت ہے۔ وہ ہمارے دانشوروں سے زیادہ جانتا ہے کہ معاشرے کو ان محرومیوں سے بچانے کیلئے کیسی سزائیں ہونی چاہئیں جس سے واقعی جرائم کا راستہ روکا جاسکے۔ لیکن مشکل یہ ہوگئی ہے کہ جب ایک دانشور یہ سنتا ہے کہ کسی معاشرے میں کسی چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا تو ندامت سے اس کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے جھلملانے لگتے ہیں' لیکن پوری دنیا جس طرح ایسے جرائم کے ہاتھوں اخلاقی موت کا شکار ہو رہی ہے' اس سے ہمارے دانشوروں کی پیشانیاں کبھی پسینے سے نہیں بھیگتیں حالانکہ یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ اگر چند ہاتھوں کے کٹ جانے سے ہزاروں سر' ہزاروں گھر اور ہزاروں قسمتیں محفوظ ہوسکتی ہیں تو یہ سودا نہ صرف یہ کہ مہنگا نہیں بلکہ انسانیت کیلئے باعث رحمت ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ شاہ فیصل مرحوم امریکہ کے دورے پر گئے۔ وہاں انہوں نے ایک پریس کانفرنس بلائی۔ اس پرہجوم پریس کانفرنس میں بڑے بڑے اخباروں کے رپورٹروں نے حدود اللہ کے حوالے سے چبھتے ہوئے سوالات کئے اور بار بار یہ بات کہی کہ آپ انسانوں کے ہاتھ کاٹ کر اور حدود اللہ کو نافذ کر کے بہت بڑی انسان دشمنی کا ثبوت دیتے ہیں' اس سے بڑھ کر ظالمانہ سزائیں اور کیا ہوسکتی ہیں؟ شاہ فیصل نے جواب میں فرمایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ تمہیں اور پورے مغرب کو انسانوں اور انسانیت سے ہمدردی نہیں بلکہ جرائم اور مجرموں سے ہمدردی ہے۔ اگر تمہیں انسانیت سے ہمدردی ہوتی تو تم نے انسانیت کے تحفظ کی کوشش کی ہوتی۔ تمہیں چونکہ جرائم اور مجرموں سے ہمدردی ہے' اس لئے تم اس کے تحفظ کیلئے کوشاں رہتے ہو اور اس میں تم کامیاب بھی ہو۔ مزید فرمایا کہ میں تمہیں ڈالروں سے بھرا ہوا ایک بریف کیس دیتا ہوں اور پھر تمہیں میں اسی شہر میں گھومنے پھرنے کیلئے بغیر کسی باڈی گارڈ کے جانے کا حکم دیتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ چند گھنٹوں کے بعد مجھے خبر ملے گی کہ تمہیں یا تو قتل کر دیا گیا ہے یا تمہارا بریف کیس چھین لیا گیا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے اور تم جانتے ہو کہ ایسا ہی ہے تو پھر تمہیں سوچنا چاہئے کہ تم نے سزاؤں کے نام سے جو ایک تماشہ رچا رکھا ہے' اس نے آخر تمہیں اور پوری دنیا کو کیا دیا ہے؟ کہ جرائم میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں انسانوں کے دکھ بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس میں تمہیں اپنے ملک چلنے کی دعوت دیتا ہوں۔ تم میرے ملک میں آؤ' میں تمہیں سونے سے لاد دوں گا اور دولت کا ایک بڑا انبار تمہارے ساتھ کر کے' تمہیں حکم دوں گا کہ پورے ملک کی سیر کرو۔ اگر اس سیر میں تمہارا کوئی نقصان ہو یا تمہاری طرف کوئی میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت کرے تو پھر میں مان لوں گا کہ تم اسلامی سزاؤں کو جو ظالمانہ سزائیں کہتے ہو اور بظاہر انسانیت سے جو محبت جتاتے ہو' یہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن اگر تم دولت کا ایک انبار رکھتے ہوئے بھی اور تن تنہا پورے ملک میں سفر کرتے ہوئے بھی' کسی حادثے کا شکار نہیں ہوتے اور کوئی تمہیں نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کرتا تو تمہیں مان لینا چاہئے کہ اسلام کی سزائیں جو بقول تمہارے سخت سہی' سراسر رحمت ہیں' اس نے انسانوں کو کچھ دیا ہے چھینا نہیں۔ کیا ایسا نہیں کہ جب کبھی یہ تجربہ ہوا ہے' وہ چودہ سال پہلے ہوا ہو یا آج' اس نے ہمیشہ انسانوں کی جان' مال' عزت' آبرو' حتیٰ کہ انسانیت کی حفاظت کی ہے۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ تم اگر انسانیت سے ہمدردی رکھتے ہو تو تمہیں اسلام کا دیا ہوا سزاؤں کا نظام قبول کرنے میں آخر تامل کیوں ہے؟

مزید فرمایا: وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿اللہ غالب ہے' حکمت والا ہے﴾ وہ چونکہ غالب ہے' اس لئے جو چاہے حکم دے سکتا ہے' اس پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ چونکہ وہ حکیم بھی ہے' اس لئے اس کا ہر حکم حکمت و دانش کا مرقع ہوتا ہے۔ انسان اپنی کوتاہ فہمی کی وجہ سے بعض دفعہ اس کے نتائج و ثمرات کو سمجھنے میں کوتاہی کر جاتے ہیں لیکن جب کبھی اس کا تجربہ کرتے ہیں تو تب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و دانش سے کس طرح ہمیں نوازا ہے۔

Marfat.com

آیت:۳۹ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝ ''اور جس شخص نے اس ظلم وسرکشی کے بعد توبہ کرلی اور اپنے عمل کی اصلاح کرلی اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائیں گے' یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والے ہیں' رحم کرنے والے ہیں''۔

توبہ کے بعد ایک مجرم سے اسلامی معاشرے کا سلوک

تمام قوموں اور انسانی معاشروں میں یہ معمول رہا ہے کہ جب کسی مجرم کو سزا دی جاتی ہے تو اس کے بارے میں طبیعتوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں معاشرہ دوبارہ ایسے آدمی کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اب وہ شخص یا تو محرومیوں کی پوٹ بن کر زندگی گزارتا ہے یا مایوسیوں کا شکار ہو کر خودکشی کی موت قبول کر لیتا ہے۔ لیکن ہمارا پروردگار چونکہ خالق فطرت اور انسانی جبلت کو جاننے والا ہے' وہ انسانیت کا یہ نقصان کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ اس لئے جہاں اس نے جرم کی سزا دے کر معاشرے پر پڑنے والے اس کے برے اثرات سے معاشرے کو بچایا' وہیں اس نے مجرم کو معاشرے سے کٹ جانے اور دوبارہ معاشرے کے اسے قبول نہ کرنے جیسے نقصان سے بچا کر نہ صرف اس مجرم کی بلکہ جمیع انسانیت کی حفاظت کا اہتمام فرمایا۔ اس لئے ارشاد فرمایا:

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝

﴿اور جس شخص نے اس ظلم وسرکشی کے بعد توبہ کر لی اور اپنے عمل کی اصلاح کر لی' اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائیں گے' یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والے ہیں' رحم کرنے والے ہیں۔﴾

یعنی ایک مجرم کیلئے نہ اسلامی معاشرے کے دروازے بند ہوتے ہیں اور نہ اللہ کی رحمت کے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کے سامنے معافی مانگے' اپنے فعلِ بد پر ندامت کا اظہار کرے' اپنے اس بگڑے ہوئے رویے کی پوری طرح اصلاح کرے اور تجدید عہد کرتے ہوئے یقین دلا دے کہ دوبارہ ایسی حرکت کا صدور نہیں ہوگا تو اللہ فرماتا ہے کہ میری مغفرت جھوم کر اس پر برسے گی اور میری رحمت اسے اپنی آغوش میں لے لے گی' اس لئے کہ کسی انسان کا ٹھوکر کھا جانا ایسا جرم نہیں' جس کی اصلاح ممکن نہ ہو۔ اصل جرم' جرم کو جرم نہ سمجھنا اور اس پر اصرار کرتے ہوئے اسے جاری رکھنا ہے' جس کے نتیجے میں اس کے اندر کی انسانیت تباہ ہو جاتی ہے اور انسانی معاشرہ نہ صرف اپنے ایک کارکن سے محروم ہو جاتا ہے' بلکہ اس کے برے اثرات دوسروں کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس جرم کا دائرہ کہیں سے کہیں پھیلا دیتے ہیں اور اگر یہ مجرم' مجرم نہ رہے' بلکہ نادم ہو کر اصلاح کی طرف لپکے تو نہ صرف یہ کہ انسانی معاشرے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ غلطی کرنے والوں کے سامنے ایک نمونہ آ جاتا ہے' جس سے ان کیلئے واپس پلٹنے کی ترغیب پیدا ہو جاتی ہے۔

سچ کہا ماہر القادری مرحوم نے

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو' جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
اک بار خطا ہو جاتی ہے' سو بار ندامت ہوتی ہے

آیت:۴۰ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ۝ ''کیا تمہیں علم نہیں ہے کہ اللہ ہی ہے' جس کیلئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔ وہی جس کو چاہے گا سزا دے گا اور جس کو چاہے گا بخشے گا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

Marfat.com

اس آیت کریمہ میں پورے سلسلۂ مضمون کو سامنے رکھتے ہوئے' ایک جامع بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اللہ کے قانون کی تعمیل میں حیل وحجت کرنا یا اس کی حکمتوں کو سمجھنے میں پس وپیش کرنا' پھر اس کے نفاذ میں بہانے تراشنا' اُخروی نجات کیلئے مصنوعی سہارے تلاش کرنا اور سمجھنا کہ بخشش اور مغفرت میں شاید ان کا بھی کوئی دخل ہے' یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس لئے فرمایا گیا کہ تم اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ زمین وآسمان پر حکومت کس کی ہے' یہ پوری کائنات کس کے حکم سے زندگی کا رزق پا رہی ہے؟ ظاہر ہے وہ پروردگار عالم ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اسی کے حکم سے وجود میں آیا ہے اور اسی کے حکم سے باقی ہے۔ حاکمیت بھی اسی کو زیب دیتی ہے کیونکہ کبریائی اور حاکمیت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب حکومت اور حاکمیت کا حق اس کا ہے تو پھر وہ جسے چاہے سزا دے اور جس کی چاہے مغفرت کرے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے' اس کی قدرت سے کوئی چیز بھی بعید نہیں ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر اس کے احکام کی تعمیل میں پس وپیش کرنا یا اس کے قانون کے مقابلے میں دوسرے سہارے تلاش کرنا' جس کے نتیجے میں خرابیوں کا سلسلہ چل نکلتا ہے' کسی طرح بھی مناسب نہیں بلکہ یہی ساری نافرمانیوں کی جڑ ہے۔ اس لئے جب تک اس پر قابو نہیں پایا جائے گا اور اس حقیقت کو مذہب ودین کی روح کے طور پر قبول نہیں کیا جائے گا' اس وقت تک نہ حدود اللہ کی حکمت سمجھ میں آئے گی اور نہ صحیح ذوق عمل نصیب ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ جب دیکھتے تھے کہ اہل کتاب اس بنیادی حقیقت کو' جس کا ابھی ذکر ہوا' بخوبی جانتے ہیں کیونکہ یہی ہر مذہب کی اساس ہے' لیکن ان کا رویہ اعتقاد اور عمل دونوں کے حوالے سے اس کے بالکل برعکس ہے تو آپ کو شدید صدمہ ہوتا تھا۔ آپ دیکھتے تھے کہ اوس اور خزرج میں سے جو لوگ بظاہر مسلمان ہوئے ہیں' لیکن تاحال یہودیوں کے زیر اثر ہیں' اسی طرح وہ لوگ بھی جو یہود میں سے نام کے مسلمان ہیں' لیکن دراصل دونوں گروہ منافق ہیں' وہ زندگی کے ہر اہم مسئلے میں بجائے اس کے کہ رسول اللہ ﷺ سے رجوع کریں' ان کی کوشش یہ ہوتی کہ یہودیوں سے راہنمائی حاصل کریں اور یہود کی عدالتوں سے فیصلے کروائیں' حالانکہ ایمان کی پہلی شرط ہی یہ ہے کہ آدمی راہنمائی اور فیصلہ لینے کیلئے اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے' لیکن جب تک کسی میں حقیقی ایمان پیدا نہیں ہوتا' اس میں یہ نفاق کی سب سے بڑی علامت زندہ رہتی ہے کہ وہ انفرادی عبادات میں بعض دفعہ شریک بھی ہوتا ہے' لیکن اجتماعی زندگی میں اور راہنمائی اور قانون کے حوالے سے کبھی بھی اسے یکسوئی نصیب نہیں ہوتی۔ ان منافقین کا بھی سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ وہ ایک طرف تو ایمان لانے کے دعوے دار تھے اور دوسری طرف بار بار یہود کے پاس جا کر ان سے رہنمائی لیتے تھے اور انہی کے سکھانے' پڑھانے سے آنحضرت ﷺ کی مجلس میں آ کر مسائل بھی پیدا کرتے تھے۔

قرآن کریم نے بعض دوسری سورتوں میں بھی منافقین کی اس روش کا بار بار نوٹس لیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

﴿ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں' وہ چاہتے یہ ہیں کہ زندگی کے فیصلے طاغوت سے حاصل کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے ہر طرح لاتعلق ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ ﴾ (النساء 4:60)

پھر آگے چل کر پروردگار نے قسم کھا کر نہایت تاکید سے یہ بات فرمائی کہ:

﴿ تم کبھی بھی حقیقی مومن نہیں ہو سکتے' تاوقتیکہ اپنے متنازعہ معاملات میں صرف آنحضرت ﷺ کو فیصل تسلیم نہ کرلو اور ان کے فیصلوں کے سامنے گردن نہ جھکاؤ۔ ﴾ (النساء 4:65)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روش ہر دور کے منافقین کی رہی ہے۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں اسلام کا بڑا دعویٰ ہے لیکن

Marfat.com

وہ اپنی تہذیبی، تمدنی اور قانونی زندگی میں کبھی اس بات کو سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہیں کہ راہنمائی صرف اللہ اور اسکے رسول سے ہی لی جاسکتی ہے۔

جن حالات میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، اس وقت ایک مشکل یہ تھی کہ ابھی تک اسلام کی اس نوزائیدہ ریاست کا دائرہ بہت محدود تھا۔ یہود کے دو قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ مدینہ کے مضافات میں رہتے تھے اور زندگی کے بیشتر معاملات میں انہیں اپنے فیصلے خود کرنے کا حق حاصل تھا۔ ان کی اپنی عدالتیں تھیں، جن میں وہ یہود کے فیصلے کرتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اسلام عدل اور مساوات کا فی الواقع علمبردار ہے اور بارگاہِ رسالت سے ہر ایک کو انصاف مل سکتا ہے تو بعض دفعہ ان کے عوام یا ان میں سے وہ لوگ، جو بظاہر اسلام قبول کر چکے تھے، وہ اپنے فیصلہ طلب مسائل میں آنحضرت کی خدمت میں آنے کی کوشش کرتے تو ان کے لیڈر اور راہنما ان کو یہ پٹی پڑھا کر بھیجتے کہ دیکھو! اگر تمہیں وہاں سے فیصلہ اپنی خواہش کے مطابق ملے تو اسے قبول کرنا، ورنہ رد کر دینا۔ رسول اللہ ﷺ ان کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر سخت غمزدہ ہوتے کہ ایک طرف تو یہ لوگ اپنے آپ کو اللہ کے دین کا پیروکار کہتے ہیں اور دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ یہ اپنی خواہشات کے سوا کسی چیز کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ چنانچہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کی طرف آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو متوجہ فرمایا۔

آیت: ۴۱ یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ لَا یَحۡزُنۡكَ الَّذِیۡنَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡكُفۡرِ مِنَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَلَمۡ تُؤۡمِنۡ قُلُوۡبُهُمۡ ۛۚ وَمِنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا ۛۚ سَمّٰعُوۡنَ لِلۡكَذِبِ سَمّٰعُوۡنَ لِقَوۡمٍ اٰخَرِیۡنَ ۙ لَمۡ یَاۡتُوۡكَ ؕ یُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ یَقُوۡلُوۡنَ اِنۡ اُوۡتِیۡتُمۡ هٰذَا فَخُذُوۡهُ وَاِنۡ لَّمۡ تُؤۡتَوۡهُ فَاحۡذَرُوۡا ؕ وَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتۡنَتَهٗ فَلَنۡ تَمۡلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَیۡــًٔا ؕ اُولٰٓـئِكَ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُرِدِ اللّٰهُ اَنۡ یُّطَهِّرَ قُلُوۡبَهُمۡ ؕ لَهُمۡ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ ۙۖ وَّلَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ○ "اے پیغمبر! ان لوگوں کی روش تمہیں غم میں نہ ڈالے، جو کفر کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں۔ ان لوگوں میں سے جو زبان سے تو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ ان کے دلوں نے ایمان قبول نہیں کیا اور ان لوگوں میں سے جنہوں نے یہودیت اختیار کی ہے یہ جھوٹ کے رسیا اور دوسروں کی باتیں ماننے والے ہیں، جو خود تمہارے پاس نہیں آتے۔ وہ اللہ کے کلام اور اس کے احکام کا موقع محل اور اس کا محمل و مصداق متعین ہونے کے باوجود اس کو اس کے موقع محل سے ہٹا دیتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو، نہیں تو نہ مانو۔ جسے اللہ ہی نے فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو، اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کیلئے تم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہی لوگ ہیں، جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہیں چاہا۔ ان کیلئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کیلئے بہت بڑا عذاب ہے"۔

خلوصِ نیت سے دین کا کام کرنے والوں کیلئے تسلی

پہلی بات کی طرف یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ کے خطاب سے آنحضرت ﷺ کو توجہ دلائی گئی کہ آپ ان لوگوں کی اس روش اور ان کے کرتوتوں سے غمزدہ نہ ہوں اور اس بات کو کبھی محسوس نہ فرمائیں کہ آپ کی تمام تر ہمدردیوں، خیر خواہیوں اور کوششوں کے باوجود یہ لوگ کفر میں بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس لئے کہ آپ کا منصب رسالت ہے۔ آپ کو اس سے ہرگز اثر قبول نہیں کرنا چاہئے کہ آپ کے حقِ رسالت کی ادائیگی کے باوجود یہ لوگ کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کا جواب اللہ کے یہاں انہوں نے دینا ہے، آپ نے نہیں۔ آپ اس پر غمزدہ کیوں ہیں اور مزید یہ بات کہ آج تک جتنے رسول دنیا میں مبعوث ہوئے ہیں، ان کی قوموں نے ان کے ساتھ کب اچھا رویہ اختیار کیا ہے، ان کی خیر خواہی کے جواب میں انہوں نے ہمیشہ بدخواہی کی، پیغمبروں نے خون کے گھونٹ پی پی کر ان کو راہِ راست پر لانا چاہا، مگر وہ ان کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ انہوں نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ سے ان کی

Marfat.com

ہدایت کیلئے دعائیں مانگیں‘ مگر ان کی قوموں نے ہمیشہ ان کے قتل کے منصوبے باندھے۔ جب رسالت کی تاریخ ایسے ہی تجربات سے بھرپور ہے اور قرآن کریم بار بار ان کا تذکرہ بھی کر رہا ہے تو پھر اے پیغمبر! آپ کو ان کی ایذاؤں اور ان کے کرتوتوں سے ہرگز متاثر نہیں ہونا چاہئے کیونکہ

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درسِ صلح دیتے ہیں‘ یہ ان سے جنگ کرتا ہے

اللہ کے نبیوں کی شان تو خیر بہت بڑی ہے لوگوں نے تو اپنے مصلحین کے ساتھ کبھی اچھا رویہ اختیار نہ کیا۔ بہت کم مصلح ایسے گزرے ہیں جنہیں اپنی اصلاحی کوششوں کے جواب میں اچھے نتائج ملے ہوں اور اپنے ان غمگساروں کے ساتھ لوگوں نے کبھی شریفانہ رویہ اختیار کیا ہو۔ لاہور میں اہل لاہور کے سب سے بڑے مصلح اور محسن شیخ علی ہجویریؒ جو ”داتا صاحب“ کے نام سے معروف ہیں‘ تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اہلِ لاہور نے زندگی میں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ زندگی میں جن مصلحین کے ساتھ ناروا رویہ اختیار کیا جاتا ہے‘ مرنے کے بعد ان کی پوجا شروع کر دی جاتی ہے۔ اسی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے کسی نے نہایت دکھ سے یہ بات کہی تھی:

یہ قوم گویا ہے اک پہیلی‘ جو عقل دقت سے بوجھتی ہے
جو بات اوروں کو جلد سوجھے‘ وہ دیر بعد اس کو سوجھتی ہے
یہ زندگی میں برا ہی کہتی ہے‘ موت کے بعد پوجتی ہے

سَمّٰعُوْنَ سے مراد کون لوگ ہیں

دوسری بات جس کی طرف ان آیات میں متوجہ کیا گیا ہے وہ ہے: سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ

”سَمّٰعُوْنَ“ جمع ہے سَمّاع کی۔ یہ اسم مبالغہ ہے‘ جس کا معنی ہے‘ بہت سننے والا۔ اس کا استعمال عام طور پر دو معنوں میں ہوتا ہے‘ ایک اس آدمی کو کہتے ہیں‘ جو کسی چیز کا رسیا ہو اور دوسرا اس کا معنی ہوتا ہے ”جاسوس“۔ یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ جھوٹ کے رسیا ہیں اور دوسری قوم یعنی یہود کے جاسوس ہیں اور ان دونوں کے درمیان چونکہ حرف عطف نہیں ہے‘ اس لئے اصلاً یہ ایک ہی بیماری کی دو شکلیں ہیں۔ پروردگار ہمیں یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ ان منافقین کی یہ روش اس وجہ سے ہے کہ ان کو جھوٹ سے انتہا درجہ کی سازگاری ہے۔ یہ اپنی زندگی کے تمام معاملات گفتگو کے تمام اسالیب میں جھوٹ ہی کو اپنا راہنما جانتے ہیں۔ یعنی جھوٹ بولتے ہیں‘ جھوٹ سنتے ہیں‘ معاملات میں جھوٹ سے کام لیتے ہیں‘ فیصلے میں بھی جھوٹ بول کر اپنا مطلب حاصل کرتے ہیں‘ گواہی کی ضرورت پڑے تو جھوٹے گواہ بنا لیتے ہیں۔ جن لوگوں کا اوڑھنا بچھونا جھوٹ بن جائے ان کی پوری زندگی جھوٹ سے عبارت ہو۔ ان کیلئے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی صحبتوں سے فائدہ اٹھائیں یا آپ کی عدالت سے اپنے معاملات کا فیصلہ چاہیں۔ اس لئے کہ یہاں آ کر ان کو سوائے صدق اور سچائی کے‘ کسی چیز کی کارفرمائی نظر نہیں آئے گی۔ وہ یوں محسوس کریں گے جیسے صورت حال سے دوچار ہو رہے ہوں اور دوسری مشکل ان کی یہ ہے‘ جو اسی برائی کا دوسرا رخ ہے کہ وہ دوسری قوم یعنی یہود کے جاسوس ہیں۔ ان کا مسئلہ صرف یہ نہیں کہ انہیں سچائی سے نفور ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ کچھ لوگوں کے ایجنٹ ہیں‘ انہی کی راہنمائی میں اور انہی کے اشاروں پر چلنا اور زندگی گزارنا رویہ بنا چکے ہیں۔ اب اگر ان کی طبیعت میں کبھی اچھائی کا تصور آتا بھی ہے تو برسوں کی برائی کی چھاپ ان کے اچھائی کے تصور کو دبا دیتی ہے اور یا ان کو ان حاکموں کا اثر اور ان کے مفادات‘ جن کے یہ جاسوس ہیں‘ اس روش سے انہیں نکلنے کی اجازت نہیں دیتے۔

Marfat.com

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان منافقین کی اس بیماری کے تذکرے میں ہم مسلمانوں کو آئینہ دکھایا جا رہا ہے۔ ہم بفضلہ تعالیٰ اسلام کا دعویٰ رکھتے ہیں لیکن جب کبھی مملکت خداداد کی عدالتوں میں اسلامی نظام کے نفاذ کا سوال اٹھتا ہے اور اس کے پورے سیٹ اپ کو بدل کر سچائی کے مطابق بنانے کی بات ہوتی ہے تو ہماری جھوٹ اور جھوٹی زندگی سے محبت ہمیں بغاوت پر آمادہ کر دیتی ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ اگر سچائی کو غلبہ مل گیا تو ہمیں اپنے کتنے جھوٹے مفادات سے دستبردار ہونا پڑے گا' کتنے مظالم ہیں جن کی ذمہ داری قبول کرنا پڑے گی۔ جھوٹ کا ایک کاروبار جو نام نہاد وکالت کے نام سے ہماری عدالتوں میں جاری ہے' وہ ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔ جھوٹے گواہوں کا عدالتوں میں داخلہ تک ممنوع ہو جائے گا۔ یہ پورا مافیا ہے' جس نے ہمارے نظامِ عدالت کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ اس لئے وہ اسلامی نظام عدالت کو کبھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا اور دوسری یہ بات کہ ہمارے دانشوروں کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے کہ جن کی تاریں ہمیشہ باہر سے ہلتی ہیں۔ انہوں نے غیر ملکی مصنفین کی کتابیں پڑھی ہیں۔ فلسفۂ کفر سے دماغ کو آباد کیا ہے۔ بے خدا تہذیب کے دیئے ہوئے ثمرات انہیں باہر سے ورثے میں ملے ہیں اور پھر باہر کی قوتوں کا سیاسی اور ثقافتی غلبہ ہمارے نام نہاد تعلیم یافتہ دانشوروں کو کبھی اپنی عقل سے کام لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے ہم مسلمان ہو کر بھی وہی سوچتے اور وہی کرتے ہیں' جو کچھ ہمارے باہر کے آقا کرنے کا حکم دیتے ہیں اور جن کی ناراضگی سے ہم ہمیشہ لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ ظفر علی خاں مرحوم نے ٹھیک کہا تھا

تم سمجھتے ہو پرایوں نے کیا ہم کو تباہ
بندہ پرور کہیں اپنوں کا یہ کام نہ ہو
یوں تو شرمِ پیمبر ہے انہیں بھی لیکن
ان کو ڈر یہ ہے کہ ناراض کہیں ٹام نہ ہو

علماء یہود کا کردار:

اس کے بعد ارشاد فرمایا:

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ

یہ منافقین جن یہود کے اشاروں پر چلتے ہیں' وہ کم از کم اتنا ہی غور کر لیں کہ ان کا اصل کردار کیا ہے کہ یہ اپنی زندگی ان کے ہاتھوں میں دے کر خود پتلیوں کی طرح ایک تماشہ بنے ہوئے ہیں' لیکن انہیں یہ تک معلوم نہیں کہ ان کے ان آقاؤں کی کارستانیاں کیا ہیں اور وہ کس سیرت و کردار کے مالک ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کے کلام اور اس کے احکام کا موقع و محل اور اس کا محمل و مصداق متعین ہونے کے باوجود اس کو اس کے موقع و محل سے ہٹا دیتے ہیں' جس سے حکم کا مقصد بالکل فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ جن کی جرأتوں اور جسارتوں کا یہ عالم ہو کہ اللہ کے کلام میں اس صریح تحریف سے بھی باز نہ رہیں اور انہیں اس بات کا ذرہ بھر خیال نہ رہے کہ قیامت کے دن جب اللہ کے حضور جواب طلبی ہو گی تو ہم اس کا کس طرح جواب دے سکیں گے۔ عجیب بات ہے کہ یہ منافقین ان بے ایمان اور بدکردار یہود کے اشاروں پر چلتے ہیں اور ان کی راہنمائی قبول کرتے ہیں۔

یہود کے سیرت و کردار کا ایک غلیظ پہلو تو یہ تھا جو ابھی سامنے آیا کہ وہ اللہ کے عذاب اور اس کا سامنا کرنے سے بالکل نہیں گھبراتے تھے' بلکہ آخرت ان کیلئے ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں تھی اور دوسری طرف ان کے اس برے کردار کا دوسرا پہلو جو اس آیت سے واضح ہو رہا ہے' وہ یہ ہے کہ وہ اپنے زیرِ اثر لوگوں کو استعمال کرنے اور ان کے سیرت و کردار کے بگاڑنے میں بھی ذرہ بھر شرم محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کے رسول کی

Marfat.com

بھی ان کو شرم نہ تھی۔ وہ ان کے پاس قضایا اور معاملات کو بھیجتے ہوئے' یہ ہدایت دینے سے بھی ہچکچاتے نہیں تھے کہ تم یہ معاملات محمد ﷺ کی عدالت میں لے جاؤ' لیکن یہ یاد رکھنا کہ وہاں سے اگر فیصلہ تمہاری خواہش کے مطابق ہو تو اسے قبول کر لینا اور اگر تمہاری خواہش کے خلاف ہو تو ہرگز قبول نہ کرنا۔ یعنی وہ انسانی تصفیہ طلب مسائل میں بھی اپنی کور باطنی سے باز نہیں آتے تھے۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اسلام کی اس نوزائیدہ مملکت میں یہودیوں کے قبیلوں کو ایک قبائلی نوعیت کا اقتدار حاصل تھا۔ وہ اس بات کے پابند نہیں تھے کہ ضرور آنحضرت ﷺ کی عدالت سے اپنے قضایا کا تصفیہ کروائیں' چنانچہ روایاتِ تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کے نزول سے پہلے دو واقعات پیش آئے تھے۔ اس پر ان کے انفرادی اور اجتماعی کردار کے جو جو پہلو سامنے آئے' ان آیات میں ان کے حوالے سے اصولی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ مسند احمد اور ابوداؤد میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے۔ مدینہ طیبہ میں یہود کے دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر آباد تھے۔ ان میں سے بنو نضیر' قوت و شوکت اور دولت و عزت میں' بنو قریظہ سے بڑھے ہوئے تھے۔ ان کو جب بھی موقع ملتا' بنو قریظہ پر ظلم ڈھاتے اور وہ بیچارے بادل نخواستہ اس کو برداشت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ بنو نضیر نے بنو قریظہ کو ایک نہایت ذلت آمیز معاہدے پر مجبور کر دیا۔ معاہدہ یہ تھا کہ اگر بنو نضیر کا کوئی آدمی بنو قریظہ کے کسی شخص کو قتل کر دے تو اس کا قصاص لینے کا انہیں کوئی حق نہ ہوگا بلکہ صرف ستر وسق کھجوریں ان کے خوں بہا کے طور پر ادا کی جائیں گی (وسق تقریباً پانچ من دس سیر کا ہوتا ہے) اور اگر بنو قریظہ کا کوئی آدمی بنو نضیر کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا ہے تو اس کے قاتل کو قتل بھی کیا جائے گا اور ان سے خون بہا بھی لیا جائے گا اور وہ بھی بنو نضیر کے خوں بہا سے دوگنا ہوگا۔ اسی طرح اور بھی نہایت غیر منصفانہ باتیں اس میں شامل تھیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے مدینہ طیبہ میں تشریف لے آنے کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ بنو قریظہ کے ایک آدمی نے بنو نضیر کے کسی آدمی کو مار ڈالا تو بنو نضیر نے معاہدہ مذکور کے مطابق بنو قریظہ سے دوگنی دیت یعنی خوں بہا کا مطالبہ کیا۔ بنو قریظہ اگرچہ اسلام میں داخل نہ تھے' لیکن مسلمانوں کے عدل و مساوات کو دیکھ رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس ظلم کو ماننے سے انکار کر دیا اور یہ مطالبہ کیا کہ ہم مسلمانوں کے پیغمبر سے اس معاملے کا فیصلہ کروائیں۔ شروع میں تو بنو نضیر نے اس پر بڑی برہمی کا اظہار کیا' آخر اس پر راضی ہو گئے۔ مگر اس میں سازش یہ کی کہ آپ کے پاس مقدمہ لے جانے سے پہلے' کچھ ایسے لوگوں کو آگے بھیجا' جو اصل میں تو انہی کے ہم مذہب یہودی تھے' مگر منافقانہ طور پر اسلام کا اظہار کر کے رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے جاتے تھے اور مطلب ان کا یہ تھا کہ یہ لوگ کسی طرح مقدمہ کے فیصلہ سے پہلے اس معاملہ میں آنحضرت ﷺ کا عندیہ اور نظریہ معلوم کر لیں اور ان لوگوں کو یہ تاکید بھی کی کہ اگر مسلمانوں کے پیغمبر نے ہمارے مطالبہ کے موافق فیصلہ کیا تو اس کو قبول کر لینا اور اس کے خلاف کوئی حکم دیا جائے تو ماننے کا وعدہ نہ کرنا۔

دوسرا واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ خیبر کے معزز یہودی خاندانوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلق پایا گیا۔ تورات کی رُو سے اس کی سزا رجم تھی۔ یعنی یہ کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے' لیکن یہودی اس سزا کو نافذ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدمہ میں محمد ﷺ کو پنچ بنایا جائے۔ اگر وہ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو قبول کر لیا جائے اور رجم ہی کا حکم دیں تو قبول نہ کیا جائے۔ چنانچہ مقدمہ آپ کے سامنے لایا گیا۔ آپ نے رجم کا حکم دیا۔ انہوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا۔ اس پر آپ نے پوچھا: تمہارے مذہب میں اس کی کیا سزا ہے؟ انہوں نے کہا کوڑے مارنا اور منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرنا۔ آپ نے ان کے علماء کو قسم دے کر پوچھا: کیا تورات میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کی یہی سزا ہے؟ انہوں نے پھر وہی جھوٹا جواب دیا۔ لیکن ان میں سے ایک شخص ابن صوریا' جو خود یہودیوں کے بیان کے مطابق اپنے وقت میں تورات کا سب سے بڑا عالم تھا' خاموش رہا۔ آپ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں تجھے اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں' جس نے تم لوگوں کو فرعون سے بچایا اور کوہِ طور پر تمہیں شریعت عطا کی۔ کیا واقعی تورات میں زنا کی یہی سزا لکھی ہے؟ اس نے جواب دیا "اگر آپ مجھے ایسی بھاری قسم نہ دیتے تو میں کبھی نہ بتاتا۔ واقعہ

Marfat.com

ہے کہ زنا کی سزا تو رجم ہی ہے۔ مگر ہمارے ہاں جب زنا کی کثرت ہوئی تو ہمارے حکام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بڑے لوگ زنا کرتے تو انہیں چھوڑ دیا جاتا اور چھوٹے لوگوں سے اگر یہی حرکت سرزد ہوتی تو انہیں رجم کر دیا جاتا۔ جب اس سے عوام میں ناراضگی پیدا ہونے لگی تو ہم نے تورات کے قانون کو بدل کر یہ قاعدہ بنالیا کہ زانی اور زانیہ کو کوڑے لگائے جائیں اور انہیں منہ کالا کر کے گدھے پر الٹے منہ سوار کیا جائے‘‘۔

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہود جن کے ہاتھوں میں یہ منافقین کھیل رہے تھے وہ کس سیرت و کردار کے مالک تھے اور قلب و دماغ کے حوالے سے کس سطح کے لوگ تھے۔ اس لئے منافقین کو یہ سوچنا چاہئے کہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اپنی دنیا اور آخرت دے کر آخر تم کیا حاصل کرنا چاہتے ہو؟ عافیت کا راستہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اپنے اندر ایمان و تقویٰ پیدا کرو اور یہ لوگ جو سرے سے ہر اچھی بات کے دشمن ہیں ان سے لاتعلق ہو جاؤ کیونکہ وہ لوگ اس جگہ تک پہنچ گئے ہیں جہاں سے پلٹنے کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔

گناہ کی روش پر ضد کا انجام

اس لئے فرمایا: وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ط یہ اللہ کی اس سنت اور قانون کا بیان ہے جو ہمیشہ ایسے لوگوں کے بارے میں جاری رہا ہے جنہوں نے آخر حد تک حق سے روگردانی کی ہے۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ انسان کو شعور اور قوت تمیز دے کر پیدا کرتا ہے۔ پھر جب وہ تکلیف شرعی کی عمر کو پہنچتا ہے اس کے سامنے فطرت اور اللہ کی جانب سے خیر اور حق کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور دوسری طرف نفس اور شیطان کی جانب سے گمراہی کے بہلاوے اس کا راستہ روکتے ہیں۔ یہ اس کی قوت تمیز اور عقل کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ کدھر جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اگر وہ صحیح راستے کا انتخاب کرتا ہے تو قدرت کی جانب سے اس کیلئے اس راستہ پر چلنے کی آسانیاں پیدا کی جاتی ہیں اور اس کی طبیعت کو ایک استحکام اور اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ تمام تر فطری ہدایات اور اللہ کی جانب سے ہدایت کے سارے امکانات کے باوجود غلط راستے پر چلنے پر اصرار کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اسی راستے پر چلنے کیلئے اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ اسے غفلت کی نیند سے اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اگر وہ غفلت کا بستر کسی طرح بھی چھوڑنے کی کوشش نہیں کرتا تو قدرت بھی اسے اسی بستر پر پڑا رہنے دیتی ہے۔ یہاں اسی قانون کو بیان کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو فتنہ میں ڈالنا چاہتا ہے تو اے پیغمبر! آپ اللہ کے مقابلے میں اس کا کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس نے اپنی کوتاہیوں سے اپنے آپ کو سنت الٰہی کی زد میں دے دیا ہے اور جب کوئی سنتِ الٰہی کی زد میں آجاتا ہے تو پھر کسی کے امکان میں یہ نہیں رہتا کہ وہ اس کو باطل سے موڑ کر حق کی راہ پر ڈال دے۔ یہ لوگ چونکہ اب اس قانونِ الٰہی کی زد میں آچکے ہیں اور ان کے طور اطوار خود اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ نبی آخر الزمان کے آنے کے باوجود بھی اور قرآنِ کریم کے نزول کے بعد بھی یہ اپنی روش بدلنے کیلئے بالکل تیار نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آنا بھی یہ اپنے لئے کسرِ شان سمجھتے ہیں اور اللہ کے نازل کردہ قانون کے بارے میں ان کا رویہ حسد پر مبنی ایک تمسخر سے زیادہ نہیں۔

اس لئے ارشاد فرمایا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ط لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْيٌ ج صلے وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ O

﴿ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہیں چاہا ان کیلئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کیلئے بہت بڑا عذاب ہے۔ ﴾

یعنی اللہ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے وہ اب ان کے دلوں میں ہدایت حق کیلئے کوئی آمادگی پیدا نہیں ہونے دیں گے۔ اور اپنی کوتاہیوں اور نادانیوں

Marfat.com

سے جس طرح انہوں نے اپنے دل کو گندا کرلیا ہے اور اسے آب وتاب سے بالکل محروم کردیا ہے کہ اس میں قبولِ حق کی کوئی رمق باقی نہیں رہ گئی ہے۔اب اس کے بعد ان سے تعلق رکھنا سراسر خسران کا سودا ہے۔ دل ودماغ کی اس کیفیت کو قرآن کریم نے رَین سے تشبیہ دی ہے جس کا نتیجہ طبع قلوب فرمایا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ دل ایک آئینہ کی مانند ہے۔ جب آدمی کوئی گناہ کرتا ہے تو اس پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرے تو یہ دھبہ مٹ جاتا ہے اور اگر مزید گناہ کرے تو اور ایک دھبہ لگ جاتا ہے۔اسی طرح مسلسل اگر یہ دھبے بڑھتے جائیں تو آخر دل کا آئینہ آب وتاب کھو کر بالکل سیاہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے' جب اللہ تعالیٰ اس دل والے کے بارے میں محرومی کا فیصلہ فرما دیتے ہیں۔ہم نے بارہا اس کا تجربہ کیا ہے کہ جب کوئی بندہ کسی برے راستے کو اختیار کرتے ہوئے اس پر مسلسل چلنے پر اصرار کرتا ہے اور برائی کی کسی سطح پر بھی رکنے کا نام نہیں لیتا تو پھر اس کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ خیر وشر کے تصور سے بھی محروم ہو جاتا ہے بلکہ جو باتیں کبھی اس کو اچھی معلوم ہوتی تھیں' وہ بھی اسے بری لگنے لگتی ہیں۔ اقبال نے ایک دوسرے حوالے سے شاید اسی کا ذکر کیا ہے:

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

کہ غلامی میں بدل جاتے ہیں قوموں کے ضمیر

ضمیر سے مراد یہی دل ہے' جو قبولیت کی استعداد سے محروم ہو جاتا ہے چنانچہ ایسے آدمی کو اگر کبھی سمجھانے کی کوشش کی جائے تو سمجھانے والا صاف محسوس کرتا ہے کہ میں شاید کسی دیوار سے سر پھوڑ رہا ہوں' سننے والے کو پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ مجھے کیا کہا جا رہا ہے بلکہ بعض دفعہ وہ سمجھانے والے کو دیوانہ اور پاگل سمجھتا ہے آدمی حیران ہوتا ہے کہ یہ شخص دانا و بینا ہوتے ہوئے بھی' آخر اتنی سیدھی بات کو کیوں نہیں سمجھ پا رہا؟ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ اللہ کے اس قانون کی زد میں آ کر قبولیت حق کی استعداد سے محروم ہو چکا ہے۔

اس بات کو سمجھنے کیلئے میں ایک چھوٹا سا لطیفہ عرض کرتا ہوں کہ کوئی صاحب اپنی گاڑی میں ایک بستی سے گزر رہے تھے' نماز کا وقت تھا' مسجد قریب آئی' ڈرائیور نمازی تھا' اس نے اپنے صاحب سے عرض کیا کہ صاحب اگر اجازت ہو تو میں مسجد میں جا کر نماز پڑھ لوں؟ اس کے صاحب نے ناگواری سے کہا کہ جاؤ' جلدی آؤ۔اس نے نماز میں دیر لگا دی یا شاید اس کو محسوس ہوا' اس لئے باہر گاڑی سے اس نے چیختے ہوئے کہا کہ ارے تجھے کس نے اندر پکڑ رکھا ہے' تم باہر کیوں نہیں آتے؟ تو اس نے اندر سے جواب دیا کہ صاحب مجھے اسی نے پکڑ رکھا ہے' جس نے باہر آپ کو پکڑ رکھا ہے۔

آیت:۴۲ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ط فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ج وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا ط وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ O ''یہ لوگ جھوٹ کے رسیا اور پرلے درجے کے حرام خور ہیں۔اگر یہ تمہارے پاس آئیں تو تمہیں اختیار ہے' خواہ ان کے معاملے کا فیصلہ کر دیا ان کو ٹال دو اور اگر تم ان کو ٹال دو گے تو یہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اگر تم فیصلہ کرو تو ان کے درمیان قانون عدل کے مطابق فیصلہ کرو' اللہ قانون عدل پر عمل کرنے والوں ہی کو دوست رکھتا ہے''۔

جھوٹ اور رشوت کی تباہ کاریاں

منافقین اور یہود کی سیرت و کردار اور طور اطوار کی مذمت کرنے کے بعد اور ان کے رہنماؤں کی سازشوں سے پردہ اٹھانے کے بعد اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روئے سخن آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی طرف پھیرا جا رہا ہے اور یہ توجہ دلائی جا رہی ہے کہ یہ اہل کتاب جو کبھی حاملِ دعوت امت رہ چکے ہیں

Marfat.com

یہ تو اپنے زوال کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ اسلئے مسلمانو تم پر جو قیامت تک اس عظیم منصب کی ذمہ داریاں ڈالی جا رہی ہیں تمہیں اس امت کے خدوخال کو بھی طرح پہچان کر اپنے بارے میں ہمیشہ محتاط رہنا ہوگا۔ اس لئے ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں کہ یہ جو اپنے منصبی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے نااہل ثابت ہوئے ہیں تو بہت ساری خرابیوں کے ساتھ ساتھ ان میں دو بنیادی برائیاں پائی جاتی ہیں۔ ارشاد فرمایا:

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ﴿یہ لوگ جھوٹ کے رسیا اور پرلے درجے کے حرام خور ہیں﴾

''اَکّٰال'' اسم مبالغہ ہے۔ اس کا معنی ہے ''بہت کھانے والا'' اور ''سُحْتِ'' کہتے ہیں ''حرام کمائی'' کو۔ لیکن امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہاں ''سُحْتِ'' سے مراد ''رشوت'' ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ انسان کے انفرادی کردار کی سب سے بڑی بنیاد سچائی ہے۔ جھوٹ اس بنیاد کو اکھاڑ دینے والی چیز ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ سے جب پوچھا گیا تھا کہ حضور ﷺ کیا ایک مسلمان چور ہوسکتا ہے، ڈاکو ہوسکتا ہے، زانی ہوسکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا ہوسکتا ہے یعنی یہ برائیاں اندیشہ ہے کہ مسلمانوں میں پیدا ہوجائیں۔ لیکن جب پوچھا گیا کہ کیا مسلمان جھوٹ بھی بول سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا مسلمان کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ یہ اہل کتاب جب دینی اعتبار سے اپنے زوال کی انتہا کو پہنچے تو جھوٹ ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا، جس نے ان کی اخلاقی زندگی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں سب سے اہم رول ادا کیا۔

اسی طرح انسان کی اجتماعی زندگی کی استواری اور ہمواری کیلئے جو چیز انتہائی ناگزیر ہے، وہ ہر سطح پر اور ہر لحاظ سے کسب حلال ہے اور اس میں سب سے اہم چیز رشوت سے بچنا ہے لیکن جب کسی قوم کو زوال آ گھیرتا ہے، پھر وہ آہستہ آہستہ رزقِ حلال سے محروم ہوتی جاتی ہے اور حرام کے سارے دروازے اس پر کھلتے جاتے ہیں اور آخری وہ چیز، جو اس کی اجتماعی زندگی کو مکمل طور پر تباہ کردیتی ہے، وہ اس کے اجتماعی اداروں میں ہر سطح پر رشوت کا داخل ہوجانا ہے۔ مسلمانوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ اہل کتاب اور منافقین جھوٹ کے رسیا بن کر انفرادی زندگی میں ہر طرح کے اخلاق سے عاری ہوگئے اور اجتماعی اداروں میں رشوت کے بازار گرم ہونے کی وجہ سے، اجتماعی اخلاق سے محروم ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق سے تعلق تو ٹوٹا ہی تھا، حقوق کی بازیابی کیلئے آخری سہارا ادارے اور عدالتیں ہوتی ہیں، وہ رشوت کی نذر ہوکر، اپنا اصل کردار ادا کرنے سے معطل ہوکر رہ گئیں۔ مسلمانوں سے یہی بات اس سورۃ کے آغاز میں کہی گئی:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ (المائدۃ 8:5)

اے مسلمانو! تمہاری منصبی ذمہ داری کا تقاضہ یہ ہے کہ تم دو ذمہ داریاں ادا کرو۔ ایک یہ کہ حق کی بےلاگ شہادت دینے والے بنو اور دوسرا یہ کہ قانون عدل وقسط کے مطابق بےلاگ فیصلہ کرنے والے تم میں موجود ہونے چاہئیں۔

یہ دونوں چیزیں، نظام حق وانصاف اور قیام عدل وقسط کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اور جھوٹ اور رشوت، ان دونوں کیلئے سمِ قاتل ہیں اور اس پورے نظام کو تباہ کردینے والی ہیں۔ شاید اسی لئے عربی زبان میں ''سُحْتِ''، جو رشوت کیلئے استعمال ہوتا ہے، حقیقت میں اس کا معنی ''استیصال کردینا'' ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے: ''فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ'' کہ اللہ تمہیں عذاب کے ذریعے جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔ اس کا مطلب یہ کہ رشوت وہ لعنت ہے، جو انسانی تہذیب وتمدن اور اجتماعیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔ کسی بھی معاشرے میں یہ رشوت کی چاٹ، جب اداروں کو لگ جاتی ہے تو پھر اس معاشرے کو تباہی سے بچانا بہت مشکل ہوجاتا ہے اور مسلمان جس عظیم منصب پر فائز کئے گئے ہیں، اس میں ظاہر ہے یہ جھوٹ اور رشوت اگر عام ہوجائے تو پھر مسلمانوں کو اس تباہی سے کون بچا سکتا ہے۔

Marfat.com

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارا پورا معاشرہ سر سے پاؤں تک اس لعنت میں ڈوب چکا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ دفاتر تباہ ہو گئے ہیں' احتسابی ادارے اپنا وقار کھو بیٹھے' عدالتیں رسوا ہو گئیں' حتی کہ ایوان ہائے حکومت میں کہانیاں بننے اور پھیلنے لگیں۔ امت کے راہنما' اپنا دامن ناگفتنیات سے بچا نہ سکے۔ جرائم پیشہ لوگوں کی چاندی ہو گئی' جان' مال' عزت و آبرو' ہر چیز معرض خطر میں ہے۔ ایک قاتل بڑے اطمینان سے انسان کی جان لیتا ہے اور جانتا ہے کہ قانون میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس لئے کہ ایف آئی آر سے لے کر سپریم کورٹ کے فیصلے تک' ہر جگہ رشوت کی ہم آہنگی ہے تو انصاف کیسے ملے اور جرائم کیسے ختم ہوں اور انسانیت کے آنسو کیسے پونچھے جائیں۔ چنانچہ مسلمانوں کو وارننگ دی جا رہی ہے کہ دیکھنا تم ان منافقین اور یہود جیسا رویہ اختیار نہ کرنا۔

ان کی ان تمام برائیوں کے باوجود آنحضرت ﷺ سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے:

فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا ۭ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○

اگر یہ تمہارے پاس آئیں تو تمہیں اختیار ہے' خواہ ان کے معاملے کا فیصلہ کرو یا ان کو ٹال دو اور اگر تم ان کو ٹال دو گے تو یہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اگر تم فیصلہ کرو تو ان کے درمیان قانون عدل کے مطابق فیصلہ کرو' اللہ قانون عدل پر عمل کرنے والوں ہی کو دوست رکھتا ہے۔

یعنی یہ یہود اور منافقین اپنی خباثتوں سے باز نہیں آئیں گے۔ اس لئے کبھی اگر آپ کی عدالتوں میں یہ فیصلہ لینے کیلئے آ جائیں تو آپ کو کوئی مجبوری نہیں کہ آپ ضرور ان کے مقدمات کو لیں بلکہ اگر آپ ان کے کرتوتوں کی وجہ سے انہیں سننا پسند نہ فرمائیں تو آپ کی اپنی مرضی ہے۔ ممکن ہے یہ بعض ایسے مقدمات آپ کے پاس بھیجیں' جن میں اسلامی قانون میں سزائیں سخت رکھی گئی ہوں اور ان کا مقصود یہ ہو کہ اس طرح آپ کو بدنام کیا جائے اور یا اگر آپ مقدمہ لینے سے ہی انکار کریں تو پھر آپ کی بے رخی کا ڈھنڈورا پیٹ کر آپ کے اخلاق میں کیڑے ڈالے جائیں۔ کوئی سی صورتِ حال بھی ہو یہ آپ کو کوئی بھی نقصان پہنچانے کا ارادہ کریں تو آپ کو اطمینان رکھنا چاہئے کہ یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ البتہ! یہ بات ضرور ہے کہ اگر آپ اپنی عدالت میں ان کا مقدمہ لے لیں تو ان کے رویے اور ان کی کرتوتوں سے متاثر ہو کر آپ اپنے فیصلے کو سرِ مو انصاف سے ہٹنے نہ دیں' بلکہ آپ کا ہر فیصلہ آپ کے انصاف کا منہ بولتا ثبوت ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جس قوم کو نوازتا ہے' وہ نسبتوں کی وجہ سے نہیں نوازتا' بلکہ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ عدل وقسط کے حوالے سے اور سیرت و کردار کے تناظر میں اس قوم کا کردار کیا ہے۔ اب چونکہ امت مسلمہ ہی کو دنیا کی قیادت و امامت کرنی ہے' اس لئے اس امت کو حق کی بے لاگ شہادت بھی دینی ہے اور قانون عدل وقسط کے مطابق بے لاگ فیصلے بھی کرنے ہیں۔

یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس امت سے گویا عہد لیا جا رہا ہے کہ دیکھنا عدل وقسط کی کبھی مخالفت نہ ہونے دینا۔ چنانچہ قرونِ اولیٰ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان عدالتیں اور خلافتِ راشدہ میں تو مسلمان حکومتیں بھی' اپنے اس عہد کی پابندی پر نہ صرف یہ کہ قائم رہیں بلکہ انہوں نے تاریخ کیلئے ایسی مثالیں چھوڑی ہیں' جو ہمیشہ تابندہ رہیں گی۔ لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ کیا یہی مسلمان ہیں کہ جنہوں نے تاریخ بنائی تھی' آج تاریخ میں گالی بنتے جا رہے ہیں۔

کبھی ان نوجوانوں نے رخِ ہستی سنوارا تھا
مگر آج ان کی اپنی شکل پہچانی نہیں جاتی

آیت: ۴۳ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰٓئِكَ

Marfat.com

بِالْمُؤْمِنِیْنَ O ''اور یہ تمہیں ''حَکَم'' کس طرح بناتے ہیں؟ جب کہ تورات ان کے پاس موجود ہے' جس میں اللہ کا حکم موجود ہے۔ پھر ''حَکَم'' بنانے کے بعد برگشتہ ہوجاتے ہیں' یہ ہرگز باایمان لوگ نہیں''۔

ایک قاری جب ان آیات کو پڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچتا ہے تو اسے حیرت ہونے لگتی ہے کہ جب ان کے پاس خود اللہ کی کتاب' تورات موجود ہے اور پھر اس میں اللہ کا حکم بھی موجود ہے' یعنی اس مقدمہ کے بارے میں جو اس وقت ان کے سامنے ہے تو پھر یہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں کیوں آنا چاہتے ہیں اور پھر مزید تعجب اس بات پر ہے کہ جب آپ کو حَکَم بنالیتے ہیں تو پھر آپ جو فیصلہ فرماتے ہیں' اس سے روگرانی کرتے ہیں یعنی اسے ماننے سے انکار کردیتے ہیں حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کا فیصلہ قانون خداوندی کے عین مطابق ہے کیونکہ جہاں تک تعزیرات کا تعلق ہے' قرآن اور تورات کے قانون تعزیرات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور پھر آنحضرت ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جب تک قرآن کریم میں کسی قضیے کے بارے میں حکم نازل نہیں ہوتا تھا' آپ تورات کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے کیونکہ جب تک قرآن تورات کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کرتا تو وہ واجب العمل ہے۔ ان سب باتوں کو جاننے کے باوجود حیرانی ہے کہ وہ آپ کو حَکَم بناتے ہیں اور پھر آپ کے فیصلے کو صحیح جانتے ہوئے بھی ماننے سے انکار کردیتے ہیں' اولاً تو حَکَم بنانا ہی تعجب خیز ہے کیونکہ وہ حضور ﷺ کو اللہ کے رسول نہیں سمجھتے ہیں اور پھر حَکَم بنانے کے بعد فیصلہ قبول نہ کرنا' جبکہ وہ تورات کے مطابق بھی ہو' یہ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ہے۔ لیکن ہمیں اس تعجب کو سمجھنے میں اس لئے دشواری نہیں ہونی چاہئے کیونکہ ہمارا اپنا رویہ اس سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے' ہم قرآن کریم کو اللہ کی کتاب سمجھتے ہیں اور اس پر ایمان لانے کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں' رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا آخری رسول جانتے ہیں' بایں ہمہ ہم کسی ایسے قرآنی فیصلے کو قبول کرنے کو تیار نہیں' جو ہماری اپنی خواہشات' رسوم ورواج یا ملکی قانون کے خلاف ہو۔ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا ہے تو ہم قرآنِ کریم کو تراویح میں بھی سنتے ہیں اور شبینہ میں بھی' پھر اس کو شوق وذوق سے پڑھتے بھی ہیں۔ کوئی مرجاتا ہے تو اس کو پڑھ پڑھ کر بخشتے ہیں' لیکن اسے اپنی عدالتوں اور اپنے ایوان ہائے حکومت سے دور رکھنے پر اصرار کرتے ہیں تو جن لوگوں کا یہ رویہ ہو انہیں اہل کتاب کے اس رویے کو سمجھنے میں کیا دشواری ہوسکتی ہے۔ ہم شاید خود تو اسے قبول نہ کریں' لیکن قرآن کریم نے اس اصل بیماری کا نام دے دیا ہے' جس میں اہل کتاب بھی مبتلا تھے اور ہم بھی مبتلا ہیں۔ وہ بیماری ہے ''وَمَا اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ'' یہ اس لئے آپ کے فیصلوں کو قبول کرنے سے انکاری ہیں کہ یہ تورات پر ایمان نہیں رکھتے۔ ایمان کا دعویٰ ضرور ہے' لیکن حقیقی ایمان سے یہ محروم ہیں۔ یہ باتیں چونکہ امت مسلمہ کو سنائی جارہی ہیں' اس لئے یہ بات بے حد ضروری ہے کہ ہم بھی اپنے رویوں پر نظرثانی کریں اور یہ سوچنے کی کوشش کریں کہ کیا ہم بھی اسی صورت حال سے دوچار تو نہیں۔

تیری ہر ادا میں بل ہے' تیری ہر نگاہ میں الجھن
میری آرزو میں لیکن' نہ پیچ ہے نہ خم ہے

تمہید:

اس سے پہلے کے رکوع میں ہم بنی اسرائیل کے حوالے سے' جو مسلمانوں سے پہلے حامل دعوت امت تھی' ان کی کوتاہیوں' نافرمانیوں' خیانتوں' بلکہ سرکشیوں کی تاریخ پڑھ چکے ہیں' جس میں سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل جس صورت حال کو پہنچ چکے ہیں' اس کی سب سے بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اللہ کی کتابوں یعنی اس کے قانون اور آئین کے بارے میں ایسا رویہ اختیار کیا' جو اس رویے سے بالکل مختلف تھا' جس کا ان سے عہد و پیمان لیا گیا تھا اور وہ بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گئے کہ اللہ کے قانون کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ کرنا تو دور کی بات رہی' اس میں انہوں

Marfat.com

نے تحریف کی۔ جا بجا اس کے محمل سے اسے ہٹایا۔ حتیٰ کہ اللہ کے قانون سے ان کو ایک چڑ سی پیدا ہوگئی' جس نے ان کو سرکشی تک پہنچا دیا۔

بنی اسرائیل کا یہ رویہ' بگڑی ہوئی امتوں کی تاریخ میں کوئی نیا رویہ نہیں بلکہ اسی کا تتمہ اور بگاڑ کی تکمیلی شکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ پہلی امتیں بھی نہ صرف اس صورت حال سے دوچار رہوئی ہیں بلکہ اللہ کے عذاب کا شکار بھی ہوئی ہیں۔ ان کی تاریخ اگرچہ ناپید نہیں' لیکن غیر محفوظ ضرور ہے۔ اس کے صرف وہ گوشے محفوظ ہیں' جنہیں قرآن پاک نے محفوظ کرلیا۔ لیکن اس بگاڑ کا مکمل ریکارڈ' جسے تاریخ کہا جاسکتا ہے اور اس کی اصلاح کی کوششوں کا بھی مکمل ریکارڈ جسے انبیاء کی سند حاصل تھی' اس سے ہم باقاعدہ طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے آگاہ ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ کے قانون کے ساتھ انسانی بگاڑ کا رویہ جو سرکشی تک پہنچ گیا' اس کی تاریخ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور سے نمایاں طور پر شروع ہوتی ہے' جو مختلف ادوار سے ہوتی ہوئی' عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک پہنچی ہے' جس میں اس جلیل القدر پیغمبر کی کاوشیں بھی ایک جزوی اصلاح کی حیثیت سے تاریخ کا حصہ ہیں۔ لیکن اہل کتاب کا رویہ اپنی سرکشی اور تمرد کے لحاظ سے مسلسل آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بالآخر یہ کشمکش آنحضرت ﷺ کی بعثت مبارکہ سے اپنے منطقی انجام کو پہنچتی ہے اور ایک عہد آفریں انقلاب کی شکل میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ اسی امانت کی امین اور اسی کی ذمہ داریوں سے گراں بار یہ امت محمدیہ ہے' جسے آج ہم حالات کے تھپیڑے کھاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ اس لئے اس امت کو اس رکوع میں اس تاریخ کے بنیادی سبب سے ایک نہایت احسن ترتیب کے ساتھ آگاہ کیا جارہا ہے تاکہ امت اپنے سے پہلے حامل دعوت امت کی معزولی اور ناکامی کے اسباب کو سمجھ سکے اور ان سے عبرت پکڑتے ہوئے اپنی اصلاح کیلئے آمادہ ہوسکے۔

آیت:۴۴ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ ''ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور تھا' فیصلہ کرتے تھے اسی تورات کے مطابق وہ نبی' جو خود اس کے فرمانبردار تھے یہودی بن جانے والوں کے معاملات کا اور اسی طرح علمائے حقانی اور فقہاء بھی (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے)' کیونکہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے کہ تم لوگوں سے مت ڈرو اور صرف مجھی سے ڈرو اور میرے احکام کو دنیا کی متاع حقیر کے عوض مت بیچو۔ جو بھی اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی لوگ تو کافر ہیں''۔

تورات علم وہدایت کا سرچشمہ تھی

ارشاد فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ج ﴿ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور تھا﴾

بنی اسرائیل کے حالات کو دیکھتے ہوئے' آدمی یہ گمان کرتا ہے کہ بنی اسرائیل جس صورت حال تک پہنچے اور اپنے بگاڑ کی جس انتہا کو انہوں نے چھوا ہے' اس کا شاید سبب یہ تھا کہ ان پر جو کتاب اتاری گئی تھی' اس میں ان کی زندگی کی ضرورتوں کی رہنمائی کیلئے شاید مکمل سامان نہیں تھا۔ وہ ایسی کتاب ہوگی کہ جس کو لذت اندوزی کیلئے شاید پڑھا جاتا ہوگا' لیکن زندگی کے تلخ حقائق سے اسے شاید کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ دنیا میں ہر زبان میں لٹریچر کی بہت ساری ایسی کتابیں ہیں' جو صرف دفع الوقتی یا لذت طلبی کیلئے پڑھی جاتی ہیں یا ان سے کسی تقریب میں مجلس آرائی کا کام لیا جاتا ہے' لیکن زندگی کے تلخ حقائق میں ان سے کبھی راہنمائی نہیں لی جاتی' کیونکہ اس کا سروسامان وہ اپنے اندر نہیں رکھتیں۔ اس لئے اس آیت کریمہ میں بتایا جارہا ہے کہ تم چاہے کتنا

Marfat.com

ہی تعجب کرو' لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ بنی اسرائیل پر جو کتاب تورات کے نام سے اتاری گئی' اس میں انسانی راہنمائی کیلئے پورا سامان موجود تھا۔ زندگی گزارنے کیلئے دوطرح کی راہنمائی انسان کو مطلوب ہوتی ہے۔ ایک فکری راہنمائی اور دوسری قانونی راہنمائی۔ فکری راہنمائی سے ذہنی الجھنوں کا علاج ہوتا ہے اور دل کے ناآسودہ تصورات اطمینان پاتے ہیں۔ فکری الجھنوں کے ہزاروں رنگ ہیں' جو دل کی بے اطمینانی پر منتج ہوتے ہیں۔ اس کیلئے ضرورت ہوتی ہے کہ فکروخیال کی ایسی روشنی قلب و دماغ کو میسر آئے' جس سے ایک ایک الجھن کا علاج ہوتا رہے اور آدمی فکری گتھیوں سے نجات پا سکے۔ ہر دور میں انسانی زندگی اور اس کے خالق کے بارے میں' کائنات سے اس کے تعلق کے بارے میں' اس کے آغاز اور اس کے انجام کے بارے میں اور اس کے مقاصد اور اہداف کے بارے میں' ہمیشہ نئے نئے خیالات' نئی نئی تھیوریاں' سامنے آتی رہی ہیں۔ اگر ان کا کوئی متعین حل تجویز نہ کیا جائے تو انسانی قلب و دماغ کو پراگندہ ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ جس کے نتیجے میں زندگی کی کوئی جہت اور کوئی سمت سفر متعین کرنا ممکن نہیں رہتا۔ ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے لئے کوئی ایسی روشنی میسر آئے' جس سے آدمی ان تمام اندھیروں میں اصل منزل کا سراغ پا سکے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اسی فکری راہنمائی کیلئے ہم نے تورات کو نور بنا کر بھیجا' یعنی اس میں وہ روشنی موجود تھی' جسکی معاونت سے فکری آسودگی حاصل کی جا سکتی تھی۔ لیکن ان دل و دماغ کے اندھوں نے ہمیشہ اس سے روگردانی کی' اس سے روشنی حاصل کرنے کے بجائے' ہمیشہ اندھیروں میں بھٹکتے رہے۔

انسانی زندگی کی دوسری ضرورت آئین اور قانون ہے' جس سے انسانی اعمال کی حدود متعین ہوتی ہیں۔ اچھائی برائی کے معیارات متعین ہوتے ہیں۔ آدمی حیوانوں کی طرح جنگل کا باسی اور اندھیروں کا مسافر نہیں بلکہ وہ آبادیوں میں رہنے والا' انسانی معاشرے کا فرد اور اپنے حقوق و فرائض کا احساس رکھنے والا ہے اور یہ دولت اسے ہمیشہ ایک متعین آئین کی شکل اور انسانی راہنمائی کی تحریک کی شکل میں میسر آتی ہے۔ کسی قوم کو اگر یہ دولت نصیب نہیں ہوتی تو اس کی نہ کوئی تہذیب ہوتی ہے' نہ تمدن۔ حتیٰ کہ وہ آداب زندگی تک سے تہی دامن رہتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اس دولت سے محروم نہیں رکھا بلکہ اس کو جو کتاب عطا کی گئی اس کے بارے میں فرمایا کہ اس میں ہدایت تھی یعنی وہ ہر لحاظ سے ایک راہنما تھی' جس میں آئینی اور قانونی ضرورتیں پوری کرنے کی صلاحیت تھی اور وہ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کیلئے ایک مکمل رہنما تھی۔

قرآن میں لفظ ہدایت کے استعمال

جہاں تک لفظ ''ہدایت'' کا تعلق ہے' قرآن کریم اس کو مختلف معانی میں استعمال کرتا ہے اور تورات ان سب معانی کے اعتبار سے' ایک واقعی ہدایت تھی۔ قرآن کریم نے ''ہدایت'' کا لفظ ایک تو صراط مستقیم کیلئے استعمال کیا۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ O (الحج 22:67)

یہاں ہدایت صراط اور راستے کے معنی میں ہے کہ ''آپ صراط مستقیم پر ہیں''۔ کبھی اسے فعل ہدایت کے معنی میں استعمال فرمایا مثلاً

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ (البقرۃ:272) ﴿ان کو ہدایت دینا آپ کی ذمہ داری نہیں۔﴾

یعنی زبردستی بالفعل ان کو ہدایت کے راستے پر ڈال دینا یا ہدایت یافتہ بنا دینا' یہ آپ کا کام نہیں ہے۔ کبھی اسے نشانِ راہ کے مفہوم میں قرآنِ کریم نے استعمال کیا۔ جیسے سڑکوں پر سنگِ میل ہوتے ہیں' جو راہ کے نشان کے طور پر منزل کی خبر دیتے ہیں۔ اسی طرح حیاتِ انسانی کے سفر پر اللہ کی کتابیں بار بار آدمی کو راہنمائی مہیا کرتی ہیں' تا کہ وہ منزل تک پہنچ سکے۔ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے

Marfat.com

رات کی تاریکی میں دور سے ایک آگ جلتی ہوئی دیکھی تو آپ نے اپنے اہلِ خانہ سے فرمایا کہ آپ یہاں ٹھہریں' میں وہاں جا کر دیکھتا ہوں' ہوسکتا ہے کہ میں وہاں سے تمہارے تاپنے کیلئے آگ لے آؤں۔

اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى O ﴿یا ہوسکتا ہے میں اس آگ پر کوئی نشان راہ پالوں﴾ (طٰہٰ 20:10)

جس سے ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ کبھی قرآن کریم نے ''ھُدًی'' کے لفظ کو قلبی نور و بصیرت کے معنی میں استعمال کیا یعنی آدمی بعض دفعہ کسی اقدام کا ذہنی طور پر فیصلہ کر لیتا ہے' لیکن دل اس سے مطمئن نہیں ہوتا۔ طبیعت اس پر یکسو نہیں ہوتی یا آدمی اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو جاتا ہے۔ فرمایا یہ تورات اپنے اندر دلوں کا اطمینان اور بصیرت کا سامان بھی رکھتی ہے۔ اصحاب کہف کے بارے میں اسی معنی میں اس لفظ کو استعمال کیا گیا۔ فرمایا:

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى O (الکھف: 13)

وہ چند نوجوان لڑکے تھے' جو اپنے رب پر ایمان لے آئے' لیکن آنے والے خطرات سے گھائل ہو رہے تھے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ وہ اس ہولناک صورتحال سے کیسے نکل سکتے ہیں۔ حکومت ان کی گرفتاری کیلئے برابر تعاقب کر رہی تھی۔ کافر معاشرہ' ان کو نگل جانا چاہتا تھا۔ ایسی صورت حال میں فرمایا جا رہا ہے کہ ﴿ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا یعنی انہیں دل کا اطمینان اور بصیرت عطا فرمائی۔﴾

اندازہ فرمایئے! جس کتاب کی یہ شان ہے کہ وہ نور بھی ہے اور ہدایت بھی (ان تفصیلات سمیت جو میں نے عرض کی ہیں)' لیکن بنی اسرائیل کا پھر بھی اس سے فائدہ نہ اٹھانا' یہ ان کی اپنی بدنصیبی اور محرومی ہے ورنہ اللہ کی طرف سے کرم فرمائی میں کوئی کمی نہ تھی۔ بات یہ نہیں تھی کہ انہیں راہنمائی میسر نہ تھی۔ بات یہ تھی کہ وہ راہنمائی قبول کرنے کو تیار نہ تھے

ے موسم اچھا پانی وافر مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دھقان

یہود کے تورات سے فائدہ نہ اٹھا پانے کے تین بنیادی اسباب اور ہم

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ج

﴿فیصلہ کرتے تھے اسی تورات کے مطابق وہ نبی' جو خود اس کے فرمانبردار تھے یہودی بن جانے والوں کے معاملات کا اور اسی طرح علمائے حقانی اور فقہاء بھی (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے۔﴾

آیت کریمہ کے اس حصہ میں تین باتیں ارشاد فرمائی گئیں اور یہ تین وہ بنیادی اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہود اپنے پاس تورات رکھتے ہوئے بھی اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔

1- سب سے پہلی وجہ یہ کہ انہوں نے اس بات کو سمجھنے سے انکار کر دیا یا سمجھ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ تورات کی اصل حیثیت ان کی زندگی میں ہے۔ انہوں نے اس کتاب کو صرف تبرک جانا' اسلئے اس سے محض برکت کے حصول کی خاطر' وہ ہمیشہ اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ ثواب کی نیت

Marfat.com

پڑھتے اور بیماریاں دور کرنے کیلئے اس سے فائدہ اٹھاتے۔ لیکن جہاں تک اس کی اصل حیثیت کا تعلق تھا' اس کو کبھی قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اس آیت کے اس پہلے لفظ میں اس کی حیثیت کا تعین کیا گیا کہ اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اور زندگی کے تمام حقائق میں' تہذیبی اور تمدنی ضرورتوں میں' آئینی اور قانونی مسائل میں' علمی اور عملی گتھیوں میں' غرضیکہ زندگی کے تمام مراحل میں' وہ ایک حاکمانہ حیثیت کی مالک ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ تم اس کے سامنے اپنے مسائل رکھو۔ وہ تمہارے مسائل کا فیصلہ کرے۔ یعنی تم اس کی راہنمائی میں مسائل کا فیصلہ کرو۔ وہ مسائل چاہے معاشی ہوں' چاہے معاشرتی' چاہے انفرادی ہوں' چاہے اجتماعی' چاہے وہ قومی ہوں' چاہے بین الاقوامی' ہر صورت میں اس کتاب کی طرف رجوع کرنا' یہ اس کتاب کی بنیادی حیثیت کا تقاضہ ہے۔ لیکن یہود نے تورات کی اس حیثیت کو ماننے سے ہمیشہ انکار کیا۔ وہ اس کا احترام بجالاتے' اس کو اللہ کی کتاب جانتے' اس کو چوم کر خوبصورت جزدانوں میں لپیٹ کر ایک اونچے طاقچے میں سجا دیتے تھے' تاکہ اس کی بے ادبی نہ ہونے پائے۔ رہا زندگی کا سفر' اس کا دھارا ہمیشہ اس سے دور بہتا تھا۔ اس پر نفس کی حکمرانی تھی یا طاغوت اور شیطان کی حاکمیت تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کس طرح ممکن تھا کہ ان کی زندگی میں اس (تورات) سے تاثر کی چھاپ بھی ہوتی۔

-2 دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ جو نبی اس کتاب کے مناد اور مبلغ رہے یا جن پر اللہ کی کتابیں نازل ہوتی رہیں' ان کی حیثیت یہ نہ تھی کہ وہ خود مستقل بالذات مرجع ہدایت ہوتے بلکہ وہ نبی ہوتے ہوئے بھی اسی کتاب تورات کی پیروی کرتے' اسی کی فرمانبرداری بجالاتے تھے۔ یہ بات بطور خاص شاید اس لئے کہی جارہی ہے کہ انسانوں کی فطرت یہ رہی ہے کہ وہ جب کسی کو نبی بلکہ ولی مان لیتے ہیں تو پھر ان کی ذات سے ان کا ایسا تعلق قائم ہو جاتا ہے کہ وہ انہی کو مستقل بالذات مرجعِ ہدایت سمجھتے ہیں۔ صحیح غلط' حلال حرام اور اچھائی برائی کی سند اور اتھارٹی' ان کے یہاں صرف ان کی ذات ہوتی ہے۔ وہ ان کی عقیدت میں اللہ کی پوری شریعت کو بعض دفعہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں سے اپنے ملک کے مختلف حصوں میں اس کے مظاہر دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ والوں نے تو ہمیشہ شریعت کی پابندی کی بھی اور کروائی بھی' لیکن عام طور پر مریدوں نے تو اپنے پیروں کو ہی سب کچھ سمجھنے کی کوشش کی۔ دنیا دار پیر' ہمیشہ اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے رہے اور جن اللہ والوں نے اس روش کو روکنا چاہا' عام طور پر خلق خدا کا رجوع ان کی طرف نہیں رہا۔

؎ اللہ کے کچھ بندے معبود ہی بن بیٹھے
لوگوں میں نظر آئی جو خوئے جبیں سائی

اس فطری کمزوری کا عالم تو یہ ہے کہ ہم بعض دفعہ بڑے بڑے بزرگوں کو بھی اسی پیمانے سے جانچتے ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پیرو مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص حاضر ہوا اور تقریباً آٹھ سال تک وہاں مقیم رہا۔ شیخ نے اس سے کبھی نہیں پوچھا کہ تم کس مقصد سے آئے ہو۔ آٹھ سال کے بعد اس نے واپسی کا ارادہ کیا تو اجازت طلبی کیلئے حاضر ہوا۔ تب شیخ نے پوچھا کہ بھئی! تم کیسے آئے تھے اور واپس کیوں جارہے ہو؟ اس نے کہا حضرت آپ کی بزرگی کی شہرت سن کر آیا تھا' لیکن میں نے اتنے سالوں تک آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ اب مایوس ہو کر واپس جارہا ہوں۔ حضرت فرمانے لگے کہ بھئی! ہمارے پاس ایسی کرامتیں کہاں' البتہ ایک بات بتاؤ کہ تم نے اتنے سالوں میں ہمارا کوئی کام خلافِ سنت بھی دیکھا؟ اس نے کہا کہ نہیں! ایسا تو نہیں دیکھا۔ شیخ نے فرمایا یہی سب سے بڑی کرامت ہے۔

اس سے آپ اندازہ کیجئے کہ وہ صاحب سنت کے متلاشی نہیں تھے بلکہ وہ تو خواجہ صاحب کو عقیدت کا مرکز جان کر انہی کی ذات میں سب کچھ دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے یہاں فرمایا جارہا ہے کہ تورات کی عظمت کا اس سے اندازہ کرو کہ وقت کے نبی بھی' اسی سے فیصلہ کرتے تھے اور خود بھی' اسی کے فرمانبردار تھے اور علمائے حقانی اور فقہا اور قضاۃ بھی' اسی تورات سے فیصلے کیا کرتے تھے۔ یعنی بنی اسرائیل کے اکابر اور اسلاف میں' جن لوگوں نے صحیح معنی

Marfat.com

میں تورات سے فائدہ اٹھایا' وہ چاہے نبی ہوں اور چاہے علما اور ماہرین قانون اور عدالتوں کے جج' سب کیلئے راہنما کتاب یہی تھی۔ لیکن بنی اسرائیل نے اس سے یہی ایک کام ہے' جو کبھی لینے کی زحمت نہ کی۔

3- تیسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ سلف صالحین تورات سے اس لئے ہمیشہ وابستہ رہے کہ انہیں ہمیشہ اس بات کا احساس رہا اور اسی احساس نے ہمیشہ ان کو بھٹکنے سے روکا بلکہ کتاب اللہ سے جذباتی تعلق' ان کا قائم رکھا۔ کہ وہ جانتے تھے کہ وہ اللہ کی کتاب کے محافظ بنائے گئے ہیں اور اس پر گواہ ٹھہرائے گئے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ کی کتاب کی حفاظت' اس کے سوا تو ممکن نہیں ہے کہ وہ جس طرح گھروں میں پڑھی جائے' اسی طرح تعلیمی اداروں میں سکھائی جائے' اسی طرح اس کا دیا ہوا قانون عدالتوں میں عدل وانصاف لینے کا ذریعہ بنے اور ایوان ہائے حکومت میں اسی کی آئینی حیثیت ہو اور پورے معاشرے پر اس کی ایسی گرفت ہو کہ زندگی میں راہنمائی کیلئے کسی اور طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا جائے۔ اسی کا علم' عزت اور ترقی کا زینہ ہو۔ اسی میں مہارت' علمی وجاہت کی آئینہ دار سمجھی جائے۔ دنیا بھر کے علوم سے انتہا درجے کا شغف رہے' لیکن اس کے حسن وقبح کا معیار اور کسوٹی' یہی کتاب ہو۔ اسی طرح اسکی شہادت بھی بجز اسکے ممکن نہیں کہ جس طرح یہ کتاب منبر ومحراب سے بولتی ہوئی سنائی دے' اسی طرح ہمارے تمام اجتماعی ادارے اسی کے مطابق وجود میں آئیں اور اسی کے مطابق عمل پیرا ہوں ہمارا نظام مالیات' ہمارا نظام تعلیم' ہمارا نظام عدالت' ہمارے تہذیب وتمدن کے مظاہر' حتیٰ کہ ہمارے ایوان ہائے حکومت اسی کے آئینہ دار ہوں نیز ہمارے علمی مذاکرات اور اسی حوالے سے منعقد ہونے والی ورکشاپس اور سیمینار' اسکی سچائی' علمی بلندی اور عملی گرفت کی منہ بولتی تصویر ہوں۔ ہر چھوٹا بڑا عالم اسی اعتماد سے سرشار ہو اور اس کے اثرات عوام تک میں نظر آئیں کہ جب بھی کبھی کسی حقیقت کا سامنا ہو تو ہر آدمی پورے اعتماد سے یہ بات کہے کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ ہمارے ان تمام چھوٹے بڑے مسائل کا حل اور ہمارے مشکلات سے نکلنے کا راستہ' اس کتاب الٰہی کے سوا اور کہیں نہیں۔

لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے' جب تک کہ ان دو باتوں کی پابندی نہ کی جائے۔

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ط

﴿تم لوگوں سے مت ڈریو اور صرف مجھی سے ڈریو اور میرے احکام کو دنیا کی متاع حقیر کے عوض مت بیچیو﴾

آیت کا یہ ٹکڑا خطاب کے صیغوں پر مشتمل ہے۔ اسلئے اسکے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب قرآن پاک نازل ہو رہا تھا' اس زمانے میں موجود یہود کو مخاطب کر کے یہ کہا جا رہا ہے کہ "دیکھو! تم اللہ سے ڈرو' لوگوں سے مت ڈرو اور میرے احکام کو دنیا کی متاع حقیر کے بدلے میں مت بیچو" مفہوم اگر لیا جائے تو ظاہر ہے' اس میں کوئی قباحت نہیں۔ اس لئے کہ ہر آنے والے رسول کی زندگی میں لوگوں کو آخر حد تک' چاہے وہ بگاڑ کی کسی انتہا تک پہنچے ہوئے ہوں' راہ راست پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہم اگرچہ مسلسل یہ بات دیکھ رہے ہیں کہ یہود میں ہدایت پانے کی صلاحیت یکسر مفقود معلوم ہے اور صدیوں سے ان کا معاملہ نافرمانی اور سرکشی کا آئینہ دار ہے' لیکن اس کے باوجود قرآن کریم انہیں راہ راست پر لانے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے۔

یا پھر دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ یہ آنحضرت کے زمانے کے یہود سے خطاب نہیں' بلکہ یہ خطاب انہی لوگوں سے ہے' جن کا تذکرہ اس سے پہلے یہود کے اکابر اور اسلاف کے حوالے سے کیا جا رہا تھا۔ اس میں انبیاء کرام بھی ہیں اور علمائے حقانی بھی اور ان کے فقہاء بھی۔ البتہ! یہ بات کھٹکتی ہے کہ اس سے پہلے غیب کے صیغوں سے بات کرتے کرتے اچانک خطاب کا اسلوب کیوں اختیار کر لیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بات کھٹکنے کی نہیں کہ قرآن کریم کا عام اسلوب جا بجا اس کی گواہی دیتا ہے۔ اس میں بہت ساری جگہوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ بات غیب میں ہو رہی ہے مگر اچانک حاضر کا اسلوب اختیار کر لیا گیا ہے یا اس کے برعکس اسلوب میں تبدیلی آگئی ہے اور اس کی جا بجا آپ کو مثالیں ملیں گی۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کہ اس تبدیلی سے

Marfat.com

ایک تو کلام میں تنوع پیدا ہوتا ہے اور دوسرا مخاطب یکسانیت سے نکل کر ایک دوسری کیفیت میں پہنچ کر ایک تازگی محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا ہے کہ یہود کے اکابر اور اسلاف کی بات کہی جارہی تھی کہ اچانک ان کو مخاطب کر کے یہ دو ہدایات دی گئیں۔ اس طرح ان کو دو ایسی رکاوٹوں سے اور موانع سے آگاہ کر دیا گیا جو زندگی کی کٹھن صداقتیں ہیں۔ ہم تاریخ کے آئینہ میں اس کے بہت سارے شواہد دیکھ سکتے ہیں کہ اچھے اچھے لوگ اور قابل ذکر قومیں زندگی کے سفر میں اس لئے ناکام ہوگئیں کہ کبھی انہیں خوف اور خشیت سے واسطہ پڑا تو اس میں استقامت نہ دکھا سکیں اور کبھی انہیں اس دنیائے فانی اور اس کی نعمتوں کا لالچ دیا گیا یا اس کے عہدہ ومنصب سے آزمایا گیا تو وہ اس آزمائش میں پوری نہ اتر سکیں۔

ہمارا سقوط بغداد کا حادثہ ان دونوں تلخ صداقتوں کا گواہ ہے۔ ہماری اپنی قریبی تاریخ جس میں ہم غلامی کی ذلت سے دوچار کئے گئے اس میں آپ برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو انہی حوادث سے دوچار ہوتا دیکھیں گے۔ واقعہ یہی ہے کہ لوگ کبھی کوڑوں سے آزمائے گئے ہیں اور کبھی اشرفیوں کے توڑوں سے۔ یعنی کبھی مصائب میں ڈال کر اور کبھی زندگی کی آسائشوں میں مبتلا کر کے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ ان دونوں آزمائشوں میں مبتلا ہونے والے لوگ ساحل مراد تک پہنچ سکے ہوں۔

چنانچہ یہود سے بھی یہی کہا گیا کہ تمہیں بار باران حوادث سے واسطہ پڑے گا۔ دیکھنا دنیا کی سرفرازیاں اور دنیا طلبی کا جوش تمہیں دین سے غافل نہ کر دے۔ اسی طرح مصائب کا ہجوم تمہیں اپنے اللہ اور آخرت سے مایوس نہ کر دے۔ تمہیں ہر حال میں اللہ کے احکام کی پابندی کرنی ہے۔ وقتی حوادث ضرور آئیں گے، لیکن اللہ اور اس کے دین سے وفاداری، یہ وہ چیز ہے جو تمہاری قومی زندگی، دنیوی اور اُخروی کامیابی کی ضمانت ہے۔

یہ باتیں صرف یہود سے ہی نہیں کہی جارہی ہیں، بلکہ اصلاً قرآن کریم میں ان کے نزول کا باعث ان کے تاریخ کے آئینہ کو ہمارے سامنے رکھ کر، ہمیں سمجھانا مقصود ہے کہ دیکھنا قیامت تک تمہیں اس منصب پر فائز کیا جارہا ہے، جس پر کبھی یہود فائز رہ چکے ہیں۔ انہی دونوں راستوں سے انہوں نے ٹھوکریں کھائی تھیں۔ تم ان دونوں راستوں پر ثابت قدم رہنا۔ تمہیں ہر سطح پر ڈرایا، دھمکایا بھی جائے گا اور تمہیں یہ باور کرانے کی کوشش بھی کی جائے گی کہ اگر تم نے اپنے دین سے تعلق نہ توڑا تو تم قصۂ ماضی بن کر رہ جاؤ گے۔ اسی طرح تمہیں سبز باغ بھی دکھائے جائیں گے اور بڑی بڑی پیشکشیں بھی ہوں گی۔ تمہاری قسمت بدلنے کے دعوے ہوں گے۔ لیکن یہ بات کبھی نہ بھولنا کہ پورا کفر اسلام کے مقابلے میں، ایک ملت ہے۔ وہ آپس میں چاہے ہزار اختلاف رکھتے ہوں، لیکن اسلام اور مسلمانوں کے مقابلے میں سب متفق اور متحد ہیں۔ اس لئے ان کی پیشکشیں، تمہاری خیر وفلاح کا باعث کبھی نہیں ہو سکتیں۔ ان کی طرف سے چھلکتے ہوئے جام دیکھ کر خوش فہمی میں مبتلا نہ ہونا بلکہ اس ساقی کو پہچاننے کی کوشش کرنا کیونکہ ہماری پوری تاریخ میں ان کی طرف سے کبھی ہمیں بھلائی کی ادنیٰ رمق بھی نصیب نہ ہو سکی۔ جہاں تک ان کے ڈرانے دھمکانے کا تعلق ہے، یقیناً وقت ان کے ساتھ ہے۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑی قوت کا سامان بھی رکھتے ہیں، لیکن اس سے بھی بڑی ایک حقیقت اور ہے، وہ یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق و مالک بھی ہے۔ اگر کمزور قومیں، اس کے سہارے اٹھنے کا فیصلہ کر لیں تو اس کے راستے پر چلنے والے مصائب کا شکار تو ہو سکتے ہیں، وقتی حوادث سے بھی دوچار ہو سکتے ہیں، لیکن آخر کار اگر اس کی اطاعت وفرمانبرداری میں استقامت کا ثبوت دے دیا جائے تو غلبہ ہمیشہ حق کا ہوتا ہے اور بڑی سے بڑی جابر وقاہر قوتیں بھی فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔ یہی ایمان ویقین ایک مسلمان کی حقیقی پہچان ہے۔ محمد علی جوہر مرحوم نے ٹھیک کہا تھا:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

Marfat.com

جو شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے' وہ کافر ہیں

وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ O

﴿جو بھی اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی لوگ تو کافر ہیں۔﴾

یعنی یہود پر ایک ایک بات واضح کر دینے کے بعد ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ تمہاری زندگی کا اصل مقصد اور تمہاری اجتماعی توانائیوں کا اصل ہدف اللہ کی شریعت کا نفاذ اور پوری زندگی میں اس کے دین کی بالادستی ہے اور مختلف حوالوں سے اس کی ایک ایک بات کو تمہارے سامنے واضح کیا جا رہا ہے' اگر تم پھر بھی اللہ کی کتاب کے نفاذ کا حق ادا کرنے سے پہلو تہی کر رہے ہو بلکہ خیانت تک کا ارتکاب کرنے سے باز نہیں آتے ہو تو پھر سن لو کہ جو بھی اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے اور اس کو حاکمانہ حیثیت دینے کیلئے تیار نہیں ہوتے' اللہ کی نگاہ میں یہی لوگ تو کافر ہیں۔

''کفر'' کا معنی ہے ''اللہ اور اس کی شریعت کو ماننے سے انکار کر دینا''۔ یہ لوگ اگرچہ اس کو ماننے سے منکر نہیں تھے' لیکن ان کا عملی رویہ انکار ہی کی تائید کرتا تھا کیونکہ انہوں نے اپنی عملی زندگی سے اللہ کی کتاب کو خارج کر دیا تھا۔ زبان سے اقرار اور عمل سے انکار' بلکہ خود کتاب خداوندی میں ترمیم' تحریف اور اجتماعی اداروں میں اس کے نفوذ سے یکسر انکار۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑا کفر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کیلئے کسی بہت بڑی عقل کی ضرورت نہیں ہے کہ قرآن کریم جو بات یہود کے بارے میں کہہ رہا ہے اور جس رویے کے نتیجے میں کہہ رہا ہے' وہی رویہ آج اگر مسلمانوں کا ہوگا اور وہ اپنی اجتماعی زندگی میں اگر اسی سرکشی اور تمرد کو اپنائیں گے تو انہیں بھی اسی سلوک کا مستحق سمجھا جائے گا۔ اللہ کے یہاں نسبتوں کا اعتبار نہیں بلکہ ایمان و عمل کا سکہ چلتا ہے۔ جو بات اہل کتاب کیلئے کفر کا باعث بنی ہے۔ یقیناً وہی بات اس امت کیلئے بھی کفر کا باعث بنے گی۔

وَکَتَبۡنَا عَلَیۡہِمۡ فِیۡہَاۤ اَنَّ النَّفۡسَ

اور ہم نے اُن لوگوں کے لیے تورات میں یہ حکم لکھ دیا تھا

بِالنَّفۡسِ ۙ وَ الۡعَیۡنَ بِالۡعَیۡنِ وَ الۡاَنۡفَ بِالۡاَنۡفِ وَ الۡاُذُنَ

کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے

بِالۡاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الۡجُرُوۡحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنۡ تَصَدَّقَ

کان اور دانت کے بدلے دانت اور سب زخموں کا اسی طرح بدلا ہے۔ لیکن جو شخص بدلا معاف

بِہٖ فَہُوَ کَفَّارَۃٌ لَّہٗ ؕ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ

کر دے وہ اس کے لیے کفارہ ہوگا۔ اور جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی

ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۵﴾ وَ قَفَّیۡنَا عَلٰۤی اٰثَارِہِمۡ بِعِیۡسَی ابۡنِ مَرۡیَمَ

لوگ بے انصاف ہیں۔ اور ان پیغمبروں کے بعد انہیں کے قدموں پر ہم نے عیسیٰؑ بن مریم کو

Marfat.com

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ

بھیجا جو اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتے تھے اور اُن کو انجیل عنایت کی

فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ

جس میں ہدایت اور نور ہے۔ اور تورات کی جو اس سے پہلی (کتاب) ہے تصدیق کرتی ہے

وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۴۶ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ

اور پرہیزگاروں کو راہ بتاتی اور نصیحت کرتی ہے۔ اور اہل انجیل کو چاہیے کہ

بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

جو احکام خدا نے اس میں نازل فرمائے ہیں اس کے مطابق حکم دیا کریں اور جو خدا کے نازل کیے ہوئے احکام

فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۴۷ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ

کے مطابق حکم نہ دے گا تو ایسے لوگ نافرمان ہیں۔ اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ

جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان (سب) پر شامل ہے تو

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ عَمَّا

جو حکم خدا نے نازل فرمایا ہے اس کے مطابق ان کا فیصلہ کرنا اور حق جو تمہارے پاس آچکا ہے اس کو چھوڑ کر اُن

جَاۗءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَ

کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک (فرقے) کے لیے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے اور

لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ

اگر خدا چاہتا تو سب کو ایک ہی شریعت پر کر دیتا مگر جو حکم اس نے تم کو دیئے ہیں ان میں وہ

اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ

تمہاری آزمائش کرنی چاہتا ہے سو نیک کاموں میں جلدی کرو تم سب کو خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے پھر

Marfat.com

بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۴۸﴾ وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ

جن باتوں میں تم کو اختلاف تھا وہ تم کو بتا دے گا ۔ اور (ہم پھر تاکید کرتے ہیں کہ) جو (حکم) خدا نے نازل فرمایا ہے

وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا

اسی کے مطابق اُن میں فیصلہ کرنا اور اُن کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا اور اُن سے بچتے رہنا کہ کسی حکم سے جو خدا نے تم پر

أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ

نازل فرمایا ہے یہ کہیں تم کو بہکا نہ دیں۔ اگر یہ نہ مانیں تو جان لو کہ خدا چاہتا ہے کہ اُن کے بعض گناہوں

يُصِيبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ﴿۴۹﴾

کے سبب اُن پر مصیبت نازل کرے۔ اور اکثر لوگ تو نافرمان ہیں۔

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا

کیا یہ زمانۂ جاہلیت کے حکم کے خواہشمند ہیں؟ اور جو یقین رکھتے ہیں اُن کے لیے خدا سے

لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۵۰﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ

اچھا حکم کس کا ہے؟ اے ایمان والو! یہود

وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ

اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور جو شخص تم میں سے اُن کو

فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۵۱﴾ فَتَرَى

دوست بنائے گا وہ بھی اُنہیں میں سے ہوگا۔ بیشک خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ تو جن لوگوں کے

الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ

دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے تم اُن کو دیکھو گے کہ اُن میں دوڑ دوڑ کے ملے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں خوف ہے کہ کہیں ہم

أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ ۚ فَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِنْ

پر زمانے کی گردش نہ آجائے۔ سو قریب ہے کہ خدا فتح بھیجے یا اپنے ہاں سے کوئی اور امر (نازل فرمائے) پھر

عِنْدِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنْفُسِهِمْ نَادِمِينَ ﴿۵۲﴾

یہ اپنے دل کی باتوں کو جو چھپایا کرتے تھے پشیمان ہو کر رہ جائیں گے۔

Marfat.com

آیت:۴۵ وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ لا وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ لا وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ط فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ط وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ O ''اور ہم نے ان پر فرض کیا کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اور اسی طرح دوسرے زخموں کا بھی قصاص ہے تو جس نے اس کو معاف کر دیا تو وہ اس کیلئے کفارہ ہے اور جو اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں گے تو وہی لوگ ہیں' جو ظالم ہیں''۔

نفاذ شریعت میں سے سب سے مشکل مرحلہ سزاؤں کا نفاذ ہوتا ہے

گزشتہ آیات میں ہم نے یہود کی کج رویوں کی جو پوری داستان پڑھی ہے' اس میں ایک بات بڑی نمایاں ہے اور وہ یہ کہ یہود کتاب اللہ کے احکام کے نفاذ کے سلسلے میں جس طرح ناکام ہوئے ہیں' اس کا ایک بڑا سبب حدود اللہ کے نفاذ میں ان کی بدنیتی رہی ہے۔ یہ وہ میدان ہے' جس میں ان کے قدم بار بار پھسلے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کر لینا اور دیگر معاملات میں تھوڑی بہت اطاعت کرنا' اگرچہ یہ بھی آسان نہیں' لیکن یہ وہ کٹھن مرحلہ نہیں ہے' جس سے امتیں مجموعی طور پر پھسل جاتی ہیں۔ البتہ! جب اللہ کے قانون کو اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے کا موقع آتا ہے اور اس میں خصوصاً جب سزاؤں کے نفاذ کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے اور وہ بھی اس وقت جبکہ اس امت کے صاحب اقتدار اور خوشحال لوگ جرائم کا ارتکاب کرنے لگیں تو پھر عموماً حدود کے نفاذ میں امتیں کمزوری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ شروع شروع میں بڑے لوگوں کو سزاؤں سے بچانے کی کوشش ہوتی ہے جو بالآخر عوام کی ناراضگی کو دیکھتے ہوئے تحریف اور عام نافرمانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لئے اس باب کو الٹتے ہوئے قرآن کریم نے تورات میں سزاؤں کا ذکر اس حوالے سے کیا ہے کہ یہ سزائیں صرف قرآن پاک میں امت مسلمہ کیلئے ذکر نہیں کی جا رہیں' بلکہ اہل تورات کو بھی ہم نے ان کا پابند ٹھہرایا تھا۔ لیکن انہوں نے جس طرح بہ لطائف الحیل شروع شروع میں اس سے بچ نکلنے کی کوششیں کیں اور پھر آخر کار کھلی نافرمانی تک جا پہنچے' اس کی طرف یہاں واضح اشارہ کیا گیا ہے اور اس امت کو وارننگ دی جا رہی ہے کہ تمہارے لئے بھی یہی مرحلہ ایک نازک مرحلہ ہوگا۔ دیکھنا! اس میں تمہارے قدم پھسلنے نہ پائیں۔

باہمی اختلافات کے نتیجے میں انسانی جان لینے کی کوشش کرنا' یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں' جو بھی کبھی پیش آتا ہو۔ بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں میں سب سے پہلے یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کو انسان کی بنیادی کمزوری جان کر' جہاں قانون کی گرفت سے اس کو روکنے کی کوشش کی گئی ہے' وہیں ایک خاص تصور سے بھی اس میں کمی کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ یہ کہ مقتول کے وارثوں کو یا زخم کا شکار ہونے والوں کو یہ ترغیب دی جا رہی ہے کہ تم اگر قاتل یا ظلم کرنے والوں کو معاف کر دو تو اللہ کے یہاں تمہاری زندگی کے بہت سارے اور گناہ بخش دیئے جائیں گے اور یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ قاتل کی زندگی اس کو بخش دی جائے گی۔ اس لئے کہ اس نے اصل جرم مقتول اور اس کے وارثوں کے ساتھ کیا ہے' جب وہ معاف کر دیں گے تو قانون تو معاف کرے گا ہی ممکن ہے اللہ کے یہاں بھی اس کو معافی مل جائے۔ اس جملہ معترضہ کے بعد پھر یہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے یہود کو یہ قانون دیتے ہوئے تاکیداً یہ بات کہی تھی کہ جو لوگ بھی اللہ کے اس نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے' یہی لوگ تو ظالم ہیں۔ یہاں ظلم ایک تو عدل کے مقابل میں استعمال ہوا' یعنی یہ لوگ اگر اس نظام عدل کو برپا نہیں کریں گے تو نتیجے میں معاشرہ ظلم کا شکار ہو جائے گا اور پھر اس ظلم سے نہ خواص بچتے ہیں اور نہ عوام محفوظ رہتے ہیں' اس لئے جو معاشرہ آپ اپنا دشمن نہیں ہے' اسے نظام عدل کے راستے میں رکاوٹ کھڑی نہیں کرنی چاہئے۔ دوسرا مفہوم ظلم کا حق تلفی اور حق شکنی ہے۔ جو لوگ اللہ کے قانون کو نافذ نہیں کرتے' وہ اللہ کے سب سے بڑے حق کو تلف کرتے ہیں۔ کیونکہ حاکمیت صرف اسی کو زیب دیتی ہے اور یہ فقط اسی کا حق ہے۔

Marfat.com

ے سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

قرآن کریم میں اللہ کی اس حق تلفی کو شرک کا نام دیا گیا ہے اور اس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ شرک وہ جرم ہے جسے پروردگار کبھی معاف نہیں فرمائیں گے۔ ایک بالکل پیش پا افتادہ حقیقت ہے کہ اللہ کی اس کائنات اور بطور خاص اس زمین پر جہاں انسان کو آزادی بخشی گئی ہے اور بے شمار نعمتوں سے اسے نوازا گیا ہے وہ اگر اللہ کے احکام کو نافذ نہیں کرتا تو دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمین پر اور اپنے اوپر اللہ کی حکمرانی کو تسلیم نہیں کرتا جبکہ مطلق العنان حکمرانی صرف اللہ کا حق ہے اور اسی کو زیب دیتی ہے۔ اسلئے اس حق کا تلف کرنا اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا اور یقیناً اسے ناقابل معافی ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے بعد مزید اسکی تائید کیلئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی دعوت کو پیش کیا جا رہا ہے تاکہ معلوم ہو کہ جب بھی کبھی کوئی رسول آیا ہے اسکے پیش نظر یہی بنیادی کام رہا ہے کہ وہ اللہ کی زمین پر اللہ کی شریعت کو نافذ کرے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

آیت: ۴۶-۴۷ وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ وَهُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ ''اور ہم نے ان کے پیچھے انہی کے نقش قدم پر عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا۔ مصداق پیشتر سے موجود تورات کے اور ہم نے اس کو عطا کی انجیل ہدایت اور روشنی پر مشتمل مصداق اپنے سے پیشتر موجود تورات کی اور ہدایت و نصیحت خدا ترسوں کیلئے اور واجب ہے کہ اہل انجیل بھی فیصلہ کریں اس کے مطابق جو اللہ نے اس میں اتارا اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو وہی لوگ فاسق ہیں''۔

تورات اور انجیل بھی ہدایت اور نور تھیں

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ کہ ہم نے ان کے پیچھے انہی کے نقش قدم پر عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا۔ یعنی جو مقصد حیات لے کر اور جو دعوت لے کر اس سے پہلے انبیاء اور رسل آ چکے تھے بالکل انہی کے نقش قدم پر اسی کام کے کرنے اور اسی ذمہ داری کو سرانجام دینے کیلئے حضرت عیسیٰ کو بھی بھیجا گیا۔

''آثار'' کا معنی ہوتا ہے نقوش قدم۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام انہی رسولوں کے قدم بہ قدم چلتے ہوئے اسی فریضہ کی انجام دہی کیلئے تشریف لائے جس فریضہ کو اس سے پہلے رسول انجام دیتے رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے آنے والے تمام انبیاء و رسل میں ان کی شخصیت ان کے مزاج ان کے کردار ان کی دعوت اور ان کے مقاصد دعوت میں کوئی جوہری فرق نہیں ہوتا۔ وقت کی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے طریق دعوت اور اسلوبِ دعوت میں فرق ہو سکتا ہے لیکن دعوت اور مقاصد دعوت میں کسی فرق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح ایک شجرہ طیبہ کے برگ و بار باہم نہایت تشابہہ اور یکسانیت رکھتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ آم کے درخت کو ایک طرف آم لگیں تو دوسری طرف انگور لگنا شروع ہو جائیں۔ اسی طرح اللہ کی طرف سے آنے والے تمام انبیاء جیسا کہ عرض کیا گیا ہے ایک دوسرے سے مشابہ اور یکساں دعوت کے حامل ہوتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا:

Marfat.com

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ ﴿پیشتر سے موجود تورات کے وہ مصدق بن کے آئے۔﴾

یعنی انہوں نے تورات کی محفوظ شریعت کی تصدیق وتائید کی' بلکہ اپنی امت کو اللہ کی طرف سے اسی شریعت کا پابند ٹھہرایا کیونکہ اللہ نے ان پر جو انجیل نازل فرمائی' اس میں شرعی احکام نہیں تھے بلکہ احکام کی حکمت بیان کی گئی تھی۔ کیونکہ یہود اپنے پاس کسی نہ کسی حد تک شریعت تو رکھتے تھے' لیکن حکمت شریعت سے محروم ہو چکے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اسی شریعت کو باقی رکھتے ہوئے' حکمت شریعت کو عام کرنے کی کوشش فرمائی۔ اور اسی لئے فرمایا:

وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ وَهُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ O

ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی' جس میں ہدایت اور نور تھا اور وہ بھی تورات کی تصدیق کرنے والی تھی۔ یعنی جس طرح عیسیٰ علیہ السلام تورات کی تصدیق کر رہے تھے' اسی طرح انجیل بھی تورات کی تصدیق کر رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اپنی دعوت سے الگ کسی حیثیت کا مالک نہیں ہوتا۔ کتاب اور پیغمبر' دونوں مل کر انسانوں کی اصلاح کا کام کرتے ہیں۔ پیغمبر کی زبان سے کتاب بولتی ہے اور پیغمبر کا عمل کتاب کی شرح ہوتا ہے۔ اسی طرح کتاب' ہو بہو پیغمبر کی سیرت کا عکس ہوتی ہے اور دوسری بات یہ کہ پیغمبر اور کتاب دونوں ایک ہی مقصد کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہیں اور دونوں کے سامنے ایک ہی مقصد ہوتا ہے' وہ ہے اللہ کی زمین اور انسانوں پر اللہ کی شریعت کو نافذ کرنا اور انسانوں سے اس کی حاکمیت کا اعتراف کروانے کے بعد ان کی اصلاح کے عمل کو مکمل کرنا۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل' دونوں مل کر اس کام کی تکمیل کر رہے تھے۔

مزید فرمایا کہ جیسے تورات میں اللہ نے افکار اور اعمال کی رہنمائی کیلئے ہدایت اور نور رکھا ہے اسی طرح انجیل کو بھی انہی دونوں صفات سے مرصع کیا گیا تھا۔ ہم نے یہاں ''مصدق'' کا معنیٰ' بار بار تصدیق کرنے والا کیا ہے۔ لیکن اس کا ایک دوسرا معنیٰ' جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیا ہے' وہ ہے مصداق۔ یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور ان پر نازل ہونے والی کتاب' تورات کا مصداق تھی۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اور ان پر نازل ہونے والی کتاب کی جو جو علامتیں اور نشانیاں بیان کی گئی تھیں' حضرت عیسیٰ اور انجیل بالکل ویسے ہی تھے۔ یعنی تورات میں عیسیٰ علیہ السلام کی خرقِ عادت ولادت اور خلاف معمول آپ کا بچپن میں باتیں کرنا اور پھر بچپن ہی میں نبوت کا اعلان کرنا' یہ من جملہ نشانیوں میں سے چند نشانیاں ہیں' جس کی خبر تورات نے دی تھی اور عیسیٰ علیہ السلام' ان تمام علامتوں کا مصداق تھے۔ یہ صرف اس لئے تھا کہ یہود آپ کو دیکھ کر پہچان لیں کہ ان کی کتاب میں جس آنے والے کی خبر دی گئی ہے' وہ آپ ہی ہیں تاکہ جو ہدایت اور موعظہ اپنے ساتھ وہ لے کر آئے ہیں' اس سے وہ فائدہ اٹھائیں اور فائدہ وہ اسی صورت میں اٹھا سکتے ہیں کہ اللہ کا تقویٰ ان کے دلوں میں ہو ورنہ جو دل اللہ سے بے نیاز ہوگا' وہ کبھی بھی پیغمبر کی دعوت کو قبول نہیں کرتا۔ اس لئے فرمایا:

وَهُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ O ﴿یہ انجیل ہدایت اور نصیحت ہے' متقین کیلئے۔﴾

اس مکمل تعارف کے بعد اہل انجیل کو وہی پیغام اور وہی حکم دیا جا رہا ہے' جو اہل تورات کو دیا گیا تھا کہ ان پر واجب ہے کہ اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلے کریں اور اس انجیل کو حاکمانہ حیثیت دے کر زندگی کے تمام مسائل میں اور زندگی کی ہر سطح پر' اس طرح اس کی راہنمائی قبول کریں کہ وہی ان کیلئے سب سے بڑا علم بھی ہو اور وہی اجتماعی معاملات میں قانون کی حیثیت بھی رکھتی ہو اور وہی ان کیلئے آداب زندگی کا درس بھی دیتی ہو۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ سمجھا جائے گا کہ انہوں نے واقعی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول کیا اور انجیل کا حق ادا کیا ہے۔ لیکن اگر انہوں نے اس کتاب کے مطابق اور تورات کی شریعت کے مطابق' فیصلے نہ کیے اور زندگی میں اس کی آئینی حیثیت اور اس کی بہ ہمہ وجوہ راہنمائی کو قبول نہ کیا تو پھر یہی لوگ تو فاسق ہیں کیونکہ ان پر تورات کی شریعت کا اختیار کرنا لازم ہے اور اس کے بارے میں فرمایا جا چکا ہے کہ جو لوگ اس شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے'

Marfat.com

وہ کافر بھی ہیں اور ظالم بھی اب چونکہ اسی شریعت کی یاد دہانی کیلئے اللہ کے عظیم رسول حضرت عیسیٰ ابن مریم اور ان پر نازل ہونے والی کتاب انجیل آ چکے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے فریضہ کی ادائیگی میں زیادہ ذمہ دار ٹھہرائے گئے ہیں۔ اس لئے اب اگر انہوں نے اس میں تساہل برتا یا انحراف کا راستہ اختیار کیا تو یہ کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کنویں میں گرنے والی بات ہوگی۔ اس لئے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ اب بھی اگر یہ اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے تو یہ فاسق ہوں گے۔

فاسق کون ہوتا ہے؟

''فاسق'' کا لفظ فقہی اصطلاح کے معنوں میں استعمال نہیں ہو رہا بلکہ یہ قرآن کریم کی اپنی اصطلاح ہے' جس کا معنی ہے' حد سے گزر جانے والا اور اللہ کی شریعت کا باغی و نافرمان کیونکہ عربی لغت میں فسق اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عرب ایک محاورہ بولتے ہیں ''فسقت الرطبة عن القشرة'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تازہ کھجور کو انگوٹھے کے پور پر رکھ کر انگلی سے دبائیں تو اس کی گٹھلی پھدک کر باہر نکل جاتی ہے۔ یہ پھدکنے اور اچھلنے کو' یہاں فسق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے ''فاسق'' وہ ہوگا' جو تمام حدود کو پھلانگ جائے اور شریعت کے کسی حکم کی اس کو پرواہ نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہود جن کے حوالے سے گفتگو ہو رہی ہے' اگر وہ تورات رکھتے ہوئے اس کی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو یقیناً وہ کافر اور ظالم ہیں اور اس کے بعد عیسائی اپنے پاس تورات اور انجیل رکھتے ہوئے اگر شریعت کی پرواہ نہیں کرتے تو وہ دوہرے اور انتہائی مجرم ہیں۔ اس لئے ان کو یہاں فاسق سے تعبیر کیا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک اور بات کو سوچتے ہوئے دل کانپنے لگتا ہے کہ اگر تورات اور انجیل کے نزول کے بعد اللہ کی شریعت کے عدم نفاذ سے کفر' ظلم اور فسق لازم آتے ہیں تو قرآنِ کریم جو اللہ کی آخری کتاب ہے اور سرکار دو عالم ﷺ جو اللہ کے آخری رسول ہیں' ان کے تشریف لے آنے کے بعد اور قرآنِ کریم کے نزول کے بعد' اگر یہی رویہ مسلمان ان کے ساتھ اختیار کریں تو پھر ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ یہ ایک لمحہ فکریہ ہے' جو ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور اگلی آیتیں پڑھنے سے پہلے اس کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے ان آیات کو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر کلام الٰہی کے الفاظ میں اس تاویل کیلئے کوئی گنجائش نہیں بلکہ سیاق و سباق اس پر واضح طور پر دلالت کر رہا ہے کہ ان آیات سے مسلمانوں کو الرٹ کیا جا رہا ہے' تاکہ وہ پوری طرح بیدار ہو جائیں اور اپنے دل و دماغ میں اس بات کو مستحضر کر لیں کہ ہمیں پہلی امتوں کی داستان' ان کی گمراہیوں اور ان کے انجام سے اسی لئے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ ہم اس راستے پر چلنے سے احتراز کریں۔ جس راستے پر چل کر وہ گمراہ بھی ہوئے اور معذب بھی ٹھہرے۔ اسی لئے جب حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں نازل ہوئی ہیں اور وہ انہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یعنی اللہ کی کتابوں کے مطابق انہوں نے اگر فیصلہ نہیں کیا تو وہ اسکی وجہ سے کافر' ظالم اور فاسق ٹھہرے تو یہ تہدید صرف ان کیلئے ہے' مسلمانوں کیلئے نہیں۔ اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

نعم الاخوۃ لكم بنو اسرائيل آن كانت لهم كل مُرّة ولكم كل حلوة كلاّ والله لتسلكن طريقهم قدر الشراك

﴿کتنے اچھے بھائی ہیں تمہارے لئے یہ بنی اسرائیل کہ کڑوا کڑوا سب ان کیلئے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمہارے لئے۔ ہرگز نہیں' اللہ کی قسم! تم انہی کے طریقہ پر قدم بقدم چلو گے۔﴾

یعنی تم اگر وہی رویہ اختیار کرو گے تو تمہارا انجام بھی اہل کتاب سے مختلف نہ ہوگا۔ اس لئے آنے والی آیات کو پڑھنے سے پہلے مسلمانوں کو اپنے دل و دماغ میں ان تصورات کو پوری طرح مستحضر کر لینا چاہیئے' تاکہ وہ ان آیات سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں۔

Marfat.com

آیت:۴۸ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَیۡمِنًا عَلَیۡهِ فَاحۡكُمۡ بَیۡنَهُمۡ بِمَاۤ [اَنۡ]زَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّ مِنۡهَاجًا ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ [لٰ]كِنۡ لِّیَبۡلُوَكُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰكُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ اِلَی اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِیۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۝ ''اور ہم نے تمہاری [ط]رف کتاب اتاری حق کے ساتھ' مصداق اس سے پیشتر سے موجود کتاب اور اس کیلئے کسوٹی بنا کر۔ تو ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق' جو اللہ نے [ا]تارا اور اس حق سے ہٹ کر جو تمہارے پاس آ چکا ہے' ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کیلئے ایک ضابطہ اور ایک طریقہ ٹھہرایا اور [اگ]ر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ لیکن اس نے چاہا کہ اس چیز میں تمہاری آزمائش کرے' جو اس نے تم کو بخشی تو بھلائیوں کیلئے ایک دوسرے سے [س]بقت کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے تو وہ تمہیں آگاہ کرے گا اس چیز سے' جس سے تم اختلاف کرتے ہو''۔

اس آیت میں خطاب اگرچہ آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی سے ہے۔ لیکن بالواسطہ خطاب پوری امت سے ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ جس [ط]رح ہم نے یہود کی طرف تورات اور نصاریٰ کی طرف انجیل نازل کی اور ان کو اس بات کا حکم دیا کہ وہ ان کتابوں کے مطابق فیصلے کریں۔ انہوں نے ان کتابوں کے ساتھ جو کیا اس کا انجام ان کے بھی سامنے ہے اور تمہارے بھی۔ اب تم پر بھی اسی طرح ایک کتاب ہم نے نازل کی ہے۔ جو اپنی خصوصیات [م]یں بہت نمایاں ہے اور تمہیں بھی یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اس کتاب کے مطابق فیصلے کرنا اور یہ چونکہ اللہ کی آخری کتاب ہے' اس لئے اب کسی غلطی کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ اگر اس کے حقوق کی ادائیگی میں کمی کی گئی اور نوع انسانی کو اللہ کی اس نعمت سے بہرہ ور کرنے کی بجائے' اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے محروم رکھا گیا تو یہ ایک ایسا حادثہ ہوگا' جس کی تلافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلئے زور دے کر فرمایا کہ ہم نے یہ جو کتاب اتاری ہے' اس کی تین حیثیتیں ہیں۔

قرآنِ پاک کی تین حیثیتیں

1- ایک تو یہ کہ اسے حق کے ساتھ اتارا گیا۔ ''حق'' سے مراد یہ ہے' جس پر سیاق کلام دلالت کر رہا ہے کہ اسے ہم نے قول فیصل بنا کر بھیجا ہے۔ چونکہ سابقہ کتابیں ترمیم اور تحریف کا شکار ہو گئیں۔ اب اس کتاب کی حیثیت یہ ہے کہ ان کتابوں کی کمی بیشی اور اہل کتاب کی خیانتوں پر یہ قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے کہ جو بات یہ کہے گی وہ صحیح ہوگی اور پہلی آسمانی کتابوں کو اس کی کہی ہوئی باتوں پر جانچا اور پرکھا جائے گا۔

2- دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ یہ سابقہ کتابوں کی محفوظ باتوں اور محفوظ حقائق کی تصدیق کرتی ہے اور خود ان حقائق کی مصداق بھی ہے۔ لیکن یہاں ایک عجیب بات یہ ہے کہ سابقہ کتابوں کا ذکر الکتاب کے لفظ سے کیا گیا۔ اس سے اس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ قرآن اور تمام وہ کتابیں جو مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں' سب کی سب حقیقت میں ایک ہی کتاب ہے' ایک ہی ان کا مصنف ہے' ایک ہی ان کا مدعا اور مقصد ہے' ایک ہی ان کی تعلیم ہے اور ایک ہی علم ہے' جو ان کے ذریعے سے نوع انسانی کو عطا کیا گیا۔ فرق اگر ہے تو عبارات کا ہے' جو ایک ہی مقصد کیلئے مختلف مخاطبوں کے لحاظ سے مختلف طریقوں سے اختیار کی گئیں۔ پس حقیقت صرف اتنی ہی نہیں کہ یہ کتابیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں' مؤید ہیں۔ تردید کرنے والی نہیں' تصدیق کرنے والی ہیں بلکہ اصل حقیقت اس سے کچھ بڑھ کر ہے۔ وہ یہ کہ سب ایک ہی الکتاب کے مختلف ایڈیشن ہیں۔

3- تیسری خصوصیت اس کی یہ ہے کہ یہ کتاب مہیمن بنا کر نازل کی گئی۔ ''مھیمن'' اللہ کی صفت بھی ہے' جو سورۃ حشر میں ذکر کی گئی ہے اور

Marfat.com

اس کتاب کی صفت بھی۔ ''مھیمن'' کا معنی ہوتا ہے محافظ، نگران، گواہ، امین، تائید اور حمایت کرنے والا۔ قرآن کریم کے مھیمن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ان تمام برحق تعلیمات کو، جو پچھلی کتب آسمانی میں دی گئی تھیں، اپنے اندر لے کر محفوظ کر لیا ہے۔ وہ ان پر نگہبان ہے، اس معنی میں کہ اب ان کی تعلیمات برحق کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے گا۔ وہ ان کی مؤید ہے، اس معنی میں کہ ان کتابوں کے اندر اللہ کا کلام جس حد تک موجود ہے، قرآن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ اس پر گواہ ہے، اس معنی میں کہ ان کتابوں کے اندر اللہ کے کلام اور لوگوں کے کلام کی جو آمیزش ہو گئی ہے، قرآن کی شہادت سے اس کو پھر چھانٹا جا سکتا ہے۔ جو کچھ ان میں قرآن کے مطابق ہے، وہ اللہ کا کلام ہے اور جو قرآن کے خلاف ہے، وہ لوگوں کا کلام ہے۔ گویا کہ علم الٰہی کے حوالے سے صحت و استناد کی اگر کوئی اتھارٹی ہے، جس کے بعد شک و شبہ کا ہر کانٹا نکل جاتا ہے، وہ صرف قرآنِ کریم ہے۔ مذہب کے حوالے سے کوئی ایسی بات، جس کی نسبت وحی الٰہی کی طرف ہو، اگر یہ دیکھنا ہو کہ یہ واقعی ثابت بھی ہے یا نہیں تو اس کیلئے قرآنِ کریم کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ پہلی آسمانی کتابیں یقیناً وحی الٰہی کا نور لے کر نازل ہوئی ہیں اور وہ اپنے دور میں اللہ کی عطا کردہ ہدایت کا سرچشمہ تھیں۔ لیکن اب ان کے مندرجات چونکہ ترمیم و تحریف کی نذر ہو گئے، اس لئے اب ان کی صحت کا دارومدار صرف اس بات پر ہے کہ قرآنِ کریم اس کی تصدیق کرتا ہے یا نہیں۔

اسے دنیائے علم کی ستم ظریفی کہئے کہ جس کتاب کی حیثیت قولِ فیصل اور مھیمن کی تھی، اس کو سابقہ آسمانی کتابوں پر جانچ جانچ کر فیصلہ کیا جانے لگا حالانکہ سابقہ کتابوں کو ماننے والے بھی اس کی صحت کے بارے میں یکسو نہیں۔ لیکن مذہبی تعصب جب علمی امانت پر غالب آ جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے، جو ہم مستشرقین کی کتابوں میں دیکھ رہے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی ہر بات کو تورات و انجیل پر رکھ کر دیکھتے ہیں۔ اگر ان سے مختلف نظر آتی ہے تو سمجھتے ہیں کہ محمد ﷺ نے چونکہ ان باتوں کا علم لوگوں سے سن سنا کر حاصل کیا تھا، اس لئے اپنی کتاب میں درج کرتے ہوئے ان سے بھول ہو گئی ہے اور اگر وہ کسی بات کو زائد دیکھتے ہیں، جس کا ذکر پہلی آسمانی کتابوں میں نہیں تو وہ حیران ہو کر اس کا انکار کر دیتے ہیں کہ یہ نئی بات کہاں سے آ گئی۔ بنیادی خرابی یہ ہے کہ وہ قرآنِ کریم کو کتاب اللہ نہیں بلکہ کتابِ محمد ﷺ سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس آیت کریمہ میں قرآن کریم کی اصل اور مخصوص حیثیت کو نمایاں کرنے کے بعد فرمایا کہ اے پیغمبر! لوگوں کے درمیان اس حق کے مطابق فیصلہ کیجئے، جو قرآن کریم کی شکل میں اللہ نے نازل کیا ہے اور آپ کو اس کتاب کے مطابق فیصلہ کرنے میں قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں گی کیونکہ اہل کتاب آپ کو بار بار اپنی خواہشات کے اتباع پر مجبور کریں گے اور وہ چاہیں گے کہ آپ کے فیصلے قرآن کریم کے مطابق ہونے کی بجائے، ان کی خواہشات کے مطابق ہوں۔ آپ پر چونکہ حق نازل ہو چکا ہے، اس لئے آپ کا کام اس حق کا اتباع ہے، کسی کی خواہش کا اتباع نہیں۔

جب ہم تفسیری روایات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ اہل کتاب، بالخصوص یہود، مختلف طریقوں سے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو نئے نئے مسلمان ہوتے تھے، ان کے ذہنوں پر چونکہ پہلے سے ان کا علمی رعب مسلط تھا کیونکہ یہی پڑھے لکھے لوگ تھے اور مدینے کی آبادی بالکل ان پڑھ ہونے کی وجہ سے ان سے علمی طور پر مرعوب رہتی تھی۔ اس لئے مسلمانوں پر اپنے اثرات کے باعث یہ لوگ طرح طرح سے اسلامی عدالتوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے تھے اور جب ان کو اس میں کامیابی نظر نہیں آتی تھی پھر وہ آنحضرت ﷺ سے مل کر آنحضرت ﷺ کے تبلیغ و دعوت میں ڈوبے ہوئے جذبات کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک دفعہ یہود کے چند علما آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ پیشکش کی کہ آپ ہمارے چند قضایا کا فیصلہ اگر ہماری رائے کے مطابق کر دیں تو ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم مسلمان ہو جائیں گے اور چونکہ ہماری قوم ہم پر اعتماد کرتی ہے، وہ جب دیکھیں گے ہم مسلمان ہو گئے ہیں تو وہ بھی سارے اسلام

Marfat.com

قبول کرلیں گے۔یہاں ان کے اسی ارادۂ بد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زور دیا جارہا ہے کہ آپ بہرصورت حق کے مطابق فیصلہ کریں' ان کی خواہشات کی پرواہ نہ کریں۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے مراد

اس آیت کریمہ کے الفاظ پر غور کرتے ہوئے دو باتوں کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ایک یہ بات کہ ''فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' یہ زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں ہے یعنی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دیوانی' فوجداری یا شخصی معاملات' جو عدالتوں میں پہنچیں تو آپ قرآن وسنت کے قانون کے مطابق فیصلہ کریں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پوری زندگی کے فیصلے وحی الٰہی کی روشنی اور اس کی راہنمائی میں ہونے چاہئیں۔جس طرح شخصی زندگی میں یہ جاننا کہ نکاح کا طریقہ کیا ہے؟' اس کے احکام کیا ہیں؟' میاں بیوی کے حقوق وفرائض کیا ہیں؟' اولاد کے حقوق کیا ہیں اور والدین کے فرائض کیا ہیں؟ پھر اولاد کی تربیت کے کیا اصول اسلام نے دیئے ہیں؟ اسی طرح حقوق وفرائض کی جو ایک پوری تفصیل شخصی زندگی کے حوالے سے اسلامی شریعت دیتی ہے' جس طرح ان تمام معاملات میں ہم اسلامی شریعت سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں' بالکل اسی طرح ہمیں اس بات کا بھی پابند ٹھہرایا گیا ہے کہ ہم اپنی معاشرتی' معاشی' سیاسی غرضیکہ اجتماعی زندگی کے تمام ادوار اور قومی اور بین الاقوامی حدود میں بھی اسلامی شریعت سے راہنمائی لینے اور اس کی پابندی کرنے پر مجبور ہیں۔گویا ہماری پوری زندگی اسلامی شریعت کی راہنمائی میں گزرنی چاہئے اور ہماری پوری زندگی کا پہیہ شریعت اسلامی کی قوت سے گھومنا چاہئے۔جہاں جہاں بھی انسانی اجتماعی زندگی میں اسلام نے احکام دے دیئے ہیں' ان سے سرتابی کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ! جہاں قرآن وسنت خاموش ہے' وہاں اسلامی شریعت کے ماہرین کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اسلامی شریعت کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اور قرآن وسنت میں غور وفکر کرتے ہوئے' اپنے لئے اصول طے کرسکتے ہیں اور اس میں انہیں آزادی حاصل ہے۔مختصر یہ کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کا حکم ہماری پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر محیط ہے۔

''وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآئَهُمْ'' میں خطاب امت مسلمہ سے ہے:

دوسری بات جو ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے۔وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو یہ حکم دیا جارہا ہے:

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآئَكَ مِنَ الْحَقِّ

آپ اہلِ کتاب کی پیروی مت کریں' اس حق سے منحرف ہوکر' جو آپ کے پاس آچکا ہے۔

یہ حیران کن بات ہے کہ اللہ کا وہ رسول' جو اپنی ذات میں معصوم ہے' جس سے باطل کا اتباع اور حق سے انحراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر یہ کہ دنیا میں وہی حق کا علمبردار' مبلغ اور منادہ ہے۔اگر وہی اس پر قائم نہ رہا تو اور کسی سے کیا توقع ہوسکتی ہے۔اس لئے معلوم یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ خطاب جناب رسول پاک ﷺ کو ہے' لیکن سمجھایا امت کو جارہا ہے کہ تمہاری زندگی میں بارہا ایسے مواقع آئیں گے کہ تمہیں اہل کتاب یا دوسری قوموں کے سامنے اپنے نظریۂ حیات پر قائم رہنا مشکل ہوجائے گا۔بعض دفعہ تم پر ایسا دباؤ پڑے گا کہ تم شاید اس کے سامنے ٹھہرتے ہوئے دشواری محسوس کرو۔اس وقت تم یقیناً یہ چاہو گے کہ مخالف قوتوں سے کوئی سمجھوتہ کرکے اور ان کی بہت سی باتیں مان کر زندگی کا کوئی راستہ نکال لو۔اس لئے تاکید کے انداز میں فرمایا جارہا ہے کہ دیکھنا یہ حرکت نہ کرنا۔تم اس کائنات کا گلِ سرسبد اور اس زمین کا نمک ہو۔اگر تمہی نے خزاں سے سازگاری پیدا کرلی اور تو شجرِ انسانیت کا

Marfat.com

مستقبل تاریک ہو جائے گا۔

اس کے بعد فرمایا جا رہا ہے کہ:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ

﴿تم میں سے ہر ایک امت کیلئے ہم نے ایک ضابطہ اور ایک راستہ مقرر کیا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن (اس نے) ایسا نہیں کیا۔ تا کہ وہ تمہیں آزمائے اس میں جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے۔ پس تم بھلائیوں میں سبقت کرو۔﴾

شریعتوں میں اختلاف انسانوں کیلئے امتحان ہے

یہ ایک جملہ معترضہ ہے اور ایک سوال کا جواب ہے' جو اس آیت کے پہلے حصے کو پڑھنے کے بعد ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جب قرآن کریم' سابقہ کتابوں کا مؤید اور تصدیق کرنے والا ہے اور تمام آسمانی کتابیں اصلاً ایک الکتاب کا درجہ رکھتی ہیں اور یہ تمام کتابیں' ایک ہی منبع ہدایت سے نکلی ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہر کتاب نے اپنی ماننے والی امت کو دوسری کتاب کی نسبت الگ شریعت دی ہے؟ یعنی جتنی کتابیں اتری ہیں اور جتنے رسول آئے ہیں' وہ سب الگ الگ شریعتیں لے کر آئے ہیں۔ اگر کتابوں کی حقیقت ایک ہے اور وہ ایک ہی علم لے کر آئی ہیں اور ان کا بھیجنے والا بھی ایک ہی ہے تو پھر الگ الگ شریعتوں کا کیا معنی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ ہم نے ہر امت کو ایک الگ ضابطہ اور شریعت دی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا سرچشمۂ ہدایت الگ الگ ہے۔ جہاں تک دین کے حقائق کا تعلق ہے' وہ ہمیشہ سے غیر متغیر ہیں اور غیر متغیر ہی رہیں گے لیکن شریعت کے ظاہری ڈھانچے اور اس کے فروع میں یقیناً تبدیلی کی جاتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ عبادتِ الٰہی کا حکم سب کو دیا گیا۔ سب پر نماز فرض کی گئی' روزہ فرض کیا گیا' قربانی مشروع کی گئی۔ لیکن تمام امتوں میں اس کی ادائیگی کے طریقوں میں اختلاف رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی ایک کمزوری ہے کہ وہ شروع شروع میں ایک حقیقت کو سمجھ کر قبول کرتا ہے' پھر وہ اسے اپنی عادت بنا لیتا ہے اور جب وہی عادت اگلی نسل میں منتقل ہوتی ہے تو وہ اس کی حقیقت پر غور کرنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کرتی بلکہ آباؤ اجداد کا ورثہ سمجھ کر' اس کے ساتھ چمٹی رہتی ہے۔ مرورِ ایام کے ساتھ اگر اس حقیقت میں کوئی آمیزش ہوتی ہے یا اس میں کمی بیشی کر دی جاتی ہے تو چونکہ اب یہ آباؤ اجداد کا ورثہ بن چکی' اس لئے اس کی اصلاح کی ہر کوشش کو بھی رد کر دیا جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا معلوم ہے کہ اس حقیقت کو قبول کرنے والے' درحقیقت اس حقیقت سے دور ہو جاتے ہیں۔ انسانوں کا خالق اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اس نے انسانوں کو عقل و شعور اور قوت تمیز دے کر دنیا میں بھیجا ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ اس کا امتحان لیتا رہتا ہے کہ تم اپنے اللہ کی اطاعت کیا سمجھ بوجھ کر اور پورے شعور کے ساتھ کر رہے ہو یا محض آباؤ اجداد کا ایک ورثہ سمجھ کر۔ اس لئے ان میں عبودیت کی تازگی پیدا کرنے کیلئے وہ ہر نازل ہونے والی نئی شریعت میں زمانے کے حالات کے مطابق فروعی احکام میں تبدیلی کر کے ایک تو وہ انسانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور دوسرا وہ لوگوں کا امتحان لیتا ہے کہ آیا وہ اللہ کی بندگی کرتے ہیں اور شعور کے ساتھ اس کی اطاعت کرتے ہیں یا وہ اپنی مرضی ہی کی بندگی کرتے اور اپنی مرضی کے ڈگر پر چلنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اس کے لئے یہ بات کوئی مشکل نہ تھی کہ پہلے دن سے انسانوں کیلئے ایک راہِ ہدایت مقرر کر دی جاتی اور وہ قیامت تک کیلئے اس پر چلتے رہتے' جس طرح کولہو کا بیل ایک دائرے میں گھومتا رہتا ہے۔ ہر آدمی اپنے اس متعین راستے پر چلتا رہتا۔ لیکن یہ اسی صورت ممکن تھا کہ اسے عقل و شعور سے محروم رکھا جاتا۔ اگر جزا و سزا کا سارا ترتب اسی قوتِ تمیز اور عقل و شعور پر ہونا ہے تو پھر ضروری تھا کہ ہر رسول کے آنے کے بعد' جہاں عبودیت

Marfat.com

تروتازگی کا سامان کیا جاتا' وہیں ان کے شعور کی آزمائش بھی ہوتی۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ کو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے عبادت کرنے کا حکم دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ آئے تھے' ان کیلئے یہ بہت بڑی آزمائش تھی کہ صدیوں سے جسے وہ اپنا قبلہ اور کعبہ بنائے ہوئے ہیں یعنی ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے اللہ کے گھر کو' اسے ترک کر کے بیت المقدس کو قبلہ بنا لیں۔ اللہ تعالیٰ سورۃ البقرہ میں اس کی حکمت بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ہم نے یہ جو قبلہ مقرر کیا تھا' تو اس لئے کیا تھا' تا کہ ہم اس بات کو ظاہر کر دیں کہ کون اللہ کے رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے انحراف کرتا ہے؟﴾

یعنی اگر تمہیں ایک ہی قبلے کی طرف عبادت کو جاری رکھنے کا حکم دیا جاتا تو اس کے تو تم صدیوں سے عادی تھے اور وہ تمہارے آباؤ اجداد کا ورثہ بھی ہے۔ اس میں تمہارا کیا امتحان ہوتا؟ اسلئے ہم نے درمیان میں چند مہینوں کیلئے بیت المقدس کو قبلہ بنا کر اُن کا امتحان لیا' جو بیت اللہ کو قبلہ مانتے تھے اور اس کے بعد پھر تحویل قبلہ کا حکم دے کر اُن لوگوں کا امتحان لیا' جو بیت المقدس کو قبلہ جانتے تھے اور اب انہیں بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مختلف شریعتوں کے نازل کرنے میں حکمت کیا تھی۔ تمام شریعتیں اپنے اصول اور بنیادی اعتقادات میں یکساں تھیں۔ اختلاف اگر تھا تو صرف فروع یا اس کے ظاہری ڈھانچے میں تھا۔ ظاہر ہے' یہ اختلاف ایسا نہیں' جس کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ دین کے حقائق میں کوئی انقلاب واقع ہو گیا۔ البتہ جو لوگ روحِ دین سے بیگانہ ہیں اور ضوابط اور ان کی تفصیلات ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھے ہیں اور جنہوں نے خدا کی طرف سے آئی ہوئی چیزوں پر خود اپنے حاشیے چڑھا کر ان پر جمود اور تعصب اختیار کر لیا ہے' وہ ہر اس ہدایت کو رد کرتے چلے جائیں گے جو بعد میں اللہ کی طرف سے آئے۔ اس لئے ایسے لوگوں کو ممیز کرنے کیلئے' اس آزمائش سے گزارنا ضروری تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے شریعتوں میں اختلاف رکھا۔

مزید فرمایا:

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ﴿نیکیوں اور بھلائیوں میں سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔﴾

تمام شریعتیں' مقصد میں یکساں تھیں۔ ان کے پیش نظر' صرف ایک مقصد رہا کہ لوگ نیکیوں اور بھلائیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں اور یہ مقصد ظاہر ہے' اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ جس وقت جو اللہ کا حکم نازل ہو' اس کی پیروی کی جائے۔ لہٰذا جو لوگ اصل مقصد پر نگاہ رکھتے ہیں' ان کیلئے شریعتوں کے اختلافات پر جھگڑا کرنے کی بجائے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ مقصد کی طرف اس راہ سے پیش قدمی کریں' جس کو اللہ تعالیٰ کی منظوری حاصل ہو۔ آخر میں فرمایا:

اِلَى اللهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ

﴿آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا' جس میں تم اختلاف کرتے رہے۔﴾

یعنی تم نے شریعتوں کے اختلاف کو' جس طرح مقصد کے اختلاف میں تبدیل کیا ہے اور اس کا بہانہ بنا کر آنحضرت ﷺ کی بعثت سے انکار کر دیا ہے اور قرآن کریم کو ماننے سے منکر ہو گئے' یہ ہٹ دھرمی اور ذہنی اپج کی انتہاء ہے۔ جب کوئی آدمی اس کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر وہاں کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی۔ نہ کسی مجلس مناظرہ میں اس کا فیصلہ ممکن ہوتا ہے اور نہ میدان جنگ میں۔ اس کا آخری فیصلہ پھر قیامت ہی میں ہو گا' جب کہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی اور لوگوں پر منکشف ہو جائے گا کہ جن جھگڑوں میں عمریں کھپا کر دنیا سے آئے ہیں' ان کی تہہ میں حق کا جوہر کتنا تھا اور

Marfat.com

باطل کے حاشیے کس قدر تھے۔

آیت:۴۹ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۝ ”پس اے محمد (ﷺ)! تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں، جو اللہ نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔ پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ ہی کر لیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں“۔

اس آیت کریمہ میں جس بات کا حکم دیا جا رہا ہے، اسی کا حکم گزشتہ آیت کے آغاز میں دیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عطف بھی سابقہ آیت کے پہلے حصے پر ہے۔ درمیان میں ایک جملۂ معترضہ آ گیا تھا، اس کی وضاحت کے بعد پھر وہی سلسلۂ کلام دوبارہ شروع ہو گیا ہے۔ بظاہر یہ تکرار معلوم ہوتی ہے اور تکرار کو عام طور پر کلام کا عیب سمجھا جاتا ہے، جس سے اللہ کے کلام کو پاک ہونا چاہئے۔ لیکن اگر مخاطب کے سابقہ تغافل کی وجہ سے یا اس کے حق سے انحراف یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے تکرار کی ضرورت محسوس ہو تو پھر تکرار نہ صرف عیب نہیں رہتی بلکہ کلام کی ضرورت بن جاتی ہے۔ یہاں بھی یہی حقیقت کارفرما ہے۔ اللہ کی نازل کردہ شریعت کے حوالے سے سابقہ امتوں نے جو روش اختیار کی، جس کے نتیجے میں قرآن کریم نے انہیں کافر، فاسق اور ظالم ٹھہرایا۔ اس روش کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری تھا کہ مستقبل کی اس امت کو جسے قیامت تک نوع انسانی کی قیادت کا فرض انجام دینا ہے بار بار تنبیہ کی جائے کہ وہ یہ رویہ اختیار نہ کرے، ورنہ نوع انسانی کا مستقبل تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ اس لئے مکرر ارشاد فرمایا اور خطاب بھی آنحضرت ﷺ سے کیا تا کہ اس حقیقت کو زیادہ نمایاں ہونے کا موقع ملے اور امت پوری طرح اس کی اہمیت کو محسوس کر سکے۔

قرآن سے امت مسلمہ کا سلوک

لیکن اس ساری احتیاط اور تاکید کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ امت اسلامیہ نے اس خدشے کو ایک حقیقت بنا کر دنیا کے سامنے عبرت کیلئے پیش کر دیا ہے۔ آج پورے عالم اسلام میں ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم سب سے زیادہ چھپنے والی اور پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ صرف سعودی عرب میں قرآنِ کریم کی طباعت و اشاعت کا محیر العقول نظام موجود ہے اور پوری دنیا میں سعودی حکومت نے اسے مفت تقسیم کرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا مجموعی طور پر اس کے ساتھ رویہ حیرت انگیز حد تک قابلِ افسوس ہے کہ جس کتاب کو وہ انتہائی مقدس اور محترم جان کر آنکھوں سے لگاتی ہے، اسے سمجھنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کرتی۔ اسے جزدانوں میں لپیٹ کر، طاقوں میں سجایا جاتا ہے۔ تعویذ بنا کر دھو دھو کر پیا جاتا ہے اور نہ جانے کیا کیا مقدس کام اس سے لیئے جاتے ہیں۔ کوئی مر جائے تو اس سے ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے۔ لیکن خود وہ کتاب کیا کہتی ہے، اس سے مسلمانوں کو کوئی سروکار نہیں۔ سمجھ یہ لیا گیا ہے کہ اس کتاب کا مقصد حصول ثواب ہے یا ایصالِ ثواب یا بیماریوں میں اس سے شفا پانا ہے اور اگر کسی کی جان نہ نکلتی ہو تو اس کے پاس پڑھ کر اس کی نزع کو سہل بنانا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم سے یہ سارے فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ وہ شفا بھی ہے، اس کے پڑھنے سے ثواب بھی ملتا ہے، اس سے ایصالِ ثواب بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ کتاب دنیا میں صرف اس حوالے سے تو نازل نہیں ہوئی تھی۔ ہماری کوتاہ فہمی ہے کہ ہم نے اس کتاب کو ان مقاصد تک محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا تھا:

Marfat.com

؎ تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی تھا

توپیں جب چلتی ہیں تو اس کی زد میں آنے والے جانور اور حیوانات بھی مر جاتے ہیں۔ لیکن توپیں جانوروں کے شکار کیلئے نہیں داغی جاتیں۔ ان سے تو مورچے تباہ ہوتے اور فصلیں اڑائی جاتی ہیں۔ اس لئے قرآن کریم بھی کتاب ہدایت' کتاب زندگی اور کتاب انقلاب بن کر آیا تھا اور قرنِ اول میں اس سے یہی فائدہ اٹھایا گیا اور یہ امت دنیا کی امامت کے منصب پر فائز رہی۔ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ یہ امت اس کتاب مقدس سے یہی سلوک کرے گی۔ اس لئے اس نے تکرار کے ساتھ اپنے حکم کو دہرایا تا کہ ہم ان کوتاہیوں سے بچ سکیں۔ لیکن ہماری امت کا ہر طبقہ' ایک محدود طبقے کو چھوڑ کر' اپنی اس روش کو بدلنے کیلئے تیار نہیں۔ جنہیں مذہب سے کوئی خاص رشتہ نہیں' ان کی تو شکایت ہی فضول ہے۔ شکایت تو ان سے ہے' جو اپنے بچوں کو قرآن پاک نہایت شوق سے حفظ تک کرواتے ہیں اور خود بھی پابندی سے روزانہ تلاوت قرآن کریم کرتے ہیں۔ لیکن نہ جانے انہیں یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ جو کتاب' کتابِ ہدایت ہو' اگر اس کو سمجھا نہ جائے تو اس سے ہدایت کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے' جیسے کوئی شخص بیرون ملک گیا اور اس نے جاتے ہوئے اپنے عزیز دوست سے کہا کہ میں بیوی بچوں کو یہاں چھوڑے جا رہا ہوں' تم میرے سب سے عزیز دوست ہو۔ خدا کیلئے میرے بچوں کی دیکھ بھال کرنا اور آتے جاتے گھر کی ضرورتوں کے بارے میں پوچھتے رہنا۔ میں خود بھی وقتاً فوقتاً تمہیں خط لکھتا رہوں گا۔ تم اس کے مطابق میرے اہل خانہ کی ضرورتوں کو پورا کرتے رہنا۔ جب وہ چند سال کے بعد اپنے گھر لوٹ کے آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس اللہ کے بندے نے کبھی ایک دفعہ بھی گھر کی راہ نہیں دیکھی اور کبھی آ کر اس نے معلوم نہ کیا کہ اہل خانہ زندہ ہیں یا مر گئے۔ اس شخص کو سن کر نہایت دکھ ہوا چنانچہ' جب اس کا دوست ملنے آیا تو اس نے اس سے منہ پھیر لیا۔ اس کے دوست نے جب اس کی بے رخی کو دیکھا تو اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے اپنے گھر لے گیا اور پوچھا دوست بتاؤ تو سہی' تمہیں شکایت کیا ہے۔ اس نے کہا شکایت پوچھتے ہو' تم نے یہی دوستی کا حق ادا کیا کہ اتنے سالوں میں میرے بچوں کی ایک دفعہ بھی خیریت معلوم نہ کی۔ اس نے کہا اس بات کو چھوڑ' گھر گیا اور اس کے تمام خطوط کا پلندہ' جو اس نے نہایت خوبصورت جزدان میں لپیٹا ہوا تھا' وہ اٹھا کر لے آیا اور اہلِ محلہ میں جا کر اس نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم ذرا میرے دوست کے سامنے اس بات کی گواہی دو کہ جب بھی اس کا خط آتا تھا تو کیا میں لہک لہک کر آپ لوگوں کو پڑھ کر نہیں سناتا تھا اور کس طرح میں اپنے دوست کی ہر وقت آپ لوگوں کے سامنے تعریف کرتا تھا؟ اب بتائیے اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا تھا؟ اس دوست نے یہ سن کر سر پکڑ لیا کہ تم تو عقل سے بالکل ہی فارغ معلوم ہوتے ہو۔ خطوط لہک لہک کر پڑھنے کیلئے اور لوگوں کو سنانے کیلئے ہوتے ہیں یا جو کچھ خطوط میں لکھا جائے' اسے سمجھ کر عمل کرنے کیلئے ہوتے ہیں۔ اگر تم ایسے ہی ضعیف العقل ہو تو میں تم سے کیا گلہ کروں۔ یہ ایک انفرادی واقعہ ہے' جس سے آپ کو تعجب ہوا ہوگا اور آپ اسے یقیناً فتورِ عقل کی ایک مثال سمجھیں گے۔ لیکن اس امت اسلامیہ کے بارے میں' جس کے ہم سب افراد ہیں کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے؟ کیا ہم سب اسی اختلالِ دماغ کا شکار ہیں کہ اللہ کا پیغام جو ہماری زندگی کی راہنمائی کیلئے آیا' وہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن اس کے مطابق زندگی کے فیصلے کرنا تو دور کی بات' ہم اسے سمجھنے کیلئے بھی تیار نہیں۔ اس لئے تکرار کے ساتھ' اس حکم کو ارشاد فرمانے کے بعد اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی۔ کہا جب تم اللہ کی شریعت کو نافذ کرنے کا ارادہ کرو تو نہایت ہوشیاری کا ثبوت دینا۔ اس بات سے پوری طرح چوکنا رہنا کہ یہ اہل کتاب یا دشمنانِ دین' تمہیں اس شریعت کے حوالے سے کسی فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنے سے برتر قوتوں کے سامنے اپنے مفادات کو غیر محفوظ سمجھ کر' اس قدر ذہنی تحفظات کا شکار ہو جاؤ کہ تم سرے سے اسلامی شریعت سے لاتعلقی کا فیصلہ کر لو۔ جب قرآنِ کریم اتر رہا تھا تو یقیناً یہ بات حیران کن ہو گی کہ مسلمان کبھی اس صورت حال سے بھی دوچار ہو سکتے ہیں لیکن آج ہم

Marfat.com

پورے عالمِ اسلام کو دیکھتے ہوئے' جب اس حقیقت کو اپنے سامنے پاتے ہیں تو اس کی کوئی تاویل کرنا مشکل نظر آتی ہے۔

ہمارے ملک کا جوڈیشری سے متعلق ایک اہم وفد ایک مسلمان ملک کے دورے پر گیا۔ اس کے پروگرام میں سربراہ مملکت سے ملاقات بھی شامل تھی۔ ملاقات سے پہلے اس وفد کے سربراہ نے پروٹوکول آفیسر کو ضابطہ کے مطابق اطلاع دی کہ ہم آپ کے ملک کے سربراہ کو قرآنِ کریم کا تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے اگلے روز جواب دینے کا وعدہ کیا۔ دوسرے دن باضابطہ جواب دیا گیا کہ آپ قرآنِ کریم کا تحفہ سربراہ مملکت کو پیش نہیں کر سکتے۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ چونکہ اس ملک میں اقلیتیں بھی رہتی ہیں' اگر قرآنِ کریم کا آپ تحفہ پیش کریں گے تو ان اقلیتوں کو شکایت پیدا ہو سکتی ہے اور ہم اسے مناسب نہیں سمجھتے۔ اندازہ فرمائیے! جس ملک کا سربراہ غیر مسلم اقلیتوں کے خوف سے قرآنِ کریم کا تحفہ قبول نہیں کر سکتا تو کیا وہ قرآنِ کریم کا نظام اپنے ملک میں نافذ کرنے کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ یہی وہ چیز ہے' جس سے اس امت کو آگاہ کیا گیا ہے کہ دیکھنا اس کمزوری کا شکار نہ ہو جانا کہ اگر تمہارے پیشِ نظر غیر مسلموں کی پسند و ناپسند رہی اور تم اپنے دینی فیصلے بھی ان کے اشارۂ ابرو سے کرنے لگے تو پھر اس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے کہ تم کبھی شریعت کو نافذ کر سکو۔ تم نے اگر فی الواقع اس فرض کو انجام دینا ہے تو پھر تمہارے سامنے اللہ کی خوشنودی کے حصول کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ تم یہ فرض کبھی انجام نہیں دے سکو گے۔

پاکستان بننے کے بعد' پاکستان میں بسنے والے یہاں بھی یہی تماشہ دیکھتے رہے ہیں کہ جب بھی اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ ہوا تو سب سے بڑی رکاوٹ وہی طبقہ رہا' جن کی نظریں ہمیشہ باہر کی طرف لگی رہتی تھیں۔ میاں امیر الدین مرحوم' جو پاکستان بننے کے بعد لاہور کے پہلے میئر تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ بتایا کہ حصولِ پاکستان کے بعد' جب اہلِ پاکستان نے بالعموم اور اس کی دینی تنظیموں نے بالخصوص زور و شور سے اسلام کے نفاذ کا مطالبہ کیا اور اس میں خود مسلم لیگ کا اسلام پسند طبقہ بھی شامل تھا اور میاں امیر الدین کا شمار بھی اسی طبقہ میں ہوتا تھا۔ میاں صاحب کہتے ہیں کہ میں ایک روز ہائی کورٹ بار میں گیا تو مجھے وکلاء نے گھیر لیا۔ کہنے لگے میاں صاحب! یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں کہ ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ میاں صاحب نے ان سے کہا کہ آخر آپ کو اس میں شکایت کیا ہے؟ کہنے لگے کہ آج کی روشنی کے زمانے میں' اگر آپ صدیوں پہلے کا قانون نافذ کریں گے تو ہم مغربی دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اندازہ کیجئے کہ نفاذِ اسلام کے راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ' یہ بے حمیتی ہے کہ اللہ ناراض ہوتا ہے تو بے شک ہو جائے' لیکن مغربی دنیا کو ہم سے ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ ظفر علی خاں مرحوم نے اسی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا

تم سمجھتے ہو پرایوں نے کیا ہم کو تباہ ۔۔۔ بندہ پرور کہیں اپنوں کا یہ کام نہ ہو
یوں تو شرمِ پیمبر ہے انہیں بھی لیکن ۔۔۔ ان کو ڈر یہ ہے کہ ناراض کہیں ٹام نہ ہو

یہ ٹام کی ناراضگی' وہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے' جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا:

وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ط

آپ ان اہلِ کتاب سے یعنی ٹام کی اولاد سے ہوشیار رہئے۔ کہیں آپ کو اللہ کی نازل کردہ شریعت سے پھسلا نہ دیں اور کسی فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں۔ جس بات سے ہوشیار رہنے کی ہمیں آگاہی بخشی گئی تھی' افسوس یہ ہے کہ آج اسی بات نے ہمارا راستہ روک رکھا ہے۔

یہود کی بدنیتی کا انجام:

اس کے بعد ارشاد فرمایا:

Marfat.com

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ط

یعنی اگر تمہاری تمام مخلصانہ کوششوں کے باوجود اہل کتاب اپنی روش سے باز نہیں آتے تو آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ آپ کو اس بات کا یقین کر لینا چاہئے کہ حق سے ان کی روگردانی' بلکہ اہل حق کو بھی اس سے پھیرنے کی کوشش' اصلاً ان کی بدنصیبی کا پیش خیمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان کی محرومی کا فیصلہ کیا' بلکہ یہ بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ انہیں ان کے کرتوتوں کی سزا دے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے تینوں قبیلے' جو مدینہ طیبہ میں آباد تھے۔ اپنی اسی روش کے باعث' اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہوئے۔ جنگِ بدر کے جلدی بعد' بنوقینقاع کو شہر بدر کر دیا گیا اور پھر ایک عرصہ کے بعد' بنونضیر بھی شہر سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے قلعے' ان کی زمینیں' ان کے کاروبار' سب کچھ پیچھے رہ گیا اور یہ عبرت کی تصویر بنے' خیبر میں جا کر آباد ہو گئے۔ سب سے آخر میں' بنوقریظہ اپنے انجام کو پہنچے کہ جن کے بیشتر افراد کو قتل ہونا پڑا اور پہلے دو قبیلے جو خیبر میں جا کر بس گئے تھے' وہاں بھی ان کی حق دشمنی کی عادت رک نہ سکی۔ بالآخر ان کو جزیرۂ عرب سے نکال دیا گیا۔ یہ وہ سزا تھی جو اللہ کے قانون کے مطابق انہیں ملی کیونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ جب کسی قوم پر اتمام حجت کر دی جاتی ہے اور پھر بھی وہ قوم راہ راست اختیار نہیں کرتی تو عام طور پر اس کے اجتماعی گناہوں کی سزا دنیا ہی میں اسے دے دی جاتی ہے۔ البتہ! انفرادی اعمال کی سزا' وہ قیامت میں پائیں گے۔ اقبال نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

آیت کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ بھی بیان فرما دی کہ ہم نے ان لوگوں کو سزا دینے کا فیصلہ کیوں کیا فرمایا:

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں۔﴾

یعنی اللہ کی ہدایت سے باغی ہیں۔ انہیں ہر طرح سمجھا بجھا کے دیکھ لیا ہے لیکن ان پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ آیت کے اس ٹکڑے نے اگرچہ ان کی شقاوت کو پوری طرح نمایاں کر دیا ہے۔ تاہم آخری بات مزید فرمائی جا رہی ہے ممکن ہے ان میں سے کوئی بھی اگر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو تو شاید وہ اس پر غور کرے اور ہدایت کے راستے پر چل نکلے۔ اس لئے ارشاد فرمایا:

آیت ۵۰: اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ط وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ O "(اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا یہ لوگ پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں' ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے"۔

جاہلیت کا لفظ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی جو چیز بھی مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مقابل ہے یا اس کے خلاف ہے' وہ جاہلیت ہے کیونکہ اسلام کی بنیاد اس علم پر ہے' جسے اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے اور جو فی الواقع حقیقی علم کہلانے کا مستحق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام حقائق کا علم رکھتا ہے' چاہے ان کا تعلق علم کے کسی شعبہ سے بھی ہو۔ اس کا علم نہ گمان پر مبنی ہے اور نہ کسی ایک شعبے میں محدود۔ اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے' جاہلیت کا طریقہ ہے۔ عرب کے زمانہ قبل اسلام کو جاہلیت کا دور اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ اس زمانہ میں علم کے بغیر محض وہم یا قیاس وگمان یا خواہشات کی بنا پر انسانوں نے اپنے لئے زندگی کے طریقے مقرر کر لئے تھے۔ یہ طرزِ عمل جہاں جس دور میں بھی انسان اختیار کرے' اسے بہر حال جاہلیت ہی کا طرز عمل کہا جائے گا۔ مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے' وہ محض ایک جزوی علم ہے اور کسی معنی میں بھی انسان کی راہنمائی کیلئے کافی نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ کے دیئے ہوئے علم سے بے نیاز ہو کر جو نظام زندگی اس جزوی علم کے ساتھ ظنون واوہام اور قیاسات وخواہشات کی آمیزش

Marfat.com

کر کے بنا لئے گئے ہیں' وہ بھی اسی طرح جاہلیت کی تعریف میں آتے ہیں' جس طرح قدیم زمانے کے جاہلی طریقے اس تعریف میں آتے تھے۔ اہلِ کتاب اپنی ساری گمراہیوں کے باوجود علم اور جاہلیت کے اس فرق کو کسی نہ کسی حد تک ضرور سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کی عقل سے اپیل کی گئی ہے کہ جب تم یہ جانتے ہو کہ علم تو وہ ہے' جو اللہ کی طرف سے آئے اور تم تسلیم کرو یا نہ کرو' لیکن تم اپنی کتابوں کی دی ہوئی خبر کے مطابق رسول اللہ ﷺ اور قرآنِ کریم کو پہچانتے ہو کہ یہ ضابطۂ حیات اللہ کی طرف سے آیا ہے' جو سراسر علم پر مبنی ہے تو کیا یہ جانتے ہوئے بھی تم پھر جاہلیت کے راستے پر چلنا چاہتے ہو؟

لیکن تمہاری مصیبت یہ ہے کہ اس حقیقت سے بے بہرہ نہیں ہو بلکہ یقین وایقان سے عاری ہو اور وہ علم جو یقین کی قوت سے محروم ہو' وہ محض ذہن کی ورزش ہے اور ذوق کی عیاشی۔ ایسے علم سے علمی مجالس میں رونق کا سامان کیا جا سکتا ہے' علمی مغالطے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن انسانی زندگی کی فوز وفلاح کیلئے جس سیرت وکردار کی ضرورت ہوتی ہے' وہ تو صرف یقین وایمان سے ہی پیدا ہوتی ہے اور اہل کتاب اسی نعمت سے محروم ہیں۔

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

پیش نظر آیات کو پڑھنے سے پہلے چند حقائق کا ادراک بہت ضروری ہے۔

انسان کی کامیابی کا انحصار اپنے مقصدِ حیات سے سنجیدہ وابستگی سے ہے

1- وہ قومیں' جو کسی نظریۂ حیات سے وابستہ ہوتی ہیں' ان کی زندگی اور بقاء کی ضمانت صرف نظریۂ حیات سے غیر مشروط وابستگی ہوتی ہے۔ ان کی تمام تر قوت کا سرچشمہ' اسی نظریۂ حیات کے بارے میں یکسو ہونا ہے۔ وہ جب کبھی بھی اس نظریۂ حیات کے بارے میں تشکک وارتیاب کا شکار ہوتی ہیں' اسی وقت ان کی اجتماعی قوت میں کمی آنے لگتی ہے اور ان کی بقاء کو خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس کو اگر ہم سمجھنا چاہیں تو ہم اپنی روزمرہ کی مثالوں سے بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً: اگر آپ اپنے بچے کو کسی تعلیمی ادارے میں پڑھنے کیلئے داخل کراتے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد آپ کو یہ شکایت ملتی ہے کہ آپ کا بچہ روزانہ سکول آتا تو ہے' لیکن نہ سکول کی تعلیم میں دلچسپی لیتا ہے اور نہ ہوم ورک کر کے آتا ہے۔ آپ پریشانی سے جب بچے کا جائزہ لیتے ہیں تو بالآخر آپ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بچہ سکول ضرور جاتا ہے' لیکن سکول جانے کا جو مقصد ہے' یعنی علم کا حصول' اس کے ساتھ اس کی وابستگی برائے نام بھی نہیں۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ سکول میں آمدورفت' بس یہی اس کا مقصد ہے۔ رہا علم کا حصول' اس کیلئے اسکے دماغ میں کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ یہ وجہ ہے' جسکے باعث وہ تعلیم سے کورا رہتا ہے۔ اگر آپ اس کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو اسکی ایک ہی صورت ہے کہ آپ اسے مقصد سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کریں اور پھر اس کی تمام تر صلاحیتوں کو اس کے ساتھ یکسو کر دیں۔ تب آپ دیکھیں گے کہ چند ہی دنوں میں آپ کا بچہ بہتر نتائج دینے لگے گا۔

ہماری قریبی تاریخ میں لکھنؤ کے ایک اچھے عالم دین گزرے ہیں' جن کا نام مولانا محمد منظور نعمانی تھا۔ انہوں نے اپنے حالات میں لکھا کہ مجھے میرے والدین نے ایک دینی مدرسے میں داخل کروا دیا۔ لیکن میں کئی سال تک اس کی ابتدائی کتابوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ والدین اور اساتذہ دونوں حیران تھے کہ بچے کی ذہنی صلاحیت تو بری نہیں' لیکن یہ آگے کیوں نہیں بڑھ پا رہا۔ اتفاق سے ان کے شہر میں مفتی محمد نعیم لدھیانوی صاحب نے ایک مدرسہ قائم کیا تو ان کے والد صاحب نے اس مدرسے میں ان کو داخل کرا دیا۔ مفتی صاحب مذکور نے ان کی تعلیمی حالت اور ان کی عمر کا اندازہ کر کے یہ محسوس کر لیا کہ یہ بچہ اپنے مقصدِ حیات کے ساتھ سنجیدہ نہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک دن' بقول مولانا کے' انہیں بٹھا کر پوچھا کہ بیٹے تم مجھے سچ سچ بتاؤ کہ تم پڑھنا چاہتے ہو یا نہیں؟ مولانا کہتے ہیں کہ میں نے پوری طرح سوچ بچار کے بعد انہیں جواب دیا کہ ہاں! میں اب پڑھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ جب

Marfat.com

انہوں نے اپنے ارادے کے بارے میں سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ محنت کرنا شروع کی تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لڑکا جو کئی سالوں سے ابتدائی کتابوں میں رکا ہوا تھا' اب وہ ہفتوں میں مہینوں کا کام کرنے لگا۔ اس مثال سے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتی ہے کہ افراد ہوں یا قوم' وہ جس نظریۂ حیات کو اپنی زندگی اور مقصدِ زندگی طے کر چکے ہوں' جب تک اس کے بارے میں ان کے اندر سنجیدگی' وابستگی اور یکسوئی پیدا نہیں ہوتی' اس وقت تک ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قوت کے وہ سرچشمے ابلنا شروع نہیں کرتے' جس کے نتیجے میں ایک کامیاب زندگی کا راستہ کھلتا ہے۔

مسلمان کا مقصدِ حیات

2- محولہ بالا حقیقت سے ایک دوسری حقیقت آپ سے آپ جنم لیتی ہے کہ جب ایک نظریۂ حیات سے وابستگی اور یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہی نظریہ اور وہی مقصد افراد اور اقوام سے تعلقات کا حوالہ بن جاتا ہے۔ اسے ان افراد سے اور اقوام سے محبت ہو جاتی ہے' جو اس کے نظریۂ حیات یا مقصدِ حیات کے بارے میں ہمدردانہ اور مخلصانہ رویہ رکھتی ہوں۔ ان سے راہ و رسم رکھنا اور ان سے اعتماد کا برتاؤ کرنا اور ان پر اعتماد کرنا' اسے محبوب ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ بعض افراد یا بعض قومیں' اس کے نظریۂ حیات یا مقصدِ حیات کے ساتھ دوستی کا نہیں' بلکہ دشمنی کا رویہ رکھتی ہیں اور انہیں یہ ہرگز گوارا نہیں کہ یہ شخص یا یہ قوم اپنے نظریۂ حیات کے مطابق زندگی گزارے' ترقی کرے اور مقاصدِ حیات کو پا سکے تو پھر اس شخص یا اس قوم کیلئے چونکہ اپنا نظریۂ حیات ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوتا ہے اور وہ اسکے مقابلے میں ہر چیز کو چھوڑ سکتا ہے' اسے پھر یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ مجھے ایسے شخص یا ایسی قوم سے کسی قسم کا کوئی بھی رشتہ نہیں رکھنا ہے بلکہ مجھے پوری طرح بیدار اور ہوشیار رہنا ہے کہ یہ لوگ مجھے نقصان نہ پہنچا سکیں۔

ہم نے اپنی گفتگو میں بار بار نظریۂ حیات یا مقصدِ حیات کا ذکر کیا ہے جس سے وابستگی ہی ایک مسلمان کی قوت و توانائی کا سرچشمہ ہے۔ ضروری ہے کہ اختصار کے ساتھ اس کی وضاحت کر دی جائے۔ مختصراً گزارش ہے کہ ہمارے تمام تر تعلقات کی بنیاد اور ہمارے تمام افکار کی جڑ خالقِ کائنات سے ہمارے صحیح تعلق پر استوار ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق فرمائی ہے' ہمیں بھی اسی نے پیدا فرمایا ہے۔ اسی نے ہمیں زندگی کے امکانات مہیا کیے ہیں۔ اسی نے ہماری بقاء کے تمام اسباب عطا فرمائے ہیں' اسی نے ہمیں حواسِ خمسہ کے ساتھ عقل اور شعور سے نوازا ہے اور وہ برابر اپنی بے شمار نعمتوں سے ہمیں گراں بار کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی علم و حکمت رکھنے والی ذات اپنی تخلیق کو' جسے اس نے عقل و شعور سے بھی نوازا ہو' بے مقصد تو پیدا نہیں کر سکتی۔ یقیناً اس نے انسان کا ایک مقصدِ زندگی رکھا ہے۔ چنانچہ انسان کو اس مقصدِ زندگی سے آگاہ کرنے کیلئے' اس نے وحی اور رسالت کا سلسلہ شروع کیا اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک اس قافلہ انسانی کو کسی دور میں بھی اس نے اس بات سے محروم نہیں رکھا کہ اس کو یہ پتہ نہ ہو کہ مجھے زندگی کس طرح گزارنی ہے' میری زندگی کے مقاصد کیا ہیں' میرا اللہ' جو میرا خالق و مالک ہے' وہ کن باتوں میں راضی ہے اور کن باتوں میں ناراض ہے۔ یہی وہ نظریۂ حیات ہے یعنی اللہ کی رضا اور خوشنودی کیلئے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اس کی ہدایات اور احکام پر چلتے ہوئے اللہ کے رسول کے سکھائے ہوئے طریقے پر' اس یقین کے ساتھ گزارنا کہ اس دنیا میں مجھے ہمیشہ نہیں رہنا بلکہ مجھے بھی ہر انسان کی طرح اپنی طبعی زندگی گزارنے کے بعد موت سے ہمکنار ہونا ہے' پھر ایک ایسا دن آئے گا' جب اس دنیا کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور قیامت قائم ہو جائے گی۔ تمام انسان زندہ کیے جائیں گے' اللہ کی عدالت میں سب کی پیشی ہوگی' وہاں زندگی میں انجام دیئے ہوئے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا' ایک ایک عمل اور ایک ایک لمحے کا حساب ہوگا' بس اس دن کی کامیابی اصل کامیابی ہے اور اس دن کی ناکامی اصل ناکامی ہے۔ یہ وہ نظریۂ حیات ہے' جس کے مطابق زندگی گزارنا تبھی ممکن ہے' جب ایک مسلمان اپنے اس نظریۂ حیات کے ساتھ نہایت یکسوئی سے وابستہ رہے۔

Marfat.com

3- دنیا میں قدم قدم پر اس نظریۂ حیات کے مطابق زندگی گزارتے ہوئے موانع پیش آتے ہیں۔ ایک مسلمان اس نظریۂ حیات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں‘ یعنی اپنے گھر سے لے کر ریاست کے تمام اداروں تک‘ اللہ کی حکمرانی کے سوا کسی اور کی حکمرانی کو قبول نہیں کر سکتا۔ قومی اور بین الاقوامی تعلقات میں‘ اللہ ہی کی حکمرانی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا اور ہر سطح پر اس کی بالادستی کو قائم رکھنا‘ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ ایسی صورتحال میں کوئی وجہ نہیں کہ غیر مسلم قوتوں کے ساتھ تصادم کی نوبت نہ آئے اور بالخصوص وہ قوتیں جو اللہ کی حاکمیت پر مبنی نظریۂ حیات کے ساتھ مخاصمت کا رویہ رکھتی ہیں‘ انہیں کسی صورت بھی یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ایسی کوئی قوم یا ایسی کوئی ریاست دنیا میں وجود پائے اور پھر ترقی کرے‘ جو ان کی حاکمیتوں اور ان کے نظریہ ہائے حیات کیلئے چیلنج بن سکے۔ چنانچہ وہ اپنی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لا کر مختلف طریقوں سے اس نوزائیدہ قوت کو ناکام کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اب اس نظریۂ حیات سے وابستہ شخص یا قوم ایسی قوتوں کا پوری طرح شعور نہیں رکھتی اور وہ ان کے ساتھ تعلقات کے بارے میں اگر پوری طرح یکسو نہیں ہے بلکہ اس کا رویہ تذبذب کا شکار رہتا ہے تو زندگی کے سفر میں وہ کبھی بھی کوئی معرکہ سرانجام نہیں دے سکتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی بقاء کیلئے بھی خطرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ تین حقائق جو اجمالی انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ انہیں ذہن میں رکھ کر پیش نظر آیات کو پڑھیئے تو ان شاء اللہ ان آیات کا اصل پیغام سمجھنا مشکل نہیں ہوگا۔

آیت:۵۱ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ ؔ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ O ”اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو ان کو اپنا دوست بنائے گا تو وہ انہی میں سے ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا“۔

یہود و نصاریٰ کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہوتے

اس آیت کریمہ میں خطاب کمزور مسلمانوں سے یا منافقین سے ہے۔ جن کا ذکر اس سے پہلے رکوع میں ہو چکا کہ یہ منافقین یہود کے زیر اثر ہیں‘ جو ان سے کسی طرح ترک تعلق کی جرأت نہیں رکھتے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ تمہیں ایمان کا دعویٰ ہے یعنی تم اسلامی نظریۂ حیات سے وابستگی کا اقرار کرتے ہو۔ اگر یہ تمہارا دعویٰ سچا ہے تو پھر یہ بات سمجھنا تمہارے لئے مشکل نہیں ہونی چاہئے کہ یہود اور نصاریٰ تمہارے نظریۂ حیات کے بدترین دشمن ہیں اور قدم قدم پر تمہیں اس کا تجربہ ہو چکا ہے؟ اس کے باوجود تم اگر ان کے ساتھ دوستی کا دم بھرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جس نظریۂ حیات پر ایمان لا چکے ہو اس کے بارے میں تم یکسو نہیں ہو؟ کیونکہ آدمی اگر اپنے نظریۂ حیات سے یکسو اور مخلص ہو اور وہ یہ بھی جانتا ہو کہ فلاں گروہ میرے نظریۂ حیات کے ساتھ مخالفت اور دشمنی کا تعلق رکھتا ہے تو وہ کبھی بھی اس کو اپنا دوست نہیں سمجھ سکتا کیونکہ دوستی اور دشمنی کبھی ایک دل میں یا ایک تعلق میں یکجا نہیں ہو سکتیں یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کے دشمنوں سے اور اللہ کے دوستوں سے آدمی یکساں تعلق رکھے۔ دوستی کے تقاضے اور ہیں اور دشمنی کے تقاضے اس کے بالکل برعکس ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ زمین اور آسمان ہم آغوش ہو جائیں یا ندی کے دو پاٹ آپس میں مل جائیں یا تاریخ کے دو باب جمع ہو جائیں یا اندھیرا اور اجالا یکساں ہو جائیں۔ اسی طرح ایک دل میں دوستی اور دشمنی کے یکساں جذبات‘ یہ ان سے بڑھ کے ناممکن باتیں ہیں۔ یہ اگر صورت میں ممکن ہے کہ آدمی یا تو کسی فریب نظر کا شکار ہو اور یا پھر وہ جانتے بوجھتے نفاق کے مرض میں مبتلا ہو۔ اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم یہود و نصاریٰ کو اپنے نظریۂ حیات کا دشمن سمجھتے ہو تو پھر ان کے ساتھ دوستی کا تعلق مت رکھو۔

Marfat.com

ولی کسے کہتے ہیں؟

یہاں لفظ اولیاء استعمال ہوا ہے' جو ولی کی جمع ہے۔ ''ولی'' ہلکے پھلکے تعلق والے پر نہیں بولا جاتا' بلکہ ایسے آدمی پر بولا جاتا ہے' جس کے ساتھ ہمراز ہونے کا' دم ساز ہونے کا' خیر خواہی کا' اعتماد کا اور غمگساری کا رشتہ ہو۔ ظاہر ہے ایسا گہرا رشتہ تم اپنے نظریہ حیات کے دشمنوں کے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ البتہ! جہاں تک عام تعلقات کا سوال ہے' مثلاً کاروباری تعلقات' ہمسائیگی کے تعلقات' ملازمت کے تعلقات وغیرہ اس طرح کے تعلقات رکھنے میں اسلام کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔ جہاں اس نے مسلمانوں کو کافروں سے گہرے تعلقات رکھنے سے منع کیا ہے' وہاں اس نے بطور خاص یہ شرط لگائی ہے ''مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ'' یعنی یہ تعلقات مومنوں کے خلاف نہیں ہونے چاہئیں۔ یعنی ایسے تعلقات نہیں ہونے چاہئیں' جہاں مسلمانوں کے مجموعی مفادات کو نقصان پہنچ سکتا ہو۔ چاہے وہ مفادات تہذیبی اور تمدنی ہوں' چاہے ان کا تعلق بین الاقوامی سیاست سے ہو' چاہے وہ ملکی سالمیت پر اثر انداز ہو سکتے ہوں یا ملکی آزادی اور خود مختاری' ان سے متاثر ہوتی ہو۔ اس نوعیت کے کوئی سے تعلقات بھی غیر مسلموں سے نہیں رکھے جا سکتے۔

''بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ'' کہہ کر اس بات کی اہمیت کو ایک اور حوالے سے نمایاں کیا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ کا حال یہ ہے کہ وہ باوجود آپس میں دشمنی کے تمہارے خلاف اکٹھے ہیں اور یہ معاملہ صرف یہود و نصاریٰ تک نہیں' بلکہ پوری دنیائے کفر آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق ملت واحدہ ہے' جو ملتِ اسلام کے خلاف اکٹھی ہے۔ چنانچہ جب ہم یہود و نصاریٰ اور دوسرے غیر مسلموں کی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں دشمنی کی بنیادیں اس قدر گہری ہیں کہ یکجائی کا تصور بھی مشکل دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً یہود و نصاریٰ ہی کو دیکھ لیجئے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے' ان کی والدہ محترمہ پر کیسے کیسے اخلاقی الزامات لگائے۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زنا کا نتیجہ قرار دیا۔ اتنے بڑے الزام کے بعد عیسائیوں کا یہود کو برداشت کرنا' بے غیرتی کی انتہا ہے اور مزید یہ کہ یہود کا دعویٰ ہے کہ ہم نے مسیح کو سولی پہ لٹکایا اور سولی پر اس کو موت آئی اور سولی پر آنے والی موت کو ان کے نزدیک لعنت کی موت سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو لعنت کی موت سے مرنے والا قرار دیتے ہیں (نعوذ باللہ من ذالک)۔ بایں ہمہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب بھی تاریخ میں کبھی مسلمانوں کا یہود یا نصاریٰ سے تصادم ہوا ہے تو یہ دونوں مسلمانوں کے مقابلے میں ہمیشہ اکٹھے ہو گئے۔ اس لئے قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ آپس میں ایک دوسرے کے معاون' حمایتی' ہمدرد و غمگسار ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ سے تعلقات قائم کرتے ہوئے اپنے ذاتی مفادات کو نہیں' بلکہ امت مسلمہ کے اجتماعی مفاد کو دیکھنا ہوگا۔ اگر ان کے تعلقات سے امت مسلمہ کیلئے کسی خرابی کا اندیشہ ہو یا اس سے امت مسلمہ کے مجموعی مفادات متاثر ہو رہے ہوں تو پھر یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ آپ کے ان کے ساتھ انفرادی مفادات کا کیا حال ہے کیونکہ انفرادیت ہمیشہ اجتماعیت کے ساتھ مل کر پروان چڑھتی ہے اور اجتماعیت سے کٹ کر ایک فرد کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ بقول اقبال

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

سورۃ انفال میں اسی بات کو زیادہ نمایاں طریقے سے اور زور دے کر کہا گیا ہے' فرمایا:

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ ؕ اِلَّا تَفۡعَلُوۡهُ تَكُنۡ فِتۡنَةٌ فِى الۡاَرۡضِ وَ فَسَادٌ كَبِيۡرٌ ۝ (الانفال ۸:۷۳)

﴿ کافر ایک دوسرے کے حمایتی اور مددگار ہیں۔ اگر تم نے آپس میں اسی طرح کا اتحاد قائم نہ کیا (یعنی مسلمان' امت مسلمہ کے مجموعی مفادات کیلئے' اسی طرح ایک دوسرے کے حمایتی نہ بنے) تو زمین میں فتنہ اٹھے گا اور بہت فساد مچے گا ﴾

Marfat.com

مسلمانوں کی آپسی نااتفاقی اور یہود و نصاریٰ سے دوستی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہولناک صورت حال

یہ مسلمانوں کیلئے کھلی کھلی وارننگ تھی کہ تمہاری بطور ایک امت کی بقاء کی ضمانت اور تمہاری عزت و سرفرازی کا وجود اگر کسی بات میں ہے تو وہ دنیائے کفر کے مقابلے میں، دنیائے اسلام کا مکمل اتحاد اور اتفاق ہے۔ مسلمانوں کا ایک دوسرے کیلئے جسدِ واحد بن جانا ہے اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو پھر زمین میں فتنہ اٹھے گا اور بہت بڑا فساد مچے گا۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو مدینہ منورہ کی آبادی چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس لئے زمین میں فتنہ پھیلنے اور فساد مچنے کا صحیح اندازہ کرنا، اس وقت قطعاً ممکن نہیں تھا۔ یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ اس فتنہ کی وسعت کا حال کیا ہوگا۔ لیکن آج ہم اپنی آنکھوں سے اس امت کی نااتفاقی کا انجام دیکھ رہے ہیں۔ نیویارک سے ایک فتنہ اٹھا، جس نے بڑھتے بڑھتے عالم اسلام کے ایک بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں پیش آنے والے واقعہ میں جن لوگوں کو محض شکوک کی بنیاد پر ذمہ دار ٹھہرایا گیا، ان میں ایک بھی پاکستانی نہیں اور پھر جو بائیس افراد امریکہ کو مطلوب ٹھہرے، ان میں بھی کوئی پاکستانی نہیں۔ لیکن اس فتنے کی وسعت اور ہولناکی کا اندازہ کریں کہ افغانستان کی تباہی کے بعد، اب پاکستان اس فتنے کا سامنا کر رہا ہے۔

اگر عالم اسلام نے اپنے اپنے مفادات کی بجائے، امت مسلمہ کے اجتماعی مفادات کو دیکھا ہوتا تو آج عالم اسلام اس زبوں حالی کا شکار نہ ہوتا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ آج کے دور کے عالم اسلام کے حوالے سے، جب مورخ قلم اٹھائے گا تو ان باتوں کی کیا توجیہ کرے گا کہ کشمیر میں مسلمان کا خون ارزاں ہو گیا ہے، ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزتیں پامال ہو رہی ہیں۔ لیکن جس ملک کے ہاتھوں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ باقی سارے عالم اسلام کے تعلقات چاہے وہ سیاسی ہوں یا تجارتی، برابر اس ملک کے ساتھ قائم ہیں۔ اس ملک کے افراد کو اپنے یہاں تجارتی پیکج دیئے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے پراجیکٹس کے ٹھیکے دیئے جاتے ہیں، ثقافتی وفود کے تبادلے ہوتے ہیں، معمولی مالی مفادات کیلئے، ملی مفادات کو قربان کیا جا رہا ہے۔ افراد کی ایک بڑی تعداد کو ملازمتیں مہیا کر کے، اس ملک کیلئے زرمبادلہ کا سامان کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کی فوجی قوت میں اضافہ کیا جاتا ہے اور ایک لمحے کو یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی جاتی کہ آخر اس ملک کا مسلمانوں کے معاملے میں کردار کیا ہے۔ یہی حال فلسطین کے بارے میں بھی ہے کہ اسرائیل سارے عرب ممالک کے سینے پر مونگ دل رہا ہے۔ لیکن جو غیر مسلم ممالک اس کی تقویت کا باعث ہیں اور ہر طرح سے اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں، ان سے مسلمان ممالک کے نہایت دوستانہ قریبی روابط ہیں اور ان میں کسی طرح بھی کمی کرنے کیلئے کوئی مسلمان ملک تیار نہیں ہے۔ حالانکہ اس آیت کریمہ میں صاف فرمایا جا رہا ہے کہ جو مسلمان ملک یا مسلمانوں کا کوئی گروہ، ان یہود و نصاریٰ سے دوسرے مسلمانوں کے مفادات کے خلاف دوستی کا رشتہ قائم کرتا ہے تو وہ انہی میں شمار ہوگا یعنی قیامت کے دن اس کا شمار مسلمانوں میں نہیں، بلکہ یہود و نصاریٰ میں ہوگا۔

مزید یہ فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ کہ اگر مسلمان اپنا یہ رویہ تبدیل نہیں کرتے اور یہود و نصاریٰ سے ایسے ہی بے غیرتی کے تعلقات قائم رکھتے ہیں تو پھر یہ لوگ ظالم ہیں یعنی خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں اور اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مار رہے ہیں اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ کبھی ایسے ظالموں کو راہ یاب نہیں کیا کرتا۔ یعنی وہ اپنے اجتماعی مفادات کے حوالے سے ہمیشہ زبوں حالی کا شکار رہتے ہیں اور دنیا انہیں عبرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ چنانچہ عالم اسلام جس طرح صدیوں سے زخم پہ زخم کھا رہا ہے، اس کی پوری تاریخ اس حقیقت کی منہ بولتی تصویر ہے۔

اس آیت کریمہ میں بغیر نام لئے اصولی بات فرمائی گئی ہے کہ جو قوم یا افراد کا گروہ بھی یہود و نصاریٰ سے دوستی کا رشتہ قائم کرے گا، وہ انہی میں شمار ہوگا اور اپنے انجام کو پہنچے گا۔ لیکن آنے والی آیت کریمہ میں، ان لوگوں کا چہرہ دکھا دیا گیا ہے اور ان کی اصل بیماری بھی بتادی گئی ہے۔

Marfat.com

آیت:۵۲ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ؕO ”تم ان لوگوں کو جن کے دلوں میں روگ ہے دیکھتے ہو کہ وہ ان کی طرف پینگیں بڑھا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں تو بہت ممکن ہے کہ اللہ فتح یا اپنی طرف سے کوئی خاص بات دکھائے اور انہیں اس چیز پر جو یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں نادم ہونا پڑے“۔

یعنی یہود و نصاریٰ سے جو لوگ تعلقات اور روابط ختم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں بیماری ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہ بیماری نفاق کی بیماری ہے یعنی یہ لوگ پوری طرح اسلام کے بارے میں یکسو نہیں ہیں۔ ان کی زبانوں پر اسلام کا نام ہے لیکن دلوں میں ابھی تک یہود و نصاریٰ کیلئے نرم گوشہ موجود ہے اور چونکہ اس وقت تک اسلام نے ایک فیصلہ کن قوت اختیار نہیں کی تھی کہ جس سے مستقبل کے بارے میں کوئی قطعی بات واضح ہو جاتی اور منافق یہ سمجھ لیتے کہ اب مستقبل کی قوت اسلام ہے اور کفر تو ایک گرتا ہوا گھر ہے جس کی پاسبانی کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس غیر واضح صورت حال اور مسلسل کشمکش کی فضا میں وہ کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ انہیں اندیشہ ہوا کہ اگر ہم نے مسلمانوں کے ساتھ پختہ رشتہ باندھ کر یہود و نصاریٰ سے اپنا تعلق توڑ لیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کل کلاں کفر غالب آ جائے تو یہود و نصاریٰ کے سامنے ہم پھر کیا منہ لے کر جائیں گے اور ان کے ساتھ ہمارے مفادات کیسے محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو حضرت عبادہ ابن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جن کے یہود کے ساتھ بڑے وسیع تعلقات تھے صاف اعلان کر دیا کہ آج کے بعد میں یہود سے کسی طرح کا تعلق نہیں رکھوں گا بلکہ اللہ اور رسول کے ساتھ میرا رشتہ آخری اور قطعی رشتہ ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں عبداللہ بن ابی نے صاف کہا کہ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ ہو سکتا ہے یہود غالب آ جائیں تو ہم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔ اس لئے عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں ہی سے رسم و راہ باقی رہے۔ تاکہ ہر صورت میں ہمارے مفادات محفوظ رہیں۔ جو قوت بھی غالب آ جائے ہم اسے یقین دلا سکیں کہ ہم تو آپ ہی کے ساتھ تھے۔ یہ وہ موقع شناسی ہے جس کا راستہ نفاق دکھاتا ہے اور ایک مخلص مومن کیلئے اس صورت حال کو قبول کرنا ایمان کی جان کنی سے کم نہیں۔ اس لئے اس آیت کریمہ میں ان منافقین کا پردہ چاک کر کے مسلمانوں کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ تم اطمینان رکھو وہ وقت دور نہیں جب پروردگار ایسی صورت حال پیدا فرما دے گا جب منافقین کو سوائے ندامت اور شرمندگی کے اور کچھ نہیں ملے گا اور وہ مسلمانوں کے سامنے ندامت سے منہ چھپاتے پھریں گے۔ اس کی دو صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک صورت تو یہ کہ اللہ تعالیٰ مکہ معظمہ کی فتح کیلئے اسباب پیدا فرما دیں جس کے نتیجے میں پورے عرب پر اسلام کا غلبہ مکمل ہو جائے۔ چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا اور دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی ایسی سورۃ نازل فرما دیں جس سے منافقین کا کچا چٹھا کھل کر مسلمانوں کے سامنے آ جائے۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں اسی کا حوالہ دیا گیا ہے ارشاد فرمایا:

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِىْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ O

﴿منافقین ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے باب میں کوئی ایسی سورۃ نہ نازل ہو جائے جو ان کے دلوں کے سارے راز ان پر آشکارا کر دے۔ کہہ دو! مذاق کر لو اللہ ظاہر کرنے والا ہے جس کا تم اندیشہ رکھتے ہو﴾ (التوبہ 9:64)

چنانچہ بعد میں پیش آنے والے واقعات نے ان دونوں باتوں کی سچائی کو واضح کر دیا۔ بنو قینقاع کو مدینہ طیبہ سے نکلنا پڑا بنو نضیر شہر بدر کئے گئے اور جنگ خندق کے فوراً بعد بنو قریظہ اپنے انجام کو پہنچے۔ بالآخر کفر کی قوتیں اس حد تک کمزور ہو گئیں کہ مکہ معظمہ جو ان کی طاقت کا مرکز اور سرچشمہ سمجھا جاتا تھا وہ بھی سرنگوں ہو گیا۔ کفر اور جاہلیت کی اپنی بقاء کی آخری کوشش مذبوحی جنگِ حنین کی صورت میں تھی۔ لیکن اللہ نے اس میں بھی ان کو ناکامی سے

Marfat.com

دوچار کیا۔ اس طرح پورے جزیرۂ عرب میں اسلام کے غلبے کا راستہ کھل گیا اور جہاں تک منافقین کا تعلق ہے، جیسے جیسے تاریخ آگے بڑھتی گئی بار بار مسلمانوں کیلئے سرفروشی اور اخلاص کے مواقع پیدا ہوتے گئے۔ نتیجتاً منافقین اپنے اصل چہرے کو چھپانے سے عاجز رہ گئے اور مسلمان آہستہ آہستہ ان میں چھپے ہوئے نفاق کا اندازہ کرنے لگے۔ جنگِ تبوک نے بہت حد تک ان کے چہرے کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ پھر جنگِ تبوک سے واپسی پر آنحضرت ﷺ نے سورۃ توبہ کی روشنی میں جو اقدامات فرمائے، ان سے بڑے بڑے منافقین کا پردہ فاش ہوگیا۔ اب مسلمان انہیں حیرت سے دیکھتے اور تعجب سے ایک دوسرے سے وہی کہنے لگے، جس کی قرآن کریم نے آنے والی آیت میں پہلے سے خبر دی تھی۔

وَيَقُوْلُ

اور (اس وقت)

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ

مسلمان (تعجب سے) کہیں گے کہ کیا یہ وہی ہیں جو خدا کی سخت سخت قسمیں کھایا کرتے تھے کہ ہم تمہارے

لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

ساتھ ہیں۔ اُن کے عمل اکارت گئے اور وہ خسارے میں پڑ گئے۔ اے ایمان والو!

اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ

اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو

يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ

وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں۔ اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی

يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىِٕمٍ ۭ ذٰلِكَ

سے پیش آئیں خدا کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔

فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ

یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور خدا بڑی کشائش والا اور جاننے والا ہے۔ تمہارے دوست

اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ

تو خدا اور اُس کے پیغمبر اور مومن لوگ ہی ہیں جو نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے

Marfat.com

الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَالَّذِیْنَ

اور (خدا کے آگے) جھکتے ہیں۔ اور جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر اور مومنوں سے

اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ ع

دوستی کرے گا تو (وہ خدا کی جماعت میں داخل ہوگا اور) خدا کی جماعت ہی غلبہ پانے والی ہے۔

آیت:۵۳ وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ ۙ اِنَّھُمْ لَمَعَکُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِیْنَ O ”اور اس وقت اہل ایمان کہیں گے کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں‘ جو بڑے زور وشور سے اللہ کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے تھے کہ وہ تو تمہارے ساتھ ہیں؟ ان کے سارے اعمال ڈھے گئے اور وہ نامراد ہو گئے“۔

منافق کے تمام اعمال صالح ضائع ہو جاتے ہیں

مسلمانوں کو ان کے سابقہ طرزِ عمل پر انتہائی تعجب ہو رہا تھا کہ وہ کس طرح بڑھ بڑھ کر اپنی وفاداری اور اخلاص کا ثبوت دیا کرتے تھے۔ نمازوں میں شریک ہوتے‘ زکوٰتیں دیتے‘ جہاد کا اعلان ہوتا تو بڑھ چڑھ کر بہادری اور سرفروشی کی باتیں کرتے۔ اب جو ان کا اصل چہرہ مسلمانوں کے سامنے آیا تو انہیں حیرت اور تعجب ہی ہو سکتا تھا۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ کوئی گروہ اس طرح دو چہروں کے ساتھ بھی زندگی گزار سکتا ہے۔ لیکن منافقین کی مشکل یہ تھی کہ اگر وہ یہ اسلامی زندگی اختیار نہ کرتے تو اسلامی معاشرے میں ان کیلئے رہنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ وہ معاشرہ ہماری طرح کا معاشرہ نہیں تھا کہ جس میں صرف اسلام کا نام لینے سے کام چل سکتا ہو۔ اس معاشرے میں تو ہر آدمی کی شناخت اس کے کردار اور عمل سے ہوتی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ نماز کے وقت میں کوئی آدمی نماز نہ پڑھتا اور اذان کے ہو جانے کے بعد کوئی شخص اپنے گھر میں بیٹھا رہتا اور اگر ایسا عمل کسی سے ظہور پذیر ہوتا تو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین یا تو اسے بیمار سمجھ کر اس کی مزاج پرسی کیلئے اس کے گھر کا رخ کرتے اور اگر معلوم ہوتا کہ وہ صحت مند آدمی ہے تو پھر یہ گمان ہونے لگتا کہ یہ شخص منافق ہے۔ اس لئے منافقین کیلئے اسلام کا لبادہ اوڑھنا ایک مجبوری تھی اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب تھے۔ اب جب ان کے چہرے سے پردہ ہٹا تو مسلمانوں کو ان پر یقیناً تعجب ہونا چاہئے تھا‘ سو ہوا۔ لیکن ان کے وہ اعمال خیر‘ جو وہ مسلمانوں کے ساتھ دکھاوے کیلئے کیا کرتے تھے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ اعمال ان کے ڈھے گئے اور ضائع ہو گئے کیونکہ کوئی عمل بھی ایمان اور اخلاص کے بغیر اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اس کے یہاں عمل کی صورت کے ساتھ ساتھ اس کی حقیقت بھی دیکھی جاتی ہے۔ جب تک یہ دونوں بہم نہ ہوں قبولیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ وہ لوگ نامراد ہو گئے۔ یہ اصلاً اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ یعنی منافقین اسلام کے بارے میں محض اس لئے یکسو نہیں ہو رہے تھے کہ انہیں کفر کے غلبے کی صورت میں نقصان اٹھانے اور نامراد ہونے کا اندیشہ تھا۔ پروردگار ان سے یہ فرما رہے ہیں کہ دیکھو! تمہیں جس نامرادی کا ڈر تھا اور جس نقصان سے تم خوف زدہ تھے‘ اس نقصان سے تم دوچار تو ضرور ہوئے ہو لیکن اس کا سبب وہ نہیں جو تم سمجھتے تھے بلکہ اس کا سبب تمہارا انفاق

Marfat.com

ہے جس نے تمہیں اسلام سے دور رکھا اور تم کفر کی پناہ کو آخری پناہ سمجھتے رہے۔ اب جب کہ اللہ نے اسلام کو غلبہ دیا ہے تو تمہارے لئے اس انجام کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔

ے نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

اس طرح منافقین کو آنے والے دنوں میں جو صورت حال پیدا ہونے والی تھی' اس کا آئینہ دکھا کر انہیں جھنجھوڑا گیا ہے کہ تم اپنی روش پر غور کرو اور اپنی دنیا اور آخرت کی حفاظت کی کوشش کرو' ورنہ یہ روش تمہیں ارتداد تک لے جائے گی کیونکہ نظریۂ حیات کے بارے میں یکسو نہ ہونا اور نظریۂ حیات کے دشمنوں سے پینگیں بڑھانا' یہ اسلام سے تعلق کی علامت نہیں بلکہ اسلام سے دشمنی کے مترادف ہے اور تم اسی راستے پر بڑھتے جا رہے ہو۔ تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری اس روش سے شاید اسلام کو کوئی نقصان پہنچے گا' یہ تمہارا خیالِ خام ہے۔ اس سے اسلام کو تو کیا نقصان پہنچے گا' البتہ تمہاری دنیا اور آخرت تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے ارشاد فرمایا:

آیت: ۵۴ یَاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ یَّرۡتَدَّ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِهٖ فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰهُ بِقَوۡمٍ یُّحِبُّهُمۡ وَیُحِبُّوۡنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ۫ یُجَاهِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰهِ یُؤۡتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ○ ''اے ایمان والو! جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ کو کوئی پرواہ نہیں۔ وہ جلد ایسے لوگوں کو اٹھائے گا' جن سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔ وہ مسلمانوں کیلئے نرم مزاج اور کافروں کے مقابلے میں سخت ہوں گے' اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے' وہ جس کو چاہے بخشے گا اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا ہے اور علم والا ہے''۔

دین کا کام کرنے والوں کی صفات

یہاں خطاب اگرچہ مسلمانوں سے ہے' لیکن روئے سخن منافقین ہی کی طرف ہے۔ ان سے صاف فرمایا جا رہا ہے کہ تم میں سے جو بھی دین سے پھر جائے گا' وہ دین کا کوئی نقصان نہیں کر سکے گا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت کیلئے ایسے لوگوں کو کھڑا کرے گا' جن میں یہ یہ صفات ہوں گی۔

یہاں جن لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے' جن کو ان کے مقابلے میں اٹھایا جائے گا' وہ کون لوگ ہوں گے؟ اس بارے میں اہل تفسیر کی دو رائے ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ آیت درحقیقت آنے والے فتنہ کی پیشین گوئی اور اس کا ہمت کے ساتھ مقابلہ کر کے کامیاب ہونے والی جماعت کیلئے بشارت ہے۔ آنے والے فتنہ سے مراد فتنۂ ارتداد ہے' جس کے کچھ جراثیم تو عہد نبوت کے بالکل آخری ایام میں پھیلنے لگے تھے اور پھر آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد پورے جزیرۃ العرب میں اس کا طوفان کھڑا ہو گیا اور بشارت پانے والی جماعت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ہے جس نے خلیفہ اول حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مل کر اس فتنۂ ارتداد کا مقابلہ کیا۔

واقعات یہ تھے کہ سب سے پہلے تو ''مسیلمہ کذاب'' نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ شریک نبوت ہونے کا دعویٰ کیا اور یہاں تک جرأت کی کہ آپ کے قاصدوں کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اگر ساری دنیا میں قاصدوں اور سفیروں کا قتل کرنا حرام نہ ہوتا تو میں تمہیں قتل کر دیتا۔ اسی طرح یمن میں قبیلہ مذحج کے سردار ''اسود عنسی'' نے اپنی نبوت کا اعلان کر دیا۔ رسول کریم ﷺ نے اپنی طرف سے مقرر کئے ہوئے حاکم یمن کو اسکا مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ جس رات میں اس کو قتل کیا گیا' اس کے اگلے دن ہی آنحضرت ﷺ کی وفات ہو گئی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تک اس کی خبر ربیع الاول کے

Marfat.com

میں پہنچی۔ اسی طرح قبیلہ بنو اسد کے سردار ''طلیحہ بن خویلد'' نے بھی نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ یہ تین وہ جھوٹے اشخاص ہیں' جنہوں نے آپ کی زندگی ہی میں نبوت کا دعویٰ کیا اور اس طرح ارتداد کا راستہ کھولا۔ لیکن آپ کی وفات کی خبر نے اس فتنۂ ارتداد کو ایک طوفانی شکل دے دی اور عرب کے سات قبیلے مختلف مقامات پر اسلام اور اس کی حکومت سے منحرف ہو گئے اور خلیفۂ وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اسلامی قانون کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ سرور کائنات ﷺ کی وفات کے بعد ملک وملت کی ذمہ داری خلیفہ اول حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر عائد ہوئی ایک طرف ان حضرات پر اس حادثۂ عظیم کا صدمہ جاں گداز اور دوسری طرف یہ فتنوں اور بغاوتوں کے سیلاب۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد جو صدمہ میرے والد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر پڑا' اگر وہ مضبوط پہاڑوں پر بھی پڑ جاتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو صبر و استقامت کا وہ اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا کہ تمام آفات ومصائب کا پوری عزم وہمت کے ساتھ مقابلہ کیا اور بالآخر کامیاب ہو گئے۔ اس لئے حضرت علی' حسن بصری' ضحاک' قتادہ وغیرہ جمہور آئمہ تفسیر نے بیان فرمایا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق ؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہی سب سے پہلے اس قوم کا مصداق ثابت ہوئے' جن کے من جانب اللہ میدان میں لائے جانے کا آیت مذکورہ میں ارشاد ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ آیت نمبر 41 جہاں سے اس بحث کا آغاز ہوا' وہاں آنحضرت ﷺ کو خطاب فرما کر پروردگار نے تسلی دی ہے کہ اے پیغمبر! یہ منافقین' جو کفر میں سبقت کرتے جا رہے ہیں' آپ ان کے طرز عمل سے دل گرفتہ نہ ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ حقیقی کمانڈر کو فوج کا ایک ایک سپاہی عزیز ہوتا ہے جبکہ اس کا مقابلہ بھی دنیا بھر کے دشمنوں سے ہو۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ میری فوج کے سپاہیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں' جو بجائے اسلام کو اپنا سب کچھ سمجھنے کے غیر مسلم قوتوں کی آغوش سے نکلنے کا نام نہیں لیتے بلکہ بار بار انہیں کی پناہ میں جانے کی کوشش کرتے ہیں تو کمانڈر کو یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اس طرح میری فوج کی افرادی قوت اور اس کے اصل جوہر میں بھی کمی آ جائے گی تو پھر دنیا بھر کے دشمنوں سے عہدہ برآ ہونا کس طرح ممکن ہوگا۔ آنحضرت ﷺ کے ساتھ ان منافقین کے طرز عمل کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے ہی احساسات تھے' جن پر آپ کو تسلی دی جا رہی ہے اور اس کا اختتام مذکورہ آیت میں اس بات پر ہو رہا ہے کہ آپ افرادی قوت کے کم ہونے کے اندیشہ سے پریشان ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اگر اپنے طرز عمل سے بڑھ کر بھی ارتداد کا راستہ اختیار کر لیں تو یہ اللہ کے دین کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے' اس کا محافظ خود پروردگار ہے۔ ان کے نکل جانے کے بعد وہ ان کی جگہ ایک تازہ دم فوج لائے گا' جو ان جیسے نہیں ہوں گے۔ چنانچہ جب ہم تاریخ کے آئینہ میں دیکھتے ہیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ ''اسود عنسی'' کے مقابلے میں ''ابو مسلم خولانی'' جیسے مجاہدوں نے جان پر کھیل کر اپنا فرض انجام دیا اور یمن کو اپنی ایمانی حرارت سے گرما دیا اور ''مسیلمہ کذاب'' کے چالیس ہزار لشکری' جو اس کی بہت بڑی قوت تھے اور جن کی جنگجوئی اور شجاعت میں پورا عرب رطب اللسان تھا' مسیلمہ کے قتل کے بعد اللہ نے اس پوری قوت کو اس طرح اسلام کی قوت میں ڈھالا کہ انہی کی سرفروشیوں سے عراق اور شام حتیٰ کہ اس زمانے کی بڑی بڑی طاقتیں بالآخر اسلام کی آغوش میں آئیں اور اسلامی قوت کے سامنے یہ ملک سرنگوں ہوتے چلے گئے۔

ایسے پاکیزہ لوگوں کے اٹھانے کی خبر پر پروردگار نے اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ان کی پاکیزہ صفات کا بھی ذکر کیا تاکہ ایک طرف پوری دنیا کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو لوگ اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے اٹھتے ہیں' ان کی صفات کیا ہوتی ہیں اور دوسری طرف منافقین کو یہ بتلانا ہے کہ تم نے اسلام کا لبادہ تو اوڑھ رکھا ہے' لیکن یہ صفات تمہارے اندر نہیں ہیں۔ اگر تم واقعی حقیقی مومن بننا چاہتے ہو تو تمہیں اپنے اندر یہ صفات پیدا کرنی چاہئیں۔ اب ہم ایک

Marfat.com

ایک کر کے ان صفات کا ذکر کرتے ہیں۔

1- اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے کام کرنے والوں میں سب سے پہلی صفت یہ ہوتی ہے:

یُحِبُّھُمْ وَ یُحِبُّوْنَہٗ ﴿اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔﴾

اللہ کی محبت کسی کے نام ونسب' شکل وصورت اور مال وجان سے نہیں' بلکہ ایمان وعمل اور اخلاق وکردار سے ہوتی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ ایمان وعمل اور اخلاق وکردار کا معیار کیا ہے' جس کے نتیجے میں اللہ کی محبت نصیب ہوتی ہے؟ قرآنِ کریم کے قربان جائیے' اس نے اس مشکل سوال کا ایک متعین جواب مرحمت فرمایا ہے۔ فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

﴿اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو پھر میری پیروی کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا﴾ (آل عمران۔31)

یعنی ایمان وعمل کا معیار رسول اللہ ﷺ کی اتباع ہے اور یہ وہ سرمایہ ہے' جس کے حاصل ہو جانے کے بعد اللہ کی محبت نصیب ہو سکتی ہے تو یہ لوگ' جو اللہ کے دین کی علمبرداری کے لئے اٹھیں گے' ان کی پہلی شناخت یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں کامل ہوں گے۔ دوسری بات فرمائی کہ یہ لوگ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ جو آدمی اللہ سے محبت کا دعویدار ہے' وہ یقیناً اسلام کے ساتھ وفاداری کا تعلق رکھتا ہوگا اور اس تعلق کے ساتھ یکسوئی میں اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ وہ اپنی وفاداری اور سرفروشی کا حوالہ اللہ کے سوا کسی اور کو ہرگز نہیں بنائے گا۔ اس کیلئے یہ بات ممکن ہی نہیں ہوگی کہ وہ اللہ کے دین کے دشمنوں کے ساتھ ایسا تعلق رکھے' جس سے اسلام یا مسلمانوں کے مجموعی مفادات پر آنچ آتی ہو۔ اس کا رویہ کبھی ان منافقین جیسا نہیں ہوگا' جو محض اس اندیشہ سے کہ آنے والے دنوں میں ہو سکتا ہے کفر کو غلبہ مل جائے اور ہمارے مفادات محفوظ نہ رہیں' اسلام کی دشمن قوتوں سے پینگیں بڑھانے سے بھی گریز نہ کریں۔ اللہ کے ان سپاہیوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ آنے والے دنوں میں حالات کیسے ہوں گے' خطرات کا عالم کیا ہوگا' کس طرح کے مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ وہ تو صرف ایک بات کو جانتے ہیں کہ ہمیں چونکہ اپنے اللہ سے محبت ہے تو اس سے وفاداری اور اس کے دین کی پابندی ہی ہماری اول وآخر ترجیح ہے اور یہ ہماری محبت کا کم سے کم تقاضہ ہے' یہ بات ہمارے سوچنے کی نہیں کہ اس محبت کی قیمت ہمیں کیا ادا کرنا ہوگی۔ اس کیلئے انہیں سر بھی کٹوانا پڑے تو وہ اسے بھی کوئی بڑی قیمت نہیں سمجھتے۔ انتہائی نامساعد حالات میں ان کی سوچ کا انداز یہ ہوتا ہے۔

ہری ہے شاخِ تمنا' ابھی جلی تو نہیں
دبی ہے آگ دل کی' مگر بجھی تو نہیں
جفا کی تیغ سے گردن وفا شعاروں کی
کٹی ہے برسرِ میداں' مگر جھکی تو نہیں

2- ''اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ'' مسلمانوں کیلئے نرم مزاج۔ ''اَذِلَّةٍ'' یہ ذلیل یا ذلول کی جمع ہے۔ صاحبِ قاموس نے تصریح کی ہے کہ یہ لفظ دونوں کی جمع کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ذلول کا معنی ہے ''نرم خو' نرم مزاج' فرماں بردار' متواضع اور سہل الانقیاد'' یعنی یہ لوگ مسلمانوں کیلئے نہایت نرم خو' بھولے بھالے ہر پہلو سے لچک قبول کرنے والے اور ہر سانچے میں ڈھل جانے والے ہوتے ہیں۔ اللہ انہیں اگر اقتدار بھی عطا کر دے تو ان کی ا

Marfat.com

صفات میں کبھی کمی نہیں آتی۔ ناواقف آدمی انہیں دیکھے تو ایک مزدور سمجھے اور جسے ان سے معاملہ کرنے کا موقع ملے وہ ان کو نہایت وسیع القلب، متحمل اور ایثار کا پیکر پائے۔ اگر کبھی اپنے جائز حقوق کے بارے میں بھی انہیں کسی ضدی اور جھگڑالو آدمی سے واسطہ پڑ جائے تو وہ اپنے جائز حقوق سے دستبردار ہونے سے بھی دریغ نہ کریں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ان کے پیش نظر رہتا ہے:

اَنَا زَعِیْمٌ بِبَیْتٍ فِیْ رَبْضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَکَ الْمِرَاءَ وَھُوَ مُحِقٌّ

﴿میں ضمانت دیتا ہوں عین وسط جنت میں گھر لے کر دینے کی اس آدمی کو جو حقدار ہوتے بھی جھگڑا چھوڑ دے۔﴾

3- ''اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ'' کافروں کے مقابلے میں سخت۔ ''اَعِزَّةٍ'' ''عزیز'' کی جمع ہے۔ یہ بالکل ذلیل یا ذلول کے مقابل لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے معنی ہیں ''سخت، مشکل، بھاری، ناقابل شکست، ناقابل عبور اور عسیر الانقیاد'' یعنی یہ لوگ مسلمانوں کے مقابلے میں نہایت نرم ہوں تو ہوں، لیکن کافروں کے مقابلے میں پتھر کی چٹان ہوتے ہیں۔ وہ اگر اپنے اغراض و مقاصد کیلئے ان کو استعمال کرنا چاہیں تو کہیں سے انگلی دھنسانے کی جگہ نہ پا سکیں۔ ان کی صحیح منظر کشی اقبال نے کی ہے

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

اس کے برعکس منافقین کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ دینے کیلئے تو بڑے ہوشیار اور گھاگ ہوتے ہیں۔ پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے لیکن یہود اور مشرکین کے ہاتھوں میں موم کی ناک اور کٹھ پتلی بنے رہتے ہیں۔ وہ جس طرف چاہتے ہیں انہیں موڑتے اور جس طرح چاہتے ہیں انہیں نچاتے ہیں۔ قرنِ اول کے مسلمانوں میں ہمیں بڑے سے بڑے معرکے میں بھی مسلمانوں کی یہ صفت چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ دشمن کیلئے ایک ایک مسلمان لوہے کا چنا ثابت ہوتا ہے، لیکن جب ان کا معاملہ مسلمانوں سے پڑتا ہے تو یہ ریشم سے زیادہ نرم ثابت ہوتے ہیں۔

4- ''یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ط'' وہ لوگ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتے نہیں ہیں۔ ان پاکیزہ صفات لوگوں کی یہ چوتھی صفت ہے، جو پہلی تین صفات کا منطقی نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ صرف اللہ ہی سے محبت کریں اور اللہ کے مقابلے میں دشمن قوتوں کے سامنے سرنگوں ہونے سے انکار کر دیں اور دشمن انہیں ہر قیمت پر اپنے سامنے سرنگوں ہونے کیلئے مجبور کریں تو پھر ان کے سامنے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ اللہ کی محبت کا حق ادا کرتے ہوئے اور اس کے دین کی سربلندی کیلئے اعلائے کلمۃ الحق کا فرض انجام دیتے ہوئے، جو کچھ ان کے بس میں ہے، وہ کر گزریں۔ جہاد اپنی ہمت اور توانائی کو آخری حد تک اللہ کے دین کی گواہی اور کلمۂ حق کی سربلندی کیلئے خرچ کرنے اور کھپا دینے کا نام ہے۔ یہ سعی و محنت کبھی علمی اسلوب میں ہوتی ہے تو استدلال کی قوت، افکار کی صداقت و سطوت اور زبان و قلم کی رعنائی سے کام لیا جاتا ہے۔ لوگوں میں نفوذ پیدا کرنے کیلئے دوڑ بھاگ اور میل ملاپ سے کام لیا جاتا ہے۔ کبھی پاکیزہ سیاسی طور اطوار اختیار کر کے ریاست کے مختلف اداروں میں فہم و تفہیم کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ کبھی قانونی اور آئینی جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ لیکن اگر ان تمام راستوں کو بالجبر بند کرنے کی کوشش کی جائے یا دشمن دین قوتیں مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیں تو پھر قتال تک بھی نوبت پہنچ سکتی ہے، نتیجتاً جہاد قتال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اب مسلمان اپنے پاس

Marfat.com

موجود قوت کے تمام ذرائع اور وسائل سے کام لیتے ہوئے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن یہ جو کچھ ہوگا، فی سبیل اللہ ہوگا یعنی اللہ کے راستے میں ہوگا' اپنے نفس کے راستے میں یا شہرت ونمود کی خاطر یا قوم کے مالی مفادات کیلئے یا محض اپنی کلغی اونچی کرنے کیلئے نہیں ہوگا۔اس کا مقصد اعلائے کلمۃ الحق اور اللہ کی رضا کا حصول ہوگا اور اگر اس پر اس سے متصادم کسی اور جذبے یا خواہش کی پرچھائیں بھی پڑ جائے تو یہ ساری تگ ودو اور جہاد وقتال مسموم ہو کر رہ جاتا ہے اور اسلام میں اس کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔واضح ہے کہ یہ ایک جانگسل مرحلہ ہے اور جان پر کھیل جانے کی ایک کوشش ہے۔جس کو اختیار کرنے سے پہلے آدمی کو ہر طرح کے علائق سے دامن کشاں ہونا پڑتا ہے۔وہ پوری سنجیدگی سے اس راستے پر چلنے سے پہلے اس کے مخالف تقاضوں کو نظر انداز کر کے یکسو ہو جاتا ہے اور اگر کوئی اس راستے میں اس کیلئے عناں گیر ہونا چاہتا ہے تو وہ جھٹک کر اپنے راستے پر چل پڑتا ہے۔اس لئے یہاں ارشاد فرمایا گیا کہ وہ لوگ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور پھر کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتے نہیں ہیں کیونکہ وہ اپنے گھر سے یہ فیصلہ کر کے نکلتے ہیں کہ اس راستے میں ہمیں کسی کی بات سننی نہیں ہے اور زندگی کا تجربہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی انسان کسی بڑے اقدام کا فیصلہ کرتا ہے اور کسی بھی عزم وجزم والے راستے پر چلنے کی کوشش کرتا ہے اور یا ایسا فرض انجام دینا چاہتا ہے' جس میں قدم قدم پر بلاؤں سے واسطہ پڑسکتا ہے تو سب سے پہلی چیز جو اس کا دامن کھینچتی ہے' وہ یہی ملامت کرنے والے کی ملامت ہے یعنی اپنے احباب کا حلقہ' اس کیلئے حلقۂ زنجیر بن جاتا ہے۔اس کے عزیز واقارب بات بات پر اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تم آخر یہ کیا کام کرنے لگے ہو۔ایک بالکل معمولی سی مثال سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ کوئی آدمی اگر اپنے بچے کو اس خیال سے کسی دینی مدرسے میں داخل کروا دے کہ کم ازکم میں اپنے ایک بیٹے کو عالم بنا کر اللہ کے سامنے سرخرو ہو جاؤں تو پورا خاندان اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے کہ تم اپنے بچے کو مسیتڑ بنا کر کیوں برباد کرنے لگے ہو۔اگر کوئی آدمی تنگی ترشی میں گزارا کرتا ہے' جب کہ وہ ایک ایسی سیٹ پر بیٹھا ہے جس میں مالِ حرام کمانے کے ذرائع کشادہ ہیں تو اس کے دفتر کے احباب نصیحتوں سے اس کا جینا مشکل کر دیں گے۔بے شمار مثالیں ہیں' جو ہمارے گردوپیش میں پھیلی ہوئی ہیں' جس میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نیکی پر چلتے ہوئے جو سب سے پہلے اور نہایت جاندار قسم کی رکاوٹ پیش آتی ہے' وہ یہی سمجھانے والوں کا سمجھانا اور ملامت کرنا ہے۔اس لئے ہم شعرا کو دیکھتے ہیں' چاہے وہ عرب کے ہوں یا عجم کے کہ جب وہ عشق کی وادی میں داخل ہوتے ہیں' یہ چونکہ سب کچھ کھو دینے والی وادی ہے تو وہ سب سے پہلے انہی ملامت کرنے والوں کی ملامت اور ناصحین کی نصیحت کا ذکر کرتے ہیں۔دور کیوں جائیے ہمارے اردو کا بہت بڑا شاعر مرزا غالب بھی بڑے عزم کے ساتھ ناصحین کی نصیحت کو رد کرتا ہوا کہتا ہے:

حضرتِ ناصح گر آویں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا وے کہ سمجھائیں گے کیا

اور پھر وہ دوستوں کی شکایت کرتا ہوا کہتا ہے

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا' کوئی غمگسار ہوتا

مختصر یہ کہ فتنۂ ارتداد کا مقابلہ کرنے کیلئے اللہ جس اولوالعزم گروہ کو اٹھائے گا' ان کی یہ پاکیزہ صفات ہوں گی۔لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایک صفت بھی ان میں ہوگی کہ وہ اپنی ان صفات کو اپنی ذاتی صلاحیتوں اور محنتوں کا نتیجہ نہیں سمجھیں گے۔وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ ایمان وعمل کی راہ پر چلنا اور ان کا حق ادا کرنا ہر آدمی کی ذمہ داری ہے۔لیکن یہ راستہ اللہ کی توفیق کے بغیر سر ہونا ممکن نہیں ہے اور اگر اس راستے میں

Marfat.com

کامیابیاں ملیں تو شیطان پھر بہکانے کی کوشش کرتا ہے اور دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ تم تو ماشاء اللہ بڑی قد آور شخصیت بن گئے ہو۔ اسلئے فرمایا کہ ان کے باطن کی پاکیزگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ﴿یہ اللہ کا فضل ہے‘ وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔﴾

ان کی یہ ساری صفات اللہ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہیں اور یہ فضل جسے بھی ملتا ہے‘ اس کی توفیق سے ملتا ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اس کی مشیت اور اس کی توفیق بندوں کی محنت و عمل اور حسن نیت کو دیکھ کر فیصلہ کرتی ہے۔ لیکن ہر بات کا سر رشتہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے‘ اس لئے ہمیشہ اسی سے مانگتے رہنا چاہئے۔ بقول اکبر

؎ کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہو گا
ہم کیا ہیں‘ جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو ہوا‘ ہوا کرم سے تیرے
جو ہو گا‘ تیرے کرم سے ہو گا

صفات کے اس آئینہ میں اصلاً منافقین کو اپنی شکل دیکھنے کا موقع دیا جا رہا ہے کہ اللہ کے راستے پر چلنے والے اور ایمان و یقین کا حق ادا کرنے والے لوگ‘ وہ ان صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ تو صرف اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ ہی کے راستے میں فدا ہوتے ہیں۔ دشمنانِ دین سے وہ کبھی ایسا تعلق قائم کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے‘ جس سے اسلامی صفوں میں دراڑیں پڑ سکیں۔ اس کے برعکس تم اچھی طرح اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھو‘ تمہیں صاف نظر آئے گا کہ تم ان صفات میں سے کسی صفت کے بھی حامل نہیں ہو۔ تمہیں بجائے اللہ سے محبت کے‘ یہود و نصاریٰ سے محبت ہے۔ تم بجائے اللہ پر اعتماد کرنے اور اسے معتمد سمجھنے کے‘ تم یہود و نصاریٰ کو اپنا معتمد سمجھتے ہو اور اپنے مستقبل میں انہی پر اعتماد رکھتے ہو۔ اب بھی تمہارے لئے سمجھنے کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اس لئے اب ہم مثبت انداز میں تمہیں توجہ دلا رہے ہیں کہ اچھی طرح اس بات کو سمجھ لو کہ زندگی میں تمہارا ولی‘ تمہارا دوست اور تمہارا معتمد کون ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت: ۵۵ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ ○ ”تمہارے دوست اور معتمد تو بس اللہ‘ اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں‘ جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں فروتنی کے ساتھ“۔

مسلمان قوم کے دوست

یعنی تم یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست اور معتمد نہ بناؤ بلکہ اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا دوست اور معتمد بناؤ۔ تمہارا ایمان‘ اگر تمہیں واقعی اس سے کوئی تعلق ہے تو وہ تمہیں ان سے جوڑتا ہے‘ یہود و نصاریٰ سے نہیں۔ اللہ اور رسول سے زیادہ تو ظاہر ہے کوئی ہمدرد‘ غمگسار‘ مشکل وقت میں مدد دینے والا اور بے بسی میں سہارا بننے والا اور کون ہو سکتا ہے اور جہاں تک تعلق ہے مسلمانوں کا‘ ظاہر ہے ایمان کے دعوے داروں کے ساتھ ان سے بڑھ کر اور کس کا قریبی رشتہ ہو سکتا ہے۔ اسلامی اخوت اور اسلامی حمایت اور حمیت نے جس طرح مسلمانوں کو جسد واحد بنا دیا ہے‘ اس کی موجودگی میں ان کو چھوڑ کر کسی اور سے رسم و راہ پیدا کرنا حماقت کے سوا اور کچھ نہیں ہے‘ اس لئے ان کمزور مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم صحیح راستے کو چھوڑ کر ایک غلط راستے پر چل نکلے ہو اور مزید یہ بھی فرمایا کہ مسلمان بھی ایسے ہونے چاہئیں جو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں فروتنی اور

Marfat.com

عاجزی کی تصویر ہوں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان جو مسلمانوں کو اعتماد کی دولت فراہم کرتے ہیں اور جن پر ہر معاملے میں اعتماد کیا جاسکتا ہے اور جو اسلام کی اصل قوت ہیں' وہ وہ ہیں جن کا نماز' زکوٰۃ' عاجزی اور انکساری سے رشتہ ہے کیونکہ جو مسلمان نماز نہیں پڑھتا' وہ گویا اللہ کے عہد وفا سے انحراف اختیار کرتا ہے اور جو زکوٰۃ نہیں دیتا وہ مال و دولت کو اللہ کی امانت کی بجائے ذاتی ملکیت سمجھتا ہے اور جو انکساری اختیار نہیں کرتا' یقیناً اس کے اندر تکبر اور غرور کا مادہ ہوگا۔ایسا شخص مسلمانوں کے اجتماعی معاشرے میں معاشرت کے توازن کو درہم برہم کرنے کا سبب بنتا ہے تو ایسے مسلمان تو اپنے لئے بھی طاقت کا باعث نہیں ہوتے باقی اسلامی سوسائٹی کو کیا طاقت دے سکتے ہیں۔مزید فرمایا:

آیت:۵۶ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ O ''اور جو اللہ اس کے رسول اور اہل ایمان کو دوست بناتے ہیں تو وہ اللہ کی جماعت ہیں اور اللہ ہی کی جماعت ہے' جو غالب رہنے والی ہے''۔

آخری فتح مومنین ہی کی ہوگی

یہاں ایک بہت بڑی حقیقت کا انکشاف کیا جارہا ہے' جو آج ہمارے لئے بھی چشم کشا ہے اور اس دور کے منافقین کیلئے بھی سبق آموز تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہود و نصاریٰ اور دوسرے کفار چونکہ ابھی تک بڑی طاقت کے مالک ہیں' اس لئے ان سے ترک تعلق نہیں ہوسکتا ورنہ کسی بھی نقصان کا اندیشہ ہوسکتا ہے اور آج ہم بھی یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت' قوت اور طاقت ہے۔اسلئے' ہمیں اپنے مسائل کے حل اور اپنی بقا کے سروسامان کیلئے ان قوتوں کی طرف دیکھنا چاہئے' جو دنیا کو لیڈ (Lead) کررہی ہیں۔لیکن یہاں پروردگار اس حقیقت کا انکشاف فرمارہے ہیں کہ اصل طاقت اللہ کے پاس ہے اور اس کی طاقت اس قوم کے ہم رکاب ہوتی ہے' جو اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کا تعلق رکھتی ہے' جس کا ذکر گزشتہ آیات میں ہوچکا اور اپنے اندر وہ صفات پیدا کرلیتی ہے' جن کا گزشتہ آیات میں شمار کیا گیا ہے۔اس صورت میں وہ ایک قوم نہیں رہتی بلکہ وہ ایک قطرہ ہوتے ہوئے بھی اللہ کی قوت کے بے پناہ سمندر کا حصہ بن جاتی ہے۔اب اس کی طاقت ایک قطرے کی طاقت نہیں بلکہ سمندر کی طاقت ہے۔اب ریت کا طوفان بھی اس پر غالب آکر اسے خشک کرنے کی کوشش کرے تو ناکامی کا منہ دیکھے گا۔اب یہ قوم محض انسانوں کا ایک ہجوم نہیں رہتی بلکہ یہ اللہ کی جماعت اور پارٹی ہے اور اللہ کی پارٹی کو اور اس کی جماعت کو دنیا کی پارٹیاں اور جماعتیں شکست نہیں دے سکتیں کیونکہ اس کی شکست اللہ کی شکست ہوگی اور اللہ تو ہمیشہ غالب رہتا ہے۔اسی طرح اللہ کی جماعت بھی ہمیشہ غالب رہتی ہے۔یہی وہ بات ہے جس کو اقبال نے کہا:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا و کارساز

....

اے ایمان والو! ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ' جنھوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنالیا ہے۔ان لوگوں میں سے

Marfat.com

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا

اے ایمان والو! جن

تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

لوگوں کو تم سے پہلے کتابیں دی گئی تھیں اُن کو اور کافروں کو جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا

الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ

رکھا ہے دوست نہ بناؤ اور مومن ہو تو خدا سے

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ

ڈرتے رہو۔ اور جب تم لوگ نماز کے لیے اذان دیتے ہو تو یہ اُسے بھی ہنسی اور کھیل

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ

بناتے ہیں یہ اس لیے کہ سمجھ نہیں رکھتے ف۔ کہو کہ اے اہل کتاب! تم ہم میں بُرائی ہی کیا دیکھتے

مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ

ہو سوا اس کے کہ ہم خدا پر اور جو (کتاب) ہم پر نازل ہوئی اس پر اور جو (کتابیں) پہلے نازل ہوئیں

اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً

اُن پر ایمان لائے ہیں۔ اور تم میں اکثر بدکردار ہیں۔ کہو کہ میں تمہیں بتاؤں کہ خدا کے ہاں اس سے بھی بدتر جزا پانے

عِنْدَ اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ

والے کون ہیں وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی اور جن پر وہ غضبناک ہوا اور (جن کو) ان میں سے بندر

وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ

اور سور بنا دیا اور جنہوں نے شیطان کی پرستش کی ایسے لوگوں کا بُرا ٹھکانا ہے اور وہ سیدھے

سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾ وَاِذَا جَاۗءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَ

رستے سے بہت دور ہیں۔ اور جب یہ لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے حالانکہ کفر

Marfat.com

هُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿٦١﴾ وَتَرٰى كَثِيْرًا

لے کرتے ہیں اور اُسی کو لے کر جاتے ہیں۔ اور جن باتوں کو یہ مخفی رکھتے ہیں خدا اُن کو خوب جانتا ہے۔ اور تم دیکھو گے

مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ

کہ اُن میں اکثر گناہ اور زیادتی اور حرام کھانے میں جلدی کر رہے ہیں بے شک یہ جو کچھ

مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٢﴾ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ

کرتے ہیں بُرا کرتے ہیں۔ بھلا ان کے مشائخ اور عُلماء انہیں گناہ کی باتوں

قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَ

اور حرام کھانے سے منع کیوں نہیں کرتے؟ بلاشبہ وہ بھی بُرا کرتے ہیں۔ اور

قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا

یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ (گردن سے) بندھا ہوا ہے۔ (یعنی اللہ بخیل ہے) انہیں کے ہاتھ باندھے جائیں

بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ

اور ایسا کہنے کے سبب اُن پر لعنت ہو (اس کا ہاتھ بندھا ہوا نہیں) بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جس

مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۭ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ

طرح اور جتنا چاہتا ہے خرچ کرتا ہے اور (اے محمدؐ) یہ (کتاب) جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئی اس سے

وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا

ان میں سے اکثر کی شرارت اور انکار اور بڑھے گا۔ اور ہم نے ان کے باہم عداوت اور بُغض قیامت تک کے لیے ڈال دیا ہے۔

اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٤﴾

یہ جب لڑائی کے لیے آگ جلاتے ہیں خدا اُس کو بجھا دیتا ہے اور یہ مُلک میں فساد کے لیے دوڑے پھرتے ہیں اور خدا

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ

فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور اگر اہلِ کتاب ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے۔ تو ہم اُن سے اُن کے

Marfat.com

وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ

گناہ محو کردیتے اور اُن کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے۔ اور اگر وہ تورات اور انجیل کو

وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ

اور جو اور کتابیں) اُن کے پروردگار کی طرف سے اُن پر نازل ہوئیں اُن کو قائم رکھتے تو اُن پر رزق مینہ کی طرح

وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۭ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ

برستا کہ) اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔ ان میں کچھ لوگ میانہ رو ہیں اور بہت سے ایسے ہیں

سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٦﴾ ع

جن کے اعمال برے ہیں

تمہید

افراد ہوں یا اقوام' جب وہ نظریاتی قوت یا سیرت و کردار کی عظمت سے محروم ہو جاتی ہیں تو وہ ہمیشہ اپنے معاملات کو صرف نفع و ضرر کے حوالے سے دیکھتی ہیں۔ جہاں وہ محسوس کرتی ہیں کہ ہمیں یہاں سے نقصان پہنچ سکتا ہے' وہ اس کے قریب جانا بھی پسند نہیں کرتیں۔ اسی طرح وہ اپنے تعلقات کو بھی عافیت و خطر کے حوالے سے متعین کرتی ہیں۔ جہاں انہیں خطرے کا احساس ہوتا ہے یا وہ سمجھتی ہیں کہ ان کی بقا کیلئے کوئی مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے تو وہ ایسے تعلق کو ترجیح دینے کیلئے تیار نہیں ہوتیں۔ گزشتہ رکوع میں کمزور مسلمانوں اور منافقین کو اسی طرز عمل میں ہم نے گرفتار دیکھا ہے۔ وہ یہود و نصاریٰ سے اس لئے ترک تعلق پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے کیونکہ ابھی تک وہ کفر کو عرب کی غالب قوت سمجھتے تھے۔ لیکن عرب قوم میں بہت ساری خصوصیات میں سے ایک نہایت اہم خصوصیت جو قابل ذکر ہے' وہ یہ ہے کہ اس کے افراد میں حمیت و غیرت کا عنصر ہمیشہ غالب رہتا تھا۔ جب کسی چیز میں وہ یہ دیکھتے تھے کہ ان کی حمیت و غیرت پر حرف آ سکتا ہے تو وہاں وہ ہر طرح کے نقصان یا خطرے کو نظرانداز کرنے کیلئے تیار ہو جاتے تھے۔ لیکن اپنی حمیت کو ہاتھ سے کھونے کیلئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ اس رکوع کی پہلی آیت میں ان کی اسی قومی خصوصیت کو حوالہ بنا کر انہیں راہ راست دکھانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور سابقہ حکم ان کی اس خصوصیت کے حوالے سے دوبارہ دیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت: ۵۷ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ ''اے ایمان والو! ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ' جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنا لیا ہے۔ ان لوگوں میں سے' جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور نہ کفار کو اور اللہ سے ڈرو! اگر تم مومن ہو؟''۔

یعنی اگر تمہارا ایمان کے ساتھ کوئی بھی رشتہ ہے اور تم اسلام کو واقعی اپنا دین قرار دے چکے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اس دین سے ایک نسبت ہے اور اس دین کو تم سے نسبت ہے تو کیا تم یہ نسبت رکھتے ہوئے بھی ان لوگوں سے تعلق قائم کرنا برداشت کرو گے' جو تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں؟ جبکہ تمہاری قومی روایت یہ ہے کہ تمہارا تعلق جس چیز سے بھی ہو تم اس کی توہین و تذلیل کبھی برداشت نہیں کرتے' کسی قبیلے کا سردار بھی اگر تمہارے غلام پر ہاتھ اٹھائے اور وہ غلام تمہارے قبیلے کا نام لے کر تمہیں اپنی مدد کیلئے پکارے تو تم بے سوچے سمجھے تلواریں سونت کے نکل پڑتے ہو اور اس وقت تک تلواریں بے نیام رکھتے ہو' جب تک تم اپنے غلام کی توہین کا بدلہ نہیں لے لیتے حالانکہ تمہارے معاشرے میں ایک غلام کی کسی قبیلے کے سردار کے مقابلے میں کیا حیثیت ہے۔ لیکن چونکہ وہ غلام تمہارا ہے اور تم سے اسے ایک نسبت ہے' تم اس نسبت کو اپنی حمیت کا حوالہ سمجھتے ہو۔ اگر زندگی کے عام معاملات

Marfat.com

میں تمہارا یہ رویہ ہے تو دین تو زندگی کا سب سے نازک رشتہ ہے۔ اس معاملے میں تم یہ بے حمیتی کیسے گوارا کر لیتے ہو کہ اہل کتاب اور دوسرے کفار تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں اور تم پھر انہی سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو۔

ان اہلِ کتاب کے بعض اشرار کا یہ رویہ تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی مجلس مبارک میں آتے تو طریقے طریقے سے شرارتیں کرتے اور دل کے پھپھولے پھوڑتے۔ آنحضرت ﷺ کو آ کر بظاہر سلام کہتے' لیکن حقیت میں بدتمیزی کرتے۔ بجائے ''السلام علیکم'' کہنے کے ''السام علیکم'' کہتے۔ ''السلام علیکم'' کا معنی تو ہے آپ پر سلامتی ہو اور ''السام علیکم'' کا معنی ہے' آپ کو موت آئے۔ لیکن وہ اس طرح دبی زبان میں کہتے کہ مسلمانوں کو اس احساس نہ ہوتا۔ ایک دن انہی میں سے کچھ لوگ آنحضرت ﷺ سے گھر پر ملنے کیلئے آئے اور اسی خباثت کا اظہار انہوں نے پھر کیا' حضرت عائشہ پسِ پردہ بیٹھی تھیں' انہوں نے سنا تو آگ بگولہ ہوگئیں اور کہا کہ اللہ کرے تمہیں موت آئے اور تم پر اللہ کی لعنت ہو۔ آنحضرت ﷺ نے روکا اور فرمایا یـا عـائشه الرفق الرفق ''نرمی نرمی'' جس کو اللہ نے نرمی سے محروم کردیا' اس کو نصف دین سے محروم کردیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا یارسول اللہ: آپ نے سنا نہیں' انہوں نے کیا کہا۔ فرمایا میں نے سنا اور جواب بھی دے دیا۔ انہوں نے کہا ''السام علیکم'' یعنی تمہیں موت آئے میں نے کہا ''وعلیکم'' اور تمہیں بھی آئے۔ اخلاق کی کیا بلندی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے السلام کا لفظ زبان مبارک پر لانا گوارا نہیں فرمایا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی عادت تھی کہ جب آنحضرت ﷺ کی گفتگو میں کسی لفظ کے بارے میں انہیں شبہ ہوتا اور وہ اسے جاننا چاہتے تو کہتے ''یارسول اللہ راعـنا' اے اللہ کے رسول ہماری رعایت فرمایئے۔ یعنی وہ بات دھرا دیجئے۔ لیکن یہ یہود کے اراذل اور کمینے جب حضور ﷺ کی خدمت میں آتے تو ایسے موقعوں پر ''راعـنا'' کی بجائے ''راعـینا'' کہتے۔ یعنی اے ہمارے چرواہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں پروردگار نے اس لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کو روک دیا تاکہ یہود اس سے فائدہ نہ اٹھا سکیں اور حکم دیا کہ تم ''راعنا'' کی بجائے ''انظرنا'' کہا کرو۔ اہل کتاب کا یہ وہ رویہ تھا جس کی طرف یہاں توجہ دلائی جارہی ہے کہ وہ تو ہر موقع پر اس طرح کی حرکتوں سے باز نہیں آتے اور تم پھر انہی کے ساتھ دوستی کا تعلق رکھنا چاہتے ہو۔ پھر اگلی آیت میں اس کی ایک بہت نمایاں مثال بھی ذکر فرمائی۔

آیت:۵۸ وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ ۝ ''اور جب تم نماز کیلئے منادی کرتے ہو تو یہ اس کو مذاق اور کھیل بنا لیتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ یہ ایسے لوگ ہیں' جو عقل نہیں رکھتے''۔

ان یہودی اشرار کی اسلام دشمنی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ یہ اذان کا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتے۔ اس کی بھونڈی نقلیں اتارتے ہیں ہنستے اور مذاق اڑاتے ہیں۔ اس سلسلے میں احادیث میں ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک یہودی تھا' جس کا معمول یہ تھا کہ جب بھی اذان ہوتی تو وہ اس کی نقل اتارتا اور مذاق اڑاتا اور جب کہا جاتا ''اشهد ان محمد رسول الله'' تو وہ کہتا ''احرق الله الكاذب'' ''اللہ جھوٹے کو جلائے'' یعنی وہ حضور ﷺ کو جھوٹا کہتا اور آپکے جلانے کی بددعا دیتا۔ اللہ نے اس کو سزا دی کہ ایک رات جب وہ اور اس کے گھر والے سب سو رہے تھے' اس کا غلام آگ لے کر گھر میں داخل ہوا نہ جانے کیسے کوئی شعلہ اڑ کر کسی کپڑے پر جا پڑا۔ وہ غلام جا کر سو گیا۔ رات کے کسی حصے میں آگ بھڑک اٹھی اور اس یہودی سمیت اس کے تمام اہل خانہ جل کر بھسم ہوگئے۔ ان کا یہ رویہ اسلام کے اس حکم کے بارے میں تھا' جس کے بارے میں اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شعائر اسلام میں سے ہے۔ جس کی عزت و حرمت کا تحفظ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ جب ان کی ان خباثتوں سے شعائر اسلام بھی محفوظ نہیں ہیں تو اس سے ان کی اسلام دشمنی کی گہرائی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ مگر کمال ہے ان نام نہاد مسلمانوں پر جو یہود کی اسلام دشمنی کی گہرائی کو محسوس بھی کرتے ہیں مگر پھر

Marfat.com

ان کی حمیت وغیرت پر آنچ نہیں آتی۔

اس آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں' جو عقل نہیں رکھتے۔ اس سے ایک اہم حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اذان فی الحقیقت نماز یعنی عبادت کی طرف بلانے کا ایک ذریعہ ہے۔ عبادت کی طرف بلاوا چاہے کسی مذہب کی طرف سے بھی آئے وہ لائق احترام ہے۔ عام انسانی عقل بھی اس کی تائید کرتی ہے' کیونکہ عبادت دنیا کے ہر مذہب میں رہی ہے۔ آسمانی مذاہب میں تو نماز کا حکم بھی ہمیشہ موجود رہا۔ خود یہود کیلئے تورات میں اس کا حکم نازل کیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان بدبختوں نے سب سے پہلے نماز ہی کو ضائع کیا۔ قرآن کریم ان کی اس گمراہی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ

﴿پھر ان کے بعد نالائق جانشین آئے' جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور شہوات کی پیروی کرنے لگے﴾ (مریم ۱۹:۵۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانی مذاہب رکھنے والی قومیں' جب تنزل کا شکار ہوتی ہیں تو سب سے پہلے نماز ہی ان کی زندگیوں سے خارج ہوتی ہے اور نماز کا اہتمام رفتہ رفتہ ان سے جاتا رہتا ہے۔ مسلمان بھی اہل کتاب ہی کی طرح ایک امت ہیں' جن کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی یہ تنبیہ ریکارڈ پر موجود ہے کہ جن راستوں سے برائیاں اہل کتاب میں آئیں' انہی راستوں سے تم میں بھی آئیں گی۔ اس لئے ہماری یہ ملی اور دینی ذمہ داری ہے کہ اہل کتاب چونکہ نماز چھوڑ کر گمراہ ہوئے۔ ہم اپنی قوم کو اس بربادی کے راستے پر چلنے سے روکیں اور اسے تباہی سے بچائیں اور اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو جس طرح سابقہ امتیں تباہ ہوئیں' اس امت کو بھی تباہی سے بچایا نہیں جاسکے گا۔ اس وقت اس امت کی غالب اکثریت نماز سے بیگانہ ہو چکی ہے' جمعہ تک کی پابندی ختم ہوگئی ہے اور جہاں تک نماز کی حقیقی روح کا تعلق ہے' اس کا وجود تو شاید تلاش کرنے سے بھی مشکل سے ملے۔ کہنا یہ ہے کہ نماز ہر مذہب میں موجود رہی اور نماز کی طرف بلانے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ بھی رہا' جس کو اذان کہا جاتا ہے۔ اب اگر اہل کتاب اس نماز اور نماز کی طرف بلانے والی ندا کی توہین کرنے پر تل جائیں تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ بنیادی طور پر عقل سے محروم ہوگئے ہیں۔ کیونکہ انہیں اگر دشمنی ہے تو وہ اسلام اور مسلمانوں سے ہے' لیکن اللہ کا نام لینا اور اللہ کا نام لے کر نماز کی طرف بلانا' اس میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ان کی دشمنی کو انگیخت کرتی ہو۔ لیکن اگر یہ بھی انہیں گوارا نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دشمنی نے ان کی عقل پر غلبہ پالیا ہے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے' اس کے برخلاف ہم مسلمانوں کا رویہ یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے کبھی ان کی عبادت گاہوں کی توہین نہیں کی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت اسامہ کے لشکر کو روانہ کرتے ہوئے جو ہدایات دی تھیں' اس میں واضح طور پر یہ حکم دیا تھا کہ تم راستے میں اہلِ کتاب کی عبادت گاہوں سے گزرو گے' دیکھنا! انہیں نقصان نہ پہنچانا۔ ان عبادت گاہوں میں تمہیں تارک الدنیا راہب ملیں گے ان سے تعرض نہ کرنا کیونکہ عبادت تو ایک مشترکہ سرمایہ ہے۔ بنیادی اعتقادات اور شرعی معاملات زیر بحث آسکتے ہیں لیکن مشترکہ اقدار پر تو دشمنی کا تماشہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اہلِ کتاب اپنی دشمنی میں حد سے گزر چکے تھے۔ اس لئے منافقین کو اس طرف توجہ دلاتے ہوئے اصل حقیقت کو سمجھنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔ اس طرح ممکن ہے کہ ان نام نہاد مسلمانوں کے پندار کو ٹھیس لگے اور وہ راہ راست اختیار کرنے پر تیار ہو جائیں۔

اہل کتاب کی دشمنی کے ذکر کے بعد پروردگار آنحضرت ﷺ کو حکم دیتے ہیں کہ آپ ان اہل کتاب سے ایک سوال کیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۵۹ قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ هَلۡ تَنۡقِمُوۡنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَاَنَّ اَكۡثَرَكُمۡ فٰسِقُوۡنَ ۝ ''اے پیغمبر ان سے کہئے کہ اے اہل کتاب! تم ہم پر بس اس بات کا غصہ نکال رہے ہو کہ ایمان لائے ہم اللہ پر اور اس چیز پر' جو ہماری طرف

Marfat.com

بھیجی گئی اور اس چیز پر' جو پہلے اتاری گئی اور تم میں اکثر نافرمان ہیں''۔

یہود و نصاریٰ کی مسلمانوں سے وجہ دشمنی

مسلمانوں کے ساتھ یہود دشمنی کی پوری داستان اور اس سلسلے میں ان کی طرف سے کی جانے والی دشمنی پر مبنی شرارتوں میں سے چند ایک کا ذکر کرنے کے بعد ان سے پوچھا گیا ہے کہ آخر تم مسلمانوں سے اس قدر دشمنی کیوں روا رکھتے ہو؟ معلوم تو ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کے ساتھ تمہاری دشمنی کے اصل اسباب کیا ہیں؟ بظاہر تو مسلمانوں کا اس کے سوا اور کیا گناہ ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے ہیں اور تم پر جو کتابیں اتری ہیں' ان پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ ان پر نازل کیا جا رہا ہے' اسے وہ مانتے اور اس پر عمل کرتے ہیں اور تمہیں خوب معلوم ہے کہ جتنے بھی دنیا میں پیغمبر آئے ہیں اور جتنی ان پر کتابیں اتری ہیں' ان سب کا مرکز ہدایت ایک ہے۔ ان کی بیان کردہ بنیادی صداقتوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ ایک ہی روشنی ہے' جو تمام کتابوں میں یکساں نور بن کر دکھائی دیتی ہے۔ پھر ان پیغمبروں اور کتابوں کا اسلوب دعوت ایک ہے۔ باہمی ایک دوسرے سے اس حد تک مماثل ہیں کہ پہلے پیغمبروں اور کتابوں کا جاننے والا قرآنِ کریم اور صاحب قرآن کی پہچان میں کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔ انہی بنیادی صداقتوں کو ماننے والے مسلمان ہیں اور وہ انتہائی اخلاص کے ساتھ اس نازل کردہ شریعت کے ایک ایک حکم پر نہایت خوش دلی سے عمل کر رہے ہیں۔ یہ جرم ایسا ہے' جو کل تک تمہارے اسلاف بھی کر چکے اور تم خود اسی کو راہِ راست سمجھتے ہو' اب آخر اس میں ایسی کیا بات ہے کہ تم نے واقعی اس کو جرم قرار دے کر مسلمانوں کے ساتھ ہر طرح کی دشمنی پر ادھار کھا رکھا ہے؟ حالانکہ قابلِ نفرت اور قابلِ مذمت اگر کوئی رویہ ہے تو وہ تمہاری اکثریت کا ہے کیونکہ وہ تمہاری اپنی شریعت کے نافرمان اور باغی ہیں' لیکن تم سب اپنے کرتوتوں کے باوجود ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہو اور علماء تک کو ان کی نافرمانی پر مبنی روش پر کوئی اعتراض نہیں۔ لڑائی ہے تو مسلمانوں سے جبکہ ان کا گناہ اس کے سوا اور کچھ نہیں:

ے خونے نہ کردہ ایم و کسے رانہ کشتہ ایم
جرم ہمیں کہ عاشقِ رُوئے تو گشتہ ایم

قرآنِ کریم نے اس سوال کو جواب سے تشنہ چھوڑا ہے' کیونکہ یہود اس کا جواب دینے کیلئے کبھی تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کا جواب دینا ان کیلئے ممکن ہی نہیں تھا' ورنہ ان کی پوری شخصی اور اجتماعی زندگی بالکل برہنہ ہو کر رہ جاتی۔ لیکن وہ اسکے جواب کو جانتے تھے اور تمام اہل نظر بھی اسے جانتے ہیں' جواب اس کا یہ تھا کہ وہ نبی آخر الزمان کی تشریف آوری' ملت ابراہیمی پر ان کی بعثت' پھر کعبۃ اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنانا' اسے مرکز دعوت قرار دینا' دعوتِ ابراہیمی کو تجدیدی عمل سے گزارنا اور تکمیل دین کے اعلانات' یہ تمام باتیں یہود کو یہ بتانے کیلئے کافی تھیں کہ اسلام محض ایک دعوت نہیں بلکہ یہ پوری زندگی کیلئے ایک انقلاب ہے اور مسلمانوں کا بطور امت اٹھایا جانا صرف ایک نئی امت بننے کے مترادف نہیں بلکہ ایک ایسی امت کا وجود ہے جسے شہادتِ حق' عدل اجتماعی کے قیام اور پوری دنیا کی ہدایت کے منصب پر کھڑا کرنا ہے' جس منصب پر اس سے پہلے بنی اسرائیل فائز تھے۔ اب نئی امت کا ان کی جگہ لینا' ان کی نااہلی کا اعلان ہے۔ چنانچہ وہ ان تمام باتوں میں چونکہ اپنی ہمیشہ کیلئے معزولی اور اس عظیم منصب سے دھتکارے جانے کو دیکھ رہے تھے تو بجائے اس کے کہ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتے کہ یہ برے دن ہم محض اپنی بداعمالیوں کے باعث دیکھ رہے ہیں اور پھر اپنی اصلاح کے سلسلے میں وہ اسلام کی آغوش میں چلے جاتے اور اس طرح اپنی مکمل تباہی سے بچ جاتے' انہوں نے یہ راستہ اختیار کرنے کی بجائے حسد اور بغض کا راستہ اختیار کیا اور اپنے آپ کو اس کے ذمہ دار ٹھہرانے کی بجائے مسلمانوں' ان کے رسول اور ان پر اترنے والی کتاب کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا اور پھر ایک ایسی دشمنی کے راستے پر چل پڑے' جس کا کوئی انجام نہیں۔ یہ وہ چیز ہے' جس کو یہود اچھی طرح سمجھتے تھے اور قرآنِ کریم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے' ان سے سوال کیا ہے۔ ظاہر ہے' وہ اپنی دشمنی

Marfat.com

کو چھپاتے ہوئے اس کا جواب دینے کی کبھی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی دشمنی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ انہوں نے تاریخی مسلمات اور ہر طرح کی عقل کی بات سے منہ موڑ لیا تھا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں سے دشمنی کرتے اور ان کے شعائر تک کی توہین کرتے تھے بلکہ یہ بات بھی کہتے تھے کہ مسلمان اپنے مذہب کے اعتبار سے اس حد تک برے ہیں کہ مشرکین مکہ' جو صرف شرک ہی کو اپنا مذہب قرار دیتے تھے اور ہر طرح کی مذہبی راہنمائی سے محروم تھے' وہ بھی مسلمانوں سے اچھے ہیں۔ اب یہ ایک ایسی بات ہے کہ جو ایک ایسی قوم کہہ رہی ہے' جو اگرچہ شرک میں ملوث ہے' لیکن وہ شرک کو بہر حال سب سے بڑی برائی قرار دیتی ہے اور وہ یہ بات بھی جانتی ہے کہ توحید' رسالت اور آخرت پر ایمان لائے بغیر کسی بھی قوم کیلئے ہدایت کے دعویٰ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے مشرکین مکہ تو سرے سے ہدایت ہی سے محروم تھے چہ جائیکہ انہیں مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دیا جاتا۔ لیکن یہود کو یہ بات سمجھانا ممکن نہ تھا کیونکہ سمجھے ہوئے کو سمجھانا اور جاگتے کو جگانا' ممکن نہیں ہوتا۔ البتہ الزامی دلیل کے طور پر انہیں تاریخ کا آئینہ ضرور دکھایا جا سکتا ہے تاکہ اس میں اپنی اصل شکل دیکھ کر شاید ان کی عقل ٹھکانے آئے یا ایسی بے سرو پا باتوں پر وہ شرم محسوس کریں۔ اس لئے اگلی آیت میں انہیں تاریخ کا آئینہ دکھایا جا رہا ہے۔

آیت: ۶۰ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ O ''کہو! کیا میں تمہیں باعتبار انجام اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برے لوگوں کا پتہ دوں؟ یہ وہ ہیں' جن پر اللہ نے لعنت بھیجی' جن پر اس کا غضب ہوا اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور سور بنائے اور جنہوں نے طاغوت کی پرستش کی۔ یہ ٹھکانے کے لحاظ سے بدتر اور اصل شاہراہ سے بعید تر ہیں''۔

یہود کی نافرمانیوں کی سزا

اس آیت کریمہ میں پروردگار نے براہ راست ان کی بات کا جواب دینے کی بجائے' ان کی تاریخ کا انہیں آئینہ دکھایا تاکہ اگر وہ سمجھنا چاہیں تو اس آئینہ کو دیکھنے کے بعد بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اگر براہ راست انہیں اسی تند و تیز لہجے میں جواب دیا جاتا' جس کے وہ مستحق تھے تو یقیناً ان کے اندر ایک اشتعال پیدا ہوتا۔ لیکن یہ اسلوب بھی اپنے اندر دعوتی حکمت رکھنے کے باوجود ایسا مُسکِت ہے کہ جس کا جواب آج تک یہود سے بن نہ پڑا۔ فرمایا گیا کہ تمہارا حال تو یہ ہے کہ تمہارے وہ اسلاف جن کے تم وارث ہو' تم خوب جانتے ہو کہ اپنی بداعمالیوں کی پاداش میں وہ کیسے بڑے بڑے عذابوں سے دوچار ہوئے۔ جب انہوں نے صحرائی زندگی میں اولوالعزمی' جانفروشی اور سخت جانی کی تربیت حاصل کرنے کی بجائے' شہری زندگی اور اس کی مراعات کا مطالبہ کیا تو انہیں حکم دیا گیا کہ جاؤ! کسی شہر میں جا اترو' تمہیں وہاں یہ ساری نعمتیں مل جائیں گی کیونکہ جس مقصد کیلئے تمہیں مصر سے نکالا گیا تھا' اگر وہ مقصد تمہیں عزیز نہیں بلکہ کھانے پینے کی ہوس ہی تمہیں عزیز ہے تو پھر اللہ کی بارگاہ سے تمہارے لئے ذلت اور مسکنت کے سوا اور کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان پر ذلت اور مسکنت کی پھٹکار ماری گئی اور جہاں سے انہیں اللہ کی رحمت کو لے کر پلٹنا تھا' وہیں سے وہ اللہ کے غضب کو لے کر لوٹے۔ پھر تاریخ تمہاری اس ذلت اور مسکنت اور غضب کی داستان سے بھری ہوئی ہے' جس کو تم بڑی آسانی سے دیکھ سکتے ہو اور جب انہوں نے ان تاریخی حوادث اور اللہ کے غضب سے کوئی سبق نہ سیکھا تو اللہ نے سبت کی صورت میں' ان پر پابندیاں لگا کر انہیں آزمایا۔ جب وہ اس آزمائش میں بری طرح ناکام ہوئے تو ان پر وہ سخت ترین عذاب آیا کہ جس میں انہیں بندر اور سور بنا دیا گیا۔ سورۃ البقرہ میں اس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے' جس سے صاف معلوم ہوتا

Marfat.com

ہے کہ یہ تاریخی حقیقت یہود میں ایک مسلمہ واقعہ کی حیثیت رکھتی تھی اور پھر یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ قرآنِ کریم کی جب یہ آیات نازل ہوئیں' یہود نے ان الزامات کی ہرگز تردید نہیں کی بلکہ اس پر چپ سادھ لی کیونکہ ان حوادث سے ان کے عوام تک بھی آگاہی رکھتے تھے۔ یہ بندر اور خنزیر بنائے جانے کا واقعہ سورۃ الاعراف میں کسی حد تک تفصیل سے بیان کیا گیا ہے' جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ایک ایسی بستی میں پیش آیا' جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔ محققین کا غالب میلان اس طرف ہے کہ یہ مقام ایلہ یا ایلات یا ایلوت تھا' جہاں اب اسرائیل کی یہودی ریاست نے اسی نام کی ایک بندرگاہ بنائی ہے اور جس کے قریب ہی اردن کی مشہور بندرگاہ عقبہ واقع ہے۔ اس کی جائے وقوع بحر قلزم کی اس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے' جو جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی رہی ہے۔ بنی اسرائیل کے زمانہ عروج میں یہ بڑا اہم تجارتی مرکز تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بحر قلزم کے جنگی وتجارتی بیڑے کا صدر مقام اسی شہر کو بنایا تھا۔

اس بستی کے رہنے والے بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ سبت کے احترام میں اس دن کوئی دنیوی کام نہ کریں۔ گھروں میں آگ تک نہ جلائی جائے' جانوروں اور لونڈی غلاموں تک سے کوئی خدمت نہ لی جائے اور یہ کہ جو شخص اس ضابطہ کی خلاف ورزی کرے اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن بنی اسرائیل نے آگے چل کے اس قانون کی علانیہ خلاف ورزی شروع کر دی۔ یرمیاہ نبی کے زمانہ میں (جو 668 سے 586 قبل مسیح کے درمیان گزرے ہیں) خاص یروشلم کے پھاٹکوں سے لوگ سبت کے مال واسباب لے کر گزرتے تھے۔ اس پر نبی موصوف نے اللہ کی طرف سے یہودیوں کو دھمکی دی کہ اگر تم لوگ شریعت کی اس کھلم کھلا خلاف ورزی سے باز نہ آئے تو یروشلم نذر آتش کر دیا جائے گا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اپنی اس بری عادت سے باز نہ آئی بلکہ اس قدر نافرمانی میں دلیر ہوگئی کہ انہیں صاف حکم دیا گیا تھا کہ تم سبت کے دن مچھلیاں نہیں پکڑو گے' چونکہ ان کی گزر بسر ساحل سمندر پر رہنے کی وجہ سے زیادہ تر مچھلیوں پر ہی ہوتی تھی' اسلئے یہ ان کیلئے ایک سخت آزمائش تھی۔ وہ بجائے اسکے کہ اپنی اطاعت سے اس آزمائش سے نکلنے کی کوشش کرتے' انہوں نے کھلم کھلا نافرمانی کا راستہ اختیار کیا۔ البتہ حیلہ یہ اختیار کیا کہ سبت کے دن مچھلیاں حوضوں میں جمع کر لیتے اور اتوار کے دن پکڑ لیتے۔ اس پر اللہ کا عذاب حرکت میں آیا۔

قرآن کریم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی کے رہنے والے تین قسم کے لوگ تھے' جو اپنے اعمال کے اعتبار سے یکساں نہیں تھے۔ اس لئے پروردگار نے بھی ان کے ساتھ یکساں سلوک نہیں فرمایا۔ ہم اس کی تفصیل ایک محقق کے قلم سے نقل کرتے ہیں۔

﴿ایک وہ' جو دھڑلے سے احکام الٰہی کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ دوسرے وہ' جو خود تو خلاف ورزی نہیں کرتے تھے' مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے تھے اور ناصحوں سے کہتے تھے کہ ان کم بختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل ہے۔ تیسرے وہ' جن کی غیرتِ ایمانی حدود اللہ کی اس کھلم کھلا بے حرمتی کو برداشت نہ کر سکتی تھی اور وہ اس خیال سے نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے میں سرگرم تھے کہ شاید وہ مجرم لوگ ان کی نصیحت سے راہ راست پر آجائیں اور اگر وہ راہ راست نہ اختیار کریں' تب بھی ہم اپنی حد تک تو اپنا فرض ادا کر کے اللہ کے سامنے اپنی براءت کا ثبوت پیش کر ہی دیں۔ اس صورت حال میں جب اس بستی پر اللہ کا عذاب آیا تو قرآنِ مجید کہتا ہے کہ ان تینوں گروہوں میں سے صرف تیسرا گروہ ہی اس سے بچایا گیا کیونکہ اسی نے اللہ کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کی فکر کی تھی اور وہی تھا' جس نے اپنی براءت کا ثبوت فراہم کر رکھا تھا۔ باقی دونوں گروہوں کا شمار ظالموں میں ہوا اور وہ اپنے جرم کی حد تک مبتلائے عذاب ہوئے۔﴾

Marfat.com

برائی کے خلاف جدوجہد کرنے والا ہی اللہ کے عذاب سے بچتا ہے

بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے گروہ کے مبتلائے عذاب ہونے کی اور تیسرے گروہ کے نجات پانے کی تصریح کی ہے لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ نجات پانے والوں میں سے تھا یا مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے۔ پھر ایک روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ وہ پہلے اس بات کے قائل تھے کہ دوسرا گروہ مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے تھا' بعد میں ان کے شاگرد عکرمہ نے ان کو مطمئن کر دیا کہ دوسرا گروہ نجات پانے والوں میں شامل تھا۔ لیکن قرآن کے بیان پر جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا پہلا خیال ہی صحیح تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی بستی پر اللہ کا عذاب آنے کی صورت میں تمام بستی دو ہی گروہوں میں تقسیم ہوسکتی ہے' ایک وہ' جو عذاب میں مبتلا ہو اور دوسرا وہ جو بچا لیا جائے۔ اب اگر قرآن کی تصریح کے مطابق بچنے والا گروہ صرف تیسرا تھا تو لامحالہ پہلے اور دوسرے دونوں گروہ نہ بچنے والوں میں شامل ہوں گے۔ اسی کی تائید مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ کے فقرے سے بھی ہوتی ہے' جس کی توثیق بعد کے فقرے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرما دی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس بستی میں علانیہ احکام الٰہی کی خلاف ورزی ہو رہی ہو' وہ ساری کی ساری بستی قابلِ مواخذہ ہوتی ہے اور اس کا کوئی باشندہ محض اس بنا پر مواخذہ سے بری نہیں ہوسکتا کہ اس نے خود خلاف ورزی نہیں کی بلکہ اسے اللہ کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے لازماً اس بات کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا کہ وہ اپنی حد استطاعت تک اصلاح اور اقامتِ حق کی کوشش کرتا رہا تھا۔ پھر قرآن اور حدیث کے دوسرے ارشادات سے بھی ہم کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی جرائم کے باب میں اللہ کا قانون یہی ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ (انفال ۸:۲۵)

''ڈرو اس فتنہ سے' جس کے وبال میں خصوصیت کے ساتھ صرف وہی لوگ گرفتار نہیں ہوں گے' جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو''

اس کی تشریح میں نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ:

ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصہ حتی یروا المنکر بین ظھرانیھم وھم قادرون علیٰ ان ینکروہ فلا ینکروہ فاذافعلوا ذلک عذب اللہ الخاصۃ والعامۃ

﴿اللہ عزوجل خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا' جب تک عامۃ الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے برے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہار ناراضی کرنے پر قادر ہوں اور پھر کوئی اظہار ناراضی نہ کریں' پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔﴾

بنی اسرائیل پر مختلف وقتوں میں اترنے والے عذابوں کا ذکر فرما کر پروردگار نے ان کے ایک خاص جرم کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کی سزا کا ذکر نہیں فرمایا۔ فرمایا وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ یعنی ان کا ایک بہت بڑا جرم یہ تھا کہ باوجود اہل کتاب ہونے کے' انہوں نے طاغوت کی پرستش کی۔ طاغوت ہر اس قوت یا اقتدار کو کہتے ہیں' جو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنی عبادت کرواتا ہے یا اپنے وضعی قوانین کو اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے قوانین کے مقابلے میں اپنے زیر تسلط ملک میں یا اپنے دائرہ اثر میں نافذ کرتا ہے اور اس کی اطاعت پر مجبور کرتا ہے جبکہ غیر مشروط اطاعت صرف اللہ کی صفت ہے اور اس کی اطاعت کے توڑ پر اور اس کے احکامات کو نظر انداز کر کے' جب کوئی دوسری قوت اس کی جگہ لے لیتی ہے تو وہ طاغوت کہلاتی ہے اور جو لوگ اس کی اس طرح غیر مشروط اطاعت کرتے ہیں' وہ طاغوت کی اطاعت کا جرم کرتے ہیں۔ یہ طاغوت ایک بادشاہ بھی ہوسکتا ہے' ایک ڈکٹیٹر بھی' جمہوری ملک میں پارلیمنٹ

Marfat.com

بھی اور آزاد قبائل کی دنیا میں کوئی جرگہ یا پنچایت بھی یعنی جب بھی کوئی اجتماعی قوت اللہ کے قانون کو نظر انداز کر کے اپنے قانون کو رائج کرے گی اور لوگوں کو اس کے سامنے جھکنے پر مجبور کرے گی' وہ طاغوتی قوت ہے۔ اس کی اطاعت کرنا' طاغوت کی اطاعت کرنا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو چیلنج کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ جرم کوئی بھی کرے' قابل مذمت ہے۔ لیکن اگر اس کا ارتکاب ایک کتاب اور شریعت رکھنے والی قوم کرے تو اس کی شناعت اور برائی میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی ساری وہ بداعمالیاں' جس پر بنی اسرائیل عذابوں کا شکار ہوتے رہے' ان سب سے بڑھ کر یہ وہ برائی اور جسارت ہے' جس کا ذکر اس آیت کریمہ کے آخر میں کیا گیا ہے۔

امت مسلمہ اور طاغوت کی پرستش

یہاں رک کر امت مسلمہ کو سو بار سوچنا ہوگا کہ اگر طاغوت کی بندگی اور اطاعت' بنی اسرائیل کیلئے' اس لئے سب سے بڑا جرم بن گئی کہ وہ ایک حامل شریعت امت تھی۔ شریعت کی موجودگی میں انہوں نے کسی اور قانون کی اطاعت اور کسی اور اتھارٹی کی بندگی کیسے قبول کر لی۔ تو امت مسلمہ نہ صرف کہ حامل شریعت امت ہے بلکہ یہ تو آخری امت ہے' جس پر آخری کتاب اتاری گئی ہے' جس کی طرف آخری نبی آیا' اس کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا' نہ کوئی کتاب اترے گی اور نہ ان کے بعد کوئی امت آئے گی۔ اب اگر یہ امت بھی صراط مستقیم سے ہٹ جاتی ہے تو پھر آخر اس دنیا کی اصلاح کیلئے اور کس سے امید وابستہ کی جائے گی۔ اس لئے اس امت مسلمہ کو اس عظیم جرم کے بارے میں جس کا ارتکاب پورے عالم اسلام میں ہو رہا ہے' سو دفعہ گہرے غور و فکر سے کام لینا ہوگا اور اپنی اس گمراہی سے نکل کر اللہ کے دین کے ساتھ اپنی زندگیوں کا ربط قائم کر کے اور اللہ کے دین کو قوت نافذہ بنا کر اپنی اس بہت بڑی کوتاہی کا ازالہ کرنا ہوگا ورنہ جس ذلت سے آج یہ امت گزر رہی ہے' اس سے نکلنے کی اور کوئی صورت ممکن نہیں۔

بنی اسرائیل کے اسلاف کی اس تاریخ کو بیان کرنے کے بعد' آنحضرت ﷺ کے ہم عصر بنی اسرائیل کے چند ایسے کرتوتوں اور نمایاں عادتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ جس راستے پر ان کے اسلاف چلتے رہے' یہ اخلاف بھی اسی راستے پر چلنے کیلئے کوشاں ہیں۔ اس لئے اس اگر انہیں شہادت حق کے منصب سے معزول کیا جا رہا ہے تو انہیں بجائے اس پر برہم ہونے اور حسد کے پھپھولے پھوڑنے کے' اپنے اعمال کے آئینہ میں اپنی شکل دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ ان کے مکروہ اعمال میں سے ایک عمل یہ تھا:

آیت:۶۱ وَإِذَا جَآءُوكُمْ قَالُوٓا ءَامَنَّا وَقَد دَّخَلُوا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِۦ ۚ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ ۝ ''اور جب یہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں حالانکہ وہ کفر کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ نکلتے ہیں اور اللہ خوب واقف ہے اس چیز سے' جس کو وہ چھپا رہے ہیں''۔

اس سے پہلے یہود کی اس خباثت کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اسلام کی بہت ساری باتوں کا مذاق اڑاتے تھے' حتیٰ کہ اذان جو شعائر اسلام میں سے ہے' اس کو بھی وہ ہنسی اور کھیل سمجھتے تھے اور اس کی توہین کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اب اس آیت کریمہ میں ان کی ایک اور حرکت کو بیان کیا جا رہا ہے۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ دینی شعائر کا مذاق اڑانا شاید ان کے عوام کی حرکت تھی۔ لیکن ان کے دانشور' جو اپنے علم و دانش کے زور سے اسلام کو نقصان پہنچانے کیلئے گہری سازشوں میں مبتلا تھے۔ ان کی ایک سازش یہ تھی' جس کا ذکر اس آیتِ کریمہ میں کیا جا رہا ہے کہ یہ لوگ جب مسلمانوں کی مجالس میں آتے تھے تو کہتے کہ ہم بھی تو مومن ہیں۔ آخر آپ ہمیں مومن تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ کیونکہ ایمان نام ہے اللہ پر ایمان لانے کا' اس کی کتابوں اور

Marfat.com

کے رسولوں پر ایمان لانے کا اور آخرت کو ماننے کا۔ ان سب باتوں پر تو ہم بھی ایمان رکھتے ہیں' ہم کئی پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں' تورات اور اس کے ساتھ کئی صحیفوں کو مانتے ہیں' آخرت کے ہم بھی قائل ہیں' صرف اگر ہم محمد (ﷺ) کو نہیں مانتے تو آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آخر ہمارے پیغمبر اور ہماری کتاب بھی تو اللہ ہی کے بھیجے ہوئے ہیں؟ عام مسلمان ان کی اس طرح کی باتوں سے دھوکے میں آجاتے اور ان سے ایک قسم کے حسنِ ظن میں مبتلا ہو جاتے۔ چنانچہ پہلے پارے میں قرآنِ کریم نے ان کی اس بات کو مخادعت (دھوکہ دہی) سے تعبیر کیا ہے' جب ان سے یہ کہا جاتا کہ اگر مومن ہو تو سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح کیوں ایمان نہیں لاتے؟ یعنی محمد (ﷺ) اور قرآن کا اقرار کیوں نہیں کرتے؟ تو اس پر برہم ہو جاتے اور کہتے کہ ہم بے وقوفوں کی طرح کی حرکت نہیں کر سکتے' ہم ملک میں صلح وامن چاہتے ہیں اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ مسلمان اگر کسی کو پیغمبر ماننا چاہتے ہیں تو مانیں' لیکن ہمارے لئے اس کا ماننا ضروری قرار نہ دیں۔ اس کو مانے بغیر ہمارا دینی مقام ومرتبہ تسلیم کریں۔ اگر مسلمان اپنے سوا سب کو کافر قرار دیں گے تو اس سے ملک میں فساد برپا ہوگا' جس میں سب کا نقصان ہے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں یہود کے انہی دانشوروں کا ذکر ہے کہ جب یہ تمہاری مجالس میں آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی مسلمان ہیں حالانکہ جس کفر کے ساتھ وہ آتے ہیں' اسی کفر کے ساتھ وہ واپس جاتے ہیں۔ ایمان نہ داخل ہوتے وقت ان کے ساتھ ہوتا ہے' نہ نکلتے وقت۔ بس تمہارے سامنے دعویٰ کر کے تمہیں دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اللہ خوب جانتا ہے' جو کچھ وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ یعنی اصلاً وہ ایک سازش کا ارتکاب کر رہے ہیں تاکہ اس طرح وہ مسلمانوں کو دھوکہ دے کر اسلام کے بارے میں یکسوئی نہ پیدا ہونے دیں۔

چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں قرآن کریم نے ان کے اس دعویٔ ایمان کی قلعی کھول دی۔ ارشاد فرمایا:

آیت: ۶۲ وَ تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْهُمْ یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَکْلِهِمُ السُّحْتَ ط لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ O

''تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ حق تلفی' زیادتی اور حرام خوری کی راہ میں گرم رو ہیں۔ کیا ہی برا ہے' جو کچھ یہ کر رہے ہیں''۔

سابقہ آیت میں یہود کے ایمان کا ذکر گزرا ہے۔ انہیں بہت اصرار ہے کہ ہم صاحب ایمان لوگ ہیں' ہمارے ایمان کو تسلیم کیا جانا چاہئے۔ پروردگار فرماتے ہیں کہ ذرا ان کے ایمان کا حال دیکھو کہ ان میں زیادہ تر افراد چاہے وہ عام لوگ ہوں یا ان کا پڑھا لکھا طبقہ' وہ پوری طرح اخلاقی اور اعتقادی برائیوں کا شکار ہیں اور صرف یہی نہیں کہ وہ ان اخلاقی برائیوں کا کبھی کبھی ارتکاب کر بیٹھتے ہیں' بلکہ ''یُسَارِعُوْنَ'' کا لفظ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ بداعمالیاں اور بداطواریاں ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب برائی کے ارتکاب میں اس حد کو پہنچ چکے ہیں' جس میں برائی کا احساس تک ختم ہو جاتا ہے۔ پھر پورا معاشرہ ان برائیوں کے ارتکاب میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں لگ جاتا ہے۔ برائی جب کسی معاشرے کا چلن بن جاتی ہے تو پھر آہستہ آہستہ اس کا احساس مرجاتا ہے۔ پھر اگر کبھی کوئی اللہ کا بندہ' اس پر سرزنش کرنے کی غلطی کر بیٹھتا ہے تو وہ اپنے معاشرے میں نکو بن کر رہ جاتا ہے۔ جس طرح بیمار معدہ ہر مقوی غذا کو اگل دینے کی کوشش کرتا ہے' اسی طرح معاشرہ ایسے فرد یا ایسے افراد کو اگل دیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہود ایسی ہی حالت کو پہنچ گئے تھے۔

اس آیت کریمہ کے الفاظ سے مزید یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی بداعمالیاں کسی ایک دائرے میں بند نہیں' بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کا رویہ ہر طرح کی برائی کی تصویر بن کے رہ گیا تھا۔ عام طور پر گناہ اور برائی کو 'اثم'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ہر طرح کے ظلم اور زیادتی کو 'عدوان'' کا نام دیا جاتا ہے اور ہر طرح کی حرام خوری بالخصوص رشوت کو ''سحت'' کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہی تینوں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بڑے بڑے جرائم ہیں۔ جب کوئی قوم ان جرائم میں اس حد تک آلودہ ہو جائے کہ ان میں احساس گناہ بھی باقی نہ رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ معاشرہ

Marfat.com

اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو کر رہ گیا ہے چنانچہ یہی کیفیت یہود کے معاشرے کی تھی۔ وہ ان تمام بڑے بڑے گناہوں میں سر سے پاؤں تک آلودہ تھے۔ اس لئے پروردگار نے ارشاد فرمایا:

لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿کس قدر برا تھا' جو کچھ وہ کرتے تھے﴾

یعنی ان کی اجتماعی زندگی اعتقادی اور اخلاقی طور پر بری طرح تباہ ہو چکی تھی جس کی انتہاء یہ تھی کہ کسی بھی قوم کا صالح ترین طبقہ ان کے علماء اور مشائخ پر مشتمل ہوتا ہے۔ قومیں بگاڑ کی کسی بھی انتہاء کو پہنچ جائیں' یہ طبقہ برابر اصلاح وہدایت کے کام میں لگا رہتا ہے۔ لیکن جب یہ طبقہ بھی خود برائیوں میں ڈوب جائے اور اصلاح وہدایت کے کام کو لپیٹ کر رکھ دے تو پھر اس قوم کی بقاء کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یا یہ قوم اللہ کے عذاب کا شکار ہو جاتی ہے اور یا تصویر حسرت بن کر دوسروں کیلئے عبرت کا سامان بن کے رہ جاتی ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

آیت:۶۳ لَوۡ لَا یَنۡهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِهِمُ الۡاِثۡمَ وَاَكۡلِهِمُ السُّحۡتَ ؕ لَبِئۡسَ مَا كَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ ۝

''کیوں نہیں روکتے تھے ان کو ان کے علماء اور فقہا' گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے۔ کتنی بری ہے یہ حرکت' جو یہ کر رہے تھے''۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت

''ربانی'' علماء اور ''احبار'' فقہاء کیلئے بولا جاتا ہے اور یہ دونوں گروہ کسی بھی قوم کی اخلاقی زندگی کے امین ہوتے ہیں۔ لیکن اس قوم کی اخلاقی تباہی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ اس گروہ نے بھی اپنی ذمہ داریاں ادا کرنی چھوڑ دیں۔ سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ خود دنیوی محبت کے اسیر ہو کر ان تمام برائیوں میں ملوث ہو چکے تھے' جن میں ان کی قوم ملوث تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک مجرم تو مجرم کو نصیحت نہیں کر سکتا اور مزید یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ عوام کی غلط کاریوں کا ذکر کرتے ہوئے تو لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ کہا اور ان مشائخ اور فقہاء کی بداطواریوں کا ذکر کرتے ہوئے لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ ارشاد فرمایا گیا۔ اہلِ لغت کہتے ہیں کہ ''صنع'' کے لفظ میں ''عمل'' کی نسبت زیادہ گہرائی پائی جاتی ہے۔ بتلانا یہ مقصود معلوم ہوتا ہے کہ عوام بھی بداخلاقیوں میں ڈوب چکے تھے' لیکن ان کا یہ مذہبی اور علمی طبقہ اپنی بدعملیوں میں شعوری طور پر ان سے بھی آگے تھا کیونکہ ان کا گناہ صرف ان تک محدود نہیں تھا بلکہ دوسری قوم کے طبقات بھی ان کو دیکھتے ہوئے گناہ پر زیادہ دلیر ہو جاتے تھے۔ اسی لئے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ مشائخ اور علماء کیلئے پورے قرآن میں اس سے زیادہ سخت تنبیہ کہیں نہیں اور امام تفسیر ضحاک نے فرمایا کہ میرے نزدیک مشائخ اور علماء کیلئے یہ آیت سب سے زیادہ خوفناک ہے۔ اسلئے علماء اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر علماء اس بات کی امید رکھتے ہوں کہ ان کی نصیحت سے لوگوں میں اچھے اثرات پیدا ہو سکتے ہیں' لیکن وہ پھر بھی حقِ نصیحت ادا کرنے میں تامل کریں تو اللہ کے یہاں ان کی سخت باز پرس ہوگی۔ ہاں! اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ قوم ان کی بات نہیں سنے گی بلکہ الٹا انہیں اذیتیں دے گی تو پھر اگرچہ یہ اپنی ذمہ داریوں میں ماخوذ نہیں ہوں گے' لیکن بہتر یہی ہے کہ پھر بھی عزیمت کا راستہ اختیار کیا جائے اور جیسا گزشتہ رکوع میں فرمایا گیا:

وَلَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَةَ لَآئِمٍ ؕ ﴿اللہ والے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرا نہیں کرتے﴾

انہیں بھی نامساعد حالات کے باوجود ہر طرح کے اندیشوں سے بے نیاز ہو کر اپنا فرض انجام دیتے رہنا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی قوم کی خیریت وعافیت اس وقت تک ممکن ہے' جب تک ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والے باقی رہتے ہیں اور اپنا فرض انجام دیتے رہتے ہیں اور جب یہ فریضہ رک جاتا ہے تو پھر ایسا ہی ہے' جیسے ڈاکٹر مریضوں کے مرض ہی کو سامان شفا سمجھ کر اپنی

Marfat.com

ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر بیٹھ جائے۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں مریضوں کے انجام کے بارے میں پیش گوئی کرنا مشکل نہیں۔ اسی طرح جب علماء اور مشائخ کا طبقہ قوم کی اصلاح سے غافل ہو جاتا ہے تو پھر قوم کی اخلاقی صحت کے بارے میں کوئی امید رکھنا خام خیالی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس لئے قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر خاص زور دیا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کام کو امت محمدیہ کی خصوصیات میں شمار فرمایا ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے کو سخت گناہ اور موجب عذاب قرار دیا ہے۔ حدیث میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب کسی قوم میں گناہ کے کام کئے جائیں اور کوئی آدمی اس قوم میں رہتا ہو اور ان کو منع نہ کرے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں پر عذاب بھیج دے۔ مالک بن دینار فرماتے ہیں کہ

> ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو حکم دیا کہ فلاں بستی کو تباہ کر دو۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ اس بستی میں تو آپ کا فلاں عبادت گزار بندہ بھی رہتا ہے۔ حکم ہوا' اس کو بھی عذاب کا مزا چکھایا جائے کیونکہ ہماری نافرمانیوں اور گناہوں کو دیکھ کر اس کو کبھی غصہ نہیں آیا اور اس کا چہرہ غصہ سے کبھی متغیر نہیں ہوا۔

علماء اور مشائخ کی تباہی کی جڑ' گناہ کی بات اور حرام خوری ہیں

اس آیت کریمہ میں علماء ومشائخ کے حوالے سے دو جرائم کا بطور خاص ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک ہے: ''قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ'' گناہ کی بات اور دوسرا ہے ''أَكْلِهِمُ السُّحْتَ'' یعنی حرام خوری۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء ومشائخ کیلئے یہ دو گناہ تمام گناہوں کی جڑ اور تمام برائیوں کا سرچشمہ ہیں کیونکہ علماء ومشائخ اپنی قوم کیلئے اس وقت تک اسوہ اور نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں' جب تک ان میں حق گوئی اور حق نصیحت کا جذبہ باقی رہتا ہے۔ لیکن جب ان کی زبان گناہ سے آلودہ ہو جائے اور بڑھتے بڑھتے اللہ کے بارے میں یاوہ گوئی سے بھی دریغ نہ کرے اور دین کی باتوں کا مذاق اڑانا یا ان کا برداشت کرنا' ان کا معمول بن جائے تو پھر وہ اپنی قوم کیلئے نمونہ اور اسوہ کیا' الزام بن کے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کا عمل اس وقت تک قوم کیلئے قابل تقلید رہتا ہے' جب تک وہ عسرت اور تنگدستی میں زندگی گزارنے کو تو برداشت کر لیتے ہیں' لیکن کبھی ہوس زر کے اسیر ہو کر حرام خوری اور مادی آلودگیوں میں مبتلا نہیں ہوتے۔ لیکن اگر وہ خود ان برائیوں کا ارتکاب کرنے لگیں تو ان کا عمل قوم کیلئے نہ صرف قابل تقلید نہیں رہتا' بلکہ ان کا وجود گالی بن کے رہ جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل کے اس مذہبی طبقہ کو انہی دونوں بنیادی برائیوں نے اپنی منصبی ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

آج امت مسلمہ کیلئے بھی سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ امت کی غالب اکثریت بری طرح ان مفاسد کا شکار ہو گئی ہے اور جن لوگوں کو ان برائیوں کو روکنے کیلئے عملی نمونہ بننا چاہیے' اگرچہ ان میں ابھی تک قابل تقلید مثالیں موجود ہیں' لیکن ان کی ایک اچھی خاصی تعداد خود ان کمزوریوں کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ میرے استاد مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک دفعہ دوران درس یہ واقعہ بیان فرمایا کہ بھوپال میں ایک قاضی صاحب تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ خواب میں سرکار دو عالم ﷺ کی زیارت کی' دوران ملاقات آنحضرت ﷺ سے قاضی صاحب نے عرض کی کہ حضور ﷺ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔ آپ نے انگشت شہادت اٹھائی' پہلے ہونٹوں پہ رکھی اور اس کے بعد پیٹ پر اور ارشاد فرمایا کہ ان دونوں کی نگہداشت کرنا یعنی پیٹ میں حرام لقمہ نہ جانے پائے اور زبان پر گناہ کی بات نہ آنے پائے۔ واقعہ یہ ہے کہ صدقِ مقال اور رزقِ حلال ہی ایک مسلمان کا حقیقی جوہر ہے اور علماء اور مشائخ کی حقیقی پہچان' اگر یہ دونوں باتیں امت مسلمہ میں کمزور پڑ جائیں اور بالخصوص علماء ومشائخ میں اس برائی کو داخل ہونے کا موقع مل جائے تو پھر اپنے اچھے انجام کی اللہ ہی سے دعا کرنی چاہیے۔

قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ یعنی گناہ کی بات کی یوں تو کئی صورتیں ہیں اور اس لفظ میں بڑی وسعت ہے۔ لیکن سب سے بڑی گناہ کی بات بارگاہ ایزدی میں

Marfat.com

گستاخی کی جسارت کرنا ہے جس کی چند مثالیں پیچھے گزر گئی ہیں۔ اگلی آیت میں اس کی ایک مثال بیان فرمائی جارہی ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۶۴ وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوطَتٰنِ لا يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ؕ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ O ''اور یہود کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ہاتھ ان کے بندھ جائیں اور ان کی اس بات کے سبب سے ان پر لعنت ہو بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، وہ خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور ان کے کفر کو وہ چیز بڑھا رہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے تیری طرف اتاری گئی اور ہم نے ان کے اندر دشمنی اور کینہ قیامت تک کیلئے ڈال دیا ہے۔ جب جب یہ لڑائی کی کوئی آگ بھڑکائیں گے اللہ اس کو بجھا دے گا۔ یہ زمین میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔

یہود پر اللہ کی لعنت اور دور حاضر میں اس کے اثرات:

دین اور شعائرِ دین کے ساتھ ان کے مذاق کی مثالیں گزشتہ آیات میں گزر چکی ہیں۔ ایک مثال اس آیت کریمہ میں ذکر کی جارہی ہے کہ بد بخت یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں یعنی اللہ تنگ دست ہوگیا ہے۔ اب اس کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں رہا اور یا ہاتھ بندھا ہونا بخل سے کنایہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ بخیل ہوگئے ہیں۔ یہ بات کہنے والے یہود میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک تو عوام تھے اور دوسرے خواص۔ عوام کا کہنا یہ تھا کہ لوگ مدینہ طیبہ کے خوشحال اور متمول لوگ تھے، اب اللہ نے ہمیں فقیر کر دیا ہے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اوس و خزرج کو یہ لوگ لڑائیوں پر اکساتے رہتے اور جب لڑائی چھڑ جاتی تو وہ اسلحۂ جنگ خریدنے کیلئے ان یہود سے قرض لیتے اور یہ ان کو بھاری سود پر قرض دیتے۔ اس طرح ان کا ساہوکاری کاروبار چلتا رہتا اور ان کی مالداری میں اضافہ ہوتا رہتا۔ جب سود کی رقم بڑھ جاتی تو بعض دفعہ ان کے باغات بھی یہ اپنے پاس گروی رکھ لیتے۔ اس طرح مدینہ کی دولت ان یہود کے پاس سمٹ آئی تھی اور یہ علاقے کا امیر ترین طبقہ بن گئے تھے۔ اسلام جب مدینہ طیبہ میں آیا۔ اوس و خزرج نے اسلام قبول کیا، اللہ نے ان کے دلوں میں اسلام کی وجہ سے محبت پیدا کر دی اور نفرتوں کی آگ ہمیشہ کیلئے سرد ہوگئی۔ باہمی محبت و پیار پیدا ہو جانے کے بعد لڑائیاں رک گئیں۔ اب انہیں یہود سے قرض لینے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ وہ اپنے وسائل میں رہ کر گزارا کرنے لگے بلکہ اللہ نے ایسی قناعت کی دولت دی کہ انہوں نے مہاجرین کا بوجھ بھی اٹھا لیا۔ اس صورت حال نے یہود کی مالی حالت کو پتلا کر دیا۔ چنانچہ اپنی اس مالی کمزوری کا سبب چونکہ یہود مدینہ طیبہ میں ورود اسلام کو سمجھتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گستاخیاں کرنے لگے کہ پہلے ہم دولت میں کھیلتے تھے، اب پروردگار معلوم ہوتا ہے بخیل ہوگئے ہیں۔ انہوں نے ہماری مدد سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اسی وجہ سے ہماری مالی حالت بگڑتی جارہی ہے۔

دوسرا خواص کا طبقہ تھا۔ وہ اپنے خاص انداز میں بارگاہ حق میں گستاخی کا ارتکاب کرتا تھا۔ وہ جب یہ سنتے کہ رسول کریم ﷺ مسلمانوں کو صدقات واجبہ و نافلہ کی ترغیب دیتے اور انفاق فی سبیل اللہ پر ابھارتے ہیں۔ انہوں نے اس پر فقرے کسنے شروع کئے اور مسلمانوں کے ذہنوں کو مسموم کرنے کی کوشش کی حالانکہ ایک واضح سی بات تھی کہ اس نوزائیدہ ریاست کے کاروبار کو چلانے اور جہاد و غزا کی ضرورتیں پوری کرنے اور پورے جزیرۂ عرب سے آنے والے مہاجرین کا بوجھ اٹھانے کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ مسلمانوں کو انفاق فی سبیل اللہ پر آمادہ کیا جاتا اور پھر قرآن کریم میں پروردگار نے اس کی ضرورت اور فضیلت پر آیات نازل فرمائیں اور اس میں تعبیر یہ اختیار فرمائی کہ لوگو! تم میں کون اللہ کو قرض دے گا؟ جو آج اللہ کو قرض دے گا وہ قیامت

Marfat.com

کے دن دگنا چوگنا واپس بھی پائے گا تو یہود کے طبقۂ خواص نے اس تعبیر کو استہزاء کا نشانہ بنایا اور کہنے لگا کہ آج کل مسلمانوں کے اللہ میاں بہت غریب ہو گئے ہیں' بندوں سے قرض مانگنے کی نوبت آ گئی ہے۔ اللہ میاں غریب ہیں اور ہم بندے امیر۔ ایسی ہی بات کا تذکرہ سورۃ آل عمران میں بھی گزر چکا' جس میں اللہ پاک نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے ان بدبختوں کی یہ بات سن لی ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ ﴿اللہ فقیر ہے اور ہم غنی اور مالدار ہیں﴾ (آل عمران – ۱۸۱).

ممکن ہے بعض ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہود کیسے بھی گئے گزرے ہوں' بہر حال مسلمان تھے۔ اللہ کی عظمت کے قائل اور رسولوں پر ایمان لانے والے۔ ان سے یہ بات کیسے تصور کی جا سکتی ہے کہ وہ اللہ کریم کی شان میں ایسی گستاخیوں کا ارتکاب کر سکتے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر بگڑی ہوئی قوموں کے احوال ہماری نگاہ میں رہیں تو پھر ذہنوں میں یہ سوال پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ پچھلی امتوں کے احوال کو تو چھوڑیئے' خود اپنی ہی امت کو دیکھ لیجئے کہ ہمارے غریب لوگوں سے لے کر طبقہ امراء تک آپ کو بکثرت ایسے لوگ ملیں گے کہ جنہیں بھی اگر کسی حادثے سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور کسی انہونی سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ نہ صرف گھبرا اٹھتے ہیں بلکہ اللہ رب العزت کے بارے میں وہ وہ باتیں کہتے ہیں' جس کا ایک مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کسی کا اگر کوئی جوان بیٹا مر جائے یا کسی کی اولاد نہ ہوتی ہو تو ایسے بے اولاد والدین کا کبھی مرثیہ سنئے یا جوان بیٹے کی موت سے دوچار ہونے والے ماں باپ کے کبھی شکوے سماعت فرمایئے۔ اللہ رب العزت کے بارے میں اس طرح شکایات کا طومار باندھیں گے کہ آدمی شاید اپنے معمولی افسر کے بارے میں بھی اس طرح کی باتیں کہتا ہوا سو دفعہ جھجکتا ہے۔ ممکن ہے آپ یہ خیال فرمائیں کہ یہ باتیں جاہل لوگوں میں ہوں گی۔ تعلیم یافتہ لوگ تو ایسا نہیں کر سکتے۔ لیکن آپ ان تعلیم یافتہ لوگوں سے مل کر دیکھئے' خاص طور پر وہ لوگ جو نودولتیے ہیں۔ ان کو حالات کا معمولی دھچکا بھی ایمان اور شائستگی سے لاتعلق کرنے کیلئے کافی ہوتا ہے بلکہ اگر انہیں یہ احساس ہو جائے کہ میں حالات کی گرفت سے کوئی کفر کر کے نکل سکتا ہوں تو اسے ایسا کرنے سے بھی دریغ نہیں ہوتا اور پھر یہ ان کا رویہ کسی ایک نکتہ پر موقوف نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی' رسول اللہ ﷺ کی شخصیت مقدسہ' مسلمات دین اور شعائر اسلام میں سے کوئی ایک بھی تو ان کی زبان درازیوں سے بچا ہوا نہیں ہے۔ اس لئے شاید ظفر علی خان مرحوم نے کہا تھا:

تمسخر کرنے والے دین سے ہی گر مہذب ہیں
تو ان تہذیب کے پتلوں سے مجھ جیسا گنوار اچھا

اس لئے یہود کی ان گستاخیوں کا احوال پڑھتے ہوئے اگر اپنی اس امت کے حالات بھی پیش نظر رہیں تو پھر ہمیں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔

البتہ! یہ ضرور ہے کہ اس طرح کی گستاخی کا ارتکاب یہود کرے یا کوئی اور یہ ایسا بڑا جرم ہے' جس کا براہ راست جواب دینا بھی علم اور ایمان کی توہین ہے۔ اس لئے ان کی اس گستاخی کا براہ راست جواب ارشاد نہیں فرمایا بلکہ اس گستاخی پر انہیں لعنت کی پھٹکار ماری اور فرمایا:

غُلَّتْ اَیْدِیْھِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ﴿ہاتھ ان کے بندھ جائیں اور ان کی اس بات کے سبب سے ان پر لعنت ہو۔﴾

اس فوری لعنت اور پھٹکار کی وجہ یہ ہے کہ یہود نہ تو اللہ اور اس کی شان سے بے خبر تھے اور نہ دعوت انفاق کے اس بلیغ انداز سے ناواقف۔ وہ ہر چیز کو جانتے بوجھتے ہوئے اس طرح کی حرکتیں صرف اس لئے کر رہے تھے کہ قرآن اور پیغمبر اسلام کی عداوت میں ایسے اندھے بہرے ہو گئے تھے کہ تحقیر و استہزاء کا جو موقع بھی مل جاتا اس سے ضرور فائدہ اٹھاتے اور اس عمل کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ بات کہاں تک پہنچے گی۔

حیران کن بات یہ ہے کہ ان کی اس گستاخی پر ان پر جو پھٹکار اور لعنت کی گئی اس کے اثرات تو متنوع قسم کے ہیں' لیکن ایک اثر تو آج بھی

Marfat.com

دیکھا جاسکتا ہے۔ باوجود اس کے کہ آج بنی اسرائیل اپنی ایک نام نہاد آزاد ریاست رکھتے ہیں۔ امریکہ اور مغربی دنیا کی پشت پناہی سے ان کا ملک ایک مضبوط فوجی چھاؤنی کی صورت اختیار کر گیا ہے اور عرب دنیا میں ان کی حیثیت ایک ناسور سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور مغربی دنیا اور امریکہ میں ذرائع ابلاغ اور بعض کلیدی وسائل پر قبضہ کرنے کی وجہ سے ہر ملک میں ایک اہم حیثیت کے مالک ہیں۔ بااین ہمہ! جن لوگوں کو انہیں قریب سے دیکھنے یا ان کے ہمسائے میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے' وہ بتاتے ہیں کہ یہود قوم کا ایک ایک فرد اپنی ساری امارت اور مالداری کے باوجود اپنی خست و دنائت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ وہ انتہائی مالدار ہوتے ہوئے بھی جس محلے میں رہتے ہیں' اہل محلہ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ کسی غریب کی مدد کرنا' کسی ننگے کو کپڑا پہنانا اور کسی بھی رفاہی کام میں شرکت کرنا' ان کی بنیادی سرشت کے خلاف ہے۔ وہ اپنے قومی مفادات اور گروہی تعصبات کیلئے بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کو تیار ہو جائیں گے اور دوسری قوموں کے خلاف سازشوں کا جال بچھانے کیلئے آپ ان سے کچھ بھی خرچ کروا لیجئے' لیکن انسانیت کی بھلائی کیلئے آپ ان سے ایک دمڑی تک نہیں لے سکتے۔ یہ بخل اور خست جس کا الزام انہوں نے پروردگار کو دیا تھا' اس طرح ان کی سرشت میں اتر گئی ہے کہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ان پر لعنت برسائی تھی' وہ پوری طرح اس کی گرفت میں ہیں۔

اس کے بعد پروردگار نے ان کی بات کا جواب بھی دیا ہے اور اس کا سبب بھی بیان فرمایا ہے۔ فرمایا: اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں اور وہ جو چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ البتہ! تم اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی میں اندھے اور بہرے ہو کر جس طرح گستاخیوں کا ارتکاب کر رہے ہو' اس کا سبب تمہارا وہ حسد اور بغض ہے جو قرآن کریم کے نزول کی وجہ سے تمہارے اندر پیدا ہو گیا ہے کیونکہ بنی اسرائیل قرآن کریم کے نزول کی شکل میں اس کے طبعی نتائج کو دیکھ رہے تھے وہ جانتے تھے کہ عربوں کو قرآن کا ملنا' صرف قرآن ہی کا ملنا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ امامت و سیادت بھی اب ان کی طرف منتقل ہو رہی ہے' جس کے تنہا اجارہ دار اب تک وہ خود بنے بیٹھے تھے۔ اسی حسد نے ان کو اللہ کا باغی بنا دیا اور اسی کے سبب سے ان کے اندر مسلمانوں کے خلاف بھی ہمیشہ کیلئے عداوت اور کینہ کا بیج پڑ گیا۔ لیکن مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا کہ تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب بھی جزیرۃ العرب میں موجودہ حالات میں کوئی فتنہ اٹھے گا تو اس فتنے کو اٹھانے اور مسلمانوں کے دشمنوں کو اکسانے میں سب سے زیادہ ہاتھ انہیں کا ہوگا۔ لیکن تمہیں اطمینان رکھنا چاہئے کہ یہ تو اپنی فطرت سے مجبور ہو کر سازشوں کے جال بچھاتے رہیں گے اور مسلمانوں کو بار بار لڑائی میں کھینچنے کی کوشش کریں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ ہمیشہ ان فتنوں کی آگ کو ٹھنڈا کرتا رہے گا اور لڑائیوں کے جہنم کو بجھاتا رہے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جتنی بھی بڑی بڑی لڑائیاں لڑنا پڑیں' ان تمام لڑائیوں کے پیچھے انہی یہود کا سازشی دماغ کارفرما تھا۔ لیکن پروردگار نے برابر مسلمانوں کی نصرت و اعانت فرمائی اور یہود کو بالآخر ذلیل و خوار ہو کر مدینے سے نکلنا پڑا یا اپنے انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ مزید فرمایا:

وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ

﴿یہ لوگ ہمیشہ زمین میں فساد برپا کرنے میں سرگرم رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فساد پھیلانے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔﴾

فساد کیلئے ان کی سرگرمی کی ایک صورت تو یہ تھی' جس کا ابھی ذکر ہوا کہ وہ ہمیشہ دشمنان دین کو اکساتے تھے اور مسلمانوں کیلئے پریشانی کا باعث بنتے تھے۔ لیکن فساد فی الارض کی جو اصل صورت ہے' وہ یہ ہے کہ اس کائنات میں دو نظام کارفرما ہیں۔ ایک نظام تکوینی ہے اور دوسرا تشریعی۔ اس دنیا میں اس وقت تک ہمواری اور سازگاری پیدا نہیں ہو سکتی' جب تک نظام تکوینی اور نظام تشریعی پوری طرح ہم آہنگ نہ ہوں۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کی بیشمار مخلوق زمین و آسمان اور اس کے درمیان موجود ہیں' لیکن اس پوری کائنات میں ہم کہیں بھی کوئی خرابی اور فساد محسوس نہیں کرتے۔ بڑے چھوٹے ہزاروں کرے

Marfat.com

آسمان کی وسعتوں میں محوِ پرواز ہیں' لیکن ان میں کہیں تصادم نظر نہیں آتا۔ سورج کبھی چاند کے راستے میں حائل نہیں ہوتا' چاند کبھی اپنا راستہ نہیں بدلتا' شب و روز کے آنے میں کبھی تخلف نہیں ہوتا' زمین کبھی اپنی قوتِ روئیدگی کے خزانے لٹانے میں پس و پیش نہیں کرتی' ستارے روشنی دینے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے' پھول خوشبو دینے میں' کلی چٹکنے میں' پانی بہنے میں' ہوا چلنے میں' پرندے اڑنے اور چہکنے میں' سبزہ لہلہانے میں' سایہ دار درخت سایہ دینے میں کبھی تساہل کا شکار نہیں ہوتے۔ سورج برابر اپنی تخلیق کے دن سے لے کر آج تک سمندر سے کرنوں کے ڈول بھر بھر کر فضائے آسمانی میں ابر کی چادریں بچھاتا ہے۔ ہوا انہیں لوریاں دیتی ہوئی برسنے کی جگہ پر پہنچاتی ہے' بارش ایک قانون کے مطابق برستی ہے اور زمین ضرورت کے مطابق اسے نگلتی اور باقی اگل دیتی ہے۔ دانۂ گندم ایک خاص انداز میں اگتا' بڑھتا' پروان چڑھتا اور ایک پودے کی شکل اختیار کرتا ہے' حتیٰ کہ سات سو دانوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جس قانونِ تکوین کے تحت یہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہیں' اس میں کبھی کمی بیشی واقع ہو جائے۔ مختصر یہ کہ پوری کائنات کا نظام جس قانونِ تکوین کے تحت چل رہا ہے' کہیں بھی اس سے سرتابی نہیں ہوتی۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ اس سرتابی نہ ہونے اور مکمل اطاعت کی وجہ سے پورے نظامِ کائنات میں کہیں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ہم انسانی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ قدم قدم پر تنازعات ابھرتے ہیں' حقوق متصادم ہوتے ہیں' تلخیاں ہیں کہ رکنے کا نام نہیں لیتیں۔ جان' مال' عزت' آبرو کوئی چیز بھی اپنا یقینی تحفظ نہیں رکھتی۔ آدمی آدمی سے الجھ رہا ہے' قومیں قوموں سے ٹکرا رہی ہیں' کہیں خون بہہ رہا ہے' کہیں عزتیں رسوا ہو رہی ہیں' کہیں عفتوں کو پامال کیا جا رہا ہے۔ جنگل کی طرح طاقت اور قوت دنیا کا قانون بن چکی ہے۔ کسی کو کسی کے سامنے جوابدہی کا احساس نہیں۔ کوئی خبر نہیں کہ ان معمولات کا آخر نتیجہ کیا ہوگا۔ غور کیا جائے تو یہ ساری صورتِ حال اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ جس طرح باقی کائنات ایک نظام کی مکمل اطاعت میں رہ کر عافیت و خیریت کے ساتھ زندگی کا سفر طے کر رہی ہے' انسانیت اس کے برعکس بجائے قانونِ تشریع کی اطاعت کرنے اور اپنی خواہشات اور نفسانی آرزوؤں کو اسی قانون کے حوالے کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کے احساس کے ساتھ زندگی گزارنے کے' مسلسل نافرمانی اور قانون کی پامالی کے ساتھ زندگی کا سفر طے کر رہی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ پوری کائنات کا سفر اطاعت کی جہت میں ہے اور نوعِ انسانی کا سفر اس کے برعکس عدمِ اطاعت اور نافرمانی کی منزل کی طرف ہے۔ جب کہ دونوں کا خالق و مالک ایک ہے۔ اس نے دونوں کی کامیابی اور کامرانی اپنی اور اپنے قوانین کی اطاعت میں رکھی ہے۔ لیکن جب یہ نظامِ تکوین اور نظامِ تشریع کا آپس میں تصادم ہوتا ہے اور کائنات اور نوعِ انسانی جب آپس میں ٹکراتے ہیں تو ظاہر ہے کہ زمین کی برکتیں اٹھ جاتی ہیں۔ عناصرِ فطرت بجائے ہمارے ہم رکاب ہونے کے' ہم سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ قدرت کی رحمتیں انسانوں سے منہ موڑ لیتی ہیں اور دنیا جنت بننے کی بجائے' ایک دہکتا ہوا جہنم بن جاتی ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے' جب بھی دنیا نے اس حقیقت کو سمجھ کر باقی کائنات کی طرح اپنے آپ کو اللہ کے قانون کی اطاعت میں دیا تو دیکھتے ہی دیکھتے انسانی زندگی میں بجائے دکھوں کے آسودگی کے سائے گہرے ہو گئے۔ بجائے نفرت و عداوت کے شعلے اگلنے کے' یہ دھرتی آشتی اور محبت کے پھول اگانے لگی۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد جس طرح زمین اور اہلِ زمین کی حالت بدلی' وہ اسی حقیقت کی عکاس ہے۔ آنحضرت ﷺ نے دعوت کے آغاز ہی میں اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ لوگو! اگر تم مجھ پر ایمان لا کر اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت میں دے دو تو تم دیکھو گے آج جب کہ کوئی قافلہ بھی خیریت سے سفر نہیں کر سکتا' ایک شخص ملک کے ایک کونے سے سونا اچھالتا ہوا ملک کے دوسرے کونے تک سفر کرے گا' لیکن راستے میں کوئی اسے میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ آج جبکہ تمہارے گھروں میں بھوک اور فاقوں کے پہرے ہیں' ایک وقت کھانا ملتا ہے تو دوسرے وقت نصیب نہیں ہوتا۔ اللہ کی اطاعت کی برکت سے وہ وقت آئے گا کہ تم جھولیوں میں زکوٰۃ کا مال لے کر زکوٰۃ لینے والوں کو تلاش کرنے نکلو گے' لیکن تمہیں زکوٰۃ لینے والا نہیں ملے گا۔ اللہ اپنی زمین پر محض اس دین کی برکت

Marfat.com

سے تمہیں ایسا غلبہ نصیب فرمائے گا کہ زمین کی بیشتر آبادی تمہارے زیر نگیں ہوگی۔ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ ان میں سے ایک ایک بات سچ ثابت ہوئی اور انسانوں نے ان ساری تبدیلیوں کو بچشم سر دیکھا۔ قرآن کریم یہاں اسی بات کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ یہود کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ اللہ کی زمین پر انسانوں میں اللہ کا قانون نافذ کرنے کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے۔ اللہ نے ان کو حامل دعوت امت بنایا تھا' تا کہ وہ اعلائے کلمۃ الحق اور شہادت حق کا فریضہ انجام دیں۔ لیکن انہوں نے خود نافرمانی کی اور نافرمانی پر مبنی قانون کو رواج دے کر اللہ کی زمین کو فساد سے بھر دیا۔ یہ اہلِ کتاب اگرچہ پیغمبروں کی اولاد ہیں اور اپنے یہاں اللہ کے دین کا پاکیزہ ورثہ بھی رکھتے ہیں' لیکن اللہ کو نسبتیں عزیز نہیں' بلکہ اپنی اطاعت پر مبنی عمل عزیز ہے۔ اس لئے ان کا ماضی کچھ بھی رہا ہو اب یہ مفسدین میں شامل ہیں اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ مفسدین سے نہیں' مصلحین سے محبت رکھتا ہے۔ اگر یہ چاہتے ہیں کہ ان کو دوبارہ اللہ کے یہاں عزت کا مقام نصیب ہو تو پھر ان کیلئے ایک آخری موقع ہے' جس کا اگلی آیت کریمہ میں ذکر کیا جا رہا ہے:

آیت: ۶۵ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ O ''اور اگر اہلِ کتاب ایمان لائیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم ان سے ان کے گناہ جھاڑ دیں گے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کریں گے''۔

یعنی یہ اہل کتاب مسلسل اپنی نافرمانیوں اور کجرویوں کے باعث بظاہر اس قابل نہیں ہیں کہ اللہ کی رحمت سے کوئی حصہ ان کو مل سکے' کیونکہ انہوں نے مسلسل اپنی کرتوتوں سے اپنے آپ کو ہر طرح کے استحقاق سے محروم کر دیا ہے۔ لیکن یہ سراسر ان پر ایک عنایت ہے کہ انہیں آخری موقع دیا جا رہا ہے کہ اگر یہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئیں اور تقویٰ کی زندگی اختیار کریں اور اس طرح اپنے آپ کو بدلیں کہ پوری طرح امت اسلامیہ کا حصہ ہو جائیں اور اپنے بڑائی اور عظمت کے دعووں سے دستبردار ہو کر اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کی اطاعت میں دے دیں تو اللہ فرماتا ہے' ہم ان سے ان کے گناہ جھاڑ دیں گے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کریں گے۔ یہاں ایمان سے ہم نے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا مراد لیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جہاں تک ان کا اپنے پیغمبروں پر ایمان لانے کا تعلق ہے' اسکے تو وہ پہلے ہی دعوے دار تھے اور اس وقت جو دعوت ان کے سامنے پیش کی جا رہی ہے' اس کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے اور انہیں اگر انکار ہے تو حضور ﷺ ہی کی ذات سے ہے۔ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے سے تو انہیں کوئی انکار نہیں اور مزید یہ بات بھی کہ پہلے انبیاء کی دعوتیں اور شریعتیں اپنا دور گزار چکیں' اب ان کے سامنے اسلام کے نام سے جو مکمل دعوت پیش کی جا رہی ہے' اس کے داعی رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس لئے یہ بالکل بدیہی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ یہاں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے واسطے سے اسلام پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے اور یہ ایک بہت بڑی عنایت فرمائی جا رہی ہے کہ تم اپنے حال اور ماضی کو دیکھتے ہوئے یقیناً اس دعوت کی طرف آتے ہوئے ہچکچاؤ گے کیونکہ تم نے اپنے آپ کو اس قابل چھوڑا ہی نہیں لیکن یقین رکھو! تمہیں اس دعوت کو قبول کرنے کے بعد کسی ترجیحی سلوک کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا' سابقہ گناہوں کی باز پرس ہوگی بلکہ تمہارے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور تمہیں نعمتوں والے باغوں میں داخل کیا جائے گا۔

اہلِ کتاب کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جو اپنی سابقہ دینی زندگی میں بگاڑ پیدا کیا تھا' اس کا سب سے بڑا سبب درہم و دینار یعنی دولت دنیا کی ہوس تھی چنانچہ انہوں نے دنیا کی خاطر اللہ کی کتابوں میں تحریف تک کر ڈالی اور اس طرح اپنی قسمت بگاڑ لی۔ اب یہ ہوس زر چونکہ ان کی ایک طبیعتِ ثانیہ بن چکی ہے اور پھر اپنے سابقہ مذہب پر باقی رہتے ہوئے ان کے مذہبی سربراہوں کو بہت سارے مناصب' اور بہت ساری مراعات حاصل تھیں۔ اس لئے جب ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی جاتی تو یہ دولتِ دنیا کی ہوس اور موجود مراعات و مناصب ان کو اسلام کی طرف آنے سے روکتے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہماری تمام عزت و منفعت اسی گروہی عصبیت میں محفوظ ہے۔ اگر ہم نے اس سے باہر قدم نکالا تو ظاہر ہے یہ تمام فتوحات اور تمام

Marfat.com

بڑھا دے ختم ہو کر رہ جائیں گے اور ہم دنیوی آسائشوں سے محروم ہو جائیں گے۔ اگلی آیت کریمہ میں ان کی اس غلط فہمی کو دور کیا جا رہا ہے۔

آیت:۶۶ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ O ''اور اگر وہ تورات اور انجیل اور اس چیز کو قائم کریں' جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے اتاری گئی تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے اللہ کا رزق و فضل پائیں گے۔ ان میں ایک راست رو جماعت بھی ہے۔ لیکن زیادہ ان میں سے ایسے ہیں' جن کے عمل بہت برے ہیں''۔

نفاذ شریعت کی برکات

یعنی انہیں یہ اطمینان رکھنا چاہئے کہ اسلام کی آغوش میں آنے کے بعد انہیں زندگی کی نامرادیوں سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا بلکہ وہ من حیث الامت اللہ کی رحمتوں اور عنایتوں کے مرکز ٹھہریں گے اور باقی مسلمانوں کے ساتھ ان کو اس طرح نوازا جائے گا کہ رزق ان کے اوپر سے بھی برسے گا اور نیچے سے بھی ابلے گا۔ یعنی آسمان کی برکتوں کے دروازے بھی کھل جائیں گے اور زمین اپنے خزانے اگلنا شروع کر دے گی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ تورات اور انجیل اور جو کچھ ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل کیا جا رہا ہے' اسے قائم کریں۔ یہاں مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ سے مراد قرآنِ کریم ہے' جو اس وقت اللہ کی طرف سے نازل کیا جا رہا تھا۔ حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ تم تورات اور انجیل اور قرآن کریم کو قائم کرو۔ تورات اور انجیل کو قائم کرنے کے حوالے سے ایک تو یہ ظاہر کرنا ہے کہ قرآنِ کریم کو قائم کرنا صرف قرآنِ کریم کو قائم کرنا نہیں بلکہ درحقیقت تورات و انجیل کو بھی قائم کرنا ہے۔ اس لئے کہ تورات و انجیل دونوں کی اپنی پیشین گوئیوں کے مطابق یہ قرآنِ کریم ہی ہے' جو تورات اور انجیل سب کی تکمیل کرنے والا اور سب کا محافظ و نگران ہے۔ مزید یہ بات کہ قرآنِ کریم نے ہمیں یہ اطلاع دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ جب بھی تمہارے پاس نبی آخر الزماں تشریف لائیں جو تمہاری کتابوں اور شریعتوں کا مصدق بن کے آئیں گے:

لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ ﴿تو تم ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا﴾

اس لحاظ سے اہل کتاب اس بات کے پابند تھے کہ وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں اور قرآن کریم کو نافذ کرنے میں ان کی مدد کریں اس لئے انہیں یاد دلایا جا رہا ہے کہ اب تمہیں اپنے پیغمبروں کے ذریعے کئے گئے وعدے کے مطابق اللہ کے آخری رسول پر ایمان لا کر ان کی مدد کرنی چاہئے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اخروی نعمتوں کا ذکر تو اس سے پہلی آیت میں ہو چکا' دنیوی نعمتوں کا وعدہ اس آیت میں کیا گیا ہے۔

مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ سے مراد قرآن و سنت دونوں ہیں

یہاں ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ تورات اور انجیل کے نام لینے کی طرح یہاں قرآنِ کریم کا نام لینے کی بجائے مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ کیوں کہا گیا؟ اس کی مختلف وجوہ ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ جس طرح تورات اور انجیل موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئیں اور دونوں کی تبلیغ و دعوت کے مخاطب بنی اسرائیل تھے۔ گویا یہ دونوں کتابیں بنی اسرائیل کی طرف آئیں۔ اسی طرح اب بنی اسرائیل یہ سمجھ رہے تھے کہ قرآنِ کریم بنی اسماعیل کی طرف آیا ہے' جس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے اگر اس کا کوئی حامل ہے تو وہ بنی اسماعیل ہیں اور اگر یہ کوئی اعزاز ہے تو اس کے مستحق بھی بنی اسماعیل ہیں چنانچہ ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ کتاب عالمگیر اور ہمہ گیر بن کر آئی ہے۔ یہ بنی اسماعیل کیلئے نہیں بلکہ ساری نوعِ انسانی

Marfat.com

کیلئے ہے کیونکہ یہ ذکر للعالمین ہے۔اس لئے تمہیں آگے بڑھ کر اس لئے اسے قبول کرنا چاہئے کہ یہ تمہارا اپنا سرمایہ ہے اور تمہارے اپنے وعدے کی نعمت اور تمہاری اپنی میراث ہے۔کسی خاص قبیلے کا اس پر کوئی استحقاق نہیں' بلکہ یہ کتاب ہر اس قوم کیلئے راہنما ہے' جو اسے آگے بڑھ کر قبول کرلے اور اس کی ذمہ داریوں کے بوجھ کو اٹھالے۔

دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ سابقہ امتوں کی گمراہی اور فساد کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ یہ امتیں جب گمراہ ہوئیں اور زوال نے ان کے اندر نفوذ اختیار کیا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے ہاتھوں سے کتابیں گم ہوگئی تھیں اور یہ اللہ کی نازل کردہ کتابوں سے بالکل محروم ہوگئے تھے بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ سب سے پہلے جوان پر حادثہ گزرا ہے' وہ یہ ہے کہ کتابیں کسی نہ کسی حد تک ان کے پاس موجود رہیں' لیکن یہ اپنے رسولوں کی سنت اور سیرت سے بہت جلدی محروم ہوگئے۔نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جب کتاب اللہ کے احکام کے مطابق پیغمبر کے عمل کی سند یا کتاب اللہ کے مجملات کی پیغمبر کی جانب سے تشریح کتاب اللہ کے مبہمات کی پیغمبر کی جانب سے تفسیر' ان کے پاس موجود نہ رہی تو اللہ کی کتاب ان کے ہاتھوں میں موم کی ناک بن کر رہ گئی۔انہوں نے جیسے چاہا اس کے احکام کا قالب تیار کیا۔شروع میں معنوی تحریف ہوئی' آہستہ آہستہ لفظی تحریف اور ترمیم تک نوبت پہنچی۔گویا ان کی گمراہی اور کج روی کا آغاز اور پھر اس میں توسیع کا سبب صرف پیغمبروں کی سنت اور سیرت کا گم ہو جانا تھا۔اس کو ایک مختصر سی مثال سے اس طرح سمجھ لینا چاہئے کہ قرآنِ کریم ہمیں ''اقیموا الصلوٰۃ'' کہہ کر اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا۔لیکن قرآنِ کریم میں کہیں طریقہ نہیں بتایا گیا۔قرآنِ کریم سے ہمیں یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ نمازوں کی تعداد کتنی ہے' اس کے اوقات کیا ہیں' اذان کیا چیز ہے' جماعت کے احکام کیا ہیں۔ہر نماز کی رکعتیں کتنی ہیں' فرائض اور واجبات کیا ہیں غرضیکہ نماز کی پوری تفصیل سے متعلق کوئی چیز' ہمیں قرآن کریم سے معلوم نہیں ہوتی۔آج اگر خدانخواستہ ہمارے ہاتھوں میں صرف قرآنِ کریم محفوظ رہ جائے تو ہم نماز ادا کرنے سے عاجز ہو جائیں کیونکہ اس کی پوری تفصیل ہمیں آنحضرت ﷺ کی احادیث مبارکہ اور سنت طیبہ سے ملتی ہے۔اگر احادیث اور سنت مسلمانوں کے پاس موجود اور محفوظ نہ ہوتیں تو ہم نماز تک ادا نہیں کر سکتے تھے' چہ جائیکہ ہم باقی پوری شریعت پر عمل کرتے۔اس لئے یہاں بجائے قرآنِ کریم کے لفظ کے مَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ فرمایا گیا کہ تم نے دنیا میں اب جو چیز قائم کرنی ہے وہ صرف قرآن کریم نہیں بلکہ سب کچھ ہے' جو آنحضرت ﷺ پر نازل کیا گیا۔اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا گیا:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ط

﴿ہم نے اے پیغمبر! آپ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور وہ کچھ آپ کو سکھایا ہے' جو آپ نہیں جانتے تھے﴾ (النساء۴:۱۱۳)

اس کی بہترین تشریح آنحضرت کا وہ ارشاد گرامی ہے' جسے ابوداؤد' ابن ماجہ اور دارمی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

الا انی اوتیت القرآن ومثله معه الایوشک رجل شبعان علیٰ اریکته یقول علیکم بهذاالقران فما وجدتم فیه من حلال فاحلوا، وماوجدتم فیه من حرام فحرموه وان ما حرم رسول الله (ﷺ) کما حرم الله

﴿یاد رکھو! مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اسی کے مثل اور بھی علوم دیئے گئے۔آئندہ زمانہ میں ایسا ہونے والا ہے کہ کوئی شکم سیر راحت پسند یہ کہنے لگے کہ تم کو صرف قرآن کافی ہے' جو اس میں حلال ہے' صرف اس کو حلال سمجھو اور جو اس میں حرام ہے' صرف اس کو حرام سمجھو حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ کے رسول ﷺ نے حرام ٹھہرایا ہے' وہ بھی ایسی ہی حرام ہے' جیسی اللہ تعالیٰ کے کلام کے ذریعہ حرام کی ہوئی اشیاء حرام ہیں۔﴾

Marfat.com

حاصل کلام یہ کہ قرآن کریم کے ساتھ چونکہ آنحضرت ﷺ کی سنت کو بھی قائم کرنا تھا' اسلئے اگر صرف قرآن کا لفظ بولا جاتا تو اس سے یہ وضاحت نہیں ہوتی تھی۔اس لئے مَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡھِمۡ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ کہا گیا' تا کہ امت مسلمہ اپنے فریضہ منصبی کو اچھی طرح سمجھ لیں اور مزید یہ بات بھی شاید اشارۃً اس میں کہی جارہی ہے کہ اللہ کی کتاب یقیناً امت اسلامیہ کا سب سے بڑا سرمایہ ہے کیونکہ وہ کلام اللہ ہے اور وہی مسلمانوں کیلئے آئین اور قانون ہے۔لیکن کوئی کتاب بھی کسی امت اور افراد امت کی شخصیت کی تعمیر کیلئے کافی نہیں ہوتی' جب تک کہ اس کے ساتھ پیغمبر کی شخصیت موجود نہ ہو۔ یہاں اس لئے بالواسطہ یہ سمجھایا جارہا ہے کہ تم سابقہ امتوں کی طرح انبیاء کی شخصیتوں سے کٹ کر زندگی گزارنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ زندگی کے سفر میں آوارہ ہو جاؤ گے۔تمہاری وابستگی قرآن کریم کے ساتھ ساتھ ذات رسالت مآب ﷺ سے بھی ویسی ہی گہری ہونی چاہئے' ورنہ تمہاری شخصیتوں کی تعمیر نہیں ہو سکے گی۔

سید سلیمان ندوی مرحوم ومغفور نے لکھا ہے کہ میں مصر سے واپسی پر جس بحری جہاز پر سفر کر رہا تھا' اسی میں بنگال کے مشہور شاعر ڈاکٹر ٹیگور بھی سفر کر رہے تھے۔ایک دن ہمارے دوستوں میں سے کسی نے ان سے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب برہمو سماج ایک بڑا اصلح کن قسم کا مذہب تھا۔اس کے بنانے والوں کا یہ دعویٰ تھا کہ اس میں تمام مذاہب کی سچائیاں موجود ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ تمام مذاہب سے زیادہ کامیاب ٹھہرتا۔مگر دیکھا یہ گیا کہ وہ تھوڑی عمر میں ہی ناکام ہو گیا اور آج اس کے ماننے والے نہایت محدود تعداد میں ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس فلسفی شاعر نے بڑی سچی بات کہی کہ مذاہب ہمیشہ شخصیتوں سے توانا ہوتے اور رواج پکڑتے ہیں۔اس مذہب کے پیچھے چونکہ کوئی شخصیت نہیں تھی۔اس لئے باوجود صداقتوں کا مجموعہ ہونے کے' شخصیت سے خالی ہونے کی وجہ سے وہ ناکام ہو گیا۔اس لئے یہاں پیغمبر کی شخصیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

کسی چیز کو قائم کرنے سے کیا مراد ہے؟

اس آیت کریمہ میں ''اَقَامُوا'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔یعنی یہ اہل کتاب تورات وانجیل اور قرآن کریم کو قائم کریں۔قائم کرنے سے کیا مراد ہے؟ عربی زبان میں اقامت کسی چیز کو اس طرح وجود میں لانے کو کہتے ہیں' جس میں اس کے وجود کے تمام تقاضے پورے ہو جائیں۔مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ عدالت قائم ہو گئی تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ عدالت کی عمارت بن گئی' جج نے اپنے کام شروع کر دیئے' مدعی اور مدعا الیہ اپنے معاملات لے کر عدالت کی طرف رجوع کرنے لگے' وکلاء نے کیس پیش کرنے شروع کر دیئے' دفتری عملے نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا' انصاف کا عمل پوری طرح جاری ہو گیا۔اس پورے پروسس کو عدالت کا قائم ہونا کہتے ہیں۔اس طرح اللہ کی کتابوں کو قائم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے ماننے والوں کی زندگی' ان کتابوں کی تعلیمات سے متعلق ہو جائے۔ان کا کوئی شخصی' جماعتی' انفرادی اور اجتماعی کام اور رویہ جو بھی شکل اختیار کرے' اس میں راہنمائی اس کتاب سے لی جائے۔ہر ادارہ اس کی راہنمائی میں اپنا کام کرے۔تعلیمی اداروں کی بنیاد اسی کی مہیا کردہ علمی بنیادوں پر اٹھائی جائے۔معاشرت کے اصول' معیشت کے قوانین' سیاست کے طور اطوار' حکومت کا طریق کار' ملک کا دستور وآئین' ان سب کا سرچشمہ یہی اللہ کی کتاب ہو۔اس پورے پروسس کو کتاب کا قائم کرنا کہیں گے اور یہی وہ حقیقت ہے' جس کے بروئے کار لانے پر دنیوی سہولتوں' کامرانیوں اور سرفرازیوں اور اخروی نعمتوں کی نوید سنائی گئی ہے۔

اس آیت کریمہ میں آخر میں یہ فرمایا ہے: مِنۡھُمۡ اُمَّۃٌ مُّقۡتَصِدَۃٌ ''ان میں ایک راست رو جماعت بھی ہے''یعنی یہود پر اتمام حجت کے بعد آخر میں یہ خبر دی گئی ہے اور مسلمانوں کو شاید اس حقیقت سے آگاہ کیا جارہا ہے کہ آپ ان یہود سے کوئی بہت زیادہ توقعات وابستہ نہ کریں۔ان میں ایک مختصر جماعت ہے' جو پہلے سے راست روی پر قائم ہے' وہی اب بھی ایمان لائیں گے۔رہے باقی یہود تو ارشاد فرمایا کہ ان میں زیادہ ایسے لوگ ہیں' جن

Marfat.com

کے عمل بہت برے ہیں۔ اس لئے ان سے قبول اسلام کی توقع عبث ہے۔ چنانچہ بعد میں حالات نے یہ ثابت کو دیا کہ قرآنِ کریم کی یہ خبر بالکل صحیح تھی۔
ان میں سے ایک مختصر گروہ نے اسلام قبول کیا' باقی حسد و بغض کی آگ میں جلتے رہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ
اے پیغمبر جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو
رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ
پہنچا دو۔ اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے (یعنی پیغمبری کا فرض ادا نہ کیا) اور خدا تم کو
مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ٦٧ قُلْ
لوگوں سے بچائے رکھے گا بے شک خدا منکروں کو ہدایت نہیں دیتا۔ کہو کہ اے
يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰي شَيْءٍ حَتّٰي تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ
اہل کتاب! جب تک تم تورات اور انجیل کو اور جو (اور کتابیں)
وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ
تمہارے پروردگار کی طرف سے تم لوگوں پر نازل ہوئیں ان کو قائم نہ رکھو گے کچھ بھی راہ پر نہیں ہو سکتے اور
مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَي الْقَوْمِ
(یہ قرآن) جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے۔ اس سے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر اور
الْكٰفِرِيْنَ ٦٨ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ
بڑھے گا۔ تو تم قوم کفار پر افسوس نہ کرو۔ جو لوگ خدا پر اور روز آخرت پر ایمان لائیں گے اور عمل نیک
وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا
کریں گے خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہودی یا ستارہ پرست یا عیسائی ان کو قیامت
فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٦٩ لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ
کے دن نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ ہم نے بنی اسرائیل سے

Marfat.com

بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ

عہد بھی لیا اور اُن کی طرف پیغمبر بھی بھیجے۔ (لیکن) جب کوئی پیغمبر اُن کے پاس ایسی باتیں لے کر

بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِیْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِیْقًا یَّقْتُلُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَ

آتا جن کو اُن کے دل نہیں چاہتے تھے۔ تو وہ (انبیاء کی) ایک جماعت کو تو جھٹلا دیتے اور ایک جماعت کو قتل کر دیتے

حَسِبُوْۤا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ

تھے۔ اور یہ خیال کرتے تھے کہ (اس سے) ان پر کوئی آفت نہیں آنے کی تو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے پھر خدا نے اُن پر

ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

مہربانی فرمائی (لیکن) پھر اُن میں سے بہت سے اندھے اور بہرے ہو گئے۔ اور خدا اُن کے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ ؕ وَ

وہ لوگ بے شبہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ مریمؑ کے بیٹے (عیسیٰ) مسیحؑ خدا ہیں۔ حالانکہ

قَالَ الْمَسِیْحُ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ

مسیحؑ یہود سے یہ کہا کرتے تھے کہ اے بنی اسرائیل خدا ہی کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی (اور جان

مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ

رکھو کہ) جو شخص خدا کے ساتھ شرک کرے گا خدا اس پر بہشت کو حرام کر دے گا اور اس کا ٹھکانا دوزخ

وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ

ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ وہ لوگ (بھی) کافر ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا تین

ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنْ لَّمْ یَنْتَهُوْا

میں کا تیسرا ہے حالانکہ اُس معبود یکتا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اگر یہ لوگ ایسے اقوال (و عقائد) سے

عَمَّا یَقُوْلُوْنَ لَیَمَسَّنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۳﴾

باز نہیں آئیں گے تو ان میں جو کافر ہوئے ہیں وہ تکلیف دینے والا عذاب پائیں گے۔

Marfat.com

أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٧٤﴾

تو یہ کیوں خدا کے آگے توبہ نہیں کرتے اور اس سے گناہوں کی معافی نہیں مانگتے۔ اور خدا تو بخشنے والا مہربان ہے

مَّا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ

مسیح ابن مریمؑ تو صرف (خدا کے) پیغمبر تھے۔ اُن سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے

الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ۗ انظُرْ كَيْفَ

تھے۔ اور اُن کی والدہ (مریمؑ) خدا کی ولی اور سچی فرمانبردار تھیں۔ دونوں (انسان تھے اور) کھانا کھاتے

نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٧٥﴾ قُلْ أَتَعْبُدُونَ

تھے۔ دیکھو ہم ان لوگوں کے لیے اپنی آیتیں کس طرح کھول کھول کر بیان کرتے ہیں پھر (یہ) دیکھو کہ یہ کدھر الٹے جا رہے ہیں

مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۚ وَاللَّهُ هُوَ

کہو کہ تم خدا کے سوا ایسی چیز کی کیوں پرستش کرتے ہو جس کو تمہارے نفع اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں۔ اور خدا ہی

السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٧٦﴾ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ

(سب کچھ) سنتا جانتا ہے۔ کہو کہ اے اہلِ کتاب! اپنے دین (کی بات) میں ناحق مبالغہ

الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِن قَبْلُ وَ

نہ کرو اور ایسے لوگوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلو جو (خود بھی) پہلے گمراہ ہوئے اور اور بھی

أَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ ﴿٧٧﴾

اکثروں کو گمراہ کر گئے اور سیدھے رستے سے بھٹک گئے۔

تمہید

ہم گزشتہ دورکوعوں سے مسلسل اہل کتاب خصوصاً یہود کی اسلام دشمنی اور نبی کریم ﷺ سے بغض کی تاریخ پڑھ رہے ہیں اور ہم نے دیکھا ہے کہ اسلام دشمنی میں وہ اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ باوجود اس کے کہ وہ رسول پاک ﷺ کی شخصیت کو اپنی کتابوں کے دیئے ہوئے تعارف کی روشنی میں پوری طرح پہچانتے بھی تھے، لیکن وہ ان پر ایمان لانے اور انہیں قبول کرنے کیلئے کسی طرح تیار نہیں تھے بلکہ آنحضرت ﷺ کی شخصیت کے حوالے سے غلط فہمیاں پیدا کرنا اور لوگوں کو بدگمان کرنا ان کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔ ان کے خواص و عوام میں دشمنی کی جڑیں اس قدر گہری ہو گئی تھیں کہ وہ شعائرِ اسلام مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتے تھے بلکہ اس اسلام دشمنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عقل و خرد سے تو اندھے ہوئے ہی تھے، قومی اور انسانی شرافت

Marfat.com

بھی محروم ہو گئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ خود اللہ رب العزت کی ذات کے بارے میں انہیں کوئی بھی نازیبا بات کہنے سے بھی شرم نہیں آتی تھی۔ مزید یہ بات کہ یہ ان کی مخالفت و دشمنی صرف ایمان قبول نہ کرنے اور شعائرِ اسلام کی توہین کرنے اور اللہ کریم کی بارگاہ میں نازیبا باتیں کہنے تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ وہ مسلسل اپنی سازشوں کے ذریعہ اس کوشش میں تھے کہ آنحضرت ﷺ کو جسمانی طور پر اگر نقصان پہنچایا جا سکتا ہو تو اس سے بھی دریغ نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان ہمیشہ ان کی طرف سے ایک اضطراب محسوس کرتے تھے۔ ایسی صورت حال میں جب کہ معاملے کا ایک فریق اس حد تک پہنچ جائے، جس کا تذکرہ کیا گیا ہے تو طبیعتوں میں دو قسم کے ردعمل کا پیدا ہونا نہ صرف کہ مستبعد نہیں بلکہ فطرت کا عین تقاضہ ہے۔ ایک ردعمل کی صورت تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو جن کی دشمنی عقل و شرافت کی حدود سے آگے بڑھ چکی ہے ان کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے اور ان کی طرف سے مایوسی کا شکار ہو کر حق نصیحت کسی اور پر صرف کیا جائے اور ان کے بارے میں یہ سمجھ لیا جائے کہ قدرت ایمان اور اسلام کے حوالے سے شاید ان کی محرومی کا فیصلہ کر چکی ہے۔ دوسرا ردعمل یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ان کو ایمان و اسلام کی دعوت دی بھی جائے اور ان تک اسلام کا پیغام پہنچایا بھی جائے تو وہ اس احتیاط سے پہنچایا جائے کہ اندھی دشمنی میں یہ آخری اقدام اور آخری داؤ کا فیصلہ نہ کر سکیں۔ چنانچہ اس متوقع ردعمل کے پیش نظر قرآن کریم آنحضرت ﷺ سے خطاب فرما رہا ہے:

آیت:٦٧ يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ O "اے رسول (ﷺ)! تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے، اس کو اچھی طرح پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور اللہ لوگوں سے تمہاری حفاظت کرے گا، اللہ کافروں کو ہرگز راہ یاب نہیں کرے گا"۔

رسول کا اصل کام:

بجائے اس کے کہ پروردگار رسول پاک ﷺ کا نام لے کر یا آپ کے کسی لقب کے ذریعے مثلاً طٰہٰ یا یٰسین کہہ کر آپ کو خطاب کرتا آپ کو رسول کہہ کر خطاب کرنا بہت معنویت کا حامل ہے۔ یعنی آپ کی حیثیت نہ تو ایک ناصح کی ہے کہ آپ مخاطب کے مزاج کو دیکھ کر اور اس کے معمولات کا اندازہ کر کے حق نصیحت استعمال کریں اور اگر آپ دیکھیں کہ مخاطب کا مزاج اسے قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تو آپ حق نصیحت ہی سے ہاتھ اٹھا لیں اور نہ آپ کی حیثیت صرف ایک مصلح کی ہے کہ مصلح بھی اپنے اصلاحی عمل کا تخم بنجر زمین میں کبھی ضائع نہیں کرتا بلکہ فرمایا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور رسول کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ کے کلام اور اس کے پیغام کو بندوں تک بلا کم و کاست پہنچاتا ہے، اس کے سامنے چاہے مخالفت کے پہاڑ کیوں نہ کھڑے ہوں اور چاہے ناساعد حالات کی وجہ سے امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی ہو اسے پھر بھی اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کا رسول اور پیغامبر ہے اور پیغامبر کا کام پیغامبری کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ رہی یہ بات کہ وہ دشمنی میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں اور ان کی طرف سے پیغام کی قبولیت کا کوئی ادنیٰ سا امکان بھی دکھائی نہیں دیتا، یہ بات اپنی جگہ چاہے کتنی ہی وزنی کیوں نہ ہو، لیکن بحیثیت رسول اسے مخاطب کی حالت کو نہیں دیکھنا بلکہ اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ رہی اس کی قبولیت کی طرف سے مایوسی، تو اس سے ہزار دفعہ روکا گیا ہے کیونکہ یہ بات سراسر اللہ کے علم میں ہے کہ کس کا دل کس وقت قبولیت کیلئے کھل سکتا ہے اور مزید یہ بات بھی کہ بعض دفعہ قوموں کے سامنے پیغام خداوندی اس لئے نہیں بھیجا جاتا کہ وہ اسے ضرور قبول کریں بلکہ اس لئے بھی بھیجا جاتا ہے تاکہ ان پر اتمام حجت ہو جائے اور قیامت کے دن وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں تو کسی پیغامبر نے پیغام نہیں پہنچایا ورنہ ہم ضرور قبول کر لیتے اور رہی یہ بات کہ ان کی دشمنی کے باعث اس بات کا شدید اندیشہ تھا کہ وہ پہلے ہی اپنی دشمنی میں جلے بھنے بیٹھے ہیں، اب یہ پیغام جو اس آیت کریمہ کے بعد شروع

Marfat.com

ہو رہا ہے، جس میں ان کی اصل حیثیت کو واضح کیا جا رہا ہے، جب ان تک پہنچے گا تو وہ یقیناً دشمنی میں آخری اقدام کرنے اور آخری داؤ کھیلنے سے بھی باز نہیں آئیں گے۔ اس سے حالات کے بگاڑ میں یقیناً اضافہ ہوگا اور دعوت و تبلیغ کی راہ مسدود ہو کر رہ جائے گی اور ہو سکتا ہے اس طرح وہ آنحضرت ﷺ کی ذات والاصفات کو کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں۔

اس سلسلے میں دو باتیں فرمائی گئیں۔ ایک تو یہ بات کہ حالات چاہے کیسے بھی ہوں ان سے متاثر ہو کر پیغامبری کے عمل میں کمی بیشی کرنا، یہ اللہ کے رسولوں کا کام نہیں ہے اور ہمیں قرآن کریم میں جابجا اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حضور ﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ اللہ نے جب یہ حکم دیا کہ کسی کو منہ بولا بیٹا نہ بنایا جائے بلکہ انہیں ان کے باپوں کے حوالے سے ہی پکارا جائے اور اگر ان کے باپوں کے بارے میں علم نہ ہو:

فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ﴿تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں﴾

لیکن یہ تبنیت کی رسم چونکہ صدیوں سے چلی آ رہی تھی اس کا ٹوٹنا آسان نہ تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ آنحضرت ﷺ اپنے قول اور عمل سے اس رسم کا ابطال کریں۔ چنانچہ جب حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی زوجہ محترمہ یعنی حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو طلاق دے دی اللہ تعالیٰ نے اس رسم کے خاتمے کیلئے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ آپ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح فرمائیں۔ اب صدیوں سے چونکہ یہ سمجھا جا رہا تھا کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹوں کی طرح ہوتا ہے اور اس کی بیوی اس کے منہ بولے باپ کی بہو ہوتی ہے۔ خسر چونکہ کسی بھی مذہب میں بہو سے نکاح نہیں کر سکتا اس لئے اگر آنحضرت ﷺ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضور ﷺ نے اپنی بہو سے نکاح کر لیا اس کے نتیجے میں مخالفین کو مخالفت کا ایک ایسا ہتھیار مل جائے گا جس سے آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی اور اسلام کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کرنے کا ایک راستہ کھل جائے گا اور مخالفت کا ایسا طوفان اٹھے گا جس کا توڑ کرنا مسلمانوں کیلئے آسان نہ ہوگا۔ اس لئے اس حکم پر عمل کرنے میں آپ یقیناً بہت سے اندیشہ ہائے دور دراز کا احساس فرما رہے تھے۔ سورۃ احزاب میں رسول اللہ ﷺ کو واضح حکم دیا گیا کہ اللہ کے رسول ہمیشہ اللہ کے پیغامات کو برملا پہنچاتے رہے ہیں اور جب ان کا ابلاغ عمل کی صورت میں ضروری ہو تو وہ ہمیشہ اس پر عمل بھی کرتے رہے ہیں اس لئے آپ کو ایسا کرنا چاہئے۔ رہا مخالفت کا اندیشہ تو فرمایا:

وَ يَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ﴿وہ اللہ سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی کی پرواہ نہیں کرتے﴾ (الاحزاب ۳۳:۳۹)

آپ بھی ان اندیشوں کی ہرگز پرواہ نہ کریں اور اس کے بعد کی آیت کریمہ میں فرمایا کہ آپ کیلئے ان کٹھن مراحل سے گزرنا اس لئے ضروری ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور رسول کی زبان سے چونکہ اللہ کا قانون بولتا ہے اور اس کی ذات منشاء ایزدی کا مظہر ہوتی ہے اور اس کا قول و عمل دین کی سند کہلاتا ہے، اس لئے یہ باتیں سوچنا کہ مخالفین کیا کر گزریں گے، یہ آپ کا منصب نہیں۔ اگر آپ ایسا سوچیں گے اور اس پیغام کے پہنچانے میں تامل کریں گے تو فرمایا: وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اسکی رسالت کا حق ادا نہیں کیا اور اس کا پیغام نہیں پہنچایا۔ اندازہ فرمایئے! اس جملے کے تیور کتنے تیز ہیں اور آنحضرت ﷺ سے ایسے تیکھے تیوروں کے ساتھ پروردگار کا خطاب بظاہر عجیب محسوس ہوتا ہے، لیکن غور و فکر سے یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ اس جملے میں جو عتاب معلوم ہوتا ہے، اس عتاب کا مورد اور اس کے مخاطب رسول اللہ ﷺ نہیں بلکہ روئے سخن یہود اور منافقین کی طرف ہے۔ عتاب ان پر ہے، خطاب آنحضرت ﷺ سے ہے۔ ان سے خطاب نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ پروردگار

Marfat.com

یہود کو خطاب کے قابل نہیں سمجھتے' اسلئے کہ جب کسی قوم یا فرد پر اللہ کا غضب بھڑکتا ہے تو نہ دنیا میں اسے خطاب کے قابل سمجھا جاتا ہے اور نہ آخرت میں۔ قرآن کریم میں ہے:

وَلاَ یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلاَ یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَهِ وَلاَ یُزَکِّیْهِمْ ص (ال عمران 3:77)

﴿اللہ قیامت کے دن نہ ان سے کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف نظر رحمت سے دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا﴾

اس لئے یہاں بھی ان کو خطاب کے قابل نہیں سمجھا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے خود دشمنوں سے حضور ﷺ کی حفاظت فرمائی

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ اپنی اندھی دشمنی میں کوئی ایسا ویسا اقدام نہ کر گزریں جس سے ذات رسالت مآب ﷺ کو نقصان پہنچ جائے تو ارشاد فرمایا گیا:

وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ﴿اللہ آپ کی لوگوں سے حفاظت کرے گا۔﴾

حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہود کی اندھی دشمنی کے باعث مسلمانوں کو آنحضرت ﷺ کے بارے میں ہمیشہ ایک اضطراب رہتا تھا۔ حضور ﷺ اگر کبھی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تو مسلمان دیوانہ وار آپ کی تلاش کیلئے نکل کھڑے ہوتے کیونکہ ہر وقت یہود کی جانب سے حملے کا اندیشہ رہتا تھا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ خطرے کے باعث حضور ﷺ رات کو سو نہ سکے۔ چنانچہ ایسے ہی حالات میں ایک دفعہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم میں اگر کوئی بھلا آدمی پہرہ دیتا تو میں رات آرام سے سو لیتا۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہتھیار پہن کر تشریف لائے اور آپ کے دراقدس پر پہرے کیلئے کھڑے ہو گئے۔ ابھی رات کا کچھ حصہ ہی گزرا تھا کہ آیت کریمہ کا یہ حصہ نازل ہوا تو آپ ﷺ نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر فرمایا "سعد! تم چلے جاؤ' اللہ نے میری حفاظت کا وعدہ فرما لیا ہے"۔ شاید اسی حفاظت کا نتیجہ تھا کہ بڑے بڑے حوادث میں بھی دشمن آپ کو نقصان پہنچانے میں ہمیشہ ناکام رہا۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک غزوہ میں حضور ایک درخت پر کپڑا ڈال کر اس کے سائے میں آرام فرما رہے تھے اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین بھی سائے کی تلاش میں دور دور بکھر گئے تھے کہ اچانک ایک بدوی نجانے کیسے چھپتا چھپاتا آنحضرت ﷺ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ حضور ﷺ کی تلوار درخت سے لٹک رہی تھی اس نے تلوار اتاری اور نیام سے نکال کر آنحضرت ﷺ سے کہنے لگا کہ محمد (ﷺ)! اب بتاؤ تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ اندازہ کیجئے! ایک گنوار شخص جس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہو اور جو دشمنی میں اندھا ہو کر اور اپنی جان پر کھیل کر حضور ﷺ کی جان لینے کیلئے سر پر کھڑا ہے اور اب وہ موت کے فرشتے کی صورت میں حضور ﷺ سے پوچھ رہا ہے کہ بتاؤ! تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ تو حضور ﷺ نہایت اطمینان سے فرماتے ہیں: "اللہ"۔ یہ سنتے ہی اس کے جسم پر کپکپی طاری ہوئی' ہیبت زدہ ہو کر اس نے تلوار نیام میں ڈال دی اور حضور ﷺ کے پاس بیٹھ گیا۔ یہ وہ حفاظت خداوندی تھی جس کا آپ ﷺ سے وعدہ کیا گیا تھا۔

اللہ کافروں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حفاظت کرتا ہے

ایسی حفاظت اگرچہ رسولوں کے ساتھ خاص ہے' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کی رسالت کے صدقے مسلمانوں کو بھی اس سے محروم نہیں رکھا گیا اور ان کیلئے ایک مستقل قانون بنا دیا گیا' جس کی طرف اشارہ اس آیت کے آخری حصے میں ہے، فرمایا:

Marfat.com

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿بے شک اللہ کافروں کی قوم کو راہ یاب نہیں کرتا۔﴾

یعنی اس کا قانون یہ ہے کہ اگر ایک طرف مسلمانوں کا ایک ایسا گروہ ہو جو تدبیر میں بھی اور اطاعت وعمل میں بھی اسلام کی پوری تصویر ہو اور پھر وہ اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر اور شہادت حق کا فرض انجام دیتے ہوئے اپنے ملی دفاع کیلئے اٹھتا ہے اور اس کے مقابلے میں ایک ایسا کافر گروہ ہو جو ان مسلمانوں کو صرف اس لئے مٹا دینا چاہتا ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کی بات کیوں کرتے ہیں اور ان کا گناہ صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کیلئے جینا اور مرنا چاہتے ہیں اور اسی کے نام کی عظمت اور اسی کے بندوں کی حفاظت کیلئے سر ہتھیلی پر رکھ کے آئے ہیں' ایسی صورت میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ 313 بھی ہوں تو ایک ہزار کے سامنے بھی سرنگوں نہیں ہوتے اور اللہ انہیں ہمیشہ فتح وکامرانی سے نوازتا ہے۔

اس تمہید کے بعد اگلی آیت سے وہ پیغام شروع ہو رہا ہے جو اہل کتاب کے سامنے ان کی ہدایت اور اتمامِ حجت کیلئے پیش کیا جا رہا ہے۔

آیت:۶۸ قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ لَیَزِیْدَنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْیَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ O ''کہہ دو: اے اہلِ کتاب! تمہاری کوئی بنیاد نہیں جب تک تم تورات' انجیل اور اس چیز (قرآن) کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے۔ لیکن وہ چیز جو تیری طرف تیرے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے' وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور ان کے کفر میں اضافہ کرے گی تو تم اس کافر قوم پر غم نہ کرو''۔

شہادتِ حق کے منصب پر فائز امت کا اصل کام

اس سلسلے میں سب سے پہلے اس چیز کی طرف توجہ دلائی گئی ہے' جو اہل کتاب کی ہدایت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی تھی' وہ چیز اہلِ کتاب کا یہ زعم باطل تھا کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں' ہماری حیثیت دنیا کی ساری قوموں کے مقابلے میں ایک منفرد نوعیت کی ہے۔ ساری دنیا اپنے اعمال کے حوالے سے پرکھی جائے گی' لیکن ہمارے لئے یہ نسبتیں کافی ہیں۔ ہم کیسی بھی بداعمالیاں کیوں نہ کریں جہنم کی آگ ہمیں کبھی نہ چھوئے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ چند روز کیلئے ہمیں جہنم میں جانا پڑے' لیکن اس کے بعد جنت کے وارث ہم ہی ہوں گے۔ ان کے یہی تصورات تھے جنھوں نے انہیں شریعت کی پابندیوں سے یکسر غافل کر دیا تھا۔ وہ بڑے سے بڑا جرم کرنے میں دلیر اس لئے ہو گئے تھے کہ انہیں جوابدہی کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو اپنے قومی خصائص کی وجہ سے ان چیزوں سے بہت بالا بلند سمجھتے تھے۔ سب سے پہلے ان کے اسی احساسِ تفاخر پر چوٹ لگائی گئی ہے۔ ایک جراح کا نشتر ہمیشہ وہاں چبھتا ہے جہاں مادۂ فاسد جمع ہوتا ہے کیونکہ اگر جسم سے فاسد مادہ نکال دیا جائے تو جسم اصلاح کے راستے پر پڑ جاتا ہے۔ ان کی اصلاح کی صورت بھی یہی تھی کہ ان کے اس احساسِ تفاخر پر چوٹ لگتی اور یہ فاسد مادہ ان کے دماغوں سے نکلتا تو پھر امید کی جاسکتی تھی کہ شاید وہ اصل حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس لئے فرمایا کہ اے اہلِ کتاب! تمہاری کوئی حیثیت نہیں' تم کسی بنیاد پر نہیں ہو۔ اس لئے نسبتوں کا دعویٰ کرنا اور ایمان وعمل سے تہی دامن ہو جانا' یہی تو محرومی کی دلیل ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ تم اپنی محرومی کو اپنی خوبی بلکہ تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھ رہے ہو۔ اب اس پیغام کے آغاز ہی میں جو چوٹ لگائی جا رہی ہے' اس سے یہ اندیشہ بے سبب نہیں کہ وہ لوگ بھڑک کر کچھ بھی کر گزریں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اصلاحی عمل میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کیونکہ بیمار جسم سے مادۂ فساد نکالنا یا اس کو ابھار کر اوپر لے آنا' بہت ضروری ہوتا ہے۔

مشہور ہے کہ نظام حیدر آباد دکن نے ایک دفعہ حکیم اجمل خان کو اپنی ایک جلدی بیماری کے علاج کیلئے اپنے یہاں بلایا۔ حکیم صاحب

Marfat.com

جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس کیلئے آپ کو میرے مطب میں تشریف لانا ہوگا۔ نظام نے ہر چند کوشش کی کہ حکیم صاحب اس کے یہاں حاضری دینے پر آمادہ ہو جائیں' لیکن حکیم صاحب اس کیلئے تیار نہ ہوئے۔ مجبوراً اپنی تکلیف کی وجہ سے نظام حکیم صاحب کے پاس آئے۔ حکیم صاحب نے مزید ستم یہ کیا کہ بجائے باہر آ کر ان کا استقبال کرنے کے' ان کو انتظار گاہ میں بٹھا دیا۔ نظام صاحب نے اس کو اپنی توہین جانا' غصے سے بے قابو ہو گئے اور انتظار گاہ میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے اور بار بار غصے کا اظہار بھی کرنے لگے۔ حکیم صاحب نے کافی انتظار کے بعد جب ان کو اپنے پاس بلایا تو اس وقت تک نظام صاحب کا غضب اپنی حدود عبور کر چکا تھا۔ اب حکیم صاحب ان کی پیشوائی کیلئے آگے بڑھے' نہایت معذرت پیش کی جب ذرا ان کا غصہ فرو ہوا تو تب انہیں بتایا کہ یہ جو کچھ میں نے کیا' یہ سب کچھ آپ کے علاج کیلئے ضروری تھا۔ آپ کی جلدی تکلیف کے علاج کیلئے ضروری تھا کہ آپ کو جوشِ غضب میں مبتلا کیا جاتا اور اس کے نتیجے میں چہرے پر جس کیفیت کا اظہار متوقع تھا' اس سے میں مرض کا اندازہ کر سکتا تھا' چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور میرے اندازے کے مطابق نتائج سامنے آئے اور میں مرض کو سمجھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علاج کیلئے مرض کا اظہار' بعض دفعہ ضروری ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی صورت حال سے اہل کتاب کو دوچار کرنے کیلئے سب سے پہلے ان کے اصل مادۂ فساد پر چوٹ لگائی گئی اور پھر انہیں اصل مرض سے آگاہ کیا گیا ہے کہ تم اپنی حیثیت نام نہاد نسبتوں میں سمجھتے ہو حالانکہ ایک حامل دعوت امت ہونے کے لحاظ سے اور شہادت حق کے منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے تمہارا اصل کام یہ تھا کہ تم تورات اور انجیل اور اس چیز کو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے' اسے قائم کرو یعنی زندگی کے معاملات و مسائل سے عملاً ان کا ربط قائم کرو۔ زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی حاکمیت کو بروئے کار لاؤ' انفرادی اور اجتماعی زندگی انہی کی راہنمائی میں دے دو' ہر دیکھنے والا محسوس کرے کہ زندگی کے ہر شعبے پر صرف ان کتابوں کی راہنمائی کی چھاپ کے سوا اور کچھ نہیں۔

سابقہ رکوعوں میں تفصیل کے ساتھ یہ بات بتائی گئی ہے کہ یہ تورات و انجیل اللہ کے عہد و میثاق کے صحیفے ہیں۔ ان میں اللہ نے اپنے احکام و قوانین دیئے اور یہ عہد لیا کہ انہی کے مطابق زندگی گزاری جائے اور انہی کے مطابق باہمی نزاعات کے فیصلے کیے جائیں۔ اسی ذمہ داری کیلئے ان کے حاملین کو قوامین بالقسط اور شہداء اللہ کا لقب عطا ہوا۔ اگر اسی عہد و میثاق کی دھجیاں بکھیر دی گئیں اور زندگی سے عملاً ان کا کوئی تعلق یا تو سرے سے باقی ہی نہیں رہا یا باقی ہے تو صرف اس حد تک جس حد تک اپنی خواہشوں کی سند اس سے حاصل ہو سکے تو آخر دینی پیشوائی مذہبی تقدس اور خدا رسیدگی کے یہ سارے دعوے کس بنیاد پر ہیں؟ ایسے لوگوں کو اللہ سے کیا تعلق اور اللہ کو ایسے لوگوں سے کیا واسطہ؟

بنی اسرائیل کو قرآن نافذ کرنے کا حکم اور ان کا ردعمل

اس آیتِ کریمہ میں تورات و انجیل کو قائم کرنے کے ساتھ ساتھ قرآنِ کریم کو قائم کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے لیکن اس کی تعبیر بجائے لفظ قرآن کے مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ کے الفاظ سے کی گئی ہے۔ سابقہ رکوع کی وضاحت میں اگرچہ ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں' لیکن یہاں بھی اتنی بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسی آیت میں آگے مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ کا جملہ آ رہا ہے' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد قرآن کریم کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآن کریم کے لفظ کی بجائے یہ تعبیر اختیار کرنا اس میں کئی حکمتیں ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ تورات' زبور اور انجیل یہ بنی اسرائیل کی طرف نازل ہوئی تھیں۔ اب اہلِ کتاب کو غلط فہمی یہ تھی کہ قرآن کریم شاید بنی اسماعیل کی طرف نازل ہوا ہے۔ ان کی یہ غلط فہمی دور کی جا رہی ہے کہ یہ قرآنِ کریم ذکر للعالمین ہے یعنی سارے جہانوں کیلئے نصیحت بن کے آیا ہے۔ اس کا خطاب کسی ایک قبیلے یا قوم سے نہیں' اس لئے جس طرح اس کے مخاطب بنی اسماعیل ہیں' اسی طرح تم بھی ہو۔ تمہیں آگے بڑھ کر اس کتاب کا حامل بننا چاہئے کیونکہ تم خوب پہچانتے ہو کہ اللہ کی طرف سے آنے والی کتابوں کی

Marfat.com

صفات کیا ہوتی ہیں اور پھر یہ بھی تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے پاس آسمانی کتابوں میں قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی صفات تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ ان کی روشنی میں تمہیں قرآنِ کریم کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی اور مزید یہ بات بھی کہ تمہاری کتابوں میں یہ بات موجود ہے کہ تم سے تمہارے پیغمبروں کی معرفت یہ عہد لیا گیا تھا کہ جب وہ اللہ کے آخری رسول آئیں تو تمہیں ان پر ایمان لانا ہے اور ان کی مدد کرنی ہے اور اُس عہد میں بھی رسول کا لفظ اختیار کیا گیا تھا اور یہاں اس پیغام کی تمہید میں بھی شاید اسی لئے رسول کا لفظ اختیار کیا تا کہ اہل کتاب کو اپنے عہد کو یاد کرنے میں آسانی ہو۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جیسے قرآنِ کریم نازل ہوتا گیا اور اسلام کا دائرۂ اثر پھیلتا گیا اور رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ و دعوت کے نتیجے میں اور آپ کی ہمہ گیر شخصیت کے زیر اثر اہلِ کتاب کا قافیہ تنگ ہوتا گیا تو ان کی دشمنی جو دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی بجائے کم ہونے کے پوری طرح بھڑک اٹھی، جس کے نتیجے میں ہدایت کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے ان کے کفر اور سرکشی میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ اسی حوالے سے یہاں پروردگار ذکر فرما رہے ہیں:

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا

﴿لیکن وہ چیز جو تیری طرف تیرے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے، وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور ان کے کفر میں اضافہ کرے گی۔﴾

چنانچہ ایسا ہی ہوا ان کی بعد کی تاریخ اس پر شاہد و عادل ہے کہ انہوں نے بجائے ذات رسالت مآب ﷺ اور قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے اور اپنا رویہ بدلنے کے اپنی سازشوں کو مزید تیز کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کو قتل کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ پورے عرب میں دشمنی کی آگ تیز کر دی اور ہر قبیلے میں جا جا کر ان کو اسلام کے خلاف بھڑکایا۔

آنحضرت ﷺ ان کو اہل کتاب سمجھتے ہوئے ان سے بہت امیدیں رکھتے تھے کہ یہ تو دوسرے لوگوں کی نسبت میری دعوت کو جلدی قبول کریں گے۔ اس لئے جب ان کی طرف سے اس طرح کے واقعات سامنے آتے تو حضور ﷺ کے دل کو بہت ٹھیس لگتی تھی۔ آپ ﷺ اس پر کبھی افسوس کا اظہار کرتے اور کبھی اسے دل کا غم بنا لیتے۔ اسلئے ارشاد فرمایا گیا:

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿آپ اس کافر قوم پر غم نہ کھائیں۔﴾

یہ آنحضرت ﷺ کو ایک طرح کی تسلی بھی ہے اور آپ ﷺ کے طبعی اضطراب کو دور کرنے کی ایک کوشش بھی۔ پروردگار نے جیسی آپ ﷺ کو طبیعت بخشی تھی، اس کو پروردگار سے زیادہ کون جانتا تھا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ کفار اپنی اسلام دشمنی اور حق سے دوری میں جتنا آگے بڑھتے ہیں، آنحضرت ﷺ کے غم اور اضطراب میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے۔ حضور ﷺ دنیا کیلئے رحمت بن کر آئے تھے اور بندوں کیلئے رحمت کا اظہار ہدایت کی صورت میں ہوتا ہے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس سے دنیا میں آدمی خوف سے نجات پاتا، نفسانی آلودگیوں سے پاک ہوتا اور اخلاق حسنہ کا پیکر بنتا ہے اور آخرت میں اسی کی وجہ سے اللہ کی رضا نصیب ہوگی اور سرخروئی اس کا مقدر بنے گی۔ جب آپ دیکھتے تھے کہ یہ لوگ حق سے منہ موڑ کر جہنم کے ایندھن بنتے جا رہے ہیں تو آپ کی پریشانی میں حد درجہ اضافہ ہو جاتا تھا، چنانچہ خود اس کا ایک موقع پر اظہار بھی فرمایا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿میری اور کفار کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے آگ جلائی تو پروانے اور دوسرے کیڑے مکوڑے اس میں آ آ کر گرنے لگے اور بھسم ہونے لگے، اب وہ آگ جلانے والا چاروں طرف ہاتھ مار رہا ہے کہ میں ان پروانوں کو جلنے سے بچاؤں، لیکن وہ پروانے ہیں کہ بجائے اس کی کاوشوں کی قدر کرنے کے، جل مرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔﴾

Marfat.com

کہاں ان لوگوں کا اور میرا بھی یہی حال ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ جہنم کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ میں اپنی امکانی مساعی کو بروئے کار لا کر ان کو بچانے کی کوشش کرتا ہوں' لیکن بجائے اس کے کہ یہ میری کوششوں کے ساتھ تعاون کریں' یہ میرے ساتھ دشمنی کرتے ہیں اور مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔

آپ ﷺ کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی نعمت اور سب سے بڑی خوشی اس بات میں تھی کہ لوگ اسلام کے راستے پر آ جائیں اور کسی ایک فرد کا اسلام قبول کر لینا آپ ﷺ کے نزدیک دنیا کی سب سے قیمتی چیز سے بڑھ کر قیمتی تھا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب یمن میں عامل بنا کر بھیجا تو آپ نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ

﴿علی ؓ! اگر تمہارے ہاتھ پر کوئی ایک یا دو کافر مسلمان ہو جائیں تو یہ تمہارے لئے سو سرخ اونٹوں سے بڑھ کر قیمتی ہے۔﴾

آنحضرت ﷺ کی طبیعت اور فطرت پر معلوم ہوتا ہے انسانی ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ اس حد تک غالب تھا کہ آپ ﷺ ان کی سرکشی اور کفر کے رویے کو دیکھ کر اس حد تک کڑھتے اور پریشان ہوتے تھے کہ قرآن کریم نے متعدد بار آپ کو تسلی دے کر آپ کے اس طبعی و فطری جذبے کو سکون آشنا کیا۔ سورۃ الکہف میں ارشاد فرمایا:

﴿آپ محض اس لئے اپنے آپ کو بیمار کر لیں گے کہ یہ لوگ آپ کی دعوت پر ایمان نہیں لائے۔﴾

اور سورۃ طٰہٰ میں فرمایا کہ

﴿ہم نے آپ پر یہ قرآن اس لئے تو نازل نہیں فرمایا کہ آپ گھل گھل کر مر جائیں۔﴾

یہاں بھی آپ کی اسی صفت رحمت اور خیر خواہی کے حوالے سے آپ سے کہا جا رہا ہے کہ آپ کافر قوم پر غم نہ کھائیں کہ یہ لوگ اگر ایمان نہیں لائیں گے تو یقیناً جہنم کا ایندھن بنیں گے کیونکہ ان کے ایمان لانے یا نہ لانے کے آپ مکلف نہیں ہیں۔ آپ ﷺ کا کام تو صرف اللہ کا پیغام پہنچانا اور لوگوں کو راہِ راست پر لانے کیلئے اپنی امکانی مساعی کو بروئے کار لانا ہے۔ اس پر لوگوں کا ردعمل کیا ہوتا ہے' وہ ایمان لاتے ہیں یا نہیں لاتے' یہ ان کا اور پروردگار کا معاملہ ہے۔ آپ اس پر دل گرفتہ کیوں ہوتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی معرفت اہل کتاب کو جو عظیم پیغام دیا' اس میں ان کی اس بنیادی بیماری کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے کہ تم انبیاء کرام کی اولاد ہونے کی وجہ سے اپنے بارے میں خاص تصورات پیدا کر چکے ہو اور اسی کو تم اللہ کے یہاں اپنے تقرب کی بنیاد بنا چکے ہو۔ اس لئے انہیں صاف صاف کہا گیا کہ تمہارے لئے اصل فضیلت کی بات یہ نہیں ہے کہ تم کس انسانی گروہ سے تعلق رکھتے ہو بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جو فرض اور ذمہ داری تمہیں سونپی گئی ہے کہ تم نے اللہ کے قانون کو اللہ کی دھرتی پر قائم کرنا ہے' جب تک تم اس ذمہ داری کو ٹھیک ٹھیک پورا نہیں کرو گے' اس وقت تک تم اپنی اس شرف اور فضیلت کو نہیں پا سکتے جو ایک حامل دعوت امت ہونے کی حیثیت سے تمہیں حاصل رہی ہے۔ اس کے بعد ان کی بدنصیبیوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ اتنے واضح پیغام کے بعد بجائے اپنی اصلاح کرنے کے ان کے حسد اور بغض میں مزید اضافہ ہوا اور وہ بجائے اسلام کے' کفر میں بڑھتے چلے گئے۔ آخر میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ اہل کتاب اگر اپنی روش کو بدلنا نہیں چاہتے تو آپ بھی ان کی روش پر غم نہ کھائیں اور اپنے آپ کو پریشان نہ کریں' اب اس کے بعد کی آیت میں ان کی اسی بنیادی بیماری اور اس کے نتیجے میں حق سے دوری کو ایک دوسرے پہلو سے اجاگر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ شاید وہ پیرایہ بیان کے بدل جانے کے بعد اپنی حالت پر نظر ثانی کیلئے تیار ہو جائیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ کسی بھی گہرے مرض کے علاج کیلئے اس وقت تک اس پر محنت کی جاتی ہے اور بار بار ضروری باتوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے' جب تک مریض کے بارے میں مایوسی کا فیصلہ نہیں ہو جاتا اور

Marfat.com

مزید یہ بات کہ مریض کے عدم تعاون کے باعث اس کا مرض چاہے کیسی ہی صورت اختیار کر جائے معالج اگر سراپا ہمدردی اور غمگساری ہے تو وہ آخری حد تک اس کو سمجھانے اور اس کا علاج کرنے کی کوشش جاری رکھے گا۔ یہاں بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب قومی خود پسندی کے جس مرض میں مبتلا ہیں اور وہ حسب ونسب کو جس طرح آخرت میں سرخروئی کی بنیاد بنا چکے ہیں اور پھر بار بار سمجھانے کے بھی وہ اس مرض سے نکلنے پر تیار نہیں ہیں' ہونا تو یہ چاہئے کہ انہیں یکسر نظر انداز کر دیا جائے' لیکن پروردگار اور ان کی طرف سے آنے والے رسول چونکہ انسانوں کے معاملے میں انتہا درجہ ہمدرد اور غمگسار واقع ہوئے ہیں' اس لئے وہ انسانی امکانات کی حد تک ان پر اتمام حجت کر دینا چاہتے ہیں۔ اسلئے پیرائیہ بیان بدل کر ان کو پھر اسی بیماری کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔

آیت:٦٩ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَ النَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ O ''بیشک جو ایمان لائے' جو یہودی ہوئے اور صابی اور نصاریٰ' جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے' ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

صٰبِئُوْن کون تھے؟

اس آیت کریمہ میں چار مذہبی گروہوں یعنی مومن (مسلمان) یہودی' نصاریٰ اور صابیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں مسلمانوں کا ذکر قطع نظر اس کے کہ باقی گروہوں کے اعتبار سے وہ راہ راست اور ہدایت پر ہیں' اس وقت صرف ایک گروہ کے طور پر کرنا مقصود ہے۔ دوسرا گروہ یہودی اور تیسرا نصاریٰ۔ ان کے بارے میں تو ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں البتہ جہاں تک چوتھے گروہ یعنی صابیوں کا تعلق ہے' ان کا آج دنیا میں کہیں وجود نہیں۔ اس لئے ان کے تعارف میں دشواری پیش آتی ہے۔ اہلِ علم کے اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ مجاہدؒ اور حسنؒ کے نزدیک یہ لوگ کسی خاص دین کے پیرو نہیں تھے' بلکہ یہودیت اور مجوسیت کے بین بین تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک ان کا ذبیحہ حرام ہے۔ ابن زیدؒ کا قول ہے کہ یہ ایک مخصوص دین کے پیرو تھے اور جزیرہ موصل میں آباد تھے۔ ان کا عقیدہ توحید تھا' لیکن نہ تو یہ کسی نبی اور کسی کتاب کے پیرو تھے اور نہ ان کے ہاں شرعی اعمال کا کوئی مخصوص نظام تھا۔ قتادہؒ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ملائکہ کی پرستش کرتے' قبلہ کی طرف نماز پڑھتے اور زبور کی تلاوت کرتے تھے۔ ابوالعالیہؒ اور سفیانؒ کے نزدیک یہ لوگ اہلِ کتاب میں سے ایک فرقہ تھا۔ محققین فرماتے ہیں کہ یہ اقوال بظاہر متضاد نظر آتے ہیں' لیکن حقیقت میں ان میں تضاد نہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے اوّل اوّل یہ لوگ دین حق پر تھے' لیکن بعد میں یہ لوگ دینِ حق سے منحرف ہو کر ملائکہ اور ستاروں کی پرستش میں مبتلا ہو گئے۔ قرآن کریم نے اس گروہ کا جس انداز سے ذکر فرمایا ہے' اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ یہ لوگ ابتداءً دینِ حق پر تھے' بعد میں بدعتوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے۔ تاریخی روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نماز پڑھتے تھے اور اس کا ان میں عام رواج تھا۔ چنانچہ اسی اشتراک کے سبب سے مشرکین آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو صابی کہتے تھے' چونکہ اس مذہب کے پیروکاروں کا وجود اب کہیں باقی نہیں رہا ہے اور نہ ان کی کوئی مستند تاریخ موجود ہے' اس وجہ سے ان کے متعلق اعتماد سے کوئی بات کہنا مشکل ہے۔ لیکن قرآن مجید کے زمانہ نزول میں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرقہ کی حیثیت سے ان لوگوں کا وجود بالکل معروف تھا۔

Marfat.com

اللہ کے ہاں خاندانی نسب اور گروہی نسبت کی کوئی وقعت نہیں

اہل مذاہب میں چار آسمانی کتابیں معلوم ومعروف ہیں اوران کوتسلیم کیا جاتا ہے۔تورات کے ماننے والے یہود ہیں۔انجیل کے ماننے والے عیسائی ہیں اور قرآن کے ماننے والے مسلمان ہیں۔صابیوں کا ذکر شاید اسی وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ چار کتابوں میں سے زبور کے ماننے والے تھے۔ قرآنِ کریم کے ان چاروں کے ذکر کرنے سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیکھو یہ چار گروہ اس وقت موجود ہیں' ان میں مسلمان اس وقت راہ ہدایت پر قائم ہیں' لیکن اگر وہ بھی ان تینوں گروہوں کی طرح صرف گروہی نسبت کو اپنے لئے نجات کا ذریعہ سمجھ کر اس پر قانع ہو کر بیٹھ جائیں تو جس طرح ان تینوں گروہوں کیلئے یہ گروہی نسبت نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتی' اسی طرح مسلمانوں کیلئے بھی نجات کا ذریعہ نہیں بنے گی۔اس سے اہل کتاب اور مسلمانوں کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ گروہی نسبتیں اور گروہی انتسابات اللہ کے یہاں کسی قدر و قیمت کے حامل نہیں۔اس کے یہاں جو چیز قدر و قیمت کی حامل سمجھی جاتی ہے وہ صرف ایمان وعمل کا سرمایہ ہے۔اس لئے اے اہل کتاب تمہیں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ تم نے آج تک صرف اپنے خاندانی نسب اور گروہی نسبت کو سب کچھ سمجھ کر اپنی دنیا اور آخرت برباد کی ہے' اس لئے اب تمہیں اپنی اس گمراہی سے تائب ہو کر راہ راست پر آ جانا چاہئے۔

وحدتِ ادیان کا بھونڈا نظریہ

دونوں آیتوں کے سیاقِ کلام کو دیکھتے ہوئے اس آیت کا یہ وہ صاف اور سیدھا مفہوم ہے' جو ہم نے ذکر کیا ہے لیکن برا ہو کج فہمی کا کہ بعض لوگوں نے نہ جانے کیسے یہ مفہوم اس سے اخذ کر لیا کہ سابقہ امتوں کے لوگ اگر اپنے اپنے صحیفوں اور اپنی مذہبی تفصیلات پر عمل کرتے رہیں تو ان کی نجات کیلئے کافی ہے۔رسولوں پر ایمان لانا اور بالخصوص آنحضرت ﷺ پر ایمان لانا' جس پر اسلام کا دارومدار ہے' کوئی ضروری نہیں۔حیرت کی بات یہ ہے کہ سیاق کلام خود بول رہا ہے کہ یہاں تردید ان کی گروہی عصبیت کی کی جا رہی ہے اور اہل کتاب کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ تم نے اپنی عصبیتوں کی وجہ سے جس طرح اپنی مذہبی اور شرعی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے' یہ تمہارے لئے تباہی کا راستہ ہے' حالانکہ تمہارے پاس کتابیں موجود ہیں' پیغمبر آتے رہے' انہوں نے ہمیشہ تمہیں ایمان وعمل کی تاکید کی' لیکن بجائے ایمان وعمل پر محنت کرنے کے تم اپنی نسبتوں پر فخر کر کے آج تک زندگی گزارتے رہے ہو۔اس لئے اب بھی موقع ہے کہ اگر ایمان وعمل کا راستہ اختیار کر و تو تم اللہ کے یہاں اجر وثواب کے مستحق ٹھہرو گے' واضح ہے کہ اس میں نہ ایمان کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور نہ عملی مسائل چھیڑے گئے ہیں' بلکہ ان کی بنیادی کمزوری کا ذکر کرنے کے بعد ان کو اساسی حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔لیکن جو بات کج فکری یا بدنیتی سے اس میں ڈالی جا رہی ہے' جسے آج کی زبان میں وحدت ادیان کا نام دیا گیا ہے' اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر دو باتوں کا جواب ضروری ہے:

ایک تو یہ بات کہ اگر کسی ایک مذہب کو ماننا اور اس کی دی ہوئی شریعت پر عمل کرنا نجات کیلئے کافی ہے تو پھر یہ بار بار اللہ کی جانب سے انبیاء و رُسل کیوں آتے رہے؟

دوسری یہ بات کہ اگر رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا ضروری نہیں تو حضور ﷺ کو دنیا میں کیوں بھیجا گیا؟ قرآن کریم کیوں اتارا گیا اور اس وقت کی دنیا میں اس دین کے نفاذ کیلئے جس طرح آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے برس ہا برس تک جان توڑ محنت کی اور اس راستے میں زندگی کا ہر دکھ اٹھایا اور قربانیوں کی ایسی تاریخ مرتب کی جس کی نظیر کہیں اور ملنا آسان نہیں تو آخر اس سارے تکلف کی ضرورت کیا تھی؟ صرف یہ کہہ دیا جاتا کہ لوگ اپنے اپنے صحیفوں پر عمل کرتے رہیں' جو مذہب بھی جس کے پاس موجود ہے وہ اس کی نجات کیلئے کافی ہے۔

Marfat.com

کیا ایمانیات میں اللہ کے ساتھ کسی اور چیز پر ایمان ضروری ہے؟

اہل علم کے نزدیک یہ اصول ہمیشہ مسلّم رہا ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت سے اگر کوئی بات پوری طرح سمجھ نہ آ رہی ہو یا اشتباہ پیدا ہو رہا ہو تو اس کے سمجھنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے قرآن کریم کی دوسری آیات کو دیکھا جائے۔ اگر قرآن کریم کی دوسری آیات میں اس کی وضاحت مل جائے تو پھر کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہم دو باتیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اس آیتِ کریمہ میں چونکہ صرف اللہ پر ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور رسولوں پر ایمان کا کوئی تذکرہ نہیں۔ تو کیا دوسری آیات میں کہیں رسولوں پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا گیا ہے یا نہیں اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ کیا ایمانیات میں اللہ کے ساتھ کچھ اور بھی چیزیں موجود ہیں یا نہیں، جن پر ایمان لانا ضروری ہو۔ اس حوالے سے صرف دو آیتوں پر غور فرمائیے۔

تمام رسولوں پر ایمان نہ لانے والا کافر ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ لا وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا O اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا ج (النساء 4:150)

﴿جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کر دیں (کہ اللہ پر تو ایمان لائیں مگر اس کے رسولوں پر ایمان نہ ہو) اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم بعض (رسولوں) کو مانتے ہیں اور بعض (رسولوں) کو نہیں مانتے اور وہ یہ چاہیں کہ (کفر و اسلام کے) بیچ کا ایک راستہ نکال لیں، تو سمجھ لو کہ وہی اصل میں کافر ہیں﴾

اس آیت کریمہ میں پروردگار نے اللہ پر ایمان اور اس کے رسولوں کے انکار کو کفر قرار دیا ہے اور جو لوگ صرف اللہ پر ایمان کو کافی سمجھتے ہیں اور رسولوں کا انکار کرتے ہیں، انہیں کافر قرار دیا ہے اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی دیکھ لیجئے کہ قرآن کریم اللہ کے ساتھ اور کن پر ایمان لانا ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کی تفصیل کا تو موقع نہیں، صرف ایک مختصر آیت پیش خدمت ہے۔ یہ آیت کریمہ سورۃ البقرہ کی ان آخری آیات میں سے ہے، جو آنحضرت ﷺ پر معراج کے سفر میں نازل ہوئیں اور حضور ﷺ نے جن کی بے انتہا فضیلت بیان فرمائی۔ اس میں ایمانیات کی تفصیل کو بیان کرتے ہوئے پروردگار ارشاد فرماتے ہیں:

کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ قف لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ قف

﴿سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، اس طرح کہ اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے﴾ (البقرہ 2:285)

توجہ فرمائیے! اس آیت میں اللہ کے ساتھ فرشتوں، کتابوں اور رسولوں کو بھی ایمانیات میں شامل کیا گیا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کفر ہے۔

Marfat.com

حضور ﷺ پرایمان لانے کی حقیقت

دوسری بات جو سمجھنا بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ پرایمان لانا اس حد تک ضروری ہے کہ اس کے بغیر اسلام کے تحقق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ خود باری تعالیٰ پرایمان بھی اس وقت تک معتبر نہیں جب تک کہ رسول اللہ ﷺ پرایمان نہ لایا جائے اور ان کی دی ہوئی ہدایات کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کو نہ سمجھا جائے۔ اس لئے کہ بغیر ذات نبوت کے نہ تو ذات باری تعالیٰ کا یقین پیدا ہوسکتا ہے اور نہ اس کی صفات کے علم کا کوئی اور ذریعہ ہے۔ اس لئے جب ہم اللہ تعالیٰ پرایمان لاتے ہیں تو اللہ کے رسول کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق لاتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر ہم اس عظیم ذات کے بارے میں کوئی واضح تصور قائم نہیں کر سکتے۔ اس وجہ سے قرآن کریم نے پوری نوع انسانی کو جب اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے تو ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ پرایمان لانا بھی لازمی قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨالَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ O

﴿کہہ دو! اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ اس اللہ کا جس کیلئے ہی ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر' جو ایمان لاتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو' تاکہ تم راہ یاب ہو﴾ (الاعراف ۷:۱۵۸)

سورۃ اعراف ہی کی ایک اور آیت کریمہ میں بطور خاص اہل کتاب سے یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد اہلِ کتاب میں سے اللہ کی رحمت سے صرف وہ لوگ حصہ پائیں گے' جو آنحضرت ﷺ پرایمان لائیں گے اور جو حضور ﷺ پرایمان نہیں لائیں گے ان کا اللہ کی رحمت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ قرآنِ کریم میں موسیٰ علیہ السلام کی اپنی امت کیلئے رحمت کی دعا نقل کی گئی ہے کہ آپ نے اللہ سے اپنی امت کیلئے رحمت مانگی تو پروردگار نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ یہ رحمت ان لوگوں کیلئے خاص ہوگی جو تقویٰ اختیار کریں گے' زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور ہماری آیتوں پرایمان لائیں گے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اس رحمت سے وہ لوگ نوازے جائیں گے جو رسول اللہ ﷺ پرایمان لائیں گے۔ اب ذرا اس آیت کریمہ کو پڑھئے:

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ O اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O (الاعراف ۷:۱۵۷-۱۵۶)

﴿اور ہمارے لئے اس دنیا میں اور آخرت میں بھلائی لکھ دے' ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ فرمایا' میں اپنے عذاب جس پر چاہتا ہوں نازل کرتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو عام ہے۔ سو میں اس کو لکھ رکھوں گا' ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کریں گے

Marfat.com

اورزکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔ (یعنی) جو اس رسول نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جس کو لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں' جو ان کو حکم دیتا ہے نیکی کا اور روکتا ہے برائی سے اور حلال ٹھہراتا ہے ان کیلئے پاکیزہ چیزیں اور حرام ٹھہراتا ہے ناپاک چیزیں اور ان سے دور کرتا ہے وہ بوجھ اور پھندے جو ان پر تھے۔ پس جو اس پر ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی تائید اور مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے' وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

قرآنِ کریم کی اس قدر واضح آیات کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ اس غلط فہمی کی کیا بنیاد باقی رہ جاتی ہے کہ صرف اللہ پر ایمان کافی ہے کسی اور ایمان کی ضرورت نہیں یا یہ کہ رسولوں پر ایمان ضروری نہیں اور آخری انتہائی خطرناک بات یہ کہ نبی آخری الزمان ﷺ پر ایمان لانا کوئی ضروری نہیں حالانکہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد دنیا کیلئے صراطِ مستقیم پانے اور نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اگر کوئی ہے تو یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لایا جائے اور آپ کی پیروی کی جائے۔ اس کے سوا نجات حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے اور پھر اس پر قرآن کریم کی بیسیوں آیات واضح راہنمائی بھی دے رہی ہیں۔ لیکن کج فکری اور کج روی کی انتہا ہے کہ تمام آیات کی طرف سے آنکھ بند کر لی جائے اور صرف ایک آیت کو ذریعہ بنا کر اپنی کج فکری اور گمراہی کا سامان کیا جائے۔

گزشتہ دونوں آیات میں ہم اچھی طرح پڑھ چکے ہیں کہ اہل کتاب کو ان کی اصل ذمہ داری کی طرف واپس لانے اور ان کی اصل بنیاد فضیلت کو اجاگر کرنے کیلئے مختلف پیرایوں سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تمہاری اصل ذمہ داری یہ تھی کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف نازل کردہ کتابوں کی روشنی میں اس کے پیغام کو عام کرتے اور اس کے دیئے ہوئے نظامِ زندگی کو اپنی اور دوسروں کی زندگیوں پر نافذ کرتے۔ اب اگلی آیت کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے ان کی اصل ذمہ داریوں کے بارے میں صرف یہی نہیں کیا کہ ان کو آگاہ کر دیا ہو بلکہ ہم نے بنی اسرائیل سے اس کا عہد و پیمان بھی لیا اور پھر ان کے پیشگی تغافل کو دیکھتے ہوئے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ ایک ہی دفعہ کا عہد و میثاق کافی ہے بلکہ ہم نے یاددہانی کیلئے بار بار رسول بھیجے۔ لیکن ان سے انہوں نے جس طرح کا سلوک کیا اس کے حوالے سے آغاز کلام میں یہ ارشاد فرمایا گیا تھا کہ اے اہل کتاب! تم کسی بنیاد پر کھڑے نہیں ہو' کیونکہ تم نے ہر بنیاد کو اپنے ہاتھوں سے گرا دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

آیت: ۷۰ لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝ ''ہم نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے۔ جب جب آیا ان کے پاس کوئی رسول ایسی بات لے کر جو ان کی خواہش کے خلاف ہوئی' تو ایک گروہ کی انہوں نے تکذیب کی اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے''۔

بنی اسرائیل کا رسولوں اور نبیوں سے سلوک' امت مسلمہ کیلئے عبرت

یعنی ان سے شریعت کی پاسداری احکامِ خداوندی کے نفاذ اور عدلِ اجتماعی کے قیام کا جو عہد و میثاق لیا گیا تھا' جب انہوں نے اس میں کوتاہی اختیار کی تو اللہ نے اس کی یاددہانی اور ان کی اصلاح کیلئے رسول اور انبیاء بھیجے تو یہ لوگ اس حد تک خواہشاتِ نفس کے اسیر ہو چکے تھے کہ اپنی خواہشوں کے مقابلے میں اللہ کی طرف سے آنے والے نبیوں کی ہدایات کو قبول کرنے کیلئے ہرگز تیار نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام زوال پذیر قومیں شاید ایک ہی جیسا مزاج رکھتی ہیں کہ جب ان کے اندر دینی زوال کے نتیجے میں اللہ کے قانون کو بار پانے کا موقع نہیں ملتا اور اخلاقیات کے بندھن ٹوٹنے لگتے ہیں تو

Marfat.com

پھر خواہشات نفس، مقاصد زندگی کی جگہ لے لیتی ہیں اور قومیں ان کے حصول کیلئے دیوانہ وار ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں لگ جاتی ہیں۔ اس جنونی کیفیت میں جب بھی ان کا کوئی راستہ روکتا ہے یعنی ان کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ اسے اپنا دشمن خیال کرتی ہیں۔ پھر یا تو اس کا جینا دوبھر کر دیتی ہیں اور یا سرے سے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔ یہی تاریخ بنی اسرائیل کی تھی اور یہی شاید آج امت مسلمہ کی بھی ہے کہ مادے کی ہوس نے پورے عالم اسلام کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور ہر جگہ دینی قوتیں اور اصلاح کا عمل کرنے والوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جا رہا ہے جو مرنے والی قوموں کا خاصہ رہا ہے، وہ لوگ ان کی بھلائی کی بات کرتے ہیں، یہ اس کا جواب دشمنی سے دیتے ہیں اور یہی شاید زمانے کی ریت ہے۔

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درسِ صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

بنی اسرائیل کی تاریخ ہمارے سامنے اسی لئے بیان کی جا رہی ہے کہ مسلمان اس سے سبق سیکھیں اور وہ غلطیاں نہ کریں جس کے نتیجے میں بنی اسرائیل عذاب کا شکار ہوئے۔ چنانچہ یہاں بتایا جا رہا ہے کہ جب ان کی خواہشاتِ نفس کو اللہ کے نبیوں نے لگام دے کر اصلاح کی کوشش کی تو انہوں نے کسی کی تو تکذیب کی اور جس پر بس چلا، اس کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا اور پھر شقاوت کی انتہا ہے کہ انہوں نے اپنی اس تاریخ کو خود بیان بھی کیا۔ ہم یہاں چند واقعات کا اس لئے ذکر کرتے ہیں کہ شاید امت مسلمہ اس سے فائدہ اٹھا سکے۔

1:- حنانی نبی علیہ السلام: حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہو کر دو ریاستوں (یروشلم کی دولت یہودیہ اور سامریہ کی دولت اسرائیل) میں بٹ گئی تو ان میں باہم لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ یہودیہ کی ریاست نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دمشق کی آرامی سلطنت سے مدد مانگی۔ اس پر خدا کے حکم سے حنانی نبی نے یہودیہ کے فرمانروا آسا کو سخت تنبیہ کی۔ مگر آسا نے اس تنبیہ کو قبول کرنے کے بجائے خدا کے پیغمبر کو جیل بھیج دیا۔ (۲۔ تواریخ، باب ۱۶۔ آیت ۷-۱۰)

2:- حضرت الیاس (ایلیاء Elliah) علیہ السلام نے جب بَعل کی پرستش پر یہودیوں کو ملامت کی اور از سرِ نو توحید کی دعوت کا صور پھونکنا شروع کیا تو سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اخی اب اپنی مشرک بیوی کی خاطر ہاتھ دھو کر ان کی جان کے پیچھے پڑ گیا، حتیٰ کہ انہیں جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ اس موقع پر جو دعا حضرت الیاس علیہ السلام نے مانگی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: ''بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا...... تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں، سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں''۔ (۱۔ سلاطین باب ۱۹۔ آیت ۱-۱۰)

3:- ایک اور نبی حضرت میکایاہ علیہ السلام کو اسی اخی اب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیجا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا۔ (۱۔ سلاطین۔ باب ۲۲۔ آیت ۲۶-۲۷)

4:- حضرت زکریا علیہ السلام: پھر جب یہودیہ کی ریاست میں علانیہ بت پرستی اور بدکاری ہونے لگی اور زکریا نبی نے اس کے خلاف آواز بلند کی تو شاہ یہوداہ یوآس کے حکم سے انہیں عین ہیکل سلیمانی میں ''مقدس'' اور ''قربان گاہ'' کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔ (۲۔ تواریخ، باب ۲۴۔ آیت ۲۱)

5:- ایک اور نبی حضرت عاموس علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ جب انہوں نے سامریہ کی اسرائیلی ریاست کو اس کی گمراہیوں اور بدکاریوں پر ٹوکا اور ان حرکات کے برے انجام سے خبردار کیا تو انہیں نوٹس دیا گیا کہ ملک سے نکل جاؤ اور باہر جا کر نبوت کرو۔ (عاموس، باب ۷۔

Marfat.com

آیت ۱۰-۱۳)

6:- حضرت یحییٰ (یوحنا) علیہ السلام نے جب ان بداخلاقیوں کے خلاف آواز اٹھائی جو یہودیہ کے فرمانروا ہیرودیس کے دربار میں کھلم کھلا ہو رہی تھیں، تو پہلے وہ قید کئے گئے، پھر بادشاہ نے اپنی معشوقہ کی فرمائش پر قوم کے اس صالح ترین آدمی کا سر قلم کر کے ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کر دیا۔ (مرقس، باب ۶، آیت ۱۷-۱۹)

7:- آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بنی اسرائیل کے علماء اور سرداران قوم کا غصہ بھڑکا، کیونکہ وہ انہیں ان کے گناہوں اور ان کی ریاکاریوں پر ٹوکتے تھے اور ایمان و راستی کی تلقین کرتے تھے۔ اس قصور پر ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا گیا، رومی عدالت سے ان کے قتل کا فیصلہ حاصل کیا گیا اور جب رومی حاکم پیلاطس نے یہود سے کہا کہ آج عید کے روز میں تمہاری خاطر یسوع اور براباڈاکو دونوں میں سے کس کو رہا کروں، تو اس کے پورے مجمع نے بالاتفاق پکار کر کہا کہ براباڈاکو کو چھوڑ دے اور یسوع کو پھانسی پر لٹکا۔ (متی، باب ۲۷۔ آیت ۲۰-۲۶)

جس قوم کے ہاتھ سے اللہ کے یہ برگزیدہ بندے بھی ظلم اور قتل سے نہ بچ سکے حقیقت یہ ہے کہ اسے روئے زمین پر زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں لیکن اللہ کا اپنا ایک قانون ہے کہ وہ اپنے علم کے مطابق قوموں کو مہلت دیتا ہے۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی اصلاح کر لیں۔ لیکن اگر وہ قومیں اصلاح کی بجائے بگڑتی چلی جاتی ہیں تو یہ ان کی انتہائی بدنصیبی کا دور ہوتا ہے۔ قدرت انہیں پھر بھی پکڑنے میں جلدی نہیں کرتی۔ لیکن اب انہیں اس لئے مہلت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں اور اپنی فائل اچھی طرح موٹی کر لیں تاکہ جب قدرت ان پر ہاتھ ڈالے تو انہیں چیخنے کا بھی موقع نہ ملے اور وہ فریاد کرنا چاہیں تو عذاب کا ہاتھ ان کے گلے تک پہنچ چکا ہو۔ چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنے اسی قانون کے تحت مہلت دی۔ لیکن ان کی کج فکری ملاحظہ فرمائیے کہ انہوں نے اس مہلت عمل کو اپنے لئے ہر طرح کے جرائم کا لائسنس سمجھ لیا۔ نتیجہ واضح ہے کہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔

آیت:۷۱ وَحَسِبُوٓا اَلَّا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ فَعَمُوۡا وَ صَمُّوۡا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ ثُمَّ عَمُوۡا وَ صَمُّوۡا كَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ ۝ ''اور انہوں نے گمان کیا کہ کوئی پکڑ نہیں ہوگی، بس اندھے اور بہرے بن گئے، پھر اللہ نے ان پر رحمت کی نگاہ کی، پھر ان میں بہت سے اندھے بہرے بن گئے اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں''۔

بنی اسرائیل کے سدھرنے کا آخری موقع

جیسا کہ گزشتہ آیت کریمہ کی تفسیر میں عرض کیا گیا کہ بنی اسرائیل نے رسولوں کی تکذیب اور ان کے قتل کے بڑے بڑے جرائم کئے۔ لیکن جب ان پر کوئی گرفت نہ ہوئی تو وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اب کوئی پکڑ نہیں ہوگی اور پھر وہ اللہ کے دین کی طرف سے، اپنی ذمہ داریوں کی جانب سے، رسولوں کی تبلیغ دعوت کے حوالے سے، اس طرح کا رد عمل ظاہر کرنے لگے، گویا کہ وہ اندھے اور بہرے ہیں۔ یعنی وہ اپنی انفرادی زندگی میں اخلاقی بگاڑ کے نقصانات دیکھ رہے تھے اور اجتماعی زندگی میں ہمسایہ حکومتوں کی جانب سے بار بار کے حملوں سے بھی دوچار ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود ان کا رویہ ایسا تھا کہ جیسے کسی چیز کو دیکھ نہیں رہے اور پکارنے والے ان کو پکار پکار کر تھک چکے تھے اور حالات کی سنگینی سے بار بار انہیں آگاہ کر چکے تھے کہ اگر تم نے اپنی حالت بدلنے کی کوشش نہ کی تو تمہاری مکمل تباہی میں کوئی دیر نہیں۔ لیکن انہوں نے قسم کھا لی تھی کہ ہم کوئی بات سن کر نہیں دیں گے۔ اس کے بعد ان کے ساتھ

Marfat.com

کچھ ہوا' وہ ایک طویل داستان ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں نہایت ایجاز کے ساتھ اس کی طرف اشارے کئے گئے ہیں اور سورۃ بنی اسرائیل میں ان اشاروں کو کسی حد تک کھولا گیا ہے۔ اس آیت میں تھوڑا سا تدبر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انجام کے مختلف مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ وہ اندھے اور بہرے بن گئے تو اب یقیناً ان پر اللہ کا کوئی عذاب آیا ہوگا۔ لیکن نہ اس عذاب کا ذکر کیا گیا ہے اور نہ اس کی بعد کی صورت حال کا البتہ ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان پر عذاب آیا اور پھر انہوں نے توبہ کی۔ اللہ نے ان کی توبہ قبول فرما کر انہیں پھر اپنی ملی زندگی گزارنے کا ایک موقع عطا فرمایا۔ لیکن اس کے بعد پھر وہ اندھے بہرے ہو گئے یعنی انہوں نے پھر وہی زندگی اختیار کرلی جس پر وہ عذاب کا شکار ہو چکے تھے۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ ان کو توبہ کی توفیق نہیں ملی بلکہ برابر اپنی سرکشی میں بڑھتے چلے گئے۔ اللہ فرماتا ہے کہ وہ تو اندھے اور بہرے بن کر مسلسل اپنی قسمت کو بگاڑتے چلے جا رہے ہیں' لیکن اللہ تو بینا ہے' وہ برابر ان کے کرتوتوں کو دیکھ رہا ہے اور نبی کریم ﷺ کی بعثت سے ان کو سنبھلنے کا ایک موقع بھی دے رہا ہے۔ اگر انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا تو امت مسلمہ میں شامل ہو کر ہر طرح کی عزت سے سرفراز ہوں گے ورنہ اسی انجام کو پہنچیں گے' جو سرکش اور غافل قوموں کا انجام ہوتا ہے۔ یہ ہم نے اس آیت کا مختصراً ایک مفہوم بیان کیا ہے۔ لیکن اس وقت تک پوری طرح اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا' جب تک کسی حد تک تاریخی اسباب اور واقعات کا ذکر نہ کر دیا جائے۔ اس لئے ہم مختصراً اس کو بیان کرتے ہیں۔

تاریخ بنی اسرائیل

یوں تو موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل جب فلسطین کو فتح کرنے میں کامیاب ہوئے تو اس کے بعد جلد ہی ان کی سرکشی اور عہد فراموشی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن قدرت کی کرم فرمائی اور اپنی مسلسل تباہیوں کے احساس سے' ایک وقت آیا جب انہوں نے ایک متحدہ سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی اور حضرت سموئیل علیہ السلام سے ایک بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی۔ اس طرح ان کو سنبھلنے کا ایک موقع ملا اور قدرت نے انہیں ایک متحدہ سلطنت عطا فرما دی' جس کے مسلسل تین فرماں روا ہوئے۔ حضرت طالوت' حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما الصلوٰۃ السلام۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے' میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا عروج عطا فرمایا کہ بحیرۂ روم کے مشرقی کناروں سے لے کر افریقہ کے مشرقی ساحلوں تک ان کی حکومت کا پھریرا لہراتا تھا اور حجاز اور یمن تک ان کے عروج و اقبال کے پرچم گڑے ہوئے تھے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ اپنی عظمت کو سنبھال نہ سکے اور جلد ہی ترقی معکوس کا سفر شروع ہو گیا۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کا بیٹا تخت پر بیٹھا تو اس نے اقتدار کے نشہ میں مست ہو کر اپنے والد ماجد کی تمام روایات کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کا فوری نتیجہ تو یہ ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک خادم یربعام نے مرکز کے خلاف بغاوت کر کے شمال میں اسرائیل کے نام سے ایک الگ سلطنت قائم کر لی' اب بنی اسرائیل جو اس زمانے کے مسلمان تھے' دو حکومتوں میں بٹ گئے۔ شمال میں اسرائیلی سلطنت تھی' جس کا پایہ تخت سامرہ (موجودہ نابلس) اور جنوب میں یہودیہ کی سلطنت جس کا مرکز یروشلم (بیت المقدس) تھا۔ اس افتراق و انتشار کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ بنی اسرائیل کی جو عسکری قوت کبھی ملکہ سبا کے دروازوں پر دستک دیا کرتی تھی' اب باہمی خانہ جنگی میں صرف ہونے لگی' یہودیہ اور اسرائیل دونوں سلطنتیں سالہا سال تک ایک دوسرے سے لڑتی رہیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں ۹۲۷ ق م سے لے کر ۵۸۶ ق م تک کا پورا عرصہ ان خانہ جنگیوں کی دل خراش داستان ہے۔ ایک ایک جنگ میں بعض اوقات پانچ پانچ لاکھ بنی اسرائیل کا خون بہا' مگر اقتدار کی یہ رسہ کشی بند نہ ہوئی۔ دوسری طرف بنی اسرائیل کی اکثریت نے اپنے آباؤ اجداد کے دین کو بالکل پس پشت ڈال کر بت پرستی اور ستارہ پرستی شروع کر دی' حکمرانوں نے عیاشی پر کمر باندھ لی

Marfat.com

اور علماء میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر مذہبی اختلافات پھوٹ پڑے۔ اس دوران اللہ کی طرف سے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام ہدایت کا اجالا پھیلانے کیلئے تشریف لاتے رہے، مگر چند مختصر وقفوں کو چھوڑ کر بنی اسرائیل کا زمانہ بد اعمالیوں اور عیش پرستیوں میں بسر ہوا۔

قدرت کسی قوم پر اپنا قہر اور عذاب ایک دم نازل نہیں کرتی' بلکہ پہلے اسے مختلف طریقوں سے جھنجھوڑتی ہے۔ چنانچہ اس موقع پر انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے علاوہ بنی اسرائیل کو بیدار کرنے کیلئے ہلکے ہلکے تازیانے بھی لگائے جاتے رہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد بیرونی طاقتیں ان پر حملہ آور ہوتیں اور ان کی سرحدوں کو مختصر کر کے واپس لوٹ جاتیں۔ کبھی مصر کا بادشاہ چڑھ آتا' کبھی صور کا حکمران حملہ کر دیتا' کبھی آرام کا فرمانروا یلغار کرتا ہوا یروشلم پہنچ جاتا۔ لیکن یہ تمام حملے جزوی طور پر نقصانات پہنچا کر واپس چلے جاتے' بنی اسرائیل دیکھ رہے تھے کہ بیرونی دشمن ہماری تاک میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی فوجی قوت میں مسلسل اضافہ کر رہا ہے' لیکن ان کی آنکھ نہ کھلی۔ عیش و آرام کے خلوت کدوں کو چھوڑ کر عمل کے خارزاروں میں اترنا ان کے مزاج نازک کے خلاف تھا۔

حضرت ارمیاء' حضرت شعیا اور حضرت حزقیل علیہم السلام انہیں متواتر جھنجھوڑتے رہے کہ خدا کیلئے! اپنی حالت درست کر لو' بابل کا بادشاہ تمہاری چار دیواری تک پہنچ چکا ہے اور اگر تمہیں ہوش نہ آیا تو تمہارا نام ونشان مٹ جائے گا۔ مگر "بابر بہ عیش کوش" کے نغموں میں مست لوگ' بابل کی طرف سے پیٹھ موڑ کر یہ سمجھتے تھے کہ ہم مامون ہو چکے ہیں۔ اور یہود کے علماء کو یہ گھمنڈ تھا کہ ہم اللہ کی محبوب ترین قوم ہیں۔ دشمن کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیں ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں' دشمن جب یروشلم کا رخ کرے گا تو آسمان کی غیبی طاقتیں اس پر بجلیاں برسائیں گی اور وہ بھسم ہو کر رہ جائے گا۔

بخت نصر کا حملہ

ان حالات میں ٹھیک اس وقت جبکہ حکام عیش ونشاط میں محو تھے اور علماء اس بات پر مناظرے کر رہے تھے کہ ایک سوئی کے ناکے پر کتنے فرشتے بیٹھ سکتے ہیں؟ بابل کا جابر بادشاہ بخت نصر ان پر قہر خداوندی بن کر نازل ہوا۔ یروشلم (بیت المقدس) اور اس کے گردونواح سے بنی اسرائیل کا بیج مارا گیا۔ اس کی فوج کیا تھی؟ ایک طوفان تھا' جس نے مزاحمت کی ہر دیوار کو ڈھا کر یہودیوں کی پوری سلطنت کو پیوند زمین کر ڈالا اور ظلم وستم کے ایسے ایسے اسلوب ایجاد کئے جن کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے اس کے بیٹے ذبح کر دیئے گئے۔ بادشاہ اور رہے سہے یہودی پابہ زنجیر بابل لے جائے گئے اور پچاس سال تک بخت نصر کی غلامی میں حسرت وندامت کے آنسو بہا کر اپنے دن کاٹتے رہے۔ قرآن کریم نے سورۃ بنی اسرائیل میں اسی قہر الٰہی کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝

﴿پس جب دونوں میں سے پہلے وعدے (کا وقت) آیا تو ہم نے تم پر اپنے کچھ بندے بھیجے جو شدید قوت والے تھے' وہ گھروں میں گھوم گئے اور یہ ہونے والا وعدہ تھا﴾ (بنی اسرائیل 5:7)

اس زبردست طوفان نے بنی اسرائیل کی کچھ آنکھیں کھول دیں۔ ان کی غلامی کی زندگی پہلے کی بہ نسبت کافی پاکیزہ ہو چکی تھی' آپس کے اختلافات کم ہو گئے تھے اور تمام لوگوں کے ہاتھ دعا کیلئے اٹھے ہوئے تھے۔ قدرت نے انہیں ایک اور موقع دیا۔ ۵۳۶ ق م میں ایران کے بادشاہ خسرو نے بابل پر چڑھائی کر کے اسے فتح کر لیا اور بنی اسرائیل پر رحم کھا کر انہیں دوبارہ بیت المقدس تعمیر کرنے اور فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۵۱۵ ق م میں بیت المقدس دوبارہ آباد ہوا اور بنی اسرائیل نے حضرت عزیر علیہ السلام کی موجودگی میں رو رو کر توبہ کی اور آئندہ خدا کے احکام کے

Marfat.com

طابق زندگی گزارنے کا عہد کیا۔ کچھ عرصے تک یہ لوگ اپنے عہد پر قائم رہے' رفتہ رفتہ ان کی خوش حالی واپس آنے لگی' انہیں حکومت تو نصیب نہ ہوسکی' مگر مال ودولت اور وسائل واسباب کی پھر فراوانی ہوگئی اور عیش ومسرت کی زندگی پھر لوٹ آئی۔ قرآن کریم اسی نئی زندگی کا تذکرہ اس طرح فرماتا ہے:

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا

﴿پھر ہم نے ان پر تمہاری باری پھیردی (تمہیں غلبہ دے دیا) اور مالوں سے اور بیٹوں سے ہم نے تمہیں مدد دی اور ہم نے تمہیں بڑا جتھا (لشکر) کردیا﴾ (بنی اسرائیل 6:17)

اس کے ساتھ ہی اللہ کی طرف سے انہیں یہ تنبیہ بھی فرمادی گئی کہ:

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ قف وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ط (بنی اسرائیل 7:17)

﴿اب اگر تم اچھے کام کروگے تو تمہارے لئے مفید ہوں گے اور اگر تم نے بدکاری کی تو اپنا ہی کچھ بگاڑو گے﴾

انیٹوکس ایپی کا حملہ

لیکن نیکوکاری کی یہ زندگی پائیدار ثابت نہ ہوئی' خوشحالی بڑھی تو عیش ونشاط کی وہ محفلیں پھر لوٹ آئیں' بت کدے پھر آباد ہونے لگے۔ فارغ البالی نصیب ہوئی تو ایک دوسرے سے جھگڑنے کا مشغلہ پھر زندہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بنی اسرائیل پھر اسی حالت کو پہنچ گئے جس میں ان پر بخت نصر کا عذاب نازل ہوا تھا' اس مرتبہ بخت نصر کی جگہ روم کے بادشاہ انیٹوکس ایپی فانیس نے ۱۶۵ ق م میں بیت المقدس پر حملہ کرکے دوبارہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی' تورات کے تمام نسخے چن چن کر جلادیئے' بنی اسرائیل کو ایک ایک کرکے تہ تیغ کیا اور جو لوگ بچ گئے انہیں لوٹ کھسوٹ کر جلاوطن کر دیا۔ قرآن کریم اس واقعہ کا ذکر اس طرح فرماتا ہے:

فَاِذَاجَآءَ وَعْدُالْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗ اوُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُواالْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝

﴿اور جب آخری (عذاب) کا وعدہ آیا' تا کہ وہ (یعنی رومی) تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (اقصیٰ) میں داخل ہوں' جیسے کہ وہ (یعنی کلدانی) پہلی مرتبہ داخل ہوئے تھے' اور جس چیز پر ان کا غلبہ ہو اس کو برباد کردیں﴾ (بنی اسرائیل:7)

یہ قوم یہود کو آخری موقعہ دیا گیا تھا' حکومت تو ان سے چارسو سال پہلے چھن ہی چکی تھی' اب ہمیشہ کی ذلت وخواری ان کی قسمت میں لکھ دی گئی' اور کسی خطے میں یکجا ہوکر عزت کی زندگی گزارنے کا موقع بھی ان سے چھین لیا گیا۔

تاریخ بنی اسرائیل امت مسلمہ کیلئے آئینہ

یہود کی یہ تاریخی سرگزشت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں امت مسلمہ ایک حاملِ دعوت امت کے عروج وزوال کے پورے خدوخال ملاحظہ کر سکتی ہے اور یہ بھی دیکھ سکتی ہے کہ وہ کیا اسباب ہیں' جن سے امتیں گرتی اور اللہ کے غضب کا شکار ہوتی ہیں اور قرآن کریم میں اس تاریخی سرگزشت کے مختلف ابواب کو امت مسلمہ کی سبق آموزی کیلئے ہی متعدد مرتبہ بیان کیا گیا ہے تاکہ یہ امت اللہ کی جانب سے عائد کردہ ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے کہیں بھی خلا محسوس نہ کرے اور ان نشیب وفراز سے پوری طرح آگاہ رہے' جن سے یہود بار بار دوچار ہوتے رہے اور ان کھائیوں کو پوری طرح پہچانے جن میں گرنے کے بعد یہود آج تک نہ اٹھ سکے۔

Marfat.com

اس کے بعد کی آیت کریمہ میں یہود کے تذکرہ کے بعد نصاریٰ کا تذکرہ کیا جارہا ہے' تا کہ بنی اسرائیل کی دوسری شاخ (جن کو یہود ہی کی طرح اپنے برگزیدہ ہونے کا دعویٰ ہے اور اسی وجہ سے وہ شرعی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں) کے بھی اصل خدوخال کو بیان کر دیا جائے جس سے یہ اندازہ کرنے میں آسانی رہے کہ جس طرح یہود اپنی بداعمالیوں اور بداعتقادیوں کے باعث بگاڑ کا شکار ہوئے' یہ نصاریٰ بھی ان سے کسی طرح پیچھے نہ تھے۔ اُن پر سرکشی غالب رہی اور یہ کفروشرک میں پوری طرح دھنستے چلے گئے۔ انہوں نے اگر اللہ کے نبیوں کو قتل کیا تو انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو عقیدہ توحید کے سراسر خلاف تھا چنانچہ ارشاد فرمایا گیا:

آیت ۷۲: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ط اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ط وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ O ''بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ خدا تو یہی مسیح ابن مریم ہے اور حال یہ ہے کہ مسیح نے کہا اے بنی اسرائیل! اللہ کی بندگی کرو' جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے' جو کوئی اللہ کا شریک ٹھہرائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا''۔

نصاریٰ کا عقیدہ ''حلول''

پہلی آیت کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ قرار دیتے تھے یعنی حلول کے قائل تھے اور وہ اللہ کو اور مسیح کو ایک ہی ذات سمجھتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ اللہ مسیح میں حلول کر گیا ہے۔ اس پر مسیح علیہ السلام نے انہیں نہایت سامنے کی بات کہی کہ نادانو تم دیکھ رہے ہو کہ جس طرح تم رہتے سہتے' کھاتے پیتے اور جیتے جاگتے ہو اور جن اسباب سے تمہاری تربیت ہو رہی ہے بالکل اسی طرح میں بھی تربیت پا رہا ہوں اور ہم سب کا تربیت کرنے والا' یعنی پالنے والا ایک اللہ ہے۔ وہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی کیونکہ زمین کی غذاؤں سے میں جیتا ہوں اور عناصر کائنات کا تمہاری طرح میں بھی محتاج ہوں تو پھر جس طرح تم بندے ہو' اس طرح میں بھی ایک بندہ ہوں۔ بندہ تو کبھی خدا نہیں ہو سکتا تو میں کیسے خدا ہو گیا۔ ہر بندے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے رب اور اپنے اللہ کی بندگی کرے' سو میں بھی اسی کی بندگی کرتا ہوں تم بھی اسی کی بندگی کرو۔ جو بالکل سامنے کی بات کو نظرانداز کر کے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرے گا' اللہ نے ایسے شخص کیلئے جنت کو حرام کر دیا ہے۔ وہ شرک کا ارتکاب کر کے اپنے ساتھ بھی اور ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ بھی ظلم کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کی کبھی مدد نہیں کرتا۔

آیت ۷۳: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ م وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ط وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ O ''ان لوگوں نے بھی کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تین کا تیسرا ہے۔ حالانکہ نہیں ہے کوئی معبود' مگر ایک ہی معبود ہے اور اگر یہ باز نہ آئے ان باتوں سے جو یہ کہہ رہے ہیں تو ان میں سے جنہوں نے کفر کیا' ان کو ایک دردناک عذاب آ پکڑے گا''۔

نصاریٰ کا عقیدہ ''اقانیم ثلاثہ''

دوسری آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نصاریٰ میں سے کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے یعنی وہ اقانیم ثلاثہ کے قائل ہیں کہ وہ اللہ کی عبودیت میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شریک سمجھتے ہیں اور یا حضرت عیسیٰ اور حضرت جبرائیل یعنی روح القدس کو اللہ کا شریک مانتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ جس طرح مسیح کو اللہ کہنے والوں نے کفر کیا' اسی طرح عقیدہ تثلیث اختیار کرنے والوں نے بھی کفر کیا کیونکہ اللہ تو وحدہٗ

Marfat.com

شریک ہے۔ اس کی ذات یا اس کی صفات میں کسی اور کو شریک کرنے سے بڑا شرک اور ظلم کیا ہوگا اور اس سے بڑھ کر جہالت بھی کیا ہوگی کہ جو شخص اللہ کو الٰہ مانتا ہے اور پوری کائنات کا خالق سمجھتا ہے' وہ اس کی خدائی کے دو حصوں کو دوسری ذاتوں کے سپرد کر کے اس کے ایک تہائی خدا ہونے کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے اور تثلیث کے قائل ہونے کا ظاہر ہے اس کے سوا اور کیا مطلب ہے کہ پروردگار اس کائنات کا مکمل الٰہ اور خدا نہیں بلکہ ایک تہائی خدا ہے اور یہ سراسر جہالت کی بات ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اگر یہ لوگ ایسی بات کہنے سے باز نہیں آئیں گے اور سمجھانے کے بعد بھی اس سے توبہ نہیں کریں گے تو ایسے لوگوں کو دردناک عذاب پہنچے گا۔ مزید فرمایا:

آیت: ۷۴ اَفَلَا یَتُوْبُوْنَ اِلَی اللّٰہِ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَہٗ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ O

''کیا یہ اللہ کی طرف رجوع اور اس سے مغفرت طلب نہیں کرتے' حالانکہ اللہ مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے''۔

یعنی مسیح کو اللہ قرار دینا یا اللہ کو تین میں تقسیم کر کے' اس کو تین میں تیسرے کا درجہ دینا' یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ ایسا جرم کا کرنے والا کسی رحم کا مستحق نہیں رہتا۔ لیکن پروردگار اتمامِ حجت کے طور پر فرما رہے ہیں کہ ہم نے نصاریٰ کے اتنے بڑے جرم کے بعد بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا۔ اس لئے اب بھی اگر کوئی اس راستے سے داخل ہونے کی کوشش کرے گا تو ہم اس کی قدر افزائی کریں گے۔ اس لئے فرمایا اے گروہ نصاریٰ! کیا اب بھی تم اللہ کی طرف رجوع کر کے اور اس سے معافی مانگ کر اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھاؤ گے اور تم جانتے ہو کہ وہ بخشنے والا اور مہربان ہے' اس لئے اس سے بخشش چاہو اور اس کی مہربانی کے سائے میں آ جاؤ۔ ان تین آیتوں میں نہایت سادہ اور قابلِ فہم اسلوب میں عیسیٰ علیہ السلام کی اصل حیثیت واضح کر دی گئی ہے اور شرک کا پوری طرح ابطال کر دیا گیا ہے۔ لیکن استدلال کی اپنی ایک حیثیت ہے' اس لئے کہ عقل کی خوگر طبیعتیں استدلالی انداز سے زیادہ اثر قبول کرتی ہیں' اس لئے اگلی آیتِ کریمہ میں ایک ایسے سادہ لیکن پرکار اور مؤثر طریقہ استدلال سے اس مضمون کو واضح فرمایا گیا ہے کہ جس طبیعت میں قبولیتِ حق کا ذرا بھی مادہ ہو وہ اس استدلال سے اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آیت: ۷۵ مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ ط وَ اُمُّہٗ صِدِّیْقَۃٌ ط کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ ط اُنْظُرْ کَیْفَ نُبَیِّنُ لَھُمُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ O ''مسیح ابن مریم تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزرے ہیں اور ان کی ماں ایک صداقت شعار بندی تھیں۔ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو! کس طرح ہم ان کے سامنے اپنی آیتیں کھول کر بیان کر رہے ہیں پھر دیکھو! وہ کس طرح اوندھے ہوئے جا رہے ہیں''۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل حیثیت

اس آیت کریمہ میں حضرت مسیح ابن مریم کی اصل حیثیت کو واضح کرنے کیلئے مختلف طریقوں سے استدلال فرمایا گیا ہے۔ پہلی یہ بات فرمائی کہ مسیح کو تم اپنی انجیل میں جس طرح دیکھتے ہو اور جس طرح تم نے ان کے حواریوں سے ان کے حالات سنے ہیں کیا تم نے ان کو خدا پایا ہے یا خدا کا رسول؟ بعد کے خیالی فلسفوں کو چھوڑ کر آج بھی اگر انجیل کو دیکھا جائے تو اس میں صاف نظر آتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام انسان کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ وہ دنیا میں باقی رسولوں کی طرح رسالت کا فرض انجام دینے کے لئے تشریف لائے تھے۔ پھر جس طرح باقی رسول اپنی طبعی زندگی میں اپنا فرض انجام دینے کے بعد واپس چلے گئے اور موت سے ہمکنار ہوئے بالکل اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام بھی ایک مختصر زندگی لے کر آئے بالآخر اپنے اللہ کے پاس

Marfat.com

چلے گئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک انسان جو ایک مختصر زندگی لے کر آتا ہے اور پھر موت کا شکار بھی ہوتا ہے اور ایک محدود وقت دنیا میں گزار کر یہاں سے جانے پر مجبور ہے' کیا وہ خدا ہو سکتا ہے؟ خدا ایک ابدی ذات کا نام ہے۔ اسے کبھی فنا نہیں۔ اللہ خود فرماتا ہے:

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ﴿ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے﴾ (القصص 88:28)

بقا اس کی ذات کی صفت ہے' جو اسی کے ساتھ خاص ہے۔ باقی ہر چیز فانی ہے اور فانی خدا نہیں ہوتا۔ حضرت مسیح بھی باقی مخلوقات کی طرح فانی ہیں تو وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں؟

دوسری بات یہ فرمائی کہ ان کی ماں ایک راست باز خاتون تھیں یعنی ان کی ایک والدہ تھیں' وہ ایک خاتون کے بیٹے تھے حالانکہ اللہ کی صفت یہ ہے کہ نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا ہے کیونکہ بیٹا ہونا فنا اور احتیاج کی دلیل ہے اور اللہ تعالیٰ ایسی تمام کمزوریوں سے پاک ہے۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ مسیح تو خدا کا بیٹا تھا۔ اسلئے فرمایا کہ ان کی ماں ایک راست باز خاتون تھیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ مسیح میرا بیٹا ہے اور خود مسیح نے ہمیشہ اپنی ماں کا فرمانبردار ہونے کا اعلان کیا اور اس کا ذکر انجیل اور قرآن دونوں کتابوں میں موجود ہے تو جو شخص کسی کا بیٹا ہو ظاہر ہے وہ انسان ہوگا اور انسان تو خدا نہیں ہوتا۔

تیسری بات یہ فرمائی کہ دونوں ماں اور بیٹا کھانا کھاتے تھے۔ کھانا کھانا احتیاج کی علامت ہے اور احتیاج بھی ایسی کہ جس کے لئے نجانے دست سوال کہاں کہاں پھیلتا ہے کیونکہ ایک آدمی جو غذا کھاتا ہے' اس کے وجود میں آنے کیلئے عناصر کا ایک طویل سلسلہ ہے' جو خدمت انجام دینے پر مجبور ہے کیونکہ غذا کا کوئی ذرہ بھی اپنے وجود میں آنے کیلئے زمین کی روئیدگی' سورج کی تمازت' چاند کی حلاوت' سمندر سے کرنوں کا اٹھنا اور فضا میں بادلوں کا پھیلنا اور پھر چھم چھم برسنا اور ہواؤں کا پودوں کو لوریاں دینا اور موسم کے تغیرات جیسے بنیادی عوامل کا محتاج ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مخلوقات میں سے جو بھی غذا کا محتاج ہے' وہ اصلاً ان تمام عناصر اور عوامل کا محتاج ہے۔ اب اگر حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کھانا کھاتے تھے تو یقیناً وہ ان تمام عوامل اور عناصر کے محتاج تھے۔ اللہ کی شان تو اللہ الصمد ہے یعنی اللہ بے نیاز ہے اور جو بے نیاز نہ ہو بلکہ محتاج ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے' شاید کوئی بے اصل بات کہی ہے۔ اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ یہاں انجیل سے ایک حوالہ دے دیا جائے تاکہ اس بارے میں پوری طرح اطمینان پیدا ہو۔ انجیل لوقا میں صفحہ ۲۴-۳۶-۴۳ میں یہ عبارت موجود ہے۔

﴿وہ (یعنی حواری) یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ یسوع آپ ان کے بیچ میں آ کھڑا ہوا اور ان سے کہا' تمہاری سلامتی ہو۔ مگر انہوں نے گھبرا کر اور خوف کھا کر یہ سمجھا کہ کسی روح کو دیکھتے ہیں۔ اس نے ان سے کہا تم کیوں گھبراتے ہو اور کس بات سے تمہارے دل میں شک پیدا ہوتا ہے۔ یہ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں دیکھو کہ میں ہی ہوں۔ مجھے چھو کر دیکھو کیونکہ روح کے گوشت اور ہڈی نہیں ہوتی' جیسا مجھ میں دیکھتے ہو اور یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے۔ جب مارے خوشی کے ان کو یقین نہ آیا اور تعجب کرتے تھے تو اس نے ان سے کہا کہ کیا یہاں تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے انہوں نے اسے بھنی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا۔ اس نے لے کر ان کے روبرو کھایا۔﴾

آیت کے آخر میں پروردگار نے فرمایا: دیکھو! کس طرح ہم واضح دلائل سے نہایت سادگی کے ساتھ تم پر اس حقیقت کو واضح کر رہے ہیں حضرت مسیح علیہ السلام کا خدا ہونا یا اللہ کی خدائی میں شریک ہونا' کس قدر دلیل سے خالی' معقولیت سے عاری اور حقیقت کے منافی دعویٰ ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اس قدر واضح دلائل کے ہوتے ہوئے بھی تم ایسے اندھے ہوئے ہو کہ اس اندھے پن سے نکلنے کو تیار نہیں۔ دراصل تمہاری اصل مصیبت یہ ہے

Marfat.com

کہ یہود کو تو گستاخی اور سرکشی نے تباہ کیا' لیکن تم عقیدت میں غلو کا شکار ہوئے اور یہ دونوں چیزیں راہِ حق سے پھیر دینے کیلئے کافی ہیں اس لئے ارشاد فرمایا:

آیت:۷۶ قُلۡ اَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَمۡلِکُ لَکُمۡ ضَرًّا وَّ لَا نَفۡعًا ؕ وَاللّٰہُ ھُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ O ''کہو! کیا تم اللہ کے سوا اس چیز کی بندگی کرتے ہو جو تمہارے لئے کسی نقصان اور نفع کا اختیار نہیں رکھتی اور سننے والا اور جاننے والا تو بس اللہ ہی ہے''۔

عبادت کس کی کرنی چاہیے؟

ان کی نادانی اور جہالت کی طرف توجہ دلانے کیلئے ارشاد فرمایا کہ تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی بندگی کرتے ہو جو براہِ راست کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتے حالانکہ انسان کو عبادت تو صرف اس ذات کی کرنی چاہیے جو حقیقی معنوں میں نفع وضرر کی مالک ہے اور ایسی ذات صرف اللہ کی ذات ہے۔ وہ نافع اور ضار بھی ہے اور وہی سمیع وعلیم بھی ہے۔ دوسروں کی عبادت سے کیا حاصل' جو نہ نافع وضار ہیں اور نہ سمیع وعلیم۔

آیت:۷۷ قُلۡ یٰۤاَھۡلَ الۡکِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ غَیۡرَ الۡحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَھۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَ اَضَلُّوۡا کَثِیۡرًا وَّ ضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِیۡلِ O ''کہہ دو اے اہلِ کتاب اپنے دین میں بے جا غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی بدعات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہوئے اور جنہوں نے بہتوں کو گمراہ کیا اور جو راہِ راست سے بھٹک گئے''۔

نصاریٰ کی اصل بیماری ''غلو''

آخری آیت میں اگرچہ خطاب عام اہلِ کتاب سے ہے لیکن اس کا رخ نصاریٰ ہی کی طرف ہے اور ان کی اصل بیماری کی خبر دی گئی ہے جو کہ اسی غلو کا نتیجہ ہے کہ نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو رسول سے خدا بنا ڈالا۔ پھر ان کی ماں اور روح القدس کو بھی خدائی میں شریک کر دیا۔ یہ اسی غلو کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے خواہشات نفس کو دین کا درجہ دے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے حق کی پیروی کرنے کے' وہ گمراہ قوموں کی پیروی کرنے لگے' خصوصاً فلاسفۂ یونان کی۔ جن کے تخیلات سے متاثر ہو کر عیسائی اس صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے' جس کی طرف ابتداء میں ان کی راہنمائی کی گئی تھی۔ مسیح کے ابتدائی پیرو جو عقائد رکھتے تھے' وہ بڑی حد تک اس حقیقت کے مطابق تھے' جس کا مشاہدہ انہوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم ان کے ہادی اور رہنما نے ان کو دی تھی۔ مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف مسیح علیہ السلام کی عقیدت اور تعظیم میں غلو کر کے اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اوہام اور فلسفوں سے متاثر ہو کر اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تاویلیں شروع کر دیں اور ایک بالکل ہی نیا مذہب اختیار کر لیا' جس کو مسیح کی اصل تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہ رہا۔ اس باب میں خود ایک عالم دینیات کا بیان قابل ملاحظہ ہے جو اس نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے چودھویں ایڈیشن میں یسوع مسیح علیہ السلام کے عنوان پر لکھا ہے وہ ایک طویل مضمون ہے۔ ہم اس کے صرف چند فقرے نقل کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

> ﴿پہلی تین انجیلوں' متی' مرقس' لوقا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے' جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے یسوع علیہ السلام کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا' ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی روح سے فیضیاب ہوا تھا۔﴾

اس رکوع سے امت مسلمہ کو کیا سبق ملتا ہے؟

ہم نے اس رکوع میں اہل کتاب کو جو پیغام دیا گیا ہے وہ بھی پڑھا ہے اور اس کے ضمن میں یہود و نصاریٰ کی گمراہیوں کا تذکرہ بھی پڑھا۔ یہود

Marfat.com

میں اگر تفریط کی بیماری ہے تو نصاریٰ میں افراط اور غلو کی بیماری ہے۔ ایک کو سرکشی نے تباہ کیا ہے اور دوسرے کو محبت اور عقیدت میں غلو نے اور خواہشاتِ نفس کو بدعات کا رنگ دے کر اس کی پرستش کرنے نے۔ امت مسلمہ کو اگر اللہ کے یہاں جواب دہی کا کچھ بھی احساس ہے تو اس کیلئے یہ بات ازبس ضروری ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کی تاریخ کے آئینہ میں ان کی بداعمالیوں کو سمجھ کر خود اس سے بچنے کی کوشش کرے اور اس بات کا اچھی طرح جائزہ لے کہ اس امت کے کسی طبقے نے سرکشی کا راستہ تو اختیار نہیں کر لیا یا اس امت کا کوئی طبقہ غلو کا شکار ہو کر بدعات و شرک کی وادی میں داخل تو نہیں ہو گیا۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ

كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى

جو لوگ بنی اسرائیل میں کافر ہوئے ان پر داؤدؑ اور عیسٰی بن مریمؑ کی زبان سے لعنت کی

ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۷۸﴾ كَانُوْا لَا

گئی یہ اس لیے کہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ (اور) بُرے کاموں

يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾

سے جو وہ کرتے تھے ایک دُوسرے کو روکتے نہیں تھے۔ بلاشبہ وہ بُرا کرتے تھے۔

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا

تم اُن میں سے بُہتوں کو دیکھو گے کہ کافروں سے دوستی رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے جو کچھ اپنے

قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ

واسطے آگے بھیجا ہے بُرا ہے (وہ یہ) کہ خدا اُن سے ناخوش ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں

هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ

(مُبتلا) رہیں گے۔ اور اگر وہ خُدا پر اور پیغمبرؐ پر اور جو کتاب اُن پر

اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ

نازل ہوئی تھی اس پر یقین رکھتے۔ تو اُن لوگوں کو دوست نہ بناتے لیکن اُن میں اکثر بدکردار

فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ

ہیں۔ (اے پیغمبرؐ!) تم دیکھو گے کہ مومنوں کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے

Marfat.com

آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا ۖ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ

والے یہودی اور مشرک ہیں اور دوستی کے لحاظ سے

مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۚ ذَٰلِكَ

مومنوں سے قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں یہ اس لیے

بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿٨٢﴾

کہ اُن میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ

اور جب اس (کتاب) کو سنتے ہیں جو (سب سے پچھلے) پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی تو تم دیکھتے ہو کہ اُن کی

مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا

آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس لیے کہ اُنہوں نے حق بات پہچان لی اور وہ (خدا کی جناب میں) عرض

مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨٣﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ

کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہم ایمان لے آئے تو ہم کو ماننے والوں میں لکھ لے اور ہمیں کیا ہوا ہے کہ خدا پر اور حق بات پر

وَنَطْمَعُ أَنْ يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ﴿٨٤﴾ فَأَثَابَهُمُ

جو ہمارے پاس آئی ہے ایمان نہ لائیں۔ اور ہم اُمید رکھتے ہیں کہ پروردگار ہم کو نیک بندوں کے ساتھ (بہشت میں) داخل

اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ

کرے گا۔ تو خدا نے اُن کو اس کہنے کے عوض (بہشت کے) باغ عطا فرمائے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں

وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٨٥﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

وہ ہمیشہ اُن میں رہیں گے۔ اور نیکوکاروں کا یہی صلہ ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿٨٦﴾

جھٹلایا وہ جہنمی ہیں

تمہید:

سابقہ رکوع میں جو پیغام بنی اسرائیل کو اتمامِ حجت کے طور پر دینا مقصود تھا' اس کی تفصیل ہم پڑھ چکے ہیں۔ پھر اس پیغام کے ردِعمل کے طور پر جو رویہ بنی اسرائیل کا سامنے آیا' قرآن کریم نے اس کی توجیہہ کرتے ہوئے یہود و نصاریٰ کے مجموعی طرزِ عمل کو اعتقادات اور اعمال کی صورت

Marfat.com

میں بیان کر کے اہل کتاب پر حجت تمام کی اور امت محمدیہ کیلئے مستقبل کے خطرات کی نشاندہی کی۔ پھر نصاریٰ کے عقائد کو بیان کرتے ہوئے ان کے عقیدے کی دو بنیادی خرابیوں کا بطور خاص تذکرہ کیا اور بتایا کہ یہ وہ خرابیاں ہیں' جن کی وجہ سے ان کے اندر وہ غلط عقائد پیدا ہوئے جن کا ذکر کیا گیا ہے اور امتِ اسلامیہ کو بھی اس بات سے ہوشیار رہنا چاہئے کہ آئندہ چل کر کہیں ان میں یہ دو بنیادی خرابیاں پیدا نہ ہوں۔ آج کے رکوع کے آغاز میں بظاہر ایک ایسی بات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو سزا کے طور پر ان پر وارد ہوئی۔ لیکن درحقیقت ایک اہم حقیقت سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے۔ وہ یہ کہ قومیں اور امتیں جن علائق اور موانع کی وجہ سے بالعموم راہِ راست پر نہیں آتیں' وہ فطری نتائج ہیں اس کوتاہی فکر کے جس نے ان کے اندر ایک ایسا رویہ جنم دیا جس کی وجہ سے وہ کبھی اپنی تاریخ سے کبھی دامن چھڑانے کی کوشش نہیں کرتیں اور اپنے ماضی کی اسیر ہو کر کبھی بھی صحیح راہ عمل اختیار کرنے کی جرأت نہیں کرتیں۔

بنی اسرائیل بھی اس تصور سے دست کش ہونے کیلئے تیار نہیں تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ہم اس کی خاص قوم ہیں۔ انبیاء کی اولاد ہیں۔ صدیاں گزر گئیں' نبوت ہمیشہ ہم میں آتی رہی۔ آج اگر بنی اسماعیل کو اس نعمت سے نوازا جا رہا ہے اور ان میں آخری نبی کو اٹھا کر دنیا کی سیادت و قیادت انہیں دی جا رہی ہے تو بنی اسرائیل کا احساسِ تفاخر کسی قیمت پر بھی اسے قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ بنی اسماعیل جن کو ہم ہمیشہ امی کہہ کے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے رہے اور جنہیں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں' یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جیسی معزز قوم ان کے نبی پر ایمان لے آئے اور ان کی قیادت کو قبول کر لے یعنی وہ اپنے ماضی کی بنیاد پر اللہ کے اس آخری پیغام کو قبول کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ پروردگار نے اس رکوع کی پہلی آیتوں میں انہیں تاریخ کا آئینہ دکھا کر ان کے اس خیال باطل کا علاج کیا ہے کہ نادانو! تم جس تاریخ پر اتراتے ہو اور جس کی وجہ سے تم راہِ ہدایت اختیار کرنے سے انکار کر رہے ہو' تمہیں خوب معلوم ہے کہ تمہارے اپنے پیغمبر تاریخ کے مختلف ادوار میں تم پر لعنت برساتے رہے ہیں۔

آیت:۷۸ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ ''بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا' ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت ہوئی۔ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھ جایا کرتے تھے''۔

بنی اسرائیل پر تمام انبیاء نے لعنت کی

یہاں ذکر صرف دو نبیوں کا کیا گیا ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ تورات اور قرآن کریم پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی رسول شاید ایسا نہیں گزرا جس نے ان کی بداعمالیوں کے باعث' ان سے ناخوشی کا اظہار نہ کیا ہو اور اللہ کی جانب سے ان پر لعنت نہ کی ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے چند رکوع پہلے ہم ایسی ہی صورت حال پڑھ چکے ہیں اور یہاں حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر شاید اس لئے کیا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام وہ رسول ہیں کہ جنہیں بنی اسرائیل اپنی عظمتوں کا امین سمجھتے اور دنیوی رفعتوں کے اعتبار سے انہیں تاریخ کی عظیم ترین شخصیتوں میں شمار کرتے تھے اور ان کے بنی اسرائیل میں ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ان پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور مزید یہ بات بھی کہ حضرت داؤد علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح پرجلال پیغمبر نہیں تھے بلکہ ان کی طبیعت پر جمال کا غلبہ تھا اور شاید اسی جمال ہی کا نتیجہ تھا کہ اللہ نے ان کو خوبصورت آواز عطا فرمائی تھی۔ تاریخ میں آج تک خوبصورت آواز کیلئے ''لحنِ داؤدی'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور پھر آواز میں ایسا سوز و گداز تھا کہ جب وہ پہاڑوں میں مزامیرِ زبور کی تلاوت کرتے تھے تو پہاڑ ان کے ساتھ ہم آواز ہو جاتے

Marfat.com

اور پرندے جھوم جھوم کے اترتے اور بعض دفعہ بے ہوش ہو کر گر جاتے۔ بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کا اندازہ فرمائیے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جیسی دل آویز شخصیت بھی ان پر لعنت کرتی اور ناگواری کا اظہار کرتی ہے کیونکہ بنی اسرائیل کی بدعہدیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا دل زخمی تھا۔ اس لئے اپنی دعاؤں اور مناجاتوں میں بار بار اپنی نارضامندی کا اظہار فرماتے۔ ہم ان کی مناجاتوں میں سے صرف ایک مناجات کا ایک ٹکڑا پیش کرتے ہیں جس سے بنی اسرائیل کے بارے میں ان کے انداز کی وضاحت ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

لیکن خدا شریر سے کہتا ہے
تجھے میرے آئین بیان کرنے سے کیا واسطہ
اور تو میرے عہد کو اپنی زبان پر کیوں لاتا ہے؟
جب کہ تجھے تربیت سے عداوت ہے۔
اور میری باتوں کو پیٹھ پیچھے پھینک دیتا ہے۔
تو چور کو دیکھ کر اس سے مل گیا۔
اور زانیوں کے شریک رہا ہے۔
تیرے منہ سے بدی نکلتی ہے۔
اور تیری زبان فریب گھڑتی ہے۔
تو بیٹھا بیٹھا اپنے بھائی کی غیبت کرتا ہے۔
اور اپنی ماں کے بیٹے پر تہمت لگاتا ہے۔
تو نے یہ کام کئے اور میں خاموش رہا۔
تو نے گمان کیا کہ میں بالکل تجھ ہی سا ہوں۔
لیکن میں تجھے ملامت کر کے ان کو تیری آنکھوں کے سامنے ترتیب دوں گا
ایسا نہ ہو کہ میں تم کو پھاڑ ڈالوں اور کوئی چھڑانے والا نہ ہو۔ (زبور ۵۰: ۱۶-۲۲)

اسی طرح سیدنا مسیح نے بھی ان پر بارہا لعنت کی ہے جن کی مثالیں انجیلوں میں موجود ہیں۔ ہم اختصار کے خیال سے ان کے خطاب سے صرف دو اقتباس نقل کرتے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے؟ اس لئے دیکھو! میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ ان میں سے تم بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھرو گے تاکہ سب راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راستباز ہابل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک' جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانے کے لوگوں پر آئے گا۔

Marfat.com

اے یروشلم! اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتی اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتی ہے۔ کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے جمع کر لیتی ہے' اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں مگر تم نے نہ چاہا۔ دیکھو! تمہارا گھر تمہارے لئے ویران چھوڑا جاتا ہے۔ کیوں کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب سے مجھے پھر ہرگز نہ دیکھو گے' جب تک نہ کہو گے کہ مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے۔ (متی ۲۳:۱۴-۳۹)

لعنت کے دو مفہوم

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی تاریخ کے ابتدائی دور کے ایک عظیم رسول اور پھر بنی اسرائیل کی تاریخ کے آخری رسول' دونوں کے حوالے سے ان پر لعنت کا ذکر فرمایا ہے۔ اس طرح اس تاریخ کے درمیان میں جو ہزاروں نبی گزرے ہیں' ان کا ذکر اگرچہ نہیں کیا گیا' لیکن پہلی اور آخری کڑی کا ذکر کر کے گویا پوری تاریخ کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ اس تاریخ کے تناظر میں جو بات انتہائی قابلِ توجہ ہے' وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل اپنی تاریخ میں کچھ بھی رہے ہوں' بہر حال ایک حامل دعوت امت تھے۔ ایسی امت پر بار بار لعنت کا برسنا' یہ ان کی تاریخ کا ایسا داغ ہے جس کو کبھی بھی دھویا نہیں جا سکتا کیونکہ لعنت کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ ایک اللہ کی رحمت سے دوری اور دوسرا اس بات کا اعلان کہ یہ قوم قبولیت حق سے پوری طرح محروم ہو چکی ہے' اب ان سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہم اپنے معاشرے میں آج بھی اس لفظ کا استعمال تقریباً اس کے قریب قریب معنی کیلئے کرتے ہیں۔ کسی آدمی پر لعنت اس وقت کی جاتی ہے جب اس کے اخلاق اور شرافت کی طرف سے بالکل مایوسی ہو جاتی ہے۔ یہ قوم بھی معلوم ہوتا ہے' ایسی ہی انتہاء کو بار بار چھوتی رہی۔ اب رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی صورت میں انہیں جو آخری موقع دیا جا رہا ہے' اسے تو انہیں غنیمت سمجھ کر قبول کرنا چاہئے تھا کیونکہ اس کے نتیجے میں انہیں ایک نئی زندگی مل سکتی تھی۔ لیکن یہ لوگ چونکہ اپنی تاریخ اور اپنے ماضی کے اسیر تھے' اس لئے یہ اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ البتہ! ایک سوال باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ لعنت جیسا کہ عرض کیا سب سے بڑی محرومی کا نام ہے۔ بنی اسرائیل سے ایسا کون سا جرم سرزد ہوا تھا کہ انہیں اتنی بڑی محرومی کی سزا دی گئی؟

بنی اسرائیل پر لعنت کی وجوہات

اس کا جواب ان دو آیات کریمہ میں دیا گیا ہے۔

1- فرمایا گیا کہ ان کا پہلا جرم تو یہ تھا ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا کہ یہ لعنت ان پر اس لئے کی گئی کہ وہ لوگ نافرمانی کرتے تھے یعنی وہ اللہ کے احکام کے نافرمان تھے۔ قرآنِ کریم سے ان کی اس نافرمانی کی تین شکلیں معلوم ہوتی ہیں:

(i) ان بنی اسرائیل میں ایک ایسا طبقہ بھی موجود تھا کہ جو اللہ کے احکام کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیتا تھا۔ چنانچہ اس کی مثالیں ان کی ابتدائی تاریخ کے آخری دور تک آپ کو جا بجا ملیں گی۔ جب ان پر تورات نازل کی گئی' جس طرح انہوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا اور پھر کوہِ طور کو ان کے سروں پر لا کر ان کو اسے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا' یہ ان کی ابتدائی تاریخ کی ایک نمایاں مثال ہے۔ پھر جزیرہ نمائے سینا میں جب انہیں فلسطین پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا اور انہوں نے جس طرح اس حکم سے سرتابی کی بلکہ ایک حد تک بغاوت کی' اس کا تذکرہ خود تورات میں موجود ہے اور بعد کی تاریخ میں ان کی سرتابیوں اور نافرمانیوں کا تذکرہ مختلف صحیفوں میں موجود ہے۔

(ii) بنی اسرائیل کا ایک خاصہ بڑا عنصر ایسا تھا جو صاف صاف اللہ کے احکام کو قبول کرنے سے تو انکار نہیں کرتا تھا لیکن اس میں چور درواز

Marfat.com

نکالنے اور اپنی بے عملی کی گنجائش پیدا کرنے کیلئے' پے در پے سوالات کرتا تھا۔ قرآنِ کریم نے سورۃ البقرہ میں ان کی اس بری عادت کا تذکرہ کرتے ہوئے اس امت کو تنبیہ کی ہے کہ تم قومِ موسیٰ کی طرح نہ ہو جانا۔

(iii) ان لوگوں میں ایک اور عادت تھی۔ وہ یہ کہ احکامِ حق سے انحراف نہیں کرتے تھے' البتہ وہ آداب زندگی جو پیغمبر کے واسطے سے ملتے ہیں کیونکہ اللہ کی کتاب تو اصول اور احکام دیتی ہے' لیکن زندگی کے آداب اللہ کے نبیوں کی سنت سے ملتے ہیں اور یہی وہ آداب ہیں جو ثقافت و تہذیب کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل پیغمبر کی دی ہوئی اس زندگی سے معلوم ہوتا ہے' اختلاف کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک حدیثِ پاک میں ان کی اس خوئے بد کا ذکر فرمایا:

انما اهلک الذين من قبلكم كثرة مسائلهم و اختلافهم على انبيائهم

﴿تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا ہے' کثرت سوالات نے اور اپنے انبیاء سے اختلاف نے۔﴾

نافرمانی کی یہ تینوں شکلیں بتمام و کمال بنی اسرائیل میں موجود تھیں۔

-2 ان کا دوسرا جرم اور برائی جو ان کیلئے لعنت کا باعث ہوئی وہ ہے:

كَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿یہ لوگ حد سے گزر جایا کرتے تھے۔﴾

نافرمانی کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت نہ کی جائے۔ حد سے گزر جانا اس کا اگلا مرحلہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اطاعت نہ کرنے میں یہ احساس بھی مر جائے کہ میں نے اطاعت نہ کر کے کوئی جرم کیا ہے' بلکہ بڑے سے بڑے جرم کو بھی آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق یوں سمجھا جائے کہ ایک مکھی تھی جو چہرے پر بیٹھی اور اڑ گئی جبکہ ایک مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو یوں محسوس کرتا ہے جیسے پہاڑ اس کے سر پر گر گیا ہو۔

معصیت اور اس کے احساس کا مٹ جانا یہ بجائے خود بہت بڑی محرومی کی علامتیں ہیں۔ لیکن ایسی صورت حال میں اگر اس قوم یا اس معاشرے میں خیر کی دعوت دینے والے نیکی کی طرف بلانے والے اور برائی سے روکنے والے لوگ موجود ہیں اور وہ اپنا فرض انجام دیتے رہیں' اس کے نتیجے میں کسی نہ کسی حد تک قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ رہتا ہے' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بگڑے ہوئے افراد کو کھل کھیلنے کا موقع نہیں ملتا اور قوم بحیثیت مجموعی بگڑنے نہیں پاتی۔ لیکن اگر قوم ان افراد کے معاملے میں تساہل شروع کر دے اور غلط کار لوگوں کو ملامت کرنے کی بجائے انہیں سوسائٹی میں غلط کاری کیلئے آزاد چھوڑ دے اور خیر کی طرف بلانے والے لوگ اشرار کے خوف سے گھر میں چھپ کے بیٹھ جائیں تو پھر رفتہ رفتہ وہی خرابی جو پہلے چند افراد تک محدود ہوتی ہے' پوری قوم میں پھیل جاتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب قوم قبولیتِ حق کی استعداد سے محروم ہو جاتی ہے اور پھر برائی کا احساس آہستہ آہستہ دم توڑ جاتا ہے۔ اب اگر برائی کی طرف سے روکنے کی کوشش بھی کی جائے تو لوگ اسے دیوانگی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں یہی صورت حال پیدا ہوئی جس کا اس آیت کریمہ میں تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

آیت:79 كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ ط لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ O ''جس برائی کو اختیار کر لیتے' اس سے باز نہ آتے۔ نہایت ہی بری بات تھی' جو یہ کرتے تھے''۔

-3 لَا يَتَنَاهَوْنَ کے دو معنی ہیں ایک معنی تو یہ ہے کہ وہ لوگ ایک دوسرے کو برائی کرنے سے روکتے نہیں تھے۔ گویا ان کے اندر تبلیغ و دعوت کا سلسلہ

Marfat.com

اورامر بالمعروف ونہی عن المنکر کا جذبہ نہ صرف کہ سرد ہو گیا تھا بلکہ مر گیا تھا اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اس قوم کا اجتماعی مزاج یہ بن گیا تھا کہ اگر انہیں کسی برائی سے روکا جاتا تھا تو برائی سے رکنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ظاہر ہے یہ دوسرا رویہ پہلے رویے کا منطقی نتیجہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث پاک میں ان دونوں باتوں کی طرف توجہ دلائی۔ آپ نے فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''بنی اسرائیل میں جب شروع شروع میں برائی کا آغاز ہوا تو ایک ایسی تعداد ان میں موجود تھی جو انہیں اس برائی کے ارتکاب سے روکتی تھی۔ لیکن ان سے الگ نہیں ہوتی تھی' بلکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں روک دینے سے ہمارا فرض مکمل ہو گیا' اب اگر وہ نہیں رکتے تو وہ جانیں اور ان کا خدا جانے۔ لیکن جہاں تک ہمارے تعلقات کا سوال ہے' اس میں کوئی کمی نہیں آنی چاہئے۔ چنانچہ وہ اسی طرح ہم نوالہ وہم پیالہ اور باہم شیر وشکر رہتے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ برائی کا ارتکاب کرنے والوں کے اثرات روکنے والوں کے دلوں پر بھی پڑنے لگے۔ ان کے اندر سے برائی تو کیا ختم ہونا تھی' ان نیک لوگوں کے اندر سے بھی نیکی کی عصبیت ختم ہو گئی۔ آخر جب اللہ کا عذاب آیا تو اس نے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا''۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے ہمیں اپنی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کیلئے جو اصول دیئے ہیں ان میں اس بات کو بے حد اہمیت حاصل ہے کہ اپنی نیکی پر اس وقت تک قائم رہو گے' جب تک تم خیر کی دعوت دیتے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے رہو گے۔ جب تم دیکھو کہ کسی گروہ تمہاری کاوشیں بے نتیجہ ہو رہی ہیں اور وہ خیر کی طرف آنے کیلئے قطعاً تیار نہیں تو پھر تمہارے لئے لازم ہے کہ تم ایسے لوگوں سے ترکِ تعلق کر دو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دعائے قنوت میں ہمیں اس عہد کو بار بار دہرانے کا حکم دیا ہے' تا کہ اسے یاد رکھنے میں ہمیں آسانی رہے۔ وہ عہد یہ ہے:

وَ نَخْلَعُ وَ نَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ

﴿''ہم بائیکاٹ کر دیں گے اور ترک تعلق کر دیں گے اس آدمی سے جو تیرا قانون توڑے گا اور تیری نافرمانی کرے گا۔﴾

حاصل کلام یہ کہ بنی اسرائیل پر لعنت کے اسباب تین تھے:

1- اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی۔

2- نافرمانی میں حد سے گزر جانا۔

3- ایک دوسرے کو برائی سے نہ روکنا اور اگر روکا جائے تو رکنے سے انکار کر دینا۔

اللہ فرماتا ہے کس قدر برے تھے وہ کرتوت' جو یہ لوگ کرتے تھے۔

کہیں خدانخواستہ ہم بھی اللہ کی لعنت کی طرف تو نہیں بڑھ رہے

بنی اسرائیل اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ قرآنِ کریم نے ان کے واقعات کا تذکرہ کر کے ہمارے لئے نصیحت وعبرت کا سامان بہم پہنچایا۔ یہاں رک کر ہمیں سوچنا چاہئے کہ کیا یہ تینوں برائیاں اس امت میں موجود تو نہیں۔ کہیں ہم بھی اللہ کی نافرمانی تو نہیں کرتے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نافرمانی میں ہم بھی حد سے گزر چکے ہیں اور کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم کسی برائی کا ارتکاب کر رہے ہیں تو اس میں ہمارا رویہ یہ ہو گیا ہے کہ جو ہمیں اس سے روکتا ہے اس کا منہ نوچنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں لیکن اس سے رکنے کا کبھی نام نہیں لیتے؟ اگر امت کی اجتماعی حالت دیکھی جائے اور اپنے اجتماعی اداروں بالخصوص احتسابی اداروں' عدالتوں اور ایوان ہائے حکومت کے طرز عمل کو سامنے رکھا جائے تو یہ دیکھ کر دل بیٹھ جاتا ہے کہ یہ تینوں بیماریاں بہت حد تک ہم میں در آئی ہیں اور سود کے مسئلے میں تو ہمارا نظام حکومت اور نظام عدالت بالکل عریاں ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ اس لئے ہمیں صرف بنی اسرائیل ہی کے بارے نہیں بلکہ اپنے بارے میں سوچنا ہے کہ اگر ہم نے اپنا فرض نہ پہچانا تو کہیں اس لعنت کا رخ ہماری طرف تو نہیں ہو جائے گا۔

Marfat.com

انسان کا ذوق اس کے اعمال کا سرچشمہ ہوتا ہے

یہود کی بنیادی بداعمالیوں اور ان کے مجموعی رویے کا ذکر تفصیل سے ہم پڑھ چکے ہیں۔ اگلی آیت میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اپنی زندگی میں جس طرح کا رویہ اختیار کرتا ہے یا قومیں اپنی اجتماعی زندگی میں جو معمول اپنا لیتی ہیں' آہستہ آہستہ اس کے نتیجے میں ایک مزاج اور ذوق پیدا ہوتا ہے جو ان کی زندگیوں کے تمام اعمال اور باہمی معاملات پر نہ صرف یہ کہ اثر انداز ہوتا ہے بلکہ تمام اعمال کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ پھر وہ فرد یا قوم کے لوگ اعمال کرنے میں اپنی عقل یا اپنے اعتقادات کو بہت کم استعمال کرتے ہیں بلکہ ان کے تمام تر اعمال ان کے مزاج اور ذوق کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں اور اسی ذوق کے آئینہ دار بھی ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہم ایک فرد کے عام طرز زندگی میں بھی دیکھتے ہیں اور کسی بھی قوم کے مجموعی رویے میں بھی۔ آپ کسی بھی ایسی قوم کا مطالعہ کریں جو بے شک اپنی دنیوی زندگی میں نہایت پسماندگی کی علامت ہو اور انہیں اپنی زندگی کی ضروریات میں نہایت خست سے کام لینا پڑتا ہو اور لوگ انہیں کسی طور بھی قابل ذکر نہ سمجھتے ہوں۔ لیکن اگر انہوں نے کبھی غلامی کی زندگی اختیار نہیں کی اور ہمیشہ آزادی ان کے اجتماعی طرزِ عمل کا جوہر رہی ہے تو آپ ان سے مل کے دیکھئے' آپ ان کے ایک ایک فرد میں آزادروی' اولوالعزمی اور خود اپنے فیصلے کرنے کی صلاحیت محسوس کریں گے۔ وہ زندگی کی سب سے قیمتی متاع عزت اور غیرت کو قرار دیں گے' وہ ایسے کسی بڑے سے بڑے دنیوی فائدے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں گے جس سے ان کی آزادروی میں فرق آتا ہو۔ لیکن اس کے برعکس جو قومیں غلامی کا شکار ہوتی ہیں ان کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ فرد میں حتی کہ ان کے اہل علم میں بھی اور دنیوی اعتبار سے ان کے بالا قامت لوگوں میں بھی اور انتہاء یہ کہ ان کے مشیخت اور تقدس کے دعوے داروں میں بھی' آپ عزت اور غیرت کی خوشبو مشکل سے ہی سونگھ پائیں گے۔ برصغیر کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ جس قوم نے سید احمد شہید' علمائے بنگال' علمائے صادق پور اور ریشمی رومال جیسی تحریکوں کو جنم دیا۔ اس کے سجادہ نشین اور مذہبی پیشوا فاتح قوت کے سامنے کس طرح اپنی وفاداریاں بیچتے رہے اور کس طرح چشم فلک نے اس ملک کے جاگیرداروں کو اس فاتح قوم کے معمولی عہدیداروں کے سامنے سر جھکاتے اور ذلت کی تصویر بنے دیکھا اور وہ فاتح قوم جو ایک محدود تعداد میں یہاں آئی' لیکن برصغیر میں بسنے والی کروڑوں افراد پر مشتمل قوم محض اس لئے ان کے سامنے سرنگوں ہوتی چلی گئی کہ ان کو مسلسل غلامی نے غیرت و حمیت سے محروم کر کے ایک نئے مزاج اور ذوق سے آشنا کیا' جس نے ان سے عزت سے زندہ رہنے اور آزادی کو اپنے سب سے بڑا سرمایہ سمجھنے کی خوبو چھین لی اور وہ چیزیں' جو کل تک ان کیلئے عزت و افتخار کی علامت تھیں' وہ آہستہ آہستہ ناقابل توجہ ہوتی چلی گئیں۔ بقول اقبال:

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتے ہیں قوموں کے ضمیر

کسی بھی انسان کا اصلی جوہر جو اس کی انسانی قدر و قیمت کی پاسبانی کرتا ہے۔ درحقیقت اس کا اپنا احساس ہے' جس کو دل کی بیداری بھی کہا گیا ہے۔ جب تک یہ دل کی زندگی کی صورت زندہ رہتا ہے تو آدمی زندہ رہتا ہے اور جب یہ مر جاتا ہے تو آدمی اور اس کی ہر چیز مر جاتی ہے۔

اس لئے اقبال نے کہا

اے دلِ زندہ کہیں تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

بعض دفعہ چھوٹی چھوٹی مثالیں بڑی بڑی حقیقتوں کیلئے عقدہ کشا ثابت ہوتی ہیں۔ ایسی ہی مثالوں میں ایک چھوٹا سا واقعہ سن لیجئے کہ میں اپنے

Marfat.com

دفتر میں بیٹھا تھا کہ دفتر کے باہر دو لڑکوں کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے کان لگائے تو ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ بھئی تم نے یہ اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے' بال تمہارے الجھے ہوئے ہیں' کپڑے تمہارے شکن آلود ہیں' شیو تمہاری بڑھی ہوئی ہے' آخر تم اپنا خیال کیوں نہیں کرتے؟ دوسرے نے جواب دیا یار! اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پہلے نے کہا فرق پڑتا ہے۔ دوسرے نے کہا' کیا؟ اس نے کہا It looks very awkward (بہت برا لگتا ہے) میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کیا بات ہوئی؟ ایک چیز ایک آدمی کو بری نہیں لگتی۔ لیکن دوسرے کو بری لگتی ہے۔ آپ غور کریں گے تو یقیناً آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ دونوں میں فرق جمالیاتی ذوق کا ہے۔ جس میں جمالیاتی ذوق ہے' وہ اس بے ترتیبی کو ناگوار سمجھتا ہے اور جس میں جمالیاتی ذوق کی کمی ہے' اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کہنا یہ ہے کہ افراد اور قوموں کی زندگی میں سب سے مؤثر عامل جو ان کی زندگی میں رہنما ثابت ہوتا ہے' وہ ان کا مزاج اور ذوق ہے اور یہ اچانک وجود میں نہیں آتا بلکہ اس کے پیچھے ہر صاحب ذوق کا اجتماعی رویہ کارفرما ہوتا ہے۔ ہم گزشتہ رکوع میں دیکھ چکے ہیں کہ یہود کا طرزِ عمل اسلام' قرآن اور خود ذات رسالت مآب ﷺ کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے اس طرز عمل نے ان کے اندر ایک خاص ذوق پیدا کیا۔ وہ یہ ہے کہ وہ ہر چیز برداشت کر سکتے ہیں یا ہر ایک سے تعلق جوڑ سکتے ہیں۔ لیکن نہ وہ اسلام کو قبول کر سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں سے کوئی تعلق رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اگلی آیات میں اسی حقیقت کو نمایاں کیا گیا ہے۔

آیت: ۸۰ تَرٰی كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَ فِی الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ O "تم ان میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں' نہایت برا توشہ ہے' جو انہوں نے اپنے لئے بھیجا کہ خدا کا ان پر غضب ہوا اور عذاب میں وہ ہمیشہ رہنے والے بنے۔

جب کوئی حاملِ مذہب قوم لامذہب کو دوست بنالے

یعنی ان کی زندگی کے طرز عمل نے ان میں جو ذوق پیدا کیا اور جس طرح کا مزاج ڈھالا اس کا نتیجہ ہے کہ وہ کافروں سے پیار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ وہ دعوے دار تو ہمیشہ مذہب کے رہے' لیکن زندگی کا رویہ ہمیشہ مذہب سے بغاوت پر مبنی رہا۔ اس سے جو ذوق تشکیل پایا' اس میں مذہب سے تعلق اور خدا پرستی کا جذبہ کہاں سے آئے گا۔ اس کے نتیجے میں یقیناً ان کو وہ لوگ اچھے لگیں گے جو مذہب کے منکر اور خدا کے باغی ہیں اس لئے کہ انسانی فطرت ہے کہ ایک پڑھا لکھا آدمی ہمیشہ پڑھے لکھے سے دوستی کرتا ہے' ایک مہذب آدمی اپنے رفاقت کیلئے کوئی مہذب آدمی چنتا ہے' ایک عالم فاضل شخص کسی جاہل کی دوستی سے کبھی خوش نہیں رہ سکتا' ایک نیک آدمی برے کی صحبت سے بچتا ہے اور اپنے جیسے آدمی کو ہم نشینی کیلئے تلاش کرتا ہے حتیٰ کہ ہم جانوروں تک میں دیکھتے ہیں کہ ہر جانور اپنے ہم جنسوں میں خوش ہوتا ہے اور ناجنسوں کے قریب نہیں جاتا۔

؎ کند ہم جنس باہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

یہی حال قوموں کا بھی ہے۔ وہ بھی ہمیشہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ تعلقات رکھتی ہیں اور جب کبھی یہ نظر آئے کہ کوئی حامل مذہب قوم لامذہب لوگوں سے دوستی کا تعلق پیدا کر رہی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ حامل مذہب قوم مذہب سے بغاوت اختیار کر کے اپنے اندر لامذہب لوگوں جیسا ذوق پیدا کر چکی ہے۔ اس لئے ہم یہود کو دیکھتے ہیں کہ ان کے ذوق اور مزاج کے بگاڑ کی انتہا یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں کفارِ مکہ کو

Marfat.com

ترجیح دیتے تھے کہ وہ مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔ اس سے ان کی ذہنی پستی کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اعتقادی اور عملی بگاڑ نے ان کے ذوق کو کس حد تک پست کر دیا تھا۔ چنانچہ سورۃ النساء میں پروردگار نے ان کی اس حالت پر اظہار تعجب بھی فرمایا ہے اور ان کی اس حرکت کی بناء پر ان پر لعنت بھی کی ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَ یَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا O اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ط وَمَنْ یَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِیْرًا O

﴿ کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا' جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا اور وہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کفار کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ایمان لانے والوں سے زیادہ ہدایت پر ہیں؟ یہی ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر اللہ لعنت کر دے تو ان کا تم کوئی مددگار نہیں پا سکتے ﴾ (النساء ۴:۵۱-۵۲)

یہود کے مجموعی رویے نے ان کے اندر یہ مزاج پیدا کیا کہ ان کو مسلمانوں کی بجائے وہ کافر اور مشرکین اچھے لگتے تھے جو سرے سے مذہب ہی کے منکر تھے۔ نہ آخرت پر یقین رکھتے تھے اور نہ کسی نبی اور رسول کے قائل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں اور یہود میں زندگی کے اساسی عقائد اور مسلمات کے حوالے سے کوئی ایک چیز بھی مشترک نہیں تھی' سوائے اس کے کہ دونوں میں اللہ کے احکام سے بغاوت کا جذبہ یکساں تھا۔ آج ہم مسلمان بفضلہ تعالیٰ ایمان بھی رکھتے ہیں اور اسلامی شریعت کے ساتھ تعلق کا ہمیں بھی دعویٰ ہے لیکن اس کے باوجود ہم پورے عالم اسلام میں اس بیماری کو رواں دواں دیکھ رہے ہیں' جس کا ابھی یہود کے مزاج کے حوالے سے تذکرہ ہوا کہ جس طرح ان کی دوستیاں کافروں کے ساتھ تھیں باوجود اس کے کہ یہ اس دور کے مسلمان تھے۔ آج ہم مسلمان ہیں' اپنے پاس ایک دین رکھتے ہیں اور شہادتِ حق کی ذمہ داری ہم پر عائد کی گئی ہے۔ لیکن ہماری دوستیاں اور ہماری محبتیں مسلمانوں سے کم' غیر مسلموں سے زیادہ ہیں۔ اسلامی اخوت کو معمولی ذاتی اور ملکی مفاد پر قربان کرتے ہوئے ہمیں کبھی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ کسی بھی مسلمان ملک کے خارجی تعلقات اور تجارتی معاہدوں کو دیکھ لیجئے' مسلمان ملکوں سے کم ہوں گے اور غیر مسلم ممالک سے زیادہ۔ مشرق وسطیٰ ہی کے ممالک کو دیکھ لیجئے۔ وہ ہمارے ساتھ اخوت اسلامی میں شریک ہیں' وہ خوب جانتے ہیں کہ کشمیر میں ہندوستان کس حد تک مظالم توڑ چکا ہے اور پاکستان کو ہندوستان سے تین جنگیں لڑنی پڑی ہیں اور بین الاقوامی معاملات میں اس نے کبھی نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بااین ہمہ! پورے عرب ممالک تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ہندوستان کو پاکستان پر ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے تجارتی روابط اور معاہدے پاکستان کی نسبت ہندوستان سے زیادہ ہیں اور سیاسی اور سفارتی تعلقات پاکستان کی نسبت ہندوستان سے زیادہ گہرے ہیں۔ کسی ملک کا نام لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا ورنہ ایک ایک ملک کے تعلقات کی نوعیت کو دیکھ لیجئے' آپ کو تعجب ہوگا کہ یا اللہ! ہندوستان کے ساتھ آخر ان کی قدر مشترک کیا ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں عالمِ اسلام میں یہود جیسا ذوق اور مزاج پیدا تو نہیں ہو گیا۔ اس سے آگے بڑھ کر میں تو خود پاکستان کے بارے میں متفکر ہوں کہ ہمارا بالائی طبقہ' اپنے دل و دماغ کے رشتے خود اپنے ملک کی نسبت مغربی ملکوں سے زیادہ محسوس کرتا ہے اور اپنے مفادات کو مغربی ملکوں میں زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔ یہ ایک مستقل وجہِ پریشانی ہے' مجھے نہیں معلوم آپ اس کو کیسا دیکھتے ہیں' میرا حال تو یہ ہے کہ:

؎ پریشاں ہوں مرے دل کی پریشانی نہیں جاتی
بڑی مدت ہوئی اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

Marfat.com

اس آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں فرمایا گیا ہے:

لَبِئۡسَ مَا قَدَّمَتۡ لَهُمۡ اَنۡفُسُهُمۡ اَنۡ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ وَفِى الۡعَذَابِ هُمۡ خٰلِدُوۡنَ

﴿نہایت برا توشہ ہے جو انہوں نے اپنے لئے بھیجا ہے کہ خدا کا ان پر غضب ہوا اور عذاب میں وہ ہمیشہ رہنے والے بنے۔﴾

افراد یا قومیں، وہ جو کچھ یہاں کرتی ہیں، اس کے نتائج کچھ یہاں بھی انہیں بھگتنے پڑتے ہیں، لیکن اصل جزا و سزا کا معاملہ تو آخرت میں پیش آنے والا ہے۔ یہاں آدمی اعمال کی صورت میں جو کچھ کرتا ہے، وہ آخرت کے سفر کیلئے توشہ تیار کرتا ہے اور یہی زادِ سفر ہے، جسے اس کو ساتھ لے کر جانا ہے۔ اسی سے اسے سفر میں آسانی ہوگی اور اسی سے اس کے انجام کا تعین ہوگا۔ اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان نادانوں نے اپنے لئے جو توشہ بھیجا ہے، ان کو اندازہ نہیں کہ وہ توشہ ایسا ہے، جس نے اللہ کے غضب کو دعوت دی ہے کیونکہ افراد اور اقوام کے انفرادی اعمال سے بعض دفعہ صرفِ نظر بھی کر لیا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ اعمال اس قوم کا اجتماعی رویہ بن جائیں اور مزید یہ کہ ان اعمال کا تعلق اللہ کے باغیوں کے ساتھ دوستی کی صورت میں نکلے تو یہ وہ خطرناک رویہ ہے، جس سے اللہ کا غضب بھڑکتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے ساتھ تعلق کا کم سے کم تقاضہ یہ تو ہونا چاہئے کہ آدمی اپنے اللہ سے جو وفا کا رشتہ رکھتا ہے، اسے ٹوٹنے نہ دے۔ لیکن اگر انتہا یہ ہو جائے کہ وہ اللہ کے مقابل میں اس کے باغیوں اور دشمنوں سے جا کر رشتۂ محبت قائم کر لے تو یہ ایسا خطرناک اقدام ہے، جس کو پروردگار کبھی معاف نہیں فرماتے۔ اس لئے یہود کے اس رویے نے ان پر اللہ کے غضب کو بھڑکایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ فرماتا ہے کہ اب یہ لوگ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے کیونکہ انہوں نے ہم سے تعلق توڑ کر ہماری مغفرت اور رحمت سے تعلق توڑ لیا ہے اور ہمارے دشمنوں سے تعلق جوڑ کر انہوں نے عذاب سے رشتہ جوڑ لیا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے اپنے اختیار کردہ رشتے کے نتیجے میں، یہ ہمیشہ عذاب میں ڈال دیئے جائیں گے۔

اسی سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے پروردگار نے ان کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا ہے کہ ان ظالموں نے یہ جو رویہ اختیار کیا ہے، جو ان کے مجموعی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ یہ اچانک پیدا نہیں ہو گیا بلکہ اس کے ڈانڈے تاریخ کے ان ادوار سے ملتے ہیں جس پر انہیں بڑا ناز ہے اور جس کے حوالے سے ہمیشہ یہ دعویٰ کرتے رہتے ہیں کہ ہم ہی تو ہیں جو آج بھی توحید کے علمبردار ہیں، رسالت کو مانتے ہیں، آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور پوری دنیا کی امامت و سیادت کے منصب پر صدیوں سے ہم فائز ہیں اس لئے ہم جیسا کون ہو سکتا ہے؟ اس لئے ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ درخت ہمیشہ اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور آدمی کے اندر کا اعتقاد اس کے عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ تم اگر واقعی اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر تمہارا تعلق اسلامی قوتوں کو چھوڑ کر کافر قوتوں کے ساتھ کیوں۔ اسلئے کہ نبی کا ماننے والا، نبی کے منکر سے تو کبھی رشتہ نہیں رکھ سکتا۔ اللہ کا پرستار اللہ کے سامنے سر نہ جھکانے والے سے کیسے محبت رکھ سکتا ہے؟ اور ان دونوں کے درمیان آخر فکری ہم آہنگی کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اسی طرح جو آدمی اللہ کی کتاب اور اس کی نازل کردہ شریعت پر ایمان رکھتا ہے، وہ کتاب اور شریعت کے انکار کرنے والے کے ساتھ محبت و اخوت کی پینگیں کیسے بڑھا سکتا ہے؟ جس طرح تاریخ کے دو باب کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے، جس طرح اندھیرا اور اجالا یکساں نہیں ہو سکتا اور جس طرح زمین و آسمان ہم آغوش نہیں ہو سکتے، اسی طرح صاحبِ ایمان اور بے ایمان میں، خدا پرست اور خدا کے منکر میں، نبی کے ماننے والے اور اسکے انکار کرنے والے میں بھی کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا۔ اسلئے تم جن ادوار پر فخر کرتے ہو کہ تم اللہ کے نبی پر ایمان رکھتے تھے اور اللہ کو مانتے تھے، اگر اس میں واقعی کوئی حقیقت ہے تو پھر تمہارے آج کے طرزِ عمل کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے اسلئے ارشاد فرمایا:

آیت: ۸۱ وَلَوۡ كَانُوۡا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِىِّ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مَا اتَّخَذُوۡهُمۡ اَوۡلِيَآءَ وَلٰـكِنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ۝

Marfat.com

اور اگر یہ اللہ پر' نبی پر اور اس پر جو اس کی طرف اترا' ایمان رکھنے والے ہوتے تو ان کفار کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے تو اکثر نافرمان ہیں۔

اس آیت کریمہ میں نبی سے مراد "حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں" اور مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ سے مراد "تورات" ہے یعنی ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں اور تورات کو بھی مانتے ہیں۔ گویا یہ مذہب سے قدیمی تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور ان پر نازل کردہ شریعت کے متبع ہیں۔ اگر یہ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو ان کا آج کا طرز عمل بلکہ ان کا مجموعی مزاج جو انہیں کافروں اور مشرکین مکہ سے جوڑتا ہے اور اسلام اور پیغمبر اسلام کے قریب نہیں آنے دیتا' یہ آخر کس بات کا غماز ہے؟ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایمان و عمل کے سارے دعوے سراسر جھوٹ پر مبنی ہیں۔ اگر ان میں کوئی صداقت ہوتی تو انہیں تو آگے بڑھ کر اسلام کا علمبردار ہونا چاہئے تھا کیونکہ ان کی کتابوں میں نبی آخر الزماں ﷺ کی علامات اور ان کی تشریف آوری کا تذکرہ ہے۔ قرآن کی خصوصیات تک کا ذکر کیا گیا ہے اور مزید یہ کہ اپنی کتابوں کے علم کی وجہ سے ان کے اہل علم خوب جانتے ہیں کہ سچے نبی کی علامتیں کیا ہوتی ہیں اور اس کا اسلوب دعوت کیا ہوتا ہے۔ اس لئے ان کو آنحضرت ﷺ کی پہچان میں کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود ان کا آنحضرت ﷺ کو تسلیم نہ کرنا اور مسلمانوں کی بجائے غیر مسلموں سے دوستی کا تعلق رکھنا' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ

كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿ان میں زیادہ تر لوگ فاسق (یعنی اللہ کے باغی) ہیں۔﴾

اس لئے ان کے ایمان و عمل کے دعوے اور نبی اور کتاب کے تذکرے' یہ سب بےکار ہیں۔ اس لئے کہ ان کا ماننا' صرف زبان سے ماننا ہے' حقیقت میں ان کی اکثریت ہمیشہ باغیوں پر مشتمل رہی ہے اور ان کے تاریخی تعامل نے اب ان کو یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ یہ مسلمانوں کی بجائے غیر مسلموں سے دوستی کا تعلق رکھنا پسند کرتے ہیں بلکہ یہ مسلمانوں کے ساتھ تمام دنیا کی قوموں سے بڑھ کر دشمنی کا تعلق رکھتے ہیں۔ اب گلہ یہ نہیں کہ یہ مسلمانوں سے دوستی کیوں نہیں رکھتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے بدترین دشمن ہیں۔

آیت:۸۲ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ O "تم ایمان والوں کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور اہل ایمان کی دوستی سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان کے اندر عالم اور راہب ہیں اور یہ تکبر نہیں کرتے"۔

نصاریٰ کون تھے؟

قسیس اور رہبان کے الفاظ عرب کے نصاریٰ اپنے علماء اور زاہدوں کیلئے بولتے تھے' جس طرح یہود اپنے علماء اور فقہاء کیلئے ربی' ربانی اور احبار کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ یہ الفاظ اہل کتاب ہی کے واسطے سے عربی میں آئے چونکہ عرب کے یہود و نصاری کی عام زبان عربی تھی' ان میں بڑے بڑے شاعر اور ادیب بھی تھے، اس وجہ سے ان کی یہ دینی اصطلاحیں عربی ادب میں معروف و مقبول ہو گئیں۔ اس آیت میں یہود کو اسلام دشمنی کے اعتبار سے مشرکین مکہ کا ہم پلہ قرار دیا ہے بلکہ ان کا پہلے تذکرہ فرما کر شاید اس طرف اشارہ ہو کہ یہ دشمنی میں مشرکین مکہ سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے دور میں مشرکین سے مراد مشرکین مکہ ہی تھے۔ لیکن آج مشرکین سے مراد پوری مشرک دنیا' بالخصوص ہندوستان ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن

Marfat.com

کریم کی بیان کردہ یہ حقیقت تاریخ کے ہر دور میں ثابت ہوتی رہی ہے۔ اس لئے کہ جب کبھی مسلمانوں کا غیر مسلموں سے تصادم ہوا تو یہود اور مشرک قوتیں اکٹھی ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئیں۔ اس سے جس طرح دونوں گروہوں کی ہم مشربی اور ہم آہنگی نمایاں ہوتی ہے۔ اسی طرح یہود کی خست اور ذہنی پستی بھی واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں ان کا ہمیشہ یہ رویہ رہا ہے کہ مسلمان دشمنی میں ان کو کسی سے بھی تعلق قائم کرنا پڑے یہ کبھی اس میں حجاب محسوس نہیں کریں گے۔ ان کے مقابلے میں اس آیت کریمہ میں نصاریٰ کی تعریف فرمائی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں کے قریب ہیں۔ لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ نصاریٰ سے آج کے عیسائی مراد ہیں کیونکہ آج کے عیسائی اصلاً اس دین کے پیروکار نہیں، جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر تشریف لائے۔ بلکہ یہ تو پال کی ایجاد کردہ مسیحیت کے پیرو، تثلیث اور کفارہ وغیرہ کے قائل اور اسلام دشمنی میں تمام اعدائے اسلام کے سرخیل ہیں اور پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اسلام دشمنی کے کسی موقع پر یہ کبھی یہود سے پیچھے نہیں رہے بلکہ جس طرح مشرکین اسلام دشمنی میں یہود کے ہم پلہ ہیں، یہی حال ان مسیحیوں اور عیسائیوں کا بھی ہے۔ رہی یہ بات کہ یہاں قرآن کریم نے جن نصاریٰ کا ذکر کیا ہے تو اس سے مراد (پہلے بھی ایک درس قرآن میں ہم اس کا تذکرہ کر چکے ہیں) شمعون صفا کے پیروکار ہیں، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ راشد تھے۔ جو پال کی تمام بدعات سے بالکل الگ حضرت مسیح کی اصل تعلیم پر قائم رہے اور جن کے باقیات صالحات آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد آپ کی دعوت پر اسلام لائے۔ نجاشی وغیرہ اسی باایمان گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اس بات کا احساس تھا کیونکہ مکہ معظمہ میں جب قریشِ مکہ کی جانب سے اذیتیں اپنی انتہاء کو پہنچ گئیں اور مسلمانوں کیلئے ان کا برداشت کرنا بہت مشکل ہو گیا تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں جو لوگ جا سکتے ہیں، وہ حبشہ ہجرت کر جائیں کیونکہ وہاں بادشاہ نجاشی نہ خود ظلم کرتا ہے، نہ کسی کو ظلم کرنے دیتا ہے، تم وہاں انشاء اللہ محفوظ رہو گے۔ چنانچہ بارہ مرد و عورت کا ایک قافلہ جس میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی اہلیہ محترمہ آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی شامل تھیں، حبشہ ہجرت کر گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بڑے بھائی تھے، ان کی سرکردگی میں بیاسی افراد پر مشتمل ایک قافلہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ نجاشی نے ان کا استقبال کیا اور عزت سے ان کو اپنے ملک میں رہنے کی اجازت دی۔ قریشِ مکہ کو جب علم ہوا کہ مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد ہمارے مظالم سے تنگ آ کر حبشہ چلی گئی ہے تو انہوں نے ان کے پیچھے اپنے آدمی بھیجے تاکہ وہ بادشاہ کو ورغلا کر وہاں سے ان کو نکلوانے میں کامیاب ہو جائیں چنانچہ یہ لوگ بادشاہ سے ملے اور اس کو بتایا کہ یہ لوگ ہمارے دین سے مرتد ہو کر آپ کے پاس آ گئے ہیں اور آپ کے مذہب کو بھی نہیں مانتے بلکہ اس کی مذمت کرتے ہیں۔ اسلئے آپ انہیں ہمارے حوالے کر دیجئے۔ بادشاہ نے مسلمانوں کو بلایا اور ان سے تفصیل معلوم کی۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام کی حقانیت پر ایک واقعاتی اور مدلل تقریر کی جس سے بادشاہ بہت متاثر ہوا اور اس نے قریش مکہ کے سفیروں کو ناکام اور نامراد لوٹا دیا۔ لیکن دوسرے دن، قریش مکہ کے یہ سفیر پھر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بادشاہ سے کہا کہ آپ ذرا ان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں پوچھئے۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ لوگ کس قدر غلط عقائد رکھتے ہیں۔ چنانچہ بادشاہ نے مسلمانوں کو بلایا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان سے سوال کیا۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر سورۃ مریم کا دوسرا رکوع پڑھا جس میں حضرت عیسیٰ ابن مریم کی خرقِ عادت ولادت اور پنگھوڑے میں معجزاتی کلام اور نبوت کا تذکرہ ہے۔ حتیٰ کہ حضرت جعفر طیار ان آیات کی تلاوت کرتے ہوئے جب یہاں تک پہنچے:

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝ وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَتِیْ ۡ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ

Marfat.com

اَمُوۡتُ وَيَوۡمَ اُبۡعَثُ حَيًّا O ذٰلِكَ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ ۚ قَوۡلَ الۡحَقِّ الَّذِىۡ فِيۡهِ يَمۡتَرُوۡنَ O

﴿کہا میں اللہ کا بندہ ہوں' اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا اور بابرکت کیا جہاں بھی میں رہوں اور نماز اور زکوۃ کی پابندی کا حکم دیا' جب تک میں زندہ رہوں اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔ سلام ہے مجھ پر جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مروں اور جبکہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں۔ یہ ہے عیسیٰ ابن مریم اور یہ ہے اس کے بارے میں وہ سچی بات' جس میں لوگ شک کررہے ہیں﴾ (مریم ۱۹: ۳۰-۳۴)۔

نجاشی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ تلاوت کے اختتام پر اس نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کے کہا کہ جو کچھ آپ نے پڑھا ہے' حضرت مسیح ایک تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں تھے۔ مزید کہنے لگا کہ ایسا لگتا ہے کہ قرآن کریم اور انجیل ایک ہی سرچشمہ سے نکلی ہوئی شعاعیں ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ ہجرت فرما گئے تو حبشہ سے مسلمان بھی مدینہ طیبہ آ گئے۔ ان کے ساتھ نجاشی نے اپنے علماء اور مشائخ کا ایک وفد بھیجا۔ جو ستر افراد پر مشتمل تھا وہ راہبوں کے لباس میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے' آپ ﷺ نے ان کے سامنے سورۃ یٰسین کی تلاوت فرمائی۔ وہ سن کر روتے جاتے تھے اور ساتھ ہی یہ کہتے تھے کہ یہ کلام اس کلام کے کتنا مشابہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا اور یہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ ان کی واپسی کے بعد شاہ حبشہ نجاشی نے بھی اسلام کا اعلان کر دیا اور اپنا ایک خط دے کر اپنے صاحبزادہ کو ایک دوسرے وفد کا قائد بنا کر بھیجا' مگر سوئے اتفاق سے یہ کشتی دریا میں غرق ہو گئی اس طرح وہ وفد آپ تک نہ پہنچ سکا۔

جب نجاشی نے انتقال کیا تو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو اس کی وفات کی اطلاع دی اور فرمایا تمہارے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اٹھو اور اس کی نماز جنازہ پڑھو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔ مختصر یہ کہ نجاشی اور اس کے ساتھی شمعون صفا کے پیروکاروں میں سے تھے اور یہاں قرآن کریم نے ان کو نصاریٰ کے نام سے ذکر فرمایا ہے۔

آج کے عیسائی نصاریٰ نہیں

رہی یہ بات کہ آج کے عیسائی اس سے مراد نہیں ہیں۔ اس کی تائید میں کئی باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ آج کے عیسائی اپنے آپ کو کرسچین یا مسیحی کے نام سے یاد کرتے ہیں' نصاریٰ کہلانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ نصاریٰ صرف اپنے آپ کو شمعون صفا کے پیروکار کہلاتے تھے کیونکہ پال کے پیروکاروں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں جس طرح تبدیلیاں کیں' ان میں سے ایک اہم تبدیلی یہ ہے کہ انہوں نے نام تک بدل ڈالا۔ چنانچہ مشہور عیسائی مورخ ولیم بلیکی اپنی بائبل ہسٹری صفحہ ۳۹۷ میں لکھتا ہے

(برناباس اور پال' انطاکیہ میں ایک سال تک غیر خدا پرستوں کو نصرانی بنانے میں مصروف رہے۔ معلوم ہوتا ہے اسی سال (۴۴ میں) پہلی بار نصرانیت اختیار کرنے والوں کو مسیحی یعنی کرسچین کا نیا اور شاندار نام دیا گیا)۔

اس عبارت میں مسیحی کا (نیا اور شاندار نام) کے الفاظ نگاہ میں رہیں۔ اس سے صاف واضح ہے کہ پال اور اس کے پیرو نصاریٰ کے لفظ کو اپنے لئے حقیر خیال کرتے تھے اور موجودہ مسیحیت تمام تر اسی پال کی ایجاد ہے۔

اسی سلسلے میں دوسری بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ نصاریٰ کا اطلاق مسیحیوں کے جس گروہ پر ہوا ہے' قرآن کریم نے ان کی ایک نشانی یہ بیان فرمائی

Marfat.com

ہے کہ ان میں علماء اور زاہد و عابد لوگ موجود ہیں۔ موجودہ عیسائیت کے پاپائی نظام کو دیکھ لیجئے' جس طرح اس میں درجہ بدرجہ عیسائیوں کے مذہبی عہدے داروں اور راہنماؤں کی نامزدگی ہوتی ہے اور جو بالآخر 70 ڈائیل پر منتج ہوتی ہے اور وہی پاپائے اعظم کا انتخاب کرتے ہیں' ان میں کہیں بھی نامزدگی یا انتخاب کا مدار علم و زہد پر نہیں ہوتا بلکہ وہ بالکل ایک سیاسی یا گروہی نظام بن چکا ہے' جس میں باقاعدہ ملکوں اور علاقوں کے حصے مقرر ہیں اور اس کے اہم ترین عہدوں کیلئے جابجا ہمیں وراثت کا قانون جاری وساری دکھائی دیتا ہے۔ اس سے یہ بات سمجھنے میں آسانی ہوجاتی ہے کہ آج کل عیسائیت کے مذہبی پروہتوں کو ان نصاریٰ سے کوئی رشتہ نہیں' جن کے راہنماؤں کو قسیس اور رہبان کہا گیا تھا۔

ان کی ایک نشانی قرآن کریم نے یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ لوگ تکبر نہیں کرتے۔ آج کی عیسائی دنیا کو جس نے بھی کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے اور کبھی اسے یورپ یا امریکہ جانے کا اتفاق ہوا ہے یا اس نے کبھی ان کا مذہبی لٹریچر پڑھنے کا حوصلہ کیا ہے تو وہ جابجا اس بات کا مشاہدہ کرتا ہے کہ ان کے مذہبی لٹریچر میں' ان کے مذہبی راہنماؤں میں' ان کے سیاسی لیڈروں میں اور ان کے حکمرانوں میں' سب سے بڑی چیز جو کارفرما دکھائی دیتی ہے' وہ دوسری قوموں اور دوسرے مذاہب کے مقابلے میں بالعموم اور مسلمانوں اور اسلام کے مقابلے میں بالخصوص ان کا حد سے بڑھا ہوا تکبر ہے۔ اب تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ آپ کسی بھی امریکی سے بات کر کے دیکھ لیجئے یا اس سے کوئی معاملہ کر کے دیکھ لیجئے آپ کو قدم قدم پر اس کے قول و عمل میں بچھو کی طرح تکبر سے بھرپور اس کے رویے سے واسطہ پڑے گا۔ ان کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کے ایک ایک لفظ سے اپنی بڑائی اور دوسروں کی حقارت کی بو آتی ہے اور اب تو امریکی بالخصوص اپنے آپ کو مافوق الفطرت مخلوق سمجھنے لگے ہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے جن نصاریٰ کی خاص صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ تکبر نہیں کرتے' ان کے ساتھ ان تکبر کے زہر میں بجھے ہوئے لوگوں کا کیا رشتہ ہوسکتا ہے۔

پھر آخری نشانی جو نصاریٰ کی بیان فرمائی ہے' اس کے بعد تو یہ بحث ختم ہی ہوجاتی ہے کہ آج کے عیسائیوں کا اس گروہ سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے۔

آیت: ۸۳-۸۴ وَإِذَا سَمِعُوا مَآ أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰٓ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ج يَقُولُونَ رَبَّنَآ ءَامَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّٰهِدِينَ ۝ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ لا وَنَطْمَعُ أَن يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّٰلِحِينَ ۝ ''اور جب انہوں نے سنا اس چیز کو جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھ رہے ہو کہ حق کو پہچان لینے کے سبب سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے' تو ہمیں اس کی گواہی دینے والوں میں لکھ لے''۔ ''اور آخر ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہم کو پہنچا' ایمان کیوں نہ لائیں؟ جب کہ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیکوکاروں کے زمرے میں شامل کرے گا''۔

ان آیات کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس گروہ کو نصاریٰ کے نام سے یہاں یاد کیا گیا ہے' ان کا حال یہ تھا کہ جب انہوں نے اللہ کے رسول کو دیکھا اور ان پر اترنے والی کتاب یعنی قرآن کریم کو سنا تو انہوں نے والہانہ انداز میں آپ کا اور قرآن کریم کا خیر مقدم کیا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سچے پیروکار تھے' اس لئے انجیلوں میں جس تسلی دینے والے اور جس نجات دہندہ کی بشارت دی گئی تھی اور اس کی جو علامتیں بیان کی گئیں تھیں' وہ ان میں سے ایک ایک چیز کو محفوظ کیے ہوئے اس آنے والے کی راہ تک رہے تھے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس آنے والے کی صفات کو اس طرح کھول کر بیان فرمایا تھا کہ وہ ذات ان کیلئے ایک نہایت محبوب ذات بن گئی تھی اور پھر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہمیں دنیا اور آخرت میں جن کامیابیوں کی خبر دی گئی ہے' وہ تمام کی تمام اس ذات اور اس کے لائے ہوئے دین سے وابستگی کی صورت میں ہی حاصل ہوسکتی ہیں۔ اس لئے جیسے ہی انہوں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا تو وہ اس طرح آنحضرت ﷺ کی طرف بڑھے' جیسے کوئی شخص اپنی کسی محبوب ترین ذات

Marfat.com

انتظار میں راہ تکتے ہوئے کئی برس گزار چکا ہو اور جب اسے یہ معلوم ہو کہ آج وہ ذات عزیز اس کی مہمان بننے والی ہے تو اس کے دل و دماغ کی کیفیت اور اس کے استقبال کی بے ساختگی اور اس کے انتظار کی بے چینی کا اندازہ کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ چنانچہ یہی حال آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر ان لوگوں کا ہوا۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ جیسے ہی آنحضرت ﷺ کی زبان سے انہوں نے اللہ کا کلام سنا تو جوشِ مسرت سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور وہ بے ساختہ پکار اٹھے کہ یا اللہ! ہم اس کتاب اور اس کے لانے والے پر ایمان لاتے ہیں، تو ہمیں ان لوگوں کے زمرے میں شمار فرما لے جو اس دین کی گواہی دینے کی عزت حاصل کر چکے ہیں اور ہمیں توفیق عطا فرما کہ پہلے انبیاء کے واسطے سے اور آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے توسط سے ہم سے اس آخری نبی پر ایمان لانے' اس کی نصرت کرنے اور اس کی سچائی کی گواہی دینے کا تو نے جو عہد لیا تھا کہ ہم اس عہد کو پورا کر سکیں اور اس طرح تیرے ان بندوں میں شامل ہو جائیں جن سے تو راضی ہے۔ پھر ان کی بے ساختگی کا عالم یہ ہے کہ خوشی اور مسرت ان کے ایک ایک لفظ سے اس طرح پھوٹی پڑ رہی ہے کہ جس ایمان و اسلام کا وہ اعلان کر رہے ہیں' اس کی تائید میں خود دلیل بھی دے رہے ہیں کہ جب ہم یہ توقع لئے بیٹھے ہیں کہ اللہ ہمیں زمرہ صالحین میں داخل کرے گا تو پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ پر اور اس حق پر ایمان نہ لائیں' جو اللہ کے آخری رسول کے واسطے سے ہمارے پاس آ گیا ہے اور اسی حق کی پاسداری اور علمبرداری کی صورت میں ہم آخر کیوں یہ توقع نہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر عنایات کی بارش فرمائے گا اور طبقہ صلحا میں ہمیں شامل فرمائے گا۔

حق اور صاحبِ حق کا یہ والہانہ اعتراف اللہ کے یہاں شرفِ قبول پا گیا اور یہ لوگ ان تمام اعزازات کے مستحق ٹھہرے' جن سے اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے نیک بندوں کو مشرف فرماتا ہے۔

آیت:۸۵-۸۶ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ ○ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ○ ''ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنتیں عطا کیں' جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے نیک رویہ اختیار کرنے والوں کیلئے''۔ ''رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا اور انہیں جھٹلایا تو وہ جہنم کے مستحق ہیں''۔

انسان کی اصل کامیابی

نصاریٰ کے اس گروہ کو جنہوں نے نہایت کشادہ قلبی اور مسرت کے جذبات کے ساتھ اللہ کے دین کو قبول کیا تو اللہ نے ان کو وہ تمام نعمتیں عطا فرمائیں' جو اللہ کے عظیم خوش نصیب بندوں کا ہمیشہ مقدر بنتی ہیں' جس کا اجمالی نام ''جنت'' ہے۔ قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی زندگی کی سرفرازیوں کیلئے پوری زندگی جہد و عمل میں گزارتا ہے اور پھر ہر آدمی کی کامیابی کے عنوانات اور صورتیں بھی جدا جدا ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم کی نگاہ میں کسی بھی انسان کی حقیقی کامیابی کی جو آخری صورت ہے' جس کے سامنے ساری کامیابیاں ہیچ ہیں اور اگر وہ کامیابی نصیب نہ ہو تو باقی ساری کامیابیاں' کامیابی کے نام پر داغ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں' وہ کامیابی یہ ہے

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ

﴿جس کو جہنم کی آگ سے ہٹا دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ حقیقت میں کامیاب ٹھہرا﴾ (ال عمران 185:3)

یہ وہ کامیابی ہے جو اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کے اس گروہ کو عطا فرمائی اور یہی وہ کامیابی ہے جو ہر اس گروہ کو ملے گی جو ان کی طرح والہانہ اللہ کے

Marfat.com

دین کی قبولیت اور عمل کیلئے اقدام کرے گا۔ جو شخص یا جو افراد اللہ کے دین کی قبولیت سے محروم رہیں گے اور وہ اس سے انکار اور اس کی تکذیب کی دلدل میں دھنستے چلے جائیں گے' ان کا انجام' جسے نہایت خطرناک انجام کہنا چاہئے' وہ یہ ہوگا کہ انہیں جہنم کی نذر کر دیا جائے گا۔ یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نصاریٰ کے اس مکمل کردار کی تصویرکشی سے یہود پر تعریض کی جارہی ہے کہ تم ایسے بدنصیب ہو کہ تمہیں صدیوں سے مذہب کے ورثے کے حامل ہونے کا دعویٰ ہے اور اپنے بارے میں نجانے کیسے کیسے باطل خیالات تم نے بنا رکھے ہیں' لیکن حق کی قبولیت سے محروم رہ کر تم نے اپنے لئے جہنم کا سودا کیا۔ بجائے اس کے کہ تم نصاریٰ کی طرح آگے بڑھ کر اسلام کی علمبرداری کرتے اور جنت کے وارث ہو جاتے' لیکن تمہاری ایسی قسمت پھوٹی ہے کہ اب تمہارا مستقل مقدر جہنم میں رہنا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہ کی سب سے بڑی خواہش

اس رکوع کی آخری آیتوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ اللہ کے ان نیک بندوں کو کس طرح جنت کی آرزو میں تڑپتا ہوا دکھایا گیا ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کی سب سے بڑی آرزو جنت کے حصول کے سوا اور کچھ نہیں' یہی وجہ ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی وہ چیز' جس نے ان کے شب و روز کی خواہشات پر غلبہ پالیا تھا' حتیٰ کہ جس کیلئے وہ جان قربان کر دینا بھی معمولی بات سمجھتے تھے وہ صرف یہ جنت کی آرزو تھی۔ بہت سارے ایسے واقعات میں سے میدان بدر کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ جب ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ کاش! میں بھی اس جنت میں جاتا' جس کی وسعت زمین و آسمان سے بڑھ کر ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا تم بھی انہی میں سے ہو۔ چنانچہ اس خوشخبری کے بعد اس صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جوشِ مسرت کا عالم دیدنی ہے کہ اس نے وہ کھجوریں پھینک دیں' جنہیں وہ کھا رہا تھا اور کہنے لگا کہ جنت کی طلب میں اتنی دیر کے رہنا' جتنی دیر میں یہ چند کھجوریں ختم ہوں گی' یہ تو بڑی طویل محرومی ہے۔ اب جنت ہی میں چل کر کھجوریں کھائیں گے' چنانچہ دیوانہ وار لشکر میں گھس گیا اور دادِ شجاعت دیتا ہوا شہید ہو گیا۔ اسی طرح ہم جنگِ احد میں دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اسی وقت ایمان لایا۔ پوچھا حضور ﷺ! اب میرے لئے کیا حکم ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ سامنے جنت تیرے انتظار میں ہے' وہ مستانہ وار آگے بڑھا اور لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس کو کوئی اسلامی عمل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ادھر اسلام قبول کیا' اس کے چند گھنٹوں کے بعد وہ اللہ کے پاس پہنچ گیا۔ حضور ﷺ نے اس کی لاش پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ اس شخص نے کام بہت تھوڑا کیا لیکن اجر بہت پا گیا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ جنتی ہے اور یہ بھی فرمایا کہ یا اللہ میں اس سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا۔

کہنا صرف یہ ہے کہ جنت کی طلب ہمیشہ مومنوں کے دل کی آرزو اور ان کے دل میں ہیجان پیدا کرنے والی ہوتی تھی۔ لیکن آج نجانے کیا بات ہے کہ ہمارا بالخصوص پڑھا لکھا طبقہ جو ماشاء اللہ نیک بھی ہے' اسے جنت کی طلب ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے اور جنت کی آرزو کرتے ہوئے وہ جھجک محسوس کرتا ہے۔ نہ جانے یہ ہمارے دینی جذبات اور ہمارے اخروی احساسات کیوں تبدیل ہو کے رہ گئے ہیں؟ ہمیں اس پر بھی غور کرنا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ

مومنو! جو پاکیزہ چیزیں خدا نے تمہارے لیے حلال کی

مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿٨٧﴾

ہیں اُن کو حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو کہ خدا حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا

Marfat.com

وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ

اور جو حلال طیب روزی خدا نے تم کو دی ہے اُسے کھاؤ اور خدا سے جس پر ایمان رکھتے ہو

بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ

ڈرتے رہو۔ خدا تمہاری بے ارادہ قسموں پر تم سے مواخذہ نہ کرے گا لیکن پختہ قسموں

يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ

پر (جن کے خلاف کروگے) مواخذہ کرے گا۔ تو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو

مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ

اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو۔ یا ان کو کپڑے دینا یا

تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ

ایک غلام آزاد کرنا۔ اور جس کو یہ میسر نہ ہو وہ تین روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب

اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ

تم قسم کھا لو (اور اُسے توڑ دو)۔ اور (تم کو) چاہیئے کہ اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اس طرح خدا تمہارے سمجھانے کے

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ

لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔ اے ایمان والو! شراب اور جوا

وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ

اور بت اور پاسے (یہ سب) ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ

تاکہ نجات پاؤ۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب

الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوا دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے

Marfat.com

وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿٩١﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا
تو تم کو (ان کاموں سے) باز رہنا چاہیے ۔ اور خدا کی فرمانبرداری اور رسولِ (خدا) کی
الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ
اطاعت کرتے رہو اور ڈرتے رہو اگر منہ پھیرو گے تو جان رکھو کہ ہمارے پیغمبر کے ذمے تو صرف پیغام کا کھول
الْمُبِيْنُ ﴿٩٢﴾ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا
کر پہنچا دینا ہے ۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے اُن پر اُن چیزوں کا کچھ گناہ
طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا
نہیں جو وہ کھا چکے ۔ جب کہ انہوں نے پرہیز کیا اور ایمان لائے اور نیک کام کیے پھر پرہیز کیا اور ایمان
ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٣﴾
لائے پھر پرہیز کیا اور نیکوکاری کی ۔ اور خدا نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے ۔

تمہید

آج ہم سورۃ المائدہ کی ان آخری آیات کا آغاز کر رہے ہیں جو تقریباً پانچ رکوعوں پر مشتمل ہیں۔ ان آیات کی خصوصی حیثیت یہ ہے کہ جہاں تک سورۃ المائدہ میں بیان کردہ مضامین اور احکام کا تعلق ہے وہ اختتام کو پہنچ گئے۔ لیکن ان بیان کردہ احکام کے بارے میں ذہنوں میں جو سوالات ہوئے یا جو پیدا ہو سکتے تھے اور جو سوالات پوچھے گئے یا پوچھے جا سکتے تھے ان آیات میں ان تمام سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ بعض دفعہ کہیں سوال کا ذکر کیا گیا ہے لیکن بالعموم سوال کا ذکر کئے بغیر جواب دیا گیا ہے۔ اسی لئے ان آیات کریمہ کو توضیحی آیات کہا جاتا ہے اور خود ان آیات میں اس طرف اشارات بھی موجود ہیں۔ اس وقت جو رکوع پیش نظر ہے اس کی پہلی ہی آیات میں ایسے ہی چند سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔ مثلاً اس سورۃ کی آیت میں اللہ تعالیٰ اور بندوں کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو پورا کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور پھر دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے خصوصی وصف کے حوالے سے امت مسلمہ کو متوجہ کیا گیا ہے کہ پہلی امتیں جن باتوں میں ٹھوکریں کھاتی رہیں ان میں ایک اہم تر بات یہ رہی ہے کہ انہوں نے حلت و حرمت کا حق جو سراسر ذاتِ باری تعالیٰ کی صفت ہے انہوں نے کبھی اس کو اپنے لئے اور کبھی ان کیلئے جن کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک رکھا تھا استعمال کیا اور یہیں سے ان کی اجتماعی ذمہ داریوں کے حوالے سے گمراہیوں کا آغاز ہوا۔ چنانچہ آگے پوری سورۃ میں جابجا محرمات شرعیہ کے حوالے سے احکام دیئے گئے۔ چنانچہ جب ایک آدمی ایفائے عہد کی تاکید اور حلت و حرمت کے حوالے سے اٹھائی جانے والی بحث کو دیکھتا ہے تو معلوم

Marfat.com

کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے ایسی بہت ساری چیزوں کو اپنے اوپر حرام کرلیا جو طیبات میں شامل تھیں حالانکہ تمام طیبات کو ان کیلئے حلال کیا گیا تھا یا پھر بہت ساری چیزوں کو انہوں نے اس خیال سے اپنے اوپر ممنوع قرار دے دیا کہ یہ ممانعت شاید تقربِ الٰہی کا ذریعہ ثابت ہو' باقی لوگوں نے تو حلت و حرمت کی حدود کو نافرمانی کرتے ہوئے پامال کیا۔لیکن یہ لوگ نیکی اور قرب الٰہی کے جذبہ سے حلت و حرمت کے حق کو استعمال کرتے رہے تو ایسے لوگوں کا انجام آخر کیا ہوگا؟ اسی طرح ہم گزشتہ رکوع کی آیت نمبر ۸۲ میں دیکھتے ہیں کہ نصاریٰ میں راہبوں کی تعریف کی گئی ہے۔اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش ہے؟ یہ یاد رہنا چاہئے کہ رہبانیت ترکِ دنیا کا دوسرا نام ہے اور ترکِ دنیا کا سب سے پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی بہت سارے طیبات کو اپنے اوپر ممنوع قرار دے دیتا ہے۔اس لئے ضروری تھا کہ اس سوال کا فوری جواب دیا جاتا تاکہ اس فتنہ کو مسلمانوں میں پھیلنے کا موقع نہ ملے۔چنانچہ ایسے ہی سوالات ہیں' جن کا ان پانچ رکوعوں میں جواب دیا گیا۔

آیت:۸۷-۸۸ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ O وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ O ''اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ' جو خدا نے تمہارے لئے جائز کیں اور نہ حدود سے تجاوز کرو۔اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔''اور خدا نے تمہیں جو حلال اور طیب چیزیں بخشی ہیں' ان کو برتو اور اس اللہ سے ڈرتے رہو' جس پر تم ایمان لائے ہو''۔

ان دونوں آیتوں میں بنیادی طور پر وہی بات ارشاد فرمائی گئی ہے' جس پر پوری سورۃ میں جا بجا زور دیا گیا ہے کہ حلت و حرمت سراسر اللہ کا حق ہے' وہی اس کا مختار ہے' وہ جسے چاہے حلال کرے اور جسے چاہے حرام کرے۔اس لئے حلال وہی ہے' جو اس نے حلال کیا اور حرام وہی ہے' جو اس نے حرام کردیا۔اس لئے اللہ کے اس خصوصی حق اور صفت میں کبھی دخیل ہونے کی کوشش نہ کرو کیونکہ اگر تم اس اختیار کو اپنے لئے استعمال کرنے لگو گے تو قانون الٰہی کی بجائے خواہشِ نفس کے اطاعت گزار بن جاؤ گے اور یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ ایک مسلمان کا کام خواہشاتِ نفس سے منہ موڑ کر قانون الٰہی کی پیروی کرنا ہے اور یہی اسلام اور کفر میں فرق ہے۔کافر ہمیشہ خواہشِ نفس کی پیروی کرتا ہے اور اگر مسلمان بھی ایسا کرنے لگیں تو پھر ان کا نام مسلمان رکھنا' ایک تکلف سے زیادہ نہیں ہوگا۔

اسلام میں ترک دنیا کا کوئی تصور نہیں

پہلی آیت کے پہلے حصے میں بطورِ خاص ایک بات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے' وہ یہ کہ مذہبی ذہنیت کے نیک مزاج لوگوں میں عموماً یہ میلان پایا جاتا رہا ہے کہ نفس و جسم کے حقوق ادا کرنے کو وہ روحانی ترقی میں مانع سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا' اپنے نفس کو دنیوی لذتوں سے محروم کرنا اور دنیا کے سامان زیست سے تعلق توڑنا' بجائے خود ایک نیکی ہے اور خدا کا تقرب اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔چنانچہ یہی وہ تصور ہے' جس نے عیسائیوں میں راہب' ہندوؤں میں جوگی' بدھ مذہب میں بھکشو اور مسلمانوں میں اشراقی متصوفین پیدا کئے۔نیکی کا یہ تصور اور اللہ سے قرب پیدا کرنے کا یہ کسی خاص زمانے کی پیداوار نہیں بلکہ ہر دور میں غلط مذہبی تصورات نے ایسے ہی نتائج پیدا کئے۔چنانچہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد جو لوگ مسلمان ہوئے' ان میں سے جن لوگوں میں پہلے سے نیکی کا جذبہ غالب تھا' ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے اندر یہ ذوق پایا جاتا تھا اور وہ اللہ سے قرب کیلئے ترک دنیا کو ضروری سمجھتے تھے اور دنیا کو ایک برائی تصور کرکے ترک دنیا کو نیکی خیال کرتے تھے۔چنانچہ ایسا ہی ذوق رکھنے والے چند

Marfat.com

صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بارے میں آنحضرت ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ انہوں نے یہ عہد کیا ہے کہ ہمیشہ دن کو روزہ رکھیں گے اور راتوں کو بستر پر نہ سوئیں گے بلکہ جاگ کر عبادت کرتے رہیں گے۔ گوشت اور چکنائی استعمال نہ کریں گے اور عورتوں سے واسطہ نہ رکھیں گے۔ اس پر آپ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا کہ

﴿مجھے ایسی باتوں کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ تمہارے نفس کے بھی تم پر حقوق ہیں لہٰذا روزہ بھی رکھو اور کھاؤ پیو بھی' راتوں کو قیام بھی کرو اور سوؤ بھی' مجھے دیکھو! میں سوتا بھی ہوں اور قیام بھی کرتا ہوں' روزے رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا' گوشت بھی کھاتا ہوں اور گھی بھی' پس جو میرے طریقے کو پسند نہیں کرتا وہ مجھ سے نہیں ہے۔﴾

ایک اور موقعہ پر فرمایا:

﴿یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انہوں نے عورتوں کو اور اچھے کھانے کو اور خوشبو اور نیند اور دنیا کی لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے؟ میں نے تو تمہیں یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ تم راہب اور پادری بن جاؤ۔ میرے دین میں نہ عورتوں اور گوشت سے اجتناب ہے اور نہ گوشہ گیری و عزلت نشینی ہے۔ ضبط نفس کیلئے میرے ہاں روزہ ہے اور رہبانیت کے سارے فائدے یہاں جہاد سے حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ کی بندگی کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' حج اور عمرہ کرو' نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو۔ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے' وہ اس لئے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے اپنے اوپر سختی کی اور جب انہوں نے خود اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ یہ انہی کے بقایا ہیں جو تم کو صومعوں اور خانقاہوں میں نظر آتے ہیں۔﴾

اسی سلسلہ میں بعض روایات سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق نبی ﷺ نے سنا کہ وہ ایک مدت سے اپنی بیوی کے پاس نہیں گئے ہیں اور شب و روز عبادت میں مشغول رہتے ہیں تو آپ ﷺ نے بلا کر ان کو حکم دیا کہ ابھی اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔ انہوں نے کہا! میں روزے سے ہوں۔ آپ نے فرمایا: روزہ توڑ دو اور جاؤ۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایک خاتون نے شکایت پیش کی کہ میرے شوہر دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر عبادت کرتے ہیں اور مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مشہور تابعی بزرگ کعب بن سور الازدی کو ان کے مقدمہ کی سماعت کیلئے مقرر کیا اور انہوں نے فیصلہ دیا کہ اس خاتون کے شوہر کو تین راتوں کیلئے اختیار ہے کہ جتنی چاہیں عبادت کریں مگر چوتھی رات لازماً ان کی بیوی کا حق ہے۔

طیبات کو اپنے اوپر حرام قرار دے لینے کے تین درجے

یہاں ایک اور بات کا سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ طیبات کو اپنے اوپر ممنوع قرار دے لینے کے تین درجے ہیں۔

1- پہلا درجہ یہ ہے کہ اللہ نے تمام طیبات کو حلال ٹھہرایا ہے اور کوئی آدمی ان میں سے کسی پاکیزہ نعمت کو اپنے اوپر یہ سمجھ کر ممنوع قرار دے لے کہ یہ حلال نہیں بلکہ حرام ہے اور اسی کا اعتقاد رکھے تو اگر وہ چیز اسلامی شریعت میں فی الواقع حلال ہے تو اس کو حرام قرار دینے والا کافر ہو جاتا ہے کیونکہ ہم بار بار پڑھ چکے ہیں کہ حلت و حرمت صرف اللہ کا حق ہے۔ دوسرا اسے اگر اپنے لئے اختیار کرے گا تو وہ کفر اور شرک کا ارتکاب کرے گا۔

2- دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام تو نہ سمجھے' البتہ یہ خیال کرے کہ ان میں سے بعض حلال چیزوں کو ترک کر دینا اجر و ثواب کا باعث ہو گا اور اس کے نتیجے میں مجھے اللہ کا قرب حاصل ہو گا۔ ایسا سمجھنے والا گمراہ اور بدعتی ہے کیونکہ کسی چیز پر اجر و ثواب کا حاصل ہونا یا نہ ہونا

Marfat.com

اس کا تعلق سراسر شریعت سے ہے اور شریعت رسول اللہ ﷺ پر ختم ہو گئی۔ آپ نے اللہ کی جانب سے جن اعمال پر اجر و ثواب کی خبر دی ہے' انہی پر اجر و ثواب ملے گا' کسی اور چیز پر ہرگز نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے طور پر کسی اور چیز کو اجر و ثواب کا حامل سمجھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ احکام شریعت پر یا آدابِ شریعت پر اضافہ کرنے کی جرأت کر رہا ہے' اسی کو بدعت کہتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی آدمی اس خیال سے کسی بھی حلال چیز کو اپنے اوپر ممنوع قرار دے لے کہ مجھے اس سے اجر و ثواب ملے گا' جبکہ شریعت میں اس کا کوئی وجود نہیں تو یہ گناہگار ہو گا اور اسے اس سے توبہ کرنی چاہئے۔

-3 تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی نہ تو اس چیز کو حرام قرار دے اور نہ اسے اجر و ثواب کا ذریعہ سمجھے بلکہ محض اس خیال سے کہ اس کی طبیعت اسے پسند نہیں کرتی یا وہ چیز اس کے جسم کیلئے سازگار نہیں' اس لئے اسے اپنے اوپر ممنوع قرار دے لے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ اس میں نہ تو کوئی گناہ لازم آئے گا اور نہ اس میں کوئی گمراہی کی بات ہے۔ البتہ! میں ذاتی طور پر یہ عرض کرتا ہوں کہ اللہ کی کسی بھی نعمت کو طبعی کراہت یا ناپسندیدگی کی وجہ سے زندگی بھر کبھی بھی استعمال نہ کرنا یہ کوئی اچھی بات معلوم نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید کسی نعمت کو استعمال نہ کرنے والا یہ گمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ چیز مناسب طریقے سے پیدا کرنا نہیں آئی ورنہ اس میں ناپسندیدگی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے میں ذاتی طور پر یہ کہتا ہوں کہ چاہے کوئی چیز طبعاً پسند نہ بھی ہو پھر بھی یہ سمجھ کر اسے استعمال کرنا چاہئے کہ یہ اللہ کی پیدا کی ہوئی نعمت ہے' اس کی قدر واجب ہے۔

یہ بات واضح کر دینے کے بعد کہ اللہ کی تمام حلال کردہ طیبات نیکی کے تصور سے بھی اپنے اوپر حرام قرار نہیں دی جا سکتیں۔ اب ایک اور اہم بات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے فرمایا:

وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿حدود سے تجاوز نہ کرو' بیشک اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا﴾

حدود سے تجاوز کی تین صورتیں

حدود سے تجاوز کی تین قسمیں ہیں جنہیں ہم ایک ترتیب سے بیان کرتے ہیں۔

-1 حلال کو حرام ٹھہرانا' جس کا ابھی ذکر ہو چکا۔

-2 اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھرانا۔ اللہ تعالیٰ نے تمام طیبات کو حلال ٹھہرایا ہے۔ ان میں سے چند گنتی کی چیزیں ہیں' جنہیں حرام کیا گیا ہے۔ ان کی حیثیت اللہ کی حدود کی ہے اور حدود کو لانگنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص ان حدود سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتا ہے تو وہ محارمِ الٰہی کی حدود میں مداخلت کرتا ہے اور یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ اللہ کی حدود کو پامال کرنا اور محارم الٰہی کی حدود میں داخل ہونے کی جسارت کرنا' یہ ایک ایسا جرم ہے جو ناقابل معافی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ان حدود کے قریب آنا تو دور کی بات ہے' اس سے دور روک دینے کی کوشش فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی شریعت میں حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ لیکن ان کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں' جن کا حرام اور حلال ہونا پوری طرح واضح نہیں۔ اگر تم محارم الٰہی میں داخل ہونے سے بچنا چاہتے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کے قریب بھی نہ جاؤ تو پھر مشتبہ چیزوں یعنی مکروہ چیزوں سے پرہیز کرو۔ آپ ﷺ نے اس کی مثال دیتے ہوئے اس طرح سمجھایا کہ ''ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے'' آج شاید اس بات کو سمجھنا نوجوانوں کیلئے مشکل ہو کیونکہ اب تو بادشاہوں کے کاروں اور جہازوں کے بیڑے ہوتے ہیں' اس لئے انہیں چراگاہوں کی ضرورت اتنی نہیں پڑتی۔ اگرچہ شاہی چراگاہیں اب بھی بعض علاقوں میں موجود ہیں۔ لیکن قدیم زمانے میں جب کہ سواری اور جنگی ضرورت کیلئے گھوڑے استعمال

Marfat.com

ہوتے تھے، حکومتوں کے پاس ہزاروں سے بھی شاید متجاوز گھوڑے ہوتے تھے، جن کے چرنے کیلئے حکومتوں کو بہت بڑی بڑی چراگاہیں مخصوص کرنا پڑتی تھیں۔ چنانچہ ایسی ہی چراگاہوں کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اس کی حفاظت کیلئے اس کے اردگرد باڑھ لگائی جاتی ہے"۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا کوئی جانور اچھل کر اور پھلانگتے ہوئے باڑھ میں داخل نہ ہو تاکہ تم حکومت کے مجرم نہ ٹھہرو تو ضروری ہے کہ اپنے جانوروں کو باڑھ کے قریب نہ آنے دو۔ اگر انہوں نے باڑھ کو چرنا شروع کر دیا تو اندیشہ ہے کہ کسی وقت بھی باڑھ پھلانگ کر چراگاہ کے اندر داخل ہو جائیں۔ فرمایا کہ اسی طرح تمہارے پروردگار کی حرام کردہ چیزیں یہ اللہ تعالیٰ کی وہ چراگاہ ہے، جس میں تمہیں داخل ہونے سے روک دیا گیا ہے۔ پھر اس کی حفاظت کیلئے اردگرد مشتبہ یعنی مکروہ چیزوں کی باڑھ لگائی گئی ہے۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے نفس کا شریر جانور اللہ کی اس چراگاہ میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرے تو ضروری ہے کہ اسے اس باڑھ سے دور رکھو۔ اگر اس نے اس باڑھ کو منہ مارنا شروع کر دیا تو وہ ضرور کسی وقت اس چراگاہ میں بھی داخل ہو جائے گا"۔

آیتِ کریمہ کے اس حصے میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ محرماتِ شرعیہ سے اپنے آپ کو بچاؤ اور ان کا احترام کرو کیونکہ یہ اللہ کی قائم کردہ وہ حدود ہیں جنہیں لانگنے کی کسی صورت اجازت نہیں ہے۔

3- تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے ان حلال نعمتوں کے استعمال میں اسراف اور افراط سے کام لیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کیلئے دو چیزیں درکار ہیں۔ ایک ہے انسانی ضرورتیں، جن کے بغیر انسانی زندگی گزارنا محال ہے۔ دوسرے ہیں انسانی زندگی کے مقاصد، جن کو سمجھے بغیر انسانی زندگی بے سمت اور بے جہت رہتی ہے اور انسان انسان ہوتے ہوئے بھی، انسانیت سے محروم رہتا ہے۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ انسانی زندگی کی تین بنیادی ضرورتیں ہیں۔

I:- غذا، اس کے بغیر کسی بھی انسان کا زندہ رہنا، پروان چڑھنا اور زندگی کے مسائل کا سامنا کرنا، ناممکن ہے۔

II:- راحت و آرام، کوئی بھی آدمی مسلسل کام کرنے کے قابل نہیں ہوتا، ایک خاص حد تک پہنچ کر وہ تھکاوٹ کا شکار ہوتا ہے اور جب تک آرام نہیں کرتا اس کی قوتِ کارکردگی بحال نہیں ہوتی۔ اس لئے انسانی زندگی کو رواں دواں اور مصروفِ عمل رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ ہر انسان کو سونے اور آرام کرنے کا موقع ملے۔

III:- جنسی ضرورت یا جنسی آسودگی۔ بقائے انسانی اور قافلۂ انسانی کو آگے بڑھانے کیلئے یہ بات انتہائی لازمی ہے کہ ہر آدمی کو جنسی آسودگی میسر آئے۔ اس کی جنسی قوت کو صحیح راستہ ملے تاکہ وہ اس راستے پر چلتے ہوئے حدود میں رہ کر بقائے نسل انسانی کا باعث بنے۔

یہ تینوں وہ بنیادی انسانی ضرورتیں ہیں جن سے کسی طور پر صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اور انسان کی قوت کا اصل راز بھی انہی میں مضمر ہے۔ ان تینوں میں سے اگر ایک چیز بھی انسان کو نہ ملے تو وہ کبھی انسانی زندگی گزارنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہی تینوں ضرورتیں انسان کی کمزوریاں بھی ہیں اور اس کی تباہی کا سبب بھی۔ جو آدمی غذا کا اس طرح اسیر ہو کر رہ جائے کہ اسے کھانے پینے اور اسی کو ترقی دینے اور اسی میں نئے نئے تنوعات کو پیدا کرنے کے سوا کسی چیز کا ہوش نہ رہے تو ایسا آدمی بندۂ شکم تو کہلا سکتا ہے، اسے انسان کہنا بہت مشکل ہے۔ اسی طرح جو آدمی صرف راحت و آرام کو زندگی کا ہدف سمجھ لے اور اسی کے حصول کیلئے تمام اسباب و ذرائع کو صرف کر ڈالے تو ایسا آدمی آدمی تو کہلا سکتا ہے، لیکن اسے کارآمد آدمی کہنا بہت مشکل ہے، وہ انسانی قافلے کا شریک نہیں بلکہ دھرتی کا بوجھ ہے، جو انسان کیلئے باعث عار ہے۔ اسی طرح کوئی آدمی اگر صرف جنسی تلذذ ہی کو مقصود بنا لے اور ہر وقت اسی کے اسباب فراہم کرنے میں لگا رہے تو وہ بلیوں اور کتوں کی سطح پر حیوانی زندگی تو گزار سکتا ہے، اسے ایک مہذب انسان قرار

Marfat.com

دینا خود انسانیت کی توہین ہے۔

ان تینوں حوالوں سے جو میں نے ذکر کیے ہیں' آپ نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ بنیادی بات جو میں کہنا چاہتا ہوں' وہ یہ ہے کہ ان تینوں حوالوں میں جو خرابی پیدا ہوئی باوجود اس کے کہ یہ ہماری ضرورتیں ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے ان ضرورتوں کو ضرورتوں کے مقام سے اٹھا کر مقاصد کے مقام پر فائز کر دیا ہے۔ نتیجہ اس کا واضح ہے کہ یہ ضرورتیں انسانی ترقی اور قوت کا سامان بننے کی بجائے انسان کی ہلاکت و بربادی کا سبب بن گئیں۔ اقبال نے شاید اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

ضرورت اور مقصد کے تعلق کو مزید واضح کرنے اور سہل بنانے کیلئے میں ایک اور مثال عرض کرتا ہوں۔ ایک غریب اور خود دار آدمی نے اپنے بیٹے کو کالج داخل کرایا۔ کالج چونکہ گھر سے دور تھا تو اس نے بہت ہمت کر کے اس کو نئی سائیکل خرید کر دی۔ بیٹا جب سائیکل پر سوار ہو کر خوش خوش کالج پہنچا تو یہ دیکھ کر اسے پریشانی نے آ پکڑا کہ کالج میں آنے والا ہر لڑکا یا تو موٹر سائیکل پر سوار ہے یا کار پر۔ اسے شرم آئی کہ کیا میں کالج اپنے کلاس فیلوز کے سامنے سائیکل پر چڑھ کر آؤں گا۔ یہ لوگ مجھے سائیکل پر دیکھ کر یقیناً میری غربت کا مذاق اڑائیں گے۔ اس نے جا کر اپنے والد سے کہا کہ ابا جان میں کل سے کالج نہیں جاؤں گا۔ باپ نے حیران ہو کر پوچھا کیوں؟ کہنے لگا وہاں کوئی بھی سائیکل پر نہیں آتا۔ مجھے سائیکل پر جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ باپ نے بیٹے کو پاس بٹھایا اور سمجھاتے ہوئے کہا کہ بیٹا کالج میں جانے کا ایک مقصد ہے اور وہ ہے علم کا حصول اور وہاں جانے کیلئے سواری ایک ضرورت ہے اور وہ کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ تمہارا باپ چونکہ تمہیں سائیکل سے بہتر کوئی اور سواری خرید کر نہیں دے سکتا تو تمہیں اپنی ضرورت کو سائیکل سے ہی پورا کرنا چاہئے اور اگر تم ضرورت کی وجہ سے کالج جانا چھوڑ دو گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنے مقصد کو اس ضرورت پر قربان کر دیا حالانکہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ ضرورتیں ہمیشہ مقاصد پر قربان ہوتی ہیں۔ مقاصد کبھی ضرورتوں پر قربان نہیں ہوتے۔ تمہیں تو سائیکل مل گئی' اگر تمہیں پیدل بھی جانا پڑتا تو تمہیں مقصد کے حصول کیلئے جانا چاہئے تھا۔

یہاں یہی بات ارشاد فرمائی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت سی حلال نعمتیں عطا فرمائی ہیں' لیکن دیکھنا ان نعمتوں میں حد سے نہ گزر جانا' یعنی ان نعمتوں کو ضرورتیں سمجھنا اور ان کو مقصد کے حصول کیلئے ہمیشہ بروئے کار لانا اور اگر ضرورت پڑے تو انہیں مقصد پر قربان کر دینا' لیکن تمہارا اصل ہدف تمہارے مقاصد ہیں' ان میں اعلیٰ تر مقصد ایسی زندگی گزارنا ہے جس سے اللہ راضی ہو جائے۔ لیکن اگر تم نے ان نعمتوں ہی کو اپنا مقصد اور ہدف سمجھ لیا تو تم مقصد سے محروم رہ جاؤ گے اور یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہرگز ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا کہ جو حلال نعمتوں کو حرام کریں یا حرام کو حلال کرنے کی جرأت کریں اور یا حلال نعمتوں میں اس حد تک اسراف اور افراط سے کام لیں کہ وہ ان کی زندگی کے مقاصد بن جائیں۔

ان تمام قباحتوں سے بچنے کیلئے تین چیزوں کی ضرورت ہے' جن کا ذکر اگلی آیت میں فرمایا گیا۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ انسان حلال نعمتوں کو حرام میں تبدیل کر کے برائی کا ارتکاب کرتا ہے' اس کا علاج کرتے ہوئے فرمایا: وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ''اللہ نے جو تمہیں حلال اور طیب نعمتیں بخشی ہیں' انہیں کھاؤ اور استعمال کرو۔ نیکی کے جذبے کو شریعت کی حدود میں محدود رکھو اور ان حدود سے تجاوز نہ کرو۔ دوسری خرابی یہ تھی کہ جن چیزوں کو اللہ کے حرام قرار دیا ہے' ان کو اپنے لئے حلال کر لیا جائے' اس کیلئے فرمایا وَاتَّقُوا اللهَ ''اور اللہ سے ڈرو' اور دیکھو اس کی حدود لانگنے کی کوشش نہ کرنا

Marfat.com

ورنہ تم اس کی گرفت سے بچ نہیں سکو گے۔

تیسری خرابی یہ تھی کہ خود حلال نعمتوں میں اسراف سے کام لے کران کو بجائے ضرورتوں کے مقاصد کا درجہ دے دیا جائے۔ فرمایا دیکھو تم مومن ہو اور مومن ہونے کے بعد تمہاری زندگی گزارنے کا ایک طریقہ بھی متعین کر دیا گیا ہے اور تمہاری زندگی کے مقاصد بھی طے کر دیئے گئے ہیں۔ اب تمہارے لئے عافیت کا راستہ یہ ہے کہ تم ضرورتوں کو ضرورتیں سمجھ کر اپنی تمام مساعی کو ان مقاصد کو بروئے کار لانے کیلئے صرف کر دو، جن کی آگہی تمہیں قرآن وسنت نے بخشی ہے۔

آیت:۸۹ لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْۤ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ ۚ فَکَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰکِیْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِیْکُمْ اَوْ کِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِکَ کَفَّارَةُ اَیْمَانِکُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْۤا اَیْمَانَکُمْ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۝ ''تمہاری قسموں میں جو غیر ارادی ہیں، ان پر تو اللہ تم سے مواخذہ نہیں کرے گا۔ لیکن جن قسموں کو تم نے پختہ کیا ہے، ان پر مواخذہ کرے گا۔ سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ اس معیار کا جو عام طور پر اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑا پہنانا یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ جو اس کی مقدرت نہ رکھتا ہو، وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جبکہ تم قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو، اس طرح اللہ تمہارے لئے اپنے احکام کی وضاحت کرتا ہے، تاکہ تم اسکے شکر گزار رہو''۔

سابقہ آیت کی تشریح کرتے ہوئے ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ بعض لوگ اللہ کی جائز اور حلال نعمتوں کو اپنے اوپر ممنوع قرار دیتے ہوئے قسم کھا لیتے تھے کہ آئندہ میں اس نعمت کا استعمال نہیں کروں گا تو اس کیلئے ضروری ٹھہرا کہ قسم کے بارے میں احکامات ذکر کر دیئے جائیں تاکہ لوگ اس بارے میں گمراہی کا شکار نہ ہوں اس لئے مختصراً یہ سمجھ لیا جائے کہ یمین (قسم) کی تین قسمیں ہیں۔

قسم کی تین اقسام

1 یمین لغو: اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ بلاوجہ ہر بات پر قسم کھاتے ہیں۔ یہ ان کا تکیہ کلام بن جاتا ہے۔ اسے یمین ''لغو'' کہا گیا ہے۔ یعنی یہ ایک فضول قسم ہے، جس کا کوئی مقصد نہیں۔ لیکن اس میں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی ایک عظمت ہے، لہٰذا بلاوجہ اللہ کا نام تکیۂ کلام کے طور پر استعمال کرنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ اس لئے اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی ماضی کے کسی واقعہ کے بارے میں قسم کھائے کہ یہ واقعہ اس طرح پیش آیا تھا اور سمجھتا ہو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بالکل سچ ہے اور واقعہ کے مطابق ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ واقعہ کے مطابق نہ ہو۔ اسے بھی یمین ''لغو'' کہتے ہیں۔ اس کا نہ کوئی کفارہ ہے اور نہ اس کا مواخذہ ہوگا۔ اس لئے کہ قسم کھانے والے نے نہ تو قصداً جھوٹ بولا ہے اور نہ اس نے کسی وعدے یا معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ کیونکہ یہ ماضی سے متعلق ہے۔

2- یمین کی دوسری قسم یمین ''غموس'' ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ فرض کریں ایک شخص نے کوئی کام کیا ہے اور وہ اچھی طرح جانتا ہے اور اسے یاد ہے کہ اس نے یہ کام کیا ہے اور پھر جان بوجھ کر قسم کھاتا ہے کہ میں نے یہ کام نہیں کیا۔ یہ جھوٹی قسم گناہ کبیرہ ہے اور دنیا و آخرت میں وبال کا باعث ہے اور ایسی قسم کھانے والے کو توبہ واستغفار کرنا چاہئے۔ البتہ! اس پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہے کیونکہ اس نے ماضی کے حوالے سے جھوٹ بولا ہے اور اس

Marfat.com

سے قسم ٹوٹنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یمین کی تیسری قسم یمین ''منعقدہ'' ہے کہ کوئی آدمی آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائے اسے یمین ''منعقدہ'' کہا جاتا ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اس قسم کو توڑنے کی صورت میں کفارہ واجب ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں اس پر گناہ بھی ہوتا ہے اور بعض میں نہیں ہوتا۔ اس آیت کریمہ کے پہلے حصے میں تو یمین ''لغو'' کا ذکر ہے' جس کے بارے میں فرمایا کہ اس پر اللہ تم سے مواخذہ نہیں کرے گا اور آیت کے دوسرے حصے میں یمین ''منعقدہ'' مراد ہے کیونکہ اس میں بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ سے اسی کی طرف اشارہ ہے۔

قسم کا کفارہ

اگر کوئی آدمی یمین منعقدہ کھاتا ہے اور پھر اسے توڑ دیتا ہے اب ظاہر ہے کہ اس پر کفارہ لازم آئے گا۔ آیت کے بقیہ حصہ میں کفارے کے مسائل بیان کئے گئے ارشاد فرمایا:

فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ط فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ط ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ط

﴿سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے اس معیار کا جو تم عام طور پر اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑا پہنانا یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے جو اس کی مقدرت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جبکہ تم قسم کھا بیٹھو۔﴾

پیشتر اس کے کہ کفارے کے مسائل ذکر کئے جائیں ضروری معلوم ہوتا ہے بارِ دگر اس تصور کو دماغوں میں تازہ کر لیا جائے کہ کفارہ سے قسم توڑ دینے کے گناہ کا ازالہ نہیں ہوتا۔ یہ تو صرف تنبیہ کا ایک انداز ہے کیونکہ جو آدمی قسم توڑتا ہے کفارہ ادا کرنے سے اسے کسی نہ کسی حد تک احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ میں نے غلط کام کیا ہے' جس کا میں جرمانہ ادا کر رہا ہوں۔ لیکن جہاں تک گناہ کا تعلق ہے' اس کی معافی تو صرف استغفار سے ہوتی ہے۔ اس لئے قسم توڑنے والے کو کفارے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ استغفار کرنا چاہئے اور آئندہ کیلئے یہ عہد کرنا چاہئے کہ دوبارہ میں یہ غلطی نہیں کروں گا۔

کفارے کے ساتھ اگر استغفار کا تصور باقی نہ رہے تو پھر دولت مندوں کے حوالے سے یہ اندیشہ پریشان کن صورت اختیار کر سکتا ہے کہ وہ نہایت جسارت کے ساتھ قسمیں توڑیں کیونکہ دس آدمیوں کو کھانا کھلا دینا' جن کے گھروں میں دس دس نوکر کام کر رہے ہوں کیا مشکل کام ہے۔ اس لئے وہ نہایت لاپرواہی سے قسمیں توڑیں گے اور کفارہ ادا کر کے اس سے عہدہ برآ ہو جائیں گے۔ اس لئے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ کفارہ قسم توڑنے کی تلافی اسی صورت میں بن سکتا ہے' جب اس کے ساتھ اس گناہ پر ندامت کا تصور بھی موجود ہو اور اس پر معافی مانگنے کی بے چینی بھی ساتھ ہو۔

قسم توڑنے کے کفارے کی تین صورتیں ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

(1) ''دس مسکینوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا''۔ یعنی جس طرح کا عام طور پر کھانا آپ کے گھر میں روزانہ کھایا جاتا ہے' اس کی ایک اوسط نکال لی جائے۔ مثلاً گھر میں گوشت پکتا ہے' کبھی سبزی اور کبھی دال پکتی ہے۔ اس کی اوسط یہ ہے کہ دس مسکینوں کو ایک وقت میں دال کھلا دی جائے اور دوسرے وقت میں سبزی گوشت سے تواضع کی جائے کیونکہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانے سے مراد دو وقت کھانا کھلانا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھی جائے کہ ''اطعام'' کا معنی عربی لغت میں کھانا کھلانے کے بھی آتے ہیں اور کسی کو کھانا دے دینے کے بھی۔ اس لئے کفارہ دینے والے کو دونوں باتوں کا اختیار ہے کہ دس مسکینوں کو گھر بلا کر کھانا کھلا دے یا کھانا ان کی ملکیت میں دے دے۔ فقہاء کے نزدیک ایک مسکین کا کھانا' ایک آدمی کے فطرانہ کے

Marfat.com

برابر ہے یعنی پونے دو سیر گیہوں یا اس کی قیمت۔

(2) دوسری صورت یہ ہے کہ ''دس مسکینوں کو کپڑے دے دیئے جائیں''۔ یہاں ''کسوۃ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے' جس کا معنی پہناوا ہے' لباس نہیں۔ اس لئے ان کو جو کپڑے دیئے جائیں' ضروری نہیں کہ ان کی تن پوشی کیلئے کافی ہوں بلکہ صرف اتنے کپڑے جن سے ستر پوشی ہو سکے' وہ کافی ہیں اور کپڑا بھی ایسا ہونا چاہئے جو عام درجے کا آدمی پہنتا ہو۔

(3) تیسری صورت یہ ہے کہ ''غلام آزاد کیا جائے''۔ لیکن اب چونکہ غلامی کا رواج ختم ہو گیا ہے' اس لئے اب تیسری صورت یہ ہے کہ اگر کھلانے اور کپڑے پہنانے پر قسم توڑنے والا قادر نہیں تو پھر اسے تین روزے رکھنے چاہئیں۔ ان تینوں صورتوں میں سے کسی بھی ایک صورت پر عمل کرنے کا قسم توڑنے والے کو اختیار ہے۔

یہ کفارہ کی ادائیگی اس وقت ہوگی' جب قسم کھانے والا قسم توڑ دے گا۔ یعنی اپنی قسم کی خلاف ورزی کرے گا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قسم توڑنے سے پہلے بھی کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے' یہ بڑی کمزور بات ہے۔ اس لئے کہ کفارہ ایک غلطی کا جرمانہ ہے اور جب تک اس غلطی کا ارتکاب نہیں ہو جاتا جرمانے کی ادائیگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح نماز کا وقت آنے یا نماز فرض ہونے سے پہلے نماز ادا نہیں کی جا سکتی یا ماہ رمضان آنے سے پہلے روزے نہیں رکھے جا سکتے' اسی طرح قسم ٹوٹنے سے پہلے کفارہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔

وَاحۡفَظُوۡۤا اَيۡمَانَكُمۡ ﴿اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔﴾

اس کے کئی مفہوم ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب تک قسم کی شدید ضرورت نہ ہو اس وقت تک قسم نہ اٹھائی جائے کیونکہ قسم میں اللہ کا نام آتا ہے۔ اس کے سوا کسی اور نام کی قسم نہیں ہوتی۔ بے ضرورت اگر اس کا نام استعمال کیا جائے تو اس کے نام کی قدر و قیمت دلوں سے جاتی رہے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ قسم' قول و قرار' شہادت اور عہد و پیمان کی بنیاد ہے اور عہد و پیمان نہ صرف تمام معاشرتی' اجتماعی اور سیاسی حقوق فرائض کی اساس ہے بلکہ اس عہد و میثاق کی بھی اساس ہے جو ہم نے اپنے رب کے ساتھ باندھا تھا۔ اس لئے ضروری ہے کہ آدمی قسم کے معاملے میں نہایت محتاط رہے اور اگر یہ احتیاط کا دامن بار بار ہاتھ سے چھوٹنے کی وجہ سے ایک عادت سی بن جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قسم کا آدمی نہ معاشرے کی ذمہ داریوں کا اہل رہے گا' نہ میثاقِ الٰہی کی ذمہ داریوں کا۔

اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ قسم کو صحیح مصرف میں استعمال کیا جائے' فضول باتوں اور معصیت کے کاموں میں استعمال نہ کیا جائے۔

تیسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ جب کسی بات پر آدمی قسم کھا لے تو اسے یاد رکھے' ایسا نہ ہو کہ اپنی غفلت کی وجہ سے اسے بھول جائے اور پھر اس کی خلاف ورزی کر گزرے اور آخری مفہوم یہ ہے کہ جب کسی صحیح معاملہ میں بلا ارادہ قسم کھائی جائے تو اسے پورا کیا جائے اور اگر اس کی خلاف ورزی ہو جائے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿اسی طرح اللہ اپنے احکام تمہارے لئے واضح کرتا ہے تا کہ تم شکر ادا کرو﴾

اس آیت میں یہ اشارہ موجود ہے کہ یہ توضیحی آیات ہیں' جو بعد میں پیدا ہونے والے سوالات کے جواب میں نازل ہوئیں۔ انسانوں کو احکام شریعت کا ملنا اور زندگی کی راہنمائی کیلئے کتاب اور نبوت کے ذریعے زندگی کے ہر موڑ پر ہدایت اور روشنی کا عطا ہونا' یہ بجائے خود اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اگر ان احکام شریعت میں کسی اجمال یا ابہام کے باعث کسی وضاحت کی ضرورت ہو اور وہ وضاحت طلب کرنے پر یا بے طلب اللہ کی طرف

Marfat.com

سے نازل ہو جائے تو یہ مزید اس کا فضل و احسان ہے اور پھر اس توضیح میں اگر بندوں کیلئے سہولت کے بھی بہت سے پہلو ملحوظ ہوں جیسا کہ غیر ارادی قسموں اور کفارہ کے معاملہ میں یہاں ملحوظ ہیں تو گویا احسان کے گونا گوں پہلو جمع ہو گئے۔ اس کا فطری تقاضا یہی ہو سکتا ہے کہ بندے اپنے پروردگار کے زیادہ سے زیادہ شکر گزار بنیں اور اگر اس ساری توضیح و تفصیل کے بعد بھی اس نعمت کی قدر نہ کی تو یہ انتہائی ناشکری ہوگی اور کفران نعمت ہوگا۔

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا کہ یہ آخری چند رکوع توضیحی آیات پر مشتمل ہیں' جن میں سے کچھ سابقہ احکام کی تکمیل پر مشتمل ہیں اور کچھ سوالات کے جوابات ہیں۔ اگلی آیات کریمہ میں بھی انہیں دونوں ضرورتوں کو پورا کیا گیا ہے۔

آیت:۹۰ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ O ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہ شراب اور جوا' یہ آستانے اور پانسے' یہ سب گندے شیطانی کام ہیں' ان سے پرہیز کرو امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی''۔

اس آیت کریمہ میں چار چیزیں قطعی حرام کی گئی ہیں۔ ایک شراب' دوسرا قمار بازی' تیسرے وہ مقامات جو خدا کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرنے یا اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر قربانی اور نذر و نیاز چڑھانے کیلئے مخصوص کیے گئے ہوں اور چوتھے پانسے۔ اب تھوڑی سی ترتیب بدل کر ان تمام کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

حرمتِ شراب

شراب کی حرمت کے سلسلے میں اس سے پہلے دو حکم آ چکے تھے۔ ایک سورۃ البقرۃ آیت 219 میں' جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ

﴿اے پیغمبر ﷺ! لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں' آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے' لیکن کچھ فائدے بھی ہیں اور گناہ ان دونوں کا ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔﴾

پھر سورۃ النساء آیت 43 میں ارشاد ہوا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

﴿اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نماز کے قریب مت جاؤ جب کہ تم نشے کی حالت میں ہو تاوقتیکہ (تم نشہ اترنے کے بعد) یہ نہ سمجھنے لگو کہ نماز میں کیا کہہ رہے ہو﴾

ان دونوں آیتوں میں شراب کی مذمت اور قباحت کا ذکر ضرور موجود ہے' لیکن اس کی حرمت کا ذکر نہیں اور مسلمانوں کو اس کے پینے سے منع نہیں کیا گیا۔ محتاط صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم نے تو ان کے نزول پر ہی شراب سے تعلق توڑ لیا۔ لیکن بہت سی طبیعتیں اس کی کراہت کو محسوس کرتے ہوئے بھی اس سے ترکِ تعلق نہ کر سکیں کیونکہ اللہ نے اسے واضح طور پر حرام قرار نہیں دیا تھا' اس لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت کے اترنے پر اللہ کی بارگاہ میں درخواست کی:

ربنا انزل علینا بیاناً شافیاً ﴿اے اللہ! ہم پر واضح حکم نازل فرما﴾

چنانچہ اس دعا اور سوال کے جواب میں اور مسلمانوں کی عام ضرورت کے حوالے سے پہلی آیات کی تکمیل کے طور پر یہ آیات کریمہ نازل

Marfat.com

ہوئیں، جن میں شراب کو قطعی طور پر حرام قرار دے دیا گیا۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری حکم کے آنے سے پہلے نبی کریم ﷺ نے ایک خطبہ میں لوگوں کو متنبہ فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ کو شراب سخت ناپسند ہے، بعید نہیں کہ اس کی قطعی حرمت کا حکم آ جائے۔ لہٰذا جن لوگوں کے پاس شراب موجود ہو وہ اسے فروخت کر دیں۔ اس کے کچھ مدت بعد یہ آیت نازل ہوئی اور آپ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ "اب جن کے پاس شراب ہے وہ نہ اسے پی سکتے ہیں نہ بیچ سکتے ہیں، بلکہ وہ اسے ضائع کر دیں"۔ چنانچہ اسی وقت مدینہ کی گلیوں میں شراب بہادی گئی۔ بعض لوگوں نے پوچھا: ہم یہودیوں کو تحفۃً کیوں نہ دے دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "جس نے یہ چیز حرام کی ہے اس نے اسے تحفۃً دینے سے بھی منع کر دیا ہے"۔ بعض لوگوں نے پوچھا: ہم شراب کو سر کے میں کیوں تبدیل کر دیں؟ آپ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا اور حکم دیا کہ "نہیں، اسے بہا دو"۔ ایک صاحب نے باصرار دریافت کیا کہ دوا کے طور پر استعمال کی تو اجازت ہے؟ فرمایا: "نہیں، یہ دوا نہیں ہے، بلکہ بیماری ہے"۔ ایک اور صاحب نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہم ایک ایسے علاقے کے رہنے والے ہیں جو نہایت سرد ہے اور ہمیں محنت بھی بہت کرنی پڑتی ہے۔ ہم لوگ شراب سے تکان اور سردی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: جو چیز تم پیتے ہو نشہ کرتی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں۔ فرمایا: تو اس سے پرہیز کرو۔ انہوں نے عرض کیا: مگر ہمارے علاقے کے لوگ تو نہیں مانیں گے۔ فرمایا: اگر وہ نہ مانیں تو ان سے جنگ کرو۔

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

لعَن اللّٰہ الخمر وشاربھا و ساقیھا وبائعھا ومُبتاعھا وعاصرھا ومعتصرھا وحاملھا والمحمولۃ الیہ

﴿اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے، شراب پر اور اسکے پینے والے پر اور پلانے والے پر اور بیچنے والے پر اور خریدنے والے پر اور کشید کرنے والے پر اور کشید کرانے والے پر اور ڈھو کر لے جانے والے پر اور اس شخص پر جس کیلئے وہ ڈھو کر لے جائی گئی ہو۔﴾

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے اس دسترخوان پر کھانا کھانے سے منع فرمایا، جس پر شراب پی جا رہی ہو۔ ابتداءً آپ ﷺ نے ان برتنوں تک کے استعمال کو منع فرمادیا تھا جن میں شراب بنائی اور پی جاتی تھی۔ بعد میں جب شراب کی حرمت کا حکم پوری طرح نافذ ہو گیا، تب آپ ﷺ نے برتنوں پر سے یہ قید اٹھالی۔

خمر کا لفظ عرب میں انگوری شراب کیلئے استعمال ہوتا تھا اور مجازاً گیہوں، جو، کشمش، کھجور اور شہد کی شرابوں کیلئے بھی یہ لفظ بولتے تھے۔ مگر نبی ﷺ نے حرمت کے اس حکم کو تمام ان چیزوں پر عام قرار دیا، جو نشہ پیدا کرنے والی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں حضور ﷺ کے یہ واضح ارشادات ہمیں ملتے ہیں کہ

کل مسکر خمر و کل مسکر حرام ﴿ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔﴾

کل شراب اسکر فھو حرام ﴿ہر وہ مشروب جو نشہ پیدا کرے، حرام ہے۔﴾

وانا انھی عن کل مسکر ﴿اور میں ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں۔﴾

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جمعہ کے خطبہ میں شراب کی یہ تعریف بیان کی تھی کہ

الخمر ما خامر العقل ﴿خمر سے مراد ہر وہ چیز ہے، جو عقل کو ڈھانک لے۔﴾

نیز نبی ﷺ نے یہ اصول بھی بیان فرمایا کہ:

Marfat.com

ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام ﴿جس چیز کی کثیر مقدار نشہ پیدا کرے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔﴾ اور

ما اسکر الفرق منہ فملُ الکف منہ حرام ﴿جس چیز کا ایک پورا قرابہ نشہ پیدا کرتا ہو اس کا ایک چلو پینا بھی حرام ہے۔﴾

شریعت کی رو سے یہ بات حکومت اسلامی کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ شراب کی بندش کے اس حکم کو بزور وقوت نافذ کرے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بنی ثقیف کے ایک رویشد نامی شخص کی دکان اس بنا پر جلوا دی گئی تھی کہ وہ خفیہ طور پر شراب بیچتا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر ایک پورا گاؤں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم سے اس قصور پر جلا ڈالا گیا کہ وہاں خفیہ طریقہ سے شراب کی کشید اور فروخت کا کام ہو رہا تھا۔

جوا' قمار اور ازلام کی حرمت

دوسری چیز جس کو حرام کیا ہے' وہ میسر ہے اس کا معنی ہے جوا اور قمار۔ شراب اور جوا یہ دونوں جڑواں بیماریاں ہیں۔ کم از کم عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں اس کی حیثیت یہی تھی۔ اس لئے قرآن کریم بالعموم خمر اور میسر کو ایک ساتھ ذکر کرتا ہے۔ قحط سالی اور تنگدستی کے دنوں میں عرب شراب نوشی کی محفلیں منعقد کرتے تھے' پھر شراب کے نشے میں دھت ہو جانے کے بعد جس کا اونٹ چاہتے' ذبح کر دیتے۔ مالک کو منہ مانگے دام دے کر راضی کر لیتے' پھر اس کے گوشت پر جوا کھیلتے' گوشت کی جو ڈھیریاں جیتتے جاتے' ان کو بھونتے' کھاتے' کھلاتے اور شراب پیتے اور بعض اوقات اس شغل بدمستی میں ایسے ایسے جھگڑے کھڑے کر دیتے کہ قبیلے کے قبیلے برسوں کیلئے آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے اور سینکڑوں جانیں اس کی نذر ہو جاتیں۔ انہی دونوں برائیوں کے نتیجے میں عموماً گھر اجڑتے' حتیٰ کہ بستیاں تک ویران ہو جاتیں۔

اس کے بعد چوتھی چیز جو حرام کی گئی ہے' چونکہ اس کا تعلق بھی میسر سے ہے' اس لئے ہم اس کا ذکر اس کے ساتھ ہی کئے دیتے ہیں۔ وہ چوتھی چیز ہے ازلام' یہ زلم کی جمع ہے۔ ازلام ان تیروں کو کہا جاتا ہے جن پر قرعہ اندازی کر کے عرب میں جوا کھیلنے کی رسم جاری تھی' جس کی صورت یہ تھی کہ دس آدمی شرکت میں ایک اونٹ ذبح کرتے تھے' پھر اس کا گوشت تقسیم کرنے کیلئے بجائے اس کے کہ دس حصے برابر کر کے تقسیم کرتے' اس میں اس طرح جوا کھیلتے کہ دس عدد تیروں میں سات تیروں پر کچھ مقررہ حصوں کے کچھ نشانات بنا رکھتے تھے کسی پر ایک' کسی پر دو یا تین اور تین تیروں کو سادہ رکھا ہوا تھا۔ ان تیروں کو ترکش میں ڈال کر ہلاتے تھے پھر ایک ایک شریک کیلئے ایک ایک تیر ترکش میں سے نکالتے اور جتنے حصوں کا تیر کسی کے نام پر نکل آتا' وہ ان حصوں کا مستحق سمجھا جاتا اور جس کے نام پر سادہ تیر نکل آئے' وہ حصہ سے محروم رہتا تھا۔ جیسے آج کل بہت سی قسمیں لاٹری کے طور پر بازاروں میں جاری ہیں' اس طرح کی قرعہ اندازی قمار یعنی جوا ہے' جو از روئے قرآن حرام ہے۔

ان ازلام یعنی تیروں کو جس طرح جوئے کیلئے استعمال کیا جاتا تھا' اسی طرح مشرکانہ فال گیری کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا' جس میں کسی دیوی یا دیوتا سے قسمت کا حال پوچھا جاتا تھا یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی تھی یا باہمی نزاعات کا تصفیہ کرایا جاتا تھا۔ مشرکین مکہ نے اس غرض کیلئے کعبہ کے اندر ہبل دیوتا کے بت کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے استھان میں سات تیر رکھے ہوئے تھے۔ ان پر مختلف الفاظ اور فقرے کندہ تھے۔ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو یا کھوئی ہوئی چیز کا پتہ پوچھنا ہو یا اونٹ کے مقدمہ کا فیصلہ مطلوب ہو۔ غرض کوئی کام بھی ہو' اس کیلئے ہبل کے پانسہ دار کے پاس پہنچ جاتے۔ اس کا نذرانہ پیش کرتے اور ہبل سے دعا مانگتے کہ ہمارے اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔ پھر پانسہ داران تیروں کے ذریعے سے فال نکالتا اور جو تیر بھی فال سے نکل آتا' اس پر لکھے ہوئے لفظ کو ہبل کا فیصلہ سمجھا جاتا۔ اس تفصیل سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ازلام جوئے ہی کی ایک دوسری صورت کا نام ہے۔ البتہ! اس میں وسعت یہ ہے کہ ان کا استعمال عرب قرعہ اندازی کی شکل میں صرف معاملات میں ہی نہیں کرتے تھے بلکہ قسمت کا حال معلوم

Marfat.com

کرنے کیلئے بھی ان کو استعمال کیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بت پرستی کو بھی مستحکم کیا جاتا اور ہبل کی عزت وعظمت میں اضافہ کیا جاتا تھا۔

اسلام نے میسر اور ازلام کو حرام کر کے جہاں ایک طرف بت پرستی کے واسطے سے بننے والے اتفاقی عوامل کا خاتمہ کیا' وہیں جوئے کی قسم کے وہ سارے کھیل اور کام (بھی ممنوع قرار دیئے) جن میں اشیاء کی تقسیم کا مدار حقوق اور خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھنے کی بجائے محض کسی اتفاقی امر پر رکھ دیا جائے۔ مثلاً یہ کہ لاٹری میں اتفاقاً فلاں شخص کا نام نکل آیا ہے' لہٰذا ہزار ہا آدمیوں کی جیب سے نکلا ہوا روپیہ اس ایک شخص کی جیب میں چلا جائے۔ یا یہ کہ علمی حیثیت سے تو ایک معمہ کے بہت سے حل صحیح ہیں' مگر انعام وہ شخص پائے گا جس کا حل کسی معقول کوشش کی بناء پر نہیں بلکہ محض اتفاق سے اس حل کے مطابق نکل آیا ہو جو صاحب معمہ کے صندوق میں بند ہے۔

ان تین اقسام کو حرام کر دینے کے بعد قرعہ اندازی کی صرف وہ سادہ صورت اسلام میں جائز رکھی گئی ہے' جس میں دو برابر کے جائز کاموں یا دو برابر حصوں کے حقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو۔ مثلاً ایک چیز پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے اور فیصلہ کرنے والے کیلئے ان میں سے کسی کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے اور خود ان دونوں میں سے بھی کوئی اپنا حق خود چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ اس صورت میں ان کی رضامندی سے قرعہ اندازی پر فیصلہ کا مدار رکھا جا سکتا ہے۔ یا مثلاً دو کام یکساں درست ہیں اور عقلی حیثیت سے آدمی ان دونوں کے درمیان مذبذب ہو گیا ہے کہ ان میں سے کس کو اختیار کرے؟ اس صورت میں ضرورت ہو تو قرعہ اندازی کی جا سکتی ہے۔ نبی ﷺ بالعموم ایسے مواقع پر یہ طریقہ اختیار فرماتے تھے جبکہ دو برابر کے حق داروں کے درمیان ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آ جاتی تھی اور آپ ﷺ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آپ ﷺ خود ایک کو ترجیح دیں گے تو دوسرے کو ملال ہو گا۔

آستانہ کی حرمت

درمیان میں تیسری چیز جس کو حرام کیا گیا ہے وہ ہے نصب۔ جس سے مراد وہ سب مقامات ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کیلئے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو' خواہ وہاں پتھر یا لکڑی کی کوئی مورت ہو یا نہ ہو۔ ہماری زبان میں اس کا ہم معنی لفظ آستانہ یا استھان ہے' جو کسی بزرگ یا دیوتا سے یا کسی خاص مشرکانہ اعتقاد سے وابستہ ہو۔ عرب میں ایسے تھان یا استھان بے شمار تھے' جہاں دیویوں' دیوتاؤں اور جنوں کی خوشنودی کیلئے قربانیاں کی جاتی تھیں۔ مسلمان جو عقیدہ توحید کے آج سب سے بڑے علم بردار ہیں' افسوس کی بات یہ ہے کہ ان میں بھی اس طرح کی بیہودہ حرکتیں ہوتی ہیں' جن کا تعلق عرب کی جاہلیت کی اسی رسم سے معلوم ہوتا ہے۔ بعض جگہ جنوں کے نام سے اور بعض جگہ بزرگوں کے نام سے' ایسی ایسی خرافات کی جاتی ہیں' جنہیں دیکھ کر کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ یہ امت محمدیہ ﷺ کے افراد ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان چاروں چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد انہیں نجس شیطانی کاموں میں سے قرار دیا یعنی یہ شیطان کی ایجادات اور کارستانیوں میں سے ہیں۔ یہ حربے اس نے اس لئے ایجاد کئے تھے کہ بنی آدم کو شریعت کی صراطِ مستقیم سے بھٹکانے کا جو عہد اس نے کر رکھا ہے' اسے پورا کر سکے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ جہاں جہاں بھی ان چاروں حرام کردہ چیزوں میں سے کسی ایک کے چلن کو بھی عام کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے' وہیں شرعی احکام کی بالادستی ختم ہونے لگتی ہے اور لوگ اسلامی زندگی سے رفتہ رفتہ غیر اسلامی زندگی کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں معاشرت اور اخوت کی بنیادیں بری طرح سے شکست و ریخت کا شکار ہونے لگتی ہیں۔

آیت:۹۱ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْ

Marfat.com

اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ ۚ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ ۝ ''شیطان تو بس یہ چاہتا ہے کہ تمہیں شراب اور جوئے میں لگا کر تمہارے درمیان دشمنی اور کینہ ڈالے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روکے' تو بتاؤ! کیا اب تم ان سے باز آتے ہو؟''۔

شراب اور جوئے کے تین یقینی نتائج

شراب اور جواء یوں تو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ہر سطح پر تباہ کن برائیاں ہیں' لیکن ان کی اصل تباہی یا وسیع تر تباہی اس وقت شروع ہوتی ہے' جب کسی معاشرے میں ان کے ساتھ اشتغال اور انہماک بڑھتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ کہہ کر اسی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ شیطان ان برائیوں میں محدود سطح پر معاشرے کے آلودہ ہونے سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ پوری طرح معاشرے کو ان برائیوں میں ڈبو دیا جائے اور جب یہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس کے تین نتائج نکلتے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ شیطان یہ تین نتائج پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں ان تینوں باتوں کو بیان فرمایا گیا ہے:

ایک یہ کہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ تمہارے اندر عداوت اور بغض پیدا کر دے۔

دوسری یہ بات کہ تمہیں ذکر اللہ سے روکے۔

تیسری یہ بات کہ تمہارا تعلق نماز سے توڑ دے۔

اگر تھوڑا سا تدبر کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی تمام تر قوت انہی تینوں باتوں میں مضمر ہے کیونکہ اگر اس میں بغض اور عداوت پیدا ہو جائے تو معاشرہ کھیل کھیل ہو جاتا ہے اور اسلامی اخوت جو مسلمانوں میں اللہ کا خاص کرم ہے' وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اسلامی معاشرے کی تمام تر مضبوطی اور اس کے سمت سفر کا تعین اس کا دارومدار اللہ کی یاد کے باقی رہنے پر ہے اور یاد کی عملی شکل اور اس کی ابتدائی اور آخری صورت نماز ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی معاشرے کا ان تینوں قوتوں سے بے بہرہ ہو جانا' یہ مسلمانوں کیلئے قیامت سے پہلے قیامت ہے۔ اس لئے ہمیں اس پر تھوڑا سا غور کرنا ہے کہ شراب اور جوئے سے یہ تینوں برائیاں کس طرح پیدا ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے شراب کو لیجئے۔ جس قوم کی مجلسی زندگی میں شراب داخل ہو جاتی ہے اس کا سب سے پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ جب مختلف تقریبات میں شریک ہونے والے مل جل کے شراب پیتے ہیں تو ان میں سے اکثر شراب کے زیر اثر ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ پھر ان کے سفلی جذبات کے تحت جو کچھ ان کے دماغ میں ہوتا ہے' وہ زبانوں پر آتا ہے اور عزتیں پامال ہونے لگتی ہیں۔ لہٰذا عموماً اسی مجلس کے شرکاء میں سے کوئی ایک اٹھتا ہے تو دوسرے شریک مجلس کی بیٹی' بہن یا بیوی کے بارے میں عشق کا اظہار کرنا شروع کر دیتا ہے اور جب نشہ آخری حدوں کو چھونے لگتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ خواتین کے گریبانوں تک مردوں کے ہاتھ پہنچنے لگتے ہیں۔ اب دو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہو کے رہتی ہے کہ اگر ان شرابیوں میں عفت و عصمت اور غیرت کی کوئی رمق بھی باقی ہے تو یقیناً جس کی بہن بیٹی یا بیوی کے بارے میں اس طرح کی بے حیائی کا اظہار ہو رہا ہے' وہ یقیناً اس پر ردعمل کا اظہار کرے گا' جس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے گریبانوں تک ہاتھ پہنچیں گے' مار کٹائی ہو گی اور کوئی بڑی بات نہیں کہ ان میں سے کئی ایک گھر جانے کی بجائے پولیس کے نرغے میں پہنچ جائیں۔ یہ صورت حال صرف ایک مفروضہ نہیں بلکہ وہ عرب جو قرآنِ کریم کے احکام کے براہِ راست مخاطب تھے' ان میں آئے دن اس طرح کے واقعات پیش آتے تھے۔ وہ ایک طرف تو شراب کے رسیا تھے اور دوسری طرف عفت کا احساس اور غیرت کا جذبہ بھی پوری طرح ان میں توانا تھا۔ اس لئے جب کوئی شرابی شراب کی ترنگ میں ان کی عزت سے کھیلنے لگتا تھا تو ہاتھ ہمیشہ قبضۂ شمشیر تک پہنچتے اور کندھوں سے سروں کا بوجھ ہلکا ہونے لگتا اور پھر ایسی لڑائی چھڑتی جس کی آگ برسوں تک بجھنے

Marfat.com

نہیں پاتی تھی۔ چنانچہ عربوں کی کئی بڑی بڑی لڑائیاں اسی شراب خانہ خراب کے نتیجے میں وجود میں آئیں۔حتیٰ کے شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی بعض مجالس میں بھی لڑائی تک تو نوبت نہیں پہنچی لیکن بدمزگی کے بعض واقعات ضرور پیش آئے اور انہی واقعات کے باعث حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ سے دعا کی کہ ''یا اللہ! شراب کے بارے میں مکمل حکم نازل فرما'' آج بھی اس طرح کے واقعات سے شرابیوں کے حوالے سے واقفان حال بہت کچھ آگاہی رکھتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ شراب پینے والے شراب کے نتیجے میں ہوش وخرد کے ساتھ ساتھ عفت وعصمت کے احساس اور جذبہ غیرت سے بھی محروم ہوجائیں' جس طرح مغربی سوسائٹی میں ہم اس کا مشاہدہ کررہے ہیں کہ شراب کے نتیجے میں ان میں عفت عزت' ناموس اور وفا وحیا کا احساس تک باقی نہیں رہا۔ ظاہر ہے مسلمان کتنے بھی بدراہ کیوں نہ ہوجائیں' اس صورت حال کو قبول کرنا ان کیلئے کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اس وقت بھی اگرچہ ہمارا بالائی طبقہ مغربی تعلیم وتہذیب کے زیر اثر ایک حد تک اس کا شکار ہوچکا ہے' لیکن مسلمانوں کی عمومی زندگی ابھی تک اس اثر سے محفوظ ہے۔ مگر شیطان کا اصل ہدف چونکہ اسی صورت حال کو پیدا کرنا ہے' اس لئے وہ اس وقت تک مطمئن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے اس ہدف کو حاصل نہ کرلے۔ مختصراً یہ کہ شراب کے ذریعے بغض وعداوت کا پیدا ہونا' یہ ایک ایسی مشاہدے کی بات ہے' جس کا انکار کرنا مشاہدے کا انکار کرنا ہے۔

جہاں تک مَیْسِر یعنی ''جوئے'' کا تعلق ہے' اس کے ذریعے بھی شیطان مسلمانوں میں یہی بغض وعداوت کی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے اور جہاں جہاں بھی جواء ہوتا ہے' جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہاں ایسی صورت حال بالعموم دکھائی دیتی ہے' ہمارے احتسابی ادارے مجھے نہیں معلوم کہ اس طرف دھیان دیتے ہیں یا نہیں۔ لیکن میرا گمان یہ ہے کہ یہ اندھے قتل اور نامعلوم وارداتیں' جہاں ان کے اور بہت سارے اسباب ہیں وہاں اس کا ایک بڑا سبب یہ قمار بازبھی ہیں کیونکہ قمار اور جوئے کی بازی میں یہ تو طے شدہ بات ہے کہ دو فریقوں میں سے ایک فریق ہارتا ہے لیکن وہ اپنے اس شغلِ ناپاک سے کبھی دست کش نہیں ہوتا۔ اسے ہمیشہ یہ خیال ہوتا ہے کہ آج میں بازی ہار گیا ہوں' کل ضرور جیت لوں گا۔ رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ گھر کا اثاثہ تک اس کی نذر ہوجاتا ہے اور بعض ناہنجار تو اپنی بیویاں تک اس میں ہار دیتے ہیں۔ اندازہ فرمایئے! جب ایک آدمی سب کچھ ہار دینے کے بعد فاقوں کی نذر ہوتا ہے اور گھر میں بچے بھوک سے بلکنے لگتے ہیں اور اس کا اپنا پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے غیظ وغضب کا تنور بن جاتا ہے تو پھر یہ شخص خود سے جیتے ہوئے آدمی کے بارے میں کیا محبت کے جذبات رکھے گا؟ یقیناً اس کے اندر غیظ وغضب کی فصل اگے گی اور عداوت اس کی رگ رگ میں سما جائے گی۔ جیسے جیسے قمار بازوں کی تعداد بڑھے گی ویسے ویسے اسلامی معاشرے میں غیظ وغضب کی فصل بھی بڑھتی جائے گی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایک نہ ایک دن یہ معاشرہ تباہ ہوجائے گا۔ یہی وہ صورت حال ہے' جس کے بارے میں یہاں توجہ دلائی جارہی ہے کہ خمر اور قمار سے شیطان تمہارے اندر عداوت اور بغض کے جذبات پیدا کرکے' تمہیں تباہ کردینا چاہتا ہے۔

2- دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ اس خمر اور میسر یعنی شراب اور جوئے سے شیطان یہ چاہتا ہے کہ تمہیں اللہ کے ذکر سے روک دے۔ اب ہم الگ الگ دونوں حوالوں سے دیکھتے ہیں کہ شیطان کس طرح ان کے ذریعہ ذکر اللہ سے روکتا ہے۔ جہاں تک شراب کا تعلق ہے' اس کا سب سے پہلا اثر جو ایک مے خوار یعنی شرابی پر ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ شراب کا نشہ اسے زندگی کی ضرورتوں اور زندگی کی حقیقتوں سے فرار کا راستہ دکھاتا ہے' وہ اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں سے جب اپنی کوتاہیوں کے باعث عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ حالات کا مقابلہ کرے اور محنت اور کوشش سے ناکامیوں پر غالب آنے کی کوشش کرے' وہ شراب کے نشے میں مغلوب ہوکر گریز کی ایک صورت پیدا کرلیتا ہے۔ شروع شروع میں تو ایسا کبھی کبھی ہوتا

Marfat.com

ہے۔ لیکن جیسے جیسے اس کی مشکلات بڑھتی جاتی ہیں' ویسے ویسے اس کی خیالی جنت کی طلب افزوں ہوتی جاتی ہے' آخر وہ مرحلہ بھی آ جاتا ہے کہ انسانی ذمہ داریوں سے فرار کے بعد' وہ اللہ کی یاد سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسے یہ بات بھول جاتی ہے کہ مجھے کل کو اللہ کے سامنے جواب دہی بھی کرنی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ کوئی ٹیم اس وقت تک کامیابی حاصل کرتی ہے' جب تک ان میں کپتان کی اطاعت کا جذبہ اور ٹیم ورک موجود ہو۔ کوئی ادارہ بھی اسی وقت تک اپنی ذمہ داریاں ادا کر سکتا ہے' جب تک اسے اپنے سربراہ کا احساس اور اپنی ذمہ داریوں کا شعور حاصل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود فراموشی' یہ کسی کے لئے بھی سب سے بڑی سزا ہے اور یہ اس کی ناکامیوں کا اصل باعث ہے۔ یہاں یہی کہا جا رہا ہے کہ شیطان تمہیں شراب کے ذریعے سے اللہ کے ذکر سے روک کر تمہیں اصل قوت سے محروم کر دے گا۔ شروع میں تمہارے اندر خدا فراموشی آئے گی' جس کے نتیجے میں تمہیں خود فراموشی کی سزا ملے گی اور یہ وہ سزا ہے' جس کے بعد نہ کوئی فرد باقی رہتا ہے' نہ کوئی قوم زندہ رہتی ہے۔

جواء اور قمار کے ذریعہ بھی شیطان اللہ کے ذکر سے روکتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ جوا کھیلنے والے کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ میں بغیر محنت کئے' بغیر تکلیف اٹھائے' بغیر حالات سے لڑے' بغیر دوڑ بھاگ کئے اور بغیر عرصہ دراز تک امید کے چراغ جلائے' کوئی ایسا ہاتھ ماروں جس کے نتیجے میں مجھے ایک بڑی دولت مل جائے۔ میں راتوں رات امیر بن جاؤں۔ پھر زندگی کو میں عیش و عشرت سے گزاروں۔ یہ خواہش یوں تو بڑی مختصر اور بڑی معصوم سی لگتی ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں ہوس زر اور دنیا کی محبت کا ایسا شدید غلبہ ہوتا ہے' جس کے سامنے نہ حلال و حرام کی تمیز باقی رہتی ہے' نہ کسی اخلاقی قدر کا وجود رہتا ہے۔ نہ انسانیت کے رشتے باقی رہتے ہیں' نہ ذمہ داریوں کے احساس کا وجود رہتا ہے۔ آدمی کے سر پر پیسے دھیلے کی ایک ایسی دھن سوار ہوتی ہے کہ وہ معاشرے کی سب سے بڑی قدر' سب سے بڑی طاقت اور سب سے بڑی عزت کی علامت صرف دولتِ دنیا کو سمجھتا ہے۔ یہی اس کا معبود ہے' جس کی وہ رات دن پوجا کرتا ہے۔ یہی اس کا محبوب ہے' جس کے وہ راتوں کو سپنے دیکھتا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں سے وہ اس طرح فرار اختیار کرتا ہے' جس طرح ایک سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا اور اس سے دوڑتا ہے۔ قمار اسی دولت دنیا کی ہوس کو عبادت کی حد تک پہنچا دینے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے جس کے نتیجے میں جیسے میں نے عرض کیا کہ ہر تعلق بھول جاتا ہے اور انسانیت تک پسپا ہو جاتی ہے۔ آدمی شہنشاہ بھی ہو تو حب دنیا کا اسیر ہو کر وہ اسلامی دنیا کو تباہ کرنے پر تل جاتا ہے۔ یہ ہم تاریخ میں جتنے غداروں کے نام پڑھتے ہیں' ان کی اگر آپ تحقیق کریں تو ان میں سے ایک ایک فرد آپ کو حب دنیا کا اسیر بلکہ اس کی محبت میں پاگل اور دیوانہ دکھائی دے گا۔ کسی نے اس کے نتیجے میں ملک بیچا' کسی نے قوم تک فروخت کر ڈالی۔ یہ جعفر و صادق قسم کی مخلوق' اسی خطرناک بیماری کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ مستعصم عباسی جیسا خلیفہ بھی خلافت کو تار تار کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ بیماری کئی اور اسباب سے بھی پیدا ہوتی ہے' لیکن اس کا اہم تر ذریعہ یہی جوا اور قمار ہے' جس کا آخری نتیجہ خدا فراموشی ہے۔ جس کی سزا خود فراموشی کی شکل میں ملتی ہے اور بالآخر تمام ذمہ داریوں' تعلقات' رشتے ناطے حتیٰ کے اپنی ذات کی تباہی پر منتج ہوتی ہے۔

3- تیسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ "شیطان تمہیں نماز سے روک دینا چاہتا ہے"۔ یہ اگرچہ ذکر اللہ ہی کا ایک حصہ ہے' لیکن الگ سے اس کا ذکر یقیناً بے سبب نہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ شراب ہو یا قمار' ان خانہ خراب قسم کی برائیوں کے نتیجے میں شیطان سب سے پہلے جس عظیم نعمت سے مسلمانوں کو محروم کرتا ہے' وہ نماز ہے کیونکہ نماز ہی اصل میں اللہ کی یاد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ پانچ وقت نماز کے ذریعہ اللہ کی یاد دہانی اس طرح آسان کر دی گئی ہے کہ اگر آدمی تھوڑے سے احساس سنجیدگی کے ساتھ نماز ادا کرے تو اللہ کی یاد سے غافل ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جس معاشرے کو اللہ کی یاد سے غافل کرنا مقصود ہو' اس کی آسان ترین شکل یہ ہے کہ اسے نماز سے غافل کر دیا جائے اور جس معاشرے کو اللہ سے جوڑنا مقصود ہو'

Marfat.com

اس کا بھی اہم تر راستہ یہ ہے کہ اسے نماز کا عادی بنا دیا جائے اور نماز کے شعور سے بہرہ ور کر دیا جائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے اندر جو سب سے پہلی خرابی پیدا ہوئی' جس کے نتیجے میں پھر وہ دوسری خرابیوں کا شکار ہوئے اور آخر اپنے انجام کو پہنچ گئے' وہ خرابی یہی تھی کہ انہوں نے نماز ضائع کر دی تھی۔

شراب تو آدمی کو ہوش و حواس سے بے بہرہ کر دیتی ہے اور خود اس کو اپنی ذات سے محروم کر دیتی ہے اور جواء دنیا طلبی کی محبت میں ڈبو کر اور آئے دن جوئے کی سکیموں میں اندھوں کی طرح لگا کر باقی ہر رشتے سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کی موجودگی میں نماز سے تعلق باقی رہنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جب نماز غائب ہو جاتی ہے تو پھر اللہ کی یاد یعنی ذکر اللہ کا کون سا موقع باقی رہ جاتا ہے۔

خمر اور قمار کے بارے میں تفصیل سے ان برائیوں کا ذکر کرنے اور اس کی ممکن قباحتوں اور خطرات سے آگاہ کرنے کے بعد مسلمانوں سے پوچھا جا رہا ہے:

فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَهُوۡنَ ﴿تو بتاؤ کیا اب تم ان سے باز آتے ہو۔﴾

استفہام عربی زبان میں تاکید' اقرار' تنبیہ' انکار' زجر' امر اور تحقیر کے مفہوم کیلئے آتا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ یہ امر کے مفہوم میں ہے۔ لیکن اس اسلوب میں امر کے ساتھ زجر' موعظت' تاکید و تنبیہ اور اتمام حجت کا مضمون بھی پیدا ہو گیا ہے۔ یہاں اس حقیقت کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ شراب اور جوئے کے مقاصد کی تفصیل اتنے مختلف مواقع پر اور اتنے مختلف پہلوؤں سے تمہارے سامنے آ چکی ہے کہ اب اس معاملے میں کسی کیلئے بھی کسی اشتباہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تو بتاؤ اب بھی اس سے باز آتے ہو یا نہیں۔ اب تمہارے لئے ایک ہی راستہ ہے۔ اگر تم ان تمام خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہو تو شیطان کے بچھائے ہوئے جال سے نکل کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں آ جاؤ اور اس کی نافرمانی اور سرکشی سے بچو۔

آیت:۹۲ وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاحۡذَرُوۡا ۚ فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ۝ ''اور اللہ کی اطاعت کرو' رسول کی اطاعت کرو اور اس کی نافرمانی سے بچتے رہو۔ اگر تم اعراض کرو گے تو جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے''۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ اور گزشتہ آیات میں محرمات شرعیہ کے سلسلے میں جس طرح تفصیل سے بات کی گئی ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں اتمامِ حجت کے طور پر کہا جا رہا ہے کہ جہاں تک سمجھانے بجھانے اور مختلف پیرایوں میں شرعی احکام کی وضاحت کا تعلق تھا اس میں کوئی کمی باقی نہیں رہی' اب بھی اگر تم بجائے اطاعت کے معصیت کا راستہ اختیار کرتے ہو تو تم اللہ کے حضور اپنی ذمہ داری کے حوالے سے پکڑے جاؤ گے۔ رسول اللہ ﷺ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہو گی۔ ان کا کام صاف صاف واضح طور پر اللہ کے احکام کو پہنچانا ہے' سو انہوں نے پوری طرح اس کا حق ادا کر دیا اور مکمل طور پر اتمام حجت کر دیا۔ اب جو اسکے بعد بھی بے راہ روی اختیار کرے گا وہ اسکے نتائج بھگتنے کیلئے اپنے آپ کو تیار رکھے۔

شراب کی حرمت کا ذکر جس تفصیل اور شدت کے ساتھ کیا گیا ہے اور پھر آخر میں جس طرح اس سے رکنے کا حکم دیا گیا ہے' اس میں یقیناً ایک زجر اور توبیخ مضمر ہے۔ کوئی وجہ نہیں تھی اسلامی معاشرے پر اس کے اثرات مرتب نہ ہوتے جبکہ وہ معاشرہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے واقعی اثرات محسوس کئے اور اس کی وجہ سے' وہ اس پریشانی میں مبتلا ہو گئے کہ شراب کی حرمت کے اس حکم کے نزول سے پہلے ابتدائی حکم بھی آ چکے تھے' کیا ہی اچھا ہوتا کہ بعض دوسرے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کی طرح ہم اسی وقت شراب نوشی سے رک جاتے۔ کہیں ایسا نہ ہو

Marfat.com

شراب کی برائی کے ذکر کے باوجود (اگر چہ اس کی حرمت کا ذکر نہیں آیا تھا) ہم نے نہ رک کر کوئی برائی کی ہو اور یہ جو تاخیر ہم سے ہوئی ہے کہیں اللہ کے ہاں اس کی باز پرس نہ ہو۔ مزید پریشانی انہیں یہ بھی لاحق ہوئی کہ کتنے مسلمان شراب کی اس مکمل حرمت کے نزول سے پہلے اللہ کو پیارے ہو گئے اور اس دوران وہ شراب پیتے رہے' کہیں ایسا نہ ہو کہ ان سے اس بارے میں سوال ہو' چنانچہ یہی احساسات زبانوں پر بھی آئے اور اس کے جواب میں پروردگار نے اگلی آیت نازل فرمائی:

آیت:۹۳ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ O ''ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں پر اس چیز کے باب میں کوئی گناہ نہیں جو انہوں نے کھائی' جب کہ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا' ایمان لائے اور عمل صالح کیا' پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے' پھر تقویٰ اختیار کیا اور خوبی کے ساتھ اس کا حق ادا کیا اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے''۔

صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دلوں میں جو شبہات اور خیالات پیدا ہوئے تھے' جس کا باعث اللہ کے سامنے ان کی جواب دہی کا گہرا احساس تھا' اس آیت میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پرسش کسی ایسی چیز کے کھانے پینے پر نہیں ہو گی' جس کے بارے میں کسی صریح ممانعت کی خلاف ورزی کا ارتکاب نہیں ہوا ہے۔ شریعت الٰہی کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ جس چیز کے باب میں جو حد معین ہو گئی ہو' لوگ اس حد کا احترام کریں۔ پھر اگر اس حد میں کوئی اضافہ شریعت کی طرف سے ہو جائے تو اس کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کر لیں اور اگر اس پر مزید اضافہ ہو جائے تو اس کو بھی تھام لیں اور پھر پوری خوبی' پوری احتیاط اور پورے اخلاص کے ساتھ زندگی بھر اس پر عمل کریں۔

اللہ تعالیٰ کن لوگوں کو پسند کرتے ہیں؟

صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو یہ جو خیال پیدا ہوا تھا کہ اس سے پہلے دو آیتوں میں چونکہ شراب کی مذمت کر دی گئی تھی' ہمیں اسی وقت اس سے رک جانا چاہئے تھا' ہم نے اس میں تاخیر کر کے شاید کوئی جرم کیا ہے۔ اس پر یہ بتایا جا رہا ہے کہ شریعتِ الٰہی میں احکام کا نزول بتدریج ہوا ہے اور یہ تدریج بندوں کی سہولت کے پہلو سے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں پر کوئی گرفت نہیں جنہوں نے اس کی بخشی ہوئی سہولت سے فائدہ اٹھایا ہے کیونکہ کسی چیز سے پرہیز کرنا اس وقت لازم ہوتا ہے' جب اس کی حرمت نازل ہو اور حرمت کے نازل ہونے میں تاخیر بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ پروردگار ابھی اس پر پابندی لگانا نہیں چاہتا ظاہر ہے ان لوگوں سے باز پرس کیوں کی جائے گی جنہوں نے حرمت کے نزول سے پہلے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اگر چہ ان لوگوں کو سبقت الی الخیر کا صلہ ضرور ملے گا' جنہوں نے اس معاملے میں ہوا کا رخ پہچان کر اس کے پہلے ہی مرحلہ میں احتیاط اور تقویٰ کا آخری قدم اٹھا لیا۔ مثلاً شراب کی حرمت کا حکم بتدریج نازل ہوا۔ لیکن دین کے معاملے میں جن کی حس زیادہ تیز تھی' وہ پہلے ہی مرحلہ میں اس سے تائب ہو گئے۔ یہ ان کے کمال درجہ فطرت اسلام پر ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر بھی رحم فرمائے گا جنہیں اگر چہ یہ درجۂ کمال تو حاصل نہ ہو سکا' لیکن انہوں نے کسی مرحلہ میں حدودِ الٰہی سے تجاوز نہیں کیا۔ البتہ اس آیت میں جو بات بہت توجہ کے قابل ہے' وہ یہ ہے کہ اس میں تین بار تقویٰ کا ذکر ہوا ہے۔ پھر پہلی بار تقویٰ کے ذکر کے ساتھ ایمان و عمل کو ذکر کیا گیا' دوسری دفعہ صرف ایمان کا ذکر ہے اور تیسری بار احسان کو ذکر فرمایا گیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ چونکہ شراب کی حرمت کا ذکر تدریجاً ہوا ہے آخری آیت سے پہلے دو آیتیں مختلف وقتوں میں نازل ہو چکی تھیں' اس میں اگر چہ حرمت کا ذکر تو نہیں آیا تھا' لیکن جو کچھ اس میں فرمایا گیا تھا' عمل تو اس پر بھی کرنا ضروری تھا اور تقویٰ چونکہ حدود الٰہی کی نگہداشت کا نام ہے' اس لئے تینوں آیتوں

Marfat.com

کے حوالے سے تین دفعہ تقویٰ کو ذکر فرما کر یہ بتلانا مقصود ہے کہ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو اس پر پریشان نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اس سے پہلے شراب نوشی سے کیوں نہ رک گئے کیونکہ مقصود ہر طرح کے حکم کی اطاعت ہے' جسے تقویٰ کہا جاتا ہے۔ پہلے جن باتوں کا حکم دیا گیا تھا' انہی پر عمل کرنا ضروری تھا' سو آپ لوگوں نے کیا اور جب آخری آیت میں حرمت نازل ہو گئی تو آپ لوگ شراب نوشی سے رک گئے۔ اس طرح تینوں آیتوں کے حوالے سے بفضلہ تعالیٰ تقویٰ برابر آپ کا عناں گیر رہا ہے۔ اس لئے آپ کیلئے پریشانی کی کوئی وجہ نہیں۔ البتہ! اس کے ساتھ ایمان و عمل کا ذکر کر کے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تقویٰ یعنی اس کے احکام کی اطاعت کرنے اور نافرمانی سے بچنے کا اعتبار صرف اس وقت ہے' جب اس کے ساتھ ایمان و عمل بھی شامل ہو کیونکہ بہت سے لوگ کھانے پینے کے معاملے میں بڑے محتاط اور متقشف ہوتے ہیں حالانکہ ایمان و عمل صالح سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جوگیوں' سنیاسیوں اور راہبوں سے قطع نظر جو لوگ اعمال سفلیہ کا کاروبار کرتے ہیں' وہ بھی شدت سے بہت سی چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں اور بہت ساری پابندیاں اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں اور بڑی سختی کے ساتھ ان کی نگہداشت بھی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس پابندی اور نگہداشت کا دین سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اعتبار صرف اس احتیاط اور پابندی کا ہے جو ایمان و عمل صالح کے ساتھ ہو۔ آخر میں تقویٰ کے ساتھ احسان کی جو شرط ہے' وہ یہ بتلانے کیلئے ہے کہ تقویٰ ایمان اور عمل صالح کا اپنا اپنا مقام ہے۔ لیکن یہ اپنے معراج کو اس وقت پہنچتے ہیں' جب ان کے ساتھ احسان کی صفت بھی شامل ہوتی ہے۔ جس کا مقصود یہ ہے کہ آدمی اللہ کی حدود کی خلاف ورزی سے اس طرح بچے' جس طرح اس سے بچنے کا حق ہے۔ وہ ہر حکم کی تعمیل اس طرح کرے گو وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے اور اس یقین سے اپنے باطن کو منور رکھے کہ اگر وہ اللہ کو نہیں دیکھ رہا ہے تو اللہ تو بہر حال اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہی احسان تقویٰ کی اصل روح اور حدود الٰہی کا اصل پاسبان ہے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

مومنو! کسی قدر شکار سے

اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ

جن کو تم ہاتھوں اور نیزوں سے پکڑ سکو خدا تمہاری آزمائش کرے گا یعنی حالتِ احرام میں

لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ

شکار کی ممانعت سے تاکہ معلوم کرے کہ اس سے غائبانہ کون ڈرتا ہے۔ تو جو اس کے بعد زیادتی کرے اُس کے

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ

لیے دُکھ دینے والا عذاب (تیار) ہے مومنو! جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارنا اور جو تم میں

وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ

سے جان بوجھ کر اُسے مارے تو (یا تو) اس کا بدلا (دے اور وہ یہ ہے کہ) اُسی طرح کا چارپایہ جسے تم میں سے دو معتبر شخص

Marfat.com

بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ

مقرر کر دیں قربانی (کرے اور یہ قربانی) کعبے پہنچائی جائے یا کفارہ (دے اور وہ) مسکینوں کو کھانا کھلانا

اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَ

(ہے) یا اس کے برابر روزے رکھے تاکہ اپنے کام کی سزا (کا مزہ) چکھے۔ (اور) جو پہلے ہو چکا وہ خدا نے معاف

مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾ اُحِلَّ لَكُمْ

کر دیا۔ اور جو پھر ایسا کام کرے گا تو خدا اس سے انتقام لے گا۔ اور خدا غالب اور انتقام لینے والا ہے ﴿۹۵﴾ تمہارے لیے دریا

صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ

(کی چیزوں) کا شکار اور ان کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے (یعنی) تمہارے اور مسافروں کے فائدے کے لیے

الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾ جَعَلَ

اور جنگل (کی چیزوں) کا شکار جب تک تم احرام کی حالت میں رہو تم پر حرام ہے۔ اور خدا سے جس کے پاس تم (سب) جمع

اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ

کیے جاؤ گے ڈرتے رہو ﴿۹۶﴾ خدا نے عزت کے گھر (یعنی) کعبے کو لوگوں کے لیے موجب امن مقرر فرمایا ہے۔ اور عزت کے

وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

مہینوں کو اور قربانی کو اور ان جانوروں کو جن کے گلے میں پٹے بندھے ہوں۔ یہ اس لیے کہ تم جان لو کہ جو کچھ آسمانوں

وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾ اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ

میں اور جو کچھ زمین میں ہے خدا سب کو جانتا ہے اور یہ کہ خدا کو ہر چیز کا علم ہے ﴿۹۷﴾ جان رکھو کہ خدا سخت عذاب دینے والا

اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ

ہے اور یہ کہ خدا بخشنے والا مہربان بھی ہے ﴿۹۸﴾ پیغمبر کے ذمے تو صرف (پیغام خدا کا) پہنچا دینا ہے۔ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے

وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ

ہو اور جو کچھ مخفی کرتے ہو خدا کو سب معلوم ہے ﴿۹۹﴾ کہہ دو کہ ناپاک چیزیں اور پاک چیزیں برابر نہیں ہوتیں گو ناپاک چیزوں کی کثرت

Marfat.com

الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ع ۱۰۰

تمہیں خوش ہی لگے۔ تو عقل والو خدا سے ڈرتے رہو تاکہ رستگاری حاصل کرو

☆ ☆ ☆

تمہید

پیشتر ازیں ہم یہ بات کسی حد تک واضح کر چکے ہیں کہ سورۃ المائدہ کے چند امتیازی پہلو ہیں' جو اسے قرآن کریم کی باقی سورتوں سے ممتاز کرتے ہیں۔

1- سب سے زیادہ احکام' بالخصوص حلت وحرمت کے بارے میں' اسی سورۃ میں نازل کئے گئے ہیں۔

2- بعض ایسے احکام جو بعض دوسری سورتوں میں بھی ذکر کئے گئے تھے' انہیں تکمیلی شان اسی سورۃ میں بیان کردہ احکام سے ملی ہے اور ان احکام کی تکمیل کرتے ہوئے' بعض دفعہ احکام کی حکمتیں بھی واضح کردی گئی ہیں۔

3- دوسری سورتوں اور خود سورۃ المائدہ میں بیان کردہ احکام کے حوالے سے جو بعض سوالات پیدا ہوئے یا جو پیدا ہو سکتے تھے' اس سورۃ کے آخر میں تفصیل سے ان کا جواب دیا گیا ہے۔

4- احکام کے علاوہ بعض ایسے انسانی خصائص پر گفتگو کی گئی ہے' جن میں ذرا سی خرابی بھی انسان کو اس حد تک بگاڑ دیتی ہے کہ وہ احکام الٰہی کی پیروی کرنے کے قابل نہیں رہتا بلکہ اس میں چور دروازے تلاش کرتا ہے۔

یہ چاروں باتیں جو سورۃ المائدہ کا اختصاصی پہلو ہیں' ان پر چلنا اس وقت تک آسان نہیں' جب تک مسلمانوں کو ایسے مراحل سے نہ گزارا جائے جس کے نتیجے میں ان کے سیرت وکردار میں ایسی پختگی پیدا ہو جائے' جو انہیں کسی وقت بھی اللہ کے احکام کی تعمیل سے اور پروردگار کے ساتھ اپنے بنیادی رشتے سے منحرف نہ ہونے دے۔ چنانچہ آج ہم جس رکوع کا آغاز کر رہے ہیں' اس میں جہاں سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں اور بعض احکام کو تکمیلی شان عطا کی گئی ہے' وہیں ان احکام کے سلسلے میں سیرت وکردار کی پختگی کیلئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے' اس کی طرف بتمام وکمال توجہ دلائی گئی ہے۔ چنانچہ اس رکوع کی پہلی ہی آیت میں ایسی ہی دو بنیادی ضرورتوں کو واضح فرمایا گیا ہے۔

آیت: ۹۴ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ O ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ ضرور تمہاری کسی ایسے شکار سے آزمائش کرے گا' جو تمہارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں آجائے گا تاکہ اللہ دیکھ لے کہ کون اس سے غیب میں ڈرتا ہے اور جس نے اس کے بعد حدود سے تجاوز کیا تو اس کیلئے دردناک عذاب ہے''۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے چند حقائق منکشف فرمائے ہیں جو انسانی سیرت وکردار یعنی تقویٰ کیلئے انتہائی ضروری ہیں۔ ان کے بغیر انسانی سیرت وکردار کی تعمیر اولاً تو ہو نہیں سکتی اور اگر کسی حد تک ہو بھی جائے تو وہ دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔ اس میں سب سے پہلی بات جس کی طرف توجہ

Marfat.com

لائی گئی ہے' وہ یہ ہے کہ تمہاری سیرت و کردار کی تعمیر اور تمہارے اندر تقویٰ پیدا کرنے اور اس کو مستحکم بنانے کیلئے جو بات انتہائی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نہیں آزمائش کے مرحلے سے گزارا جائے کیونکہ دنیا میں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی آدمی کسی نظریے یا شخصیت سے وابستگی کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کی اس وابستگی کے دعوے کو ضرور آزمایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر دعوے کی آزمائش نہ ہو تو پھر تو دنیا میں دعویٰ کرنے والوں کے سچے یا جھوٹے ہونے کی کوئی کسوٹی باقی نہ رہ جائے اور یہ دعویٰ چاہے معمولی درجے کا ہو یا آخری درجے کا' یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا امتحان نہ کیا جائے۔ وہ چیز جسے میں یہاں وابستگی کا نام دے رہا ہوں' اسی کو ہماری زبان میں محبت کا نام دیا جاتا ہے اور یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب کوئی کسی سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ اس محبت کو آزمائش کی کٹھالی سے نہ گزرنا پڑے۔ بقول شاعر:

محبت کے مقدر میں کہاں آرام ہے ہمدم
کہیں شعلہ' کہیں بجلی' کہیں سیماب ہوتی ہے

اس لئے قرآنِ کریم میں سورۃ العنکبوت میں واضح طور پر ارشاد فرمایا: ''کیا لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ وہ جب ایمان کا دعویٰ کریں گے تو ہم انہیں آزمائش میں نہیں ڈالیں گے' ہم نے تو انہیں بھی آزمایا تھا جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں (اور اب مسلمانوں کو بھی آزمائیں گے)''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وابستگی اور محبت کے دعوے داروں کیلئے دنیا کے عام دستور اور الہامی زبان دونوں میں آزمائش ضروری ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو آزمائش میں نہ ڈالا جائے۔

دوسری بات جو ہمیں قرآن کریم سے معلوم ہوتی ہے' وہ یہ ہے کہ اس طرح کی آزمائشیں دو حوالوں سے ضروری ہوتی ہیں۔ ایک تو اس لئے کہ کسی سے وابستگی اور محبت کا دعویٰ کرنا' یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ لیکن یہ جاننا کہ کون اپنے دعوے میں سچا ہے اور کون جھوٹا' اس کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے' جب آزمائش کا مرحلہ پیش آتا ہے۔ جس طرح خالص سونے کی پہچان اس وقت ہوتی ہے' جب اسے بھٹی میں تپایا جاتا ہے۔ تب پتہ چلتا ہے کہ اس میں خالص سونا کتنا ہے اور کھوٹ کتنا۔ انسانی سیرت و کردار، عقیدہ اور ایمان کا معاملہ سونے سے بھی زیادہ نازک ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سچے جھوٹے اور کھرے کھوٹے کی پہچان کیلئے انہیں آزمائشوں سے نہ گزارا جائے۔

دوسری بات یہ کہ انسانی سیرت و کردار کی پختگی اور اسے جلا دینے کیلئے آزمائشوں کے مراحل انتہائی ضروری ہوتے ہیں۔ بعض لوگ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں' لیکن جب تک ان پر ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈالا جاتا اور کٹھن مراحل سے گزار کر ان کی صلاحیتوں کو جلا پانے کا موقع نہیں ملتا اس وقت تک ان کی غیر معمولی صلاحیتیں کبھی ابھر کر سامنے نہیں آتیں بلکہ رفتہ رفتہ دم توڑ دیتی ہیں۔ ایک آدمی جو کبھی پانی میں نہیں اترا' آپ اگر یہ چاہتے ہیں کہ وہ تیراک بنے تو ضروری ہے کہ آپ اسے پانی میں دھکا دے دیں۔ جس آدمی کے بارے میں یہ خواہش ہو کہ وہ تیز دوڑنے لگے تو ضروری ہے کہ آپ روزانہ اسے تیز دوڑنے پر مجبور کریں۔ آہستہ آہستہ اس کے اعصاب اس قابل ہوتے جائیں گے کہ اس کیلئے تیز دوڑنا کوئی مشکل نہیں رہے گا۔ جن لوگوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ عام لوگوں کی نسبت زیادہ بوجھ اٹھا لیتے ہیں' اگر ہم ان کی صلاحیت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ صلاحیت مسلسل بوجھ اٹھانے اور اپنے آپ کو اس مشقت میں مبتلا کرنے سے ان کے اندر پیدا ہوئی۔ مختصر یہ کہ انسانی وابستگیوں کے حوالے سے مشکلات اور آزمائشوں سے گزرنا' یہ غلط لوگوں کیلئے تو سزا ہو سکتی ہے' لیکن فرمانبرداروں کیلئے ان کے جذبۂ عبودیت و سرفروشی کو جلا دینے کی انتہائی حکیمانہ کاوش ہے' جس کے بغیر ان بنیادی جذبوں میں مطلوب پختگی' جسے ہم تقویٰ کا نام دیتے ہیں' کبھی پیدا نہیں ہوتی۔

Marfat.com

جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو ہمیشہ ان مراحل سے گزارا گیا ہے۔ وہ جب بھی سعادت مندی کے ساتھ ان مراحل سے گزرنے میں کامیاب ہو گئے تو دنیوی اور اخروی نعمتوں کا راستہ ان کیلئے کھل گیا اور جب انہوں نے اس میں کمزوری دکھائی تو اللہ کے عذاب کا شکار ہوئے۔ قرآن کریم نے جابجا اس کی مثالیں ذکر کی ہیں۔ انہی میں سے ایک مثال جو اس آیت میں بیان کردہ آزمائش سے بہت ملتی جلتی ہے' اسے سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۶۳ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ تھا جو ساحل سمندر کی کسی بستی میں آباد تھا۔ اللہ نے بنی اسرائیل کو جب ہفتہ کے بارے میں خاص احکام دیئے کہ تم اس دن کا پوری طرح احترام بجالاؤ گے اس میں سوائے اللہ کی عبادت کے اور کوئی دنیوی مصروفیت پیدا نہیں کرو گے۔ اس دن تمہارے چولہے تک نہیں جلیں گے' بلکہ سارا دن تمہارا روزے اور عبادت میں گزرے گا اور پھر اس حوالے سے ان کی آزمائش کی گئی اور حکم دیا گیا کہ تم اس دن مچھلیاں نہیں پکڑو گے۔ ساحل بحر پر رہنے کی وجہ سے چونکہ مچھلیوں کا شکار ان کی گزر بسر کا سب سے بڑا ذریعہ تھا' اس لئے اس پر عمل کرنا ان کیلئے آسان نہیں تھا۔ لیکن ایسا مشکل بھی نہیں تھا' کیونکہ باقی ہفتے کے دنوں میں مچھلیاں پکڑ سکتے تھے اور دوسرا کاروبار بھی کر سکتے تھے۔ لیکن وہ چونکہ اپنے سیرت و کردار کو بگاڑ چکے تھے اس لئے اس امتحان میں پورے نہ اترے اور بری طرح ناکام ہو کر اللہ کے عذاب کے سزاوار ہوئے۔ پھر یہ بات بھی ایسی آزمائشوں میں نمایاں نظر آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی نعمت سے کسی قوم کو آزماتے ہیں تو ان کی آزمائش کو مشکل بنانے کیلئے اس نعمت کو فراوانی سے ان کے دائیں بائیں مہیا کر دیتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ قرآن کریم میں ہے:

اِذْ يَعْدُوْنَ فِى السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

﴿اور یاد کرو! جب کہ وہ سبت کے معاملے میں حدود الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے' جب کہ ان کی مچھلیاں ان کے سبت کے دن منہ اٹھائے ہوئے نمودار ہوتی تھیں اور جب سبت کا دن نہ ہوتا تو مچھلیاں نمودار نہ ہوتیں۔ اسی طرح ہم ان کو آزمائش میں ڈالتے ہیں بوجہ اس کے کہ وہ ہماری نافرمانی کرتے تھے﴾ (اعراف ۷:۱۶۳)

مسلمانوں کو بھی اسی طرح کی آزمائش سے دوچار کیا گیا اور کرم یہ فرمایا گیا کہ یہ بتا دیا گیا کہ تمہیں اللہ تعالیٰ ایسے ایک شکار سے آزمائے گا اور وہ شکار اتنی فراوانی سے تمہارے دائیں بائیں ہوگا کہ تم چاہو تو آگے بڑھ کر اسے پکڑ سکو گے اور چاہو تو نیزوں سے شکار کر سکو گے۔ جس طرح بنی اسرائیل کی آزمائش میں قرآن کریم نے ہمیں بتایا کہ مچھلیاں سر اٹھائے ہوئے ان کی طرف آتی تھیں حالانکہ مچھلی ہمیشہ پانی میں ڈوب کے تیرتی ہے۔ لیکن وہ کشتی کی طرح سطح آب پر تیرتی ہوئی آتی تھی تاکہ ان کے شوق کو بڑھایا جائے اور آزمائش سخت کی جائے۔ یہاں بھی مسلمانوں کو اسی طرح آزمایا گیا اور مزید یہ کہ جس طرح بنی اسرائیل کی آزمائش ان کی ایسی غذا کے حوالے سے کی گئی جو ان کی ایک اہم ضرورت تھی۔ اس طرح مسلمانوں کو بھی حج کے سفر کے دوران صحرا سے گزرتے ہوئے ایک ایسی چیز سے آزمایا گیا جو ان کی سخت ضرورت تھی کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ صحرائے عرب میں بہت کم ایسے علاقے ہیں جہاں کوئی چیز اگتی ہو۔ اس لئے ان کی گزر بسر کا زیادہ تر دارومدار تجارت' گلہ بانی یا پھر شکار پر تھا۔ حج کے سفر میں اگر ان کے پاس زاد سفر ختم ہو جاتا یا کم ہو جاتا تو راستے میں کسی چیز کا ملنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ اب نہ تو ان کیلئے کوئی تجارت کا موقع تھا اور نہ گلہ بانی کا۔ ایک ہی صورت تھی' جس سے ان کی معاشی ضرورتیں پوری ہو سکتی تھیں' وہ شکار تھی۔ جب اس سے انہیں روک دیا گیا تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتنی شدید آزمائش تھی اور اس آزمائش کو مزید

Marfat.com

شکل اس حوالے سے بنا دیا گیا کہ جانوروں کی ڈاروں کی ڈاریں ان کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ کتنے جانور تھے جو ان کے دائیں بائیں اچھلتے کودتے پھرتے تھے۔لیکن وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے بھی مجاز نہ تھے اور پھر بنی اسرائیل کی آزمائش تو ایک دن کیلئے تھی اور یہ تو جتنے دنوں حالت احرام میں رہتے اتنے ہی دنوں یہ آزمائش بھی جاری رہتی۔لیکن چونکہ اس امت کو آخری امت کے طور پر ایک عظیم مقصد کیلئے تیار کیا جا رہا تھا' اس لئے ان کے ایمان وعمل کو جلا بخشنے اور ان کے تقویٰ میں گہرائی پیدا کرنے کیلئے انہیں ایسی آزمائشوں سے گزارنا بہت ضروری تھا تا کہ ان کے اندر وہ جوہر پیدا ہو سکے اور وہ حقیقی ملکہ ان کے اندر راسخ ہو سکے جو اصلاً زندگی کی پاکیزگی کی ضمانت ہے۔اس کو بیان کرنے کیلئے ارشاد فرمایا: لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ کہ مسلمانوں کو اس آزمائش میں ہم نے اس لئے ڈالا ہے تا کہ اللہ ممیز کر دے ان لوگوں کو جو اللہ سے غیب میں رہ کر ڈرتے ہیں' ان لوگوں سے جو غیب میں اللہ کو بھول جاتے ہیں۔

اللہ پر ایمان کی کیفیت اور اس کے ثمرات:

اللہ کو بن دیکھے ماننا' اس کی صفات کا یقین رکھنا' ہر وقت اس کی ذات کو متحضر رکھنا' اپنی تنہائیوں کو اس کی یاد سے آباد رکھنا' اپنی ذات کو ہر وقت اس کی دسترس میں سمجھنا اور اپنے دل ودماغ کے خیالات تک کو اس کے علم کی گرفت میں جاننا' یہ وہ تصورات ہیں جن کے نتیجے میں دل ودماغ میں وہ جوہر پیدا ہوتا ہے' جو ایک مضبوط سیرت وکردار یعنی تقویٰ کو جنم دیتا ہے' جس کے پیدا ہو جانے کے بعد شیطان کا کوئی حملہ کارگر نہیں ہوتا۔ ہوس کا بڑے سے بڑا بہلاوا بھی اپنا اثر پیدا کرنے سے عاجز رہتا ہے۔ انسان انتہائی عاجز ہوتے ہوئے بھی اس قدر مضبوط ہو جاتا ہے کہ نہ وہ بکتا ہے' نہ جھکتا ہے۔ نہ وہ کبھی سرکشی کا راستہ اختیار کرتا ہے اور نہ کبھی معصیت کا کوئی چھینٹا اس کے دامن کو داغ دار کر سکتا ہے۔ اگر وہ بادشاہ بھی ہو تو تخت پر بیٹھ کر بھی فقیری کرتا ہے' کیونکہ اسے یقین ہے کہ اس کا اللہ اسے دیکھ رہا ہے اور اگر وہ فقیر ہو تو قناعت اور خودداری کا ایسا پیکر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے اس کے چہرے پر شاہوں کی بے نیازی دیکھتے ہیں' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرا تعلق اس خالق کائنات سے ہے' جو کائنات کے تمام خزانوں کا مالک ہے۔ قرون اولیٰ میں مسلمانوں میں جو نہایت خوبصورت سیرت وکردار اور اعلیٰ صفات دیکھتے ہیں' ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تربیت نے اسلامی معاشرے کو جن مضبوط بنیادوں پر اٹھایا تھا' ان میں سب سے مضبوط بنیاد یہی تصور تھا کہ ہم ہر وقت اللہ کے سامنے ہیں' ہمارا ہر عمل اس کے علم میں ہے' ہمارے تصورات اور خیالات تک سے وہ واقف ہے' ہمارا کوئی عمل اس سے مخفی نہیں' ایک دن اس کے سامنے پیش ہونا ہے' وہ ہم سے ایک ایک بات' ایک ایک عمل اور ایک ایک لمحے کا حساب لے گا' اگر ہم نے کہیں بھی معصیت یا خیانت کا ارتکاب کیا ہو گا تو وہاں ہماری سخن سازی ہمیں بچا نہیں سکے گی' ہمارا ایک ایک رونگٹا ہمارے خلاف یا ہمارے حق میں گواہی دے گا۔ اللہ کے ساتھ اس مضبوط رشتے نے انسان کو یکسر بدل کے رکھ دیا۔

اصحاب سیر لکھتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمانوں کے احوال جاننے کیلئے دورے پر تھے کہ انہوں نے جنگل میں ایک چرواہے کو دیکھا' جو بکریاں چرا رہا تھا۔ اس سے کہا: میں بھوکا ہوں' مجھے کسی بکری کا دودھ پلاؤ۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت میرے ریوڑ میں کوئی دودھ دینے والی بکری نہیں۔ آپ نے کہا: تم کوئی بکری میرے پاس بیچ دو اور اسے ذبح کر کے مجھے کھلا دو اور مالک اگر تم سے پوچھے کہ بکری کہاں گئی تو اسے کہہ دینا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا۔ میری بھوک کا علاج ہو جائے گا اور تمہیں دام مل جائیں گے۔ اس نے یہ بات سن کر نہایت غصے سے حضرت عمرؓ کی طرف دیکھا اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا:

فاین اللہ ایھا الرجل ﴿اے شخص! پھر اللہ کہاں ہے' اللہ کہاں گیا؟﴾

Marfat.com

تم یہ سمجھتے ہو کہ مالک کو دھوکا دے کر میں اللہ کے عذاب سے بچ جاؤں گا؟ مالک تو نہیں دیکھ رہا' لیکن میرا اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو انسان کو گناہ سے بچاتا ہے اور ہمیشہ اسے راہ راست پہ چلنے کی ضمانت دیتا ہے۔ اسی کو پروردگار فرما رہے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کو اس لئے آزمائش میں ڈالا کہ لوگوں کو معلوم تو ہو سکے کہ کون ان دیکھے خدا سے دیکھے بغیر ڈرتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور اس کے بعد اس بات کو مکمل کرتے ہوئے فرمایا کہ جس آدمی یا جس قوم کو یہ دولت نصیب نہیں ہوتی کہ وہ آزمائشوں میں پڑ کر اپنے یقین اور ایمان کو مضبوط کر سکے کہ نہ دیکھے ہوئے بھی اللہ کو کبھی نہ بھولے' ایسی قوم اور ایسا فرد زندگی میں وہ رویہ اختیار کرتے ہیں' جس پر صرف ان کی خواہشات کی چھاپ ہوتی ہے۔ وہ ہوس کے اسیر ہو کر حیوانی زندگی گزارتے ہیں اور انسانی رشتوں کو پامال کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے اعمال کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کیلئے عذاب الیم ہے۔

قوانین حلت وحرمت ہر دور اور ہر زمانے کیلئے ہیں

حلت وحرمت کے حوالے سے یہاں ایک اور فتنے کا ذکر کر دینا شاید منفعت سے خالی نہ ہو۔ اگرچہ عام مسلمانوں کی اسلامی زندگی ابھی تک اس سے محفوظ ہے۔ لیکن بعض دانشور ایسے ہیں' جو مسلمان کہلاتے ہوئے بھی اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے جھجک محسوس نہیں کرتے کہ اسلام میں حلت حرمت کے تصور پر جو اس قدر زور دیا ہے کہ اس کی مخالفت کرنے والے کو عذاب الیم سے ڈرایا ہے' وہ کوئی اسلام کا مستقل فلسفہ نہیں بلکہ ایک عارضی حکم تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب میں چونکہ اشیائے خوردنی کی بہت کمی تھی' عرب کا بیشتر حصہ صحرا پر مشتمل تھا' بارشیں بہت کم ہونے کی وجہ سے عموماً قحط سالی کا سماں رہتا تھا' چند علاقوں کو چھوڑ کر کہیں بھی زراعت کا نام تک نہیں تھا' ایسی صورت حال میں مسلمان معاشرے کو جرائم سے بچانے اور بے اطمینانی کی کیفیت سے محفوظ رکھنے کیلئے یہ ضروری تھا کہ ان پر کچھ چیزیں حرام کر دی جاتیں تاکہ وہ ازخود بہت ساری چیزوں سے جب احتراز کریں گے تو تھوڑی چیزیں ان کی ضرورت کیلئے کفایت کر جائیں گی۔ اس طرح جزیرہ عرب کی معاشی پریشانیوں کا کسی حد تک علاج ہو سکے گا' لیکن آج جبکہ خود جزیرۂ عرب میں ہر طرح کی اشیاءِ ضرورت کی فراوانی ہے اور دنیا بھر سے ضرورت کی چیزیں وہاں پہنچ رہی ہیں اور پوری دنیا سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب آ گئی ہے اور کسی بھی ملک سے کسی ضرورت کی چیز کا درآمد کر لینا کوئی مسئلہ نہیں رہ گیا تو اب حلت وحرمت پر اتنا اصرار کرنا' کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔

ان دانشوروں کے ذہن میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دانش کے سوا اور سب کچھ ہے۔ اگر انہیں معمولی عقل ودانش بھی میسر ہوتی تو دو باتوں کا سمجھنا ان کیلئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ ایک یہ بات کہ اللہ کے احکام مستقل ہیں' کسی خاص علاقے یا کسی خاص زمانے کیلئے نہیں۔ علاوہ ازیں پروردگار نے قرآنِ کریم میں اور نبی کریم ﷺ کی زبان سے بھی مسلمانوں کو یہ بات مکہ معظمہ ہی میں باور کرا دی تھی کہ تمہاری معاشی تنگ دستی اور سیاسی مغلوبیت کا یہ زمانہ کوئی طویل نہیں بلکہ اسلام کے غلبہ عمومی کا دور عنقریب شروع ہونے والا ہے' جس میں اللہ تعالیٰ تمہیں ایسی فارغ البالی عطا فرمائیں گے کہ تم زکوٰۃ کا مال جھولیوں میں ڈال کر نکلو گے اور تمہیں زکوٰۃ لینے والا نہیں ملے گا۔ تعجب کی بات ہے کہ جن لوگوں کو معاشی فراوانی کی خوشخبریاں سنائی جا رہی ہیں' کیا انہی لوگوں کو حلت وحرمت کے وقتی احکام دیئے جائیں گے؟

دوسری یہ بات کہ ان دانشوروں کا اپنے پروردگار کے بارے میں نجانے کیا تصور ہے کہ اگر وہ اس طرح بعض چیزوں کی حرمت کے احکام نازل نہ کرتا تو لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی حالانکہ ایک معمولی آدمی بھی جانتا ہے کہ اللہ کے خزانے بے شمار اور بے پناہ ہیں' جن میں قیامت تک کبھی کمی نہیں آئے گی۔ دنیا ظلم کے ذریعے بعض لوگوں کو بھوکا مرنے پر مجبور کر دے تو اور بات ہے ورنہ اللہ کے پیدا کردہ وسائل ہر دور میں

Marfat.com

اس کی مخلوق کی ضرورت سے زیادہ رہے ہیں نیز ہمارے پیش نظر تو صرف انسانی ضرورتیں ہیں' اس کی مخلوقات تو بے شمار ہیں' جن میں سے بیشتر کو ہم نہیں جانتے۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ ان کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتا ہے' پھر بھی اس کے خزانوں میں کبھی کمی نہیں آتی۔ اسرائیلی روایات میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا سے منفرد حکومت عطا کی کہ ان کی رعایا میں انسانوں کے ساتھ ساتھ جنات اور پرندے بھی شامل تھے اور بہت سارے عناصر قدرت پر انہیں اختیار عطا فرمایا گیا تھا تو انہوں نے اپنے وسیع اختیارات کو دیکھتے ہوئے پروردگار سے دعا کی کہ یا اللہ! آپ نے مجھے اتنی بڑی حکومت عطا فرمائی ہے اور ایسے وسائل بخشے ہیں' میں ان کے شکر کے طور پر یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن تیری ساری مخلوق کی دعوت کروں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سلیمان! تم ایسا نہیں کر سکتے' تمہارے وسائل اس کیلئے کافی نہیں۔ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کے بار بار التجا کرنے پر اللہ تعالیٰ نے اجازت دے دی۔ کہا جاتا ہے کہ جنات نے دعوت کا اہتمام کیا۔ سینکڑوں میل لمبا دسترخوان بچھایا گیا۔ سہ پہر کے وقت سمندر سے ایک بہت بڑی مچھلی نے سر اٹھایا اور پوچھا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ آج میری دعوت سلیمان کے یہاں ہے' چنانچہ اسے کھانا کھانے کی دعوت دی گئی۔ مچھلی باہر آئی اور وہ اس دسترخوان کی بیشتر نعمتیں چٹ کر گئی اور پھر کہنے لگی کہ اور بھی کچھ ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا تم ابھی سیر نہیں ہوئی ہو؟ مچھلی نے کہا: کیا میزبان کی طرف سے مہمان کو ایسا جواب زیب دیتا ہے؟ مجھے تو روزانہ اللہ کی جانب سے اتنا ہی رزق مہیا کیا جاتا ہے۔ اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام پروردگار کے حضور سجدہ ریز ہو گئے اور استغفار کرتے ہوئے عرض کیا کہ یا اللہ! تو ہی رازق ہے' تیرے ہی خزانے اس قابل ہیں کہ وہ تیری مخلوق کی ضرورت کیلئے کافی ہو سکیں۔ یہ ایک عام سی مثال سہی' لیکن اس میں جو بات کہی گئی ہے' وہ اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقیت کو سمجھنے کیلئے کافی ہے۔ اس لئے یہاں حلت و حرمت کے حوالے سے جو کچھ کہا جا رہا ہے' وہ اصلاً اس بات کا امتحان ہے کہ انسان اللہ کے احکام کی اطاعت میں کہاں تک مخلص ہے اور وہ بن دیکھے کہاں تک اس سے ڈرتا ہے۔

سورۃ المائدہ کے آغاز میں' جانوروں کی حلت و حرمت کا ذکر کرتے ہوئے' پروردگار نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ حالت احرام میں شکار کو حلال نہ سمجھنا۔ لیکن اس کی حرمت کے بارے میں نہ تو تاکیدی حکم دیا اور نہ تفصیلی مسائل بیان فرمائے اور نہ یہ بتایا کہ اگر کوئی آدمی اس جرم کا ارتکاب کر بیٹھے تو دنیا میں اس کی تلافی کی کیا صورت ہو گی اور آخرت میں وہ اس کی جواب دہی سے کس طرح بچ سکے گا۔ ابھی ہم نے جس آیت کریمہ کا مطالعہ کیا ہے' اس میں بھی بطور آزمائش اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن صراحتاً ان باتوں میں سے کسی بات کا تذکرہ نہیں کیا۔ ظاہر ہے جب بھی کوئی آدمی سورۃ المائدہ کی پہلی آیت اور اس رکوع کی پہلی آیت کو پڑھے گا تو اس کے ذہن میں یقیناً تفصیلی احکام کے بارے میں سوالات پیدا ہوں گے' چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں انہی سوالات کا جواب دیا گیا ہے:-

آیت: ۹۵ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْیًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِیْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا لِّیَذُوْقَ وَ بَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝ ''اے ایمان والو! حالت احرام میں شکار نہ کیجیو اور جو تم میں سے اس کو قصداً مارے گا تو اس کا بدلہ اسی طرح کا جانور ہے' جیسا کہ اس نے مارا ہے' جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر آدمی کریں گے یہ نیاز کی حیثیت سے خانہ کعبہ کو پہنچایا جائے۔ یا کفارہ دینا ہو گا مسکینوں کو کھانا یا اس کے برابر روزے رکھنے ہوں گے' تا کہ وہ اپنے کئے کا وبال چکھے' جو ہو چکا اللہ نے اسے درگزر کیا۔ لیکن جو کوئی پھر کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ غالب اور انتقام والا ہے''۔

Marfat.com

حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت

اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلے حالت احرام میں شکار کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ لیکن اس میں دو باتوں کا جان لینا بہت ضروری ہے' ورنہ اس حکم کے سمجھنے میں کوتاہی ہوگی۔ پہلی بات یہ کہ حالت احرام میں ہی شکار کرنا حرام نہیں بلکہ حرم کی حدود میں شکار کرنا بھی حرام ہے۔ حرم کی حدود میں آدمی احرام کی حالت میں ہو تب بھی شکار کرنا حرام ہے اور احرام کی حالت میں نہ ہو' تب بھی شکار کرنا حرام ہے۔ دوسری بات جس کا جاننا ضروری ہے وہ یہ کہ شکار خواہ مُحرم خود کرے یا کسی دوسرے کو شکار میں کسی طور پر مدد دے' دونوں باتیں حالت احرام میں منع ہیں۔ یعنی کوئی شکار سامنے سے گزر رہا ہو اور محرم خود تو شکار نہ کرے' لیکن کسی دوسرے کو متوجہ کر کے کہہ دے یا اشارۃً کہہ دے' کسی طرح بھی اگر اس شکار میں وہ اعانت کا مرتکب ہوگا تو گنہگار بھی ہوگا اور اس شکار کا گوشت کھانا اس کیلئے حرام بھی ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی اور آدمی محرم کی خاطر شکار کرے' تب بھی اس کا کھانا محرم کیلئے جائز نہیں۔ البتہ اگر کسی شخص نے اپنے لئے خود شکار کیا ہو اور پھر وہ اس میں سے محرم کو بھی تحفتاً کچھ دے دے تو اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ شکار نہ کرنے کے اس حکم سے موذی جانور مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً چوہا، سانپ' بچھو' باولا کتا' کوا' چیل یا کوئی بھی جانور جو حملہ کرنے کا عادی ہو ایسے تمام نقصان پہنچانے والے جانور حالتِ احرام میں بھی مارے جاسکتے ہیں۔

حالتِ احرام میں شکار کا کفارہ

دوسری بات جو اس آیت کریمہ میں بیان فرمائی گئی ہے' وہ یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی حالت احرام میں ہونے کے باوجود عمداً اس گناہ کا ارتکاب کرے تو اس کا کیا حکم ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ایسا شخص کفارہ ادا کرے۔ اس کی تین صورتیں ہیں: ایک یہ کہ جس طرح کا جانور اس نے شکار کیا ہے' اسی قبیل کا جانور گھریلو چوپایوں میں سے کفارہ کے طور پر قربان کرے۔ اس میں البتہ علماء میں اختلاف ہے کہ ایسا گھریلو جانور جو شکار کے جانور کے مشابہ ہو' کفارے میں قربان کرنا ضروری ہے یا اس کی قیمت طے کرنے کے بعد کوئی جانور خرید کر ذبح کیا جاسکتا ہے۔ البتہ! یہ ضروری ہے کہ قیمت طے کی جائے یا پالتو جانوروں میں سے اس جیسا جانور لیا جائے' اسے کعبہ شریف یعنی حرم کی حدود میں پہنچایا جائے۔ وہاں اسے ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جانا چاہئے۔ جہاں تک جانوروں کا مثیل تلاش کرنے کا سوال ہے' یہ کوئی مشکل کام نہیں کیونکہ پروردگار نے جنگلی اور پالتو جانوروں میں سے بہت سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے پیدا فرمائے ہیں۔ مثلاً ہرن کی جگہ بکری' دنبہ' مینڈھا وغیرہ۔ نیل گائے اور گورخر کی جگہ' گائے وغیرہ۔ لیکن جہاں یہ مثلیت کا مسئلہ حل نہ ہو سکے' وہاں تو سب کے نزدیک قیمت ہی اس کا بدل ہو سکتی ہے اور قیمت ہی طے ہونی چاہئے اور اگر یہ جانور کی قربانی مشکل ہو جائے تو اس جانور کی قیمت کی نسبت سے مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے اور اگر یہ بھی اس کیلئے دشوار ہو تو آخری درجہ میں اتنے روزے رکھے' جتنے مسکینوں کو کھانا کھلانا اس پر عائد ہوتا ہے۔ رہا اس عمل کا فیصلہ کہ شکار کردہ جانور کا مثل اور بدل پالتو چوپایوں میں سے کون سا چوپایہ ہوسکتا ہے تو اس کا فیصلہ اور اس کے متعذر ہونے کی صورت میں اس کی قیمت یا مساکین کو کھانا کھلانا یا روزوں کی تعداد کا فیصلہ تو یہ کام مسلمانوں میں سے دو ثقہ آدمی کریں گے' تاکہ جرم کے مرتکب کیلئے اپنے نفس کی جانبداری کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ اس سلسلے میں فقہاء نے بعض تفصیلی مسائل کا بھی ذکر کیا ہے' جنہیں ہم معارف القرآن سے نقل کر رہے ہیں۔

مسئلہ 1: صید (شکار) جو کہ حرم اور احرام میں حرام ہے' عام ہے' خواہ ماکول (یعنی حلال جانور ہو) یا غیر ماکول (یعنی حرام) (لاطلاق الآیۃ)

Marfat.com

مسئلہ 2: صید یعنی شکار' ان جانوروں کو کہا جاتا ہے' جو وحشی ہوں' عادۃً انسانوں کے پاس نہ رہتے ہوں' پس جو خلقۃً اہلی ہوں' جیسے بھیڑ' بکری' گائے' اونٹ' ان کا ذبح کرنا اور کھانا درست ہے۔

مسئلہ 3: البتہ! جو دلیل سے مستثنیٰ ہو گئے ہیں' ان کو پکڑنا' قتل کرنا' حلال ہے۔ جیسے دریائی جانور کا شکار' لقولہ تعالیٰ اُحِلَّ لَکُمۡ صَیۡدُ الۡبَحۡرِ'' اور بعضے خشکی کے جانور' جیسے کوا' چیل' بھیڑیا' سانپ' بچھو اور کاٹنے والا کتا' اسی طرح جو درندہ خود حملہ کرے' اس کا قتل بھی جائز ہے' حدیث میں ان کا استثناء مذکور ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اَلصَّیۡدُ میں ''الف لام'' عہد کا ہے۔

مسئلہ 4: شکارِ حرم کو جس طرح قصداً قتل کرنے پر جزاء واجب ہے' اسی طرح خطاء و نسیان میں بھی واجب ہے۔ (اخرجہ الروع)

مسئلہ 5: جیسا پہلی بار میں جزاء واجب ہے' اسی طرح دوسری' تیسری بار قتل کرنے پر بھی واجب ہے۔

مسئلہ 6: حاصل جزاء کا یہ ہے کہ جس زمان اور جس مکان میں یہ جانور قتل ہوا ہے' بہتر تو یہ ہے کہ دو عادل شخصوں سے اور جائز یہ بھی ہے کہ ایک ہی عادل شخص سے' اس جانور کی قیمت کا تخمینہ کرائے۔ پھر اس میں یہ تفصیل ہے کہ وہ مقتول جانور اگر غیر ماکول ہے' تب تو یہ قیمت ایک بکری کی قیمت سے زیادہ واجب نہ ہوگی اور اگر وہ جانور ماکول تھا تو جس قدر تخمینہ ہوگا' وہ سب واجب ہوگا اور دونوں حال میں اس کو تین صورتوں میں اختیار ہے' خواہ تو اس قیمت کا کوئی جانور حسب شرائط قربانی کے خرید لے اور حدودِ حرم کے اندر ذبح کر کے فقراء کو بانٹ دے اور یا اس قیمت کے برابر غلہ حسب شرائط صدقہ فطر کے فی مسکین نصف صاع' فقراء کو دے دے اور یا بحساب فی مسکین نصف صاع' جتنے مساکین کو وہ غلہ پہنچ سکتا ہو اتنے شمار سے روزے رکھ لے اور تقسیم غلہ اور روزوں میں حرم کی قید نہیں اور اگر قیمت نصف صاع سے بھی کم واجب ہوئی ہے تو اختیار ہے خواہ ایک مسکین کو دے دے یا ایک روزہ رکھ لے۔ اسی طرح اگر فی مسکین نصف صاع دے کر نصف صاع سے کم بچ گیا تو بھی یہی اختیار ہے کہ خواہ وہ بقیہ ایک مسکین کو دے دے یا ایک روزہ رکھ لے۔ نصف صاع کا وزن ہمارے وزن کے اعتبار سے پونے دو سیر ہوتا ہے۔

مسئلہ 7: تخمینہ مذکور میں جتنے مساکین کا حصہ قرار پاوے' اگر ان کو دو وقت کھانا شکم سیر کر کے کھلاوے تب بھی جائز ہے۔

مسئلہ 8: اگر اس قیمت کے برابر ذبح کیلئے جانور تجویز کیا' مگر کچھ قیمت بچ گئی تو اس بقیہ میں اختیار ہے' خواہ دوسرا جانور خرید لے یا اس کا غلہ دے دے یا غلہ کے حساب سے روزے رکھ لے۔ جس طرح قتل میں جزاء واجب ہے' اسی طرح ایسے جانور کو زخمی کرنے میں بھی تخمینہ کرایا جائے گا کہ اس سے جانور کی کس قدر قیمت کم ہوگئی۔ اس مقدار قیمت میں پھر وہی تین مذکورہ صورتیں جائز ہوں گی۔

مسئلہ 9: محرم کو جس جانور کا شکار کرنا حرام ہے اس کا ذبح کرنا بھی حرام ہے۔ اگر اس کو ذبح کرے گا تو اس کا حکم مردار کا سا ہوگا (وفی لا تقتلوا اشارة الیٰ ان ذبح کالقتل)۔

مسئلہ 10: اگر جانور کے قتل ہونے کی جگہ جنگل ہے تو جو آبادی اس سے قریب ہو' وہاں کے اعتبار سے تخمینہ کیا جائے گا۔

مسئلہ 11: اشارہ و دلالت و اعانت شکار میں' مثل شکار کرنے کے حرام ہے۔

شکار کے جرم کے ارتکاب پر کفارے کی تفصیل بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا:

لِّیَذُوۡقَ وَبَالَ اَمۡرِهٖ ﴿ تا کہ وہ اپنے کیئے کا وبال چکھے ﴾

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کفارہ اس گناہ کا وبال یعنی سزا ہے۔ یہ سزا عام نگاہوں میں تو معمولی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن صحرائے عرب کے رہنے

Marfat.com

والے جو بنیادی انسانی ضرورتوں میں بھی خود کفیل نہیں تھے' ان میں ایک عام آدمی کیلئے یہ کفارہ ادا کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ اس لئے عام آدمی کیلئے تو یہ کسی سزا سے کم نہ تھا۔ قانون سازی چونکہ ہمیشہ عام افراد کو دیکھ کے کی جاتی ہے اور پھر مقصود صرف سزا دینا نہیں ہوتا بلکہ اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سزا کے نتیجے میں گناہ کی شناعت اور مذمت کا تصور دلوں میں راسخ ہو جائے کیونکہ جب تک یہ تصور دلوں میں جڑ نہیں پکڑتا نہ اطاعت آسان ہوگی' نہ آدمی گناہ سے نفرت کرے گا۔ اس لئے اصل مقصد اور عربوں کی عام حالت کو دیکھتے ہوئے یہ کفارہ واقعی ایک سزا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ذہنوں میں رہنی چاہئے کہ سزا یعنی کفارہ وغیرہ سے اگرچہ قانونی ضرورت تو پوری ہو جاتی ہے اور وقتی طور پر تنبیہ کا عمل بھی مکمل ہو جاتا ہے' لیکن اسے کارآمد اور مثمر بنانے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ دل کی آمادگی' رجوع الی اللہ اور توبہ کی توفیق بھی میسر آئے ورنہ امراء کا طبقہ تو ایسے کفاروں کو دفع الوقتی کا ایک ذریعہ سمجھ کر اس کے ارتکاب کی جسارت سے کبھی نہیں رکے گا کیونکہ انہیں ایسا کفارہ ادا کرتے ہوئے کوئی بڑا مالی بوجھ برداشت نہیں کرنا پڑے گا۔ اس لئے اس کی حقیقت جیسا کہ عرض کیا ہے توبہ ہے اور جو آدمی کفارہ ادا کرنے کے ساتھ توبہ نہیں کرتا اور اللہ سے رجوع کر کے استغفار نہیں کرتا' اس کیلئے یہ کفارہ اس کی گناہ کی تلافی نہیں بنے گا اور قیامت کے دن اسے ناگفتہ بہ صورت حال سے واسطہ پڑے گا۔ اس کے بعد اس آیت کریمہ کے آخر میں مزید ایک توجہ دلانے والی بات ارشاد فرمائی گئی ہے:

عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ O

﴿اب تک جو ہو چکا' اللہ نے اس سے درگزر کیا۔ لیکن جو کوئی پھر اس کا اعادہ کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ غالب اور انتقام والا ہے۔﴾

اس سے پہلے اگرچہ یہ بات معلوم تھی کہ احرام کی حالت میں شکار کرنا جائز نہیں۔ لیکن نہ تو اس کی پوری تفصیل ذکر فرمائی گئی تھی اور نہ اسے اس امت کیلئے آزمائش کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اب اس بات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ جس طرح ہم نے مچھلیوں کے شکار کو بنی اسرائیل کیلئے آزمائش بنایا تھا اور انہیں واضح طور پر بتا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے آزما رہا ہے' لیکن جب وہ مچھلیوں کے شکار سے باز نہ آئے اور اس آزمائش میں ناکام ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک ہولناک سزا دی کہ وہ تاریخ میں عبرت بن کے رہ گئے۔ اسی حوالے سے یہاں بھی فرمایا جا رہا ہے کہ ہم تمہیں واضح طور پر بتا چکے ہیں کہ ان کیلئے بحری شکار آزمائش تھا اور تمہارے لئے بری شکار کو آزمائش بنایا گیا ہے۔ اگر تم ان کی طرح اس آزمائش میں ناکام ہو گئے اور اللہ کے حکم کی تم نے خلاف ورزی کی تو یاد رکھو! تمہارا انجام بھی ان سے مختلف نہیں ہوگا اور جس طرح اللہ نے ان سے انتقام لیا' وہ تم سے بھی انتقام لے گا کیونکہ اس کے یہاں ایمان و عمل اور اطاعت امر کے سوا اور کسی خاص چیز کی اہمیت نہیں۔ بہتر سے بہتر نسبتیں بھی ایمان و عمل کے ساتھ ہی قابل لحاظ ٹھہرتی ہیں ورنہ وہ الٹی سزا کا موجب بنتی ہیں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ امت مسلمہ نے اس حکم کی اہمیت کو سمجھا اور خیر القرون میں اس آزمائش میں سرخرو ہو کر اللہ کی طرف سے انعامات کے مستحق ٹھہرے اور اللہ تعالیٰ نے زمین کے بڑے حصے پر انہیں خلافت سے نوازا اور وہ تمام وعدے پورے فرمائے جو قرآن کریم میں یا لسان نبوت سے ادا کئے گئے تھے۔

آج امتِ مسلمہ کی سب سے بڑی آزمائش

ان دونوں آیات میں آزمائش اور احکام الٰہی کی اطاعت کے حوالے سے جو کچھ ذکر کیا گیا' آج اس امت کو پوری طرح اس پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ آزمائش صرف حالتِ احرام میں شکار کرنے میں ہی نہیں بلکہ بدلتی ہوئی دنیا میں' کبھی اس کا کوئی حکم آزمائش بن جاتا ہے اور کبھی کوئی حکم

Marfat.com

آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدید معاشی زندگی کے تقاضے، تہذیب مغرب کے مطالبے اور عالم سیاست کی نزاکتیں امت مسلمہ کیلئے سب سے بڑی آزمائش بن گئی ہیں۔ اس آزمائش میں افراد اور حکمران' دونوں پوری طرح شریک ہیں اور یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ تقریباً سارا عالم اسلام پوری طرح ان آزمائشوں میں ناکام ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنے کیلئے کسی بڑی عقل کی ضرورت نہیں کہ اگر آزمائش میں ناکامی بنی اسرائیل کیلئے رسوائی کا باعث ہوسکتی ہے تو ہم اس سے بھی وسیع سطح پر قدم قدم پر جس طرح آزمائشوں میں ناکام ہی نہیں ہورہے بلکہ سرکشی اور بغاوت کی حدوں کو چھو رہے ہیں' اس کے بعد اگر ہمیں رسوائی سے واسطہ پڑے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ اس لئے یہ بات ازبس ضروری ہے کہ ہم ان آیات کے آئینہ میں اپنی صورت حال کو دیکھتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو پہچاننے کی کوشش کریں۔

مسلمانوں کو حالت احرام اور حرم میں شکار سے روک کر جس آزمائش میں مبتلا کیا گیا' اس میں دو باتیں قابل توجہ ہیں۔ پہلی یہ بات کہ بنی اسرائیل کو بحری شکار سے روکا گیا کیونکہ یہی ان کی اصل ضرورت تھی۔ لیکن یہ ممانعت ہفتے میں صرف ایک دن کیلئے تھی جبکہ مسلمانوں کو بری شکار سے روکا گیا کیونکہ خشکی کا سفر کرتے ہوئے یہی ان کی بڑی ضرورت تھی۔ لیکن یہ آزمائش ان معنوں میں سخت تھی کہ احرام کی مدت ایک آدھ دن نہیں ہوتی بلکہ میقات سے لے کر حرم تک پہنچنا بعض دفعہ کئی دنوں کا سفر ہوتا ہے اور پھر وہاں بھی ایام حج کئی دنوں پر مشتمل ہیں۔ اس لحاظ سے یہ آزمائش خاصی طویل تھی۔ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس کٹھن آزمائش میں مسلمانوں کو اس لئے ڈالا گیا ہے کیونکہ ان کی ذمہ داریاں' بنی اسرائیل کی نسبت زیادہ عظیم تھیں اور ان کا زمانہ بنی اسرائیل کی نسبت زیادہ طویل تھا اور یہ مسلم بات ہے۔

؎ جن کے رتبے ہیں' سوا ان کی سوا مشکل ہے

البتہ! بری سفر میں اگر زادِ سفر ختم ہو جائے تو شکار کے علاوہ دوسرے وسائل سے کسی نہ کسی حد تک ضرورتیں پوری کی جاسکتی ہیں۔ لیکن اگر عمرہ اور حج کے مسافر دریا یا سمندر کے راستے سفر کر رہے ہوں اور ان پر پانی کے شکار کی پابندی لگادی جاتی تو یہ ایک ایسی ناقابل برداشت پابندی ہوتی' جس کی تلافی کبھی نہ ہوسکتی۔ اس لئے کہ سمندری سفر میں ہمیشہ اس بات کا امکان رہتا ہے کہ طوفان آجانے یا ہواؤں کی سمت بدل جانے سے کشتیوں کو بعض دفعہ رکنا پڑے اور بعض دفعہ رفتار سست ہونے کے باعث چند دنوں کا سفر کئی دنوں تک طویل ہو جائے۔ اس صورت میں اگر ان کا زادِ سفر ختم ہو جاتا اور مچھلیاں پکڑنے کی انہیں اجازت نہ ہوتی تو وہ تو بھوک سے مرجاتے۔ اس لئے اللہ نے کرم فرمایا۔

آیت:۹۶ أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ ۚ وَ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ O ''اور تمہارے لئے دریا کا شکار اور اس کا کھانا' جائز کیا گیا' تمہارے اور قافلوں کے زادراہ کیلئے اور خشکی کا شکار جب تک تم احرام میں ہو تم پر حرام کیا گیا۔ اس اللہ سے ڈرتے رہو' جس کے حضور میں سب حاضر کئے جاؤ گے''۔

احرام کی حالت میں بحری شکار جائز ہے

اللہ تعالیٰ نے دریا اور سمندر کا شکار مُحرم کیلئے حلال فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اس کا کھانا بھی حلال ہے۔ یہ اس لئے فرمایا گیا کہ بری سفر میں محرم کیلئے جس طرح شکار کرنا حرام ہے' اسی طرح اس کا کھانا بھی حرام ہے۔ حتیٰ کہ وہ خود شکار نہ بھی کرے' لیکن دوسرے آدمی کو شکار کی طرف راہنمائی کرے تو تب بھی اس کیلئے اس شکار کا کھانا حرام ہے۔ ہاں! کوئی آدمی اگر اپنے لئے شکار کرے اور وہ تحفتاً اس محرم کو کچھ بھیج دے تب اس کیلئے کھانا حلال

Marfat.com

ہے۔لیکن بحری شکار کیلئے مطلقاً یہ اجازت دے دی کہ تم اس کا شکار بھی کر سکتے ہو اور اسے کھا بھی سکتے ہو اور مزید یہ بات بھی کہ اگر اس شکار سے تمہارے پاس کچھ بچ جائے تو تم زادِ سفر کیلئے اپنے ساتھ بھی لے جاسکتے ہو اور یہ معاملہ صرف انفرادی نہیں بلکہ قافلے بھی اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو ان کیلئے بھی اجازت ہے۔لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اب پروردگار نے اجازت دی ہے تو بری مسافر بھی شاید اس کی آرزو کرنے لگیں۔اسلئے وضاحت کیلئے یہ کہنا ضروری سمجھا گیا کہ بری شکار اس وقت تک تمہارے لئے حرام ہے' جب تک تم حالت احرام میں ہو۔

آیت کریمہ کے آخر میں وہی بات فرمائی گئی جو ان تمام ہدایات کا حاصل ہے کہ حلال اور حرام' جائز اور ناجائز' اپنی ذات میں مقصود نہیں بلکہ مقصود ان سے یہ ہے کہ اپنے ہر عمل اور اپنے ہر خیال میں تم ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہو اور ذہنوں سے یہ بات کبھی نکلنے نہ پائے کہ یہ زندگی تمہاری کتنی بھی دراز ہو جائے اور تمہیں خوشحالیاں کتنا بھی اس سے غافل کر دیں' ایک نہ ایک دن تمہیں اس کے حضور جانا ہے اور ایک ایک عمل کی جواب دہی کرنی ہے۔ درحقیقت آدمی کی فریب خوردگی کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ جب اللہ کی جانب سے اس کی نافرمانیوں پر گرفت نہیں ہوتی تو وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاید اس دنیا میں اور اس دنیا کے بعد بھی کوئی پوچھنے والا نہیں تو پھر وہ دلیر ہو کر من مانی کرنے لگتا ہے۔اس لئے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اس اللہ سے ڈرتے رہو کہ یہاں اگر وہ تمہیں مہلت دے رہا ہے تو آخر ایک دن اس کے حضور حاضر تو ہونا ہی ہے۔پھر اندازہ ہو سکے گا کہ یہاں کی غفلت' وہاں کتنی مہنگی پڑتی ہے۔ظفر علی خاں نے تنبیہ کرتے ہوئے ٹھیک بات کہی

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیرگیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

ایک محرم کیلئے حالت احرام میں اور ایک عام آدمی کیلئے حرم میں جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں اور جس طرح مسلمانوں کو ان شعائر کے احترام کی تعلیم اور تاکید کی گئی ہے' اس سے آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر ان پابندیوں اور ان تاکیدات کا مقصد کیا ہے۔اگلی آیت کریمہ میں انہی باتوں کو سلجھایا گیا ہے۔

آیت:۹۷ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ''اللہ نے کعبہ حرمت والے گھر کو لوگوں کے لئے مرکز بنایا اور حرمت کے مہینوں' قربانی کے جانوروں اور گلے میں پٹے پڑے جانوروں کو شعیرہ بنایا۔یہ اس لئے کہ تم جانو کہ اللہ جانتا ہے' جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے''۔

''کعبہ'' کو مرکزِ اسلام بنایا گیا ہے

یہ سوال کہ حرم اور احرام کے حوالے سے اس قدر پابندیاں کیوں عائد کی گئیں ہیں اور شعائر کے احترام پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے؟ اس کے جواب میں اس آیت کریمہ سے مختلف باتیں سمجھ آتی ہیں۔سب سے پہلی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایک امن و امان کا منطقہ قائم کیا ہے جہاں تک انسانی جنگ و جدال کا اثر نہیں پہنچنا چاہیے۔''کعبہ'' کو قِيٰمًا لِّلنَّاس یعنی مرکز اسلام قرار دیا گیا کیونکہ دنیا کے ہر گوشے کے لوگ ہر وقت' ہر موسم میں' ہر طرف سے اس کا رخ کرتے ہیں' پس لازم تھا' ایک امن و امان کا علاقہ قائم کیا جائے۔ایک امن کا شہر بنایا جائے۔ایک موسم کو امن کا موسم ٹھہرایا جائے

Marfat.com

تاکہ لوگ با آسانی بے کھٹکے اس گھر میں جمع ہو کر مراسم عبادت وعبودیت ادا کرسکیں۔ دنیا بھر میں جنگ وجدال کی آگ بھڑکی ہوئی ہو مگر عین اس معرکہ کے وسط میں، لڑنے بھڑنے والوں، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے والوں اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش کرنے والوں کے بیچ ایک امن وامان کا علاقہ ہو۔ جہاں پر مختلف اجناس وانواع کے لوگ ہر قسم کے اختلافات کو بھلا کر اپنے مالک کے حضور میں ہدیہ عبادت وعبودیت پیش کرسکیں۔ دنیا کے متحارب گروہ، متخاصم اقوام وملل اپنے ذاتی، قومی اور رنگ ونسل کے اختلافات کو نظر انداز کر کے بے خوف وخطر، امن وسلامتی کے ساتھ جمع ہوسکیں۔ ایک میدان میں، ایک عبادت گاہ میں ایک مسجد میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوسکیں۔ اس منطقے میں محبت، بھائی چارے اور امن وسلامتی کے پرچم پھڑ پھڑائیں۔ سب کا لباس ایک ہو، ہدف ایک ہو، معبود ایک ہو، ایک جیسے اعمال بجالا کر انسانیت کے ایک ہونے کا عملی ثبوت بہم پہنچا سکیں۔

دوسری بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ عرب میں کعبہ کی حیثیت محض ایک مقدس عبادت گاہ ہی کی نہ تھی بلکہ اپنی مرکزیت اور اپنے تقدس کی وجہ سے وہی پورے ملک کی معاشی وتمدنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا۔ حج اور عمرے کیلئے سارا ملک اس کی طرف کھنچ کر آتا تھا اور اس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہوئے عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہوتا، مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدنی روابط قائم کرتے، شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی نصیب ہوتی اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی معاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرام مہینوں کی بدولت عربوں کو سال کا ایک تہائی زمانہ امن کا نصیب ہو جاتا۔ مختصر یہ کہ یہی زمانہ تھا جس میں ان کے قافلے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بسہولت آتے جاتے تھے۔ قربانی کے جانوروں اور قلادوں کی موجودگی سے بھی اس نقل وحرکت میں بڑی مدد ملتی تھی کیونکہ نذر کی علامت کے طور پر جن جانوروں کی گردن میں پٹے پڑے ہوتے، انہیں دیکھ کر عربوں کی گردنیں احترام سے جھک جاتیں اور کسی غارت گر قبیلے کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی۔

بعض علماء نے تیسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ کا معنی صرف مرکز نہیں بلکہ یہ معنی بھی ہے کہ اللہ نے بیت اللہ کو سب لوگوں کی بقاء وقیام اور معاش ومعاد کی صلاح وفلاح کا ذریعہ بنایا اور اہلِ عرب اور اہلِ مکہ کو خصوصیت کے ساتھ اس کی برکات ظاہرہ اور باطنہ سے نوازا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک دنیا کا ہر ملک ہر خطہ اور ہر سمت کے لوگ اس بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرتے رہیں اور بیت اللہ کا حج ہوتا رہے یعنی جن پر حج فرض ہو وہ حج ادا کرتے رہیں۔ اس وقت تک یہ دنیا قائم اور محفوظ رہے گی اور اگر ایک سال بھی ایسا ہو جائے کہ کوئی حج نہ کرے یا کوئی شخص بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا نہ کرے تو پوری دنیا پر عذابِ عام آجائے گا۔ اسی مضمون کو امام تفسیر حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: ''لو ترکوہ عاما واحد الم ینظروا ولم یؤخروا (بحر محیط) اس سے معلوم ہوا کہ معنوی طور پر بیت اللہ اس پورے عالم کا عمود ہے، جب تک اس کا استقبال اور حج ہوتا رہے گا، دنیا قائم رہے گی اور اگر کسی وقت بیت اللہ کا یہ احترام ختم ہوا تو دنیا بھی ختم کر دی جائے گی۔ رہا یہ معاملہ کہ نظام عالم اور بیت اللہ میں جوڑ اور ربط کیا ہے؟ سو اس کی حقیقت معلوم ہونا ضروری نہیں، جس طرح مقناطیس اور لوہے اور کہربا اور تنکے کے ربط باہمی کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں، مگر وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو مشاہدہ میں آتی ہے اس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا، بیت اللہ اور نظام عالم کے باہمی ربط کی حقیقت کا ادراک بھی انسان کے بس میں نہیں، وہ خالق کائنات کے بتلانے ہی سے معلوم ہوسکتا ہے، بیت اللہ کا پورے عالم کی بقاء کیلئے سبب ہونا تو ایک معنوی چیز ہے، ظاہری نظریں اس کو نہیں پاسکتیں، لیکن عرب اور اہل مکہ کیلئے اس کا موجب امن وسلامتی ہونا، طویل تجربات اور مشاہدات سے ثابت ہے''۔

مختصر یہ کہ اللہ کا یہ گھر امت مسلمہ کیلئے ایک مقناطیس کی حیثیت رکھتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ جسدِ امت میں اس کی حیثیت دل کی ہے۔ آج بھی وہ پورے عالم اسلام سے صالح عناصر کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور ان کی شریانوں میں ایمان وعمل کا خون دوڑا کر انہیں ان کے علاقوں میں واپس بھیج دیتا ہے

Marfat.com

تا کہ واپس جا کر دنیا میں اسی انقلاب کو برپا کریں' جو انقلاب اس گھر سے پھوٹا تھا اور جس کی وحی سب سے پہلے اسی سرزمین پر اتری تھی اور یہیں سے اللہ کا آخری رسول پوری دنیا کا راہنما اور آئیڈیل بن کر اٹھا تھا اور دنیا نے اس کی راہنمائی سے وہ زندگی پائی تھی کہ جس کی طلب صدیوں سے دنیا کر رہی تھی۔ لیکن آج ہم اللہ کے اس گھر سے صحیح معنی میں اس لئے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہے کہ ہمارا اس سے تعلق' حقیقی نہیں بلکہ واجبی سا رہ گیا ہے۔ ہم اس کے سائے میں کھڑے ہو کر بھی اس کے پیغام سے ناآشنا رہتے ہیں۔ اس کا طواف ضرور کرتے ہیں' لیکن وہاں سے ہم اللہ اور اس کے دین سے وارفتگی کا سبق نہیں لیتے۔ اللہ کے گھر کے طواف کے بعد بھی زندگی بھر ہم اپنے معدے اور اپنی خواہشات کا طواف کرتے رہتے ہیں اور ہماری زندگی کی ترجیح وہ انقلاب نہیں ہوتا' جسے اللہ نے ''ھدی للعٰلمین'' قرار دیا تھا بلکہ ہم کبھی معاشی انقلاب کے چکر میں رہتے ہیں اور کبھی تہذیبی وسیاسی انقلاب ہمارا کعبہ مقصود بن جاتا ہے۔ اس لئے جب تک دو باتوں کا شعور ہمارے اندر نہیں ابھرتا۔ ایک یہ بات کہ کعبہ کی تاریخ اسلام کے دنیا میں آنے سے پہلے بھی اللہ کے بارے میں ہمیں کیا تصور دیتی ہے اور دوسری یہ بات کہ کعبۃ اللہ اور دوسرے شعائر اسلام سے ہمارا قلبی تعلق عروۃ الوثقیٰ کی طرح مضبوط نہ ہو جائے اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اس خطے کو اس وقت تک امن نہیں مل سکتا ہے' جب تک ہم خود دل ودماغ کے حقیقی امن واطمینان سے آشنا نہ ہوں۔

انہی دونوں حوالوں سے قرآن کریم کہتا ہے:

ذٰلِکَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ O

﴿تا کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کے سب حالات سے باخبر ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔﴾

اس مختصر سے جملے میں جیسے ابھی ہم نے عرض کیا ہے' دو باتیں ارشاد فرمائی گئیں۔ پہلی بات یہ کہ حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے صرف کعبۃ اللہ کی برکت سے جس طرح عرب کی زندگی رواں دواں رہی' اگر صرف اس انتظام پر ہی غور کر لیا جائے تو اس امر کی بین شہادت مل سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے مصالح اور ان کی ضروریات کا کیسا مکمل اور گہرا علم رکھتا ہے اور اپنے ایک ایک حکم کے ذریعہ سے انسانی زندگی کے کتنے شعبوں کو فائدہ پہنچا دیتا ہے۔ بدامنی کے یہ سینکڑوں برس جو محمد عربی ﷺ کے ظہور سے پہلے گزرے ہیں' جن میں تم لوگ خود اپنے مفاد سے ناواقف تھے اور اپنے آپ کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے' مگر اللہ تمہاری ضرورتوں کو جانتا تھا اور اس نے صرف ایک کعبہ کی مرکزیت قائم کر کے تمہارے لئے وہ انتظام کر دیا تھا' جس کی بدولت تمہاری قومی زندگی برقرار رہ سکی۔ دوسری بے شمار باتوں کو چھوڑ کر اگر صرف اسی ایک بات پر دھیان کرو تو تمہیں یقین حاصل ہو جائے کہ اللہ نے جو احکام تمہیں دیئے ہیں' ان کی پابندی میں تمہاری اپنی بھلائی ہے اور ان میں تمہارے لئے وہ وہ مصلحتیں پوشیدہ ہیں' جن کو نہ تم خود سمجھتے ہو اور نہ اپنی تدبیروں سے پورا کر سکتے ہو۔

دوسری یہ بات کہ حرم مکہ زمان ومکان کے اعتبار سے ہی امن وامان کا علاقہ نہیں ہے اور اس کا امن صرف حیوان وانسان کو ہی محیط نہیں ہے بلکہ انسانی ضمیر میں بھی یہ امن وامان کا منطقہ ہے۔ زمین پر برپا ہونے والی جنگ پہلے انسانوں کے ضمیر میں بھڑکتی ہے پھر وہ زمان ومکان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور اس کا اثر انسان اور حیوان سب پر محیط ہو جاتا ہے۔ حرم مکہ کا امن وامان سب سے پہلے انسانی قلوب وضمائر کے میدان جنگ میں قائم ہوتا ہے۔ احرام باندھنے والا اور حدِ حرم کے اندر داخل ہونے والا چرند پرند کی طرف اپنا ہاتھ نہیں بڑھاتا۔ درآنحالیکہ حرم سے باہر وہ انسان کے لئے حلال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ذہنی وقلبی اور اخلاقی تربیت کیلئے حرمِ مکہ اور حرمِ مدینہ کے احکام دیئے ہیں تا کہ انسان ان کے ذریعے سے اخلاقی عظمت حاصل کرے اور ملاءِ اعلیٰ سے متصل ہو سکے۔ دنیا بھر میں امن وامان کا کوئی علاقہ نہیں اور نہ اس کا کوئی زمانہ متعین ہے۔ اسلام نے زمان ومکان ہر دو کے امن و

Marfat.com

امان اور اکرام واحترام کے احکام دے کر اس کمی کو پورا کیا ہے۔

زمان ومکان کے امن سے بہت پہلے ضمیر انسانی کا امن درکار ہے۔ جب تک انسانی قلب وضمیر مامون نہ ہو باہر کے امن کا سوال خارج از بحث رہے گا۔ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿یہ اس لئے ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کو جانتا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔﴾

جب تک انسانی ضمیر میں یہ احساس زندہ نہ ہو کہ اللہ میری ہر حرکت وسکون کو جانتا ہے۔ وہ میرا محاسبہ کرنے والا ہے۔ مجھے اپنے کردار کا اچھا یا برا بدلہ مل کر رہے گا۔ اس وقت تک حقیقی اطمینان مفقود رہے گا اور جب انسانی نفوس بے امنی اور اضطراب کا شکار ہو جائیں گے تو یہ دنیا درندوں کا بھٹ بن جائے گی۔ انسانوں کو یہ علم ہونا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی طبیعت' اس کی حاجات' اس کے ضمیر کی پوشیدہ آرزوؤں اور اس کی روح کی پکار کو جانتا ہے۔ اور اس نے یہ شریعت عین طبائع بشریہ کے مناسب احوال قائم کی ہے۔ جب انسانوں کو پتہ چل جائے کہ اللہ کی شریعت میں ان کیلئے رحمت ہے۔ اس کا قانون ان کی حاجات کے بالکل مطابق ہے تو انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ واقعی اللہ کائنات کی ہر چیز کو جانتا ہے۔ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

اس کے علم پر مکمل یقین اور ایمان چونکہ ایک مومن کی دینی زندگی کی اساس ہے' اس لئے پروردگار نے آیت کریمہ کے اس حصے میں اپنے علم کو فعلاً بھی بیان کیا ہے اور صفتاً بھی۔ اس لئے کہ اللہ کا علم ماضی' حاضر' مستقبل' ظاہر' باطن' غائب' موجود' مضمر' سب پر محیط ہے اور انسان کا اللہ کے علم کے متعلق یہی عقیدہ ہے' جو اس کے اندر خشیت پیدا کرتا ہے۔

اللہ کے بارے میں جب آدمی کا یہ یقین مستحکم ہو جائے کہ وہ میرے ایک ایک عمل سے واقف ہے اور یہ بات بھی ذہن میں مستحضر ہو کہ وہ صفت عدل کا مالک بھی ہے تو پھر اس کے اندر وہ برائی اور وہ خرابی پیدا نہیں ہو سکتی' جو ہر امت میں موجود رہی ہے اور آج اس امت میں بھی ایک بڑی تعداد اس برائی میں مبتلا ہے۔ وہ برائی یہ ہے کہ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ ایک رحم کرنے والی ذات ہے اور اس کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے۔ دنیا میں ماں سب سے زیادہ محبت کرنے والی ذات کے طور پر مشہور ہے اور اللہ کے بارے میں ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ رحیم و کریم ہے' جتنی ایک ماں اپنے بچوں پر ہوتی ہے۔ مشاہدہ یہ ہے کہ کوئی ماں اپنے بچے کو تکلیف دینا تو دور کی بات ہے' تکلیف میں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی اور اگر اللہ کی ذات ماں سے زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بندوں کی بداعمالیوں سے ناراض ہو کر بندوں پر رحم کھانے کی بجائے انہیں جہنم کا ایندھن بنا دے۔ یہ وہ غلط تصور ہے جو اللہ کے علم کی شان سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے ہر امت کی طرح اس امت میں بھی پیدا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے شرعی احکام کی پابندی ایک تکلف بن کے رہ گئی ہے۔ چنانچہ اس کے ازالے کیلئے اگلی آیت میں ارشاد فرمایا گیا۔

آیت:۹۸ اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ؕ "جان رکھو! بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا بھی ہے اور بڑا بخشنے والا مہربان بھی ہے"۔

اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہی نہیں عادل بھی ہے

جب تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ کائنات کی ہر چیز کو جاننے کے ساتھ ساتھ ہمارے ہر عمل سے بھی مکمل آگاہی رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ صفت

Marfat.com

عدل کا مالک بھی ہے تو پھر تم یہ کیسے سمجھتے ہو کہ وہ اچھوں اور بروں کے ساتھ یکساں سلوک کرے گا۔ یعنی قیامت کے دن ایک آدمی ایسا آئے گا' جس نے زندگی بھر اس کی کبھی نافرمانی نہیں کی ہوگی بلکہ اس کی رضا پر چلتے ہوئے اپنی خواہشات کا گلا گھونٹا ہوگا اور اس کے احکام پر عمل کرتے ہوئے نجانے کتنی دفعہ اسے حالات سے لڑنا پڑا ہوگا' حتیٰ کہ اسی کے دین کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اس نے اس کے راستے میں جان بھی دی ہوگی اور دوسرا اس کے ساتھ ایک ایسا آدمی آئے گا' جس نے کبھی اللہ کے کسی حکم کے سامنے سر نہیں جھکایا ہوگا۔ اولاً تو اس کی کبریائی کو مانا نہیں اور اگر زبان کی حد تک مانا بھی تو اس پر عمل کبھی نہیں کیا۔ پوری زندگی اس نے اپنی خواہشات کی تکمیل میں گزار دی اور عیش و عشرت میں ڈوب کر اللہ کے پاس جا پہنچا۔ ان دونوں کے بارے میں پروردگار مکمل علم رکھتا ہے تو کیا انسانی عقل یہ سمجھتی ہے کہ ان دونوں کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہئے کیونکہ وہ غفور الرحیم ہے؟ قرآنِ کریم نے ایک دفعہ نہیں' متعدد دفعہ یہ بات فرمائی کہ کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم برائیوں کا ارتکاب کرنے والے اور نیکی کی زندگی گزارنے والوں کے ساتھ قیامت کے دن یکساں سلوک کریں گے؟ فرمایا:

سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ ﴿ کس قدر برا ہے' وہ فیصلہ جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ ﴾

اس آیتِ کریمہ میں یہی فرمایا جا رہا ہے کہ لوگو اس بات کو اچھی طرح سمجھو کہ اللہ کی صفت عدل کا تقاضہ یہ ہے کہ انسانی اعمال کی جزا و سزا کیلئے اس کی دونوں صفتیں بروئے کار آئیں۔ یعنی وہ سخت سزا دینے والا بھی ہے اور بخشنے والا مہربان بھی ہے۔ اسی بات پر ایک اور جگہ اس طرح ارشاد فرمایا کہ

﴿ میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں غفور الرحیم ہوں اور یہ بھی بتلا دو کہ میرا عذاب' عذاب الیم ہے۔ ﴾

رہی یہ بات کہ وہ کن باتوں پر رحم فرمائے گا اور کن باتوں پر عذاب دے گا۔ اس بات کو پروردگار نے ہماری عقلوں پر نہیں چھوڑا بلکہ اس کا کرم ہے کہ اس نے کتابیں اتاریں' رسول بھیجے اور سب سے آخر میں آخری رسول تشریف لائے' جنہوں نے پیغامبری کا حق ادا کر دیا اور جس کے بعد کہا جا سکتا ہے۔

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

اس رسول کے آجانے اور دین کے پوری طرح پہنچ جانے اور پیغامبری کے حق ادا ہو جانے کے بعد اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کن باتوں پر انعام فرمائیں گے اور کن باتوں پر سزا دیں گے۔

آیت:۹۹ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ○ ''رسول پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ اللہ جانتا ہے' جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو''۔

جو ذمہ داری اللہ کے رسول کی تھی' وہ انہوں نے بلا کم و کاست ادا کر دی۔ اب آگے ذمہ داری تمہاری ہے۔ تم مانو یا نہ مانو' عمل کرو یا نہ کرو۔ مانو گے تو اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے' نہ مانو گے تو اس کا انجام خود دیکھ لو گے۔ البتہ! اس غلط فہمی میں کبھی مبتلا نہ ہونا کہ تم اپنا کوئی عمل یا کوئی خیال اللہ سے چھپا سکتے ہو۔ وہ تمہارے ان اعمال سے بھی واقف ہے' جو تم ظاہر کرتے ہو اور ان اعمال سے بھی واقف ہے' جن کو تم چھپاتے ہو یا چھپاؤ گے کیونکہ قرآنِ کریم میں ہے کہ ہم قیامت کے دن لوگوں کے منہ پر مہریں لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے ان اعمال کی جو وہ کرتے رہے۔ ایسی صورتحال میں کس کی مجال ہوگی کہ وہ اپنا کوئی عمل' اپنے رب سے چھپا سکے۔ اس لئے ہماری پوری زندگی کی اصلاح کا دار و مدار اس

Marfat.com

بات پر ہے کہ ہم اللہ کی صفت علم پر مکمل یقین رکھیں۔اس کی عطا کی ہوئی راہنمائی کو ہر طرح کے شبہ سے بالاتر سمجھیں اور اپنے اعمال کے بارے میں ایسی کسی خوش گمانی کا شکار نہ ہوں کہ ہم اللہ کے سامنے جھوٹ بول کر یا سخن سازی سے کام لے کر شاید عذاب سے بچ جائیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان آیات کریمہ میں جہاں حلت و حرمت سے متعلق احکام کو بیان کیا جا رہا ہے' وہیں بعض ایسی فکری کج رویوں کی اصلاح بھی کی جارہی ہے' جس کے نتیجے میں افراد اور امتوں کے مزاج بگڑتے اور اخلاق تباہ ہوتے رہے ہیں۔انہی میں سے ایک فکری کج روی اچھائی اور برائی کو یکساں سمجھنے کی بھی ہے۔

آیت:۱۰۰ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ''کہہ دو کہ ناپاک اور پاک دونوں یکساں نہیں ہوسکتے' اگرچہ ناپاک کی کثرت تمہیں فریفتہ کرنے والی ہو۔پس اللہ سے ڈرتے رہو' اے اہل عقل! تاکہ تم فلاح پاؤ''۔

جہاں تک خبیث اور طیب یعنی پاک اور ناپاک اور اچھے اور برے کا تعلق ہے' یہ ایک ایسا سوال ہے جو انسانوں میں ہمیشہ قابل توجہ رہا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ہو ہر آدمی اس سوال سے تعرض کرتا ہے۔کھانے پینے کی بے شمار چیزیں ہیں' جب ہم انہیں اپنے لئے حاصل کرتے ہیں تو سب سے پہلا سوال جس سے ہماری عقل اور ہماری قوت ذائقہ کو واسطہ پڑتا ہے' وہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں کون سی اشیاء ہیں جو حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق ہیں اور کون سی چیزیں ہیں جو اس کے خلاف ہیں۔مجھے چونکہ اپنی صحت عزیز ہے' اس لئے میں اشیاء خوردنی میں سے ایسی کسی چیز کا انتخاب نہیں کرسکتا جو ذائقے اور شکل وصورت کے اعتبار سے چاہے کیسی ہی دلفریب کیوں نہ ہو' اگر وہ میری صحت کیلئے نقصان دہ ہوسکتی ہے تو میں اسے کبھی بھی قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔اسی طرح اگر ہم کوئی کاروبار کرتے ہیں تو پھر ہمیں اسی سوال سے واسطہ پڑتا ہے کہ کون سا کاروبار ہمارے لئے منفعت بخش ہوسکتا ہے؟ اس لئے ہم اس کاروبار کو اپنے لئے انتخاب کرتے ہیں' جس میں ہمیں منفعت کی زیادہ امید ہوتی ہے اور ایسے کسی کاروبار کو ہاتھ نہیں لگاتے جس میں نقصان کا اندیشہ ہو۔اگر ہم اپنے بچے کو حصول تعلیم کیلئے کسی تعلیمی ادارے میں داخل کرتے ہیں تو پھر یہی سوال ہمارے دامن گیر ہوتا ہے کہ بچے کو ایسے تعلیمی ادارے میں بھیجا جائے' جہاں اس کی ذہنی اور فکری تربیت ہوسکے اور اخلاق بھی پروان چڑھ سکیں اور اگر کوئی ادارہ لباس کی تراش خراش اور کھیلوں کی ترقی پر تو بہت زور دیتا ہو' لیکن وہاں نہ تعلیم ہے نہ اخلاق اگر ہم اپنی اولاد کے دشمن نہیں ہیں تو ہم کبھی اپنی اولاد کو وہاں بھیجنا پسند نہیں کرتے۔مختصر یہ کہ حیوان اور انسان میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ حیوان اپنی زندگی کے بیشتر معاملات میں خبیث اور طیب' اچھے اور برے کی تمیز میں کبھی نہیں پڑتا' وہ صرف شکم پروری اور لذت اندوزی کے سوا اور کسی بات کو نہیں جانتا۔

اسی طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خبیث اور طیب کے حوالے سے جو فیصلہ بھی ہم کریں' اس میں بہرصورت کثرت ہماری ترجیح نہیں ہوتی بلکہ اس میں بھی ہم اپنی صحت اپنی منفعت اور مستقبل کی بھلائی کو حتی الامکان نظر انداز نہیں ہونے دیتے۔لیکن مشکل یہ ہے کہ معاملہ چاہے خبیث اور طیب کا ہو اور چاہے خبیث کی کثرت کا' ہم باقی تمام معیارات کو قابل لحاظ سمجھتے ہیں۔لیکن حلت و حرمت کے معاملے میں اللہ کی اتھارٹی' سند اور کبریائی کو تسلیم کرنے کے باوجود ہم صرف اسی معیار پر اکتفا کرنے کیلئے تیار نہیں۔ہم جب دیکھتے ہیں کہ حلال کے دائرے میں رہتے ہوئے ہم ایک پر تکلف یا پر تعیش زندگی نہیں گزار سکتے تو ہم صرف گزارے کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ حلال کمائی سے زیادہ حرام ذرائع ہمیں عزیز ہوجاتے ہیں اور جب ہمیں کبھی اس کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے تو ہمارا عام طور پر عذر یہ ہوتا ہے کہ کیا کیا جائے' حلال میں رہ کر آسودہ زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خبائث میں مبتلا ہو کر آسودہ زندگی

Marfat.com

مل سکتی ہو تو ہمیں وہ عزیز ہے۔ لیکن حلال کی حدود میں رہ کر ایک سادہ زندگی اختیار کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلے اسی فکری کج روی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور ہمارے ہاتھوں میں ایک بالکل نیا ترازو دیا گیا ہے' جس میں سب سے پہلے تو یہ بات بتائی گئی ہے کہ جس طرح خبیث اور طیب کا اطلاق بری اور اچھی اشیاء پر ہوتا ہے۔ اسی طرح برے اور اچھے اشخاص پر بھی ہوتا ہے اور جس طرح ان اشیاء پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو مادی اعتبار سے بری اور اچھی ہیں' اسی طرح ان اشیاء پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو عقلی اور اخلاقی اعتبار سے اچھی یا بری ہیں۔ یہاں پیش نظر اشیاء اور اشخاص دونوں ہیں' لیکن جہاں تک اچھائی اور برائی کا تعلق ہے' وہ صرف اخلاقی پہلو سے زیر بحث ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے نزدیک خیر و شر' نیکی اور بدی' فسق اور تقویٰ' نیکوکار اور بدکار دونوں یکساں نہیں ہیں۔ اللہ خیرِ مطلق اور سراپا حق و عدل ہے' اس وجہ سے وہ صرف خیر کو پسند کرتا ہے' شر کو پسند نہیں کرتا' وہ صرف طیب کو قبول فرمائے گا' خبیث کیلئے اس کے ہاں جہنم کی آگ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اسکی تائید اسکے شانِ نزول سے بھی ہوتی ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ جب اسلام میں شراب کو حرام اور اس کی خرید و فروخت کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا تو ایک شخص نے جس کا کاروبار شراب فروشی کا تھا اور اس ذریعہ سے اس نے کچھ مال جمع کر رکھا تھا آنحضرت ﷺ سے سوال کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ! یہ مال جو شراب کی تجارت سے میرے پاس جمع ہوا ہے' اگر میں اس کو کسی نیک کام میں خرچ کروں تو کیا وہ میرے لئے مفید ہوگا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اگر تم اس کو حج یا جہاد وغیرہ میں خرچ کرو گے تو وہ اللہ کے نزدیک مچھر کے ایک پر کے برابر بھی قیمت نہ رکھے گا' اللہ تعالیٰ پاک اور حلال چیزوں کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔

حرام مال کی یہ بے توقیری تو آخرت کے اعتبار سے ہوئی اور اگر گہری نظر سے معائنہ کیا جائے اور سب کاموں کے اخروی اور اجتماعی انجام کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے کاروبار میں بھی حلال و حرام برابر نہیں ہوتے۔ حلال سے جتنے فوائد اور اچھے نتائج اور حقیقی آرام و راحت نصیب ہوتی ہے' وہ کبھی حرام سے نہیں ہوتی۔

دنیا کا ہر معاشرہ جرائم کی روز افزوں ترقی سے پریشان ہے اور وہ ساری انسدادی تدبیروں کے باوجود نہ جرائم پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکا ہے اور نہ مجرمانہ ذہنیت کو بدلنے میں۔ اگر اس صورت حال پر غور کرنے کی زحمت کر لی جائے تو بعض دوسرے اسباب سمیت ایک بڑا سبب یہ سامنے آئے گا کہ خبیث اور طیب کی تقسیم ختم کر کے اور ان دونوں کو یکساں حیثیت دے کر ہم نے جس طرح حلال کی بجائے حرام کا راستہ کھولا ہے اور جائز کی بجائے ناجائز کو فروغ دیا ہے اور مادی زندگی کو جس طرح اخلاقی زندگی پر برتری دی ہے' یہ جرائم اور مجرمانہ ذہنیت دونوں اس کے منطقی نتائج ہیں۔ محنت و کوشش سے حلال کمائی کی بجائے' اگر حرام ذرائع سے چند دنوں میں دولت و امارت حاصل کی جا سکتی ہے اور معاشرہ ایسے شخص کو صرف دولت مند ہونے کی وجہ سے عزت کے مناصب پر بٹھانے میں فخر محسوس کرتا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ ان رستوں پر چلنے والوں کو آخر جرائم کے ارتکاب سے کس طرح روکا جا سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں رشوت بھی عام ہوگی' سمگلنگ بھی بڑھے گی' چوریاں اور ڈاکے بھی ہوں گے' دھوکہ دہی کی وارداتیں بھی ہوں گی اور جب ان کی برائی کا تصور بھی دلوں سے نکل جائے گا تو پھر ان کا راستہ روکنے کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کے روکنے کی ایک ہی صورت ہے کہ قرآنِ کریم کا دیا ہوا تصور یعنی خبیث اور طیب کے فرق کو دل و دماغ میں راسخ کیا جائے۔

خبیث کتنا ہی زیادہ ہو طیب کے مقابلے میں کچھ نہیں

عجیب بات یہ ہے کہ خبیث اور طیب کا فرق جب سے مٹا ہے' ایک اور غلط ذہنیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ یہ کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اور عام کاروباری زندگی سے لے کر حکومت کے ٹیکس لگانے تک ہر جگہ یہ سوچ کارفرما ہے کہ حلال اور طیب کی پابندی سے نہ اجتماعی رفاہی ادارے وجود میں آ سکتے

Marfat.com

ہیں اور نہ ہی مالی اعتبار سے ترقی ہوسکتی ہے اس لئے یہ اگر برائی بھی ہے تو ایسی ناگزیر ہے جس کے ارتکاب کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے زمانہ عروج میں بھی اس سے احتراز کر کے یہ ثابت کیا کہ یہ ایک غلط ذہنیت ہے جس نے ہمیشہ انسانی معاشروں کو تباہ کیا ہے۔ تفسیر "درّ منثور" میں ہے کہ زمانہ تابعین کے خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جب اپنے سے سابق امراء کے ناجائز ٹیکس ختم کیے اور جن لوگوں سے ناجائز طور پر اموال لئے گئے تھے وہ واپس کیے تو نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ سرکاری بیت المال خالی ہو گیا اور آمدنی بہت محدود ہو گئی تو ایک صوبہ کے گورنر نے ان کی خدمت میں خط لکھا کہ بیت المال کی آمدنی بہت گھٹ گئی ہے فکر ہے کہ حکومت کے کاروبار کس طرح چلیں گے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں یہی آیت تحریر فرمائی اور لکھا کہ تم سے پہلے لوگوں نے ظلم و جور کے ذریعہ جتنا خزانہ بھرا تھا تم اس کے بالمقابل عدل و انصاف قائم کر کے اپنے خزانہ کو کم کر دو اور کوئی پرواہ نہ کرو ہماری حکومت کے کام اسی کم مقدار سے پورے ہوں گے۔ ان کی دو اڑھائی سال کی حکومت کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ عراق میں حجاج ابن یوسف کے تمام ظالمانہ ٹیکس جب ختم کر دیئے گئے تو بظاہر کمی کا یہی خدشہ پیدا ہوا لیکن دو ہی سالوں میں صوبہ کی آمدنی حجاج کے زمانے کے تمام ظالمانہ ٹیکسوں کے خاتمے کے باوجود حجاج کے زمانے سے کئی گنا بڑھ گئی۔ چنانچہ جب اس کی اطلاع حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو دی گئی تو آپ نے فرمایا کہ حجاج کو نہ دنیا کی سمجھ تھی نہ دین کی۔ اس نے یہ سمجھا کہ ظلم سے شاید ملک ترقی کرتے ہیں حالانکہ اللہ کی رحمتیں اور برکتیں عدل سے نازل ہوتی ہیں اور اس کے نتیجے میں زمین کی قوت روئیدگی میں اضافہ ہوتا ہے فصلیں پہلے سے زیادہ لہلہانے لگتی ہیں غلے کی پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے پھل دار درختوں کے پھلوں میں برکت آ جاتی ہے دودھ دینے والے جانوروں میں دودھ بڑھا دیا جاتا ہے اس طرح ایک عام برکت کی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس سے اللہ کے نیک بندے شادکام ہوتے ہیں۔ لیکن انسان اپنی اجتماعی زندگی میں ہمیشہ فریب نظر کا شکار رہتا ہے۔ وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ سو روپے بمقابلہ پانچ روپے کے لازماً زیادہ قیمتی ہیں کیونکہ وہ سو ہیں اور یہ پانچ۔ تو وہ اپنے انہی مادی پیمانوں کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے جس کا ابھی ذکر کیا گیا۔ لیکن یہ آیتِ کریمہ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب تک تم اپنے ان مادی پیمانوں کو توڑ کر اخلاقی پیمانے اختیار نہیں کرو گے تمہاری زندگی میں حقیقی آسودگی کبھی نہیں آ سکتی اور تم اس تباہ کن مستقبل سے کبھی نہیں بچ سکو گے جو اس صورت حال کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لئے تمہیں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام کے یہاں خبیث اور طیب ہرگز برابر نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سو روپے پانچ روپے سے زیادہ ہیں۔ لیکن سو روپے اگر اللہ کی نافرمانی کر کے حاصل کئے گئے تو وہ ناپاک ہیں اور پانچ روپے اگر اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے کمائے گئے تو وہ پاک ہیں اور ناپاک خواہ مقدار میں کتنا ہی زیادہ ہو بہرحال وہ پاک کے برابر کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ غلاظت کے ایک ڈھیر سے عطر کا ایک قطرہ زیادہ قدر رکھتا ہے اور پیشاب کی ایک لبریز ناند کے مقابلے میں پاک پانی کا ایک چلو زیادہ وزنی ہے۔ لہٰذا ایک سچے دانشمند انسان کو لازماً حلال ہی پر قناعت کرنی چاہئے خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی حقیر و قلیل ہو اور حرام کی طرف کسی حال میں بھی ہاتھ نہ بڑھانا چاہے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی کثیر و شاندار ہو۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ

مومنو ایسی چیزوں کے

اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا

بارے میں مت سوال کرو کہ اگر ان کی حقیقتیں تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری لگیں اور اگر قرآن کے نازل ہونے کے ایام میں ایسی

Marfat.com

حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ ۗ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٠١﴾

باتیں پوچھو گے تو تم پر ظاہر بھی کر دی جائیں گی (اب تو) خدا نے ایسی باتوں (کے پوچھنے) سے درگزر فرمایا ہے اور خدا بخشنے والا بردبار ہے

قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ﴿١٠٢﴾ مَا جَعَلَ اللَّهُ

اس طرح کی باتیں تم سے پہلے لوگوں نے بھی پوچھی تھیں (مگر جب بتائی گئیں تو) پھر ان سے منکر ہو گئے ﴿۱۰۲﴾ خدا نے نہ تو بحیرہ

مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ ۙ وَلَٰكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

کچھ چیز بنایا ہے اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام بلکہ کافر خدا پر

يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَأَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٠٣﴾ وَإِذَا قِيلَ

جھوٹ افترا کرتے ہیں۔ اور یہ اکثر عقل نہیں رکھتے ﴿۱۰۳﴾ اور جب ان لوگوں سے

لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا

کہا جاتا ہے کہ جو (کتاب) خدا نے نازل فرمائی ہے اس کی اور رسول اللہ کی طرف رجوع کرو تو کہتے ہیں کہ جس طریق

عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٠٤﴾

پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے وہی ہمیں کافی ہے۔ بھلا اگر ان کے باپ دادا نہ تو کچھ جانتے ہوں اور نہ سیدھے راستے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا

پر ہوں (تب بھی)؟ ﴿۱۰۴﴾ اے ایمان والو! اپنی جانوں کی حفاظت کرو۔ جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا کچھ بھی

اهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٠٥﴾

بگاڑ نہیں سکتا۔ تم سب کو خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے اس وقت وہ تم کو تمہارے سب کاموں سے جو (دنیا میں) کیے تھے آگاہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ

کرے گا (اور ان کا بدلہ دے گا) ﴿۱۰۵﴾ مومنو! جب تم میں سے کسی کی موت آ موجود ہو تو شہادت (کا نصاب) یہ ہے کہ وصیت

حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ

کے وقت تم (مسلمانوں) میں سے دو مرد عادل (یعنی صاحب اعتبار) گواہ ہوں یا اگر (مسلمان نہ ملیں اور) تم سفر کر رہے

Marfat.com

أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةُ الْمَوْتِ ۚ تَحْبِسُونَهُمَا

ہو اور اُس وقت تم پر موت کی مصیبت واقع ہو تو کسی دوسرے مذہب کے دو (شخصوں) کو گواہ کر لو اگر تم کو ان

مِنْ بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا

گواہوں کی نسبت کچھ شک ہو تو اُن کو (عصر کی) نماز کے بعد کھڑا کرو اور دونوں خدا کی قسمیں کھائیں کہ ہم شہادت کا

وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّا إِذًا لَمِنَ الْآثِمِينَ ﴿١٠٦﴾

کچھ عوض نہیں لیں گے گو ہمارا رشتہ دار ہی ہو۔ اور نہ ہم اللہ کی شہادت کو چھپائیں گے اگر ایسا کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ ف

فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰ أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا إِثْمًا فَآخَرَانِ يَقُومَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ

پھر اگر معلوم ہو جائے کہ ان دونوں نے (جھوٹ بول کر) گناہ حاصل کیا ہے تو جن لوگوں کا اُنہوں نے حق مارنا چاہا تھا

الَّذِينَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْأَوْلَيَانِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ لَشَهَادَتُنَا

اُن میں سے اُن کی جگہ اور دو گواہ کھڑے ہوں جو (میت سے) قرابت قریبہ رکھتے ہوں۔ پھر وہ خدا کی قسمیں کھائیں کہ ہماری

أَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَا إِنَّا إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠٧﴾ ذَٰلِكَ

شہادت اُن کی شہادت سے بہت سچی ہے اور ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ ایسا کیا ہو تو ہم بے انصاف ہیں۔ اس طریق

أَدْنَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِالشَّهَادَةِ عَلَىٰ وَجْهِهَا أَوْ يَخَافُوا أَنْ تُرَدَّ أَيْمَانٌ

سے بہت قریب ہے کہ یہ لوگ صحیح صحیح شہادت دیں یا اُس بات سے خوف کریں کہ (ہماری) قسمیں اُن کی قسموں کے

بَعْدَ أَيْمَانِهِمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاسْمَعُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

بعد رد کر دی جائیں گی۔ اور خدا سے ڈرو اور اُس کے حکموں کو (گوش ہوش سے) سنو۔ اور خدا نافرمان لوگوں کو ہدایت

الْفَاسِقِينَ ﴿١٠٨﴾ ع

نہیں دیتا

Marfat.com

تمہید

یہ بات اس سے پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ سورۃ المائدہ کے آخری چند رکوع توضیحی آیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سورۃ المائدہ میں جو اساسی امور بیان کئے گئے ہیں یا جو احکام ذکر کئے گئے ہیں' ان میں وقت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں ضرورت محسوس کی گئی کہ ان مجمل احکام کی وضاحت کی جائے اور اساسی امور کو کسی حد تک کھول کر بیان کر دیا جائے اور بعض دفعہ اس صورتحال سے جنم لینے والے سوالات' زبانوں پر بھی آئے یا ذہنوں میں مچلتے رہے تو پروردگار نے ان آخری رکوعوں میں ایسے تمام سوالات کے جوابات دیئے ہیں اور اساسی امور کیلئے جہاں وضاحت کی ضرورت تھی' وضاحت بھی کی گئی ہے اور جن احکام کی تکمیل کیلئے مزید آیات کا اترنا ضروری تھا' وہ تکمیلی آیات بھی نازل کی گئیں۔ چنانچہ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو اب ضرورت پیدا ہوئی کہ سوالات کے حوالے سے اس خاص دور کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے' جس دور میں یہ آیات نازل ہو رہی تھیں' چند اصولی ہدایات بھی جاری کی جائیں۔ اس رکوع کے آغاز میں یہی ہدایات دی جا رہی ہیں۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان ہدایات کی وضاحت کریں' ان آیات کا پس منظر اور تہہ منظر ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

سورۃ المائدہ کا نزول چھٹی ہجری کے آخر میں یا ساتویں ہجری کے آغاز میں ہوا ممکن ہے آئندہ چند سالوں میں اس کی تکمیل ہوئی ہو چنانچہ اس سورۃ کے زمانہ نزول پر جب ہم غور کرتے ہیں تو بعض امور ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مختصراً جن کی تفصیل یہ ہے:

یہ وہ زمانہ ہے' جب حدیبیہ کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ مسلمان جو اب تک ایک بند دائرے میں گھرے ہوئے تھے' ان کیلئے قدرت نے اس معاہدے کے نتیجے میں تبلیغ و دعوت کا ایک وسیع میدان کھول دیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی نبوت کے تیرہ سال مکے میں گزرے اور چھ سال مدینے میں۔ ان انیس سالوں میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا' ان کی تعداد چار پانچ ہزار سے زیادہ نہیں۔ لیکن حدیبیہ کے معاہدے کے دو سال بعد جب فتح مکہ کا عظیم واقعہ پیش آیا تو مسلمانوں کی تعداد بیس پچیس ہزار سے بھی زیادہ ہو چکی تھی اور پھر اس کے بعد کے دو سالوں میں اس تیزی سے اسلام پھیلا کہ مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب پہنچ گئی۔ اس صورتحال کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیبیہ تک جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا' ان کو تربیت حاصل کرنے کا زیادہ موقع ملا اور وہ تربیت کے نتیجے میں پختہ فکر' پختہ عزم اور پختہ کردار کے مالک ہو گئے۔ لیکن بعد کے سالوں میں جس تیزی سے اسلام کی نشر و اشاعت میں وسعت آتی گئی' اسی تیزی سے نومسلموں کی تعداد بھی بڑھی۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اسلام کے دامن میں ضرور آ گئے' لیکن ابھی ضرورت تھی کہ چند سال یہ زیر تربیت رہیں تاکہ ان کے اندر مہاجرین اور انصار جیسا عظیم کردار پیدا ہو سکے۔ لیکن تربیت کے اس عرصے میں ان نئے نئے اسلام کی آغوش میں آنے والوں میں چند باتوں کا ہونا نہایت فطری تھا۔ ایک تو یہ بات کہ یہ لوگ کفر کے ماحول سے نکل کر آئے تھے' شرک ان کی گھٹی میں پڑا تھا' اخلاقی پابندیاں ان کیلئے نئی تھیں۔ اس لئے اس دوسرے ماحول میں آتے ہی فکری یکسوئی اور ذہنی پختگی کا پیدا ہو جانا' سراسر خلاف توقع تھا۔ چنانچہ یہ بات عین توقع کے مطابق تھی کہ یہ جیسے جیسے اسلام کو جاننے کی کوشش کرتے' ویسے ویسے ان کے ذہنوں میں سوالات سر اٹھاتے۔ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین چونکہ ایک عرصہ دراز تک تربیت حاصل کر چکے تھے' اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان میں ایسی ذہنی جلا پیدا فرمائی تھی کہ وہ مزاج شناس رسول بھی تھے اور مزاج شناسِ قرآن بھی۔ اس لئے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بقول وہ اس قدر صاف ستھرے ذہن کے مالک تھے اور اللہ نے اپنی الوہیت' حاکمیت اور حقانیت پر انہیں اس قدر شرح صدر عطا فرمایا تھا کہ بہت کم سوالات ان کی زبانوں پر آتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباس

Marfat.com

فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ میں آپ سے صرف تیرہ سوالات پوچھے جن کا قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے۔لیکن اسلام کی آغوش میں نئے نئے آنے والوں کی یہ فطری مجبوری تھی کہ ایک نیا ماحول نیا مذہب' نیا طرز زندگی' نئے نئے اہداف اور نئے نئے آداب کی پابندی' عدم یکسوئی کے ساتھ ساتھ ان کے دماغوں میں اشتباہات پیدا کرتی۔ چنانچہ یہ نئے نئے آنے والے لوگ بار بار آنحضرت ﷺ سے مختلف قسم کے سوالات پوچھتے۔ان کے سوالات کے پوچھنے کے نتیجے میں جو صورت حال پیدا ہو رہی تھی' اس میں صاف نظر آتا تھا کہ یہ سوالات یقیناً تو اسلئے زبان پر آ رہے ہیں کہ وہ ابھی تک ذات رسالت مآب ﷺ کے عظیم مرتبہ ومقام سے پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکے' اس وجہ سے بجائے اس کے کہ وہ دینی احکام سے متعلق سوال کریں' ان میں سے کوئی آدمی یہ پوچھتا کہ حضور ﷺ میرا مقام جنت ہے یا جہنم؟ کوئی یہ سوال کرتا کہ میرا باپ کون ہے؟ ظاہر ہے' اس طرح کے سوالات پیغمبر کے ادب واحترام کے خلاف تھے۔ضروری تھا کہ ان سوالات کو روک کر ان کی تربیت کا انتظام کیا جاتا اور بعض سوالات ایسے تھے جو شریعت کے مزاج کو نہ سمجھنے کا نتیجہ تھے۔ وہ اس بات کو نہ سمجھ سکے کہ پیغمبر کی زبان سے اللہ کے قانون کا اعلان اور اظہار ہوتا ہے۔ان کی زبان سے جو نکلے گا وہ قانون بن جائے گا۔اس لئے ہم اسلامی احکام کے سلسلے میں ایسا کوئی سوال نہ کریں جس سے پابندیوں میں اضافہ ہو سکتا ہو یا احکام سخت ہو سکتے ہوں۔حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا

﴿جو بیت اللہ تک جانے کی استطاعت رکھتے ہیں' ایسے لوگوں پر اللہ کی طرف سے حج فرض ہے﴾ (آل عمران:۹۷)

ایک شخص جس کا نام ''اقرع بن حابس'' تھا۔اس نے کھڑے ہو کر سوال کیا۔حضور کیا ہر سال حج فرض ہے؟ آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔اس نے پھر پوچھا؟ آپ نے پھر اعراض فرمایا۔تیسری مرتبہ پوچھنے پر آپ نے فرمایا: تم پر افسوس ہے۔اگر میری زبان سے 'ہاں' نکل جائے تو حج ہر سال فرض قرار دیا جائے۔پھر تم ہی لوگ اس کی پیروی نہ کر سکو گے اور نافرمانی کرنے لگو گے۔یہ حالات اور اس سے پیدا ہونے والی وہ صورت حال تھی جس کی اصلاح کیلئے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

آیت:۱۰۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو' جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار گزریں۔لیکن اگر تم انہیں ایسے وقت پوچھو گے' جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ تم پر کھول دی جائیں گی۔اب تک جو کچھ تم نے کیا' اسے اللہ نے معاف کر دیا ہے۔وہ درگزر کرنے والا اور بردبار ہے''۔

سوال کرنے کی ممانعت کی دو بنیادی وجوہ

اس آیت کریمہ میں دو وجہ سے سوال کرنے سے روکا گیا ہے اور جو اسباب سوال کرنے کا باعث بن رہے ہیں' اگر تدبر سے کام لیا جائے' جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تو وہ اسباب بھی اس آیت میں صاف جھلک رہے ہیں۔

سوال سے منع کرنے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ تم اگر ایسے امور کے بارے میں سوال کرو گے' جس کا تعلق تمہاری پرائیویٹ زندگی سے ہے۔اللہ سے چونکہ کوئی چیز مخفی نہیں' ممکن ہے تمہارے سوال کے جواب میں وہ بات تمہیں بتا دی جائے۔لیکن اگر وہ بات تمہاری معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہونے والی ہو

Marfat.com

تو خود سوچو تمہارے لئے کیسے پیچیدہ مسائل پیدا ہو سکتے ہیں اور جب ان مسائل سے تمہیں واسطہ پڑے گا تو تم اپنے آپ کو کوسو گے اور تمہارے متعلقین تمہیں برا بھلا کہیں گے' اس طرح اپنی عزت بھی کھو دو گے اور اپنے خاندان کیلئے بھی مسائل پیدا کر دو گے۔ پھر یہ بات بھی کہ اللہ کے نبی دنیا میں شخصی خبریں دینے کیلئے نہیں بلکہ زندگی کے مسائل حل کرنے کیلئے آتے ہیں اور ان معاملات میں راہنمائی دیتے ہیں' جس میں راہنمائی کی اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس لئے بجائے وہ باتیں پوچھنے کے ایسی ویسی باتیں پوچھنا' جن کی نہ دین کے کسی معاملہ میں ضرورت ہے اور نہ دنیا کے کسی اہم معاملہ میں تو سراسر نبوت کے مقام کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اس لئے مسلسل تربیت سے اس بنیادی کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کرو۔

سوال سے منع کرنے کی دوسری وجہ جو اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی آسانی کیلئے بعض امور مجمل بیان کیا ہے اور ہمیں اس کی تفصیل کی پابندیوں سے بچایا ہے اور بعض احکام مطلق بیان کئے ہیں' جس میں مقدار یا تعداد یا دوسرے تعینات کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پروردگار ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کیلئے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔ اب جو شخص خواہ مخواہ سوال پر سوال نکال کر تفصیلات' تعینات اور تقیدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ امت مسلمہ پر بہت بڑا ظلم کرتا ہے اور مسلمانوں کو ایک بڑے خطرے میں ڈالتا ہے۔ اس لئے کہ مابعد الطبیعی امور میں جتنی تفصیلات زیادہ ہوں گی' ایمان لانے والے کیلئے اتنے ہی زیادہ الجھن کے مواقع بڑھیں گے اور احکام میں جتنی قیود زیادہ ہوں گی پیروی کرنے والے کیلئے خلاف ورزی کے امکانات اسی قدر زیادہ ہوں گے۔ مزید یہ بات بھی کہ آنحضرت ﷺ چونکہ آخری رسول ہیں' آپ کے بعد وحی الٰہی کا سلسلہ رک جائے گا' اس لئے قیامت تک آنے والے مسائل کے بارے میں ایک متعین بات کہہ کر ہمارے لئے زندگی کو مشکل نہیں بنایا گیا بلکہ بنیادی اصول دے کر مسلمانوں کیلئے اجتہاد کا دروازہ کھول دیا گیا ہے تاکہ وہ ہر دور میں شریعت اسلامی کے مزاج کو سامنے رکھ کر اس کے نظائیر پر غور کر کے' احکام کی علتوں کو پہچان کر' خود سے اسلامی احکام کا تعین کریں۔ ایسی کوششوں کے سلسلے میں یقیناً مجتہدین میں اختلافات ہوں گے اور قانون سازی کے مراحل میں یہی وہ اختلافات ہیں' جو آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق امت کیلئے رحمت ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہی حکمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے سختی سے اس طرح کے سوالات کرنے سے منع فرمایا' جس طرح قرآن کریم میں منع کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

ان اعظم المسلمین فی المسلمین جرما من سأل عن شیٔ لم یحرم علی الناس فحرم من اجل مسألته

﴿ مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے' جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال چھیڑا' جو لوگوں پر حرام نہ کی گئی تھی اور پھر محض اس کے سوال چھیڑنے کی بدولت وہ چیز حرام ٹھہرائی گئی۔ ﴾

ایک دوسری حدیث میں ہے:

ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد حدوداً فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان لا تبحثوا عنھا

﴿ اللہ نے کچھ فرائض تم پر عائد کئے ہیں انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے ان کے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے بغیر اس کے کہ اسے بھول لاحق ہوئی ہو لہٰذا ان کی کھوج نہ لگاؤ ﴾

جو سوالات دین سیکھنے اور بات سمجھنے کیلئے پوچھے جاتے ہیں' نہ قرآنِ کریم نے ان کی ممانعت کی ہے نہ رسول اللہ ﷺ نے۔ جن دو باتوں کی

Marfat.com

سے سوالات کی ممانعت فرمائی گئی ہے' اس کا ذکر اوپر گزر چکا۔ لیکن آج جب کہ قرآن کا نزول بند ہو گیا ہے' وحی الٰہی رک گئی' اب احکام میں اضافے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تو سوال یہ ہے کہ کیا اب بھی اس آیت کریمہ پر عمل باقی ہے؟ یعنی کیا اب بھی امت مسلمہ اس بات کی پابند ہے کہ وہ شریعتِ اسلامی کے بارے میں سوالات نہ کرے؟ بات یہ ہے کہ آج یقیناً وہ خطرہ باقی نہیں رہا' جو پیغمبر کی زندگی میں وحی الٰہی کے نزول کے وقت ہوتا ہے۔ لیکن غیر متعلق اور لایعنی سوالات اور فضول قیل وقال سے جو نقصان اس وقت ہوتا تھا' وہ آج بھی ہوتا ہے۔ وہ نقصان یہ ہے کہ جس آدمی کو بات سمجھنا مقصود ہو' اسے کبھی ضرورت سے زیادہ سوالات کرنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ وہ جب بات کو سمجھ لیتا ہے تو عمل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اب اس کی ساری توجہ بہتر سے بہتر عمل کرنے پر مرتکز ہوتی ہے سوالات کی طرف نہیں۔ لیکن جس آدمی میں بے عملی یا بدعملی کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں' وہ اس لئے سوالات نہیں کرتا کہ وہ بات کو سمجھنا چاہتا ہے بلکہ وہ اپنی بے عملی یا بدعملی کو چھپانے کیلئے سوالات کا سہارا لیتا ہے یا احکام کی پابندی سے بچنے کیلئے سوالات کے ذریعہ کوئی چور دروازہ نکالنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ مرض آج نیا نہیں' ہر بے عمل قوم میں' چاہے وہ صدیوں پہلے گزری ہو' اس عمل کی موجودگی کا ہمیں سراغ ملتا ہے۔ اگلی آیت کریمہ میں اسی کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔

آیت:۱۰۲ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ○ ''تم سے پہلے ایک قوم نے انہی قسم کے سوالات کئے تھے' پھر وہ لوگ انہی باتوں کی وجہ سے کفر میں مبتلا ہو گئے''۔

انہوں نے احکامات پر عمل کرنے کی بجائے مسلسل سوالات کے ذریعہ' جب اپنے لئے آسانیاں تلاش کرنا شروع کیں تو سوالات کے نتیجے میں تفصیلات اور قیود کا ایک جال اپنے لئے تیار کر لیا۔ پھر خود ہی اس میں الجھ کر اعتقادی گمراہیوں اور عملی نافرمانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے تو اپنے لئے چور دروازے تلاش کئے تھے' لیکن ان کی نادانیوں کے نتیجے میں مزید احکام نازل ہوتے گئے اور احکام میں شدت آتی گئی۔ لیکن اصل چیز جس کی طرف اس قوم کی مثال سے توجہ دلائی گئی ہے' وہ اس قوم کی بدعملی پر مبنی ان کا ذہنی رویہ ہے (اور یہ یاد رہنا چاہئے کہ یہاں اس قوم سے مراد یہود ہیں) ان کے ذہنی رویے کی عکاسی قرآن کریم نے سورۃ البقرۃ میں ایک واقعہ سے کی ہے' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومیں جب بدعمل یا بے عمل ہو جاتی ہیں تو وہ احکام کی تعمیل کرنے کی بجائے کس طرح کا رویہ اختیار کرتی ہیں اور اس رویے کے نتیجے میں اپنے لئے کیسی کیسی مشکلات پیدا کر لیتی ہیں۔

وہ واقعہ سورۃ البقرۃ میں آیت نمبر ۶۷ تا ۷۱ میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم اس کا ترجمہ نقل کر دیتے ہیں:

﴿پھر وہ واقعہ یاد کرو! جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کہنے لگے کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو؟ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔ بولے' اچھا! اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں اس گائے کی کچھ تفصیل بتائے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا! اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہئے' جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا بلکہ اوسط عمر کی ہو۔ لہٰذا جو حکم دیا جاتا ہے' اس کی تعمیل کرو۔ پھر کہنے لگے! اپنے رب سے یہ اور پوچھ دو کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: وہ فرماتا ہے' زرد رنگ کی گائے ہونی چاہیے' جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔ پھر بولے! اپنے رب سے صاف صاف پوچھ کر بتاؤ' کیسی گائے مطلوب ہے' ہمیں اس کے تعین میں اشتباہ ہو گیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم اس کا پتہ پا لیں گے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا: اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے' جس سے خدمت نہیں لی جاتی' نہ زمین جوتتی ہے' نہ پانی کھینچتی ہے' صحیح سالم اور بے داغ ہے۔ اس پر وہ پکار اٹھے کہ

Marfat.com

ہاں! اب تم نے ٹھیک پتہ بتایا ہے۔ پھر انہوں نے اسے ذبح کیا' ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔﴾

یہ ذہنیت یا ذہنی رویہ یہود کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جب بھی کسی امت میں بے عملی اپنی جڑ بنا لیتی ہے' اس کی کیفیت اس سے مختلف نہیں ہوتی۔ آج مسلمانوں میں اگر آپ دیکھنا چاہیں تو آپ کو جابجا اس کی مثالیں ملیں گی۔ اسلامی شریعت کے کسی بھی حکم کی بات چھیڑ کے دیکھ لیجئے' ایک فرد سے لے کر اجتماعی اداروں تک' بجائے اس پر عمل کرنے کے' یہی رویہ آپ کو کارفرما دکھائی دے گا۔ بحثوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا اور ایک مخلص اور سنجیدہ آدمی یہ دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ یا اللہ! یہ کیا رویہ ہے؟ لیکن پریشان کن چیز یہ رویہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے وہ ذہنیت ہے' جس کے نتیجے میں یہ رویہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ کیلئے اس امت کو بلاضرورت سوالات کرنے سے منع فرمایا ہے بلکہ ہر ایسے کام سے منع فرمایا ہے' جس کا دنیا اور دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ارشاد فرمایا:

من حسن اسلام المرء ترکه ما لا یعنیه ﴿کسی بھی آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے۔﴾

اس لئے آج بھی ہمیں اس بات کی اجازت نہیں کہ ہم اپنا قیمتی وقت بجائے ضروری امور میں صرف کرنے اور دین سیکھنے میں لگانے کے فضول سوالات میں ضائع کریں اور اسے ہم دینی خدمت سمجھیں۔ آپ نے بعض لوگوں کو دیکھا ہوگا جو عجیب و غریب' غیر متعلق باتوں میں وقت صرف کر رہے ہوتے ہیں اور اسے تحقیق کا نام دیتے ہیں۔ کوئی پوچھتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام کیا تھا؟ کسی نے یہ تحقیق شروع کر رکھی ہے کہ کشتی نوح کا طول و عرض کیا تھا؟ کوئی حروف مقطعات کے معنی معلوم کرنے کی فکر میں ہے اور کسی کو یہ فکر لاحق ہے کہ متشابہات کا مفہوم معلوم کیا جائے حالانکہ خود قرآن کریم نے متشابہات کے پیچھے پڑنے والے کو ذہنی کج روی کا مریض قرار دیا ہے کیونکہ متشابہات بالعموم اللہ کی صفات پر مشتمل ہیں یا اللہ کی ان مخلوقات سے متعلق ہیں' جن کا تعلق عالم غیب سے ہے' کسی آدمی کیلئے ممکن نہیں کہ وہ عالمِ غیب پر رسائی حاصل کر سکے۔ اب اگر وہ اس کو اپنی تحقیق کا موضوع بناتا ہے تو اندازہ فرمائیے! آخر وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح کی مصروفیات ہیں' جو قوائے عمل کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہیں۔

سورۃ المائدہ میں احکام کے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ دو باتوں پر زور دیا گیا ہے۔

سورۃ المائدہ کے دو بنیادی مضامین

1- حلت و حرمت کی اتھارٹی اور اختیار اللہ کے سوا کسی اور کے پاس نہیں۔ جو بھی یہ اختیار اپنے لئے مخصوص کرتا ہے' وہ گویا اللہ کی صفتِ حاکمیت اور اس کی کبریائی میں شریک ہونے کی کوشش کرتا ہے اور یہ ایک بدترین شرک ہے' جسے اللہ کبھی معاف نہیں فرماتا۔

2- مخلوقات کیلئے ایسی عزت و حرمت کا فیصلہ کرنا' جس کا تعلق ثواب و عقاب سے ہو اور جس کا رشتہ دین سے باندھا جائے' اس کا حق بھی سوائے اللہ کی ذات کے اور کسی کو نہیں۔ جو چیز اس کی طرف منسوب ہو جاتی ہے یا اس کی عظمت کی علامت بن جاتی ہے' اللہ تعالیٰ اسے انسانوں کیلئے واجب الاحترام قرار دے دیتا ہے اور ایسی چیزیں جن کا احترام اور ادب واجب ہے' انہیں ''شعائر اللہ'' کہا گیا ہے۔ کسی کو شعائر اللہ میں سے قرار دینا' یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ دوسرا اگر کوئی ایسا کرے تو یہ شرک ہے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں مشرکین مکہ کی اس جسارت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفات اور پروردگار کے ان دونوں خصوصی حقوق میں' دوسروں کو دخیل کر کے شرک کا ارتکاب کرتے تھے اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ اسے اللہ ہی کی طرف منسوب کرتے تھے کہ ہمیں یا ہمارے بتوں یا ہمارے دیوتاؤں کو اللہ نے اس کا حق دیا ہے۔

Marfat.com

آیت:۱۰۳ مَاجَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ O ''اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام۔ مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں (کہ ایسے اوہام کو مان رہے ہیں)''۔

جس طرح ہمارے ملک میں گائے' بیل اور بکرے اللہ کے نام پر یا کسی بت یا قبر یا دیوتا یا پیر کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں اور ان سے کوئی خدمت لینا یا انہیں ذبح کرنا یا کسی طور پر ان سے فائدہ اٹھانا حرام سمجھا جاتا ہے' اسی طرح زمانہ جاہلیت میں اہل عرب بھی مختلف طریقوں سے جانوروں کو پُن کر کے چھوڑ دیا کرتے تھے اور ان طریقوں سے چھوڑے ہوئے جانوروں کے الگ الگ نام رکھتے تھے۔

بحیرہ: اس اونٹنی کو کہتے تھے' جو پانچ دفعہ بچے جن چکی ہو اور آخری بار اس کے ہاں نر بچہ ہوا ہو۔ اس کا کان چیر کر اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ پھر نہ کوئی اس پر سوار ہوتا' نہ اس کا دودھ پیا جاتا' نہ اسے ذبح کیا جاتا' نہ اس کی اون اتاری جاتی۔ اسے حق تھا کہ جس کھیت اور جس چراگاہ میں چاہے' چرے اور جس گھاٹ سے چاہے' پانی پئے۔

سائبہ: اس اونٹ یا اونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی منت کے پورا ہونے یا کسی بیماری سے شفا پانے یا کسی خطرے سے بچ جانے پر بطور شکرانہ کے پُن کر دیا گیا ہو۔ نیز جس اونٹنی نے دس مرتبہ بچے دیئے ہوں اور ہر بار مادہ ہی جنی ہو' اسے بھی آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وصیلہ: اگر بکری کا پہلا بچہ نر ہوتا تو وہ خداؤں کے نام پر ذبح کر دیا جاتا اور اگر وہ پہلی بار مادہ جنتی تو اسے اپنے لئے رکھ لیا جاتا تھا۔ لیکن اگر نر اور مادہ ایک ساتھ پیدا ہوتے تو نر کو ذبح کرنے کی بجائے یونہی خداؤں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس کا نام وصیلہ تھا۔

حام: اگر کسی اونٹ کا پوتا سواری دینے کے قابل ہو جاتا تو اس بوڑھے اونٹ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ نیز اگر کسی اونٹ کے نطفہ سے دس بچے پیدا ہو جاتے تو اسے بھی آزادی مل جاتی۔

اندازہ فرمایئے! جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور انسانوں کو ان سے انتفاع کی اجازت دی اور جنہیں انسان کی خدمت کیلئے وجود بخشا گیا' کیسی جہالت کی بات ہے کہ ان جانوروں کو' جنہیں اللہ نے مختلف کاموں کیلئے انسانوں کی خدمت میں دیا تھا' مخدوم بنا دیا جائے اور جن سے نفع اٹھانے کا انسانوں کو حق بخشا گیا تھا' انہیں مقدس اور مطہر بنا کر محض آوارہ گھومنے کیلئے چھوڑ دیا جائے اور اس میں اللہ نے جتنی نفع کی شکلیں رکھی تھیں انسانوں کو اس سے محروم کر دیا جائے۔ لیکن جہالت کے ساتھ' جب مذہبی عقیدت شامل ہو جاتی ہے تو ایک ایسی جبر کی صورت اختیار کر لیتی ہے کہ اس پر چلنے والے نہ صرف اس کو چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہوتے بلکہ اسے اپنی عقیدت کا مظہر سمجھتے ہوئے اسے باقی رکھنے کیلئے ہر حربہ اختیار کرنے کیلئے تیار رہتے ہیں اور مزید ستم کی بات یہ ہے کہ ہر برائی کی طرح یہ برائی بھی کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کہ یہ سمجھا جائے کہ یہ شاید جہالت کا نتیجہ ہے آج جبکہ روشنی علم و ہنر کا دعویٰ ہے' مختلف قوموں اور ممالک میں آج بھی اس کا چلن دکھائی دیتا ہے۔ خود مسلمان' جنہوں نے جاہلیت کو ختم کر کے دنیا کو وحی الٰہی کی روشنی سے منور کیا ہے' ان کے مختلف علاقوں میں آج بھی اس کے مظاہر کہیں کہیں نظر آ جاتے ہیں۔ کئی پیران کرام اپنے مریدوں کے پاس جب نزول اجلال فرماتے ہیں تو بعض دفعہ جانوروں کا ایک غول بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے' جب تک وہ اپنے مریدوں کے پاس مقیم رہتے ہیں' یہ جانور جو اکثر گائیوں پر مشتمل ہوتے ہیں' آزادانہ گھومتے پھرتے ہیں' جس فصل کو چاہتے ہیں' اجاڑ دیتے ہیں۔ کسی بھی کھانے والی چیز میں منہ ڈال دیں' کوئی اسے روکنے کی جرأت نہیں کرتا کیونکہ انہیں یہ باور کرا دیا گیا ہے کہ یہ مقدس جانور ہیں' انہیں اگر روکا گیا تو اس کے نتیجے میں تمہارے رزق میں کمی آ جائے گی یا تم

Marfat.com

کسی اور نقصان سے دوچار کر دیئے جاؤ گے اور سب سے بڑا ظلم یہ ہے' جیسے اس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ اس سراسر جہالت کی کارروائی کو یہ نام نہاد پیران کرام مشرکین مکہ کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس لئے اس آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ یہ لوگ سراسر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور سمجھتے اس لئے نہیں وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ''اور اکثر ان میں عقل نہیں رکھتے''۔ یعنی بے وقوف ہیں' انہوں نے جہالت کو علم سمجھ رکھا ہے اور گمراہی کو ہدایت سمجھتے ہیں اور اتنی معمولی بات نہیں سمجھتے کہ زندگی گزارنے یا زندگی میں راہنمائی حاصل کرنے کیلئے' ہمارے پاس بنیادی ذرائع کیا ہیں۔ یہ بجائے ان بنیادی ذرائع کی طرف لوٹنے کے اپنے نام نہاد مفروضوں پر زندگی گزارنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ایک بے عقلی کا عمل ہے' جس کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ ان کی اس بے عملی کی دلیل اور اس پر تنبیہ کیلئے اگلی آیت میں ارشاد فرمایا جارہا ہے۔

آیت: ۱۰۴ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ○ ''جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ' جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف آؤ تو جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لئے وہی کافی ہے' جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے' کیا اس صورت میں بھی' جبکہ ان کے باپ دادا نہ کچھ جانتے رہے ہوں اور نہ ہدایت پر رہے ہوں''۔

آباء کی اندھی تقلید

عرب کے جاہل معاشرے میں جس چیز نے ان کو جہالت پر ثابت قدم رکھا ہوا تھا اور جس کی وجہ سے وہ اپنی نادانیوں اور بے وقوفیوں کو بھی عقل اور ہدایت کی بات سمجھتے تھے' وہ ان کی تقلید آباء کی ایک مستقل روایت تھی' جس سے وہ دستبردار ہونے کو کسی بھی طرح تیار نہیں تھے۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ زندگی میں صحیح راہ عمل اختیار کرنے اور صحیح اہداف مقرر کرنے اور پھر کامیابی سے اس پر چلنے کیلئے دو چیزیں درکار ہیں اور جس کے بھی دماغ میں تھوڑی سی عقل موجود ہے' وہ ان دونوں باتوں سے انکار نہیں کرسکتا۔ وہ ہیں علم اور اہتداء۔ آپ کسی بھی چیز کو اختیار کرنا چاہیں' کوئی رویہ اپنانا چاہیں' کسی طرزِ عمل کا فیصلہ کرنا چاہیں تو سب سے پہلے آپ اس کے مَالَهٗ وَمَا عَلَيْهِ سے واقف ہونا ضروری سمجھیں گے۔ آدمی تجارت کرنا چاہے تو تجارت کے رموز و اسرار سے آگاہی حاصل کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ ملازمت کرنے کا ارادہ ہو تو ملازمت کی تمام شرائط کو جاننا اور اس کی پوری تفصیلات کو سمجھنا' یہ ہماری جانی پہچانی سی بات ہے۔ کھیلوں سے لے کر زندگی کے سنجیدہ فرائض تک کوئی سا کام بھی پیش نظر ہو' جب تک اس کی مکمل واقفیت حاصل نہیں کر لی جاتی' اس وقت تک اس کام کو شروع کرنا' بے عقلی کی بات سمجھی جاتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے ''علم'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری چیز جس کا جاننا اسی طرح ضروری ہے' وہ یہ کہ جس طرح آپ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس کا علم حاصل کرتے ہیں' اسی طرح آپ یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں نے کامیابی سے اس کام کو سرانجام دیا ہے' میں ان لوگوں سے مل کر دیکھوں' تاکہ مجھے یہ معلوم ہوسکے کہ اس راستے کے نشیب و فراز کیا ہیں اور اس راستے میں کیا کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ یعنی علم کے ساتھ ساتھ اس راستے پر چلنے والوں کا عمل' ان کا تجربہ' نئے چلنے والوں کیلئے راہنمائی کا کام دیتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے' جس کو اہتداء کہا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں' اگر اختصار سے ہم ان دونوں لفظوں کی تعریف کریں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ علم نام ہے منزل مقصود اور اس تک پہنچنے کے طریقوں کی آگاہی کا اور اہتداء اس علم کے مطابق عمل مستقیم کا نام ہے۔ یہی دو چیزیں جس طرح زندگی کے عام معمولات کیلئے ضروری ہیں' ''خود زندگی کیلئے'' اس سے بھی زیادہ ضروری ہیں اور پھر ایسی زندگی جس کا تعلق صرف دنیا سے ہی نہیں بلکہ آخرت سے بھی ہو

Marfat.com

اس میں تو ان دونوں چیزوں کی پابندی اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔

اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ بات بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ خود زندگی کا مقصود کیا ہے؟ زندگی کے سفر کی آخری منزل کیا ہے اور اس منزل تک پہنچنے کے طریقے کیا ہیں اور پھر وہ کونسی شخصیت ہے' جس نے ان طریقوں پر چل کر اور منزل مقصود کو آسان بنا کر انسانی زندگی کیلئے راہنمائی فراہم کی ہے؟ اگر کسی شخص کے دل و دماغ پر اندھی عصبیت کی پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے تو اس کے لئے یہ جاننا کوئی مشکل نہیں کہ یہ علم وہ ہے' جو نبی آخر الزمان ﷺ پر نازل کیا جا رہا ہے اور اس راستے کے راہنما وہ ہیں' جنہیں ہم نبی آخر الزماں کے نام سے جانتے ہیں۔ لیکن عرب کے مشرکین کی نادانی ملاحظہ فرمائیے کہ انہیں جب علم اور اہتداء کے انہی دونوں ذرائع کی طرف دعوت دی جاتی ہے کہ آؤ! اسے قبول کرو اور اس کی راہنمائی میں زندگی گزارو' تو وہ اس کے جواب میں کس قدر نادانی کی بات کہتے ہیں کہ ہمیں اس طرف نہیں آنا بلکہ ہماری راہنمائی کیلئے تو وہ چیز کافی ہے' جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اگر علم اور اہتدا کو نظر انداز کر کے صرف تقلید آباء ہی کو زندگی کا راہنما مان لیا جائے تو پھر وہ علم اور عقل جو انسانیت کے جوہر ہیں' ان کا تو دنیا سے جنازہ اٹھ جائے گا اور اس کے بعد خود انسان کا مستقبل کیا ہوگا۔ کیوں کہ تقلید آباء تو زندگی گزارنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ہاں یہ دیکھا جانا چاہئے کہ اگر آباء و اجداد علم اور ہدایت کے نور سے بہرہ ور ہوں اور وہ یہی روشنی آئندہ نسلوں کے سپرد کرنا چاہتے ہوں تو پھر یقیناً ان کی تقلید ہونی چاہئے کیونکہ یہ تقلید اصلاً ان کی نہیں بلکہ اس علم و ہدایت کی ہے' جس کی خود وہ تقلید کرتے رہے ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل جس راہنمائی کے پیچھے چلنا ہے' وہ علم اور ہدایت ہے' آباؤ اجداد نہیں۔ اسلئے مشرکین عرب کو اپنی جہالت سے نکل کر اور عصبیت سے جان چھڑا کر علم و ہدایت کی روشنی سے اکتساب فیض کرنا چاہئے' اسی میں ان کی دنیا ہے اور اسی میں آخرت۔

مشرکینِ عرب کے رویے پر قرآن کریم کی اس تنقید کی روشنی میں ہمارے سوچنے کی بھی بہت سی باتیں ہیں۔ ہم جب اپنے حالات پر نظر ڈالتے اور اپنے گرد و پیش کو دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علم کے سارے دعوؤں کے باوجود' ہم بھی اس بیماری کے شکار ہیں۔ دیہات میں برادریوں کے فیصلے بالعموم آباؤ اجداد کی تقلید پر مبنی ہوتے ہیں۔ کوئی سی بات کر کے دیکھ لیجئے' ان کا سب سے بڑا حوالہ یہی ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور کوئی اللہ کا بندہ اگر کبھی ان کی غلطیوں کی طرف توجہ دلاتا ہے تو اسے ناگفتہ بہ صورت حال سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ جہاں تک شہروں کا تعلق ہے' دینی معاملات میں شہروں کے رہنے والوں کا حال بھی کچھ اس سے مختلف نہیں' بجز اس کے کہ اللہ نے کسی پر اپنا فضل کیا ہو اور وہ اہل علم کی مجلسوں میں بیٹھنے کی وجہ سے یا اپنے ذاتی مطالعہ کے نتیجے میں دین کی بنیادی باتیں سمجھ چکا ہو تو اور بات ہے ورنہ ہمارے اکثر تعلیم یافتہ لوگ اپنی مذہبی تعلیم سے یکسر بیگانہ ہیں' اس لئے ان کی راہنمائی کا بھی سب سے بڑا ذریعہ ان کے اپنے آباؤ اجداد کا طرز عمل ہی بنتا ہے۔ آپ اگر ان کی غلطیوں پر انہیں آگاہ کیجئے تو وہ جواب میں یہی کہیں گے کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور جہاں تک ہمارے سیاسی معاملات کا تعلق ہے' اس میں بھی وسعت ظرف اور شعور و آگہی کا چلن کوئی زیادہ دکھائی نہیں دیتا' بلکہ پارٹی کی روایت، بڑے لیڈروں کے فیصلے اور اگر کوئی ایسا بڑا لیڈر ہو جس کی عقیدت نے اکثریت کو اسیر کر رکھا ہو تو اس کے ذاتی فیصلے اور ذاتی پسند و ناپسند پوری پارٹی کی راہنما بن جاتی ہے' قطع نظر اس سے کہ اس میں علم و ہدایت کا کوئی دخل ہے یا نہیں۔ اس لئے ہمارے لئے بھی یہ سوچنا از بس ضروری ہے کہ قرآنِ کریم کی دی ہوئی اس راہنمائی کے مطابق ہم اپنے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں یا نہیں۔ اگلی آیت کریمہ میں براہ راست مسلمانوں سے خطاب فرمایا جا رہا ہے' جس میں انہیں نہایت اساسی باتوں پر توجہ دلائی جا رہی ہے۔

آیت: ۱۰۵ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا

Marfat.com

فَیُنَبِّئُکُم بِمَا کُنتُم تَعمَلُونَ O ''اے ایمان والو! تم اپنی فکر رکھو' اگر تم ہدایت پر ہو تو جو گمراہ ہوا' وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ اللہ کی ہی طرف تم سب کو پلٹنا ہے۔ وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو''۔

امت مسلمہ کی ذمہ داری اور اس کی نوعیت

اس آیت کریمہ کا ایک ایک لفظ قابل توجہ ہے۔ جیسے جیسے اس میں غور کریں نئے نئے مفاہیم ذہن میں آتے ہیں۔ سب سے پہلے اس کے پہلے لفظ کو دیکھئے کہ اے مسلمانو! تم اپنی فکر رکھو۔ یہاں مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ تم امت مسلمہ کی شکل میں ایک اکائی ہو' تم میں سے ہر فرد کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں بلکہ وہ اس بہتے ہوئے دریا کی ایک موج ہے۔ اس لئے تمہیں فکر کرنی ہے تو اپنی نہیں بلکہ اس پورے دریا کی یعنی مجموعی طور پر اس پوری امت کی۔ تم میں سے ہر ایک کا حقیقی مفاد وہ ہے' جو پوری امت کا مفاد ہے اور حقیقی نقصان وہ ہے' جو پوری امت کا نقصان ہے۔ اسی طرح خیر و شر اور علم اور اخلاق کے حوالے سے تمہاری نظر پوری امت مسلمہ پر رہنی چاہئے کہ اس میں کہیں دڑاریں تو نہیں پڑ رہیں' اخلاقی مفاسد کو کہیں ان میں راہ بنانے کا موقع تو نہیں مل رہا' کہیں ان کے عقائد میں اضمحلال پیدا تو نہیں ہو رہا۔ اگر تم پوری امت پر نظر رکھو اور پوری طرح ان کی فکر پر کار بند رہو تو پھر تمہارے گرد و پیش باقی قومیں' کچھ بھی کیوں نہ کرتی ہوں' تمہارے لئے چنداں فکر کی بات نہیں۔ البتہ! یہ ضرور ہے کہ تم دیر تک ان سے لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ اسلئے کہ تمہارا ہدف پوری دنیا کو راہ راست پر لانا ہے یہ تمہارے فرائض میں شامل ہے۔ لیکن اس کیلئے بنیاد اور اصل (Base) کی حیثیت تو خود امتِ مسلمہ ہے۔ اگر یہ پوری طرح محفوظ اور توانا ہے تو پھر دوسری امتوں کی برائیاں بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکیں گی۔

دوسری بات جو اسی ضمن میں کہی جارہی ہے' وہ اس دور کی امت مسلمہ یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کیلئے ایک کلمہ تحسین بھی ہے اور ان کیلئے تسلی بھی۔ ابھی چند آیات پہلے ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے یہ فرمایا گیا کہ رسول کے ذمہ صرف پہنچا دینا ہے اور آپ نے اللہ کے فضل سے اس کا پیغام پہنچانے اور اس کا حق ادا کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اسلئے اگر کافر راہِ راست اختیار نہیں کرتے اور ایمان قبول نہیں کرتے تو اس کی ذمہ داری ان پر ہے۔ ان کے بارے میں آپ سے نہیں پوچھا جائے گا بلکہ ان سے پوچھا جائے گا کہ اس روشنی کی موجودگی میں انہوں نے آنکھیں کیوں بند کئے رکھیں؟ آنحضرت ﷺ کو اس طرح کی تسلی اور بھی کئی جگہ قرآنِ پاک میں دی گئی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کافر جب اسلام کی مخالفت کرتے اور بجائے اسلام قبول کرنے کے اسکے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتے اور آپ کی کاوشوں کو وہ کامیابی نہ ملتی جو ملنی چاہئے تھی تو آپ نہایت دل گرفتہ ہوتے اور کبھی کبھی یہ خیال فرماتے کہ یہ ان کا حق کو قبول نہ کرنا' شاید میری کسی کوتاہی کا نتیجہ ہے اور بعض دفعہ اس تاثر کے زیر اثر بیمار بھی پڑ جاتے۔ اسلئے پروردگار نے بار بار آپ ﷺ کو تسلی دی۔ یہاں اسی طرح کی تسلی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو دی جارہی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کی تربیت نے ان میں غلبہ دین کی ذمہ داریوں کا ایسا شدید احساس پیدا کر دیا تھا کہ وہ بھی برابر تبلیغ و دعوت کے کام میں لگے رہتے اور جب وہ بھی دیکھتے کہ اس قدر جان مارنے کے باوجود نتائج حوصلہ افزا نہیں ہیں تو انہیں یہ خیال دامن گیر ہوتا کہ شاید اس میں ہماری کوتاہیوں کا دخل ہو۔ چنانچہ ان کو تسلی دی جارہی ہے اور اسکے ضمن میں ان کی کوششوں کا اعتراف بھی ہے کہ تم نے تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں اور غلبہ دین کیلئے جس طرح سرفروشیاں دکھائی ہیں' وہ اللہ کے یہاں قبولیت پا چکی ہیں۔ رہی یہ بات کہ دنیائے کفر اس سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا رہی تو اس کا وبال انہی پر پڑے گا اور قیامت کے دن انہی سے اسکا سوال کیا جائے گا' آپ اپنی فکر رکھیں' ان کی گمراہی آپ کا کچھ نہیں بگاڑے گی اور اسکے حوالے سے آپ سے کوئی باز پرس نہیں ہو گی۔

مزید اگر تدبر سے کام لیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیامت تک آنے والی امتِ مسلمہ کو ایک خاص فکر سے آشنا کیا جارہا ہے۔ وہ یہ کہ رفتہ رفتہ

Marfat.com

اس امت کی یہ حالت تو باقی نہیں رہے گی' یقیناً اس میں زوال آئے گا' پھر ایمان وعمل کی کمزوریاں پیدا ہوں گی۔ اس آنے والے دور سے پہلے یہ شعور دینا بہت ضروری ہے تاکہ اس وقت اس سے فائدہ اٹھایا جاسکے وہ یہ کہ انسانی فطرت یہ ہے کہ ہر انسان اپنے جسم کی حفاظت کیلئے بیماری کے بارے میں نہایت متفکر رہتا ہے۔ ذرا سی تکلیف ہوتی ہے تو علاج کی فکر کرتا ہے' گھر میں اس کا ذکر کرتا ہے' دوست احباب سے تذکرہ ہوتا ہے اور اگر ذرا تکلیف بڑھ جائے تو ڈاکٹر کی تلاش شروع ہوتی ہے' علاج کی کوشش کی جاتی ہے بلکہ بیمار آدمی کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ میرے پاس اگر ملنے والے آئیں تو سوائے میری بیماری کے اور کسی بات کا ذکر نہیں ہونا چاہئے' جتنا کوئی اس کی بیماری کا ذکر کرتا ہے' اتنا ہی اسے ایک سکون محسوس ہوتا ہے۔ آپ کہیں کسی گھر میں عیادت کیلئے جا کر دیکھ لیجئے' اگر اس گھر میں ایک سے زیادہ بیمار ہیں تو ہر ایک کی یہ خواہش ہوگی کہ پہلے میری خبر لی جائے اور میری بیماری کے بارے میں پوچھا جائے اور اگر کسی دوسرے کی طرف عیادت کرنے والا پہلے متوجہ ہو جائے تو اسے اپنے آپ کو نظر انداز کرنے کا گلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عام سی بیماری میں مبتلا ہو' لیکن اس کے مقابلے میں دوسرا کوئی مریض نہایت تکلیف دہ اور مہلک بیماری کا شکار ہے تو تب بھی یہ عام سی بیماری کا مریض اس کی بیماری کو اہمیت دینے کی بجائے اپنی ہی بیماری کا تذکرہ کرتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ اپنی بیماری کی فکر اور اپنے جسمانی تحفظ کا احساس آدمی کو کسی اور طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بڑا سبق آموز اور دلچسپ ہے کہ ایک صاحب اپنی ایک عزیزہ کو جس کے پیٹ میں درد تھا لے کر ہسپتال گئے۔ وہ اس کو وہیل چیئر پر بٹھا کر جب لے جارہے تھے تو سامنے سے ایک دوسری مریضہ کو آتے ہوئے دیکھا' جس کے جسم کے تقریباً تمام جوڑوں پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ کسی ایکسیڈنٹ میں اس کے گھٹنے' ٹخنے اور بازو تک ٹوٹ چکے تھے۔ مریضہ کو لے جانے والے اس کے عزیز نے اس کی بیماری سے اس کی توجہ ہٹانے کیلئے کہا کہ اس مریضہ کو دیکھو! اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹ چکا ہے اور کس قدر تکلیف میں ہے اور تم اللہ کا شکر ادا کرو کہ تمہیں تو صرف پیٹ میں تکلیف ہے۔ خاتون نے یہ سن کر کہا کہ ہاں واقعی اس مریضہ کو بہت تکلیف ہے' اس کے نجانے کتنے اعضاء ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں' اللہ ہی اس کو صحت دے' لیکن ایک بات ہے کہ میری طرح اس کے پیٹ میں درد تو نہیں ہے۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ انسان کو چونکہ اپنی جسمانی صحت عزیز ہے' اس لئے وہ اپنی بیماری کو کبھی نظر انداز کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح تمہارے جسم کو بیماریاں لگتی ہیں' اسی طرح تمہاری روح اور تمہارے اخلاق بھی بیمار ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کی بیماریوں کو تم گناہ کے نام سے یاد کرتے ہو' لیکن جس طرح جسمانی بیماریاں جسم کیلئے مہلک ہیں' اسی طرح روحانی اور اخلاقی بیماریاں روح اور اخلاق کو تباہ کر دیتی ہیں۔ جب تک ان بیماریوں کا جسمانی بیماریوں کی طرح احساس پیدا نہ ہو اور بجا طور پر ان کی طرف سے دل میں فکر مندی نہ ابھرے' اس وقت تک آدمی کبھی بھی راہ راست پر نہیں رہ سکتا' لیکن ہماری بدنصیبی کا عالم یہ ہے کہ ہم اخلاق اور روح کے اعتبار سے چاہے کتنے بھی بیمار کیوں نہ ہوں' ان بیماریوں کی فکر ہونا تو دور کی بات ہے' ہم ان کا کبھی تصور بھی نہیں کرتے بلکہ اگر کبھی کوئی دوسرا آدمی ہماری ان برائیوں یعنی بیماریوں کی طرف توجہ دلا دے تو ہم اس سے لڑ پڑتے ہیں اور مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم اپنے گردوپیش بلکہ اپنے ملک میں رہنے والے سب لوگوں کو ان برائیوں میں مبتلا سمجھتے ہیں' اس لئے ہم سخت سے سخت تبصرہ ان پر جاری رکھتے ہیں اور یہ کہنے سے بھی باز نہیں آتے کہ پورا ملک تباہ ہوگیا' پوری قوم تباہ ہوگئی' اب اس کی اصلاح کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی' اس قوم کا ایک ایک شعبہ اور ایک ایک ادارہ زندگی سے محروم ہوگیا' لیکن اپنی ذات کا کبھی ہم بھول کر بھی نام نہیں لیتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کی نظر میں اس قوم کا ہر فرد بد اخلاق ہے اور نجانے کس کس برائی کا شکار ہے' لیکن صرف اس کی ذات ہے جو ہر طرح کی برائیوں سے پاک ہے حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

هلك من قال هلك الناس ﴿وہ شخص ہلاک ہوگیا' جس نے کہا کہ سب لوگ ہلاک ہوگئے۔﴾

یعنی وہ اپنے سوا سب کو سمجھتا ہے کہ وہ ہلاک ہوگئے' لیکن اپنے بارے میں سوچنے کی بھی زحمت نہیں کرتا۔

Marfat.com

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والے کی اصل پہچان ''اپنی دینی حالت پر فکرمند رہنا''

اس لئے یہاں یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ مسلمانو! سب سے پہلے اپنی فکر پیدا کرؤ یہی فکر تمہیں دنیوی اور اخروی وبال سے بچائے گی۔ صرف دوسروں کی برائیاں دیکھتے رہنا اور اس پر تبصرے کرتے رہنا' آدمی کی اپنی اصلاح کیلئے نقصان دہ تو ہو سکتے ہیں' مفید کبھی نہیں ہو سکتے۔ اسی ہدایت کا نتیجہ تھا کہ امت مسلمہ کا بڑے سے بڑا آدمی سب سے پہلے اپنی اصلاح کے بارے میں فکرمند ہوتا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ ''میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتا'' وہ بھی اپنی ذات کے بارے میں اس حد تک متفکر رہتے تھے کہ ایک دفعہ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہنے لگے کہ حذیفہ! تم میرے بھائی ہو' اللہ کیلئے مجھ پر ایک احسان کرؤ میں جانتا ہوں کہ تمہیں رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے منافقین کے بارے میں نام بنام خبر دی تھی کہ کون کون لوگ منافق ہیں' میں تم سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے صرف اتنا بتادو کہ کہیں ان میں میرا نام تو نہیں تاکہ میں اپنی اصلاح کرلوں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پریشان ہوکر کہا امیر المومنین! اللہ نہ کرے' آپ ایسے کیسے ہو سکتے ہیں۔ اندازہ فرمایئے! ان کا اپنی فکرمندی کے بارے میں کیا حال تھا اور آج ہم لوگ اپنے بارے میں کس حد تک بے فکر ہیں۔ لیکن یہاں ایک اور بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ جو آدمی اپنی دینی حالت کے بارے میں حتیٰ کے خود دین کے بارے میں فکرمند ہوگا' یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ تبلیغ ودعوت اور امر بالمعروف سے لاتعلق ہوجائے کیونکہ جس آدمی کو اپنے گھر کی فکر ہے کہ کہیں اس کو آگ نہ لگ جائے' اس سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ اگر اس کے پڑوسی کے گھر کو آگ لگ جائے تو وہ آرام سے اپنے گھر سویا رہے کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ اگر میرے پڑوسی کے گھر کی آگ نہ بجھی تو میرا گھر بھی جلنے سے نہیں بچے گا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ کچھ لوگ کسی بحری جہاز پر سوار سمندر میں کہیں جارہے ہیں۔ بحری جہاز کے تمام مسافروں کیلئے پینے کا میٹھا اور ٹھنڈا پانی جہاز کے اوپر کے درجے میں ہے' نچلے درجے والے اپنی ضرورت کیلئے اوپر سے پانی لے کر آتے ہیں' ان میں سے کسی نے مشورہ دیا کہ ہم بار بار اوپر پانی لینے جاتے ہیں اور تکلیف اٹھاتے ہیں' ہم کیوں نہ نیچے اپنے حصے میں سوراخ کرکے پانی نکال لیں اور اس طرح اوپر جانے کی تکلیف سے بچ جائیں؟ آنحضرت ﷺ نے سوال کرتے ہوئے پوچھا کہ اگر اوپر کے تختے پر رہنے والوں نے ان نیچے والے بیوقوفوں کو سوراخ کرنے سے نہ روکا اور یہ سوچ کر چپ ہورہے کہ وہ سوراخ کریں گے تو خود ڈوبیں گے ہم انہیں کیوں روکیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر ان بیوقوفوں نے واقعی ایسا کرڈالا تو کیا ان کا حصہ جب ڈوبے گا تو جہاز کا اوپر کا حصہ بچ جائے گا؟ ظاہر ہے کہ نہیں بچے گا۔ اسی طرح دینی حالت پر فکرمند رہنے والا شخص امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔

برائی کو دیکھ کر چپ ہوجانے والوں کا انجام

لیکن اس آیتِ کریمہ کے ظاہر اسلوب سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ صرف اپنی اصلاح کی فکر ہونی چاہئے' دوسرے کی اصلاح کی فکر کرنا کوئی ضروری نہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں خطبہ دیتے ہوئے اس پر تنبیہ فرمائی کہ میں نے سنا ہے کہ بعض لوگ اس طرح کی باتیں کہتے ہیں' انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ فرماتے تھے (اس کا مفہوم یہ ہے) کہ

﴿اگر کوئی آدمی کسی کو برائی کرتا دیکھے یا کسی بادشاہ کو ظلم کرتا دیکھے اور وہ چپ رہے اور اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش نہ کرے تو قیامت کے دن جب برائی والا اور یہ ظالم بادشاہ پکڑے جائیں گے اور اللہ ان کو جہنم میں پھینکے گا تو یہ خاموش رہنے والے بھی

Marfat.com

ساتھ ہی پھینکے جائیں گے اور اسی عذاب کا شکار ہوں گے۔

یہ فکر مندی ہی ایک مسلمان کی سیرت و کردار کی اصلاح کی ضمانت بھی ہے اور اس کے کردار کا اصل جوہر بھی۔ لیکن یہ جوہر اس وقت تک باقی رہتا ہے' جب تک یہ تصور دل و دماغ میں جاگزیں رہے کہ ایک نہ ایک دن اللہ کے پاس جانا ہے۔ ہم آج ہزار بے فکری کی زندگی گزار لیں' اس دن پروردگار ہمیں بتائے گا کہ دنیا میں ہم کیا اعمال کرتے رہے اور آج اس کا انجام کیا ہوگا۔ جب تک یہ فکر دامن گیر نہ ہو' زندگی صحیح نہج پر استوار نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی جائے تو پائیدار نہیں ہوتی۔

اگلی آیات کی حیثیت ایک تکمیلی اور اتمامی حکم کی ہے۔ سورۃ المائدہ کے آغاز میں بعض احکام دیئے گئے تھے۔ ان آیتوں میں ان کی وضاحت کی گئی ہے۔

آیت: ۱۰۶ تا ۱۰۸ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِىْ بِهٖ ثَمَنًا وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ O فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ O ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ O ''اے ایمان والو! تمہارے درمیان گواہی (بوقت وصیت) جب کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچا ہو' اس طرح ہے کہ دو معتبر آدمی تم میں سے گواہ ہوں یا دو دوسرے تمہارے غیروں میں سے' اگر تم سفر میں ہو اور وہیں تمہیں موت کی مصیبت آپہنچے۔ تم ان کو نماز کے بعد روک لو۔ پس وہ اللہ کی قسم کھائیں اگر تمہیں شک ہو کہ ''ہم اس کے بدلے میں کوئی قیمت قبول نہیں کریں گے اگرچہ کوئی قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہم اللہ کی گواہی کو چھپائیں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بے شک ہم گنہگار ٹھہریں''۔ 106 ''پس اگر پتہ چلے کہ یہ دونوں کسی حق تلفی کے مرتکب ہوئے ہیں تو ان کی جگہ دوسرے دو ان میں سے کھڑے ہوں' جن کی مقدم گواہوں نے حق تلفی کی ہے۔ پس وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ راست ہے اور ہم نے کوئی تجاوز نہیں کیا ہے۔ اگر ہم نے ایسا کیا ہے تو ہم ظالم ٹھہریں''۔ 107 ''یہ طریقہ اس امر کے قرین ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں یا اس بات سے ڈریں کہ ان کی گواہی کے بعد ان کی گواہی رد ہو جائے گی اور اللہ سے ڈرو اور سنو اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرتا''۔ 108

دورانِ سفر موت آجانے کی صورت میں وصیت کا طریقِ کار

سورۃ المائدہ عہد و میثاق کی سورۃ ہے۔ اس میں جن بنیادی باتوں پر عہد لیا گیا ہے اس میں ایک بڑی اہم بات یہ ہے کہ مسلمانو! تمہیں اللہ کے گواہ کے طور پر اور عدل و احسان کے علمبردار کی حیثیت سے شہادت حق کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ تمہاری یہ ذمہ داری ہے کہ تم اللہ اور اس کے دین کی حقانیت کی گواہی پورے عالم انسانیت کے سامنے اس طرح پیش کرو کہ اس کے نتیجے میں دنیا کے سامنے اللہ اور اس کے دین کی سچائی واضح ہو جائے۔ تمہارے علم کے سرچشمے' تمہاری عبادت گاہیں' تمہارے انتظامی ادارے' تمہارے حکومتی ایوان' حتیٰ کہ حسب ضرورت تمہارے میدان جنگ' اپنے دعوؤں اور اپنے عمل سے اس شہادت حق کا فریضہ اس طرح انجام دیں کہ اللہ اور اس کے دین کی حقانیت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے۔ یہ شہادت حق یقیناً

Marfat.com

نامکمل رہتی ہے' اگر انسانی معاملات پر اس کے اثرات گہرے نہ ہوں۔ ایک مسلمان جو اپنے آپ کو شہادت حق کا امین سمجھتا ہے' اگر وہ باہمی معاملات میں سچی شہادت نہیں دیتا' اس میں جھوٹ بولتا ہے یا کتمان سے کام لیتا ہے' ایسے شخص سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں شہادت حق کا فرض انجام دے گا؟ اس لئے کہ شخصی معاملات' اجتماعی معاملات سے اس طرح پیوست ہوتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہتے۔ افراد ہی سے اجتماعیت پیدا ہوتی ہے اور اجتماعیت کے زیر اثر افراد سازی کا کام ہوتا ہے۔ زندگی کے معاملات میں سچی شہادت دینا' یہ وہ عملی تربیت ہے جو شہادتِ حق کے منصب کے حوالے سے ذمہ داریاں ادا کرنے کی ضمانت دیتی ہے۔ ان آیات میں جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں' باہمی معاملات میں سچی شہادت دینے کا حکم دیا گیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ باہمی انسانی معاملات کی گواہی ہے۔ لیکن ان آیات میں اسے شہادۃ اللہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپس کی چھوٹی موٹی گواہیاں بھی اس اجتماعی شہادتِ حق کا حصہ ہیں کیونکہ جس معاشرے میں معاملات شہادت باطل کا شکار ہوتے ہیں' چاہے اس کا حلقہ کتنا بھی چھوٹا کیوں نہ ہو' وہ معاشرہ وسیع سطح پر شہادت حق کا فرض انجام نہیں دے سکتا۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان آیات کی وضاحت کریں یا اس کے احکام کا خلاصہ بیان کریں' ہم اس کا شان نزول بیان کئے دیتے ہیں تاکہ ان آیات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

امام قرطبی رحمتہ اللہ علیہ نے ان تین آیات کے شان نزول کے متعلق کہا ہے کہ مجھے اس میں کوئی اختلاف معلوم نہیں کہ یہ تین آیات تمیم داری اور عدی بن بداء کے متعلق نازل ہوئی تھیں۔ بخاری اور دار قطنی وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے' تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک مسلمان ''بُدَیل'' نامی دو نصرانیوں تمیم داری اور عدی بن بداء کے ساتھ بغرض تجارت ملک شام کی طرف گیا۔ شام پہنچ کر بدیل بیمار ہو گیا۔ اس نے اپنے مال کی فہرست لکھ کر اسباب میں رکھ دی اور اپنے دونوں رفیقوں کو اطلاع نہ کی۔ مرض جب زیادہ بڑھا تو اس نے دونوں نصرانی رفقاء کو وصیت کی کہ سامان میرے وارثوں کو پہنچا دینا۔ انہوں نے سب سامان لا کر وارثوں کے حوالے کر دیا' مگر چاندی کا ایک پیالہ جس پر سونے کا ملمع یا نقش و نگار تھے اس میں سے نکال لیا۔ وارثوں کو فہرست اسباب میں سے دستیاب ہوئی' انہوں نے اوصیاء سے پوچھا کہ میت نے کچھ مال فروخت کیا تھا یا کچھ زیادہ بیمار رہا معالجہ وغیرہ میں خرچ ہوا ہو؟ ان دونوں نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ آخر معاملہ نبی کریم ﷺ کی عدالت میں پیش ہوا چونکہ وارثوں کے پاس گواہ نہ تھے ان دونوں نصرانیوں سے قسم لی گئی کہ ''ہم نے میت کے مال میں کسی طرح کی خیانت نہیں کی نہ کوئی چیز اس کی چھپائی'' آخر قسم پر فیصلہ ان کے حق میں کیا گیا۔ کچھ مدت کے بعد ظاہر ہوا کہ وہ پیالہ ان دونوں نے مکہ میں کسی سنار کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ جب سوال ہوا تو کہنے لگے کہ ہم نے میت سے خرید لیا تھا چونکہ خریداری کے گواہ موجود نہ تھے' اس لئے ہم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا' مبادا ہماری تکذیب کر دی جائے۔

میت کے وارثوں نے پھر نبی کریم ﷺ کی طرف رجوع کیا۔ اب پہلی صورت کے برعکس اوصیاء خریداری کے مدعی اور وارث منکر تھے شہادت موجود نہ ہونے کی وجہ سے وارثوں میں سے دو شخصوں نے جو میت سے قریب تر تھے' قسم کھائی کہ ''پیالہ میت کی ملک تھا اور یہ دونوں نصرانی اپنے قسم میں جھوٹے ہیں''۔ چنانچہ جس قیمت پر انہوں نے فروخت کیا تھا (ایک ہزار درہم پر) وہ وارثوں کو دلائی گئی۔

شانِ نزول میں جو کچھ بیان کیا گیا' اس میں ان تینوں آیات میں بیان کردہ احکام کا اجمالی تذکرہ موجود ہے۔ لیکن پھر بھی مناسب ہے کہ ان آیات میں جو احکام بیان کئے گئے ہیں' اس کا ایک خلاصہ بیان کر دیا جائے۔

خلاصۂ احکام یہ ہے کہ جو آدمی اپنی موت کے قریب ہونے کو محسوس کرے اور چاہتا ہے کہ حاضر مال کے بارے میں اپنے گھر والوں کو وصیت کرے تو اسے چاہئے کہ دو مسلم گواہ بنائے' اگر وہ سفر پر نہیں ہے اور جو کچھ وہ اپنے غیر حاضر رشتہ داروں کو دینا چاہتا ہے' وہ ان کے سپرد کر دے۔ لیکن اگر

Marfat.com

وہ سفر پر ہو اور اسے دو مسلم گواہ نہیں ملتے، جن کی شہادت رکھے اور اپنا مال ان کے سپرد کرے تو دو گواہوں کا غیر مسلموں میں سے ہونا بھی جائز ہے۔ پھر اگر مسلمانوں کو شک ہو جائے یا میت کے گھر والے شک میں پڑ جائیں کہ آیا یہ دو گواہ جو کچھ پہنچا رہے ہیں، یہ سچ ہے یا نہیں اور جس چیز کو ان کی حفاظت میں دیا گیا تھا۔ آیا انہوں نے ادا کی ہے یا نہیں۔ تو وہ ان کو ادائے صلوٰۃ کے بعد ان کے عقیدے کے موافق (نماز کے بعد) کھڑا کریں تاکہ وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ "وہ اپنے فائدے یا کسی اور کے فائدے کی خاطر قسم نہیں کھا رہے، گو ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو اور جو کچھ ان کی حفاظت میں دیا گیا تھا، وہ اس میں سے کچھ نہیں چھپائیں گے، ورنہ وہ گنہگار ہوں گے" اس قسم کے ساتھ ان کی گواہی نافذ ہو جائے گی۔

پھر اگر اس کے بعد ظاہر ہو جائے کہ ان دونوں نے جھوٹی گواہی دینے اور جھوٹی قسم کھانے کا ارتکاب کیا ہے اور جو کچھ ان کی حفاظت میں دیا گیا تھا، اس کی ادائیگی میں انہوں نے بددیانتی کی ہے تو میت کے قریب ترین وارثوں میں دو آدمی اٹھیں۔ جن کے خلاف وہ گناہ واقع ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر اللہ کی قسم کھائیں کہ "ان کی شہادت پہلے دونوں گواہوں کی شہادت سے صادق تر ہے اور انہوں نے اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تعدی نہیں کی" پس اس سے پہلوں کی شہادت باطل ہو جائے گی اور یہ دوسری شہادت نافذ ہو جائے گی۔ پھر نص قرآنی کہتی ہے کہ یہ احکام شہادت کو صحیح طور پر ادا کرنے کے زیادہ ضامن ہیں یا ان سے یہ خوف لاحق ہو جائے گا کہ پہلے دو گواہوں کی شہادت رد کی جائے گی اور یہ خوف ان کو صحیح بات کہنے پر آمادہ کرے گا۔

باہمی معاملات میں شہادت کے قانون کا خلاصہ ہم نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اسکے بارے میں چند نکات ذہن میں رہنے بہت ضروری ہیں۔

شہادت کے قانون کے متعلق چند اہم نکات

1- یہ قانون، شہادت کی تمام ضرورتوں اور تمام حالات پر حاوی نہیں۔ اس کا تعلق ایک عارضی حالت سے ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص قریب المرگ ہے اور وہ اپنا مال چند لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اب اس وقتی ضرورت میں اس کیلئے یہ بات آسان نہیں کہ عدالتی طریقے کو اپنائے اور قانون کی تمام ضروریات کو پورا کرے، اس کیلئے آسان طریقہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے، جو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے اور اگر وہ حالتِ سفر میں ہے اور سفر بھی اس زمانے کا جب کہ تمدنی ضرورتوں کا دور دور فقدان تھا۔ ایسی صورت حال میں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ایک ایسا قانون دیا جائے، جو ضرورت مند کے حالات کے مطابق ہو کیونکہ قانون سے الجھنیں پیدا کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ آسانیاں پیدا کرنا، قانون کا اصل ہدف ہے۔

شہری زندگی میں جبکہ تمدنی اور قانونی ضرورتیں ہر طرح دستیاب ہو سکتی ہوں اسلام نے بعض دوسرے احکام پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے، جن کا ذکر فقہی کتابوں میں موجود ہے۔

2- اس قانون میں مال جن دو آدمیوں کے حوالے کیا جا رہا ہے اور جنہیں فقہی اصطلاح میں وصی کہتے ہیں، ان کے سلسلے میں اجازت دی گئی ہے کہ اگر مسلمان میسر نہ ہوں تو غیر مسلموں کو وصی مقرر کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی حالت ہے۔ عام معمول کی زندگی میں اس سے اجتناب کیا جانا چاہئے۔

3- اوصیاء کیلئے عادل ہونے کی شرط لگائی گئی ہے۔ یہ مطلوب ضرور ہے، لیکن ایسی لازمی شرط نہیں کہ ضرورت کے وقت بھی اس سے صرف نظر نہ کیا جا سکتا ہو۔

4- اس قانون میں یہ بتایا گیا ہے کہ مدعی کے لئے گواہ پیش کرنا ضروری ہیں۔ اگر وہ ضابطۂ شرعی کے مطابق گواہ پیش کر دے تو فیصلہ اس کے حق میں ہوگا اور اگر وہ پیش نہ کر سکے تو پھر مدعا علیہ سے قسم لی جاتی ہے۔ اگر وہ شرعی ضابطہ کے مطابق قسم کھا لے تو مقدمہ اس کے حق میں ہو جائے گا، لیکن اگر مدعا علیہ قسم کھانے سے انکار کر دے تو پھر مدعی مقدمہ جیت جائے گا۔

5- اس قانون میں قسم لینے کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ قسم میں شدت پیدا کرنے کا دارومدار حاکم کی رائے پر ہے۔ اس آیت کی رو سے لزوم ثابت نہیں ہوتا۔

Marfat.com

6- تَحۡبِسُوۡنَهُمَا سے ایک اصول معلوم ہوتا ہے کہ جس آدمی پر کسی کا کوئی حق واجب ہو اس کو اس حق کی ضرورت کے وقت قید کیا جا سکتا ہے۔

7- بعض اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ اس میں نماز کے بعد جو قسم لینے کا ذکر کیا گیا ہے' اس سے عصر کی نماز مراد ہے۔ اس وقت کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب اس وقت کی بہت تعظیم کرتے تھے' ایسے وقت میں خصوصاً جھوٹ بولنا' ان کے نزدیک بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قسم میں کسی خاص وقت یا خاص مقام وغیرہ کی قید لگا کر تغلیظ کرنا جائز ہے۔

اسلام قانون دیتے وقت ہر دور اور ہر زمان کو مدنظر رکھتا ہے

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ یہ قانون ایک خاص نوعیت کا حامل ہے' جس میں بعض خاص ضرورتوں کا لحاظ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ تمام صورتوں پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ اسلام شاید کسی پسماندہ قوم کا وقتی قانون ہے' کسی متمدن قوم میں چلنے کی اس میں صلاحیت نہیں ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ساری انسانیت کیلئے ہر زمانے اور ہر مکان کیلئے آیا ہے۔ دنیا کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں' آج کچھ ہیں تو کل کچھ اور ہوں گے۔ ایک ملک کا ماحول دوسرے سے لازمی مختلف ہوتا ہے۔ ہر قوم و ملت کے تقاضے یکساں نہیں ہوتے۔ آج بھی دنیا میں ایسے علاقے موجود ہیں جہاں انسان بدویت کی طرف مائل ہے۔ اگرچہ یہ بدویت شہریت کی طرف محوِ سفر ہے' لیکن شہری تقاضے بھی تو یکساں نہیں ہوتے اور انسانیت کو جن احکام کی ضرورت ہے' وہ بحیثیت مجموعی ہیں' جو ہر قسم کے احوال اور ہر قوم و ملت کی ضروریات کو پورا کر سکتے ہوں۔ اسلام نے ہر ضرورت کی کفالت کی ہے اور ہر قسم کے معاشرے کیلئے ہر قسم کے احوال میں احکام دیئے ہیں۔ انسانیت ایک دور سے' جب دوسرے دور میں داخل ہوتی ہے اور دوسرے سے تیسرے میں تو اپنی تمام ضروریات کا حل اسے اسلام کے پاس مل جاتا ہے۔ کیا آج کے مہذب شہروں کی بالکل وہی ضروریات ہیں' جو دیہات' صحراؤں اور تہذیب و تمدن سے دور علاقوں کی ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ پس قانون ایسا ہونا چاہئے' جو ہر معاشرے' ہر فرد' ہر حالت اور ہر زمان و مکان میں راہنمائی کے لائق ہو۔ صرف شہری زندگی کی نہیں بلکہ بدوی اور صحرائی زندگی کی راہنمائی بھی کرے۔ دنیا کے ہر کونے میں اس پر عمل ہو سکے۔ وہ لچک دار بھی ہو اور ہر وقت اور ہر جگہ کی ضرورت کا بھی اس میں لحاظ ہو۔ انسان اپنی اور دوسرے انسانوں کی ضروریات کا رب العالمین سے زیادہ جاننے والا اور سمجھنے والا نہیں ہے۔ کائنات کا رب اپنی مخلوق کی مصلحتوں' گوناں گوں ضرورتوں اور مختلف احوال و ظروف کو مخلوقات سے زیادہ جانتا ہے۔

قانون صرف انہیں ایک اچھی زندگی گزارنے کی آسانیاں مہیا کرتا ہے' جو دل کی آمادگی کے ساتھ قانون کی پیروی کرتے ہیں اور جن کے دلوں میں قانون کے بارے میں مخاصمانہ یا منافقانہ رویہ پایا جاتا ہو' ان کیلئے قانون کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ اسلامی قانون کی اصل روح اللہ کا تقویٰ اور اس کے احکام کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔ اسلامی قانون کے ماننے والے اللہ کی رضا کے حصول اور آخرت میں سرخروئی کیلئے اس قانون کی پابندی کرتے ہیں اور اگر یہ جذبہ مفقود ہو جائے تو اسلامی قانون اللہ کا قانون ہوتے ہوئے بھی' اپنے ماننے والوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے ان آیاتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسۡمَعُوۡا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ۝

﴿اللہ سے ڈرو! پیغمبر کی بات سنو! جو اللہ سے نہیں ڈرتے اور پیغمبر کی بات نہیں سنتے' وہ نافرمان ہیں اور اللہ ایسے نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ وہ دنیا میں بھٹکتے رہیں گے اور آخرت میں اپنے انجام بد سے دوچار ہوں گے۔﴾

Marfat.com

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا

(وہ دن یاد رکھنے کے لائق ہے) جس دن خدا پیغمبروں کو جمع کرے گا۔ پھر ان سے پوچھے گا کہ تمہیں کیا

لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ

جواب ملا تھا۔ وہ عرض کریں گے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ تو ہی غیب کی باتوں سے واقف ہے۔ جب خدا (عیسیٰ) سے فرمائے گا کہ

مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰي وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ

اے عیسیٰ بن مریم! میرے ان احسانوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کیے۔ جب میں نے روح القدس یعنی

الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ

جبرئیل) سے تمہاری مدد کی تم جھولے میں اور جوان ہو کر (ایک ہی نسق پر) لوگوں سے گفتگو کرتے تھے اور جب میں نے

وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ

تم کو کتاب اور دانائی اور تورات اور انجیل سکھائی اور جب تم میرے حکم سے مٹی کا جانور بنا کر اس

الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ

میں پھونک مار دیتے تھے تو وہ میرے حکم سے اُڑنے لگتا تھا۔ اور مادر زاد اندھے اور سفید داغ

وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ

والے کو میرے حکم سے چنگا کر دیتے تھے۔ اور مُردے کو میرے حکم سے (زندہ کرکے قبر سے) نکال کھڑا کرتے تھے۔ اور جب

اِسْرَاۗءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ

میں نے بنی اسرائیل (کے ہاتھوں) کو تم سے روک دیا جب تم ان کے پاس کھلے نشان لے کر آئے تو جو ان میں سے

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا

کافر تھے کہنے لگے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ اور جب میں نے حواریوں کی طرف حکم بھیجا کہ مجھ پر اور میرے

بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اِذْ قَالَ

پیغمبر پر ایمان لاؤ وہ کہنے لگے کہ (پروردگار) ہم ایمان لائے تو شاہد رہیو کہ ہم فرمانبردار ہیں۔ (وہ قصہ بھی یاد کرو)

Marfat.com

الْحَوَارِيُّونَ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ

جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ بن مریمؑ! کیا تمہارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے

عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿١١٢﴾

(طعام کا) خوان نازل کرے؟ انہوں نے کہا کہ اگر ایمان رکھتے ہو تو خدا سے ڈرو ف۲

قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَّأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ

وہ بولے کہ ہماری یہ خواہش ہے کہ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل تسلی پائیں۔ اور ہم جان لیں کہ تم

صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِينَ ﴿١١٣﴾ قَالَ عِيسَى ابْنُ

نے ہم سے سچ کہا ہے اور ہم اس (خوان کے نزول) پر گواہ رہیں ف۳۔ (تب) عیسیٰؑ بن مریم نے دعا

مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا

کی کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ ہمارے لیے (وہ دن) عید قرار

لِّأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِينَ ﴿١١٤﴾ ف۱

پائے یعنی ہمارے اگلوں اور پچھلوں (سب) کے لیے اور وہ تیری طرف سے نشانی ہو اور ہمیں رزق دے تو بہتر رزق دینے والا ہے

قَالَ اللّٰهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ

خدا نے فرمایا میں تم پر ضرور خوان نازل فرماؤں گا لیکن جو اس کے بعد تم میں سے کفر کرے گا اسے ایسا عذاب

عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِينَ ﴿١١٥﴾ ع وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ

دوں گا کہ اہل عالم میں کسی کو ایسا عذاب نہ دوں گا ف۲۔ اور (اس وقت کو بھی یاد رکھو) جب خدا فرمائے گا

مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ

کہ اے عیسیٰ بن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری والدہ کو معبود مقرر کرو؟

اللّٰهِ ۖ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ۚ إِنْ

وہ کہیں گے کہ تو پاک ہے مجھے کب شایاں تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کا مجھے کچھ حق نہیں۔ اگر میں

Marfat.com

كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ

لے ایسا کہا ہوگا تو تجھ کو معلوم ہوگا۔ (کیونکہ) جو بات میرے دل میں ہے تو اُسے جانتا ہے۔ اور جو تیرے ضمیر

اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ

میں ہے اُسے میں نہیں جانتا بلاشبہ تو علام الغیوب ہے۔ میں نے اُن سے کچھ نہیں کہا بجز اس کے جس کا تو نے مجھے

اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ

حکم دیا وہ یہ کہ تم خدا کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے اور جب تک میں اُن میں رہا اُن (کے

فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ

حالات) کی خبر رکھتا رہا جب تو نے مجھے دنیا سے اُٹھا لیا تو تو اُن کا نگران تھا اور تو ہر چیز سے خبردار

شَهِیْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ

ہے۔ اگر تو اُن کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں۔ اور اگر بخش دے تو (تیری مہربانی ہے) بیشک

اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۱۸﴾ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ

تو غالب (اور) حکمت والا ہے۔ خدا فرمائے گا کہ آج وہ دن ہے کہ راستبازوں کو اُن کی

صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ

سچائی ہی فائدہ دے گی۔ اُن کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ ابدالآباد اُن

اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ

میں بستے رہیں گے۔ خدا اُن سے خوش ہے اور وہ خدا سے خوش ہیں۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔ آسمان اور

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِیْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۲۰﴾ ع

زمین اور جو کچھ اُن (دونوں) میں ہے سب پر خدا ہی کی بادشاہی ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تمہید:

سورۃ المائدہ عہد و میثاق کی سورۃ ہے۔ اس لئے جن اساسی باتوں پر امت اسلامیہ کی بنیاد اٹھائی جا رہی تھی ان تمام باتوں کا اس سورۃ میں تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کی پابندی کا عہد لیا گیا ہے۔ مزید برآں احکام کے سلسلے میں تکمیلی پہلوؤں سے جن مزید احکامات کی ضرورت تھی یا اس سلسلے میں

Marfat.com

جو مزید ہدایات ناگزیر تھیں' ان کا بھی اس سورۃ میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ پھر تکمیلِ دین کی نعمت کا ذکر فرما کر مسلمانوں کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا ہے اور حلّت وحرمت کے تصور کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کر کے' حاکمیت الٰہیہ کے بنیادی عقیدے کو دل و دماغ میں راسخ کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ مزید برآں شریعت اسلامی کی پابندی اور اللہ کی توحید کا عہد و پیمان لیتے ہوئے دوسری امتوں کا تذکرہ' اس لحاظ سے کیا گیا ہے کہ اساسی اعتقادات اور شریعتِ اسلامی کی پابندی کا عہد' یہ اللہ کی ایسی سنت ہے' جس پر ہمیشہ عمل ہوتا رہا ہے۔ جب بھی اللہ نے کسی انسانی گروہ کو اپنی شریعت کی پابندی کیلئے چنا اور اس کو دعوت کا علمبردار بنایا ہے تو اس سے اس کی پابندی کا عہد ضرور لیا گیا ہے اور اسی عہد کی پابندی کی صورت میں ان کی دنیوی سرفرازی اور اخروی سرخروئی کا وعدہ فرمایا گیا۔ یوں بھی اگر دیکھا جائے کہ جب بھی کوئی آدمی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا دعویٰ کر کے' اس کے رسول کی امت کا ایک فرد بنتا ہے تو اصلاً وہ اللہ اور اس کے رسول سے ایک عہد و پیمان کرتا ہے کہ میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں اللہ کی عبودیت میں کسی کو شریک نہیں کروں گا اور اللہ کے رسول کے مقابلے میں کسی شخصیت کو نہ اپنا رہنما سمجھوں گا اور نہ آئیڈیل کے طور پر قبول کروں گا۔ اس سورۃ میں بار بار ایسے ہی عہد و پیمان کی طرف نہ صرف یہ کہ متوجہ کیا گیا' بلکہ اس عہد کی پاسداری کو مستحکم اور استوار رکھنے کیلئے' ان تمام احکام اور اعمال پر بھی زور دیا گیا ہے' جس سے اس عہد و پیمان کی یاددہانی اور اسے زندہ اور توانا رکھنے میں مدد مل سکے۔

عہد و پیمان کی یہ تمام تر تاکید اور امت اسلامیہ کی اصل حیثیت کا احساس' اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو صرف اسی وقت تک توانا رہ سکتا ہے جب کہ ایک ایک فرد کے دل میں اس بات کا تصور زندہ رہے کہ مرنے کے بعد ایک دن ایسا ضرور آنے والا ہے' جس دن ہمیں اللہ کی بارگاہ اور اس کی عدالت میں کھڑا کیا جائے گا اور ہم سے اس عہد و پیمان کے حوالے سے اور اسی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اعمال کے حوالے سے' جواب طلبی ہوگی اور اگر ہم اپنے اس عہد و پیمان میں اس عدالت کے سامنے پورا اترنے میں کامیاب ٹھہرے' تو ابدی نعمتوں سے ہمیں نوازا جائے گا اور اگر خدانخواستہ ہم ناکام ہو گئے تو ہمیشہ کا عذاب اور ذلت ہمارا مقدر بنے گی۔ چنانچہ اس سورۃ کے آخری جو دو رکوع ہمارے پیش نظر ہیں' ان میں اسی احساس کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ لیکن بات کا انداز اور اسلوب کلام کے تیور ایسے موثر اور تیکھے ہیں' جسے پڑھتے ہوئے آدمی سہم سہم جاتا ہے۔

آیت:۱۰۹ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ط قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ط اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ O

''(اس دن کو یاد رکھو!) جس دن اللہ سب رسولوں کو جمع کرے گا' پھر پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب ملا؟ وہ کہیں گے' ہمیں کچھ علم نہیں' غیب کی باتوں کا جاننے والا تو بس تو ہی ہے''۔

بارگاہِ الٰہی میں جوابدہی کا تصور اور اس کی عظمت

اس آیت کریمہ میں' اس آیت کا پہلا لفظ ''یَوْمَ'' سب سے پہلے قابل توجہ ہے۔ قبل اس کے کہ یہ بتایا جائے کہ اس دن کیا ہوگا اور اصل میں جس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے' وہ کیا ہے' یَوْمَ کا لفظ کہہ کر اس دن کی ہولناکی کو نمایاں کیا گیا ہے کہ آج تمہیں جس عہد و پیمان کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے' تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ اس عہد و پیمان کے بارے میں' تمہیں جس عدالت کے سامنے کھڑے ہونا ہے' وہ کوئی دنیا کی عدالت نہیں بلکہ وہ تو ایک ایسے دن کی عدالت ہے' جس میں جج اور منصف کے منصب پر خود خداوند ذوالجلال فائز ہوں گے اور اس کے جلال اور اس کی ہیبت سے ہر چیز لرزہ براندام ہوگی۔ ایک بے کراں انسانی سمندر' امید و بیم کی کیفیت میں سراپا محو انتظار ہوگا۔ اچانک ایک آواز گونجے گی' لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ'' انسانو! تم نے دنیا میں کیسی کیسی بادشاہتوں کے تخت و تاج بچھا رکھے تھے اور کیسی کیسی عظمتوں کے آستانے قائم کر رکھے تھے' اپنے اقتدار اور اپنی بڑائی کے کیسے کیسے دعوے

Marfat.com

بتاؤ! آج کس کی حکومت ہے؟ کون ہے جو مطلق العنان بادشاہ ہے؟ جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں؟ پھر خود ہی جواب دیا جائے گا:

لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿آج اس اللہ کی حکومت ہے' جو ایک ہے اور قہار ہے۔﴾

مزید دل ہلا دینے والی بات یہ ہے کہ ایسے ہولناک اور ہیبت ناک دن میں' سب سے پہلے جن کو حاضری کیلئے بلایا جائے گا' وہ میرے اور آپ جیسے گناہ گار لوگ نہیں ہوں گے بلکہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی عظمتِ پا کو فرشتے سلام کرتے ہیں۔ ساری کائنات مل کر جن میں سے کسی ایک کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اللہ نے جنہیں معصوم پیدا فرمایا اور ہمیشہ انہیں اپنی حفاظت میں رکھا' جنہوں نے انسانوں کو انسانیت کا جوہر عطا کیا اور جن کے احسانات سے آج تک دنیا میں خیر کا وجود زندہ ہے۔ جنہیں ہم انبیاء و رسل کے نام سے جانتے ہیں۔ اس دن اللہ تعالیٰ ان رسولوں کو جمع فرمائے گا اور سب سے پہلے جواب طلبی اور باز پرس ان سے ہوگی اور قرآن کریم میں دنیا ہی میں اس بات کا تذکرہ اس لئے فرما دیا گیا تاکہ نوعِ انسانی کے افراد اس دن کی اہمیت اور اس دن میں جواب دہی کی نزاکت کو آج ہی اچھی طرح محسوس کر کے اس کیلئے تیاری کر لیں اور یہ باور کر لیں کہ جس عدالت کے سامنے نوع انسانی کے گل ہائے سر سبد کھڑے ہونے پر مجبور ہوں گے' اس میں ما و شما کا کیا حال ہوگا اور اگر آج اس دن کی تیاری نہ کی گئی تو پھر جس صورت حال سے دوچار ہونا پڑے گا' آج شاید اس کا تصور کرنا بھی آسان نہ ہو۔

اللہ کے جن بندوں نے دنیا میں اس عدالت کی ہولناکی اور اس کی عظمت کو سمجھ لیا' ان کی زندگی گناہوں سے پاک ہو گئی اور وہ اپنی ساری عظمتوں کے باوجود' ہمیشہ اس تصور سے خوفزدہ رہے کہ بارگاہِ خداوندی میں کس طرح پیش ہو سکیں گے۔ تاریخ میں آتا ہے کہ کسی صاحب کو امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے کوئی کام تھا۔ اس نے سوچا امام صاحب نماز میں مل جائیں گے' چنانچہ وہ عشاء کی نماز میں مسجد میں چلا آیا۔ اتفاق سے نماز میں امام صاحب نے جو آیات تلاوت کیں' اس میں یہ جملہ بھی تھا:

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿اے مجرمو! آج الگ ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔﴾

یعنی تمہیں اللہ کے نیکوکار بندوں کے ساتھ کھڑے ہونے کی اجازت نہیں' تمہیں الگ سے کھڑا ہونا ہوگا تاکہ تمہارے جرائم کے مطابق تم سے سلوک کیا جائے۔ یہ شخص جو امام صاحب سے ملنے کیلئے گیا تھا وہ کہتا ہے کہ نماز کے بعد میں نے امام صاحب کو دیکھا کہ بیٹھے ہوئے آہیں کھینچ رہے ہیں اور بار بار اس آیت کی تلاوت کر رہے ہیں۔ کہتا ہے میں نے دیر تک انتظار کیا' حتیٰ کہ جب رات ڈھلنے لگی تو میں ناامید ہو کے اٹھ آیا۔ تہجد کے وقت پہنچا تو امام صاحب کو اسی کیفیت میں پایا۔ زار و قطار رو رہے تھے اور اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے یہ درخواست کر رہے تھے' یا اللہ! جس دن مجرموں کو الگ کیا جائے گا' اپنے غلام نعمان پر رحم فرمانا اور اس کو بخش دینا۔

یہی وہ احساس ہے جو انسان کو راہِ راست پر رکھتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کے پہلے ہی جملے میں یہ تصور دیا جا رہا ہے کہ قیامت کے دن کی ہولناکی کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس میں اللہ کے نبیوں اور رسولوں کو بھی جواب دہی کیلئے کھڑا ہونا پڑے گا اور پھر اللہ ان سے سوال فرمائے گا: مَاذَآ اُجِبْتُمْ بتاؤ تمہاری امتوں کی طرف سے تمہیں کیا جواب دیا گیا؟ یہ سوال دوہری نوعیت کا ہے۔ اس میں پہلا سوال جو مضمر ہے' وہ یہ ہے کہ بتاؤ اللہ نے جو شریعت تم پر اتاری تھی اور نبوت اور رسالت کے جس عظیم منصب پر تمہیں فائز کیا گیا تھا' کیا تم نے اس کا پورا حق ادا کیا' اللہ کے بندوں تک اس کی شریعت کا ایک ایک حکم پہنچایا اور پھر اس کے جواب میں تمہاری امتوں نے اس پیغام اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا۔ انہوں نے قبول کیا یا اسے رد کر دیا؟ اندازہ فرمایئے! اس سورۃ میں تو بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ عہد و پیمان صرف ان لوگوں سے لیا جا رہا ہے' جو اللہ کے رسول پر ایمان لائے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ

Marfat.com

ایمان لانے والے تو اس عہد و پیمان کے حوالے سے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے کیے ہی جائیں گے' وہ رسول بھی جواب دہی پر مجبور ہوں گے' جو ان امتوں کی طرف مبعوث کیے گئے۔ اس سے اس عہد و پیمان اور اس کی جواب دہی کی عظمت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

پیغمبر اس کے جواب میں کہیں گے کہ ہمیں اس کا کوئی علم نہیں کہ ہماری امتوں نے ہماری دعوت کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ان کے جواب کا مفہوم یہ ہے کہ جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جنہوں نے ہماری دعوت کو رد کر دیا' ان کو تو پیغمبر جانتے ہیں۔ لیکن یہاں سوال ان کے بارے میں نہیں' بلکہ سوال ان لوگوں کے بارے میں ہے' جنہوں نے اس دعوت کو قبول کیا اور پھر اس کے تقاضوں اور ذمہ داریوں کے حوالے سے کیا کردار ادا کیا۔ ظاہر ہے' اس بات کا جواب دینا پیغمبروں کیلئے ممکن نہ تھا۔ کیونکہ جواب کا تعلق دو باتوں سے ہے۔ ایک تو یہ کہ جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول کیا' کیا انہوں نے اسے ظاہری طور پر قبول کیا یا دل و دماغ کی آمادگی بھی اس کے ساتھ تھی اور انہوں نے واقعی اس کا ویسے ہی حق ادا کیا' جیسے کرنا چاہئے تھا؟ اس بات کا تعلق چونکہ انسان کے باطن سے ہے اور باطن کا جاننے والا تو صرف اللہ تعالیٰ ہے اور دوسری یہ بات کہ پیغمبروں کے دنیا سے اٹھائے جانے کے بعد' ان کی امتوں نے اس دعوت کے ساتھ کیا سلوک کیا' اس دعوت کے کیا نتائج نکلے اور اگلی نسلوں میں اس کے کیا برگ و بار پیدا ہوئے؟ اس بات کا علم بھی پیغمبروں کو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے انہوں نے عرض کیا کہ ہمیں اس کا کوئی علم نہیں۔ یعنی ہم اس کے بارے میں نہ تو یقینی طور پر کچھ جانتے ہیں اور نہ پوری تفصیل سے جانتے ہیں کیونکہ ان دونوں باتوں کا تعلق غیب سے ہے اور غیب کا علم رکھنے والا الٰہی تو ہی ہے' ہم تو غیب کے جاننے والے نہیں:

اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿بے شک غیبوں کے جاننے والے تو آپ ہی ہیں۔﴾

علمِ غیب کی حقیقت

یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہئے اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے ہم ایک بے کار بحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ اہلِ علم نے علم کی پاسداری چھوڑ دی ہے۔ لہٰذا معاملہ جہلا کے ہاتھوں میں ہے' وہ بلا وجہ عوام کو آپس میں لڑاتے رہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جہاں تک اللہ کے نبیوں اور رسولوں کے علم کا تعلق ہے' وہ بلا شبہ اپنے دور کے سب سے بڑے عالم اور سب سے زیادہ باخبر لوگ ہوتے ہیں بلکہ ان کے علم کی رسائی وہاں تک ہوتی ہے' جہاں دوسروں کیلئے دم مارنے کی مجال نہیں۔ پھر ان کے علم کی بنیادیں قیاسات اور تخمینوں پر نہیں اٹھائی جاتیں بلکہ ان کے علم کا ذریعہ اللہ کی وحی ہے' جس میں غلطی اور گمان تک کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ وہ دنیا کو علم اور یقین سے بہرہ ور کرتے ہیں اور دنیا میں پروردگار انہیں علم اور یقین کے سرچشمے کی حیثیت سے بھیجتا ہے۔ لیکن ان کے پاس جو بھی اور جتنا بھی علم ہوتا ہے وہ ان کا ذاتی نہیں بلکہ پروردگار کی عطا اور اس کی دین ہے۔ وہ دین کے بارے میں کبھی یہ نہیں کہتے کہ ہم اس کو از خود جانتے ہیں بلکہ ہمیشہ وہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ وہ دنیا میں دین کے حوالے سے کسی کے شاگرد نہیں ہوتے' بلکہ وہ براہ راست اور کبھی جبرائیل کے واسطے سے' اپنے پروردگار سے استفادہ فیض کرتے ہیں۔

جہاں تک علم غیب کا تعلق ہے اس کی تعریف یہ ہے کہ علم غیب اس علم کو کہتے ہیں جو از خود ہو، کوئی اس کا ذریعہ نہ ہو، ایسا علم ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں ہے ہمارے رسول پاک ﷺ علم الاولین والاخرین کے مالک ہیں لیکن آپ کا یہ تمام تر علم اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے، وہ کبھی جبرائیل کے واسطے سے اترتا ہے کبھی براہ راست اللہ کی طرف سے القاء ہوتا ہے یہی حال باقی انبیاء و رسل کا بھی ہے اس لئے علمی لحاظ سے ان کے تمام علوم کو جن تک دنیا کی رسائی نہیں ہے علم غیب نہیں کہا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے رسول اللہ ﷺ یا کسی اور نبی کیلئے عالم الغیب کا لفظ اختیار نہیں فرمایا اس رکوع میں بھی یہی کہا گیا کہ ہم تو کچھ نہیں جانتے علام الغیوب تو آپ ہیں۔ اگر اتنی سی بات کو سمجھ لیا جائے کہ یہ صرف ایک علمی اصطلاح کا معاملہ ہے

Marfat.com

نفس علم کا تو کوئی جھگڑا نہیں جو آدمی انبیاء کرام کے تمام دنیا سے زیادہ علم کا قائل نہیں وہ تو سرے سے مسلمان ہی نہیں سوال تو صرف یہ ہے کہ کیا ان کا یہ علم اپنے طور سے ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر نازل ہوتا تھا اگر دوسری صورت ہے تو اس کو علم تو کہیں گے علم غیب نہیں کہیں گے اور اگر پہلی بات ہے تو ایسا علم کسی پیغمبر کو حاصل نہیں یہ صرف اللہ کی صفت ہے۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے۔ مشہور واقعہ ہے جس سے ہم سب واقف ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت یوسف علیہ السلام کو بچپن میں ان کے بھائیوں نے کنعان کے ایک کنویں میں پھینک دیا اور گھر آ کر اپنے والد گرامی سے یہ کہا کہ ان کو بھیڑیا کھا گیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام باوجود پیغمبر ہونے کے یہ نہ جان سکے کہ بیٹا تین میل کے فاصلے پر کنویں میں پڑا ہے حتیٰ کہ یہ بیٹا ایک قافلے کی مدد سے مصر پہنچا عزیز مصر کے گھر میں پلا بڑھا پروردگار نے محض اپنے فضل و کرم سے اسے تخت و تاج کا وارث بنا دیا لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام اس کی جدائی میں روتے رہے پھر ایک وقت آیا کہ خود یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو بتایا کہ میں ہی تمہارا بھائی یوسف ہوں۔ ان کو وہاں سے اپنا پیراہن دے کر روانہ کیا کہ جا کر اباجان کی آنکھوں پر ڈال دینا وہ جو رورو کے اندھے ہو گئے ہیں ان شاء اللہ ان کی بینائی بحال ہو جائے گی۔ چنانچہ جیسے ہی وہ پیراہن مصر سے چلا سینکڑوں میل پر بیٹھے ہوئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ اگر تم یہ نہ کہو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں یوسف کی خوشبو سونگھ رہا ہوں۔ شیخ سعدی نے اسی سوال کو منظوم کرتے ہوئے کہا

یکے پرسید زاں گم کردہ فرزند — کہ اے روشن گہر پیر خرد مند
زمصرش بوئے پیراہن شمیدی — چرا در چاہِ کنعانش ندیدی
بگفت احوالِ ما برقِ جہاں است — دمِ پیدا و دیگر دمِ نہاں است
گہے بر طارِ اعلیٰ می نشینم — گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

(ترجمہ) ﴿ایک آدمی نے اس بزرگ سے، جس کا بیٹا گم ہو گیا تھا، پوچھا کہ اے روشن گہر اور اے پیر خردمند تو نے مصر سے تو بیٹے کے کرتے کی بو سونگھ لی، لیکن کنعان کے کنویں میں تو اس کو کیوں نہ دیکھ سکا؟ اس مردِ بزرگ (حضرت یعقوب علیہ السلام) نے جواب دیا کہ ہم لوگوں کی حالت دنیا کی بجلی جیسی ہے، ادھر چمکتی ہے، ادھر بجھ جاتی ہے۔ کبھی تو ہمارا یہ حال ہوتا ہے کہ ہمیں ایک اونچے بالا خانے پر بٹھا دیا جاتا ہے (اور ہم سب کچھ دیکھتے ہیں) اور کبھی ہمارا یہ حال ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے پاؤں کی پشت کی خبر نہیں ہوتی۔﴾

اس واقعہ سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پیغمبر کا علم سراسر اللہ کا عطیہ ہے۔ وہ جب چاہتا ہے، جتنا چاہتا ہے، عطا کرتا ہے اور جس کی ضرورت نہیں سمجھتا، وہ عطا نہیں کرتا۔ اس لئے پیغمبر دنیا کو جن بے کراں علوم سے مالا مال کرتے ہیں، وہ ان کی اپنی کاوشوں کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ کی وحی کے ذریعے دنیا میں آتا ہے۔ اس لئے شیخ سعدی مرحوم نے فرمایا:

علم غیبے کس نمی داند بجز پروردگار — ہر کسے گوید کہ می داند ازو باور مدار
مصطفیٰ ہرگز نہ گوید تا نہ گوید جبرائیل — جبرائیل ہرگز نہ گوید تا نہ گوید کردگار

(ترجمہ) ﴿اللہ کے سوا علمِ غیب کوئی نہیں جانتا۔ اگر کوئی شخص کہے کہ کوئی جانتا ہے تو اس کا یقین مت کرو کیونکہ مصطفیٰ ﷺ کبھی کچھ نہیں فرماتے جب تک جبرائیل وحی لے کر نہیں آتے اور جبرائیل علیہ السلام ہرگز کبھی کچھ نہیں کہتے تاوقتیکہ پروردگار کا حکم نہیں ہوتا۔﴾

Marfat.com

تمام انبیاء ورسل کے اجمالی تذکرے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسی جواب دہی کے حوالے سے کسی حد تک تفصیلی تذکرہ کیا جارہا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل کے سلسلے کے آخری رسول تھے اور مزید یہ بھی کہ ان کی تعلیم کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں دو قومیں تباہ ہوئیں۔ قوم یہود ان کی دشمنی کی وجہ سے اور عیسائی ان سے محبت میں غلو کے نتیجے میں۔ اس لئے یہاں بطور خاص ان کا تذکرہ کیا جارہا ہے تاکہ یہودی اس کو سمجھ کر اپنی غلطی کو محسوس کریں اور عیسائی صحیح صورت حال سے آگاہ ہونے کے بعد اپنے عقائد کی اصلاح کریں۔

آیت:۱۱۰ اِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ اذۡكُرۡ نِعۡمَتِىۡ عَلَيۡكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ‌ ۘ اِذۡ اَيَّدْتُّكَ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ‌ قف تُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الۡمَهۡدِ وَكَهۡلًا‌ ۚ وَاِذۡ عَلَّمۡتُكَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَالتَّوۡرٰٮةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ‌ ۚ وَاِذۡ تَخۡلُقُ مِنَ الطِّيۡنِ كَهَيۡـئَةِ الطَّيۡرِ بِاِذۡنِىۡ فَتَنۡفُخُ فِيۡهَا فَتَكُوۡنُ طَيۡرًۢا بِاِذۡنِىۡ‌ وَتُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ بِاِذۡنِىۡ‌ ۚ وَاِذۡ تُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰى بِاِذۡنِىۡ‌ ۚ وَاِذۡ كَفَفۡتُ بَنِىۡۤ اِسۡرٰٓءِيۡلَ عَنۡكَ اِذۡ جِئۡتَهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡهُمۡ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ‏ ○ ''جبکہ اللہ کہے گا: اے عیسیٰ ابن مریم! میرے ان احسانات کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کئے' جبکہ میں نے روح القدس سے تمہاری تائید کی' تم لوگوں سے کلام کرتے تھے گہوارے میں بھی اور ادھیڑ عمر کا ہو کر بھی اور یاد کرو! جبکہ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت اور تورات وانجیل کی تعلیم دی اور یاد کرو! جبکہ تم مٹی سے ایک صورت' پرندے کی صورت کی مانند میرے حکم سے بناتے تھے' پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی اور تم اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتے تھے اور یاد کرو! جبکہ تم مردوں کو میرے حکم سے (قبروں سے) نکال کھڑا کرتے اور یاد کرو! جبکہ بنی اسرائیل کے شر کو میں نے تم سے دور رکھا جبکہ تم ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے تو ان کے کافروں نے کہا کہ یہ تو بس صریح جادو ہے''۔

یہود اور عیسائیوں پر اللہ کی طرف سے اتمام حجت

اس آیت کریمہ میں پروردگار یہود ونصاریٰ دونوں پر حجت تمام فرما رہے ہیں۔ یہود پر ان معنوں میں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو قبول کرنے سے انکار کیا اور آپ کے معجزات کو جادو اور شیطانی اثرات کا نتیجہ قرار دیتے رہے۔ ان کے سامنے جب اللہ تعالیٰ اپنے احسانات کا ذکر فرمائیں گے اور یہ بات واضح ہوجائے گی کہ یہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ کے احسانات تھیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں پر ان کا ظہور دراصل وہ بینات تھے' جو ان کی نبوت اور صداقت کے دلائل تھے۔ لیکن یہود نے اس کو قبول نہ کرکے اپنی عاقبت تباہ کی اور قرآن کریم کے نزول کے وقت قیامت سے پہلے' ان باتوں کا بیان کرنا یہود کیلئے ایک اتمام حجت سے کم نہیں کہ آج بھی اگر وہ چاہیں تو گمراہی سے نکل کے ہدایت کا راستہ اختیار کرسکتے ہیں کیونکہ آج اگر وہ قرآن پر اعتماد کرتے ہوئے عیسیٰ علیہ السلام کی صحیح حیثیت کو قبول کرنے کیلئے تیار ہوجاتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ قرآن کریم کی حقانیت کو تسلیم نہ کریں اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان نہ لائیں۔ یہی ان کیلئے ہدیت اور سلامتی کا راستہ ہے۔ عیسائیوں پر اس طرح حجت تمام کی جارہی ہے کہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ محترمہ پر جو بھی انعامات ہوئے وہ ان کی ذات کا اظہار نہ تھے' دراصل وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی نبوت کے دلائل تھے اور ان کا ظہور عیسیٰ علیہ السلام کے کسی کمال کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ظہور تھا۔ اس صورت حال میں عیسائیوں کو یہ سوچنا چاہئے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو خیالات بنا رکھے ہیں اور جس طرح سے انہیں خدائی منصب پر فائز کر رکھا ہے' اس کا آخر کیا جواز ہے۔

اب ہم ان معجزات کی جو سراسر اللہ تعالیٰ کے احسانات ہیں' تھوڑی سی وضاحت کرتے ہیں' تاکہ انہیں سمجھنے میں آسانی ہوجائے۔

Marfat.com

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات

(i)......حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت: اس میں سب سے پہلے جس احسان کا ذکر ہے' وہ یہ ہے کہ اے عیسیٰ! میرے اس احسان کو یاد کرو! جو میں نے تجھ پر کیا اور تیری والدہ پر کیا۔ یوں تو یہ احسانات کا ایک طویل سلسلہ ہے' لیکن بطور خاص یہاں جس بات کا ذکر ہو رہا ہے' وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خرقِ عادت ولادت ہے۔ اس صورتحال کو آپ ذہن میں لائیے تو پھر اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتنا بڑا احسان تھا' جو اللہ تعالیٰ نے ماں بیٹے پر کیا۔ صورتحال یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام ابھی کنواری ہیں' اس کنوارے پن میں اللہ تعالیٰ انہیں اس آزمائش سے دوچار کر دیتے ہیں کہ وہ ایک بچے کی ماں بن جاتی ہیں۔ آپ ایک جانے پہچانے معروف اور معزز خاندان کی آبرو ہیں۔ اچانک جب وہ اس نوزائیدہ بچے کو لے کر اپنے لوگوں میں آتی ہیں تو انہیں عجیب صورتحال سے واسطہ پڑتا ہے۔ لوگ دیکھتے ہی حیرت زدہ رہ جاتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ زبانیں کھلنے لگتی ہیں۔ قرآن پاک اس کا تذکرہ کرتے ہوا کہتا ہے:

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْـًٔا فَرِیًّا ○ یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا ○ فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ ؕ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا ○ قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ قف اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ○ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ص وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ○ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ز وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ○ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ○ (سورۃ مریم ۱۹:۲۷ تا ۳۳)

﴿پھر وہ اس بچے کو لئے ہوئے اپنی قوم میں آئی۔ لوگ کہنے لگے ''اے مریم! یہ تو تو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی۔ مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔ لوگوں نے کہا ہم اس سے کیا بات کریں' جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے؟ بچہ بول اٹھا میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی' اور نبی بنایا اور بابرکت کیا' جہاں بھی میں رہوں اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا' جب تک میں زندہ رہوں اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔ سلام ہے مجھ پر' جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مروں اور جبکہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں﴾

اندازہ فرمایئے! صورتحال کس قدر سنگین ہے' حضرت مریم علیہا السلام کی عفت و عصمت اور ان کے صاحبزادہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حسب و نسب دونوں معرض خطر میں ہیں۔ ایک کنواری لڑکی' ایک بیٹے کو جنم دیتی ہے۔ دنیا کا کوئی اخلاق اس لڑکی کی عفت مآبی کی گواہی نہیں دے سکتا اور دنیا کا کوئی قانون بیٹے کو صحیح النسب ثابت نہیں کر سکتا۔ ایسے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پنگھوڑے میں بولنا اور اللہ کی طرف سے اپنے نبی ہونے کا اعلان کرنا' یہ ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے' جس نے شک و شبہ کرنے والوں کے دلوں کو بدل ڈالا اور طعن و تشنیع کرنے والوں کی زبانیں گنگ کر دیں۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ احسان نہ فرماتے تو زمین و آسمان بھی ہم آغوش ہو جاتے تو بھی نہ حضرت مریم علیہا السلام کی پاکدامنی ثابت ہو سکتی اور نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نسب کی گواہی دی جا سکتی۔ اس لئے قرآن کریم نے سب سے پہلے اللہ کے اسی احسان کا ذکر فرمایا۔

(ii)......روح القدس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد: دوسرے جس احسان کا ذکر کیا گیا ہے' وہ ہے ''اِذْ اَیَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ'' کہ ''ہمارے اس احسان کو یاد کرو! جب ہم نے روح القدس سے تمہاری تائید کی۔ اس بات کو سمجھنے کیلئے اس کا پس منظر جاننا ضروری ہے۔

Marfat.com

مختصراً گزارش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا اور آپ کی نبوت کی شہادت کیلئے آپ کو بڑے بڑے معجزات عطا کئے' جو آپ کی حقانیت کو ثابت کرنے کیلئے اس قدر واضح تھے کہ ان کو خدا کی طرف سے ہونے میں کوئی ہٹ دھرم ہی شک کر سکتا تھا۔ لیکن یہود نے ان کھلے کھلے معجزات کو بھی تائید ربانی اور فیض روح القدس کا نتیجہ قرار دینے کی بجائے' نعوذ باللہ! شیطانی تصرف کا نتیجہ قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ معجزے شیطانوں اور بھوتوں کے سردار ''بعلز بول'' کی مدد سے دکھاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے یہود کے اسی الزام کی تردید کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بار بار یہ فرمایا:

اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ﴿ہم نے روح القدس سے اس کی مدد کی﴾

یعنی اس سے جو معجزے صادر ہوئے' یہ تائید روح القدس کا نتیجہ ہیں نہ کہ کسی شیطان یا جن کی مدد کا' جیسا کہ یہود کہتے ہیں۔ انجیل میں یہود کے اس الزام کا ذکر بار بار آیا ہے اور ان کے اس الزام کا جو جواب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیا ہے' وہ بھی نقل ہوا ہے۔ ہم یہاں ایک اقتباس انجیل متی سے پیش کرتے ہیں:

﴿اس وقت اس کے پاس لوگ ایک اندھے، گونگے کو لائے' جس میں بدروح تھی۔ اس نے اسے اچھا کر دیا۔ چنانچہ وہ گونگا بولنے اور دیکھنے لگا اور ساری بھیڑ حیران ہو کر کہنے لگی کہ کیا یہ ابنِ داؤد ہے۔ فریسیوں نے سن کر کہا! یہ بدروحوں کے سردار بعلز بول کی مدد کے بغیر بدروحوں کو نہیں نکالتا۔ اس نے ان کے خیالوں کو جان کر ان سے کہا' جس بادشاہی میں پھوٹ پڑتی ہے' وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس شہر یا گھر میں پھوٹ پڑے گی وہ قائم نہ رہے گا اور اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنے مخالف ہو گیا' پھر اس کی بادشاہی کیونکر قائم رہے گی اور اگر میں ''بعلز بول'' کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں تو تمہارے بیٹے کس کی مدد سے نکالتے ہیں؟ پس وہی تمہارے منصف ہوں گے' لیکن اگر میں خدا کی روح کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں تو خدا کی بادشاہی تمہارے پاس آ پہنچی یا کیونکر کوئی آدمی کسی زور آور کے گھر میں گھس کر اس کا اسباب لوٹ سکتا ہے جب تک کہ پہلے اس زور آور کو نہ باندھ لے۔ پھر وہ اس کا گھر لوٹ لے گا۔ جو میرے ساتھ نہیں' وہ میرے خلاف ہے۔ جو میرے ساتھ جمع نہیں کرتا' وہ بکھیرتا ہے۔ اسلئے میں تم سے کہتا ہوں کہ آدمیوں کا ہر گناہ اور کفر تو معاف کیا جائے گا' مگر جو کفر روح کے حق میں ہے' وہ معاف نہ کیا جائے گا اور جو کوئی ابن آدم کے برخلاف کوئی بات کہے گا' تو وہ معاف کی جائے گی۔ لیکن جو کوئی روح القدس کے خلاف کوئی بات کہے گا' وہ معاف نہ کی جائے گی' نہ اس عالم میں اور نہ آنے والے عالم میں یا تو درخت کو بھی اچھا کہو اور اس کے پھل کو بھی اچھا یا درخت کو بھی برا کہو اور اس کے پھل کو بھی برا کہو کیونکہ درخت پھل سے ہی پہچانا جاتا ہے۔﴾ (متی باب ۱۲۔ آیات ۲۲-۲۳)

اس پس منظر کو اگر سامنے رکھا جائے تو تب یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں روح القدس کی تائید کا کیوں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ جہاں تک روح القدس کی تائید کا ذکر ہے' وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت نہیں۔ وہ ہر پیغمبر کو حاصل ہوتی ہے اور پیغمبر سے جو معجزات صادر ہوتے ہیں' وہ اسی تائید کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں اس بات کا اظہار بار بار اس لئے فرمایا گیا کہ یہود ان پر مذکورہ بالا الزام لگاتے تھے۔ روح القدس سے مراد وہ پاکیزہ روح ہے' جو خدا کی طرف سے آتی ہے اور عبرانی میں اس سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔

Marfat.com

(iii)......حضرت عیسیٰ علیہ السلام بڑھاپے میں بھی لوگوں سے کلام کریں گے: تیسرا معجزہ جس کا یہاں ذکر فرمایا گیا ہے وہ ہے:

تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلاً ﴿تو لوگوں سے باتیں کرتا ہے' گہوارے میں اور بڑھاپے میں۔﴾

جہاں تک گہوارے میں باتیں کرنے کا تعلق ہے' یہ تو یقیناً ایک معجزہ ہے کیونکہ انسانی بچہ ایک خاص عمر کو پہنچ کے بولنا سیکھتا ہے' پیدا ہونے کے چند دنوں بعد بولنے لگنا اور وہ بھی اس طرح جیسے بڑی عمر کا آدمی بولتا ہے اور ایسی عقل و خرد کی باتیں کرنا کہ بڑے بڑے اسے سن کر دنگ رہ جائیں۔ یہ یقیناً ایک غیر معمولی بات ہے' جو ایک معجزہ ہی کہی جا سکتی ہے۔ لیکن کہولت اور بڑھاپے میں باتیں کرنا یہ تو ایک معمول کی بات ہے۔ ہر آدمی بڑھاپے میں' جب تک اس کی زبان ساتھ دیتی ہے، باتیں کرتا ہے بلکہ جیسے جیسے بوڑھا ہوتا جاتا ہے' زیادہ باتیں کرنے لگتا ہے۔ اسلئے ایک ایسی بات کو جو تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے' معجزے کے طور پر پیش کرنا' ناقابل فہم سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس کا پس منظر سمجھ لیا جائے تو پھر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بات کتنا بڑا معجزہ ہے۔

بات اصل میں یہ ہے کہ عیسائی دنیا کا یہ دعویٰ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے دنیا میں تینتیس (۳۳) سال عمر گزاری ہے۔ تیس سالوں کے بارے میں عیسائی کچھ نہیں جانتے۔ البتہ! آخری تین سالوں کے بارے میں انجیل ان کے احوال سے بھری ہوئی ہے۔ اس کا اختتام اس بات پر ہوتا ہے کہ یہودی جو آپ کی پیغمبرانہ دعوت کی وجہ سے ان کے جانی دشمن ہو گئے تھے' انہوں نے آنجناب کے خلاف سازش تیار کی' حکومت کو ورغلایا' بالآخر آپ کو گرفتار کرانے میں کامیاب ہو گئے' پولیس آپ کو گرفتار کر کے عدالت تک لے گئی' عدالت نے آپ کو سولی دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ' دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کو سولی دے دی گئی۔ البتہ! عیسائیوں کا مزید یہ دعویٰ ہے کہ:

﴿تین دن کے بعد آپ کی قبر خالی پائی گئی اور آپ قبر سے نکل کر آسمانوں پر چلے گئے اور وہاں اللہ کے عرش پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیٹھ کر کائنات پر حکمرانی کرنے لگے۔﴾

اس پوری صورتحال کو سامنے رکھیے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بڑھاپے کی عمر سے پہلے ہی موت کی آغوش میں چلے گئے۔ لیکن اس کے برعکس مسلمانوں کا دعویٰ یہ ہے اور قرآن کریم جس کی شہادت دیتا ہے کہ یہود اپنی ساری کوششوں کے باوجود نہ آپ کو صلیب دے سکے اور نہ آپ کو قتل کر سکے۔ انہوں نے اپنے تئیں آپ کے قتل کے سارے اسباب فراہم کر دیئے تھے' لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ قرب قیامت میں دجال کا فتنہ فرو کرنے کیلئے آپ دمشق میں اتارے جائیں گے اور آپ اسی عمر میں ہوں گے جس عمر میں آپ آسمانوں پر اٹھائے گئے تھے۔ پھر آپ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ کی حیثیت سے' چالیس سال تک ایک عادلانہ حکومت کریں گے۔ جب آپ بوڑھے ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو موت دے گا اور آپ اپنے اللہ کے پاس پہنچ جائیں گے۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو جب آپ موت سے دوچار ہوں گے تو اس وقت آپ کی عمر تہتر سال ہو گی اور اس وقت تک آپ ایک حکمران کی حیثیت سے احکام جاری کرتے ہوں گے۔ وعظ و نصیحت فرماتے ہوں گے' اصلاح و تبلیغ کا کام کرتے ہوں گے' یہ ہے بڑھاپے میں آپ کا بولنا' جو ایک بہت بڑا معجزہ ہے کہ جوانی میں اٹھائے جانے کے بعد آسمانوں سے پھر آپ کا نزول ہونا اور پھر بڑھاپے کی عمر تک ایک عادلانہ حکومت چلانا' یہ ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ ہے' جو صرف آپ کی خصوصیت ہے۔ اس لحاظ سے یہاں اس کو معجزہ قرار دیا گیا ہے اور اللہ کے احسانات میں شمار کیا گیا ہے۔

Marfat.com

(iv)...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کتاب وحکمت کی تعلیم دی: اس کے بعد فرمایا:

وَ اِذْ عَلَّمْتُکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَالتَّوْرٰۃَ وَالْاِنْجِیْلَ

﴿اور اس وقت کو یاد کرو جب میں نے تمہیں کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل دی۔﴾

تورات اور انجیل کے الفاظ یہاں کتاب اور حکمت کی تفسیر کے طور پر آئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان دونوں چیزوں کی تعلیم عطا فرمائی۔ جہاں تک کتاب وشریعت کا تعلق ہے' حضرت مسیح' حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے پیرو اور داعی تھے وہ تورات سے الگ شریعت لے کر نہیں آئے تھے۔ اس حقیقت کا اعلان بار بار بڑے زور اور تاکید کے ساتھ انہوں نے خود فرمایا تھا۔ انجیلوں میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔ البتہ! انہوں نے اس شریعت کی روح اور اس کی حکمت نہایت معجزانہ انداز میں بے نقاب فرمائی ہے اور اناجیل درحقیقت ان کی انہی حکمتوں کا مجموعہ ہے۔ یہود نے تورات کو بالکل بے روح احکام اور بے جان رسوم کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس وجہ سے ان کی شریعت زندگی سے بالکل خالی' ان کیلئے صرف ایک بوجھ بن کے رہ گئی تھی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس کے اندر اپنی تعلیمِ حکمت سے زندگی پیدا کی اور یہی وہ چیز ہے' جس کو یہاں معجزے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

اس کے بعد مزید چند معجزات کا ذکر ہے' جن کا تذکرہ انجیل میں بھی کیا گیا ہے۔ یعنی مٹی سے پرندے کی ایک شکل بنانا اور پھر اس میں پھونکنا اور اللہ کے حکم سے اس کا پرندہ بن جانا۔ مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اللہ کے حکم سے صحت مند کر دینا۔ مردوں کو اللہ کے حکم سے زندہ کر دینا۔ لیکن ان تمام معجزات کے ذکر میں بطور خاص جو لفظ توجہ کے قابل ہے' وہ ہے ''بِاِذْنِی'' جس کا معنی ہے ''میرے حکم سے''۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ عیسائیوں کے عقیدے کا بگاڑ اس سبب سے ہوا کہ انہوں نے حضرت مسیح کے تمام معجزات کو ان کی ذات کی طرف منسوب کیا۔ یہاں ان کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ ان سے جتنے حیرت انگیز معجزات کا صدور ہوا ہے' وہ ان کی اپنی ذات کے کمال کا نتیجہ نہیں' بلکہ وہ سراسر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ظہور تھے۔ انہوں نے جتنے معجزات بھی دکھائے' سب اللہ کے اذن وحکم سے دکھائے۔ یہ بالکل سامنے کی بات ہے' جس کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ جب یہ سارے معجزات اللہ کے حکم اور اذن سے صادر ہوئے ہیں تو پھر نصاریٰ یہ بتائیں کہ انہوں نے آخر کس علمی دلیل کی بنیاد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بنا ڈالا کیونکہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میرے ہاتھ سے جو کچھ صادر ہو رہا ہے' میں خود اس کا فاعل ہوں بلکہ جب آپ کسی مردے سے یہ کہتے کہ تم زندہ ہو جاؤ تو آپ یہ نہیں کہتے تھے کہ میرے حکم سے زندہ ہو جاؤ بلکہ یہ کہتے تھے کہ میرے رب کے حکم سے زندہ ہو جاؤ۔ اسی پر باقی معجزات کو بھی قیاس کر لیجئے۔ جب حقیقت صرف یہ ہے تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں الوہیت کی علامات کہاں سے تلاش کر لی گئیں کہ ان کو خدا یا خدا کا بیٹا بنا دیا گیا بلکہ اس آیت کے اگلے حصے میں یہ تک فرمایا گیا ہے کہ جب یہود (بنی اسرائیل) نے آپ کو صلیب دینے کی کوشش کی اور آپ کی جان کے درپے ہو گئے تو خود آپ کے بس میں یہ بات نہ تھی کہ اپنے آپ کو ان دشمنوں کی دسترس سے بچا لیتے۔ اللہ فرماتا ہے۔ یہ میرا احسان ہے کہ میں نے بنی اسرائیل کی ظالمانہ کاروائی سے آپ کو محفوظ رکھا اور آپ کو آسمانوں پر اٹھا لیا۔ جو ذات والا صفات اپنی ساری عظمتوں کے باوجود اپنی ذات کا تحفظ نہ کر سکے اس کیلئے بھی وہ اپنے اللہ کی محتاج ہو' اسے بجائے اللہ کا برگزیدہ بندہ قرار دینے کے' خود معبود قرار دے دینا' تاریخ میں شاید اس سے بڑے ظلم کی مثال اور کوئی نہ ہو۔

اگلی آیت کریمہ میں ایک عجیب بات ارشاد فرمائی جا رہی ہے' وہ یہ کہ انسانی قلوب اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ انہیں جدھر چاہتا ہے' پھیر دیتا ہے۔ اگر وہ کسی کو مسلمان بنانا چاہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے اسلام قبول کرنے سے روک نہیں سکتی۔ عیسیٰ علیہ السلام اگر واقعی خدائی قدرتوں کے مالک

Marfat.com

تھے تو پھر کس قدر عجیب بات ہے کہ وہ اپنی ساری دعوتی مساعی اور اپنے سارے معجزات کے صدور کے باوجود نہ یہودی عوام کو قائل کر سکے اور نہ یہودی علماء کو بلکہ جیسے جیسے ان کی تبلیغی کاوشوں میں تیزی آتی گئی' ویسے ویسے ان کی دشمنی بھی بڑھتی گئی۔ بالآخر ایک ذخیرۂ آب کے کنارے پہنچے تو وہاں ماہی گیروں کے سامنے اللہ کا دین پیش کیا۔ اللہ فرماتا ہے کہ یہ میرا فضل واحسان تھا کہ میں نے ماہی گیروں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ وہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لائیں ورنہ حضرت مسیح کے بس میں یہ بات نہ تھی کہ وہ ایمان کی دولت سے انہیں بہرہ ور کر سکتے۔

آیت:۱۱۱ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَ بِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ O ''اور یاد کرو کہ جب حواریوں کے دل میں' میں نے یہ بات ڈالی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ' تو وہ بولے کہ ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا مذہب اسلام تھا

''حَوَارِیُّوْنَ'' حواری کی جمع ہے۔ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے' جس کا معنی ہے ''ہمدرد' خیر خواہ' غمگسار اور مددگار''۔ یوں کہنا چاہئے کہ یہ ''انصار'' کا ہم معنی لفظ ہے۔ جس طرح مدینے کے مسلمان' اسلام کی نصرت وتائید اور مسلمانوں کی ہر طرح کی مدد کی وجہ سے ''انصار'' کہلائے اور اسلامی تاریخ میں نہایت عزت ووقار کی علامت بن گئے۔ اس کے قریب قریب مقام' عیسائیت میں ان حواریوں کا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں' جنہوں نے ناگفتہ بہ حالات میں یہود کی دشمنی کی دہکتی آگ کے باوجود ایمان لانے کی ہمت کی۔ پھر اللہ کے اس دین کی تبلیغ ودعوت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کی اور انہی کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلفاء کی حیثیت بھی حاصل ہوئی۔ اس لئے بطورِ خاص ان کے ایمان کا تذکرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جبکہ ماحول قبولیتِ اسلام کیلئے بالکل ناسازگار تھا اور عیسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ ودعوت مسلسل ناکامی کے زخم اٹھا رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ احسان فرمایا کہ ان غریب لوگوں کو اسلام لانے کی توفیق عطا فرمائی اور مزید اس میں ایک اور بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ لوگ جب اسلام لے آئے اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت قبول کر لی تو انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ہم مسیحی ہیں بلکہ یہ کہا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جب بھی اللہ کا کوئی نبی یا کوئی رسول اللہ کے جانب سے دین لے کر آیا ہے تو اسکے ماننے والے ہمیشہ مسلمان ہی کہلائے ہیں۔ لیکن جب ان میں بگاڑ پیدا ہوا تو پھر اسکی انتہاء یہ ہوئی کہ وہ اپنا اصل نام گم کر بیٹھے اور کہیں وہ یہود ہو گئے اور کہیں مسیحی بن گئے۔ امت مسلمہ کیلئے یہ بات نہایت فکر مندی کی ہے کہ پہلی امتیں جس فساد کا شکار ہوئیں اور اپنا نام تک انہوں نے کھو دیا' ہمیں اس حوالے سے نہایت احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ جو آئے دن نئے نئے انتسابات اس امت میں پیدا ہو رہے ہیں اور نئے نئے نام اختراع کئے جا رہے ہیں اگر اس صورتحال کو نہ روکا گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بھی یہود ونصاریٰ کی طرح اپنے انجام کی گرفت میں آ جائیں۔

ابھی میں نے عرض کیا کہ حواریوں کا عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا رشتہ تھا اور تبلیغ ودعوت میں ان کا کیا مقام رہا ہے اور امت عیسائیت پر ان کے کیا کیا احسانات ہیں چونکہ اس سلسلۂ مضمون میں ان کا ذکر آ گیا ہے تو اپنی اس اہمیت کی وجہ سے پروردگار نے یہ ضروری سمجھا ہے کہ عیسائی جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو صحیح نہ سمجھنے کے باعث گمراہی کا شکار ہوئے' اسی طرح انہوں نے حواریوں کی طرف بھی بعض غلط باتیں منسوب کر دیں اور پھر اسی کو سند جان کر بہت ساری بدعات کو فروغ دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اسلئے یہاں حواریوں کا تذکرہ کر کے عیسائیوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم حواریوں کے بارے میں نجانے کیا کیا غلط انتسابات کر چکے ہو۔ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ حواری پروردگار اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا تصورات رکھتے تھے۔

آیت:۱۱۲تا۱۱۵ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ

Marfat.com

قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَO قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَO قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰيَةً مِّنْكَ ط وَارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَO قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ج فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَO ''یاد کرو! جبکہ حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تمہارا رب یہ کرسکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے خوان اتارے؟ اس نے کہا: اللہ سے ڈرو! اگر تم سچے مومن ہو''۔ ''وہ بولے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہم یہ جان لیں کہ تم نے سچ کہا اور ہم اس کی گواہی دینے والے بنیں''۔ ''عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی اے اللہ! ہمارے پروردگار تو ہم پر آسمان سے ایک خوان اتار جو ہمارے لئے یادگار بن جائے ہمارے اگلوں اور پچھلوں کیلئے اور تیری طرف سے ایک نشانی ٹھہرے عطا فرما تو بہترین عطا فرمانے والا ہے''۔ ''اللہ نے فرمایا: میں یہ خوان ضرور تم پر اتاروں گا لیکن اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا تو میں اس کو سزا بھی وہ دوں گا جو جہاں والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا''۔

سب سے پہلے ان آیات کے بعض نکات پر غور فرمائیے۔

1- حواری جو عیسیٰ علیہ السلام کے براہِ راست شاگرد اور آپ کے مقرب ترین صحابہ ہیں پہلی آیت کے آغاز ہی میں دیکھئے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کرتے ہوئے ''اے عیسیٰ ابن مریم'' کہہ رہے ہیں۔ نہ انہیں اللہ کہہ رہے ہیں' نہ ابن اللہ' نہ اس طرح کا کوئی اور لقب۔ اگر اس طرح کی کسی بات کی گنجائش ہوتی تو عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے اصل رازدان تو یہی لوگ تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کے مزاج شناس بھی یہی تھے۔ وہ یقیناً اس گنجائش سے فائدہ اٹھاتے اور آپ کو عیسیٰ ابن مریم کہنے کی جسارت کبھی نہ کرتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو جو دین سکھایا تھا اور دین کی جن بنیادی باتوں پر ان کی تربیت کی تھی' اس کے حوالے سے وہ آپ کو عیسیٰ ابن مریم ہی سمجھتے تھے کیونکہ یہی اس کا تقاضہ تھا اور اس سے زیادہ یا کم کسی اور لفظ کا استعمال وہ ہرگز آپ کیلئے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ذہن میں عیسیٰ علیہ السلام ایک انسان تھے الوہیت کا کوئی تصور ان سے چھو کر بھی نہیں گزرا تھا اس لئے وہ اس سے مختلف کوئی بات آپ کے بارے میں نہ سوچ سکتے تھے اور نہ کہنے کی جسارت کرسکتے تھے۔

2- اس سے پہلے کی آیت میں جیسا کہ ہم اشارہ کرچکے ہیں' حواریوں نے جس دین کو قبول کیا' اسے انہوں نے اسلام کا نام دیا اور اپنے آپ کو انہوں نے مسلمان کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اچھی طرح اس بات کو سمجھتے تھے کہ یہ دین یہودیت یا نصرانیت نہیں بلکہ اسلام ہے۔

3- ان آیات میں عیسیٰ علیہ السلام سے یہ درخواست کی گئی ہے کہ وہ اپنے رب سے یہ دعا کریں کہ وہ ہم پر ایک خوان نعمت نازل کرے۔ اس آیت میں انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے براہِ راست یہ نہیں کہا کہ آپ آسمان سے ہمارے لئے خوانِ نعمت اتاریں بلکہ ان سے درخواست جا رہی ہے کہ آپ اللہ سے دعا مانگیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کو بالذات معجزات کا دکھانے والا نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو صرف ان کے ظہور کا ایک ذریعہ جانتے تھے اور یہی وہ بنیادی تصور ہے' جو ایک آدمی کو راہ راست پر رکھ سکتا ہے کیونکہ جب آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اصل قدرت کا مالک' وہ پروردگار اور جس کے ہاتھ سے اس قدرت کا اظہار ہو رہا ہے وہ صرف ایک ذریعہ ہے' قدرت کا مالک نہیں۔ اب وہ جو کچھ بھی عبودیت کے احساسات اپنے اندر محسوس کرے گا اور پھر اس کی اچھی سے اچھی تعبیر لانے کی بھی کوشش کرے گا تو اس کی مصداق پروردگار کی ذات ہوگی اور وہ پیغمبر یا رسول مصداق نہیں ہوگا' جس کے ہاتھ سے ان معجزات کا ظہور ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۱۱۲ میں ایک لفظ استعمال ہوا ہے ''هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ'' کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تیرا رب طاقت رکھتا ہے کہ وہ ہماری مطلوبہ

Marfat.com

نعمت کو اتار سکے۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ یہ حواری جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحابہ ہیں' کیا انہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی طاقت کے بارے میں کچھ شبہ تھا کہ وہ بعض کام کر سکتا ہے اور بعض نہیں کر سکتا' ظاہر ہے کوئی بھی مومن جو اللہ کو قادر مطلق مانتا ہے' وہ کبھی بھی ایسے شبہے کا اظہار نہیں کر سکتا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس لفظ کا یہاں وہ مفہوم نہیں ہے' جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ وہ اصل میں یہ کہنا چاہتے تھے کہ ''آپ اللہ سے اس نعمت کے نازل کرنے کیلئے دعا فرمائیں' لیکن پہلے یہ معلوم کرلیں کہ کیا اللہ کی حکمت میں اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ ایسے معجزے کو ظاہر فرمائے اور ہمیں اس کی اجازت دے کہ ہم اس معجزے کا مطالبہ کرسکیں''، یعنی یہاں مقصود یہ نہیں ہے کہ ایسا کرنا اس کی قدرت میں ہے یا نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس کی قدرت کا ظہور ہمیشہ اس کی حکمت کے ساتھ ہوتا ہے' تو کیا ایسا معجزہ طلب کرنا اس کی حکمت کے مطابق بھی ہے یا نہیں۔ حواری صاحب ایمان لوگ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ معجزات طلب کرنا' اسکی بھی ایک خاص حد ہے۔ جب یہ طلب اس حد سے آگے نکل جائے اور وہ ایمان کے بنیادی تقاضوں ہی کو پامال کرنے لگے تو پھر اس کی اجازت نہیں دی جاتی بلکہ بعض دفعہ اس پر خدا کا عذاب آجاتا ہے۔ وہ یقیناً اس مثال سے واقف تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر تورات لینے کیلئے گئے تو اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے چند اشراف کو بھی لے گئے۔ لیکن وہاں پہنچ کر ان اللہ کے بندوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عجیب وغریب چیزوں کا مطالبہ شروع کردیا۔ وہ یہاں تک بڑھے' کہنے لگے:

لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً ﴿ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے' تاوقتیکہ کھلم کھلا اللہ کو نہ دیکھ لیں﴾ (البقرۃ ۲:۵۵)

اس پر وہ اللہ کے عذاب کی لپیٹ میں آگئے کیونکہ اللہ پر ایمان لانا' ایک آزمائش ہے اور یہ آزمائش اس وقت تک ہے' جب تک بن دیکھے اللہ کو مانا جائے اور اگر یہ شرط لگا دی جائے کہ میں اللہ کو دیکھ کر ایمان لاؤں گا تو پھر یہ آزمائش نہیں رہتی کیونکہ دیکھ کر کسی چیز کو مان لینا' یہ تو ایک معمول کی بات ہے۔ ایمان تو اصل میں اللہ کے نبی پر اعتماد کرتے ہوئے تمام ان باتوں کو ماننا ہے' جنہیں مانے بغیر آدمی مومن نہیں ہوسکتا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے' جیسے میں کسی سے یہ کہوں کہ فلاں جگہ فلاں واقعہ پیش آیا اور وہ مجھے پلٹ کر یہ کہے کہ اس طرح ہم نہیں مانتے۔ آپ ہمیں وہاں لے جاکر دکھایئے' دیکھنے کے بعد ہم مانیں گے۔ آپ اندازہ فرمایئے کہ اگر وہ دیکھ کر مان بھی گئے تو اس کی میرے نزدیک کیا قدر و قیمت ہوگی کیونکہ میرے نزدیک قدر و قیمت تو تب ہوگی' جب میرے اعتماد پر اسے تسلیم کیا جائے۔ یہ باتیں حواری جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اللہ سے ڈرتے ہوئے یہ بات کہی کہ ہم اپنی آنکھوں سے یہ معجزہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے آپ اس کا اطمینان کرلیں کہ یہ پروردگار کی حکمت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگرچہ یہ مطالبہ ایسا تو نہیں تھا' جسے ایمانی حقیقت کے خلاف قرار دیا جاتا۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ یہ پیغمبر کے اصحاب کے مقام و مرتبہ سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ سے ڈرو! اگر تم مومن ہو۔ ایمان لانے کے بعد معجزات کی طلب' کوئی پسندیدہ روش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کے بارے میں کوئی ایک واقعہ بھی ریکارڈ پر نہیں کہ ایمان کے دائرے میں آنے کے بعد کبھی بھی اس طرح کے کسی مطالبے کے بارے میں انہوں نے سوچا بھی ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام کے حواری یقیناً برگزیدہ لوگ تھے' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس دور کا واقعہ ہے' جبکہ وہ ابھی زیر تربیت تھے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اصحاب محمد ﷺ اور اصحاب عیسیٰ علیہ السلام دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے۔

ان آیات کے سلسلے میں ایک بات مزید کہنے کی ہے' وہ یہ کہ یہاں جس خوان نعمت کا مطالبہ کیا گیا ہے' کیا وہ نازل کیا گیا یا نہیں؟ اس بارے میں کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے کیونکہ قرآنِ کریم میں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا اور انجیل میں تو سرے سے اس واقعے کا تذکرہ ہی نہیں۔ اس لئے اکثر اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ جب پروردگار نے یہ تنبیہ کی کہ تمہارے مطلوبہ معجزے کو میں نازل تو کردوں گا' لیکن اس کے بعد اگر کسی نے کفرانِ نعمت کیا تو سزا

Marfat.com

ایسی دوں گا' جو آج تک کسی کو نہیں ملی ہوگی۔ اس سے حواری خوفزدہ ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی درخواست واپس لے لی۔ لیکن بعض لوگ اِنِّیۡ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک طرح سے پروردگار کا وعدہ ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ یہ مائدہ نازل نہ کیا گیا ہو۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ اگر یہ نازل کیا گیا تو اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کے بارے میں کوئی بات کہنا ممکن نہیں کیونکہ جتنی باتیں اس حوالے سے کہی گئی ہیں' ان میں سے کوئی بات بھی ثبوت کے مقام کو نہیں پہنچتی۔

تمہید

سابقہ آیات میں عیسیٰ علیہ السلام پر اللہ کے احسانات کا ذکر ہوا تا کہ یہود پر اتمام حجت ہو جائے۔ پھر اس میں ''بِاِذْنِی'' کی تکرار سے عیسائیوں پر اتمامِ حجت کیا گیا کہ تم ان معجزات کو عیسیٰ علیہ السلام کی طرف بالذات منسوب نہ کرو' وہ صرف ان کا واسطہ ہیں۔ اصل فاعل اللہ کی ذات ہے۔ اس لئے تمہیں اللہ کی قدرت کا قائل ہونا چاہئے نہ یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کے منصب پر فائز کر دو۔ پھر حواریوں کے تذکرے سے مزید عیسائیوں کو سمجھایا گیا کہ دیکھو! جو براہ راست حضرت مسیح کے شاگرد تھے' ان کا تصور حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں کیا تھا اور تم ان کو کیا سمجھے بیٹھے ہو۔ ان باتوں کو ذکر کرنے کے بعد اگلی آیات میں عجیب منظر نامہ ہمارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے' جس کا ایک ایک لفظ دل کو ہلا دینے کیلئے کافی ہے۔ اس میں جہاں عیسائیوں کیلئے بہت عبرت کے مقامات ہیں' وہاں مسلمانوں کیلئے بھی غور و فکر کا بہت مواد ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک امت کی بے اعتدالیاں' کس طرح ایک برگزیدہ پیغمبر کو عدالتِ خداوندی کے کٹہرے میں کھڑا کر دیں گی اور کس طرح ان کی بداعمالیوں کا حساب ان کے برگزیدہ پیغمبر سے لیا جائے گا۔ اسکو دیکھتے ہوئے یہ اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں امت مسلمہ کی بے اعتدالیاں' جو وہ اولیائے امت کے بارے میں روا رکھتے ہیں' کہیں ان اولیائے کرام کو اللہ کی عدالت میں کھڑا ہونے پر مجبور نہ کر دیں۔ آج جو کچھ ہم بڑے بڑے بزرگانِ دین کے مزاروں پر کر رہے ہیں اور جیسے جیسے تصورات' ان کے بارے میں ہم نے اختیار کر لئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان بزرگوں کو ان کی جواب دہی کرنا پڑے حالانکہ یہی وہ بزرگ ہیں' جو برصغیر کے ایک ایک مسلمان کے محسن ہیں۔ لاہور میں حضرت شیخ علی ہجویری المعروف داتا صاحب اور پاکپتن میں حضرت بابا فریدالدین گنج شکر اور اسی طرح اور بزرگانِ دین' اگر نہ ہوتے تو پنجاب میں لوگ شاید مڑھیاں پوج رہے ہوتے۔ نہ جانے کتنے لوگ آج تک اسلام کی دولت سے محروم ہوتے۔ اس لحاظ سے ہمارا رواں رواں ان کا شکر گزار ہے۔ لیکن دکھ کی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں تعلیم کیا دی تھی اور ہم ان کے مزاروں پر کیا کر رہے ہیں؟ بعض دفعہ ایسی ایسی باتیں سننے میں آتی ہیں کہ آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ ایک مسلمان بھی کبھی اس طرح سوچ سکتا ہے۔ ایک ذمہ دار آدمی نے مجھے یہ صحیح واقعہ سنایا کہ لاہور کی ایک فیملی حج کرنے گئی چند دنوں کے بعد اس خاندان کی بڑی اماں کا اہلِ خانہ کو خط ملا کہ اللہ کا شکر ہے' ہم خیریت سے مکہ معظمہ میں ہیں۔ عمرہ ادا ہو گیا ہے۔ روزانہ حرم میں نماز پڑھتے ہیں' طواف کرتے ہیں' اب صرف حج کا انتظار ہے۔ آپ سب لوگ داتا صاحب کے مزار پر جا کر دعا کرنا کہ اللہ ہمیں خیریت سے واپس لائے۔

شاید ایسے ہی احساسات تھے جن کی وجہ سے آنحضرت ﷺ آخری دنوں میں بار بار اس فکرمندی کا اظہار فرماتے تھے کہ جن باتوں سے اہلِ کتاب گمراہ ہوئے' کہیں وہ باتیں اس امت میں بھی نہ آ جائیں۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کہتے ہیں کہ آپ بار بار یہ فرما رہے تھے:

لعن اللہ الیہود و النصاری اتخذوا قبور انبیائھم مساجدًا

﴿اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے' انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔﴾

اس سے امت کو یہ سمجھانا مقصود تھا کہ دیکھو! اگر نبیوں کی قبریں سجدہ گاہ نہیں بن سکتیں تو پھر اولیاء امت کی قبریں سجدہ گاہ کیسے بن سکتی ہیں' اس

Marfat.com

دیکھنا تم کسی افراط و تفریط کا شکار نہ ہونا۔

اب اگلی آیات کو ملاحظہ فرمائیے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کی امت کی بے اعتدالیوں کے حوالے سے جواب طلبی کی گئی ہے:

آیت:۱۱۶تا۱۱۸ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَ اُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِىْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِىْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِىْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ○ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِىْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ ○ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ ''اور یاد کرو! جب کہ اللہ پوچھے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بناؤ۔ وہ جواب دے گا تو پاک ہے، میرے لئے کیسے روا تھا کہ میں وہ بات کہوں، جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات کہی تو تُو اسے جانتا ہے۔ تو جانتا ہے، جو کچھ میرے دل میں ہے، پر میں نہیں جانتا، جو تیرے دل میں ہے۔ غیب کی باتوں کا جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔ میں نے تو ان سے وہی بات کہی، جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی بندگی کرو، جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی اور میں ان پر گواہ رہا جب تک ان میں موجود رہا۔ پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تُو ہی ان پر نگران رہا اور تُو تو ہر چیز پر گواہ ہے ہی۔ اگر تو ان کو سزا دے، تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے، تو بیشک تُو غالب اور حکمت والا ہے''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی عدالت میں

اللہ کے دین میں چونکہ سب سے بنیادی عقیدہ توحید ہے۔ اسلئے ہر امت میں اسی پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسی عقیدہ میں اضمحلال کے باعث صاحب ایمان لوگ بھی عقیدہ کی خرابی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اگر یہ عقیدہ محض الفاظ کا کھیل بن کے رہ جائے اور اس کی روح موت کا شکار ہو جائے تو پھر وہ قومیں ایمان و اسلام کا نام لینے کے باوجود بھی اسلامی زندگی سے محروم ہو جاتی ہیں۔ ان کے اندر شرک کی آمیزش سے ایک ایسا کردار پیدا ہوتا ہے، جس میں نہ اللہ کا خوف ہوتا ہے نہ اللہ پر توکل۔ اعمال میں وہ لوگ اپنی خواہشات کے بندے ہوتے ہیں۔ تقویٰ کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑتی۔ پہلی امتیں اسی آشوب کا شکار ہوئیں اور بالآخر تباہی کو پہنچ گئیں۔ اسلئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کی امت کے حوالے سے سب سے پہلے عقیدۂ توحید سے متعلق ہی باز پرس ہو رہی ہے کیونکہ اس امت نے اس عقیدہ کی جس طرح دھجیاں اڑائی ہیں، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ عیسائیوں نے اللہ کے ساتھ صرف مسیح اور روح القدس ہی کو خدا بنانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسیح کی والدہ ماجدہ حضرت مریم علیہا السلام کو بھی ایک مستقل معبود بنا ڈالا حالانکہ حضرت مریم علیہا السلام کی الوہیت یا قدوسیت کے متعلق کوئی اشارہ تک بائبل میں موجود نہیں ہے بلکہ مسیح کے بعد ابتدائی تین سو برس تک عیسائی دنیا اس تخیل سے بالکل نا آشنا تھی۔ تیسری صدی عیسوی کے آخری دور میں سکندریہ کے بعض علماءِ دینیات نے پہلی مرتبہ حضرت مریم کیلئے ''اُمّ اللہ'' یا ''مادرِ خدا'' کے الفاظ استعمال کئے۔ اسکے بعد آہستہ آہستہ الوہیت مریم کا عقیدہ اور مریم پرستی کا طریقہ عیسائیوں میں پھیلنا شروع ہوا۔ لیکن اول اول چرچ اسے باقاعدہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھا بلکہ مریم پرستوں کو فاسد العقیدہ قرار دیتا تھا۔ پھر جب نسطوریس کے اس عقیدے پر کہ مسیح کی واحد ذات میں دو مستقل جداگانہ شخصیتیں جمع تھیں، مسیحی دنیا میں بحث وجدال کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تو اس کا تصفیہ کرنے کیلئے ۴۳۱ء میں شہر افسوس میں ایک کونسل منعقد ہوئی اور اس کونسل میں پہلی مرتبہ کلیسا کی سرکاری زبان میں حضرت مریم کیلئے ''مادرِ خدا'' کا لقب استعمال کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریم پرستی کا جو مرض اب تک کلیسا کے باہر پھیل رہا تھا، وہ اسکے بعد کلیسا کے اندر بھی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا، حتیٰ کہ نزولِ قرآن کے زمانہ تک پہنچتے پہنچتے

Marfat.com

حضرت مریم اتنی بڑی دیوی بن گئیں کہ باپ' بیٹا اور روح القدس تینوں ان کے سامنے ہیچ ہو گئے۔ ان کے مجسمے جگہ جگہ کلیساؤں میں رکھے ہوئے تھے' ان کے آگے عبادت کے جملہ مراسم ادا کئے جاتے تھے' انہی سے دعائیں مانگی جاتی تھیں' وہی فریاد رس' حاجت روا' مشکل کشا اور بیکسوں کی پشتیبان تھیں اور ایک مسیحی بندے کیلئے سب سے بڑا ذریعہ اعتماد اگر کوئی تھا تو وہ یہ تھا کہ ''مادرِ خدا'' کی حمایت و سرپرستی اسے حاصل ہو۔ ''قیصر جسٹینین'' اپنے ایک قانون کی تمہید میں حضرت مریم علیہا السلام کو اپنی سلطنت کا حامی و ناصر قرار دیتا ہے۔ اس کا مشہور جنرل ''نرسیس'' میدان جنگ میں حضرت مریم علیہا السلام سے ہدایت و رہنمائی طلب کرتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے ہمعصر ''قیصر ہرقل'' نے اپنے جھنڈے پر ''مادرِ خدا'' کی تصویر بنا رکھی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس تصویر کی برکت سے یہ جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ اگرچہ بعد کی صدیوں میں تحریک اصلاح کے اثر سے پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے مریم پرستی کے خلاف شدت سے آواز اٹھائی' لیکن رومن کیتھولک کلیسا آج تک اس مسلک پر قائم ہے۔

اس تفصیل سے آپ کو کسی حد تک اندازہ ہو گیا ہوگا کہ عیسائی دنیا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ محترمہ کے بارے میں جو تصورات اختیار کئے' وہ کس حد تک عقیدۂ توحید کو تباہ کرنے والے تھے اور ایسے عقائد کے بعد ایسے عقائد کے حاملین کا اللہ سے کیا رشتہ باقی رہ سکتا ہے۔ اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سب سے پہلے اسی بنیادی عقیدے کے حوالے سے ان کی امت کے طرز عمل کے بارے میں سوال کیا جا رہا ہے کہ اللہ کے رسول تو دنیا میں اپنی امتوں کو اسی عقیدۂ توحید پر قائم کرنے کیلئے آتے ہیں' لیکن آپ کی امت نے جس طرح اس عقیدہ کے پرخچے اڑائے' کیا آپ نے انہیں اسکی تعلیم دی تھی؟ ظاہر ہے' یہ سوال اس قدر تکلیف دہ اور حیران کن ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام' اس لرزہ خیز سوال کا جواب ہانپتے کانپتے ہونٹوں کے ساتھ' عاجزانہ دل سے' گردن جھکا کر' نہایت ادب اور خشوع سے دینے کی کوشش فرمائیں گے۔ لیکن شدت احساس کے باعث یہ ہمت نہیں پڑے گی کہ براہ راست اس سوال کا جواب دیں۔ اسلئے اس جواب کا آغاز اللہ کی تسبیح و تنزیہ سے کریں گے۔ لفظ ''سبحان'' تعجب آمیز خوف پر بھی دلالت کرتا ہے اور اللہ کی تنزیہ پر بھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک طرف تو تعجب آمیز خوف میں پوری طرح مبتلا ہوں گے اور آپ اس احساس میں ڈوبے جا رہے ہوں گے کہ میری ساری تعلیم کے باوجود' میری اس امت نے آخر اتنا بڑا جرم کیسے کیا اور دوسری طرف' وہ اللہ کی ذات کو دیکھتے ہوئے کہ وہ ہر طرح کی شرک سے پاک ہے' بار بار اسکی شرک سے پاکیزگی کا اظہار کریں گے۔ انہی جذبات میں غلطاں و پیچاں' بڑی مشکل سے آپ یہ کہنے کی جسارت فرمائیں گے کہ اے پروردگار! آپ نے مجھے اپنا رسول بنا کر بھیجا' رسول کا کام لوگوں کو اللہ کی ذات اور صفات کا صحیح تصور دینا اور اسی کی بنیاد پر ان کی صحیح تربیت کرنا ہے' اسلئے میرے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ میں رسول ہوتے ہوئے' اس طرح کی بات کہتا۔ ایسی بات تو کوئی عامی بھی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا' جو اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں معمولی علم بھی رکھتا ہو۔ مجھے تو آپ نے منصب رسالت پر فائز کیا تھا اور علم نبوت سے بہرہ ور فرمایا تھا۔ میرے لئے یہ کیسے ممکن تھا اور میرا مقام اسکی کیسے اجازت دیتا کہ میں ان سے اس طرح کی بے سروپا بات کہتا۔ پھر اپنے اسی جواب کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید عرض کریں گے کہ یا اللہ! تیری صفات میں سے ایک صفت علم بھی ہے' تو ہر چیز کا جاننے والا ہے' تیرے علم سے تو دنیا کی کوئی چیز مخفی نہیں' یہ کیسے ممکن تھا کہ اگر میں ایسی بات کہتا تو آپ کے علم میں نہ آتی۔ اسلئے اگر میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوگی تو یقیناً آپ کے علم میں ہوگی۔ کیونکہ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں سخن سازی سے کام لیتے ہوئے اپنے دل میں کسی بات کو چھپاؤں کیونکہ تو تو میرے دل کے بھیدوں سے بھی واقف ہے' البتہ! میں ایک بندہ ہوتے ہوئے' یہ بالکل نہیں جانتا کہ تیرے دل میں کیا ہے' اس لئے کہ

اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿بے شک غیبوں کے جاننے والے تو آپ ہی ہیں۔﴾

Marfat.com

عبرانی زبان میں ''اب'' اور ''ابن'' کا مطلب

اس عاجزی اور سرافگندگی کے بعد اب عیسیٰ علیہ السلام اپنے آپ کو کچھ سنبھال پائیں گے تو ہمت کر کے اصل بات کہنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ عرض کریں گے کہ میرے مالک میں نے تو ان سے وہی بات کہی تھی، جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا کیونکہ میں تیرا رسول معصوم ہوں، تیرے احکام سے ہٹ کر میں ان سے کوئی اور بات کیسے کہہ سکتا تھا اور وہ بات یہ تھی:

اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیۡ وَ رَبَّکُمۡ ﴿اللہ کی بندگی کرو، جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔﴾

اس میں اس بات کا امکان ہرگز نہیں تھا کہ وہ آپ کی ربوبیت اور الوہیت میں مجھے اور میری والدہ کو شریک کرتے۔ یہاں رک کر شاید اس کی وضاحت مناسب رہے گی کہ عبرانی زبان میں اصل میں ''اب'' کا لفظ رب اور اب یعنی باپ اور رب دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ''ابن'' کا لفظ بیٹا اور بندہ دونوں معنوں میں بولا جاتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اب کے لفظ کو ''رب'' کے معنی میں استعمال کیا اور ''ابن'' کو بندہ کے معنی میں۔ لیکن بعد کے مترجمین نے اس کو بجائے رب اور بندہ کے معنی میں لینے کے باپ اور بیٹے کے معنی میں لیا اور یہاں سے بگاڑ بڑھتے بڑھتے اس انتہاء کو پہنچ گیا، جو آج ہمارے پیشِ نظر ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام اسی کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ میری دعوت تو صرف یہ تھی کہ اللہ ہی کی عبادت اور بندگی کرو جو تمہارا بھی رب ہے اور میرا بھی رب ہے۔ انہوں نے بجائے رب کے اس کو اب یعنی باپ بنا لیا اور مزید یہ کہ میں جب تک ان میں موجود تھا، میں ان کا نگران تھا اور میں جانتا تھا کہ یہ لوگ اللہ کے بارے میں اور میرے بارے میں کیا طرزِ عمل رکھتے ہیں۔ لیکن جب آپ نے مجھے اٹھا لیا، اس کے بعد تو آپ ان کے نگران تھے اور آپ ہی ان کے حالات کو جاننے والے تھے، میں تو ہرگز نہیں جانتا کہ میرے بعد انہوں نے کیا کیا کیونکہ ہر چیز کے ہر وقت جاننے والے تو آپ ہی ہیں، کسی اور میں یہ قدرت تو نہیں کہ وہ ہر طرح کا علم ہر زمانے میں رکھتا ہو۔ میری غیر حاضری میں انہوں نے کیا گل کھلائے، یہ تو وہ جانتے ہیں یا پھر آپ جانتے ہیں۔ میں اس سے بالکل بے خبر ہوں۔ اسلئے ان کی بداعمالیوں کی ذمہ داری مجھ پر کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ تمام وضاحتیں میدانِ حشر میں تمام دنیا کے سامنے ہو رہی ہوں گی اور عیسائی دنیا بھی برابر اس کو سن رہی ہو گی، جس کے نتیجے میں وہ ندامت کے سمندر میں غرق ہو گی اور لوگ برابر نفرت کے تیر ان پر برسا رہے ہوں گے۔ یہی وہ تصور ہے، جو عیسائی دنیا کو دینا مقصود ہے کہ تمہارے مشرکانہ عقائد کی وجہ سے تمہیں کل کو جس صورتحال سے دوچار ہونا ہے، آج موقع ہے کہ نبی آخر الزماں کی تشریف آوری اور قرآنِ کریم کے نزول سے تمہارے لئے جو ہدایت کا سامان ہو رہا ہے اور کل کا پیش آنے والا منظر نامہ تمہاری آنکھوں کے سامنے کھول کر دکھا دیا گیا ہے تاکہ اگر تمہیں کچھ بھی اپنے آپ سے ہمدردی ہے تو اس سے عبرت حاصل کرو۔

قرآنِ کریم نے دوسرے مقامات پر اس بات کو بیان کیا ہے کہ اللہ کے نبیوں کو بھی اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ کسی مشرک کے بارے میں اللہ سے مغفرت کی سفارش کریں۔ حتیٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے والد، جن کا انتقال حالت شرک میں ہوا، کی شفاعت سے روک دیا گیا۔ عیسیٰ علیہ السلام اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اسلئے وہ اپنی امت کے بارے میں ان کے مشرکانہ عقائد کے واضح ہو جانے کے بعد، کوئی سی بھی سفارش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو رقت قلبی اور دل کے گداز کی نعمتوں سے جس طرح نوازتا ہے، اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنی امت کے بارے میں سراپا رحمت بنے رہتے ہیں۔ چنانچہ اسی احساس کے پیشِ نظر ایک طرف تو عیسیٰ علیہ السلام یہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ آپ اپنی امت کی سفارش کریں، لیکن ساتھ ہی دل کے ہاتھوں مجبور بھی ہیں۔ اس لئے پیرایۂ بیان ایسا اختیار فرمایا ہے کہ سفارش کا الزام بھی نہیں لیا، لیکن اللہ کی رحمت کو آواز دیئے بغیر بھی نہیں رہ سکے۔ عرض کیا:

اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ ۚ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ ○

﴿اگر تو ان کو عذاب دے، تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو بخش دے تو بے شک تو غالب حکمت والا ہے۔﴾

Marfat.com

آیت:۱۱۹ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ O ”اللہ فرمائے گا: آج سچوں کو ان کی سچائی کے نفع پہنچانے کا دن ہے۔ ان کیلئے باغ ہوں گے، جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، یہی بڑی کامیابی ہے“۔

مطلب یہ ہے کہ آج کا دن تو راست بازوں کی فتح مندیوں اور کامرانیوں کے ظہور کا دن ہے۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد و میثاق کو پوری طرح نبھایا اور اپنے قول و عمل اور جفا کوشی اور وفا شعاری سے اس کو سچ ثابت کیا اور ہر طرح کے نشیب و فراز میں، اس پر قائم رہے یہ دن ان کی کامیابیوں کا دن ہے۔ آج بدعہدوں، خائنوں اور جھوٹی آرزوؤں میں زندگی گزارنے والوں کیلئے حسرت و یاس کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ جنہوں نے اللہ کے ساتھ رشتۂ اخلاص کو مضبوط رکھا، ان کیلئے آج باغ ہوں گے، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یعنی ان کے رب نے جو کچھ ان سے چاہا، انہوں نے اس کی رضا کے مطابق وہ پورا کر دکھایا اور انہوں نے اپنے رب سے جو امیدیں باندھیں، ان کی توقعات اور ان کے تصورات سے ہزاروں، لاکھوں درجہ بڑھ کر وہ پوری ہوئیں۔ یہی وہ بڑی کامیابی ہے، جو ایک مومن کی اصل منزل ہے اور آج مومن اپنی اس منزل کو پالیں گے۔

آیت:۱۲۰ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۭ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ O ”آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے، سب کی بادشاہی اللہ ہی کیلئے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے“۔

انسان کی فلاح کا حقیقی نسخہ

یہ سورۃ مائدہ کی آخری آیت ہے۔ اس میں نہ صرف سورۃ مائدہ کی تعلیمات کی روح کھینچ لی گئی ہے بلکہ یہ تمام اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔

انسان کی تمام گمراہیوں کا اصلی سبب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سمیت، تمام زیر تصرف دنیا کا مالک اور حاکم انسانوں کو سمجھتا ہے اور یا ان قوتوں کو جن کے بارے میں اس نے کچھ تصورات اختیار کر رکھے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ وہ انسانوں اور ان قوتوں کے سامنے اپنی ضرورتوں کیلئے دست سوال دراز کرتا ہے۔ اپنی تنہائیوں میں انہیں سے مناجاتیں کرتا ہے اور محسوس دنیا میں انہیں کے سامنے جھکتا اور انہیں کو اختیارات کا مالک سمجھتا ہے۔ قانون کی ضرورت پڑتی ہے تو انسانوں کے وضعی قوانین کو اختیار کرتا ہے۔ تہذیب اور تمدن کیلئے انہیں کی دریوزہ گری کرتا ہے۔ خوف اور امید میں انہیں کو اپنا آستانہ سمجھتا ہے۔ گویا خود انسان اور انسانی ادارے اس کی عبادت گاہ بھی ہیں اور اس کی عقیدت کا مرکز بھی۔ وہی اس کیلئے تخت و تاج کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں کی قوتیں اور طاقتیں، اس کیلئے پناہ گاہیں ہیں۔ انہی تصورات نے انسانوں کو ہمیشہ اللہ سے یکسر بیگانہ کیا ہے۔ اس لئے اس بنیادی خرابی کا علاج کرنے کیلئے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان بسنے والی قوتیں اور مخلوقات، ان تمام کا اگر کوئی مالک ہے، کوئی حاکم ہے اور کسی کو ان پر حکومت چلانے کا حق ہے اور کوئی ان کو قانون کی اطاعت پر مجبور کر سکتا ہے تو وہ صرف ایک اللہ ہے۔ اسی کی قدرتیں بے پناہ ہیں۔ ساری دنیا کی قوتیں اس کے سامنے پرکاہ جیسی حیثیت بھی نہیں رکھتیں۔ اس کی قدرتوں میں، اس کے علم میں، اس کی حاکمیت میں، کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں۔ یہی وہ تصور ہے جس نے ہمیشہ انسانی زندگی کی اصلاح کی اور آج بھی اسلام اسی کی دعوت دیتا ہے اور یہی انسانی زندگی کے بگاڑ کو دور کرنے کا حقیقی نسخہ ہے کیونکہ باقی تمام نسخے انسان کو بگاڑ تو سکتے ہیں سنوار کچھ نہیں سکتے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ [illegible]

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی [illegible]

ھُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات کا مجموعہ

تفسیر روح القرآن

(جلد [illegible])

(سُوْرَةُ النِّسَآءِ) ...... ۱۴ ...... ([illegible])

مؤلف

مولانا ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی

Marfat.com